ماہِ نو

مدیر ـــــــ وقار عظیم

جلد ۱ شمارہ ۱

اپریل ۱۹۴۸ء

[illegible]

کچھ اپنی باتیں

"ماہِ نو" کا پہلا پرچہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ اپنی تنگ دامانی کے باوجود اس نے مختلف قسم کا مواد پیش کرنے کی کوشش کی ہے — افسانے، نظمیں، غزلیں، علمی، ادبی، اخلاقی اور تمدنی موضوعات پر مقالے نظم و نثر کے اس مجموعے کو دیکھ کر آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ "ماہِ نو" کی اشاعت کا مقصد کیا ہے۔ اس کے مضامین وقت کے اہم تقاضوں کے آئینہ دار ہیں، وہ اخلاق کی قدروں کے ایک خاص معیار کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ انھوں نے اُس وحشت اور درندگی کے خلاف آواز اٹھائی ہے جسے انسان اور انسانیت کے نام و نشان تک سے دشمنی ہے۔ کچھ مضمون مایوس ذہنوں کو امید کی کرن کی جھلک دکھاتے ہیں۔ مضامین کے اس تنوع میں آپ کو ماضی کی پسندیدہ قدروں کے نقوش کے ساتھ ساتھ حال کی تصویریں بھی نظر آئیں گی اور مستقبل کا پیام بھی۔ "ماہِ نو" کا اجرا انھیں مقاصد کا پرتو ہے۔

ادبی نقطۂ نظر سے ماہِ نو کا مسلک و مشرب وسیع النظری پر مبنی ہوگا۔ اس کے اوراق ادب کی قدیم روایتوں کے نقوش کے بھی حامل ہوں گے اور ادب اور شعر کے نئے تجربوں کی جولاں گاہ بھی ——— ادب میں جو کچھ لطیف و جمیل ہے، ادب میں جو کچھ زندگی کی نزاکتوں کا حامل ہے اور اس میں جو کچھ خیر کا حامی اور شر سے باغی ہے، اس کے لئے 'ماہِ نو' کا دامن ہمیشہ وسیع رہے گا۔ اس شمارہ میں مجموعی حیثیت سے آپ کو معلوماتی مضامین کی کسی قدر کمی محسوس ہوگی۔ امید ہے کہ ارباب قلم کی مزید توجہ سے "ماہِ نو" اس کمی کو دور کر سکے گا۔

جن ادیبوں نے "ماہِ نو" کی قلمی اعانت کی ہے وہ انسان کے مستقبل کی طرف سے مایوس نہیں ہیں۔ انھیں انسانیت کی فتح کا یقین ہے۔ وہ محبت، اخوت اور انسانیت کو دنیا میں عام کرنے کے خواہش مند ہیں۔ ان کا یہ جذبہ پُرامن، پُرسکون اور پُرمسرت مستقبل کی ضمانت کرتا ہے۔ خدا کرے "ماہِ نو" اس جذبہ کا ترجمان بن کا امن، سکون اور مسرت کو قریب سے قریب تر لانے کا وسیلہ بن سکے۔

"ماہِ نو" کے اس نقشِ اول کو دلچسپی اور افادیت سے مرقع بنانے میں جن فن کاروں نے ہمارا ہاتھ بٹایا ہے ہم ان کے ممنونِ احسان ہیں۔ جن حضرات کی نگارشات "ماہِ نو" کے آئندہ پرچوں کے لئے ہمارے پاس آچکی ہیں، ہم ان کے بھی ممنون ہیں۔ اور اپنے اُن کرم فرماؤں سے ہماری درخواست یہ ہے کہ وہ "ماہِ نو" کو اپنا سمجھیں اور وہ خدمت سرانجام دینے میں اس کی اعانت فرمائیں جو اس نے اپنے ذمہ لی ہے۔ "ماہِ نو" کا دامن ہمیشہ ان کے الطاف کریمانہ کا محتاج رہے گا۔

جو کچھ ہوا، ہوا کرم سے تیرے
جو کچھ ہوگا، تیرے کرم سے ہوگا

مدیر

حامد حسن قادری

تاریخ قیامِ پاکستان

(قرآن مجید سے)

(۱)

کُنتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ ¹

۱۳۶۶ھ

ہوا قائم جو پاکستان آخر	بھلے ہی دن تھے ہندوستان کے وہ
سمجھتے ہیں اسے وہ مژدۂ امن	جو اسلام اور مسلم سے ہیں آگہ
یہ دنیا کو ہے آزادی کا پیغام	شبِ تاریک میں ہے مشعلِ رہ
مساوات و اخوت کا علمدار	سکون و عافیت کا پیش خیمہ
ریاست کی مثالِ بے مثالی	سیاست کا زمانے کو نمونہ
سناؤں قادری قرآں سے تاریخ؟	بتاؤں اس کی اک وجہِ موجّہ؟

مسلمانوں کا پاکستان حق تھا
کہ تھا ارشاد، کُنتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ

[illegible]

۱۳۶۶ھ

(۲)

(تاریخ دیگر از قرآن کریم سنہ عیسوی)

اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ ²

(سنہ عیسوی) ۱۹۴۷ء

---

¹ کُنتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ۔ (تم بہترین امت ہو جس کو انسانوں کے لئے پیدا کیا گیا ہے تم نیکی کا حکم کرتے ہو اور برائی سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو) ² ترجمہ: ہم کو اپنے فضل سے ہمیشہ رہنے کے گھر میں لا اتارا جہاں ہم کو کوئی تکلیف نہ پہنچے گی۔

اسد ملتانی

غم نہ کر

گر فضا ہے تیرہ و تار اے مسلماں غم نہ کر ظلمتِ شب سے سحر ہوگی نمایاں غم نہ کر

ہر طرف سے آفتوں نے گرچہ گھیرا ہے تجھے مژدۂ لاتقنطو دیتا ہے قرآں غم نہ کر

میں نے مانا تجھ پہ ٹوٹا ہے مصیبت کا پہاڑ شاید اس میں بھی کوئی نعمت ہو پنہاں غم نہ کر

خالی از حکمت نہیں ہوتا کوئی فعلِ حکیم پختہ ہے جب حکمتِ باری پہ ایماں غم نہ کر

پھر نظر آئینگی اس میں لہلہاتی کھیتیاں گر زمیں سیلاب نے کردی ہے ویراں غم نہ کر

ہے یہی رفتار جلد اس کے گزرنے کی دلیل ہو چلی ہے تیز اگر رفتارِ طوفاں غم نہ کر

جس نے آزادی کی دولت سے نوازا ہے تجھے ہے اس آزادی کا وہ خود ہی نگہباں غم نہ کر

عزم و ہمت سے قدم رکھ تو سہی میدان میں غیب سے ہو جائے گا نعمت کا ساماں غم نہ کر

رائگاں ہرگز نہ جائیں گی تری قربانیاں رنگ لائے گا ابھی خونِ شہیداں غم نہ کر

اے اسد اللہ پر پورا بھروسا چاہیئے
مشکلیں ہو جائیں گی پل میں سب آساں غم نہ کر

غزل

فراق گورکھپوری

ستارے ابھی لے چکے ہیں بسیرے
کہاں آگئے تم سویرے سویرے ؟

یہ زلفِ سیہ تاب کی مہکی راتیں !!
یہ گل رنگ رُخ کے سہانے سویرے

تبسم میں وہ فصلِ گل کے مناظر
تنفس میں وہ خوشبوؤں کے بسیرے

ستاروں کی آنکھیں بھی لگتی چلی ہیں
چلے آؤ۔ دل ہیں اندھیرے اندھیرے!

بہت کم نکلتے ہیں ہم گھر سے لیکن !
ترے کوچے کے ہو ہی جاتے ہیں پھیرے!

مری زندگی کیا سے کیا کر چکے ہیں ؟
یہ دل کے اُجالے یہ دل کے اندھیرے

یہ کس مہرومہ کے قدم اُٹھ رہے ہیں
اُجالے اُجالے؛ اندھیرے اندھیرے

جگی بھیرویں کی پَویں پھوٹ رہی ہیں
وہ باتوں کے ترڑکے ہنسی کے سویرے

جوانی کی راتیں، محبت کی باتیں!
کہ انگڑائیاں لے رہے ہیں اندھیرے

وہ امرت میں ڈوبی جبیں کے اُجالے
وہ آہستہ اُٹھتی نظر کے سویرے

زمیں پر اُتر آئیں گے آسماں بھی !
محبت سے کہہ دو یہیں ڈالے ڈیرے

رقابت کا ایسے میں مذکور ہی کیا
سُن اے مدعی وہ نہ میرے نہ تیرے

یہ سورج کا پرچم، یہ تاروں کا عالم
ترے عشق کے اُڑ رہے ہیں پھریرے

ترا درد چمکا؛ تری یاد آئی !
اُجالے اُجالے؛ اندھیرے اندھیرے

بھرا دل جنھیں سونپ رکھا ہے تم نے
وہی ہیں فراق اس نگر کے لٹیرے

احمد ندیم قاسمی

کل اور آج

کل تو ہر گام پہ منزل کا گماں ہوتا تھا
آج ہر منزلِ دشوار ہے پیغامِ رحیل

کل ہر انکار تھا گستاخی و دہر آشوبی
آج ہر لغزشِ پا عظمتِ آدم کی دلیل

کل سلاطیں کا اجارہ تھا سیاست بازی
آج قانون کی تشکیل کا دہقاں ہے کفیل

کل جہاں قتل کے فرمان لکھے جاتے تھے
آج وہ اوج ہے جمہور کی نظروں میں ذلیل

کل جو بھڑکائی تھی نمرودِ ملوکیت نے
آج وہ نارِ جہنم ہے گلستانِ خلیل

کل تو قابیل کی ہیبت تھی دلوں پہ طاری
آج آنکھوں میں اُتر آیا ہے خونِ ہابیل

کل فرنگی کا رُخِ سُرخ تھا معیارِ جمال
آج زنگی بھی ہے اللہ کی تخلیقِ جمیل

کل تھے بے مایہ سی نالے وطنیت کے نشاں
آج ذہنوں میں نہ دجلہ ہے نہ گنگا ہے نہ نیل

کل تھی جس بحر کے ساحل کی کولمبس کو تلاش
آج وہ بحر ہے سمٹی ہوئی سکڑی ہوئی جھیل

کل فقط کاکل و رخسار سے تھی فکر حسیں
آج مزدور کی تاریخ بھی ہے ذکرِ جمیل

کل جو آدم پہ کئی آفتیں بن کر ٹوٹے
آج اُن احکام کی کرتی ہے مشیت تعمیل

آج اُس اوج پہ انساں ہے جہاں تک نہ اُٹھے
بالِ جبریل کا کیا ذکر! ــــ خیالِ جبریل

مسعود حسن

مدینۂ آدم

دیئے وہ جل گئے مدھم! ذرا قدم تو بڑھا

وہ دور — ! ساحلِ دریا پہ جگمگاتا دیار
وہاں ملے گی تجھے زندگی کی تازہ بہار
ابھی سے اتنا ہے بے دم، ذرا قدم تو بڑھا

نہ دیکھ مڑ کے نظر آئیں گے وہ کوہِ گراں
طویل راہوں میں جن کی گزار دیں صدیاں
ہزاروں ندیاں پُرنم — ذرا قدم تو بڑھا

جہانِ نو کے لئے باب وہ مدینۂ نو
ہمارے خوابوں کا ملتا ہے اس میں کچھ پرتو
ہزار تجھ میں نہیں دم، ذرا قدم تو بڑھا

مکیں وہاں پہ ملیں گے تجھے کشادہ جبیں
ہر ایک کوچے کو پائے گا شاہراہ حسیں
نگیں ہو جس پہ وہ خاتم — ذرا قدم تو بڑھا

ہر ایک رُخ پہ گلاب اور ہر ایک لب پہ کنول
جبیں جبیں پہ ہے مہتاب بال بال میں بَل
نظر بھی شعلہ و شبنم! ذرا قدم تو بڑھا

جسے بھی دیکھو وہاں شعلہ ہے، شرارہ نہیں
کہ ماہتاب بھی ہیں کوئی ستارہ نہیں
کوئی دیا نہیں مدھم — ذرا قدم تو بڑھا

وہاں بہار میں کوئی بھی سوگوار نہیں
چراغ ہنس کے یہ کہتے ہیں شہریار نہیں
نہ جام ہے نہ کوئی جم — ذرا قدم تو بڑھا

نیا جنوں ہے وہاں اور نئی دلوں میں ترنگ
خیال کے بھی شبستاں میں جاگ اٹھی ہے امنگ
عمل سے فکر ہے مدغم — ذرا قدم تو بڑھا

دریچے کھلتے ہیں پُر شور بحر پر اس کے
اک انقلاب سمیٹے ہیں بام و در اس کے
چل اور کہہ بھی دے سَم سَم، ذرا قدم تو بڑھا

ملے گا تجھ کو نشانِ سحر وہاں جا کر
تجھے بشر کی ملے گی خبر وہاں جا کر
وہ ہے مدینۂ آدم! ذرا قدم تو بڑھا

خواجہ غلام السیدین

آندھی میں چراغ![1]

آج کل ہم لوگ قومی زندگی کے جس دَور سے گذر رہے ہیں اس میں بعض اہم قدروں کو سخت خطرہ درپیش ہے۔ اور ان کا تحفظ جس قدر ضروری ہے اسی قدر مشکل بھی ہے۔ بے شک اس عرصے میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے بل جل کر اور اس کے بعد علیٰحدہ علیٰحدہ بہت کچھ سیاسی جدوجہد کی ہے، جس پر یہاں تبصرہ کرنا مقصود نہیں لیکن ملک کی عام ذہنی اور اخلاقی حالت کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ دو صدیوں کی غلامی کے اثرات نے اور راستہ دکھانے والوں کی ناعاقبت اندیشی اور راستہ چلنے والوں کی بے حسی اور جہالت نے قوم کے دل اور دماغ کو مسخ کر دیا ہے اور ان میں سے خوب اور ناخوب کی تمیز بڑی حد تک اٹھ گئی ہے۔ لوگ سیاسی ہنگاموں کی رونق دیکھ کر خوش ہو جاتے ہیں جماعتوں کے دعوؤں میں انہیں قومی ترقی کا سراب دکھائی دیتا ہے یا آزادی کے دل خوش کن وعدے کو سن کر سمجھتے ہیں کہ منزلِ مقصود کو پہنچ گئے لیکن ان کے چاروں طرف جو خوفناک حقیقتیں منڈلا رہی ہیں، جو طاقتیں ان کے روحانی اور اخلاقی توازن کو بگاڑ رہی ہیں، جو آندھیاں اچھی قدروں کے چراغوں کو بجھانے کے درپے ہیں وہ ان کی طرف سے غافل ہیں۔ ان کی آنکھیں ہیں لیکن وہ دیکھتے نہیں ورنہ محض ملک کے روزانہ اخباروں کا مطالعہ ہر سمجھدار شخص کے سکون خاطر کو ختم کر دیتا ہے۔ ان کے کان ہیں لیکن وہ سنتے نہیں ورنہ وہ زہر جو تقریروں کے ذریعے لوگوں کے دماغوں تک پہنچتا ہے ملک کے ہر بھلا چاہنے والے کی نیند ختم کر دینے کے لئے کافی ہے۔ ان کے دل ہیں لیکن وہ سوچتے نہیں ورنہ ان کے بچے اور نوجوان اور بالغ جس فضا میں زندگی بسر کر رہے ہیں، ان کی مختلف جماعتیں جس وحشیانہ انداز میں ایک دوسرے سے لڑ رہی ہیں، ان کے بنگال اور بہار اور پنجاب اور گڑھ مکتیسر کے شرمناک کرتوت، جو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی مشترکہ تہذیب پر لعنت کا داغ ہیں، یہ تمام چیزیں انہیں مجبور کرتیں کہ وہ اپنے دلوں اور دماغوں کو ٹٹولیں اور ہر قسم کی سیاسی اور اقتصادی کشمکش اور باہمی مخالفت اور تعصب کو بھلا کر ان بنیادی خرابیوں کی طرف توجہ کریں جو قومی زندگی اور قومی اخلاق کو گھن کی طرح کھا رہی ہیں۔ میں سب خوفناک آثار دیکھتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اس تیز اور تند "آندھی" میں قدروں کے یہ چراغ روشن رہ سکیں گے یا نہیں! یورپ کی پہلی جنگ عظیم کے شروع ہونے پر ۱۹۱۴ء میں ایک مشہور مغربی مدبر نے کہا تھا۔ "براعظم یورپ کی روشنیاں ایک ایک کر کے گل ہوتی جاتی ہیں۔ خدا جانے یہ لیمپ دوبارہ ہماری زندگی میں روشن ہوں گے یا نہیں!" مجھے بھی بعض اوقات اسی قسم کا اندیشہ ہوتا ہے۔ جو چراغ ہمارے مذہب اور تہذیب نے، ہمارے ادب اور فلسفے نے، ہمارے شاعروں اور مفکروں نے، ہمارے فقیروں اور صوفیوں نے، ہماری عورتوں اور مردوں نے صدیوں کی کوشش سے جلائے تھے اور صدیوں تک روشن رکھے تھے وہ سب ایک خوفناک آندھی کی جھپیٹ میں آ گئے ہیں۔ اور اکثر لوگوں کی حرکتوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اب نہ ان کے گھروں میں روشن ہیں، نہ ان کے دلوں میں۔ مجھے بحیثیت ایک معلم کے یہ بات اس زمانے کی اور تمام خرابیوں سے زیادہ کھٹکتی ہے اور زیادہ خطرناک معلوم ہوتی ہے۔ میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ اگر کوئی قوم عدل اور انصاف، شرافت اور اخلاق کی رسّی کو مضبوط تھامے رہتی ہے تو اس کے لئے ممکن ہے کہ وہ سیاسی آزادی، مادّی خوش حالی حاصل کرے لیکن اگر ان اقدار اعلیٰ پر اس کی گرفت ڈھیلی ہو گئی تو وہ ان چیزوں کو یا تو حاصل نہ کر سکے گی یا حاصل کرنے کے بعد جلد کھو دے گی۔ کیونکہ اس کی وجہ سے قومی زندگی کے اندر خود بخود ایسی کشاکش پیدا ہو جاتی ہے کہ اس کا سکون اور توازن قائم ہی نہیں رہ سکتا۔ علاوہ اس کے یہ بھی یاد رکھئے کہ اگر ہم مقصد اور ذریعے کی اضافی اہمیت کو نظر انداز کر کے ذریعہ کو وہ اہمیت دینے لگیں جو مقصد کا حصہ ہے تو ہم سراسر گھاٹے میں رہیں گے۔ آخر علم، دولت اور سیاسی آزادی کی اہمیت کیوں ہے؟ وہ بجائے خود تو مقصودِ حیات نہیں ہیں۔ ان کو حاصل کرنے کی غرض یہی ہوتی ہے کہ انسان ان سے فائدہ اٹھا کر اپنی زندگی کو بنائے اور سنوارے اپنی صلاحیتوں کو فروغ دے اور مذہب کی اصطلاح میں

[1] :- خواجہ صاحب نے یہ مضمون ملک کی موجودہ بد امنی سے پہلے مرتب فرمایا تھا اور اس سے بھی کئی مہینے پہلے لکھا تھا۔ اس لئے ممکن ہے مضمون کے بعض حصّے قارئین کو بعد از وقت معلوم ہوں۔ مدیر

"زمین کو، جو فسق و فجور سے بھر گئی ہے، عدل و انصاف سے معمور کر دے"۔
لہٰذا بقول انجیل مقدس کے "کیا فائدہ ہوگا انسان کو اس بات سے کہ وہ ساری دنیا کو حاصل کرے لیکن اپنی روح کی دولت کو کھو بیٹھے"۔
مجھے اندیشہ یہ ہوتا ہے کہ ہم کہیں اپنی انفرادی اور جماعتی خود غرضی کی یورش اور کشمکش میں نہ صرف دنیا حاصل کرنے میں ناکام رہیں بلکہ "روح کی دولت" بھی نہ کھو بیٹھیں! کیا آپ کو یہ اندیشہ بے بنیاد معلوم ہوتا ہے؟ سنئے! اگر کسی ملک میں افراد کی اوسط آمدنی چند آنے روزانہ ہو، اور اوسط عمر پچیس سال کے قریب ہو، اگر ان میں پچاسی فی صدی ناخواندگی ہو، اگر ان کو کھانے کے لئے کافی اور مناسب غذا نہ ملتی ہو، پہننے کو کپڑا میسر نہ ہو، رہنے کو ایسے مکان ملیں جن میں نہ صفائی کا انتظام ہو نہ ہوا اور روشنی کا گذر، اگر شہر اور گاؤں دونوں موجودہ تمدن کی مادی آسائشوں سے محروم ہوں اور ملک کی بہت بڑی اکثریت محض روزی کمانے کی کشمکش میں گرفتار ہو اور انھیں زندگی کے دوسرے امکانات کی طرف توجہ کرنے کے لئے نہ فرصت ہو نہ دل نہ دماغ، اگر کسی ملک میں ایسی صورت حال ہو تو کیا یہ کہنا غلط ہے یا مبالغہ ہے کہ اس نے دنیا حاصل نہیں کی؟ اب رہی روح کی دولت، تو اس کا اندازہ کس طرح لگایا جا سکتا ہے؟ اول تو یہ ضروری ہے کہ ہم دنیا کی دولت اور روح کی دولت کا صحیح تعلق سمجھیں۔ مشرق کے فکر میں اکثر جسم اور روح، دنیا اور دین کو دو مختلف بلکہ متضاد چیزیں سمجھا گیا ہے۔ اگر دنیا کی طرف توجہ کروگے۔ اگر جسم کی مادی ضروریات کی فکر کروگے تو دین ہاتھ سے جاتا رہے گا، روح افسردہ ہو کر رہ جائے گی۔ لیکن درحقیقت یہ خیال صحیح نہیں یہ تو ایک غلط اور بیمارانہ "روحانیت" کا اظہار ہے! جو قوم اپنی روح کی عفت اور دماغ کی جولانی کو قائم رکھتی ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ وہ دنیاوی اعتبار سے پس ماندہ ہو اور اگر کسی قوم کی وہ حالت ہو جو آج کل ہماری ہے۔ اس کے عام لوگوں کی ہے تو اس کا روحانیت کا دعویٰ سرے سے باطل ہے۔ زبورِ عجم میں مرید ہندی پیر رومی سے شکایت کے لہجہ میں سوال کرتا ہے:۔

آسمانوں پہ میرا فکر بلند　　میں زمیں پر خوار و زار و دردمند
کارِ دنیا میں رہ جاتا ہوں میں　　ٹھوکریں اس راہ میں کھاتا ہوں میں
کیوں مرے بس کا نہیں کارِ زمیں　　ابلہِ دنیا ہے کیوں دانائے دیں

پیر رومی کا جواب جسم اور روح کے اصلی تعلق کو ایک معنی خیز اختصار کے ساتھ یوں واضح کرتا ہے:۔

ہر کہ بر افلاک رفتارش بود　　بر زمیں رفتن چہ دشوارش بود!

لیکن اس اصول دلیل کو قطع نظر کر کے اگر ہم ملک کی موجودہ ذہنی اور اخلاقی آب و ہوا پر نظر ڈالیں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ آج ہماری روح کی دولت بھی معرض خطر میں ہے۔ دور کیوں جایئے گزشتہ چند سال کے واقعات ہی کو دیکھئے۔ بنگال کے قحط میں پندرہ لاکھ سے زیادہ خدا کے بندے فاقوں سے سسک سسک کر مر گئے اور ان سے کہیں زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے جن کی صحت اور قوتِ عمل ہمیشہ کے لئے تباہ ہو گئی لیکن ہمارے ضمیروں کوئی زبردست انقلاب پیدا نہ ہوا! ہاں، مجھے یہ معلوم ہے کہ اس فوری مصیبت سے متاثر ہو کر ملک کے ہر حصے میں بہت کچھ چندہ کیا گیا اور نیم فاقہ کش طریبوں سے لے کر سوسائٹی کی معزز اور فیشن ایبل خواتین تک نے اس تحریک میں حصہ لیا لیکن کیا اس طرح چندہ دے کر افراد اور سماج اس گناہ کا کفارہ کر سکتے ہیں، خون کے ان دھبوں کو دھو سکتے ہیں جو اس ہولناک حادثے کی وجہ سے ان کے نامۂ اعمال پر لگ گئے ہیں؟ یہ لاکھوں آدمی آنکھوں کے سامنے مر گئے اور حکومت ٹس سے مس نہ ہوئی، اہل دولت عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے رہے نفع خور سوداگر اور مہاجن ذخیرہ اندوزی کرتے رہے اور اس موت کے ڈرامے سے نفع کماتے رہے۔ چاول اور گیہوں کے کھلیان اور رس گلوں کی دوکانیں بھری رہیں اور لوگوں نے ان کے سامنے بے بسی کے عالم میں دم توڑ دیا! چشمِ فلک اور چشمِ انسان نے یہ تماشا دیکھا اور ضمیرِ عالم میں تہلکہ برپا نہ ہوا! میں اپنی خوش فہمی اور ناسمجھی کی بدولت سمجھتا تھا کہ بنگال کی یہ قیامت نہ صرف ہماری آنکھیں کھول دے گی بلکہ ہمارے دل اور دماغ کی بند اور تنگ کوٹھریاں بھی کھل جائیں گی اور وہ یہ محسوس کریں گے کہ اب شرافت اور سمجھداری کے ساتھ مل جل کر اپنی مادی اور تہذیبی زندگی کو بچانے کے لئے جد و جہد کا وقت ہے۔ مجھے یہ گمان نہ ہو سکتا تھا کہ چند سال کے اندر اندر ملک کے دوسرے حصوں کے فساد اور خوں ریزی اور نام نہاد "انسانوں" کی حیوانیت کے مظاہرے بنگال کے قحط کو بھی بھلا دیں گے۔ قحط کے متعلق تو بہت کچھ

لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ایک آسمانی عذاب ہوتا ہے گو آج کل کے زمانے میں ایسا خیال کرنا غلطی ہے لیکن بہرحال اس سے بعض لوگ ایک قسم کی تسکین حاصل کر لیتے ہیں "ہم کیا کر سکتے ہیں۔ خدا کی مرضی ہی یہ تھی کہ فصلیں خراب ہو جائیں اور ملک میں کال پڑ جائے" لیکن یہ خون ریزی جو ابھی سال بھر کے اندر اندر ہوئی ہے اس کے لئے تو اس قسم کا غلط جواز بھی نہیں مل سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ تہذیب اور شرافت محض ایک بیرونی ملمع تھی ایک دھوکا یا دکھاوا تھی اور ذرا سے اشتعال پر وہ درندے نکل پڑے جو ان انسانوں کے اندر چھپے بیٹھے تھے ہیں تو اقبال کے ان اشعار کو، جن میں تہذیب حاضر پر چبھتا ہوا طنز کیا گیا ہے یہ سمجھ کر پڑھتا تھا کہ ان کا وار صرف مغرب کی قوموں پر پڑتا ہے خود ہم پر نہیں۔ اور اس سے مجھے ایک قسم کا افسردہ اطمینان حاصل ہوتا تھا!

انساں جہانِ تازۂ تہذیب برفروخت — خاکِ سیاہ و رُش پُر آئینہ دا نمود
پوشید پنجہ را تہِ دستانۂ حریر — افسونِ قلم شد و تیغ از کمر کشود
ایں بوالہوس صنم کدۂ صلحِ عام ساخت — رقصید گرد او بنوائے چنگ و عود
دیدم چو جنگ پردۂ ناموسِ او درید — جز سفکُ الدماء و خصیمٌ مبینٌ نبود!

لیکن ان واقعات سے اندازہ ہوا کہ ہمارا اپنا ملک، جس کو اپنی قدیم تہذیب اور امن پسندی اور انسان دوستی پر ناز رہا ہے اس الزام سے کسی طرح بری نہیں ہو سکتا۔ نگاہ حقیقت شناس میں ایٹم بم بنانے اور استعمال کرنے والوں اور فرقہ واری جنون سے حواس باختہ ہو کر عورتوں و بچوں اور نہتے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارنے والوں میں کوئی فرق نہیں جو بات غلط ہے، خلاف انسانیت ہے رحم اور ہمدردی اور شرافت کے جذبات کے منافی ہے وہ اخلاقی نقطۂ نظر سے اتنی ہی قابل گرفت ہے خواہ اس کے نتیجہ کے طور پر ایک شخص زیر ظلم ہو یا ایک جماعت پر اس کی وجہ سے چند سو آدمیوں کا خون ہو یا چند ہزار کا یا چند لاکھ کا لیکن آج کل عام اخلاقی احساس اس قدر مسخ ہو گیا ہے کہ اول تو لوگوں کو ان واقعات کی پوری اہمیت اور نزاکت کا ان کے اخلاقی اور معاشرتی ردعمل کا پورا اندازہ ہی نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو وہ عارضی ہوتا ہے اور اس کے متعلق اخباروں میں چند بیان شائع کر کے لوگ سمجھ لیتے ہیں کہ ان کا فرض پورا ہو گیا۔ مگر کیا اثر ہو سکتا ہے ان چند بیانات کا اس مسلسل اور خطرناک زہر کے مقابلے میں جو اخباروں کے کالموں میں ہر روز شائع ہوتا رہتا ہے اور عوام کی ذہنی خوراک کا کام دیتا ہے؟ بلکہ مجھے تو یہ شکایت ہے کہ معقول بیان شائع کرنے میں بھی خست سے کام لیا جاتا ہے۔ میں نے بار بار دیکھا ہے کہ جب ہندو مسلم فساد کا کوئی واقعہ ہوتا ہے تو حتی الامکان ہندو اور مسلمان دونوں دوسری جماعت پر الزام لگانے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں اور خود اپنی جماعت کی ذمہ داری پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں اور جب تک بالکل ہی مجبور نہ ہو جائیں اس کے بارے میں لب کشائی اور خامہ فرسائی کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ ہندوستان بھر میں شاید چند ہی آدمی ایسے نکلیں گے جو اس بارے میں انصاف پسندی اور غیر جانبداری سے کام لیتے ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ حال میں بعض بااثر لیڈروں نے فساد کے علاقوں میں جا کر امن قائم کرنے کی کوشش کی ہے اور باہمی رواداری اور مفاہمت پر زور دیا ہے اور مہاتما گاندھی اور قائد اعظم محمد علی جناح نے ایک مشترکہ بیان شائع کیا ہے لیکن یہ اس قدر تاخیر سے کیا جا رہا ہے اور اس کا پس منظر اس قدر تاریک اور خوفناک ہے کہ ان کوششوں میں بہت دیر میں کامیابی ہو سکتی ہے۔ علاوہ اس کے عوام کے جذبات کو سالہا سال تک اس بے دردی سے بھڑکایا گیا ہے اور تعصب، نفرت، مخالفت اور تنگ دلی کا اس طرح پرچار کیا گیا ہے کہ عام لوگ جو صدیوں سے امن اور آشتی سے زندگی بسر کر رہے تھے اب لیڈروں کے ہاتھ سے نکل گئے ہیں اور اگر ملک کے تمام بااثر لیڈر نیک نیتی اور یک جہتی کے ساتھ ان کے خیالات کو پلٹنے کی کوشش نہ کریں گے تو یہ مہم ہرگز سر نہیں ہو سکتی۔ دراصل یہ کام اس قدر اہم اور ضروری ہے کہ اس کے مقابلے میں جماعتوں کے سیاسی مفاد اور چال بازیاں اور اقتصادی و صنعتی مسائل سب ہیچ نظر آتے ہیں۔ سب سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ موجودہ فضا کی بدولت ہمارے بچوں اور نوجوانوں کی ذہنیت بھی دن بہ دن خراب ہوتی جاتی ہے یعنی اس طرح یہ مسئلہ نہیں بلکہ آئندہ نسل کی تباہی اور اخلاقی ابتری کا بیج بویا جا رہا ہے۔ اگر ہمیں دراصل اس صورت حال کی اصلاح مقصود ہے تو تمام نیک اور شریف اور بااثر لوگوں کا جو اپنے ملک و ملت کا بھلا چاہتے ہیں، یہ فرض ہے کہ پہلے وہ اپنے دل و دماغ کا رشتہ ان ابدی قدروں کے ساتھ جوڑیں جن پر انسانی شرف کا دار و مدار ہے اور پھر اپنی مثال اور تبلیغ اور تلقین

کوشش کے ذریعے مسخ شدہ ذہنوں کی سنگلاخ زمین میں ان قدروں کا بیج بوئیں۔

میرا عقیدہ یہ ہے کہ انسانی تہذیب، تمدن اور اخلاق کی بنیاد اس مرکزی جذبے پر قائم ہے کہ ہر انسان ایک قابل قدر شخصیت کا امین ہے جس کی نشو و نما اور پوشیدہ صلاحیتوں کی تربیت فرد اور جماعت دونوں کا اہم ترین فرض ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ زندگی کی اصل دولت زر و سیم ہے نہ کارخانے، نہ مکان، نہ ساز و سامان، نہ تمدنی زندگی کے مادی اور مشینی آلات۔ اس کی اصل دولت افراد ہیں اور افراد کی دولت کیا ہے؟ ان کے دماغ کی جلالی، ان کے دل کا گداز، ان کی حسن آفرینی، ان کی قدر شناسی، ان کا سماجی احساس، ان کی خوب تر کی جستجو، ان کا جذبۂ تلاش و تحقیق۔ اقبال نے اس دولت کی طرف اپنے ساقی نامے میں اس خوبصورتی اور اثر کے ساتھ اشارہ کیا ہے کہ بے اختیار جی چاہتا ہے کہ چند اشعار آپ کو سنا دوں۔ یہ اس متاعِ فقیر کی تفسیر ہے جس نے اقبال کو فقیری میں امیر بنا دیا تھا:—

مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں — مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
امنگیں مری آرزوئیں مری — امیدیں مری جستجوئیں مری
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز — مری خلوت و انجمن کا گداز
مرا دل مری رزم گاہِ حیات — گمانوں کے لشکر یقیں کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر — اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے — لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے!

جس سماج میں فرد کی قدر کی جاتی ہے، بعض کی نہیں بلکہ تمام افراد کی۔ کالے اور گورے کی، غریب اور امیر کی، معمولی اور غیر معمولی کی، ذہین اور کند ذہن، گوشہ نشین اور آرائش محفل کی۔ اور ان کی تربیت کے لئے ایک موزوں ماحول مہیا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اس میں پُرامن ترقی اور آزادی کا امکان ہے۔ لیکن جہاں باہمی تعلقات کی بنیاد نفرت، تعصب، تنگ نظری اور کشاکش پر رکھی جائے، جہاں چند کے فائدے میں باقی سب کا نقصان ہو، جہاں افراد کی ذاتی صفات اور صلاحیت کے بجائے ان کے نسل، خاندان اور مذہب کے لیبل دیکھے جائیں اور ان کے مطابق ان کے ساتھ سلوک کیا جائے، ایسی سوسائٹی کبھی ایک صالح اور صحت مند سوسائٹی نہیں بن سکتی۔ اس لئے میرے نزدیک انسان کی سب سے بڑی صفت "انسانیت" ہے یعنی تمام انسانوں کی عزت کرنا کیونکہ وہ انسان ہیں، اس بات کا پرخلوص یقین کہ ہر شخص یا تقریباً ہر شخص کے اندر نورِ الٰہی کی کوئی چنگاری پوشیدہ ہے جس کو محنت اور محبت اور صبر کے ساتھ روشن کرنا سب کا مشترکہ فرض ہے۔ بسا اوقات عقل کی آنکھ اس چنگاری کو دیکھ نہیں سکتی، ماہر نفسیات کی نظر اس تک پہنچ نہیں سکتی۔ لیکن دل اسے محسوس کرتا ہے اور محبت کی کنجی ان سات پردوں کو کھول سکتی ہے جن کے اندر یہ چنگاری چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ ممکن ہے وہ لوگ جو سرے سے خدا کے وجود ہی کے منکر ہیں "نورِ الٰہی کی چنگاری" کے الفاظ سے ڈریں۔ لیکن وہ بھی اسے اپنی جگہ پر یوں سمجھ سکتے ہیں کہ ہر فرد میں کوئی نہ کوئی ایسی صلاحیت ہوتی ہے کہ اگر اس کی مناسب تربیت کی جائے تو اس کی بدولت نہ صرف اس کی اپنی شخصیت مالا مال ہو جاتی ہے بلکہ وہ سماج کا ایک مفید رکن بھی بن سکتا ہے۔

در اصل ہماری تمام سیاسی، معاشرتی، اقتصادی اور اخلاقی تحریکوں کی قدر اسی کسوٹی پر پرکھی جا سکتی ہے جو تحریک فرد کا احترام کرتی ہے اس کی نشو و نما میں معین ہوتی ہے ہمیں اس کا خیر مقدم کرنا چاہئیے۔ جو تحریک فرد کو دباتی ہے یا اس کے دل و دماغ کو تنگ بناتی ہے وہ خطرناک ہے، خواہ اسے کیسی ہی دلفریب شکل میں ہمارے سامنے پیش کیا جائے۔ ہٹلر کے سیاسی اور نسلی فلسفے کے خلاف انسان کے اخلاقی احساس نے اس وجہ سے بغاوت کی کہ وہ وحدت انسانی کے تصور اور شخصیت کے احترام کو رد کر کے اس کے بجائے نسل اور رنگ اور خون کو فضیلت کا معیار قرار دیتا تھا۔ اس نظریہ کے مطابق فرد کی حیثیت محض حکومت کی مشین کے ایک پرزے کی ہو جاتی ہے جس کی قوت محرکہ ایک مطلق العنان حاکم کی مرضی ہو۔ ممکن ہے ان حالات میں کوئی قوم دولت اور فوجی اور سیاسی اقتدار کے لحاظ سے ترقی کر لے لیکن اس کے افراد اپنے سب سے بڑے شرف سے محروم رہ جاتے ہیں یعنی انہیں یہ چیزیں اپنے ضمیر اور اپنے عقیدے اور عمل کی آزادی کو بیچ کر حاصل ہوتی ہیں اور ان داموں یہ سودا بہت مہنگا ہے۔ اگر یاد رکھئے کہ اخلاق اندھیر گردی کے اس زمانے میں یہ خرابی اور خطرہ صرف جرمنی یا اٹلی تک محدود نہیں بلکہ مختلف شکلوں میں اور مختلف ملک دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی پایا جاتا ہے، خواہ وہ کتنی بلند آہنگی سے آزادی

جمہوریت اور انفرادی حقوق کے احترام کا دعویٰ نہ کریں۔ برطانیہ اور امریکہ جمہوری ملک ہیں لیکن ان کا سیاسی اور سماجی نظام سرمایہ داری کی بنیادوں پر تعمیر ہوا اور اسی کے ستونوں پر قائم ہے اور وہ بھی بڑی حد تک اس جرم میں شریک رہی ہیں جس کا الزام ان کی طرف سے کلیت پسند ملکوں پر لگایا جاتا ہے۔ (گو اس میں شک نہیں کہ برطانیہ میں سوشلسٹ حکومت قائم ہو جانے سے کی سیاست کا رنگ ڈھنگ بہت کچھ بدلا ہے اور اس کا اثر ان کی داخلی اور خارجی پالیسی دونوں پر پڑا ہے) سرمایہ داری کے نظام کا ایک ناگزیر نتیجہ یہ ہے کہ اس میں بیشتر افراد کی حیثیت مقصد کی نہیں رہتی بلکہ وہ محض دوسرے زیادہ چالاک یا زیادہ دولت مند لوگوں کے مقاصد کی تحصیل کا ذریعہ بن جاتے ہیں اور اس طرح مذہب کی تعلیم نے انسان کے لئے جو کسوٹی مقرر کی ہے جس پر جرمن فلسفی کانٹ نے بھی خاص طور پر زور دیا ہے وہ اس پر پورے نہیں اترتے۔ خود اپنے ملک کے کسانوں اور مزدوروں اور عام لوگوں کی حالت کو دیکھ لیجیے۔ ان کی ساری زندگی محنت اور مشقت کر کے چیزیں بنانے، فصلیں اگانے اور دولت پیدا کرنے میں صرف ہوتی ہے لیکن انہیں اس دولت میں سے بمشکل اتنا حصہ ملتا ہے کہ وہ اپنا گزارہ کر سکیں۔ (اور کبھی اتنا بھی نہیں ملتا)۔ اس وجہ سے وہ زندگی کی ذہنی اور جمالی لذتوں سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ ان کی اقتصادی زندگی پر سرمایہ داروں کا اور سیاسی زندگی پر سیاسی پارٹیوں کا تصرف بے جا ہے۔ یہاں تک کہ وہ "اپنی روح کو بھی اپنا نہیں کہہ سکتے!"

جاں بھی گرو غیر بدن بھی گرو غیر　　افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے

میں نے اوپر ذکر کیا ہے کہ وہ سب مفکر جو زندگی کی صحیح قدروں کو پہچانتے ہیں ایسی تحریکوں کا خیر مقدم کرتے ہیں جن کا مقصد فرد کی خودی کا احترام کرنا اور اس کو سماج کا محور اور مرکز سمجھنا ہے۔ ہمارے اس زمانے میں بعض ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں جن کی وجہ سے ان تحریکوں کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ مشینی صنعت و حرفت کی تنظیم، بڑے پیمانے کی منصوبہ سازی، نقل و حرکت کی سہولتیں اور اس قسم کی تمام جدید ترقیوں کا تقاضا یہ ہے کہ اجتماعی جدوجہد اور سوسائٹی کے مقاصد اور منصوبوں کو مقدم سمجھا جائے اور فرد کو موخر۔ جہاں کاروبار بین الاقوامی ہو، کارخانوں میں لاکھوں مزدور کام کریں، وسائل نقل و حرکت زمین کی طنابوں سے ملا دیں، تجارتی کمپنیاں ملکوں کی حد بندی کو توڑ کر ساری دنیا میں پھیل جائیں، فوجی زندگی کی یکسانیت اور تنظیم سول زندگی میں پیدا ہونے لگے، تعلیم کے ادارے اور لاکھوں کی تعداد میں چھپنے والے اخبار اور رسالے لوگوں کے دماغ کو ایک ہی سانچے میں ڈھالنے کی نامبارک کوشش میں لگے ہوں وہاں بغیر کسی خاص بدنیتی کے بھی اس ہنگامے اور یورش میں فرد کے لئے اپنی شخصیت کا توازن اور اپنی ذہنی اور جذباتی دیانت اور آزادی کو قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ دراصل ہر وہ تحریک خطرناک ہے جو فرد کی اہمیت کو کم کرے خواہ وہ کسی شکل میں نمودار ہو۔ دور حاضر میں اس نے مختلف شکلوں میں اپنا سر اٹھایا ہے۔ کبھی وہ سرمایہ داری کے بھیس میں انسان کو جسے بجائے خود ایک مقصد ہونا چاہیئے محض دوسروں کا ذریعہ یا آلہ کار بنا دیتی ہے۔ کبھی شہنشاہیت کے نشے میں بدحواس ہو کر کمزور قوموں کی حق تلفی اور محرومی کا سبب بنتی ہے، کبھی حب وطن کا لباس پہن کر شرافت اور رواداری کا خون کرتی ہے کبھی نسل اور رنگ کا تعصب بن کر دنیا کے امن کو خطرے میں ڈالتی ہے، کبھی فرقہ پرستی کا جنون بن کر صدیوں کی اخلاقی اور تہذیبی میراث کو برباد کر دیتی ہے، کبھی جماعت کو حیوانی قوت کا غرور دلا کر افراد کی آزادی پر چھاپہ مارتی ہے اور کبھی افراد کی خود غرضی اور مطلب پرستی کو ابھار کر انہیں جماعت کے لئے تباہ کار بنا دیتی ہے۔ غرض اس کے ہزار رنگ ہیں اور ہر رنگ زہریلا ہے اور یہی کشمکش جو انصاف اور ظلم میں ہمیشہ ہوتی رہتی ہے۔ حق و باطل کی اصلی جنگ ہے جو آج بھی اپنی پوری شدت کے ساتھ جاری ہے۔

حقیقت ابدی ہے مقامِ شبیری　　بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی

"مقامِ شبیری" کی عظمت تو یہ ہے کہ وہ ہر انسان کی واقعی اور امکانی انسانیت کا احترام کرتی ہے، جو قوتیں اس کی تخریب کے درپے ہیں ان کا بے خوف ہو کر مقابلہ کرتی ہے اور اس راستے میں کسی قیمت کو کسی قربانی کو گراں نہیں سمجھتی۔ ساری جماعت کی آستینوں میں بت چھپے ہوں مگر یہ حکم اذاں کی تعمیل کرتی ہے۔ برخلاف اس کے "انداز کوفی و شامی" کا مشترک مقصد اور کوشش یہ ہے کہ انسان اپنے شرف حقیقی سے محروم ہو جائے۔ سب کی بھلائی میں اپنی بھلائی اور سب کی ترقی میں اپنی ترقی تلاش نہ کرے بلکہ دوسرے کا حق مار کر اپنا نفس موٹا

کرے اور جبر کے ذریعے ناحق کو حق تسلیم کرائے۔ انیسویں صدی نے خطرے کی گھنٹی بجائی۔ بیسویں صدی میں اس کی پکار اور تیز ہوگئی ہے اور اس خطرے کا مقابلہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ خودی کو عقل اور عشق کے ہتھیاروں سے مستحکم کر دیا جائے تاکہ عصر حاضر کی یورش میں اس کے پاؤں شرافت، انصاف، امن اور خودداری کے راستے سے نہ ڈگمگائیں۔

لیکن خودی کی پاسداری کے آداب میں ایک دلچسپ چیز یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی خودی کی پاسداری نہیں کر سکتا جب تک وہ دوسروں کی خودی کی پاسداری بھی اسی خلوص اور اہتمام سے نہ کرے۔ اس طوفان میں سے صرف اپنی کشتی بچا کر بھاگ نکلنا ممکن نہیں، دوسرے ڈوبتوں کو بچانا بھی ضروری ہے۔ بات یہ ہے کہ ہر فرد کی خودی جہاں ایک طرف ایک بالکل جدا اور آزاد چیز ہے وہاں دوسری طرف اس کا اپنے ساتھیوں کی خودی کے ساتھ بہت گہرا رشتہ بھی ہے، بلکہ ایک طرح وہ ان کی خودی کا ایک لازمی جزو ہے اور زندگی کا نقشہ ان کے باہمی ردعمل، ان کے تانے بانے سے تیار ہوتا ہے یعنی یہ خودی شمع محفل کی طرح سب سے جدا بھی ہے اور سب کی رفیق بھی ہے! جب کبھی کوئی جماعت ایسا نظام قائم کرتی ہے یا کوئی شخص ایسا طریقہ اختیار کرتا ہے جس سے کسی خاص گروہ کی یا بعض افراد کی خودی کمزور ہوتی ہے اور وہ اپنے جائز حقوق سے محروم ہو جاتے ہیں تو اس کا اثر دیر یا سویر خود ان پر بھی پڑتا ہے جنھوں نے ایسا اقدام کیا تھا۔ شیخ سعدی کا یہ اندیشہ، بالکل درست تھا کہ تمام بنی آدم ایک دوسرے کے اعضا ہیں اور اگر کسی ایک عضو کو تکلیف پہنچتی ہے تو باقی تمام اعضا بھی بے چین ہو جاتے ہیں۔ یہ بات تو ہمیشہ صحیح تھی لیکن آج اس کی صداقت زیادہ شدت کے ساتھ ثابت ہے کیونکہ پہلے زمانوں میں باہمی انحصار اور اغراض و مفاد کی وابستگی اس قدر واضح نہ ہو پائی تھی جیسی آج ہے۔ اگر ہم اس حقیقت کو سمجھ لیں تو شاید انفرادیت اور اجتماعیت کی کشمکش اور ان کے سطحی تضاد کے مسئلے کو بھی حل کر سکیں گے۔

میں اس مضمون میں برابر اس امر پر زور دیتا رہا ہوں کہ ہماری اجتماعی جدوجہد اور تنظیم کا مقصد خودی کا استحکام اور اس کی مناسب تربیت ہے۔ لیکن جب ہم اس مقصد کی تحصیل کے لئے کوئی عملی پروگرام بنائیں گے تو ہم خودی کے سماجی رشتوں کو نظر انداز نہیں کر سکیں گے اور ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ کسی شخص کی خودی اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک اس میں جماعت کا ایک مستعد کارکن اور فرض شناس ممبر بننے کی صلاحیت پیدا نہ ہو۔ بچے ہوں یا بالغ، ان کی صحیح تربیت کے لئے ضروری ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ مل جل کر کام کریں، کھیلیں، مشاغل کی تنظیم کریں اور ایسی جماعتوں اور اداروں میں شریک ہوں جن میں اشتراک عمل کے ذریعے باہمی رواداری اور لین دین کا سبق سیکھ سکیں۔ اس لئے "انفرادیت" کی جنگ اجتماعی تنظیم کے خلاف نہیں، وہ سوسائٹی کی اہمیت کو کم کرنا نہیں چاہتی بلکہ اس کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ جماعت کی تعداد اور قوت سے مرعوب ہو کر ہم یہ نہ بھول جائیں کہ انسانی جدوجہد کا اصلی مقصد جماعت کا تحفظ اور تقویت نہیں بلکہ افراد کی تہذیب نفس اور ان قوتوں کی تربیت ہے۔ جماعت بلکہ اس غرض کو حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے کیونکہ خودی کی تکمیل جماعت سے باہر رہ کر نہیں ہو سکتی۔ فرد کی ابتدائی تربیت جماعت کی آغوش میں ہوتی ہے، اسی کی ذہنی اور اخلاقی تحصیلات سے وہ اپنے لئے غذا حاصل کرتا ہے، اسی کے کاروبار میں وہ اپنی ترقی کے امکانات تلاش کرتا ہے، اس لئے وہ عام حالات میں جماعت کے ساتھ برسر پیکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن جب کبھی ایسا موقع آ پڑے کہ جماعت اپنی اکثریت کے بل بوتے پر یا اپنی جہالت اور حق ناشناسی کی وجہ سے اپنا رشتہ سچی انسانی قدروں سے توڑ لے اور حق کے بجائے قوت اور اصول کے بجائے تعداد کی پرستش کرنے لگے اس وقت ایک حق شناس انسان کا فرض اس جرم میں شریک ہونا نہیں بلکہ اسکے خلاف آواز بلند کرنا، اس کے خلاف جہاد کرنا ہے۔ اگر کسی قوم میں ایک بھی ایسا فرد پیدا ہو جاتا ہے تو وہ تنہا درحقیقت سچ مچ پوری جماعت پر بھاری ہے! اس وقت صداقت کا عشق اور جوش اس میں غیر معمولی قوت پیدا کر دیتا ہے اور

ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کار سپاہ!

لہٰذا فرد اور جماعت میں ہم آہنگی کا عالم ہو یا کشمکش کی صورت ایک ہی مقصد ہے جو ہمارے پیش نظر ہونا چاہئے اور وہ یہ کہ دونوں کو زندگی کے ان اخلاقی اصولوں کا پابند بنایا جائے جن کی

پابندی اصل آزادی ہے اور جن کی پیروی میں دونوں کی عافیت کا راز پوشیدہ ہے۔ ان اصولوں کو کسی قیمت پر قربان نہیں کیا جا سکتا اور اگر کیا گیا تو "انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں!"

اگر فرد اور جماعت کے باہمی تعلق کی یہ تفسیر جو میں نے پیش کی ہے درست ہو تو اس سے ہماری قومی زندگی کے مسئلے پر کیا روشنی پڑتی ہے؟ ہندوستان سیاسی آزادی کے دروازے پر کھڑا ہے (کبھی کبھی تو معلوم ہوتا ہے کہ آزادی کے بھیانک غار کے سامنے کھڑا ہے!) ہمیں یہاں ایک جمہوری نظام قائم کرنا ہے۔ اس کی بے شمار مفلوک الحال آبادی کے معیارِ زندگی کو بلند کرنا ہے اور ان بے شمار محرومیوں کو دور کرنا ہے جنہوں نے ہندوستانیوں کی زندگی کو اپنے نرغے میں لے رکھا ہے۔ عالمگیر جہالت اور بیماری کے خلاف محاذ قائم کرنا ہے اور اس کٹھن سفر کو طے کرنے کے لئے ہمارے پاس کیا زادِ راہ ہے؟ تنگ دلی، انفرادی اور جماعتی خود غرضی، فتنہ و فساد کی بڑھتی ہوئی لہر فوری اغراض کے لئے اقدارِ مطلقہ کی قربانی! دل کی فراخی اور رواداری نہ ہندو میں باقی ہے نہ مسلمان میں۔ باہمی محبت، انصاف، سلوک، بھروسہ تو ماضی کی داستان بن چکے اب تو معمولی روزمرہ کا میل جول اور وضع داری بھی ختم ہوئی جاتی ہے۔ دماغ کے ساتھ دل اور دل کے ساتھ زبان تک میں تفرقہ پڑ گیا ہے۔ اختلاف انگیزی قومی فرض قرار پائی ہے۔ صلح و آشتی کی تلقین اور بے لاگ تنقید کرنا روز بروز زیادہ مشکل بلکہ ناممکن ہو چلا ہے۔ انصاف پسندی کا یہ عالم ہے کہ ہندو، مسلمان، سکھ سب ایک دوسرے کو الزام دینے اور ایک دوسرے کے خلاف بدزبانی کرنے میں مردِ میدان ہیں اور احتسابِ نفس سے سب کو پرہیز ہے۔ یہاں تک کہ جہاں صریحاً اپنے فریق کی زیادتی ہوتی ہے وہاں بھی حق کے اظہار سے زیادہ پارٹی کے فائدے کی فکر ہوتی ہے۔ جب کسی جماعت کے لوگ صریحاً قتل و غارت اور آتش زنی کے مجرم ہوتے ہیں تو ان تک کو پناہ دینے اور ان کے جرموں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے گویا کہ سماج کے خلاف بدترین حرکات کی پشت پناہی دین دھرم کی خدمت ہے! اگر رائے عامہ دراصل ان حرکات کے خلاف ہوتی جن کی وجہ سے آج ہم دنیا کے سامنے سرنگوں ہیں تو یہ ناممکن تھا کہ یہ فساد مہینوں جاری رہ سکتے۔

کیا یہی ذہنی اور اخلاقی سرمایہ لے کر ہم قومی زندگی کے مشکل مسائل کو حل کر سکتے ہیں؟ آزادی کو جیتنا آسان ہے اور اس کو قائم رکھنا مشکل ہے کیونکہ اس کے واسطے ایک فوری جذباتی ہیجان کافی نہیں بلکہ مسلسل جدوجہد اور چوکسی کی ضرورت ہے۔ انسان کی فطرت میں بہت سے ایسے ایسے عناصر ہیں جو آزادی کی گھات میں لگے رہتے ہیں کہ جہاں نگہبان کو غافل پائیں اس پر چھاپہ ماریں اور لوگوں کو نت نئی زنجیروں میں قید کر لیں۔ جمہوریت اس وقت تک نہیں پنپ سکتی جب تک ہم میں اختلافات کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کرنے، مخالفت کو صبر کے ساتھ برداشت کرنے، آزادیٔ رائے کی قدر کرنے اور سب کے ساتھ رواداری برتنے کی صلاحیت نہ ہو۔ پس ماندہ طبقوں کو ابھارنے اور ان کو حقوق دلانے کے لئے نہ صرف انصاف پسندی، فیاضی اور ایثار کی ضرورت ہے بلکہ مشترکہ کوشش اور جدوجہد کی ضرورت ہے جو آج کل کی مخالفت اور انتقام کی فضا میں ناممکن ہو گئی ہے۔ جہالت اور بیماری کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر قسم کے انسانی اور فنی وسائل اور ذرائع سے کام لینے کی ضرورت ہے لیکن جب ساری قوت اور توجہ باہمی کشاکش اور رسہ کشی میں صرف ہوتی ہو اس وقت ان چیزوں کا دماغ کس کو ہو سکتا ہے؟ لہٰذا ملک کے تمام بہی خواہوں کو ٹھنڈے دل سے یہ سوچنے کی ضرورت ہے کہ حالات کا رخ کس طرف ہے۔ اور اگر دیانت داری کے ساتھ اس رخ کو بدلنے کی کوشش نہ کی گئی تو ملک کا انجام کیا ہو گا۔

بعض خوش فہم اور امید پرور لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہمارا سیاسی مسئلہ حل ہو گیا یعنی ہندوستان کی تقسیم کے بارے میں کوئی بات طے پا گئی تو اور سب مشکلیں خود بخود حل ہو جائیں گی۔ لیکن یہ خیال غلط ہے۔ وہ ہماری مشکلوں کا انجام نہیں بلکہ اس کی ابتدا ہو گی۔ فطرت کی تعزیریں بہت سخت ہوتی ہیں۔ وہ برسوں کی بدعملی کو آسانی سے معاف نہیں کر سکتی بلکہ اس کا تاوان وصول کرتی ہے۔ ہندوستان ہو یا ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ ہمیں گذشتہ دو سو برس کی غلامی کا اور بالخصوص گذشتہ پندرہ بیس سال کی حرکتوں کا خمیازہ اٹھانا پڑے گا یہ بتانا مشکل ہے کہ ہماری آزمائش کی یہ بھیانک رات کتنی لمبی ہو گی۔

لیکن ظاہر ہے کہ اس وقت تک طلوعِ سحر نہ ہوگا جب تک ہمارے معلم اور ہمارے مفکر، ہمارے سیاسی لیڈر اور ہمارے مذہبی راہ نما سب کے سب ایک گہرے ذہنی انقلاب کی ضرورت کو محسوس نہ کریں اور اپنے پورے اثر کو استعمال کرکے ان قدروں کی تخم ریزی نہ کریں جن کا میں نے ذکر کیا ہے۔ یہ قدریں جو نئی بھی ہیں اور پرانی بھی۔ نئی اس لئے کہ آج لوگوں نے ان کو بھلا رکھا ہے اور وہ ان کی اہمیت سے منکر ہو گئے ہیں۔ پرانی اس لئے کہ ان کی تلقین دنیا کے بہترین اور شریف ترین انسان اس وقت سے کرتے آئے ہیں جب سے انسان میں اخلاقی شعور بیدار ہوا ہے۔ ان چراغوں کی حفاظت کیجئے ورنہ وہ بجھ جائیں گے اور شاید آپ دوبارہ ان چراغوں کو روشن نہ کر سکیں گے۔ ممکن ہے دوسرے ملک اور قومیں ان کو روشن کریں، ممکن ہے ہماری آنے والی نسلیں تاریکی کے ایک دور میں سے گذر کر ایسا کر سکیں لیکن اس سے ان لوگوں کو کیا تسکین ہو سکتی ہے جن کی غفلت کی وجہ سے وہ ٹمٹما رہے ہیں اور ایک ایک کرکے بجھ رہے ہیں؟

آخر میں ایک بات اور سن لیجئے مضمون نگار کو خدانخواستہ یہ غلط فہمی نہیں کہ وہ خود اس آندھی میں کوئی چراغ جلا رہا ہے۔ اس نے تو محض بعض لوگوں کا، بعض کتابوں کا، بعض اصولوں اور قدروں کا ذکر کیا ہے جن کی حیثیت اس کی نظر میں چراغِ راہ کی ہے۔ اس کو صرف اتنا دعویٰ ہے کہ اس کے دل میں ان چراغوں کی قدر ہے۔ اور اس بات کا احساس ہے کہ ان کو آندھی کے تھپیڑوں سے بچانا تمام اچھے انسانوں کا فرض ہے۔ اس کو جس مذہب اور تہذیب سے وابستہ ہونے کا فخر ہے اس کی تعلیم بھی یہی ہے کہ کسی قوم کی اخلاقی حیات اسی حالت میں قائم رہ سکتی ہے کہ جب اس میں ایک ایسی جماعت موجود ہو جو اور تمام اغراض اور مصالح سے بے نیاز ہو کر لوگوں کو بھلائی کی طرف بلائے۔ اچھے کاموں کا حکم دے اور برے کاموں سے روکے۔ جب تک مسلمانوں میں اس قسم کی "امتِ وسط" موجود میں نہ آئے گی، بلکہ ہر جماعت میں ایسے لوگ پیدا نہ ہوں گے، ہمارا مستقبل کسی طرح روشن نہیں ہو سکتا۔ مذہب کی بہترین تعلیم، اخلاق کا اعلیٰ ترین اصول، عقل کا شدید ترین تقاضا اور زمانے کے حالات کا اہم ترین مطالبہ یہی ہے کہ ہم تمام

محسوسات

ش۔ صبحی

میں نے ہنستے ہوئے ہونٹوں کی خزاں دیکھی ہے
اشک آلود نگاہوں میں سکوں پایا ہے
سرنگوں دیکھی ہے کہسار کی چوٹی اے دوست!
میں نے صحراؤں میں بے نام فسوں پایا ہے

سیل میں ساحلِ آرام بھی دیکھا ہے ندیم!
ساحلوں پر بھی نظر آئے ہیں مجھ کو گرداب
میں نے دیکھا ہے کئی بار چمن زاروں میں
پھول کی آگ میں جلتے ہوئے کانٹوں کا شباب

تجھ سے کہتا ہوں مگر تجھ کو نہ آئے گا یقیں
برف کی گود میں شعلے بھی مچل سکتے ہیں
رات کے خوف سے سورج بھی لرز سکتا ہے
آگ کے قلب سے چشمے بھی ابل سکتے ہیں!

تجھ سے کہتا ہوں مگر تجھ کو نہ آئے گا یقیں
میں نے ہنستے ہوئے ہونٹوں کی خزاں دیکھی ہے

انسانوں کی انسانیت کو بغیر کسی ذہنی پس و پیش کے تسلیم کریں۔ ان کی خودی کا دل سے احترام کریں اور ان کے ساتھ انفرادی اور جماعتی معاملات میں وہی سلوک جائز رکھیں جو انہوں یعنی اپنے عزیز ترین دوستوں اور رشتہ داروں کے ساتھ کرتے ہیں۔ انصاف، شرافت، رواداری، ہمدردی پر کسی قسم کی حد بندی کرنا محض دوسروں کی انسانیت سے انکار نہیں بلکہ خود بھی انسانیت کے شرف سے محروم ہو جانا ہے!

کرشن چندر

لال باغ

کملاکر کے جبڑے بڑے مضبوط تھے، اتنے مضبوط کہ رخسار کی ہڈی اور جبڑوں کے درمیان کے گوشت میں گڑھے پڑ گئے تھے۔ اس کا رنگ گورا تھا، قد لمبا، جسم گٹھا ہوا، آنکھوں میں بلی کی سی چمک اور مکاری پائی جاتی تھی۔ کملاکر کی عمر پچاس کے قریب ہوگی لیکن دیکھنے میں وہ تیس کے اوپر نہیں تیس سے کچھ کم کا ہی معلوم ہوتا تھا۔ کملاکر لال باغ کا معروف دلوا تھا۔ بچپن میں اس نے جیب کترنے کا فن سیکھا تھا۔ دو چار بار جیل جا کر وہ بمبئی کی سب سے بڑی صنعت کا ایک معزز رکن بن گیا تھا۔ یوں تو بمبئی ایک کاروباری شہر ہے، صنعتی مرکز ہے۔ یہاں ملیں، فیکٹریاں، تجارتی گودام سب کچھ موجود ہیں، لیکن لوہا، کاٹن، تیل، کاغذ اور اناج کے کالے بیوپار سے بڑھ کر بھی جو صنعت یہاں کمال کو پہنچی ہوئی ہے وہ جرائم پیشہ لوگوں کا کاروبار ہے۔ اس میں کروڑوں روپوں کا لین دین ہوتا ہے۔ اور ملبار ہل سے لے کر مدن پورہ کی جھونپڑیوں تک اس کے بھگتان کرنے والے پھیلے ہوئے ہیں۔ کملاکر اسی معزز صنعت کا ایک فرد تھا، اور لال باغ میں داداگیری کرتا تھا۔ داداگیری آسان کام نہیں اور کرنے سے نہیں آتی۔ کسی بڑی سے بڑی مملکت کا حکمراں بننا آسان ہے لیکن لال باغ کا دادا بننا آسان نہیں۔ کملاکر نے یہ تاج پچاس برس کی کاوشوں کے بعد حاصل کیا تھا۔ بچپن میں وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ کاروار سے بمبئی آیا تھا۔ یہاں اس کے ماں باپ وکٹوریا مل میں نوکر ہو گئے تھے، اور وہ دن بھر گلیوں میں اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ ٹراموں پر بغیر ٹکٹ لئے سوار ہوتا، میوہ فروشوں سے الجھتا، بوٹ پالش کرنے والوں کو دھمکاتا، خوش پوش راہگیروں سے بھیک مانگتا، پان والوں کی دوکان سے بیڑی اڑاتا، اور اس طرح کے کئی ایک نیک کام کرتا کہ جن سے غریبوں کے بچوں کا مستقبل تعمیر ہوتا رہتا ہے۔ پھر ایک مہربان نے ترس کھا کر اسے جیب کترنے کا فن سکھا دیا اور اپنی دانست میں اسے راہِ راست پر ڈال دیا۔ یہ راستہ اسے تین چار بار جیل لے گیا۔ پہلی بار جب وہ ریفارمیٹری سکول گیا تو اسے اپنا گاؤں یاد آیا۔ اسے چھوٹے چھوٹے مرغی کے چوزے یاد آئے جن سے وہ اپنے گھر کے آنگن میں کھیلا کرتا تھا۔ اسے وہ ندی کنارے جامن کا پیڑ یاد آیا جہاں وہ حسین اور پری جمال گلہریوں کی اچھل کود سے محظوظ ہوا کرتا تھا۔ وہ نمے کی جھاڑیاں یاد آئیں جو ندی کے کنارے اُگ رہی تھیں، اور جہاں اس نے ایک مرتبہ مینا کے گھونسلے میں تین نہایت نرم و نازک چتکبرے انڈوں کو دیکھا تھا۔ اس نے انڈے اپنی ہتھیلی میں اٹھائے اور دیر تک انہیں چھوتا رہا۔ پھر اس نے انڈے گھونسلے میں رکھ دئیے اور ایک خوبصورت تیتری کے پیچھے بھاگا۔ اس کے بھاگنے سے ایک خرگوش چوکنا ہو گیا، اور اس کے سامنے سے لمبے لمبے کان کھڑے کئے تیر کی طرح بھاگا۔ اور وہ وہیں کھڑا ہو کر ہنسنے لگا۔ تیتری فضا میں رنگ بھرتی جا رہی تھی۔ اس کے قہقہے گونج رہے تھے۔ یکایک خرگوش دور جا کر کھڑا ہو گیا اور حیرت سے مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگا کہ یہ لڑکا کیوں ہنس رہا ہے؟ پہلی بار کملاکر کو یہ سب کچھ یاد آیا۔

دوسری بار وہ ریفارمیٹری میں نہیں جیل میں لایا گیا۔ اب اسے بمبئی کی گلیاں یاد آئیں۔ بمبئی کے بازار اور مون سون کی بارش جب گرم گرم اُبلی ہوئی نمکین مونگ پھلی چائے کے ساتھ کھانے میں مزا آتا ہے اور اس کے بعد شیر مارکہ بیڑی۔ اُسے فٹ بال کے میچ یاد آئے جو اس کے قریب ہی اینگلو انڈین کلب لال باغ میں ہوا کرتے تھے۔ کس قدر دلچسپی تھی اسے فٹ بال میں۔ زندگی بھر اس نے کبھی فٹ بال نہیں کھیلا تھا۔ وہ فٹ بال کو لات لگانا چاہتا تھا، یہ گول گول ٹھکنا جو دھماکے سے ہوا میں اڑتا ہے اور زمین پر اچھل کر پھر فضا میں پرواز کرتا ہے۔ دھم دھم اوپر، دھم دھم اوپر۔ کملاکر چاہتا وہ ایک ایسی ٹھوک لگائے کہ فٹ بال اوپر فضا میں دو دو میلوں تک اوپر چلا جائے، حتیٰ کہ کسی کو بھی نظر

کرشن چندر نے یہ افسانہ ہماری درخواست پر "ماہِ نو" کے لئے بھیجا تھا۔ ماہِ نو کی اشاعت میں تاخیر ہو گئی اور افسانہ چھپنے سے پہلے ان کے ایک مجموعہ میں شائع ہو گیا ہے۔

آئے اور سب لوگ اسے حیرت سے تکنے لگیں لیکن ایسا کبھی نہ ہوا۔ وہ تو صرف فٹ بال دیکھنے والے تماشائیوں کی جیبیں کاٹ سکتا تھا، اور بس۔

جیب کترنے کے لئے تین جگہیں سب سے عمدہ ہیں، ایک تو کھیل کا میدان جہاں تماشائیوں کو کھیل میں اتنی دلچسپی ہوتی ہے کہ وہ اپنی ساری سُدھ بھول جاتے ہیں، دوسری سیاسی جلسہ جہاں مقرر اپنی آتش بیانی سے لوگوں کے دلوں میں، یعنی ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف اور مسلمانوں کے دلوں میں ہندوؤں کے خلاف، اور ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف آگ لگا دیتا ہے۔ کملاکر بھی سیاسی جلسوں میں جاتا تھا۔ اسے میٹھی، سنبھلی ہوئی، متین تقریریں پسند نہ تھیں۔ ایسے موقعوں پہ لوگ جمائیاں لینے لگتے تھے اور اپنی جیبوں سے خبردار ہو جاتے تھے۔ ہاں ایسی تقریریں بہت کم ہوتی تھیں یہی غنیمت تھا۔

نفرت کے جذبات لوگ بڑی خوشی سے قبول کرتے تھے۔ محبت، رواداری، آشتی، صلح، امن کے جذبات لوگوں کو پسند نہ آتے تھے، اس لئے اچھی تقریر کرنے والوں کو اس نے کبھی اس غلطی کا مرتکب نہ پایا تھا۔ وہ اکثر سیاسی جلسوں میں جانے سے پہلے صاحب تقریر کا نام پوچھ لیا کرتا۔ جب بھگوان گوپال چرخے کی افادی حیثیت پر تقریر کرنے آتے تو وہ سمجھ جاتا کہ اب اس جلسے میں کسی کی جیب کاٹنا مشکل ہوگا۔ جب چنچلانی شیتکار کر کر جدار آواز میں بمبئی کو سمیکت مہاراشٹر میں شامل کرنے کی دھمکی دیتے اور بمبئی کے غیر مرہٹہ لوگوں کو للکارتے تو کملاکر سمجھتا کہ آج دو چار جیبیں ضرور کاٹی جائیں گی۔ اس لئے وہ ہمیشہ سوچ سمجھ کر اور پوچھ گچھ کر کے سیاسی جلسوں میں شرکت کرتا تھا۔ ہاں ریلوے پلیٹ فارم پر وہ ضرور جاتا تھا، ہر روز دن میں دو تین بار، بالعموم شام کے وقت جب لوگ گھروں کو لوٹتے، اسے جلدی گھبراہٹ، بے چینی اور تا بڑ توڑ گھر پہنچنے کی شدید خواہش میں جو اس مجمع میں ہوتی ہے اسے اپنا کام کرنے کا موقع مل ہی جاتا تھا۔ لیکن وہ اس پیشے سے بددل سا ہو چلا تھا جس نے اسے دو بار جیل کی ہوا کھلائی تھی۔ اس لئے تیسری بار جب وہ جیل میں آیا تو خوب پچھتایا، جیسے کوئی کسی سکول میں داخل ہو رہا ہے۔ اس نے دوسرے جرائم پیشہ قیدیوں سے علاوہ رسم پیدا کی، معلوم ہوا کہ اسے

معلوم ہوا کہ اب تک وہ بسم اللہ کے گنبد ہی میں بند تھا۔ بمبئی میں تو ایک سے ایک اونچا کاروبار پڑا ہے جس میں لاکھوں روپے کا ہیر پھیر ہوتا ہے۔ یہ جیب کترنا بھی کوئی کاروبار ہے۔ آدمی کام کرے تو لڑکیوں کے بیچنے لانے لوانے کا کام کرے۔ احمد آباد سے چرس، افیم، بھنگ کی درآمد کرے۔ کالینا میں شراب کی بھٹی لگائے۔ کلیان میں بیٹھ کر کوکین سازی کرے۔ پھر چور بازار کے سودے ہیں، قمار خانے ہیں، بڑے بڑے لوگوں کی کمزوریوں سے واقف ہو کر انہیں لوٹنے کے بہانے ہیں، میاں یہ جیب کترنا بھی کوئی کام ہے؟ پکڑے جاؤ تو پہلے تو لوگ پیٹتے ہیں، پھر پولیس پیٹتی ہے، پھر جیل کی چکی پیسنی ہے۔ تیسری بار تو کملاکر نے عہد کر لیا کہ اب وہ جیب کترنے کا دھندا نہیں کرے گا۔ تیسری بار جیل جانے کے بعد اس نے افیم اور چرس کی درآمد کا دھندا کیا۔ اور اس میں اسے اور پولیس کو اور دوسرے لوگوں کو اتنا فائدہ ہوا کہ اس نے لال باغ کے دو چار بڑے بڑے سیٹھوں سے مل کر اپنی پتی رکھ لی، اور بڑے پیمانے پر تجارت کرنے لگا۔ اس کے بعد وہ کبھی جیل نہیں گیا۔ دو ایک بار پولیس نے اسے تڑی پار ضرور کر دیا تھا لیکن سیٹھوں نے مل ملا کے اسے واپس بلوا لیا۔ اب اس کی عمر پچاس برس کی ہو گئی تھی۔ اس کا اپنا ہوٹل تھا، شراب کی بھٹی تھی، افیم کا کاروبار تھا، ایک قحبہ خانہ تھا، ایک اپنا گھر تھا، موٹر تھی، بیوی تھی، چار بچے تھے، اس نے اپنے گاؤں میں اپنا گھر اینٹوں کا بنوایا تھا اور وہاں زمین بھی مول لی تھی۔ لال باغ میں ہر کوئی اس کی عزت کرتا۔ وہ جدھر سے گزرتا لوگ اس کی تعظیم کے لئے اٹھ جاتے، اور پھر جھک جاتے، اور پھر وہ ان کے سامنے سے گزر جاتا۔

آج بھی جب وہ کھانا کھا کے گھر سے نکلنے لگا تو کئی لوگ اس کی دید کے منتظر باہر کھڑے تھے، دست بستہ۔ اس نے کھانا کھا کر اپنی بیوی، اپنی چوتھی بیوی کے گال میں چٹکی بھری اور تیزاب کی بوتل ہاتھ میں تھامے گھر سے نکلا۔ دروازے پر اس کا چھوٹا لڑکا راؤ کھڑا تھا۔ اس نے راؤ سے کہا "تو اور کے تانگے کی طرف مت جانا۔ ادھر رنجیت فلم کمپنی کا سٹوڈیو ہے۔ اس علاقے کے مسلمان لڑکوں سے نہ کھیلا کر۔ تجھے کتنی بار سمجھایا ہے۔ اب تو نہیں جائے گا؟" راؤ نے کان پکڑ کر کہا۔

آپ کبھی نہیں جاؤں گا دادا۔" راؤ بھی اپنے باپ کو دادا ہی کہتا تھا، بچپن ہی سے وہ اپنے باپ کے متعلق ہر کس و ناکس سے یہی لفظ سنتا آیا تھا۔

راؤ کی فہمائش کرنے کے بعد اور تیزاب کی بوتل دے کر دادا کملاکر آگے بڑھا۔ اس کے چھیتے نائب شنکر نے تیزاب کی بوتل اپنے ہات میں تھام لی۔ اور کملاکر اپنے گرگوں کے جلو میں لال باغ کے بڑے بازار میں آ گیا۔

یہاں کل رات سے بڑی گڑبڑ تھی۔ گو بمبئی میں ہندو مسلم فساد ایک سال سے جاری تھا لیکن کل رات سے جھگڑا بہت بڑھ گیا تھا۔ کملاکر فساد ہو جانے سے بہت خوش تھا کیونکہ جب امن ہو تو جرم کا کاروبار ذرا ٹھنڈا پڑ جاتا ہے پولیس بھی ذرا ہوشیار ہو جاتی ہے، اور فساد میں کسی کو یہ ہوش نہیں ہوتا کہ کل کا راشن کہاں سے آئے گا۔ چرس اور افیم کے کیمپ کون پکڑ سکتا ہے دادا کملاکر کا کاروبار فساد کی وجہ سے بہت اچھا چل رہا تھا۔ سیٹھ پہلے سے زیادہ مہربان ہو گئے تھے۔ ان کی حفاظت کے لئے اس نے ہزاروں روپے ہتھیا لیتے تھے اور سینکڑوں نوجوان ہندو چھوکروں کا پیٹ بھرتا تھا۔ دوسری صورت میں یہ شریف لڑکے ملوں میں ذلیل مزدوری کرتے اور صبح شام بسر کرتے ہوتے۔ اب تو چین تھا۔ اور اچھا کھانا تھا، اور جیب میں ہائی سگرٹ اور رات کو شراب اور لڑکیاں اور لوگوں کے دلوں میں وہ ڈر، جیسے ہٹلر کے سامنے جرمن سپاہی کے چلے جا رہے ہوں۔ یہ فساد زندگی بھر رہے تو کیا برا ہے!

شنکر نے کملاکر کے کان میں کہا "رات کچھ سالے گرائے!"

کملاکر نے اس کی پیٹھ ٹھونکی "شاباش" پھر رک کر کہا "کون کون ہیں وہ؟"

"ابھی ان کی لاشیں اٹھوائی نہیں، چلئے دکھاتا ہوں۔"

وکٹوریہ مل کے ادھر اک تنگ سی گلی ہے جہاں کارپوریشن کے بھنگی غلاظت جمع کر کے رکھتے ہیں وہاں ایک لڑکے کی لاش پڑی تھی نیم برہنہ کرتا پھٹا ہوا۔ آنکھیں باہر نکلی ہوئی، ہات میں تیل کی شیشی شاید گھر سے ماں نے بازار بھیجا تھا کہ راشن میں تھوڑا سا لے کے لئے تیل لے آئے۔

"کیسے پہچانا؟"

شنکر نے اشارہ کر کے کہا "ختنے سے"

"شاباش" کملاکر نے کہا۔ "یہ تیل کی شیشی لے لو" کسی غریب ہندو کے کام آ جائے گی" دوسرا موقع کونسا ہے؟ کملاکر نے پوچھا

"وہ میرے علاقے میں ہے" بودکر نے آگے بڑھ کے اور اپنے استاد کو خوش کرنے کے لئے جیبتی نکالتے ہوئے کہا۔ بودکر کا ماتھا چھوٹا تھا، کان بڑے اور دانت باہر نکلے ہوئے۔ اس کی باہیں سوکھی تھیں اور ہات بڑے بڑے، اتنے بڑے کہ انھیں دیکھتے ہی سے ڈر معلوم ہوتا تھا۔ تنگ سی گلیوں میں گذرتے ہوئے وہ اپریل کے عقب میں کاردار سٹوڈیو کے بہت آگے نکل گئے، جدھر ایک اکیلی سڑک ویرانے میں سے گذرتی ہوئی ڈاک یارڈ کی طرف جاتی تھی۔ یہاں ایک گڑھے میں ایک بڈھے کی لاش پڑی تھی۔ لاش سے معلوم ہوتا تھا جیسے یہ آدمی زندگی بھر زندہ نہ رہا ہو۔ ہونٹوں پر، ماتھے پر، آنکھوں کی پتلیوں میں، پیٹ پر جسم کے ہر حصے میں اس مسلسل موت کے نشان تھے جو ہندوستان میں ایک غریب آدمی کے پیدا ہوتے ہی پڑنے شروع ہو جاتے ہیں، اور روز بروز بڑھتے ہی جاتے ہیں۔ اس بڈھے کی زندگی اک ایسی پرانی سڑی بوسیدہ کتاب تھی جس کے ہر صفحے پر بھوک، بیکاری، بیماری قحط کی ہولناکیاں ثبت تھیں۔ یہ کتاب کیچڑ میں پڑی تھی۔ اک گڑھے میں۔ یہ زندگی جو اک گڑھے سے شروع ہوئی اور اک گڑھے میں ختم ہو گئی۔ یہ اکڑے اکڑے پاؤں جو ہمیشہ کیچڑ میں چلتے رہے۔ یہ ہونٹ جنھیں کبھی دو وقت کھانا نہیں ملا۔ یہ کان جنھوں نے کبھی اقبال کا نغمہ نہیں سنا۔ یہ آنکھیں جو سدا خوبصورتی سے ناآشنا رہیں کیوں ایسی مسلسل موت کو لوگ زندگی کہتے ہیں؟

اور اب یہ لاشیں کملاکر کا انتظار کر رہی تھیں۔

رشید و بریلی کا رہنے والا تھا بمبئی کے لال باغ میں تیس برس سے مونگ پھلی بیچتا تھا۔ اتنا پرانا تھا وہ کہ ٹرام والے، اور مزدور، اور دوکاندار، اور منشی لوگ، اور گجراتی سیٹھوں کے منیم، اور سود خور پٹھان سبھی اُسے جانتے تھے۔ وہ اتنا پرانا تھا جیسے بس کا سٹینڈ، یا وکٹوریہ مل کی گھڑی، یا ایرانی کا ریستوراں۔ لال باغ اس کے بغیر نامکمل تھا۔ مونگ پھلی بھوننے، تلنے اور اسے خوش اخلاقی سے بیچنے میں اُسے کمال حاصل تھا۔ اس کی زندگی ہندوؤں کے ساتھ بسر ہوتی تھی۔ انہی کے

ساتھ اس نے اپنا لڑکپن، اپنی جوانی اور اپنا بڑھاپا بسر کیا تھا۔ اسی محلے میں اس کی شادی ہوئی تھی اور گجراتی سیٹھوں نے پانسو روپے سے اس کی مدد کی تھی۔ اسی علاقے میں اس کے بیوی بچے بے خوف و خطر گھومتے تھے۔ وہ لال باغ کی تخلیق تھے۔ اس کے ماحول کا حصہ تھے اس کی خوشیوں غموں کے وارث، وہ اسے چھوڑ کر کہاں جا سکتے تھے۔ جب فساد شروع ہوا تو بہتیرے مسلمانوں نے اس سے کہا کہ وہ لال باغ چھوڑ کر چلا جائے لیکن رشید نے ہنس کر ٹال دیا "میں اپنے بھائی بندوں میں ہوں۔ کوئی مجھے کیا کہے گا" ابھی دو روز پہلے کملاکر نے بھی اس سے یہی کہا تھا "رشیدو میاں، ہم تو ان مسلمانوں کے خلاف ہیں جنہوں نے ہمارے دیس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں تم تو اپنے آدمی ہو۔ تمہارا کوئی بال بیکا نہیں کر سکتا!"

کملاکر آگے بڑھ گیا۔ اس نے بورکر سے کہا "اسے کیوں مارا؟"

بورکر نے کہا "کیا کرتا، اپنے علاقے میں اب یہی باقی رہا تھا، اور مجھے پچاس روپوں کی ضرورت تھی۔"

کملاکر نے جیب سے پچاس روپے نکال کر اسے دے دیئے "سیٹھ اگلے ہفتے سے پچاس کے پچیس کرنے والے ہیں کیونکہ ـــ سیٹھ بولتے تھے ـــ اب مسلمانوں کو مارنے والے بہتیرے آدمی مل رہے ہیں۔ میں نے کہا سیٹھ لال باغ میں دوسرے آدمی نہیں آ سکتے۔ اور دوسرے آدمی تو ایک مسلمان کے مارنے کے پچاس روپے ہی لیں گے۔"

پچاس روپے، رشیدو کا گھر، رشیدو کی بیوی، رشیدو کے بچے۔ پچاس روپے، پچاس روپے بھنی ہوئی مونگ پھلی کا کرکرا ذائقہ، بارش کی پھوار، رشیدو کی ملائم آواز، "مونگ پھلی لے لو"...... پچاس روپے ایک چھوٹا سا دیا، ایک چھوٹا سا ٹمٹماتا ہوا دیا، چار آنے میں صبح و شام کا کھانا، اللہ کا شکر، بچوں کے بھولے بھالے چہرے۔ بیوی کی نرم مہربان مسکراہٹ، پچاس روپے۔ رات کے گرم لحاف میں فرش پر خاموشی سے سو جانا، بچوں کے سانسوں کی مدھم آوازیں، ننھے کے ملائم ہاتھ رشیدو کی داڑھی سے کھیلتے ہوئے، کھیلتے کھیلتے باپ کی آغوش میں سو جاتے ہوئے...... پچاس روپے......!

کملاکر کے دماغ کے اندر کسی تہہ میں کسی دور، اندر گہری تہہ میں

ایک لمحے کے لئے ایک جھجھک سی پیدا ہوئی اور پھر دوسرے لمحے میں مر گئی وہ آگے بڑھ گیا۔ دعورت سنگھ نے کہا "ہسپتال کے پیچھے، مزدوروں کے جھونپڑے ہیں نا جو...... اُدھر......"

سرکاری ہسپتال کے پیچھے کھلی زمین تھی، اور تاڑ کے پیڑ تھے، اور بہت عرصے سے ایک مارواڑی سوداگر اسے بیچنا چاہتا تھا۔ لیکن اس زمین کی قیمت، روز بروز بڑھتی جارہی تھی اور وہ بے چارہ اس پریشانی میں تھا کہ اسے کب اور کیسے بیچے۔ جب اس نے یہ زمین خریدی تھی اس نے دو روپے گز کے حساب سے لی تھی اور اب لوگ اس کے دس روپے گز دینے کے لئے تیار تھے۔ اس نے سوچا کہ اسے بیچ دے کہ دوسرے روز کسی دوسرے سوداگر نے گیارہ روپے گز کے حساب سے زمین خریدنے کی بولی دی۔ تیسرے روز بھاؤ بارہ روپے ہو گیا۔ بیچارہ مارواڑی بہت پریشان تھا کہ کیا کرے۔ متواتر چھ سال سے وہ اسے بیچنا چاہ رہا تھا، اور اسی وجہ سے نہ بیچ سکتا تھا کہ لوگ اس کے دام زیادہ ہی لگاتے چلے جاتے تھے۔ اسی اثنا میں یہاں بلوچی خانہ بدوشوں کا قافلہ آ کے آباد ہو گیا۔ کشمیری مسلمان آئے جو لکڑیوں کے گودام پر کام کرتے تھے۔ ڈاک یارڈ روڈ پر، اور پھر سود خور پٹھان جو اپنی میلی واسکٹ میں روپے سینے سے لگائے سو روپے پر سو روپیہ سود لینے کے لئے مزدوروں اور کلرکوں اور بیکار ظلی ادیبوں کی تلاش میں گھومتے تھے۔ اس قطعے میں خیمے لگے تھے اور چھپر، اور کئی جگہ تو صرف درخت کے تنے سے تاڑ کے پتوں کی چھت لگا دی گئی تھی کہ بارش میں بھیگنے سے بچ جائیں۔ فساد کے دوران میں یہ بستی آہستہ آہستہ خالی ہوتی گئی۔ اور اب تو چند روز سے بالکل ہی خالی پڑی تھی۔

کملاکر نے پوچھا "دعورت سنگھ، ارے وہاں تو اب کوئی نہیں رہتا"

دعورت سنگھ نے کہا "وہاں تو کوئی نہیں تھا۔ یہ دو کشمیری مسلمان آئے تھے۔ میاں بیوی اپنے کسی رشتہ دار کو پوچھتے ہوئے۔ بچے لڑکوں نے بتایا۔ میں نے کہا آؤ تمہیں ان سے ملادوں۔ بس میں انہیں ادھر لے گیا، اور وہیں انہیں ختم کر دیا۔" چلئے دو سر تاڑ کے جھاڑ کی طرف۔ دونوں نوجوان تھے۔ کپڑے میلے کچیلے، ہونٹوں پر حیرت اور ڈر

سید احتشام حسین

اُردو کا لسانیاتی مطالعہ

اُردو زبان نے اپنی مختصر سی زندگی میں — دنیا کی اور بہت سی زبانوں کو دیکھتے ہوئے اسے مختصر ہی تو کہہ سکتے ہیں۔ نہ جانے کتنے نشیب و فراز دیکھے۔ اس کی پیدائش اور ارتقاء کی تاریخ اکثر دوسری زبانوں کی تاریخ سے اس قدر مختلف اور اس کی ساخت دوسری زبانوں کی ساخت سے اتنی علاحدہ ہے کہ چند بندھے ٹکے اصولِ قواعد اور مقررہ لسانی ضوابط اس کے ارتقاء کی پوری تاریخ کا تجزیہ نہیں کر سکتے۔ گو یہ بات دنیا کی اکثر زبانوں کے لئے صحیح ہے لیکن اُردو کی ہیئت ترکیبی میں جن عناصر نے کام کیا ہے ان سب کا شمار کرنا ممکن نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ اس کے متعلق خود اُردو کے جاننے والوں میں غلط اندیشیاں ہیں اور اس کے نہ جاننے والے تو نہ جانے کتنی غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں اور کتنی غلط فہمیاں پھیلا رہے ہیں۔ اس وقت دنیا کی کسی زبان کے سامنے وہ مسائل نہیں ہیں جو اُردو کے سامنے ہیں، کہیں کسی زبان سے اس بنا پر مخالفت نہیں کی جا رہی ہے کہ وہ ارتقائے تمدن کے ایک خاص دور میں پیدا ہوئی اور گو اس کی آب یاری میں ہر طبقہ اور فرقہ نے حصہ لیا تھا لیکن اس مخصوص دورِ تمدن سے نفرت پیدا ہو جانے کی وجہ سے وہ تہذیبی سرمایہ بھی تباہی کی زد میں ہے جو اپنی پیدائش اور ترقی میں صرف تاریخی طاقتوں کا مرہونِ منت ہے، جسے دین، مذہب یا کسی ایسی دوسری طاقت نے سہارا نہیں دیا۔

بہر حال اس تمدنی دور میں جہاں دنیا کے عقلا زندگی کے اور بڑے بڑے پیچیدہ مسائل حل کرنے میں لگے ہوئے ہیں اس وقت ہندوستان میں اُردو زبان کی بقاء اور حقیقت کا سوال اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قومی جوش، ارادہ اور عمل سے زندگی کی راہ بدلی جا سکتی ہے، انسانی فطرت میں تغیر پیدا کیا جا سکتا ہے، مادی حالات میں تبدیلی پیدا کر کے سارے نظامِ حیات اور اس کے فلسفیانہ اور تہذیبی روابط کو تبدیل کیا جا سکتا ہے، ایسی حالت میں زبان جو خود انسانی ضرورت کی پیداوار اور انسانی ضرورت کے ماتحت بدلنے والی چیز ہے تغیر کے سیلاب سے کس طرح محفوظ رہ سکتی ہے! زبان کا فطری ارتقاء ہی سب کچھ نہیں ہے اس کا عمل تو اسی وقت ہلکا پڑ جاتا ہے جس وقت انسان اپنی سماجی ضرورتوں کے لحاظ سے ان میں ترمیم و تنسیخ شروع کرتا ہے یہ عمل جن اثرات کے ماتحت ہوتا ہے ان میں کبھی کوئی ترتیب اور اصول کارفرما ہوتا ہے اور کبھی ضرورت کا سیلاب زبان کی سنگلاخ سرزمین میں اپنا راستہ آپ بنا لیتا ہے فطری ارتقاء، تہذیبی اثرات، قواعد اور ایک زبان استعمال کرنے والوں کی روایات کے تسلسل سے زبان کا مزاج بنتا ہے اور یہی مزاج ادب میں داخل ہو کر ایک زبان بولنے والوں کے تہذیبی سرمایہ میں اضافہ کرتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ابھی تک اُردو زبان کے مطالعہ میں لسانیات سے بہت کم کام لیا گیا ہے بہت سے لوگوں نے تو غلطی سے "زبان دانی" کو اصل چیز سمجھا۔ دلّی اور لکھنؤ کے شہر جنہیں اُردو کا مرکز قرار دیا گیا ہے دیا غالباً "تھا" زیادہ صحیح ہے!)، زبان دانوں اور مستند بولنے والوں سے بھرے پڑے ہیں لیکن ان میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ملے گا جو اردو کی پیدائش یا ارتقاء سے واقفیت رکھتا ہو۔ (جدید تعلیم یافتہ لوگوں کا ذکر نہیں ہے کیونکہ ان کی ذہنی تربیت دوسری طرح ہوئی ہے) جب تک کسی زبان کی لسانیاتی حیثیت کا صحیح علم نہ ہو اس وقت تک اس کی ارادی تشکیل اور ضرورت کے ماتحت قابلِ قبول تنظیم یا تبدیلی کی راہ میں قدم بڑھانا درست نہ ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ قدماء کو اس کی ضرورت نہیں پڑی، انھوں نے زبان کو بنایا، مانجھا، سنوارا اور رواں کیا لیکن آج جب نئے مسائل

پیدا ہو چکے ہیں، جب اردو کی زندگی خطرے میں ہے۔ اس وقت سائنٹفک مطالعہ کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ یہ مطالعہ وسیع پیمانے پر ہونا چاہیے۔ اس میں لسانیات کے ساتھ ساتھ تہذیبی عمل اور ردِ عمل، ہندوستانی زندگی کی ضروریات اور مسائل، تاریخی حالات اور نفسیاتی اثرات کا جائزہ لینا چاہیے اور اس میں ان تغیرات کے لانے سے ہچکچانا نہ چاہیے جو اس کی بقا میں معین ہوں۔

ہندوستان دو وسیع حصوں میں (نہیں بلکہ تین حصوں میں) تقسیم ہو چکا ہے اس تقسیم نے سیاسی حیثیت سے جو نئے مسائل پیدا کئے ہیں ان سے قطع نظر، لسانی مسئلہ نہایت پیچیدہ ہو گیا ہے ہندوستان کے ہر قومی خطہ کے پاس بول چال کی معمولی یا ترقی یافتہ زبانیں اور بولیاں موجود ہیں۔ تہذیبی احیاء کی وجہ سے ان کے دوبارہ زندہ ہونے اور ترقی کرنے کی صورتیں بھی پیدا ہو رہی ہیں، ایک یا دو ایسی زبانوں کی بھی ضرورت ہے جو مختلف خطوں میں مشترک زبان کا کام دیں۔ ہر علاقہ میں اس مسئلہ کی نوعیت بول چال، تعلیم، ادب اور کاروباری یا دفتری ضرورتوں کے لحاظ سے مختلف ہے، جذباتی وابستگی یا نفرت نے اس میں اور دشواریاں پیدا کر دی ہیں، فرقہ وارانہ عصبیت لسانی ارتقاء کے تمام تصورات کو پس پشت ڈال کر من مانی تبدیلیاں کرنے اور انھیں عوام سے منوانے پر تلی ہوئی ہے اور موجودہ حالات میں اس کے کامیاب ہو جانے کے آثار بھی ہیں۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ مستقبل بعید میں حقیقت کی فتح ہوگی، لیکن یہ کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ مستقبل قریب میں جو کچھ ہوگا وہی مستقبل بعید کا تعین کرے گا۔ اس لئے صرف حق کی فتح کے خیال پر جینا اور خوش ہونا صحیح نہیں۔ آج اور اسی وقت اردو کے سائنٹفک لسانیاتی مطالعہ کی ضرورت ہے تاکہ مناسب تغیرات شعوری طور پر کئے جا سکیں، چاہے وہ تغیرات زبان کی ساخت سے متعلق ہوں یا رسم خط سے۔

سوال یہ ہے کہ اردو کے سائنٹفک لسانیاتی مطالعہ سے مراد کیا ہے اور اس کے لوازم کیا ہیں؟

سب سے پہلی ضرورت تو خود لسانیاتی مطالعہ اور علم اللسان کی اہمیت کو سمجھنا ہے۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ آم کھانا چاہیے گٹھلیاں گننے سے کیا فائدہ، ہم زبان بولتے اور استعمال کرتے ہیں ہمیں یہ جاننے کی کیا ضرورت ہے کہ زبان کی ماہیت کیا ہے۔ اس کے ارتقاء اور تغیرات کے محرکات کیا ہیں، اس کے عروج و زوال کے کیا اسباب ہیں؟ لیکن یہ خیال علمی حیثیت سے صحیح نہیں ہے کیونکہ کسی چیز کی بقا اور ترقی کے اصول کا علم حاصل کئے بغیر ہم اس چیز کا تحفظ بدلتے ہوئے حالات میں نہیں کر سکتے۔ علم اللسان کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ زبان سماج کی کس ضرورت کے ماتحت پیدا ہوئی اور نطق و گویائی کی جو طاقت انسان میں پائی جاتی ہے وہ جانوروں کی قوت گویائی سے کس طرح مختلف ہے؟ اس نے ابتدائی انسانوں کو کس طرح اپنا تہذیبی سرمایہ اکٹھا کرنے اور اس ورثے کو آئندہ نسلوں تک منتقل کرنے کا راز بتایا۔ آج زیادہ تر ماہرین لسانیات اس پر متفق ہیں کہ زبان ابتدائی سماج میں مشترکہ اور اجتماعی محنت سے وجود میں آئی اور سماجی ضرورتوں ہی کی وجہ سے بڑھی، اسی نے تجربوں کو محفوظ رکھنے اور خیالوں کو ملفوظی شکل دے کر قابلِ فہم بنانے کی راہ سجھائی، اسی نے اس قوت استدلال کو جنم دیا جو علوم کے محرک بنے اور جس نے تہذیب و تمدن کا ڈھانچہ کھڑا کیا۔ تہذیب کے کسی دور میں ایسی سماجی یا جماعتی زندگی کا تصور بھی محال ہے جب اس کے پاس اظہار خیال کا کوئی ایسا ذریعہ نہ رہا ہو جو اس کی ضروریات کی کفایت کرے۔ جب ہم یہ تسلیم کر لیں کہ زبان کا وجود سماجی ضرورتوں کے لئے ہوا تو ہمیں زبان کے مصرف اور تہذیب و تمدن سے اس کے تعلق کا صحیح اندازہ ہوگا۔

ماہرین لسانیات اس بات پر بھی متفق ہیں کہ زبان کوئی ماں کے پیٹ سے لے کر نہیں پیدا ہوتا، ہر شخص عالم طفولیت سے لے کر آخر وقت تک دوسری باتوں کی طرح زبان بھی اسی طرح سیکھتا ہے جیسے اگلوں نے سیکھی تھی۔ زبان کے سیکھنے میں انسانی جسم کی ساخت، ماحول، تہذیب اور تمدن کا معیار، تاریخی حالات، جغرافیائی اثرات، قومی روایات ہر چیز مدد دیتی ہے، کس کا کتنا حصہ ہوتا ہے، فرد ان باتوں سے کتنا متاثر ہوتا ہے، اجتماعی زندگی یہاں کا کتنا اثر پڑتا ہے، قومی جذبات اس کی تعمیر اور تشکیل میں کتنی مدد دیتے ہیں، تعلیم کے

طریقے اس کی رو کس طرح متعین کرتے ہیں، بیرونی اثرات کس طرح
کبھی قابل قبول اور کبھی ناقابل قبول بن جاتے ہیں؟ یہ وہ نازک معاملات
ہیں جن کا احساس کئے بغیر زبان کے ارتقاء کا صحیح علم نہیں ہو سکتا۔

اُردو زبان کے سائنٹفک اور لسانیاتی مطالعہ کا یہ مطلب ہے
کہ زبان کی سماجی پیدائش کو تسلیم کر کے اس کے اصول ارتقاء اور
تغیر پر غور کیا جائے۔ اُردو ایک ہند آریائی زبان ہے، ہند آریائی
زبان کی خصوصیات کا مطالعہ کیا جائے، جن تہذیبی علاقوں میں ہند
آریائی کی شاخیں پھیلی ہیں انھوں نے وہاں کون کون سی خصوصیتیں
نئی پیدا کر لیں اور ان کی کیا وجہ تھی، سنسکرت، فارسی قدیم اور
پراکرتوں میں کیا تعلق ہے، سنسکرت کا زوال اور پراکرتوں کا عروج
کن سماجی وجوہ کا نتیجہ ہے، پراکرتوں کی خصوصیات کیا ہیں، ایک دور
سے دوسرے دور میں آکر ان کی خصوصیات کس طرح بدل گئیں، ایسی
پراکرتیں کس قسم کا تہذیبی سرمایہ فراہم کرتی رہیں، مسلمانوں کے آنے
کے وقت ہندوستان میں کون کون سی زبانیں بولی جاتی تھیں اور
خاص کر ان علاقوں کی زبانوں کا کیا حال تھا جہاں ان کا اختلاط ہوا، اس
اختلاط کے اثرات دوسرے تہذیبی مظاہر میں کیسے اور کس طرح ہوئے۔
ہندوستان کی مختلف بھاشاؤں اور بولیوں پر اس تہذیبی اختلاط کا
کیا اثر پڑا، کیا کوئی زبان ایسے اختلاط کے بعد غیر متاثر رہ سکتی ہے۔
اردو کا تعلق ہند آریائی زبان کی جن بھاشاؤں سے ہوا ان کے ارتقاء
کی تاریخ اور قواعد کیا تھے۔ اُردو کی ابتدائی حالت کن اثرات کا نتیجہ
ہے اور جب اس کا تعلق ملکی سماج کے اعلیٰ طبقات سے ہو گیا اُس وقت
اس پر کون سے اثرات کام کرنے لگے۔ یہ اور اس طرح کی اور بہت
سی باتوں پر غور کرنا اور لسانیاتی نقطۂ نظر سے انھیں سلجھانا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ زبان کا مطالعہ تغیر ہی کے نقطۂ نظر سے ہو سکتا ہے
اور تغیر کے سماجی اور عمرانی اسباب پیچ در پیچ ہوتے ہیں اس لئے زبان کا
ارتقاء بھی پیچ در پیچ ہوتا ہے۔ زبان بھی قانون نمو کے تابع ہے۔ کیونکہ
جن کے ذریعہ سے اس کا اظہار ہوتا ہے وہ قانون ارتقاء کے تابع ہیں
زبان رجحانات وقت سے متاثر ہوتی ہے اور انسانی ضروریات کے
مطابق صورت اختیار کرتی ہے اُردو کا مطالعہ تاریخی اور فلسفیانہ
دونوں حیثیتوں سے کرنا چاہئے تاکہ زبان و مکان کی تینوں وسعتوں
میں اس کے امکانات کا اندازہ کیا جا سکے اور آئندہ نسلیں اسے محض
روزمرہ اور زبان دانی کے بھروسے پر نہ سیکھیں بلکہ صوتیات اور لسانیات
کی مدد سے سیکھیں ؛

نئی کتابیں

بقیہ صفحہ ۵۵

چند برس میں بہت سی نئی راہیں کھلی ہیں لیکن ان نئی راہوں پر چل کر بھی ڈرامہ
کسی بہت اونچی منزل پر نہیں پہنچا۔ اور اس لئے پڑھنے والے اب اس
صنف کی طرف سے کچھ مایوس سے ہو چکے ہیں۔ مایوسی کی اس فضا میں بھی
ڈرامہ لکھتے رہنا بڑی ہمت کی بات ہے۔ اپیندر ناتھ اشک کے چار ڈراموں
کا یہ مجموعہ اسی ہمت، استقلال اور حوصلہ کی مضبوطی کا مظہر ہے۔ جب
باقی لکھنے والے تھک ہار کر بیٹھ چکے وہ اب بھی ڈرامے لکھے جا رہے ہیں،
یہ بڑی قدر کی بات ہے۔

ڈراموں کے موضوع کچھ غیر معمولی نہیں بلکہ سماج کے وہی مسائل ہیں جو
کبھی نہیں بدلتے ___ انسانی فطرت جس کا راستہ ازل سے آج تک ایک
ہی رہتا ہے اور زندگی کی وہ تفصیلیں جن میں غم و غصہ، بے چارگی و بے بسی
کے ساتھ ساتھ خندہ و تبسم کے بھی بہت سے پہلو ہیں۔ یہی چیزیں اشک کے
ان ڈراموں کا موضوع ہیں۔ مکالموں کی زبان سیدھی سادی اور شاعری
اور ادبیت کے غیر ضروری احساس سے بری ہے۔ ڈرامے پڑھنے والے کو
کسی ذہنی ہیجان میں مبتلا ہونے اور فکری پیچ و خم میں الجھنے کی ضرورت محسوس
نہیں ہوتی۔ اشک کا شاید ارادہ بھی یہ نہیں۔

امید ہے کہ یہ ڈرامے عام طور پر دلچسپی سے پڑھے جائیں گے اور
جو لوگ محض پڑھنے کے علاوہ انھیں اسٹیج پر کھیلنا چاہیں ان کے لئے بھی
تفریحی اور سبق آموز مواد مہیا کر سکیں گے ؛

آغا محمد اشرف

دلّی کا ایک پودا

پچھلے سال گرمی بھر ہر روز میں صبح کی سیر کے لئے پرانے قلعے تک جاتا تھا۔ وہیں ایک مالی سے میری ملاقات ہوگئی۔ اور اسی مالی نے چند روز بعد میرے گھر کے سامنے والے لان میں پرانے قلعے سے ایک چنبیلی کا پودا لاکر لگادیا۔ یہ پودا اس قدر کمزور اور مختصر تھا کہ مجھے اس کے پھلنے پھولنے کا کبھی خیال تک نہیں آسکتا تھا۔ مگر مالی کو اپنے پودے پر بہت اعتماد تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ پودا بہت جلد جڑ پکڑ جائے گا۔ دوسرے مجھے یقین تھا کہ چند روز بعد دلّی کی مئی جون کی گرمی میں اس پودے کی گنتی کی چند شاخیں جل جائیں گی۔ لیکن آخر میں جیت مالی کی ہی ہوئی۔ واقعی پرانے قلعے کا یہ پودا جڑ پکڑنے لگا۔ اس کی شاخوں میں نئی کونپلیں نکل آئیں۔ اور جب مالی نے جمنا کا پانی دے کر اسے سینچا تو اس چنبیلی کے پودے میں ہرے ہرے پتے نظر آنے لگے۔

جولائی کے مہینے میں اگرچہ بارش نہیں ہوئی لیکن اس کے باوجود مالی کی محنت نے اس پودے کو جلنے نہیں دیا۔ بلکہ مہینے کے آخر میں اس میں کلیاں نکل آئیں۔ جس روز شام کو مالی نے چنبیلی کے دو پھول توڑ کر مجھے دئے ہیں اس کی فاتحانہ مسکراہٹ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اب میں بھی مالی کا قائل ہوگیا تھا۔ اور چنبیلی کے پودے سے میرا ایسا ہی قلبی تعلق ہوگیا تھا جیسے کسی قریب المرگ مریض کے تیمار دار اگرچہ اس سے اکتا جاتے ہیں لیکن مریض کے شفا پانے سے انھیں ایک گونہ خوشی بھی ہوتی ہے۔

آخر اگست کا مہینا شروع ہوگیا۔ اور ہمیں حکم ملا کہ ۱۵ اگست تک ہم سب دلّی سے کراچی پہنچ جائیں۔ آہستہ آہستہ ہم نے سامان باندھنا شروع کیا سامان کے بڑے بڑے صندوق اور فرنیچر لکڑی کے صندوقوں اور ٹاٹ کے ٹکڑوں میں حفاظت سے بند کئے گئے اور روانگی سے کئی دن پہلے یہ سامان موٹر لاریوں اور چھکڑوں پر لاد لاد کر مال گودام میں بھیجا جانے لگا۔ مالی اب بھی اپنے مقررہ اوقات پر باغیچے کی دیکھ بھال کرنے کے لئے آتا تھا۔ لیکن جب سے میری مصروفیت دوسرے کاموں کی وجہ سے بڑھی تھی، مجھے اس سے بات چیت کا موقعہ نہیں ملتا تھا۔ نہ مجھے اتنی فرصت تھی کہ چنبیلی کے پودے میں جو نئی کلیاں لگی تھیں انھیں پھول بنتے دیکھوں۔ البتہ مالی اسی تندہی سے کھرپی لئے باغیچے میں اِدھر اُدھر کھدائی کرتا رہتا تھا۔ آٹھویں دن جب ہمارے ہاں جمنا کا پانی ملنے کا نمبر آتا تھا۔ مالی اسی طرح پانی کا بڑا پائپ سانپ کی طرح اپنے جسم کے گرد باندھ کر لاتا اور تمام باغیچے اور لان کو پانی سے بھر دیتا۔ میں نے مالی سے کبھی کراچی جانے کا ذکر نہیں کیا مگر اسے نوکروں سے ہماری روانگی کا علم ہوچکا تھا۔ ۱۰ اگست کو رات کے گیارہ بجے ہم گھر سے روانہ ہونے والے تھے۔ سارا سامان نئی دلّی کے اسٹیشن جاچکا تھا۔ بس اب ہم گھر والے موٹر میں بیٹھنے والے تھے گھر میں بالکل اندھیرا تھا۔ باغیچہ اور لان بھی خاموش تھا۔ ابھی میں نے موٹر کا دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ اتنے میں خدا جانے کہاں سے مالی ہاتھ میں کچھ لئے گاڑی کے پاس آیا۔ مجھے فوراً یاد آیا کہ مالی کا انعام تو دینا بھول ہی گیا۔ مالی نے آگے بڑھ کر گاڑی میں کوئی چیز میرے قدموں کے پاس رکھ دی۔ میں نے کہا یہ کیا۔ مالی نے ہلکی آواز میں کہا صاحب آپ کا چنبیلی کا پودا ہے۔ میں نے اسے ایک گملے میں لگا دیا ہے۔ آپ اسے اپنے ساتھ دلّی سے کراچی لے جائیے۔

رات کی تاریکی میں ہماری موٹر انڈیا گیٹ کے نیچے سے گذری۔ دور سے پرانے قلعے کی دیواریں سائے کی طرح نظر آرہی تھیں۔ لیکن ہمارا رُخ پرانے قلعے کی طرف نہیں بلکہ کراچی کی طرف تھا۔ نئی دلّی کی سڑکیں بالکل خاموش تھیں سینما کا دوسرا شو ابھی ختم نہیں ہوا تھا اس سے سنیما دیکھنے والے اکا دکا جو رات گئے نظر آجاتے ہیں دکھائی نہیں دے۔ البتہ سڑکوں اور بڑی بڑی دوکانوں کے سامنے بجلی کی روشنی سے آنکھیں چکا چوند ہوئی جاتی تھیں۔ میں نے نئی دلّی کی دوکانوں اور سڑکوں کو بارہا دیکھا ہے اور رات کے وقت بھی ان راستوں پر چلا ہوں۔ مگر اس رات ان سڑکوں پر

کچھ عجب اداسی تھی۔ اور بڑی بڑی عمارتوں سے دہشت سی ٹپک رہی تھی۔
نئی دلی کے اسٹیشن پر ہماری گاڑی کھڑی تھی۔ میں نے اپنے درجے میں جاکر
سامان رکھوایا۔ معلوم ہوا کہ گاڑی صبح پانچ بجے چلے گی۔ رات کو بڑی مشکل
سے نیند آئی۔ طبیعت صرف اس خیال سے پریشان تھی کہ دلی میرا وطن
ہے۔ میں وطن چھوڑ رہا ہوں اور آخری رات اپنے گھر میں نہیں بلکہ اسٹیشن
پر ریلوے ٹرین کے ایک ڈبے میں گزار رہا ہوں۔

رمضان کا مہینہ تھا اس لئے رات کے تین بجے سے لوگ سحری کھاکر
پلیٹ فارم پر پہنچنے لگے۔ پریشان ہوکر میں بھی اٹھ بیٹھا۔ صبح کی نماز کے بعد
گاڑی چلی۔ بہت تھوڑے سے لوگ کراچی جانے والوں کو رخصت کرنے
آئے تھے۔ دو دن پہلے ایک ٹرین پر بم پھینکا جا چکا تھا اس لئے ہماری ٹرین
کے چلنے کی اطلاع بہت محفوظ رکھی گئی تھی۔ جب گاڑی چلی ہے تو صرف گنتی
کے چند لوگ ہاتھ ہلا رہے تھے۔ اور ایک لڑکا دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔

عربک کالج کی مسجد کے سفید برج سامنے آئے اور ٹرین فراٹے بھرتی
ان کے سامنے سے گذر گئی۔ میں نے کہا اگر گاڑی کی رفتار یہی رہی تو کراچی
کا سفر بہت جلد طے ہو جائے گا۔ فراش خانے کی کھڑکی کے سامنے اب
بہت سے مکان بن گئے ہیں۔ لیکن کھڑکی کا راستہ بھی نظر آگیا۔ قدم شریف
کے قبرستان میں سے گاڑی گذری۔ پرانی ٹوٹی ہوئی قبریں۔ اکثر کتبے
آدھے ٹوٹ پھوٹ چکے ہیں۔ قبروں کے پتھر بھی ٹوٹ کر جھڑ گئے۔ چبوتروں
پر گھاس اُگ آئی۔ انہی قبروں میں سنا جاتا ہے کہ استاد ذوق کی بھی قبر ہے۔
ایک بڑے میاں سفید نورانی ڈاڑھی ہاتھ میں تسبیح لئے ایک قبر پر بیٹھے تھے۔
جب ٹرین ان کے سامنے سے گذری تو مسافروں میں سے اکثر نے مل کر
پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگایا۔ بڑے میاں مسکرانے لگے اور ہاتھ اٹھا کر
دعا مانگی۔ گاڑی اب بھی اسی تیز رفتاری سے چلی جا رہی تھی اور مجھے یقین تھا
کہ کراچی کا سفر جلد طے ہو جائے گا۔

مگر شام تک ٹرین کی رفتار بدل گئی۔ پھر ہر قدم پر ٹھہرنے لگی۔ اور ہر
مقام پر ہمیں [illegible] خبریں مل رہی تھیں۔ رات کے بارہ بجے پاکستان
اور ہندوستان کو آزادی ملنے والی تھی۔ اس آزادی کے لئے سب نے
مل کر کس قدر قربانیاں دی تھیں مگر ہماری ٹرین کے مسافروں کے چہروں
پر ہراس اور دہشت کے آثار نظر آرہے تھے۔ ایک جگہ ہمیں حکم ملا کہ گاڑی
کی روشنی گل کر کے سب مسافر زمین پر بیٹھ جائیں۔ کیونکہ پٹڑی کے دونوں
طرف سے گولیاں چلنے کا خطرہ ہے۔ ہم نے اپنے ڈبے کی روشنی بجھا دی
اور زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ اندھیرے میں میرا ہاتھ کسی چیز پر
لگا۔ لیکن میں اسے پہچان نہیں سکا۔ اور قریب سر لے جاکر اندھیرے
میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی تو اندازہ ہوا کہ وہی چنبیلی کا
پودا تھا جو دلی سے چلتے ہوئے مالی نے دیا تھا۔ اب مجھے اس کی کلیوں کی
بھینی بھینی خوشبو آنے لگی۔ اس خوف و ہراس کے وقت جب میں نے
گملے کو اپنے قریب کیا ہے تو اس سے مجھے کتنی تقویت ملی ہے اس کا
اندازہ صرف میں ہی کر سکتا ہوں۔ رات کے بارہ بجے پاکستان اور
ہندوستان میں آزادی کے جشن منائے جا رہے تھے مگر میں ایک پودے
کو گود میں لئے اندھیری گاڑی میں بیٹھا تھا۔ وہی پودا جس کی جڑ لال
قلعے سے آئی تھی اور جو جمنا کے پانی سے سیراب ہو کر دلی میں پلا بڑھا تھا۔
کراچی پہنچ کر جب مجھے رہنے کے لئے مکان مل گیا تو مکان صاف کرنے
اور اس میں سامان لگانے سے پہلے میں نے مکان کے سامنے والے
صحن میں ایک کونہ اینٹوں اور پتھروں سے صاف کیا۔ کھرپی موجود
نہیں تھی اس لئے ہاتھ سے رتیلی زمین ہموار کی پھر ایک بڑے سے
چاقو کی مدد سے زمین کو کھودا۔ اور جب اس زمین میں کوئی بالشت بھر
گہرا گڑھا بن گیا تو دلی کی مٹی جو اس گملے کے ساتھ آئی تھی اس مٹی سے
میں نے یہ گڑھا بھر دیا۔ اور نہایت حفاظت سے چنبیلی کا پودا گملے سے
نکال کر کراچی کی زمین میں منتقل کر دیا۔ اس کے چاروں طرف مٹی کی ایک
چھوٹی سی منڈیر بنا دی اور پھر اپنے ہاتھ سے سندھ کا پانی لا کر دے دیا۔

اس کے بعد ایک ہفتے تک اس پودے پر نہایت شکست اور
سختی کا زمانہ گذرا۔ موت اور زندگی میں جیسے جنگ ہو رہی تھی۔ کبھی وہ
مرجھانے لگتا تھا۔ اور کبھی صبح اٹھ کر دیکھتے تو اس کے پتوں میں زندگی
کے آثار نظر آنے لگتے تھے۔ صبح شام میں اسے دھڑکتے ہوئے دل سے
دیکھتا اور اس احتیاط سے اسے پانی دیتا تھا کہ کہیں پانی دینے والے
[illegible] اسے مجروح نہ کر دیں۔ [illegible]
تھا اور میں اس کا علاج [illegible] خیال آیا کہ کسی [illegible]
یا تجربہ کار باغبان سے مشورہ کروں مگر ہمت [illegible]

(باقی صفحہ [illegible] پر)

اختر حسین رائے پوری

پاکستان کے بعض تعلیمی مسائل

پاکستان جس خطۂ زمین کا حامل ہے وہ جغرافیائی اعتبار سے ہی نہیں بلکہ تمدنی اعتبار سے بھی ہند کے کنارے کنارے واقع ہے۔ مسلمانوں کے دورِ حکومت میں جو تمدنی، لسانی یا ادبی تحریکیں بیدار ہوئیں وہ ان علاقوں کو چھوکر رہ گئیں۔ کیونکہ یہ ایک تاریخی امر ہے کہ جو علاقہ تمدنی مرکزوں سے دور رہتے ہیں ان کی زندگی کم و بیش یکساں گذر جاتی ہے۔ لاہور اور ڈھاکہ کی تمدنی اہمیت کو سکھ شاہی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں سخت نقصان پہنچا۔ اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ انیسویں صدی کے نصف میں جب برطانوی سامراج سارے ملک پر مسلط ہوا تو ان علاقوں کے اکثر رہنے والے ہر لحاظ سے پچھڑے ہوئے تھے۔ تب سے لے کر اب تک ایک صدی کی طویل مدت میں یہ اکثریت جو مسلمانوں پر مشتمل ہے صنعتی یا تعلیمی لحاظ سے کوئی خاص ترقی نہ کر سکی۔ بلکہ اسی زبوں حالی کے احساس نے اسے خود مختاری کے مطالبہ کی ترغیب دلائی۔ اسے محض اتفاق نہیں کہا جا سکتا کہ پنجاب کا سب سے زرخیز خطہ جسے خطۂ نو آبادی COLONY LAND کہا جاتا ہے، انگریز غیر مسلم اقلیت کے لئے مخصوص کیا گیا۔ مشرقی بنگال میں جوٹ یا سندھ میں کپاس کی ملیں قائم نہ کی گئیں۔ بلوچستان یا صوبۂ سرحد کی معدنی دولت کو زمین میں دفن رکھا گیا۔ یہ غیر ملکی سامراج اور اس کے ملکی مددگاروں کی ملی بھگت تھی کہ مسلمانوں کو ابھرنے سے روکیں۔ گویا اگر ایک طرف برطانوی سامراج سارے برِ عظم ہند کو خام اشیاء پیدا کرنے والی نو آبادی کی طرح برت رہا تھا۔ تو ملک کے غیر مسلم ملکی شریکِ کار ان مسلم علاقوں سے بعینہٖ وہی سلوک کر رہے تھے اور اس دوہرے دباؤ نے ان علاقوں کو بالکل اپاہج کر رکھا تھا۔

اس پس منظر میں پاکستان کی تعلیمی حالت کا مطالعہ کیا جائے۔ دورانِ جنگ میں تعلیمی اعداد و شمار جمع کرنے کی فرصت کسے تھی اور بنگال و پنجاب کی تقسیم نے اس مسئلہ کو اور بھی الجھا دیا ہے تاہم یہ سب جانتے ہیں کہ ملک کی ۲۲ یونیورسٹیوں میں سے صرف تین پاکستان میں ہیں اور اسی طرح کے ۵۰۰ اداروں میں سے ۴۹ ہندوستان میں ہیں۔ حکومتِ ہند کے درجنوں کتب خانوں میں سے ایک بھی پاکستان میں نہیں اور نہ ان میں سے کسی ایک کا کوئی حصہ ملا ہے۔ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے لحاظ سے فقط ۱۲ فی صدی [illegible] مرد حرف شناس تھے اور غالباً یہ تخمینہ بھی کسی نہ کسی حد تک مبالغہ پر مبنی تھا۔ اب اگر یہ دیکھئے کہ مشرقی و مغربی پاکستان کے غیر مسلموں میں تعلیم کا چرچا نسبتاً بہت زیادہ تھا اور مسلمان عورتیں تعلیم کے لحاظ سے بہت پچھڑی ہوئی ہیں اور پھر یہ کہ آبادی کے جبری تبادلہ کی وجہ سے جو لوگ پاکستان میں آ رہے ہیں ان میں تعلیم نسبتاً ان لوگوں سے کم ہے جو یہاں سے جا رہے ہیں تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستان میں حرف شناسوں کی تعداد دس فی صدی سے زیادہ نہ ہوگی۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ تعلیم کے ابتدائی ثانوی اور اعلیٰ مدارج میں پاکستان کی حالت بالکل ابتر ہے۔ اسی نسبت سے یہاں کی تعلیمی زندگی [illegible] کی محتاج ہے کیونکہ اس کے بغیر شہریت یا جمہوریت کا کوئی تصور قرینِ قیاس نہیں۔

اسی ضرورت کے پیشِ نظر کراچی میں نومبر کے اواخر میں حکومتِ پاکستان کے وزیرِ تعلیم کے ایما پر ایک تعلیمی کانفرنس ہوئی۔ کانفرنس نے بعض ایسے بنیادی مسئلوں پر بھی غور کیا جو [illegible] قومی زندگی کی تشکیل سے ہے۔ اس ضمن میں [illegible] نے [illegible] سفارشیں کی ہیں ان میں سے جو بہت اہم ہیں [illegible]

پاکستان کے مہمان

۱۴ اگست کے بعد سے اب تک دنیا کے مختلف ملکوں سے طرح طرح کے مہمان پاکستان آئے اور اس نئی مملکت سے قدیم روابط پر مسرت کرنے کے علاوہ اس کے مستقبل کے متعلق امید افزا خیالات ظاہر کئے — اس صفحے کی تصاویر ان بہت سے مہمانوں میں سے چند ہی ہیں —

(۱) شرق اردن کے وزیر اعلیٰ ہز ایکسیلنسی محمد پاشا الشوبکی جو غیر معمولی سفیر کی حیثیت سے تشریف لائے تھے، تصویر میں بائیں طرف بیٹھے ہیں — قائد اعظم کی دائیں جانب حکومت پاکستان کے وزیر امور خارجہ سر محمد ظفر اللہ خاں تشریف فرما ہیں —

(۲) کچھ عرصہ ہوا جس سے ایک خیر سگالی وفد پاکستان آیا تھا — تصویر میں اس کے اراکین مس فاطمہ جناح

سے باتیں کر رہے ہیں — بائیں طرف مسٹر عبدالعزیز ہیں — مسٹر کے ایچ شان امیر تصویر کو تھامے ہوئے ہیں جو حبشیوں کی طرف سے قائد اعظم کی خدمت میں پیش کی گئی تھی — ان کے بعد مسٹر رشدی ٹی بی لی ہیں جو صدر وفد ہیں — آل پاکستان عربک سوسائٹی کے سکریٹری پروفیسر حسن اعظمی نے جو اس منظر میں کھڑے ہیں، مترجم کے فرائض انجام دئے — اراکین وفد بھی عربی زبان سے خوب واقف ہیں —

(۳) حکومت پاکستان کے وزیر مواصلات سردار عبدالرب نشتر مصر کے مشہور صحافت نگاروں مسٹر عبدالقدیر حمزہ اور مسٹر صالح الشماوی سے گفتگو کر رہے ہیں —

(۴) افغانستان کے [illegible] ہز رائل ہائنس سردار شاہ محمد خان غازی کراچی کی بندرگاہ پر — پاکستان کی

قیام

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کا دن دنیا کی تاریخ میں ایک یادگار دن سمجھا جائے گا اس مبارک دن دنیا کی پانچویں بڑی اور اسلامی دنیا کی سب سے بڑی مملکت کا قیام ہوا اور ایک بہت بڑی قوم کے لئے آزادی کے دور کی ابتدا ہوئی۔ اس تاریخ کو مملکت پاکستان کے دارالسلطنت میں جشن آزادی منایا گیا۔ ذیل کی چند تصاویر میں اسی جشن کے چند مناظر ہدیہ ناظرین ہیں۔

(۱) [illegible] ہوا میں لہرا رہا ہے [illegible] میں سبز رنگ [illegible] مملکت میں اقلیتوں کی [illegible] نمائندگی کرتی ہے [illegible] توحید قومی پرچم کو سلامی [illegible] رہے ہیں۔

2

پاکستان

(۲) پاکستان کے گورنر جنرل قائد اعظم محمد علی جناح لاہور کے چیف جسٹس آنریبل عبدالرشید کے سامنے حلف وفاداری اٹھا رہے ہیں۔

(۳) قائد اعظم محمد علی جناح پاکستان کی ساحلی مسلح فوج کا معائنہ فرما رہے ہیں ان کے ملٹری سکریٹری ساتھ ساتھ ہیں۔

(۴) پاکستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے قائد اعظم محمد علی جناح اہل پاکستان کو پیغام تہنیت و مبارکباد دے رہے ہیں۔ پشت کی جانب پاکستانی افواج کے افسران اعلیٰ کھڑے ہیں۔

(۵) قائد اعظم مجلس آزادی کے سامنے اپنا خطبہ پڑھ رہے ہیں۔ سامنے لاؤڈ سپیکروں کے مائکروفون انکے سامنے رکھے ہیں تاکہ یہ پیغام سارے ملک کے ہر حصہ میں آسانی سے سنا جا سکے۔ آپ کے داہنی طرف انڈیا کے گورنر جنرل ہز ایکسیلنسی ماؤنٹ بیٹن بیٹھے ہیں۔

(۶) قائد اعظم اور چیف جسٹس آنریبل عبدالرشید کی موجودگی میں پاکستان کے وزیر اعظم مسٹر لیاقت علی خاں حلف وفاداری اٹھا رہے ہیں۔ باقی وزرا اُن کے داہنی طرف کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔

(۷) کراچی کے اسمبلی ہال کا ایک منظر۔ حکومت پاکستان کے وزیر متعلقہ "لا اینڈ لیبر" مسٹر جے۔ این منڈل اپنا پیغام مائکروفون کے ذریعہ نشر کر رہے ہیں۔"

★

A-329

A-302

مغلوں کے عہد میں خطاطی

ہندوستان میں مغلوں کا عہد فنون لطیفہ کی ترقی و ترویج کے سلسلہ میں بہت مشہور رہا ہے — مصوری اور موسیقی کی طرح خطاطی یا خوشنویسی کو بھی زبردست عروج حاصل ہوا — سرپرستی کے علاوہ بعض بادشاہوں نے بذات خود اس فن لطیف میں کمال حاصل کیا — چنانچہ ان کے ہاتھ کے بہت سے نمونے آج تک محفوظ ہیں اور ارباب ذوق کو دعوت نگاہ دیتے ہیں — اس موضوع پر ایک مختصر سا مضمون اسی شمارے کے صفحہ ۵۴ پر ملاحظہ کیجئے —

۳۲۹ — دہلی کے آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ثانی کا یہ قطعہ خط نسخ میں خود انہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور تاریخی حیثیت سے اس لئے اہم ہے کہ اس میں بہادر شاہ نے اپنے کلیات کے نام کا ذکر کیا ہے

۳۰۲ — دربار جہانگیر کے مشہور خطاط عبدالرحیم نے یہ رباعی سنہ ۱۶۱۹ء میں لکھی تھی — انہیں "عنبریں قلم" کا خطاب ملا تھا — اعلیٰ نمونہ خطاطی کے علاوہ اس لوح میں حاشیے کی نقاشی بھی لائق تعریف ہے بتایا جاتا ہے کہ بہت سی قلمی کتابوں کے جملہ صفحات ایسے ہی دیدہ زیب ہوتے تھے —

۳۱۵ — دہلی کے مشہور خطاط میر پنجہ کش نے یہ قطعہ سنہ ۱۸۵۰ء میں لکھا تھا — وہ ۹۱ سال کی عمر میں غدر دہلی کے موقعہ پر انگریزوں کے ہاتھوں شہید ہوئے تھے —

۳۳۲ — یہ رباعی شہزادہ ولی عہد الملک عرف مرزا فخرالدین نے سنہ ۱۸۴۸ء میں لکھی تھی — ان کا انتقال غدر سے ایک سال پہلے ہوا — وہ میر پنجہ کش کے شاگرد تھے — اس رباعی کی خوبی یہ ہے کہ اس کے ہر حرف پر نقطہ ہے —

A-332

A-315

خواجہ احمد عباس

میں کون ہوں ؟

"ہاں تو تم سب جاننا چاہتے ہو کہ میں کیوں ہنس رہا ہوں ؟"....

"تم جاننا چاہتے ہو کہ ایک آدمی جو مرنے کے قریب ہو وہ کیسے کھلکھلا کر ہنس سکتا ہے ؟....."

تم رہنے دو ڈاکٹر صاحب ۔ کیوں تکلیف کرتے ہو؟ اپنی ڈسپنسری میں کونین مکسچر اور اسپرین کی گولیاں بیچو ۔ تم مجھے مرنے سے نہیں بچا سکتے ۔ بات یہ ہے کہ مجھے ایک چھوڑ دو گھاؤ لگے ہیں ۔ ایک پسلیوں میں آر پار کمر سے لے کر جگر تک ۔ دوسرا پیٹ میں ۔ دیکھتے نہیں آنتیں باہر نکل آئی ہیں .....

"ہاں تو تم سب جاننا چاہتے ہو کہ میں کیوں ہنس رہا ہوں ؟ تم جاننا چاہتے ہو کہ مرتا ہوا آدمی کیسے ہنس سکتا ہے ۔ ۔ میں ابھی بتاتا ہوں ۔ ۔ بات یہ ہے کہ مجھے یاد آگیا ہے کہ میں کون ہوں ۔ کیا کہا تم نے بڑے میاں ؟ اس میں ہنسی کی کیا بات ہے ؟ کمال کیا ہنسی کی نہیں تو کیا رونے کی بات ہے ؟ ایک مہینے سے میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں کون ہوں ۔ ہندو یا مسلمان یا سکھ جس کے بال اور ڈاڑھی زبردستی مونڈ دئے گئے ہوں اور زبردستی ختنہ کر دی گئی ہو ۔ برہمن یا اچھوت ؟ ... امیر یا غریب ؟ ... مشرقی پنجاب کا رہنے والا یا مغربی پنجاب کا ؟ ... لاہور کا باشندہ یا امرتسر کا ؟ ... راولپنڈی کا یا جالندھر کا ؟ ..... میں نے ہی نہیں بلکہ اور بھی بہت سے لوگوں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ میں کون ہوں ، میرا دھرم کیا ہے ۔ ذات کیا ہے ، نام کیا ہے ؟ ..... پر کسی کو نہیں معلوم ہو سکا ..... خود مجھے یاد نہ تھا ۔ مگر یاد آیا تو اب ... اب جبکہ میں مر رہا ہوں ...

"ڈاکٹر صاحب ! تم اتنے پریشان نہ ہو نہیں تو تمہاری شکل دیکھ کر مجھے اور ہنسی آنے کی ۔ تمہیں معلوم ہے ؟ تم کیا اب دنیا کا کوئی ڈاکٹر بھی مجھے نہیں بچا سکتا ؟ ..... میں جانتا ہوں تم کس شش و پنج میں پڑے ہو ؟ میرے دو زخم اتنی بیڈھب جگہوں پر پڑے ہیں کہ تمہاری سمجھ میں نہیں آرہا کہ پہلے کس کی مرہم پٹی کرو ۔ پہلے پیٹ لگا کر آنتوں کو واپس اندر ڈال کر پیٹ سیتے ہو تو اتنی دیر میں کمر والے گھاؤ میں اتنا خون بہہ جائیگا کہ ایک ٹانکہ بھی نہ لگا سکو گے کہ میں مر چکوں گا ۔ اور اگر تم مجھے الٹا کر کے پہلے کمر کے گھاؤ کی خبر لیتے ہو تو اتنی دیر میں انتڑیاں تو انتڑیاں سارا کلیجہ باہر نکل آئے گا ...

"ہاں تو بات یہ ہے کہ ایک مہینہ ہوا جب میرا دماغ نہ جانے کتنے دنوں کے بعد ایک اندھیرے سپنے سے باہر نکلا اور میں نے اپنے آپ کو دہلی کے ایک سرکاری ہسپتال میں پڑا پایا تو میری یاد ایک دم غائب ہو چکی تھی ۔ ڈاکٹر نے پوچھا ۔

"تمہارا نام ؟"

"میں نے بہت سوچا ۔ دماغ پر زور ڈالا ۔ پھر کہنا پڑا ۔ یاد نہیں "

"ہندو یا مسلمان " ڈاکٹر نے دوسرا سوال کیا ۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں تھا

"کچھ بھی یاد نہیں تھا ۔ دھرم ، مذہب ، ذات ، جماعت ، وطن ، شہر ، محلہ ، یہ بھی یاد نہیں تھا کہ میں شادی شدہ ہوں ، کنوارا یا رنڈوا ۔ اور تو اور مجھے اپنی عمر کا بھی کوئی اندازہ نہیں تھا ، نا جانے کیوں ہوش آنے پر میرا خیال تھا کہ میں کافی جوان ہوں مگر جب ایک نرس نے آئینہ دکھایا تو میں اپنی شکل دیکھ کر ڈر گیا ۔ سر کے آدھے بال سفید ۔ آٹھ دس دن کی بڑھی کھچڑی رنگ کی ڈاڑھی ۔ آنکھیں اندر دھنسی ہوئیں ۔ چہرہ پر جھریاں غرض یہی حلیہ جو اب بھی تم لوگ دیکھ رہے ہو ۔ ہاں اس وقت سر کے سفید بالوں میں خون کی مہندی نہیں لگی تھی ۔ جو اب لگی ہوئی ہے ۔ دیکھا تم بھی ہنس دئے ۔ خون کی مہندی ؟ مگر تم کتنیوں پر لگائی ہے اور بوڑھے مرد کے سفید بالوں میں ۔ اب خود ہی بتاؤ یہ سوچ کر ہنسی کیوں نہ آئے ؟ .....

"ہاں تو دلی کے ڈاکٹروں نے بہت کوشش کی کہ میرا نام، پتہ، دھرم، مذہب معلوم ہو جائے مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ میں نے خود بڑی دوڑ دھوپ کی کیونکہ بغیر اپنا نام جانے ہوئے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میں نہ زندہ ہوں نہ مردہ ہوں۔ پوچھ گچھ کرنے پر پتہ چلا کہ پچاس ساٹھ اور زخمیوں کے ساتھ مجھے ریل میں پنجاب سے لایا گیا ہے۔ میں نے سوال کیا باقی زخمی ہندو تھے یا مسلمان تو معلوم ہوا ہندو بھی تھے۔ سکھ بھی، مسلمان بھی۔ ہوا یہ تھا کہ امرتسر اور لاہور کے درمیان کچھ بعد دیگرے دو ریلیں پٹڑی سے اتار دی گئی تھیں۔ ایک میں مغربی پنجاب سے ہندو امرتسر آرہے تھے۔ دوسری میں مشرقی پنجاب سے مسلمان لاہور جا رہے تھے۔ رات کے گیارہ بجے کے قریب ایک اسپیشل کے نیچے بم پھٹا۔ پہیئے پٹڑی سے نیچے آرہے۔ انجن الٹ گیا۔ کتنے تو ویسے ہی ہلاک ہو گئے۔ باقیوں پر گولیاں برسیں رات کے اندھیرے میں زخمی گرتے پڑتے اِدھر اُدھر بھاگے۔ اس کے بعد اس جگہ سے میل بھر دور دوسری اسپیشل پر جو الٹی طرف سے آرہی تھی حملہ ہوا۔ اس بار بم کی ضرورت نہیں پڑی، گاڑی جوں ہی ایک موڑ پر پہنچی مشین گن کی گولیوں کی بوچھاڑ اس پر پڑی۔ ڈرائیور، گارڈ اور بہت سے مسافر جو کھڑکیوں کے قریب بیٹھے تھے فوراً ہلاک ہو گئے انجن مست ہاتھی کی طرح دھڑ دھڑاتا گاڑی کو گھسیٹتا چلا گیا۔ مگر تھوڑی ہی دور پہ ریل کی پٹڑی کا کانٹا بدل دیا گیا تھا۔ اس لئے پوری گاڑی الٹ گئی۔ اس کے زخمیوں نے بھی رات کے اندھیرے میں پناہ لی . . . اگلی صبح کو جب ہندوستانی سرحدی فوجیں اور پاکستانی سرحدی فوجیں گشت کو نکلیں تو انھوں نے کتنے ہی ہندوؤں اور مسلمانوں کو عین نئی سرحد پہ مردہ اور زخمی پڑا پایا۔ ان میں میں بھی تھا . . . اب تم ہی کہو مینشی نا آئے یہ سن کر کہ کتنے ہی ہندوؤں نے اندھیرے میں پاکستان میں دم توڑا تھا اور کتنے ہی مسلمانوں نے ہندوستان میں۔ اور پھر بھی وہ اس طرح عین سرحد پر خلط ملط پڑے تھے کہ یہ کہنا مشکل تھا کہ کون ہندو ہے اور کون مسلمان، کون ہندوستان میں ہے اور کون پاکستان میں۔ بہرحال نئی سرحد کی لکیر ضرور کھنچ گئی تھی . . خون سے! . . . . یا یوں کہیے کہ بوڑھے زمین کی ڈاڑھی میں خون کی مہندی لگ گئی تھی . . . . . .

"دیکھو سفید ڈاڑھی والے مولانا گھبراؤ مت۔ میرا اشارہ ہرگز تمہاری ڈاڑھی کی طرف نہیں تھا۔ تم میری طرف اس طرح ناگھور رہے ہو میں جانتا ہوں تم کیا سوچ رہے ہو میں مر رہا ہوں نا اور مرتے وقت انسان پر سب بھید کھل جاتے ہیں نا۔ ہاں تو تم سوچ رہے ہو کہ اگر میں مسلمان ہونے کا اعلان کر دوں تو تم انجمن خدام المسلمین کی طرف سے میری تجہیز و تکفین کا بندوبست ابھی سے شروع کر دو۔ اور لمبی چوٹی والے پنڈت جی میں تمہارے دل کا بھید بھی جانتا ہوں تم اس تاک میں ہو کہ کب میں اپنے ہندو ہونے کا اقرار کروں اور تم دھرم سیوک سماج کی طرف سے میرے کریا کرم کا انتظام شروع کر دو۔ میں نے سنا ہے یہاں بمبئی میں پارسی لوگ اپنے مردوں کو مالابار ہل پر ایک کھلے میدان میں رکھ آتے ہیں تاکہ گدھ لاشوں کو کھا جائیں۔ یہ بھی سنا ہے کہ ہزاروں گدھ ہر وقت اس انتظار میں منڈلاتے رہتے ہیں کہ کب کوئی تازہ لاش لائی جائے۔ پر یہ نہیں معلوم تھا کہ ایسے گدھ بھی ہوتے ہیں جو موت سے پہلے ہی مرنے والے پر منڈلاتے رہتے ہیں۔

"کسی نے مجھے بتایا کہ جب مجھے ہندوستان پاکستان سرحد پہ اس طرح بے ہوش پڑا پایا گیا کہ میری ایک ٹانگ ہندوستان میں تھی دوسری پاکستان میں۔ ایک ہاتھ ادھر تو دوسرا اُدھر۔ تو اس وقت میرے بدن پر ایک پھٹی ہوئی شلوار اور خون میں لت پت قمیص تھی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ پنجابی ہندو کا لباس ہے یا پنجابی مسلمان کا۔ خیر نا جانے کیوں مجھے دلی لے آیا گیا۔ مجھے زخم تو معمولی آئے تھے۔ وہ جلد اچھے ہو گئے۔ مگر ڈاکٹر کہتے تھے کہ دماغ میں کوئی شدید اندرونی چوٹ آئی ہے جس سے یاد غائب ہو گئی ہے . . . .

"ہاں صاحب! تو میں تمام دنیا میں عجیب الخلقت انسان بن گیا۔ جس کو نہ اپنا نام یاد تھا نہ اپنا پتہ نہ دھرم۔ میری تصویریں ہندوستان بھر کے اخباروں میں چھپیں اور پاکستان کے اخباروں میں بھی مگر میرے کسی رشتے دار دوست یا جاننے والے نے میری خبر نہ لی۔ شاید سب کے سب ختم ہو چکے تھے۔ شاید سرے سے میرا کوئی رشتہ دار یا کوئی دوست یا کوئی جاننے والا تھا ہی نہیں اور اس عرصے میں زخم اچھے ہونے پر مجھے ہسپتال سے نکال دیا گیا۔ میں نے سوچا میرے جیسے مصیبت کے مارے کے لئے کہیں تو دو وقت روٹیوں کا انتظام ہو ہی جائے گا۔

"پھرتا پھراتا جامع مسجد کے پاس ایک کیمپ میں پہونچا۔ میں نے کہا میں مصیبت زدہ ہوں مجھے پناہ دو۔ کیمپ کے مہتمم نے پوچھا ہندو ہو یا مسلمان؟ میں نے جواب دیا "یاد نہیں" واقعہ یہی تھا۔ جھوٹ بولنے کو میرا جی نہ چاہتا تھا۔ مہتمم نے ٹکا سا جواب دے دیا "یہ کیمپ صرف مسلمانوں کے لئے ہے" سڑکوں کی خاک چھانتا پرانی دلی سے نئی دلی پہونچا وہاں ایک بہت بڑا کیمپ نظر آیا۔ دروازے پر میں نے کہا میں بڑا دکھی ہوں تین وقت سے دانہ پیٹ میں نہیں گیا مجھے پناہ دو۔ پوچھا گیا۔ "ہندو ہو یا مسلمان۔" میں نے پھر یہی جواب دیا "مجھے یاد نہیں"۔

"نام؟"...... نام بھی یاد نہیں" میں نے کہا۔ جواب ملا یہ کیمپ صرف ہندوؤں کے لئے ہے۔ نہ جانے کتنی دیر تک میں دہلی اور نئی دہلی کی خاک چھانتا رہا۔ کتنے ہی کیمپ نظر آئے مگر وہ یا ہندوؤں اور سکھوں کے لئے تھے یا مسلمانوں کے لئے۔ انسانوں کے لئے کوئی نہیں تھا۔

اس رات میں ایک کوٹھی کے سامنے بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ کوٹھی کسی سردار جی کی تھی۔ وہ مجھے مصیبت زدہ دیکھ کر اٹھا لائے۔ مجھے دودھ پینے کو دیا۔ جب ہوش آیا تو انہوں نے یہ نہیں پوچھا کہ میں ہندو ہوں یا مسلمان یا سکھ۔ صرف یہ پوچھا "کیوں بھئی اچھے تو ہو؟"

"میں کئی دن وہاں رہا۔ سردار جی ان کی بیوی اور بچے سب مجھ سے بڑی اچھی طرح پیش آتے تھے۔ میں نے انھیں بتا دیا کہ میری یاد جاتی رہی ہے اور مجھے معلوم نہیں کہ میں کون ہوں۔ پھر بھی انھوں نے میرے ساتھ اچھا ہی سلوک کیا۔ پھر چند روز بعد ان کے کتنے ہی رشتہ دار راولپنڈی ضلع سے آ گئے۔ ان بیچاروں پر وہاں کے مسلمانوں نے بڑا ظلم کیا تھا۔ انھوں نے اپنے دوستوں پڑوسیوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے قتل ہوتے دیکھا تھا۔ ان سب کے دل مسلمانوں کے خلاف نفرت اور غصے سے بھرے ہوئے تھے۔ ان کی زبانی یہ واقعات سن کر خود میرا دل مسلمانوں کے نام سے نفرت کرنے لگا۔ سردار جی نے ان کو میری بابت بتا دیا تھا کہ میں بھی مصیبت زدہ ہوں جس کی یاد جاتی رہی ہے۔ ان میں سے کئی بڑے بوڑھوں نے مجھ سے ہمدردی کا اظہار کیا مگر چند نوجوان مجھے شبہ کی نظر سے دیکھتے رہے اور ایک رات میں نے ان میں سے ایک کو کہتے سنا "کیا معلوم یہ آدمی بھی مسلمان ہو۔ اور اگر [illegible] کا

واقعہ سچا بھی ہے تو کون کہہ سکتا ہے ممکن ہے یہ مسلمان ہی ہو" میں نے ان کی آنکھوں میں انتقام کی خونی چمک دیکھی۔ اور میں نے سوچا شاید میں واقعی مسلمان ہی ہوں شاید خود زخمی ہونے سے پہلے میں نے بھی وہ تمام مظالم کئے ہوں جن کا بیان یہ ہوتے ہیں شاید میں اسی قابل ہوں کہ مجھ سے انتقام لیا جائے...... اسی رات میں وہاں سے بھاگ گیا۔

"پھر کئی دن کے فاقے۔ سڑکوں کی خاک۔ یہ کیمپ ہندوؤں کے لئے ہے۔ یہ کیمپ مسلمانوں کے لئے ہے؟ تمہارا نام کیا ہے؟ تمہارا دھرم کیا ہے؟ کہاں سے آئے ہو؟۔

جب کہیں پناہ نہ ملی اور کمزوری کے مارے چلنا مشکل ہو گیا تو میں جامع مسجد کی سیڑھیوں پر لیٹ گیا۔ سامنے میدان میں ہزاروں مسلمان پڑے ہوئے تھے جو مشرقی پنجاب سے بھاگ کر آئے تھے۔ دن بھر پڑے رہنے کے بعد مجھے ہوش بھی نہ رہا نہ جانے کب تک یونہی پڑا رہا۔ ایک بار ہوش آیا تو ایسا معلوم ہوا۔ جیسے کوئی میرے قریب ہی کھڑا ہو۔ آنکھ اٹھا کر دیکھا تو ایک بچہ تھا شکل سے آٹھ برس کا ہوگا۔ کہنے لگا "یہ کھانا امّاں نے بھیجا ہے کہ کسی بھوکے کو کھلا آؤ۔" بے سہارے میرے لئے بیٹھنا بھی مشکل تھا۔ اس بے چارے نے ہاتھ کا سہارا دیا تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اُف کتنی مزیدار تھیں وہ روٹیاں اور وہ دال۔ کھانا کھا کر میں نے بچے سے کہا "جیتے رہو بیٹا" اور محبت سے اس کے ننھے ہاتھ کو چھوا۔ تو وہ بولا "ارے تمہیں تو بخار ہے چلو میرے ابا کے پاس چلو وہ حکیم ہیں تمہیں دوا دیں گے تو تم فوراً اچھے ہو جاؤ گے"......

"ہاں تو وہ مجھے اپنے گھر لے آیا۔ حکیم جی بے چارے بڑے نیک آدمی تھے۔ پانچ وقت نماز پڑھتے اور کتنے ہی آدمیوں کا ہر روز مفت علاج کرتے۔ دوا اپنے پاس سے بلا قیمت دیتے۔ انہوں نے مجھے بھی دوا دی۔ میرا بخار اتار دیا پر میری کھوئی ہوئی یادداشت واپس نہ لا سکے۔ میں نے انھیں اپنا پورا حال بتا دیا تھا۔ حکیم جی ہی سے میں نے ایک دن کہا "ممکن ہے اصل میں میں ہندو ہی ہوں۔ آپ کہیں تو آپ کے گھر سے کہیں چلا جاؤں" وہ بولے "ہندو ہے تو کیا ہوا خدا کا بندہ تو ہے"......

"اور پھر ایک [illegible]

کھانا کھلانے گیا تو شام تک واپس نہ آیا رات کو پتہ چلا کہ واپسی میں دیسے سے ہو کر آ رہا تھا کہ ہندوؤں نے قتل کر ڈالا۔ گھر میں کہرام مچ گیا حکیم جی کی بیوی کو غشی کے دورے پڑنے لگے۔ اب میرے لئے اس گھر میں رہنا بھی مشکل ہو گیا۔ ہر وقت مجھے یہی خیال کھائے جاتا کون جانے شاید میں ہندو ہوں، شاید میں نے بھی حکیم جی کے بچوں کی طرح اور مسلمان بچوں کو قتل کیا ہو۔ آخر کار میں وہاں سے بھی بھاگ نکلا۔

اب دہلی میں چاروں طرف قتل عام ہو رہا تھا گولیوں کی بارش ہو رہی تھی۔ بچتا بچاتا اسٹیشن پہنچا۔ سنا تھا بمبئی میں کسی قدر امن ہے بمبئی کی ریل میں بیٹھ گیا۔ برابر میں ایک ہندو نوجوان بیٹھا تھا۔ گاڑی چلی تو وہ بولا تم کون ہو بھائی؟ میں نے کہا کہ مجھے یاد نہیں کون ہوں۔ شاید ہندو ہوں شاید مسلمان۔ اس نے کہا سنا ہے راستے میں مسلمان مسافروں پر بہت ظلم کیا جا رہا ہے تمہارے چہرے پر ڈاڑھی ہے اس لئے پوچھتا ہوں۔ میں نے اپنا پورا حال بتا دیا۔ پر اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ اسے یقین نہیں آیا اور وہ میری بڑھی ہوئی ڈاڑھی کو شبہ کی نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے بتایا کہ اس کی بہت بڑی دوکان تھی لاہور میں۔ جو ساری لٹ گئی۔ کتنے ہی رشتہ دار مارے گئے۔ کتنے لاپتہ تھے۔ اب وہ ریلیف کیمپ سے تھوڑا کرایہ لے کر بمبئی میں قسمت آزمائی کرنے جا رہا ہے۔ ہاں تو پھر تھوڑی دیر میں لائن کے پاس پتھر رکھ کر گاڑی روک لی گئی۔ درجے سے مسلمان مسافروں کو گھسیٹ گھسیٹ کر نکالا گیا۔ ہمارے درجے میں بھی قاتل گھس آئے۔ مگر میرے نوجوان ساتھی نے مجھے چادر سے ڈھانک دیا۔ جب انہوں نے پوچھا یہ کون ہے تو اس نے کہہ دیا یہ تو میرا بھائی ہے بیچارہ پہلے ہی لاہور میں زخمی ہو چکا ہے، وہ چلے گئے۔ گولیاں چلنے کی آواز آئی۔ چیخیں اور ٹرین پھر روانہ ہو گئی۔ اور میں بمبئی پہونچ گیا۔ یہاں بھی اس جان لیوا سوال نے میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ ہندو ہو؟ مسلمان ہو؟ اور میں سوچتا ہندو کون ہے؟ مسلمان کون ہے؟ سکھ کون ہے؟ ہندو وہ نوجوان ہے جس نے ایک ڈاڑھی والے کی جان بچائی جس کو وہ مسلمان سمجھتا تھا۔ یا وہ درندے قاتل جنہوں نے حکیم جی کے معصوم بچے کو ذبح کر ڈالا؟ مسلمان حکیم جی ہیں یا وہ سب جنہوں نے راولپنڈی میں سردار جی کے رشتے داروں کو قتل اور ان کی عورتوں کو بے عزت کر ڈالا؟ سکھ سردار جی ہیں یا وہ سورما جنہوں نے امرتسر میں سینکڑوں مسلمانوں کو گھروں میں بھون ڈالا؟

پھر بھی وہی سوال ہندو ہو؟ مسلمان ہو؟

ایک سوال تم کون ہو؟ تم ہندو ہو؟ تم مسلمان ہو؟

یہ سوال میرے دماغ میں ہر وقت گونجتے رہتے۔ میں کون ہوں؟ میں کون ہوں؟ ہندو ہوں؟ مسلمان ہوں؟ سکھ ہوں؟ میں کون ہوں؟ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے یہ سوال میرا پیچھا کرتا۔ خواب میں مجھے دہکتے ہوئے انگاروں جیسی آنکھوں والے بھوت گھیر لیتے اور آگ میں تپے ہوئے بھالے مار مار کر پوچھتے تو کون ہے؟ بول تو ہندو ہے یا مسلمان؟ اور میں نیند میں چلا اٹھتا مجھے نہیں معلوم میں کون ہوں۔ مجھے چھوڑ دو۔ میں کچھ نہیں ہوں۔ میں صرف ایک انسان ہوں۔

بمبئی میں پنجاب سے آئے ہوئے لوگوں کے لئے بڑے بڑے کیمپ کھلے تھے۔ سکھ ہو تو خالصہ کالج جاؤ۔ ہندو ہو تو راما کرشنا آشرم میں پناہ لو۔ مسلمان ہو تو بھنڈی بازار میں مسلم لیگ کے دفتر کا رخ کرو۔ پر میں کہاں جاؤں؟ میں ہر جگہ سے دھتکار دیا گیا تھا۔ میں جس کو نہیں معلوم کہ میں کون ہوں۔

بھیک کے ٹکڑے ملنے بھی بند ہو گئے۔ ہندو ہو یا مسلمان ہر ایک بھیک دینے سے پہلے پوچھتا تھا تم کون ہو؟ فاقوں کی نوبت آ گئی۔ میں بھوکا مرنے لگا۔ ایک آسیبی بگولے کی طرح یہ سوال میرے دماغ پر چھا گیا۔ میں کون ہوں؟ میں کون ہوں؟ ہندو یا مسلمان؟ مسلمان یا ہندو؟ جب تک اس سوال کا جواب نہ ملے جینا ناممکن تھا۔

" ایک شریف آدمی نے کہا ڈاکٹر سانی کے پاس جاؤ وہی تمہاری یاد واپس لا سکتا ہے۔ ڈاکٹر سانی کا نام تو تم نے سنا ہوگا۔ وہ دماغی مرضوں کے علاج کا ماہر ہے۔ وہ چیر پھاڑ سے نہیں باتوں سے دماغی خرابیوں کا علاج کرتا ہے۔

" مجھے ایک خاندار کمرے میں ایک نرم کوچ پر لٹا دیا گیا۔ اوپر بڑی طاقت کا لیمپ روشن تھا چاروں طرف ہر چیز سفید۔ دیواریں اجلایاں۔ ڈاکٹر کوٹ۔ نرس کی یونی فارم۔

ڈاکٹر نے نرمی سے کہا آنکھیں بند کر لو۔ دماغ پر زور نہ ڈالو۔ ڈھیلا چھوڑ دو۔ پھر جو کچھ بھی تمہیں یاد آئے وہ بولتے رہو خواہ کتنا ہی

بے معنی اور بے کار خیال کیوں نہ ہو۔ یہ کہہ کر وہ کاغذ پنسل لے کر قریب بیٹھ گیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں . . . . . میں نے کہنا شروع کیا۔

سر سبز لہلہاتے کھیت۔ دور تک پھیلے ہوئے۔ نیلا آسمان۔ 'شاباش شاباش' ڈاکٹر بولا اور کاغذ پہ پنسل چلنے کی آواز آئی۔ 'بولتے رہو' اور میں بولتا گیا۔ 'نیلا آسمان ۔ ایک دریا۔ برسات میں پانی چڑھا ہوا۔ دریا میں کشتیاں . . . ایک نہر . . . نہر میں بچے نہاتے ہوئے۔ ان بچوں میں میں بھی . . . . شاباش، شاباش' ڈاکٹر کی آواز جیسے دور بہت دور سے آئی۔

'کھیت میں فصل کٹی ہوئی۔ سنہری گیہوں کا ایک ڈھیر۔ بہت بڑا ڈھیر۔ آسمان تک۔ ۔ بیساکھی کا میلہ . . . . . دور کوئی بنسری بجا رہا ہے۔ ۔ ڈھولک کی آواز قریب ہوتی جا رہی ہے۔ نیم کے تلے عورتیں بیٹھی گیت گا رہی ہیں۔ ۔ ۔ شاباش، ڈاکٹر بولا، کونسا گیت گا رہی ہیں۔

میں نے اسے بتایا: 'او جدوں ماہی یاد آوے ہائے ہائے جن دی صنجو ڈل ڈل پینیدے نے'

یہ گیت ہندو عورتیں گاتی ہیں یا مسلمان عورتیں؟ پنجابی عورتیں گاتی ہیں۔ دیکھو وہ سب مل کر انترہ اٹھا رہی ہیں'۔ یہ عورتیں کون ہیں ہندو یا مسلمان؟' پنجابی۔ ہندو بھی مسلمان بھی۔

ڈاکٹر کے بھاری سانس کی آواز آئی جیسے اس جواب سے اس کا بنا بنایا کام بگڑ گیا ہو۔ 'شاباش بولے جاؤ جو کچھ بھی یاد آئے۔

ایک بہت بڑا باغ۔ میلہ سا لگا ہوا۔ رنگین شلواریں اور قمیضیں دوپٹے ہوا میں لہراتے ہوئے۔ چنچل لڑکیوں کے قہقہے۔ ۔ بچوں کا شور۔'

'شاباش۔ شاباش۔ بولے جاؤ۔ خاموش کیوں ہو گئے۔

'اب کچھ نہیں سنائی دیتا کچھ نہیں دکھائی دیتا۔

'کیوں کیا ہوا،

'میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا ہے میرے کانوں میں ایک عجیب سا شور۔ شاباش شاباش۔ آگ لگ رہی ہے ہر طرف شعلے ہی شعلے۔ شور بڑھتا جا رہا ہے۔ شاباش یہ فسادیوں کا شور ہے یہ وہی لوگ ہیں جن کے ظلم نے تمہارے گھر بار کو تباہ کر ڈالا۔ تمہارے عزیزوں کا خون کر ڈالا۔ تمہارے دماغ کے توازن کو ہلا ڈالا۔ سنو غور سے سنو۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں . . . . 'کچھ سنائی نہیں دیتا۔ شور بہت ہے بس ایک لفظ سمجھ میں آتا ہے۔ مارو! مارو! مارو!! مجھے بچاؤ ڈاکٹر صاحب۔'

'گھبراؤ نہیں۔ پھر غور سے سنو۔ یہ لوگ جو آگ لگا رہے ہیں شور مچا رہے ہیں۔ یہ ہندو ہیں یا مسلمان۔ ابھی پتہ لگ جاتا ہے تم کون ہو'۔

اور میرے دماغ میں جیسے خطرے کی گھنٹی بجی۔ ابھی معلوم ہو جائیگا میں کون ہوں! ابھی معلوم ہو جائے گا میں کون ہوں' میں مسلمان ہوں۔ میں نے سردار جی کے گھر والوں کا ہزاروں بے گناہ سکھوں اور ہندوؤں کا خون کیا ہے۔

'میں ہندو ہوں۔ میں نے حکیم جی کے بچے اور سینکڑوں معصوم مسلمان بچوں کو قتل کیا ہے۔

نہیں! نہیں!!' میں چلایا۔ میں نہیں معلوم کرنا چاہتا میں کون ہوں۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ ڈاکٹر کی نرم آواز کے جادو کو توڑ ڈالا میں کوچ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں ڈاکٹر کو حیران و پریشان چھوڑ کر چلا گیا۔

'میں ہندو ہوں۔ میں مسلمان ہوں۔ میں مسلمان ہوں۔ میں ہندو ہوں۔ میں کیا ہوں؟ میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ میں مسلمان ہوں میں ہندو ہوں' راستے بھر میرے کانوں میں یہ آوازیں آتی رہیں۔

'نہ جانے میں کس راستے۔ کس علاقے سے ہو کر چلا جا رہا تھا کہ کسی نے ٹوکا۔ اے کدھر جاتا ہے؟ کون ہے تو؟' وہ ایک مسلمان مولوی تھا۔ اس کی آنکھوں میں خون، اس کے ہاتھ میں چھرا تھا۔ میں نے اس کا سوال سنا مگر سمجھا نہیں۔ اس کی طرف ایک نظر دیکھ کر پھر اپنے راستے چل پڑا۔ میں اپنی دھن میں ایک ایک جز بڑبڑائے جا رہا تھا: میں ہندو ہوں، میں؟ . . . . .'

ابھی میں: 'میں مسلمان ہوں' نہ کہہ پایا تھا کہ اس کا چھرا میری کمر میں پیوست ہو گیا۔ یہی لگا جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ نہ فکر کیجیے، میں بچ گیا گرتے گرتے سنبھل گیا۔ چلتا ہی رہا گو میرے پیچھے خون کی ایک گہری لکیر سڑک پہ پھیلتی جا رہی تھی تمہیں یقین نہیں آتا؟ میں مر رہا ہوں مجھے تم سے سچائی کا سرٹیفکیٹ نہیں چاہیے۔

'ہاں تو میں گرتا پڑتا کسی اور سڑک پہ نکل گیا۔ اس بار ایک

ہندو قاتل نے مجھے روکا۔ "اے کون ہے تو؟" "میں مسلمان ہوں۔ میں ہندو —" اور ابھی ہندو نہ کہہ پایا تھا کہ اس کی تیز دھار والی کٹاری نے میرا پیٹ چاک کر ڈالا۔

"تو یوں یہ دونوں گھاؤ لگائے ہیں میں نے۔ مجھے ہندو مسلمان دونوں نے مارا ہے جبھی تو میں کہتا ہوں ڈاکٹر صاحب تم مجھے نہیں بچا سکتے اور نہ تم سب بچا سکتے ہو تم جو میرے مرنے کی راہ دیکھ رہے ہو۔ اور یہ بھی بات یہ ہے کہ تم لوگ مجھے بچانا چاہتے ہی نہیں۔ اگر میں مرتے مرتے کہہ دوں کہ میں ہندو ہوں تو یہ ہندو ویر فوراً میرے بدلے چار مسلمانوں کو قتل کرنے کا بیڑا اٹھا لیں گے۔ اور اگر کہوں کہ میں مسلمان ہوں تو یہ مسلمان مجاہد پوری ہندو قوم سے میرا انتقام لینے کو تیار رہیں۔ اور میں ہنس رہا ہوں کیونکہ مجھے یاد آگیا ہے کہ میں کون ہوں۔ اپنی بیوی کی آنکھیں، اپنے بچے کی باتیں، اپنا کھیت۔ اپنا گھر بار جو جل چکا ہے مجھے سب یاد آگیا ہے۔

اب جب میں مر رہا ہوں تم سب بے کار انتظار کر رہے ہو میری زبان سے ہرگز نہ نکلے گا کہ میں ہندو ہوں یا مسلمان۔ نہ میرے ہندو قاتل کو معلوم ہوگا نہ مسلمان قاتل کو کہ ان میں سے کس نے غلطی سے اپنی ہی قوم کے آدمی کو مار ڈالا۔ ان سے یہی میرا انتقام ہے۔ ان سے ہی نہیں۔ ان جیسے ہزاروں ہندوؤں مسلمانوں اور سکھوں سے جنہوں نے میرے وطن پنجاب کو ملیا میٹ کر ڈالا۔ میرے بوڑھے مادرِ وطن کے سفید بالوں میں خون کی مہندی مل دی۔ میں ہندو تھا یا مسلمان۔ مسلمان تھا یا ہندو؟ یہ سوال ایک بھوت بن کر ان کے دماغوں پر منڈلاتا رہے گا۔ یہ سوال ان کے دن کا آرام، راتوں کی نیند اڑا دے گا۔ یہ سوال ان کو، ان کی اولاد کو، ان کی آنے والی نسلوں کو کبھی چین سے نہ بیٹھنے دے گا۔

میرا انتقام بہت خوفناک ہوگا۔۔۔ جاؤ بھائی جاؤ اپنا کام کرو۔ میرے مرنے کا انتظار کب تک کرو گے۔ میں تو دیر کا مر چکا ہوں یقین نہیں آتا تو سامنے والے ڈاکٹر کو بلا کر معائنہ کرا لو۔ اب تو میری لاش بھی ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ میں کبھی نہیں مروں گا۔

مطلب بھی جاننا چاہتے ہو کہ میں کیوں ہنس رہا ہوں؟۔۔۔

وشوامتر عادل

نیند سے پہلے

آخر پلکوں کے دروازے بند ہوئے
لو پھر لمحے آئے بیتے ماضی کے
رو پہلے — مرجھائے۔
غم کی ظلمت نے پَر جھٹکے۔ غم کی ظلمت پاس نہیں۔
ہر جانب خاموشی ہے
ان لمحوں نے چھیڑ دیا ہے دل کا ساز
جس کے نغمے بے معنی ہیں، جس کے نغمے بے آواز —
دور سہانی وادی میں
نرم کثیف پھسلتے بادل چھائے ہیں۔
ہلکی پھلکی دُھنکی دُھنکی برف کے گالے گرتے ہیں
گرتے گرتے گر یہ سوچیں "آؤ، پل بھر رُک جائیں"
رُک جانے سے پہلے ہی لیکن پھر نیچے گر جائیں
تب خاموش فضا کے ہونٹوں پر اک نغمہ سی ناچے گی
ایسے ہی
ان لمحوں نے چھیڑ دیا ہے دل کا ساز
جس کے نغمے بے معنی ہیں جس کے نغمے بے آواز —
سو جانے سے پہلے میں ان نغموں ہی کے تاگوں سے
اپنے سپنوں کی اُوشا کا رنگیں آنچل بُنتا ہوں
ہر جانب خاموشی ہے۔
خاموشی!
تنہائی!
کس کی آہٹ سنتا ہوں؟
چوم رہے ہیں میرے ہونٹوں کو یہ کس کے نازک ہونٹ؟

علی سردار جعفری

اقبال کی آواز

"پشکن کے کلام سے ہمیں وہ تمام چیزیں الگ کر دینی چاہئیں جو معمولی ہیں، جو اس کے زمانے کے حالات اور ذاتی موروثی خصوصیات کا نتیجہ ہیں، جو امرا کے طبقے سے آئی ہیں اور غیر ضروری ہیں۔ وہ نہ ہماری ہیں اور نہ ہمیں ان کی کوئی حاجت ہے۔ جب ہم ان تمام چیزوں کو الگ کر دیں گے تو پشکن ایک عظیم المرتبت عوامی شاعر کی شکل میں جلوہ گر ہوگا..... جو روس کے عظیم الشان ادب کا بانی ہے۔"

میکسم گورکی

"طالسطائی کے نظریات اور تعلیمات میں جو تضاد ہے وہ اتفاقی نہیں بلکہ روسی زندگی کے تضاد کا اظہار ہے ..... طالسطائی جب پیغمبر بن کے سامنے آتا ہے تو مضحکہ خیز ہو جاتا ہے اس لئے ان لوگوں کی کوششیں بڑی حقیر ہیں جو طالسطائی کی تعلیمات کی کمزوریوں کو بڑے بڑے اصول بنا کر پیش کرنا چاہتے ہیں۔ طالسطائی کی عظمت اس میں ہے کہ وہ ان خیالات اور احساسات کا اظہار کرتا ہے جو روس میں بورژوا انقلاب کے وقت لاکھوں کسانوں کے دل میں موجزن تھے۔"

لینن

پشکن اور طالسطائی کی طرح اقبال کے کلام میں بھی تضاد پایا جاتا ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اس سے اقبال کی عظمت میں کوئی بٹہ نہیں لگتا۔ خود ہماری قومی زندگی اور سیاسی تحریکوں کے اندر تضاد موجود ہے اور یہی تضاد ہے جو اقبال کی شاعری میں جھلک رہا ہے۔

اقبال کی تیز نگاہ صرف ان کے توہمات ہی میں الجھ کر نہیں رہ گئی بلکہ دل وجود کو چیر کر بھی گذری ہے۔ ان کی شاعری میں مابعد الطبیعاتی تصورات کے ساتھ عالم آب و گل کے خوبصورت نقوش بھی ہیں: "اندیشہ ہائے افلاکی" کے ساتھ ساتھ "زمین کے ہنگامے" بھی ہیں۔ تجدید مذہب کے ساتھ ساتھ سماجی اصلاح کا رجحان بھی ہے۔ ذاتی روحانی پاکیزگی کے ساتھ ساتھ سیاسی انقلاب کا پیام بھی ہے۔ انسان کامل کے انفرادی تصور کے ساتھ ساتھ "سلطانی جمہور" کا جاں فزا نغمہ بھی ہے۔ خود فلسفۂ خودی میں روحانی ماورائیت ہی نہیں بلکہ اجتماعی قومی بیداری کا احساس بھی کروٹیں لے رہا ہے۔ اقبال کا انسان مخلوق ہی نہیں خالق بھی ہے۔ وہ اہرمن و یزداں کا سادہ لوح شکار ہی نہیں بلکہ جبریل و یزداں کا شکاری بھی ہے۔ وہ باشعور اور باعمل ہستی ہے جو اپنی انسانی قوتوں سے دنیا اور زمانے کو بدل سکتا ہے۔ یہ آسمان کا "ابلۂ جنت" زمین کا "دانائے کار" ہے۔

مختصر یہ کہ اقبال انسانی عظمت کا شاعر ہے اور یہی سب سے بڑا سرمایہ ہے جو ہمیں ورثے میں ملا ہے۔

اقبال نے اردو شاعری کو تین ایسے نئے تصور عطا کئے ہیں جنہوں نے ہندوستانی زندگی میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ حرکت، تغیر اور ارتقا تینوں نئے تصور ہیں جو اقبال کی بدولت آج اردو شاعری میں عام ہو گئے ہیں۔ ہماری شاعری اقبال سے پہلے ان تینوں تصورات سے تقریباً خالی تھی۔ صرف حالی کے یہاں ان کے ابتدائی نقوش ابھر رہے تھے۔

زندگی میں مجموعی حیثیت سے جب نیا پن آتا ہے تو نئے خیالات بھی پیدا ہوتے ہیں جو بعد کو خود بھی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں، خیالات، تصورات اور مضامین آسمان سے نازل نہیں ہوتے۔ نئے خیالات اور تصورات نئے زمانے کی فضا میں تیرتے رہتے ہیں اور اچھا اور بڑا شاعر ان کو اپنی شاعرانہ قوتوں کے ذریعے الفاظ کے سانچے میں ڈھال لیتا ہے۔ خیالات اور تصورات حقائق کا

شاعروں میں کھلنے والے پھول ہیں جن کی پنکھڑیوں میں نئی حقیقتوں کے بیج پوشیدہ ہوتے ہیں۔

حرکت، تغیر اور ارتقا میسوں بنیادی طور سے سماجی تصورات ہیں۔ جو شاعر زندگی کی حقیقتوں سے دور ہو کر ہوائی اور آسمانی ہو جاتے ہیں اور جن کے قدم زمین سے اکھڑ جاتے ہیں وہ کبھی ان صالح اور بالغ تصورات کا ادراک نہیں کر سکتے۔

اردو کی پرانی شاعری ان تصورات سے اس لئے خالی تھی کہ وہ ایسے سماج میں پروان چڑھی جو ٹھہرے ہوئے بند پانی کی طرح تھا اور اس میں ہلکی سی لہر بھی بڑی مشکل سے پیدا ہوتی تھی۔ پورا ہندوستان اور ایشیا صدیوں سے گہری نیند سو رہا تھا۔ ہندوستان کو گوتم بدھ کے بعد کسی نے نہیں جگایا تھا اور ایشیا کی روح میں بانیٔ اسلام کے بعد کسی نے اضطراب نہیں پیدا کیا تھا۔ سماج کا ایک پرانا ڈھانچہ، ایک پرانا نظام تھا جس میں سیکڑوں برس سے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ زندگی ایک ہی ڈھرے پر چل رہی تھی جس میں روز بروز گھن لگتا جاتا تھا۔

پورا ملک چھوٹے چھوٹے گاؤں اور قصبوں پر مشتمل تھا۔ ہر بستی اپنی ضروریات کا سامان خود پیدا کر لیتی تھی۔ باہر سے کچھ نہیں آتا تھا۔ آبادی ان طبقوں میں بٹی ہوئی تھی جنہیں ذاتیں کہتے تھے اور ہر ذات کے آدمی نسلاً بعد نسلٍ ایک ہی پیشے میں لگے رہتے تھے۔ کسان اناج پیدا کرتا تھا۔ اور پارچہ باف کپڑا بنتا تھا۔ لوہار لوہے کا سامان تیار کرتا تھا اور بڑھئی لکڑی کا۔ کھیتوں میں تین چار ہزار برس پرانا لکڑی کا ہل چلتا تھا اور گھروں میں چرخے اور کرگھے۔ بیل اور گدھے باربرداری کے لئے اور اونٹ گھوڑے اور ہاتھی سواری کے لئے استعمال ہوتے تھے۔ دنیا کا افق گاؤں کے گرد ختم ہو جاتا تھا۔

درۂ خیبر اور سمندر سے ہو کر فاتح اور ان کے لشکر ہندوستان آتے رہتے تھے۔ سیاست کی فضا میں طوفان اٹھتے تھے، گرد و غبار پیدا ہوتا تھا اور پھر مطلع صاف ہو جاتا تھا۔ ملک کے معاشی اور سماجی نظام پر اس سیاسی اتار چڑھاؤ کا کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ مغل بادشاہوں کی طرح جو فاتح یہاں آ کر بس گئے تھے انھوں نے بھی یہاں کے معاشی نظام کی بنیادوں ہل اور کرگھے میں اور طریق پیداوار میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی، اور گاؤں کو بدستور اس کی پرانی حالت پر چھوڑ دیا تھا۔ ذات پات کے بیہودہ امتیازات سے گھبرا کر ہزاروں اور لاکھوں آدمی مسلمان ہو گئے لیکن ان کے آبائی پیشے میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس لئے یہاں اگر کوئی تبدیلی ہوئی تھی تو وہ بادشاہوں کی جن کے قصیدے درباروں میں پڑھے جاتے تھے۔ عام زندگی نہیں بدلتی تھی۔ معیشت نہیں بدلتی تھی۔ ہمایوں کی جگہ شیر شاہ سوری تخت پر بیٹھ جائے یا شیر شاہ کی جگہ پھر ہمایوں یا اکبر آ جائے، چاہے تیمور حملہ کرے، چاہے نادر اور محمود، چاہے چنگیز خاں، لیکن کھیتوں میں وہی لکڑی کا ہل چلتا رہتا تھا اور پارچہ بافوں کے گھر میں وہی کرگھا۔ کسان کا بیٹا عالم فاضل نہیں ہو سکتا تھا اور سپاہی کا بیٹا کپڑا نہیں بن سکتا تھا۔ جو باپ دادا کرتے آئے تھے وہی بیٹوں اور پوتوں کا بھی مقدر تھا۔ جب وہ سماجی مظالم سے گھبرا جاتے تھے تو پورے پورے خاندان اپنا مذہب بدل لیتے تھے۔ لیکن کام وہی کرتے تھے جو باپ دادا کرتے آئے تھے۔ طریق پیداوار اور حالات پیداوار میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔ اس لئے ہر چیز ٹھہری ہوئی تھی۔ زندگی چیونٹی کی طرح رینگ رہی تھی اور کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ

"دگرگوں ہے جہاں تاروں کی گردش تیز ہے ساقی"

نہ لباس میں کوئی تبدیلی ہوتی تھی نہ چال ڈھال میں۔ نہ کھانے پینے میں۔ عادات و اطوار ہی میں نہیں بلکہ ادب میں بھی وضعداری کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ خیالات اور تصورات میں بھی وہی یکسانیت تھی۔ دنیا فانی ہے، زمانہ بے وفا ہے، زندگی ایک کارواں ہے اور اس کی اصل منزل دوسری دنیا ہے جو موت کے بعد شروع ہو گی۔ یہ دنیا ایک سرائے ہے اور مظاہر فطرت صرف مایا جال ہیں۔ اس طرح کے پوچ خیالات کو ابدی صداقت کا نام دے دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ ؎

یہیں بہشت بھی ہے حور و جبرئیل بھی ہے
تری نگہ میں ابھی شوخیٔ نظارہ نہیں

یہاں تو محبت پائیدار نہیں ہوتی تھی کیونکہ معشوق باوفا نہیں ہوتا تھا لیکن عاشق کے مرنے کے بعد اس کی قبر پر جاتا تھا۔ وصال سے

زیادہ مزا افراق میں تھا اور محبوب سے زیادہ اہم رقیب کا کردار تھا غرض شاعری کا ایک ڈھرّا تھا جس سے سرمو کوئی اختلاف نہیں کرسکتا تھا۔ بندھے ٹکے اصول تھے اور جب ان اصولوں سے دم گھٹنے لگتا تھا تو زاہد اور محتسب پر پھبتیاں کس دی جاتی تھیں اور شیخ جی کی پگڑی اچھال دیتے تھے کبھی کبھی کوئی سرپھرا شاعر غالب کی طرح چیخ اٹھتا تھا ؎

بقدرِ ذوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

لیکن اسے بھی یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ وسعت کہاں سے پیدا ہوگی اور وہ پھر اس پرانی لکیر کو پیٹنے لگتا تھا۔ اس لئے غزلیں اور ان کی بحریں بحوں کے ارکان، ردیف اور قافیئے تشبیہ اور استعارے سب پرانے تھے صرف ان کے باندھنے کا ڈھنگ نیا ہوتا تھا اور اسی پر داد سخن ملتی تھی ـــ "تحسین ناشناس و سکوت سخن شناس" شعر کی کسوٹی تھی۔ کیونکہ سخن شناسی صرف تشبیہوں، استعاروں اور تلمیحات سے واقفیت تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ ہر معشوق کی آنکھ نرگس ہوتی تھی، زلف سنبل اور زبان سوسن، ہر نگاہ تیر ہوتی تھی اور ہر ابرو کمان۔ ہر عاشق مجنوں اور فرہاد کا ہمسر ہوتا تھا اور ہر دل میں لالے کی طرح داغ پڑتے تھے۔ جو کوئی اس سے ذرا بھی انحراف کرتا تھا (حالانکہ انحراف کا مطلب تھا زندگی اور اس کے حقائق کا احتراف) اسے شاعر تسلیم کرنے ہی سے انکار کر دیا جاتا تھا۔ (اس کی بڑی اچھی مثال نظیر اکبرآبادی ہیں اور اقبال بھی جن کی شاعری کا لکھنؤ کے پرانی وضع کے لوگوں نے مذاق اڑایا)۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے شاعر سینکڑوں سال سے اپنے گریبان چاک کر رہے ہیں اور دردِ دل کا رونا رو رہے ہیں۔

اس شاعری نے لکھنؤ کے درباری انحطاط کے زمانے میں سب سے زیادہ فروغ حاصل کیا اور رسم پرستی فن کا معیار بن گئی اور غزل رعایت لفظی کے ساتھ اس کا اعلیٰ ترین نمونہ۔ باقی اصناف سخن مثلاً مثنوی وغیرہ جن میں خارجی حقائق کی جھلک ہوتی تھی اور زندگی کی تپش وہ اس مسند پر نہیں بیٹھ سکتی تھیں جس پر غزل اپنی ساری روایتی شان و شوکت، نزاکت اور لطافت کے ساتھ جلوہ فگن تھی۔ اور اب بھی غزل کے مارے ہوئے لوگوں کی نظروں میں اچھی شاعری نہیں جچتی۔

لیکن جب انیسویں صدی میں کرگھے ٹوٹ گئے اور ڈھاکے کی ململ اور تن زیب کی جگہ ولائتی کپڑا آنے لگا، ملک میں مشینیں چلنے لگیں، زمین کے سینے پر لوہے کی پٹریاں بچھ گئیں (اور غالب ریل میں بیٹھ کر کلکتے گئے)، تو ایشیا اور ہندوستان کے پرانے سماج نے اپنا چولا بدلا۔ جب زندگی بدلی تو خیالات کی تبدیلی بھی ناگزیر تھی اور روائتی مسائل کی جگہ حقیقی مسائل نے لے لی۔ غالب پہلا شاعر تھا جس نے کہا ؎

ہندوستان سایۂ گل پائے تخت تھا
جاہ و جلالِ عہدِ وصالِ بتاں نہ پوچھ

غالب کے بعد حالی نے شاعری کے پرانے انداز کو بالکل بدل دیا اور نظمیں کہنے کی طرح ڈالی۔ اب مشاعروں میں مصرعۂ طرح نہیں دیا جاتا تھا بلکہ موضوع یا نظم کا عنوان جو زیادہ تر قومی یا سماجی ہوتا تھا۔ مصرعۂ طرح لفظی گورکھ دھندے کی دعوت دیا کرتا تھا۔ دامن کے ساتھ گریبان، طور کے ساتھ موسیٰ، شمع کے ساتھ پروانہ، یہ لگے لپٹے الفاظ تھے لیکن موضوع سخن اور نظم کے عنوان نے خیالات کے جوہر دکھانے کا موقع دیا۔ خوردہ اندیشی کی جگہ سنجیدہ تفکر نے لے لی۔

مقدمۂ شعر و شاعری میں حالی نے شعر کی نئی کسوٹی بنائی اور مسدس مد و جزر اسلام لکھ کر شاعری کے لئے ایک نئی شاہراہ کھول دی۔ اقبال اس شاہراہ پر ادب کے قافلے کو لے کر آگے بڑھ گیا۔

اب پوری زندگی میں ایک ابال تھا۔ زمین پر ایک ہنگامہ برپا تھا۔ زمانہ بڑی تیزی سے بدل رہا تھا۔ صدیوں کی سوئی ہوئی سرزمینوں پر نیا قومی احساس بیدار ہو رہا تھا۔ پرانی معاشی بندشیں ٹوٹ رہی تھیں سیاسی اتار چڑھاؤ میں سمندر کے مد و جزر کی سی کیفیت تھی۔ جمال الدین افغانی، سر سید احمد خاں اور حالی کی جگہ زاغلول پاشا، کمال اتاترک، مولانا محمد علی، ابوالکلام آزاد اور اقبال لے رہے تھے اور پورا ایشیا یورپ کی غلامی کی زنجیریں توڑنے کے لئے بے تاب تھا۔ ترکی، مصر، ایران، ہندوستان، چین، ہر جگہ نئی بیداری کے آثار نمایاں تھے ؎

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا
سفینۂ برگِ گل بنا لے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر وہ دریا کے پار ہوگا

میں ظلمت شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری نفس مرا شعلہ بار ہوگا

جب اقبال نے یہ شعر کہا کہ ؎

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں

تو زندگی واقعی بدل چکی تھی ؎

فریب نظر ہے سکون و ثبات   تڑپتا ہے ہر ذرّہ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروان وجود   کہ ہر لحظہ تازہ ہے شان وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی   فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

حرکت کا یہ تصور اردو شاعری میں بالکل نیا تھا اور اس تصور سے پیدا ہونے والی اقبال کی شاعری میں زندگی کی بے پناہ قوت تخیل کی بے انتہا بلندی اور جوشِ نمو کی لطیف تازگی تھی۔

حرکت ہی سے تغیر کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ تغیر بغیر حرکت کے ناممکن ہے۔

ایشیا کی قومی تحریکوں کی حرکت سے اقبال کی نظروں کے سامنے ایک دنیا بدل رہی تھی۔ ایشیا کا خرقۂ دیرینہ چاک ہو رہا تھا اور مشرق نیا لباس زیب تن کر رہا تھا۔ مغربی سرمایہ دار شہنشاہیت نے جو غلامی کا جال انسانیت کو گرفتار کرنے کے لئے ساری دنیا میں بچھا دیا تھا وہ پرانا ہو کر کمزور پڑ گیا تھا اور جگہ جگہ سے ٹوٹنے لگا تھا۔ خود اس کے پھندوں میں پھنسے ہوئے انسانوں کی کشمکش اسے توڑ رہی تھی۔ دنیا کے ایک چھٹے حصے یعنی روس میں انقلاب ہو گیا تھا اور وہاں کا نظام حکومت کسانوں، مزدوروں اور محنت کشوں کے ہاتھ میں آگیا تھا۔ شہنشاہیت کی اس شکست اور جمہوریت کی فتح سے انسانیت کے دل میں نیا یقین، نیا اعتماد، نیا ولولہ پیدا ہو گیا تھا۔ اقبال جو شاعر کی حیثیت سے سارے بنی نوع انسان کے جذبات و احساسات کا ترجمان اور معمار تھا اس یقین اور اعتماد کے گیت گانے پر مجبور ہو گیا۔ تغیر کا یہ فلسفہ اقبال کے فلسفۂ خودی کا ایک اہم جزو بن گیا کبھی یہ نظریہ فلسفیانہ شکل میں ظاہر ہوا، کبھی فطری اور رومانی شاعری کی صورت میں اور کبھی سیاسی حقائق کے قالب میں۔ اقبال کی فطری شاعری میں بہار کی کلیاں چٹکتی ہیں، کشمیر کے پھول کھلتے ہیں، اس کی رومانی شاعری میں ساری کائنات اس کا ایک ایک ذرّہ ذوقِ نمو سے بیتاب ہے، فلسفیانہ شاعری میں رائی پربت بن رہی ہے، کوئلہ ہیرے میں تبدیل ہو رہا ہے اور سیاسی شاعری میں ذرّے ستارے اور ستارے آفتاب بن رہے ہیں ؎

نغمۂ بیداریٔ جمہور ہے سامان عیش   قصۂ خواب آورِ اسکندر و جم کب تلک
آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا   آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

اور جب سرمایہ داری اور شہنشاہیت اتنی کمزور ہوگئی کہ دنیا کے تمام غلام ملکوں میں عوام نے اس کا جنازہ نکالنے کی تیاری شروع کر دی تو اقبال نے بڑے موثر الفاظ میں اعلان کیا ؎

زمانے کے انداز بدلے گئے   نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
پرانی سیاست گری خوار ہے   زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا   تماشہ دکھا کر مداری گیا

تغیر اور تبدیلی کا احساس اردو کے پرانے شاعروں کو بھی تھا لیکن وہاں تغیر کے ساتھ قنوطیت کا تصور وابستہ تھا۔ ہر شاعر بہار کے بعد خزاں کا رونا روتا تھا لیکن خزاں کے بعد بہار کا مژدہ سنانے والا کوئی نہ تھا۔ صرف روائتی بہار آتی تھی جس میں دیوانے اپنے گریبان چاک کرتے تھے۔ دراصل وہ تغیر سے ڈرتے تھے۔ گھبراتے تھے۔ اس لئے انقلاب زمانہ اور گردش فلک سے سب شاعر پریشان رہتے تھے۔ کیونکہ عام طور سے تغیر اور انقلاب کا مطلب کسی نئے خونخوار بادشاہ کی آمد یا کسی پرانے بادشاہ کی موت یا حکومت کی تباہی ہوتا تھا یا دو بادشاہوں کی جنگ جس میں خون کی ندیاں تو بہتی تھیں لیکن زندگی کی کھیتیاں ہری نہیں ہوتی تھیں۔ گردش فلک صرف سماج کی سختیوں اور دنیا کی مصیبتوں کی علامت ہوتی تھی جس پر افراد کا کوئی قابو نہیں تھا۔

لیکن اقبال نے پہلی بار تغیر کو رجائیت کا سرچشمہ سمجھا کیونکہ اب تغیر کے معنی آزادی ہو گئے تھے۔

پرانے شاعر پھولوں کے مرجھانے پر آنسو بہاتے تھے۔ ان کی دوروزہ بہار پر کف افسوس ملتے تھے۔ اس لئے پھول دنیا کی بے ثباتی اور انسان کی فنا کی علامت بن گئے تھے۔ وہ اگر کلی کو کھلتے ہوئے بھی دیکھتے تو زیادہ خوش نہیں ہو سکتے تھے اور اس کے مرجھا جانے

کے خیال سے رو دیتے تھے ؎

کہا میں نے کتنا ہے گل کو ثبات — کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

یہ تمیر ہی کا نہیں بلکہ اس زمانے کے تمام شاعروں کا نقطۂ نگاہ تھا۔ لیکن اقبال نے کلی کا مرجھانا ہی نہیں بلکہ نئی کلی کا مسکرانا بھی دیکھا۔ اس نے زندگی کے اس تسلسل کو سمجھ لیا جس کا نام تغیر ہے ؎

گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے — اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے

اس شعر کا پہلا مصرعہ تمیر بھی کہہ سکتے تھے اور غالب بھی لیکن دوسرا مصرعہ صرف اقبال کا حصہ ہے۔

تغیر کا یہ پرکیف تصور اقبال کے پورے کلام پر حاوی ہے۔ اس میں انگریزی شہنشاہیت کا زوال اور مشرق کی بیداری اور صبح آزادی کا تصور بھی شامل ہے جسے اقبال نے نئی دنیا اور نئی زندگی سے تعبیر کیا ہے ؎

جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ہوگا یہی ہے اک حرف محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ
شفق نہیں مغربی افق پر یہ جوئے خوں ہے یہ جوئے خوں ہے
طلوع فردا کا منتظر رہ، کہ دوش و امروز ہے فسانہ
جہان نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالم پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا تھا قمار خانہ

جب پرانا عالم مر کر نیا عالم پیدا ہوتا ہے اور مرجھائی ہوئی شاخ سے نئی کلی کھلتی ہے تو زندگی ارتقا کی راہ میں ایک منزل آگے بڑھ جاتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ اقبال کے نزدیک تغیرات کی اس دنیا میں انسان کی کیا جگہ ہے؟ کیا انسان تغیرات کے ہاتھوں میں ایک بے بس کھلونا ہے؟ یہ تو پرانے شاعروں کا نظریہ تھا جو تغیرات سے گھبراتے تھے اور ہمیشہ گذرے ہوئے زمانے کو یاد کرتے تھے لیکن اقبال کا نظریہ کچھ اور ہی ہے۔ تغیر سے ترقی کی راہیں کھلتی ہیں اور انسان بلند منزل کی طرف گامزن ہوتا ہے۔ اس لئے تغیرات کی اس دنیا میں انسان بے بس نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنے شعور اور ارادے کی قوت سے ان تغیرات پر حکمرانی کر سکتا ہے اور ان کو اپنے مقصد کے مطابق ڈھال سکتا ہے ؎

گفتند جہانِ من آیا بہ تو می سازد؟
گفتم کہ نمی سازد، گفتند کہ برہم زن۔

اس طرح اقبال نے انسان کے دل میں ایک نئی اور بہتر دنیا کی تعمیر کا شوق پیدا کیا ہے۔ اس سلسلے میں اقبال کی اس نظم کا ذکر ضروری ہے جو تین مختلف بحروں میں تین حصوں پر مشتمل ہے۔ لینن خدا سے شکایت کرتا ہے کہ اس دنیا میں مساوات کی تعلیم دینے والے (سرمایہ دار) انسانوں کا لہو پی رہے ہیں اور بندۂ مزدور کے اوقات بہت تلخ ہیں۔ فرشتے "نقش گر ازل" سے کہتے ہیں کہ تیرا نقش ابھی ناتمام ہے۔ خواجگی اور بندگی، بلندی اور پستی، امیری اور غریبی کا امتیاز اور فریب ابھی باقی ہے۔ اقبال کا انسان با عمل اور خلاق فطرت لے کر پیدا ہوا ہے۔ اس نقش کی تکمیل صرف اسی کے ہاتھوں ممکن ہے کیونکہ اس کی محنت ہی کے عمل سے زندگی اور سماج کا ساز بج رہا ہے۔ اس لئے فرشتوں پر "فرمان خدا" نازل ہوتا ہے ؎

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے — کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی — اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

لیکن یہ صرف تخریب کا پروگرام نہیں ہے۔ یہ تخریب تعمیر کا پیش خیمہ ہے۔ انسان ہزاروں برس سے اس تخریب اور تعمیر میں لگا ہوا ہے۔ وہ ایک نظام کو ڈھا کر دوسرا بہتر نظام بناتا ہے ؎

ہزاراں سال با فطرت نشستم — با او پیوستم و از خود گسستم
ولیکن سرگذشتم این دو حرف است — تراشیدم، پرستیدم، شکستم

ایک ایسی قوم کو جو صدیوں سے جہالت، مفلسی، غلامی اور توہمات کی دلدل میں پڑی ہوئی سڑ رہی ہو تغیر کے اس فلسفے کی تعلیم دینے کا مطلب اس قوم کو حقیقی زندگی سے آشنا کرنا تھا۔ اور یہی اقبال کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

اقبال کے فلسفے میں مسلسل حرکت، مسلسل تغیر اور مسلسل ترقی کا نام زندگی ہے۔ ترقی کی کوئی منزل آخری منزل نہیں ہے۔ آسودگی اور اطمینان موت ہے۔ تڑپ، جستجو، آرزو، تگ و دو، حرکت اور عمل انسانیت کے جوہر ہیں ؎

چہ کنم کہ فطرتِ من بہ مقام در نہ سازد
دلِ ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے
چو نظر قرار گیرد بہ نگارِ خوب روئے
تپد آں زماں دلِ من پئے خوب تر نگارے
ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے
سرِ منزلے نہ دارم کہ بمیرم از قرارے

اس نظم میں "حور" جو شاعر کو عشق کی دعوت دیتی ہے سکون، اطمینان اور آسودگی کی حسین روح ہے اور شاعر تجسس، حرکت اور عمل کا خوبصورت پیکر۔

رموزِ بے خودی میں اقبال نے اس نکتہ پر زور دیا ہے کہ آسمان اور زمین، ہوائیں، سورج، چاند، ستارے، پھول پھل، دریا، پہاڑ، وادیاں سب انسان کے لئے ہیں۔ انسان کو ان پر قبضہ کرنا ہے یہ قبضہ ارادہ عمل اور تخلیق کی قوت سے حاصل ہوگا اور یہ وہ قوت ہے جو انسان کو اشرف المخلوقات بناتی ہے۔

اقبال کی تعلیم پر صوفیت کے فلسفے کا خول چڑھا ہوا ہے۔ لیکن ہمیں اس سے سروکار نہیں۔ جب ہم اس خول کے اندر گھستے ہیں اور الفاظ سے گزر کر معنی کی تہوں کو ٹٹولتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا ہی انسان کی سب سے بڑی جولاں گاہ ہے جہاں اس کی خودی کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس عالم آب و گل کو فتح کر کے اس کی مادی قوتوں پر قابو حاصل کرنا، یعنی انسانی زندگی کو خوبصورت اور شاندار بنانا ہی انسانی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہے یہی سب سے بڑی نیکی ہے جس میں حسن بھی ہے اور محبت بھی۔ مساوات بھی ہے اور اخوت بھی ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی   یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

اس سلسلہ میں اقبال کا یہ جملہ بھی خاص طور سے قابل غور ہے کہ "عمل ہی بہترین تفکر ہے"۔ انسان کی اس دنیا میں کیا جگہ ہے اس کو اقبال نے پانچ مصرعوں میں سمو دیا ہے ؎

خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں   آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں   جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

یہ کوششِ پیہم تخلیق کا جوہر ہے جس سے انسان کی عظمت قائم ہے۔ "فروغِ آدمِ خاکی ز تازہ کاری ہاست" اقبال کے نزدیک ہر انسان چھوٹے سے پیمانے پر ایک خالق ہے اور انسان کی تخلیقی قوتوں کو نقصان پہنچانا سب سے بڑا گناہ ہے۔"

جو نظامِ زندگی، حکومت، سماج، اور ماحول، انسان کی ترقی میں حائل ہو اور اس کو تخلیق و عمل کا موقع نہ دے برباد کر دینے کے قابل ہے اور اس کھنڈر پر زندگی کے نئے قصر کی بنیاد رکھنی چاہئے۔ اس زمانے میں انسان کی تخلیقی قوت کا سب سے بڑا دشمن سرمایہ داری اور انگریزوں کی شہنشاہی ہے جس کے خلاف اقبال نے یوں جہاد کا اعلان کیا ہے ؎

فریاد ز افرنگ و دل آویزیٔ افرنگ
فریاد ز شیرینیٔ پرویزیٔ افرنگ
عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیٔ افرنگ
معمارِ حرم باز بہ تعمیرِ جہاں خیز

تخلیق اور عمل انسان کا سب سے بڑا جوہر ہے اسی میں انسانی عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔ تخلیق کا سلسلہ نہ کبھی ختم ہوا ہے نہ کبھی ختم ہوگا۔ یہ ہمیشہ جاری رہے گا اور اس طرح انسان فطرت کے ناتمام نقوش کی تکمیل کرتا رہے گا۔

آج آزاد ہندوستان اور آزاد پاکستان میں ہمیں تخلیق اور عمل کا موقع ملا ہے۔ اقبال کا پیام ہماری ہمتوں کے لئے مہمیز ہے۔ جب ہم زندگی کی سختیوں اور کشمکش سے گھبرانے لگیں گے، اعضا تھک کر چور ہو جائیں گے اور دل بیٹھنے لگیں گے تو گذرتے ہوئے ماہ و سال کے افق کو چیرتی ہوئی اقبال کی آواز بلند ہوگی اور تھکی ہوئی روحوں کو تقویت پہونچائے گی ؎

میا را بزم بر ساحل کہ آنجا
نوائے زندگانی نرم خیز است
بہ دریا غلط و با موجش در آویز
حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

م۔ ا۔ ح

قبر کے گوشے میں

مشرقی پنجاب کی پہاڑیوں کی آغوش میں ایک چھوٹا سا شہر آباد ہے، ایک چھوٹا سا تاریخی شہر جس کی یادوں کا سلسلہ مغل شہنشاہوں کے زرّیں عہد تک پہنچتا ہے۔ میں اسی شہر میں پیدا ہوا یہیں میری ماں نے بارہا مجھے خاندانی اقبال مندیوں کی وہ داستان سنائی تھی جس میں تاریخ اور افسانہ کی عجیب و غریب آمیزش تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ کی سنی ہوئی باتیں میرے ذہن میں کچھ الجھی الجھی سی ہیں۔ پھر بھی ان باتوں کا کم سے کم ایک نقش میرے ذہن پر بہت گہرا ہے۔ میں یہ سمجھنے لگا ہوں کہ ہر انسان فطرتاً جاہ پسند ہے۔ ہر امیر کا سلسلہ آسانی سے کسی نہ کسی "عالی نسب خانوادے" سے جا ملتا ہے اور ہر غریب کو اکثر اس کے پر شکوہ ماضی کی یادوں میں پناہ مل جاتی ہے۔ جمہوریت کے اس نئے دور میں بھی حسب نسب کے حسن کی رعنائی کم نہیں ہوئی۔ اور ہماری ماں جب خاندان کی باتیں کرتیں تو ذکر چار صدی پہلے کے چتوڑ کے محاصرہ تک جا پہنچتا جس نے قلعہ کی حفاظت میں اپنی جان کی بازی لگائی تھی اور مورچہ پر اکبر کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

داستان کے اس ٹکڑے پر مجھے خیال آفرینی کا شبہ ہوتا ہے لیکن یہ بات میرے خیال سے بھی بالکل صحیح ہے کہ ہمارا خاندان اصل میں راجپوتوں کا تھا اور ہم چتوڑ سے بھاگ کر مشرقی پنجاب آئے تھے۔ پھر ہم لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا اور جہانگیر نے ہمیں جاگیر دی تھی۔ اس بات کی تصدیق کے لئے فرمان کی قسم کی ایک چیز موجود بھی ہے اور اس فرمان کی تجدید شاہجہاں اور عالمگیر نے بھی کی ہے۔ لیکن اس کے بعد سے تاریخ کے اوراق ہمارے ذکر سے خالی ہیں۔ وجہ معلوم نہیں کیا ہے، شاید اس لئے کہ اس کے بعد کے واقعات ہمارے بزرگوں کے ذہن میں محفوظ نہیں رہے یا شاید اس لئے کہ ہمارے بزرگوں میں کوئی غیر معمولی خصوصیت ایسی نہیں تھی جو ان کے نام کو زندہ رکھتی۔

لیکن تاریکی کے اس دور کے بعد پھر روشنی کا دور آیا اور مغلوں کی سلطنت کے زوال اور پنجاب میں سکھوں کے عروج نے ہمارے اسلاف میں پھر زندگی کی لہر دوڑائی۔ سکھ مسلموں کا مقابلہ کرنے والوں میں انھیں لیڈری کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سکھوں نے انھیں بری طرح کچلا اور ان کی شہرت کا ستارہ مدتوں غروب رہا، اور اسے ماضی قریب ہی میں دوبارہ ابھرنے کا موقع ملا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں ہمارے خاندان نے اپنی خدمات سکھ حکمرانوں کے آگے پیش کر دیں۔ چنانچہ میرے پردادا کے ایک بھائی ریاست کے وزیر تھے اور دوسرے خالصہ فوج میں جرنیل۔ داستان کے اس قصہ کو آپ خیال آرائی نہ جانیں۔ ان دونوں کے نام تاریخ کی کتابوں تک میں موجود ہیں۔ اور سکھوں کی لڑائیوں کے زمانے میں ہمارے گھرانے کے بہت سے لوگ سکھ فوج میں بڑے بڑے افسر تھے۔ ان میں سے اکثر چلیاں والا، علی وال اور میانی کی لڑائیوں میں لڑتے ہوئے مارے گئے اور ایک بزرگ جو سکھ فوج میں جرنیل اور شیرپور کے قلعہ کے کمانڈر تھے ایک انگریز کی گولی کا نشانہ بنے اور اس طرح خاندانی شہرت کو پھر ایک بار گھن لگنا شروع ہو گیا۔

اپنے آقا کے ساتھ وفاداری ہمیشہ راجپوتوں کے کردار کی ایک نمایاں خصوصیت رہی ہے۔ آپ چاہیں تو اسے حماقت سے تعبیر کریں لیکن ان کی پوری تاریخ ان کی اس خصوصیت کی شاہد ہے۔ نمک خواری اور اس کا پاس، پہلے مغلوں کے ساتھ، پھر سکھوں کے ساتھ اور اس کے بعد انگریزوں کے ساتھ۔ ان میں سے ہر ایک کو پہلے انھوں نے اپنا دشمن جانا اور پھر پوری وفاداری سے اس کی خدمت کی۔ یہ ہے ہمارے خاندان کی تاریخ کا خلاصہ، کبھی اتار کبھی چڑھاؤ۔ اور ہر اتار چڑھاؤ کے ساتھ ستاروں کا طلوع و غروب۔ جو ستارے سکھوں کے عہد میں ڈوب چکے تھے

ان کی یاد بہت تازہ تھی اور میرے دادا مہاراجہ رنجیت سنگھ، شیر سنگھ اور مائی جنداں کی کہانیاں ہمیں سنایا کرتے تھے۔ یہ ساری باتیں انھوں نے اپنے بچپن میں اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں۔ پنجاب انھیں کے بچپن میں انگریزوں کی حکومت میں شامل ہوا تھا۔

تاریخ میں سکھوں کے ساتھ ہمارے خاندان کو بہت قوی تعلق رہا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی یا شاید کوئی اور وجہ ہو کہ اسکول اور کالج میں سکھ ہم سبقوں کے ساتھ میرے تعلقات ہمیشہ بہت اچھے رہے بلکہ کئی سکھ تو میرے بے حد عزیز دوست ہیں۔

بات شاید ذرا لمبی ہو گئی لیکن جو کچھ میں نے اب تک کہا ہے اس سے آپ کو میری اس بات کے سمجھنے میں مدد ملے گی جو میں آگے چل کر آپ سے کہنے والا ہوں۔

ہاں! تو اس چھوٹے سے تاریخی شہر میں جس کے ذکر سے یہ بات شروع ہوئی تھی ہمارا خاندانی قبرستان بھی تھا۔ ہمارے پردادا نے جو رنجیت سنگھ کے وزیر اور ان کے بیٹے شیر سنگھ کے اتالیق تھے اس قبرستان کے چاروں طرف ایک باغیچہ لگوا دیا تھا۔ اور گو قبرستان میں کئی نسلوں سے ہمارے خاندانی بزرگ دفن ہوتے چلے آ رہے تھے لیکن ہم سب کے لئے اس کی حیثیت قبرستان کی نہیں بلکہ تفریح گاہ کی سی تھی۔ اور بچے گرمیوں میں شام کے وقت یہاں کھیلا کرتے تھے۔ پھولوں اور پھلوں سے لدے ہوئے چھوٹے بڑے درختوں اور گھاس کے ہرے بھرے تختوں سے اور رہٹ کی رومانی آواز سے فضا کی وہ افسردگی جاتی نہیں رہی تھی جو قبرستانوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ ہمیں یہ جگہ بہت پسند تھی۔ آس پاس کے گاؤں سے سکھ بچے یہاں آ کر ہمارے ساتھ کشتی لڑتے اور کبڈی کھیلا کرتے تھے۔ مجھے اب تک یہ بات اچھی طرح یاد ہے اور اس یاد سے مجھے یک گونہ مسرت بھی ہوتی ہے، کہ اکثر ان مقابلوں میں جیت ہماری ہوتی تھی۔

اس لحاظ سے کہ ہمارے شہر کی آبادی میں مسلمانوں کی کثرت تھی وہ مسلمانوں کا شہر تھا۔ باؤنڈری کمیشن کے فیصلے نے اسے ہندوستان میں شامل کر دیا اور اب یہاں نام کو بھی کوئی مسلمان نہیں۔ ہمارے گھرانے کے اقبال کا ستارہ پھر زوال میں آ گیا۔ ہم تقریباً برباد ہیں۔ ہمارے گھر، ہماری زمینیں اور ہر وہ چیز جو ہمارے پاس تھی ہم سے چھن گئی۔ اب پھر ہمیں زندگی نئے سرے سے شروع کرنی ہے۔ زندگی میں یہ اتار چڑھاؤ، یہ تبدیلیاں، یہ انقلاب۔ شاید یہ سب کچھ ہمارے ذہن اور احساس کا ایک جزو بن گیا ہے اور اس لئے اپنی اور دوسروں کی خانماں بربادی کی جو داستانیں میں نے سنیں ان کا مجھ پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ ہر ایک کی زبان سے ایک ہی داستان سنائی دیتی تھی، لاکھوں آدمیوں نے بار بار مصیبتوں کی دلدوز اور غم انگیز کہانیاں سنائیں لیکن انسانی فطرت عجیب ہے۔ وہ مسرت و کامرانی کی طرح غم و اندوہ میں بھی اپنے لئے آسانی سے مساوات پیدا کر لیتا ہے۔

لیکن فرصت کے لمحوں میں کبھی کبھی میرا آوارہ تصوّر مجھے اس چھوٹے سے قبرستان کی طرف لے جاتا ہے۔ وہ قبرستان جس کے چاروں طرف خوشنما باغیچہ ہے، اور جس کے اندر زمین میں میرے آباواجداد کی ہڈیاں مدفون ہیں۔ میں فطرتاً کچھ زیادہ جذباتی نہیں ہوں۔ بلکہ سچ پوچھئے تو میری شخصیت جذبات کی شعریت سے مبرا ہے لیکن میرے تصوّر کی یہ آوارگی محض اس خوشنما باغیچہ یا ان چند قبروں کی وجہ سے نہیں۔ اس آوارگی میں مجھے اپنے خاندان کی چار صدیوں کی تاریخ کی جستجو ہوتی ہے۔ اور پھر میں اپنی زندگی میں اس قبرستان کی کمی محسوس کرتا ہوں۔

مجھے لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ مسلمانوں نے شہر بڑے منظم طریقہ سے خالی کیا۔ نہ کوئی لڑائی جھگڑا ہوا، نہ کسی کی جان گئی۔ ایک ہفتہ کے اندر مسلمانوں نے شہر خالی کر دیا اور جو کچھ اپنے ساتھ لے جا سکے لے گئے۔ دوسرے ہفتہ سکھ پناہ گزیں شہر میں داخل ہوئے اور جو کچھ اپنے ساتھ لا سکے لائے۔ مکانوں پر قبضہ ہو گیا، زمینیں بانٹ دی گئیں۔ باغیچہ اور چھوٹا قبرستان پناہ گزیں سکھوں کے ایک گھرانے کے حصہ میں آیا۔ بعد میں مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ باغیچہ اب بھی ویسا ہی ہے لیکن قبرستان کے اندر کی چھوٹی مسجد اب وہاں نہیں۔ سکھوں کو شاید یہ دیکھ کر بہت غصہ آیا تھا کہ انھیں شہر میں کوئی مسلمان نہیں ملا۔ لیکن اگر زندہ چلے گئے تو کیا، مردے تو اب بھی وہاں تھے ان کی ہڈیوں کو کیوں چین سے رہنے دیں؟ قبریں مٹا ڈالی گئیں اور ان قبروں میں ایک قبر رنجیت سنگھ کے معتمد وزیر کی تھی اور ایک ۔۔۔ کی جن کے ہاتھوں میں جلیانوالا میں سکھ فوجوں کی کمان تھی اور جنھیں خالصہ سپاہی محبت میں دلیراں دا دلیر دلیروں کا دلیر کہتے تھے۔

آغا محمد یعقوب دواشی

اتاترک کی وصیت

(اکتوبر ۱۹۲۷ء میں غازی مصطفےٰ کمال اتاترک نے ترکی جمہوری پارٹی کی دوسری کانگریس میں ایک معرکتہ الآرا تقریر کی جو چھ دن تک جاری رہی۔ اس تقریر میں جو دنیا کی تاریخ میں سب سے لمبی تقریر سمجھی جاتی ہے، غازی موصوف نے پہلی عالمگیر جنگ سے لے کر ۱۹۲۷ء تک کے ترکی کے واقعات، اوضاع اور مسائل پر بصیرت افروز تبصرہ کرنے کے بعد آنے والی ترکی نسلوں سے ایک روح انگیز اپیل کی جو "اتاترک کی وصیت" کہلاتی ہے۔ اس وصیت کا ترجمہ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے — محمد یعقوب دواشی)

حضرات محترم!

یہ لمبی اور مفصل تقریر، جو آپ کئی دن سے سن رہے ہیں ہمارے ماضی قریب کی کہانی ہے۔ اس میں میں نے قوم اور آنے والی نسلوں کو بعض امور کی طرف توجہ دلائی اور غور و خوض کی دعوت دی ہے۔ اگر میں ان امور کو واضح کر سکا ہوں تو میں خود کو خوش قسمت سمجھوں گا۔

حضرات! اس تقریر میں میں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ایک قوم نے جسے مردہ تصور کیا جاتا تھا، کیونکر آزادی حاصل کی اور علم و فن کی نئی سے نئی بنیادوں پر ایک جدید قومی ریاست قائم کی۔ یہ نعمت جو آج ہمیں حاصل ہے اس بیداری کا نتیجہ ہے جو صدیوں کی مصیبتوں نے ہم میں پیدا کی، اور اس خون کا بھی جو ہر آزمائش میں ہمارے عزیز وطن کی رگوں سے بہا۔

میں یہ نعمت ترک نوجوانوں کو امانت کے طور پر سونپتا ہوں!

اے ترک نوجوانو! ترکی کی آزادی اور جمہوریت کو ابد تک سنبھالنا اور بچانا تمہارا اولین فرض ہے۔ یہی تمہاری بقا اور تمہارے استقلال کی واحد بنیاد ہے۔ یہی تمہارا گنج بے بہا ہے۔ مستقبل میں تمہارے اندر اور باہر اور بھی زیادہ دشمن پیدا ہو جائیں گے جو تمہیں اس نعمت سے محروم کرنا چاہیں گے۔ ایک نہ ایک دن ایسے واقعات پیش آئیں گے جن کی روش اور امکانات کے پیش نظر تم اپنے استقلال اور جمہوریت کے بچانے کا فریضہ ادا کرنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ واقعات نہایت ناسازگار حالات میں رونما ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ جو تمہاری موجودہ فتح و ظفر میں پیش پیش رہے ہوں وہی تمہارے استقلال اور جمہوریت کے درپے ہو جائیں۔ ہو سکتا ہے کہ دشمن تمہارے عزیز وطن کے سب قلعے سر کر لے، سب اسلحہ خانے ہتیا لے، تمہاری سب فوجوں کو تتر بتر کر دے اور تمہاری سرزمین کے چپے چپے پر قبضہ کر لے۔ اور اس سے بھی زیادہ المناک اور خطرناک صورت یہ کہ وہ لوگ جن کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور ہو، غفلت، سہو بلکہ خیانت کے مرتکب ہوں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمہارے ارباب حل و عقد کے ذاتی مفاد اور حملہ آوروں کے سیاسی مقاصد میں ہم آہنگی ہو جائے اور قوم اس مصیبت اور ادبار کی حالت میں بے بس اور تباہ ہو جائے۔

اے آنے والی ترک نسلو! سمجھ لو کہ ایسے حالات میں ترکی استقلال اور جمہوریت کے بچانے کی ذمہ داری تم پر اور بھی زیادہ عائد ہو گی۔ میں جانتا ہوں کہ جس طاقت کی ضرورت ہو گی وہ تمہارے خون میں موجود ہے۔

وقائعِ علم

شاہ عبداللطیف[1] کا تعارف

حیدرآباد سندھ سے کوئی ۲۲ میل دور، بھٹ شاہ نام کی ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ شہری ہنگاموں سے دور اس سیدھی سادی آبادی میں سندھ کے عظیم المرتبہ صوفی شاعر شاہ عبداللطیف کی آخری آرام گاہ ہے۔ دور دور سے اس گوشہ میں بھی شاہ عبداللطیف کی یاد کے شیدائی سال کے ہر حصہ میں آتے اور ان کی روح کو نذرِ عقیدت پیش کرتے رہتے ہیں۔ ان آنے والوں میں مذہب و ملت کی کوئی قید نہیں۔ شاہ کے کلام کے جادو نے ہر دل پر اثر کیا ہے۔ ہندو، مسلمان، پارسی، امیر، غریب، خواندہ اور ناخواندہ سب کے لئے اس شخصیت میں، اس ذات کے پسندیدہ اخلاق میں اور اس کی میٹھی، دل میں گھر کرنے والی سچی شاعری میں بلا کی کشش ہے۔ یہی کشش دور دور سے آنے والوں کو سال میں ایک بار اس خاموش بستی میں لا کر اکٹھا کر دیتی ہے۔ فروری کے مہینہ میں لوگ شاہ کا عرس مناتے ہیں۔ میلا لگتا ہے، اور اس میں وہ ساری چہل پہل اور گہما گہمی ہوتی ہے جس سے میلے نشاط آفریں اور رومان انگیز بنتے ہیں۔ لیکن اس سالانہ میلے کی سب سے بڑی کشش یہ ہے کہ میلے میں ہر طرف لوگ اپنے اپنے مذاق کی ٹولیاں بنا کر بیٹھ جاتے ہیں اور ہر ٹولی میں شاہ عبداللطیف کا کلام اسی خاص طرز میں گا کر پڑھا جاتا ہے جیسے اب سے دو سو برس پہلے خود شاہ کے زمانہ میں۔ کچھ خاص لوگ ہیں جنہیں اس کلام کو پڑھنے کا ملکہ ہے۔ پڑھنے والے پڑھتے ہیں اور سننے والے سر دھنتے ہیں۔ کسی کو کلام کا صوفیانہ تخیل سرمست و سرشار کرتا ہے۔ کوئی اس کے نرم و نازک احساسات سے متاثر ہوتا ہے، کسی کو اس کی سادگی بھاتی ہے، اور کسی کو اس میں حسنِ فطرت کے دلفریب جلوے نظر آتے ہیں۔ کوئی تخیل کی باریکی کا دلدادہ ہے اور کوئی لفظوں کی شیرینی کا۔ شاہ عبداللطیف کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ اسے ہر مذہب و ملت کے، ہر طبقے کے، اور ہر سمجھ کے لوگ ذوق و شوق سے پڑھتے اور سنتے ہیں۔ سندھ کے ہر حصے میں لوگوں کو ان کا کلام زبانی یاد ہے۔ اور بہت سے یاد کرنے والے ایسے ہیں کہ شاہ کے کلام کا ایک ایک لفظ ان کے دلوں کا نقش اور زبانوں کا ورد ہے۔ جو مقبولیت سندھ میں شاہ عبداللطیف کے کلام کو حاصل ہے اسکا مقابلہ اُردو میں کسی حد تک اگر کوئی شاعر کر سکتا ہے تو غالب اور اقبال۔ لیکن غالب اور اقبال کی مقبولیت ایک خاص طبقہ تک محدود ہے۔ اور شاہ عبداللطیف کی مقبولیت کسی خاص طبقہ یا علاقہ تک محدود نہیں۔

شاہ عبداللطیف اٹھارویں صدی کے شروع کے شاعر ہیں۔ سندھ میں ان کی زندگی کے حالات کے متعلق جو تحقیق ہوئی ہے اُسکی رو سے ان کا سال پیدائش ۱۶۸۹ء ہے اور سال وفات ۱۷۵۲ء۔

شاہ عبداللطیف حیدرآباد (سندھ) میں مٹیاری سے قریب ہالا حویلی کے مقام پر پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید حبیب شاہ اپنے زمانہ کے بڑے باعزت اور صاحبِ حیثیت بزرگ سمجھے جاتے تھے اور ان کا تعلق علوی سیدوں کے ایک معتقد گھرانے سے تھا۔ لیکن شاہ عبداللطیف کو بچپن ہی سے دنیاوی جاہ و حشم سے ایک بے تعلقی سی تھی۔ ان کا رجحان دنیا سے زیادہ دین کی طرف تھا۔ عمر کا ابتدائی زمانہ ہالا حویلی میں گزرا۔ کچھ سال بعد ان کے والد ہالا سے ایک قریب ہی کے موضع کوٹری جا کر رہنے لگے تو شاہ عبداللطیف بھی ان کے ساتھ ہی گئے اور ان کے شباب کے چند برس کوٹری میں بسر ہوئے۔ عمر کے اسی زمانہ سے ان کا رجحان دو چیزوں کی طرف تھا۔ ایک تو یہ کہ وہ اپنے وقت کا زیادہ حصہ

[1] یہ اس مضمون کی ترتیب میں ہم نے ایچ۔ ٹی۔ سورلے کی کتاب SHAH ABDUL LATIF OF BHIT سے بہت مدد لی ہے اور اس کے علاوہ [illegible] صاحب [illegible] کی معلومات سے بھی استفادہ کیا ہے۔ [illegible] شاہ عبداللطیف کا ایک مختصر سا تعارف ہے۔ دوسرے حصے میں انشاء اللہ ان کے کلام کی خصوصیات اور شاعری پر تبصرہ کیا جائے گا۔

صوفی منش بزرگوں کی صحبت میں گذارتے تھے اور دوسرے یہ کہ اپنے فرصت کے اوقات میں ذکر و فکر میں مصروف رہتے تھے۔ تحقیق کرنے والوں نے ان کی عمر کے اس دور کے متعلق بیان کیا ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں سادگی ان کا شعار تھا۔ کھانے پینے، پہننے اوڑھنے اور رہنے سہنے کی ساری تفصیلوں میں وہ حد درجہ کی سادگی پسند کرتے تھے۔ محبت، ہمدردی، رحم و کرم، گفتگو میں نرمی اور شیرینی اور ذاتی معاملات میں انکسار اور عاجزی ان کے اخلاق کی خصوصیات تھیں۔ کسی جاندار کو تکلیف میں دیکھتے تو ان کا دل تڑپ جاتا اور جس طرح بن پڑتا اس کے دکھ کا مداوا کرنے کی کوشش کرتے۔ جوانی کی عمر میں دنیاوی جاہ و حشم تک دسترس ہو اور آدمی اس سے بے نیازی برتے، آنی جانی دولت چھوڑ کر دولتِ ایمانی سے اپنا دامن بھرے، اپنے ہم جنسوں کے دکھ درد کا شریک ہو، خود بڑا ہو کر اپنی بڑائی پر نازاں نہ ہو تو دنیا والے اسے اپنا محبوب بناتے ہیں۔ شاہ عبداللطیف کے ساتھ بھی یہی ہوا لوگ انکی طرف مائل ہوئے، اور رفتہ رفتہ ان کے پرستاروں کا حلقہ بڑھنے لگا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مٹیاری کے سیدوں کا وجود خود ایک بہت اثر تھا۔ مقامی حکمراں نور محمد کلہوڑو اس خاندان کے لوگوں کے اثر سے واقف تھا اور ان کی دوستی کے دامن کو ہاتھ میں رکھنا چاہتا تھا۔ مٹیاری کے سیدوں نے شاہ عبداللطیف کی شہرت اور ہر دلعزیزی بڑھتی دیکھی تو انہیں اپنا جاہ و حشم خطرہ میں نظر آنے لگا۔ ان سیدوں نے نور محمد خاں کے کان شاہ صاحب کی طرف سے بھرنے شروع کئے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ نور محمد خاں نے مختلف طریقوں سے شاہ صاحب کی دل آزاری شروع کردی۔ لیکن انہیں اللہ کی [illegible] بھروسہ تھا۔ یہی قوت ان کا سہارا بنی اور آخر نور محمد خاں کو شاہ صاحب کی عظمت کا اعتراف کرنا پڑا۔

شاہ صاحب نے اپنی جوانی ہی کے دنوں میں اپنے صوفیانہ خیالات کو نظم کا لباس پہنانا شروع کردیا تھا۔ ان نظموں میں اتنی کشش تھی کہ اس نے شاہ صاحب کے حلقۂ ارادت کو اور بھی وسیع کردیا۔ وہ رباب و وجد و وان کے روحانی نغموں کی گونج سنائی دینے لگی۔ اب تک شاہ صاحب اپنے گھر والوں کے ساتھ رہتے تھے۔ لیکن انہوں نے محسوس کیا کہ ان کے روحانی نغموں کے لیے زیادہ تنہا فضا کی ضرورت ہے۔ اسی احساس کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے بھٹ[1] نامی ایک مقام پر پہنچ کر اپنے ہاتھ سے اپنا مکان بنانا شروع کیا اور اسی مکان کے گرد ایک چھوٹی سی بستی بس گئی۔ اسی بستی میں ۱۷۵۲ء میں ۶۳ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا اور غلام شاہ کلہوڑو نے ان کا مزار بنایا۔ یہی مزار اب دو سو برس بعد بھی مرجع خلائق ہے۔

شاہ عبداللطیف کی حیات کا زمانہ (۱۶۸۹ء تا ۱۷۵۲ء) یعنی سترھویں صدی کا آخر اور اٹھارویں صدی کا نصف اول سندھ کی تاریخ کا بے حد اہم دور ہے۔ یہی زمانہ ہے جب سندھ کی حکومت رفتہ رفتہ مغلوں کے ہاتھوں سے خود سندھی حکمرانوں کے ہاتھ میں آرہی تھی۔ کلہوڑو[2] خاندان کی قوت بڑھنی شروع ہوگئی تھی اور سندھ نے سیاسی آزادی کی فضا میں سانس لینی شروع کردی تھی۔ جب اورنگ زیب کا انتقال ہوا تو شاہ عبداللطیف کی عمر ۱۸ سال کی تھی۔ اس کے بعد کلہوڑو خاندان کی قوت تیزی سے بڑھنی شروع ہوئی اور اس نئی آزادی کے کرشمے شاہ نے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا اور سندھ کو فارس کا باج گذار بنایا تو شاہ کی عمر ۵۰ سال تھی۔ اس کے آٹھ سال بعد جب احمد شاہ درانی نے دہلی کی دم توڑتی ہوئی سلطنت پر حملہ کرکے سندھ کو کابل کی مملکت کا مطیع بنایا تو شاہ ۵۸ سال کے تھے [illegible] پانچ سال بعد شاہ کا انتقال ہوا۔

سیاسی [illegible] نظر سے شاہ عبداللطیف کی زندگی کا

---

[1] بھٹ سندھی میں ریت کے ٹیلے کو کہتے ہیں۔ [illegible] ریگستان کے علاقوں سے [illegible] ان سے [illegible] ٹیلے سے بن جاتے ہیں۔ بھٹ اسی قسم کی ایک جگہ تھی۔

[2] کلہوڑو خاندان کے بادشاہوں کی نسل اصل میں [illegible] سندھیوں سے ملتی ہے جو پہلے ہندو تھے لیکن بعد میں مسلمان ہوگئے تھے۔ جب سندھ میں ان کی قوت بڑھی تو انہوں نے [illegible] شروع کیا کہ [illegible] لیکن [illegible] تھے اور [illegible] نہیں [illegible] حکمرانوں کی حمایت سے ان کا [illegible] لیکن [illegible] میں [illegible] مغل [illegible] کوئی [illegible] شروع ہو چکا تھا۔

پس منظر انتشار اور آزادی کا ایک بلا جلا مرقع تھا۔ ان کے گرد و پیش کی زندگی سیدھے سادے دیہاتیوں کی زندگی تھی — ایسے دیہاتی جو زرخیز زمینوں میں کاشت کرتے، بھیڑوں، بکریوں اور بیلوں کے گلوں کی پاسبانی کرتے۔ اونٹ پالتے اور اس مرنجاں مرنج، آہستہ خرام لیکن جفاکش چوپائے کی طرح صحرا کی تپتی ریت اور سورج کی تیز شعاعوں میں اپنا وقت کام کاج میں گزارتے، اپنے کھیتوں میں بیج بوتے اور دریائے سندھ کی بڑھتی گھٹتی رو کے سہارے ان بیجوں میں پانی دیتے۔ اور پھر اللہ کے رحم کے منتظر رہتے کہ وہ ان بیجوں سے پودے اگائے اور پودوں میں سنہری بالیں نکلیں۔ ان سادہ لوح دیہاتیوں کی زندگی میں مادیت اور روحانیت ایک ہی سلسلہ کی دو کڑیاں تھیں۔ زندگی کی کامیابی اور خوشحالی میں جہاں ایک طرف خود ان کی جفاکشی کا ہاتھ تھا، دوسری طرف دستِ مشیت کا سہارا بھی تھا۔ اور اس لئے ان کا ہر قدم گو فطرت کے تقاضے سے اٹھتا تھا لیکن مشیت کی مرضی کا محتاج تھا — ان دیہاتیوں کی روزانہ زندگی میں طرح طرح کے چوپائے ان کے ہم عنان و ہم سفر تھے اور مظاہر قدرت ان کے معین و مددگار۔ اس لئے ان کے دلوں میں ان کی محبت اور عزت تھی اور وہ ان کے عشق و محبت میں بھی ان کے ہمراز تھے۔ یہی دیہاتی جب اپنے کاموں سے فارغ ہوتے تو فرصت کے وقت کو اللہ کی دی ہوئی ایک بڑی نعمت سمجھ کر اس کی قدر کرتے۔ گاتے، بجاتے، اپنے دیس کی عشق و محبت کی کہانیاں مزے لے لے کر سنتے سناتے۔ ان میں نغمہ کا رنگ بھرتے اور قدیم روایتوں کو حیات جاوید بخشتے۔ فرصت کا ہر وقت اور تہوار کا ہر دن — عید، بقر عید، ہولی، دیوالی، ان خوشیوں کے لئے وقف تھا۔ اور ان کی زندگی میں لوک گیتوں اور ان لوک گیتوں کی گود میں پلی ہوئی موسیقی کا بڑا حصہ تھا — شاہ عبداللطیف نے اپنی ساری زندگی انہیں دیہاتیوں میں گذاری۔ گھر کے اندر، اور گھر سے باہر ان کی مادی، روحانی اور جذباتی زندگی میں جن چیزوں کی گہری جگہ تھی ان کا مطالعہ کیا۔ ان کی ذہنی سطح اور اخلاقی ضرورتوں کا اندازہ لگایا اور پھر انہیں میں رہ کر انہیں کے لئے خیالات کو نغمہ کے پیرہن میں پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ عبداللطیف کی شاعری (جسے اس کی ہیئت اور روح کے اعتبار سے نغمہ کہنا زیادہ موزوں ہے) میں ہر جگہ ان کے دلوں کی دھڑکن موجود ہے۔ اس کا موضوع وہی لوک کہانیاں ہیں جو ان کے بچے بچے کی زبان پر ہیں، انہیں مناظر کا ذکر ہے جو ان کی زندگیوں پر گہرا اثر ڈالتے ہیں، وہی اشارے اور تشبیہ اور استعارے ہیں جو ان کے دلوں سے قریب ہیں۔ انہیں کی سادگی زبان ہے۔ شاعر نے ایک اچھے فن کار کی طرح یہ کیا ہے کہ ان بہت سی بکھری ہوئی چیزوں میں سے صرف ان کا انتخاب کیا ہے، جن سے اس کے نغمہ میں سرمستی پیدا ہوتی ہے۔ اس نے تفصیلوں کی جگہ اشاروں سے کام لیا ہے، پوری کہانی سنانے کے بجائے صرف اس کے وہ ٹکڑے لے لئے ہیں جن کی کوئی جذباتی اہمیت ہے۔

شاہ عبداللطیف کے کلام کی بنیاد ان کا صوفیانہ اندازِ نظر ہے۔ لیکن اس صوفیانہ فکر کے لئے انھوں نے سترہویں صدی کے آخر اور اٹھارویں صدی کے شروع کی دیہاتی زندگی کے مادی اور جذباتی پہلوؤں کے پیکر سے مدد لی ہے۔ اور اس عہد کی زندگی میں ظاہری اور باطنی حقیقی اور روایتی جتنے رخ تھے سب پر نظر رکھ کر اپنے گیتوں کا تانا بانا تیار کیا ہے۔ اسی لئے گو ان کے خیالات سرتاسر صوفیانہ ہیں لیکن ان صوفیانہ خیالات میں تصوف کی خشکی کے بجائے ایک صحت مند، تازہ شگفتہ اور سچے عشق کی ولولہ انگیزی ہے۔ اس تصوف میں فلسفہ نہیں رومان ہے۔ اور اس رومان میں وہی سب کچھ ہے جس سے رومان کی داستان سننے والوں کے لئے بھی حیات بخش بن جاتی ہے۔ یہ عشق دنیاوی ہے، لیکن دنیاوی عشق کی آلائشوں سے پاک۔ روحانی ہے لیکن حقیقت اور صداقت کی بنیادوں پر قائم۔ شاہ عبداللطیف کی شاعری کا بنیادی جذبہ اسلامی تصوف ہے لیکن انھوں نے اس تصوف کو اپنے عہد کی زندگی اور اس عہد میں پھیلی ہوئی محبوب روایات کے قالب میں ڈھال کر اسے عوام کے ذہن سے قریب کر دیا ہے۔ اور سندھی پڑھنے والے اس شاعری کو اپنی حیات اجتماعی کا مرقع، گرد و پیش کے مظاہر فطرت کا آئینہ، اور شخصی جذبات و محسوسات کا سچا ترجمان سمجھ کر اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ انہیں شاہ عبداللطیف کی ہر بات اپنے دل کی بات معلوم ہوتی ہے — اس کے ایک ایک لفظ میں ان کی اپنی

مانوس زندگی کی جھلک ہے۔ وہ انہیں ماضی کی روایات کی یاد دلاتی ہے محبوب لوک گیتوں اور لوک کہانیوں کی دنیا کی سیر کراتی ہے اور پھر اپنی ہی دنیا میں رکھ کر بلند اخلاق کے درس دیتی ہے۔ اسی لیئے شاہ عبداللطیف سندھی کے سب سے ہر دل عزیز شاعر ہیں۔

لیکن سندھی کے اس صوفی شاعر کے کلام کی ان مقامی خصوصیات میں فن کی لطافتوں کا اتنا متوازن امتزاج بھی ہے کہ اہل زبان نہ جاننے والا ان کے ترجمے پڑھتا ہے تو اس کے دل پر بھی گہرا اثر پڑتا ہے۔ سندھی زندگی کے جن پہلوؤں کی طرف شاہ کے کلام میں اشارے ہیں، اور جن اخلاقی نکات کی ان اشاروں اور کنایوں میں تعلیم ہے، وہ بے حد تصور آفریں ہے۔ اور پڑھنے والے کو ایک واضح ذہنی تصویر بنانے میں مدد دیتی ہے پڑھنے والا تخیل کی نزاکت اور معنی آفرینی پر بھی سر دھنتا ہے، اور ایک خاص طرح کے ماحول کا نقشہ بھی اس کی نظر میں پھر جاتا ہے۔ اگر غور سے دیکھئے تو اس ماحول میں آپ کو زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی چیز دکھائی دے گی اور پھر اسی چھوٹی سے چھوٹی چیز کا ایک وسیع مفہوم ہوگا، کبھی جذباتی، کبھی اخلاقی اور کبھی سماجی اور معاشی ــــ مثال کے طور پر شاہ کے کلام کو پڑھ کر بیرونی زندگی کی ایک تصویر بنایئے تو اسکا انداز کچھ اس طرح کا ہوگا ــــ

ریت کے چمکیلے ذروں کی گود میں ایک چوڑا چکلا دریا مچل رہا ہے۔ کبھی جوش میں آتا ہے تو اپنے دائیں بائیں میلوں زمین کو سیراب کرتا چلا جاتا ہے، اور کبھی آس پاس کی زمینیں آس لگائے بیٹھی رہتی ہیں اور وہ بے نیازی سے آگے گذر جاتا ہے کہیں سیدھا چلتے چلتے اپنا رخ بدل دیتا ہے، اور خشک زمینوں میں کھدے ہوئے گڑھے تالاب بن جاتے ہیں۔ ان تالابوں میں گھڑیال ہیں جو دھوپ کھانے کو ریت پر آ پڑتے ہیں اور انسان کی جان کے لئے خطرہ کا ایک نیا سامان پیدا ہو جاتا ہے۔ دریا کے کنارے گھاٹ ہیں، ان میں رسیوں سے کشتیاں بندھی ہوئی ہیں۔ سوداگر اپنا سامان باندھتا ہے اور اس کشتی میں لاد کر کسی دور کے دیس کو لے جاتا ہے۔ جب وہ اپنا سفر پورا کر کے واپس آتا ہے تو دریا کے کنارے کھڑی ہوئی دوشیزہ اس کے بادبانوں کے رنگ سے پہچان لیتی ہے کہ وہ اس کے محبوب کی کشتی ہے۔

زندگی کی ایک دوسری تصویر بارش لانے والے بادلوں کی آمد سے وابستہ ہے۔ بادل آتے ہیں، بجلی چمکتی ہے، بوندیں پڑتی ہیں، جل تھل ہو جاتے ہیں، اور ہر طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔ سب خوش ہیں لیکن بارش کی کثرت نے مہاجن کے سارے منصوبوں پر پانی پھیر دیا ہے۔ اب وہ غلہ پانچ گنے داموں پر کیسے بیچے گا۔ پھر شمال کی طرف سے تلوار کی طرح کاٹنے والی خشک ہوائیں چلتی ہیں اور جھونپڑیوں کے سر پر سیٹیاں بجاتی اور گھاس کے سبز تنوں کی نوکوں کو مرجھاتی ہوئی آگے نکل جاتی ہیں۔ کبھی ریگستان کی پھیلی ہوئی بنجر گود میں سورج کی کرنیں اترتی ہیں، اور ریت کے ٹیلوں کو آگ کی بھٹی بنا دیتی ہیں، اور بھور دوشیزہ اس تپتی ہوئی ریت میں اپنے محبوب کی تلاش کی سختیاں جھیلتی ہے۔ اور ان مختلف منظروں میں بگلے، کوے، گدھ اور لوے اپنے اپنے روایتی کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔

گھر کے اندر کسان آنے والی بارش کے انتظار میں اپنے ہل جوڑ رہا ہے مشکی میں رکھی ہوئی چھاچ میں جھاگ اٹھ رہے ہیں، اور چرخے کی دھیمی آواز پس منظر کی موسیقی پیدا کر رہی ہے۔ عورتیں چرخا کاتتی جاتی ہیں اور گاؤں کی باتیں کرتی جاتی ہیں اور گاؤں کے باہر دور سے مویشیوں کی گھنٹیوں کی آواز آ رہی ہے۔

سید اپنے فاخرہ لباس میں گھوڑے پر تنا بیٹھا ہے اور غرض مند غریب نے اس کی رکابیں ہاتھ سے پکڑ رکھی ہیں۔ امیروں کے گھروں میں عورتوں نے سروں میں تیل ڈال کر آنکھوں میں سرمہ لگایا ہے اور ان کے گلے میں طوق اور ہاتھوں میں کنگن ہیں اور غریب عورت کے جسم کا کپڑا سو جگہ سے پھٹا ہوا ہے۔

شادیاں ہوتی ہیں، لوگ جمع ہوتے ہیں، ہالے ہجالے ہوتے ہیں، مطرب اپنے ساز کو طرح طرح بجاتا ہے اور اس پر اپنے نغمے گاتا ہے ــــ ہر طرف فقیروں کا دور دورہ ہے، لوگ ان سے مرادیں مانگتے ہیں اور اپنے محبوب سے بچھڑی ہوئی دوشیزہ کڑکڑاتے جاڑے کی اندھیری راتیں میں دروازے سے لگی صبح کا انتظار کر رہی ہے کہ اسکا شوہر صبح کو آنے والا ہے۔

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

فضل حق قریشی دہلوی

مغلوں کے عہد میں خطاطی

مصوری کی طرح خطاطی یا خوشنویسی کا تعلق بھی انسان کے ذوقِ لطیف سے ہے اور اسی فن لطیف کی طرح قدیم بھی ہے۔ ہر زبان کی عبارت کو ہر ملک اور ہر زمانے میں زیادہ سے زیادہ دلآویز طریقے پر لکھنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ خصوصاً اس عہد میں جب موجودہ زمانے کے ڈھلے ہوئے حروف کے ذریعے چھاپنے کا رواج معدوم تھا، خطاطی کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ حکومتوں کے قوانین نظم و نسق بادشاہوں کے فرمانوں، بڑے لوگوں کے مراسلوں اور مختلف قسم کی اہم دستاویزوں کی کئی کئی نقلیں تیار کرنے کے لئے خوشنویسوں کو اعلیٰ عہدوں پر مامور کیا جاتا تھا اور ان کو اچھی تنخواہیں ملتی تھیں۔ اب بھی ان زبانوں میں جن کے حروف آہنی سانچوں سے ڈھل کر باہر نہیں آئے ہیں یا اس اعتبار سے جن کو پوری ترقی حاصل نہیں ہوئی ہے، یہ فن بدستور اپنی اہمیت کا سکہ جمائے ہوئے ہے۔

چونکہ احادیثِ اسلامی نے زندہ اشیا کی صورت گری کو قطعاً ممنوع قرار دے دیا تھا، اس لئے اس نوع کی مصوری اور بت تراشی کو مسلمانوں میں کوئی درجۂ قبول حاصل نہ ہو سکا اور ان کی بجائے بھی انسان کا ذوقِ لطیف خطاطی کے دامن میں تسکین پانے لگا۔ اس لئے مغرب کی نسبت مشرق میں، خصوصاً اسلامی ممالک میں اس فن کو زیادہ فروغ نصیب ہوا۔ پرانے مسودوں اور کتبوں کا مطالعہ اس امر کا ثبوت پیش کر سکتا ہے۔ مسلمانوں میں خطاطی کے رواج کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ عربی رسم الخط میں قدرتی طور پر یہ صلاحیت موجود ہے کہ اسے سپردِ قلم کرتے وقت ہر فنکار اپنی ذاتی قابلیت کے جوہر دکھا سکتا ہے۔

ہر فاتح قوم کی طرح عرب کے مسلمانوں سے بھی یہ دستور رہا ہے کہ وہ دوسرے ملک پر اپنی حکومت کا سکہ بٹھانے کے ساتھ ساتھ اپنی ثقافت و تہذیب کا رنگ جمانے سے کبھی نہ چوکے۔ چنانچہ جب ایران و توران و افغانستان پر ان کا تسلط ہوا تو دوسرے فنون کے ساتھ خطاطی نے بھی اپنا نقش جمایا اور پوری طرح فروغ حاصل کیا اور جب آگے بڑھ کر ہندوستان تک آئے تو وہ لطیف نشانیاں پیچھے نہیں چھوڑیں بلکہ اپنا سرمایہ یہاں والوں کے سپرد کرنے کے لئے ہمراہ لے آئے۔

ہندوستان کے اسلامی دور پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ابتدائی عہد کے حکمراں زیادہ تر ملک رانی و جہانبانی کے جھمیلوں میں پھنسے رہے اور صحیح ذوقِ سلیم رکھنے کے باوجود عوام میں فنونِ لطیفہ کا شوق پیدا کرنے کے لئے ان کی سرپرستی خاطر خواہ نہ فرما سکے۔ تاہم مغلوں کا عہد اس اعتبار سے مثالی ہے اور بابر ہی کے وقت سے اس منزل کے نشانات کا پتہ چلتا ہے۔

بابر فطرتاً چمن بندی و باغبانی کا دلدادہ تھا۔ زمین ہند کے سینے پر باغوں کی داغ بیل اسی کے ہاتھوں پڑی تھی۔ اس کا یہ ذوقِ لطیف اتنا بڑھا ہوا تھا کہ وہ دوسرے فنون میں بھی چمن کی سی بہار دیکھنی چاہتا تھا۔ چنانچہ اس کے عہد کی خطاطی میں وہ پھول کھلے کہ خاص طرزوں کے نام ہی خطِ گلزار و خطِ ریحان پڑ گئے۔ لوگوں نے اس طرح لکھنا شروع کیا کہ عبارت پر بیل بوٹوں کا شبہ ہونے لگا۔ اگر نسخ و نستعلیق میں کوئی چیز لکھی گئی تب بھی اس کے حاشئے عشقِ پیچاں کی بیلوں یا انگور کے خوشوں سے سجائے گئے گوشوں پر سرو و صنوبر کا قبضہ ہوا اور اس طرح ہر عبارت کی زمین کھل کر زمین چمن بن گئی۔

بابر کے آخری عہد اور ہمایوں کے زمانۂ شہزادگی میں میر علی ایک مشہور خطاط تھے۔ انہوں نے ہمایوں کے حکم کے مطابق جو سنہ ۱۵۳۰ء میں صادر ہوا تھا، تزکِ بابری کو بڑی محنت و جانفشانی کے ساتھ دلپذیر انداز میں لکھنا شروع کیا اور ہمایوں کے تخت نشین ہونے کے بعد مکمل کر کے دربار سے بڑا انعام پایا۔ اس کے پہلے صفحے پر ہمایوں اور اکبر کی شاہی مہریں ثبت ہیں۔ وہ نسخہ عرصۂ دراز تک مغلوں کے شاہی کتب خانے میں محفوظ رہا اور اب مہاراجہ الور کے پاس موجود ہے۔ میر علی ہرات کے رہنے والے اور نستعلیق طرز میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ سنہ ۱۵۴۳ء میں ان کا انتقال ہوا۔ وفات سے ایک سال پہلے انہوں نے حکایاتِ لقمان کو نستعلیق خط میں

تھا اصل نسخہ مرزا احمد سعید خاں صاحب نواب لوہارو کے پاس موجود ہے۔

ہمایوں کے وقت تک خطاطی و مصوری کے ضمن میں زیب و زینت کی چیزیں مناظرِ قدرت تک محدود رہیں لیکن اکبر کسی قدر روشن خیال تھا اس نے پرانے مسلک سے ذرا الگ ہٹ کر ایک قدم آگے بڑھایا اور اس طرح چند خاص جانور اور پرندے مصوری کے دائرے میں آ گئے۔ چنانچہ شمع کے ساتھ پروانے، پھول کے ساتھ بلبل، سرو کے ساتھ قمری اور میدان کارزار کے ساتھ ہاتھی گھوڑے اپنا پرا جمانے لگے۔ پہلو بہ پہلو خطاطی نے بھی ترقی کی اور موضوعِ عبارت کے پیشِ نظر حاشئے کی نقاشی میں پرندوں کی پرواز دکھائی جانے لگی۔ اسی زمانے میں ایک نئے خط نے ترقی پائی جسے خطِ ماہی کہتے ہیں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ حروف کی شکل میں تڑپتی اور بل کھاتی مچھلیوں کو اس طرح ایک دوسری کے ساتھ ملایا جاتا ہے کہ پورے الفاظ تخلیق پاتے چلے جاتے ہیں اور کوئی جگہ خالی رہنے نہیں پاتی۔

اکبر کے عہد میں بادشاہ کے حکم سے بہت سی عربی کتابوں کے فارسی ترجمے ہوئے اس لئے خطاطوں کی خاص طور پر ضرورت محسوس ہوئی تاکہ وہ ہر مسودے کے کئی کئی خوشخط نسخے تیار کر کے، اسے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیں۔ چنانچہ اسی بڑھتی ہوئی ضرورت کے پیشِ نظر خطاطی کی مختلف طرزوں کے لئے چند اصول مقرر ہوئے جو معمولی رد و بدل کے ساتھ اب تک قائم ہیں۔ نہ صرف حروف کی تشکیل بلکہ ان کی لمبائی چوڑائی، گولائی، کشش، میل، فصل، مرکزوں کے جھکاؤ، نقطوں کے انداز اور اعراب کی نشست تک کے لئے اصول قائم کئے گئے۔ اس فن کی وسعت کا مختصر اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ نستعلیق خط میں صرف نقطہ پانچ مختلف طریقوں سے لکھا جا سکتا ہے۔ ان کے نام یہ ہیں: مربع، چہار گوشہ، مائل بہ طول، خمیدہ اور مدور۔ پھر نقطے ہی کو پیمائش کی اکائی مانتے ہوئے باقی حروف کی لمبائی وغیرہ متعین کی گئی۔ مثلاً مبدا اور منتہا کو چھوڑ کر الف تین نقطے کے برابر ہونا چاہئے۔

محمد حسین کشمیری، مولانا عبد العزیز، میر حسین کلنگی، قاسم ارسلان، محمد امین مشہدی اور نظامی قزوینی دربارِ اکبری کے مشہور خطاط تھے۔ محمد حسین کشمیری کو شہنشاہ کی طرف سے زریں قلم کا خطاب ملا تھا۔

جہانگیر و شاہجہاں نے باپ دادا کے نقوشِ قدم پر چلتے ہوئے ذرا اور ترقی کی اور انسانی چہرے تصاویر کے پردوں میں جھلک دکھانے لگے۔ اب یہاں کی مصوری بھی مغربی مصوری کی ہم پلہ اور ہم سر ہو گئی بلکہ بت تراشی کو بھی فروغ ہونے لگا۔ چنانچہ وہ سنگین ہاتھی جو اکبر کے عہد میں فیلبان کے بغیر تراشے یا مصور کئے جاتے تھے، شاہی عماری میں بیٹھے ہوئے بادشاہ کے درشن دینے لگے۔ شاہناموں یا تزکِ بابری و تزکِ جہانگیری جیسی مشہور کتابوں کے وہ نسخے جن کے حاشئے اس وقت تک محض بیل بوٹوں سے مزین ہوتے تھے، صفحات کے بیچ میں واقعاتِ رزم و بزم کا پورا نقشہ پیش کرنے لگے۔ چنانچہ اس زمانے کی ایسی سینکڑوں قلمی کتابیں موجود ہیں جن کو صحیح معنوں میں مصور کہا جا سکتا ہے۔ تاہم یہ کارنامے چونکہ صرف بادشاہ کے ایما و اشارے پر تیار ہو سکتے تھے اس لئے ان کی تعداد محدود رہی اور رعیت میں ایسے قیمتی نسخوں کا رواج عام نہ ہو سکا۔ ان کا ذوق انہی فن پاروں سے تسکین پاتا رہا جو ان کے عہد کے مشہور خطاط یا خوشنویس پیش کرتے رہے۔ عموماً لوگ یہ کرتے کہ اپنے محبوب شعرا کے دل پسند اشعار کسی خطاط سے مرغوب طرز میں لکھواتے اور چوکھٹوں میں جڑوا کر اپنی نشست گاہوں میں آویزاں کر لیتے۔ چنانچہ اس عہد کے ایسے بھی بہت سے نمونے دستیاب ہو سکے ہیں۔

عہدِ جہانگیر کے خوشنویسوں نے قلمی نیزے کے انتخاب، قلم کی تراش اور اس کی نوک پر قط رکھنے کے لئے بھی چند اصول مقرر کئے تھے جن کا لحاظ ابتدائی مشق کے وقت اب بھی ذہن میں رہتا ہے۔

سنہ ۱۶۰۵ء میں میر عماد نے بوستانِ سعدی کو اپنے خوبصورت انداز میں لکھا۔ اس کا اصل نسخہ لاہور کے قاری عبد السلام صاحب کے پاس موجود تھا۔ میر عماد قزوین کے اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی کئی تحریریں ہندوستان آئیں اور شاہجہاں نے بہت پسند کیں۔ کہا جاتا ہے کہ بادشاہ ہر اس شخص کو جو میر عماد کی تحریر فراہم کرتا۔ ایک سالارِ فوج کی تنخواہ کے برابر انعام عطا کر دیتا تھا۔ میر عماد بالکل فقیرانہ زندگی بسر کرتے اور دنیوی معاملات سے کوئی سروکار نہ رکھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایران کے بادشاہ شاہ عباس نے جس کا عہدِ حکومت ۱۵۸۸ء سے ۱۶۲۹ء تک تھا ان کو محض ان کے سنی ہونے کے باعث قتل کرا دیا۔ میر عماد کے بھتیجے عبد الرشید اپنے چچا کے قتل کے بعد شاہجہاں کے عہد میں قزوین سے ہندوستان آ گئے اور بہت جلد دربارِ شاہی میں باریاب ہو گئے۔ بادشاہ نے

ان کو دارا شکوہ کا اتالیق مقرر کر دیا۔ انکی کوشش سے شہزادے نے اس فن میں بڑا نام پیدا کیا۔ عبدالرشید کا انتقال ۱۱۱۸ھ میں ہوا۔ ان کا مزار آگرہ میں موجود ہے۔ ۱۶۹۰ء میں محمد صالح نے حکایاتِ امام جعفرؒ کو خوشخط انداز میں لکھا یہ نسخہ دہلی کے مشہور نواب ابوالحسن حقانی کے پاس محفوظ تھا۔

شاہ اورنگ زیب عالمگیر اور بہادر شاہ ثانی خود بھی اپنے وقت کے اعلیٰ خطاط سمجھے گئے ہیں۔ چنانچہ ان کی خوشنویسی کے بہت سے نمونے قلعۂ دہلی میں اب تک محفوظ ہیں۔ ان کے علاوہ مغل شہزادے فن سپہ گری اور دوسرے علوم و فنون سیکھنے کے ساتھ ساتھ خطاطی بھی ضرور سیکھتے تھے۔ ان میں سے بعض نے ایسا کمال پیدا کیا کہ استادِ وقت بھی انکی تعریف کرنے کے لئے مجبور ہو گئے۔ چنانچہ شہزادہ دارا شکوہ اور مرزا فخرالدین (شہزادہ فتح الملک) کے نام خصوصیت کے ساتھ لئے جاتے ہیں۔ مرزا صاحب نے یہ فن میر پنجہ کش سے سیکھا تھا۔ ان کے ہاتھ کی ایک رباعی جو ۱۸۴۸ء میں لکھی گئی تھی بہت سے دائروں اور لفظوں کی دلپذیر مناسبت کے باعث خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے۔

غدر سے کچھ عرصے پہلے میر پنجہ کش کو سب سے زیادہ شہرت حاصل تھی۔ ان کا اصل نام سید محمد امیر رضوی تھا۔ خطاطی کے علاوہ پنجہ کشی کے زبردست ماہر تھے۔ اور یہی امرِ استعجاب ہے کہ پنجہ لڑانے کے باوجود ان کی انگلیوں میں اتنا لوچ موجود تھا کہ بہترین خطاطی بھی کر سکتے تھے۔ انکی بابت مشہور ہے کہ وہ حاجت مندوں کو امداد کے طور پر کوئی نقد رقم دینے کی بجائے ایک آدھ شعر کاغذ پر لکھ کر دیدیتے تھے تاکہ وہ اس نوشتے کو قدردانوں کے ہاتھ بیچ کر اپنی ضرورت پوری کر لیں۔ کہا جاتا ہے کہ کاغذ کے معمولی پرزوں پر لکھے ہوئے ان کے وہ اشعار بھی اچھی قیمت پر فروخت ہو جاتے تھے۔ مشہور بات ہے کہ ایک روز وہ بازار گئے۔ ضرورت کی کوئی چیز خرید لینے کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ جیب میں رقم موجود نہیں ہے لیکن دکاندار نے انہیں مایوس کرنے کی بجائے انکے سامنے قلم دوات رکھدی اور کہا کہ ایک کاغذ پر کچھ تحریر کر دیجئے۔ غدر کے زمانے میں انکی عمر ۹۰ سال تھی۔ وہ اپنے مکان کو بلوائیوں سے بچانے کی کشمکش میں شہید ہو گئے۔

عباد اللہ اعجاز رقم میر پنجہ کش کے شاگرد اور بہادر شاہ ثانی کے دربار میں باریاب تھے۔ اعجاز رقم کے علاوہ انھیں بادشاہ نے زمرد قلم کا خطاب بھی عطا کیا تھا۔

شاہ عبداللطیف کا تعارف

بقیہ صفحہ ۵۱

اس طرح کی پچاسوں تصویریں شاہ عبداللطیف کے کلام میں ہیں جس میں ان کے لئے بھی کشش ہے جو ان تصویروں سے مانوس ہیں اور ان کے لئے بھی جنھوں نے کبھی یہ تصویریں اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھیں۔

شاہ عبداللطیف کا یہ سارا کلام ایک مجموعہ کی شکل میں مرتب ہو چکا ہے اور شاہ عبداللطیف کے رسالے کے نام سے مشہور ہے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ سندھ کے سب سے محبوب شاعر کے کلام کا یہ مجموعہ بازار میں کہیں نہیں ملتا۔ جو تھوڑے بہت نسخے اس وقت تک مرتب ہو کر شائع ہوئے ہیں وہ بھی شاہ صاحب کے کلام سے گہری دلچسپی رکھنے والے گنے چنے علم دوست حضرات کے ذاتی کتب خانوں کی زینت ہیں۔

اب تک جتنے نسخے مرتب و مدون ہوئے ان کی مختصر تفصیل یہ ہے:-

(۱) شاہ کے کلام کا سب سے پہلا نسخہ ان کی وفات کے چالیس سال بعد ان کے ایک مرید نے مرتب کیا تھا۔ یہ نسخہ لوانری والا نسخہ کہلاتا ہے اور رسالے کے سارے نسخوں میں سب سے زیادہ مستند ہے۔ (۲) لوانری والے نسخہ کے ۶۰ سال بعد ایک اور نسخہ مرتب ہوا، یہ بھٹ والا نسخہ کہلاتا ہے۔ (۳) تیسرا نسخہ سندھ کے شاعر میر عبدالحسین والا کا مرتب کیا ہوا ہے۔ چونکہ میر صاحب نے جا بجا متروک الفاظ نکال کر مروج الفاظ شامل کر دئیے ہیں۔ اسلئے یہ نسخہ مستند نہیں سمجھا جاتا (۴) رسالہ کا ایک نسخہ حکومت سندھ کے ایماء پر بمبئی میں شائع ہوا۔ اس نسخہ میں شاہ صاحب کا مکمل کلام موجود ہے (۵) ایک نسخہ ۱۸۶۶ء میں جرمنی میں چھپا اسے TRUMP والا نسخہ کہتے ہیں (۶) چھٹا نسخہ تاراچند ذوقی لعل کا ہے۔ (۷) ساتواں مرزا قلیچ بیگ کا اس نسخہ میں مرزا قلیچ بیگ نے مرتبہ اور مطبوعہ کلام کے علاوہ بہت سی ایسی چیزیں بھی شامل کر دی ہیں جو سینہ بسینہ اس زمانہ تک پہنچی ہیں اور شاہ عبداللطیف کے نام سے منسوب ہیں (۸) آٹھواں نسخہ ڈاکٹر گربخشانی کا ہے۔ ڈاکٹر گربخشانی نے کلام کی ترتیب و تدوین میں بڑی کاوش و تحقیق سے کام لیا ہے۔ لیکن انکا مرتب کردہ کلام شاہ کا پورا کلام نہیں ہے (۹) ایک نسخہ عثمان علی انصاری صاحب پرنسپل پیر الٰہی بخش ٹریننگ کالج کراچی نے مرتب کیا ہے۔ اس کے تھوڑے تھوڑے حصے سندھی ادب کے مرکزی ایڈوائزری بورڈ آف کنٹرول کے رسالے مہران میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

ف ۱: شاہ عبداللطیف کے کلام کے یہ سارے نسخے عثمان علی انصاری صاحب کے کتبخانہ میں موجود ہیں۔

نئے فلم

ع-ا

ڈولی، اور منجدھار ہماری انحطاط پذیر فلمی صنعت کی نمائندہ تصویریں کہی جاسکتی ہیں۔ ڈولی تیار کرنے والی ٹیم میں بیشتر وہ نام نظر آتے ہیں جو ہدایتکار کی نگرانی میں فلمسازی کے مختلف شعبوں میں تجربہ حاصل کرچکے ہیں۔ اور اس لئے گو ڈولی کے فلمساز ادارہ پر آل انڈیا پکچرز کا ٹریڈ مارک ہے اس ٹیم کی بنا پر ڈولی سے کچھ توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں۔

ڈولی کی ہدایتکاری اچھا نے کی ہے لیکن اس کا عام رجحان ایم صادق کے رنگ میں ہے۔ حرکت وعمل کی رفتار، تسلسل اور مربوط فضا جو صادق کے پچھلے فلموں کی خصوصیتیں ہیں، ڈولی میں بھی بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ منظرنامہ بہت مکمل ہے اور منظر نگار (جو خود ایک کامیاب ہدایتکار بھی ہے) کی شخصیت سارے ماحول پر اس قدر چھائی ہوئی ہے کہ اچھا کو اپنی ذاتی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع ہی نہیں مل سکا۔

ڈولی کی کہانی عام فلمی کہانیوں کی طرح چند حادثات عشق کی ناکامی، دولت وافلاس کی کشمکش اور فرض وقربانی کے تقاضوں کا مجموعہ ہے۔ گو افسانہ نگار نے واقعات کا تانا بانا خاصی چابکدستی سے تیار کیا ہے اور کہانی میں خاصی دلچسپی پیدا کردی ہے لیکن فلم کا مجموعی تاثر اچھا نہیں۔ اس کی وجہ پھسپھسے مکالمے، بے جان گانے اور کمزور اداکاری ہے مکالمے بالکل ربی ہیں اور ان میں آمد کا نام نہیں گانے، سوائے دو ایک کے قطعی مہمل اور گھٹیا ہیں۔ اس پستی کی وجہ سے پختہ کار غلام محمد کی موسیقی اور کاردار اسٹوڈیو کا نغمہ بار آرکسٹرا بھی ان میں جان نہ ڈال سکا۔

اداکاروں میں نمایاں رول سلوچنا چٹرجی کا ہے۔ ایک بے بس اور مجبور اندھی لڑکی سے لے کر امیر زادے کی شوخ وشنگ رفیقۂ حیات تک زندگی کی مختلف منزلوں میں اس نے اداکاری کو خوب نبھایا ہے۔ واسطی ناکام محبت نوجوان کے رول میں ناکام ہے۔ اس کا کردار فلم کے ماحول پر بوجھ سا معلوم ہوتا ہے۔ سوشیل کمار نے ڈاکٹر کے روپ میں اوسط درجہ کا کام کیا ہے۔ ادھوری اور ششی کلا ناکام ہیں۔ البتہ جبیں نے شرابی کا کردار بڑی کامیابی سے ادا کیا ہے۔ بحیثیت مجموعی ڈولی کی اداکاری اوسط درجہ سے کم ہے اور یہ ہدایتکار کی ناتجربہ کاری کا نتیجہ ہے۔

ڈولی کا ایک روشن پہلو اس کی ٹیکنکل پختگی ہے عکاسی بہت کامیاب ہے۔ اسٹوڈیو فوٹوگرافر لا کی چند ساکت تصویریں بہت اعلیٰ درجہ کی ہیں۔ صدابندی صاف اور متوازن ہے اور سیٹنگ عام طور پر موزوں ہیں اس فنی پختگی کے باوجود اداکاری کی خامیوں، کمزور مکالموں اور گھٹیا گانوں کی وجہ سے ڈولی کو اوسط درجہ کے معمولی فلم سے زیادہ درجہ نہیں دیا جاسکتا۔

منجدھار کا خالق سہراب مودی فلمی صنعت کی ایک اہم شخصیت ہے۔ اسکی تصویریں عام طور پر متوازن، سنجیدہ اور لغویات سے پاک ہوتی ہیں لیکن منجدھار میں وہ بھی فلمسازی کے زوال پذیر رجحان سے متاثر نظر آتا ہے۔

منجدھار ایک نوجوان شاعر اور اسکی خوش گلو بیوی کی داستانِ عشق ہے اس لحاظ سے ہیرو کے لئے سریندر اور ہیروئن کے لئے خورشید کا انتخاب لائقِ تحسین ہے۔ موسیقی کی نگرانی غلام حیدر، انل بسواس اور گیان دت جیسے موسیقاروں نے کی ہے۔ گانے عام سطح سے بلند ہیں۔ صادق علی اور بے بی تبسم کی اداکاری بھی اوسط درجہ سے اچھی ہے۔ اسکے باوجود فلم کامیاب نہیں کہا جاسکتا۔ کہانی کی خامی اور منظرنگار اداکاروں کے غلط انتخاب کی وجہ سے یہ اعلیٰ درجہ کی فلمی تخلیق نہیں ہوسکی۔

کہانی میں حسبِ معمول جوشِ عشق اور سماجی مفروضات کی کشمکش پیش کرکے سماج کی جھوٹی اقدار کی شکست دکھائی گئی ہے۔ اس لحاظ سے فلم ترقی پسند رجحانات کا آئینہ دار ہے لیکن آخر میں شاعر اور اسکی بیوی کی موت نے کہانی کے افادی پہلو کو دبا دیا ہے اور فلم کے مجموعی تاثر کو مجروح کیا ہے۔

اداکاروں میں سریندر نے شاعر کے روپ میں اوسط درجہ کا کام کیا ہے۔ خورشید اور صادق علی اوسط درجہ سے بلند ہیں اور بے بی تبسم بالکل ذہانت کی گڑیا معلوم ہوتی ہے۔ اسکے علاوہ کسی کی اداکاری پایہ کی نہیں ہے خصوصاً شاعر کے دوستوں اور پرستاروں کا جمگھٹا بہت ہی مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ ان خامیوں کی وجہ سے فلم کے اچھے پہلو بھی ابھر نہیں سکے۔

مکالمے اور گانے عام سطح سے بلند ہیں۔ برجستہ مکالموں اور خورشید کی کامیاب اداکاری نے بعض نادر لمحے پیدا کردئے ہیں۔ فوٹوگرافی اور صدابندی بہت معمولی ہے۔

و-ع

نئی کتابیں

نئی دنیا کو سلام:- ناشر کتب پبلشرز لمیٹڈ - بمبئی - قیمت تین روپے (۳ ر)

یہ کتاب علی سردار جعفری کی دو نظموں کا مجموعہ ہے پہلی نظم نئی دنیا کو سلام" تقریباً ڈیڑھ سو صفحے کی ایک طویل تمثیلی نظم ہے - اور اس تمثیلی نظم میں شاعر نے اُردو میں پہلی مرتبہ ہندوستان اور انسان کی غلامی کی داستان کا پس منظر کسی قدر تفصیل سے پیش کیا ہے - غلامی کی زنجیروں نے کیسی کیسی دلفریب صورتیں بدل کر آہستہ آہستہ انسان کو اپنے شکنجے میں کسا - کس طرح اسکے جسم کو غلام بناکر اس کے ذہن کی آزادی چھینی اور کس طرح سامراج اور سرمایہ داری نے اسے زندگی کی مادی آسائشوں اور حسن اخلاق کے آدرشوں کے تصور سے بھی محروم کردیا - اور ان کی ساری زندگی پر بھوک، بیکاری، افلاس، قحط و وبا، جہل، جنگ، گیس، بم، اور موت کے سائے منڈلانے لگے - زندگی جب اس طرح محرومیوں کا مجسمہ بن جائے تو تاریخ انقلاب کا تقاضا کرتی ہے اور انسانی ذہن میں بغاوت کا نغمہ بیدار ہوتا ہے - بغاوت اپنے ساتھ طرح طرح کی مصیبتیں لاتی ہے، قید و بند، دار و رسن، بربادی اور موت لیکن وقت کے پاس ان ساری مصیبتوں کا انعام بھی ہے - عہد غلامی کی تیرگی کی جگہ صبح آزادی کا اجالا - علی سردار جعفری نے ہندوستان کی تاریخ کو ذہن میں رکھ کر اس کی زندگی کے ماضی اور حال کی یہی تصویریں پیش کی ہیں اور انہیں کی بنیاد پر ایک روشن مستقبل کا تصور قائم کیا ہے - اس لئے کہ ان کے نزدیک (اور اس بات میں سب ان سے متفق ہوں گے) دنیا کی تاریخ میں "انسان" کو کبھی شکست نہیں ہوئی - تاریخ کا تقاضا ہے کہ وہ ہمیشہ فتح مند اور کامران رہے گا -

شاعر نے نظم کو کئی تصویروں میں بانٹا ہے - ہر تصویر ایک خاص ذہنی کیفیت کی ترجمان ہے - اسی ذہنی کیفیت اور فضا کی مناسبت سے ہر تصویر میں بحریں بدلتی رہی ہیں - کہیں کہیں بحروں کی پابندی کی جگہ آزاد نظم سے بھی کام لیا گیا ہے اور اکثر جگہ اس تبدیلی نے اچھے نتیجے پیدا کیے ہیں - بہت کم موقعے ایسے ہیں جہاں پڑھنے والے اس تبدیلی میں کوئی اجنبیت محسوس کرتے ہوں - کہیں کہیں یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے لفظوں کے انتخاب میں اس فنی ادراک سے مدد نہیں لی جو بحروں کے انتخاب میں اس کا رہنما رہا ہے - اور اس لئے کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ عین اس وقت جب شاعر کے تخیل کی بنائی ہوئی تصویر ہمارے ذہن میں گہرے تاثرات بیدار کر رہی ہے ایک ناموزوں لفظ کی کمی تاثرات کے تسلسل میں جھٹکے ڈال دیتی ہے - جعفری صاحب نے اس طویل نظم میں ہیئت کے مجموعی تاثر کا جو تجربہ کرنے کی کوشش کی ہے وہ اکثر جگہ کامیاب ہے - اگر اس کاوش سے جو ہر اچھے فن کی تخلیق کا پیش خیمہ ہے اور زیادہ کام لیا گیا ہوتا تو یہ نظم اردو کی بہت کامیاب نظموں میں شمار ہوتی -

دوسری نظم "جمہور" ایک سیاسی مثنوی ہے - اور اس مثنوی کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان اصناف سخن میں جنہیں ترقی پسندی کی ایک غلط رو نے مردود قرار دے دیا ہے کتنے امکانات ہیں - جعفری صاحب نے اردو پر بڑا احسان کیا ہے کہ اپنے انقلابی خیالات کے لئے اور اس ادب کے لئے جس کی رگ و پے میں محنت کش عوام کی زندگی کے خون کی روانی ہے ایک ایسی صنف کا انتخاب کیا جسے "فنی اجتہاد" رجعت پسندی کی علامت سمجھتا ہے - یہی ترقی پسندی آنکھیں بند کر کے ہر اس چیز کو قابل لعنت نہیں سمجھے گی جس کے نام پر قدامت کی مہر ہے -

کتاب کا کاغذ، لکھائی، چھپائی اچھی ہے - سر ورق جتنا رنگین اب ہے اس سے کم رنگین بھی ہوتا تو جاذب نظر ہوتا -

ازلی راستے:- مصنف اوپندر ناتھ اشک - ناشر مکتبہ سلطانی، بمبئی - صفحات ۴۸۵، قیمت تین روپیہ (۳ ر)

اردو میں ناول اور ڈرامے مدتوں سے لکھے جا رہے ہیں مختصر افسانوں کی طرف لوگوں نے ذرا بعد میں توجہ کی - لیکن اس صنف ادب کے مرد میدان ناولوں اور ڈراموں کو وقت سے بہت پیچھے چھوڑ کر وقت سے بھی کچھ آگے نکل گئے - اور ڈرامہ بے چارہ اب بھی اپنی ازلی میانہ روی اور سبک گامی سے وقت کی آواز سے بےخبر اپنے بنائے ہوئے راستے پر چلے جا رہا ہے - اس کے تنگ نیک میں پچھلے

(باقی صفحہ ۲۳ پر)

ایکسپریس بلاک
بلاک سازی میں تخلیقی فن کاری کے لئے
مشہور و معروف
حاجی عبداللہ ہارون بلڈنگ
ساؤتھ نیپیئر روڈ کراچی

ماہِ نو

مدیر ——— وقار عظیم

جلد ۱ شمارہ ۲

مئی ۱۹۴۸ء

قیمت فی پرچہ ۸ر

چندہ سالانہ ص ر

کس نے کیا کہا

"جہاں تک صوبائی زبان کا تعلق ہے لوگوں کو اختیار ہے کہ جو زبان چاہیں اختیار کریں۔ لیکن قومی زبان صرف ایک ہو سکتی ہے ——— وہ زبان جو پورے پاکستان میں باہمی اظہار کا ذریعہ بن سکے، وہ زبان صرف اردو ہو سکتی ہے، کوئی دوسری زبان نہیں۔"

قائد اعظم، ڈھاکہ ۲۴ مارچ ۱۹۴۸ء

"آپ مجھ سے اس بات میں متفق ہوں گے کہ آپ خواہ کوئی ہوں اور کہیں ہوں، آپ مسلمان ہیں، آپ ایک قوم کا جزو ہیں۔ آپ نے اپنے لئے ایک سرزمین حاصل کی ہے۔ وہ پوری سرزمین آپ کی ہے۔ وہ کسی پنجابی، سندھی، پٹھان یا بنگالی کی نہیں ——— وہ آپ کی ہے۔"

قائد اعظم، ڈھاکہ، ۲۲ مارچ ۱۹۴۸ء

"پاکستان کی تعمیر و تشکیل میں آپ کو حصہ لینا ہے۔ ایسا کرنے میں آپ کو بہت سی دقتوں کا سامنا کرنا پڑے گا، اور بہت سی قربانیاں کرنی پڑیں گی۔ لیکن یہ سب دقتیں ہمیں برداشت کرنی ہیں اس لئے کہ تاریخ میں موجودہ نسل کا نام پاکستان کے بانیوں کی حیثیت سے لکھا جائے گا۔"

مس جناح، ڈھاکہ ۲۲ مارچ ۱۹۴۸ء

"پاکستان کا قیام ہم میں سے ہر ایک کے لئے اس بات کی زبردست تحریک کا باعث ہونا چاہیئے کہ جتنی جلدی ممکن ہو ہم معاشی زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی کمیوں کو پورا کریں ——— ہمیں چاہیئے کہ تجارت میں کبھی ہمیں جو امتیاز حاصل تھا اُسے دوبارہ حاصل کریں۔"

آنریبل فضل الرحمن۔ وزیر داخلہ، حکومت پاکستان۔ کراچی ۱۲ مارچ ۱۹۴۸ء

"بین الاقوامی امن وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ انسانیت کو اب تیسری جنگ عالم کی اخلاقی پستیوں، مہیب خطروں اور تباہیوں میں مبتلا نہیں کیا جا سکتا ..... امن پاکستان کی نئی حکومت کی ترقی اس کے موزوں ارتقا اور اس کے قیام کے لئے بھی بے حد ضروری ہے۔"

آنریبل لیاقت علی خاں، وزیر اعظم پاکستان ——— کراچی ۲۶ مارچ ۱۹۴۸ء

"میں یہ کہتے وقت خوشی محسوس کر رہا ہوں کہ خدا کی عنایت سے ہماری مشکلیں ختم ہو گئیں، اور ہم نے مئی کے آخر تک کے لئے اپنی ضرورت کی غذا کا ذخیرہ اکٹھا کر لیا ہے۔ اس کے بعد نئی فصل آ جائے گی ——— ہماری نئی فصل نہ صرف پاکستان کی ضرورت کے لئے کافی ہوگی بلکہ ہم دوسرے ضرورتمند ملکوں کو بھی اس میں سے کچھ حصہ دے سکیں گے۔"

آنریبل پیرزادہ عبدالستار وزیر خوراک ... کراچی ۳ اپریل ۱۹۴۸ء

"اسلام کے گرد جمع ہو جائیے، قرآن کے گرد جمع ہو جائیے، مکہ کے گرد جمع ہو جائیے اور عربی کے گرد جمع ہو جائیے ——— اسلامی ریاستوں کا قرآنی آئین کے مطابق قیام ہی دنیائے اسلام کے امور کے لئے اکسیر اعظم ہے۔ اگر مسلمانوں کی سرزمین پر مسلمانوں کی ریاست قائم کر کے ہم نے اپنے اس عہد کا ایفاء کیا جو ہم نے خدا سے کر رکھا ہے تو مخالف قوتیں ہمیں ذروں کی طرح نہیں بکھیر دیں گی۔"

شیخ صالح عشماوی ——— کراچی ۷ اپریل ۱۹۴۸ء

واقعات کی ڈائری

مارچ — اپریل

۶ر مارچ :- دنیا کی ۱۰ قوموں کے نمائندوں نے (جن میں برطانیہ، ریاستہائے متحدہ، فرانس اور ہندوستان بھی شامل ہیں) آج ایک منشور پر دستخط کئے جس کی رو سے جہازوں کی ایک نئی تنظیم قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ڈنمارک، ناروے، سویڈن، پاکستان، نیوزی لینڈ، مصر اور لبنان نے ووٹنگ میں حصہ نہیں لیا۔ اور چین نے اس تجویز کی مخالفت کی۔

۹ر مارچ :- ولندیزی لفٹننٹ گورنر جنرل ڈاکٹر وان موک کی صدارت میں انڈونیشیا میں عارضی حکومت قائم ہوئی۔

۱۰ر مارچ :- زکوسلواکیا کے وزیر خارجہ نے آج پراگ میں اپنے سرکاری مکان کی کھڑکی سے کود کر خودکشی کر لی۔

۱۴ر مارچ :- یمن کے مقتول حکمراں کے بڑے بیٹے امیر سیف الاسلام احمد یمن کے دارالسلطنت صنعاء میں داخل ہوئے اور اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کیا۔

۱۷ر مارچ :- آج مغربی یورپ کی پانچ حکومتوں یعنی بلجیم، فرانس، لکسم برگ، ہالینڈ اور برطانیہ نے ایک پچاس سالہ معاہدہ پر دستخط کئے اور اس کی رو سے معاشی اشتراک عمل اور حملہ کی صورت میں فوجی امداد کا وعدہ کیا۔

کانگریس کے ایک مشترکہ اجلاس میں ریاستہائے متحدہ کی بیرونی پالیسی کا اعلان کرتے ہوئے صدر ٹرومین نے فوج میں لازمی بھرتی کی ضرورت پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت دنیا میں امن قائم رکھنے اور جنگ روکنے کے لئے سخت سے سخت اقدامات ضروری ہیں۔

برطانیہ اور شرق اردن نے جنگ کے دوران میں ایک دوسرے کو فوجی امداد دینے کے لئے ایک معاہدہ پر دستخط کئے۔

خاران، لاس بیلا اور مکران کی ریاستیں پاکستان میں شامل ہوگئیں۔

۱۹ر مارچ :- یو۔ این۔ او میں امریکا کے نمائندوں نے اعلان کیا کہ وہ اب مجلس عام کی تقسیم کی تجویز کی تائید میں شریک نہیں ہیں۔ اور ان کی تجویز ہے کہ پورے فلسطین کے لئے ایک عارضی متولیانہ نظام قائم کیا جائے۔

۲۰ر مارچ :- پاکستان کے گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح مشرقی پاکستان کے دورے پر روانہ ہوئے اور ڈھاکہ پہنچے۔

۲۷ر مارچ :- قلات پاکستان میں شامل ہوگیا۔

۲ر اپریل :- پاکستان نے اپنی صنعتی پالیسی کا اعلان کیا۔

۳ر اپریل :- پاکستان کے وزیر خوراک پیرزادہ عبدالستار نے اگلے سال کی غذائی صورت حال بیان کرتے وقت یہ اعلان کیا کہ غذا میں خاصی بچت ہوگی۔

۴ر اپریل :- ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ہوائی راستوں اور سہولتوں کے متعلق جو گفتگو ہو رہی تھی وہ ختم ہوگئی اور دونوں حکومتوں میں جو باہمی معاہدہ ہوا ہے اس کی رو سے پاکستان کو اس بات کی اجازت مل گئی ہے کہ اس کے جہاز مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے درمیان کی اڑان میں دہلی کے علاوہ ڈم ڈم کے ہوائی اڈے کو بھی استعمال کر سکیں گے۔

۵ر اپریل :- مشرقی بنگال اور مغربی بنگال کی حکومتوں میں سامان اور روپے کی تقسیم کے تعین کے لئے جو کمیٹی مقرر کی گئی تھی اس نے مشرقی بنگال کو کل اثاثہ کا ۸ء۴۶ فی صدی حصہ دیا ہے۔ اس کی قیمت ۴۲ کروڑ روپے ہوگی۔

اسلم جیراج پوری

حضرت ابوذر غفاریؓ

ابوذر کنیت اور نام جندب تھا۔ ان کے والد جنادہ بن کعب اور والدہ رملہ بنت ربیعہ دونوں قبیلۂ غفار سے تھے جو کنانی نسل کی شاخ تھا اور مکہ سے شام کی طرف جو راستہ جاتا ہے، اس کے کنارے مدینہ کے قریب آباد تھا۔

قبیلۂ غفار اور اس کا پڑوسی دوسرا قبیلہ اسلم دونوں کا پیشہ عرب جاہلیت کی عادت کے مطابق لوٹ مار تھا۔ ان کی اوقات بسری ہی غارت گری پر تھی اور یہ لوگ غیر معمولی قسم کے ڈاکو تھے۔

اہل عرب بالعموم اپنے آپ کو دین ابراہیمی کا پیرو کہتے تھے جس میں سال کے چار مہینوں رجب، ذی قعد، ذی الحجہ اور محرم میں جنگ بالخصوصیت کے ساتھ ممنوع تھی، کیوں کہ ان مہینوں میں قومی میلے اور بالخصوص حج کا اجتماع ہوتا تھا جس میں ملک کے اطراف و دیار سے لوگ شرکت کے لئے آتے تھے، اس لئے عام طور پر عرب کے باشندے ان مہینوں کا احترام کرتے اور ان میں ہتھیار نہیں اٹھاتے تھے۔ مگر قبیلۂ غفار نے ان کی حرمت کا بھی لحاظ رکھنا چھوڑ دیا تھا اور ان میں بھی غارت گری کرتے تھے۔ یہاں تک کہ قریش کا قبیلہ جو بیت اللہ کا مجاور ہونے کے باعث تمام عرب میں محترم سمجھا جاتا تھا اور اس کے تجارتی قافلوں پر کوئی عربی قبیلہ ہاتھ نہیں ڈالتا تھا۔ وہ بھی غفار کی دست برد سے ڈرتا اور موسم گرما میں ملک شام کی طرف آتے جاتے ان کی رعایت اور خاطر داری کرتا۔

ابوذر جب جوان ہوئے تو اپنے قبیلہ کے ساتھ راہ چلتے قافلوں اور مخالف قبائل کو لوٹنے لگے اور بہادری کی خصوصیت کی بدولت مشہور ڈاکو ہو گئے۔ وہ قافلوں پر اس طرح جا پڑتے تھے جیسے بھیڑیا ٹوٹ پڑتا ہے۔

ایک مدت کے بعد خود بخود ان کے ضمیر نے اُن کو ملامت کی اور ان سنگین قزاقانہ جرائم اور سخت سفاکانہ مظالم کو صحیح شکل میں ان پر آشکارا کر دیا جس سے ان کو نظر آگیا کہ یہ سب شیطانی حرص کا کرشمہ اور دنیاوی ہوس کی کارفرمائی ہے۔ اس احساس سے ان کا دل اس قدر پسیجا کہ توبہ کر کے اللہ کے خوف اور حساب کے ڈر سے دن رات عبادت کرنے اور معافی مانگنے لگے۔ ان کا خود بیان ہے کہ میں رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہونے سے تین سال پہلے ہی سے نمازیں پڑھتا تھا کسی نے پوچھا، کس طرف؟ بولے کہ جدھر اللہ رخ کر دیتا تھا۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ گذشتہ گناہوں کی پشیمانی سے پوری پوری راتیں روتے اور خدا کے سامنے عاجزی سے گڑگڑاتے گذر جاتیں۔ ابن سعد نے طبقات میں ان سے روایت لکھی ہے کہ "میں عشا کے وقت نماز کے لئے کھڑا ہوتا۔ پچھلے پہر تھک کر زمین پر گر پڑتا، پھر جب دھوپ لگتی تو اٹھتا"۔

انھوں نے اپنے قبیلہ کو بھی ان گناہوں سے روکنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے اس کے اکثر لوگ مخالف ہو گئے، اس لئے ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور اپنے چھوٹے بھائی انیس اور والدہ کو ساتھ لے کر مکہ کی طرف روانہ ہو گئے اور اس کے قریب پہنچ کر ایک بستی میں سکونت اختیار کی۔

جب مکہ میں ایک نبی کی بعثت کی خبر ملی۔ اس وقت اپنے بھائی انیس کو دریافت حال کے لئے وہاں بھیجا۔ انیس اچھے شاعر تھے جن کے اشعار کی لوگ تعریف کرتے تھے بلکہ مقابلہ میں بعض شعراء سے بازی بھی جیت چکے تھے۔ انھوں نے مکہ سے واپس آکر کہا کہ بے شک یہ خبر صحیح ہے اور قریش کے ایک شخص محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے نبی ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ وہ لوگوں کو اکیلے معبود اللہ کی طرف بلاتے ہیں اور بتوں کی پرستش اور ہر قسم کے شرک اور مشرکانہ رسوم سے روکتے ہیں

جس سے ان کی قوم ان کے خلاف ہو گئی ہے۔

حضرت ابوذر یہ اطلاع پا کر مکہ کو روانہ ہوئے۔ وہاں جا کر حرم میں ٹھیر گئے۔ کفار مکہ سے جو آں حضرتؐ کے مخالف تھے، آپ کا پتہ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ کئی دن کے بعد اتفاقاً حضرت علیؓ وہاں آگئے، جن کی عمر اس وقت دس گیارہ سال کی تھی۔ ابوذر کو اجنبی دیکھ کر پوچھا کہ کیسے آنا ہوا؟ ابوذر نے ان کے چہرے سے خیر کے آثار دیکھکر اپنے آنے کی غرض بیان کی۔ حضرت علیؓ ان کو اپنے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے۔ ابوذر سلام کر کے بیٹھ گئے اور کہا کہ جو کچھ آپ کہتے ہیں میں اس کو سننے کے لئے آیا ہوں۔ حضور نے فرمایا کہ میں نہیں کہتا میرا رب کہتا ہے۔ بولے کہ بس وہی سنائیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی چند آیات تلاوت فرمائیں سننے کے بعد حضرت ابوذرؓ مسلمان ہو گئے۔ حضورؐ نے پوچھا کس قبیلہ سے ہو؟ بولے کہ غفار سے۔ تعجب سے آپؐ نے ہاتھ اپنی پیشانی پر رکھ لیا یعنی ایسے لٹیروں میں سے ایسا نیک نفس!

حضورؐ نے ان کی ظاہری حالت فلاکت زدہ دیکھکر حضرت ابوبکرؓ کے سپرد کیا۔ وہ اپنے گھر لائے، کھانا کھلایا، صاف کپڑے پہننے کو دئے اور اپنا مہمان بنا کر رکھا۔

یہ اسلام کا ابتدائی زمانہ تھا جس میں اسکی تعلیم مخفی طور پر ہوتی تھی، کیونکہ کفار مکہ سخت مخالفت کرتے تھے، اس وقت تک کل چار آدمی اسلام لائے تھے۔ پانچویں حضرت ابوذرؓ ہوئے۔ یہ اعلانِ حق میں نہایت بے باک اور نڈر تھے۔ ان سے نہ رہا گیا۔ خانۂ کعبہ میں جا کر جہاں قریشی جمع تھے، توحید کا اعلان کیا۔ وہ صابی صابی (کافر کافر) کہہ کر ان پر ٹوٹ پڑے اور مارنے لگے۔ آخر قبیلۂ بنی بکر کے چند نوجوانوں نے آکر بچایا اور قریش سے کہا کہ یہ ایک پردیسی بیکس مہمان ہے، اس کو کیوں مارتے ہو، خود تمہارے قبیلہ کے جو لوگ صابی ہو گئے ہیں، ان کو مارو۔

باوجود اس کے پھر بھی ابوذر سے نہ رہا گیا۔ ایک دن دوبارہ جا کر خانہ کعبہ میں زور سے کلمۂ طیبہ کا نعرہ لگایا۔ قریش کے لوگوں نے ان کو اس قدر مارا کہ ان کے سر سے خون جاری ہو گیا۔ حضرت عباسؓ نے دیکھا تو دوڑ کر آگئے اور کہنے لگے، یہ تم کیا کر رہے ہو؟ جانتے ہو یہ کون ہے؟ قبیلۂ غفار کا ہے، جو تمہارے شام کے راستہ میں آباد ہے۔ کیا چاہتے ہو کہ تمہارے تجارتی قافلے لُوٹ لئے جائیں؟ یہ سنکر قریشیوں نے ہاتھ روک لیا۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کیفیت دیکھ کر مناسب سمجھا کہ ان کو مکہ سے رخصت کر دیں۔ فرمایا کہ ابوذر! تم اپنی قوم میں جا کر توحید کی تبلیغ کرو۔ اس لئے وہ مکہ سے اپنے گھر چلے آئے۔ وہاں اپنے بھائی انیس کو سمجھایا، وہ مسلمان ہو گئے۔ پھر اپنی والدہ کے سامنے توحید کی تعلیم پیش کی، وہ اسلام لائیں۔ دونوں کو ساتھ لیکر قبیلہ غفار میں پہنچے اور ان کو سمجھانا شروع کیا۔ ایک مدت کی محنت اور کوشش سے وہ ان کی طرف مائل ہوئے اور ان کی باتیں سننے لگے۔

ہجرت کے بعد جب خندق سے قریش اور ان کے حلیف قبائل جنہوں نے ۲۴ ہزار کی تعداد میں مدینہ پر اس غرض سے چڑھائی کی تھی کہ مسلمانوں کو بالکل فنا کر دیں، بے نیل مرام واپس ہوئے اور ان کی اس ناکامی کا سارے عرب میں چرچا ہوا۔ اس وقت ابوذرؓ اپنے قبیلہ غفار نیز اپنے پڑوسی قبیلہ اسلم کو بھی ساتھ لے کر مدینہ میں آئے۔ یہ دونوں قبیلے حضور اکرمؐ کی خدمت میں پہنچ کر مسلمان ہو گئے۔ اس کے بعد اپنے اپنے مقامات کو واپس چلے گئے۔ لیکن حضرت ابوذرؓ رسول اللہؐ کے پاس ہی رہ گئے اور اصحاب صُفّہ میں شامل ہو کر آخر دم تک وہیں رہے۔

یہ آں حضرتؐ کے خادم بھی تھے اور ساتھی بھی۔ ایسا بھی ہوتا کہ حضورؐ سفر میں کبھی کبھی ان کو سواری پر اپنے پیچھے بٹھا لیتے۔ حضورؐ کو اُن پر اس قدر اعتماد تھا کہ خاص اسرار کی تعلیم ان کو دی تھی اور صحابہؓ کی جماعت میں یہ "اصاحب سرّ النبیؐ" کے لقب سے مشہور تھے۔ ان کے قلب میں دُنیا اور متاعِ دنیا کی کوئی محبت نہ تھی۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی گئی ہے کہ

"جو حضرت عیسیٰؑ کے زہد کو دیکھنا چاہے وہ ابوذرؓ کو دیکھ لے۔"

اور یہ استغنا اور بے نیازی آں حضرتؐ کی تعلیمات نے ان کے اندر پیدا کی تھی۔ کیوں کہ حضورؐ دھن دولت بٹورنے کی خرابیاں بار بار ان کو

سمجھاتے رہتے تھے- ایک بار آپ کا گذر کوہِ اُحد پر ہُوا- ابوذرؓ ساتھ تھے،
فرمایا" ابوذرؓ! مجھے اس پہاڑ کے بھی برابر سونا مل جائے تو میں پسند نہ
کروں گا کہ اس میں سے کچھ بھی میرے پاس رہ جائے. سب اللہ کے
بندوں میں اِدھر اُدھر تقسیم کر دوں گا" پھر فرمایا کہ" وہ ہی لوگ
مفلوک ہیں، جو مالدار ہیں بجز ان کے جنہوں نے اپنے مال کو محتاجوں
میں تقسیم کر دیا" دوسری روایت ہے کہ "جو لوگ سونے اور چاندی
کو بند کر کے رکھتے ہیں، وہ ان کے حق میں دہکتی ہوئی آگ ہیں"

ایک دن مسجد نبوی میں ایک شخص آیا، جس کے بدن پر قیمتی
لباس تھا- ایک دوسرا مسکین بھی وہاں تھا جس کے کپڑے پھٹے پرانے
تھے- آں حضرتؐ نے ابوذرؓ سے کہا کہ" دیکھو قیامت کے دن اس فقیر
کی نیکیوں کا وزن اس دولت مند کی نیکیوں کے وزن سے بہت
زیادہ ہوگا"

یہی وجہ تھی کہ حضرت ابوذرؓ ہمیشہ مسکینوں کے ساتھ رہتے- ان
سے ہمدردی کرتے اور فرماتے کہ میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم نے
مجھے یہ ہی حکم دیا ہے کہ میں محتاجوں کو عزیز رکھوں اور ان کے ساتھ
مل کر رہوں- اپنے غلام کے ساتھ بھی مساوات رکھتے تھے- جو خود کھاتے
وہی اس کو کھلاتے اور جو خود پہنتے وہی اس کو پہناتے-

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عہد لیا تھا کہ کبھی کسی سے کوئی
سوال نہ کرنا- اس لئے اگر ان کا کوڑا بھی ہاتھ سے گر جاتا تو گھوڑے سے
اتر کر اس کو اٹھاتے اور یہ جائز نہ رکھتے کہ کسی سے اس کے اٹھانے کا
سوال کریں-

صحابہؓ کی جماعت میں ان کی راست بازی اور حق گوئی مسلّم تھی-
سچی بات کہنے میں ہمیشہ بے باک تھے- ذرا سی بھی کوئی بات خلاف
دیکھتے تو بڑے سے بڑے صحابی کو بھی ٹوک دیتے بلکہ ڈانٹ دیتے-
سب لوگ ان سے ڈرتے اور ان کا ادب کرتے تھے-

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی یہ مدینہ ہی میں رہے-
جب حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو ان کے زمانے میں دمشق چلے گئے
اور وہاں رہنے لگے- اس وقت امیر معاویہ پورے ملکِ شام کے
والی ہو گئے تھے- اور شاہانہ شان و شوکت سے رہتے تھے- ان کے
علاوہ امراء اور رؤسا بھی امیرانہ زندگی گذارتے تھے اور غریبوں اور
محتاجوں کی طرف سے بے التفاتی برتی جاتی تھی- حضرت ابوذرؓ اس کو
کیسے برداشت کر سکتے- انہوں نے اس کے خلاف آواز اٹھائی اور
لوگوں میں اعلان کیا کہ درہم و دینار کو سینت سینت کر رکھنے والے اور اللہ
کی راہ میں خرچ نہ کرنے والے جہنمی ہیں- یہ تلقین مسجدوں، بازاروں، عام
گذرگاہوں اور مجمعوں میں کرنے لگے- یہاں تک کہ فقراء امراء کے
خلاف کھڑے ہو گئے اور ایک عام شورش برپا ہو گئی اور معاملہ اس قدر
بڑھ گیا کہ امیر معاویہ کو اس میں دخل دینا پڑا- انھوں نے حضرت
ابوذرؓ کو بلا کر سمجھانے کی کوشش کی، مگر وہ کب ماننے والے تھے- فرمایا
کہ قرآن میں ہے کہ جو لوگ سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں، ان کو
سخت عذاب ملے گا- امیر معاویہ نے کہا کہ یہ آیت اہل کتاب یعنی
یہودی اور عیسائی پیشوایانِ دین سے متعلق ہے- پوری آیت یہ ہے:-

> اے ایمان والو! اکثر یہودی اور عیسائی پیشوایانِ دین (عالم
> زاہد بن کر) لوگوں کے مال کو ناروا طریقہ سے خورد برد کرتے
> اور اللہ کی سیدھی راہ سے روکتے ہیں اور جو لوگ چاندی اور
> سونا جمع کر کے رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے-
> ان کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو جس دن کو جہنم کی
> آگ میں وہ (درہم و دینار) تپائے جائیں گے اور ان سے
> ان کی پیشانی، پہلو اور پیٹھ داغی جائے گی (اور کہا جائیگا کہ)
> یہ وہی ہے، جس کو تم نے اپنے لئے سینت کر رکھا تھا سو
> اب اپنے خزانے کا مزہ چکھو" (سورہ توبہ رکوع ۵)

حضرت ابوذرؓ کا فرمانا تھا کہ جرم بہر صورت جرم ہے، خواہ اس کا
مرتکب کوئی ہو- اگر روپیہ جوڑ جوڑ کر رکھنا یہودیوں اور عیسائیوں کے
لئے گناہ ہے تو مسلمانوں کے لئے کیوں نہیں گناہ ہے- امیر معاویہ
اس کا جواب نہ دے سکے-

آخر ابوذرؓ برابر اپنی تبلیغ میں مصروف رہے- یہاں تک کہ
غریب طبقہ کے لوگ امراء کو لوٹنے لگے- امیر معاویہ نے ممتاز صحابہ
حضرت عبادہ بن صامت، ابوالدرداءؓ اور عمرو بن العاص کو ان کے
پاس سمجھانے کے لئے بھیجا، لیکن یہ لوگ حضرت ابوذرؓ کے سامنے

کیا کہہ سکتے تھے، کیوں کہ ان حضرات نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی درویشانہ زندگی، متاعِ دنیا سے بے نیازی اور زہد و قناعت کی کیفیت دیکھی تھی۔

حضرت ابوذرؓ نے عبادہ بن صامت سے جو اس جماعت کے رئیس اور بزرگ صحابی تھے، فرمایا کہ اس وفد میں تمہاری شرکت سے مجھ کو بہت رنج ہوا۔ آخر یہ لوگ ان کی حق گوئی اور جلال سے مرعوب ہوکر واپس آگئے۔ اب امیر معاویہ نے ممانعت کردی کہ ابوذرؓ کے پاس کوئی نہ جائے نہ بیٹھے۔ اس اعلان کے بعد جو لوگ حضرت ابوذرؓ کے پاس جاتے وہ خود ان کو منع کرتے کہ میرے پاس سے چلے جاؤ اور امیر کے حکم کی خلاف ورزی نہ کرو۔ اس پر بھی اگر کوئی جماعت نہ اٹھتی تو اس کو وہی باتیں اپنی سناتے۔ فرمایا کرتے تھے کہ

"اگر ابوذرؓ کی گردن پر تلوار بھی رکھ دی جائے اور سچی بات کے کہنے سے روکنے کی کوشش کی جائے تو بھی وہ باز رہنے والا نہیں ہے۔ میرے دوست صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے وصیت فرمائی ہے کہ میں سچی بات کہوں اور اس کی تبلیغ کردوں چاہے وہ کتنی ہی تلخ ہو۔ حکام کی اطاعت ہمارے اوپر فرض کی گئی ہے مگر تین باتوں میں ممانعت کا ان کو حق نہیں ہے۔ بھلائی سکھلانے۔ برائی سے روکنے اور سنت کی اشاعت میں۔"

آخر میں دولت مندوں کی پریشانی بہت بڑھ گئی اور امیر معاویہ کے پاس ان کی اس قدر درخواستیں گذریں کہ انھوں نے مجبور ہو کر حضرت عثمانؓ کو واقعات کی اطلاع دی اور لکھا کہ ابوذرؓ کی وجہ سے یہاں فتنہ پیدا ہو رہا ہے۔ اس لئے آپ ان کو اپنے پاس بلا لیجئے۔ حضرت عثمانؓ نے ایک خاص قاصد کے ہاتھ ابوذرؓ کے پاس حکم بھیجا کہ فوراً مدینے چلے آؤ۔ حکم پاتے ہی اطاعت کے خیال سے مدینہ روانہ ہوگئے۔ یہاں تک کہ بیوی اور بیٹی کو بھی ساتھ نہیں لیا۔ بعد میں امیر معاویہ نے ان دونوں کو آرام کے ساتھ بھیج دیا۔

جب مدینہ میں داخل ہوئے، اس وقت مخلوق ان کو دیکھنے کے لئے ٹوٹ پڑی۔ اب یہاں بھی ان کے پاس بھیڑ لگی رہتی تھی جن میں زر اندوزوں اور سرمایہ داروں کے خلاف تبلیغ کرتے تھے۔ چنانچہ مدینہ میں بھی وہی کیفیت پیدا ہوگئی جو دمشق میں تھی اور فقرا امراء کے خلاف کھڑے ہوگئے۔ لوگوں نے آکر حضرت عثمانؓ سے کہا کہ جس فساد سے بچنے کے لئے ان کو ملک شام سے آپ نے یہاں بلوایا ہے۔ وہی فساد اب یہاں برپا ہو رہا ہے۔ حضرت عثمانؓ نے ابوذرؓ کو بلایا۔ کعب احبار نے ان سے بحث شروع کی کہ جب مال کی زکوٰۃ دے دی گئی تو اس کے جمع کرنے اور رکھنے میں کیا قباحت ہے؟

کعب احبار پہلے یہودی تھے جو حضرت عمرؓ کے عہد میں اسلام لائے تھے۔ کتب سماوی کے عالم تھے اور قرآن کا بھی اچھا علم حاصل کیا تھا، لیکن صحابی نہ تھے۔ حضرت ابوذرؓ کو جو سابقین اولین میں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص تربیت یافتہ تھے، ان کا اعتراض ناگوار معلوم ہوا، غصہ سے ڈنڈا لے کر اٹھے۔ کعب نے خوف سے بھاگ کر حضرت عثمانؓ کے پس پشت پناہ لی۔ مگر ڈنڈا ان کی پیٹھ پر پڑ گیا اور بحث ختم ہوگئی۔ حضرت عثمانؓ ادب کے مارے کچھ نہیں بولے۔ صرف یہ کہا "ہمارا فرض یہی ہے کہ ہم بیت المال کا حق دولتمندوں سے وصول کرلیں۔ زہد اور ترکِ دنیا پر کسی کو مجبور نہیں کرسکتے۔"

لیکن حضرت ابوذرؓ کا خیال تھا کہ جب کہ قرآن میں تصریح کے ساتھ حکم ہے کہ (اے نبیؐ) لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں کیا خرچ کریں۔ کہہ دے کہ جو کچھ بچ رہے۔" (سورہ بقرہ رکوع ۲۷)

یعنی ہر مسلمان کے لئے لازم ہے کہ جو کچھ اس کے جائز اور ضروری اخراجات سے بچ رہے، اس کو فی سبیل اللہ خرچ کردے تو کسی کو پس انداز کرکے جمع رکھنے کا حق از روئے قرآن حاصل نہیں ہے لہٰذا لوگ مجبور کئے جاسکتے ہیں، کیوں کہ خلیفہ کا فریضہ ہے کہ ان کو قرآن کے مطابق چلائے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ سبائی فتنہ ملک کے صوبوں میں پھیلا ہوا تھا۔ بعض لوگوں نے حضرت عثمانؓ سے آکر کہا کہ ابوذرؓ عبداللہ بن سبا کے ورغلائے ہوئے ہیں مگر وہ حضرت ابوذرؓ کی طبیعت اور ان کے رتبہ سے اچھی طرح واقف تھے۔ جانتے تھے کہ جو کچھ کہہ رہے ہیں خلوص اور حقیقت پر مبنی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے فرمایا کہ "آج امرِ حق میں ملامت گروں کی طعن و تشنیع سے نہ ڈرنے والے صرف ابوذرؓ رہ گئے ہیں۔"

جب خلفشار بہت بڑھ گیا، اس وقت حضرت عثمانؓ نے ابوذرؓ سے کہا کہ مناسب یہ ہے کہ آپ مقام ربذہ میں (مدینہ سے مکہ کے راستہ میں ایک طرف واقع ہے) جاکر رہیں۔ یہ سُن کر وہ ربذہ میں چلے گئے۔ وہاں جاکر ایک خیمہ ڈال لیا اور اپنی بیوی اور بچی کے ساتھ رہنے لگے۔ حضرت عثمانؓ نے جاتے وقت ان سے کہا کہ تمہارے گزارے کے لئے میں کچھ مویشی ساتھ کردوں۔ انہوں نے قبول نہیں کیا۔ خود اپنے سالانہ وظیفہ میں سے جو ان کو ملا کرتا تھا، کچھ اونٹ اور بکریاں خرید لیں۔ انھیں سے معیشت کا سامان حاصل کرتے تھے۔

سبائیوں نے یہاں آکر ان کو حضرت عثمانؓ کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی، مگر انھوں نے سختی کے ساتھ ان کو ڈانٹا اور فرمایا کہ جو اپنے مقرر کئے ہوئے امام کی مخالفت کرے، اس کی توبہ بھی قبول نہیں ہوتی۔ میں حضرت عثمانؓ کی اطاعت کو نیکی اور ثواب اور ان کے حکم کی خلاف ورزی کو جرم اور گناہ سمجھتا ہوں۔

ذی الحجہ ۳۲ھ میں انھوں نے ربذہ ہی میں وفات پائی۔ حجاج کی ایک جماعت نے جو اُدھر سے گذر رہی تھی، کفن دفن کا سامان کیا۔ اس جماعت میں حضرت عبداللہ بن مسعود بھی تھے۔ انہوں نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور مکہ میں پہنچ کر حضرت عثمانؓ کو جو حج کے لئے آئے تھے مطلع کیا۔ وہ واپسی میں ربذہ ہوتے ہوئے ابوذرؓ کی بیوی اور بیٹی کو اپنے ساتھ مدینہ لائے۔

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار
نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی
شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

خلش

سُنی برسوں ستاروں سے فضاؤں کی کہانی بھی
بہت دیکھی چمن میں لالہ و گل کی جوانی بھی
مجھے پھر بھی کسی شے کی کمی محسوس ہوتی ہے

مری نظروں میں ہیں سب مشرق و مغرب کے مے خانے
خیال افزا، جنوں انگیز، طوفاں خیز پیمانے
مجھے پھر بھی کسی شے کی کمی محسوس ہوتی ہے

تخیل کی بلندی، جذبۂ صادق کی گہرائی
کوئی تجلی سی گویا میرے سینے میں اتر آئی
مجھے پھر بھی کسی شے کی کمی محسوس ہوتی ہے

بہت کچھ اپنی محفل کے چراغوں سے حرارت لی
حسینوں کے جنوں پرور تبسم کی لطافت لی
مجھے پھر بھی کسی شے کی کمی محسوس ہوتی ہے

دلوں کے زخم، ذہنوں کی نرالی بے بسی دیکھی
ہزاروں حسرتوں کے خون میں ڈوبی ہنسی دیکھی
مجھے پھر بھی کسی شے کی کمی محسوس ہوتی ہے

بہت دیکھا، بہت سوچا، بہت پی پی کے چھلکایا
بہت توڑا، بہت جوڑا، بہت چاہا، بہت پایا
مجھے پھر بھی کسی شے کی کمی محسوس ہوتی ہے

آل احمد سرور

اختر انصاری

دنیا کی دوسری بڑی لڑائی

(شاعر کے نغموں میں)

شاعر کائنات کے ہاتھوں میں ایک ساز ہے۔ فطرت ایک مضراب کی طرح اس ساز کو چھیڑتی ہے اور اس کے تاروں سے زندگی کے رنگا رنگ نغمے پیدا کرتی ہے۔ یہ ساز نہایت درجہ حساس ہے۔ کائنات کی خفیف سے خفیف دھڑکن اسے متاثر کئے بغیر نہیں رہتی۔ فطرت کا ہلکے سے ہلکا اشارہ اس کے تاروں میں ایک جھنجھناہٹ پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے تھرتھراتے ہوئے بے قرار تاروں سے جو موسیقی پیدا ہوتی ہے وہ زندگی سے علیحدہ کوئی دوسری چیز نہیں ہوتی۔ کائنات، فطرت اور زندگی! یہی تین چیزیں ہیں جن کی روشنی میں شاعر کے اصلی خدوخال کو جانا اور پہچانا جا سکتا ہے۔ شاعر کا فکر و احساس انھیں تین چیزوں تک محدود ہے اور انھیں تین چیزوں کی بے پایاں وسعت کی طرح لامحدود و بے کراں بھی ہے۔

کائنات، فطرت اور زندگی ہر لحظہ بدلنے والی اور نئی نئی شکلوں میں ڈھلنے والی حقیقتیں ہیں۔ اور شاعر ایک زندہ اور متحرک وجود کی حیثیت سے ان حقیقتوں کے اثرات قبول کرنے پر مجبور ہے۔ وہ اپنے اردگرد کی مادی دنیا سے منہ نہیں موڑ سکتا۔ نہ اپنے انسانی ماحول سے آنکھیں چرا سکتا ہے۔ وہ اپنے خارجی گردوپیش کی بنیادی قوتوں اور اساسی مسئلوں ہی کو احساس، تخیل اور وجدان کے سانچوں میں ڈھال کر پیش کرتا ہے۔

شاعر کی حس دوسروں کے مقابلے میں زیادہ تیز ہوتی ہے۔ وہ اپنی غیر معمولی سوجھ بوجھ اور قوی تر ادراک کی بنا پر زندگی اور زندگی کے مظاہر کو نہ صرف تفصیل بلکہ گہرائی کے ساتھ بھی دیکھنے کی قدرت رکھتا ہے۔ وہ اپنے وقت کے اہم اور غیر اہم مسائل کے سطحی پہلوؤں سے گزر کر ان کے بنیادی پہلوؤں کو دیکھتا ہے اور سیاسی و سماجی پس منظر میں ان کا مطالعہ کرتا ہے۔ اس کی نظر زندگی کے سرسری جائزے پر اکتفا نہیں کرتی اور زندگی کی سطح تک محدود رہنے کی بجائے سطح کو چیر کر ان بنیادی قوتوں تک پہنچتی ہے جو زندگی کی تہوں میں کارفرما ہوتی ہیں۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ شاعر کا مادی اور انسانی ماحول کسی تاریخی تقاضے کی زد میں آکر غیر معمولی تاریخی حالات کا منظر پیش کرتا ہے۔ مثلاً کوئی بڑی لڑائی چھڑ جاتی ہے یا کوئی اہم سیاسی انقلاب رونما ہو جاتا ہے۔ ان غیر معمولی حالات میں وقت کی بنیادی حقیقتیں زندگی کی سطح پر ابھر آتی ہیں اور ایسی پیش پا افتادہ حقیقتیں بن جاتی ہیں جو سطح بین نظروں سے بھی پوشیدہ نہیں رہ سکتیں۔ اور ظاہر ہے کہ شاعر تو ان کو کسی طرح نظرانداز نہیں کر سکتا۔

۱۹۳۰ء کے بعد دنیا ایک ایسے ہی غیر معمولی حالات کے دور کی طرف تیزی کے ساتھ قدم بڑھا رہی تھی۔ یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو چکی تھی کہ دنیا کی پہلی بڑی لڑائی دنیا کی آخری لڑائی نہیں تھی۔ ایک دوسری بڑی لڑائی کی ضرورت ناقابل انکار طور پر واضح ہوتی جا رہی تھی۔ یورپ کی سامراجی جمہوریت اپنی خارجی اور اندرونی کمزوریوں کی وجہ سے اس منزل میں پہنچ گئی تھی جہاں اس کے بطن سے فاشزم کا پیدا ہونا ایک لازمی امر تھا۔ چنانچہ فاشزم کا فتنہ بیدار ہو چکا تھا اور پہلے اٹلی اور پھر جرمنی میں مضبوطی کے ساتھ اپنے قدم جما چکا تھا۔ یورپ کے مختلف ملک مثلاً اسپین، آسٹریا اور چیکو سلواکیہ یکے بعد دیگرے فاشزم کی خون آلود قربان گاہ پر بھینٹ چڑھائے جا رہے تھے۔ ساری دنیا ایک آتش فشاں کے دہانے پر کھڑی تھی۔ ایسا آتش فشاں جس کے لئے ہر وقت ممکن تھا کہ یکایک پھٹ پڑے اور انسانی زندگی کو اپنے منتشر لاوے کے ساتھ ساتھ انسانی تہذیب کو بھی جلا کر راکھ کر دے۔ دنیا کے

مختلف حصوں میں اس آتش خیزی اور ہلاکت باری کے آثار ظاہر بھی ہو چکے تھے۔ نانکنگ، شنگھائی، میڈرڈ، بارسلونا، اور تہذیب وتمدّن کے بہت سے اہم مرکز تباہی، ہلاکت اور آتش زدگی کا مرکز بنے ہوئے تھے۔

بالاخر ۱۹۳۹ء کے اواخر میں ایک دن یہ آتش فشاں پہاڑ پھٹ پڑا۔ توپوں کے دہانے کھل گئے اور بموں کی بارش شروع ہو گئی۔ روئے زمین کا ایک وسیع رقبہ تو میدان جنگ میں تبدیل ہو ہی گیا لیکن جو علاقے براہ راست جنگ کی زد میں نہیں تھے وہ بھی ہلاکت اور بربادی کے خطرے سے گھرے ہوئے تھے۔ جہاں بھی انسانی آبادی تھی وہاں موت کا بھیانک اندیشہ لاحق تھا اور جس جگہ بھی تہذیب وتمدّن کی روشنی جگمگاتی تھی وہاں درندگی اور بربریت کی تاریکی منہ پھاڑے نظر آتی تھی۔

ان حالات میں کوئی بھی چشم پوشی یا بے حسی سے کام نہیں لے سکتا۔ اور شاعر کے لئے تو ناممکن تھا کہ وہ غیر متاثر رہتا۔ وہ انجم و مہتاب، نغمہ و سرودٗ، بہار و گلزار، ادا اور رنگ و نکہت کا شیدائی تھا اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ ساری حسن بھری کائنات آگ اور خون کے سیلاب میں غرق ہو جانے کو ہے۔ اس کے ساز کے تاروں کو جنبش ہوئی اور ایک دردناک نغمہ فضا میں گونجا

مرا جام مستی سے خالی ہے آج ہے نغمہ مرا نغمۂ نیم رنگ
زمین چمن خوں سے ہے سرخ پوش ابھی تک ہے کیوں چاندنی سیم رنگ؟

مگر یہ شاعر کا ایک فوری ردِ عمل تھا محض ایک شاعرانہ احساس!

جب اُس نے اپنے دور کے اجتماعی نظام اور اس کی بنیادی حقیقتوں پہ نظر ڈالی تو اُس نے محسوس کیا کہ انسانوں کی کثیر آبادی کے لئے جنگ کا زمانہ دراصل امن کے زمانے سے کچھ بہت مختلف نہیں ہے۔ دنیا کے مظلوم طبقوں اور محکوم قوموں کے لئے امن اور جنگ دراصل ایک ہی بات ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ امن کے دور میں خون آشامی اور خوں ریزی کا جو کھیل مہاجنی اداروں اور ریاست وحکومت کے ایوانوں میں ریشم و اطلس کے بھاری بھاری پردوں کے پیچھے کھیلا جاتا تھا۔ وہی کھیل اب جنگ کے زمانے میں کھلم کھلا بے لگام اور بے روک ٹوک کھلی زمین اور کھلے آسمان کے درمیان کھیلا جا رہا ہے۔ جنگ ہو یا امن، عوام کی سیاسی محکومیت اور اقتصادی مظلومیت برابر قائم رہتی ہے۔ اگر جنگ کے زمانے میں عوام کے خون سے ہولی کھیلی جا رہی ہے تو امن کے دنوں کی رونق کیا عوام کے خون کی مرہون منت نہ تھی؟

یہ تباہی اور ہلاکت کا جنوں یہ شکست و فتح کا مہلک فسوں
یہ مسلح فوجیوں کا طمطراق یہ بلکتی ماؤں کا سوزِ فراق
آسماں سے موت کی یہ بارشیں رات دن یہ قتل ہی کی سازشیں
یہ حصولِ برتری کے مشورے اور یہ غارت گری کے مشورے
یہ اچھوتی وضع کے آلاتِ جنگ یہ تحیّر آفریں حالاتِ جنگ
کھیل ہے سارا ہمارے خون کا ایک فوارہ ہمارے خون کا!

اور وہ دورِ اماں، وہ عہدِ امن وہ تعیش کا سماں، وہ عہدِ امن
امن کی وہ برکتیں یا دش بخیر وہ سکوں وہ راحتیں یا دش بخیر
وہ ادب وہ علم، وہ تنقیدِ فن وہ ثقافت، وہ سیاست وہ مدن
گفتگو وہ آرٹ پر وہ ذکرِ شعر وہ حسین راتوں میں اکثر فکرِ شعر
شام کی وہ پر تکلف صحبتیں وہ طرب خانوں کی رنگیں عشرتیں
برق پاروں کا وہ سیلِ بے کراں شب کو بھی وہ روزِ روشن کا سماں
دل فریبی وہ تماشا گاہوں کی دیدہ زیبی وہ تماشا گاہوں کی
گیت میں وہ لمبی تانوں کی بہار رقص میں وہ ننگی رانوں کی بہار
مے کدوں میں وہ ہجومِ مرد و زن وہ جمالِ ساقیانِ سیم تن
الغرض وہ عیش کی دنیا وہ امن جنگ سے پہلے جو قائم تھا وہ امن

رنگ تھا کس چیز کا اس امن میں؟ کیا ہمارا خوں نہ تھا اس امن میں؟

شاعر دیکھتا ہے کہ اس کے اس خیال کی تصدیق بار دِگر دے حالات سے بخوبی ہو رہی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ دنیا کے ایک بڑے حصّے میں آگ لگی ہوئی ہے، انسانی خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں، بچے، عورتیں اور بوڑھے تک لاکھوں کی تعداد میں قتل کئے جا رہے ہیں، آبادیاں اور بستیاں قبرستانوں اور کھنڈروں میں تبدیل ہو رہی ہیں لیکن اس کے باوجود استحصالی طبقوں کی عیش پرستانہ زندگی اپنے پرانے معیار پر قائم ہے۔ اس مطالعے کی روشنی میں شاعر کا نغمہ طنز میں

بجھا ہوا نشتر بن جاتا ہے ——————

وہی زندگی ہے، وہی مشغلے ہیں   وہی طبعِ پُرجوش کے ولولے ہیں
امنگیں وہی ہیں، وہی حوصلے ہیں   اگر ہے گرانی فزوں انتہا سے

ہماری بلا سے

کہ ہم حسبِ سابق جئے جا رہے ہیں

وہی صحبتِ شام ہے مے کدوں میں   وہی گردشِ جام ہے مے کدوں میں
وہی عشرتِ تام ہے مے کدوں میں   اگر لوگ مرتے ہیں قحطِ غذا سے

ہماری بلا سے

کہ ہم حسبِ سابق جئے جا رہے ہیں

ہمارے شبستاں ہیں سرشارِ عشرت   طرب خانے اپنے گراں بارِ عشرت
بہاریں ہماری فرح بارِ عشرت   اگر بم برستے ہیں اوجِ فضا سے

ہماری بلا سے

کہ ہم حسبِ سابق جئے جا رہے ہیں

جنگ ۱۹۳۹ء کے موسم خزاں میں شروع ہوئی تھی۔ ۱۹۴۰ء کے موسم گرما میں نازیوں کی جارحانہ کارروائیاں ایک دم زور پکڑ گئیں۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے فرانس کا پرچم سرنگوں ہو گیا۔ وہ ملک جو سینکڑوں برس سے امن، آزادی اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنا ہوا تھا اب فاشسٹ درندوں کی ٹھوکروں میں ایک زخمی شکار کی طرح پڑا تھا۔ یہ وہ سرزمین تھی جہاں کے تہذیبی اداروں اور ثقافتی مرکزوں سے علم، ادب اور آرٹ کی شعاعیں پھوٹتی تھیں اور سارے عالم انسانیت کو منور کرتی تھیں مونالزا، اطالوی مصور لیونارڈو کا شاہکار، اور دنیا کی مشہور ترین تصویر جو پیرس کی پکچر گیلری کی ملکیت اور زینت ہے گویا فرانسیسی کلچر کا نشان ہے۔ یہ گویا علامت ہے اس ذہنی برتری کی جو ذہن و دماغ، علم و ادب، اور فن و ثقافت کی دنیا میں فرانس کو روئے زمین کے دوسرے خطوں پر حاصل ہے۔ شاعر نے کلچری ترقی کی اسی نشان اور تہذیبی عظمت کی اسی علامت کو اپنا مخاطب بنایا اور اس فن کارانہ تخاطب کے پردے میں انسان کی ہلاکت اور انسانی ذہن کی اہانت پر آنسو بہائے ——————

آج تو اس حسین تبسم میں   کوئی تاثیرِ زہر ہی ہوتی
اور اگر وہ نہیں تو کم سے کم   طنز کی ایک لہر ہی ہوتی

یہ تبسم کی دھیمی دھیمی رو   موجِ نورِ فرانس ہے بے شک
ہے یہ نازِ اطالیہ لاریب   اور غرورِ فرانس ہے بے شک

——————

یہ تبسم کہ ہے بہت شیریں   زندگی کی مٹھاس ہے، مانا
موت پر فتحِ حُسن کی ہے یہ   اور تمدن کی آس ہے، مانا

——————

مگر افسوس اے حسیں شہ کار!   خود تمدن ہے آج خاک بسر
خون میں لتھڑی لاش ہے تہذیب   زندگی کی ہے لاج خاک بسر

——————

آج تو اس حسین تبسم میں   کوئی تاثیرِ زہر ہی ہوتی
اور اگر وہ نہیں تو کم سے کم   طنز کی ایک لہر ہی ہوتی

۱۹۴۱ء کے موسم گرما میں فاشیت کے دیو نے سوویٹ جمہوریت کی پیٹھ میں چھرا بھونکا۔ اس چیز نے جنگ کی نوعیت اور حیثیت کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ دنیا بھر کے ادیب، آرٹسٹ اور اہل علم جو اب تک جنگ کے بارے میں ایک بے تعلقی کا سا برتاؤ اختیار کئے ہوئے تھے، اور ایک تذبذب کے سے عالم میں تھے اب ایک سلجھے ہوئے نقطۂ نظر کے ساتھ فاشزم کے خلاف قلمی جہاد میں مشغول ہو گئے۔ اب ان پر یہ امر اچھی طرح واضح ہو گیا کہ اگر انسانی زندگی اور انسانی تہذیب کو دنیا میں باقی رہنا ہے تو بین الاقوامی فاشزم کو جلد سے جلد صفحۂ ہستی سے نابود ہو جانا چاہئے۔ فاشسٹوں کی تہذیب دشمنی اور تمدن سوزی کبھی بھی راز نہ تھی۔ وہ ہمیشہ علوم و فنون اور اہل علم اور اہل فن کے کھلے ہوئے دشمن رہے تھے۔ کتب خانوں، تصویر خانوں اور عجائب گھروں کو آگ لگانا، قدیم فنی شاہکاروں کو خاک میں ملانا، ادیبوں، فلسفیوں، اور سائنسدانوں کو جلاوطن کرنا یا موت کی گود میں سلا دینا —————— یہ ان کی تاریخ کے نمایاں کارنامے تھے۔ وہ علانیہ طور پر ہزاروں سال پہلے کی وحشیانہ اور غیر متمدن زندگی کی طرف لوٹ جانے کے علم بردار تھے۔ تمام دنیا کے اہل علم اس بہیمیت کے خلاف احتجاج بھی کرتے رہے تھے۔ مگر اب یہ طوفان اپنے غلیظ سرچشمے سے آگے بڑھ کر دنیا کے ایک بڑے حصے پر چھا گیا تھا اور عنقریب ساری دنیا کو ہڑپ کرتا ہوا دکھائی

دیتا تھا۔ اب اس کے خلاف اہلِ علم کا ردِ عمل یوں ظاہر ہوا کہ انھوں نے انسان اور انسان کی فضیلت اور تخلیقی قوت کو ہلاکت سے بچانے کے لئے ایک عالمگیر محاذ مرتب کیا اور ایک زبردست قلمی جنگ کا آغاز کیا۔ شاعر نے بھی ایک واضح انداز میں فاشزم کی انسان دشمنی کے خلاف اپنی آواز اٹھائی ——

دیوِ استبداد ! کیا کہنا ترا　　ظلم کے منّاد ! کیا کہنا ترا
اے ستم ایجاد ! کیا کہنا ترا　　اے مرے صیاد ! کیا کہنا ترا

حکمراں ہے ہر جگہ تخریب آج　　مل رہی ہے موت کو ترغیب آج
لُٹ رہی ہے خاک میں تہذیب آج　　اے مرے صیاد ! کیا کہنا ترا

آنسوؤں میں خون بھی شامل ہو آج　　نغمۂ شعر و ادب گھائل ہے آج
رونقِ گلزار لاطائل ہے آج　　اے مرے صیاد ! کیا کہنا ترا

اجڑے بازاروں میں ہنگامہ نہیں　　سونی گلیوں میں صدائے پا نہیں
ٹھنڈے چولھوں سے دھواں اٹھتا نہیں　　اے مرے صیاد ! کیا کہنا ترا

تھی جو طاقت خادمِ انسانیت　　بن گئی وہ ہادمِ انسانیت
بلکہ سچ مچ عادمِ انسانیت　　اے مرے صیاد ! کیا کہنا ترا

نیستی، دارالفنا، ملکِ عدم　　مل کے سب کھاتے ہیں ہم، دمبدم
تیرے خون آلود جبڑوں کی قسم　　اے مرے صیاد ! کیا کہنا ترا!

۱۹۴۳ء میں بیسویں صدی کا خوفناک ترین قحط بنگال کی زرخیز زمین سے پیدا ہوا۔ وہ خطہ جس کی فضائیں شعر و ادب اور موسیقی کے رسیلے نغموں سے گونجتی تھیں بھوک اور بھوک سے پیدا ہونے والی لعنتوں کا گھر بن گیا۔ ریل اور ہوائی جہاز اور ٹیلیفون اور ریڈیو کی دنیا میں لاکھوں انسان قلّتِ غذا کے اس طرح شکار ہوئے جس طرح شاید ازمنۂ وسطیٰ کے نیم بربری حالات میں بھی نہ ہوتے ہوں گے۔ اور یہ لاکھوں انسان بھوک سے دم توڑ رہے تھے اس حال میں کہ لاکھوں من غلّہ گوداموں میں بھرا رہا، اور ذخیرہ بازوں، نفع خوروں اور مہاجنوں کی رنگ رلیاں پورے زور و شور کے ساتھ جاری رہیں۔ شاعر نے کلکتے کی زندگی کا یہ تضاد دیکھا اور اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا ——

نازنینوں کا یہ نازِ دل فریب　　دردمندوں کا مداوا ہی سہی
جگمگاتی شاہراہوں کا یہ نور　　تیرہ بختوں کا اجالا ہی سہی
یہ تماشا گاہوں کی رنگینیاں　　ناامیدوں کا سہارا ہی سہی
یہ طرب خانوں کی دنیائے نشاط　　قحط کے ماروں کی دنیا ہی سہی
دل کی حیرانی کو ہمدم ! کیا کروں
اپنی نادانی کو ہمدم ! کیا کروں

قحط، موت اور تباہی کے اس ماحول میں شاعر نے محسوس کیا کہ ذہنی مشاغل کو دلجمعی اور یک سوئی کے ساتھ کسی طرح جاری نہیں رکھا جا سکتا۔ اس نے سوچا، یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ انسانیت کی تقدیر چند جاہل، متعصب، نکمے اور عیاش افراد کے ہاتھوں میں ہے اور بے چارے شاعر، ادیب، آرٹسٹ، فلسفی اور سائنسداں جن کی متفقہ کوششوں سے اس کرۂ آب و باد کو ایک بہشتِ رنگ و بو میں تبدیل کیا جا سکتا تھا بے بس ہیں اور شریف آدمی عاجز و حیران ہیں۔ چند بدمعاشوں نے انسانیت عامّہ پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ بھوک، ذہنی پستی اور اخلاقی مذلت کے تاریک سائے گہرے ہوتے جا رہے ہیں اور دنیا ایک لق و دق صحرا بنتی جا رہی ہے۔ زندگی کے حسن کو خود دیکھنا اور دوسروں کو دکھانا، علم کی روشنی کو خود حاصل کرنا اور دوسروں تک پہنچانا یہ اعلیٰ تہذیبی مشغلے ہیں جن کے لئے مہذب حالاتِ زندگی درکار ہیں۔ جنگ نے یہ حالات یکسر ختم کر دئے تھے اور جنگ سراسر فاشزم کی پیداوار تھی۔ قدرتی طور پر فاشزم تخلیقی آرٹ کا قاتل ہونے کی حیثیت سے شاعر کی نظروں میں ابدی لعنتوں کا مستحق قرار پایا ——

کس کے تیروں کی زد پہ اے ہمدم !　　شعر اور آرٹ کا جہان ہے آج ؟
زخم آلودہ ہے مرا بربط　　میرا نغمہ لہولہان ہے آج

لذتِ مے تھی جن ہواؤں میں　　ان میں تاثیرِ زہرِ قاتل ہے

جس میں آبِ حیات کی تھی مہک آج اس جام میں ہلاہل ہے

یہ دہکتا ہوا لہو ہمدم! کس کے ایوانِ جبر پر برساؤں؟
یہ ہلاکت فروز زہر، بتا کس کے ناپاک حلق میں ٹپکاؤں؟

کس نے جذبات پر چلائی چھری؟ کس نے احساس کو کیا گھائل؟
دشمنِ رنگ و حسن و نور ہے کون؟ کون ہے میرے آرٹ کا قاتل؟

کون ہے؟ سچ بتا مجھے ہمدم! آرٹ کا واسطہ تجھے ہمدم!

اب فاشزم زوال کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ جرمنی نے روسی جمہوریت کو اپنے منہ کا نوالہ بنانے کی جو غدارانہ سازش کی تھی وہ ناکام ثابت ہو رہی تھی۔ روس کی عوامی فوج نے جرمن فوجوں کو ناک چنے چبوا دیئے تھے، اور نازیوں نے جس میدان جنگ کو اپنی عظیم ترین فتح کا میدان بنانا چاہا تھا وہی میدان اب ان کا قبرستان بنتا دکھائی دے رہا تھا۔ روسی جاں بازوں نے دنیا کی تاریخ کے سب سے خوفناک حملے کو رد کیا تھا اور دنیا کی سب سے بڑی لڑائی کامیابی کے ساتھ لڑی تھی۔ اُن کی شاندار مدافعت نے قربانی، شجاعت، سرفروشی اور یک جہتی کی جو مثال پیش کی تھی اس سے تاریخ عالم کے اوراق اب تک خالی تھے۔ ان کی بے مثال دلیری نتیجہ تھی اُن کے عقیدے کی بے پایاں پختگی اور ان کے مقاصد کی ناقابلِ انکار عظمت کا۔ اور اسی کی بدولت وہ دورِ جدید کی مہلک ترین تحریک کا رُخ زوال کی طرف پھیرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ اُن کی بیس سال کی تعمیری کارگزاری جو باقی دنیا کے دو ہزار سال کے تعمیری کام پر بھاری تھی خاک میں مل چکی تھی۔ سٹالن گراڈ اینٹوں اور پتھروں کا ایک ڈھیر تھا۔ لیکن شاعر کی نظر میں یہ تباہی اسٹالن گراڈ کی تباہی نہ تھی، بلکہ دراصل بین الاقوامی فاشزم کی تباہی تھی ——

خاک و خوں کا ڈھیر ہیں، خاشاک کا انبار ہیں
سارے ایوانِ فلک فرسا اسٹالن گراڈ کے
مسکرا کر کان میں کہتا ہے کوئی، یہ کھنڈر
فاشسیت کے کھنڈر ہیں یا اسٹالن گراڈ کے؟

اور سچ تو یہ ہے کہ اب جب کہ روسی فوجوں نے جنگ کا رُخ ہی بدل دیا تھا، دنیا کا ہر وہ حصہ جہاں ٹینکوں اور ہوائی جہازوں کی لائی ہوئی تباہی اور بربادی کے آثار تھے فاشسٹوں کی اور فاشسٹوں کی جنگ آرائی اور موت کا نشان تھا ——

سرنگوں ایوان، اجڑے بام و در، ویراں شہر
ہیں پھریرے فتح کے، ہیں یادگاریں جیت کی
دیکھتے ہو یہ جو تم دھرتی کے سینے میں شگاف
قبر کھودی جا رہی ہے جنگ کے عفریت کی

فاشزم کے انجام کا آغاز ہو چکا تھا۔ لیکن فاشسٹ اب بھی غارتگری کے تمام ساز و سامان سے پوری طرح مسلح تھے اور ان کے غارت گرانہ عزائم میں کسی طرح بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ان حالات میں شاعر کی نظر ان بستیوں پر پڑتی ہے جو جنگ کے اثرات سے کسی قدر محفوظ رہی ہیں اور جہاں مہذب زندگی اور اس کے مشاغل کسی حد تک برقرار رہے ہیں۔ وہ ان بستیوں کا ذکر کر کے فاشزم کو ایک بے پناہ طنز کا نشانہ بناتا ہے اور ایک نہایت لطیف پیرائے میں فاشسٹ نظام کے خاتمے کی طرف اشارہ کرتا ہے ——

کچھ ستم اور، دیوِ استبداد!
اک قدم اور، دیوِ استبداد!

اب بھی ہیں چند سخت جاں باقی ہیں ابھی ایسی بستیاں باقی
آگ اور خون میں جو غرق نہیں پائمالِ شرار و برق نہیں
پھول کھلتے ہیں صبح و شام جہاں شعر و نغمہ نہیں حرام جہاں
بچے ہنستے ہیں کھلکھلاتے ہیں ڈالیوں پر طیور گاتے ہیں
جگمگاتی ہیں حسن سے گلیاں اور دلوں کی چٹکتی ہیں کلیاں
دن کو چولھوں میں آگ جلتی ہے قصہ گوئی میں رات ڈھلتی ہے
ہیں ابھی ایسی بستیاں باقی اب بھی ہیں چند سخت جاں باقی

کچھ ستم اور، دیوِ استبداد!
اک قدم اور، دیوِ استبداد!

تیری منزل ہے اب قریب بہت رہی دنیا ستم نصیب بہت!

فاشزم پر جاں کنی کا عالم طاری تھا۔ مگر جنگ کے شعلے اب بھی بھڑک رہے تھے۔ قتل و غارت کا بازار اب بھی گرم تھا۔ آسمان سے برسنے والے بموں کے دھماکے خوبصورت شہروں کو اب بھی کھنڈرات میں تبدیل کر رہے تھے۔ البتہ امن، آزادی اور مسرت کے پرستاروں میں اب ہراس اور پریشانی کی جگہ ایک رجائیت پیدا ہو چکی تھی۔ اب ان کی نظروں میں جنگ کے بھڑکتے ہوئے شعلے فاشزم کی جلتی ہوئی چتا کی حیثیت رکھتے تھے۔ شہروں کے کھنڈر اب ان کو ایک شاندار تعمیر کا پیش خیمہ معلوم ہوتے تھے۔ شاعر نے تاملک کے کھنڈروں کو اسی زاویۂ نگاہ سے دیکھا اور اپنے تاثر کو ایک تیکھے انداز میں پیش کیا ——

اک مسافر ہوں، اجنبی ہوں بتاؤ
اس معمے کا مجھ کو حل کوئی
زلزلے نے گرائے ہیں یہ مکاں؟
یا بنے گا یہاں محل کوئی؟

یہ رجائی نقطۂ نظر علمائے سیاسیات کے منطقی نتائج کے منافی نہ ہوتے ہوئے بھی ان سے علیحدہ ایک چیز تھی۔ سیاسی نظریات کی دنیا میں تو انسان کی کم نظری کا ابھی تک یہ حال ہے کہ اس جنگ کے بارے میں کوئی بھی ٹھیک ٹھیک یہ نہ بتا سکا تھا کہ واقعات کیا شکل اختیار کریں گے۔ بڑے سے بڑا مبصر بھی غور غاں کرنے کے سوا کوئی اہم پیشین گوئی نہ کر سکا تھا۔ گویا انفرادی طور پر تو بڑے بڑے کھاگ پڑے ہوئے تھے۔ برٹرنڈ رسل اور جوڈ اور دیگر ادملا سکی اور برنارڈ شا! مگر جہاں تک عالمگیر حالات کا تعلق ہے سبھی تو بے خبری اور قیاس آرائی کی دلدل میں پھنسے ہوئے تھے۔ انسان یا تو ماضی کے گڑھوں میں دبا پڑا رہتا ہے، یا پھر مستقبل کے خوش آئند خواب دیکھا کرتا ہے۔ حال کی نبض پر کسی کی انگلی نہیں ٹھہرتی اب جنگ کے آخری دنوں میں شاعر نے جو رجائی نقطۂ نظر اختیار کیا اس میں عقیدے کی پختگی تھی اور ایقان کی روشنی۔ وہ اس رجائیت کو بار بار شعر کا جامہ پہنانے پر مجبور تھا ——

دفعتاً پیار بھڑکتے ہیں فضا میں شعلے		دیکھنا ہم نفسو! یہ کوئی گلزار نہ ہو
شور و ہنگامہ ہے برپا افق عالم پر		یہ کسی طائر فردوس کی جھنکار نہ ہو
ہم نشیں! مقتل ہستی کو ذرا غور سے دیکھ		کہیں اس پردۂ خوں میں کوئی گل کار نہ ہو

میدانِ جنگ میں

رات کی گود میں ہے صبح کی لاش
ہاں بچھا صفِ ماتم کہ زمیں
پُرسکوں ہو گئی کچھ دیر کو پھر
سورما قوم کی نفرت کے امیں
سوئے ہیں خاک پہ لمبی تانے
غسلِ میّت کی ضرورت ہی نہیں
ان کو، یہ سب ہیں شہیدانِ وفا
جن کی میراث چلے گی آگے
ہوگی تکمیل زوالِ آدم!

اختر الایمان

جس کو پیکار سمجھتا ہے زمانہ وہ کہیں		لیلیٰ امن کا دہکا ہوا رخسار نہ ہو
یہ قیامت سی اٹھاتی ہوئی دنیا کی روش		کسی معشوقۂ طناز کی رفتار نہ ہو

مگر کون کہہ سکتا ہے کہ شاعر اپنی رجائیت میں حق بجانب تھا یا نہیں۔ جنگ تو بے شک ختم ہو گئی اور فاشزم کی منظم تحریک کا جنازہ بھی اٹھ گیا لیکن جنگ کے آخری شعلوں کے آئینے میں جس دہکتے ہوئے گلزار کی جھلک شاعر نے دیکھی تھی وہ گل زار کب پھلے پھولے گا، اور لڑائی کے ہتھیاروں کی آخری جھنکار میں جس فردوسی نغمے کے لئے اس کو سنائی دی تھی وہ نغمہ کب ایک لمبی تان بن کر دنیا کی فضاؤں میں گونجے گا، یہ شاید کسی کو نہیں معلوم!

اختر شیرانی

تاثیر

(سانیٹ)

میں نے اک نغمہ سنایا تھا تری محفل میں !
ایسی حالت میں کہ تھا سازِ شکستہ میرا
یعنی تارِ نفس آوازِ شکستہ میرا
دل کا خون آنکھ میں تھا، آنکھ کے آنسو دل میں!
میں نے دیکھا کہ ترے دل پہ اثر تک نہ ہوا!!
میری فریادِ حزیں، خوابِ پریشاں ہی رہی
دل میں امید جو تھی، یاس بداماں ہی رہی
رحم کا تیری نگاہوں میں گزر تک نہ ہوا !
ساز کو پھینک دیا بادلِ غمگیں میں نے
اس کے تاروں نے کبھی پھر نہ سنایا نغمہ
ناامیدی سے کوئی لب پہ نہ آیا نغمہ!
گرچہ کتنے ہی لکھے نغمۂ خونیں میں نے !
آج حیرت مگر اے جاں مجھے اس راز پہ ہے!
اپنی آواز کا دھوکا تری آواز پہ ہے!

محمود ہاشمی

سری نگر کی ایک یادگار رات

دو دن رہی ہرسل۔ پھر دسہرہ۔ اور دسہرے کی شام کو مہاراجہ کا شاہی دربار ــــ

"جوتے یہیں اتار دیجئے" اور راج محل کے سب سے پہلے دروازے پہ ہر ایک درباری نے اپنے جوتے اتار دئے۔ اور پھر ان کی سیاہ جرابیں سفید پاجاموں کے نیچے اور زیادہ نمایاں ہوگئیں۔ سیاہ جرابیں۔ ان کے اوپر چوڑی دار پاجامے کی سلوٹیں۔ پھر چوڑی دار پاجامہ۔ اس کے اوپر کسی نہایت شوخ رنگ کی ریشمی شیروانی۔ کاترا۔ اور پھر سولیشت سے پیشۂ آبا سپہ گری" کا مضحکہ اڑاتی ہوئی اس کے ساتھ لٹکتی ہوئی ایک تلوار۔ اور پھر "کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے" کی معذرت کرتا ہوا سر پر ایک بڑا سا تربوزی رنگ کا صافہ۔

درباریوں نے جوتے اتارنے کے بعد اپنی پگڑیاں سنبھالنے کی ایک بے بس سی کوشش کی۔ اور پھر جھجکتے ہوئے، شرماتے ہوئے آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ ان کی جرابوں کے نیچے قالین تھے۔ اور ان کے دائیں بائیں قدِ آدم شیشے جن میں نہایت مضحکہ خیز مورتیں حرکت کرتی ہوئی اور آگے کو بڑھتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں "یہ شیروانیاں مانگے کی ہیں۔ اور یہ صافہ بھی کسی اور سے بندھوا کے سر پہ رکھا گیا ہے" ہر صورت دوسری سے یہی کہتی دکھائی دے رہی تھی۔ اور "کوئی ہرج نہیں۔ کوئی ہرج نہیں۔ اس حمام میں سب ننگے ہیں!" کی تسلی کا لیبل بھی ہر چہرے پر نمایاں تھا۔

اور مہاراجہ کے محل کے اس حمام میں واقعی یہ سارے درباری ننگے دکھائی دے رہے تھے۔ انھیں اپنے لباس کے بے ڈھنگے پن کا۔ اپنے کارٹون بنے ہونے کا۔ اپنی بے بسی کا۔ اور ساتھ ہی ساتھ اپنی اس خودداری کا جسے ہر سال وہ اس موقع پر مہاراجہ کی بھینٹ چڑھایا کرتے تھے۔ احساس ضرور تھا مگر ہر سال کی طرح اس سال بھی وہ اسے راج محل کے سب سے پہلے دروازے پہ چھوڑ آئے تھے۔ اپنے جوتوں کے ساتھ۔ گھسٹتے ہوئے اور بازاروں میں سے گزرتے ہوئے جب تک کہ وہ تنہا تھے۔ انہیں اپنی اس ہونے والی ذلت کا احساس تھا۔ ساری راہ دکھ بھرے خیال ان کے دماغ میں بھنبھناتے رہے۔ مگر اب "مرگِ انبوہ" ایک "جشن" بن گیا تھا۔ یہ خیال کہ اپنی شیروانی کے نیچے اکثر نے دو سوئٹر صرف اس لئے پہن رکھے ہیں کہ شیروانی مانگے کی ہے اور ان کے ڈھیلی ہے۔ اب سب بھول چکے تھے اور ان کا یہ احساس بھی راج محل کے ماحول میں کہیں کھو چکا تھا۔ کہ ابھی تھوڑی ہی دیر بعد مغرور مہاراجہ کے سامنے جھک کر نذر پیش کرتے ہوئے ان میں سے ہر ایک کو ایک خودکشی کرنی ہے۔ ایک خودکشی۔ کیونکہ ہر سال انھیں اس دن ایک خودکشی کرنی پڑتی ہے۔ ہر سال یونہی ہوتا ہے۔ ہر سال یہاں اس محل میں ان گنت خودداریوں کی موت ہوتی ہے۔ بے دلی سے ایک انسان کے آگے ان گنت انسان جھکتے ہیں۔ صرف اس لئے کہ وہ مہاراجہ ہے اور یہ نہیں۔ صرف اس لئے کہ ایک مہاراجہ نے ایک دفعہ ان سے کہا تھا۔ کہ اسی میں ان کی عزت ہے ــ اور ان میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اسے جھٹلا سکیں۔ مہاراجہ گلاب سنگھ نے یہی کہا تھا۔ اور ان کے اجداد نے مانا تھا۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے بھی یہی کہا تھا اور ان کے اجداد مان گئے تھے۔ پھر اب جب مہاراجہ ہری سنگھ بھی یہی کہتا ہے تو یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ بات اپنی اصلیت کھو چکی ہے مجبور ہیں۔ کہ مہاراجہ کی بات کو اب بھی باتوں کی رانی سمجھیں۔ اس لئے مت آؤ بحث آؤ۔ ہمارے قریب اے نئے زمانے کی موجو! کہ تم ہمیں ورغلا رہی ہو۔ اور ہم میں اتنی ہمت نہیں۔ کہ ہم مہاراجہ ہری سنگھ کو جھٹلا سکیں۔ اور وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے آگے کو بڑھتے جا رہے تھے۔ زبردستی کی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پہ پیدا کر کے ایک دوسرے سے خوشی کی باتیں بھی کر رہے تھے۔ مگر قدِ آدم آئینے بدستور ان کا منہ چڑا رہے تھے۔

اور پھر راج محل کے بڑے ہال کا دروازہ آگیا۔

دروازے کے سامنے ہال کے دوسرے سرے پر تخت تھا۔

شاہی کرسی تھی۔ اور اوپر نیچے۔ دائیں بائیں ہر طرف سنہری جھالریں جھلملا رہی تھیں۔
حکم تھا کہ ان سب کو دروازے میں سے داخل ہوتے وقت جھک کر کورنش
بجالانا ہر درباری کا فرض ہے جس طرح مہاراجہ کی بات باتوں کی رانی ہوتی
ہے۔ اسی طرح ہر وہ شے جو مہاراجہ کی ہے۔ قابلِ احترام ہے۔ اور اگر آپ
اسے اپنے سر آنکھوں پر جگہ اس لئے نہیں دے سکتے۔ کہ وہ آپ سے بہت
دور ہے۔ تو اس کی برتری اور اپنی خاکساری کے اعتراف کے طور پر کم از کم
جھکئے تو۔

اور ہر ایک درباری جھکا۔ ہر ایک نے اپنی خاکساری کا اعتراف کیا۔
دروازے پر دکتے ہوئے۔ دھڑکتے ہوئے دل اور سہمی ہوئی نگاہوں سے
ہر ایک اپنا فرض بجالایا۔ اور اس کے بعد سہما سہما ہال میں چپ چاپ دم بخود سا
اس جگہ پر بیٹھ گیا۔ جو اس کے لئے مخصوص تھی۔ یہ سب ریہرسل کی برکت تھی
ورنہ اپنی نشست کا پتہ چلانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اور پھر یوں جھکنے کے آداب
بجالانے کا سلیقہ بھی آسانی سے نہیں نبھا کرتا۔

ایک ایک کر کے سب درباری بیٹھ گئے۔

ہال میں سناٹا تھا۔ اگر سوئی بھی گرتی۔ تو آواز سنائی دیتی۔ کسی کو سرگوشی
تک کرنے کی ہمت نہ تھی۔ "میرے اردگرد کیا کچھ ہے۔ بھلا دیکھوں تو؟" ہر
دل میں اشتیاق تھا۔ پر دربار۔ دربار کے آداب۔ راہ و رسم منزل ہا۔ اور
روایات کے بھوت خواہ مخواہ دلوں کی دھڑکنیں تیز کر رہے تھے۔ کسی
گردن میں جنبش نہ تھی۔ اور کوئی سر نہ تھا۔ جو اٹھا ہوا ہو۔ مگر آہستہ آہستہ
ذہن ماحول سے مانوس ہونے لگے۔ اور جھکے ہوئے سر اور جھکی ہوئی گردنیں
ذرا ذرا اوپر کو اٹھتی ہوئی دکھائی دینے لگیں۔ اور پھر نگاہوں نے اپنا کام
شروع کر دیا۔

تخت اور شاہی کرسی اب تک خالی تھی۔ البتہ اس کے گرد اگرد
دونوں طرف قوس کی سی شکل میں ننگی تلواروں والی گارد ضرور کھڑی تھی۔
گارد "اٹن شن" کی حالت میں تھی۔ اور "اٹن شن" کی حالت میں ہلنا ناممکن تھا۔
ہال کی چھت پر جابجا گبر۔ بہتاب سنگھ اور ہری سنگھ کی تصویریں گلے مل رہی تھی۔
مصوّر کے نقوش والی چھت کے ساتھ پرانی وضع کے فانوس لٹک رہے تھے۔
اور ان میں بجلی کے قمقموں کی جگمگاہٹ تھی۔ اور ان سے ذرا پیچھے ہال کے
گرداگرد وہ بالکونی تھی جس میں مہاراجہ ہری سنگھ کے مہمان اس کی شان

دیکھنے کے لئے بیٹھے تھے کہیں فوجی لباس میں کوئی انگریز لفٹیننٹ کرنل۔ کہیں
کسی دیسی ریاست کا کوئی مہاراجہ۔ کوئی چیرٹ پیتا ہوا نہ جانے کون؟ اور
ایک طرف فر سے لدی ہوئی ایک بوڑھی بی بی تھی۔ جو ایک الھڑسی لڑکی کو اپنے
ساتھ لٹکائے تھی۔ غالباً یہ کوئی امیر بیوہ ہوگی۔ اور وہ اس کی پوتی۔ بیوہ کا
انداز یوں تھا۔ جیسے وہ اپنی پوتی کو کسی چڑیا گھر میں لائی ہو۔ اور پوتی فرش پہ
بیٹھے ہوئے درباریوں کو یوں دیکھ رہی تھی۔ جیسے وہ کسی ترقی پسند سرکس
میں ہو۔ "یہ لوگ اپنا تماشا کب شروع کریں گے؟ اے خدایا۔ کھیل
ذرا جلد شروع ہو!" اور وہ بڑی بے تابی سے ہال کے اس دروازے
کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جہاں تھوڑی ہی دیر پہلے کھیل کی ابتدا ہوئی تھی۔
درباریوں نے ہال میں داخل ہوتے وقت کچھ اس انداز کا ایکٹنگ کیا
تھا۔ کہ اسے بے ساختہ ہنسی آگئی تھی۔ اور اگر اس کی دادی اسے نہ روکتی
تو شاید وہ تالیاں بھی بجاتی۔ مگر اسے روک دیا گیا تھا۔ اور اب اس کے
بعد یہ سب لوگ جو اگرچہ مسخروں کا لباس پہن کر آئے تھے۔ چپ چاپ
منہ بنائے یوں بیٹھ گئے تھے جیسے وہ مسخرے بالکل ہی نہ ہوں۔ کسی المیہ
میں کام کرنے والے اداکار ہوں۔ "نہ جانے یہ تماشا کیسا ہوگا؟ اللہ۔
یہ شروع کیوں نہیں کرتے؟"

اور اگر یہ تماشا تھا۔ تو جلد ہی تماشا شروع ہونے کے انداز پیدا
ہو گئے۔

دربار شروع ہو گیا۔

ایک اونچی گڑگڑاتی ہوئی آواز نے کہا "راجوں کے راجہ ......
مہاراجہ ہری سنگھ جی پدھارتے ہیں۔" اور ہال میں بیٹھے ہوئے سب کے سب
اٹھ کھڑے ہوئے۔ باہر زور زور سے بینڈ بجنے لگا۔ اور اس کے بعد دروازے
میں سے کچھ آدمی اور مہاراجہ ہری سنگھ جلوس کی صورت میں داخل ہوئے۔

کھڑے ہوئے لوگوں کی آنکھیں نیچی ہو گئیں۔ اور اس وقت تک
نیچی رہیں جب تک مہاراجہ شاہی کرسی پر نہ بیٹھ گیا۔ اور اس کی ٹانگیں سامنے
کے زرین پائدان پہ نہ ٹک گئیں۔ اور ریاست کے ایک نہایت معزز گھرانے
کا وزیر امین چند شاہی کرسی کے پیچھے اس جگہ پر نہ کھڑا ہو گیا۔ جہاں سے
کہ وہ اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے مورچھل کو اس طور پکڑے کھڑا رہ سکتا تھا
کہ مورچھل کا سایہ مہاراجہ کے سر پر پڑتا رہے۔ تاکہ مہاراجہ کا سایہ

وزیر امین چند پر بیٹھ رہ سکے اور وزیر امین چند ہر سال اس موقع پر اسی طرح یہاں کھڑا رہ سکے۔ اور ریاست کے دوسرے افسر دیکھ سکیں کہ وہ مہاراجہ کے کتنا نزدیک ہے۔ اس کے اجداد مہاراجہ کے اجداد سے کتنے نزدیک رہے ہیں۔ اور اس کے بیٹے مہاراجہ کے بیٹے کے کس قدر نزدیک رہیں گے۔ مورچھل پکڑنے موچھل کا سایہ مہاراجہ کے سر پر کرنے اور اپنی اس عزت کی جلوہ نمائی کرنے کے علاوہ وزیر امین چند یہاں اس لئے بھی کھڑا رہنا چاہتا تھا۔ کہ اس طرح وہ دوسرے درباریوں کی اس کڑے وقت میں کچھ نہ کچھ مدد کر کے بھی اپنی برتری جتا سکتا تھا۔ وہی ان کو دربار کی رسمی ہر سال کروا تا رہا تھا۔ اور اس لئے اگر اب نذر دیتے وقت ان میں سے کوئی غلطی کرنے لگے۔ تو وہ مہاراجہ کے دیکھے بغیر اسے اشاروں سے سمجھا سکتا تھا۔ کہ بھئی اب تمہاری باری ہے۔ اب اٹھو۔ بڑھو۔ جھکو۔ پھر جھکو۔ پھر جھکو۔ اور اب جھک کر ریشمی رومال میں رکھ کر اپنی نذر مہاراجہ کے سامنے پیش کر دو۔

جب مہاراجہ تخت پر اور درباری فرش پر بیٹھ گئے۔ تو کرسیوں کی ہلکی سی سرسراہٹ سنائی دی۔ اور پھر سامنے کی بالکونی پر مہارانی براجمان ہوتے نظر آئی۔ مہارانی۔ اس کی سکھیاں اور اس کے گرد جمع جن کے کندھے پر سے شال بار بار نیچے کھسک آتا تھا۔ اور اسے اٹھانے کے لئے بار بار ہر کسی کا ہاتھ بڑھتا لیکن اٹھانے کی سعادت صرف مہارانی کو نصیب ہوتی۔

پھر نذریں پیش ہونی شروع ہو گئیں۔

سب سے پہلے بڑے جاگیردار۔ پھر چھوٹے جاگیردار۔ اور رذیل تعلیمی سردار۔ اور محض نمک خوار سردار۔ اور پھر پانچ ہزار روپے ماہوار پانے والا سب سے بڑا وزیر۔ پھر دوسرے وزیر۔ اس کے بعد ریاستی محکموں کے ناظم۔ اور پھر دوسرے گزیٹڈ آفیسران۔ پہلے بڑے پھر چھوٹے۔ لیکن کمرے میں بدستور خاموشی تھی۔

ہال کے ایک کونے میں بیٹھے ہوئے ایک نو عمر درباری کو دفعتاً خیال آیا۔ کہ پچھلے سال تو یہاں ہال کے دروازے کے پاس ایک گانے والی اس دوران میں ٹھمری گا رہی تھی۔ اور اس کا سازندہ بجاتا رہا تھا۔ کیا اب کے کوئی گانے والی ان درباریوں کو حیران کرنے کے لئے نہیں آئے گی۔

اس سال یہ دربار طاؤس و رباب کا دربار نہیں بن سکے گا۔ کیونکہ دور کہیں سے شمشیر و سناں کی جھنکار سنائی دینے لگی تھی۔ مہاراجہ کے ہاتھ سے طاؤس و رباب جاتا رہا تھا۔

اپنی شاہی کرسی پر بیٹھا۔ اس بھرے دربار میں مہاراجہ سوچ رہا تھا۔

"طاؤس و رباب کے بعد کیا ہوگا؟"

مہاراجہ کی زبان خاموش تھی۔ مگر اس کے فکر کا عکس اس کی آنکھوں میں جھلک رہا تھا۔ اور یہ آنکھیں ہر درباری کے سامنے تھیں۔ "اے مہاراجہ کی فکرو! کاش تم چھپ کے رہتیں۔ اور اس کا اضطراب یوں بھرے مجمع میں رسوا نہ ہوتا!!"

مگر یہ لحاظ آنکھیں مہاراجہ کو رسوا کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔

ایک سو سال تک مہاراجہ اور اس کے اجداد من مانی کرتے رہے تھے۔ اور ان کی یہ جاخاموش انھیں دیکھتی رہی تھی۔ مہاراجہ کے دادا گلاب سنگھ نے ایک سو سال پہلے پچھتر لاکھ روپے دے کر ان لوگوں کو خرید لیا تھا۔ اور اس کے بعد وہ سب اس کے غلام رہے تھے۔ اور اس نے بھی انھیں غلام ہی سمجھا تھا۔ ذلیل۔ خریدے ہوئے۔ بے بس غلام۔ مگر اب جبکہ سو سال ختم ہو چکے تھے۔ پچھتر لاکھ روپے والی خریداری کا معاہدہ سنبھال سنبھال کر رکھنے کے باوجود پھٹ گیا تھا۔ اور غلام آزاد ہونے کے لئے ہاتھ پیر مارنے لگے تھے۔ آزاد کشمیر کا نعرہ مہاراجہ کے دل کو دھڑکانے لگا تھا۔ اور اس نعرے کی گونج ریاست کے کونے کونے میں طوفان برپا کر رہی تھی۔ پونچھ۔ اور پونچھ کے ساتھ ساتھ مظفر آباد کا علاقہ۔ اور اب دو دن سے مظفر آباد مہاراجہ سے چھن چکا تھا۔ اور چھیننے والے آزاد کشمیر کا نعرہ لگاتے۔ مہاراجہ کے راج محل پر نظریں گاڑے آگے بڑھتے آ رہے تھے۔ اور وہ نہیں جانتا تھا۔ کہ کیا کرے۔ طاؤس و رباب کے نغموں میں پلنے والا مہاراجہ پریشان تھا۔ اور نہیں جانتا تھا۔ کہ اب اسے کیا کرنا چاہئے۔ کل وہ لوگ یہاں سے صرف ۳۴ میل دور اوڑی میں تھے۔ اور آج ——

" اور آج اس وقت جبکہ مجھے یہ دربار کرنا پڑ رہا ہے۔ وہ لوگ نہ جانے کہاں ہوں گے؟ اے کاش کچھ ہو سکتا۔ اور اے کاش۔ اگر کچھ اور نہ ہو سکتا تھا۔ تو ۱۹۴۷ء کا یہ دسہرہ آج نہ آتا۔ یہ دربار آج نہ ہوتا۔" غالباً مہاراجہ سوچ رہا تھا۔ "آج میں خود بے بس ہوں۔ اپنے ان

نذر خرید درباریوں کی بے بسی کا تماشا کیسے دیکھ سکوں گا۔"

مگر اس کے باوجود وہ کوشش کر رہا تھا کہ دیکھ سکے۔ اور دسہرہ کا یہ نذر دربار شروع ہو چکا تھا۔ نذریں پیش کی جا رہی تھیں۔

سب سے پہلے ڈبل تعظیمی سردار جھکتے جھکتے گئے۔ اور نذر دینے کے بعد اپنی پیٹھ سنبھالتے سنبھالتے لوٹے۔ مبادا پیٹھ مہاراجہ کی طرف ہو جائے اور آداب اور احترام میں فرق پڑے۔ اور وہ اس دربار سے یوں نکالے جائیں جیسے ہر سال دو ایک درباری اسی وجہ سے نکال دئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد دوسرے سرداروں کی باری آئی۔ اور انھوں نے بھی "تسلیم و رضا" کا ثبوت یوں ہی دیا۔ قالین کے بیچوں بیچ جو راستہ تھا۔ اس پر تین بڑے بڑے پھول بنے ہوئے تھے۔ اور انھیں ان میں سے ہر پھول پہ کھڑے ہو کر جھکنا تھا۔ اور اس کے بعد مہاراجہ کے قدموں میں جا کر اسے نذر پیش کرنا تھی۔ اور اس احساس کو دور اپنے دل کے کسی نہاں خانے میں دفن کر دینا تھا۔ کہ یوں اپنے جسم کے ساتھ وہ اس سنگھاسن پر اپنی روح کو بھی جھکا آتے ہیں۔ اور ریشمی رومال میں لپیٹ کر جب وہ ایک اشرفی کی نذر مہاراجہ کو پیش کرتے ہیں۔ تو ساتھ ہی اُن کی خودداری کا جوہر بھی مہاراجہ کے تخت سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ اس وقت شاعر کا یہ سوال کہ "ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں۔" بے معنی ہو جاتا ہے۔ اور دور آسمانوں پر وہ فرشتے جنھوں نے کبھی آدم کو سجدہ کیا تھا کچھ اس انداز سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے جیسے ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہوں۔ "کیا یہی ہے وہ انسان؟"

ہاں یہی ہے وہ انسان۔ صرف دور بدل چکا ہے۔ تاریخ نے پتھر اور دھات اور اخلاق اور تہذیب کے زمانوں کے بعد اس انسان کو اب مہاجنی دور عطا کیا ہے۔ اور مہاجنی دور کی یہی ریت ہے جس کے پاس چاندی ہے۔ اور سونا ہے۔ وہ تمہیں خرید لے گا۔ اور پھر تم اسے پوجو گے۔ ایک صدی پہلے مہاراجہ گلاب سنگھ نے پچھتر لاکھ روپے میں چالیس لاکھ انسان خریدے تھے۔ اور پھر اس کے بیٹوں۔ پوتوں نے ان میں سے چند ایک کے دام ذرا بڑھائے۔ اور انھیں اور بھی زیادہ خرید لیا۔ کہا کہ تم سردار ہو۔ وزیر ہو۔ گزیٹڈ آفیسر ہو۔ اور اس لئے آؤ۔ اور ہمارے سامنے جھکو ہمیں پوجو۔

اور وہ سب انھیں پوجتے رہے۔ اور اب مہاراجہ ہری سنگھ کو پوج رہے تھے۔

سرداروں کے بعد وہ اٹھا جو ریاست کا سب سے بڑا وزیر تھا۔ اور جس نے اپنے آپ کو سمجھا دیا تھا۔ کہ ہر مہینے پانچ ہزار روپے۔ ایک ٹھاٹھ دار کوٹھی۔ اور ایک کار لینے کے بعد یوں مہاراجہ ہری سنگھ کو پوجنا کوئی بری بات نہیں۔ وہ بظاہر بڑا مطمئن تھا۔ مگر اس وقت جب پانچ ہزار روپے ماہوار کی آمدنی میں سے مہاراجہ کو ایک اشرفی واپس کرنے کے بعد وہ واپس اپنی جگہ لوٹا تو ایک لمحے کے لئے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اپنے آپ سے اس کے اس سمجھوتے کی بنیاد کم از کم ایک لمحے میں ضرور متزلزل ہوتی ہے۔ اس ایک لمحے میں جب اس کی نظر دوسرے درباریوں پہ پڑی۔ تو وہ مسکرایا۔ اور اس کی یہ زبردستی کی مسکراہٹ ایسی تھی جیسے وہ کہہ رہا ہو "دوستو۔ سمجھو یقین جانو جس طرح میں ابھی جھکا تھا یوں جھکتے وقت صرف جسم ہی جھکتا ہے۔" مگر اس مسکراہٹ کے ساتھ ایک پتلی سی تہ اس ندامت کی بھی تھی۔ جو سارا بھانڈا پھوڑ رہی تھی۔ "دیکھنے والو میں خود فریبی کا عکس ہوں۔ دیکھ لو کہ انسان ذلیل ہونے کے بعد کس طرح اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے۔"

صرف یہی ایک نہیں۔ وہاں سب ذلیل ہو رہے تھے۔ اور سب کسی نہ کسی انداز میں اپنے آپ کو دھوکا دے رہے تھے۔

"دیکھو۔ وہ چودھری ...... ہے جس کی شرافت کی کہانیاں مشہور ہیں جس کی مسکراہٹیں ہر ایک کے لئے عام ہیں۔ اور جو کشمیر کے انسانوں میں ایک بہت بڑا انسان ہے۔ مگر چونکہ اتفاق سے وہ ریاست کا چیف سیکرٹری بھی ہے۔ اس لئے اس دربار میں اس کی شرافت کی کوئی قیمت نہیں۔ اس کی مسکراہٹیں بے نام ہیں۔ اور اس کی انسانیت کا کوئی پرسان نہیں۔ اور وہ دیکھو۔ وہ ڈاکٹر ... ہے جس نے یہ جاننے کے لئے کہ اسلام کیا سکھاتا ہے۔ سات سمندر پار کئے تھے۔ مگر جب اسلام کی تعلیمات حاصل کر کے وہ واپس آیا تو پیٹ نے وہ ساری آیتیں بھلا دیں۔ جو انسان کو انسان کے سامنے جھکنے سے روکتی ہیں۔ اور اب وہ اس ریاستی مشین کا ایک بے بس پرزہ ہے۔ وہ اشرف المخلوقات

نہیں جس کے لئے یہ دنیا بنی تھی۔ بلکہ وہ راندۂ درگاہ ہے۔ جسے جنّت سے نکالا گیا تھا۔ اور وہ دیکھو۔ وہ لمبا سا۔ دبلا پتلا آدمی جس سے تلوار سنبھالے نہیں سنبھلتی۔ اور جواب نذر دینے کو بڑھ رہا ہے۔ اور جو ابھی ابھی مہاراجہ کے سامنے جھکے گا۔ یہ پروفیسر... ہے جو جب تک ہر صبح خدا کے سامنے نہ جھک لے۔ اور کوئی کام نہیں کرتا۔ ان دنوں جاوید نامہ کا انگریزی ترجمہ کر رہا ہے۔ لیکن اس وقت شاید اسے یہ یاد نہیں رہا کہ اس جاوید نامہ میں شاعر نے اسے خودی و خودداری کی تعلیم ان لفظوں میں دی ہے ؎

عقل تو حاصلِ حیات عشق تو سترِ کائنات ✤ پیکرِ خاک! خوش بیا! ایں سوئے عالمِ جہات

مگر اس وقت پروفیسر کو یہ شعر بالکل یاد نہیں۔ اس وقت وہ اس شاعر کا مترجم نہیں جو عمر بھر انسان کی بلندی اور اس کی خودی کے گیت گاتا رہا۔ لیکن اس نے اپنی خودی اپنے پیروں کے نیچے کچل دی۔

یہاں سب سے انسانیت کا لبادہ اتروایا جا چکا ہے۔ اور ہر آنے والا انسان کی عظمت سے سارے نقوش اس لبادے کے ساتھ ہی اس راج محل کے سب سے پہلے دروازے پہ اپنے جوتوں کے ساتھ رکھ آیا ہے۔ یہاں سب غلام ہیں۔ صرف ایک مہاراجہ ہے۔ جو اس زمین پہ ان کا خدا ہے۔ ان کی جانوں کا محافظ اور ان کی عزتوں کا نگہبان ہے اور اسی لئے سب کے سب اس کے سامنے جھک رہے ہیں۔ اسے نذرانہ پیش کر رہے ہیں۔ ایک ایک کر کے۔ باری باری۔ قالین کے تین بڑے پھولوں پر اپنی گردنیں جھکائے۔ اس کے قدموں کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اور مہاراجہ خاموش انھیں یوں حقیر ہوتے دیکھ رہا ہے۔ اس کی آنکھیں دیکھ بھی رہی ہیں۔ اور اس کے افکار کا عکس بھی ان میں جھلملا رہا ہے جنھوں نے اس وقت مہاراجہ کے ذہن میں ایک طوفان اٹھا رکھا ہے۔

مہاراجہ سوچ رہا ہے۔ "یہ قدم جلد جلد کیوں نہیں بڑھ رہے۔ اور یہ مخلوق اپنی عاجزی کا اعتراف کرنے میں آج دیر کیوں لگا رہی ہے۔ میں بیٹھ بیٹھ کے تھک گیا ہوں۔ اور یہ ہیں۔ کہ ختم ہونے میں ہی نہیں آتے۔"

ہر سال کی طرح اس سال بھی نذر دربار کے اس موقع پہ بہتیرے نوآموز اور گھبرائے ہوئے درباری نذر پیش کرنے کے آداب میں غلطیاں کر رہے ہیں۔ جھکتے وقت زاویہ ٹھیک نہیں بناتے۔ قالین پہ ان کے قدم لڑکھڑا جاتے ہیں۔ اور انھیں یاد نہیں رہتا کہ دوسرا پھول کہاں تھا۔ اور تیسرا کہاں ہے۔ اور ان کی وہ منزل جو مہاراجہ کے قدموں میں ہے۔ اُن سے کتنی دور ہے۔ مگر اس سال مہاراجہ کی آنکھیں اُن کے یہ سارے گناہ معاف کر رہی ہیں۔ آج مہاراجہ کسی کو دربار سے نہیں نکال رہا۔ آج مہاراجہ خاموش ہے اور سوچ رہا ہے "وہ لوگ جنھوں نے پرسوں شام کو مظفرآباد پر حملہ کیا تھا۔ اور جو آج صبح اوڑی میں تھے۔ اس وقت کہاں ہوں گے؟ اے کاش یہ دربار جلد ختم ہو جائے۔ اور میں جان سکوں۔ کہ وہ لوگ اس وقت کہاں ہیں؟ میرے اس راج محل سے کتنی دور ہیں؟"

مہاراجہ کو پتہ لگ چکا ہے۔ کہ اس کی فوجیں اس کی اس پرجا کے ساتھ جا ملی ہیں۔ جو آج صبح اوڑی میں تھی۔ اسے یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ ہر جگہ جہاں یہ حملہ کرنے والے پہنچتے ہیں۔ سارے مقامی باشندے ان کا پرتپاک خیرمقدم کرتے ہیں۔ اور شاید وہ اب پچھتا رہا ہے۔

"اے کاش! جب میں اپنی پرجا کے گاڑھے پسینے کی کمائی میں سے ہر سال ..... کروڑ روپے سالانہ اپنی ذات پر خرچ کیا کرتا تھا۔ تو اس وقت مجھے ان کی بھوک اور اُن کے آنسوؤں کا بھی خیال آسکتا! اے کاش میں کبھی اُن کے دکھوں کا مداوا بننے کی بھی کوشش کرتا۔ اے کاش!—"

مہاراجہ سوچ رہا تھا۔ اور اس کی اس "سوچ" کی اُداسی اور غمگینی دسہرے کے سارے دربار پر چھائی ہوئی تھی۔ راج محل کے جاہ و جلال میں ہیبت کی جگہ افسردگی تھی اور شاید درباری بھی یہ سوچ رہے تھے۔

"آخر ہم یوں کب تک جھکا کریں گے؟ کب تک؟—"

ممکن ہے اس سے پہلے بھی ان درباریوں میں سے ہر ایک کے دل میں یہ سوال بارہا کھٹکا ہو۔ مگر دسہرے کی اس رات کو تو یقینی طور پر یہ سوال ان میں سے اکثر کے دل میں متواتر کھٹک رہا تھا۔ جب ہر درباری نذر دینے کے لئے اٹھتا۔ تو قالین کے تین پھولوں پہ اس کے پاؤں لڑکھڑا جاتے۔ اور اُس کا خیالات سے بوجھل ذہن اس سے سنبھالے نہ سنبھلتا۔ "آخر کب تک اس سامنے بیٹھی ہوئی مورتی کو ہم پوجتے رہیں گے کب تک ہم اپنی انسانی عظمت کو ایک اشرفی کا روپ دے کر اس مورتی کی بھینٹ چڑھاتے رہیں گے؟"

ل۔ احمد۔ اکبرآبادی

ایک اُزبک شاعر

(غفور غلام)

زمانۂ تاریخ میں ازبک شعروادب کی منزلیں ہمیشہ ہی ہموار اور درخشاں نہیں رہیں۔ کبھی تو اس نے عروج و ترقی کی بلندیاں پائیں اور کبھی ادبار و تنزل کی گہرائیوں میں جا پڑا۔ خوارزم و خراسان کے درباروں کا زمانہ دیکھا۔ جب علی شیر نوائی جیسا فاضل و ادیب اور الغ بیگ سا حکیم پیدا ہوئے، اور امیر بخارا نصراللہ خاں کا زمانہ بھی دیکھا جس نے ایک پل اور مسجد بنوا کر ہمیشہ فخر کیا۔ ایک وہ زمانہ تھا جب دنیا میں حسین اور متمول ترین شہر ازبکستان کی آبادیاں تھیں کہ حافظ شیرازؔ سمرقند و بخارا ہی کو اپنے ترک شیراز کے سامنے تحفتہً پیش کر سکتے تھے، اور ایک وہ وقت آیا کہ یہ عروس البلاد ویرانے بن کر رہ گئے۔

اب ازبک شعروادب کے خشک گلزار میں نئے عہد کی آبیاری سے پھر بہار آئی ہے۔ پچھلے دس سال کی مدت میں متعدد شاعر و ادیب منظرِ عام پر آئے ہیں جنکی تکمیل فن و صناعت مکمل ہے، جو بے مثال جدت و ندرت کے مالک ہیں، جنکی شخصیتیں آج نمایاں اور سربلند ہیں۔ آج ازبکستانی ادب میں تمام پرانی اصنافِ سخن کے ساتھ نئی صنفیں بھی کامراں و مقبول ہیں۔ ازبکستان کے ان اربابِ کمال میں ایک غفور غلام بھی۔ شاعری اور ادب سے عشق غفور غلام کا پشتینی مذاق ہے اور بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ شعریت و شعرگوئی اس کی گھٹی میں پڑی ہے۔

غفور کے کلام میں زندگی سانسیں لیتی ہے۔ وہ اپنی قوم اور عوام کا شاعر ہے۔ عالم انسانیت سے رشتہ و قربت اس کے شعر کی جان ہے۔ غفور کے ہاتھ میں پہنچکر ہر موضوع کلام شعری تعمیم کی بلندیاں حاصل کرلیتا ہے۔ عورت پر اس کی ایک نظم ہے اور ایک شعر میں عورت کی اہمیت بیان کرتے ہوئے کہا ہے:۔

تو تو نوعِ انسان کی ابدی ماں ہے!
تو تو ابدی زندگی کا وعدہ ہے!

اس ایک شعر میں غفور نے عورت کی ایک ایسی حسین یادگار قائم کردی ہے جس کے اندر ماں، بہن، بیوی اور محبوبہ سب ہوگئی ہیں! قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ غفور نے یہ شاہکار اسوقت پیدا کیا جب وسط ایشیا میں صدیوں سے عورت کنیز محض تھی۔ خانہ داری کا سامان تھی، مرد کا کھلونا تھی، یعنی جو کچھ بھی تھی مگر انسان نہ تھی۔ غفور کا یہ شعر سادگی اور قوتِ بیان کا نمونہ و مثال سمجھا جاتا ہے۔

غفور غلام کی کوئی تصنیف ایسی نہیں جسے کم درجہ قبول کہا جا سکے۔ اس کی اکثر نظمیں روسی اور دوسری سوویٹ زبانوں میں ترجمہ ہوتی رہتی ہیں۔ غفور نے شکسپیر اور دوسرے مقتدر یورپی مصنفوں کے ڈراموں کے ترجمے کئے ہیں جو دس اور پندرہ سال سے برابر ازبک اسٹیج پر کھیلے جا رہے ہیں اور ان کی شگفتگی میں فرق نہیں آیا۔ اس نے بہت سی روسی کلاسک تصانیف کو بھی ازبک زبان میں منتقل کیا ہے۔

غفور کی سب سے زیادہ مقبول نظم وہ ہے جسکا ہیرو "ایک سب ل" کھیتی کرنے والا ہے اور اس کی فکر کی رسائی کا بہترین مظاہرہ اس کی نظم "لاکھوں دن" میں ہوا ہے۔ افسوس ہے کہ پہلی نظم دستیاب نہیں ہوئی مگر دوسری نظم کا انگریزی ترجمہ ہندوستان میں آگیا ہے، جو یہاں درج کیا جاتا ہے:۔

"اس پرانی اور لمبی سڑک پر
فاتح عالم سکندر، سپہ اعظم اور مقتول چنگیز آئے اور گئے۔

تیمور لنگ اپنے لشکر چھوڑ گیا اور منگولوں نے انتقام لیا،
چین پر حملہ کر کے انسانوں کو قتل اور باغوں کو تاراج کیا!
ہر جگہ خون تھا، خون ہی خون!
جہاں جنگی (۱) گیا، وہاں کے لوگوں پر مصیبت آئی۔
ان سڑکوں پر، ان قدیم سڑکوں پر، ان کوہستانی اور میدانی
سڑکوں پر سے غلام اور بیوائیں گزریں،
ان کی گردنوں میں غلامی کا طوق پڑا تھا،
لاکھوں کروڑوں انسان جن کی موت یقینی تھی اور جو کمزور و
نحیف تھے،
جو رنج و غم کے مارے ہوئے تھے، ظالم جن کا پیچھا کر رہے تھے،
ماسکو سے بیجنگ تک بھاگے پھر رہے تھے، اور ناقابل فتح فوجیں
مارچ کرتی پھر رہی تھیں۔ ہر سڑک پر انسانی ہڈیاں پڑی
چمکتی تھیں!

ابھی قدیم سڑکوں پر ہم نوں نے کیا کچھ نہیں دیکھا!
چین سے لے کر ایران تک اور ہندوستان سے لے کر
ترکستان تک،
ساری دنیا میں، لاکھوں کروڑوں پر وقار یا فولادی قافلوں کی
صورت میں، اتحاد و اتفاق کی حالت میں گزریں گے!
یہ قدیم سڑکیں ہماری ابدیت کا نشان ہیں!
اور انہی سڑکوں پر آزادی کی ہوائیں چلیں گی! اب وہاں خون
کی بو نہ آئے گی۔

غفور غلام کی زندگی زمانے کی چکی میں پس کر نکلی۔ اپنے بچپن میں اسے طبلہ بجانا پڑا، موچی کی دوکان پر نوکری بھی کی، تمباکو کی ایک فیکٹری میں بھی کام کیا اور یتیم خانے کی خدمت گاری بھی بھگتائی اور اس طرح غفور سڑک اور بازار کی پُر فریب اور تباہ کار زندگی کے امتحان سے گزر کر سوویٹ نظام میں ایک اسکول ٹیچر بن گیا لیکن غرب میں، ٹیچر کیا ہوتا ہے؟ ہم ہندوستانیوں کی سمجھ میں یہ بات بمشکل سے آئے گی۔ ہمارے اسکول ٹیچر جیسے ہیں اس کے برعکس وہاں کا ٹیچر بچوں کے نفسیات کا ماہر ہی ہو سکتا اور ہوتا ہے!

ٹیچری مل جانے کے بعد غفور ایک نہایت تیز عمل اور مخصوص قابلیت کا اخبار نویس بن گیا اور آخر میں فن شعر اس کا پیشہ قرار پایا۔ یہ بات بھی ہم ہندوستانیوں کے لئے بعید الفہم ہوگی۔ سوویٹ روس کے صحافی زیادہ تر اسکول ٹیچر ہی ہوتے ہیں جو دور افتادہ مقامات میں دیہاتی بچوں کو تعلیم دیتے ہیں۔

غفور ایک کامیاب شاعر ہونے کے ساتھ ایک شوخ نگار نثر نویس بھی ہے۔ وہ متعدد مختصر افسانوں کا مصنف ہے جن کی نازک خیالی اور رعونت جس آپ اپنی مثال ہے۔ غفور نے "شریر لڑکا" کے نام سے ایک ناول بھی لکھا ہے جس میں خود غفور کی داستان حیات بیان ہوئی ہے۔

غفور غلام کا شعر ہو یا افسانہ، ازبکستان کے لوک گیتوں کی ابھرتا حال ہوتا ہے۔ اس کے ہر منظر میں وہی اسپرٹ کارفرما نظر آتی ہے اگرچہ عشق شعری ازبک قوم کا کردار کہا جا سکتا ہے اور اس موقع کی یہ خصوصیت روایتی چیز ہے، لیکن ازبک عوام میں غفور غلام کی مقبولیت کی دوسری مثال نہیں ملتی۔ اور ایک شاعر کا اپنی قوم میں مقبول ہونا اس قوم کی کلچری ترقی کی شہادت ہے۔ لیدیا توفا، ایک روسی شاعرہ نے اپنے حالات سفر میں غفور غلام سے ملاقات کا حال لکھتے ہوئے بتایا ہے کہ اس کی ملاقات غفور سے نئے تاشقند میں ہوئی اور تاشقند دہلی کی طرح تقریباً دس لاکھ آبادی کا شہر ہے۔ غفور نے اسے اپنے گھر آنے کی دعوت۔ پتا پوچھنے پر کہنے لگا:-

"پرانے تاشقند میں پہنچ کر جس سے پوچھوگی وہ تمہیں میرے گھر پہنچا دے گا!"

اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ تاشقند کا کم سے کم ہر بالغ مرد و عورت نہ صرف غفور کو جانتا ہے بلکہ اس کا مکان بھی جانتا ہے۔ اور وہ غفور سے اتنی محبت کرتا ہے کہ پوچھنے والے کو غفور کے مکان تک پہنچانے پر مشغف بھی ہے۔ ایک شاعر کی مقبولیت اور ایک قوم کی کلچری بلندی، اس واقعہ میں یہ دونوں باتیں مرکوز ہیں۔

ایک ہندوستانی اخبار نویس وسط ایشیا کے سفر سے واپس آئے ہیں انھوں نے تاشقند میں غفور سے اپنی ملاقات کا حال اخباروں

میں شائع ہوا ہے۔ اس اخبار نویس کا نام مسٹر میش سانگھوی ہے جنہوں نے غفور غلام کو ازبکستان کا "گنوئٹے" قرار دیا ہے۔

مسٹر میش سانگھوی کے بیان کے مطابق غفور کی تعلیم بچپن ہی میں موقوف ہو گئی تھی اور انقلاب سرخرو ہونے پر اس نے میٹرک کی تعلیم مکمل کی۔ اور بیس سال کی عمر سے لکھنا شروع کر دیا۔ غفور نے اپنی شاعری میں ازبک فن شعر کے پرانے قاعدوں ہی پر عمل درآمد کیا لیکن نئے موضوعات اور جدید ٹیکنیک سے بھی جا بجا کام لیا۔ اس کی ابتدائی نظمیں اسی تاریک زمانے کے فرسودہ موضوعات پر ہیں، لیکن اس کی شاعری نے ازبک کسان مزدور کو قدامت پرستی اور سماج دشمنوں کے خلاف جنگ کرنے کے لئے تیار کر دیا۔

پھر جب اشتراکی تعمیر شروع ہوئی تو غفور کے شعروں نے عوام کو ولولہ تازہ اور جوش محنت سے معمور کر دیا۔ اور جب اشتراکی وطن پر نازیوں کا حملہ ہوا تو اس کی نظموں سے ازبک عوام کو حفاظتِ وطن کے لئے سینہ سپر اور جاں بکف بنا دیا۔

مسٹر میش سانگھوی جب اس سے ملے تو غفور پختہ سالی کی حد میں داخل ہو چکا تھا۔ غفور نے ہندوستانی قوم سے اپنی محبت کا اظہار کیا۔ سانگھوی کا کہنا ہے کہ "ایک روز ہم ایک ساتھ "شیریں فرہاد" کا اوپیرا دیکھنے گئے تو غفور نے سوال کیا:-

"برٹش حکومت کو ہندوستان میں کتنا زمانہ ہوا؟"

"قریب ڈیڑھ سو سال!"

"یہ سن کر غفور کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، کیونکہ اس ازبک شاعر کو غلامی کی مصیبت کی زندگی بھولی نہ تھی۔ پھر جب میں اس سے رخصت ہونے لگا تو غفور مجھے چمٹ گیا اور کہنے لگا:-

"رابندرناتھ کی قبر پر جا کر میرا سلام پہنچانا۔ ٹیگور زندگی بھر جو جنگ کرتا رہا ہے وہ جنگ مظفر و کامران ہو گی!"

غفور کی تصانیف کی تعداد چھبیس تک پہنچ چکی ہے۔ اور ان میں سے ہر کتاب یا مجموعہ لاکھوں کی تعداد میں چھپ چکا ہے اور اگر اس بات کو سامنے رکھا جائے کہ ازبک قوم کی تعداد صرف ساٹھ لاکھ ہے تو غفور کے شعر و ادب کی مانگ کی اہمیت سامنے آ جاتی ہے۔

تقسیم واتحاد

صبح کی دُھن میں ستاروں کو بجھایا میں نے

قبل از وقت مگر پو کا بکھرنا معلوم

ایک خود ساختہ ظلمت کا سمندر اُمڈا

ہو گئے دھندلے کناروں کے نشاں تک معدوم

راستے ڈوب گئے، گھل گئے پیڑوں کے نقوش

سرسراتے ہیں فضاؤں میں بھٹکتے ہوئے بوم

اے مشیت! میں بغاوت کا گنہگار نہ تھا

نو دمیدہ مرا احساس۔ ارادے معصوم

بجھتے تاروں کے سسکتے ہوئے انگاروں کو

میں مگر صبح کی قندیل کے بدلے کیوں لوں!

وقت اگر میری امنگوں سے الجھنا چاہے

تو الجھ لے، کہ میں اس جنگ میں بھی یکتا ہوں!

رات کٹ جائے گی، ہٹ جائے گی ظلمت کی نقاب

بھیک ظلماتوں کی اندھیروں سے بھلا کیوں مانگوں!

جس کے موڑوں پہ لٹایا گیا انساں کا سہاگ

میں تو اس راہ کو تلووں کا ہوکا بھی نہ دوں

احمد ندیم قاسمی

محمد تقی

شگون کا دِن

چھوٹا محل ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد دلی سے بھاگے ہوئے ایک شہزادے نے بنوایا تھا۔ سب کو معلوم ہے کہ اس زمانے میں چھوٹے محل کی ایک عجب شان تھی۔ اس کے وسیع صحن میں جھاڑو دینے والے حلال خور کشمیری دوشالے اوڑھتے تھے اور ان کی جھاڑو میں سونے کے مٹھے لگے ہوتے تھے۔ شام کے وقت محلے کے غریب غربا اس کے احاطے میں چاندی سونے کے تار اور سلمے ستارے چننے کے لئے آیا کرتے تھے کیونکہ دن بھر زرنگار جوتیاں اور کار چوبی چغے پہننے والے مہمانوں کا ایسا تانتا بندھا رہتا تھا کہ آتے جاتے چار پانچ روپئے کی چاندی تو جھڑ ہی جاتی تھی۔ مگر اب خاندان شاہی کے وظیفے کم ہو گئے تھے۔ ان کی بڑی بڑی جائدادیں سودخوار ساہوکاروں کی نذر ہو چکی تھیں اور چھوٹے محل کی گز بھر چوڑی دیواریں جگہ چھوڑ چکی تھیں۔ پرانا پلستر کہیں کہیں اس طرح پھول چلا تھا جیسے استسقاء کے مریض کا جسم۔ ان دیواروں کے پاس سے گزرنے والے انھیں ہراس سے دیکھتے ہوئے تیزی سے گزر جاتے تھے کہ خدا جانے یہ کب گر پڑیں۔

احاطے میں ایک طرف بڑی بڑی پرانی گاڑیوں کے آہنی زنگ خوردہ ڈھانچے کئی فٹ دھنسے پڑے تھے جیسے عہدِ قدیم کے جانوروں کے ڈھانچے۔ شام کو محلے کے بچے ان پرانی گاڑیوں پر سوار "ہٹو بچو" کنارے رہو کرتے ہوئے خیالی چوکڑیاں ہانکا کرتے تھے۔ بس اسی جگہ پر نیچ ذات کرائے دار بسائے گئے تھے۔ یہاں پر بیس چھوٹی چھوٹی کچی کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں جن پر ٹین کی چادروں کی چھتیں تھیں اور ٹین ہی کے دروازے۔ یہ ایک اچھی خاصی چھوٹی سی جائداد تھی۔ ان پر تقریباً چھ سو روپئے کا خرچ بیٹھا تھا اور اب ہر کوٹھری کا کرایہ دو روپیہ آتا تھا۔ مرمت پر کبھی کچھ خرچ کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی تھی کیونکہ جس کی کوٹھری گرنے لگتی وہی اس کی مرمت کر لیتا۔ مرمت کے لئے بس ایک ہی مسالہ کافی تھا۔ خالص مٹی کی ہر طرف افراط تھی۔ جہاں سے دل چاہے کھود کر نکال لو۔

آپ اس کا مطلب یہ نہ سمجھیں کہ خاندانِ شاہی کے لوگ لالچی یا سخت گیر تھے۔ وہ کبھی اپنے کرائے داروں پر سختی نہ کرتے تھے۔ کسی نے کرایہ دیا دیا نہ دیا نہ دیا۔ بلکہ ان غریب نیچ ذات لوگوں پر چھوٹے محل کے رہنے والے ہر طرح کا سلوک کرتے رہتے تھے۔ بڈھی بڈھی رئیس زادیاں چھوٹے چھوٹے اچھوت بچوں پر اکثر قرآن کی آیتیں دم کرتی تھیں اور اس طرح نہ جانے کتنوں کی جانیں جاتے جاتے بچ گئی تھیں۔ بلکہ مجھلی صاحبزادی نے تو ایک دن غضب کیا کہ گھر سے نکل کر پیدل لنگڑی راجو کی کوٹھری تک گئیں اور اس کے چار ناجائز بچوں میں سے سب سے چھوٹے بچے کی پیٹھ اور سینے پر اپنے ہاتھوں سے اینٹی فلوجسٹین کی پلیٹس باندھی۔ سب کہتے تھے کہ ننھے کلو کو ڈبل نمونیہ ہو گیا ہے اب اس کا بچنا مشکل ہے۔ مگر صاحبزادی نے اس کی کچھ ایسی تیمارداری کی کہ وہ چند دنوں میں بالکل اچھا ہو گیا بلکہ تھوڑے ہی دن میں پھول کر اچھا خاصا کپا ہو گیا۔

جاڑوں میں چھوٹے چھوٹے کالے کالے اچھوت بچے بچے کھچے اُون کے بنے ہوئے نیلے پیلے پل اوور پہنے نظر آتے تھے۔ باغ کی لمبی لمبی دیواروں پر سیم اور کدو کی بیشمار بیلیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان میں منوں ترکاری پیدا ہوتی تھی اور یہ سب انھیں اچھوت کرایہ داروں میں تقسیم ہو جاتی تھی۔

ان مہربانیوں کی بدولت چھوٹے محل میں نوکروں کی کبھی کمی نہ ہوتی تھی۔ اور بے دام درم کے بیسیوں نوکر چاکر عورتیں بچے بوڑھے باغ کی گھاس صاف کرنے۔ پانی ڈالنے۔ پیغام سلام کرنے اور دنیا بھر کے چھوٹے موٹے کاموں میں لگے رہتے تھے۔ اس طرح دونوں فریق مطمئن تھے اور زندگی اچھی خاصی گذرتی تھی۔ اس بستی کے رہنے والوں میں

جو محل کے چاکر نہیں تھے، یعنی جوان آدمی وہ تانگا چلاتے، سائیسی کرتے یا کسی فیشن ایبل پیشے کی تلاش ہوتی تو سائیکل رکشا چلاتے۔ جوان عورتیں دن بھر گھاس چھیلتیں اور شام کو منڈی میں بیچنے لے جاتیں اسے تانگے والے خرید لیتے اور جو تھوڑی بہت بچ رہتی اسے خوش عقیدت ہندو خرید کر سڑک پر چلتی پھرتی گایوں کو کھلا دیتے۔ اس طرح گئو ماتا کی سیوا بھی ہو جاتی اور ایک غریب کا پیٹ بھی بھرتا۔ ایک پنتھ دو کاج۔

بستی کی سب سے عمدہ کوٹھری موتی کے قبضے میں تھی جو بیک وقت محل کا سائیس بھی تھا۔ گھسیارہ بھی اور مالی بھی۔ زمانہ ہوا وہ ایک خوبصورت چمارن بیاہ کر لایا تھا مگر یہ کمبخت ایک تانگے والے کے ساتھ بھاگ گئی تھی کسی اور غرض سے نہیں صرف اس لئے کہ اسکا تانگہ نیا تھا اور اسے نئے تانگے پر سیر کرنے کا بڑا شوق تھا۔ اس واقعے کے بعد موتی لنگڑی راجو کے ساتھ رہنے لگا۔ یہ بیچاری بدصورت تھی لنگڑی تھی اور عمر میں موتی سے کئی سال بڑی تھی اور اسے تانگے کی سیر کا شوق بھی نہ تھا۔ اسلئے اس کے بھاگنے کا کوئی اندیشہ نہ تھا۔ دونوں ذات سے نکالدئے گئے تھے اور ان کے پاس اتنا روپیہ کبھی نہ ہوا کہ برادری کا لگایا ہوا جرمانہ دیتے۔ اس کے علاوہ موتی کو اپنی برادری کی پروا بھی نہ تھی۔ وہ فطرتاً خاموش اور ترش مزاج تھا اور اسے لوگوں سے ملنے جلنے کا قطعی شوق نہ تھا۔ راجو سے اس کے چار بچے ہوئے ان بچوں کی پرورش محل سے ہوتی تھی۔ راجو محل میں جھاڑو بہارو کرتی بازار سے گوشت ترکاری لاتی اور راتوں کو بڑی بیگم صاحبہ کی ایڑیوں میں چٹکی کاٹنے کی خدمت انجام دیتی۔ بیگم صاحبہ بغیر ایڑیوں میں چٹکی کٹوائے سو ہی نہ سکتی تھیں۔

موتی نے محل کی نوکری بڑی مجبوری سے کی تھی۔ اپنی برادری کے دوسرے ہونہار لڑکوں کی طرح ایک زمانے میں وہ بھی یکہ چلایا کرتا تھا مگر ایک دن قصہ یہ ہوا کہ ایک مسلمان پولیس والے نے اسے ایک موقع واردات پر چلنے کا حکم دیا۔ موتی دن بھر کا تھکا ماندہ تھا اس نے کچھ عذر کیا۔ اس پر اس سپاہی نے اسے بری طرح پیٹا۔ گالیاں دیں اور چلتے وقت اس کے منہ پر تھوک بھی دیا۔ اسی دات موتی نے تانگہ چلانے کا کام چھوڑ دیا۔

اس کے بعد کئی سال تک وہ درخت کاٹنے اور لکڑی چیرنے کا کام کرتا رہا۔ بیچارہ کمزور آدمی تھا اس کی صحت جواب دے گئی۔ اسے دمہ ہوا اور کچھ عرصے کے بعد اس کے منہ سے خون آنے لگا۔ اس علالت نے اسے گھسیارے کا کام کرنے پر مجبور کر دیا ورنہ تانگہ چلانے والے کے لئے گھسیارہ بن جانا بڑی سخت بے عزتی کی بات تھی۔ لیکن یہ پیشہ بھی بھیک مانگنے سے تو بہرحال بہتر ہی تھا۔ اس لئے اپنے لاغر اور کمزور جسم اور نہ رکنے والی کھانسی کے باوجود موتی گھاس کاٹتا۔ باغ کی باڑھ درست کرتا۔ گھوڑے کی مالش کرتا۔ اور اپنا کھانا پکاتا۔

وہ کام کرتے کرتے اتنا دبلا ہو گیا کہ بڑی بیگم صاحبہ نے رحم کھا کر اسے ایک مہینے کی چھٹی مع تنخواہ کے دی اور اس کے ساتھ اسے ایک بکری عنایت کی۔ ان کا مقولہ تھا کہ بکری کا دودھ ماں کے دودھ کے برابر ہوتا ہے اور اس کا استعمال تقریباً ہر مرض کو اچھا کر سکتا ہے۔ خصوصاً دمہ، دق، سل اور پھیپھڑے کے دوسرے امراض کے لئے تو اکسیر کا حکم رکھتا ہے اسکے لئے ایک دوا بھی تیار کی گئی۔ السی۔ گڑ۔ اور تخم خیارین پیس کر گھی میں پکا کر اس کے لڈو بنائے گئے تھے۔ یہ دوا سخت بدمزہ تھی اور اس میں بڑی ناگوار ہیک آتی تھی مگر جیسا کہ بیگم صاحبہ نے فرمایا دوا کوئی مٹھائی تو تھی نہیں اس کے علاوہ موتی نے ایک دوا کا اضافہ اپنی طرف سے کر لیا تھا۔ باغ میں ایک پرانا انار کا درخت تھا جس میں فصل پر چھوٹے چھوٹے کسیلے انار پھلتے تھے۔ یہ ان کسیلے اناروں کو بکریاں بھی نہ کھاتی تھیں۔ مگر موتی انھیں بڑی محنت سے چھیلتا۔ ان کے دانوں کو سل پر پیستا اور انھیں پانی میں گھول کر پی جاتا۔ اس کا مقولہ تھا کہ انار خواہ کتنے ہی کسیلے ہوں ہیں تو انار۔

بکری کا پاؤ آدھ سیر دودھ موتی کے لئے کافی تھا مگر جب بھی وہ اپنی موٹی موٹی روٹیاں اس میں بھگو کر کھانے بیٹھتا تو وہ اس کے حلق کے نیچے نہ اترتیں کیونکہ اسکا بڑا لڑکا پنوا اور سب سے چھوٹا کلو ندیدے پن سے اس کی طرف گھورتے رہتے۔ لڑکیوں کو جن میں سے ایک آٹھ اور دوسری گیارہ برس کی تھی وہ ڈانٹ کر بھگا دیتا تھا کیونکہ لڑکیوں کو کھلانے پلانے میں فائدہ کی جگہ نقصان تھا۔ جتنا کھائنگی اتنا ہی جلد بڑھیں گی اور پھر کوئی نہ کوئی معاملہ کھڑا ہو جائے گا۔ مگر لڑکوں کا معاملہ

ذرا مختلف تھا۔ ان بیہودہ پروانہ وار رجحان جھڑکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ خوب موٹے تازے اور مضبوط نکلیں اور طاقت میں دوسرے لڑکوں سے آگے ہی رہیں۔ اس لئے روزانہ دودھ اور روٹی میں ان کا بھی حصہ لگا دیا کرتا۔ مگر یہ لڑکے خصوصاً پنوا اس کے لڈوؤں کو بھی چکھنا چاہتے۔ اس پر موتی بالکل خفا ہو جاتا۔ اور کہتا "بدمعاشو کیا یہ بھی کوئی مٹھائی ہے۔ تم سب ہر چیز کھانے کو تیار ہو جاتے ہو۔ وہ دودھ روٹی ہوا گھوڑے کا دانہ ہو یا میری دوا۔ چلو بھاگو یہاں سے نہیں تو پٹو گے" جس ڈبے میں یہ لڈو رکھے تھے اسے وہ ٹین کی چھت اور دیوار کے بیچ کی دراز میں چھپا کر رکھتا تھا۔

چھٹی کے پندرہ دن گزر چکے تھے اور وہ کچھ کچھ اچھا ہو چلا تھا بس اسی دن ایک نیا جھگڑا اکھڑا ہو گیا۔ شام ہو چکی تھی۔ موتی اپنی کھاٹ پر خاموش لیٹا تھا۔ سامنے برآمدے میں لنگڑی راجو آڑ میں دروازے سے ذرا ہٹ کر بیٹھی تھی۔ یکایک راجو نے ایک لمبی چیخ ماری اور کچھ بین کر کے رونے لگی۔ وہ کہہ رہی تھی "دو مہینے تک تم بیمار پڑے رہے۔ کوئی دیکھنے والا بھی نہ تھا مجھے کسی نے خبر بھی نہ کی" یقینی کوئی مر گیا تھا اور راجو اس کا نوحہ کر رہی تھی۔ موتی جھپٹ کر دروازے کے باہر آیا اس کی پتلی پتلی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ اس نے گھبرا کر پوچھا "کیا ہوا۔ کون مر گیا؟" راجو کے پاس ٹینیا کی بڈھی ماں بیٹھی ہوئی تھی سوکھی سیاہ اور ڈراونی۔ اس نے بڑی طنز کی نگاہوں سے موتی کی طرف دیکھا۔ وہ ہمیشہ بدخبر لاتی تھی۔ موتی کی اس کی بول چال نہ تھی۔ کیونکہ سولہ برس پہلے موتی کو ذات باہر کروانے میں اس نے بڑا نمایاں حصہ لیا تھا۔ موتی نے اس سے کچھ بھی نہ پوچھا۔ مگر وہ بڑے پرمعنی لہجے میں بولی۔ "او کر آدمی مر نہ گئل"۔

موتی دم بخود رہ گیا۔ جب وہ زندہ سلامت کھڑا تھا تو اس اطلاع کا مطلب کیا تھا۔ اس نے بڑی ترش روئی سے پوچھا "کیکر آدمی رہے؟"

ٹینیا کی ماں بھی تیز ہو کر بولی "رجو ننیا کا آدمی اور کیکر آدمی۔ مادھوا وہی ہے کہ چھوڑ کے تو ہرے پاس آئی رہی"

موتی نے کہا "اچھا۔ او"

وہ خاموش کھڑا ہو گیا۔ اس کے سینے میں ایک آگ سی دہکنے لگی۔ اس نے اپنے دل میں کہا "رنڈی ہیاں سے نی" اور پھر اپنی کوٹھری میں جا کر زمین پر بیٹھ گیا۔ اس کے گال اور اندر گھس گئے تھے آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس کے پیر پتھر کی طرح بھاری ہو گئے تھے اور کانپ رہے تھے۔ اس نے کئی منٹ انتظار کیا کہ شاید اب بھی یہ مکاری کا رونا بند ہو جائے مگر لنگڑی بغیر اس کے جذبات کا خیال کئے ہوئے روتی رہی۔ آخرکار وہ اٹھا اور بڑے طیش میں اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا "اتنا اوکے چاہت رہل تو کاہے اوکے چھوڑ لی رہے" اور اس نے اسے ایک موٹی سی گالی دی "بے بس اب چپ ہو جا نا ہیں ابھئی بتاییب کیسے رذل جات ہو ہم کہت ہئی تو پارا و ہو ٹانگ ابھئی توڑ دیب۔ سور کی اولاد۔ چوپ۔ چوپ" اور یہ کہتے کہتے اس نے پوری قوت سے اس کے ایک لات رسید کی۔ لنگڑی برآمدے کے نیچے آ رہی۔ موتی بھی لڑکھڑایا اپنے کو سنبھال نہ سکا اور گرا۔ گرتے ہی اس کے گھٹنے اور ہتھیلیاں چھل گئیں۔ چوٹ کھا کر اس کا غصہ اور بھی بڑھ گیا اور وہ بری طرح لنگڑی پر پل پڑا۔ اس کی سانس پھول رہی تھی اور کف اس کے منہ کے کنارے جمع ہو گیا تھا۔ لنگڑی پر اس نے گھونسے اور لاتوں کی بارش کر دی۔ لنگڑی گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہی تھی۔ اور اس کا چہرہ مٹی میں دھنس گیا تھا۔ خون اس کی ناک سے نکل کر اس کے سیاہ ہونٹوں اور مسوڑھوں پر پھیل گیا تھا۔ آخرکار موتی تھک کر چور ہو گیا۔ وہ کوٹھری کے اندر گیا اور اسے اندر سے بند کر کے لیٹ رہا۔ اور تھوڑی دیر بعد خود بھی بڑی خاموشی سے رونے لگا۔

محل کے اندر اس شور کی آواز پہنچ چکی تھی۔ بڑی بیگم صاحبہ نے اپنی حسین ہلالی بھویں چڑھا کر پوچھا "اب کیا ہوا ابھی۔ فنا گردیپنے میں کون شور مچا رہا ہے" بیگم صاحبہ وقت سے پہلے بڈھی ہو چلی تھیں مگر اب بھی وہ بہت حسین تھیں۔ ان کا رنگ بہت گورا تھا۔ جلد بہت نازک اور بے عیب تھی اور ناک اس قدر سفید اور پتلی تھی جیسے کسی چابکدست کاریگر نے ہاتھی دانت سے تراش کر بنائی ہو۔ ان کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی جس سے ان کے خاندانی جلال اور عظمت کا

پتہ چلتا تھا۔ رسولن جو قریب قریب آدھی صدی سے اس خاندان میں رکابدار کی خدمات انجام دے رہی تھی دریافت حال کے لئے بھیجی گئی رسولن بالکل بونی تھی اس کا قد مشکل سے ساڑھے تین فٹ کا رہا ہوگا۔ اور وہ اتنی ہی چوڑی بھی تھی۔ وہ ہنستی ہوئی واپس آئی "لنگڑی ہو سرکار اس کا آدمی مر گیا" اس نے یہ خبر اس طرح سنائی جیسے بڑی خوشی کا پیام ہو۔

بیگم صاحبہ تڑپ گئیں "ارے۔ موتی؟" انھوں نے بیتابی سے پوچھا۔ رسولن اور ہنسی "نہیں سرکار۔ اس کا پہلا آدمی بڑھوا مادھو" رسولن نے حقارت سے کہا۔

بیگم صاحبہ کی دونوں صاحبزادیاں اس خبر کو سننے کے لئے آ گئی تھیں۔ انھوں نے زور کا قہقہہ لگایا۔ بیگم صاحبہ نے کہا "وہ کیا محبت ہے۔ جیتے جی بات نہ پوچھی موئے دھڑا دھڑ رو رہے ایسے کہو موتی کے لئے بھی تو کچھ آنسو بچا کر رکھے یا سب آج ہی ختم کر ڈالے گی۔ ایک آدھ مہینے کا تو وہ بھی مہمان ہے۔"

"مگر سرکار موتی نے اسے بری طرح پیٹا ہے۔ ناک سے نالی کی طرح لہو بہہ رہا ہے" رسولن نے اطلاعاً کہا۔

چھوٹی شہزادی نے کہا "مارے گا نہیں تو اور کیا کرے گا بیچارہ موتی۔" اور سب ہنس پڑیں۔

دوسرے دن صبح کو بیگم صاحبہ نے موتی سے کہلوا بھیجا کہ "جورو کو مارنے کے لئے طاقت ہے اور کام کرنے کے لئے بیمار ہے۔ اگر پڑے پڑے دودھ روٹی کھانے سے جی اکتا گیا ہے تو ذرا سا کام کیوں نہیں کرتا معلوم نہیں ہے سات تاریخ کو چھوٹے بھیا کی سالگرہ ہے۔ ذرا دھیرے دھیرے باغ کی باڑھ ہی درست کر ڈالے اور کیاریوں کی گھاس وغیرہ صاف کر لے۔

موتی نے خاموشی سے ان احکام کو سنا اور جواب میں صرف ایک لفظ کہا "اچھا"۔ اسے بڑا طیش آیا اور وہ ایک بڑی بھاری زنگ خوردہ قینچی لے کر باڑھ کترنے چلا گیا۔ چار روز تک وہ باڑھیں کترتا رہا اور کیاریوں کی گھاس کھودتا رہا۔ یہاں تک کہ باغ بہت صاف ستھرا نکل آیا بیگم صاحبہ نے جب باغ کا معائنہ کیا تو ان کے دل میں موتی کے لئے رحم اور ہمدردی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ کہنے لگیں "کیسا دل لگا کر کام کرتا ہے بیچارہ موتی" مگر اس محنت کا موتی کی صحت پر بہت برا اثر پڑا۔ پانچویں دن اسے زور کا بخار آ گیا۔ کھانسی کا ایک زبردست دورہ پڑا اور اس کے منہ سے سیروں خون۔ جیتا ہوا چمکدار خون آیا۔ اس کے پھیپھڑوں میں جلتا جلتا بلغم چھن چھن کرنے لگا۔ اسے سانس لینا دوبھر ہو گیا اور اس کا سارا جسم پھوڑے کی طرح دکھنے لگا۔ راجو نے اس کے پاس آنا جانا چھوڑ دیا تھا اس کے بچے اس کی صورت سے بھاگتے تھے۔ چند دنوں بعد اس میں اتنی سکت بھی باقی نہ رہی کہ وہ اپنی روٹیاں پکا سکتا یا اپنی بکری دوہ سکتا۔

سالگرہ کے ایک دن پہلے محل میں بڑی چہل پہل تھی۔ اس رات کو رت جگا منایا گیا۔ قریبی اعزہ جمع ہوئے۔ بیگم صاحبہ خود ڈھول لے کر بیٹھیں۔ کبھی اپنے لاڈلے بیٹے کا سہرا گاتیں کبھی مبارکبادیاں کبھی کوئی پرانی دعائیہ غزل۔ محل کی پرانی دیواریں قہقہوں سے گونج رہی تھیں بیگم صاحبہ کے ظریفانہ جملوں سے ساری محفل لوٹ پوٹ ہوئی جاتی تھی۔ رات کے دو بجے سب نے کھانے سے فراغت پائی ہی تھی کہ احاطہ کی طرف سے ایک زبردست چیخ سنائی دی۔ بیگم صاحبہ نے بلا تامل کہا "راجو کی آواز ہے معلوم ہوتا ہے موتی ختم ہو گیا۔"

اتنے میں راجو کے چیخنے کی آواز اور تیز ہو گئی۔ سارا محل دم بخود تھا۔ لڑکیاں بیگم صاحبہ کے گرد جمع ہو گئی تھیں۔ آخر کار بڑی صاحبزادی نے ہمت کر کے کہا "اب کیا ہوگا اماں۔ اس نے تو مرنے کا بڑا برا وقت نکالا۔ صبح ہی مہمان آنا شروع ہوں گے۔ اس کو جلانا بھی مشکل ہوگا کیونکہ یہ لوگ ٹاٹ سے اتارے ہوئے ہیں۔ اس کو تو کوئی ہاتھ بھی نہ لگائے گا۔"

بیگم صاحبہ سخت غصے میں تھیں۔ کہنے لگیں "تم فکر نہ کرو میں سب ٹھیک کر دوں گی۔ کیا یہ حرامزادے ہمارا کام خراب کر سکتے ہیں جب تک مہمان آئیں آئیں یہ معاملہ کر راکھ ہو چکا ہوگا۔ تم جاؤ سو رہو۔ بہت جاگی ہو۔"

رسولن جو اب تک بے خبر سوئی تھی جگائی گئی۔ بیگم صاحبہ کا غصہ اپنے پورے عروج پر پہنچ چکا تھا وہ بالکل آپے سے باہر تھیں۔ انھوں نے دانت پیس کر رسولن سے کہا "جا کے اس لنگڑی سے کہو کہ یہ فضیحتا بند کرے یہ ہمارا شگون کا دن ہے۔ وہ اگر رو رو کر بدشگونی پھیلائیگی تو میں جھونٹے پکڑوا کر احاطے کے باہر کروا دوں گی اور وہ حرامزادہ

مرا ہے اس کی ٹانگ ڈوملوں سے گھسیٹوا کر کہیں گھورے پر پھنکوا دوں گی۔ جب تک مرد و زندہ رہا ایک عذاب رہا۔ اب مر کر اور بھی عذاب ہو گیا ہے"

رسولن جا چکی تھی مگر بیگم صاحبہ کا مزاج برہم تھا اور وہ چلاتی رہیں۔ "ابھی چار دن ہوئے اپنے پہلے آدمی کے لئے رو رہی تھی اب ان کے لئے رو رہی ہے۔ ایسی ستی ساوتری ہیں یہ"

دوسرا شخص جس کی طلبی ہوئی محل کا بڈھا کوچوان تھا۔ اس کا نام منّا تھا۔ اور وہ چار برادری کا ایک اہم افسر تھا۔ اس کا کام یہ تھا کہ جب برادری میں کسی فیصلے کی ضرورت ہو تو وہ "چھڑی گھما دے" یعنی برادری کے ہر فرد کو جمع ہونے کی دعوت دے دے۔ بیگم صاحبہ دروازے پر گئیں اور منّا سے بڑی نرمی سے بولیں "منّا اس موتی کا کیا ہوگا۔ اس کو تم لوگ کب لے جاؤ گے۔ تم جانتے ہو یہ ہمارا شگون کا دن ہے"

منّا اپنا گلا صاف کرنے لگا۔ بیگم صاحب کی بدمزاجی اور بدزبانی سے منّا بہت ڈرتا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ہچکچاتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "حجور۔ اب ہم کا کہی۔ جون سرکار کا حکم ہوئے باکی اد تو جات باہر رہل اوکے کے چھوئی سولہ برس کھیل اد کے جات باہر کھیلے۔ اب ہم کا بتائی۔ اد کے کتنا کہا گوا"

بیگم صاحب ڈپٹ کر بولیں "کا بتائیں۔ کا بتائیں۔ کر رہا ہے اُلّو۔ تو کیا وہ یہیں پڑا سڑتا رہے گا۔ اور دس بجے میرے مہمان آنا شروع ہونگے۔ تم سب چمار مجھے پریشان کرنا چاہ رہے ہو۔ اب تو جی چاہتا ہے کہ میں پولس کو بلواؤں اور خوب پٹواؤں تم سب کو"

"اب سرکار ہم کا بتائیں" منّا نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ پولس کی دھمکی بیگم صاحب کی بڑی پرانی اور محبوب دھمکی تھی۔ یہ اس زمانے کی یادگار تھی جب کہ اس گھر کے ایک اشارے پر کوتوال صاحب سارے شہر کی کھال اتارنے پر تیار ہو جاتے تھے مگر اپنی تیس سال کی ملازمت کے دوران میں منّا نے پولس کو کبھی آتے نہ دیکھا تھا۔ چوراہے کے پہریدار کو جو دو روپے عید اور بقرعید پر ملا کرتے تھے وہ بھی عرصہ ہوا بند ہو چکے تھے۔ مگر تہذیب کا اقتضا یہی تھا کہ منّا اس دھمکی سے اسی طرح ڈرے جیسے کہ لوگ پہلے ڈرا کرتے تھے۔ اس نے کہا "حجور ہم اکیل تو اوکے اٹھا نا ہی سکت ہیں۔ دوسر کوئی آئے نا ہیں کرت۔ اے ہی سب ہمر د ساتھ ہوئی جب ہم مرب"

یہ جملہ کہتے ہوئے منّا نے ایک روہنذی سی آواز نکالی۔

"بیگم صاحب نے یکایک پوچھا اس پر کتنا ڈنڈ لگا تھا"

پچپن روپے حجور۔ ایہہ کوٹھی کی کھاطر اتنا کم ڈنڈ لگا وا گوار یا۔ ناہیں تو ایہہ بات پر سو روپیہ سے کم ڈنڈ کہوں ناہیں لگت" بیگم صاحبہ نے کچھ صلح کن لہجے میں کہا "اچھا اب میں پچپن روپے لنگڑی کی طرف سے دے دوں تو تم لوگ اسے ذات میں لے لو گے" منّا مسکرایا مگر بیگم صاحبہ اسے دیکھ نہ سکتی تھیں۔ اس نے کہا "سرکار با کی اب تو او مر گیل ہموے کے لیئی جات میں"

بیگم صاحبہ آپے سے باہر ہو گئیں "مجھ سے اس سے کیا مطلب ہے کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا۔ تم لوگوں کو تو روپیہ چاہئے کہ جس میں خوب دارو پی جائے۔ بس اگر صبح چھ بجے تک تم لوگ اسے نہیں لے گئے تو یاد رکھنا کھال کھچوا لوں گی۔ یاد ہے جب تو نے گاڑی کے لمپ چرائے تھے تو کیسی مار پڑی تھی۔ اب کے اس سے زیادہ برا حال ہوگا۔ میں روپیہ نہیں دے رہی ہوں" یہ کہہ کر بیگم صاحبہ پیر پٹکتی اور دنیا بھر کے چماروں کو گالیاں دیتیں اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

دس بجے جب مہمان آنا شروع ہوئے تو جیسا بیگم صاحبہ نے کہا تھا موتی کا کہیں نام و نشان باقی نہ رہا تھا۔ البتہ جس پانی سے وہ نہلایا گیا تھا وہ اس کی کوٹھری کے سامنے چھوٹے چھوٹے گڑھوں میں جمع ہو گیا تھا۔ اور اس کی غلیظ دھوتی اور قمیص اس کے دروازے کے سامنے پڑی تھی۔ شام کو راجو مسان گھاٹ سے واپس آئی جس راجو کو کسی نے اس سے پہلے سفید دھوتی پہنے نہ دیکھا تھا وہ آج نہائی دھوئی صاف ستھری ہو کر بہت بھیانک معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے بال جن میں ہمیشہ تیل چپڑا رہتا تھا آج دھل کر بالکل کورے نکل آئے تھے۔ وہ آکر اپنی کوٹھری کے دروازے پر بیٹھ گئی۔ بھوک اور تھکن کی وجہ سے اب اس سے رویا بھی نہ جاتا تھا۔ آج اسے دہرا نقصان پہنچا تھا۔ ایک تو اس کا آدمی مر گیا تھا دوسرے وہ محل میں جا کر نہ اپنا حق طلب کر سکتی تھی نہ اسے وہاں سے کھانا ملنے کی کوئی امید تھی۔ محل کے عمدہ عمدہ کھانوں کے تصور سے اس کی بیتابی اور بھی بڑھ رہی تھی۔ وہاں خوشی کا ایک ہنگامہ برپا تھا۔ گانے بجانے اور ہنسنے کی آوازوں نے اس کے نقصان اور بےبسی کے احساس کو

(باقی صفحہ ۴۲ پر)

جناگا رنگ کے پہاڑی علاقے کا ایک سردار قائد اعظم کے حضور میں -
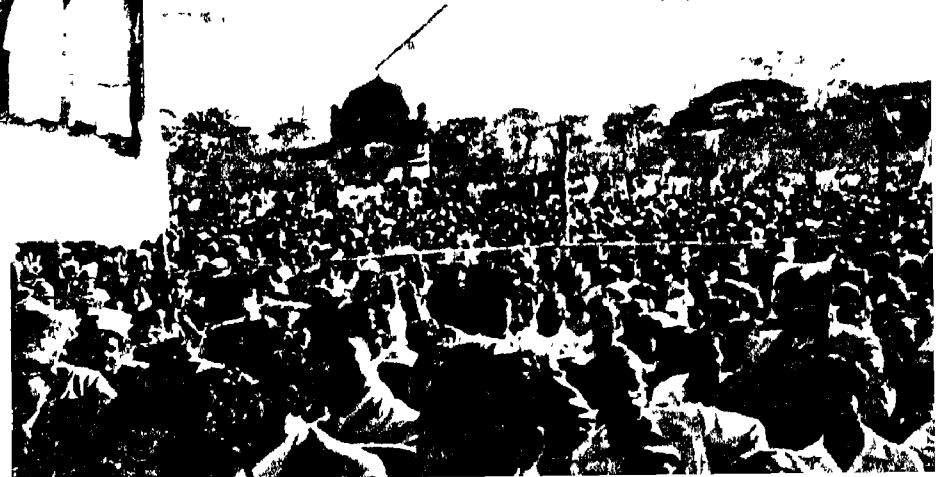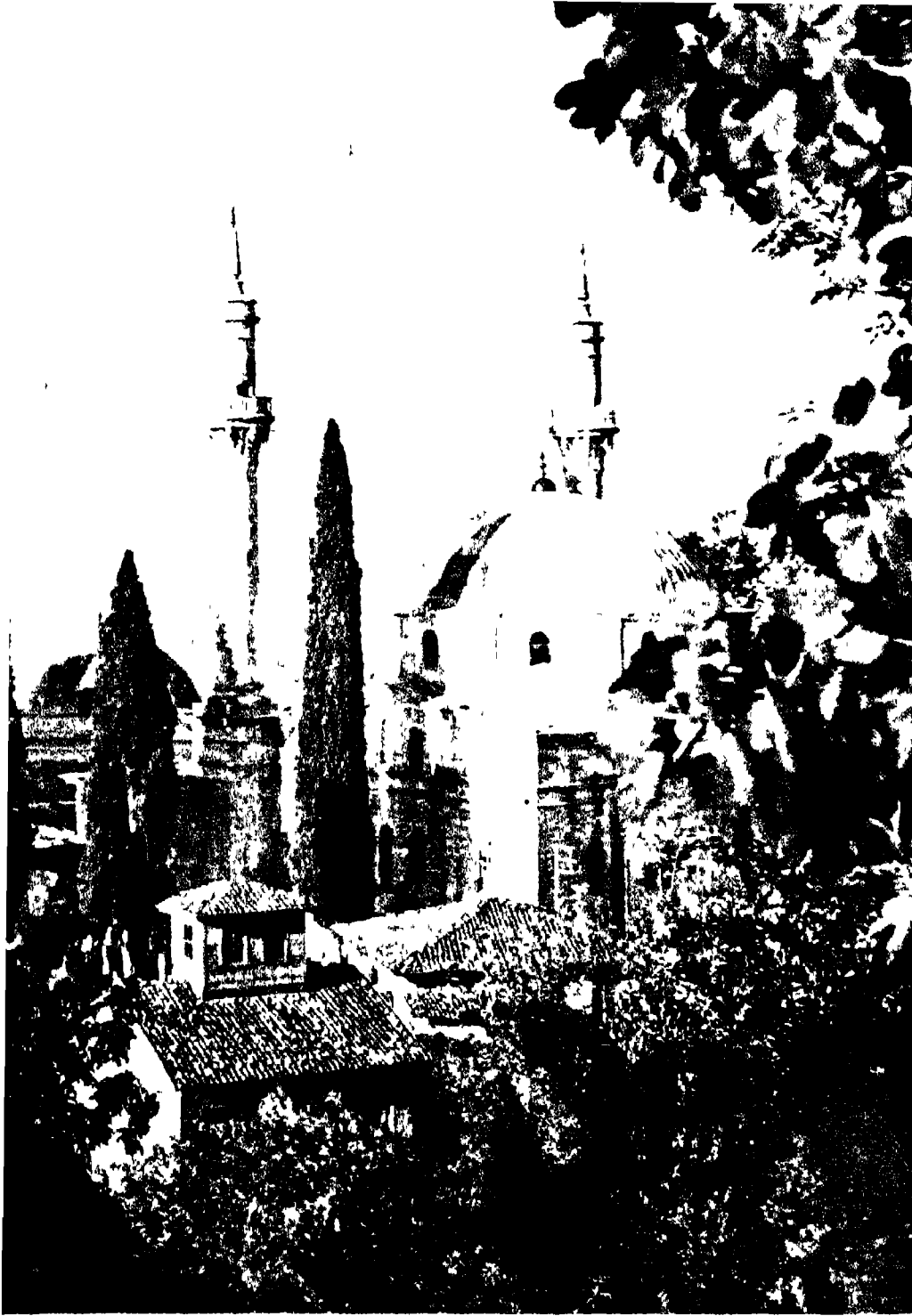
قائد اعظم مشرقی پاکستان میں

ساحل کراچی کا ایک دلکش منظر

وقار عظیم

شاہ عبداللطیف کی شاعری[1]

شاہ عبداللطیف کی شاعری کے متعلق کچھ لکھنے سے پہلے انسان کو تین چیزوں کے علم اور مہارت کی ضرورت ہے۔ تصوف کا علم، سندھی زبان کی مہارت اور سندھی زندگی کی تفصیلات سے پوری واقفیت۔ تصوف کے متعلق میرا علم محض نظری ہے وارداتی نہیں۔ سندھی زبان کے علم میں میری حیثیت مبتدیوں سے بھی کچھ کم ہے۔ زندگی کی تفصیلات کی واقفیت کے لئے بھی میں دوسروں کے علم کا محتاج ہوں۔ اس کے باوجود میں شاہ عبداللطیف کی شاعری پر کچھ لکھنے کی جسارت صرف اس عذر کی بنا پر کر رہا ہوں کہ اردو والے اب تک سندھ کے اس صوفی شاعر کے کلام سے روشناس نہیں ہیں۔

شاہ عبداللطیف کے کلام کو سمجھنے اور ان کے شاعرانہ محاسن سے لطف اندوز ہونے کے لئے ہمیں یہ چیز ہر وقت ذہن میں رکھنی پڑتی ہے کہ شاہ صوفی شاعر ہیں۔ اور تصوف اور شعر اس حد تک ان کی ذات اور شخصیت کا جزو بن گئے ہیں کہ پڑھنے والے کلام کے کسی حصے کے متعلق بھی آسانی سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ محض تصوف یا محض شعر ہے۔ تصوف اور شعریت اُن کے یہاں ایک ہی زنجیر کی دو کڑیاں ہیں۔ اُن کا ہر خیال اور ہر جذبہ تصوف کے رنگ میں ڈوب کر باہر نکلتا ہے، اور شاہ کی شخصیت کا دوسرا عنصر (یعنی شعریت) اسے اپنے قالب میں ڈھال لیتا ہے۔ یہاں ہر جگہ تصوف ہے اور ہر جگہ شعریت ہے۔ دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے پر غالب نہیں آنے پاتا۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ کے کلام کو اگر موضوع کے اعتبار سے مختلف حصوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کی جائے تو بڑی دقت پیش آتی ہے۔ اس لئے کہ اس تقسیم کا معیار خواہ کچھ بھی ہو تصوف کی چاشنی اس میں بہرحال موجود رہتی ہے۔ اور اسی لئے شاہ کے نقادوں نے جب اُن کے کلام کی تقسیم کرنے کی کوشش کی ہے تو اُنھیں مختلف قسم کی معذرتیں پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ پھر بھی مجموعی حیثیت سے جس بات پر اکثر نقاد اور شارح متفق ہیں وہ یہ ہے کہ ان کے کلام کا ایک حصہ دعائیہ ہے، جسے عاشقانہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ دوسرا حصہ وہ ہے جس میں سندھی زندگی کا پس منظر ہے اور تیسرا حصہ وہ جس میں مروجہ لوک کہانیوں کے ٹکڑے نظم کئے گئے ہیں۔

دعائیہ یا عاشقانہ کلام میں عشق و محبت کے وہی سارے مدارج اور وہی ساری کیفیات ہیں جو عموماً عاشقانہ شاعری میں ہوتے ہیں، حسن بےنیاز ہے، عشق بےتاب و بیقرار ہے لیکن فرق یہ ہے کہ گو عشق کی ساری علامتیں دنیاوی ہیں لیکن اُن کا احساس بلند روحانی احساس ہے۔ اس میں ارضی عشق کی تنگ نظری اور تنگ ظرفی کہیں نہیں۔ محبوب سے شکوہ شکایت کا نام نہیں۔ لہجہ میں سختی، کرختگی حتیٰ کہ طعن و طنز سرے سے مفقود ہے بات چونکہ ہمیشہ عورت کی طرف سے کی گئی ہے اس لئے قدرتی طور پر اس میں ایک طرح کی نرمی نزاکت اور لوچ ہے۔

شاہ کی محبت میں عاشق اور محبوب کے کرداروں کی دو خصوصیتیں ہیں اور ان کے ہر عمل میں یہ خصوصیتیں جلوہ گر نظر آتی ہیں۔ عشق اپنے آپکو بدیوں کا مجسمہ جانتا ہے اور حسن اس کی نظر میں مجسم حسن ہے۔ اس بنیادی خیال کو شاہ نے اپنے کئی دوہوں میں ادا کیا ہے۔ دو تین دوہے ملاحظہ کیجئے:۔

"میرے محبوب کی پیشانی سے نیکیوں کے انوار ہویدا ہیں۔ یہی وجہ تو کہ

---

[1] :۔ اس مضمون کی ترتیب کے سلسلہ میں میں نے محترمی عثمان علی انصاری صاحب کو وقت وناوقت بار بار زحمتیں دی ہیں۔ اس مضمون میں جو کچھ اچھا ہے وہ مجھے ان کی رہنمائی میں حاصل ہوا ہے، اور جو کچھ کسی وجہ سے گوارا نہ بن سکے اُس کی ذمہ داری سرتاسر مجھ پر ہے۔

کہ وہ مجھ جیسے بد اطوار کے پاس آنے سے گریز نہیں کرتا۔ اسی لئے تو میں
اپنے دوستوں سے کہتا ہوں کہ شمس و قمر میرے محبوب کا مقابلہ نہیں
کر سکتے۔ ان میں حسن تو ہے لیکن نیکی نہیں۔"

"میرا محبوب مجسّم خیر ہے۔ اس نے یہ بات بالکل بھلا دی ہے کہ وہ
نیکیوں سے پُر ہے۔ اس کی نیکی اور معصومیت کا سب سے بڑا ثبوت
یہ ہے کہ وہ میرے پاس آیا لیکن اس نے مجھ سے میرے عیبوں
اور میری کوتاہیوں کا کوئی ذکر نہیں کیا۔"

"اے چاند، تو میرے محبوب سے مقابلہ کرتا ہے۔ میں تجھے للکارتا ہوں
۔۔۔ تو چودھویں رات کو جو نکھار چاہے کر۔ ساری عمر کا حسن اکٹھا کرلے
لیکن میرے محبوب کے ایک جلوے کی برابری بھی نہیں کر سکتا۔
تم اور تمہارے جیسے ایک سو سورج نکل آئیں پھر بھی محبوب کے
بغیر میرے لئے اندھیرا رہے گا۔ جاؤ نیچے اتر جاؤ ۔۔۔۔۔۔ تمہاری
روشنی میں میں محبوب سے نہیں ملنا چاہتا۔"

یہ تو ہے محبوب کا تعارف۔ اب دیکھئے کہ عاشق کے دل میں اس کے دئے
ہوئے درد کی کتنی محبت ہے:۔

"وہ میرے دل میں درد اٹھا کر چلے گئے۔ اور مجھے یہ درد اس لئے
پیارا ہے کہ وہ محبوب کا دیا ہوا ہے۔ اسی لئے مجھے طبیبوں کی آواز بھی
بُری لگتی ہے۔"

"مجھے طبیبوں کے پاس جانا بھی گوارا نہیں۔ اس نے میرا سب سے
بڑا دوست تو محبوب کا دیا ہوا درد ہے۔"

یہ درد عاشق کو اتنا عزیز ہے کہ محبوب سے استدعا کرتا ہے کہ وہ اُسے جس طرح
بھی ہو یہ درد دے۔ دیکھئے دو تین دوہوں میں شاعر نے عاشق کی اس تمنا کو کتنے
جوش، ولولے اور ارمان کے ساتھ بیان کیا ہے:۔

"اے میرے محبوب، لگاؤ زور سے لگاؤ آہستہ لگا کر مجھ پر احسان
مت کرو۔ اس لئے کہ یہ مجھ پر احسان نہیں۔ میرے لئے تو عزت کی
بات یہ ہے کہ تمہارے دئے ہوئے زخم سے مر جاؤں۔"

"اے میرے محبوب، چوٹ لگاؤ اور جتنی زور سے ہوسکے لگاؤ،
تاکہ مجھے تمہاری جھولی میں گر جانے کا موقع مل جائے۔"

"اُن کا دیا ہوا زخم مجھ سے سدا یہی کہتا رہتا ہے کہ طبیب کے پاس
مت جا ورنہ میں اچھا ہو جاؤں گا۔"

عشق کی دنیا میں تصویر کا ایک رخ تو وہ ہے جس میں شاعر عاشق کی روداد بیان
کرتا ہے اور دوسرا وہ جس میں ان لوگوں کی زندگی کی جھلک نظر آتی ہے جو عشق
کے میدان میں اس کے مدِ مقابل اور رقیب ہیں جس عشق کی پرورش بوالہوسی کے
گہوارہ میں ہوتی ہے۔ وہ عشق کی رقابت کی تاب نہیں لا سکتا۔ لیکن جس عشق میں
لگاؤ سچا ہے، وہ اس تنگ ظرفی کو پاس بھی نہیں آنے دیتا۔ اسے تو اُن
ہم جنسوں اور ہم چشموں کی صحبت اور بھی عزیز ہوتی ہے جن کے دلوں میں محبوب کا
دیا ہوا درد ہے:۔

"آؤ چلیں، ایک رات ان کے پاس گذاریں جن کے جسم درد سے
چاک ہیں، لیکن جب لوگ آتے ہیں تو اُن سے اپنا درد چھپاتے ہیں"

شاہ کے عاشقانہ کلام میں عاشق کا کردار بہت بلند ہے۔ اس میں ان ایک طرف حسن کا
ایک بہت اونچا نصب العین ہے، دوسری طرف عشق کا نصب العین بھی کسی
طرح اس سے کمتر نہیں۔ حسن کی بلندی یہ ہے کہ وہ دنیا کے ہر حسن سے بہتر و برتر ہو۔
ایسے حسن کے لئے عشق بھی ایسا ہی بلند ہونا چاہیئے۔ وہ محبوب کے حسن کا
فریفتہ ہے۔ اسے اس میں نیکیوں کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا۔ اس کے دئے ہوئے
درد میں اسے باقی ہر چیز سے زیادہ لذت محسوس ہوتی ہے۔ اُسے ان عاشقوں کی
صحبت میں رہنے کی تمنا ہے جو اس کے رقیب تو ہیں لیکن اسی حسن کے عاشق
ہیں جس کے جلوے اس کی نظر میں سما رہے ہیں۔ اسی نازک رشتہ کی دو ایک
کڑیاں اور ملاحظہ کیجئے:۔

"کسی نے پوچھا "تمہارا محبوب کبھی تم سے بات کرتا ہے؟"
"نہیں"
"پھر وہ محبوب کیسا؟"
"محبوب کا سکوت ہی میرے لئے سلام ہے"

"میری آنکھوں نے مجھ پر احسان کیا کہ میرے گھر کے سامنے سے
ہزاروں انسان گذرتے ہیں لیکن وہ کسی کو نہیں دیکھتیں۔"

"میری آنکھیں اگر محبوب کے سوا کسی اور کو دیکھیں تو اے کاگا اُن کو
نکال کر گڑھے میں ڈال دے۔"

یہ ایک جھلک ہے شاہ کے عاشقانہ یا دعائیہ کلام کی۔ کلام کے دوسرے

حصّے ہیں جن میں سندھی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی بہت سی دلکش تصویریں نظر آتی ہیں۔ مثلاً بارش کے موضوع پر شاہ نے ایک طرف تو اس عام ذہنی کیفیت کی مصوری کی ہے جو سندھ جیسی بنجر زمین میں بارش ہونے پر ہر ایک میں پیدا ہوتی ہے۔ اور پھر اس پھیلی ہوئی زندگی میں سے کچھ خاص کردار چن کر اس تصویر کو مکمل بنا دیا ہے۔

"دیکھو، لطیف گھنے بادل نیچے اُتر رہے ہیں، اور پانی کی بڑی بڑی بوندیں پڑنے لگیں۔ اپنے بیلوں کو باہر نکالو اور میدانوں کا رُخ کرو ـــــ یہ وقت مایوس ہو کر بیٹھنے اور سُستی کرنے کا نہیں ـــــ دیکھو پھوار پڑنے لگی۔"

"کل رات پدم جھیل پر بارش کے دیوتا نے گھڑے کے گھڑے اُنڈیل دیئے، لیکن وہ جن کے شوہر پردیس میں ہیں ان بادلوں کو دیکھ کر غمگین ہیں۔"

"وہ موسم آ گیا، جب لوگ خوش ہو کر باتیں کرتے ہیں اور موسیقی کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ کسان اپنے ہل درست کر رہے ہیں، گلّہ بان خوش ہیں۔ اور میرے محبوب نے بارش کی خوشی میں اچھے سے اچھے کپڑے پہنے ہیں۔"

"جو لوگ محمدؐ کے سہارے پر جیتے ہیں اور جو لوگ کنجوس ہیں، ان سے کہو کہ چلے جائیں، گاؤں کے گلّے بارش کی خبر لا رہے ہیں ـــــ سب تیری رحمت کو اپنے قریب محسوس کر رہے ہیں۔"

سندھی زندگی کی جن خاص رسموں کو شاہ نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ ان کے رسالے کا ایک باب جس کا نام سُر سامندری ہے۔ ان رسموں میں سے ایک کے مختلف پہلوؤں کا ترجمان ہے۔ سمندر کے کنارے بسے ہوئے گاؤں میں بہت ہندو آباد تھے یہ سمندر کے راستے تجارت کی غرض سے دوسرے ملکوں کو جاتے تھے۔ رسم یہ تھی کہ جو نوجوان تجارت کے لئے جانے والا ہوتا اس کی شادی روانگی سے ایک ہفتہ پہلے کر دی جاتی تھی۔ اس وقت اس کا جانا سب سے زیادہ شاق اس کی نئی بیوی پر گذرتا تھا۔ شاہ نے اس نئی بیوی کی زبان سے اس کی دلی کیفیتوں کا جو اظہار کیا ہے اس کے مختلف مرقع سُر سامندری میں ہیں کچھ تصویریں دیکھئے:۔

"سہیلی نے اس سے پوچھا" تم آج سمندر پر نہیں آئیں؟ اس نے جواب دیا" اے سکھی! اس پردیسی جہاز نے جو زخم میرے دل پر لگائے تھے وہ اُبھر آئے تھے ـــــ کیونکہ صبح کو ایک بادبان نظر آیا تھا۔"

سہیلی نے اس سے کہا" تم نے اس سے یہ کیوں نہیں کہا کہ اگر تمہاری محبت اس کشتی کے سفر کے ساتھ تھی تو پھر مجھ سے یہ ناتا کیوں جوڑا ـــــ اور اگر اس سے یہ نہ کہہ سکی تو خود اپنے آپ سے کہہ لیتی کہ اس کشتی میں جانے والوں سے محبت نہیں کی جاتی۔"

"اگر تم مجھ سے بھلائے نہیں جا سکتے تو اللہ کرے کہ میں بھی تمہیں یاد رہوں، کیونکہ نگینہ تو انگوٹھی کے بغیر بالکل بیکار ہے۔"

"آج پھر ایک جہاز جا رہا ہے۔ میرا جانے والا اس قسم میں ہزار روؤں پھر بھی وہ نہ رُکے گا۔ اے میری ماں جس کی محبت سمندر کی سیر سے ہے اُسے کہاں تک روک سکوں گی، جب میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں کہ لنگر بھی اُٹھا لیا گیا ہے۔"

اسی طرح کا ایک دوسرا باب "سُر کا پاتی" ہے۔ سُر کا پاتی کے سارے دوہے اس خاص رواج کا پس منظر پیش کرتے ہیں کہ ان دنوں لڑکیوں کے لئے چرخا چلانا اور سوت کاتنا ایک ہنر کی بات سمجھی جاتی تھی یہاں تک کہ لڑکیوں میں سوت کاتنے کے مقابلے بھی ہوتے تھے۔ اس سُر میں شروع سے آخر تک شاہ کے صوفیانہ تخیّل کا بہت گہرا پرتو ہے۔ انھوں نے چرخے اور سوت سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کو ایک کنایہ کی صورت دے کر بظاہر ایک سیدھے سادے انداز میں تصوّف کا کوئی نہ کوئی نکتہ بیان کیا ہے ـــــ خصوصاً عمل اور حُسنِ عمل کے بارے میں صوفیا کا جو نقطۂ نظر ہے، اس کی وضاحت اس سُر کے اکثر دوہوں میں ہوتی ہے:۔

"تمہیں کاتنے سے ذرا بھی دلچسپی نہیں، تمہیں تو بس سونا چاہیئے اور اپنی ہڈیوں کے لئے آرام ـــــ لیکن عید آ جائے گی، لوگ نئے کپڑوں سے محروم رہیں گے۔ خود تمہارے پاس بھی پہننے کو اچھے کپڑے نہیں ہوں گے، جب تمہاری سہیلیاں تمہیں باہر لے جانے کو آئیں گی۔"

"اگر انھوں نے اپنے دلوں میں دھوکا رکھ کر باریک سے باریک سوت بھی کاتا تو سوداگروں نے ان کا رتّی بھر سوت بھی نہیں لیا۔

"اور انھوں نے دل میں محبوب کی محبت کو جگہ دی اور موٹا سوت کا تا تو
سوداگر نے ان کا سوت تولے بغیر ہی قبول کرلیا۔"
"جن کے دلوں میں غرور تھا جب انھوں نے سوت کاتا تو ان کے
پریتم نے ان کے مہین سوت کو بھی پسند کرلیا۔"

اس پورے سُر کا یہی انداز ہے۔ زندگی کی سادگی ہے، احساس کا خلوص ہے اور شاعرانہ بیان کی تازگی۔ اور ان سب چیزوں پر چھایا ہوا صوفیانہ تخیل شاہ کے کلام کی یہی خصوصیتیں ہیں جنھوں نے انھیں سندھ کے ہر طبقہ کا محبوب بنایا ہے۔ اس کا پس منظر وہ زندگی ہے جسے انھوں نے بہت قریب سے دیکھا ہے، وہ احساس ہے جس کی دھڑکن انھوں نے دوسروں سے زیادہ خود سنی ہے۔ زندگی کی ان تفصیلوں پر اُن کی گہری نظر ہے لیکن وہ اپنے شاعرانہ حسنِ انتخاب کی مدد سے اس پوری فضا میں سے صرف ایسی چیزیں چنتے ہیں جو اِن کے مخصوص طرزِ تخیل اور اخلاقی نصب العین کی وضاحت میں ممد ثابت ہوتی ہیں۔ اور ان دو چیزوں کے درمیان اتنا گہرا امتزاج ہے کہ ایک چیز دوسری کے اثر اور مقصد کو زائل اور فنا نہیں کرتی۔ زندگی کی ایک خاص فضا نظر کے سامنے آجاتی ہے اور ذہن اس اخلاقی نکتہ کی تہ تک پہنچ جاتا ہے جو اس فضا میں رہ کر شاعر نے دوسروں تک پہنچانا چاہا ہے ——— اسی لئے ایک جگہ میں نے کہا تھا کہ شاہ صوفی بھی ہیں اور شاعر بھی اور یہ دونوں خصوصیتیں ان کی شخصیت کا جزو لاینفک ہیں اور اس لئے ان کے کلام کا کوئی حصہ بھی ایسا نہیں جس میں ان کی اس دوہری شخصیت کا پرتو نہ ہو۔ چنانچہ ان کے کلام کا وہ جزو بھی جس میں سندھ کی مروجہ لوک کہانیاں بیان کی گئی ہیں، شروع سے آخر تک تصوف اور شاعری کا ایک بے حد متوازن اور شیریں امتزاج ہے۔

رسالہ میں اس طرح کی پانچ کہانیاں ہیں سسی پنوں، سوہنی مہار، مومل رانو، لیلیٰ چنیسر اور ماروی عمر۔ لیکن ایک مزے کی بات یہ ہے کہ شاہ نے یہ کہانیاں پوری کی پوری بیان کرنے کے بجائے ان کے وہ ٹکڑے سامنے رکھے ہیں جہاں کہانی اپنے نقطۂ عروج پر پہنچتی ہے۔ کہانی کا یہ نقطۂ عروج عشق کی آزمائش کا سخت ترین لمحہ ہوتا ہے۔ چنانچہ شاہ کو اس نفسیاتی لمحہ میں جو شاعرانہ اور صوفیانہ امکانات نظر آئے ان سے انھوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ اور کہانی کے اس نقطہ پر پہنچ کر عاشق کی ذہنی کیفیت کی ترجمانی کرنے کے علاوہ اسے اس آفاقی عشق کی راہ دکھائی ہے جس پر چل کر ارضی محبت بھی سماوی مراتب حاصل کرلیتی ہے۔ ان کہانیوں میں سوہنی مہار ایسی ہے جو ان کے صوفیانہ مطمح نظر کی سب سے زیادہ صحیح ترجمانی کرتی ہے۔ اس نظم کے کچھ ٹکڑے پڑھ کر اس کا اندازہ کیجئے:—

"دریا میں طوفان اٹھ رہے ہیں۔ بھیانک گھڑیال ہزاروں بھیانک گھڑیال منہ پھاڑے کھڑے ہیں۔ اے ساحر، میرا نازک جسم بغیر تیرے سہارے کے اس خطرے کا مقابلہ نہیں کرسکتا ——— آ، ندی میں آجا، اے وہ جو میرا آقا اور مجھ پر مہربانیاں کرنے والا ہے۔"

"جب کچا گھڑا ٹوٹ گیا، اور زندگی کا سہارا باقی نہ رہا تو سوہنی کے کانوں میں اس محبوب چرواہے کی آواز گونجی ——— "اے سوہنی سلامتی کے طریقوں کو بھول جا، محبت تیری نگہبان ہے، وہ تجھے ان اونچی اور بپھری ہوئی موجوں کے پار لے جائے گی۔ محبت جن کی رہبر ہے وہ تیزی سے گہرے پانی میں سے گزر جاتے ہیں۔ اس گہرائی میں محبت کا سہارا پکڑ۔ چرواہا ان کی خبرگیری کرتا ہے جو اسے تلاش کرتے ہیں۔"

"میں محبت کے خیال کو روکنے کے لئے لاکھ جتن کرتی ہوں لیکن وہ نہیں رُکتا۔ اس لئے میں اب اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر پانی میں کود جاؤں گی جن کے خیال چرواہے کے ساتھ ہیں انھیں ایسا کرنے کا حق ہے۔"

سوہنی —"لوگ دریا کے دوسری طرف کھڑے ہیں اور مجھے بلا رہے ہیں کہ سوہنی آ، لیکن دو خطرے ایسے ہیں جو میرے دل کو روکتے ہیں۔ تیز بہتا ہوا گہرا دریا اور یہ کچا گھڑا۔ لیکن جن کے ساتھ سچائی ہے، میں جانتی ہوں کہ وہ کبھی نہیں ڈوبتے۔"

سید—"تو پھر اللہ کی مدد سے بھروسے کو اپنی کشتی بنا۔ جو عورتیں ساحر کے کہے پر چلتی ہیں وہ کبھی خطرہ میں نہیں ——— دیکھو سمجھ دار آدمی جب ڈوبنے لگتا ہے تو جھاڑیوں کو پکڑ لیتا ہے۔ لیکن ذرا دیکھو کہ کبھی تو یہی جھاڑیاں سہارا لینے والے کو کنارے تک پہنچا دیتی ہیں اور کبھی وہ ٹوٹ جاتی ہے اور پکڑنے والا دریا میں ڈوب جاتا ہے۔"

سوہنی مہار میں اور اسی طرح دوسری کہانیوں میں جا بجا شاہ نے عشق کو بزرگی و برتری کے یہ آداب سکھائے ہیں۔ عشق میں سوائے ایک سہارے کے اور سب

(باقی صفحہ ۳۹ پر)

ایم - اے - حسین

پاکستان کے بجٹ پر ایک سرسری نظر

۲۸ فروری ۱۹۴۸ء کا دن مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ اس دن پاکستان کے پہلے وزیر مالیات کو اسمبلی کے سامنے پاکستان کا پہلا بجٹ پیش کرنا تھا۔ لوگ امید و بیم کے ملے جلے جذبات کے ساتھ یہ تقریر سننے کے لئے اکٹھے ہوئے تھے۔ مہینوں پہلے سے وزیر مالیات نے آنے والی مشکلوں سے آگاہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ مخالف پریس پاکستان کی اقتصادی بدحالی کا ڈھنڈورا پیٹ رہا تھا اور خود پاکستان میں بھی یہ افواہ پھیلی ہوئی تھی کہ پاکستان کے پہلے بجٹ میں ۳۰ کروڑ کے قریب خسارہ ہوگا۔ تقریر کا وقت آیا۔ اور وزیر مالیات نے کسی قدر دھیمے انداز میں اپنی تقریر شروع کی۔ آن کے لہجہ میں سنجیدگی اور احتیاط تھی۔ وہ ایک ایک کر کے ان دقتوں کا ذکر کر رہے تھے جو پاکستان قائم ہوتے ہی اس کے راستے میں حائل ہوئی تھیں۔ ہجرت کا زبردست مسئلہ۔ بینکوں اور بیمہ کمپنیوں کا انتشار، رسل و رسائل اور حمل و نقل کے وسائل کی بدنظمی و بے ترتیبی، زائد عملے کا بار، صنعتی وسائل کا فقدان، ایک ایک کر کے ساری چیزوں کا ذکر ہوا۔ اور ہم نے اس وقت یہ محسوس کیا کہ وزیر مالیات خسارہ کے بجٹ اور زبردست محصولوں کے لئے زمین تیار کر رہے ہیں۔

تقریر ہو رہی تھی اور اسمبلی کے ارکان اور دوسرے سامعین پر ایک اضطراب اور کشاکش کی کیفیت طاری تھی۔ لیکن جب وزیر مالیات نے یہ اعلان کیا کہ بجٹ میں ۵ لاکھ روپے کی بچت ہوگی تو ساری فضا ڈرامائی انداز سے بدل گئی۔ اسمبلی ہال تالیوں کی آواز سے گونج اٹھا۔ بجٹ میں جو محصول تجویز کئے گئے تھے گو وہ بعض صورتوں میں خاصے زیادہ تھے لیکن مجموعی حیثیت سے لوگوں کے اندازے سے بہت کم تھے۔ ہر ایک نے اطمینان کا سانس لیا اور وہ وزیر مالیات جائز طور پر اس تہنیت کے مستحق تھے جو ہر طرف سے ان کی خدمت میں پیش کی گئی۔

بجٹ پیش ہوتے ہیں تو اقتصادیات کے ماہران پر طرح طرح کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ اب بھی کریں گے۔ لیکن ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ جن لاکھوں عوام پر اس بجٹ کا براہ راست اثر پڑتا ہے ان کی رائے اس بجٹ کے متعلق کیا ہے۔

گھر پہنچ کر جب میں نے ذرا اطمینان سے بجٹ کی تقریر پڑھی تو میرا ذہن سب سے پہلے قبل جنگ کے ہندوستانی بجٹ کی طرف منتقل ہوا۔ یہ بجٹ عموماً کم و بیش ۵۰ کروڑ کا ہوتا تھا۔ پاکستان کا یہ بجٹ ۹۰ کروڑ کا ہے۔ پچھلے دنوں قیمتوں میں جو اضافہ ہوا ہے اسے بھی نظر میں رکھا جائے۔ یہ فرق حیرت انگیز ہے۔ پاکستان رقبہ اور آبادی میں تقسیم سے پہلے کے ہندوستان کا چوتھائی بھی نہیں۔ اور اس لئے اس بجٹ کی یہ وسعت معنی خیز ضرور ہے۔ پھر اگر ہم پاکستان کے بجٹ کا مقابلہ ہندوستان کے ۲۵۰ کروڑ کے بجٹ سے کریں تب بھی یہ بجٹ کسی طرح ہلکا نہیں پڑتا۔

یہ رقم پاکستان کے بجٹ کی رقم کے ایک تہائی سے کم ہے اور پاکستان اور ہندوستان کے موجودہ وسائل میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

دوسری چیز اس سلسلہ میں ذہن میں آتی ہے یہ ہے کہ دونوں مملکتوں کے بجٹوں نے بازار پر دو مختلف قسم کے اثرات ڈالے ہیں۔ پاکستان میں بجٹ نے عام طور پر اطمینان کی فضا پیدا کی ہے اور بانداز مجموعی حیثیت سے اس کا اثر اچھا پڑا ہے۔ لیکن کچھ نامعلوم اسباب کی بنا پر ہندوستان میں ایسا نہیں ہوا۔ یہ ایسا راز ہے جس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ ممکن ہے آئندہ کے حالات اس نمایاں فرق کی وجہ ظاہر کر سکیں۔

۴۹-۱۹۴۸ء کے بجٹ کی آمدنی اور خرچ کا خلاصہ یہ ہے:

آمدنی: ———————

آمدنی کی مد	کروڑوں میں
محصول کی خاص مدوں سے	۳۱ ر ۲۰
ریل، ڈاک اور تار سے	۳۶ ر ۸۹
دوسری مدوں سے	۱۱ ر ۴۸
نئے محصولوں سے	۱۰ ر ۱۶
کل آمدنی	۸۹ ر ۶۳

خرچ کی مد	کروڑوں میں
دفاع	۳۷ ر ۱۱
ریل، ڈاک، تار	۳۷ ر ۱۵
دوسرے اخراجات	۱۵ ر ۴۲
کل خرچ	۸۹ ر ۶۸
بچت	۵ لاکھ

اخراجات کا تجزیہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ دفاع پر کل خرچ کا ۴۱ فیصدی خرچ کیا جائے گا۔ یہ رقم بہت بڑی ہے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں ہندوستان کا دفاعی خرچ کل خرچ کا ۴۹ فی صدی ہے۔ وزیر مالیات کی تقریر میں اس بات پر افسوس کی ایک جھلک موجود ہے کہ تعمیری کاموں کے بجائے دفاع پر اتنی بڑی رقم خرچ کی جا رہی ہے۔ اس سلسلہ میں خود ان کے الفاظ یہ ہیں "مجھے اس بات کا احساس ہے کہ ہم نے دفاع کے لئے رقم الگ کی ہے وہ عام حالات میں ہماری جیسی نئی مملکت کے لئے بہت زیادہ ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ہے کہ جن خطرات نے ہمیں گھیر رکھا ہے ان کا تقاضا یہ ہے کہ ہمارے پاس ایک قومی دفاعی فوج ہو۔ اور ہمیں بہت سی وہ رقم جو بہتر حالات میں ملک کی سماجی، معاشی اور صنعتی ترقی پر خرچ کی جاتی، مجبوراً فوج پر خرچ کرنی پڑ رہی ہے۔"

ریل، ڈاک اور تار کے محکموں پر ۲۷ لاکھ کا خسارہ آیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تجارت اور معاشی زندگی کے انتشار کی وجہ سے ڈاک اور تار کی آمدنی بہت کم ہو گئی لیکن یہ صورت حال یقیناً عارضی ہے۔ ہم ریل کے کرایہ میں ۲۲ فی صدی کا اضافہ کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ تیسرے اور درمیانہ درجے کے مسافروں کے لئے ڈاک گاڑی کا کرایہ ۵ پائی اور ساڑھے سات پائی فی میل کر دیا جائے گا۔ پوسٹ کارڈ کی قیمت دو پیسے سے تین پیسے کر دی گئی ہے۔ ڈاک کے پیکٹ اور ہوائی ڈاک کا محصول بھی کسی قدر بڑھا دیا گیا ہے۔

سول محکموں پر ۵۱ کروڑ ۴۰ لاکھ کا خرچ آئے گا۔ اس رقم میں خرچ کی بعض مدیں خاص طور پر ذہن کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ مغربی پنجاب، سرحد اور سندھ کو پناہ گزینوں کے سلسلہ میں جو ڈیڑھ کروڑ کی رقم دی گئی ہے اس کے علاوہ ۳ کروڑ روپیہ کی رقم پناہ گزینوں کے ایک کارپوریشن کے قیام کے لئے مخصوص کی گئی ہے۔ لیکن پناہ گزینوں کو بسانے کا مسئلہ بڑا زبردست مسئلہ ہے اور وزیر مالیات نے اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے بڑی مقدار میں قرض لینے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ ۵۰ لاکھ ہوائی محکمہ پر خرچ کئے جائیں گے اور ۴۱ لاکھ محکمہ نشریات پر۔ ۵ لاکھ شڈیول ذاتوں کے وظیفوں کے لئے اور ۵ لاکھ قبائلی علاقوں میں گھریلو دستکاریوں کی ترقی کے لئے دئے گئے ہیں۔ تصور پاکستان کے بانی شاعر اعظم علامہ اقبال کی یاد کو تازہ رکھنے کے خیال سے ایک لاکھ کی رقم اقبال اکاڈمی کے قیام کے لئے منظور کی گئی ہے۔

ٹیکسوں کے سلسلہ میں وزیر مالیات نے براہ راست اور بالواسطہ محصولوں کے درمیان کا راستہ اختیار کیا ہے۔ براہ راست محصول اب بھی خاصے زیادہ ہیں اور اس لئے آسانی سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ سر دست ان میں کسی قسم کے اضافہ کا خیال دانش مندی کے خلاف ہے۔ اسی لئے انکم ٹیکس اور سوپر ٹیکس کی شرحوں میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی لیکن نیا کاروبار کرنے والوں کو ایک بے حد قیمتی رعایت دی گئی ہے ـــــ یعنی ایسے لوگوں کو پانچ سال تک نفع کے پانچ فی صدی حصہ پر ٹیکس نہیں دینا پڑے گا۔ اس کے علاوہ مشینوں اور عمارتوں کی ٹوٹ پھوٹ کی مد میں پندرہ فی صدی کی مزید رعایت بھی دی گئی ہے۔ اس رعایت سے پاکستان میں صنعت کو آگے بڑھنے کا بہت موقع ملے گا اور چونکہ صنعت کی زیادہ سے زیادہ ترقی اس وقت پاکستان کی بڑی ضرورت ہے اس لئے وزیر مالیات کا یہ اقدام بے حد دانش مندانہ ہے۔ ہندوستان میں پاکستان کے بجٹ پر جو تبصرے ہوئے ہیں ان میں بھی پاکستانی بجٹ کے اس پہلو کو سراہا گیا ہے اور بعض مبصروں نے تو یہ تک کہا ہے کہ کاش مسٹر چیٹی کے

بجٹ میں بھی اسی طرح کی کوئی چیز ہوتی۔

اب چونکہ براہ راست ٹیکسوں میں اضافہ کی کوئی گنجائش نہیں تھی اس لئے وزیر مالیات کو مجبوراً بالواسطہ ٹیکسوں کی طرف توجہ کرنی پڑی۔ ایسے ٹیکسوں میں سب سے اہم بجری کا ٹیکس ہے۔ اب تک اسطرح کے ٹیکس عموماً صوبہ کی حکومتیں وصول کرتی تھیں لیکن اب ٹیکس مرکزی حکومت کے زیر اہتمام وصول کیا جائے گا اور آمدنی کا ایک حصہ صوبوں کو دے دیا جائے گا۔ اس ٹیکس کی مجموعی آمدنی ۳ کروڑ ۵۰ لاکھ ہوگی۔

اس ٹیکس اور اس کے علاوہ شکر، تمباکو، چھالیہ اور مٹی کے تیل کے ٹیکس سے عام لوگوں پر خاصا اثر پڑے گا۔ لیکن اس ٹیکس کے جواز میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ بکری کے ٹیکس اور آرائش کی چیزوں کے ٹیکس سے امیروں کے طبقہ پر جو بوجھ پڑا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ ہر وزیر مالیات کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ براہ راست اور بالواسطہ محصولوں کے درمیان ایک توازن پیدا ہو جائے تاکہ ریاست کی آمدنی میں امیر غریب سب اپنی اپنی حیثیت کے مطابق برابر کے شریک ہوں۔ اس نقطۂ نظر سے اگر پاکستان کے بجٹ پر کسی قدر سخت تنقیدی نظر بھی ڈالی جائے تو ان کا یہ دعویٰ صحیح معلوم ہوگا کہ انھوں نے محصولوں کے بوجھ کو ہر شخص میں برابر تقسیم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے بعد بیرونی ممالک کے خریداروں کی جیب سے بھی بجٹ کی آمدنی میں اضافہ کیا گیا ہے۔ مثلاً سوت، سن، کھالوں اور بنولوں پر ٹیکس بڑھایا گیا ہے۔ اور اس سلسلہ میں وزیر مالیات نے بیرونی ممالک کی بڑھتی ہوئی ضرورت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔

لیکن ابھی ایک سوال اور باقی ہے ——— کیا پاکستان کے بجٹ کی نظر مستقبل کی طرف ہے؟ بجٹ کی تقریر میں دو ایسی باتیں نظر آتی ہیں جن میں پاکستان کی آئندہ پالیسی کا اعلان کہا جاسکتا ہے۔ ان میں سے ایک ملک کو صنعتی بنانے کے متعلق ہے۔ صنعت اور زراعت کے درمیان ایک معاشی توازن پیدا کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے اور بڑی وضاحت کے ساتھ یہ بات کہی گئی ہے کہ صنعتی پروگرام پر جلدی سے جلدی عمل شروع کیا جائے گا۔ اس لئے کہ لوگوں کا معیار زندگی بلند کرنا اشد ضروری ہے۔ دوسری بات نجی صنعتوں اور ان صنعتوں کے سلسلہ میں حکومت کے رویہ کے متعلق ہے۔ اس اہم مسئلہ پر غلام محمد صاحب نے جو کچھ کہا ہے وہ یہ ہے "صنعتوں کے سلسلہ میں حکومت کا ارادہ ایک درمیانی راستہ پر چلنے کا ہے۔ اس طرح جو تھوڑی سی صنعتیں حکومت کی سلامتی اور قیام کے لئے ضروری سمجھی جائیں گی انھیں مرکزی حیثیت دی جائے گی اور باقی صنعتوں کا میدان ذاتی اور شخصی سرگرمیوں کے لئے کھلا رہے گا۔ کچھ صنعتیں ایسی بھی ہوں گی جنھیں حکومت اور شخصی ادارے مل کر چلائیں گے۔" بیرونی سرمایہ کے متعلق وزیر مالیات کے الفاظ یہ ہیں "ذاتی اور شخصی سرگرمیوں کے میدان میں بیرونی سرمایہ کے استعمال کی کچھ صورتوں میں پابندیاں ہوں گی تاکہ سرمایہ اور انتظام دونوں میں پاکستان کے باشندوں کا حصہ رہے۔"

آزاد اور پابند صنعت اور معاشیات کے اس پیچیدہ مسئلہ کو جس سلجھے ہوئے منظم اور مرتب انداز سے دیکھا گیا ہے اسے سب معتدل پسند اور آزاد خیال لوگ پسند کریں گے۔

قیام پاکستان کی تاریخ ۱۵ اگست کے بعد پاکستان کو سختیوں اور آزمائشوں کے جس طویل دور سے گزرنا پڑا ہے اس کے بعد ۲۸ فروری کا دن شاید خوشی کا پہلا دن تھا۔ مسرت کے اس لمحہ کے لئے ہم پاکستان کے وزیر مالیات اور ان کے شرکائے کار کے ممنون ہیں اور پاکستان کے شہریوں کو مبارکباد دیتے ہیں کہ انھوں نے سختیوں کے ایک ایسے دور کا مقابلہ جو نئی مملکتوں کی تاریخ میں شاید اس سے پہلے کبھی نہیں آیا تھا، ہمت اور جوانمردی سے کیا۔

شاہ عبداللطیف کی شاعری ——— بقیہ صفحہ

سہارے بیکار ہیں لیکن یہ تعاب سکھاتے وقت ان کا لہجہ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ پڑھنے والا اپنی روزانہ کی زندگی کی فضا اور اس کے بے تکلف ماحول سے دوری محسوس کرے۔ تصوف اور شاعری دونوں کا پس منظر خالص ارضی اور چھوٹی سے چھوٹی تفصیل میں بھی مقامی ہے یہاں تاثر تخیل کی بلند پروازیوں کا سہارا ڈھونڈنے کے بجائے، جذبات کی صداقت اور زندگی کی سادگی پر تکیہ کرتی ہے، اور یہی چیز ہے جس نے ہر دل میں اس کے لئے گھر بنایا ہے۔

یہ ہے شاہ عبداللطیف کے کلام کا ایک سرسری سا تعارف۔ افسوس ہے کہ اس تعارف میں شاہ کے حسن بیان اور ان کو شاعرانہ فن کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

حامد حسن قادری

جوہر شناسی

"تم اپنی تائی سکینہ کے جنازے سے آرہے ہو؟" چچا گلنواز خاں نے بھتیجے سے پوچھا۔ "اس ہنگامے میں کوئی خاص قابلِ ذکر بات تو پیش نہیں آئی؟"

"میں ابھی کھانے کے وقت آپ سے سب حالات بیان کروں گا۔" دل سفیر خاں نے کہا۔

"تم ایسی حرکت نہیں کر سکتے۔" چچا صاحب نے فوراً فرمایا۔ "اس قسم کی گفتگو تمہاری تائی اماں کی یاد کے ساتھ کوئی حرمت کا مفہوم نہیں رکھتی ہے، نہ کھانے کی تعظیم سے اس کو کچھ مناسبت ہے۔ کھانے میں پہلے بریانی اور کباب ہوں گے، پھر پراٹھے اور مرغ مسلّم۔ اس کے بعد شاہی میٹھے ٹکڑے۔ اور آخر میں غالباً آئس کریم۔ میرا خیال تھا کہ آئس کریم کھانے کے ساتھ موزوں نہ رہے گی۔ مگر خانساماں نے اپنی کاریگری کی تعریف کی تو میں نے سوچا آج دوسری میٹھی چیز بجائے پڈنگ کے آئس کریم ہی سہی۔ تو اب دیکھو کہ ان کھانوں میں کوئی چیز نہیں جو تائی سکینہ یا ان کی میّت و جنازہ کے موضوع سے ادنیٰ موزونیت بھی رکھتی ہو۔ سکینہ بڑی دلچسپ خاتون تھیں۔ اور اپنی ضرورت کے لائق ذہین بھی۔ مگر خدا جانے کیا بات ہے کہ مجھے ہمیشہ سکینہ میں اور مدراس کی کڑھی میں مشابہت محسوس ہوا کرتی تھی۔"

"تائی اماں کہا کرتی تھیں کہ آپ لایعنی باتیں بہت کرتے ہیں۔" دل سفیر خاں نے کہا۔ اور لہجے سے معلوم ہوتا تھا کہ اس فیصلے پر خود اس کی مہرِ تصدیق بھی ثبت ہے۔

"مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ سکینہ خانم بہت نزع ہوئی تھیں، جب میں نے ان کی کسی بات کے جواب میں کہہ دیا تھا کہ زندگی کے لئے پاکیزہ قورمہ پاکیزہ ضمیر سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ مرحومہ کو توازن و تناسب کا بہت کم احساس تھا۔ اچھا، یہ تو کہو انہوں نے تمہیں بھی اپنا وارث قرار دیا ہے؟"

"جی ہاں، اور اپنے اوقاف کا متولی بھی۔" دل خیر خاں نے جواب میں کہا۔

"میں خاص طور پر اسی سلسلے میں آپ سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔"

"کاروباری معاملات کبھی بھی میرا پسندیدہ موضوع نہیں رہے۔" گلنواز خاں نے فرمایا۔ "اور ایسی حالت میں بالیقین نہیں۔ جب ہم کھانے کے لئے ہاتھ دھو کر تیار بیٹھے ہیں۔"

"اصل میں کاروباری بات نہیں ہے۔" دل خیر خاں نے کہنا شروع کیا جب دونوں اُٹھ کر دسترخوان پر بیٹھنے لگے۔ "بلکہ کچھ غور طلب اور سنجیدہ معاملہ ہے۔ نہایت اہم اور سنجیدہ۔"

"یہ بات ہے تو اس وقت اس گفتگو کا کوئی امکان ہی نہیں۔" گلنواز خاں نے بڑی سنجیدگی سے ارشاد کیا۔ "بریانی و کباب کے وقت کوئی شخص سنجیدہ امور پر غور نہیں کر سکتا۔ خاص کر ایسی اعلیٰ درجے کی بریانی جیسی ابھی تمہارے سامنے آئی ہے۔ گفتگو کیا معنی خیالات کو بھی دماغ سے محو کر کے اپنی لذت میں گم کر دیتی ہے۔ اس کے بعد پراٹھے اور مُرغ مسلّم ہے، میں تو بھُنا ہوا مرغ تنہا کھانا پسند کرتا ہوں۔ تم کو پراٹھے کے ساتھ مرغوب ہے، اس لئے تمہارے خیال سے پراٹھے بھی ہیں۔ مرغ مسلّم کے دوران میں میرا اور سودا کی شاعری پر تو گفتگو ہو سکتی ہے۔ لیکن اقبال کا جاوید نامہ اور بالِ جبریل اس موقعہ کا موضوع نہیں ہو سکتے۔ آئس کریم سے پہلے کسی ایسے موضوع پر گفتگو کرنے سے جس میں کاروباری شائبہ بھی ہو، مجھے نہایت سختی کے ساتھ انکار ہے۔"

تمام کھانے کے دوران میں دل خیر خاں بالکل خاموش رہا۔ جیسے کسی کا ذہن و دماغ کسی خاص معاملے پر چھا ہوا ہو۔ جب آئس کریم کے گلاس سامنے آئے تو اس نے چچا گلنواز خاں کو یکایک کہنا شروع کر دیا۔

"میں نے ابھی آپ سے کہا تھا کہ تائی اماں نے مجھے اپنے ترکہ کا مختار و متولی مقرر کیا ہے۔ میں نے ان کے کاغذات کی جانچ پڑتال کی۔"

"یہ خود بڑا سخت کام ہوگا۔" چچا بولے۔ "میرا خیال ہے خاندانی خطوط کے

یم کے یم ہوں گے

"بڑا انبار، اور اکثر بالکل غیر دلچسپ، مگر ایک بنڈل تھا جس سے تمام محنت وصول ہوگئی، یہ تائی اماں کے مرحوم بھائی کے خطوط تھے۔"

"حادثے والے مولانا؟"

"جی ہاں، لبقول آپ کے حادثے والے۔ وہ حادثہ جسکی تحقیق ہی نہ ہوسکی۔"

"غالباً جو سب سے ظاہر اور سادہ تاویل تھی وہی درست تھی" گل نواز خاں نے کہا۔

"زینے سے گرے اور سر پھٹ گیا۔ اسی سے موت واقع ہوئی۔"

دل شیر خاں نے سرہلایا۔ "تمام ڈاکٹر متفق تھے کہ کسی شخص نے پیچھے سے آکر سر پر ضرب لگائی ہے، زینے سے ٹکرانے سے جو چوٹ لگے گی وہ سر کے اس زاویہ پر نہیں ہوسکتی جہاں تھی۔ ڈاکٹروں نے ایک مصنوعی قدِ آدم مجسمہ کو ہر ممکن پہلو سے گرا کر دیکھ لیا تھا۔"

"لیکن قتل کا سبب؟" گل نواز نے بڑے زور کے ساتھ کہا "کسی شخص کو مولانا کی جان لینے سے دلچسپی نہیں ہوسکتی اور ایسے لوگ جو بیت الشریعت کے مولویوں اور مفتیوں کو محض قتل کے شوق میں مار ڈالیں، یقیناً معدودے چند ہوں گے۔ بلاشبہ ایسے افراد بھی ہوتے ہیں جنکا دماغی توازن درست نہ ہو اور ایسے کام کرتے ہوں۔ لیکن وہ لوگ، اپنے کارنامہ کو چھپایا نہیں کرتے۔ بلکہ ازراہِ فخر اعلان کیا کرتے ہیں۔ اس موقع اور اسوقت پر نہ سہی۔ بعد کو سہی۔"

"مولانا کے خانساماں پر شبہ تھا" دل شیر خاں نے کہا۔

"مجھے علم ہے کہ اس پر شبہ تھا" گل نواز خاں بولے۔ "صرف اس وجہ سے کہ حادثے کے موقع پر اتفاق سے صرف وہی موجود تھا لیکن محبوب خاں خانساماں کو الزام لگانے سے زیادہ احمقانہ خیال اور کیا ہوسکتا ہے۔ اپنے آقا کو قتل کرکے اس کو کیا فائدہ حاصل ہوسکتا تھا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اسکا بڑا نقصان تھا۔ مولانا اس کو ایسی ہی اچھی تنخواہ دیتے تھے جیسی میں دے سکا۔ جب میں نے اس کو اپنے ہاں رکھا میں نے اس کے اصل جوہر لیاقت کو دیکھ کر تنخواہ میں اضافہ کردیا ہے، لیکن اس زمانے میں تو وہ فوراً دوسری ملازمت مل جانے ہی کو غنیمت سمجھتا تھا۔ لوگ اس کو رکھنے سے گھبراتے تھے اور یہاں اسکا کوئی حامی و دوست نہ تھا نہیں دل شیر، اگر دنیا میں کوئی شخص مولانا کی عمرِ طویل اور معدہ صحیح کا متمنی، دعاگو اور خیرخواہ ہوسکتا تھا تو وہ محبوب خاں تھا۔"

"لوگ ہمیشہ اپنے اقدام جرائم کے نتائج کا وزن نہیں کیا کرتے۔" دل شیر نے دلیل پیش کی۔ "ورنہ قتل کے واقعات شاذونادر ہوا کرتے۔ محبوب خاں مغلوب الغضب آدمی ہے۔"

"وہ شمالی ہند کا باشندہ ہے" گلنواز خاں نے اعتراف کے طور پر کہا۔ "جغرافیہ کی رو سے صحیح یہ ہے کہ محبوب خاں سرحدی قبائل آزاد کا ایک فرد ہے۔ یہ بات میرے ذہن میں آگئی تھی جب اس نے ایک دن کسی غلطی پر مالی کے لڑکے کو مارتے مارتے ادھ مرا کردیا تھا۔ ہم کو ایک شخص کی اصل نسل وطن، ماحول کا لحاظ رکھنا چاہیئے۔ میرا تو یہ مقولہ ہے کہ تم مجھے اپنی لمبائی بتادو میں اندازہ کروں گا کہ تمہارے لئے چوڑائی کسقدر تجویز کرنی چاہیئے۔"

"دیکھیئے۔ خود آپ کے فرمانے کے مطابق، اس نے مالی کے لڑکے کو گویا مار ہی ڈالا تھا" دل شیر خاں نے چچا کو قائل کیا۔

"عزیز از جان، ایک مالی کے لڑکے کو تقریباً مار ڈالنے اور ایک معذور بڈھے کو بالکل قتل کردینے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یقیناً تمہارے دل میں کسی وقت مالی کے لڑکے کو مار ڈالنے کی خواہش پیدا ہوتی ہوگی لیکن تم نے اپنی طبیعت کو روکا ہوگا اور میں تمہارے ضبط و تحمل کی قدر کرتا ہوں۔ مگر میں نہیں مان سکتا کہ تم نے کبھی کسی پچھتر سال کے بزرگ آدمی کو قتل کرنا چاہا ہو۔ ان باتوں کے علاوہ، جہاں تک ہم کو علم ہے مولانا اور خانساماں میں کبھی کوئی جھگڑا کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوا۔ حادثہ کی تحقیق کے دوران ہی میں یہ بات ثابت ہوگئی تھی۔"

دل شیر خاں نے زور سے گہرا سانس لیا، جیسے گفتگو میں اسی اہم پہلو اور ضروری موڑ کا منتظر تھا۔

"جی، میں خاص اسی پہلو پر آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتا تھا" اس نے جلدی سے کہا اور آئس کریم کی پیالی خالی کرکے واسکٹ کی جیب سے پاکٹ بک نکالی، اور پاکٹ بک کے اندر سے ایک لفافہ نکالا۔ لفافے میں سے ایک خط برآمد ہوا جو بہت باریک خوبصورت حرفوں میں لکھا ہوا تھا۔

"یہ مولانا مرحوم کا ایک خط ہے جو انھوں نے اپنی ہمشیرہ مرحومہ تائی اماں کو لکھا تھا" اس نے بیان کرنا شروع کیا "یہ خط مولانا کے انتقال سے چند روز قبل کا لکھا ہوا ہے جس زمانے میں یہ لکھا ہے، تائی اماں کا حافظہ ضعف پیری کے سبب سے بہت کمزور ہوگیا تھا میں کہہ سکتا ہوں کہ

اس خط کو پڑھنے کے بعد وہ اسکا مضمون بالکل بھول گئیں، ورنہ جو حادثہ اس خط کے بعد پیش آیا اس کے سلسلے میں ہم اس خط کا تذکرہ اب سے پہلے ہی سنتے۔ اگر اس حادثہ کی تحقیقات کے وقت یہ خط پیش ہوتا تو معاملات کی رفتار میں فرق ہو جاتا جیسا آپ نے ابھی فرمایا تھا محض اس وجہ سے کہ کوئی سبب اقدام اور باعث اشتعال ثابت نہ ہو سکا، عجب خاں شبہ قتل سے بچ گیا۔"

"اچھا تم خط پڑھو" گلنواز خاں سے ضبط نہ ہو سکا۔

"بہت طویل خط ہے"۔ دل شیر خاں نے کہا، "جیسا وہ اپنے آخری زمانے میں لکھنے لگے تھے میں صرف وہ حصہ سناتا ہوں جسکو براہِ راست اس پُراسرار واقعہ سے تعلق ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:-

"مجھے اندیشہ ہے کہ عجب خاں کو علیحدہ کرنا پڑے گا۔ وہ کھانا پکانے میں نہایت کامل الفن ہے مگر مزاج میں شیطان اور جن سے بڑھکر ہے۔ اور اب مجھے اپنی جان کا خوف رہنے لگا ہے۔ چند روز ہوئے ہم دونوں میں سخت جھگڑا ہو گیا تھا۔ مہمانوں کی دعوت کے لئے میں نے چند کھانے تجویز کئے۔ اس نے اختلاف کیا اور اپنی بات پر اصرار کیا۔ مجھے اسکی ضد اور ہٹ دھرمی پر غصہ آیا اور میں نے پیالی بھری چائے اسکے منہ پر پھینک ماری۔ اور اسکی بدتمیزی و گستاخی پر لعن طعن کی۔ حقیقت میں چائے اسکے منہ پر تھوڑی ہی پڑی ہوگی لیکن میں نے کسی انسان کا چہرہ ایسا پُرغضب نہیں دیکھا جیسا اسوقت اسکا تھا۔ اس نے مجھے قتل کرنے کی دھمکی دی، لیکن میں نے اسے بکواس سمجھا۔ میرا خیال تھا کہ بات آئی گئی ہوئی۔ مگر اس کے بعد سے میں نے اکثر اس کو بکتے جھکتے سُنا ہے۔ اور مجھے خطرہ ہے کہ آجکل وہ میرے پیچھے پڑا ہوا ہے میں جہاں جاتا ہوں وہ بھی پیچھے سے پہونچ جاتا ہے خصوصاً جب میں شام کو شاہی باغ میں ٹہلنے جاتا ہوں۔"

"آپ کو یاد ہوگا کہ شاہی باغ ہی کی سیڑھیوں پر مولانا کی لاش ملی تھی۔" دل شیر خاں نے خط کے بیچ میں کہا، اور پھر خط پڑھنے لگا:-

"ممکن ہے میرا خوف و اندیشہ صرف وہم و خیال ہی ہو، لیکن مجھے اسی وقت اطمینان ہوگا جب عجب خاں میرے پاس سے چلا جائے گا۔"

خط کو ختم کر کے دل شیر خاں ایک لحظہ خاموش رہا، لیکن چچا سُن کر کچھ نہ بولے تو اس نے کہا۔

"اگر عجب خاں سزا سے صرف اسلئے بچ گیا کہ قتل کا کوئی سبب نہ تھا تو یہ خط واقعات کو نئی روشنی میں لاتا ہے۔"

"تم نے یہ خط کسی اور شخص کو بھی دکھایا ہے؟" گلنواز خاں نے خط کو لینے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں" دل شیر خاں نے چچا کو خط دے کر کہا "میں نے سوچا کہ سب سے پہلے آپ سے تذکرہ کر دوں ــــ ارے! خدا کے لئے! یہ آپ کیا کرتے ہیں؟"

دل شیر خاں چیختا ہوا کھڑا ہو گیا۔ گلنواز خاں نے خط کو بیچ آتشدان کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کے اندر پھینک دیا تھا۔ خوبصورت تحریر آن واحد میں جلکر خاکستر ہو گئی۔

"آپ نے خط کو جلا کیوں دیا؟" دل شیر خاں نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا۔ "یہ خط عجب خاں کے اثباتِ جرم کے لئے واحد شہادت تھی!"

"یہی وجہ ہے کہ میں نے اس کو ضائع کر دیا۔" گلنواز خاں نے کہا۔

"لیکن آپ اس کی کیوں حمایت کرتے ہیں؟" دل شیر خاں نے چلّا کر کہا۔

"وہ شخص ایک ادنےٰ درجے کا قاتل ہے۔"

"ادنےٰ درجے کا قاتل، ممکن ہے، مگر نہایت اعلیٰ درجے کا باورچی۔"

(اخذ و ترجمہ)

شگون کا دن

بقیہ صفحہ ۲۸

اور بھی تیز کر دیا تھا۔ اس کے چاروں بچوں کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ شاید کھانوں کی خوشبو اور خوشی کے ہنگاموں میں گم ہو گئے تھے۔ اس کی بھوک بڑھتی جا رہی تھی لیکن شوہر کی موت کے بعد اتنی جلدی کھانا مانگتی تو دنیا کیا کہتی۔ بڑھتی ہوئی بھوک نے اس کے ذہن میں ایک کھلبلی سی مچا دی۔ یکے بعد دیگرے اس کے سامنے اس آگ کو بجھانے کی مختلف ترکیبیں آنے لگیں۔ لیکن ہر ترکیب کے راستے میں کوئی نہ کوئی رکاوٹ تھی ــــ یکایک اسے اس ڈبے کا خیال آیا جس میں موتی اپنے دوا کے لڈو رکھا کرتا تھا۔ وہ تیزی سے کوٹھری کے اندر گھسی اور اسکا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اس نے احتیاط سے ڈبہ کو اتارا مگر وہ فوراً ہی سمجھ گئی کہ ڈبہ خالی ہے۔ پنوا نے پہلے ہی اسے صاف کر دیا تھا۔ اس نے چپ چاپ ڈبہ وہیں رکھ دیا اور باہر آ کر اپنی کوٹھری کے دروازے پر بیٹھ گئی اس نے آنچل سے اپنا منہ چھپا لیا اور بین کر کر کے رونے لگی لیکن آج اسکی آواز محل تک نہ پہونچ سکی و

ڈاکٹر حبیب الرحمٰن

جمہوریہ ترکی

(سیاسی اور معاشی خاکہ)

عثمانی اقتدار کے خاتمہ کے بعد کمال اتاترک کی مسلسل سرگرمیوں اور ان تھک کاوشوں کی بدولت ترک اپنے وطن کے مالک بن گئے۔ کمال کو اپنے وطن اور اپنی قوم سے بے حد محبت تھی۔ اس کی شخصیت اتنی کشش انگیز اور پُر اثر تھی کہ ترک من حیث کل اس کی ہدایت اور قیادت پر چلنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے۔ اسی قیادت میں ترکی نے حیرت انگیز رفتار سے سیاسی سماجی اور معاشی نظام کی تنظیم کی۔ سب سے پہلے کمال نے ایک مستحکم پارٹی کی بنا ڈالی۔ اس پارٹی کے اثر اور تعلیم نے عوام کو نیا وہ سمجھ دار، اعتدال پسند اور آزاد نظر بنا دیا۔ ترکی میں یہی تنہا سیاسی پارٹی ہے جو گرینڈ نیشنل اسمبلی کے انتخاب کے لئے اپنے امیدوار نامزد کرتی ہے۔ گرینڈ نیشنل اسمبلی نمائندہ اشخاص کا ایک ایوانی پارلیمان ہے جس کے تمام رکن بالواسطہ عام رائے دہندگی سے منتخب کئے جاتے ہیں۔ یہ نمائندہ مجلس اپنے ارکان میں سے چار سال کے لئے کسی صدر کا انتخاب کر لیتی ہے جو صدر جمہوریہ کہلاتا ہے۔ کمال اتاترک ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۸ء تک یعنی اپنی موت تک اس کے صدر رہے۔

صدر جمہوریہ پارلیمان کے ممبروں میں سے ایک وزیر اعظم منتخب کر لیتا ہے۔ وزیر اعظم کو اپنی کابینہ کے انتخاب کا حق حاصل ہوتا ہے جس کی تعداد بالعموم سترہ سے تجاوز نہیں کرتی۔ حکومت کی تمام ذمہ داری کابینہ کے سپرد کر دی جاتی ہے لیکن یہ مرکزی حکومت، لوکل سلف گورنمنٹ کے توسط سے عوام سے منسلک رہتی ہے۔ ان مقاصد کے لئے ترکی کو ۶۳ ولائتوں یعنی صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ہر صوبہ میں کئی کئی اضلاع ہوتے ہیں۔ ولایت کی حکومت ایک گورنر کے ذمہ ہوتی ہے جسے مرکزی حکومت مقرر کرتی ہے۔ گورنر کی مدد کے لئے چند عہدہ داران اور ایک کاؤنسل ہوتی ہے۔ مختصر طور پر یہ ہے جمہوریہ ترکی کا سیاسی خاکہ جس میں ترکی کی حیثیت ایسی قوم کی ہے جس کا ہر شہری لازمی طور پر آزاد اور امن پسند ہے۔

سیاسی اقتدار کو مستحکم کر دینے کے بعد کمال نے دوسرا قدم اس اہم کام کی طرف اٹھایا کہ ترکی قوم کی تعمیر اس طرح کرے کہ اس کا ہر مرد اور ہر عورت تعصب سے پاک ہو اور زندگی کے متعلق نقطۂ نظر وسیع ہو۔ اس کام کے لئے سلطنت کی مکمل دنیوی تنظیم ناگزیر سمجھی گئی۔ کمال اور اس کے پیروؤں کے نزدیک اسلام کوئی خارجی یا داخلی مزاحمت نہیں تھا لیکن اسلام سے جس طور پر فائدہ اٹھایا جا رہا تھا وہ یقیناً قابل اعتراض تھا۔ انھوں نے سوچا اس طریق کار نے ترکوں کو بیگانہ نسل اور کلچر والی قوموں سے مربوط کر رکھا ہے اسلام کو ریاستی مذہب (STATE RELIGION) قرار دے دیا گیا تو ہو سکتا ہے کہ فرسودہ ترکی شہنشاہیت کے پرانے خیالات تازہ ہو جائیں اور ترکی کو ناخوشگوار اور پیچیدہ خارجی تعلقات میں الجھا دیں۔ اس خیال کے تحت ۱۹۲۴ء میں خلیفہ کے عہدہ کو ختم کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی مذہبی اور شرعی امور کی وزارتوں کو مع ان کے خصوصی اختیارات مثلاً قضی، اوقاف، مدارس وغیرہ منسوخ کر دیا گیا تعلیم کی دنیاوی بنیادیں استوار کی گئیں لیکن مذہبی تعلیم کو ممنوع قرار نہیں دیا گیا۔ ۱۹۳۴ء میں مسجدوں کے علاوہ دوسری جگہ مذہبی ملبوسات کا استعمال روک دیا گیا۔ ترکی ٹوپی کی جگہ انگریزی ہیٹ نے لے لی۔ ترک شریعت اور جدید آئینی اختیارات نے ترکی کے قانونی نظام کی بھی کایا پلٹ دی۔ انقرہ میں قانون کا ایک نیا شعبہ قائم کیا گیا اور جدید طرز پر قانون کی تعلیم دی جانے لگی۔ پرانے مذہبی، سول اور ملٹری خطابات ترک کر دئے گئے اور ان کے بدلے نئے ترکی

الفاظ استعمال میں آگئے۔

سنہ ۱۹۲۶ء کے قانون کے بموجب کثرتِ ازدواج کو ناجائز قرار دیا گیا اور عورتوں کے حقوق کو مردوں کے حقوق کے مساوی کر دیا گیا۔ گرینڈ نیشنل اسمبلی کا جو انتخاب سنہ ۱۹۳۵ء میں ہوا اس میں سترہ عورتیں منتخب ہوئیں۔ آج یہ عورتیں معلم، سرکاری ملازم، آرٹسٹ، قانون داں، جج، اور ڈاکٹر کے فرائض انجام دیتی ہیں۔ ایک دوسرے قانون کی رو سے، جو سنہ ۱۹۲۸ء میں منظور ہوا، ترکی کے تمام باشندوں کے لئے جن کی عمر ۴۰ سال سے کم تھی، لاطینی حروف تہجی کا سیکھنا ضروری قرار پایا۔ ان حروف نے عربی حروف تہجی کی جگہ لے لی۔ قرآن پاک کا ترک زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ اذان اور نمازوں میں قرأت بھی ترکی زبان میں ہونے لگی تاکہ عوام احکام خداوندی کی نوعیت اور اہمیت کو بآسانی سمجھ سکیں۔

ترکوں کی معاشی زندگی کی بنیاد زراعت پر ہے جو آبادی کے تین چوتھائی حصہ کی کفیل ہے۔ زراعت کے لائق ملک میں جتنی زمین ہے اس کے نصف سے بھی کم حصہ میں کاشت کی جاتی ہے۔ رقبہ کے اعتبار سے ملک کا مجموعی رقبہ برطانیہ کا تین گنا ہے لیکن برطانیہ میں ۴۶۸ آدمی فی مربع میل آباد ہیں اور ترکی میں صرف ۴۵ فی مربع میل۔ تازہ ترین مردم شماری جو سنہ ۱۹۳۵ء میں ہوئی اس کی رو سے ترکی کی مجموعی آبادی سولہ[1] میلین سے کچھ زیادہ ہے۔ اسی فی صدی آبادی دیہاتوں میں ہے۔ ہندوستان کے برعکس ترکی میں زراعتی مٹی کم پائی جاتی ہے اور آب و ہوا کا اختلاف بھی بہت ہے۔ اونچے اونچے پہاڑوں کی دیواریں مرطوب ہواؤں کو وسطی سطح مرتفع تک پہنچنے نہیں دیتیں۔ موسم سرما کے طویل مہینوں میں ٹھنڈی ہواؤں اور برف کے سبب یہ علاقہ کاشت کے لائق نہیں رہتا اور گرمی کے موسم میں جس کی مدت بہت مختصر ہوتی ہے، سورج کی چلچلاتی دھوپ اور زمین کی خشکی سے یہ خطہ ریگستان معلوم ہونے لگتا ہے دریاؤں میں ایک بھی جہاز رانی کے لائق نہیں۔ میدانی علاقے ہی زرخیز زرعی خطے ہیں۔ عوام کی قابل رحم حالت کو سدھارنے کے لئے حکومت نے بے دریغ کوششیں کی ہیں۔ زمین کی تقسیم، کاشت کے اسلوب، زرعی پیداوار کی فروخت، قرض اور امدادی رقوم کی منظوری، اور ٹیکس لگانے کے طریقوں میں خاطر خواہ ترمیم کر دی گئی۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں ایک قانون کے ذریعہ عشر یعنی پیداوار کا دسواں حصہ جو بطور محصول لے لیا جاتا تھا، معاف کر دیا گیا اور کاشتکاروں کے ذمہ حکومت کا جو قرض تھا اس کے معتد بہ حصہ کو یا قلم زد کر دیا گیا یا بہت کم۔

زرعی پیداوار میں گندم، کپاس، تمباکو اور پھل (میوے)، کو اہم جگہ حاصل ہے۔ حکومت کو اس بات پر فخر ہے کہ اس نے عمدہ قسم کے گیہوں کی پیداوار کو ترقی دے کر ترکی کو درآمد کرنے والے ملک کے بجائے برآمد کرنے والا ملک بنا دیا ہے۔ ایک بورڈ کے ذریعہ جسے (WHEAT BOARD) کہتے ہیں گیہوں اور دوسرے اناج کے نرخ پر کنٹرول رکھا جاتا ہے اور دوسرے ملکوں میں ان کی فروخت کا مناسب سامان کیا جاتا ہے۔ دیہاتوں میں انجمن امداد باہمی کے قیام نے زراعت کو فروغ دینے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ اجتماعی اصول پر زراعت کو ترقی دینے کے نئے نمونے ہیں چار زراعتی خطوں میں ملتے ہیں ہر خطہ پانچ ہزار گانوں پر مشتمل ہے۔ ان خطوں میں فصل کاٹنے اور غلہ نکالنے کی مشینوں کے علاوہ پانچ ٹریکٹر (TRACTOR) بھی استعمال ہوتے ہیں۔ زراعت کو جدید معیار پر لانے اور موسم خزاں میں بیج ڈالنے کی جو کوششیں ہو رہی ہیں ان سے امید ہے کہ موجودہ پیداوار تین گنا بڑھ جائے گی نئی فصلیں مثلاً (SUGAR-BEAT) چقندر کو رواج دیا جا رہا ہے جو کاشتکار اور حکومت دونوں کی آمدنی کا نفع خیز ذریعہ ہیں۔ اس وقت ترکی میں شکر سازی کے چار بڑے بڑے کارخانے ہیں جن سے تقریباً ۵۰ ہزار ٹن شکر نکالی جاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ترکی درآمد شکر کا محتاج ہے۔

دساور بھیجی جانے والی اشیاء میں تمباکو کو سب سے پہلی جگہ دی جاتی ہے۔ تمباکو کی پیداوار، فروخت، اور برآمد گورنمنٹ کنٹرول کے ماتحت غیر محصلہ (FREE) ہے لیکن سگرٹ بنانا ریاستی اجارہ (STATE MONOPOLY) ہے۔ کپاس کی پیداوار اب دساور نہیں بھیجی جاتی بلکہ خانگی پارچہ بافی کو ترقی دینے کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ خشک کئے ہوئے میوے مثلاً انجیر، منقی اور

[1] ایک کروڑ ساٹھ لاکھ۔

زیتون دسادر جانے والی چیزوں میں نہایت اہم ہیں۔

۱۹۳۹ء میں انقرہ میں ایک زراعاتی کالج کھولا گیا جس میں بے شمار طلباء نے داخلہ لیا۔ ان میں تمیس طالبات بھی تھیں جو زیادہ تر دیہاتوں کی رہنے والیاں تھیں۔

حکومت اپنے ملک کی تیز رداور جدید صنعتی ترقی کے لئے بھی بہت کوشاں ہے۔ صنعت کو فروغ دینے کا سب سے پہلا پروگرام ۱۹۳۳ء میں وضع کیا گیا۔ ریلوں کی نئی تعمیر کوئلہ کی کانوں کی کھدائی، اور پارچہ بافی کے کارخانے قائم کئے جانے پر عملی کارروائی شروع کر دی گئی۔ اس کے بعد کلیدی صنعتوں کیلئے حکومت کی طرف سے ایک پنج سالہ منصوبہ جاری کیا گیا جن بنیادی صنعتوں میں حکومت غایت درجہ دلچسپی لے رہی تھی انہیں فوراً قائم کیا گیا۔ ان میں کی چند صنعتیں یہ ہیں:۔

(۱) لوہا، کوک (COKE) اور کوئلہ کی دوسری ضمنی صنعتیں

(۲) تانبا اور گندھک کی پیداوار۔

(۳) ادویاتی[1] صنعتیں مثلاً سوڈا، کاسٹک، سلفرک ایسڈ اور امونیا وغیرہ۔

پنج سالہ منصوبہ کے اخراجات کا تخمینہ اکتالیس ملین ترکی پاؤنڈ سے بھی زیادہ لگایا گیا۔ اس رقم کے حاصل کرنے کے لئے بیرونی سرمایہ کو جسے اس وقت تک خطرناک سمجھا جاتا تھا، دعوت دی گئی۔ سب سے پہلے ترکی حکومت نے دس میلین پاؤنڈ حاصل کرنے کے لئے سوویٹ روس سے سلسلہ جنبانی شروع کی۔ بقیہ رقم سمر بینک (SUMMER-BANK) کے ذمہ کر دی گئی جس کو حکومت نے منصوبہ کی تعمیل کے لئے قائم کیا تھا۔ بینک نے اس شدید ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ٹیکس کے ذریعہ اسّی میلین پاؤنڈ کی رقم باسانی جمع کرنے کی اسکیم منظور کی جس پر عمل کرتے ہی حیرت انگیز ترقیاں شروع ہو گئیں قیصری میں پارچہ بافی کا ایک بہت بڑا کارخانہ قائم ہو گیا جو مشرق وسطیٰ کے تمام کارخانوں سے بڑا ہے۔ زنگولدک (ZONGULDAK) کے مقام پر جو کوئلہ کنی کا مرکز بھی ہے، جدید طرز کی ایک بندرگاہ تعمیر کی گئی جس کو ریل کے ذریعہ لوہے اور فولاد کے کارخانوں سے منسلک کر دیا گیا۔ ان کارخانوں میں سب سے بڑا مرکز کاربک (KARBUK) میں واقع ہے۔ ترابزند (TREBIZOND) میں جو بحیرۂ اسود کے ساحل پر واقع ہے ایک دوسری بندرگاہ بنائی گئی تاکہ باسفورس اور یورپ سے الحاق پیدا ہو جائے۔ ملک کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے سیواس (SIVAS) اور دورک (DIVRIK) میں تمام لوہے کی کانوں سے خاطر خواہ کام لیا جا رہا ہے آس کی شہر (ESKISHEHR) ارگین (ERGAIN) اور انطالیہ (ANTALYA) میں جدید اور ترقی یافتہ پیمانہ پر کرومیم (CHROMIUM) کی کانوں کو ترقی دی جا رہی ہے ملک کی معدنی نفع خیزیوں کی نگرانی اِٹی بینک (ETI BANK) کے ذریعہ ہوتی ہے۔ یہ بینک معدنی تعلیم اور تحقیق کے ادارہ کا مہتمم بھی ہے۔

۱۹۳۸ء کے اختتام تک ترکی نے ریل کے نئے راستوں کو دو ہزار میل کی وسعت تک ترقی دے دی۔ یہ نئے راستے پرانے راستوں کے علاوہ تھے جن کی میلی مسافت (MILE-AGE) ڈھائی ہزار میل کے قریب ہے۔ بیرونی ملکیت والی تمام ریلیں خرید لی گئیں، ہزاروں پل اور سڑکوں کی نئی تعمیر یا مرمت کی گئی۔

صنعتی قوت (INDUSTRIAL POWER) کی ترقی ایک دوسرا اہم پہلو ہے زونگل دک (ZONGULDAK) کے صنعتی خطہ میں ایک بہت بڑا مرکز تعمیر کیا گیا۔ اس کے علاوہ آزمیر استنبول اور آدانہ میں چھوٹے چھوٹے مرکز قائم کئے گئے حال ہی میں تیل کے چشموں کی دریافت بھی ہوئی ہے اور تیل کے کنوؤں کی تعمیر آہستہ آہستہ عمل میں لائی جا رہی ہے۔

---

[1] کیمیاوی۔

عبدالرحمٰن پژواک

بست کا شہزادہ

کبھی خوش حالی کسی ملک کو بہار کی مانند شاد و خرم بنا دیتی ہے اور اس قدر عام ہو جاتی ہے کہ کوئی اداس دل ڈھونڈے نہیں ملتا ۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی دل بشاش نہیں نظر آتا۔ اگر اتفاق سے کوئی ایسا ہو بھی تو یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ ایک پھول ہے جسے باغبان توڑنا بھول گیا ہو۔

قدیم زمانے میں شہر بست اسی طرح کی خوش حالی، شادی و خرمی سے معمور تھا۔ باغات سے آراستہ اور قصروں سے پیراستہ، باہر سے کشمیر اور اندر سے فرخار۔ اس کے نیک نہاد بادشاہ سے چھوٹے بڑے سب خوش تھے۔ رعایا کو اس کی خوشنودی منظور تھی اور اسے رعایا کے دلوں پر حکمرانی کی خواہش۔ اس نے دلوں کو کینہ سے پاک کر دیا تھا۔ اس کی مہر و شفقت نے ملک کو مسرور کر رکھا تھا۔ مالی اس کا نام لے کر پھول بوتے تھے اور دہقان اس کی پرستش کرتے تھے۔ ملک اور رعایا کی خوش حالی اور خرمی اسی کے طفیل تھی۔ اس نے ایک ایسی جنت بسا دی تھی اور ایسا محل کھڑا کر دیا تھا جس میں ہر طرف آرام تھا، ہر طرف راحت تھی ۔ کوئی دشمن نہ تھا جو اس کو دیکھ کر حسد کرتا، نہ کوئی دل تھا جو اس کو کسی دوسرے کے لئے چاہتا۔ اس کی آستان پر کبھی کوئی گدا نہیں دیکھا گیا۔ اس نے کبھی رعایا کی دولت نہیں چھینی۔ امیروں سے مانگتا نہ تھا اور غریبوں کو بہت دیتا تھا۔ جہاں خدا نے اسے اقبال بخشا تھا وہاں وہ بھی اپنی رعایا کی قسمت سنوارنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کے ملازم، وہ کہیں بھی رہتے ہوں، پہاڑوں یا بیابانوں میں، شہروں یا دیہاتوں میں ۔ سب اپنا اپنا حق پا رہے تھے۔

وہ اسی عدل و آئین کے ساتھ سلطنت کرتا رہا۔ یہاں تک کہ بہار زندگی گذر گئی اور بڑھاپے کا بادل اس کے سر پر چھا گیا۔ اس کے دانا دوستوں نے اس کے گرد جمع ہو کر عرض کیا: "اگر بادشاہ چل بسے تو" بلاد گرم سیر میں کوئی سایہ دار جگہ نہیں رہے گی جہاں آرام مل سکے ۔ اب کہ ملک کا حال حسب دلخواہ ہے رعایا کی دلی آرزو ہے کہ بادشاہ شادی کرلے تاکہ تخت و تاج کا وارث پیدا ہو۔ وہ اس کی اطاعت کریں اور اس کے زیر سایہ بھی امن و آرام کی زندگی بسر کر سکیں۔

بادشاہ نے شادی کر لی مگر کئی سال تک اولاد نہ ہوئی۔ یہ بات سب کے لئے مایوسی کی تھی۔ بادشاہ کا ایک خیر خواہ اور لائق وزیر تھا جس کا تدبر ہمیشہ بادشاہ کے کام آیا تھا۔ وہ بھی اولاد سے محروم تھا۔ یونہی زیست کے دن گزرتے رہے۔ ایک دن ایک آدمی جس کے بدن پر گدڑی اور سر پر نمد کی ٹوپی تھی بیابان سے نمودار ہوا اور اپنی لمبی عصا شاہی محل کے دروازے پر زور سے مارنے لگا۔ کنیزیں یہ دیکھنے کو دوڑیں کہ کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔ درویش نے قلندرانہ غرور کے ساتھ کہا: "قلندروں کا دل بادشاہوں کے قصر سے بھیک مانگنے سے بالا و برتر ہے۔ میں نے سنا ہے بادشاہ بہت منصف مزاج شخص ہے لیکن اس کا دل غمگین رہتا ہے۔ میں اس لئے آیا ہوں کہ اگر وہ اپنی دلی مراد مجھے بتائے تو وہ بر آئے گی۔"

کنیزوں کو اس کی باتوں پر تعجب ہوا۔ اندر جا کر ماجرا سنایا۔ ملکہ خوش ہوئی اور درویش سے کہا کہ مجھے اولاد نرینہ کی تمنا ہے۔ شاہی باغ میں ایک تناور درخت تھا۔ درویش نے اپنی عصا اس پر دے ماری تو دو سرخ سیب نیچے گرے۔ درویش نے ایک سیب تو ملکہ کو دیا اور دوسرا وزیر کی بیگم کے لئے بھیجا۔ محل کے لوگ چاہتے تھے درویش پر روپے اشرفیاں نچھاور کریں لیکن وہ لمبے قدم بھرتا ہوا دور نکل گیا اور کوئی اسے روک نہ سکا۔

بادشاہ اور وزیر نے اس درویش کی آمد کو فال نیک سمجھا۔ اس رات جشن منایا گیا۔ درویش کی آمد کا واقعہ ہر زبان پر تھا۔ اور سب دست بدعا تھے۔ آخر مرادیں بر آئیں۔ ملکہ کے ایک خوبصورت

لڑکا ہوا اور وزیر کی بیگم کے ایک خوبصورت لڑکی۔ بادشاہ نے محفل جشن برپائی۔ لوگوں نے خوشیاں منائیں۔ ایسا دکھائی دیتا تھا کہ دنیا میں سرور ہی سرور ہے۔ بادشاہ نے دانا درباریوں کو بلایا اور خواہش کی کہ نوزاد لڑکے اور لڑکی کے لئے نام تجویز کریں۔ شہزادے کا نام "پتی" رکھا گیا اور وزیر زادی کا "رابیا"۔ مرور زماں میں دو نو بچے جوان ہوئے۔ چمک دمک میں شہزادہ سورج تھا تو وزیر زادی چاند۔ بچپن میں جو محبت دونوں کے دلوں میں پیدا ہوگئی تھی اب عشق میں مبدل ہوگئی۔ اور یہ عشق اس قدر بڑھا کہ شہر لبت کے ہر کس و ناکس کو اس کا علم تھا۔

شباب اس سرکش گھوڑے کی مانند ہے جسے قوی سے قوی ہاتھ بھی رام نہیں کر سکتے۔ وقت اس پر تازیانے کا کام کرتا ہے اور وہ مستانہ وار کودتا پھاندتا رہتا ہے۔ "پتی" کے خون میں جوانی کا اس قدر زور تھا کہ جو اس کے سامنے آتا اس سے زور آزمائی کرتا اور جو طاقتور نظر آتا اسے پچھاڑ دیتا۔

جب تک "پتی" چھوٹا تھا لوگ اس کے ناز اٹھاتے رہے۔ اب جو جوان ہوگیا تھا اس کی حرکتیں گراں گزرنے لگیں۔ سمجھدار لوگ جو بڑی امیدیں باندھے بیٹھے تھے اب مشوش ہونے لگے۔ جب وہ محل سے نکلتا تھا تو لوگ اپنے گھروں میں جا گھستے تھے۔ اس کے ساتھ نڈر نوجوانوں کا ایک جتھا رہتا تھا۔ وہ شہر کے گلی کوچوں میں بھی ایسے ہی بے تحاشا طریقے سے مار دھاڑ کرتا تھا جیسے شکارگاہ میں۔

عادل بادشاہ کو کیا ہوگیا ہے کہ اس کا بیٹا لوگوں پر ستم ڈھاتا ہے مگر وہ اسے نہیں روکتا؟ کیا وہ بھی دوسرے بادشاہوں کی مانند اپنے بیٹے کی خوشی کو رعایا کی آسودگی پر ترجیح دیتا ہے؟ کیا زمانہ اسے اس کی قانون پسندی اور معدلت گستری کا یہ بدلہ دے رہا ہے کہ اخیر عمر میں رعایا پر ظلم و ستم ہوتا دیکھتا ہو مگر اس کی روک تھام نہ کر سکے؟

ایک دن ایک بڑھیا نے اپنی کٹیا میں کسی مظلوم کی شکایت سن کر کہا: "میں اس عادل بادشاہ کے زیر سایہ بوڑھی ہوگئی ہوں۔ میں اپنی جان اور بادشاہ کی زندگی کی قسم کھاتی ہوں کہ بادشاہ کو شہزادے کے ظلم و ستم کا علم نہیں ہے۔"

شکایت کرنے والے نے کہا: "علم کیسے نہیں؟ جب شہزادہ چھوٹا تھا تو اس نے بستی کی عورتوں کے مٹی کے گھڑے توڑ ڈالے۔ بادشاہ کو پتا چلا تو اس نے عورتوں کو چاندی کے گھڑے دے دئے اور شہزادے کو اس طرح سے نصیحت کی کہ وہ اور سرکش ہوگیا۔ اسے سزا کیوں نہیں دی؟" بڑھیا نے جواب دیا: "بچپن میں اس سے زیادہ مناسب نہیں تھا۔ بادشاہ نے مظلوموں کے ساتھ انصاف کیا البتہ اپنے لڑکے پر ظلم نہیں کیا۔" شکایت کنندہ نے کہا: "ظلم تو یہ ہے کہ بادشاہ کو اس کا علم نہیں ہے۔"

بڑھیا جو بادشاہ کو دل سے چاہتی تھی اٹھی اور قصر شاہی کی طرف گئی۔ اس وقت کوئی پاسبان موجود نہ تھا جو اسے روکتا۔ وہ سیدھی بادشاہ کے پاس گئی اور شہزادے کے سب کرتوت اسے سنا ڈالے۔

جب شہزادہ شکار سے لوٹا اور بادشاہ کے پاس گیا تو بادشاہ کو بہت برہم پایا۔ بادشاہ نے اسے ایسی ڈانٹ پلائی کہ شہزادہ تاب نہ لا سکا۔ اس نے باپ سے کہا: "میں آپ کے ملک سے جاتا ہوں۔" بادشاہ نے جواب دیا: "خدا کرے سب ظالم میرے ملک سے چلے جائیں۔"

پتی نے اپنے سب ساتھیوں کو اکٹھا کیا اور کہا کہ وہ سفر کے لئے تیار رہیں۔ قلعہ لبت کے دو دروازے تھے۔ ایک سے "پتی" نکلا اور دوسرے سے اس کی ماں کا شیون بلند ہوا۔

"گرم سیر" کے لوگ "رابیا" کو "بلبل زرد" کہتے تھے۔ اور یہ نام ان کو بہت پیارا تھا۔ جب "رابیا" نے ملکہ کی چیخیں سنیں تو وہ بیہوش ہوگئی۔ وہ دکھ جس سے مائیں چیخ اٹھتی ہیں عاشق معشوق کے لئے موت کا پیام ہوتا ہے۔ "رابیا" گئی اور بادشاہ کے قدم لئے اور التجا کی کہ "پتی" کو جانے سے روکے۔ بادشاہ نے قہر آلود خاموشی سے اپنا منہ پھیر لیا۔ "رابیا" زار زار روتی ہوئی اپنے باپ کے قدموں پر جا گری۔ باپ بھی رو دیا اور بادشاہ کے پاس جاکر شہزادے کی طرف سے معافی مانگی۔ بادشاہ نے کہا: "میں نے اپنے ایک بیٹے کو اپنے سے جدا کیا کہ رعایا جو میری اولاد ہے آرام سے زندگی بسر کرے۔ اگر تمہیں اپنی لڑکی کا ایسا ہی خیال ہے تو اسے کہہ دو جہاں چاہے چلی جائے۔ مجھے اپنے کہن سال وزیر سے یہ امید نہ تھی کہ ایک مغرور اور ظالم نوجوان کو میرے ملک میں رکھنا چاہے اور ملک کے بوڑھے اور جوانوں کے

حقوق کو دل سے بھلا دے۔" وزیر شرمندہ ہوا۔ بادشاہ نے اس کے سر پر
ہاتھ پھیرا اور اسے اس قدر نوازا کہ وہ بے حد خوش ہوا اور اپنی لڑکی کو یہ سمجھایا
کہ رعایا کے حق کا پاس اولاد کی محبت سے افضل تر ہے۔

"رابیا" باپ کی باتیں سن کر دیوانہ وار اٹھی اور اپنی سہیلیوں سے
کہا کہ سفر کے لئے تیار ہو جائیں۔ بادشاہ اور وزیر اسی سیب کے پیڑ کی
چھاؤں میں بیٹھے تھے کہ انھیں اطلاع ملی کہ رات کو "پتی" "لبت" سے چلا گیا۔
اور صبح سویرے "رابیا" بھی اس کے پیچھے ہولی۔

دونوں نے سیب کے پیڑ کو دیکھا۔ بادشاہ نے کہا: "اس درویش نے
اپنے دونو سیب واپس لے لئے" وزیر نے کہا: "ہاں لیکن تھے بہت میٹھے۔"

"پتی" "لبت" سے نکل کر ایک گاؤں پہنچا۔ دیکھا اس میں ایک بہت
دلکش باغ ہے۔ وہاں اترا اور اپنے ساتھیوں سے صلاح کرنے لگا کہ
کدھر چلیں۔ اس کے ساتھیوں میں "کرم" اور "پُردل" نامی دو بہادر پہلوان
بھی تھے اور وہ گفتگو میں بھی دوسروں سے پیش پیش تھے۔ انھوں نے کہا
کہ رات تو یہیں بسر کریں اور صبح یہاں سے چلدیں۔ چونکہ دونو ہندوستان
جانا چاہتے تھے انھوں نے شہزادے سے کہا کہ ہم ایک سبز ٹہنی زمین میں
گاڑ دیتے ہیں صبح جس طرف اس کا رخ ہوگا اسی طرف چل دیں گے۔
شہزادے نے رضامندی دے دی۔ آدھی رات کو "کرم" نے اس ٹہنی
کا رخ ہندوستان کی جانب کر دیا چنانچہ صبح اٹھتے ہی سب ہندوستان
کی طرف روانہ ہو گئے۔

عصر کے وقت ایک جگہ منزل کی۔ خیمے گاڑے اور گھوڑوں کو چرنے
چھوڑ دیا۔ اس ریگستان میں چالیس خیمے لگے ہوئے تھے اور ہر ایک میں
ایک پہلوان سویا ہوا تھا۔

دو گھڑی گئے ایک ساتھی نے جو پہرہ دے رہا تھا سب کو جگایا۔
دیکھا بہت سے سوار ان کی طرف گھوڑے دوڑاتے آتے ہیں۔ سب
لڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔ جب وہ سوار قریب آئے تو "پتی" کو معلوم
ہوا کہ "رابیا" اپنی سہیلیوں سمیت آئی ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے
مل کر بہت خوش ہوئے۔ آگ جلائی گئی اور بہت خوشیاں منائی گئیں۔
دوسرے دن پو نہیں پھٹی تھی کہ سب پھر ہندوستان کی طرف چلے۔

اگلے دن لبت کے کئی گھرانوں میں ماتم ہونے لگا۔ مائیں اپنی لڑکیوں کی
یاد میں روتی تھیں۔ یہ واقعہ مردوں کو سخت ناگوار گزرا۔ اکٹھا ہو کر بادشاہ کے
پاس گئے اور شکایت کی کہ "پتی" اور اس کے ساتھی لبت کی کنواری لڑکیوں
کو بھگا لے گئے اور لوگوں کی آبرو خاک میں مل گئی۔

بادشاہ یہ سن کر پریشان ہوا۔ اس نے وزیر کو بلایا۔ وزیر آیا تو
اس نے لوگوں سے کہا: "لوگو، میں بھی تمہاری طرح دکھی ہوں۔ "رابیا"
جسے تم "بلبل زرد" کہا کرتے تھے تمہاری لڑکیوں سے پہلے چلی گئی۔ لیکن
میں نے بادشاہ سے یہ نہیں کہا کہ آپ کا بیٹا میری بیٹی کو بھگا لے گیا ہے۔
"رابیا" دل رکھتی تھی اور وہ محبت میں دیوانہ ہو گیا تھا۔ اس نے اس دیوانے
کا کہا مانا۔ میں جانتا تھا کہ وہ جارہی ہے مگر میں اسے روک نہ سکا۔ جو دل کی
بات مانے وہ روکنے سے نہیں رکتا۔ "رابیا" تو میری اکلوتی بیٹی تھی اور
تمہارے بہت سے بیٹے بیٹیاں ہیں۔ یہ لڑکیاں آخر کو جوانوں کے ساتھ چلی
جائیں اور تم سے الگ ہو جائیں۔ کیا اس سے پہلے ایسا نہیں ہوا ہے
کہ اب تم انھیں یا دوسروں کو ملامت کرتے۔ لڑکی ایک خزانہ ہے جو
ہمیں دوسرے کو بخشنے کے لئے دیا گیا ہے۔ البتہ ہر بخشش اپنی جگہ
مناسب ہونی چاہئے بہترین جگہ وہ ہے جسے خود لڑکی چاہے۔ میری
سمجھ میں جو آیا میں نے کہہ دیا۔ باقی ہمارے عادل بادشاہ کے اختیار میں
ہے۔ وہ جو حکم فرمائیں ہم اسے بجا لائیں گے۔"

بادشاہ نے وزیر کو بہت سراہا۔ پھر خود فرمایا: "لوگو، میں تمہیں میں
بوڑھا ہوا ہوں۔ کیا تم میں سے جو سب سے بوڑھا ہو یہ کہہ سکتا ہے کہ
میں نے انصاف نہ کیا ہو اور ستم روا رکھا ہو۔ مجھے اولاد کی ہوس نہ تھی
اس لئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ عادل نہ ہو اور اس کے ظلم کو میرا ظلم
سمجھو۔ میں نے اگر اولاد کی آرزو کی تو محض تم سب کی خاطر۔ میرے لئے
یہی شرمندگی کافی ہے کہ ایسے بیٹے کا باپ نہ ہو سکا کہ لوگ میری تعریف
کریں۔ میں نے اسے ہر دوسرے ظالم کی طرح اپنے ملک سے نکال دیا۔
مگر مجھے اس کا کوئی غم نہیں۔ تمہاری لڑکیاں اپنی مرضی سے گئی ہیں لیکن
ان کی مرضی اور میرے بیٹے کی مرضی میں فرق ہے۔ وہ دوسروں پر ظلم کرنا
چاہتا تھا۔ لڑکیوں کا معاملہ دل کا معاملہ تھا نہ ملک کا۔ دل بھی اپنی مملکت
ہے جس کو بچانا چاہئے۔ میں نے بیٹے کو چھوڑا کہ ملک کو محفوظ رکھوں۔
تمہاری لڑکیوں نے اپنے ماں باپ کو اس لئے چھوڑا کہ وہ کشور دل کو

محفوظ رکھیں۔ جاؤ، دوسرے بادشاہ سے پوچھو۔ وہ بادشاہ عشق و شباب ہے۔ میں تم جیسے بڈھوں کے ساتھ اس بادشاہ سے نہیں لڑ سکتا جس کی طاقت اس کی جوانی ہے۔ مجھے ڈر یہ ہے کہ کہیں تمہارے ساتھ انصاف کرتے وقت دوسروں پر ظلم نہ کر ڈالوں۔ اس سے زیادہ اگر مجھ سے توقع رکھتے ہو تو یہ مجھ پر ظلم کرنے کے برابر ہوگا جس طرح بادشاہوں کو زیبا نہیں کہ اپنی رعایا پر ظلم کریں اسی طرح رعایا کو بھی زیبا نہیں کہ اپنے بادشاہ پر ظلم روا رکھیں۔ میری سمجھ میں جو آیا میں نے کہہ دیا تم جو چاہتے ہو کرو۔" لوگ خاموش لوٹ گئے۔

"پتی" اور اس کے ساتھی برابر چلتے رہے یہاں تک کہ وہ سرزمین ہند میں پہنچ گئے۔ کہاں ڈیرہ ڈالیں؟ یہ انھیں معلوم نہ تھا۔ آخر کار ایک گاؤں آیا "پتی" نے اپنے ساتھیوں سے کہا: "گھوڑوں کو کھیتوں میں چھوڑ دو" سب نے ایسا ہی کیا۔ کچھ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ گاؤں کے لوگ گھوڑوں کو ہانک کر "پتی" کے پاس لے آئے اور کہا: "یہ ہماری فصل چر رہے تھے۔ انھیں باندھ دیجئے۔" "پتی" نے ساتھیوں سے کہا: "اس گاؤں کے لوگوں میں بڑا اتفاق ہے۔ یہاں اجنبیوں کا گذارہ نہیں ہو سکتا ایسی جگہ چلا جائے جہاں لوگوں میں پھوٹ ہو۔"

اگلے دن دوسرے گاؤں میں گئے۔ اسے بھی ویسا ہی پایا۔ پھر وہ "گواریاں" نامی قصبے کے قریب اترے اور گھوڑوں کو کھیتوں میں چھوڑ دیا۔ وہاں ایک کسان گھوڑوں کو اپنے کھیتوں سے نکال کر دوسرے کھیتوں میں ہانک دیتا تھا۔ یہاں کے لوگوں کو آپس میں سخت بیر تھا۔ "پتی" نے "کرم" اور "شیر دل" سے کہا: "یہ جگہ ایسی ہے یہاں ہم رہ سکتے ہیں۔"

"گواریاں" میں ایک مضبوط قلعہ تھا۔ یہ طے پایا کہ اس قلعے میں ڈیرہ ڈالنا چاہئے۔ "گواریاں" کے باشندے یہ نہیں چاہتے تھے۔ لیکن چونکہ چالیس جنگ جو پہلوانوں سے ٹکر لینا کوئی کھیل نہیں تھا مجبور ہو گئے۔ رات ہوئی تو "پتی" نے ان سے قلعہ خالی کرنے کو کہا۔ وہ لوگ مجبوراً باہر تو نکل آئے لیکن انھوں نے یہ عذر پیش کیا کہ ہم باہر رہیں گے تو مخالف قبیلہ ہم پر حملہ کر دے گا اور سب کا صفایا کر دے گا۔ "پتی" نے اس قبیلہ کا پتہ معلوم کیا۔ وہ لوگ صلح پر آمادہ نہیں ہوئے۔ "پتی" نے ان پر دھاوا بول دیا اور بہت سوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔

ان قبیلوں کا ایک بادشاہ تھا۔ وہ لوگ اس کے پاس فریاد لے کر گئے۔ بادشاہ نے "پتی" کو ایک پیام بھیجا جس میں دریافت کیا تھا کہ "پتی" کون ہے، کیا چاہتا ہے۔ اور اس قلعہ پر کیوں قبضہ جمایا ہے۔ "پتی" نے ساتھیوں کو بلایا اور انھیں وہ پیام سنایا۔ اس کے بعد اس نے یہ جواب بھیجا: "میں بادشاہ لبت کا بیٹا ہوں۔ باپ مجھ سے سختی سے پیش آیا۔ میں نے وطن چھوڑ دیا۔ ہوا نے کشتی کا رخ ہندوستان کی طرف پھیر دیا۔ قسمت مجھے یہاں لے آئی۔ میں یہاں کے لوگوں کا مہمان ہو کر آیا لیکن انھوں نے مجھے دھتکار دیا۔ دروازہ جو دوستوں پر بند کیا جاتا ہے دشمنی سے کھول دیا جاتا ہے۔ میں چاہتا ہوں یہیں زندگی بسر کر دوں۔ اس قلعہ میں لبت کی لڑکیاں اور سیر مند کے لڑکے رہتے ہیں۔ ایک شہزادے کے لئے جسے باپ نے ملک سے نکال دیا ہو، دنیا تنگ ہے۔ اگر بادشاہ چاہتا ہے میں قلعہ چھوڑ دوں تو میں چھوڑ دونگا لیکن پہلے قلعے کے باہر بادشاہ سے لڑوں گا۔ میں تو چاہتا تھا کہ ان قبیلوں میں صلح صفائی ہو جائے لیکن وہ آمادہ نہ ہوئے۔ ان سے کہہ دیجئے کہ لڑیں اور اگر لڑیں تو ہتھیار نہ ڈالیں۔"

بادشاہ کو جب یہ پیام پہنچا تو اس نے سوچ کر یہ جواب دیا: "اس خیال سے کہ مہمان رنجیدہ نہ ہو ہم نے پچھلی باتوں کو معاف کیا اور قلعہ آپ کو دیا جب تک کوئی اور شکایت نہ آئے آپ وہیں رہیں۔ اور جب تک آپ خود شکایت کا موقع نہ دیں گے آپ کو اس قلعے سے نہیں نکالا جائے گا۔ شہزادے کو زیبا نہیں کہ جوانی میں بھی تشدد سے کام لے ہم مہمان سے لڑنا نہیں چاہتے۔ مگر مہمان کے لئے بھی مناسب نہیں کہ میزبان سے زیادتی کرے۔"

"پتی" کو یہ جواب ملا تو اس نے ساتھیوں کو بلایا اور مناسب جواب بھیجا۔ اس کے بعد ساتھیوں سے کہا: "ہماری خیر اسی میں ہے کہ بادشاہ اور یہاں کے لوگوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں۔ بادشاہ کے جواب سے مردانگی اور دانائی ٹپکتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے ہمارا یہاں رہنا چنداں گوارا تو نہیں ہے مگر جو بات اسے ناپسند ہے وہ اس کو بھی نبھا سکتا ہے۔ یہ دانا اور دلیر آدمیوں ہی کا کام ہے۔"

"کرم" کھڑا ہوا۔ اس کا چہرہ غصہ سے لاجورد کی مانند چمک

رہا تھا۔ اس نے طعن آمیز لہجہ میں کہا: "میں نہیں سمجھ سکتا کہ شہزادے کو کیا ہو گیا ہے اور جوانی میں اس کا خون کیوں سرد پڑ گیا ہے۔ بادشاہ کے جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیں ڈرانا چاہتا ہے۔ اگر ہم اس کی بات مان لیں گے تو ہم اس کے زیر احسان ہو جائیں گے۔ وہ ہماری بہادری آزمانا چاہتا ہے۔ ہمیں اس سے لڑ کر یہ دکھا دینا چاہئے کہ اس کا خیال غلط ہے۔ اگر اس کی ساری رعایا بھی ہماری شکایت کرے تو وہ ہمیں نہیں نکال سکتا۔"

شہزادے کو یہ تقریر ناگوار گذری۔ اس نے اپنی تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھا، یہ بتلانے کے لئے کہ اس کی شان میں کوئی گستاخی نہیں کی جا سکتی لیکن "پردل" نے اٹھ کر "کرم" کی تائید کی اور دوسرے بھی اس کے ہم نوا ہو گئے۔ شہزادے نے دیکھا کہ ان سب کی رائے ایک ہے تو نرمی اختیار کی اور کہا: "میں تمہاری دلیری اور شجاعت کی قدر کرتا ہوں لیکن تم میں مجھ سے زیادہ دلیر اور شجاع کوئی ہے؟"

سب نے چپ سادھی۔ شہزادے نے بلند آواز سے کہا: "آج پہلی دفعہ ہے کہ میرے ساتھی مجھے جواب نہیں دیتے اور میری آواز نہیں سنتے۔ میں نہیں جانتا کہ میرے گلے سے آواز نہیں نکلتی یا ان کے کان نہیں سنتے۔"

سب خاموش بیٹھے تھے۔ شہزادے نے للکار کر کہا: "ہم راہزن ہیں۔ لیکن جہاں کہیں رہیں ہمیں اپنے طریقے سے زندگی بسر کرنا چاہئے۔ کیا بھول گئے ہو کہ ہمارے پرانے رواج کے مطابق سوال تین مرتبہ کرنا چاہئے؟ میں اپنا سوال تیسری مرتبہ دہرا رہا ہوں۔"

سب چپ ہو رہے۔ "پردل" نے کھڑے ہو کر کہا: "میں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی طرف سے معافی چاہتا ہوں۔"

سب ادب سے اٹھے اور اپنے اپنے خیمے میں چلے گئے۔

کچھ عرصہ کے بعد ایک دن "کرم" نے قلعہ کی دیوار سے باہر کی طرف نظر دوڑائی۔ دیکھا ایک بڑا قافلہ گذر رہا ہے۔ وہ نیچے اترا، گھوڑے پر سوار ہوا اور اس سمت روانہ ہوا۔ جب وہ قافلے کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ اونٹ بہت آہستہ آہستہ چل رہے ہیں۔ پوچھا اونٹوں پہ کیا لدا ہے؟ قافلہ سالار نے کہا: "ہمارے اور تمہارے بادشاہ کا خزانہ ہے۔"

کرم نے کہا: "میں چاہتا ہوں یہ قافلہ میرے قلعہ میں آئے۔" قافلہ سالار جو ایک تگڑا پہلوان تھا "کرم" سے لڑنے لگا۔ "کرم" نے اسے پچھاڑ کر مار ڈالا اور قافلہ کو قلعہ میں لے آیا۔ اس دن شہزادہ لبت اور دوسرے ساتھی شکار کو گئے ہوئے تھے۔ "کرم" نے خزانہ تو کہیں چھپا دیا اور اونٹوں کو چھوڑ دیا۔

بادشاہ کو پتہ چلا تو بہت برہم ہوا حکم دیا فوج تیار ہو جائے۔ شہزادہ شکار سے اس قدر تھکا ماندہ آیا کہ اگر اسے سوتا رہنے دیتے تو طلوع آفتاب تک سوتا رہتا۔ لیکن تڑکے ہی "رابیا" نے فصیل سے دیکھا کہ ہر طرف سپاہیوں کے خیمے لگے ہوئے ہیں۔ "یتی" کو جگایا۔ "یتی" نے "پردل" کو حکم دیا کہ نعرہ مار کر پوچھے کہ ان کا کیا ارادہ ہے۔

باہر سے ایک پہلوان نے جواب دیا کہ شاہی فوج لڑائی کے لئے آئی ہے۔ وجہ دریافت کی تو اس نے بتلایا کہ آپ لوگوں نے شاہی خزانہ لوٹ لیا ہے اس لئے بادشاہ بہت برافروختہ ہو رہا ہے۔

شہزادے نے "کرم" کو بلایا۔ "کرم" نے واقعہ سنا دیا۔ شہزادہ کو سخت ملال ہوا۔ ساتھیوں نے کہا: "ہم لڑائی کو ترس رہے ہیں۔ آپ کیوں ملول ہوتے ہیں؟" شہزادے نے کہا: "لڑائی میں موت واقعہ ہوتی ہے اور موت سے سب ذمہ داریوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ لیکن عہد شکنی ایک ایسی موت ہے جس کے بعد بھی ذمہ داری ختم نہیں ہوتی۔ میں اس لئے ملول نہیں ہوں کہ ہمیں لڑنا پڑے گا۔ کاش "کرم" نے اس طرح لڑائی مول نہ لی ہوتی اور ہمیں لڑائی سے پہلے ہی مغلوب نہ کر دیا ہوتا۔"

شہزادے نے بادشاہ کو ایک خط بھیجا جس میں سارا واقعہ لکھ دیا۔ بادشاہ بہانہ ڈھونڈتا تھا ہی، وہ اس بات پر رضامند نہیں ہوا کہ خزانہ واپس لے لے اور خود لوٹ جائے۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ اگلے دن صبح کو فریقین میدان جنگ میں آ جائیں۔

اُن دنوں پہلوان ایک ایک کر کے لڑا کرتے تھے۔ تیس دن برابر نبرد آزمائی ہوتی رہی۔ شہزادے کے تیس پہلوان مارے گئے اور بادشاہ کے تین سو۔ جنگ دس دن تک اور ہوتی رہی۔ نو پہلوان شہزادے کے اور ساٹھ بادشاہ کے اور مارے گئے۔ گیارھویں دن شہزادہ خود لڑنے آیا۔ اور تیس دن تک لڑتا رہا۔ بہت سے پہلوانوں کو موت کے

لمحات اتار ا جب نیا مہینہ شروع ہوا اور شہزادہ اپنی کمر باندھ رہا تھا تو "رابیا" نے اس کو جانے سے روکا۔ شہزادے نے کہا: "میں نہیں سمجھتا تم مجھے کیوں روک رہی ہو؟"

"رابیا" نے کہا: "میں نے ایک بھیانک خواب دیکھا ہے میں نے دیکھا کہ ایک نورانی شکل کا بزرگ میری چادر لے کر گھوڑے کی پیٹھ پر بچھا دیتا ہے۔ میں گڑگڑاتی ہوں مگر وہ ایک نہیں سنتا مجھ سے کہتا ہے۔ میں بادشاہ بست سے اپنا سیب لینا چاہتا ہوں میں نہیں چاہتا تمہیں کوئی گزند پہنچے۔"

شہزادہ نے رابیا کا بوسہ لیا اور میدان جنگ کی طرف روانہ ہوا۔

اس روز بست کی لڑکیوں نے مقتول پہلوانوں کی لاشیں جا بجا پڑی پیدا کرکے ان پر رنگین شالیں (؟) اور خود فصیل سے لڑائی دیکھتی تھیں۔ "رابیا" نے شہزادے کے گھوڑے کو للکار کر کہا: "اے میرے "پتی" کے رہوار اگر آج تو اسے فاتح کی حیثیت سے واپس لے آیا تو میں تیرے نعلوں کو اپنے زیوروں سے سجاؤں گی اور تیری گردن میں موتیوں کے ہار ڈالوں گی۔"

ناگہاں دیکھا کہ "پتی" کا گھوڑا قلعے کی جانب آرہا ہے۔ خیال آیا شاید "پتی" میدان جنگ سے بھاگ کر آ رہا ہے۔ لڑکیوں نے شور مچایا اور قلعہ کا دروازہ کھولنے دوڑیں۔ "رابیا" نے للکار کر کہا: "نہیں، ایسے پہلوان کے لئے جو میدان جنگ سے بھاگ آئے دروازہ نہیں کھولنا چاہئے۔"

جب "پتی" قلعہ کے دروازے کے پاس پہونچا تو گھوڑے سے گر گیا۔ "رابیا" نے دروازہ کھولا۔ دیکھا کہ اس کے دل میں تیر لگا ہوا ہے۔ اور وہ چاہتا تھا کہ اس کی جان میدان میں نہیں "رابیا" کے آغوش میں نکلے۔ شہزادے کا دم نکل گیا اور وہ اپنے ساتھیوں سے جا ملا۔

درویش نے اپنا سیب بادشاہ بست سے واپس لے لیا تھا۔

مترجمہ۔ آغا محمد یعقوب دواشی

(سالنامہ (کابل) ۱۹۴۶-۱۹۴۵ء سے)

> خط و کتابت کے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے

کشمیر

اپنے اجداد کی میراث تھا یہ خطۂ خلد
اسکے کہساروں پہ اُڑتا تھا پھریرا اپنا
اسکی جھیلیں بھی ہماری تھیں فضا بھی اپنی
اجنبی ہاتھوں نے لیکن بڑی عیاری سے
دیکھتے دیکھتے غیروں کو اسے سونپ دیا
اور ہم محوِ تماشا رہے بچوں کی طرح
وقت کی بات تھی۔ اور وقت نے کب کھائی ہے مات
یہ مگر علم نہ تھا زیست کے بازاروں میں
جنس کے ساتھ تماشائی بھی بک جاتے ہیں
—— آج پھر اٹھا ہے وقت اپنا فسانہ کہنے
ہم تماشائی بھی جاگے ہیں نشاں لہراتے
اپنے اجداد کی میراث تھا یہ خطۂ خلد
اپنے اجداد کی میراث ہے یہ خطۂ خلد
اور اجداد کی میراث کے وارث ہم ہیں

اختر ہوشیار پوری

مشرقی پاکستان اور آزادی کے چھ مہینے

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو جب مشرقی پاکستان کے وزیروں نے ایک آزاد مملکت میں اپنے عہدوں کا حلف اٹھایا تو آزادی کی دیوی نے ان کے کانوں میں جھک کر کہا "آزادی کی ذمہ داریاں غلامی کی ذمہ داریوں سے کہیں زیادہ بھاری ہیں۔ کیا تم اس بوجھ کو اٹھا سکو گے؟" جنھوں نے اپنی محنت، اپنی صداقت اور اپنے ایثار سے آزادی حاصل کی تھی اُنھوں نے حوصلہ اور مردانگی سے جواب دیا "اللہ کی مدد ہمارے ساتھ ہے تو یہ بھاری بوجھ ہمارے لئے پھولوں کی ٹوکری سے بھی ہلکا ہو جائے گا۔" سچ ہے اللہ نے مدد کی اور مردانگی نے راستے کے بھاری سے بھاری پتھر کو ہٹا کر زندگی کا راستہ صاف کیا، اب کانٹوں کا جنگل رفتہ رفتہ پھولوں کا تختہ بن رہا ہے۔

۱۵ اگست کو جب مشرقی پاکستان میں نئی آزاد حکومت قائم ہوئی تو قوم نے جن کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ ڈور دی تھی، انھیں اپنے آگے پیچھے، داہنے بائیں سوائے ایک چٹیل، بے شمار خس میدان کے اور کچھ نہ نظر آیا۔ حکومت چلانے کے لئے روپے کی ضرورت ہوتی ہے، سرکاری عملہ کی ضرورت ہوتی ہے، اس عملہ کے دفتروں کے لئے مکانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ فرنیچر اور فرش فروش کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب مشرقی بنگال پاکستان میں آیا تو اس کے خزانے خالی تھے۔ کام چلانے کے لئے اس کے پاس سرکاری عہدیداروں کی کمی تھی، سرکاری دفتروں کے لئے مکان قریب قریب ناپید تھے، اور دریاں، قالین، میزیں، کرسیاں الماریاں ضرورت سے بہت کم۔ سرکاری کام کی یہ حالت تھی اور پچاس ہزار مربع میل میں پھیلی ہوئی چار کروڑ کی آبادی کے لئے مشکل سے چار ہفتہ کی غذا موجود تھی۔ چھ مہینے سے کسی نے گیہوں کے دانہ کی صورت تک نہ دیکھی تھی صرف چاولوں پر بسر اوقات تھی، اور اب اس کا اندیشہ تھا کہ تھوڑے دن میں یہ چاول بھی ختم ہو جائیں گے اور آبادی کے ایک بہت بڑے حصے کو فاقہ کی موت مرنا پڑے گا۔ یہ حالت اس دن تھی جب مشرقی بنگال نے آزادی کی گونج اپنے کانوں میں سنی۔ آزادی ملنے کے بعد فوراً ہی حالات بد سے بدتر ہونے شروع ہو گئے۔ دریاؤں میں سیلاب آیا اور کھیتیاں تہ آب ہو گئیں۔ قحط سالی کا بھیانک خطرہ اور بھی بڑھ گیا۔ ہندوستان کے مختلف حصوں میں خونریزیاں ہوئیں اور لاکھوں مجبور اور بے بس پناہ لینے مشرقی پاکستان میں داخل ہوئے۔ مناسب اور موزوں عملہ کی کمی اور ہندوستان جانے کا فیصلہ کرنے والے سرکاری ملازمین کی بے دلی اور بے توجہی کے علاوہ کوئلہ کی کمی نے نقل و حمل اور رسل و رسائل کے سارے وسیلوں میں شدید انتشار پیدا کر دیا۔ ریلوں اور ڈاکخانوں کے محکموں سے پاکستان آنے والے ملازمین بڑی تیزی سے پاکستان آنے شروع ہو گئے۔ اور اس طرح جو غلہ پہلے کم تھا وہ اب اور کم ہو گیا، جن سامانوں کی پہلے سے حد درجہ قلت تھی اس نے ہولناک صورت اختیار کر لی۔ ریلوں کی آمد و رفت کی بے قاعدگی اور ڈاک کے نظام کی بے ترتیبی نے سرکاری انتظام کو بالکل درہم برہم کر دیا ——— اور تخریبی قوتیں اس انتشار اور اضطراب سے فائدہ اٹھانے کی پوری پوری کوشش میں مصروف رہیں۔ سرکاری ملازموں کو حکومت کے خلاف بھڑکایا گیا، ملک کے مختلف حصوں میں مذہب، زبان اور تمدن کے نام پر ہر طرح کے فتنے اٹھانے کی کوشش کی گئی لیکن ہمت، جوانمردی اور خلوص نے سب چیزوں پر فتح پائی اور فتنہ و فساد اگر کہیں بلبلوں کی طرح اُٹھے بھی تو صداقت کی ہواؤں نے انھیں ہمیشہ کے لئے دبا دیا ——— یہ ہے مشرقی پاکستان کی آزاد مملکت کی چھ مہینے کی زندگی کا مختصر سا خاکہ۔ انھیں حوصلہ شکن حالات میں مشرقی پاکستان کے رہنماؤں کو حکومت کا کام سونپا گیا۔ اور ہر چھوٹے بڑے نے حالات کی شدت کا احساس کر کے ان حوصلہ شکن حالات کو ایسے حالات میں تبدیل کیا کہ اب مشرقی بنگال اپنی حال کی قوتوں پر فتحیاب ہو کر مستقبل کے

منصوبے بنانے اور آہستہ آہستہ ان پر عمل کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔

کام کے ابتدائی دنوں میں لوگوں نے دفتری زندگی میں بڑے دلکش اور نظر افروز مناظر دیکھے ہیں۔ آزمائش کے اس زمانہ میں بڑے بڑے افسروں نے چیڑ کے بکسوں سے میزوں اور کرسیوں کا کام لیا ہے۔ ان میں سے اکثر کو خود کوزہ و خود کوزہ گرد و خود گل کوزہ بن کر ایک کام کو شروع کر کے خود ہی اس کی ساری منزلوں کو طے کرنا پڑا ہے۔ افسروں میں سے اکثر نے چپراسیوں اور کلرکوں کی وساطت کی محتاجی کے بغیر اپنے لکھے ہوئے نوٹ جا کر دوسرے افسروں تک پہنچائے ہیں۔

رہنے کو مکان کہتے اور اس نئے صوبے کے گورنر نے ایک دو منزلہ عمارت کو اپنا محل بنایا، اور اسی عمارت کے احاطے میں پھوس کی جھونپڑیوں سے اپنے دفتر کا کام لیا۔ اسکولوں اور کالجوں کی عمارتوں میں افسروں کے دفتر بھی بنے، اور ان کے گھر بھی [illegible] ہوتا رہا، اور انجینئر، ٹھیکہ دار اور مزدور سورج اور بجلی کی روشنی میں رات دن کام میں لگ کر نقشوں کو عمارتوں میں بدلتے رہے۔ اور اب [illegible] مہینے کے بعد صورتِ حال یہ ہے کہ ہر سرکاری ملازم کو سر چھپانے کی کوئی نہ کوئی جگہ مل گئی ہے۔ لیکن حکومت اب بھی بہتر عمارتیں بنانے کی طرف سے غافل نہیں ہے۔ نقشے بنتے جاتے ہیں اور بغیر سرکاری رسوم و قیود کی پابندی کے نقشوں کو تعمیری شکل دینے کا کام ہوتا جاتا ہے۔

دوسرا سخت مسئلہ غذا کا تھا۔ خاص کر چاٹگام اور نواکھالی کے ضلعوں میں غذا کی حالت بہت نازک تھی۔ ان علاقوں کا زیادہ حصہ پانی سے بھرا ہوا تھا۔ فصلیں ختم ہو گئی تھیں، بہت سے مکان گر چکے تھے اور نہ جانے کتنے مویشی پانی کی رو کے ساتھ بہہ گئے تھے۔ اس لئے مشرقی پاکستان کے وزیروں نے اپنے عہدوں کا حلف لینے کے فوراً بعد ہی اس اہم معاملہ کی طرف توجہ کی — ریلوں اور راستوں کی بدنظمی اور بے ترتیبی کے باوجود ۲۸ ہزار من دھان نواکھالی اور ۱۰ ہزار من چاول اور دس ہزار من دھان چاٹگام بھیجنے کا فوراً انتظام کیا گیا۔ دواؤں اور ڈاکٹروں کے علاوہ مکانوں کی تعمیر کا سامان بھیجا گیا۔ حکومت نے نقصان اٹھانے والے کسانوں کی سہولت کے لئے سر دست تین لاکھ روپے کی منظوری دی۔ دس ہزار کمبلوں اور کئی سو دھوتیوں کی پہلی قسط مصیبت زدہ لوگوں میں تقسیم کرنے کے لئے فوراً بھیجی گئی۔

—— ابھی اس علاقہ میں امداد کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ اکتوبر کے مہینہ میں کاکس بازار اور جنوبی چاٹگام کے علاقوں میں کوئی ۵۰۰ مربع میل کے رقبہ پر زلزلہ آیا۔ اور اس نے فصلوں، مکانوں اور جانوں کی تباہی کو اور بھی بڑھا دیا۔ حکومت نے ہر محکمہ کے عملہ کو مدد کے کام پر لگایا۔ ان علاقوں میں بھی دس ہزار من چاول بھیجے اور مکان بنانے کے سامان کی فراہمی کے لئے چار مرکز کھول دئیے۔ حکومت نے امدادی کاموں کے لئے ۲۰ لاکھ کی رقم منظور کی اور اس کے علاوہ کمبل، دھوتیاں، اور دوائیں بڑی مقدار میں مفت تقسیم کرائیں۔

یہ سب کچھ ایک ایسے صوبہ میں ہوا جہاں معمولی دنوں میں ۲ لاکھ ٹن سالانہ غذا کی کمی رہتی ہے اور تقسیم کے بعد یہ کمی اور بھی زیادہ بڑھ گئی تھی لیکن حکومت اور عوام کے تعاون نے بہت جلد صورتِ حال بدل دی جس بنگال نے چھ مہینے سے گیہوں کے ایک دانے کی صورت نہ دیکھی تھی وہاں مہینہ بھر کے اندر مغربی پاکستان سے حاصل کیا ہوا گیہوں بازاروں میں بکنے لگا اور حکومت نے صوبہ کی غذائی حالت کو بہتر بنانے کے لئے ایک نئی اسکیم کا اعلان کیا جس کے تین خاص حصے تھے:-

(۱) باہر سے غلہ کی زیادہ سے زیادہ فراہمی

(۲) صوبہ کے اندر غلہ کی زیادہ سے زیادہ فراہمی

(۳) غلہ چھپا کر رکھنے والوں کو سزا دینے کے لئے حکومت اور عوام کا تعاون۔

پہلی مد کے سلسلہ میں مغربی پاکستان اور برما سے مدد لی۔ دوسری مد کے سلسلہ میں یہ کہا گیا کہ مختلف محکموں سے جتنے زیادہ کام کرنے والے مل سکتے تھے ان کی مدد سے لوگوں کے جمع کئے ہوئے ذخیرے کو قبضہ میں کیا گیا۔ خود لوگوں نے بھی اس موقع پر صحیح جذبہ سے کام لیا اور دو ہفتہ کے اندر ۳۰ ہزار ٹن چاول حکومت کے حوالے کر دئیے۔ حکومت نے خود اپنی کوشش سے جو چھپا ہوا غلہ نکالا [illegible] کے علاوہ تھا۔

اس طرح غذائی صورتِ حال کا ایک نازک دور ختم ہو گیا، اور مشرقی بنگال نے اپنی ہمت، جوانمردی اور استقلال سے قحط کے بھیانک دیو کو شکست فاش دی۔ حکومت اب اس قابل ہوئی ہے کہ آنے والے سال کے لئے بہتر غذائی صورتِ حال پیدا کرنے کے منصوبوں پر عمل کر سکے۔

غذا کی حالت اتنی نازک تھی اور حکومت کے پاس صحیح کام کرنے والوں کی بے حد کمی تھی۔ ضرورت تھی کہ ہر کام پوری رفتار سے کیا جائے لیکن اس رفتار کے لئے جس طرح کے عملہ کی انتہائی ضرورت تھی وہ بہت کم تھا۔ اس کے مقابلہ میں ۵ ہزار کے قریب کلرک ایسے تھے جو تقسیم کے بعد بعض محکموں کے ختم ہو جانے کی وجہ سے بیکار ہو گئے تھے۔ حکومت نے سرپلس ملازموں کی کھپت کے لئے فوراً ایک بورڈ بنایا۔ اس بورڈ نے اس وقت تک ۴ ہزار سے زیادہ آدمیوں کو کہیں نہ کہیں کام سے لگا دیا ہے۔ جن ضروری ملازموں کی کمی تھی اُن میں سب سے زیادہ تکلیف ۱۴۰۰ افسروں اور ڈھائی ہزار سپاہیوں کے نہ ہونے سے ہوئی۔ لیکن دو مہینے کے اندر سپاہیوں کی کمی پوری کرلی گئی البتہ افسروں کی جگہیں رفتہ رفتہ بھری جا رہی ہیں کسی نئی ریاست کی تعمیر اور ترقی کے لئے صحیح قسم کے کام کرنے والوں کی ضرورت سب سے پہلے ہوتی ہے، اس ضرورت کے تحت ایک نئی رضاکار جماعت قائم کی گئی ہے۔ اس جماعت کا نام انصار ہوگا اور اس میں سردست ڈیڑھ لاکھ رضاکار ہوں گے۔ انصاروں کا کام یہ ہوگا کہ وہ آبادی کے مختلف فرقوں اور گروہوں کے باہمی تعلقات کے بہتر بنانے اور صوبے میں امن قائم رکھنے کے کام میں حکومت کی مدد کریں۔ کسی قومی ضرورت کے وقت رضاکاروں کی اس جماعت سے قومی فوج کا کام بھی لیا جا سکتا ہے اس لئے فیصلہ کیا گیا ہے کہ سر دست ۱۵ ہزار رضاکاروں کو اسلحہ کے استعمال کی تعلیم بھی دی جائے گی۔ لیکن حقیقت میں اس جماعت کا مقصد عسکری نہیں ہوگا۔ وہ قومی تعمیر کے کاموں میں، خصوصاً دیہاتوں کی ترقی اور تعمیر اور جرائم کی بیخ کنی میں حکومت کا ہاتھ بٹائے گی۔ اس رضاکار جماعت کا رکن بننے کے لئے کسی مذہب و ملت کی قید ہرگز نہیں۔

حکومت نے اس رضاکار جماعت کے قیام کا جو مقصد بیان کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکومت اپنی ابتدائی زندگی کے بحرانی دور میں بھی تعمیری کاموں کی طرف سے غافل نہیں رہی۔ چنانچہ پچھلے چھ مہینے کی زندگی کا جائزہ لینے والے کو اس نئی حکومت کے تعمیری کاموں کی تفصیل کا اندازہ کر کے خاصی تشفی اور تسکین ہوتی ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلا نمبر تعلیم کا ہے۔ مدتوں سے مشرقی بنگال کی ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے انتظام کی باگ ڈور کلکتہ یونیورسٹی کے ہاتھ میں تھی۔ ڈھاکا یونیورسٹی اقامتی درس گاہ تھی اور اس کی حیثیت محض مقامی تھی۔ تھوڑے سے اسکولوں کو چھوڑ کر مشرقی بنگال اور سلہٹ کے سارے اسکول کلکتہ کے ماتحت تھے۔ اس لئے آزادی کے ساتھ ڈھاکے کو سب سے پہلے یہ سوچنا تھا کہ اتنے بڑے صوبے کی تعلیم کی تشکیل تنظیم کس طرح کی جائے۔ چنانچہ ۷ ستمبر کو ایک نئے قانون کے ماتحت ڈھاکا یونیورسٹی کو اسکولوں کے علاوہ سارے تعلیمی اداروں کے الحاق کی اجازت مل گئی۔ مدرسے مشرقی بنگال کے سکنڈری ایجوکیشن بورڈ کے تحت آ گئے تقسیم سے پہلے صنعتی تعلیم کے سارے ادارے مغربی بنگال میں تھے۔ اب مشرقی بنگال میں اس طرح کے ادارے کھولے جا رہے ہیں۔ چنانچہ چاٹگانگ اور کومیلا میں گورنمنٹ کمرشل کالج اور گورنمنٹ وٹرنری کالج نے اپنا کام شروع بھی کر دیا ہے۔ ڈھاکے کے میڈیکل کالج اور احسان اللہ انجینیرنگ کالج میں اسٹاف بڑھا لیا گیا ہے اور انجینیرنگ کالج کو ڈگری کالج بنا دیا گیا ہے۔ سلہٹ میں ایک نیا میڈیکل اسکول کھل گیا ہے۔ کلکتہ کا مدرسۃ العالیہ جو سو برس سے بھی زیادہ سے بنگال میں اسلامی تعلیم کا مرکز رہا ہے ڈھاکا آ گیا ہے۔

مشرقی بنگال کی ۹۰ فی صدی آبادی کسان ہیں اور ان کسانوں کی بہبودی گویا مشرقی بنگال کی بہبودی ہے۔ اسی لئے حکومت نے کسانوں کی موجودہ صورتِ حال اور زمینداروں اور کسانوں کے باہمی رشتے اور زمینداری کے مختلف مروجہ نظاموں کی صحیح حالت معلوم کرنے کے لئے ایک کمیٹی کا تقرر کیا ہے اور اس کی رپورٹ کا انتظار کیا جا رہا ہے پھر بھی بعض ضلعوں میں کسانوں کو عارضی طور پر سہولتیں دے دی گئی ہیں۔

مشرقی پاکستان کو ہمیشہ سے مالی حیثیت سے خسارے کا علاقہ کہا جاتا رہا ہے لیکن چھ مہینے کی معمولی سی جستجو نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ لوگوں کا خیال صحیح نہیں۔ مشرقی پاکستان کے اقتصادی اور صنعتی مستقبل کے متعلق جو منصوبے بنائے گئے ہیں اُن کی بنیاد اس بات پر ہے کہ دنیا بھر میں سَن کی پیداوار کا ۷۵ فی صدی پاکستان میں پیدا ہوتا ہے، اس کے علاوہ یہاں چاء، تمباکو، کھالیں، کاغذ بنانے کا سامان یعنی بانس اور گھاس یہاں کی قیمتی پیداواریں ہیں۔ چاٹگانگ کے علاقوں میں پٹرول نکلنے کے امکانات ہیں مشرقی پاکستان میں پانی کے راستے نقل و حمل کو بہت ترقی دی جا سکتی ہے یہاں مچھلیوں اور جنگلی معدنیات کی کثرت ہے، اور ان ساری

دولتوں کا احساس حکومت کو بھی ہے اور عوام کو بھی۔ سب کو یہ احساس ہے کہ معدنی دولتوں کا یہ بے بہا ذخیرہ کوڑی کے مول کلکتہ کے تاجروں کی جھولی میں جاتا رہا۔ اسی لئے اب ہر ممکن طریقے سے اس دولت کو اپنی مملکت میں رکھنے کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں اور ان پر تیزی سے عمل بھی ہو رہا ہے۔ سن کو بیرونی استعمال کے لئے تیار کرنے اور باندھنے کے لئے یہاں بہت تھوڑے کارخانے تھے۔ اب ان کارخانوں کی تعداد بڑھائی جا رہی ہے جو کارخانے پہلے سے موجود ہیں وہ دن رات برابر کام کر رہے ہیں اور کام کی رفتار اب ۲۰ فی صدی سے بڑھ کر ۵۰ فی صدی ہو گئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس سن کو باہر بھیجنے کی چنگی سے کلکتہ کے بندرگاہ کو ۴ کروڑ روپئے سالانہ کی آمدنی ہوتی تھی وہ اب آمدنی پاکستان کو ہوگی۔ چٹاگانگ کے بندرگاہ سے جنوری کے ابتدائی ۲۰ دنوں میں سن کے ۱۱ جہاز امریکا، آسٹریلیا، اٹلی، برطانیہ اور کناڈا کو گئے۔ چٹاگانگ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اکتوبر کے مہینہ میں یہاں سے ۸۸۴ ٹن سن باہر کے ملکوں کو گیا اور دسمبر میں ۱۲،۱۷۵ ٹن۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۸ء سے ۹ جنوری ۱۹۴۹ء تک یہاں سے ۱،۰۷،۵۰۰ بنڈل سن لادا گیا۔ برخلاف اس کے پچھلے سال اسی زمانہ میں صرف ۲۳،۱۹۷ بنڈل لادے گئے تھے۔ دوسرے ملکوں کی مانگ برابر بڑھتی جا رہی ہے۔ اسی کے ساتھ جانے والے بنڈلوں کی تعداد اور تعداد بھی بڑھے گی۔

صوبے کی اس معدنی دولت اور چٹاگانگ جیسے بندرگاہ کی موجودگی کے پیش نظر حکومت نے صنعتی مستقبل کا ایک حوصلہ افزا پروگرام تیار کیا ہے۔ ۲۱ دسمبر ۱۹۴۸ء کو اس سلسلہ میں ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی گئی۔ حکومت نے کمیٹی مقرر کرتے وقت یہ اعلان کیا کہ کمیٹی کی رپورٹ مل جانے کے بعد صنعتی ترقی کا ایک بورڈ بنایا جائیگا۔ تحقیقاتی کمیٹی نے تیزی سے اپنا کام کیا ہے اور اس کی مختلف سب کمیٹیوں نے سن، سوت کتنے، چونے، سیمنٹ، چمڑے، تیل اور کاغذ وغیرہ کے متعلق اپنی رپورٹیں اور کارخانے قائم کرنے کے متعلق اپنی تجویزیں تیار کر لی ہیں۔ ان تجویزوں پر اب آخری نظر ڈالی جا رہی ہے۔

مشرقی پاکستان کی تعمیری منصوبہ بندی کی بنیاد حکومت نے تین مقاصد پر رکھی ہے۔ پہلا مقصد تو یہ ہے کہ اس طرح کے حالات پیدا کئے جائیں کہ مشرقی پاکستان کے باشندے اس اقتصادی جبر و استحصال سے بچ جائیں، جس میں وہ مدتوں سے مبتلا ہیں، دوسرا مقصد یہ ہے کہ قومی زندگی بہتر ہو اور لوگوں کا معیار زندگی بلند ہو۔ اور تیسرے یہ کہ تعمیر ایسی ہو کہ پاکستان بین الاقوامی اقتصادیات میں اپنا وہ منصب پورا کر سکے جس کا وہ اہل ہے۔ ان تین مقاصد کے پیش نظر مشرقی پاکستان نے زندگی کے ہر شعبہ میں جرأت اور حوصلہ کا ثبوت دیا ہے۔ اسی جرأت اور حوصلہ نے اسے ان بھیانک خطروں سے محفوظ رکھا جنہوں نے آزادی ملتے ہی اسے گھیر لیا تھا۔ یہی جرأت اس [illegible] ماضی سے بہتر نمائندگی ہے اور حال ایک درخشاں مستقبل کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

غزل

اقبال عظیم

مرے ذوقِ جستجو کو کوئی دے گا کیا سہارا
مری منزلوں نے خود ہی مجھے دور سے پکارا

مرا سجدۂ عقیدت، تری عظمتوں کا ضامن
مری بندگی نے ہی تو ترا آستاں سنوارا

مری ہر نظر تجلی، مری ہر نگاہ جلوہ
میں جہاں بھی مسکرا دوں، ترا حسن آشکارا

مجھے راس میری موجیں، مجھے راس میرا طوفاں
نہ کوئی مرا سفینہ، نہ کہیں مرا کنارا

تری آرزو بھی تھک کر مرا ساتھ چھوڑ بیٹھی
نہ کچھ اب مری تمنا، نہ کچھ اب مرا سہارا

غمِ نو بنو کے ہاتھوں ہوں اگرچہ دل شکستہ
تری آرزو کی خاطر مجھے زندگی گوارا

یہ سہم کے یک بیک کیوں یہیں رک گیا زمانہ
یہ نقاب کس نے الٹی، ہوا کون آشکارا

میں بھٹک کے ظلمتوں میں تری راہ کھو چکا تھا
ترے غم کے میں تصدق، مجھے دے دیا سہارا

مرا تقوی لاکھ تقوی، مری توبہ لاکھ توبہ
مجھے اذنِ رقص و مستی، فقط اک ترا اشارا

و - ع

نئی کتابیں

سب رنگ :- مصنفہ اختر الایمان، ناشر کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ)

۱۰۰ صفحے کی یہ مختصر کتاب ایک منظوم ناٹک ہے جس کا پس منظر "برّ اعظم ایشیا کا ایک جنگل" ہے، تماشائی "شجر و حجر" ہیں، وقت "اندھیرے اجالے کے درمیان" کا ہے اور زمانہ "ہمارا آپ کا" کرداروں میں نمایاں، آدم، سانپ، گدھا، بندر، چڑیا، گینڈا، مچھر، بیل، ہدہد، کتا، اُلّو اور گدھ ہیں۔ اس پس منظر میں ان تماشائیوں کے لئے اختر الایمان نے ان بہت سے کرداروں کا انتخاب کیا ہے، جو نام کے حیوان ہیں لیکن ان کی حرکات و سکنات عام انسانوں سے ملتی ہیں۔ اور حقیقت میں اس پورے ناٹک میں یہ سارے کردار ہمارے سماج کے مختلف انسانی کرداروں کا خاکہ پیش کرتے ہیں۔ سانپ سیاسی رہنما ہے، مچھر والئی ریاست ہے، بیل محنت کش مزدور ہے، کتا، خطاب یافتہ انسان ہے اور گدھ سرمایہ دار۔ ناٹک کے ابتدائی تین منظروں (یہاں شاعر نے انھیں "رنگ" کہا ہے) میں ہمارے زمانہ کی مختلف النوع زندگی کے چند ایسے پہلو پیش کئے گئے ہیں جن میں سیاسی رہنما، سرمایہ دار، خطاب یافتہ اور والئی ریاست نے مل کر استحصال کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ ابن الوقت تو اپنے آپ کو ہر طرح کے حالات کے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں لیکن جس کی زندگی کا مدار محنت کشی پر ہے، وہ زندگی میں موت کے ذائقے چکھتا ہے ــــــ اور اس زندگی کے چاروں طرف پھیلا ہوا ناقص نظام اور تخریبی عنصر حالات کو بد سے بدتر بنا دیتا ہے۔ اور ان حالات میں سب سے زیادہ مشکل محنت کش کی ہے، اس انسان کی جسے اپنے لہو پسینے کو ایک کر کے پیٹ کا دوزخ بھرنے کا سامان کرنا پڑتا ہے۔ ناٹک کے چوتھے حصے میں بیل (یعنی محنت کش) اور قوت کا طویل مکالمہ ہے جس میں بیل اپنی مجبوری اور لاچاری کی داستان دہراتا ہے اور قوت اس سے کہتی ہے کہ تمہاری مجبوری اور لاچاری کا علاج خود تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تم اپنے دشمنوں کو پہچانو اور ان سے بچو تو تمہاری غلامی اور محنت کشی میں آسانی کے راستے پیدا ہو جائیں۔ ناٹک کا خاتمہ زمان و مکان کے اس تکلم پر ہوتا ہے کہ

"منزل آنے والی ہے اور بدلی کے چھٹنے کے دن قریب آنے والے ہیں لیکن اس بدلی کے چھٹتے ہی ہمیں کچھ اور رنگ دکھائی دیں گے۔ بہتے ہوئے خون اور بھڑکتے ہوئے شعلوں اور شراروں کا رنگ" لیکن بہتے ہوئے خون اور بھڑکتے ہوئے شعلوں کا دور ختم ہو چکا ــــــ اب تاریکی میں امید کے دیے جلانے کا وقت آگیا۔

اختر الایمان نے ناٹک میں کرداروں کی خصوصیات بڑی کامیابی سے پیش کی ہیں۔ لیکن کہیں کہیں لفظوں کے انتخاب اور نظم کی بندش میں پوری احتیاط سے کام نہیں لیا اس لئے پڑھنے والے کو کہیں کہیں تو شاعری اور فکر کا بے حد لطف امتزاج نظر آتا ہے لیکن کہیں کہیں اس زور اور جوش کی شدید کمی بھی محسوس ہوتی ہے جو ناٹک کے مجموعی تاثر کے لئے ضروری ہے۔

طلوعِ اسلام، کراچی :- ناشر ناظم ادارۂ طلوع اسلام، ۲۸۱/۱ رام باغ روڈ، کراچی۔ چندہ سالانہ دس روپے۔ قیمت فی پرچہ ایک روپیہ۔

طلوعِ اسلام کا نام اردو والوں کے لئے نیا نہیں۔ اب سے چند برس پہلے مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ میں اس رسالہ کا ذکر بڑے جوش اور احترام سے کیا جاتا تھا۔ چنانچہ جب یہ رسالہ بند ہوا تو لوگوں نے ادبی حلقوں میں ایک خلا سا محسوس کیا۔ اب طلوع اسلام دوبارہ منظرِ عام پر آیا ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے اس کے دو پرچے ہیں، ایک جنوری اور فروری کا مشترک پرچہ ہے دوسرا مارچ کا۔ ان دونوں پرچوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ طلوع اسلام نے اپنے دورِ ثانی میں مسلمانوں کی سیاسی قیادت اور اخلاقی اور ایمانی رہبری کو اپنا مسلک بنایا ہے۔ اور اس سلسلہ میں بصیرت افروز مقالے لکھ کر جہاں ایک طرف انھیں ان کے ماضی کی عظمتوں کا احساس دلایا ہے وہاں ساتھ ہی ساتھ حال کی روشنی میں مستقبل کا راستہ بھی دکھانے کی کوشش کی ہے ہمیں یقین ہے کہ پاکستانی زندگی کے اس نئے دور میں طلوع اسلام کی رہنمائی دلوں میں حرارت اور بازوؤں میں قوت پیدا کرنے کی اہم خدمت انجام دے سکے گی۔

کراچی
۱۳ اپریل

مکرمی - تسلیم

"ماہِ نو" کا پہلا شمارہ شائع ہوا اور ختم بھی ہوگیا۔ ناظرین نے اس کا خیر مقدم جس شفقت اور محبت سے کیا ہے اس کی ترجمانی بعض خطوط کے اقتباسات سے ہوتی ہے:- ایک صاحب فرماتے ہیں

"یہ کہنا شاید ضروری نہ ہو کہ اپنے آزاد ملک کے پہلے ادبی پرچے کو دیکھ کر از حد خوشی ہوئی۔ اس جذبہ میں غالباً ماہِ نو کے سب پڑھنے والے شریک ہیں۔ سب سے زیادہ مسرت اور ذہنی آسودگی یہ دیکھ کر حاصل ہوئی کہ آپ نے پہلے پرچے کیلئے جن مضامین کا انتخاب کیا ہے ان میں سے بیشتر ہمارے ماضی قریب کے صحیح آئینے ہیں"

دوسرے کرم فرما کا ارشاد ہے:-

"ایسی گرانی کے زمانہ میں ایسا شاندار و دیدہ زیب ماہنامہ نکالنا بلند حوصلگی اور ادب نوازی کی زرین مثال ہے۔ خدائے پاک آپ کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے"

اسی طرح کی سیکڑوں رائیں ہمیں موصول ہوئی ہیں اور ہم اس حوصلہ افزائی کے لئے قارئین کے بیحد ممنون ہیں۔ ہماری کوشش ہمیشہ یہی ہوگی کہ "ماہِ نو" سے ان کی جو توقعات وابستہ ہیں وہ پوری ہوسکیں۔

ماہِ نو کا پہلا پرچہ پانچ ہزار کی تعداد میں چھپا تھا۔ ہندوستان اور پاکستان کے ہر حصہ میں اسے اس قدر پسند کیا گیا کہ اب ہمارے پاس اس کی ایک کاپی بھی باقی نہیں۔ اور تقاضے برابر آرہے ہیں۔ ہم قارئین سے معافی کے خواستگار ہیں کہ انہیں مایوس ہونا پڑا۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ زیادہ کاغذ دستیاب ہو جائے تاکہ اگلا پرچہ زیادہ تعداد میں چھپایا جاسکے۔ جب تک اس کوشش میں کامیابی نہ ہو ہمیں ماہِ نو کی اشاعت کو محدود رکھنا پڑیگا۔ اسی مجبوری کی وجہ سے ہمیں اشتہارات کے صفحوں کی تعداد بھی محدود رکھنی پڑی ہے اس لئے جو قارئین اور مشتہرین مایوسی سے بچنا چاہتے ہیں وہ براہِ کرم اپنی جگہیں اور اپنے صفحات فوراً محفوظ کرالیں۔

نیاز مند
منتظم

دس روپے کے پندرہ روپے

ایک اور قدم آگے

اسٹیٹ بنک آف پاکستان

اسٹیٹ بنک آف پاکستان [illegible] کرنے کے لئے قانون بنایا جا رہا ہے۔ یہ بنک یکم جولائی [illegible] سے سب کام اپنے ذمے لیگا جو ریزرو بنک آف انڈیا انجام دے رہا تھا۔

بنک کے متعلق چند خاص باتیں

کرنسی، سرکاری قرضہ اور ایکسچینج کنٹرول کا انتظام کرے گا۔
ملک کے اندر اور باہر کے نظام کو اس طریقہ پر قائم کریگا جس میں ملک کی زیادہ سے زیادہ بہتری ہو۔
ملک کی مالی استقامت کے حصول کا ذمہ دار ہوگا۔
حکومت پاکستان اور دوسرے بنکوں کے لئے بنکر کی حیثیت سے کام کرے گا۔
سرمایہ تین کروڑ روپے ہوگا، ۵۱ فیصدی حصے حکومت خریدیگی اور باقی ۴۹ فیصدی عوام کیلئے ہونگے۔
مرکزی بورڈ آٹھ ڈائرکٹروں کا ہوگا۔ ان میں سے تین کو حصہ دار منتخب کریں گے۔ مقامی بورڈ ڈھاکہ، کراچی اور لاہور میں ہوں گے۔
ہر مقامی بورڈ کے لئے چار اراکین حصہ داروں کی طرف سے منتخب ہونگے۔ غیر سرکاری کاروباریوں میں سے زیادہ سے زیادہ پانچ اراکین مرکزی حکومت نامزد کریگی۔ اس طرح عوام کو بنک کے انتظامی امور اور نظم و نسق میں حصہ لینے کا موقع مل سکیگا۔ مجموعی منافع ۴ فیصدی سالانہ مقررہ نفع تقسیم کر دینے کے بعد منافع کی فاضل رقم ایک ریزرو فنڈ قائم کرنے کے کام آئیگی اور جب ریزرو فنڈ کی رقم مبلغ ۳ کروڑ روپے ہو جائے گی تو ۴ فیصدی کے حساب سے نفع تقسیم کر دینے کے بعد باقی فاضل منافع حکومت پاکستان کو دے دیا جایا کرے گا۔
سو سو روپے والے زیادہ سے زیادہ پانچ سو حصے خریدے جا سکتے ہیں۔
پاکستان کے بنکوں کی رہنمائی، امداد و تعاون اور تجدید کے لئے یہ اہم اور دور رس طریقہ ہے تاکہ صنعت و تجارت جس کو تقسیم ملک کے بعد سے بہت نقصان پہنچ چکا ہے، منظم و بحال ہو جائے اور وہ عوام کی خوشحالی اور فلاح و بہبود کا باعث ہو۔ روپیہ لگانے والوں کے لئے یہ بہترین موقع ہے۔ پراسپکٹس عنقریب شائع کیا جائے گا۔

اسٹیٹ بنک آف پاکستان

ماہِ نو

مدیر وقار عظیم

جلد ۱ شمارہ ۳

جون ۱۹۴۸ء

قیمت فی پرچہ ۸/

چندہ سالانہ صہ

کس نے کیا کہا؟

"ہمیں صرف اس بات سے مطمئن نہیں ہو جانا چاہئے کہ ہمارے پاس اچھی فوج ہے۔ ہماری فوج کا شمار دنیا کی بہترین فوجوں میں ہونا چاہئے ۔۔ اس وقت ہماری فوج تعداد میں اتنی بڑی ہے جتنی تقسیم سے پہلے پورے ہندوستان کی فوج تھی۔ لیکن اس سے کسی کو غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے۔ پاکستان کسی قوم کی آزادی چھیننے کے لئے جنگی فوج تیار نہیں کر رہا ہے بلکہ وہ اس طرح اپنی اُس آزادی کو قائم رکھنا چاہتا ہے جو اس نے بڑی محنت سے حاصل کی ہے۔ دنیا کی کسی قوم نے آزادی کے حصول کے لئے اتنی زبردست قربانی نہیں دی جتنی پاکستان نے۔"

آنریبل لیاقت علی خاں ——— ۸ اپریل، لاہور

"جو لوگ مہاجرین کو پاکستان پر بار سمجھتے ہیں اُن میں انسانیت اور پاکستان کی خدمت کے جذبہ کی کمی ہے۔"

آنریبل غضنفر علی خاں ——— ۱۳ اپریل، لاہور

"پاکستان مل گیا۔ اب اسے ایک مضبوط ریاست بنانے کا مشکل کام شروع ہوا ہے۔ یہ مقصد صرف اسی طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ ہم سب متفقہ طور پر اپنی ذہنی اور مادی قوتوں کو یکجا کر کے اپنی مساعی کو ریاست کے لئے وقف کر دیں۔"

قائدِ اعظم ——— ۱۶ اپریل، پشاور

"ساری دنیا کی اور خاص کر اسلامی دنیا کی نظریں آج کل پاکستان کی طرف اُٹھ رہی ہیں اس لئے کہ پاکستان دنیا کی پانچویں بڑی ریاست اور سب سے بڑی اسلامی مملکت ہے۔ دنیا دیکھنا چاہتی ہے کہ جو آزادی پاکستان کے مسلمانوں نے اتنی زبردست قربانیوں کے بعد حاصل کی ہے اُسے وہ قائم بھی رکھ سکتے ہیں یا نہیں اور پاکستان کو واقعی مضبوط ملک بنا سکیں گے یا نہیں۔"

آنریبل لیاقت علی خاں ——— ۱۵ اپریل کراچی

"اپنی جسمانی قوت بڑھائیے، جنگجوئی کے لئے نہیں، نبرد آزمائی کے لئے نہیں، بلکہ مضبوط اور توانا بننے کے لئے۔ اپنی ساری زندگی، اور زندگی کا ہر لمحہ، قومی زندگی کے ہر شعبہ میں، آپ جہاں بھی ہوں اور جو کچھ بھی ہوں ہمیشہ امن و سکون اور بین الاقوامی سلامتی محافظ بنئے۔"

قائدِ اعظم ——— ۲۳ اپریل، کراچی

"تمہاری حکومت اس بات کا تہیہ کر چکی ہے کہ حکومت میں سے ہر بددیانت ملازم کو، وہ خواہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، چُن چُن کر نکالا جائے گا۔"

آنریبل غلام محمد ——— ۲۶ اپریل

"اسلامی دنیا کا اتحاد صرف مسلمانوں ہی کے لئے قوت کا باعث نہیں ہوگا بلکہ پوری انسانی دنیا کے لئے بہبودی کا باعث بنے گا۔"

آغائے عبدالرحمٰن فراموزی۔ ایڈیٹر کیہان

"پاکستان اور ہندوستان کے باہمی تعلقات رفتہ رفتہ زیادہ دوستانہ ہوتے جائیں گے اور ہندوستان اور پاکستان کے درمیان سفر کرنے کے لئے شاید پاسپورٹ کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

مسٹر سری پرکاش، انڈین ہائی کمشنر۔ ۲ مئی۔

"دنیا کے لئے پاکستان کا پیغام آج بھی وہی ہے جو ۱۴۰۰ برس پہلے اسلام نے دنیا کو دیا تھا ——— اخوت، مساوات، امن اور انصاف کا پیغام۔"

آنریبل لیاقت علی خاں ——— ۴ مئی

واقعات کی ڈائری

اپریل ــــ مئی

۸ر اپریل۔ پریسیڈنٹ ٹرومین نے ریاستہائے متحدہ کی ہوائی طاقت کی توسیع کے لئے کانگریس سے ۰۰۰،۰۰۰،۲۵،۷۵ ڈالر کی رقم طلب کی۔

مشہور عرب لیڈر عبدالقادر حسینی یروشلم سے پانچ میل کے فاصلہ پر جبل قسطیل کے مقام پر یہودیوں سے لڑتے ہوئے مارے گئے۔ عربوں نے آج کی تاریخ میں جبل قسطیل کے موضع کو یہودیوں کے ہاتھ سے چھین لیا۔

۹ر اپریل۔ مسلم کانفرنس کے صدر الحاج چودھری غلام عباس نے آزاد کشمیر کی حکومت کی درخواست پر آزاد کشمیر کی مدافعتی تحریک کی قیادت اپنے ہاتھوں میں لے لی۔

۱۱ر اپریل۔ قائداعظم محمد علی جناح صوبہ سرحد کے دورے کے لئے کراچی سے روانہ ہوئے اور پشاور پہنچے۔

چین کے وزیر دفاع جنرل پائی چنگ سی نے نیشنل اسمبلی کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ چین اگلی ایٹم جنگ کے لئے سائنٹیفک تیاریاں کر رہا ہے۔

سیام کی نئی کابینہ نے آج کام ہاتھ میں لیا۔

۱۳ر اپریل۔ یہودیوں نے "فلسطین کی نئی ریاست" کے لئے ۱۳ وزیروں کی کابینہ بنائی۔

۱۷ر اپریل۔ سلامتی کونسل نے ایک تجویز پاس کی جس میں یہودیوں اور عربوں سے کہا گیا ہے کہ وہ لڑائی بند کر کے معاملات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔

۱۸ر اپریل۔ انڈو پاکستان کانفرنس پانچ دن کے اجلاسوں کے بعد ختم ہوئی اور دونوں ملکوں کے نمائندوں نے متفقہ طور پر اقلیتوں کی حفاظت اور ان کے حقوق کے متعلق دور رس فیصلے کئے۔

۲۱ اپریل۔ اٹلی کے الکشنوں میں کرسچین ڈیماکریٹ پارٹی نے دونوں ایوانوں میں اکثریت حاصل کر لی۔

سلامتی کی کونسل نے آج کشمیر پر اپنا نیا رزولیوشن پاس کیا۔

۲۳ر اپریل۔ پاکستان میں حکومت افغانستان کے پہلے سفیر ہز رائل ہائنس سردار شاہ ولی خاں کراچی پہنچے۔

۲۶ر اپریل۔ سندھ کے وزیر اعظم مسٹر ایم اے۔ کھوڑو کو برخاست کر دیا گیا۔

۲۸ر اپریل۔ اقوام متحدہ نے فلسطین میں امن قائم کرنے کے مسئلہ پر گفتگو کرنے کے لئے جو امن کمیٹی بنائی تھی عربوں نے اس کی تجویزوں کو مسترد کر دیا۔

۱ر مئی۔ پاکستان اور سوویٹ یونین نے آپس میں سفارتی تعلقات قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور کراچی اور ماسکو میں اس بات کا اعلان کیا گیا۔

۳ر مئی۔ سندھ کی نئی کابینہ نے اپنے عہدوں کا حلف اٹھایا۔

پیر الٰہی بخش اس نئی کابینہ کے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔

پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کے درمیان اپریل میں جو سمجھوتے ہوئے تھے۔ آج دونوں حکومتوں کے نمائندوں نے ان سمجھوتے کی تائید کرتے ہوئے سچے دل سے ان پر عمل پیرا ہونے کا اعلان کیا۔

۱۰ر مئی۔ پاکستان پارلیامنٹ کا اجلاس شروع ہوا۔

پاکستانی پارلیامنٹ میں بددیانت سرکاری ملازمین پر مقدمہ چلانے کے سلسلے میں ایک نیا قانون پیش کیا گیا۔

عرب اور یہودی آج اس بات پر متفق ہو گئے کہ یروشلم کے شہر کو بین الاقوامی ریڈ کراس کے جھنڈے کے سایہ میں دے دیا جائے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ فلسطین میں جو موجودہ خانہ جنگی ہو رہی ہے اس میں یروشلم کی حیثیت "حرم" کی سی ہوگی۔

اسلم جیراج پوری

حضرت اویس قرنیؓ[1]

ملک یمن کے قبیلۂ مراد سے تھے جو مذحج کی ایک شاخ ہے سلسلۂ نسب یہ ہے، اویس بن عامر بن جزء بن مالک بن عمرو بن سعد بن عصوان بن قرن بن ردمان بن مراد۔

بیان کیا گیا ہے کہ عہدِ رسالت میں موجود تھے اپنی والدہ ماجدہ کی خدمت کی وجہ سے جو نابینا تھیں دربارِ نبویؐ میں حاضر نہ ہو سکے۔ اس وجہ سے صحابیت کے رتبہ سے محروم رہے۔ لیکن باتفاق صلحاء و صوفیۂ کرام ان کا درجہ زہد و تقویٰ کے لحاظ سے تابعین میں سب سے بڑھ کر ہے۔ علقمہ کا بیان ہے کہ تابعین میں آٹھ اشخاص ہیں جن پر زہد منتہی ہو گیا۔ عامر بن عبدالقیس، اویس قرنی، ہرم بن حیان، ربیع بن خثیم، ابومسلم خولانی، حسن بصری، امام مسروق رحمہم اللہ۔[2]

متعدد روایات مرفوعہ بھی اس مضمون کی ہیں۔ ابن سعدؒ[3] نے لکھا ہے کہ جنگ صفین میں ایک شامی نے نکل کر پکارا کہ کیا تم (کوفہ والوں) میں اویس قرنی ہے؟ لوگوں نے کہا کہ "ہاں" اس نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اویس قرنی تابعین میں سب سے بہتر ہیں، یہ کہہ کر اپنے گھوڑے کو مہمیز لگائی اور آکر کوفیوں میں شامل ہو گیا۔

دوسری روایت سلام بن مسکین کے حوالہ سے اسی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس امت میں میرا خلیل اویس قرنی ہے[4]

تیسری روایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ہے کہ جب انہوں نے اویس سے فرمایا کہ "میرے لئے مغفرت مانگو" جواب دیا کہ "میں کیسے آپ کے لئے استغفار کروں، آپ تو صحابۂ رسول میں سے ہیں" حضرت عمرؓ نے کہا کہ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ تابعین میں سب سے بہتر ایک شخص ہے جس کا نام ہے اویس"

حافظ ابونعیم نے حلیۃ الاولیاء[5] میں حضرت ابوہریرہ سے روایت کی ہے کہ "میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اصحاب خاص کے حلقہ میں تھا۔ آپ نے فرمایا کہ "کل تمہارے ساتھ ایک جنتی شخص نماز پڑھے گا" مجھے امید ہوئی کہ شاید وہ میں ہوں۔ سویرے مسجد میں گیا اور آں حضرتؐ کے پیچھے نماز پڑھی۔ جب سب لوگ چلے گئے تو ایک سیاہ چہرہ مرد پیوند لگا ہوا تہبند باندھے ہوئے آیا۔ آنحضرتؐ سے مصافحہ کیا اور کہا کہ یا رسول اللہ میرے لئے دعا فرمایئے۔ حضورؐ نے اس کے لئے شہادت کی دعا کی۔ اس کے جسم سے مشک اذفر کی مہک آرہی تھی۔ میں نے پوچھا کہ "یہی وہ شخص ہے؟" فرمایا کہ "ہاں یہ غلام ہے اور فلاں خاندان کی ملکیت میں ہے" میں نے کہا "آپ اس کو خرید کر آزاد فرما دیتے" جواب دیا کہ "مجھے اس سے کیا جبکہ اللہ تعالےٰ نے اس کو جنت کے بادشاہوں میں سے بنایا ہے۔ اے ابوہریرہ! جنت میں بھی ملوک اور سادات ہیں اور یہ حبشی جنت کے انہیں ملوک اور سادات میں سے ہے[6]۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے ان پاک نفس، مخفی فرمانبرداروں کو پسند کرتا ہے، جن کے بال پریشان، چہرے خاک آلودہ، اور شکم بجز کسب حلال کے

---

[1] ان کے حالات ابن سعد، حافظ ابونعیم اصفہانی، حافظ ابن مندہ، امام یافعی اور امام ذہبی وغیرہ نے لکھے ہیں۔ ما دھر فارسی اور اردو کے اولیاء و اصفیاء و اخیار و ابرار کے تذکروں میں بھی بڑی باتیں کسی قدر تغیر اور غیر معتبر افسانوں کے ساتھ درج کی گئی ہیں۔ اس لئے اس سے میں نے تعرض نہیں کیا اور صرف قدماء کی روایات کو لیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس مضمون میں بہت سے دلچسپ قصے جو متاخرین نے لکھے ہیں نہیں آسکے۔ [2] یہ تین یہ تو صرف سات ہوئے۔ غالباً آٹھویں امام ابن سیرین ہونگے۔ مگر ذہبی کے نزدیک اس روایت کا یہ سیاق ہی باطل ہے (میزان الاعتدال)[3] طبقات جلد ۶ صفحہ ۱۱۱ [4] اس کے ساتھ صحیح بخاری کی یہ حدیث بھی یاد رہے "لوکنت متخذ خلیلا لا تخذت ابا بکر خلیلا" [5] جزء اول قلمی صفحہ ۲۰۰ [6] حضرت فاطمہؓ اور ان کے دونوں بیٹے روایات کے مطابق سادات جنت میں سے ہیں

بھوکے اور لاغر رہتے ہیں، امیروں کے یہاں جب وہ باریابی چاہتے ہیں تو نہیں ملتی، نازنینوں سے نکاح کا پیغام دیتے ہیں تو قبول نہیں کیا جاتا، غائب رہتے ہیں تو تلاش نہیں کئے جاتے، حاضر رہتے ہیں تو کوئی بات نہیں پوچھتا، نہ بیماری میں کوئی عیادت کو آتا ہے، نہ مرنے کے بعد ان کے جنازہ میں شرکت کرتا ہے۔"

لوگوں نے پوچھا کہ ایسا کوئی شخص ہم کو کیسے ملے؟ فرمایا کہ "ایسا شخص اویس قرنی ہے۔" لوگ بولے کہ اویس قرنی کون؟ کہا کہ "وہ بھورے بالوں والا، سرمگیں چشم ہے، درازت قد، برکشادہ، رنگ مائل بسرخی، ٹھوڑی سینے سے لگی ہوئی، نظر نیچی، دایاں ہاتھ بائیں پر رکھے ہوئے قرآن کی تلاوت کرتا ہے، اور اپنے نفس پر روتا ہے، دو سے تیسرا لباس نہیں، ایک کملی تہ بند، ایک کملی رداء، زمین میں گمنام ہے مگر آسمان میں مشہور۔ اگر وہ اللہ پر قسم دلائے تو اللہ اس کو ضرور پوری کر دے، ہاں یاد رکھو اس کے مونڈھے کے پیچھے ایک چمکتی ہوئی سفیدی ہے۔ قیامت کے دن جب نیک بندوں سے کہا جائے گا کہ جنت میں جاؤ اویس کو حکم ہوگا، ٹھہر جاؤ اور سفارش کرو، اس کی شفاعت سے ربیعہ اور مضر جتنے لوگوں کو اللہ بخش دے گا[1]۔ اے عمر! اے علی! جب تم اس سے ملنا تو درخواست کرنا کہ تمہارے لئے وہ مغفرت کی دعا کرے۔"

یہ دونوں حضرات اس کے بعد بیس سال تک اویس کی تلاش میں رہے، یہاں تک کہ خلیفۂ ثانی نے اپنی زندگی کے آخری سال میں حج کے موقع پر خود یمنی قبائل میں جا کر آواز لگائی کہ تم میں قبیلۂ مراد کا اویس نامی کوئی آدمی ہے؟ یہ سن کر ایک بڈھا شیخ لمبی داڑھی والا اٹھا اور کہا کہ ہم اویس کو تو نہیں جانتے البتہ میرا ایک بھتیجا اس نام کا ہے لیکن وہ گمنام اور بے مایہ ہے، یہ رتبہ نہیں رکھتا کہ امیر المومنین کے پاس اسکا ذکر ہو، وہ ہمارے اونٹ چرانے کو لے گیا ہے۔

حضرت عمرؓ نے پوچھا "کہاں ملے گا؟" بولا کہ میدان عرفات میں جہاں پیلو کا جنگل ہے۔ یہ سنکر حضرت عمر اور علی دونوں اونٹ پر سوار ہولے، اور تیزی کے ساتھ وہاں پہنچے، دیکھا کہ وہ شخص ایک درخت کے سایہ میں نماز پڑھ رہا ہے، اور اونٹ ارد گرد چر رہے ہیں[2]۔

ان لوگوں نے جاتے ہی سلام کیا۔ اویس نے نماز کو ختم کیا اور جواب دیا۔ "وعلیکم السلام۔" ان لوگوں نے پوچھا "تم کون ہو؟" کہا "اونٹوں کا چرواہا، اور ان کے مالکوں کا نوکر۔" بولے کہ "ہم نام پوچھتے ہیں۔" کہا کہ "عبداللہ۔" فرمایا کہ "آسمان اور زمین کی کل چیزیں 'عبداللہ' ہیں۔ ہم کو تمہارا وہ نام دکار ہے جو تمہاری ماں نے رکھا۔" کہا کہ "اس سے کیا مقصد ہے؟" فرمایا کہ "نبی صلی اللہ علیہ سلم نے ہم سے اویس قرنی کے اوصاف بیان کئے تھے جن میں سے بھورے بال اور سرمگیں آنکھیں تو ہم دیکھ رہے ہیں، اب تمہارے بائیں مونڈھے کے نیچے کوئی چمکتی ہوئی سفیدی ہو تو ہم کو دکھلا دو۔ اگر ہوگی تو تم وہی شخص ہو۔" اویس نے مونڈھا کھول کر دکھایا، سفیدی نظر آئی، ان دونوں حضرات نے لپک کر اس کو چوم لیا، اور کہا کہ "بے شک تم ہی اویس قرنی ہو، ہمارے لئے مغفرت مانگو، اللہ تمہاری مغفرت کرے گا۔"

اویس نے کہا کہ "میں استغفار میں کسی کو مخصوص نہیں کرتا نہ اپنے کو نہ اولاد کو نہ اولاد آدم میں سے کسی اور کو بلکہ جمیع مومنین و مومنات مسلمین و مسلمات کے لئے خواہ بر میں ہوں یا بحر میں مغفرت طلب کرتا ہوں۔ پھر کہا، اللہ تعالیٰ نے میرا حال تو آپ دونوں حضرات پر ظاہر کر دیا، اب آپ اپنی بھی تعریف فرمائیے" حضرت علیؓ نے کہا کہ "یہ امیر المومنین عمر ہیں اور میں علی بن ابی طالب" یہ سن کر اویس سرو قد کھڑے ہو گئے، سلام کیا اور کہا کہ "اے امیر المومنین، اللہ تعالیٰ آپ کو اس امت کی طرف سے، اور اے علی! آپ کو اپنی ذات کی طرف سے جزائے خیر عطا کرے۔" حضرت عمر نے فرمایا کہ "تم اسی جگہ رہو، میں مکہ میں جاتا ہوں اور تمہارے خرچ کے لئے کچھ عطیہ اور پہننے کے لئے کپڑا لاتا ہوں، دیکھو اسی جگہ ملنا۔" اویس نے جواب دیا کہ "میں ملنے کا وعدہ نہیں کرتا، اور آج کے بعد پھر آپ کی اور میری ملاقات بھی نہ ہوگی۔ مجھے عطیہ کی کیا ضرورت ہے اور میں کپڑے لے کر کیا کروں گا، میرے جسم پر کملی تہ بند اور کملی رداء ہے، میرے پاؤں میں تسمہ دار جوتیاں ہیں، اور چرائی کی مزدوری میں چار درہم بھی ملتے ہیں یہ کافی ہیں، اے امیر المومنین! میرے اور نیز آپ کے آگے ایسی پرخطر گھاٹی ہے جس کو وہی پار کر سکتا ہے جو لاغر میان، سبک بار اور جست گام ہو، اس لئے بوجھ ہلکا رکھئے، اللہ آپ پر رحم کرے۔"

---

[1] ربیعہ اور مضر دو نامی عدنانی قبائل ہیں، جن کی تعداد بڑی ہے اور جن کی شاخیں حجاز سے نجد تک پھیلی ہوئی ہیں۔ فارسی تذکروں میں ہے کہ ربیعہ اور مضر کی بھیڑوں کے رونگٹی کے برابر اس امت کے اشخاص کو بخش دے گا۔ کاش، یہی صحیح ہو کہ اس سے تقریباً ساری امت کی بخشش ہو جائے گی، اس لئے کہ ان قبائل کے پاس کثرت سے بھیڑیں تھیں۔

[2] بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ اسکے اونٹوں کو فرشتہ چراتا ہے۔ یہ صحیح مسلم اور اسد الغابہ میں آیا ہے کہ برص کا داغ باقی رہ گیا تھا لیکن اردو تذکروں میں اسکے برخلاف یہ تصریح ہے کہ یہ برص کا داغ نہیں تھا۔

حضرت عمرؓ نے جب یہ بات سنی تو اپنا دُرّہ زمین پر مارا اور چلا کر رو دیئے کہ "کاش، عمر کی ماں عمر کو نہ جنتی، کاش وہ بانجھ ہوتی، اور......." اس کے بعد اویس سے کہا کہ "امیر المومنین آپ روانہ ہوں تو میں اس طرف جاؤں" حضرت عمر مکہ کی سمت چلے، اویس اونٹوں کو ہانکتے ہوئے ان کے مالکوں کے پاس لے گئے، چرواہے سے معافی چاہی، اور عبادت میں مصروف ہوگئے۔

ابن سعد نے اسیر بن جابر کا یہ بیان لکھا ہے کہ کوفہ میں ایک محدث کے پاس ہم حدیث سننے کے لئے جمع ہوتے تھے۔ جب فراغت ہو جاتی تو سب لوگ چلے جاتے، صرف چند آدمی رہ جاتے تھے جن میں ایک شخص تھا جو ایسی باتیں کرتا تھا کہ دوسروں کے منہ سے میں نے نہیں سنیں۔ میرے دل میں اس کی محبت پیدا ہوگئی۔ ایک بار کئی روز تک میں نے اس کو حلقہ میں نہ دیکھا، اپنے ساتھیوں سے پوچھا کہ فلاں شخص جو اس اس صفت کا جو ہماری جماعت میں شریک تھا وہ کہاں ہے؟" ایک نے کہا کہ "میں جانتا ہوں اس کا نام اویس ہے" میں نے کہا کہ "تم اس کی منزل سے بھی واقف ہو۔؟" کہا "ہاں" میں اس کے ساتھ گیا، حجرہ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ اندر سے نکلے میں نے کہا کہ "برادر آپ کیوں نہیں حلقہ میں آئے؟" بولے کہ "میرے پاس کپڑے نہیں ہیں" میں نے دیکھا کہ ان کے ساتھی ان پر آوازہ کستے اور ان کا مذاق اڑاتے تھے میں نے ان کو اپنی چادر دی اور کہا اسکو پہن لو، جواب دیا کہ "میرے ساتھی جب اس کو میرے بدن پر دیکھیں گے تو ہنسی اڑائیں گے اور ستائیں گے" میں نے اصرار کرکے وہ چادر ان کو دے دی، جب وہ نکلے تو ان کے رفیق ہنسے اور کہا کہ "آج یہ چادر تم نے کہاں سے اڑائی ہے؟" انہوں نے آکر اس کو اتار دیا اور کہا کہ "تم نے دیکھ لیا" میں نے جاکر ان لوگوں کو سختی سے ڈانٹا اور کہا کہ "اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟ انسان کبھی برہنہ رہتا ہے، کبھی کپڑے پہنتا ہے"۔

اتفاق ایسا ہوا کہ اسی درمیان میں کوفہ سے ایک وفد حضرت عمرؓ کی خدمت میں گیا جس میں ایک شخص ان لوگوں میں سے بھی شامل تھا جو اویس سے تمسخر کرتے تھے، حضرت عمرؓ نے ان سے دریافت فرمایا کہ "تم میں سے کوئی قرن کا باشندہ ہے؟" وہ شخص جاکر سامنے کھڑا ہوا۔ انہوں نے کہا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ایک شخص تمہارے پاس یمن سے آئے گا، وہاں اس کی ماں کے سوا اور کوئی اس کا نہ ہوگا اس کا نام ہے "اویس"۔ اس کے بدن میں سفید داغ تھے، اللہ سے اس نے دعا کی کہ ان کو دور کردے، چنانچہ وہ جاتے رہے، صرف ایک درہم کے برابر داغ باقی رہ گیا ہے سو تم میں سے جو کوئی اس سے ملے اپنی مغفرت کی دعا کرائے"۔

حضرت عمرؓ نے کہا کہ جب وہ شخص آیا میں نے اس سے پوچھا کہ "کہاں گھر ہے؟" بولا "یمن" پوچھا "نام کیا ہے؟" کہا "اویس" دریافت کیا کہ "وطن میں کس کو چھوڑا؟" جواب دیا "صرف اپنی ماں کو" پوچھا کہ "کیا تمہارے جسم پر سفید داغ تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے تمہاری دعا سے دور کر دیا" بولا کہ "ہاں" میں نے کہا کہ "میرے لئے مغفرت کی دعا کرو" اس نے پہلے کہا کہ "مجھ جیسا شخص آپ جیسے بزرگ اور امیرالمومنین کے لئے مغفرت کا طالب ہو؟" پھر میرے لئے مغفرت کی دعا کی، میں نے کہا کہ "تم میرے بھائی ہو، میرا ساتھ نہ چھوڑنا لیکن وہ غائب ہوگیا، اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ تمہارے ساتھ کوفہ میں ہے" یہ سن کر وہ شخص جو اویس کی ہنسی اڑاتا تھا امیرالمومنین سے کہنے لگا کہ "ہم میں تو ایسا کوئی آدمی نہیں ہے" عمرؓ نے فرمایا "ضرور ہے" اس نے جواب دیا کہ "ہاں ایک آدمی اس نام کا ہے لیکن اس سے ہم مذاق کرتے رہتے ہیں" امیرالمومنین نے فرمایا کہ "اس سے ملنا، اگر مجھے امید نہیں کہ تم اس کو پاؤ گے"۔

جب وہ شخص کوفہ میں واپس آیا اپنے گھر میں جانے سے پہلے اویس کے پاس حاضر ہوا۔ انہوں نے کہا کہ "یہ تو تمہارا دستور نہ تھا" بولا کہ "میں نے امیرالمومنین سے تمہاری نسبت ایسی ایسی باتیں سنیں، اب تم میرے لئے مغفرت کی دعا کرو" اویس نے کہا کہ "بشرطیکہ تم میرے ساتھ تمسخر چھوڑ دو اور جو کچھ حضرت عمرؓ سے سن کر آئے ہو اس کا کسی سے تذکرہ نہ کرو" پھر اس کے واسطے استغفار کیا۔

اسیر بن جابر کہتے ہیں کہ اس کے بعد کوفہ میں شہرت ہوگئی میں ان کے پاس گیا اور کہا کہ "یہ کیسی عجیب غریب باتیں تمہاری نسبت مشہور ہو رہی ہیں" بولے کہ "میری طرف سے تو کوئی بات پھیلائی نہیں گئی ہے ہر شخص کو اس کے عمل کا بدلہ ملے گا" دوسرے سال اشراف کوفہ میں سے ایک شخص حج کے موقعہ پر حضرت عمرؓ سے ملا۔ انہوں نے اس سے اویس کی بابت پوچھا، کہا کہ "میں نے ان کو اس حال میں چھوڑا تھا کہ ان کے پاس کچھ نہ تھا اور وہ بالکل بے مایہ تھے" حضرت عمرؓ نے وہی باتیں جو اس سے پہلے کہی گئی ہیں بیان فرمائیں، اور اس شخص کو ترغیب دلائی کہ ان سے مغفرت کی دعا کرائے، جب وہ واپس آیا تو اویس سے مغفرت کی دعا کا طالب ہوا تو انہوں نے کہا کہ "تم ایک متبرک سفر سے واپس آئے ہو، حق تمہارا ہے کہ دعا کرو" پھر اس سے پوچھا کہ "کیا تم عمرؓ سے ملے تھے؟" اس نے کہا "ہاں" اس پر حضرت عمرؓ کے لئے بھی مغفرت کی

دعا کی، اور اس کے واسطے بھی۔ لوگوں میں اس کا چرچا ہونے لگا، اس وجہ سے وہ کوفہ سے چلے گئے۔

ایک بار قبیلۂ مراد کا ایک شخص ان کے پاس آیا، پوچھا کہ "اویس کیا حال ہے؟" بولے کہ "اس شخص کا کیا حال پوچھتے ہو جو صبح ہوتی ہے تو شام کی امید نہیں رکھتا اور شام ہوتی ہے تو صبح کی۔ موت کی یاد مومن کے دل میں کوئی خوشی نہیں چھوڑتی اور حقوق اللہ کی معرفت سے کوئی درہم و دینار اس کے پاس نہیں رہتا اور اس کے احکام پر قائم رہنے سے کوئی دوست بھی باقی نہیں رہ جاتا، کیونکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے لوگ ہم کو اپنا دشمن سمجھنے لگتے ہیں، اور نافرمان بندے ان کی مدد پر کھڑے ہو جاتے ہیں، اسی کی بدولت بڑی بڑی تہمتیں انہوں نے مجھ پر لگائیں لیکن پھر بھی میں امر الٰہی کی بجا آوری سے باز رہنے والا آدمی نہیں ہوں۔"

ابن زید کہتے ہیں کہ اویس کی عبادت بھی غیر معمولی تھی، کبھی کہتے کہ یہ سجدہ کی رات ہے اور تمام شب سجدہ میں گذار دیتے اور کبھی کہتے رکوع کی رات ہے، اور تمام رات رکوع میں رہتے۔ ہر شام کو جو کچھ کھانا یا کپڑا ان کے گھر والی بچتا صدقہ کر دیتے، پھر کہتے کہ اے اللہ اگر کوئی بھوکا مرے یا ننگا رہے مجھ پر اس کا مواخذہ نہیں۔

مغیرہ کہتے ہیں کہ اویس قرنی اپنے کپڑوں کو خیرات کر دیا کرتے تھے، یہاں تک کہ اپنے حجرہ میں برہنہ بیٹھے رہتے تھے اور کوئی کپڑا ان کے پاس نہیں بچتا تھا جس کو پہن کر جمعہ میں شریک ہو سکیں۔

حلیۃ الاولیاء میں یہ مرفوع روایت بھی درج ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "میری امت میں ایسے لوگ ہیں جو عریانی کی وجہ سے مسجد میں نہیں آسکتے، بوجہ اس کے کہ وہ فقرا کے سوال پر اپنے کپڑے بخش دیتے ہیں، ان میں سے اویس قرنی اور فرات بن حبان ہیں۔"

ہرم بن حبان بیان کرتے ہیں کہ "جب میں کوفہ میں پہونچا تو میرا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ اویس سے ملوں، تلاش کرتے ہوئے فرات کے کنارے گیا، دیکھا کہ اپنے کپڑے دھو رہے ہیں، میں نے علامات سے پہچان لیا، چہرہ گندم گوں، گھنی داڑھی، رعب دار صورت، سلام کیا اور ہاتھ بڑھایا۔ انہوں نے مصافحہ سے انکار کیا۔ مجھے ان کا حال زار دیکھ کر رونا آگیا، پوچھا کہ اے اویس تمہارا کیا حال ہے؟" کہا کہ "اے ہرم تم کو میرا نام کس نے بتایا؟" میں نے کہا "اللہ نے، اور آپ نے مجھے کیسے پہچان لیا کیونکہ اس سے پہلے کبھی کی شناسائی نہ تھی۔" بولے "میری روح نے تمہاری روح کو پہچان لیا، اور میری جان تمہاری جان سے ہمکلام ہوئی جسم کی طرح روح میں بھی جان ہے اور مومنین روح الٰہی کے وسیلہ سے باہم شناسائی رکھتے ہیں گو ان کے درمیان بعد مکان اور دوری منزل حائل ہو۔"

پھر میں نے کہا کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث روایت کرو، تاکہ میں اس کو یاد رکھوں۔" فرمایا کہ "مجھے دیدار نصیب نہیں ہوا، ہاں ان لوگوں سے ملا جو آپ کی صحبت میں بیٹھے تھے اور ان کے توسط سے وہ حدیثیں بھی سنیں جو تم لوگ سنتے ہو۔ لیکن میں محدث نہیں، اور نہ قاضی و مفتی بننا چاہتا ہوں مجھے میرے نفس کا شغل ہی بہت ہے۔"

میں نے کہا "تو پھر کتاب اللہ کی کوئی آیت ہی سنائیے، اور کچھ وصیت فرمائیے۔" انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور فرات کے کنارے چلے اور کہا کہ میرے رب کا قول ہے اور اسی کا قول حق ہے، میرے رب کی حدیث ہے اور اسی کی حدیث سچی ہے، میرے رب کا کلام ہے اور اسی کا کلام بہتر ہے۔ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ اِنَّ یَوْمَ الْفَصْلِ مِیْقَاتُھُمْ اَجْمَعِیْنَ ۔ یہ پڑھ کر اس طرح روئے، کہ مجھ کو گمان ہوا کہ ان کو غشی آگئی، پھر انہوں نے اس کے آگے کی آیت پڑھی اور میری طرف دیکھا اور کہا کہ "اے ہرم! تیرا باپ مرگیا اور تو بھی عنقریب مرے گا، پھر جنت میں جائے گا یا دوزخ میں، آدم بھی مر گئے، حوا بھی مر گئیں، ابراہیم خلیل الرحمٰن بھی، موسیٰ بھی، اور محمد بھی جن پر اللہ کی سلامتی ہو، ابوبکر خلیفۃ المسلمین بھی مر گئے اور میرے بھائی میرے دوست اور یار حضرت عمر بھی۔ ہائے عمر، ہائے عمر، ہائے عمر۔"

ہرم کہتے ہیں کہ یہ حضرت عمر کی خلافت کا آخری زمانہ تھا، میں نے کہا کہ "وہ تو نہیں مرے ہیں بلکہ زندہ ہیں" کہا کہ "نہیں مر گئے۔ اللہ نے ان کی موت کی خبر مجھ کو دے دی۔" پھر انہوں نے دعا کی، اس کے بعد فرمانے لگے "اے ہرم! میں تم کو کتاب اللہ کی وصیت کرتا ہوں اور موت کو یاد دلاتا ہوں۔ اسے کبھی نہ بھولنا، جب واپس جانا تو اپنی قوم کو بھی سکھانا اور اپنی جان پر زحمت اٹھانے میں دریغ نہ کرنا، جماعت کا ساتھ ہرگز نہ چھوڑنا ورنہ دین ہاتھ سے جاتا رہے گا، اور تمہیں خبر بھی نہ ہوگی، اور جب تم مرو گے، تو قیامت کے دن دوزخ میں جانا ہوگا، پھر منہ اوپر کو اٹھایا اور کہا کہ اے اللہ! اس کا خیال ہے کہ یہ میرے ساتھ خالص تیرے لئے محبت رکھتا ہے اور اسی وجہ سے ملنے آیا ہے اس کو جنت میں داخل کرنا کہ وہاں بھی میری زیارت کو آئے، اس کو

تھوڑی دنیا پر رضامند رکھنا اور قناعت دینا اور نعمتوں کا شکرگزار رہنا۔ اے ہرم الوداع خدا حافظ۔ آج کے بعد پھر میں تم کو نہ دیکھوں کہ تم میری جستجو میں ہو، نہ میری بابت کسی سے سوال کرنا، میں تم کو یاد رکھوں گا اور انشاء اللہ تمہارے حق میں دعا کرتا رہوں گا" یہ کہہ کر وہ میرا ساتھ چھوڑ کر ایک طرف نکل گئے۔ اس وقت سے پھر نہ میں نے ان کو دیکھا نہ ان کی خبر سنی"[1]

حافظ ابونعیم، عبداللہ بن سلمہ کی روایت لکھتے ہیں کہ حضرت عمر کے عہد میں ہم آذربیجان کی جنگ میں گئے تھے، اویس بھی ساتھ تھے، واپسی پر بیمار ہوئے ہم نے ان کو سواری پر اٹھا لیا۔ آخر وہ گزر گئے۔ جہاں ان کی نعش اتاری وہاں دیکھا کہ ایک قبر کھدی ہوئی ہے اور پانی اور حنوط موجود ہے۔ نہلا کر نماز جنازہ پڑھی اور دفن کر دیا۔ جب آگے بڑھے تو خیال کیا کہ ان کی قبر پر کوئی نشان بنا دیں پلٹ کر آئے تو نہ وہاں قبر تھی نہ اس کا کوئی اثر[2] اسی کے بعد وہ ایک دوسری روایت لکھتے ہیں کہ اویس جنگ صفین میں موجود تھے۔

امام ذہبی بھی فضیل بن عیاض سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمر نے جب کہ وہ مقام منیٰ میں منبر پر تھے، اہل یمن کو پکارا۔ وہ لوگ جا کر سامنے کھڑے ہو گئے، پوچھا کہ "کیا تم میں کوئی شخص اویس نامی ہے؟" ایک نے جواب دیا کہ "ایک دیوانہ شخص اس نام کا ہے جو صحرا و بیابان میں پڑا پھرتا ہے۔" کہا کہ "میں اسی کو پوچھتا ہوں، جب تم واپس جانا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اور میری طرف سے سلام پہونچا دینا" جب ان لوگوں نے جا کر اویس کو سلام پہنچایا تو انہوں نے کہا کہ "امیر المومنین نے میری تشہیر کر دی" اس کے بعد غائب ہو گئے۔ حضرت علی کے عہد میں ظاہر ہوئے اور جنگ صفین میں ان کے ساتھ شرکت کی اور اسی میں شہید ہوئے۔ دیکھا گیا تو جسم پر چالیس سے زیادہ زخم تھے[3]

ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے کہ اویس ثقہ ہیں گو ان سے کوئی حدیث مروی نہیں۔ امام بخاری نے اپنی تاریخ میں اویس کو باصطلاح محدثین "فی اسنادہ نظر" کہہ کر مجروح کیا ہے۔ اس پر امام ذہبی میزان الاعتدال میں لکھتے ہیں کہ اویس نے تو کوئی روایت ہی نہیں کی ہے جو ان کے ثقہ یا غیر ثقہ ہونے کی بحث اٹھائی جائے۔ اگر امام بخاری نے ان کو ضعفاء میں نہ لکھا ہوتا تو میں قطعاً ان کا ذکر ہی نہ کرتا کیونکہ وہ اولیاء و صادقین سے ہیں۔

بعض لوگ ابراہیم بن ادہم کے وجود کی طرح اویس کے وجود کے بھی منکر ہیں، کیونکہ ان کی قوم مراد سے جب اویس کی بابت سوال کیا گیا تو انہوں نے اپنے قبیلہ میں کسی ایسے شخص کے وجود سے انکار کیا۔ امام ابواسحاق اور عمرو بن مرۃ سے بھی جب دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ ہم اویس کو نہیں جانتے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ بھی ان کے وجود کے منکر تھے اور فرماتے تھے کہ ایسا کوئی شخص نہیں گزرا ہے۔

امام ذہبی لکھتے ہیں کہ اویس کی اس قدر شہرت ہے کہ ان کے وجود میں شک کی گنجائش نہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ علم عدم علم پر مرجح ہے ممکن ہے کہ ان منکرین کو ان کی بابت علم نہ پہونچا ہو۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ تمام روایات جو اویس کے متعلق مذکور ہوئیں باہم متضاد اور بوجہ ضعف یا مجہولیت رواۃ کے غیر موثق ہیں، اور درایتاً مجہولیت اور اختلاق کے آثار ان پر اس قدر ہویدا ہیں کہ کسی برہان یا حجت کی حاجت نہیں۔ صرف اسیر بن جابر والی روایت اصولاً قوی ہے، کیونکہ تین طرق سے صحیح مسلم میں مروی ہے۔ لیکن ائمہ حدیث میں ان کا نام ہی محل بحث ہے کہ اسیر ہے یا یسیر اور ابن جابر ہے یا ابن عمرو، پھر امام ابن حزم نے تصریح کی ہے کہ وہ قوی راوی نہیں ہیں۔ ایسی حالت میں امام مالک کا انکار کچھ معنے رکھتا ہے۔ خاص کر اس وقت جبکہ خود اویس کی قوم بھی انکاری ہے۔

صوفیوں میں ایک فرقہ اویسیہ تھا جو حضرت اویس کی طرح نبوت سے بلا واسطہ فیض حاصل کرنے کا مدعی تھا۔ اکثر اس میں صاحب حال ہوتے تھے، جو وجد میں رقص کرتے تھے، مگر تھوڑی ہی مدت میں یہ طائفہ ختم ہو گیا۔

---

[1]: حلیۃ الاولیاء جلد اول قلمی صفحہ ۲۲۰۔ [2]: میزان الاعتدال میں امام ذہبی نے بھی ایک روایت لکھی ہے کہ اویس نے غزوہ آذربیجان میں انتقال فرمایا اور ان کے ہمراہی ان کو قبر کھودنے کے لئے ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ اولاً تو اس بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے قبر ڈھونڈی تھی نہ کہ بنا کو بنوں سے۔ ثانیاً اگر امام ذہبی اور حافظ ابونعیم کی روایتیں تسلیم کی جائیں کہ حضرت اویس نے جنگ آذربیجان میں جو ۲۲ھ میں حضرت عمر کے عہد میں ہوئی تھی انتقال فرمایا تو جنگ صفین میں جو ۳۷ھ میں ہوئی وہ کیسے شریک ہو سکتے تھے۔ [3]: صحابہ کرام میں سے حضرت عمار بن یاسر جن کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی "تقتلہ الفئۃ الباغیۃ" حدیثوں میں وارد ہے، جنگ صفین میں حضرت علی کے ساتھ تھے اب یہ روایت اویس بن علی اس حدیث سے ثابت ہو گا کہ تابعین کے سرتاج اولو علی حال حضرت اویس بھی شریک تھے جن کی وجہ سے بعض حق پسند شاہی گروہ میں آکر شامل ہو گئے تھے۔ میزان الاعتدال میں انہیں لوگوں کا تذکرہ ہے جن پر کسی نہ کسی حیثیت سے جرح وارد ہوئی ہے۔

احمد علی

اُردو کی ابتدا کا تمدّنی پس منظر

پروفیسر احمد علی کا یہ مقالہ ان کی نئی کتاب (ORIGIN, SOURCES AND NATURE OF URDU POETRY) کا پہلا باب ہے۔ کتاب کے دوسرے ابواب بھی بالاقساط ناظرین کی خدمت میں پیش کئے جائیں گے۔ آئندہ کے بابوں میں موصوف نے اردو شاعری اور اس کی متعلقہ روایات سے متعلق بعض بصیرت افروز بحثیں کی ہیں۔ اُمید ہے کہ یہ کتاب اردو کے تنقیدی ادب میں ایک نمایاں اضافہ کرے گی۔ —————— مدیر

اُردو کے ارتقا کا سُراغ لگانے نکلئے تو اس کی ابتدائی منزلوں کے نشان ساتویں اور آٹھویں صدیوں میں ملتے ہیں جب عرب، ایران، یورپ اور ایشیا میں اسلام کے عروج اور تبلیغ کے ساتھ ساتھ پرانے کلچر دم توڑ رہے تھے اور نئے کلچر پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے۔ اسلام کی آمد نے مہذب دنیا کی تاریخ اور اس کے فکر پر عدیم المثال اثر ڈالا اور مشرق و مغرب میں کلچر کے ارتقا کا رُخ یکسر بدل گیا۔ مغلوب اور محکوم قوموں کو یا تب نولی اور حاکموں نے، اسلام کی حیات بخش قوت کے آگے سر جھکا دیا۔ لڑکھڑاتی ہوئی مملکتیں اسلام کے زور کی تاب نہ لا سکیں اور تاریخ میں ایک نیا باب کھلا۔ مقدس رومی مملکت کا خاتمہ ہوا، ایران قطعی طور پر دب کر رہ گیا۔ اسلام کے پیروؤں نے ان مٹتی ہوئی چیزوں میں سے بہترین عناصر چن کر انھیں اپنا لیا۔ آریہ ورت کی فتح نے ہندوستان میں آریائی کلچر کا انداز بدل دیا اس لئے کہ اسلام ہندوستان کے باسیوں کے لئے ایسے آدرش لایا تھا جن کا اس سے پہلے وجود تک نہ تھا۔

الخوری کے فاضل مصنف ...... نے لکھا ہے کہ "جان لو کہ یہ مملکت دنیا کی دوسری مملکتوں کی طرح نہ تھی۔ بلکہ اس کی حالت آنے والی دوسری دُنیا کی سی تھی اور اس کی اصلیت یوں ہے کہ اسکا انداز نبیوں کے انداز سے ملتا جُلتا اور اسکا طریقہ پارساؤں کی زندگی کے نمونہ پر تھا —— اور اس کے مفتوح ایسے ہی تھے جیسے باعظمت شاہیوں کے مفتوح۔ زندگی کے چلن میں سختی اور کھانے پینے میں سادگی اس کا شیوہ تھا۔ ان میں سے ایک (خلیفہ عمرؓ) گلیوں میں پیدل پھرتا تھا، جسم پر گھٹنوں سے بھی نیچا لبادہ اور پیروں میں جوتے۔ اس کے ہاتھ میں ایک تازیانہ ہوتا جس سے وہ انھیں سزا دیتا جو اس کے مستحق ہوتے۔ ان کی قدر ایسی ہوتی جیسی غریب سے غریب آدمی کی۔ حضرت علیؓ کو جائداد کی وافر آمدنی تھی۔ وہ ساری کی ساری آمدنی ناداروں اور محتاجوں پر صرف ہوتی تھی، اور وہ اور اُن کا گھرانا موٹے جھوٹے سوتی کپڑوں اور جَو کی روٹیوں پر گذارہ کرتے تھے۔

" جہاں تک ان کی جنگوں اور ان کی فتوحات کا تعلق ہے، لاریب کہ ان کی دلیری انھیں افریقہ لے گئی اور خراسان کی دور دراز سرحدوں تک لے گئی اور انھیں جیحون کی موجوں کے پار کیا۔"

یہ جذبہ تھا جس کے ساتھ مسلمان عرب ساتویں صدی میں عرب سے چل کر افریقہ، یورپ، مشرق وسطیٰ، مرکزی چین اور ہندوستان پر چھا گئے۔ جنگجوئی جاہلیت کے عربوں کے رگ و پے میں بسی ہوئی تھی۔ اُنھوں نے اپنی شاعری میں اس کی عظمت کے نغمے گائے تھے۔

ماضی میں انھیں صحیح رہنمائی نہیں ملی۔ اسلام نے انہیں صحیح راہوں پر لگایا۔ ان کے ارادوں میں مقصد پیدا کیا اور اس نئے جذبہ سے مملو ہو کر وہ طوفان کی طرح اُٹھے۔ بزنطینی فوجوں کو پسپا کیا، ساسانی سلطنت کو مٹا کر خاک کر ڈالا اور ۷۱۲ء تک سندھ اور اسپین کو فتح کر لیا، انکی وسیع مملکت ایک ایسی مرکزی سلطنت بن گئی جس کا اپنا مخصوص کلچر اور مذہب تھا اور تہذیب کا ایک نیا نصب العین —— اس نصب العین نے مہذب دنیا کے ہر گوشہ میں اپنی جگہ پیدا کر لی۔

مسلمانوں کی ہندوستان کی فتح سے پہلے یہاں مختلف قبیل کے آزاد تمدنوں کا دور دورہ تھا۔ موریا حکمرانوں کا سنہری عہد ختم ہو چکا تھا، اور اس وقت کلچر کی جو روایت عام تھی اُس کی بنیاد قبیلہ یا گروہ کے خاندانی

سرداروں کے لئے وفاداری کا جذبہ تھا لیکن جیسا کہ عموماً ایسے سماجی گروہوں میں ہوتا ہے، نتیجہ یہ تھا کہ لوگوں میں شخصی آزادی اور عزت نفس کا ایک بلند آدرش موجود تھا، لیکن مادی ترقی کے مقابلہ میں انکی نشو و نما میں روحانی اور اخلاقی ترقی کے آثار زیادہ تھے۔ اس لئے مسلمانوں نے جن کے دل اسلام کے جذبہ اور جوش سے معمور تھے اور جو سوسائٹی کے ایک نسبتاً بہتر جمہوری نصب العین کے پابند تھے، بڑی تیزی سے خانہ بدوش سرداروں کے غلبہ کو ختم کر دیا۔ عام طور پر عوام میں مسلمان حملہ آوروں کے خلاف کوئی جذبہ نہ تھا اور اس لئے قبیلہ کے سردار کی فوج کی شکست کے بعد عوام فوراً نئے حکمرانوں کی اطاعت قبول کر لیتے تھے۔ مسلمانوں کو اپنے نصب العین اور حکومت کے قیام میں جو کامرانی ہوئی اس میں بڑی حد تک دشمنوں کی کمزوری کو بھی دخل تھا۔

نویں اور دسویں صدی تک اسلامی تہذیب نہ صرف ہندوستان میں بلکہ یورپ اور ایشیا تک میں پھیل چکی تھی، اور سارے اسلامی ممالک میں ایک بے حد عظیم الشان کلچر ترقی کی راہیں طے کر رہا تھا ——— ایک ایسا عالمگیر کلچر جس کی تعمیر عربی، شامی، فارسی، ہسپانوی، رومی اور بزنطینی تہذیبوں سے مل کر ہوئی تھی۔ خلفائے عباسیہ کے دربار میں آزاد ذہنی تفتیش و تحقیق کا جذبہ حکمراں تھا اور علم و فن کو سوسائٹی میں بڑا اونچا رتبہ حاصل تھا۔ مسلمانوں نے یونانی کلچر کے ترکہ کو اپنایا اور ارسطوئیت اور نو افلاطونیت میں قوت فکر اور جودت ذہن کا امتزاج کر کے، جس سے ان کے کارناموں نے ایک ایسے مکمل اور متوازن فلسفیانہ نظام کی شکل اختیار کی جس کی تخلیق اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی، اس ترکے کو ترقی کی راہوں پر لگایا۔ علم و فن کو کسی تہذیب میں اتنا بلند مرتبہ حاصل نہیں ہوا جتنا خلفائے بغداد اور عروج قرطبہ کے زمانے میں۔ بادشاہ، امیر اور عامی سب یکساں طور پر شاعری، فلسفہ، سائنس، قانون اور الٰہیات کے مسائل پر اس بے تکلفی اور روانی سے گفتگو کرتے تھے۔ کوئی لاطینی کلچر اس عہد میں بھی، جب ہر دل علم کا پیاسا تھا، اس کی مثال نہیں تھی۔ اٹھارویں صدی کے ہندوستان میں جب مسلمانوں کا اقتدار کم ہو رہا تھا شہزادے، سردار، امیر اور عوام اپنے وقت کا خاصا حصہ علمی مشاغل میں صرف کرتے تھے۔ یہانتک بعض شہزادے اور امیر سائنس کے نئے رازوں کے انکشاف کی امید میں یورپ والوں کو بڑی سے بڑی تنخواہیں دیتے تھے۔ دنیا میں طب اور متعلقہ علوم کی قدر اتنی کبھی نہیں ہوئی جتنی مغلوں کے عہد میں۔

"اکثر شہروں میں طبیبوں کیلئے جاگیریں وقف تھیں تاکہ وہ بغیر کوئی فیس لئے لوگوں کی دوا دارو کر سکیں۔"[2] نہ کبھی شاعروں، مصوروں، معماروں اور موسیقاروں کی ایسی سرپرستی اور قدردانی ہوئی تھی جیسی ہندوستان اور ایران کے مسلمانوں کے عہد میں۔ حضرت محمدؐ نے فرمایا ہے کہ "جو کوئی علم کی تلاش کرتا ہے اور اسے پا لیتا ہے، اسے دو انعام ملتے ہیں۔ ایک انعام علم کی خواہش کا، اور دوسرا اس کے حصول کا۔ اس لئے اگر اسے علم حاصل نہ بھی ہو تو ایک انعام اسے مل گیا۔" ایک دوسری جگہ فرمایا ہے "جو کوئی علم کے راستے پر چلیگا، اللہ اسے جنت کے راستے کی طرف لے جائے گا، اور بے شک، ایک عالم عامی کی فضیلت ایک جاہل عابد پر ایسی ہی ہے جیسی چاند کی فضیلت سارے ستاروں پر۔"

اس کے باوجود چند ابتدائی ہجری صدیوں میں، مجموعی حیثیت سے، شاعری اور تخیلی ادب کی حیثیت ثانوی رہی۔ مسلمانوں نے یونانی کلچر کو اپناتے وقت اس کی شاعری اور ڈرامے کو قابل توجہ نہیں سمجھا۔ اور اسلام کی ترقی کے ابتدائی سو برسوں میں شاعری کا آفتاب گرہن میں رہا۔ اس بے التفاتی کی وجہ ظاہر ہے۔ عہد جاہلیت کے شعرا نے اپنے فن اور فن کی قوت سے صحیح کام نہیں لیا، اور اپنی شاعری میں جس چیز کی تعلیم دی خود اس پر عامل نہ رہے، اور اس لئے قرآن نے جھوٹے نبیوں کے متعلق کہا: "اور یہ شاعر اور ان کے پیرو وہ ہیں جو شر کی راہ پر چلتے ہیں۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں؟ اور وہ کہتے ہیں جس پر عمل نہیں کرتے؟" حضرت محمدؐ کو بھی بارہا اس بات کا اعلان کرنا پڑا کہ میں شاعر نہیں ہوں اور اسی بات کو قرآن نے بھی بار بار دہرایا "ہم نے اسے (پیغمبر اسلام کو) شاعری کی تعلیم نہیں دی۔" اور "یہ (قرآن) کسی شاعر کا کلام نہیں۔" شاعری کی طرف سے بے التفاتی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مسلمان تبلیغ، معاملات، غزوات اور بے علمی کو ختم کرنے اور علم کو عام کرنے کے زیادہ اہم اور فوری مسائل میں زیادہ منہمک تھے۔ ان کا زور عقلی علوم پر زیادہ تھا۔ ہمارے زمانہ میں بھی روس میں اور ان مقامات پر جہاں اشتمالیت کا اثر بڑھ رہا ہے یہی صورت حال نظر آتی ہے۔ لیکن اشتمالی رہنماؤں کے خلاف حضرت محمدؐ کی ذات بلند شاعرانہ محاسن سے متصف تھی۔ اس لئے انھوں نے حسن اور سچی شاعری کے ذوق کی مذمت کرنے کے بجائے اپنے پیرؤوں کو یہ تعلیم دی کہ "خدا حسن ہے اور حسن سے راضی ہوتا ہے" اور "اس کے تخت کے نیچے خزانے مستور ہیں اور ان خزانوں کی کنجیاں

1. CHRISTOPHER DAWSON: THE MAKING OF EUROPE P. 155 ED. 1935.
2. ماہ نو۔ کراچی۔ جون 1948

۲؎ سیتیر التباشرین

شاعروں کی زبانیں ہیں۔[1] اسی لئے فنون کی ترقی کا دور عہدِ عباسی (۷۵۰ء — ۱۲۰۰ء) سے شروع ہوا۔

اس سے قطع نظر، اگر مسلمانوں کی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ ان کی پرورش میں شاعری کے ایک بلند تخیل کو دخل تھا اور وہ کلچر کی صحیح قدروں سے آشنا تھے۔ ابن رشیق نے بتایا ہے کہ کس طرح عرب میں شاعروں کی عزت ہوتی تھی اور انہیں انعام و اکرام دیئے جاتے تھے۔ اس کا بیان ہے کہ "عربوں کے کسی قبیلے میں جب کسی شاعر کا ظہور ہوتا تھا تو دوسرے قبیلوں کے لوگ اس قبیلے میں آتے، اُسے مبارکباد دیتے، دعوتوں کے سامان کئے جاتے، عورتیں اور مرد گروہ در گروہ جمع ہوتے، اور اس طرح خوشی کے شادیانے بجاتے جیسے شادی بیاہ کے موقعوں پر۔ مرد اور بچے ایک دوسرے کو تہنیت دیتے ——— یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ شاعر ان سب کی عزتوں کا نگہبان تھا، وہ ایک ایسی ڈھال تھا جو ان کی نیک نامی کو توہین کے حملوں سے بچاتا تھا۔ وہ ان کے شاندار کارناموں کو زندہ رکھنے اور ان کی شہرت کو زندۂ جاوید بنانے کا وسیلہ تھا ——— اور یہ عرب ایک دوسرے کو کسی بات پر مبارکباد نہیں دیتے تھے، سوائے تین چیزوں کے ——— لڑکے کی ولادت پر، شاعر کے ظہور پر اور اونچی نسل کی گھوڑی کے بچّے پیدا ہونے پر.....۔"[2]

آنحضرت نے لبید کی شاعری کی تعریف کی اور حضرت علیؓ نے امرءالقیس کو دوسرے شعرا پر اس لئے ترجیح دی کہ وہ شاعری نہ کسی سے ڈر کر کرتا تھا نہ کسی کی تعریف کے لئے۔[3] لیکن اسلام کے ابتدائی دنوں میں شاعری کی طرف سے بے التفاتی کی وجوہ وہ نہیں تھیں جو ہمارے زمانہ میں اور شاعروں کی تعداد میں کمی یا اس کے معیار میں حسن کا فقدان سیاسی اسباب کی بنا پر نہیں تھا، بلکہ اس لئے تھا کہ لوگوں کے ذہن قدرتی طور پر شاعری کی طرف سے آسودہ تھے۔ اسی طرح کے جذبات تھے جن کے ماتحت لبید نے قبولِ اسلام کے بعد شاعری ترک کر دی۔ اس کے الفاظ ہیں کہ "خدا نے اس کے بدلے میں مجھے قرآن دیا ہے"۔[4] یہ صورتِ حال اس وقت تک باقی رہی جب تک فارسی اثر نے اپنا پورا غلبہ حاصل نہیں کر لیا اور عجمی زبان بولنے والے زیادہ لوگ دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہوئے۔ اس کے بعد شاعری کو پھر قبولِ عام حاصل ہوا۔

بلند شاعری یا امن اور سکون کے زمانوں میں پروان چڑھتی ہے، جب لوگوں کو اپنے کارناموں اور زندگی کی عظمتوں کا احساس ہوتا ہے اور یا ایسے دنوں میں جب قومی اور معاشی بحران کی سختیوں سے ان کے ذہن اور تخیل تکلیفوں کے احساس سے بیدار ہوتے۔ ایسے ہی زمانوں میں شاعر اور مفکر حسن اور صداقت کے مسائل کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ اسلام نے انہیں یہ دونوں دولتیں دی تھیں اور اس لئے انہیں فطرت یا آرٹ میں ان کی جستجو کی ضرورت نہیں تھی۔ علم کی پیاس ان میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ اس پیاس کو انھوں نے جی بھر کے بجھایا۔ ان کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اسلام اور یونانی فلسفے کے درمیان توازن اور ہم آہنگی پیدا کرنے کا تھا۔ اس مسئلہ نے ذات مطلق سے متعلق طرح طرح کے مسائل کی راہیں کھول دیں، تلاش شروع ہو چکی تھی۔ طالیس اور فیثا غورث اور مسلمان صوفیوں اور فلسفیوں نے انہیں شاعری کا زرکار راستہ دکھایا۔

یونانی فکر اور اسلام کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش سے سائنٹفک عقلیت اور تشکک کا جو جذبہ پیدا ہوا، اس نے اور عباسی عہد کے تصنع اور تکلف نے مل جل کر مجاہدانہ احتیاط پسندی کا خاتمہ کر دیا۔ ترک، سلجوق اور مغل جیسی نئی نئی قومیں اسلام کے پرچم کے سایہ میں آئیں اور غزنہ، ایران، ایشیائے کوچک اور ہندوستان کو فتح کیا۔ اس سے گو اسلامی تمدن کی وحدت کی ضرور کمی آئی۔ لیکن اسلام کی عظمت میں نمایاں اضافہ ہوا۔ نئے فکر اور نئے فن نے شعر و فن کی قدردانی کی۔ اور ایرانی عہد میں مسلمانوں نے اس میدان میں جو کارنامے دکھائے وہ اپنی عظمت میں یونان کے ہمسر ہیں۔ فارسی شاعری کو عربی شاعری کی دولت ترکہ میں ملی اور آگے چل کر مشرق و مغرب کے بہترین فکر و تخیل نے اسے اور بھی مالامال کیا۔

انہیں اثرات کے تحت، اور اسلام کی ہندوستانی فتوحات کے سایہ میں جب تمدن کے دو بڑے دھارے ایک دوسرے میں مل رہے تھے ——— ایک ہندی اور ہندوستانی اور دوسرا اسلامی اور بین الاقوامی ——— اُردو پیدا ہوئی، اور ساتھ ہی مصوّری، معماری، رقص اور کلاسکی موسیقی کے مختلف ہند اسلامی انداز۔

خریداروں سے

۱- اگر آپ "ماہِ نو" کے خریدار ہیں تو خط و کتابت کرتے وقت ہمیشہ اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔

۲- ہمارے پوسٹ بکس ۵۱ کراچی کمشا کانی ہے۔

1. ANCIENT ARABIAN POETRY P.XVII.

2. A LITERARY HISTORY OF THE ARABS — R.A. NICHOLSON

یزدانی ملک

جلوس

اس روز کا جلوس حسینؓ حسینؓ کے نعروں سے گونجتی ہوئی فضا انسانیت کے مصلحِ اعظم کی یاد کا جلوس۔ روتے پیٹتے۔ چلاتے لوگ اور مرثیہ خوانوں کی ماتمی آوازیں۔ پھول۔ سرخ دھاگے۔ کپڑے اور پھل نچھاور کرتے اور پیاسوں کو پانی پلاتے ہوئے لوگ۔ مکانوں کی چھتوں۔ دکانوں کے چبوتروں اور درختوں پر لوگوں کا اژدحام۔ چھریوں اور چاقوؤں سے اپنے آپ کو زخمی کرتے اور لہٹاتے ہوئے اس اچھے انسان کی یاد میں۔ اپنے آپ کو فنا کر دینے کے جذبہ سے سرشار۔ انسانیت کے اس علمبردار نے کیا کچھ نہ کیا۔ کون سی مصیبت نہ جھیلی۔ کون سی آزمائش میں سے نہ گزرا۔ کن کن مصائب میں وہ اور اس کے اقربا گرفتار نہ ہوئے۔ آخر یہ سب کیوں۔ محض انسان کی بھلائی کی خاطر۔ اندھیر پر روشنی کی فتح کی خاطر۔ بے آب وگیاہ میدان میں اس نے انسانیت کو بلند کیا اور دنیا گواہ ہے کہ انسانیت کا بول بالا ہوگیا۔ انسان کا سر ہمدردی اور پیار سے اونچا ہوگیا۔

اس روز سامنے کے دو منزلے مکان پر تمہاری آنکھیں کسی گم کردہ راہ کو راہ دکھاتی ہوئی مشعلیں معلوم ہو رہی تھیں جس کی وجہ سے بار بار مجھے اپنی نگاہیں اوپر اٹھانا پڑتیں۔ اور پھر ان کی تاب نہ لا کر نیچی کر لینا پڑتیں۔ تم بھی اس روز میری طرح اس عظیم الشان جلوس کو دیکھنے آئی تھیں۔ تمہاری سہیلیاں بار بار تمہیں بالکونی سے پرے ہٹا لے جاتیں۔ لیکن ہر بار ہی تم کسی نہ کسی بہانے انہیں پھر بالکونی میں کھینچ لاتیں۔ تم اور تمہاری سہیلیوں نے اس روز سیاہ لباس پہن رکھا تھا جیسے رات کے دامن میں سے نکلتی ہوئی صبح بہار۔ کیا رونق تھی، کیا گہما گہمی۔ ہر کوئی اس منظر سے متاثر معلوم ہوتا تھا۔ میرے ساتھ میرے کالج کا انگریز پروفیسر جانسن بھی تھا۔ واپسی پر بہت پژمردہ اور بجھا بجھا سا دکھائی دیتا تھا۔ میں نے سبب پوچھا تو کہنے لگا۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں بھی دو آنسو بہا لوں۔ انسانیت کے اس محسنِ اعظم کی یاد میں۔ جس کی وجہ سے آج اس مجمع کی یہ کیفیت ہے۔ بھلا کون اس سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکتا ہے۔

اور آج کئی سال کے بعد میں اس طرف آیا ہوں۔ کسی جلوس کی آواز دور سے آرہی ہے۔ "یا علی مدد" "جو بوئے سو نہال" کے نعروں سے فضا پھٹی پڑتی ہے۔ مکانوں کی چھتوں پر اینٹوں کے ڈھیر جلوس کا خیر مقدم کرنے کو تیار ہیں۔ جلوس بڑھتا چلا آرہا ہے۔ ٹوٹے ہوئے بند کے پانی کی طرح۔ بپھرتا، پھنکارتا اور اپنے جلوس انسانی لاشوں کے ساتھ آگ کے شعلے اور دھوئیں کے بادل اڑاتا عالی شان عمارتوں کو پیوندِ زمین کرتا موت کا ناچ ناچتا۔ یہ جلوس قدیم مصری فراعنہ کی موت کا سا جلوس۔ "مار دسالے کو" "یا علی مدد"۔ "جانے نہ پائے"۔ "جو بوئے سو نہال"۔ ہر طرف تباہی و بربادی کا نقشہ ہے۔ آگ کے شعلے اور ان کی لحظہ بہ لحظہ بلند ہوتی ہوئی زبانیں ہر اک شے کو چاٹتی اور ختم کر رہی ہیں۔ میں نے میدانِ جنگ بھی دیکھا ہے، وہاں مردہ ساتھی کو فوراً دبا دیتے ہیں تاکہ دشمن کو اس سے ہمدردی نہ پیدا ہو۔ لیکن یہاں اسے کندھوں پر لئے پھرتے ہیں۔ اس پہ پھول نچھاور کرتے ہیں۔ اس کی بہادری کی داستانیں بیان کرتے ہیں اوروں کو اس جیا بنانے کے لئے۔

میں تو ادھر آتا بھی نہ تھا۔ لیکن جانسن جو کہ ہماری کمپنی میں اب ایک افسر ہے کہنے لگا۔ چلو میرے ساتھ چلو۔ دیکھنا کہ تمہاری طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا۔ موٹر کے آگے اس نے یونین جیک لگا دیا۔ موٹر جس طرف سے گذرتی۔ لوگ جھک کر سلام کرتے اور راستے سے الگ ہٹ جاتے۔ ان کے چہروں سے اک عجیب اضطراب ٹپکتا۔ ایسی کیفیت جیسے کہ اپنے دھوکا دے گئے ہوں۔ اس ماہی گیر کی طرح جس کی تمام پونجی سمندر کی بے رحم لہریں بہا لے گئی ہوں۔ اور وہ کنارے پر کھڑا کچھ سوچ سکے اور نہ کر سکے۔ میں جانسن کے ساتھ اس فوجی موٹر میں بیٹھا اردگرد کا جائزہ لے رہا ہوں۔ جانسن خاموش ہے لیکن کبھی کبھی ایک فاتحانہ نظر میری طرف بھی پھینک دیتا ہے۔ جیسے کہہ رہا ہو بس دیکھ لیا نہ۔ اپنی دونوں پارٹیوں کا اثر۔ ان کی اپیلیں سن کر یہ لوگ ایک دوسرے کا اور لیا وا سر پھوڑتے ہیں اور ہمارا کیا ہے ہم تو جا رہے ہیں ہماری بلا سے۔ لیکن تم جو آزادی آزادی کے گیت الاپا کرتے ہو، دیکھ لی نہ اس کی جھلک۔ ابھی پوری تصویر تمہارے سامنے آئے گی، ذرا جگر تھام کے دیکھنا۔ وہ سامنے دیکھتے ہو ایک لوجلی لاش آنے والے دور کی پیشگوئی کر رہی ہے اسے اس سے کیا کہ آئندہ کیا ہوگا اس کے لئے تو سب کچھ بیت چکا اور پھر آئندہ بھی کیا خبر ہے کہ تم لوگ کتوں کی طرح آپس میں نہ لڑو گے۔

ماہِ نو۔ کراچی۔

اردگرد تباہی ہی تباہی ہے۔ جلے ہوئے مکانات۔ مسمار شدہ عمارتیں، رُکے ہوئے راستے۔ گلی سڑی انسانی لاشیں۔ پیٹرول اور مٹی کے تیل سے انسانی گوشت کے جلنے کی ایک عجیب سی بُو۔ روم بھی جب جلا تھا تو شاید یونہی جلا تھا۔ نیرو اس تمام منظر کو دیکھ کر قہقہے لگاتا تھا۔ آج بھی نیرو خوش ہے۔ قہقہے لگا رہا ہے۔ جانسن زیرِ لب مسکرا کر پھر سنجیدہ سا بن جاتا ہے۔ شاید سوچ رہا ہے کہ روس نے جرمنی کے حملے کے پیشِ نظر بھی تو سارٹھ پونگ کی پالیسی اتنی شدت سے نہ اختیار کی تھی۔ کسی کی آمد ہے۔ یہ سب کچھ کیوں تباہ کیا جا رہا ہے۔ یہاں کون آئے گا۔ یہ کس بات کا پیش خیمہ ہے۔

انسان فطرتاً تغیر پسند ہے۔ ایک حالت میں ہمیشہ رہ ہی نہیں سکتا۔ اس نے کبھی من و سلویٰ کو ٹھکرا دیا تھا۔ آج روٹی کے ٹکڑے کے لئے ذلیل و خوار ہے۔ تبدیلی کے لئے طرح طرح کے جواز اور خوبیاں تلاش کرتا ہے۔ امن سے تنگ آ جاتا ہے تو ہلاکو اور چنگیز سے بھی بڑھ کر تباہی مچاتا ہے۔ ایٹم بم جیسی ہلاکت خیز شے کے استعمال سے نہیں چوکتا۔ اور جب جنگ سے بھی اُکتا جاتا ہے تو امن کے بلند بانگ دعوے کرتا ہے۔ امن کی محرابیں اوجِ ثریا سے جا ملاتا ہے۔ امن۔ ابدی امن۔ لیکن پھر وہی چکر۔ امن۔ جنگ اور امن۔

میں اور جانسن اس مکان کی چھت پر لیٹے اس بازار اور اردگرد کی اشیاء کا جائزہ لے رہے ہیں۔ قبرستان کی سی خاموشی طاری ہے۔ سناٹا جو کسی شہر پر بمباری سے پیشتر ہوا کرتا ہے۔ جلتی اور گرتی ہوئی عمارتیں۔ ان میں ہزاروں ہی انسان زندہ دفن۔ انسان ہیں۔ ہندو مسلمان۔ جانسن مجھ سے کہا کرتا ہے کہ یہ لوگ، انسان تو ہرگز نہیں ہیں۔ انسانیت کی لاش تو ہر دم یہ کندھوں پر اٹھائے پھرتے ہیں۔

جانسن پھر کسی گہری سوچ میں غرق ہے۔ شاید سوچ رہا ہے کہ یہ لوگ آخر آپس میں کیوں لڑتے ہیں۔ بے خبری میں ایک دوسرے کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دینا۔ آخر کیوں۔ یہ لڑائی کیوں۔ چین میں۔ یونان میں۔ فلسطین میں اور اب یہاں۔ بڑی لڑائیاں تو بڑی بڑی طاقتوں کے خلاف لڑی جاتی ہیں۔ لیکن یہ لڑائی جھگڑے کس کے خلاف ہیں۔ اور تمہاری ہیلی سا ہلکے سبز رنگ کا دوپٹہ اور اس پر سفید ستارے، جیسے سمندر کی لہروں پہ سورج کی منعکس شعاعیں۔ اب بھی میری نگاہوں کے سامنے ہے۔ وہ سامنے کچھ لوگ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ گلی میں بڑھ رہے ہیں۔ یہ انھوں نے دیوار پر کوئی سیاہ اور تپلی سی شے پھینکی۔ دیا سلائی جلائی کہ جانسن کی

گولی نے انہیں جا لیا۔ چار میں سے تین وہیں ڈھیر ہو گئے۔ اور ایک گولی کا دائمی نشان لئے سامنے کی گلی میں غائب ہو گیا۔ بزدل، بھگوڑے جانسن کہتا ہے۔ اگر ان لوگوں نے لڑنا ہی ہے تو ایک ہی دفعہ کیوں لڑ نہیں لیتے۔ اپنے اپنے دل کا غبار نکال کیوں نہیں لیتے۔ سفید چہرے اور سیاہ گولی کو دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ ان کے ہاتھ شل اور زبانیں گنگ کیوں ہو جاتی ہیں۔ بجلی کی بتی کی بکھرتی ہوئی شعاعیں دیکھ کر تمہارے ہاتھ میں وہ موتیا کا ہار یاد آ رہا ہے جو تم نے ذوالجناح پر پھینکنے کے لئے پکڑ رکھا تھا۔ سڑک کی یہ بتی ان لاشوں پر روشنی کے ہار نچھاور کر رہی ہے لیکن وہ اوندھے منہ پڑے ہیں روٹھے ہوئے سے چہروں پر اک حسرت سی لئے۔

وہ سامنے حوا کی بیٹیوں کے مکانات ہیں جو کہ بلاتفریقِ مذہب و ملت خادمِ خلق تھیں کسی منچلے نے جلا ڈالے ہیں۔ وہ قالین بھی اب راکھ کا ڈھیر ہو چکا ہوگا جس پر کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے طلائی خلخالوں والے نازک و نفیس پاؤں ایسے پڑتے تھے جیسے گلوں پہ شبنم۔ وہ صراحی جس نے کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے خُم کے خُم لنڈھائے ہوں گے بھی کسی کونے میں پڑی رو رہی ہوگی۔ اور وہ جامِ بلوریں بھی کسی طرف پڑا سسکیاں لے رہا ہوگا۔ وہ بڑے میاں۔ بھی اب راکھ کا ڈھیر ہو گئے، جو کہ ابھی اپنی سارنگی سمیت بڑھ بڑھ کر دادِ عیش دے رہے تھے۔ اور جن کے سفید ریش سے پُر چہرے پر مسکراہٹ ایسے آتی تھی جیسے ہتھیلی پہ راکھ رکھ کر پھونک مار دی جائے۔

شہر میں ہر طرف سناٹا ہے۔ خاموشی۔ ماتمی خاموشی۔ لیکن چھاؤنی میں گوروں کی بھرمار ہے۔ سڑکوں پر، ہوٹلوں میں۔ باغوں میں کلبوں میں ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے بارش کے بعد یہ سفید سفید حشرات الارض اَن گنت تعداد میں باہر نکل آئے ہوں

مرغے بنے ہوئے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے۔ بعض دفعہ بغل میں کوئی چتکبری مرغی دبائے اس تمام کشت و خون سے بے نیاز اپنے گمگم رہے ہیں۔ مجھے آج صبح کے اپنے اخبار والے کے الفاظ یاد آ گئے۔ وہ آج بہت دیر سے اخبار لایا تھا۔ خود ہی وجہ بیان کرتے ہوئے کہنے لگا۔ صاحب کیا کریں، ایک تو ان دنوں اخبار ہی دیر میں چھپتا ہے۔ دوسرے مالک کا حکم ہے کہ گوروں کی نئی بریگیڈ میں اخبار پہلے پہنچایا جائے۔ ہر روز یہاں گوروں کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا ہے۔ سالے عیش کریں گے۔ کچھ روز یہاں سڑکوں پر گشت میں مصروف ایک دوسرے کو غلیظ گالیاں بکتے ہوئے ملیں گے

(Scorched-earth Policy) سے
-ماؤنو کراچی

فوج سے ریٹیر شدہ ہندوستانی اور اینگلو انڈین لڑکیوں کا جو پار جو کہ مدھم پڑ گیا تھا پھر چمک جائے گا۔ اور اب سب خوش ہیں۔ کیا ہندو، کیا مسلمان، کیا سکھ۔ اخبار والا تو چلا گیا لیکن میں دیر تک سوچتا رہا کہ معمولی سا واقعہ بیان کرتے ہوئے کیسے پتہ کی بات کہہ گیا ہے کمپنی کا عہدِ حکومت بھی تو ایسا ہی ہوگا۔ سب طرف گوروں کی بھرمار۔ اور بڑے بڑے فوجی افسر۔ وائسرائے اور گورنروں کے جلیل القدر عہدوں پر فائز۔

میں نے جانسن سے پوچھا کہ یہ وائسرائے لگاتار فوجی افسر ہی کیوں آرہے ہیں۔ کیا سول کی طرف تمام مدبر اور روشن دماغ لوگ ختم ہوگئے۔ جانسن خاصا پڑھا لکھا آدمی ہے۔ اور ہے بھی شریف ہی۔ کہنے لگا۔ سول کی طرف تو ایک سے ایک بڑھ کر مدبر موجود ہے۔ لیکن اس وقت مصلحت یہی ہے کہ اعلیٰ فوجی افسر ہی وائسرائے اور گورنر بنا کر بھیجے جائیں۔ یہ "ویول" کو جانتے ہو۔ یہ وہ بوڑھا جرنیل ہے جس نے کہ حبشہ میں مٹھی بھر فوج اور ڈمی ٹینکوں سے اٹلی کی ایک بھاری فوج کو نیچا دکھا دیا۔ انہی شاطرانہ چالوں میں اور بھی آنکھ مچولی کھیلتے اس کی عمر گذری ہے تم دیکھ ہی چکے ہو، اس نے تمہارے ہاں کی سیاسی پارٹیوں کو کیسے فریب اور جُل دیا۔ اور کوئی لائق سے لائق مدبر بھی اس وقت یہ کام نہ کر سکتا۔ اور اب یہ "مونٹ بیٹن"۔ یہ سفید سانپ جس نے کہ جاپانیوں جیسی چست اور مکار قوم کو ایسا جکڑا کہ انہیں سب کھایا پیا اُگلتے ہی بنی۔ اب ذرا دیکھنا اس کے ہتھکنڈے۔

وہ سامنے چیخیں اور کراہیں پھر بلند ہو گئی ہیں۔ شاید اس ہیبتناک آگ کی لپیٹ میں کوئی اور گھر آگیا ہے۔ آگ بجھانے والے انجن پانی پھینکنے میں مصروف ہیں۔ مگر وہ آگ ہی کیا جو قابو میں آجائے۔ اس کے شعلے جانسن کے چہرے پر عجیب و غریب نقوش بنا رہے ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا۔ جانسن جب تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ گے تو کیا یہاں سے تمہارا تعلق ہمیشہ کے لئے ٹوٹ جائے گا۔ جانسن کے چہرے پر ایک طنز آمیز مسکراہٹ کھلنے لگی۔ کہنے لگا۔ لڑکی جب بیاہی جاتی ہے میکے سے رخصت ہو کر سسرال چلی جاتی ہے۔ تو کیا اس کے پھر میکے آنے کی تمام اُمیدیں منقطع ہو جاتی ہیں۔ اپنے ہی ہاں کے رسم و رواج کو لو۔ جہاں کہ لڑکی اور داماد سے رشتہ کبھی ٹوٹتا ہی نہیں۔ ہر تہوار کے موقع پر لڑکی۔ داماد اور ان کے بچوں تک کے لئے کپڑے، لتے اور مٹھائیاں بھیجی جاتی ہیں اور اصرار کیا جاتا ہے کہ آپ سے ملے ایک عرصہ ہو گیا۔ کچھ دنوں کے لئے آؤ اور مل جاؤ۔ اور میرے ذہن میں وہ سامنے کی چیخیں اور کراہیں پھر اُجاگر ہو گئی ہیں۔ لڑکی کی رخصتی کے وقت چیخیں اور کراہیں۔ شکستِ رفاقت کا احساس۔ رندھے ہوئے گلے۔ بچوں۔ بوڑھوں پر رعشہ کی سی کیفیت طاری۔ لڑکے والوں کے ہنستے اور مسکراتے چہرے۔ مونچھوں کے تناؤ۔ ٹوپیوں کا ٹیڑھا پن اور کچھ ساتھ لے جانے کا احساس۔

اور جانسن کہنے لگا ہم اپنے پیچھے اپنے یہ بھائی بند۔ یہ مور کی چال چلنے والے کوّے، یہ ہمارے خونی رشتہ دار پیچھے بھی تو چھوڑ چلے ہیں۔ یہ ہماری جگہ پُر کرتے رہیں گے۔ اور ہماری یاد ان کے وجود سے تازہ ہوتی رہے گی۔ مجھے اپنے ساتھ ہی کے مکان کی وہ بوڑھی کھوسٹ۔ یوریین نما عورت یاد آگئی، جو کہ ایک لمبی چوڑی کوٹھی میں اکیلی ہی رہا کرتی ہے اور کہا کرتی ہے۔ نا ہیں۔ نا ہیں کالا آدمی کو ہم کوٹھی کرایہ پر نہیں دے گا۔ صاحب لوگ کو دیگا۔ ولایتی صاحب کو۔

وہ سامنے کی دکان کے نیچے سے محلّے کے تمام کتّوں نے مل کر ایک انسانی لاش کو باہر نکال لیا ہے اور اس کے کھانے میں مصروف ہیں بعض نے سر کی جانب سے شروع کیا ہے۔ اور بعض پاؤں کی طرف مصروف ہیں میں نے رومال نکال کر آنکھوں پر ڈال لیا۔ اور جانسن سے کہا کہ ان سالوں کو بھگاتے کیوں نہیں۔ جانسن نے گولی سے انکو بھگا تو دیا۔ لیکن کہنے لگا پھر وہی فراری کیفیت۔ تم لوگ حقیقت کا سامنا کیوں نہیں کر سکتے۔ اس لاش کو کتے نہ کھائینگے تو گِدھوں کے کام آئے گی۔ یا پھر کسی گندگی کے ڈھیر پر فضا متعفن کرنے کے لئے اسے پھینک دیا جائیگا۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

اور میرے ذہن میں گوروں کے گیت کے چند بول اُجاگر ہو رہے ہیں، جو کہ اکثر رات کو میرے کوارٹر کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ گایا کرتے ہیں۔

ہم ہندوستان سے جائیں گے۔ ہم جائیں گے انگلستان۔
ہمارا وطن۔ انگلستان۔ جان سے پیارا انگلستان۔
اس پہاڑی پر جو کہ دیودار کے درختوں میں گھری ہوئی ہے پھر کر بسائیں گے۔
اس دوشیزہ سے ملیں گے جسکی آنکھیں جھیل سے بھی زیادہ گہری ہیں۔
سکندر کا زمانہ گذر چکا چنگیز اور ہلاکو کا بھی۔
ہمارا بھی زمانہ گذر چکا۔ اب ہندوستان و پاکستان کا زمانہ ہے۔
روس کا زمانہ ہے۔ چین کا زمانہ ہے۔
اس تاریک کوٹھڑی میں رہنے والے انسان اُٹھ کہ تیرے بھی دن پھرے۔
اُٹھ اور ہمیں سلام کر۔ ہم تمہیں آزادی دئیے جا رہے ہیں۔
تیرے لئے تیرا ملک خالی کئے جا رہے ہیں۔

(بقیہ بر صفحہ [illegible])

سیماب اکبرآبادی

نشانِ راہ

محبت کی گوارائی بڑھا قلبِ شکیبا سے
تمنا کا سکوں بہتر ہے طوفانِ تمنا سے

توقع دورِ مستقبل کی بھی کیا چیز ہوتی ہے
غمِ امروز کیف اندوز ہے امیدِ فردا سے

تمہارا اور میرا ساتھ اے دُنیا پرستو کیا؟
تمہیں رہنا ہے دُنیا میں مجھے جانا ہے دُنیا سے

مری تاریکیٔ خلوت بھی وہ اِک دِن مٹا دیگا
مٹا دی جس نے دل کی تیرگی نورِ سویدا سے

گوارائی محبت میں نشاطِ غیر فانی ہے
خوشی کو کیوں بدل لوں، اپنے غمہائے گوارا سے

یہ کیسا ذوقِ جلوہ تھا نہ لی پھر جس نے انگڑائی؟
بنا اب تک نہ کوئی طور خاکِ گورِ موسیٰ سے

تصوّر سے ہو یا ہوش سے، مقصد اُجالا ہے
جلے گی کیوں مری شمعِ حرم صبحِ کلیسا سے

وضو کرتا ہے میرا ظرفِ سائلی حوضِ کوثر پر
بپاسِ خاکساری پاؤں دُھلواتا ہوں جمنا سے

ہوا تھا حسن نادم عشق بھی کچھ تو خجل ہوتا
لیا بدلہ نہ کیوں یوسفؑ نے دامانِ زلیخا سے

ندیدوں کی طرح ساغر پہ جھک کر میں نہیں پیتا
اٹھا کر سر، پیا کرتا ہوں مینائے ثریا سے

کبھی شاید وہ آجائیں تماشائے جنوں کرنے
اگر وحشت اجازت دے تو گھر اچھا ہے صحرا سے

کرے توہینِ جلوہ طالبِ جلوہ کی، ناممکن
کوئی پتھر گرا ہوگا فرازِ طورِ سینا سے

کریں شکوہ نہ اہلِ خلد، خالی ہاتھ آنے کا
یہی کیا کم غنیمت ہے کہ لوٹ آیا ہوں دنیا سے

مری تقلید اے سیماب ہے تدبیرِ منزل کی
نشانِ راہ ملتا ہے مرے نقشِ کفِ پا سے

مرزا جعفر علی خاں اثرؔ

غزل

تمنّا تھی کہ اُن سے دردِ دل کی داستاں کہتے
وہ سننے آئے ہیں تو لڑکھڑاتی ہے زباں کہتے

ستمگارو ان اشکوں کو، ہنسی جن کی اُڑاتے ہو
نظر ہوتی جو پھولوں میں، "چمن سازِ خزاں" کہتے

دلِ ناشاد ہوتا سلسلہ جنبانِ بے تابی
جو ہم بالفرض کچھ کہتے، باندازِ فغاں کہتے

وفورِ شوق کی ہنگامہ آرائی، معاذ اللہ
کسی کا آستاں ہوتا، اُنھیں کا آستاں کہتے

نیازِ عشق تھا جب تک حریفِ نازِ محبوبی
وہ ہم سے بدگماں ہوتے، ہم اُنکو بدگماں کہتے

نہ تھا محدود پہلے اس قدر ذوقِ پرافشانی
چمن کیسا دو عالم کو ہم اپنا آشیاں کہتے

ہمارے ظاہر و باطن میں یک سوئی نہیں ورنہ
جو ہم کہتے وہی مل کر زمین و آسماں کہتے

نہ سمجھا اپنی فطرت کو نہ جانا اپنی عظمت کو
اِسی انسان کو ورنہ نشانِ بے نشاں کہتے

خدا کے واسطے انصاف کر اے روٹھنے والے
نہ کہتے سرگزشت اپنی اگر تجھ سے، کہاں کہتے

صبا انگڑائیاں لیتی، فضا سرشار ہو جاتی
چمن میں جب گلوں سے ہم تمہاری داستاں کہتے

غضب اک صبر تھا، مارا پڑا بیکار حجت میں
جسے میں جور کہتا، وہ وفا کا امتحاں کہتے

کلیجہ تھام لیتے ہو اثرؔ اب، کیا وہی تم ہو؟
غمِ دل جو برائے لذتِ کام و دہاں کہتے

احمد ندیم قاسمی

صوبہ سرحد کا ادبی ماحول

(ابتدائی تاثرات)

جب اوّل اوّل میں نے احباب کی ایک محفل میں پشاور جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ تو ہر طرف سے تجویزوں، مشوروں اور نصیحتوں کی بارش ہونے لگی ۔ "پشاور آب و ہوا کے لحاظ سے ہندوستان بھر میں بے نظیر ہے" — "پشاور کے پھلوں سے خوب فائدہ اٹھانا" — "تمہیں ایک ایسے طبقے کے مطالعہ کا موقعہ مل رہا ہے، جس کے متعلق ادب میں کچھ نہیں لکھا گیا" — "پشاور کی مرغن غذاؤں سے بچے رہنا، جسے یہ غذائیں راس آجائیں وہ ہٹا کٹا لال سرخ ہو جاتا ہے، اور جسے یہ نعمتیں موافق نہ آئیں، وہ کچھ عرصے کے بعد کسی نہ کسی سینیٹوریم کا رُخ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے" — میں نے یہ باتیں نہایت غور سے سُنیں، اور پھر منتظر رہا، کہ کوئی صاحب ایسی بات بھی کہیں، جو میرے نزدیک آب و ہوا، پھلوں اور مرغن غذاؤں سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے، خصوصاً ایک ادب دوست انسان کے لئے، — مگر میری تمنا تشنۂ تکمیل رہی — مجھے کسی نے یہ نہ بتایا کہ پشاور کا ادبی ماحول کیسا ہے؟ وہاں کی ادبی محفلوں کے کیا انداز ہیں، وہاں کے شعراء و ادبا اپنی زندگی کو محض شعر و ادب کے لئے وقف کئے ہوئے ہیں، یا انسانیت کا سدھار اور نکھار بھی انکے مدنظر ہے، وہاں کے اہل قلم سیاسی تحریکوں اور سماجی بوالعجبیوں سے متاثر ہو کر ادب سے پروپگنڈا کا کام لیتے ہیں، یا ان کا وجدان اور احساس اور خلوص انہیں شعر کہنے اور دیگر ادبی اصناف میں قلمکاریاں کرنے پر مجبور کرتا ہے، فارغ بخاری اور ضیا جعفری کے اسمائے گرامی کے سوا میں کسی شاعر، افسانہ نگار یا نقاد کا نام تک نہیں جانتا تھا، اور میں اکثر حیران ہوا کرتا تھا، کہ جب پنجاب کے روزانہ اخباروں میں آئے دن پشاور کی ادبی محفلوں کی روداد یں شائع ہوتی ہیں، تو ان محفلوں نے اپنے ہونہار فن کاروں کو سرحد میں کیوں محدود کر رکھا ہے، سرحد کے لکھنے والے اردو ادب کے وسیع میدان میں کیوں نہیں اترتے، اور یہ کیا سبب ہے کہ پنجاب کے اسقدر قریب ہونے کے باوجود سرحد میں ادبی چہل پہل مفقود ہے۔

میرے ذہن سے چپکا ہوا یہ سوالیہ نشان میرے پشاور میں قدم دھرتے ہی استعجاب کا نشان بن گیا، اور اچانک مجھ پر یہ حقیقت کھلی، کہ ضیا جعفری اور فارغ بخاری کے علاوہ یہاں سلجھے ہوئے شعراء اور ادبا کی ایک خاصی تعداد موجود ہے، جو سوچ سمجھ کر لکھتے ہیں لیکن سوچے سمجھے بغیر اپنی تخلیقات کو بیاضوں میں بند کر کے رکھ دیتے ہیں، سرما کی طویل راتوں میں نہایت بے تکلفانہ اور گھریلو ماحول میں ادبی اجلاس برپا کئے جاتے ہیں، مقالے پڑھے جاتے ہیں، افسانے سنائے جاتے ہیں، نظمیں گائی جاتی ہیں، تلخ و شیریں قہوے کے دور چلتے ہیں، ادبی نوک جھوک ہوتی ہے، جلسہ گاہ کی چار دیواری میں فنونِ لطیفہ کی روح انگڑائیاں لے کر بیدار ہوتی ہے، زندگی رقصاں و جولاں ہو جاتی ہے، اور محفل کے ختم ہوتے ہی اشعار بیاضوں سے چمٹے رہ جاتے ہیں، اور افسانے فائلوں میں دبکے پڑے رہتے ہیں، اور اسی لئے بیرونی دنیا اس وہم میں بدستور مبتلا رہتی ہے کہ سرحد کا خطہ ہماری عظیم الشان ادبی مہم میں ہمارا ہاتھ نہیں بٹا سکتا، فن لطافت چاہتا ہے، اور سرحد میں قوت ہے، لطافت نہیں۔

لیکن جس طرح میں پہلے عرض کر چکا ہوں، پشاور میں پہنچتے ہی میرے اکثر اوہام باطل ثابت ہوئے اور مجھے محسوس ہوا کہ اُردو زبان کی ہمہ گیری کا دعویٰ یہاں سجنے یا پھلنے نہیں پایا، اور اگرچہ یہاں کے ادب دوست حضرات کی ادبی سرگرمیاں محدود ہیں، لیکن وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنی ملکی زبان اور اسی لئے اپنے ملکی تمدن اور تہذیب کی تعمیر میں کچھ اس طرح مگن ہیں، کہ زود یا بدیر نقادانِ فن کو پشاور کے ارباب ادب کی خاموش خدمات کا بھرپور اعتراف کرنا پڑے گا۔

پشاور کے ادبی ماحول کے متعلق میں اپنے ابتدائی تاثرات کو پانچ چھ حصوں میں تقسیم کروں گا سب سے اوّل مجھے یہ کہنا ہے، کہ پشاور کے

اکثر شعرا کا رجحان غزل کی طرف ہے، میں ہمیشہ غنائی شاعری کا مؤید رہا ہوں، اور ترقی پسند دوستوں کے نزدیک میرا یہ "جمالیاتی جنون" خطرناک رجعت پسندی کا پیش خیمہ ہے، لیکن مجھے اپنے اس عقیدے پر اتنا پختہ یقین ہے کہ میں دنیا کے کسی ملک کے کسی بھی فنِ لطیف کو لطافت اور صباحت سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتا، میں تصویر کے دونوں رُخ دیکھنے کا قائل ہوں، گندگی اور غلاظت کو جزوِ زندگی سمجھتا ہوں، لیکن ادب میں زندگی کے دخل کا یہ مطلب نہیں کہ ادیب صرف غلاظت کی علامت گندگی کو ہی سچا ادب سمجھ بیٹھے۔ توانا فن وہی ہے، جو غلاظت اور کثافت کے بیان میں بھی اس پراسرار نغمگی اور اس ناقابلِ بیان اہتزاز کو قائم رکھ سکے، جس نے اب تک ادب کو انسانیت کا سب سے حسین اور کارآمد معجزہ بنا رکھا ہے۔ —— خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا، مقصد یہ تھا کہ میں غزل کا مخالف نہیں۔ بلکہ غزل کی نت نئی کروٹوں کو دیکھ کر میرا یہ برسوں کا یقین غیر معمولی طور پر مکمل ہو چکا ہے کہ اردو غزل کبھی نہیں مر سکے گی اور یہ لطیف و حسین طریقۂ اظہار کبھی زوال پذیر نہیں ہوگا لیکن پشاور کے تقریباً نصف غزل گو شعرا پرانے ڈھب سے غزل کہتے ہیں۔

پرانا ڈھب اختیار کرنا بھی کوئی گناہ نہیں، لیکن ظلم یہ ہے کہ پرانے پیکر میں روح بھی بوسیدہ و پارینہ ہی ہوتی ہے، خیالات کی ندرت مجھے پرانے انداز کی غزلوں میں بہت کم نظر آتی ہے، البتہ یہ اعتراف باعثِ مسرت ہے۔ کہ جب یہی پرانے ڈھب کے لکھنے والے نئے تقاضوں سے چونک کر اپنی غزل میں کوئی نیا خیال پیش کرتے ہیں، تو غزل میں سنئے نئے تجربے کرنے والوں کے کارنامے دھندلا سے جاتے ہیں، شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ پرانے ڈھب کے لکھنے والے حضرات بہت زیادہ مشق اور مشرقی علوم میں کافی دسترس رکھنے کے باعث خیال کے علاوہ ہیئت کا بھی لحاظ رکھتے ہیں اور ہمارے اکثر نئے لکھنے والے خیال کی جدت کے شوق میں ہیئت کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ حضرت قضا ردولی۔ شاکر بغدادی، جگر کاظمی، برق کوہاٹی، سید عاجز اور عبدالودود قمر۔ ان شعرائے کرام کی غزلیں اکثر پرانے رنگ کی ہوتی ہیں، زمینیں پرانی ہیں اور ان زمینوں میں اُگے ہوئے پیڑ سوکھے کھڑے ٹھنٹھ ہیں۔ لیکن جب یہ بادِ بہاری کے دلنواز اثرات قبول کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں، تو ان خشک پیڑوں میں کہیں کہیں نرم نرم کونپلیں سی پھوٹ پڑتی ہیں اور دیکھنے والا سوچنے لگتا ہے کہ نہیں ابھی ان کی جڑیں خشک نہیں ہوئیں، ابھی ان میں قوتِ نمو باقی ہے۔

زمانے کی رَو اس درجہ تیز ہوتی ہے کہ کئی مرتبہ پہاڑوں کو بھی راستے سے ہٹنا پڑتا ہے، اور سرحد کے یہ ادبی کوہسار زمانے کی رَو سے بہت حد تک نہ سہی ایک حد تک متاثر ضرور ہیں، لیکن نوجوان شعرا کی ایک خاصی تعداد اپنی غزلوں نئی اُٹھان اور اپنے خیالات میں ایک تازہ کروٹ کے ساتھ ہمارے درمیان موجود ہے، وہ سیاست، سماج اور فلسفہ کی بدلتی ہوئی قدروں سے متاثر ہے۔ اور اسے اس امر کا بھی احساس ہے۔ کہ اگرچہ انسان کے بنیادی جذبات و احساسات غیر متغیر ہیں، مگر ان کے اظہار کے انداز پر کوئی پابندی نہیں اور وہ پرانی شراب سے ساغروں میں ڈال کر فن کو آسودہ اور فن پرستوں کو متکیف کر سکتے ہیں۔ میرا ذاتی خیال اور ابتدائی تاثر یہ ہے کہ پشاور میں غزل کی توانائی اور غنا کی علمبرداری کے ذمہ دار سید ضیا جعفری ہیں، آپ نظم بھی کہتے ہیں غزل بھی اور رباعی بھی، آپ نقاد بھی ہیں اور شاعر بھی، آپ پشاور کی ادبی مجالس کی جان ہیں اور آپ کی شاعری سے نوخیز شعرا نے کافی اثر قبول کیا ہے، یہاں مجھے صرف ان کی غزلوں کے متعلق کچھ کہنا ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ ضیاء صاحب پر فارسی غزل کا اثر بہت زیادہ ہے، اور یہ تو مسلّمہ امر ہے کہ فارسی غزلوں کا مرتبہ اتنی صدیاں گزرنے کے بعد بھی اسی طرح بے مثل اور بے نظیر ہے یہی وجہ ہے کہ ضیا صاحب کے شعروں میں بھی سچے تغزل کی روح کارفرما ہے فارسی ان کے گھر کی لونڈی ہے، اور اردو میں انھیں مہارتِ تامہ حاصل ہے، اس لئے اس خوشگوار امتزاج نے ان کی غزلوں کو ہیئتی نقطۂ نظر سے بھی خاصے کی چیزیں بنا دیا ہے۔ اگرچہ ضیاء صاحب فراق گورکھپوری اور دیگر نوجوان شعرا کی طرح ابھی تک غزل میں انقلابی اور گہرے فکری مسائل کو کثرت سے لانے کی جرأت نہیں کر سکے، لیکن غنا جو غزل کی جان ہے، ضیاء صاحب کی غزلوں میں اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ رچی اور بسی ہوئی ہے دوسرے شاعر جناب فارغ بخاری ہیں، ان کی غزل ایک ایسے نوجوان کی غزل ہوتی ہے، جو عالمِ شباب میں اُڑانوں اور صرف اُڑانوں کا قائل ہو، اور جس کے نزدیک گہرائیوں میں اُلجھنا شباب کی توہین ہو، فارغ صاحب سنبھل کر غزل کہتے ہیں، فارغ صاحب عام غزلگوئی کی طرح اشعار کی تعداد پر جان نہیں دیتے، بلکہ مواد اور خیال کو ان کے نزدیک اولیت حاصل ہے، رضا ہمدانی صاحب زندگی کی دوسری بے شمار خصوصیتوں کی طرح غزل کے معاملے میں بھی فارغ صاحب کے ہم خیال واقع ہوئے ہیں۔ آپ کی غزل میں بھی دلآویز سنجیدگی اور بیدار احساس کارفرما ہے، شوکت واسطی صاحب نے بھی غزلیں کہی ہیں۔ اور اگرچہ وہ قدیم رنگ کے زیادہ قریب ہیں، مگر ان کا تازہ کلام بچھ کر یوں معلوم ہوتا ہے، جیسے ان کے ذہنی افق پر پھوٹ رہی ہے، اور بہ تقاضائے شباب وہ اپنے اندر ایک دلآویز انقلاب کا نشو و نما کر رہے ہیں

شاہد سیٹھی صاحب کی جتنی غزلیں میں نے سنی ہیں، وہ اکثر مرصّع ہوتی ہیں، ان کے اشعار میں کچھ ایسی پر اسرار سی لچک ہے اور خیالات میں کچھ اس نوع کا اُجالا، کہ میرے خیال میں اگر وہ چونک اور سنبھل کر غزل کہتے رہے، اور غزل میں نت نئے خیال سمونے سے نہ گھبرائے تو جدید تر غزل گو شعرا میں وہ ایک نہایت ممتاز مقام کے مالک ہوں گے۔ نظر سیٹھی صاحب کی غزلیں نئی ہیں، مگر میں نے دیکھا ہے کہ ان کے خیالوں میں ایک عجیب معصوم جھجک ہے، جیسے وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتے ہیں، مگر انہیں مذہب یا سماج یا قانون یا اپنے محبوب کا اس درجہ احترام ہے، کہ وہ کھل کر نہیں کہہ سکتے، ہلکی پھلکی اور رواں بحروں میں غزلیں کہتے ہیں اور اسی لئے ہلکے پھلکے اور رواں اشعار کہتے ہیں، لیکن اگر اس روانی میں سیلابی صورت پیدا ہو جائے تو سبحان اللہ۔ مظہر گیلانی صاحب کی غزلوں کے جو چند ایک اشعار میں نے سُنے ہیں، ان میں ایک نادر قسم کی خصوصیت محسوس کی ہے، اور وہ یہ ہے کہ ان کے طریقِ اظہار میں سرخوشی بھی ہے اور ہوشیاری بھی، لااُبالیانہ انداز میں کہتے ہیں، مگر کچھ اس ڈھب سے کہ ہوشمند بھی داد دینے پر مجبور ہو جائیں۔ عشرت سرحدی صاحب کی غزلوں میں بھی نئے آفتابوں کے طلوع ہونے کے مژدے موجود ہیں۔ لیکن میں اپنے خیال میں ان کی نظم کو غزل پر فوقیت دیتا ہوں، حفیظ اثر صاحب اور یٰسین کوثر صاحب بھی جدید غزل کے تقاضوں سے پوری طرح متاثر ہیں۔ خاطر غزنوی صاحب تو شاعری ہو یا نثر، ہر رنگ اور ہر زاوئے سے نئے ہیں۔ میرے خیال میں اگر خاطر صاحب اپنے مطالعہ کو وسیع کریں، اور اپنے باغیانہ جذبات کی باگ کو مضبوطی سے تھامے رکھیں تو وہ بہت جلد نکھر اور سُدھر کر ایک نمایاں انفرادیت کے مالک بن جائیں گے۔ غزلوں میں نئے خیالات پیش کرنے کے باوجود وہ ایسی ایسی سنگلاخ زمینیں اور ایسی ایسی پتھریلی ردیفیں منتخب کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ تو ان کے حوصلے کی داد دینی پڑتی ہے۔ کڑی ردیفیں چن کر دراصل وہ اپنے اردگرد ایک دیوار سی کھڑی کر لیتے ہیں اور اکثر اوقات یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی معرکے کی بات کہنے لگے ہیں مگر ردیف راستہ کا روڑا بن گئی۔ بایں ہمہ جب وہ صاف ستھری زمین میں طبع آزمائی کریں تو ان کے تمام جوہر، جن میں ابھرنے کی صلاحیتیں ہیں، اجاگر ہو جاتے ہیں نئے غزلگو شعرا کے اس مختصر سے تذکرے کے آخر میں مجھے دو ایسے شعرا کا ذکر کرنا ہے، جن کے دم سے پشاور کی ادبی صحبتیں آباد رہی ہیں، اور جن کی شاعری سے بیرونِ سرحد کے حلقے بھی آشنا ہیں۔ پہلے شاعر تو ہیں مرزا برلاس صاحب میں نے ان کا کلام اکثر نہایت شوق سے پڑھا ہے، اور پشاور میں آکر معلوم ہوا ہے کہ وہ اپنی غزلوں میں ہو بہو سید ضیا جعفری ہیں۔ البتہ ان کے کلام کے خرام میں لہراؤ ہے اور ضیا صاحب کی غزلوں میں لہراؤ بھی اور ٹھہراؤ بھی ——— لہراؤ کہیں خوشگوار ہوتا ہے تو کہیں لغزشوں کا پیش خیمہ بھی بن جاتا ہے، اور اسی لئے مرزا برلاس صاحب کبھی کبھی اس طرح لڑکھڑا جاتے ہیں جیسے نشے میں مدہوش کوئی حسینہ لڑکھڑائے اور کائنات کروٹ بدلتی ہوئی محسوس ہونے لگے۔ دوسرے شاعر ہیں قتیل شفائی صاحب، میرے خیال میں اس نوجوان شاعر کا مستقبل نہایت روشن ہے۔ اس کی غزلیں چھاگل کے چھناکوں اور بوندیوں کے ترنم سے چھلک رہی ہیں، اور اگرچہ صرف چھاگلیں اور بوندیاں غیر فانی غزل پیدا کرنے کی ذمہ دار نہیں۔ لیکن ابھی قتیل صاحب عمر کے اس دور میں نہیں پہنچے۔ جب پھول کو دیکھنے کے بعد یہ خیال نہ آئے کہ "تو بوئے کسے داری" بلکہ یہ کہ بے چارا پھول مرجھا جائے گا۔ قتیل صاحب کی غزلیں پاکستان گیر شہرت حاصل کر چکی ہیں۔ اگر ان کے کلام میں نے چھپنے اور ناتجربہ کاری کے چند ایک نقائص دور ہو گئے، تو اپنے رنگ میں فرد ثابت ہوں گے۔

پشاور کے یہ نوجوان اور جدت پسند غزلگو اگر یہ سمجھ گئے کہ غزل میں آفاقی خیالات بھی سما سکتے ہیں اور ذاتی احساسات کو کائناتی بھی بنایا جا سکتا ہے تو اردو غزل کی تاریخ ان کے تذکرے کے بغیر نامکمل رہے گی۔

پشاور میں مجھے ایک عجوبۂ روزگار شاعر کا کلام سننے کا اتفاق ہوا ہے یہ ہیں مضمر تاتاری صاحب۔ سنا ہے کہ وہ "اُمّی" ہیں، ابھی کچھ ہی عرصہ سے پہلے انہوں نے لکھنے پڑھنے کی طرف نامکمل سا دھیان دیا ہے، لیکن دراصل وہ اب تک "ان پڑھ" ہیں مگر یہ "ان پڑھ" شاعر اچھے اچھے پڑھے لکھے شاعروں کے مقابل لایا جا سکتا ہے۔ ان کی نظموں میں روانی، تخیل میں بلندی اور تشبیہات و استعارات میں اچھوتا پن ہے، وہی شاعری کی مثال مضمر صاحب کے پیکر میں مجسم ہو کر رہ گئی ہے، تلفظ کی جو غلطیاں وہ کرتے ہیں، انہیں نہایت فراخ دلی سے معاف کیا جا سکتا ہے، اگر مضمر صاحب واقعی اُمّی ہیں تو مجھے کہنے کی اجازت دیجئے کہ اگر یہ شترِ اسخواں پڑھا لکھا ہوتا تو اچھے اچھوں کی کرسیاں خالی کرا لیتا۔

اور آخر میں وہی دو شاعر۔ برلاس اور قتیل۔ میرزا برلاس کی نظموں کی گہری رومانیت اور قتیل کی نظموں کے موضوعات کا تنوع، بیان کی لطافت

اور خیالات کی جدت ـــــ مسلمہ حقیقتیں ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ قتیل اپنا کوئی راستہ متعین نہیں کرنے پایا۔ باوجود اس کے وہ ہر رنگ میں انفرادیت کا مالک ہے۔

قتیل شفائی، شوکت واسطی، اور خاطر غزنوی نے اردو شاعری کی ایک اور صنف میں بھی نمایاں کامیابی حاصل کی ہے، اور وہ ہے گیت۔ گیت ہر شاعر نہیں لکھ سکتا، یہ صنف انتہا درجہ کی فنی مہارت اور ذہنی ریاضت چاہتی ہے۔ سنا ہے کہ شوکت واسطی صاحب اچھے گیت لکھتے رہے ہیں مگر اب اس طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ اگر یہ بات ہے تو انہیں مجبور کرنا چاہیئے کہ وہ اس لطیف صنف سے منہ نہ موڑیں۔ قتیل صاحب تو خیر اب گیتوں کی دنیا میں بستے ہیں، اور خاطر غزنوی صاحب ـــــ میں نے دیکھا ہے کہ خاطر نظم اور غزل سے زیادہ گیت میں کامیاب ہیں۔ "اگر" وہ گھونپا کہ گھونپا چا قو ایسے بولوں سے کنول کے اس بے داغ پھول پر خراشیں نہ ڈالیں، تو وہ گیت لکھنے والوں میں بہت جلد نمایاں ہو سکتے ہیں۔ رباعی پر جو قدرت ضیا صاحب کو حاصل ہے، وہ سرحد کیا، ہندوستان کے بھی بیشتر رباعی گو شعرا کو نصیب نہیں۔ ضیا صاحب کی رباعیاں میں نے جی بھر کر پڑھی اور سنی ہیں، اور محسوس کیا ہے کہ اس نہایت دشوار مگر بہت لطیف صنفِ شعر کو ہندوستان میں ابھی قرنوں تک زندہ رہنا ہے۔ کیونکہ ایسی رباعیاں مر نہیں سکتیں۔ ضیا صاحب کی رباعیاں اکثر سے خانہ سے متعلق ہوتی ہیں، اپنی جگہ پر مکمل۔ مگر دوسرے بے شمار تقاضے ضیا صاحب کی طرف ہاتھ بڑھاتے رہ جاتے ہیں۔

پشاور کا ادبی نا. ل نظم کے لئے سازگار ہے۔ اس لئے کہ یہاں باسلیقہ اور ب... ق حضرات کی کمی نہیں۔ اور کوئی باسلیقہ اور باذوق انسان نظم کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتا۔

مگر نظم سے بھی زیادہ افسانہ کی کس مپرسی پر رحم آتا ہے، یوں معلوم ہوتا ہے، جیسے سرحد کی فضا نثر نگاری کے لئے راس ہی نہیں۔

پشاور کے ادبی ماحول میں یہاں کی ادبی مجالس کی رقابت کچھ بری طرح کھٹکتی ہے۔ بہت سی مجالس ہیں اور تقریباً ہر مجلس دوسری کی بدخواہ ہے۔ سنا ہے کہ اب یہ دشمنیاں اور چشمکیں ختم ہو چکی ہیں۔ خدا کرے یہ بات صحیح ہو۔

غزل، نظم، افسانہ، مقالہ اور ادبی مجالس کے متعلق یہ میرے ابتدائی تاثرات تھے۔ ان میں ترمیم و اضافہ کی بے شمار گنجائشیں ہیں۔ اس لئے کہ یہاں کے فن کار اچھے شاعر ہونے کے علاوہ اچھے انسان بھی ہیں ـــــ یہاں انسانیت کو تمام پہلوؤں فن کاری کے پرستاری کی بھینٹ نہیں چڑھایا گیا۔

ادیب نوگانوی

گرچہ نیست غم خوارے

بہرِ ما گرچہ نیست غم خوارے
نے سایہ درے نہ دیوارے

یہ بھی سچ ہے کہ ہیں فضا پہ محیط
شبِ تاریک و غم کے نظارے

خارزاروں سے پُر مسافتِ راہ
راہرو خستہ حال بیچارے

ہمتوں کے ہیں امتحان مگر
ہے وہی مرد جو نہ جی ہارے

بحرِ مواج سامنے ہے تو ہو
عزم موسےٰ سے کام لو بارے

راستے سے پہاڑ ہٹتے ہیں
کوئی ٹھوکر تو کھینچ کر مارے

گر زمیں پر غذا نہیں ملتی
مثلِ شاہیں بلند ہو بارے

غمکدے میں اگر ہے تاریکی
توڑ لو جا کے عرش کے تارے

آدمی کے لئے ہے شرطِ شرف
کوششِ زیست میں نہ جی ہارے

چاہتے ہو اگر ہما بننا
خوش رہو کھا کے استخواں پارے

ہو نہ غماز غم جبیں کی شکن
لاکھ سر پر چلا کریں آرے

بہرِ راحت اگر گلے خواہی
بایدت زخم خوردن از خارے

آب دیتے ہیں موتیوں کو ادیبؔ
بحرِ مواج ہی کے گہوارے

ادیب نوگانوی

تیّار کردہ چند مشہور ادویات

جو عرصہ دراز سے آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہیں

(۱) کیسٹوفین (CASTOPHENE) جلاب کی میٹھی ٹکیاں۔ قبض کشا۔ مصفّی خون۔ فرحت بخش۔ دافع بادی۔ سر درد خرابیٔ جگر۔ اعصابی کمزوری۔ پیچش کے لئے اکسیر۔ بچّوں عورتوں اور نازک طبع اصحاب کے لئے خاص طور پر مفید ہیں۔

(۲) کیپیرن	(CAPARIN)	زکام۔ سردی۔ درد سر۔ دانت درد۔ اور دیگر ہر قسم کے دردوں کے لئے مفید ہیں۔
(۳) اسپرین	(ASPERIN)	
(۴) کیفین اسپرین	(CAFEIN ASPERIN)	
(۵) پیلیکون مرہم	(PILICON OINTMENT)	بواسیر کی اکسیر دوا۔
(۶) ریڈوسہ	(REDUSA)	موٹاپا دور کرنے کی اکسیر دوا۔
(۷) کیلسیم گلوکونیٹ	(CALCIUM GLUCONATE)	ہر قسم کی جسمانی کمزوریوں کے لئے مجرب۔ بچوں اور عورتوں کے لئے خاص طور پر مفید۔

یہ مشہور ادویات ہر اچھے دوکاندار سے مل سکتی ہیں
تاجران پوری تفصیلات کے لئے براہِ راست لکھیں
واحد تقسیم کنندگان برائے پاکستان

کریسنٹ ٹریڈنگ کمپنی کیسٹوفین بلڈنگ ۱۶۶ بندر روڈ۔ کراچی

ممتاز شیریں

ناؤ میں، دو آبہ تک!

وہ کار میں وصیل کے سامنے بیٹھا غصے سے تلملا رہا تھا۔ وہ ابھی نہیں آئی۔ اس کا میک اپ کہاں ختم ہوگا۔ کولڈ کریم پھر فنشنگ کریم اور پاؤڈر اور لپ اسٹک اور روژ اور مسکرا اور کیوٹکس۔ بال بنانا، بھویں اکھیڑنا، پلکیں سنوارنا، تو یہ کس قدر نفرت انگیز! لیکن جانے کیوں وہ آننا بے بس تھا۔ اس کی گرفت میں قیدی پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا۔ کار کا دروازہ کھلا اور وہ اس کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ سرمئی زرتار ساری کی اور دو چھوٹی چھوٹی موٹی چوٹیوں کی جو گھنگریالے بادل کے خوبصورت پھول پر ختم ہوتی تھیں، ایک جھلک اسے دکھائی دی۔ اس ساری میں اور اس میک اپ کے ساتھ وہ غضب کی حسین لگ رہی ہوگی۔ لیکن اس نے آنکھیں پھیر کر اسے دیکھا بھی نہیں۔ آخر یہ بناؤ سنگار اس نے اس کے لئے تو نہیں کیا تھا۔

اس نے کار سٹارٹ کر دی۔

وہ دونوں بالکل خاموش تھے اور کار چلی جا رہی تھی۔ تین سال پہلے وہ اسی طرح پہلو بہ پہلو بیٹھے اسی کار میں گھوما کرتے تھے۔ وہ پانچ مہینے! اُف شادی سے پہلے دو مہینے اور شادی کے بعد کے تین مہینے . . . . وہ شامیں کتنی رنگین ہوتی تھیں، رنگین اور پرکیف، ایک دوسرے کے قریب پہلو بہ پہلو کار کی تیز رفتار سے خوشگوار ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے سرور حاصل کرتے محبت بھری نگاہوں کا تبادلہ کرتے، ان کے دل دھڑک رہے ہوتے، ایک دوسرے کی قربت سے ان پر نشہ سا چھایا ہوتا۔ لیکن اب وہ اسطرح قریب بیٹھے رہ کر بھی ایک دوسرے سے کتنی دور تھے۔ ان کے دلوں میں اجنبیت اور دوری کا ایک شدید احساس تھا۔ اور وہ ایک دوسرے کی موجودگی سے بے پروا، ایک دوسرے کے وجود کو فراموش کرتے ہوئے بڑھے جا رہے تھے۔ ایک ہی کار میں، لیکن ان کی منزلیں جدا جدا تھیں۔ وہ اپنے دوست کے گھر جا رہی تھی، اور وہ اپنی دوست سے ملنے۔

"اب ٹائم کیا ہے ڈارلنگ؟ میں گھڑی بھول آئی ہوں۔ آنند نے کہا تھا ٹھیک پانچ بجے پہنچ جانا۔"

پانچ میں ابھی پندرہ منٹ ہیں۔" اس نے رکھائی سے جواب دیا۔ اس کے لبوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ڈارلنگ؟ ہونہہ! یہ لفظ کیوں اٹک کر رہ گیا ہے۔ اس کو بھی کیوں نہ کاٹ کر پھینک دیا جائے .....

"تمہیں بھی سنیہہ لتا نے چائے پر بلایا ہے کیا؟"

اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ "نہیں، ہم دونوں ہوٹل میں چائے پئیں گے۔ اور پھر سینما جائیں گے۔"

"اوہ!" اس نے بے پروائی سے کہا اور کار کو باہر دیکھنے لگی۔

جب سے وہ گئی تھی، موہن نے اسے ایک نظر بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ اسے دیکھے، اس کے حسن کی ہوشربا کیفیت کو دیکھ کر یہ اندازہ لگائے کہ کس طرح اسے دیکھ کر آنند کے ہوش باختہ ہو جائیں گے۔ یہ اندازہ لگائے اور کڑھے۔

"موہن ڈارلنگ! وہ دیکھو" اس نے اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔

"کیا ہے؟" وہ بدستور سامنے کی طرف نظریں جمائے ہوئے بولا۔

"نہیں، کچھ نہیں۔"

اور پھر وہی خاموشی! . . . . . .

موہن بھی رنگیلا نوجوان تھا۔ وہ متمول تھا اور شادی سے پہلے اپنی دولت سے خوب کیف اٹھایا تھا۔ بہت سی حسین لڑکیوں کے ساتھ اس نے کھیلا تھا لیکن جب اس نے نلینی کو دیکھا۔ اس چلبلی لڑکی کو جو ہر جگہ شمع محفل بن جاتی تھی۔ ان گنت جوان اس کے گرد پروانوں کی طرح منڈلاتے رہتے وہ اپنے شعلہ بداماں حسن، اپنی عشوہ طرازیوں اور اپنی ذہانت کی مقناطیسیت سے سب کو اپنی طرف کھینچ لیتی لیکن خود الگ رہ جاتی، کسی کے ہاتھ نہ آتی۔ اور اس نے محسوس کیا، وہ اس چنچل دوشیزہ کو جسے پانے کے لئے سب بے تاب ہیں، لیکن جسے کوئی بھی نہیں پا سکتا، حاصل کرنے میں اپنا سب کچھ بازی لگا دے گا۔ اور اس نے نلینی کو پا لیا۔ اور جب اس نے اپنی شادی کی

شام سب کو اپنی خوش قسمتی پر رشک کرتے دیکھا، اپنے دوستوں کو آنکھوں میں رشک لئے، اور نلینی کے عاشقوں کو بجھے ہوئے چہروں سے مبارک باد کہتے دیکھا تو اس کا سینہ غرور سے پھول پھول گیا۔ اور اس نے محسوس کیا وہ دنیا کا کامیاب ترین اور خوش قسمت ترین انسان ہے۔

اور پھر شادی کے بعد وہ تین چار مہینے ایک کیف آور، سرور آگیں خواب کی طرح گذر گئے۔ وہ اپنی ساری عشوہ طرازیاں اس پر صرف کر دیتی۔ مختلف قسم کے بناؤ سنگار اور لباس کے ساتھ وہ ہر دفعہ ایک نئے حسن کے ساتھ ایک نئی لڑکی بن کر آتی۔ اور اس کے ہوش و حواس پر بجلیاں گرا دیتی۔ وہ اپنی محبت کا اظہار نئے نئے اندازمیں کرتی۔ اور اسے محسوس ہوتا۔ وہ نلینی سے کبھی نہیں تھکے گا، وہ اپنے تنوع کے ساتھ ہمیشہ اس کے لئے تازہ اور شگفتہ رہے گی۔ اور وہ سوچتا وہ بے وقوف تھا جو اتنی لڑکیوں کے پیچھے پھرا کرتا تھا۔ اب اسے منزل مل گئی ہے۔ وہ اب کبھی نہیں بھٹکے گا نلینی سے محبت کرنے میں ایک کیف ہے، ایک میٹھا سرور۔ اب وہ آگ تو نہیں جو وہ دوسری لڑکیوں کے لئے اور خود نلینی کے لئے پہلے پہلے محسوس کرتا تھا لیکن ایک نرم سا، میٹھا سا سرور جو اسے مدہوش کئے دیتا تھا۔ اس عورت کو پیار کرنے میں جو اس کی اپنی تھی۔ ایک الگ ہی قسم کی ایک نئی قسم کی مسرت تھی۔ اب وہ بدعنوانیوں کی طرف کبھی نہیں بھٹکے گا۔ اس کی زندگی خوشگوار اور تندرست و توانا ہوگی۔ ایک گھر، شالی بیوی، اور بچے، خوبصورت، ذہین مہذب بچے! وہ بے حد خوش تھا......

وہ غرور سے اسے ساتھ ساتھ لئے پھرتا۔ گھر میں خوب پارٹیاں دیتا تاکہ لوگ اس نایاب ہیرے کو اس کے پہلو میں جگمگاتے دیکھ کر رشک کریں اور جب وہ اس کی بیوی کی تعریف کرتے، اور تحسین آفریں نگاہیں ادھر اٹھتیں تو غرور سے اس کا سینہ پھول جاتا۔ لیکن جب وہ تحسین بھری نگاہیں بے باک ہوتی گئیں اور تعریف اس کے سامنے ہونے کی بجائے اس کی بیوی ہی سے ہلکی سی سرگوشیوں میں ہونے لگی۔ اور اس نے دیکھا ان ہلکی سرگوشیوں اور بے باک نگاہوں کی چمک سے اس کی بیوی کی آنکھوں میں بھی چمک آجاتی ہے اور اس کے چہرے پر گلابی رنگ کی چھوٹ ہوتی ہے تو وہ حسد کی جلن سے تڑپنے لگا۔ اس نے پارٹیاں بند کر دیں۔ لیکن وہ اس کے ہاتھ سے نکل چکی تھی خود ہی چلی جاتی۔ اس کے کئی دوست بن چکے تھے۔ وہ حسد اور رقابت کی آگ میں تڑپتا رہا

لیکن اس نے بیوی پر کھل کر کبھی اس کا اظہار نہ کیا۔ اس کا اظہار کرتے اسے شرم آتی تھی۔ وہ محسوس کرتا اپنی بیوی کے سامنے اس کا اظہار کرنا خود اس کی توہین ہے۔ اس نے سختی کرنی شروع کی لیکن نلینی نے اس کی بھی پروا نہ کی۔

نلینی کے دوستوں کی تعداد بڑھتی ہی گئی۔ اب وہ اس کی بالکل پروا نہیں کرتی تھی۔ اس کا ذرا بھی خیال نہیں رکھتی تھی۔ اس نے کئی دفعہ چاہا نلینی کو چھوڑ دے۔ سول میرج ہی تو تھی۔ لیکن کورٹس، بدنامی، بے عزتی اتنا بڑا اسکینڈل، اپنی پوزیشن کو اتنا بڑا دھکا۔ او خدایا، وہ بے بس تھا۔ اسے چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کی ظالم گرفت میں پھڑپھڑا رہا تھا۔ اور شکنجے کی گرفت سخت ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے ایک بے ترتیب طوفانی زندگی کے بعد سکون چاہا تھا۔ ایک پرسکون زندگی، گھر، محبت کرنے والی بیوی، بچے۔ اور اب؟ وہ گھر ہی کیسا جس سے اس کی بیوی ہی اکثر باہر رہا کرتی ہو۔ اور بچے؟ خوبصورت اور ذہین اور مہذب بچے؟ وہ شاید اس کی قسمت میں لکھے ہی نہیں۔ اسے نلینی کی اس ظاہری زندگی سے نفرت ہو گئی تھی۔ اس کی زندگی ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی اور اس زندگی سے بھاگنے کے لئے وہ پھر گندگی میں گر گیا۔ لڑکیاں اور شراب۔ لیکن اسے یہاں بھی پناہ نہیں ملی۔ اسے گناہ میں اب وہ کیف نہ ملتا تھا، جیسا شادی سے پہلے نئے نئے اندازوں میں ملتا تھا بلکہ صرف ایک نہایت عارضی لذت اور پھر اس کے بعد زندگی کی بے مزگی کا، زندگی سے بیزاری کا، نفرت کا احساس پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ اسے آ دبوچتا۔ اپنی طبیعت کے میلان سے نہیں محض اپنی بیوی سے انتقام لینے کے لئے وہ [illegible] کے پاس جاتا رہا۔ لیکن نلینی اس کی بھی پروا کرتی نظر نہ آتی تھی۔ اس کی بے پروائی کے احساس سے وہ اور بھی کڑھتا۔ اسے اس خیال سے کبھی بھی تسکین نہیں ہوئی کہ وہ اور مردوں کے ساتھ جاتی ہے تو جانے دو میں بھی تو دوسری لڑکیوں کے ساتھ..........

اب ان دونوں میں برائے نام تعلقات رہ گئے تھے۔ وہ ایک چھت کے نیچے رہتے تھے اور بس۔ دونوں کو ایک دوسرے کے متعلق سب اچھی طرح معلوم تھا۔ وہ سب کچھ علانیہ [illegible] تھے۔ بلکہ وہ کسی [illegible] کے ساتھ، ایک ہی کار میں اپنے اپنے محبوبوں کے

پاس جاتے تھے ....

اس نے نلینی کو جوش اور مسرت سے ویو آؤٹ کرتے دیکھا تو باہر نظر دوڑائی۔ آنند کچھ دور پر کھڑا تھا۔ شاید وہ اس کا انتظار کرتے کرتے یہاں نکل آیا تھا۔

"بس کار یہیں روک لو ڈارلنگ! میں یہیں سے چلی جاؤں گی۔"

اس نے مشینی انداز میں، کچھ کہے بغیر بریکیں لگا دیں۔ نلینی نے اترتے ہوئے کہا "شکریہ" اور تقریباً بھاگتی ہوئی آنند کے پاس چلی گئی۔

وہ ادھر دیکھنا نہیں چاہتا تھا لیکن اس کی نظریں خود بخود ادھر اٹھ گئیں۔ آنند سے ملتے ہوئے اس کے چہرے پر مسکراہٹ اور روشنی پھوٹ رہی تھی۔ اور وہ پوچھ رہی تھی.......

"تم یہاں کیوں چلے آئے؟ کیوں میں نے بہت دیر کر دی کیا؟"

"نہیں بالکل ٹھیک وقت پر آ رہی ہو۔ میں کیوں چلا آیا؟....."

اور آنند آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس پر جھک گیا "تمہیں دیکھنے کی بے تابی جو تھی!" اور اچانک اس کی نظریں کار کی طرف چلی گئیں۔ وہ چونکا اور شرمندہ ہو گیا "اوہ! موہن!" نلینی نے بھی ادھر دیکھا۔ پھر ایک جھٹکے سے منہ موڑ لیا گویا کہہ رہی ہو۔ "ہونہہ! دیکھے تو دیکھے میں کیا!"

اسی لمحہ اس نے کار سٹارٹ کر دی۔ اس کے سینے میں خنجر گھونپ دیا گیا تھا، شاید ساری عمر یہ درد اسے نہ چھوڑے گا۔ اس سمے اسے اپنے گرد و پیش کا بالکل احساس نہیں تھا۔ وہ یہ بھی بھول گیا وہ کہاں جا رہا ہے۔ صرف کار اسے بڑھائے لئے جا رہی تھی۔ اس نے اپنے ذہن پر زور ڈالکر سوچا۔ وہ کہاں جا رہا ہے آخر؟ اور دماغ کے کونے میں کہیں ایک نام ابھرا۔ اوہ بنیہہ لتا، اس کی نئی دوست؟ سنیما کا پروگرام تھا۔ لیکن وہ بنیہہ لتا کے ساتھ سنیما جا کر کیا کرے گا۔ لتا اس کے پاس بیٹھی اسے لبھانے کی کوشش کر رہی ہو گی۔ لیکن وہ اس کا ہاتھ پکڑے بے حس کھویا ہوا بیٹھا رہے گا......... اوہ! زندگی میں کوئی خوشی نہیں، کوئی خوشی نہیں: ....

× × × × × × × × × ×

خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھئے

زیبا ردولوی

غزل

ہجر میں عیش نظر کیا جانوں
شام کیا جانوں سحر کیا جانوں

دل ہے منزل میں نظر منزل پہ
فتنۂ راہ گزر کیا جانوں

میں غبار رہ پروانہ ہوں
منزل شمع و شرر کیا جانوں

خون کی بوند نہیں ہے دل میں
لذّتِ دیدۂ تر کیا جانوں

آہ کا فرض ادا کرتا ہوں
کب ہو ممنون اثر کیا جانوں

زعم نظّارہ نہیں ہے مجھ کو
میں حجابات نظر کیا جانوں

دل کے رستے پہ چلا جاتا ہوں
کشش عیب و ہنر کیا جانوں

سر اٹھانے کا تو مقدور نہیں
نسبتِ سجدہ و سر کیا جانوں

نگہ لطف اِدھر کیوں آئی
میں یہ انداز نظر کیا جانوں

دھیان ان کا بھی نہیں ہے زیبا
آج ہے دھیان کدھر کیا جانوں

ابن حسن برنی

سلامتی کی کونسل کا نیا رزولیوشن
اور
کشمیر میں استصوابِ رائے کا مسئلہ

اقوامِ متحدہ کی سلامتی کی کونسل کے سامنے ۱۷ اپریل ۱۹۴۸ء کو چھ قوموں کے نمائندوں نے متفقہ طور پر ایک رزولیوشن پیش کیا، جس میں یہ سفارش کی گئی تھی کہ اقوامِ متحدہ کی طرف سے ایک کمیشن کشمیر کا دورہ کرے اور وہاں اس وقت جو لڑائی ہو رہی ہے اُسے ختم کرا کے ریاست کشمیر کے مستقبل کے متعلق استصوابِ رائے عامہ کا انتظام کرے۔ اس رزولیوشن کی ۱۸ دفعات پر ایک ایک کر کے بحث کرنے کے بعد کونسل نے اس رزولیوشن کو بعض جزوی تبدیلیوں کے بعد ۲۱ اپریل کو منظور کر لیا۔ دُنیا کے مختلف حلقوں میں اس رزولیوشن پر جو اظہارِ رائے کیا گیا ہے اس سے مختلف طبقوں کے ردِ عمل کا پتہ چلتا ہے۔ انگلستان کے وزیرِ اعظم مسٹر اٹیلی نے رزولیوشن کی تعریف کرتے ہوئے اسے ہر طرح قابلِ قبول اور قابلِ عمل بتایا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں نے اپنی اپنی تاویلوں سے اس رزولیوشن کے متعلق یہ رویہ اختیار کیا ہے کہ اس میں ایک کا فائدہ اور دوسرے کا نقصان ہے۔ سیاست میں یہ اختلافات قدرتی بھی ہیں اور لازمی بھی۔ لیکن ان اختلافات سے قطع نظر اگر رزولیوشن کو غیر جانب دارانہ نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ رزولیوشن جس مقصد سے پاس کیا گیا ہے بنیادی طور پر وہ اس مقصد کے حصول میں ممد ثابت ہونے کے بجائے اس کے راستے میں رکاوٹیں ڈالتا ہے۔ کونسل نے اس مقصد کا اظہار رزولیوشن کی تمہید میں اس طرح کیا ہے۔

کونسل "شدت کے ساتھ یہ محسوس کرتی ہے کہ جموں اور کشمیر میں امن اور سکون کا فوری قیام ضروری ہے"

اور اس لئے "وہ پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کے سامنے ذیل کے طریقے پیش کرتی ہے، جن پر عمل کرنے سے کونسل کے خیال میں لڑائی بند ہو جائے گی اور اس طرح کے صحیح حالات پیدا ہو سکیں گے کہ آزاد اور غیر جانبدار استصوابِ رائے کے ذریعہ یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ کشمیر ہندوستان کے ساتھ شامل ہوگا یا پاکستان کے۔"

رزولیوشن کے ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ کونسل سب سے پہلے جموں اور کشمیر میں امن قائم کرنا چاہتی ہے اور اس کے بعد آزاد اور غیر جانبدار استصوابِ رائے کے ذریعہ اس فیصلہ پر پہنچنا چاہتی ہے کہ کشمیر ہندوستان کے ساتھ شامل ہوگا یا پاکستان کے۔

امن اور سکون قائم کرنے کے لئے رزولیوشن میں دو طریقے تجویز کئے گئے ہیں۔ پہلے میں پاکستان سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اپنے اثرات سے کام لے کر جموں اور کشمیر سے قبائلیوں کو اور ایسے پاکستانیوں کو جو لڑائی کے خیال سے ریاست میں آئے ہوئے ہیں، باہر نکالنے میں مدد دے۔ ایسے لوگوں کو ریاست میں داخل ہونے سے باز رکھے اور جو لوگ ریاست میں لڑ رہے ہیں انھیں اسلحہ مہیا نہ ہونے دے۔

اس سلسلہ میں ہندوستان سے یہ مطالبہ ہوا ہے کہ "جب کمیشن کو اس بات کا اطمینان ہو جائے کہ قبائلی ریاست سے جا رہے ہیں اور لڑائی ختم ہونے کے حالات پیدا ہو چکے ہیں تو ہندوستان کمیشن کے مشورہ سے ایسی تجویز تیار کرے جس کے ماتحت وہ جموں اور کشمیر سے اپنی فوجوں کو ہٹانا شروع کر دے، تا آنکہ ان کی تعداد صرف اتنی رہ جائے جو انتظامی امور اور قانون اور امن کے قیام کے لئے ضروری ہے۔"

ان دونوں مطالبات کے الفاظ اور ان کی نوعیت کو سرسری نظر سے بھی دیکھا جائے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ جو مطالبہ پاکستان سے کیا گیا ہے موجودہ حالات میں پاکستان کے لئے اس کا پورا کرنا نظر

مشکل بلکہ محال ہے۔ قبائلی ریاست میں اسلئے آئے ہیں کہ وہ اپنے بھائی بہنوں کو ڈوگروں کے مظالم سے نجات دلائیں۔ اسی مقصد کے لئے انھوں نے جان کی بازی کھیلی۔ انھیں پاکستان سے برابر یہ شکایت رہی ہے کہ اس نے ان کے مقصد اور تحریک کی طرف سے انتہائی بے نیازی برتی۔ ایسی صورت میں یہ سمجھنا کہ پاکستان صرف اپنی زبان ہلاکر ان جانفروشوں کو محوں اور کشمیر سے باہر نکالنے میں کامیاب ہو جائے سیاست کا تجاہلِ عارفانہ ہے۔ قبائلی (جن کے ساتھ اس وقت قبائلیوں سے کہیں زیادہ خود مقامی کشمیری بھی شامل ہیں) صرف ایک صورت میں لڑائی سے باز رہ سکتے ہیں۔ اور وہ صورت یہ ہے کہ کسی طرح انھیں یہ اطمینان ہو جائے کہ ڈوگروں کے مظالم کا خاتمہ ہو جائے گا۔ قبائلیوں اور کشمیریوں کے نزدیک دوسری اہم چیز ریاست کشمیر کے سیاسی مستقبل کا فیصلہ ہے۔ کشمیر ہندوستان کے ساتھ رہے یا پاکستان کے؟ انھیں یہ معلوم ہے کہ اس بات کا فیصلہ اب استصواب رائے عامہ سے کیا جائے گا۔ اس صورت میں انھیں اس بات کا یقین ہونا چاہئے کہ رائیں پوری ایمانداری سے اور ایسے حالات میں لی جائیں گی جن میں کسی رائے دینے والے پر کسی طرح کا دباؤ نہ ہو۔ اس کے دل میں یہ اندیشہ نہ ہو کہ کسی کے خلاف رائے دے کر مجھے کیا سختیاں جھیلنی پڑیں گی۔

اب سوال یہ ہے کہ کونسل کے نئے رزولیوشن میں استصواب رائے کی آزادی اور ایسے حالات کے قیام کا امکان کس حد تک ہے جن میں نہ کسی پر کوئی جبر ہو نہ سختی۔ رائے دینے والا سچے دل سے یہ محسوس کرے کہ میری رائے اپنی رائے ہے اور ہر بات کا فیصلہ اسی رائے پر منحصر ہے۔ وہ یہ بھی سمجھے کہ ریاست کو ہندوستان یا پاکستان میں سے کسی ایک کے ساتھ شامل کرنے کے لئے رائیں لی جا رہی ہیں، وہ اس وقت دونوں میں سے کسی ایک کے بھی ساتھ نہیں، بلکہ اسے پوری آزادی سے اس کا موقع دیا جا رہا ہے کہ اس کے رہنے والے کثرت رائے سے جو فیصلہ چاہیں کریں۔ کونسل کے رزولیوشن میں اس لحاظ سے کئی خامیاں ہیں۔

سب سے پہلی خامی استصواب کے زمانہ میں کشمیر میں ہندوستانی فوجوں کی موجودگی ہے۔ اس زمانہ میں ان فوجوں کی یہاں کی موجودگی سے دو نتیجے نکلتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان فوجوں کی موجودگی کا رائے دینے والوں پر یہ اثر پڑے گا کہ وہ کشمیر کو پہلے ہی سے ہندوستان کا ایک جزو سمجھنے لگیں گے اور دوسری بات یہ کہ پچھلے دنوں ہندوستان اور کشمیر میں ہندوستانی فوجوں کا جو رویہ اور سلوک رہا ہے اس سے عوام کے دلوں میں ان کی طرف سے ایک طرح کی ہیبت سی ہے۔ دلوں کی یہ ہیبت لازمی طور پر رائے دہندگی کے فیصلہ پر اثر ڈالے گی۔

دوسری خامی استصواب کے دنوں میں ریاست کی حکومت اور اسکے انتظام سے متعلق ہے۔ اس سلسلہ میں تجویز میں کہا گیا ہے کہ حکومت ہند اس بات کا انتظام کرے گی کہ ریاست کی حکومت ریاست کی سیاسی جماعتوں کو طلب کر کے حکومت کے کام کی ذمہ داری ان کے نمائندوں کے سپرد کریگی۔ تاکہ یہ نمائندہ حکومت استصواب کی تیاری اور استصواب کے زمانہ میں انتظام کی پوری نگرانی کر سکے۔

کشمیر میں اس وقت دو بڑی سیاسی جماعتیں ہیں۔ نیشنل کانفرنس اور مسلم کانفرنس۔ نیشنل کانفرنس کے لیڈر شیخ عبداللہ کشمیر کی موجودہ حکومت میں وزیر اعظم ہیں اور شمولیت کے معاملہ میں ان کے رجحانات ہندوستان کی طرف ہیں۔ خود ان کی اور ان کی جماعت کے ہر فرد کی کوشش یہی ہے کہ جس طرح بھی ہو کشمیر ہندوستان کے ساتھ شامل ہو۔ استصواب کی تیاری اور اس کے انتظام کے لئے سیاسی جماعتوں کے نمائندوں کی جو حکومت بنے گی اس میں قدرتی طور پر شیخ عبداللہ اور ان کی جماعت کے لوگ اسی طرح کے حالات پیدا کرنے کی کوشش کریں گے جن میں استصواب میں آرا کی کثرت ہندوستان کے ساتھ شامل ہونے کے حق میں ہو۔ ریاست میں ہندوستانی فوجوں کی موجودگی ایسے حالات پیدا کرنے میں ممد ثابت ہوگی۔

تیسرا بڑا مسئلہ یہ ہے کہ استصواب میں رائیں صرف وہ لوگ دیں جو کشمیر کی ریاست کے باشندے ہیں۔ اس معاملہ میں پہلی دقت تو یہ ہے کہ پچھلے ۹-۱۰ مہینوں کے اندر ریاست کی فوج اور پولیس کے مظالم سے تنگ آکر لاکھوں کشمیریوں نے اپنے محبوب وطن کو خیرباد کہہ دیا ہے اور اب وہ اپنے وطن سے دور مستقل طور پر پاکستان میں بسنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ سلامتی کی کونسل کی تجویز ہے کہ اس طرح کے لوگوں سے کہا جائے کہ وہ اپنے وطن واپس آکر استصواب میں حصہ لیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگ جو ہزاروں مصیبتیں سہہ کر کشمیر سے باہر جا بسے ہیں وہ محض رائے دینے کے لئے وطن واپس آنے پر آمادہ نہیں ہو سکتے۔ خاص کر ایسی صورت میں جبکہ انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ ریاست کی حکومت کی باگ ڈور انھیں لوگوں کے ہاتھ میں ہے جن لوگوں نے ان پر یہ ظلم و ستم ہوتے
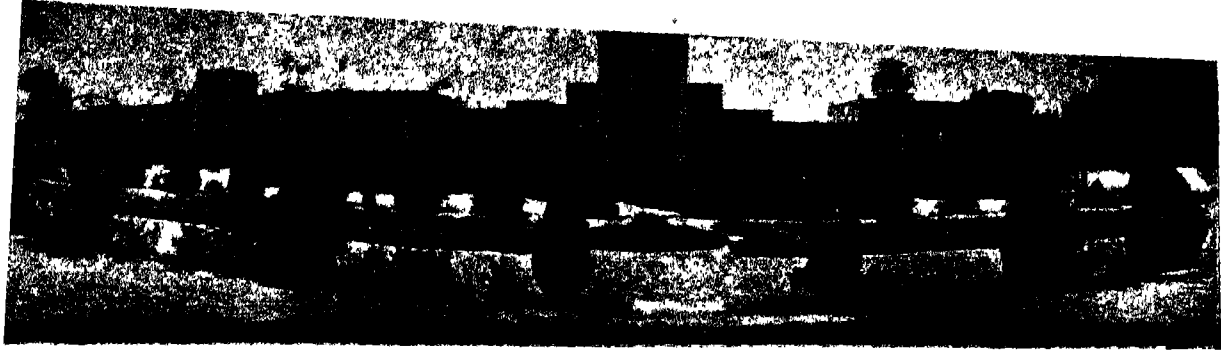
(بقیہ بر صفحہ ۵۴)

دانش کدۂ کرج ایران کے چند مناظر

دانش کدۂ کرج کی شاندار عمارت اور اس کا دلکش چمن -

طلباء کی اقامت گاہ کی خوبصورت عمارت -

شاداب درختوں کے بیچ میں دانشکدے کے مرکزی دفتر کی عمارت -

↑
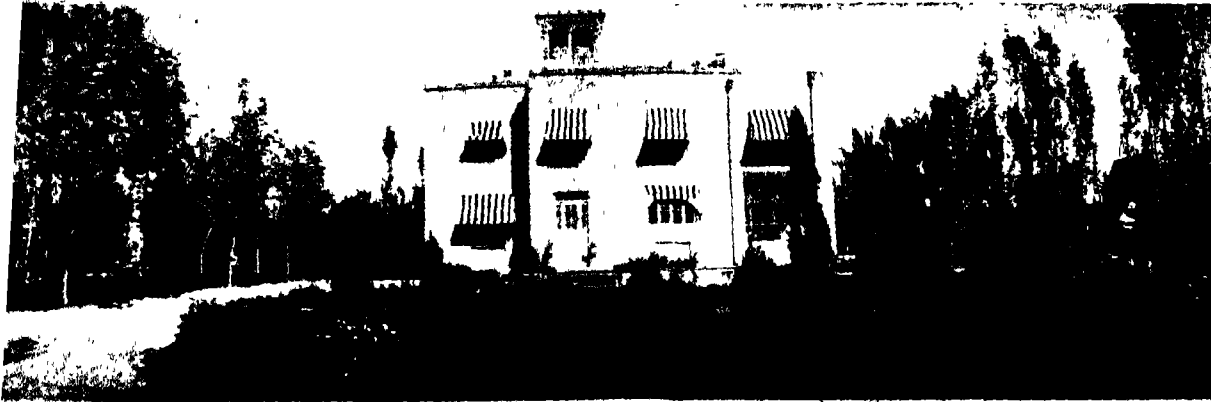
بہترین کھلاڑی خاتون انعام لے رہی ہیں ۔

(اوپر بائیں طرف) ہاکی چمپ کا انعام جیتنے والی مس گریفلن ۔

چند سربرآوردہ مہمان کھیل دیکھ رہے ہیں ۔ ←

(نیچے دائیں طرف) پاکستان کی پہلی کھیل کود کی کانفرنس کا ایک منظر ۔

ظہور احمد گولہ پھینک رہے ہیں ۔

↓

شاہی مسجد لاہور ایک نئے زاویے

عکس مصور "ماہ نو"

تابش دہلوی

عروسِ تہذیب

مرمریں جسم کو بوسیدہ لبادہ میں چھپائے — ترساں، ترساں نظر آتی ہے عروسِ تہذیب
عصمتِ نفس کے ہیں شیخ و برہمن دشمن — آج پھر جاگے ہیں پیرانِ کلیسا کے نصیب
جنسِ ناموس گرانمایۂ ہستی نہ رہی — کرچکا پردہ دری خوب ہی دیوِ تخریب

نادمیدہ سی سحر تھا کبھی فرقِ تاباں — زلف کی چھاؤں، شبِ ماہ میں دیکھا ہوا خواب
خطِ ابرو میں درخشندہ تمنا کے ہلال — گوشۂ چشم میں اُمید کے غلطاں مہتاب
لبِ میگوں میں خمستاں کے خمستاں سرشار — طرفِ عارض میں گلستاں کے گلستاں شاداب
گم شدہ جنتیں، ہر نغمۂ سرگوشی میں — ہر نفس، موجِ بہاراں متلاطم بے تاب
دوش، چھلکے ہوئے کوثر کے کناروں کی طرح — خمِ گردن، کسی سربند صراحی میں شراب
انگلیاں، بتکدۂ ناز کی روشن شمعیں — دست و بازو حرمِ حسن کے کھلتے ہوئے باب
سینہ رکھتے ہوئے طوفان کے گرداب لئے — کمر اک شعلۂ جوالہ کی پیہم تپ و تاب
ہر قدم، عہدِ گل و نغمہ کی آمد آمد — پائے رفتار میں طغیانیٔ موجِ مے ناب
قدِ موزوں میں لچکتی ہوئی شاخِ گلِ تر — مرمریں جسم برستا ہوا ایماں کا سحاب

مرمریں جسم کو بوسیدہ لبادہ میں چھپائے — ترساں، ترساں نظر آتی ہے عروسِ تہذیب
جب بھی چادر سے لوٹی گئی بیدردی سے

ایم۔ اسلم

دشمن کی بیٹی

(انقلاب ۱۹۴۷ء کا ایک افسانہ۔ نام اور مقام فرضی ہیں)

کالے کالے بادل ہر طرف چھائے تھے۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ راوی طغیانی پر تھی۔ میلوں تک پانی پھیلا ہوا تھا۔ چودھری عبداللہ خاں پانچ سات آدمیوں کے ساتھ کشتی پر بیٹھا دریا سے پار اتر رہا تھا۔ یہی فرقہ وارانہ فسادات کی باتیں ہو رہی تھیں۔ دو ملاح کشتی چلا رہے تھے۔ ایک حستو اور دوسرا اس کا بیٹا۔ حستو جو ادھیڑ عمر کا آدمی تھا کہہ رہا تھا۔

"جب چودہ برس کا تھا۔ تب سے یہ کام کر رہا ہوں۔ اب بوڑھا ہو گیا ہوں۔ تمام عمر حسرت اور افلاس میں گذر گئی۔ لیکن کسی نے کہا ہے کہ خدا جب دینے پر آتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔"

"اب تو دلدر دور ہو گئے نا؟" ایک مسافر نے کہا۔

"ہاں سب دلدر دور ہو گئے۔" حستو بانس سنبھالتے ہوئے بولا۔ "جتنا ان دو مہینوں میں کمایا ہے ساری عمر میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں ملا۔"

"دو پیسے کی جگہ دو پیسہ لیتے ہو گے؟"

"ایک روپیہ لینے سے کیا بنتا ہے۔" حستو نے سینے کے پورے زور سے کشتی کھینچتے ہوئے کہا۔ "کسی کسی روز تو میں نے ایک ایک پھیرے میں اتنا کمایا ہے جو کبھی سال بھر میں بھی نہیں ملتا تھا۔"

"پھر تو خوب لوٹا تم نے؟" ایک اور نے مسکرا کر کہا۔

"نہیں!" بوڑھے ملاح نے ہاتھ سے پیشانی پر پڑے ہوئے بارش کے قطرے پونچھتے ہوئے کہا۔ "میں نے کسی کو نہیں لوٹا۔ جب موت سامنے نظر آتی تو ہر ایک کی یہی کوشش ہوتی کہ وہی سب سے پہلے دریا سے پار اتر جائے اور ...."

"اور!" پہلے نے بات کاٹ کر کہا "تم جو کچھ پاس ہوتا دھروا لیتے۔"

"کوئی زبردستی نہیں۔ لوگ خوشی سے دیتے تھے۔" حستو ملاح نے جواب دیا۔

"مردود یہ لوٹنا نہیں تو کیا ہے؟" عبداللہ خاں نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے تمہیں مرنے کا ڈر نہیں۔"

"چودھری جی!" بوڑھے ملاح نے جواب دیا۔ "مرنا تو سب کو ہے۔ لیکن جب گنگا بہہ رہی ہو اور کوئی پیاسا چلا آئے تو دنیا یا تو اسے اندھا کہے یا بے وقوف! ساون میں جو کھیتی ہری نہ ہوئی پھر کبھی نہ ہو گی۔"

"سکھوں نے مار دھاڑ بھی تو بہت کی۔" ایک اور نے کہا۔

"مار دھاڑ کی مت پوچھو تم۔" حستو بولا۔ "صبح سے شام تک مسلمان ادھر ادھر سے بھاگ بھاگ کر گھاٹ پر آتے اور جمع ہوتے جاتے۔ پار جانے والے سینکڑوں اور پار لے جانے کو صرف ایک کشتی۔ ایسے میں اگر سکھوں کا کوئی جتھہ آ جاتا تو سب کو موت نظر آنے لگتی۔ ایک نہتے دوسرے فاقوں کے مارے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اکثر لوگوں نے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ مردوں سے زیادہ عورتیں اس طرح جان دیتی تھیں۔ کچھ جوانمرد مقابلہ پر بھی ڈٹ جاتے اور دوسروں کو پار اتر جانے کا موقع مل جاتا۔ ہم بھی جان پر کھیل کر پناہ گزینوں کو دریا پار کرواتے تھے۔ کسی سے کچھ مفت تو نہیں بھی نہیں ملتا تھا۔"

"تو اتنی دولت سمیٹ کر بھی تمہارا پیٹ نہیں بھرا؟" پہلے نے کہا "اب بوڑھے ہو گئے آرام کرو۔"

ایک اور نے کہا۔

"آرام تو اسے نصیب ہوتا ہے جس کی حق کی کمائی ہو۔ جو غریب لٹتا ہے اس کی آہ تو قبر تک بھی پیچھا نہیں چھوڑتی۔"

کشتی منجدھار میں پہنچی تو دونوں ملاح بولے۔

"بولو بھائیو۔ اللہ ہی اللہ!"

سب نے مل کر اللہ ہی اللہ کا نعرہ لگایا اور ملاح پورے زور لگا کر کشتی منجدھار میں سے نکال لے گئے۔

چودھری عبداللہ بولا۔

"حستو! سکھوں کے جتھے میں کتنے کتنے آدمی ہوتے تھے؟"

"دو دو سو چار چار سو! بندوقیں بھی ہوتیں۔ رائفلیں بھی ہوتیں۔ تلوار کرپان یا بلم سے تو کوئی خالی ہی نہ ہوتا۔" حستو نے جواب دیا۔ "اور مسلمانوں کے پاس لے دے کے ایک اللہ کا نام۔ کسی کے پاس بلم یا بھالا ہوا تو ہوا ہی سہی۔ عام طور پر سب نہتے ہوتے۔ لیکن ایک بات ہے چودھری! کبھی جو مسلمان بھی سینہ تان کر مقابلہ پر ڈٹ جاتے اور مل کر "اللہ اکبر" کے نعرے مارتے تو سکھوں میں بھاگڑ پڑ جاتی اور ایک ہی ہلے میں مسلمان ان میں سے اکثر کے پاس سے کچھ ہتھیار بھی چھین لیتے۔ خدا کی قسم! اسوقت ان بھگوڑوں کی حالت دیکھ کر ہنسی سی آجاتی۔ بس جدھر منہ اٹھا ادھر ہی بے تحاشا بھاگے جا رہے ہیں اور کیا مجال ایک بار بھی پلٹ کر دیکھیں۔"

"جتھے ہر روز آتے تھے کیا؟"

"ہر روز تو نہیں۔ پھر بھی آتے ہی رہتے تھے۔"

"اور یونہی مسلمان مارے جاتے تھے؟"

"مارے بھی جاتے تھے اور مارتے بھی تھے۔" حستو ملاح نے جواب دیا۔ "جب شروع شروع میں مار دھاڑ شروع ہوئی ہے تو مسلمانوں کا ایک قافلہ یہاں آیا۔ راوی میں شدت کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ اوپر سے چھاجوں پانی پڑتا۔ ہم جب کشتی چھوڑتے تو دوسرے کنارے پر گھاٹ سے کہیں دو میل نیچے لگتی۔ مسافر ابھی سوار ہو ہی رہے تھے کہ سکھوں کا ایک جتھا آگیا۔ بکرم سنگھ جتھے دار تھا۔ سکھوں کو آتے دیکھ کر بہت سی عورتیں ننگ و ناموس کی خاطر دریا میں کود گئیں۔ بہتیرے مرد بھی ڈوب مرے۔ باقی لوگ جھاڑیوں اور سرکنڈوں کی طرف بھاگے۔ اس قافلے میں ایک سکول ماسٹر بھی تھا۔ اس کے پاس بندوق تھی۔ سکول ماسٹر اور اس کی بیوی سرکنڈوں میں چھپ گئے۔ سرکنڈوں میں بھی پانی چل رہا تھا۔ سکھ آتے ہی مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹنے لگے۔ سکول ماسٹر کی غیرت نے جو جوش مارا تو وہ سرکنڈوں سے باہر نکل آیا۔ جو سکھ سامنے آتا اسے مار گراتا۔ اس طرح اس نے بہت سے سکھ مارے۔ اچانک ایک گولی ماسٹر کی گردن میں آ کر لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ شوہر کے گرتے ہی اس کی بیوی جو چھپی بیٹھی تھی باہر نکل آئی اور شوہر کی بندوق اٹھا کر سکھوں پر فائر کرنے لگی اور چلا چلا کر مسلمانوں کو غیرت دلانے لگی۔ عورت کی بہادری دیکھ کر ادھر ادھر سے کچھ مسلمان بھی نکل آئے کسی کے ہاتھ میں لاٹھی تھی کسی کے پاس برچھا۔ سب نے مل کر اللہ اکبر کا نعرہ مارا اور سکھوں پر حملہ کر دیا۔ سکول ماسٹر کی بیوی آگے آگے تھی۔ ہم کنارے سے کچھ دور کھڑے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے اس عورت نے کئی سکھ مار گرائے۔ اور بہت سے مردوں نے مارے۔ اچانک ایک گولی عورت کی کمر میں لگی اور وہ گر گئی۔ اتفاق سے اسی وقت کہیں سے پولیس کے سپاہی بھی آ پہنچے اور سکھ بھاگ گئے۔

"عورت مر گئی یا بچ گئی؟" عبداللہ خان نے پوچھا۔

"جب لوگوں نے اسے کشتی میں سوار کرایا تھا اس وقت تو زندہ ہی تھی۔" حستو نے جواب دیا۔

کشتی کنارے پر جا لگی اور سب مسافر اتر گئے۔

گھاٹ پر چودھری عبداللہ خاں کے لئے گھوڑا آیا ہوا تھا۔ گھوڑے پر سوار ہو گیا اور نوکر پانی پھلانگتا ہوا پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ جدھر نگاہ اٹھتی پانی ہی پانی نظر آتا۔ کہیں کہیں کمر تک گہرا۔ کہیں گھٹنے گھٹنے۔ کہیں ٹخنے ٹخنے! کہیں سرکنڈے تھے کہیں جھاڑیاں تھیں۔ کہیں سپید سپید پروں والے بگلے مچھلیوں کی تاک میں بیٹھے تھے۔ کہیں دور سے کالے تیتر کی مست آواز "سبحان تیری قدرت" بھی وقفہ وقفہ کے بعد سنائی دیتی۔ بادل آسمانوں کی فضا میں تیر رہے تھے۔ پھوار پڑ رہی تھی۔ کبھی بادل کی گرج کسی ظالم درندے کی چنگھاڑ کی طرح سنائی دیتی کبھی سیاہ بادلوں کے سینے سے بجلی کی چمک کسی سفاک کے نیزے کی انی کی طرح چمکتی نظر آجاتی۔ نوکر ملک سے الگ پگڈنڈی کے راستے گاؤں کو جا رہا تھا اور گھوڑا اور سوار کھیتوں کے کنارے کنارے چل رہے تھے۔ اچانک جھاڑیوں کی جانب سے کسی عورت کے چیخنے کی آواز آئی۔ عبداللہ خاں نے فوراً گھوڑے کی باگ موڑی اور جھاڑیوں کے پاس پہنچ کر پکارا۔

"کون چلا رہا ہے؟"

لیکن کچھ جواب نہ ملا۔ اس نے پھر رعب دارانہ کہا۔

"ارے کون ہے یہاں؟"

لیکن پھر بھی کچھ جواب نہ ملا تو وہ جھاڑیوں میں گھس گیا۔ چلتے چلتے اس نے ایک جگہ جہاں سرکنڈوں اور جھاڑیوں کا ایک جھنڈ سا تھا

ایک آدمی کو جھاڑی میں گھستے ہوئے دیکھ لیا۔ اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر بھٹ وہاں پہنچ گیا۔ یہاں ایک جوان لڑکی جسکے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور منہ میں اسی کی اوڑھنی ٹھنسی ہوئی تھی۔ پریشان حال پڑی تھی عبداللہ خاں گھوڑے سے اترا اور جھک کر لڑکی کے منہ سے کپڑا نکالنے لگا۔ اسی وقت ایک آدمی جس نے منڈاسا باندھ رکھا تھا جھاڑی میں سے کود کر نکلا اور بھاگ گیا۔ عبداللہ خاں نے للکارا۔

"ابے حرام زادے! کہاں جاتا ہے؟"

لیکن وہ کہیں جھاڑیوں میں گھس گیا۔ اس آدمی کے اچانک کودنے سے گھوڑا خوفزدہ سا ہو کر کچھ شوخی کر رہا تھا اور عبداللہ خاں اسے پچکار رہا تھا۔ اور وہ لڑکی جھاڑیوں سے لگی بیٹھی سہمی سہمی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ہاتھ رسی سے بندھے تھے۔ بال پریشان۔ لباس کیچڑ سے لت پت۔ چہرے پر خوف اور ہراس سے ہوائیاں اڑ رہی تھیں انیس بیس کے لگ بھگ عمر تھی۔ لیکن اس پریشانی اور خوف میں بھی حسن کی جلوہ فرمائیوں میں کچھ ایسی کمی نہ آئی تھی۔

"تم کون ہو؟" عبداللہ خاں نے گھوڑے کو چمکارتے ہوئے پوچھا۔

لڑکی لڑکھڑاتی ہوئی آواز سے بولی۔

"میں سردار بکرم سنگھ کی بیٹی ہوں جی!"

"تم بکرم سنگھ کی بیٹی ہو؟" عبداللہ خاں نے تعجب سے پوچھا۔ "تم یہاں کیسے آ نکلیں؟"

"جی ہاں!" لڑکی روتے ہوئے بولی۔ "میرا نام اندر کور ہے۔"

"تمہاری ہی شادی گئے جاڑوں میں ہوئی تھی؟" عبداللہ خاں نے اسکے ہاتھوں کی رسی کھولتے ہوئے پھر پوچھا۔

"جی ہاں!" اندر کور نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔

"رو نہیں بیٹی!" عبداللہ خاں نے اسے گھوڑے کی باگ پکڑاتے ہوئے کہا۔ "تم ذرا گھوڑا پکڑو۔ میں اس حرام زادے کو تو دیکھوں کہاں ہے۔"

اندر کور نے گھوڑا پکڑ لیا اور عبداللہ خاں ہنٹر پکڑ کر اس آدمی کو ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ لیکن وہ کہیں نظر نہ آیا تو وہ اندر کور کے پاس واپس آ گیا۔ اور بولا۔

"بیٹی! تم یہاں کیسے آ گئیں؟ یہ آدمی کون تھا؟"

"میں سسرال میں تھی۔ میرے پتی فوج میں ہیں۔" اندر کور سسکیاں بھرتے ہوئے بولی۔ "باپو نے مجھے واپس لانے کو گاؤں سے دو آدمی بھیجے تھے۔ راستے میں ایک جگہ ہماری گاڑی پر مسلمانوں نے حملہ کیا۔ گاڑی کے ساتھ فوج کے سپاہی تھے۔ کچھ مسافر گاڑیوں سے نکل کر کھیتوں کی طرف بھاگنے لگے۔ میں اور میرا ایک ساتھی بھی ایک کھیت میں گھس گئے۔ اس وقت شام ہو رہی تھی۔ ہم کھیتوں میں چھپے بیٹھے رہے۔ جب رات ہوئی تو ہم وہاں سے نکلے اور راتوں رات چل کر صبح ہوتے ہوتے ایک قصبے میں پہنچ گئے۔ اس جگہ اتفاق سے ایک نائب تحصیلدار جو باپو کو جانتا تھا آیا ہوا تھا۔ اس نے مجھے حفاظت سے ایک ایسی جگہ پہنچا دیا جہاں سے ہم آسانی سے اپنے گاؤں پہنچ سکتے تھے۔ لیکن یہ شخص مجھے دھوکے سے ادھر لے آیا۔ اس کی نیت خراب تھی۔ لیکن واہ گرو کو بچانا تھا جو آپ آ گئے ...."

اندر کور پھر رونے لگی۔

"بیٹی رو نہیں!" عبداللہ خاں بولا۔ "تو یہ آدمی بھی کوئی سکھ ہی تھا؟"

"جی ہاں!" اندر کور نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔ "ہمارا نوکر ہی ہے۔"

بارش ہونے لگی تھی۔ ہوا بھی تیز چلنے لگی تھی۔

"بیٹی!" عبداللہ خاں بولا۔ "اٹھو! سوار ہو جاؤ۔ کل انشاء اللہ تم اپنے گھر پہنچ جاؤ گی۔"

اندر کور نے اٹھتے اٹھتے سہمی سہمی نظروں سے اس کی طرف دیکھا وہ بولا۔

"بیٹی فکر مت کرو۔ میرا نام عبداللہ خاں ہے۔ آؤ سوار ہو جاؤ"

چنانچہ اس نے سہارا دے کر اندر کور کو گھوڑے پر سوار کرایا اور باگ تھام کر ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ کچھ دیر بعد جب وہ اندر کو ساتھ لے کر گھر آیا تو بیوی سے کہا کہ وہ لڑکی کو نہلا دھلا کر صاف ستھرے کپڑے پہنائے اور اس کے آرام کا پورا پورا خیال رکھے۔ گھر والوں نے لڑکی کے متعلق کئی بار اس سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی۔ لیکن اس نے کچھ نہ بتایا۔ اور بتاتا بھی کیسے؟ اندر کور اس شخص کی بیٹی تھی جس کے ہاتھوں سینکڑوں بے گناہ مسلمان تباہ اور ہلاک ہوئے تھے۔ جس کے جتھے نے مسلمانوں کے کئی گاؤں لوٹ کر جلا دئے تھے اور ہر طرف ایک قیامت

برپا کر رکھی تھی۔

لیکن ان فسادات سے پہلے اسی بکرم سنگھ نے دو ایک بار مقدمات کے سلسلہ میں چودھری عبداللہ خاں کی کچھ مدد بھی کی تھی اور اپنی اکلوتی بیٹی اندر کور کی شادی پر بھی اسے مدعو کیا تھا۔ عبداللہ خاں خود تو کسی وجہ سے شادی میں شامل نہ ہو سکا لیکن اس نے سونے کا ایک خوبصورت زیور دلہن کو تحفہ کے طور پر بھیجا تھا۔ گو آج بکرم سنگھ مسلمانوں کا صرف دشمن ہی نہیں بلکہ ان کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔ لیکن چودھری عبداللہ خاں اس کا احسانمند تھا۔ اور قدرت نے اسے دشمن کے احسان سے سبکدوش ہونے کا موقع دیا تھا۔

دوسرے روز عبداللہ خاں نے کہاروں سے ڈولی منگوائی اور اندر کور کو سوار کروا کر اپنے پانچ سات آدمیوں کے ساتھ گھاٹ پر آیا۔ اور ڈولی کشتی میں رکھوا کر اپنے آدمیوں سمیت پار اتر گیا۔ دریا سے کوئی دو میل کے فاصلے پر ہندوستان اور پاکستان کی سرحد شروع ہو جاتی تھی۔ سرحد تک مسلمانوں کی آبادی تو اب کوئی نہیں تھی۔ صرف کھیت تھے اور بکرم سنگھ کا گاؤں بارہ پندرہ میل سے کم نہ تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ لڑکی کو اس کے گھر کیسے پہنچایا جائے۔ کہار ڈولی لے کر دشمن کے علاقے میں جانے سے ڈرتے تھے۔ بہرکیف عبداللہ خاں نے ڈولی اٹھوائی اور اپنے آدمیوں کے ساتھ اس جگہ آگیا جہاں دونوں ملکوں کی سرحدیں ملتی تھیں۔ ادھر کے کھیتوں میں کچھ سکھ اپنے مویشی چرا رہے تھے یہ لوگ عبداللہ خاں کو جانتے تھے ان سے معلوم ہوا کہ بکرم سنگھ ابھی ابھی کچھ آدمیوں کے ساتھ کھیتوں پر آیا ہوا تھا۔ انھیں جب یہ معلوم ہوا کہ چودھری عبداللہ خاں سردار بکرم سنگھ کی بیٹی کو لے کر آیا ہے تو ان میں سے ایک گھوڑے پر سوار ہو کر بکرم سنگھ کو تلاش کرنے چلا گیا۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد ایک طرف سے کچھ سوار نظر آئے۔ یہ ادھر ہی کو آ رہے تھے۔ بکرم سنگھ مشکی گھوڑے پر سوار آگے آگے تھا۔ اور پوری طرح مسلح تھا۔ جب وہ نزدیک آیا تو اندر کور ڈولی سے نکلی۔ بکرم سنگھ بیٹی کو دیکھ کر گھوڑے سے اترا اور بیٹی کی طرف آیا۔ اندر کور بھاگ کر باپ کے سینے سے جا لگی اور روتے روتے اسے سب قصہ سنا دیا۔ عبداللہ خاں ڈولی کے پاس کھڑا تھا اور کہار خوفزدہ نگاہوں سے اس دشمن اسلام کی طرف دیکھ رہے تھے۔

بکرم سنگھ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا عبداللہ خاں کے پاس آیا اور ہاتھ ملانے کو ہاتھ بڑھایا۔ لیکن عبداللہ خاں اسی طرح خاموش رہا۔ ندامت سے بکرم سنگھ کا سر خود بخود جھک گیا۔ اندر کور بھی دونوں کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ عبداللہ خاں :-

"بیٹی انہیں دور جانا ہے۔ آؤ ڈولی میں سوار ہو جاؤ"

اندر کور جھک کر اس کے پاؤں چھونے لگی تو اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور محبت سے ڈولی میں سوار کرا دیا۔ اور بکرم سنگھ کی طرف دیکھ کر کہا،

"سردار بکرم سنگھ! خدا کا شکر ہے کہ میں تمہارے احسان سے سبکدوش ہوا۔ اب ان غریب کہاروں پر رحم کرنا"

بکرم سنگھ نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ سرخ سرخ آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر عبداللہ خاں کو سلام کیا۔ عبداللہ خاں نے بھی دایاں ہاتھ ماتھے تک لا کر سلام کا جواب دیا۔ کہاروں نے ڈولی اٹھائی اور دونوں اپنی اپنی راہ ہو لئے۔ جب کہار واپس آئے تو ان سے معلوم ہوا کہ بکرم سنگھ نے انھیں پچیس پچیس روپے اور ایک ایک پگڑی انعام دی تھی۔

جلوس

بقیہ صفحہ ۱۶

جارہے ہیں۔ ہم .... جا .... رہے .... ہیں۔

اور میں اس چھت پہ اوندھے منہ پڑا سوچ رہا ہوں کہ یہ کس قسم کی آزادی ہمیں دیئے جا رہے ہیں۔ یہ خود ساختہ بموں کا آزادانہ استعمال یہ دن دہاڑے قتل و غارت۔ یہ کیسا درد و کرب ہے۔ اس نومولود بچے کا دوران پیدائش ہی میں گلا گھونٹا جا رہا ہے۔ کہ وہ نئی صبح وہ آنے والی سرخ و سپید صبح کبھی نہ دیکھ سکے۔

جلوس گزر چکا ہے۔ اور انسانیت چولہے پہ پڑی دم توڑ رہی ہے۔ بگڑا ہوا چہرہ، جلا ہوا لباس۔ اور جسم کے کئی اعضا کٹے ہوئے۔ تمہارے بہار رنگ دوپٹہ کی جگہ اب خزاں کا دور دورہ ہے۔ یک رنگے اور سہ رنگے جھنڈے گڑے ہیں۔

ارمانوں حسرتوں اور امنگوں کا جلوس گزرتا جا رہا ہے

حلقہ ارباب ذوق مرکز لاہور میں پڑھا گیا۔

مبصر دہلوی

پنجاب میں مہاجرین کی بحالی

تقسیم ہندوستان سے قبل کسی کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ فرقہ وارانہ فسادات ایک ایسے طوفان کی صورت اختیار کرلیں گے کہ انسانیت تباہ وبرباد ہوکر رہ جائے گی۔ ہندوستان والے بیچے جاسے اپنی ساجد ھانی میں بیٹھے تھے پاکستان کے ارباب حل وعقد کو دہلی سے کراچی منتقل ہونا پڑا تھا۔ وہ اچھی طرح نئی سرزمین پر اپنے قدم رکھنے بھی نہ پائے تھے کہ ستم کی بجلیوں نے ان کے خرمن کو جلانے کی تیاریاں شروع کردیں۔

۱۵ اگست سے پہلے امرتسر میں جو فرقہ وارانہ فسادات ہوئے تھے، ان کے زیر اثر وہاں کے اور قرب وجوار کے مسلمانوں نے رخت سفر باندھنا شروع کردیا تھا اور جب مہینے کے آخر میں مختلف مقامات پر باقاعدہ محاذ بن گئے تو ہجرت کی تحریک نے زور پکڑا اور ہر طرف کے مسلمان تیزی سے پاکستان میں داخل ہونے لگے۔ ضرورت وقت کا لحاظ رکھتے ہوئے حکومت نے ستمبر ۱۹۴۷ء میں وزارت مہاجرین قائم کی تاکہ نقل مکان میں مدد دینے کے علاوہ انھیں نئے سرے سے نئی دنیا میں آباد کرنے کے لئے ہر ممکن تدبیر عمل میں لائی جائے۔ پہلے وزارت کا صدر دفتر کراچی میں تھا لیکن چونکہ مہاجرین کا مسئلہ سب سے زیادہ سخت پنجاب میں تھا اس لئے اکتوبر میں اس کا دفتر اور سارا عملہ لاہور منتقل کردیا گیا۔ مرکزی حکومت کی اس وزارت نے صوبائی حکومتوں کے ساتھ مل جل کر مہاجرین کے کیمپ کھولے جن میں لاہور کا والٹن اسکول سب سے پہلا اور سب سے بڑا کیمپ تھا۔ سرکاری اعداد وشمار سے پتہ چلتا ہے کہ روز اول سے ۲۶ اپریل ۱۹۴۸ء تک صرف مشرقی پنجاب سے ہجرت کرنے والوں کی تعداد ۵۰،۰۰،۴۸۶۴ ہے۔ اس میں نہ تو دہلی والے شامل ہیں اور نہ کشمیر سے آنے والے۔ ان لوگوں کا بھی شمار نہیں ہوسکا جنھوں نے اپنے نام پتے کسی کیمپ میں درج نہیں کرائے۔

اتنی بڑی تعداد میں ہجرت کرنے والوں کے لئے جن کی مثال تاریخ عالم میں کہیں نہیں ملتی از سر نو آباد کرنے سے پہلے عارضی قیام وطعام کا انتظام کرنا تھا اور یہ کوئی آسان بات نہیں تھی، خصوصاً جبکہ نظام نو کی تشکیل کے لئے کوئی خاکہ بھی ذہن میں نہیں آیا تھا۔ آنے والوں میں تندرست اور بیمار صحیح وسالم اور اپاہج سبھی قسم کے لوگ شامل تھے۔ اس لئے معذوروں کے علاج معالجے کے ساتھ اچھے بھلوں کو ان سے بچائے رکھنا ضروری تھا چنانچہ اجناس خورد ونوش کے علاوہ دوا دارو کا اہتمام بھی کرنا پڑا پھر تن ڈھانکنے کے لئے کپڑا درکار تھا اور وہ جو کہتے ہیں کہ مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی تو آنے والے موسم سرما کا لحاظ رکھنا بھی لائحہ عمل میں داخل ہوگیا۔ ایک طرف وہ سیاسی چپقلشیں تھیں جن سے نجات پانا مشکل تھا اور دوسری طرف ان مہاجرین کو نئے سرے سے آباد کرنا۔ خدا کا شکر ہے کہ نوزائیدہ حکومت کے ارباب حل وعقد ہر پہلو پر قابو پانے میں کامیاب ہوئے اور تھوڑی سی تکلیفیں اٹھانے کے بعد بہت سے لوگ اطمینان کا سانس لینے کے قابل ہوگئے۔

اتنا بڑا کام حکومت کی مشکلات اور سرکاری عملے کی کمی۔ ہوسکتا تھا کہ سارا نظام درہم برہم ہوجاتا لیکن خدا مسبب الاسباب ہے۔ اس نے امیر وغریب کی تفریق لوگوں کے دلوں سے مٹا کر صاحب ثروت ہستیوں کو پناہ گاہوں میں خدمت الناس کے لئے آمادہ کردیا۔ محلوں کے رہنے والے جھونپڑوں میں پہنچے اور اپنے ہاتھوں سے طلائی انگشتریاں اتار کر لٹے ہوئے لوگوں کے شکستہ دلوں پر صبر وتحمل کا مرہم لگانے لگے۔ وہ نازک ہاتھ جو ہمیشہ حنا آلود رہنے کے عادی تھے، گھائلوں کے تازہ خون دھو دھو کر زخموں کو مندمل کرنے لگے۔ اور یہ جو کچھ ہوا دین اسلام کی پیروی کرنے والوں کے لئے کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ قوم کی اجتماعی زندگی جب بھی ایسے نازک دور سے گزری محمود وایاز کو ایک صف میں کھڑا کردینے والی تعلیم نے دلوں کی ماہیت کو بدل ڈالا، امتیازات کے پردے چاک کردئے اور دست تعاون کی کوتاہی کبھی محسوس ہونے نہ دی۔ مسلمانوں کو ناز ہے اپنے مذہب کی انہی خصوصیات پر۔

اپنی حکومت کا مالی نظام عارضی طور پر کسی قدر کمزور تھا اس لئے تقاضائے وقت کا لحاظ رکھتے ہوئے فوراً ایک ریلیف فنڈ کا قیام عمل میں آگیا۔ قائداعظم کی طرف سے اعلان ہونا تھا کہ روپے کی بارش شروع ہوگئی۔

ماڈل ٹاؤن۔ کراچی۔

اس وقت تک دو کروڑ سے زیادہ روپیہ ریلیف فنڈ میں جمع ہو چکا ہے۔ اور مہاجرین کو مختلف طرح کی امداد پہنچانے کے لئے صرف کیا جا رہا ہے۔

مغربی پنجاب میں مہاجرین کی آمد کے ساتھ ہی ان کو سرکاری طور پر نئے سرے سے آباد کرنے کے خاکے عمل میں آنے لگے۔ مرکزی حکومت پاکستان کے ایک افسر اعلیٰ مسٹر امین الدین کو اس سلسلے میں نامزد کیا گیا۔ ان کے بعد مسٹر معین الدین مقرر کئے گئے۔ چونکہ مہاجرین کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا اس لئے انتظامی امور میں بھی زیادہ سرعت برتی جانے لگی۔ سرکاری عملے کے تمام افراد صبح و شام سر جوڑ کر بیٹھتے اور پچھلے واقعات کی روشنی میں آئندہ کا لائحہ عمل تیار کرتے۔ مرکزی حکومت کے وزیر اعظم مسٹر لیاقت علی خاں نے بھی بارہا ان موقعوں پر شرکت کی اور اپنے مشورہ سے مستفید فرمایا۔ اراضیات کے محکمے سے ان زمینوں کی فہرست مرتب کرائی گئی جنھیں غیر مسلم چھوڑ کر چلے گئے تھے اور چلے جا رہے تھے۔ ان زمینوں پر سب سے پہلے ان لوگوں کو آباد کیا گیا جو کاشتکاری یا متعلقہ پیشوں سے واقف تھے۔ اندیشہ تھا کہ اس کام پر فوری توجہ نہ دی گئی تو کھیتیاں برباد ہو جائیں گی۔ کاشت کا نظام بہت عرصے کے لئے درہم برہم ہو جائے گا اور اقتصادیات پر جو اثر پڑے گا وہ ناقابل برداشت ہوگا۔ چونکہ ذرائع حمل و نقل مسدود ہو چلے تھے اسلئے ڈر تھا کہ بعض حصوں میں قحط نہ پڑ جائے۔ دیہاتوں میں یہ انتظام کرنے کے ساتھ شہروں کی طرف بھی توجہ مبذول رہی۔ بہت سے مکان خالی ہو گئے تھے اور دکانیں بند پڑی تھیں۔ ان لوگوں کو جو شہروں میں کاروبار کرنے کے عادی تھے حسب استحقاق ان مکانوں میں آباد کیا گیا اور دکانیں انکی مالیت کا اندازہ کر لینے کے بعد ان کے سپرد کی گئیں۔ اس طرح شہری نظام بھی خراب ہونے نہیں پایا۔ لوگ آباد ہوئے اور بگڑتا ہوا کاروبار بھی سنبھلنے لگا۔ لاہور کی حالت کو سب سے پہلے سدھارنا ضروری تھا کیونکہ مغربی پنجاب کی حکومت کا صدر مقام ہونے کے علاوہ محل وقوع کے لحاظ سے بھی اس کی اہمیت زیادہ تھی۔

یہ تمام کارروائیاں کسی شخص واحد کے فیصلے پر منحصر نہیں تھیں بلکہ باقاعدہ ایک بورڈ بنا ہوا تھا جس کے اراکین میں مرکزی اور صوبائی افسران شامل تھے۔ اس بورڈ کی تین علیحدہ علیحدہ کمیٹیاں تھیں جو مکانوں زمینوں اور کارخانوں سے متعلق تھیں۔ ان لوگوں کو جو زراعتی، تجارتی یا صنعتی کاموں سے ناواقف تھے، سرکاری یا تجارتی کمپنیوں کے دفتر میں جگہ دی گئی۔ اس سلسلے میں بھی ملازمت دلانے والا ایک محکمہ قائم ہوا جس نے بڑی خوش اسلوبی اور تن دہی سے کام کیا۔ اس محکمے میں مہاجرین اپنے ناموں کے ساتھ قابلیت وغیرہ کی تفصیل درج کرا دیتے تھے۔ جونہی موقع ملتا، انھیں برسر روزگار کر دیا جاتا۔

ان سب کاموں میں زیادہ سے زیادہ عجلت برتی گئی کیونکہ ایک طرف عوام کی فلاح و بہبود کا خیال پیش نظر تھا تو دوسری طرف یہ احساس بھی تھا کہ حکومت پر زیادہ بار نہ پڑنے پائے۔ یہ کام بحسن و خوبی انجام پاتا رہا اور اب بھی پا رہا ہے۔

سرکاری طور پر جمع کئے ہوئے اعداد و شمار کے مندرجہ ذیل نقشے ملاحظہ کیجئے:۔

۱۔ مشرقی پنجاب سے آنے والے مہاجرین کی ماہانہ تفصیل:۔

تاریخ	پیدل	لاریوں سے	ریلوں سے	میزان
۲۸-۸-۴۷ تا ۳۱-۸-۴۷	۳۶،۰۰۰	۱۴،۰۰۰	۱،۰۱،۵۰۰	۱،۵۱،۵۰۰
۱-۹-۴۷ تا ۳۰-۹-۴۷	۳،۶۶،۳۰۰	۴۵،۵۴۰	۱،۸۹،۰۰۰	۸،۰۰،۸۴۰
۱-۱۰-۴۷ تا ۳۱-۱۰-۴۷	۶،۲۵،۵۰۰	۳۹،۹۱۱	۲،۷۶،۵۰۰	۹،۴۱،۹۱۱
۱-۱۱-۴۷ تا ۳۰-۱۱-۴۷	۸،۳۸،۷۴۰	۳۴،۹۶۴	۳،۵۲،۵۰۰	۱۲،۲۴،۲۰۴
۱-۱۲-۴۷ تا ۳۱-۱۲-۴۷	۲،۷۴،۵۰۰	۱۴،۷۱۴	۱،۰۸،۵۰۰	(۱۹ دسمبر کے بعد لوگ پیدل نہیں آئے)
۱-۱-۴۸ تا ۳۱-۱-۴۸	.....	۳۱،۸۶۰	۲۱،۰۰۰	۵۲،۸۰۰
۱-۲-۴۸ تا ۲۹-۲-۴۸	.....	۱۸،۸۷۵	۱۶،۴۰۰	۳۵،۲۷۵

(باقی اگلے صفحہ پر)

۱-۳-۴۸ تا ۳۱-۳-۴۸	.....	۹،۷۹۲	۳۱،۲۷۴	۴۱،۰۶۶
۱-۴-۴۸ تا ۲۶-۴-۴۸	.....	۶،۱۰۶	۲۴،۲۰۰	۳۰،۳۰۶
میزان	۲۳،۴۱،۰۴۰	۲،۱۵،۷۷۲	۱۱،۲۰،۸۷۴	۳۶،۷۷،۶۸۶

۲۸ اگست ۱۹۴۷ء سے قبل آنے والوں کی تعداد کا اندازہ —— ۱۴،۰۰،۰۰۰

میزان الکل ۵۰،۷۷،۶۸۶

۲- مہاجرین کو نئے سرے سے آباد کئے جانے کی تفصیل:-

مغربی پنجاب میں آنے والوں کی تعداد	دیہاتی علاقوں میں آباد کئے گئے		کیمپوں میں	دیہاتوں میں جو آباد ہونے کے لئے وقت کے منتظر ہیں	جنھیں آباد کرنا باقی ہے		تفصیل
	اراضیات پر	اور طریقوں سے			اراضیات پر	اور طریقوں سے	
۶،۱۴۵،۷۸۴	۳۰،۴۹،۷۹۲	۴۷۴،۶۹۲	۷۶۹،۵۸۳	۴۶۶،۸۹۷	۷۳۹،۹۴۳	۱۳۱،۶۹۱	

نوٹ:- پہلے خانے میں وہ مہاجرین شامل ہیں جو کسی ضلعے میں پہنچکر وہیں آباد ہوئے اور وہ بھی ہجرت کر کے دوسرے ضلعوں میں چلے گئے اس طرح انکی تعداد دوبار محسوب کر لی گئی۔ تشخیص کے وقت مغربی پنجاب میں مہاجرین کی تعداد ۵۴،۸۹،۹۷۹ تھی۔ ان میں ۱۲،۳۶،۵۲۶ شہروں کے ۳۶،۰۹،۰۳۷ دیہاتوں کے اور ۶،۴۴،۴۱۶ کیمپوں کے شامل ہیں۔ ان کے مقابلے میں ۲ سے ۷ تک کے خانوں کی کل تعداد ۵۶،۵۲،۶۰۳ ہوتی ہے۔

۳- شہروں کے مکانات کی تفصیل:-

خالی شدہ	مسمار شدہ		مہاجرین کو دئے گئے	سرکاری ملازمین کو دئے گئے	واپس آجانے والے لوگوں کو دئے گئے	دوسرے مہاجرین کو دئے گئے
	آسانی سے مرمت ہو جانے والے	آسانی سے مرمت نہ ہو سکنے والے				
۱۶۰،۰۱۰	۶۳۱۶	۱۰۵۳۶۷	۱۰۶،۰۳۷	۹،۵۳۹	۶۸	۲۷۸۹

۴- شہروں کی دکانوں کی تفصیل:-

خالی شدہ	مسمار شدہ		جو باقاعدہ دے دی گئیں			جن پر قبضہ کر لیا		ابھی تک خالی نہیں ہیں
	آسانی سے مرمت ہو جانے والے	بری طرح برباد شدہ	مہاجرین کو	واپس آنے والوں کو	دوسروں کو	مہاجرین نے	دوسروں نے	
۵۳۰۶۵	۱۱۱۳	۴۱۵۵	۳۳۰۳۴	۲۴	۴۲۰۷	۱۱۵۹	۱۲۳۵	۹۴۶۶

۵- فیکٹریوں کی تفصیل:-

جو رجسٹری شدہ تھیں					جو رجسٹری شدہ نہیں تھیں				
خالی	مہاجرین کو دی گئیں	دوسروں کو دی گئیں	واپس آنیوالوں کو دی گئیں	اس وقت کام کر رہی ہیں	خالی	مہاجرین کو	دوسروں کو	واپس آنیوالوں کو	اس وقت کام کر رہی ہیں
۴۰۵	۱۷۷	۳۲	۲	۱۳۶	۲۵۰۶	۱۴۹۸	۲۱۲	۷	۱۰۴۹

ان اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ کام کس قدر بڑا اور کتنا پھیلا ہوا تھا جس طرح کے دشوار حالات میں اس پھیلے ہوئے کام کو انجام دینے کی کوشش کی گئی اس کے پیش نظر جو کچھ ہوا وہ غنیمت معلوم ہوتا ہے۔ اور گو مہاجرین کے مسئلہ کو صحیح معنوں میں حل کرنے کی منزل اب بھی بہت قریب نہیں آئی۔ اب بھی لاکھوں مہاجرین کو گھر اور وطن کا سا آرام میسر نہیں ہوا لیکن کوششوں کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ اور اکثر کام کرنیوالوں میں اس اہم کام کے لئے خلوص اور ہمدردی ہی بہتر مستقبل کی کامیابیوں کی ضامن ہے۔

رفیق خاور

اُفق سے دور

افق سے دور کہیں اک دیارِ رنگیں میں
خیال و خواب کی نیرنگیاں پرافشاں ہیں
یہ اک دیار ہے دنیائے این و آں سے پرے
جسے بنایا ہے اُمید کی نگاہوں نے
کئی چمکتے ہوئے تارہائے سیمیں سے
جہاں برستی ہے بادل سے موجِ رنگینی
غنودہ ہیں کئی رومان اسکے دامن میں
ہزاروں گوشوں سے آتے ہیں کاروانِ خیال
سمندِ تیز پہ سامان رنگ و بو لے کر
بہار لاتی ہے چن چن کے غنچہ ہائے حسیں
ہیں جن کے سینے میں آسودہ نور کی کرنیں
نگاہیں نشے کی لہروں میں جھوم اُٹھتی ہیں
اور ایک بیخودئ جاوداں بہشت فسوں
اسیر کرتی ہے حیرانئ تماشا کو
ستارہ بافتہ دامِ حریر و اطلس میں

ہزاروں جلوے ہیں یاں لذتِ نظر کے لئے
ستارے آتے ہیں جیسے فضا سے دور کہیں
کسی مغنئ آتش نفس کا مست سرود
ہوا کے دوش پہ سیماب وار لہروں میں
اٹھائے ہیئت تصویرِ سیمیا اندود
گذرتے جاتے ہیں مستی میں گنگناتے ہوئے
کہ جیسے پردۂ سیمیں پہ کوئی برقِ ادا
سنا کے گیت فضاؤں میں محو ہو جائے

نہفتہ خُلدِ بریں اس کے مرغزاروں میں
شفق خمار میں ڈوبا ہوا وہ دیدۂ شام
نگاہیں بہکی ہوئیں ایک آتشِ خاموش
بہار کے رگ و ریشے میں خون کی لہریں
سپہر برق چراغاں، زمین آئینہ زار
گذر نہ اس میں کہیں دلگداز نالوں کا
نشارِ درد نہ زخمِ جگر کی خونریزی
نہ حسرتوں کی خلش کاریاں نہ دردِ نہاں
نہ برق شعلہ فشاں ہے نہ ابرِ طوفاں خیز
ستیزہ کاریٔ بزمِ حیات افسانہ

غزل

چھڑ کے بہت سے عشق نے دل پر لگائے ہیں
ایسے مگر نہ تھے کوئی اب کے جو کھائے ہیں

ہر وقت ہر گھڑی وہی اب مجھ پہ چھائے ہیں
آنکھوں میں بس رہے ہیں تو دل میں سمائے ہیں

بازارِ عشق میں تو یہ سودا گراں نہیں
اس[۱] دل کو بیچ کر جو ہم اس جاں کو لائے ہیں!

تو نے تو آج دیکھ لیا ان کو ہمنشیں
اب تو ہی یہ بتا کہ وہ کیوں مجھ کو بھائے ہیں

حالت یہی رہی تو لگے گی ضرور آگ
اب تک تو سوزِ عشق سے دامن بچائے ہیں

شاید کہ اب ہماری گزارش قبول ہو
مدت کے بعد حرفِ سخن لب پہ لائے ہیں

ان کا کہیں جواب ہے اردو میں اے جلیل؟
نغمے غزل کی شکل میں جو تو نے گائے ہیں

جلیل قدوائی

[۱] دے بعوضِ دستم جانے خریدم! (استاد)

ماہ نو۔ کراچی۔

ارادے

نئی رُت ہے نئے دن ہیں نئی شاخِ نشیمن ہے
جو اپنے خون سے سینچا ہے ہم نے یہ وہ گلشن ہے

نئے احساس سے دوچار ہے اب زندگی اپنی
نئے ماحول سے اچھی نہیں بیگانگی اپنی

ہمیں تو اس چمن کو گلشنِ عالم بنانا ہے
ابھی بچھڑے ہوؤں کو ایک ہی مرکز پہ لانا ہے

ابھی آراستہ کرنی ہے محفل نوعِ انساں کی
جلانی ہیں ابھی ہر گھر میں شمعیں دینِ یزداں کی

نہ ہوگا کام جو مردوں سے وہ ہم کو بنانا ہے
نئی نسلوں کے ذہنوں کو ابھی تو جگمگانا ہے

ابھی سوئے ہوؤں کو دولتِ بیدار دینی ہے
ابھی تو قوم کے ہر فرد کو تلوار دینی ہے

سحاب قزلباش

آشفتگی

قیصر زیدی

تیرے شانوں پہ چمکتے ہیں ستاروں کے نشاں
جن میں مبہم سے عزائم کے شرارے رقصاں
تجکو جنگاہ میں آسودگیٔ عید ملی !
اک نئے دورِ خوش آیند کی تمہید ملی!

یاں مگر زیست ہے، واماندگیٔ ذوقِ حصول
—— دیکھ کم مائگی بڑھتی ہے وہ طوفاں بہ کنار
جنسِ یوسف بھی جہاں مائلِ ارزانی تھی
دیکھتے دیکھتے وہ گرمیٔ بازار گئی
کچے دھاگوں کو ترستا ہے عیارِ خوددار
حسنِ یوسف کو میسر نہیں یہ حسنِ قبول——

یاں مگر زیست ہے، واماندگیٔ ذوقِ حصول
ہے وجودِ مرض و وجہِ مداوا ناپید
—— کرو میں اتنی کہ تاروں سی فزوں حدِ شمار!
چشمِ بے خواب کی آغوش میں یہ خواب وہ خواب!
فہم و ادراک ہیں پامالِ جنونِ تعبیر——
دیکھتا یہ ہوں کہ کنجشکِ فرومایہ نے
چشمِ شاہیں سے چرا لی ہے وہ حسِ بے باک!!

رنگ، آواز کا اک ظرفِ حسین و طیار
شاخِ نسریں سے پکارے ہے کہ کلیں ہشیار!
باندھ لے رختِ سفر غنچے ہوئے ہیں بیدار
نوکِ ہر خار پہ لرزاں ہے "فسونِ پیکار" !!

کچھ اسیرانِ تغافل نے جو کروٹ لی ہے
آہنی حلقۂ زنجیر ہے پابوسِ حریف
جوئے کم آب کے سینے میں وہ طوفاں آیا
مورِ بے مایہ نے اورنگِ سلیماں پایا——

ایسی آشفتہ خیالی ہے کہ توبہ توبہ
یہ جنوں خیز بخارات کا بے طور صعود
ذہنِ مجروح کو ماؤف کئے دیتا ہے
گو ہے تشخیصِ مرض وجہ مداوا ناپید
چشمِ بے خواب کی آغوش میں یہ خواب وہ خواب!
فہم و ادراک گرفتارِ جنونِ تعبیر
تیری نیندوں کو ستا سکتے تھے یہ خواب کہاں
تجکو جنگاہ میں آسودگیٔ عید ملی
جنسِ ناپید بھی تیرے لئے پابندِ وجود
تیرے شانوں پہ لرزتے ہیں ستاروں کے نشاں
جن میں مبہم سے عزائم کے شرارے غلطاں

الطاف گوہر

بوجھم

ظفر عموماً سب سے پہلے دفتر پہنچتا اور کوئی کام کرنے سے پہلے مختلف کمروں کے چکر لگاتا یہ دیکھنے کیلئے کہ باقی تینوں میں سے کوئی آیا ہے یا نہیں، "نازکی" عین وقت پر آتا اور گو وہ ظفر کے ساتھ ہی کمرے میں بیٹھتا تھا اس کی طرف قطعاً کوئی دھیان نہ دیتا اور آتے ہی چپکے سے اپنے کام میں لگ جاتا۔ ظفر علیک سلیک کا قائل تھا شروع شروع میں اسے یہ بات ناگوار گذری، لیکن آہستہ آہستہ یہی بات اس کے لئے معمول بن گئی۔ اسکے تھوڑی دیر بعد امجد میاں آتے۔ ہانپتے ہوئے پریشان سے۔ اصل میں امجد میاں کو زندگی سے ایک بہت بڑی شکایت تھی لیکن وہ اسے کسی پر ظاہر نہ کرتے تھے، اور وہ شکایت ان کی بائیسکل تھی جس پر وہ دو میل کا سفر طے کرنے کے بعد دفتر پہنچتے تھے۔ آج تک کسی نے سائیکل پر جاتے وقت امجد میاں کو کھل کر ہنستے نہیں دیکھا، امجد میاں مارکس اور لینن سے فوجی اور آزاد تک کی باتیں کرتے لیکن سائیکل کا ذکر ان کی زبان پر کبھی نہ آتا۔ اور یہ تو مسلم بات ہے کہ غم اگر ظاہر نہ ہو تو عجب عجب بھیس بدل لیتا ہے، یہ راز شاید کبھی نہ کھلتا اگر ظفر ایک روز بے دھیانی میں امجد میاں کی سائیکل نہ مانگ بیٹھتا۔ تھوڑی ہی دور جا کر وہ واپس آگیا۔ سائیکل کی مدح میں کئی ایک چلتے ہوئے جملے اس کے ذہن میں آئے لیکن امجد میاں کا چہرہ دیکھ کر وہ چپ ہو رہا۔ سب سے آخر میں "بوجھم" آتا۔ اس کی رفتار میں ایک وقار تھا یہ وقار وہ باہر ہی نہیں گھر میں بھی قائم رکھتا اس کی بیوی کو اس سے اسقدر محبت تھی کہ اگر کبھی "بوجھم" یہ کہتا "آج ایک عورت کو میں نے بہت ہی خوبصورت سرخ سوئٹر پہنے دیکھا، تم بھی ویسا ایک خرید لو" تو وہ سر پیٹ لیتی کہ ان کے میاں کی آنکھ ایک غیر عورت کی طرف اٹھی کیسے، اسکے بعد کئی کئی دن بوجھم کو اپنا وقار برقرار رکھنے کی صبر آزما کوششیں کرنی پڑتیں لیکن ایسی حالت میں بھی نہ اس کے چہرے کا رنگ بدلتا نہ اس کے جسم میں خم آتا۔ جب سے امجد میاں نے اسے بوجھم کہنا شروع کیا۔ اس کی شخصیت چمک اٹھی، اور امجد میاں کا دعوےٰ تھا کہ یہ نام انھوں نے سوچا نہیں، ان پر نازل ہوا، وہ ایک روز بوجھم کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے کہ ان کے سینے میں کوئی شے کروٹیں لینے لگی، ان کی رگوں میں کچھ اُبلنے لگا، اور وہ بے اختیار کہہ اُٹھے "بوجھم"۔ بوجھم نے پہلے تو اسے ایک دو روز کی بات سمجھ کر بے اعتنائی سے کام لیا لیکن جب سبھی اسے بوجھم کہنے لگے تو اس کے وقار کو ایک ٹھیس پہنچی اور اس نے ان سے کہہ دیا کہ یوں نام بدلنا ایک ذلیل حرکت ہے جو اسے پسند نہیں اور وہ نہیں چاہتا کہ کوئی اسے اس نام سے پکارے۔ امجد میاں تو خیر اس روز سے تائب ہو گئے لیکن دوپہر کے کھانے پر جب وہ سب اکٹھے ہوتے تو ظفر بڑے پیار سے بوجھم سے کہتا کہ تم خواہ مخواہ ناراض ہو جاتے ہو، آخر نام پیار ہی سے رکھا جاتا ہے۔ اور تمہارا نام تو بہت ہی اچھا ہے۔ اس پر امجد میاں دلیل کے طور پر "ظفر تنکا" "خالد چھلکی" اور "اللہ جد کوفتہ" قسم کے کئی نام لیتے اور کہتے کہ ماں باپ جو نام رکھتے ہیں ان کا بچے کی شخصیت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن دوست جو نام دیتے وہ شخصیت کے اہم ترین پہلو کو روشن کرتا ہے۔ اس ساری بحث میں احتیاط برتی جاتی کہ بوجھم کا لفظ زبان تک نہ آئے۔ لیکن بعض دفعہ ظفر کو اپنے پر قابو نہ رہتا اور وہ بڑی آہستگی اور نرمی سے کہتا "بُو ـــــ جھم" اس پر امجد میاں اپنے پاؤں سے اسکا پاؤں زور سے دباتے، بوجھم خاموشی سے اپنا کھانا کھانے میں مصروف رہتا جیسے وہ ان تمام باتوں سے بالاتر ہے۔ کچھ دنوں سے ایک بزرگ ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے لگے تھے، ظفر نے ایک روز ان سے کہا کہ آپ ہم سب کے چہروں کو غور سے دیکھئے اور پھر یہ کہیئے کہ بوجھم کا لفظ کس پر ٹھیک بیٹھتا ہے۔ وہ بزرگ اس تمام قصے سے ناواقف تھے تھوڑے تکلف کے بعد اس کھیل میں شریک ہو گئے اور سب کو دیکھ چکنے کے بعد ان کی نظر بوجھم پر جم گئی۔ اس واقعے کے بعد سے معاملہ بہت بگڑ گیا لیکن انتہا تو اس روز ہوئی جب بوجھم کی بیوی گھر کے کسی کام کے سلسلے میں اس سے ملنے وہیں آگئیں، امجد میاں سے جب انھوں نے پوچھا کہ ـــ صاحب کہاں ہیں تو امجد میاں نے نہایت سادگی سے کہا "کون؟ بوجھم! ابھی تو یہیں تھے، آپ تشریف رکھئے، میں دیکھتا ہوں۔"

نازکی نے ایک حدتک تو اس معاملے میں امجد میاں اور ظفر کا ساتھ دیا لیکن اسکی طبیعت ہی کچھ ایسی تھی کہ وہ ہر معاملے میں انتہائی اعتدال اور صلح پسندی کا قائل تھا، ظفر تو خیر ننگی تلوار تھا جو ہر کسی پر اوچھے ترچھے وار کرتا اور اگر کوئی نہ ملتا تو اپنے آپ ہی کو نشانہ بناتا، اسکا فلسفہ تھا کہ انسان کو اپنی اور دوسروں کی " انا " کچلنی چاہیئے، دنیا کی سب مصیبتیں " انا " ہی کی الجھنوں کی وجہ سے ہیں، اس گروہ میں اسکا سب سے پہلا شکار امجد میاں تھے جو بیچارے بلبلا اٹھے اور اس سے کہنے لگے کہ خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دو۔ میں اب اتنی عمر کا ہو چکا ہوں اور میری زندگی کے مختلف زاوئے اسقدر واضح ہیں کہ اب ان سے " انا " کا لبادہ اتارنے میں سب کچھ پارہ پارہ ہو جائے گا۔

اس مختصر سے اختلاف کے بعد امجد میاں اور ظفر ایک جان ہو گئے، اور امجد میاں ہی کو یہ جرأت تھی کہ وہ ہر موقعہ پر ہر کسی کے سامنے ظفر کا مذاق بھی اڑا لیتے۔ یہ نہیں کہ ظفر مذاق پسند نہ کرتا تھا، یہ تو اسکی زندگی تھی، لیکن وہ جب اپنے آپ پر خوب دل کھول کر ہنس چکتا تو پھر دوسروں کی طرف متوجہ ہوتا، اور یہ توجہ بعض دفعہ ناقابل برداشت ہو جاتی، بوجھم بیچارہ تو ہر وقت یہی کوشش کرتا کہ اسکا ظفر سے سامنا نہ ہو۔ دل ہی دل میں وہ اُسے بدتمیز سمجھتا اور جس روز ظفر سے اسکی کوئی بات چیت نہ ہوتی وہ بہت خوش رہتا۔ سب کو معلوم تھا کہ ظفر کی شخصیت میں ایک عجیب علیحدگی ہے۔ وہ ہر چیز پر ہنس سکتا ہے، اور اس کے لئے کوئی شے بھی، اپنی یا دوسرے کی اتنی عزیز نہیں کہ وہ اسکا مذاق نہ اڑا سکے۔ نازکی اس کی باتیں سنتا، کانوں تک سرخ ہو جاتا اور بچوں کی طرح کہتا " تو بہت شیطان ہے "۔ بوجھم چاروں میں سب سے بڑا تھا اور نازکی سب سے چھوٹا۔ یوں بھی نازکی کے چہرے اور جسم کی بناوٹ بچوں کی سی تھی۔ امجد میاں اسے بیٹا سمجھتے اور کہا کرتے کہ بڑی دھوم دھام سے تمہاری شادی رچائیں گے ہم۔ شادی کے ذکر سے نازکی جھنجھلا اٹھتا اور یوں ہوا میں ہاتھ ہلانے لگتا اور کہتا " اُف اُف " جیسے اُسے بہت گرمی لگ رہی ہو، اسوقت وہ ایک ننھا منا سا ریچھ معلوم ہوتا جو مداری کے سامنے ہاتھ اٹھا اٹھا کر ناچ رہا ہو، بوجھم کے علاوہ تینوں غیر شادی شدہ تھے۔ ہر دوسرے تیسرے ظفر بڑی افسردگی سے ان سے کہتا " یار شادی ہو رہی ہے ہماری اگلے مہینے " نازکی اچھل پڑتا " اب مزے آئیں گے۔ پردہ تو نہیں کراؤ گے، ہمارے ساتھ اسے باہر سیر کے لئے آنے دو گے؟ " اور امجد میاں اور نازکی دونوں اس سے یہ عہد لے لیتے کہ وہ اپنی بیوی کو ان کے ساتھ باہر آنے کی اجازت دے دے گا۔ عہد کرتے وقت ظفر ہمیشہ یہ شرط لگا دیتا " اگر میری بیوی پسند کرے تو " اس پر امجد میاں کہتے " وہ ہمارا ذمہ "۔ ایسے موقعوں پر بوجھم کے چہرے پر ایک حقارت آمیز چمک آ جاتی اور وہ دل ہی دل میں ظفر پر ہنستا اور سوچتا کہ شادی کے بعد میاں کی طبیعت صاف ہو جائے گی۔ اگلا مہینہ آتا اور گذر جاتا، اور عہد یوں ہی فرسودہ ہو جاتے۔

تین پڑھے لکھے نوجوان اچھے عہدوں پر مامور، اور کیا چاہیئے تھا، ایک عجب تسلسل سے اُن کی شادی کے پیغام آتے۔ سب سے پہلے ظفر کے لئے کوشش ہوتی، وہ کہہ دیتا میری نسبت ہو چکی ہے اس کے بعد وہی رشتہ نازکی کے لئے تجویز ہوتا، ظفر اور امجد میاں بغیر جانے پہچانے اس سے کہتے عجب رشتہ ہے نازکی۔ اس سے بہتر گھر نہیں مل سکتا۔ اور لڑکی کی تعریف میں وہ کئی کئی دن زمین آسمان کے قلابے ملایا کرتے۔ نازکی کہتا میں ایسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں جس میں راہبہ کی سی خود سپردگی، اور قلوپطرہ کی سی گرمی ہو اور جو مجھ سے عمر میں کم از کم پانچ سال بڑی ہو۔ اس پر وہ دونوں میز پر ہاتھ مارتے ہوئے زور زور سے کہتے " اس میں یہ سب باتیں ہیں، ہم گواہ ہیں "۔ نازکی کے بعد کئی ہفتے یہ انتظار رہتا کہ شاید وہی رشتہ امجد میاں کے لئے بھی تجویز ہو لیکن نجانے کیوں وہ انکار سُنکر سبھی خاموش ہو جاتے۔ امجد میاں کو یہ بات محسوس تو ہوئی لیکن وہ یہ کہتے " ہمارا کیا ہے، بس یہ ایک سال کاٹنا ہے، اگر گذر گیا تو پھر ہماری شادی نہیں ہوگی "۔ البتہ اس کاٹنے کے سال کے دن وہ گن گن کر گذارا کرتے۔ امجد میاں کی زندگی میں محبت نے کبھی شدید صورت اختیار نہیں کی تھی، کبھی خط و کتابت بہت کرتے تھے، اب یہ سلسلہ بھی کم ہوتا جا رہا تھا، دو ایک نے بہت انتظار کے بعد شادی کر لی اور اب ایک ہی رہ گئی تھی جسے امجد میاں " عزیزی نگار " خطاب کرتے تھے اور وہ انھیں امجد بھائی لکھتی تھی۔ ظفر نے کئی بار امجد میاں سے پوچھا کہ آخر وہ اس لڑکی سے شادی کیوں نہیں کر لیتا لیکن امجد میاں کو یہ اعتراض تھا کہ وہ بہت فیشن پسند ہے اور یہاں آپ کی قمیض کے بٹن تک کبھی پورے نہیں ہوئے، اور پھر وہ بالکل غیر جذباتی

جیسے برف کا ٹکڑا۔ ظفر نے کہا۔ یعنی برف کے ٹکڑے بہت جلد پگھل جاتے ہیں لیکن وہ خط وکتابت سے زیادہ اُس لڑکی کو اپنی زندگی میں جگہ دینے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ اس کے باوجود نگار کا خط جب آتا تو امجد میاں برآمدوں میں چکّے پھیرتے اور ظفر اور نازکی پہلے ایک ساتھ، اور پھر علیحدہ علیحدہ وہ خط پڑھتے اور "امکانات" پر رائے زنی کرتے۔

بوجہم دن کا بیشتر حصہ ان لوگوں کے ساتھ گذارنے کے باوجود ان سے الگ تھلگ رہتا، اس کی ایک اپنی دنیا تھی اور وہ اپنی خاموشی سے دوسروں پر یہ ثابت کرتا کہ وہ دنیا ان لوگوں کی دنیا سے جس میں چھچھے حماقتیں اور چہلیں تھیں نہ صرف علیحدہ تھی بلکہ بلند بھی، وہ ان سب کے قصّے ان کی زبانی سنتا اور چپ رہتا۔ جیسے کچھ کہنے سے وہ اپنے معیار سے نیچے آجائے گا اور دیکھنے والے شاید یہ سمجھیں کہ اسے ان باتوں میں کوئی دلچسپی ہے۔ اس نے زندگی میں اپنی راہ ڈھونڈ لی تھی اور اس پر چلا جا رہا تھا۔ وہ راہ کہاں جا نکلتی تھی؟ اس کے لئے اس سوال کی کوئی اہمیت نہ تھی، اس کے لئے یہی کافی تھا کہ یہ سڑک ہموار اور پکی تھی اور اس پر چلنے میں پاؤں پھسل جانے کا کوئی خدشہ نہ تھا، نازکی نے ابھی تک راہ اختیار کرنے کے مسئلے پر غور ہی نہیں کیا تھا، اور اسکی سادگی سے معلوم ہوتا تھا کہ شاید اُسے اس کی ضرورت بھی نہ پڑے۔
امجد میاں اور ظفر نجانے کن کن الجھی سلجھی پیچدار راہوں میں گرفتار تھے۔ انھوں نے کئی پرانی پگڈنڈیاں، کئی سیدھے ہموار راستے جن کے دائیں بائیں سبزہ لہلہا رہا تھا محض اس ایک کسک کی خاطر چھوڑ دی تھیں جو ان کے دل میں جستجو سی بن بن کر ابھرتی تھی، وہ بوجہم کو اس کی راہ پر جاتے دیکھتے، چھوٹی دیوار کا سبز مخمل کا ہیٹ پہنے ہوئے جو اُس کے ماتھے کے نصف تک جھکا ہوتا اور ہنس دیتے، عجب آدمی تھا چھ سال سے یہی ہیٹ پہنے تھا۔ آج سے چھ سال پہلے یہ ہیٹ بوجہم کا چھوٹا بھائی پہنتا تھا اور ہر مہینے اسے نیا رنگ کروایا جاتا تھا۔ کبھی سرخ، کبھی سیاہ، کبھی نیلا اور دونوں بھائی باری باری اسے پہنتے۔ ظفر نے اس ہیٹ کو پھنکوانے کے لئے کیا کیا نہ کیا، یہاں تک تو کہا کہ یہ ہیٹ بوجہم کے دادا جان کی محفلیں وا سکٹ کی یادگار ہے لیکن بوجہم پر اسکا کوئی اثر نہ ہوا۔ [illegible] اس کے لئے ایک خاص جاذبیت رکھتی تھی۔ لوگ جنھیں، جو چاہیں کہیں، لیکن وہ اڑا رہتا یہ ثابت کرنے کے لئے کہ ان کی ہنسی اور ان کی باتیں اُس تک پہنچ نہیں پاتیں۔ اسکی چال کے متعلق ہر شخص نے کچھ نہ کچھ کہا۔ اور امجد میاں تو اس کے لئے کوئی فقرہ یا پھبتی ڈھونڈنے کی فکر میں نجانے کتنی راتیں پریشان رہے۔ چلنے میں اس کا اوپر کا دھڑ تیر کی طرح سیدھا رہتا، ٹانگیں گھٹنوں تک اندر کی طرف خم کھاتیں جیسے گھٹنے بار بار آپس میں ملنے کے لئے بیقرار ہوں۔ گھٹنوں سے ٹخنوں تک کوئی جھکاؤ نہ آتا، یقین کے ساتھ کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ اسکی چال بری ہے یا بھلی لیکن اس پر سب کو اتفاق تھا کہ انوکھی ضرور ہے۔ اجنبی سڑک پر دیکھ کر رک جاتے اور دور تک اسے جاتے دیکھتے، ان کے چہروں پر نہ ہنسی ہوتی نہ ہمدردی، محض حیرانی۔

ان سب باتوں کے باوجود وہ ہر روز ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتا۔ وہ ظفر کے چھپے ہوئے زہریلے اشارے امجد میاں کے چٹکلے اور سادگی میں کہی ہوئی نازکی کی چبھتی ہوئی باتیں نوالوں کے ساتھ ساتھ نگل جاتا، جب بھی اسے بے حد تکلیف ہوتی تو وہ جلدی جلدی کھانا ختم کر کے "بہت کام ہے" کہہ کر اٹھ جاتا، نازکی ظفر سے کہا کرتا "تم اسے اتنا چھیڑتے ہو وہ تم سے ناراض ہو جائے گا۔" لیکن ظفر تو چاہتا تھا کہ اسکی خاموشی کسی طرح ٹوٹے۔ ناراضی کی صورت ہی میں کیوں نہ ہو، وہ غصے میں آ کر کچھ کہے تو کسی جذبہ یا احساس کا اظہار تو کرے وہ ایک پتھر کی طرح بیٹھا رہتا تھا۔ اس کی خاموشی سے ان تینوں کے دلوں میں ایک موہوم سا خوف پیدا ہو رہا تھا جیسے بوجہم اس انتظار میں ہو کہ کبھی تو اسے بھی موقع ملے گا۔ یہ سب اس پر ہنستے تھے، اس کے وقار کو جھوٹا سمجھ کر اس کی تضحیک کرتے تھے۔ آخر ان کے اپنے پاس تھا کیا؟
ایک روز ظفر نے کھانے پر اس انگریز کا قصّہ چھیڑ دیا جس کے ساتھ بوجہم نے کچھ روز کام کیا تھا۔ دراصل بوجہم کی اس انگریز سے ٹھن گئی تھی، اور وہ بھی بوجہم پر ہنسا کرتا تھا۔ ظفر نے بتایا کہ ایک محفل میں اس نے بوجہم کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ "اس کے وقار میں ایک ایسا جلال ہے کہ اسے ہائی کورٹ کا جج ہونا چاہیئے۔" بوجہم کے ہونٹ بھنچ گئے ایک لمحے کے لئے ظفر کو محسوس ہوا کہ وہ برس پڑے گا۔ لیکن وہ لمحہ گذر گیا اور بوجہم خاموشی سے اپنی پکی سڑک پر اپنی مخصوص رفتار میں چلتا رہا۔
اچھا بھلا ظفر الجھ گیا، پہلے تو امجد میاں یہ کہتے رہے کہ یہ کیفیت

محض خیالی ہے۔ جان بوجھ کر ظفر اپنے آپ پر وار کر رہا ہے۔ لیکن ظفر بیچارہ راہوں کی بھول بھلیوں میں کچھ ایسا کھو گیا کہ اب کسی طرف اس کا قدم نہ اٹھ پاتا تھا۔ وہ اس کے قہقہوں میں کچھ ایسی شریک ہوئی کہ اس کی زندگی کا اہم ترین جزو بن گئی۔ نقرئی ہنسی بن کر وہ دن رات اس کی رگوں میں دوڑتی پھرتی۔ وہ اپنے جذبے کی شدت میں یہ بھول گیا کہ وہ شادی شدہ تھی۔ اس کا اپنا گھر تھا، اسے تو محض اپنے جذبے کی گہرائی اور خلوص سے مطلب تھا، باقی سب باتیں اس کے لئے غیر متعلق تھیں۔ ایک ایک کر کے اس کی زندگی کی ہر گرہ کھل گئی اور وہ لہروں کے ساتھ چل نکلا ایک ایسی سمت جہاں دور تک کوئی کنارہ نہ تھا، اب وہ نوجم کو برآمدوں میں مصروف گھومتے دیکھتا تو اس کے ذہن پر ایک ضرب سی لگتی۔

اپنے آپ کو بچانے کے لئے، یا محض اس خیال سے کہ اپنے جنون کو وہ کسی مصروفیت میں بھلا سکے، ظفر نے بغیر سوچے سمجھے گھر والوں سے کہہ دیا کہ وہ جہاں چاہیں اس کی شادی کر دیں، اور اس کی شادی ہو گئی۔

نازکی اور امجد میاں نے اپنے اپنے عہد نامے نکالے۔ بھابھی جان کو سمندر کی سیر کرائی، سینما دکھائے، کانی کی رنگینیوں سے آشنا کیا اور "بھابھی جان" پہلے "نرگس" بنیں اور پھر "نرگس" سے "نگی"۔

امجد میاں آتے۔ قدرے تکلف سے شام کی چائے پیتے اور بڑے زور سے انکار کرتے ہوئے رات کا کھانا کھاتے اور دیر تک بیٹھے باتیں کیا کرتے۔ اور قریب قریب ہر رات یونہی ہوتا، نرگس ان کی باتیں سن کر لوٹ پوٹ ہو جاتی۔ ان کا ایک اپنا انداز تھا، آپ نے کچھ کہا اور وہ جھٹ بولے کہ صدیقی اکرام الدین والا قصہ بھی کچھ ایسا ہی ہے، آپ اگر پوچھ بیٹھے کہ صدیقی اکرام الدین کون صاحب تھے تو امجد میاں بگڑ جاتے۔

"اس سوال کی آخر کیا ضرورت ہے، آپ واقعہ سنئے" کنور چھپال غلام الحسنین، حکیم وراج الحق اور ایسے ہی کئی اجنبی نام وہ اپنی باتوں میں اس اعتماد سے لئے جاتے جیسے سبھی ان سے واقف ہیں، اور اگر کوئی اصرار کرتا کہ وہ کسی نام کی وضاحت کریں تو وہ ہاتھ جوڑ دیتے کہ حضور غلطی ہوئی آئندہ کبھی یہ نام زبان پر نہ لاؤں گا۔ کبھی کبھی جب بہت دیر ہو جاتی تو امجد میاں [illegible] ٹھیک [illegible] ظفر اپنے کمرے سے نکلا تو اس نے دیکھا کہ نرگس بڑے غور سے امجد میاں کی قمیض میں بٹن ٹانک رہی ہے، اس نے ہنسی میں کہا "نوبت بہ اینجا رسید" امجد میاں گھبرا سے گئے۔ ظفر اس ردِ عمل پر بہت حیران ہوا۔ اور جب نرگس نے دھاگہ توڑتے ہوئے کہا "آپ کو کسی ایسے شخص کی ضرورت ہے جو آپ کا دھیان رکھے" تو امجد میاں جیسے بوکھلا سے گئے۔ ظفر یہ سارا واقعہ قریب قریب بھول چکا تھا لیکن برآمدے میں سے گذرتے ہوئے جب اس نے کسی کو یہ کہتے سنا "اب امجد میاں کو شادی کی کیا ضرورت ہے" تو وہ چونک اٹھا اور اس کا یہ احساس کہ امجد میاں کچھ دنوں سے اس سے کھنچے کھنچے رہتے تھے ایک سیاہ خوف بن کر ابھر آیا۔ اُسے یہ خیال آیا کہ اس نے تو اپنے جنوں سے بچنے کے لئے یہ شادی کر لی تھی لیکن عورت ایک کھوکھلی شخصیت سے کیسے مطمئن ہو سکتی تھی۔ اس روز دوپہر کو نوجم سب سے پہلے کھانے کی میز پر پہنچے ہوئے تھے۔ امجد میاں کو بلانے کے لئے دو دفعہ ملازم بھیجا گیا۔ وہ آ کر ابھی بیٹھے ہی تھے کہ نوجم نے ان سے کہا "کیوں امجد میاں بہت پریشان نظر آ رہے ہیں آپ، معلوم ہوتا ہے کانٹے کا سال گذر گیا ہے آپ کا" ظفر کے جیسے کسی نے زور سے تھپڑ مارا ہو۔ وہ تیزی سے نوالے نگلنے لگا۔ نوجم نے اس سے کہا "بہت جلدی میں ہو؟" "ہاں۔ کام بہت ہے"۔ اور ظفر اٹھ کر چلا گیا۔ آج نوجم کی آنکھوں میں ایک چمک تھی۔ امجد میاں سامنے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ ظفر کی خالی کرسی ذرا جھک کر پیچھے کو گر گئی تھی۔ اس نے "نازکی" کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو "بس ایک تم رہ گئے"۔

(حلقۂ اربابِ ذوق کراچی میں پڑھا گیا)

ایجنٹ صاحبان سے

(۱) چونکہ کاغذ کی کمیابی کی وجہ سے ماہِ نو ایک محدود تعداد میں چھپ رہا ہے اس لئے اگر آپ کے آرڈر مہینہ کی دس تاریخ تک نہ پہنچ گئے تو اگلے مہینہ کا پرچہ آپ کو یا تو بالکل نہ مل سکے گا یا معقول تعداد سے کم ملے گا۔ (۲) جن ایجنٹوں نے ایجنسی کے خرانہ پر [illegible] واپس نہیں بھیجے ان کی خدمت میں پرچہ اس وقت تک نہیں بھیجا جائیگا جب تک [illegible] نہ مل جائے۔ (۳) خط و کتابت میں نمبر ایجنسی [illegible] لکھنا ضروری ہے۔

مجتبیٰ اصم

ایران کی تعلیمی ترقی

ایران ہمیشہ سے مشرق و مغرب کی کشمکش کا مظہر رہا ہے لیکن ایران نے مغرب پرستی کے طوفان میں اپنی انفرادیت کو قائم رکھا اور مغرب کی تعلیمات کو ایک احساس کمتری کے ساتھ قبول کرنے کے بجائے ان کے صالح اجزا کی ترکیب اپنے ملکی ماحول اور روایات کے ساتھ کی اور ان کی ہم آہنگی سے ایک جہان نو کی تشکیل کیا۔ اس جہان نو کی تشکیل کی ایک جھلک ہمیں ایران کی تعلیمی ترقی میں نظر آتی ہے۔

گو رضا شاہ کی حکومت سے پہلے ہمیں جا بجا علم و فنون کی نشاۃ ثانیہ کی کوششیں نظر آتی ہیں۔ مثلاً ۱۸۵۲ء میں دار الفنون کی تنظیم ہوئی ۱۸۷۳ء میں لسانیات کے اسکول کی بنیاد رکھی گئی اور ۱۸۷۶ء میں حکومت نے دوسرا کالج قائم کیا جس میں یورپین کے علاوہ ایرانی اساتذہ بھی تھے۔ فوجی تعلیم کی طرف حکومت کی توجہ زیادہ تھی چنانچہ اصفہان میں ۱۸۸۳ء میں اور طہران میں ۱۸۸۶ء میں ملٹری کالجوں کی بنیاد رکھی گئی لیکن مجموعی حیثیت سے ایران کی تعلیمی پالیسی بیرونی ممالک کے ہاتھ میں تھی۔ تعلیم کی از سر نو تنظیم کی پہلی کوشش ۱۸۹۸ء میں ہوئی۔ قومی درسگاہوں کی ایک کونسل کی بنیاد رکھی گئی جس کے اراکین ملک کے ممتاز اشخاص تھے۔ اس کونسل نے اس سال دس اسکول قائم کئے جس میں فارسی، عربی، ریاضی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اسی کونسل کی سفارشات کے ماتحت حکومت نے سنہ ۱۹۰۰ء میں عمرانیات کی تعلیم کے لئے ایک اعلیٰ کالج کی بنیاد رکھی۔

سنہ ۱۹۰۶ء کے انقلاب کے بعد ایران میں صحیح معنوں میں قومی تعلیم کا ارتقا شروع ہوا۔ سنہ ۱۹۱۱ء کے تعلیمی ایکٹ نے قومی اور پرائیوٹ اسکولوں کے درمیان امتیاز قائم کیا۔ اس ایکٹ کی رو سے غیر ملکی اساتذہ پرائمری اسکولوں میں تعلیم دینے کے مجاز نہیں تھے۔ جس کا مقصد در اصل روس کے بڑھتے ہوئے اثر کو روکنا تھا۔ اس وقت تک پورے ملک میں لڑکوں کے لئے ۶۷ اسکول تھے جس میں ۴۴۳۰ طلبا تعلیم پاتے تھے۔ لڑکیوں کیلئے ۴۷ اسکول جس میں طالبات کی تعداد ۲۱۸۷ تھی۔ اس کے علاوہ دو ثانوی اسکول اور تین کالج تھے جس میں طلبا کی تعداد علی الترتیب ۲۵۱ اور ۱۵۷ تھی۔

ایران کے تعلیمی ارتقا میں اس کا قومی پہلو بہت اجاگر ہے۔ حکومت کی کوشش برابر یہ رہی ہے کہ تعلیم اس کے براہ راست کنٹرول میں ہو تاکہ غیر ملکی عناصر کہیں بھیس بدل کر قومی تعمیر کو نقصان نہ پہنچائیں۔ غیر سرکاری اسکول یوں تو ملک میں اب بھی ہیں لیکن حکومت نے ان پر خاصی پابندیاں لگا رکھی ہیں۔ نصاب تعلیم کی منظوری خود حکومت کی وزارت تعلیم کرتی ہے صرف یہی نہیں بلکہ اساتذہ کا تقرر بھی اسی کی سفارشات کے ماتحت ہوتا ہے۔ ۱۹۳۲ء کے بعد سے غیر ملکی پرائمری اسکول یکلخت بند کر دئے گئے ہیں۔ اور ثانوی اسکولوں کی بھی جانچ حکومت کے افسر وقتاً فوقتاً کرتے رہتے ہیں۔ آذربائیجان کی درسگاہوں میں حکومت کے خلاف سازش کا پتہ چل جانے کے بعد سے حکومت ان اداروں پر اور بھی سخت نظر رکھتی ہے۔

ایران میں عام تعلیم کے چار مدارج ہیں۔ کنڈرگارٹن، پرائمری، ثانوی اور اعلیٰ۔ کنڈرگارٹن سات برس سے کم عمر کے بچوں کے لئے ہے۔ سات برس کی عمر میں بچے لازمی طور پر پرائمری اسکولوں میں داخل ہوتے ہیں۔ مخلوط تعلیم کا رواج اس دور میں عام ہے لیکن لڑکوں اور لڑکیوں کے نصاب میں فرق ہوتا ہے۔ لڑکوں کے لئے قرآن، فارسی، ریاضی، تاریخ، جغرافیہ اور بہت معمولی عربی لازمی ہے۔ لڑکیوں کے لئے بھی یہی مضامین ہیں لیکن ان کے لئے معیار ہلکا کر دیا گیا ہے۔ اس کے بجائے انہیں ٹانک اور سلائی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ پرائمری اسکولوں کے لئے کتابیں خود حکومت اپنی نگرانی میں تیار کراتی ہے اور یہ کتابیں اسکولوں میں مفت تقسیم کی جاتی ہیں۔ تعلیم کے اس دور کے لئے کوئی فیس نہیں ملا۔ بسا اوقات تو یونی فارم کے اخراجات کی بھی حکومت ہی کفیل ہوتی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ سماجی امتیازات کہیں لڑکوں کے دماغ میں جڑ نہ پکڑ لیں جو آئندہ

چل کر قوم کے لئے مفید ثابت ہوں۔ پرائمری اسکولوں میں امتحانات پر زور نہیں دیا جاتا۔ چھ سال میں لڑکا چھ درجے کر لیتا ہے۔ ساتویں برس جو پرائمری اسکولوں کا آخری سال ہوتا ہے امتحان لیا جاتا ہے۔ یہی امتحان ثانوی اسکولوں میں داخلہ کا ہوتا ہے۔ اس امتحان کو پاس کئے بغیر نہ کوئی ملازمت مل سکتی ہے اور نہ کسی صنعتی اور حرفتی اسکول میں داخلہ ہو سکتا ہے۔

ثانوی تعلیم ایران میں لازمی نہیں ہے۔ پرائمری سرٹیفکٹ کے بعد لڑکے کو آزادی ہوتی ہے کہ وہ اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرے۔ ثانوی تعلیم کی مدت چھ سال ہوتی ہے جس کے بعد یونیورسٹی میں داخلہ ہو سکتا ہے۔ ثانوی تعلیم کے پہلے تین برسوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے تقریباً یکساں نصاب ہے دونوں ہی کو قرآن، ادب، ریاضی، سائنس، تاریخ و جغرافیہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ لڑکوں کو ان مضامین کے علاوہ طبیعات، کیمیا بھی سیکھنا ہوتا ہے اور اس کے عوض لڑکیوں کے لئے خانگی امور، تربیت اطفال اور سلائی کی تعلیم ضروری ہے فرصت کے اوقات میں کھیل، موسیقی اور ڈراموں پر زور دیا جاتا ہے۔ اس نصاب تعلیم سے یہ بات بخوبی ظاہر ہوتی ہے کہ ایرانی تعلیم کا مقصد ایسے بہترین شہری افراد تیار کرنا ہے تاکہ ان کا ملک دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کے دوش بدوش چل سکے لیکن اپنی روح کو ہر قیمت پر برقرار رکھے مغرب سے استفادہ کے باوجود اپنی وحدت برقرار رکھنا ایرانی تعلیم کا طرۂ امتیاز ہے۔

ثانوی تعلیم مفت نہیں ہے لیکن فیس محض معمولی ہے اور زیادہ سے زیادہ طلبا کی مالی اعانت کی جاتی ہے۔ ثانوی تعلیم کے پہلے تین سال بعد طلبا اس کے دوسرے حصے میں داخل ہوتے ہیں۔ پہلے حصے کے بعد طلبا سرکاری ملازمت اختیار کر سکتے ہیں لیکن اس صورت میں انہیں چوتھا گریڈ ملتا ہے۔ اسی حصہ کے بعد وہ سرکاری ٹیکنیکل اسکولوں میں داخلہ کے مجاز ہوتے ہیں۔

ثانوی تعلیم کے اخیر تین سالوں میں عربی فارسی سائنس کے علاوہ کسی بیرونی زبان کا علم بھی لازمی ہے۔ اس مدت کو ختم کرنے کے بعد یونیورسٹی میں داخلہ ممکن ہے یا جو شخص سرکاری ملازمت پسند کرے وہ ملازمت کے تیسرے گریڈ میں لیا جا سکتا ہے۔ ثانوی سرٹیفکٹ برٹش، امریکن اور فرانسیسی یونیورسٹیوں میں میٹرکولیشن کے برابر سمجھی جاتی ہے۔ آرٹس اور سائنس کے علاوہ ثانوی معیار کے صنعتی، زراعتی، کمرشیل، پیڈاگوجی اور مذہبی درسگاہیں بھی ہیں۔ اسی مناسبت سے یونیورسٹی میں بھی مختلف مضامین کے لئے اعلیٰ تعلیم کا نظم ہے۔ لڑکیوں کے متعلق حکومت کا رجحان یہ ہے کہ وہ نرسنگ یا تعلیمی ٹریننگ میں شریک ہوں

لیکن جو لڑکیاں عام نصاب میں شریک ہونا چاہتی ہیں ان پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ ابھی حال میں لڑکیوں کے لئے دو سال کا ایک علیٰحدہ کورس تیار کیا گیا ہے جہاں عام مضامین کے علاوہ صنعت و حرفت تربیت اطفال اور امور خانہ داری کی تعلیم دی جاتی ہے۔

۵ر فروری ۱۹۳۵ء کا دن ایران کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ رضا شاہ نے اسی دن طہران یونیورسٹی کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔ یہ یادگار دن آج بھی تعلیمی تہوار کے طور پر منایا جاتا ہے۔ یونیورسٹی کی عمارت خاص طور پر وضع کی گئی اور مختلف شعبوں کے لئے علیٰحدہ علیٰحدہ خوبصورت اور وسیع عمارات تیار کی گئیں۔ یونیورسٹی کے پانچ شعبے ــــ آرٹس، سائنس، میڈیکل، قانون، صنعت ــــ ہیں اور ہر ایک کو فیکلٹی کی حیثیت حاصل ہے چھٹا شعبہ دینیات اور مذہبیات کا شعبہ ہے جو حال ہی میں سپہ سالار کی مسجد میں قائم کیا گیا ہے۔ ہر شعبہ کی اپنی لائبریری ہے جس میں کتب بینی کے علاوہ نشر و اشاعت کا بھی کام ہوتا ہے اور کوشش کی جا رہی ہے کہ ہر مضمون کے متعلق دنیا کے اچھے اور مشہور مصنفوں کی کتابوں کا ترجمہ فارسی میں ہو جائے۔ اس مقصد کے لئے ایک علیٰحدہ دارالترجمہ بھی قائم کیا گیا ہے جہاں ماہرین کی نگرانی میں ترجمہ کا کام ہوتا ہے۔ شروع میں یونیورسٹی میں بیرونی ممالک کے پروفیسروں کی اکثریت تھی لیکن اچھے اور شوقین طلبا کو یورپین اور امریکی ممالک میں اعلیٰ تعلیم دلا کر حکومت نے یہ کمی پوری کر لی ہے اور اب غیر ایرانی پروفیسر بہت کم رہ گئے ہیں۔ طہران یونیورسٹی میں وسط ایشیا مثلاً عراق، عرب، ترکی اور ران کے علاوہ روس اور ہندوستان سے بھی طلبا کافی تعداد میں آتے ہیں۔ وزارت تعلیم ایران میں تین اور یونیورسٹیوں کے قیام پر غور کر رہی ہے۔ ایران میں اعلیٰ تعلیم کے اخراجات بہت کم ہیں۔ یونیورسٹی کلاسوں کی فیس محض برائے نام ہے اور میرا خیال ہے کہ دنیا کی کسی دوسری یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم اتنی کم خرچ نہیں ہے جتنی ایران میں۔

یونیورسٹی میں صنعتی اور میڈیکل تعلیم پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ انجینئرنگ کا کورس چار سال کا ہے جس میں الیکٹریکل سول اور میکینیکل انجینئرنگ کے علاوہ کیمیا اور مائننگ (معدنیات) کا بھی کورس ہے۔ ڈاکٹری کے لئے ثانوی کے بعد چھ سال درکار ہوتے ہیں جس میں پہلا سال محض ابتدائی میڈیکل سائنس سے متعلق ہوتا ہے۔ قانون کا کورس تین سال کا ہے جس کے بعد وکالت کی سرٹیفکٹ مل جاتی ہے اس سرٹیفکٹ کے بعد اپیل سائنس کے

اعلیٰ درجوں میں بھی داخلہ ہو سکتا ہے جس کی مدت تعلیم دو سال ہے۔ مذہبیات کی مدت تعلیم تین سال ہے جس میں فلسفہ، فقہ، اور دینیات کے مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ یونیورسٹی تعلیم ختم کرنے کے بعد پہلے گریڈ کی سرکاری ملازمت مل سکتی ہے۔

یونیورسٹی کے قیام کا مسئلہ تعلیمی سے زیادہ معاشیاتی اور سیاسی تھا۔ جیسا کہ میں گزشتہ صفحوں میں لکھ چکا ہوں کہ رضا شاہ کی حکومت نے تمام شعبہ ہائے زندگی کو ایک مستحکم اور ٹھوس قومیت کی تعمیر کے لئے استعمال کیا۔ تعلیم بھی اسی طرح محض تعلیم کی خاطر نہیں تھی بلکہ اس کا پس منظر بھی ثقافتی اور عمرانی رجحانات کی سربلندی تھا، معاشیات کو بھی اس سے ایک گہرا لگاؤ اس طرح تھا کہ یونیورسٹی کے قیام سے پہلے تقریباً ہر سال سو طلبا بیرون ممالک میں محکمہ تعلیم کی طرف سے اعلیٰ تعلیم کے لئے بھیجے جاتے تھے۔ دس لاکھ ریال کی رقم سالانہ ان طلبا پر صرف ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ کثیر رقم ان طلبا پر بھی خرچ ہوتی تھی جو دوسرے محکموں مثلاً زراعت، صنعت اور جنگ کی طرف سے بیرون ممالک بھیجے جاتے تھے۔ سنہ ۱۹۴۵ء کے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ سنہ ۱۹۲۲ء سے سنہ ۱۹۴۳ء تک تقریباً ۱۷۵۰ طلبا غیر ممالک سے فارغ التحصیل ہو کر آئے تھے۔ یہ رقم اب خود طہران یونیورسٹی کی توسیع میں خرچ ہونے لگی ہے۔ طلبا اب بھی یورپ، امریکہ یا بیروت کی امریکن یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم کیلئے بھیجے جاتے ہیں لیکن ان کی تعداد پہلے کے مقابلے میں کم ہوتی ہے۔

تعلیمی لحاظ سے ایران کو سب سے زیادہ ضرورت استادوں کے اسکول کی تھی۔ سنہ ۱۹۳۴ء کے ٹیچرس ٹریننگ ایکٹ کے بننے سے پہلے بھی ٹریننگ اسکول اور کالج تھے پھر بھی ملکی ضروریات کے لئے اچھے استادوں کی فراہمی ایک دقت طلب سوال تھا۔ اس ایکٹ کی رو سے ٹریننگ کا پنج سالہ پروگرام تیار کر لیا گیا۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں سارے ملک میں ۳۶ ٹریننگ اسکول تھے اور سنہ ۱۹۴۵ء میں ان کی تعداد ۳۴ تھی۔ ان اسکولوں میں داخلہ لینے والے طلبا کی حکومت کافی ہمت افزائی کرتی تھی۔ ان اسکولوں کی مدت تعلیم دو سال ہے جس کو پورا کرنے کے بعد ایک طالب علم پرائمری اسکولوں میں پڑھانے کا مجاز ہو سکتا ہے۔ ٹریننگ اسکولوں میں داخلے کیلئے عام طور سے جونیئر ثانوی سرٹیفکیٹ اور اٹھارہ سال کی عمر کی شرط ہے۔ اسے پاس کرنے کے بعد ٹریننگ کالج میں داخلہ ہو سکتا ہے۔ اس کالج میں داخلہ براہ راست بھی سینیئر ثانوی سرٹیفکیٹ کے بعد ہو سکتا ہے۔ یہ کالج یونیورسٹی کا بہترین کالج ہے۔ اس کی عمارت بھی شاندار ہے جس میں تعلیمی ضروریات سے متعلق تمام سامان موجود ہیں۔ سنہ ۱۹۴۰ء تک ۵۰۰ طلبا اس کالج سے ڈگری حاصل کر چکے تھے۔ سنہ ۱۹۴۵ء میں اس کالج میں ۵۰۰ طلبا موجود تھے۔

ٹیکنیکل ٹریننگ کے لئے علیحدہ نصاب ہے۔ یہ تعلیم وزارت صنعت کے ماتحت ہے۔ ان کے پرائمری اسکولوں میں قالین بننے، زراعت، نجاری اور لوہے کا کام سکھایا جاتا ہے۔ ثانوی اسٹیج میں لڑکا انڈسٹریل اسکول میں داخل ہوتا ہے جہاں حقیقی طور پر اس کی صنعتی تعلیم شروع ہوتی ہے۔ پرائمری اسکولوں کا کام محض بچوں کے دماغ کو اس موضوع کے لئے تیار کرنا ہوتا ہے۔ انڈسٹریل اسکول کی مدت تعلیم چھ سال ہے۔ پہلے چار سال میں صنعت سے متعلق مختلف مضامین پڑھائے جاتے ہیں اخیر کے دو سال میں لڑکا اپنی پسند اور رجحان کے مطابق کسی ایک مضمون کا انتخاب کرتا ہے اور اس میں امتیاز حاصل کرتا ہے۔ باہمت اور بلند حوصلہ طلبا کے لئے انڈسٹریل کالج بھی موجود ہے جہاں اس موضوع سے متعلق جدید اور اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کالج میں غیر ملکی اساتذہ کافی ہیں لیکن ایرانی طلبا کو غیر ملکی تعلیم حاصل کرا کے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش برابر جاری ہے۔ ایران میں سینکڑوں ٹیکنیکل کالج ہیں۔ ان میں سے اکثر خاص قسم کی صنعت یا کاٹیج انڈسٹری کی تعلیم دیتے ہیں۔ چند ایسے بھی ہیں جن کا مقصد بچوں کو جدید ترین ٹیکنیکل تعلیم دینا ہے۔ اس سلسلہ میں لڑکیوں کے ٹیکنیکل اسکول کا ذکر بہت ضروری ہے جس کی عمارت جدید شہر کی بہترین عمارات میں سے ہے۔ ان کے علاوہ ٹیکنیکل اسکول اور کالج مختلف مضامین مثلاً ملٹری سائنس، زراعت اور تجارت کی تعلیم کے لئے بھی ہیں لیکن ان کا تعلق وزارت تعلیم سے نہیں بلکہ اپنے اپنے محکموں سے ہے۔ وزارت زراعت کی طرف سے مویشیوں کے علاج اور زراعت کیلئے دو کالج کاراج میں موجود ہیں۔ محکمہ جنگ کی طرف سے مشہد، اصفہان، تبریز، شیراز اور کرمان میں ملٹری اسکول ہیں۔ اعلیٰ ملٹری تعلیم کے لئے ملک میں تین ملٹری کالج ہیں اور دو مزید کالجوں کے قیام کی تجویز زیر غور ہے۔ اسی طرح وزارت مواصلات پوسٹ اور ٹیلیگراف کے ماتحت بھی اسکول اور کالج ہیں جو لڑکوں کو ان محکموں سے متعلق امور کے لئے تیار کرتے ہیں۔

ایران کی تاریخ سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ فنون لطیفہ سے اس ملک کو گہرا شغف رہا ہے۔ کچھ تو فطرت نے آب رکنا باد و گلگشت مصلیٰ کے رومان آفریں ماحول سے اس ملک کی فضا کو آرٹ کی پرورش کے لئے سازگار بنا دیا ہے، اور کچھ عہد قدیم کی شاندار روایات نے جس میں اسلام سے پہلے زرتشتیوں کا بہت بڑا حصہ ہے اس آرٹ کے پہلو کو اور

اُجاگر کر دیا ہے۔ ساقی و بہزاد کی سرزمین جس میں عمر خیام نے زندگی کی نئی لہر دوڑائی تھی اس شاندار پہلو کو کیسے فراموش کر سکتی ہے۔ آج بھی ایرانیوں کی زندگی میں یہ پہلو بہت نمایاں ہے۔ حکومت نے فنون لطیفہ مثلاً تصویر کشی پینٹنگ، موسیقی کی تعلیم کے لئے اچھے اچھے اسکول اور کالج بنائے ہیں۔

تعلیم بالغان کے بغیر ایران میں تعلیمی سرگرمیوں کا ذکر ادھورا رہ جائیگا ۱۹۳۶ء میں حکومت نے بہت بڑے پیمانہ پر جہالت کے خلاف محاذ قائم کیا اور اپنے تمام محکموں کو ہدایت کی کہ وہ اس سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ کاوش کریں۔ دو سال کا ایک کورس ایسی تعلیم کے لئے مرتب کیا گیا جس میں پہلے سال میں معمولی لکھنا پڑھنا اور حساب سکھایا جاتا ہے۔ دوسرے سال میں اصول حفظان صحت، معمولی تاریخ و جغرافیہ اور شہریوں کے حقوق اور حکومت کی ذمہ داریوں کے متعلق ان کو معلومات بہم پہونچائی جاتی ہیں۔ تعلیم بالغان کے سلسلہ میں ایرانی حکومت کو خاطر خواہ کامیابی ہوئی ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۵ء تک جس میں دوسری جنگ عظیم کے پانچ سال بھی شامل ہیں تقریباً ساڑھے تین لاکھ بالغوں نے اس اسکیم سے استفادہ حاصل کیا اور پرائمری سرٹیفکٹ کے مستحق ہوئے۔

ایران نے بیس سال کے عرصہ میں جو حیرت انگیز تعلیمی ترقی کی ہے وہ مندرجہ ذیل نقشہ سے ظاہر ہے۔

	۱۹۲۲ء	۱۹۴۲ء
کنڈرگارٹن	۸	۳۸
مکتب	۱۱۴	۳۸۲۰
پرائمری اسکول	۵۱۶	۱۸۵۰
ثانوی اسکول	۲۵	۲۸۰
ٹریننگ اسکول	×	۲۲
ٹیکنیکل اسکول	×	۱۸
کالج	۲	۱۷
یونیورسٹی	×	۱
اسکول بالغان	×	۵۲۰
مذہبی کالج	۷	۳۵۳

یہ سرکاری درسگاہوں کی تعداد ہے۔ خاصی بڑی تعداد غیر سرکاری لیکن حکومت سے منظور شدہ اسکول اور کالجوں کی ہے ۱۹۴۲ء میں اسکولوں کی مجموعی تعداد ۹۷۱۵ تھی جس میں طلبا کی تعداد ۱۱۳۹۶۰ تھی۔ ۱۹۲۲ء میں ایسے اسکولوں کی مجموعی تعداد صرف ۶۱۲ تھی ۱۹۴۲ء کے بجٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ تعلیمی اداروں پر تقریباً تیس لاکھ پونڈ کی رقم خرچ ہوئی تھی۔

دوسرے ایشیائی ممالک کی طرح ایران میں تعلیم محض کتابوں تک محدود نہیں رہی۔ ایران کی تمام تعلیمی کاوشوں میں ایک قومی روح جلوہ گر ہے جس کا مقصد نہ صرف اپنے ملک کی ترقی ہے بلکہ مطمح نظر ایشیا کی وہ سربلندی ہے جہاں سے علم و تمدن کی کرنیں ساری دنیا میں پہنچی تھیں۔ ۱۹۴۴ء میں اے حکمت وزیر تعلیم ایران نے جو ہندوستان میں ثقافتی اخوت کا وفد لے کر آئے تھے فرمایا تھا کہ ہم چاہتے ہیں کہ ایشیا پھر اپنی اصلی ہے، روحانیت کی وہ روح پیدا ور فضا پیدا کرے جہاں مسلسل جنگوں کی تھکی ماندی اور بے روح دنیا ابدی زندگی کی ازسرنو کیفیات محسوس کرنے لگے۔ ایران کی تعلیم میں اس بلند ثقافتی مقصد کا پتہ موجود ہے۔

فضل حق قریشی دہلوی

آبِ رواں کی سرزمین

ارضِ بنگال کا وہ طویل و عریض حصہ جو صوبے کی تقسیم کے بعد مشرقی بنگال کہلاتا ہے اور قلبِ انسان کی طرح جس کے سینے میں سارے مشرقی پاکستان کا صدر مقام، آنے والی زندگی کی نئی تڑپ کو عملی جامہ پہنانے کے منصوبے تیار کر رہا ہے حقیقتاً سارے ارض پر بھی اتنا ہی ہموار ہے جتنا کہ نقشے میں نظر آتا ہے۔ شاید اس لئے کہ ایک پرانی روایت کے مطابق دیوتا کا لے اپنے ہاتھوں سے چل پھلا کر یہاں کی ناہموار زمین کو ہم سطح بنایا اور وزانی کی کوششوں سے دریاؤں کی رکی ہوئی موجوں کو آگے بڑھا کر ندیوں اور نہروں میں تبدیل کیا تھا۔ اسی اعجاز کے زیرِ اثر آج بھی یہ حصہ ملک تشبیہ و استعارے سے قطع نظر آبِ رواں اور شاداب مرغزاروں کی سرزمین بنا ہوا ہے۔ پنجاب کے دریا صرف ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنے جاتے ہیں لیکن یہاں کے دریاؤں کا شمار کرنے کے لئے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں درکار ہیں۔

یہاں صاف شفاف اور میٹھے پانی کے تیز دھارے ہیں اور ساحلوں کے ساتھ ساتھ زمرد اگلنے والے ہرے بھرے کھیت جن میں مخلوق کا پیٹ بھرنے والے اناج سے لے کر انسانی ضروریات کی ہر چیز اپنی انتہائی صورت میں اگتی اور حیات افزا ہواؤں کے دوش پر پل کھاتی ہوئی پروان چڑھتی ہے۔ یہاں کی ہر سال بڑھتی ہوئی گنجان آبادی یقیناً ملک بھر کے لئے وبالِ دوش ہو جاتی لیکن قدرت کی فیاضی ایسے روز بد کو قریب آنے نہیں دیتی۔ چاول کی پود جو بہتے ہوئے پانی پھیلائی جاتی ہے بڑی مضبوطی سے جڑ پکڑتی اور خوب پھولتی پھلتی ہے۔ چنانچہ پنجاب کی طرح یہاں کے باشندے بھی دیہاتوں میں آباد ہیں اور ان کا پیشہ کاشتکاری ہے۔ وہ اپنی روزی اس طرح کماتے ہیں کہ ماتھے کا پسینہ بہ کر پاؤں تک آ جاتا ہے تاہم وہ اس زندگی سے ناخوش نہیں ہیں۔

ان دیہاتوں سے قطع نظر شہروں کی آبادی نہایت پررونق شاندار اور نئی رنگینیوں میں ڈوبی ہوئی ہے۔ کھیتوں کے ظلمات سے نکل کر جب انسان شہر کی بھول بھلیوں میں پہنچتا ہے تو اس کی حیرت ایک نیا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ یہاں خاموشی کی بجائے نت نئے ہنگاموں سے واسطہ پڑتا ہے۔ یہ گہما گہمی اس وقت کی پیداوار نہیں بلکہ مغلوں کے عہد سے قائم ہے اور شاید آئندہ گھٹنے کی بجائے اس میں اضافہ ہوتا رہے گا۔

بنگال کے اس نصف بہتر حصے کے مغرب میں راج محل نامی پہاڑیاں ہیں جو پتھریلی ہونے کے باوجود سرسبز تناور درختوں سے ہر وقت ڈھکی رہتی ہیں۔ مشرق میں وہ زبردست دریائے برہمپتر ہے جس کے کنارے نانگل بند کے مقام پر ہر سال چیت کے مہینے کی آٹھ تاریخ کو ایک بڑا بھاری میلہ لگتا ہے اور جس کے پانی میں ڈبکی لگا کر اہلِ ہنود اپنے جسموں سے گناہوں کی آلودگی دھو ڈالتے ہیں۔ شمال میں ریاست سکم اور نیپال ہیں جن کے عقب میں برف پوش پہاڑوں کا طویل و بلند سلسلہ قائم ہے۔ جنوب میں خلیج بنگال ہے جس کے کنارے کنارے مسافروں اور تجارتی چیزوں سے لدے ہوئے دنیا بھر کے جہاز رک رک کر گذرتے رہتے ہیں۔ اگر کسی بلندی سے ان برف پوش پہاڑوں اور ان کے دامن میں لہلہانے والے سرسبز کھیتوں پر بیک وقت نظر ڈالی جائے تو محسوس ہوگا کہ قدرت نے پاکستان کا ہرا جھنڈا سفید پٹی کے ساتھ پہلے ہی پھیلا کر رکھ دیا تھا۔

سمندر سے سو میل پرے اس مقام پر جہاں دریائے میگنا، گنگا، برہمپترا اور اشامتی سر جوڑ کر ایک ہو جاتے ہیں، وکرما جیت نے اپنی حکومت کا سب سے پہلا راج گڑھ قائم کیا جو دو ہزار سال گزرنے کے باوجود آج بھی مشہور ہے۔ بسانے والے کے نام پر اس شہر کا نام وکرم پور تھا جو اس کے بعد بھی بہت سے بودھی راجاؤں کا صدر مقام رہا۔ لیکن اب ساری مشرقی بنگال میں ان کا کوئی ایسا نام لیوا باقی نہیں ہے جو کسی چھوٹی سی ریاست ہی کو سنبھالے بیٹھا ہو۔ زمانے کی دستبرد سے بچ جانے والے چند کھنڈر اس وقت کی خصوصاً مشہور راجہ بلال سین کی عہد کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

وکرم پور کے عین مقابل دریائے اشامتی کے دوسرے ساحل پر سونار گاؤں آباد ہوا جس پر بہت سے ہندو راجے یکے بعد دیگرے

قابض رہے۔ اب ان کے عہد کی یادگار ایک معمولی عمارت ہے جو کبھی شاہی خزانے کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ مسلمانوں کی آمد سے قبل ہی اس کا زوال شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ جب بختیار خلجی افغانی فوج کو ساتھ لئے اس پر حملہ آور ہوا تو اسے بنگال کے آخری ہندو راجہ لکشمن سین کو اس کی راجدھانی لکھناؤتی سے نکالنے اور مشرق کی طرف بھگا دینے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ بختیار خلجی نے سارے سونار گاؤں پر قبضہ کر لیا اور حکومت دہلی کی ماتحتی میں ایک عظیم الشان اسلامی حکومت قائم کر لی۔

اس تاریخی واقعہ سے پہلے بحیثیت مجموعی بنگال کا کوئی نام مقرر نہیں تھا۔ ہر علمداری ایک علیٰحدہ نام سے موسوم کی جاتی تھی۔ تاریخ ہند میں لفظ بنگال سب سے پہلے "بنگا" لکھا گیا جو غالباً لفظ "ونگا" سے بنا تھا۔ ونگا کے معنی ہیں مشرق جیسے ونگالہ اگادھا بمعنی مشرقی سمندر۔ چونکہ یہ حصۂ ملک حکومت دہلی کے مشرق میں واقع تھا اس لئے مسلمان اسے ونگالہ کہنے لگے۔ صرف "و" کچھ عرصہ بعد "ب" سے بدل گیا جیسا کہ عموماً ہندی ناموں کے ساتھ ہوا ہے۔ بنگالہ بہت سے قدیم نوشتوں میں درج ہے۔ مارکوپولو نے بھی اپنے سفرنامے میں اسے بنگالہ ہی لکھا ہے۔ اس زمانے کے بنگالی بھی اپنے ملک کو بنگالہ اور اپنی زبان کو بنگلہ زبان کہتے ہیں۔

مسلمانوں کے عہد میں مشرقی بنگال بہت سے انقلابات کا شکار رہا۔ چونکہ مرکزی قوت سینکڑوں میل پرے دہلی میں قائم تھی اس لئے وہاں سے نافذ ہونے والے احکامات کی تعمیل یہاں مشکل سے ہوتی تھی اور بار ہا اُن کو نظر انداز بھی کر دیا جاتا تھا۔ ہر نائب السلطنت چاہتا تھا کہ ذاتی اغراض و مقاصد کی تکمیل میں کوئی کسر باقی نہ رہنے پائے۔ چنانچہ سو سال گذرے ہوں گے کہ فقیر الدین نامی ایک حاکم بنگال نے نیابت کا جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکا اور خود مختار بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ پھر کیا تھا جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ عنان حکومت صرف قومی ہاتھوں میں رہنے لگی زبردست کا ٹھینگا سر چڑھنے لگا۔ رعیت میں زیادہ تر ہندو شامل تھے۔ لیکن ان کا اخلاقی زور ٹوٹ چکا تھا۔ وہ ہر معاملہ بھگوان کے سپرد کر چکے تھے اسی پر بھروسہ کئے بیٹھے رہے۔ مسلمانوں کی اپنی اکثریت نہیں تھی۔ اس لئے صرف صاحب اقتدار لوگ آپس میں لڑتے جھگڑتے رہے۔ رعایا میں کسی قسم کا انتشار ہونے نہیں پایا۔ تقریباً دو سو سال اسی کشمکش میں گزرنے

پھلے گئے۔ بیٹے نے باپ کے خلاف تلوار اٹھائی اور کبھی بھائی اپنے ہی بھائی کے خلاف نبرد آزما رہا۔

افغانی فطرتاً جنگجو ہوتے ہیں لیکن شمالی ہند میں مغلوں نے اُن کا بھی تختہ پلٹ کر رکھ دیا۔ افغانی سکہ صرف سرزمین بنگال پر چلتا رہا۔ وہ بھی ہمایوں کے عہد تک۔ اکبر نے اس دوعملی کو گوارا نہ کیا اور ایک سرے سے دوسرے تک اپنا پرچم لہرا دیا۔ استحکام و اقتدار قائم کرنے کے لئے ضروری تھا کہ ایک نیا صدر مقام بنایا جاتا۔ چنانچہ سونار گاؤں سے بیس میل دور بڑی گنگا کے کنارے ایک نیا شہر ڈھاکہ آباد ہوا۔ زمانے کے بہت سے نشیب و فراز دیکھنے والا یہی شہر جو کبھی سارے بنگال کا پایہ تخت تھا، اب مشرقی پاکستان کا صدر مقام ہے۔ اس کی عظمت امتداد زمانہ کے ہاتھوں نیند کے آغوش میں سو گئی تھی مگر ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے ایک نئی کروٹ لے کر بیدار ہو چکی ہے۔ مشرق کے عجائبات میں سے وہ مثالی قسم کا جادو جو طلسم بنگال کہلاتا تھا، اب پھر ساری دنیا کو مسحور کرنے کے لئے چل پڑا ہے۔ وقت آ رہا ہے کہ یہ فردوس ارض جس کو قدیم سرکاری نوشتوں میں بھی "جنت البلاد" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، اپنی شان کا نیا نقش بٹھانا شروع کر دے۔

اس کی تشکیل اسلام خاں کے ہاتھوں عمل میں آئی تھی، اسی نے افغان فوج پر غلبہ پایا تھا، وہی اس شہر کا بانی سمجھا گیا۔ وہ جہانگیر کے معتبر وزرا میں بھی شامل تھا۔ اس کے بعد لوح تاریخ پر ابراہیم خاں، سلطان شجاع، میر جملہ اور شائستہ خاں کے نام ابھرتے ہیں۔ شائستہ خاں ملکہ ممتاز محل کا بھائی اور شاہجہاں کے دربار میں شمار ہوتا تھا۔ یہ زمانہ ڈھاکہ کے عروج کا تھا۔ ابراہیم خاں نے تجارت کے ساتھ ساتھ مختلف صنعتوں کو جو ترقی دی تھی، وہ آخر وقت تک قائم رہی۔ پارچہ جات کے ضمن میں تن زیب، آب رواں اور شبنم مشہور قسمیں تھیں جنہیں ممالک یورپ تک میں پسند کیا جاتا تھا۔ ڈھاکے کی ململ کو تو افسانوی حیثیت حاصل ہو گئی۔ لوگ آج بھی اسے یاد کرتے ہیں۔

اسی زمانے میں نرائن گنج سن کی تجارت و صنعت کا زبردست مرکز بنا۔ پہلے پہل یہ کام بڑے بے ڈھنگے پن سے شروع ہوا کیونکہ صنعت و حرفت کا کوئی سائنسی طریقہ رائج نہیں تھا۔ بعد ازاں دستکاریوں کے گھریلو اڈے کارخانوں میں تبدیل ہوتے چلے گئے۔ ہر کام بڑے پیمانہ پر

ہونے لگا۔ دریا کے کنارے کنارے بڑے بڑے گودام بنے، کارخانوں کی چمنیاں گویا زمین سے اگنے والے درختوں کی طرح سطح ارض پر ابھرنے لگیں پختہ حویلیاں بنیں اور کچے گھروندے۔ لوگ حسب حیثیت ان میں رہنے لگے۔ یہ شہر آج بھی سن اور سن کی مصنوعات کے لئے مشہور ہے۔

اٹھارھویں صدی کے شروع میں مرشد قلی خاں نے ڈھاکے کی بجائے مرشد آباد کو صدر مقام بنایا اور اس طرح ڈھاکے کی عظمت و شہرت میں داغ سا لگنے لگا اور جب مسلمانوں کی حکومت ہی زوال پذیر ہوئی اور مرہٹوں نے زور پکڑنا شروع کر دیا تو مغرب میں بیٹھ کر مشرق کا انتظام کرنا مشکل ہو گیا۔ نتیجہ یہ کہ برطانوی سوداگروں کی وہ تجارتی کمپنی جس نے سترھویں صدی کے آخر میں فورٹ ولیم کی بنیاد بھی رکھی تھی، بتدریج ہر شعبۂ حیات پر چھا جانے کے لئے پورا دباؤ ڈالنے لگی۔ ترقی کی راہ میں چونکہ کوئی بڑی رکاوٹ حائل نہیں تھی، اس لئے وہ جلدی ہی اپنا اقتدار قائم کرنے اور پنجے جمانے میں کامیاب ہوتے چلے گئے۔ اس کے بعد ڈھاکے کو سنبھالا تو ضرور ملا مگر وہ پہلی سی بات نصیب نہ ہو سکی۔ اب اس کی نشاۃ ثانیہ کا وقت آیا ہے۔ ہماری نظریں اسے پھولتا پھلتا دیکھنے کی متمنی ہیں۔

سلامتی کی کونسل کا نیا ریزولیوشن ———— بقیہ صفحہ ۲۵

دیکھے اور اغماض برتا۔ اور اب تک ریاست میں وہی فوجیں موجود ہیں جنہوں نے اپنی ستم رانیوں سے انھیں جلا وطن ہونے پر مجبور کیا۔ اس طرح گویا جو کشمیری کشمیر سے باہر جا چکے ہیں ان کا استصواب کے زمانہ میں کشمیر واپس آنا بعید دشوار ہے۔

دوسری بڑی دقت یہ ہے کہ انھیں چند مہینوں میں بظاہر ایک منظم کوشش کے ماتحت لاکھوں ہندوستانی مشرقی پنجاب سے کشمیر آگئے ہیں اور انھیں کشمیر کا باشندہ تسلیم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ایسے لوگوں کے متعلق تجویز میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ ۱۵ راگست کے بعد آکر ریاست میں بس گئے ہیں، حکومت ہند اور ریاست کی حکومت اس بات کی پوری کوشش کریگی کہ ایسے لوگ استصواب سے پہلے ریاست چھوڑ کر چلے جائیں۔ اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلہ میں بھی وہی رکاوٹیں ہیں جو باقی اور تجویزوں میں۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کا ریاست سے باہر چلا جانا استصواب کے معاملہ میں حکومت ہند اور ریاست کی حکومت کی متفقہ مفاد کے منافی ہے، اور اُن کے لئے عملی طور پر ناقابل قبول، یہ کچھ بڑی بڑی دقتیں ہیں جنکی

ماہ نو کراچی۔

موجودگی میں استصواب رائے کیا جائیگا تو اس سے غلط نتیجے نکلیں گے اور انھیں کشمیری ہرگز قبول نہیں کر سکتے۔

استصواب کی صحیح فضا اور رائے دینے والوں میں استصواب کی پوری تنظیم کی طرف سے اعتماد پیدا کرنے کے لئے کونسل کی ان تجویزوں میں کچھ ضروری ترمیموں اور اضافوں کی ضرورت ہے۔ ہم نے کونسل کی تجویزوں کا سرسری تجزیہ کرتے وقت استصواب کے نقطۂ نظر سے تین پر زیادہ زور دیا ہے۔ پہلی تجویز ریاست سے قبائلیوں کو نکالنے کے سلسلے میں ہے، دوسری ریاست میں ہندوستانی فوجوں کے قیام کے متعلق اور تیسری استصواب کے زمانہ میں ایک عارضی حکومت کے قیام کے بارے میں۔ یہی تین تجویزیں ایسی ہیں کہ اگر ان میں جزوی ترمیمیں کر لی جائیں تو جو کچھ موجودہ صورت میں ناممکن اور ناقابل عمل نظر آ رہا ہے، اس میں عملی نقطۂ نظر سے بھی سہولتیں پیدا ہو جائیں اور نتائج کے اعتبار سے بھی خرابیوں کا امکان کم ہو جائے۔ مثلاً اگر پاکستان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ قبائلیوں کو ریاست سے باہر نکالے تو اسے اس کی بھی اجازت ہونی چاہئے کہ وہ اس اہم فرض کی انجام دہی کے لئے اپنی فوجوں کی مدد ضروری سمجھے تو لے۔ پھر اگر ہندوستان کی فوجوں کو استصواب کے زمانہ میں بھارت میں رہنے کی اجازت دے کر رائے دینے والے ایک بڑے طبقہ میں عدم اعتماد اور ہیبت پیدا ہونے کا اندیشہ ہے تو اس اندیشہ کو صرف اسی طرح دور کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستانی اور پاکستانی فوجیں مل جل کر امن قائم رکھنے اور قانون کو استحکام دینے کا کام انجام دیں۔ عارضی حکومت کے قیام کے متعلق دل میں جو شبہے پیدا ہوتے ہیں ان کے دور کرنے کی ترکیب صرف یہ ہے کہ شیخ عبداللہ کے موجودہ کابینہ کو ختم کر کے اسکی تشکیل غیر جانبداری کے ساتھ اقوام متحدہ کی نگرانی میں اس طرح کی جائے کہ اس میں کشمیر کی اہم سیاسی جماعتوں کے صحیح نمائندے شامل ہوں۔ اس طرح کی تنظیم آبادی کے ہر طبقہ میں اعتماد پیدا کر سکے گی۔ ریاست کے باہر گئے ہوئے کشمیریوں میں استصواب کے موقع پر ریاست میں واپس آنے کا خیال بھی اسی اعتماد کے بعد پیدا ہوگا اور ۱۵ راگست کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے جو لوگ ریاست میں آکر بس گئے ہیں انھیں بھی ایسے ہی حالات میں اپنے وطن واپس جانے یا استصواب میں حصہ نہ لینے کے لئے مجبور کیا جا سکتا ہے کہ حکومت کی تنظیم میں ہر اہم سیاسی جماعت کے صحیح نمائندے شامل ہوں۔ اگر کونسل کی پیش کی ہوئی تجویزوں میں یہ جزوی ترمیمیں نہ ہوں تو استصواب رائے کا سارا انتظام فریب محض بن کر رہ جاتا ہے۔

عزیز احمد

پاکستان کے پہلے اولمپک کھیل

"صحت مند دماغوں کے لئے صحت مند جسموں کا ہونا ضروری ہے۔ اسی لئے دنیا بھر کی قومیں تن درستی اور جسمانی تربیت کو اتنی اہمیت دیتی ہیں۔
پاکستان کے پہلے اولمپک کھیلوں کو ہر پاکستانی کے دل میں اولمپک اصول "تیز تر، بلند تر اور مضبوط تر" پر عمل کرنے کا جذبہ پیدا کر دینا چاہئے کھیل کے منتظمین اور مقابلوں میں حصہ لینے والوں کے ساتھ میری بہترین دعائیں ہیں۔ پاکستان کو عظیم تر، استوار اور پائیدار بنائیے۔" (قائدِ اعظم)

---

۲۳ اپریل ۱۹۴۸ء کی گرم دوپہر میں کراچی کی چند بڑی بڑی سڑکوں کے دونوں طرف آدمیوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے ہوئے تھے۔ سورج کی تپتی ہوئی شعاعوں کے باوجود ہزاروں مرد، عورتیں اور بچے مشتاق نگاہوں اور بیتاب دلوں کے ساتھ قائدِ اعظم کی سواری دیکھنے کے لئے منتظر تھے جو پاکستان کے پہلے اولمپک کھیلوں کے افتتاح کے لئے تشریف لیجانے والے تھے۔

آخر قائدِ اعظم کا جلوس گزرا، آپ کھلی چھت کی سنہری گاڑی میں سوار تھے جسے آٹھ سبک رفتار گھوڑے کھینچ رہے تھے۔ آپ کی بائیں طرف آپ کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح تشریف فرما تھیں۔ گاڑی کے پیچھے پچاس سوار زرق برق لباس پہنے گھوڑے چمکاتے چلے جاتے تھے۔ ان کی زریں پوشاک سورج کی کرنوں میں جگ مگ جگ مگ کرتی ہوئی نگاہوں کو خیرہ کرتی تھی۔ اہل کراچی نے شاید اتنا شاہانہ جلوس پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

جب قائدِ اعظم کی سواری پولو گراؤنڈ پہنچی تو سندھ کے گورنر ہز ایکسیلنسی شیخ غلام حسین ہدایت اللہ نے آپ کا استقبال کیا۔ آپ کے وہاں پہنچتے ہی بگل کی آواز بلند ہوئی اور رنگ برنگا اولمپک پھریرا پاکستان کے ہلالی پرچم کے ساتھ ہوا میں لہرایا۔ قدیم رسم کے مطابق سبز سوا شامیانہ کے پیچھے سے کبوتر آزاد کئے گئے۔ اسی وقت پاکستان اولمپک ایسوسی ایشن کے صدر مسٹر احمد ابراہیم ہارون جعفر نے قائدِ اعظم سے افتتاح کی رسم ادا کرنے کی درخواست ان الفاظ میں کی:

"ہمارے محبوب قائدِ اعظم، میں پاکستان اولمپک ایسوسی ایشن کا صدر اپنی طرف سے اور تنظیمی کمیٹی کی طرف سے آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ پاکستان کے پہلے اولمپک کھیلوں کا افتتاح فرمائیں۔"

افتتاح کی رسم ادا کرتے ہوئے قائدِ اعظم نے فرمایا:-

"میں پاکستان کے پہلے اولمپک کھیلوں کا افتتاح کرتا ہوں۔ خدا کرے کہ پاکستان کے تمام افراد کی کوششیں ہمارے نئے ملک کو زندگی کے ہر شعبے میں پائیدار اور استوار بنائیں۔"

اولمپک کھیلوں کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ زمانۂ قدیم میں یونان کے مختلف شہروں کے کھلاڑی، پہلوان، مصنف، ڈرامہ نویس، مصوّر، بت تراش اور موسیقار ہر چوتھے سال اولمپیا کے مقام پر جمع ہو کر مقابلے منعقد کرتے تھے۔ ان مقابلوں کے نتیجے پالتو کبوتروں کے ذریعہ ان شہروں کو بھیجے جاتے تھے جہاں کے نمائندے مقابلوں میں حصہ لیتے تھے۔ ویسے تو یہ مقابلے تقریباً تین ہزار سال پہلے شروع ہوئے تھے لیکن باقاعدہ طور پر سب سے پہلے اولمپک کھیل ۷۷۶ء قبل مسیح میں ہوئے اور اس کے بعد ۳۹۴ء تک ہر چوتھے سال ہوتے رہے۔ اس زمانہ کے کھیلوں کا معیار آج کل کے مقابلے میں بہت بلند تھا۔

اولمپک کھیلوں کی رسم کو جدید انداز پر جاری کرنے کا خیال سب سے پہلے فرانسیسی بیرن پیئر دی کوبرتین کے ذہن میں آیا۔ انھوں نے ۱۸۹۲ء میں پیرس کی ایک بین الاقوامی کانفرنس میں ان کھیلوں کی تجدید کی تجویز پیش کی۔ چار سال بعد ۱۸۹۶ء میں اس تجویز کو عملی جامہ پہنایا گیا اور ایتھنس کے مقام پر اس سلسلے کے پہلے اولمپک کھیلوں کے مقابلے ہوئے۔

اس وقت سے برابر دنیا کے مختلف حصّوں میں اولمپک کھیلوں کے بین الاقوامی مقابلے ہوتے رہے۔ سب سے آخری اولمپک مقابلہ ۱۹۳۶ء میں برلن میں ہوا اور دوسرے مقابلے کا وقت آنے سے

پہلے دنیا دوسری جنگ عظیم کی آگ میں گھر گئی۔ اب بعد جنگ کا سب سے پہلا اولمپک مقابلہ اس سال اگست میں لندن میں ہوگا۔ پاکستان کے اولمپک کھیل اسی مقابلے کے لئے پاکستان کی ٹیم منتخب کرنے کی غرض سے منعقد کئے گئے تھے۔ ان کھیلوں میں مشرقی بنگال، مغربی پنجاب، سندھ، بلوچستان اور صوبہ سرحد کے تین سو کھلاڑیوں نے شرکت کی۔

افتتاح کی رسم کے بعد مقابلوں میں شرکت کرنے والے کھلاڑیوں نے مغربی پنجاب کے کپتان ظہور احمد کی قیادت میں مارچ کرتے ہوئے قائد اعظم کو سلامی دی۔ اس کے بعد ظہور احمد نے کھلاڑیوں کی طرف سے مندرجہ ذیل حلف لیا۔

"ہم قسم کھاتے ہیں کہ ہم پاکستان کے پہلے اولمپک کھیلوں کے مقابلوں میں وفاداری سے حصہ لیں گے اور کھیل کے قواعد کی پوری پابندی کریں گے اور اپنے ملک کی عزت اور کھیل کود کی عظمت کے لئے کھیلوں میں کھلاڑیوں کے صحیح جذبے کے ساتھ شریک ہوں گے"۔

اس کے بعد قائد اعظم شامیانے میں تشریف لے گئے اور سنہری تخت پر رونق افروز ہوئے۔ آخر کھیلوں کے مقابلے شروع ہوئے۔

اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے قائد اعظم نے فرمایا: "آپ کو میرا پیغام یہ ہے کہ جسمانی قوت حاصل کیجئے، جنگجوئی کے لئے نہیں نہ فوجی مقاصد کے لئے۔ بلکہ اس لئے کہ ہمیشہ اپنی قومی زندگی کے ہر شعبے میں، آپ جہاں کہیں بھی ہوں مقابلہ کرنے کے قابل ہوں اور سر راہ امن، بین الاقوامی اتحاد اور خیر خواہی قائم کرنے میں مدد دیں۔ ان مقابلوں کے بعد آپ بین الاقوامی اولمپک میں شرکت کی غرض سے لندن جائیں گے۔ وہاں آپ ہماری خیر اندیشی کے پیغامبر ہوں گے۔ میری دعائے خیر آپ کی شامل حال ہوگی۔ یاد رکھئے، جیتنا کچھ بھی نہیں۔ سعی اور سعی کا جذبہ سب کچھ ہے"۔

کھیل تین دن جاری رہے اور ۲۵ اپریل کو انعامات تقسیم ہونے کے بعد محترمہ فاطمہ جناح کے ان الفاظ کے ساتھ ختم ہوئے: "میں پاکستان کے پہلے اولمپک کھیلوں کے مقابلوں کے اختتام کا اعلان کرتی ہوں۔ خدا کرے کہ جنھوں نے مقابلے جیتے ہیں ہمیشہ سے زیادہ کوشش کریں، اور جو نہیں جیتے وہ اپنے آپ کو بہتر بنانے کے لئے اور پاکستان کی عظمت اور کھیلوں سے محبت کی خاطر بار بار کوشش کریں"۔

اس رسم کے بعد محترمہ فاطمہ جناح نے اولمپک پھریرا شہر کراچی کے میئر کے حوالے کیا تاکہ وہ پاکستان کے دوسرے اولمپک کھیلوں کے انعقاد تک، کارپوریشن کے پاس محفوظ رہے۔

پاکستان کے پہلے اولمپک کھیلوں کا سہرا مغربی پنجاب کے سر رہا۔ انھوں نے ۲۵۰ پوائنٹ جیتے۔ دوسرا نمبر سندھ کا تھا جنھیں ۱۸۰ پوائنٹ ملے۔ صوبہ سرحد کو ۸۵، بلوچستان کو ۱۷، اور مشرقی بنگال کو ۱ پوائنٹ حاصل ہوئے۔

مغربی پنجاب کے کپتان ظہور احمد کو پاکستان کا بہترین کھلاڑی قرار دیا گیا۔ انھوں نے فاسٹ پٹ کا ریکارڈ قائم کیا اور ڈسکس تھرو کا مقابلہ ۱۸۰ فٹ، ۸ انچ سے جیتا۔ مغربی پنجاب کی مس بیٹی اسمتھ کو عورتوں میں سب سے زیادہ پوائنٹ جیتنے پر سرہارون جعفر ٹرافی دی گئی۔ انھوں نے چار مقابلے جیتے۔ مغربی پنجاب کے وزیر علی نے سائیکل کی دوڑ میں ۱۹۴۶ء کا کل ہند ریکارڈ توڑا۔ پنجاب کے اقبال بٹ نے ۲۷۰ پونڈ کا وزن اٹھا کر میرا کل ہند ریکارڈ توڑا۔

پاکستان کے یہ پہلے اولمپک کھیل قومی زندگی میں صحت جسمانی اور توانائی کی عملی سرگرمیوں کا پیش خیمہ ہیں۔ یہ انسان کو زندگی کے تنوع اور اس کی تکمیل کا سبق سکھاتے ہیں۔

بدر،

نئے فلم

تحفہ فلم ہے جو سنٹرل اسٹوڈیو بمبئی میں ایک مشہور ادیب کی زیر ہدایت تیار ہوئی، آغا جانی کاشمیری تحفہ کے مصنف بھی ہیں اور ہدایت کار بھی، اس کی کہانی مختصراً یوں بیان کی جا سکتی ہے کہ فیروز آباد کے ایک رئیس جو خانشا اپنی نرد گی اور موسیقی میں مہارت رکھنے کی وجہ سے گرو کہلاتے ہیں اپنے ایک مرحوم دوست کے لڑکے سریندر کو گود لے لیتے ہیں۔ سریندر اور ان کی بیٹی شاما دونوں ساتھ کھیلتے کودتے جوان ہوتے ہیں۔ شاما اپنی حرکات و سکنات سے سریندر سے اپنی محبت کا اظہار بھی کرتی ہے لیکن کیونکہ سریندر کا یہ خیال تھا کہ شاما اس کے محسن اور گرو کی بیٹی ہونے کی وجہ سے اس کی اپنی سگی بہن کے برابر ہے اسلئے شاما کے ان اشارات کو ایک چھوٹی بہن کی چھیڑ چھاڑ سے زیادہ نہیں سمجھتا ہے، گرو کے ایک دوست آغا صاحب موسیقی میں سریندر کی دلچسپی دیکھ کر ریڈیو پر اس کے فن کا مظاہرہ کرانے کی غرض سے اسے بمبئی لے جاتے ہیں اور وہاں وہ ایک کامیاب موسیقار ثابت ہوتا ہے، وہاں کے ایک سیٹھ کی لڑکی کملا اور سریندر میں محبت ہو جاتی ہے، کچھ عرصہ بعد وہ دونوں شادی پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور گرو سے اجازت لینے کے لئے سریندر فیروز آباد آتا ہے، گرو اور شیاما جو سریندر کے انتظار میں ایک ایک دن گن گن کر گزار رہے تھے اس کے آنے کی خبر سنکر بہت خوش ہوتے ہیں اور گرو یہ طے کر لیتا ہے کہ اس دفعہ سریندر کی واپسی سے پہلے اسکی شادی شیاما سے ضرور کر دیگا۔ جب ان دونوں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ سریندر شادی کے لئے کملا کو زبان دے چکا ہے تو انہیں رنج تو بے حد ہوتا ہے لیکن گرو یہ نہیں چاہتا کہ وہ اپنے احسانوں کا بیجا فائدہ اٹھائے یا کملا کے ساتھ اسے محبت توڑنے پر مجبور کرے وہ یہ رشتہ منظور کر لیتا ہے لیکن شیاما پر اس خبر کا یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ بیہوش ہو کر زینے سے نیچے گر پڑتی ہے، اور چوٹ ایسی آتی ہے کہ جانبر نہیں ہو پاتی، تصویر یہاں ختم ہو جاتی ہے۔

تحفہ کے مکالمے جتنے دل نشین ہیں کہانی اسی قدر بے جان ہے، تفریح کا سامان جا بجا ملتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ اسے زبردستی ٹریجڈی بنایا گیا ہے، سریندر اور شیاما بچپن کے ساتھی ہیں پھر بھی بیسویں صدی کے نوجوان سریندر کی سادہ لوحی ملاحظہ ہو کہ وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ شیاما اس سے کیسی محبت کرتی ہے، اور لطف یہ کہ دوسری طرف اسے دو دن ہی کی ملاقات میں کملا کی محبت کا احساس ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ یہ سمجھ لیتا تو کہانی نہ آگے بڑھتی اور نہ ٹریجڈی بنتی، صرف اس لئے اس غیر فطری بنیاد پر کہانی تعمیر کی گئی ہے جیسے آگے چل کر گرو کی وضع داری اور وعدہ پرستی کا سہارا لیکر جوں توں ختم کیا گیا ہے، تصویر میں بہت سے واقعات ایسے پیش کئے گئے ہیں جنکو اگر نکال دیا جائے تو کہانی کی روانی میں کوئی فرق نہیں پڑتا مثلاً تعارفانہ تمہید، سریندر کے باپ اور شیاما کی ماں کی موت، آغا صاحب کا شیاما کو اپنی منہ بولی بیٹی بنانا، ہز ہائینس نواب آف زعمت نگر سے فیروز آباد کی حالت سدھارنے کے لئے پچیس ہزار کی رقم لینا، سریندر کا کملا کو ساتھ فیروز آباد لانا وغیرہ، اس کے علاوہ شیاما کی سہیلی، کملا کے دوست اور ہز ہائینس کے کردار بھی محض فاضل ہیں ان سے اصل کہانی کو کوئی مدد نہیں ملتی۔

مکالمے ہر طرح قابل تحسین ہیں، زبان نہایت ستھری اور مدداق، کم عمر اور معمر لوگوں کے انداز مذاق میں نمایاں فرق، مذاق میں لطافت اور ذہانت، اظہار بے تکلفی کے شائستہ طریقے، غرض آغا جانی کاشمیری کے قلم نے اس لحاظ سے اس نقل کو اصل زندگی کے اس قدر قریب کر دیا ہے کہ کہیں کہیں عقل اور نقل میں کسی طرح تمیز نہیں رہتی۔

رحمان نے سریندر کا کردار کچھ ایسا برا نہیں ادا کیا ہے لیکن نواب اور شاہ نواز کی کہنہ مشق اداکاری کے سامنے وہ بیچارہ طفل مکتب سا معلوم ہوتا ہے، کئی جگہ وہ مکالمے بھی اسٹیج کے ڈھنگ میں بولتا ہے۔

گانے آرزو لکھنوی نے لکھے ہیں اور رفیق غزنوی موسیقی کے ہدایت کار ہیں۔ دس گانوں میں سے دھنیں صرف دو تین کی اچھی ہیں۔ اکثر گانوں کی دھنیں اس قدر دھیمی ہیں کہ کلام کی شاعرانہ خوبیاں بھی دب کر رہ گئی ہیں۔

عکاسی اور لباس کے معاملہ میں بھی فلم میں کئی جگہ کوتاہی نظر آتی ہے۔ لیکن ان کوتاہیوں کے باوجود، فلموں کے موجودہ معیار کو دیکھتے ہوئے تحفہ اچھی خاصی تصویر ہے۔ اس کے اس مجموعی تاثر کو کامیاب بنانے میں سب سے نمایاں حصہ دلچسپ اور شستہ مکالموں کا ہے۔

نئی کتابیں

حاقتیں:۔ مصنف شفیق الرحمٰن، ناشر مکتبۂ جدید لاہور، قیمت [illegible]

سفید کاغذ پر چھپی ہوئی، چرمی جلد کی یہ خوبصورت کتاب شفیق الرحمٰن کے افسانوں کا نیا مجموعہ ہے۔ مجموعہ میں چھوٹی بڑی ۹ کہانیاں ہیں اس میں تقریباً ساری کہانیاں ایسی ہیں جن میں ہم زندگی کے پس منظر میں کچھ ایسے واقعات اور کچھ ایسے کردار ہمارے سامنے آتے ہیں جن کی حرکات و سکنات میں مجموعی حیثیت سے تفریحی عنصر غالب ہے۔ اس تفریحی عنصر میں سخرا پن نہیں بلکہ دل افروز مزاح ہے۔ اور اس لئے پڑھنے والا کہانی سے کسی "بلند اخلاقی مقصد" کا طالب نہیں ہوتا۔ کہانی کو پڑھ کر طبیعت میں خوشگفتگی پیدا ہوتی ہے وہی اس کا مقصد اور وہی اس کا انعام ہے۔ لیکن افسانوں کو پڑھ کر کہیں کہیں یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ شفیق الرحمٰن صاحب نے اپنے طرز کی اس دلفریب اور دلنشیں خصوصیت کے آگے فن اور تاثیر کے بعض مسلّمہ اصولوں کی طرف سے اغماض برتا ہے۔ یہ اغماض اور بے نیازی ان کے پورے فن پر چھائی ہوئی ہے۔ اس کے باوجود افسانوں میں کشش ہے۔ اگر فن کار اپنے فن کی طرف سے زیادہ خلوص برتنے لگے تو اس کشش میں یقیناً اضافہ ہوگا۔

خلاصہ نگاری:۔ مصنف ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی۔ ناشر آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔ قیمت [illegible]

خلاصہ نگاری بظاہر خشک اور بے مزہ تعلیمی کتاب ہے۔ اس لئے کہ ہم نے اب تک تعلیم اور اس کی ضرورتوں کو قومی زندگی کا ایک خشک اور بے مزہ جزو سمجھ رکھا ہے لیکن اس خشکی اور بد مزگی کے غلط احساس کو دور کر کے دیکھا جائے تو یہ کتاب اردو کے تعلیمی ادب میں ایک ایسا اضافہ ہے جس کی طرف اب تک ہمارے معلمین نے بالکل توجہ نہیں دی تھی۔ حامد صاحب نے اس بے حد اہم ضرورت کو اسی شدت سے محسوس کیا ہے جس کی وہ مستحق ہے اور اُردو والوں کو تعلیم کے ایک ایسے اصول سے روشناس کرایا ہے جو بچے کی ذہنی نشوونما اور اس کے انداز فکر میں منطقی ترتیب اور توازن پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے۔ کتاب کا انداز بے حد منطقی اور تعلیم کے جدید اصولوں پر مبنی ہے۔ الفاظ، مرکبات، فقرے، جملے اور اس کے بعد آسان اور دقیق ہر طرح کی عبارتیں لے کر بتایا گیا ہے کہ کس طرح رفتہ رفتہ بچے کے ذہن کو اس مفید مشق کا عادی بنایا جا سکتا ہے۔ خلاصے کے لئے جن عبارتوں کا انتخاب کیا گیا ہے ان میں تنوع بھی ہے اور ادبیت کا ایک خاص معیار بھی۔ اردو کی تعلیم کو اس کی موجودہ فرسودگی سے باہر نکال کر اس میں افادیت کا پہلو غالب کرنے کے لئے اس طرح کی کتابوں کو زیادہ سے زیادہ رائج کرنے کی ضرورت ہے۔

نقوش (ماہنامہ) لاہور:۔ جب سے ہندوستان کی تقسیم ہوئی اور پاکستان قائم ہوا، ہماری زندگی کو ہر آن ایک نئے جذباتی اور نفسیاتی احساس سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ اس نئے دور میں کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے تہذیب، تمدن، ادب، شعر، علم اور فن کی ساری روایتوں کا نئے سرے سے جائزہ لینے اور ان کے استحکام کے لئے ایک منظم اور مرتب لائحہ عمل بنانے کی سخت ضرورت ہے۔ یہی حال زبان کا ہے۔ پاکستان قائم ہونے کے بعد اردو کی بقا اور اس کی نشوونما کی ذمہ داری پاکستان میں شامل ہونے والے علاقوں پر اب پہلے سے کہیں زیادہ آگئی ہے۔ اردو کو ترقی کی راہ پر چلانے کی خدمت پاکستان بننے سے پہلے پنجاب سے زیادہ کسی اور صوبے نے انجام نہیں دی۔ سندھ، سرحد اور مشرقی بنگال نے اپنی اپنی بساط کے مطابق اپنی اس ذمہ داری کو سنبھالنا شروع کر دیا ہے لیکن اس اہم کام میں مغربی پنجاب کے قدم اوروں سے تیز اٹھ رہے ہیں۔ نئی کتابیں چھاپنے کا انتظام کیا جا رہا ہے، نئے اخبار نکل رہے ہیں، نئے رسالے شائع ہو رہے ہیں۔ اور اس سارے کام میں ہر جگہ خلوص اور جدوجہد کے جذبات مشترک ہیں۔ حال ہی میں لاہور سے "نقوش" نام کا ایک رسالہ شائع ہوا ہے۔ لکھائی چھپائی اور گٹ اپ کے لحاظ سے حد درجہ دیدہ زیب اور مضامین، افسانوں، نظموں اور غزلوں کے تنوع، افادیت اور رنگینی کے اعتبار سے قابل تحسین۔ رسالہ اردو کے مشہور افسانہ نگار، ادیب اور شاعر احمد ندیم قاسمی اور افسانہ نگار خاتون ہاجرہ مسرور نے مرتب کیا ہے۔ رسالہ کی ترتیب میں شروع سے آخر تک ایک دلفریب خوش سلیقگی ہے نظموں اور افسانوں میں زمانے کی غلط روشوں کے خلاف احتجاج ہے۔ مقالے اور غزلیں ادب اور سیاست کے بعض اہم ہنگامی مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں۔ "نقوش" ہر لحاظ سے ایک ایسا رسالہ ہے کہ اسے اردو داں طبقے میں زیادہ سے زیادہ مقبول ہونا چاہیے۔

Now More than Ever before...
COCOGOLD
The Finest OF ALL COOKING MEDIUMS
COCOGOLD
VACUUM REFINED
THE GANESH KHOPRA MILLS CO.
Karachi

پتہ کی باتیں

کسی اچھے کاروباری سے پوچھ لیجئے۔ دور کیوں جائیے خود اپنے بینک کے مینیجر سے پوچھ کر دیکھئے وہ آپ کو بتائے گا کہ روپیہ لگانے کی بہترین مد وہ ہے جس میں نفع یقینی ہو اور زیادہ سے زیادہ ہو، رقم محفوظ رہے اسے آسانی سے حاصل کیا جا سکے اور وہ بغیر کسی دقت کے نقدی میں تبدیل ہو سکے وہ آپ کو یہ بھی بتلائے گا کہ ایسی مد کا ملنا مشکل ہے لیکن ناممکن نہیں کیونکہ اسے معلوم ہے کہ اب پاکستان سیونگ سرٹیفکیٹ ملنے لگے ہیں۔

پاکستان سیونگ سرٹیفکیٹ خریدنے کی تفصیلات

۱۔ یہ سرٹیفکیٹ ڈاک خانوں سے، سیونگ بیورو سے یا مقرر کردہ ایجنٹوں سے خریدے جا سکتے ہیں۔

۲۔ ہر شخص پندرہ ہزار روپے تک کی کوئی رقم جمع کر سکتا ہے (دو اشخاص مل کر تیس ہزار روپے تک جمع کر سکتے ہیں)

۳۔ مبلغ پانچ، دس، پچاس، سو، پانچ سو، ہزار اور پانچ ہزار روپے کی مالیت کے سرٹیفکیٹ مل سکتے ہیں۔ تھوڑی رقم بچانے والے چار چار آنے آٹھ آٹھ آنے اور ایک ایک روپے کے سیونگ اسٹامپ خرید سکتے ہیں۔

۴۔ ہر دس روپے بارہ سال کے بعد پندرہ روپے بن جائیں گے۔ گویا ۴ فیصدی سالانہ نفع ہوگا۔

۵۔ اٹھارہ ماہ کے بعد ہر سرٹیفکیٹ نفع سمیت بھنایا جا سکتا ہے (پانچ روپے والے سرٹیفکیٹ کی صورت میں بارہ ماہ کے بعد)

۶۔ حکومت اصل رقم اور نفع دونوں کی ادائیگی کی ضامن ہے۔

۷۔ اس طرح حاصل کئے ہوئے منافع پر انکم ٹیکس ادا نہیں کرنا پڑے گا۔

پاکستان سیونگ سرٹیفکیٹ خریدیئے

یہ روپیہ کا بہترین مصرف ہے

ماہِ نو

مدیر وقار عظیم
جلد ۱ شمارہ ۴
جولائی ۱۹۴۸ء

قیمت فی پرچہ ۸/
چندہ سالانہ صہ/

واقعات کی ڈائری

مئی — جون

۱۳ مئی :- پاکستانی پارلیمنٹ نے ملک بھر سے رشوت ستانی اور دغابازی کے استیصال کے لئے ایک مسودہ قانون منظور کیا۔

قائد اعظم محمد علی جناح نے ایک اعلان پر مہر تصدیق ثبت کی کہ پاکستان کا اسٹیٹ بینک تین کروڑ کے سرمائے سے یکم جولائی سے کام شروع کر دے گا۔

۱۳ مئی :- فلسطین میں برطانوی انتداب کے خاتمے کو مدنظر رکھتے ہوئے یہودی فوجوں نے یروشلم اور ساحلی علاقوں پر اپنا اثر و اقتدار جمانا شروع کر دیا۔

کشمیر میں استصواب رائے کے سلسلے میں کولمبیا نے ڈاکٹر فرنانڈیز کو اپنے نمائندے کے طور پر نامزد کیا۔

۱۴ مئی :- فلسطین میں پچیس سال کے بعد برطانوی انتداب کے ختم ہوتے ہی یہودیوں نے "اسرائیلی حکومت" کا اعلان کر دیا۔

پاکستان کے وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خاں مسئلہ کشمیر کی بحث و تمحیص میں حصہ لے کر چار ماہ کے بعد امریکہ سے کراچی واپس آئے۔

۱۵ مئی :- یہودیوں کی طرف سے "اسرائیلی حکومت" کا اعلان ہوتے ہی امریکہ کے صدر مسٹر ٹرومین نے اسے ایک نئی حکومت تسلیم کرنے کا اعلان کر دیا۔

عرب فوجیں تین طرف سے فلسطین میں گھس گئیں۔ ان کے ہوائی جہازوں نے نئی اسرائیلی حکومت کے صدر مقام تل ابیب پر بم گرائے۔ مصریوں نے غزہ پر قبضہ کر لیا۔

۱۶ مئی :- عراقی دستے سرحد یردان کو عبور کر گئے۔ عراق، مصر، شرق اردن، شام اور لبنان کی فوجوں نے ایک خاص نظام کے تحت زبردست حملے شروع کر دئے۔ سوئیڈن اور نیوزی لینڈ نے نئی "اسرائیلی حکومت" کو تسلیم کر لیا۔

۱۷ مئی :- مصری اور عراقی جہازوں نے تل ابیب کے دو مختلف محاذوں پر بم گرائے۔ مصر کی بڑھتی ہوئی فوجیں جافہ سے صرف ۱۵ میل دور لڑ رہی ہیں۔ سوویٹ یونین نے نئی "اسرائیلی حکومت" تسلیم کر لیا۔

پاکستانی پارلیمنٹ کی مسلم لیگ پارٹی کے ایک ہنگامی اجلاس میں قرار پایا کہ پاکستان کے تمام باشندوں سے عرب ریاستوں کو ہر قسم کی مدد دینے کی اپیل کی جائے۔

۱۸ مئی :- شرق اردن کے دستے تل ابیب کے بالکل نزدیک پہنچ گئے۔ دوسری طرف عرب مجاہدین کی ٹکڑیاں قدیم یروشلم کی یہودی آبادی میں گھس گئیں۔ یہودیوں کی سرکاری خبر رساں ایجنسی نے سقوط ایکر کو تسلیم کیا۔

۱۹ مئی :- قدیم یروشلم عرب فوجوں سے گھر گیا اور دو بدو لڑائی ہونے لگی۔ تل ابیب سے یروشلم تک رسد پہنچنے کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ سلامتی کونسل نے عربوں اور یہودیوں کو ایک سوالنامہ بھیجا جس کے جواب کے لئے ۴۸ گھنٹے کی مدت دی گئی۔

مہاجرین کو نئے سرے سے آباد کرنے کے لئے پاکستان اور سندھ کی مشترک کونسل کا پہلا اجلاس منعقد ہوا۔

۲۰ مئی :- مصری فوجوں نے فلسطین کے جنوبی صحرا کی طرف سے آگے بڑھ کر یہودیوں کے اہم مورچے بیر شیبا پر قبضہ کر لیا۔ یروشلم میں

گھمسان کی لڑائی ہوتی رہی۔ تل ابیب پر بم گرائے گئے۔

۲۱ مئی :- "اسرائیلی حکومت" کی عارضی کونسل کے صدر نے انڈیا یونین سے درخواست کی کہ ہماری حکومت کو تسلیم کرلیا جائے۔ عراق کے وزیر مالیات نے کہا کہ اگر سلامتی کونسل نے امریکہ کی اس تجویز کو قبول کرلیا کہ فلسطین میں عربوں کا حملہ بین الاقوامی امن و عافیت کو خطرے میں ڈال رہا ہے تو عرب ممالک متحدہ اقوام کی انجمن سے الگ ہو جائیں گے۔

۲۲ مئی :- قدیم یروشلم میں بری طرح محصور ہو جانے والے یہودیوں نے ایک لاسلکی پیغام کے ذریعے اپنے صدر مقام سے ہر قسم کی امداد و تعاون کے لئے استدعا کی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ہتھیار ڈالنے کی حد تک مجبور ہو گئے ہیں۔ مصر، عراق، شام اور لبنان کی حکومتوں نے سلامتی کونسل کے سوالات کے جوابات بھیج دئے۔ عرب ممالک کے دفاتر کو جو نیویارک میں قائم ہیں، تباہ کر دینے کی کئی بار دھمکی دی گئی۔ برطانوی ہوائی بیڑے نے چار مصری ہوائی جہاز مار گرائے۔

پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے فیصلہ کیا کہ کراچی کو پاکستان کا صدر مقام بنایا جائے۔

۲۳ مئی :- مصر اور شرق اردن کی فوجیں یروشلم کے قریب ایک دوسرے سے آملیں اور توحید مساعی کے ساتھ جنگ میں مصروف ہو گئیں۔ سلامتی کونسل نے فیصلہ کیا کہ فلسطین میں لڑائی روک دینے کے لئے مناسب احکامات جاری کئے جائیں۔ شامی نمائندے نے اس سلسلے میں رائے دینے سے اجتناب کیا۔

حیدرآباد کے سلسلے میں ریاست کے وزیر اعظم میر لائق علی نے انڈیا کے وزیر اعظم پنڈت نہرو سے ملاقات کی۔

۲۴ مئی :- عرب ریاستوں نے سلامتی کونسل کے احکامات پر جو فلسطین میں لڑائی روک دینے کے سلسلے میں جاری ہوئے تھے، اس شرط کے ساتھ رضامندی ظاہر کی کہ ملک بھر میں وہ صورت حالات پیدا کر دی جائے جو ۱۵ مئی کو تھی۔

برطانیہ کی شہزادی الزبتھ نے سو پونڈ کا چک بھیجا جو قائد اعظم ریلیف فنڈ میں جمع کر دیا گیا۔

۲۶ مئی :- عربوں نے فلسطین میں جنگ روکنے کے سلسلے میں دو شرطیں پیش کیں جو یہودیوں کی سیاسی اور فوجی نقل و حرکت سے متعلق ہیں۔

۲۷ مئی :- فلسطین میں گھمسان کی لڑائی شروع ہو گئی۔

مہاتما گاندھی کے قاتل اور اس کے ساتھیوں پر مقدمے کی پہلی پیشی عمل میں آئی۔

۲۸ مئی :- حکومت شام نے کہا کہ اگر امریکہ نے متحدہ اقوام پر ناجائز دباؤ ڈالنے کی کارروائی بند نہ کی تو تیل کے سلسلے کی تمام مراعات منسوخ کر دی جائیں گی۔

قدیم یروشلم میں گھرے ہوئے یہودیوں نے ہتھیار ڈال دئے۔

۲۹ مئی :- سلامتی کونسل میں مسئلہ فلسطین پر بحث کرتے وقت روس اور برطانیہ کے نمائندوں میں جھڑپ ہو گئی۔

عراق نے اسرائیلی حکومت کے دو ٹکڑے کر دینے کی دھمکی دی۔

۳۰ مئی :- سلامتی کونسل نے جنگ فلسطین کو چار ہفتے تک روکے رکھنے کے لئے دونوں فریقین سے استدعا کی۔ لڑائی بدستور جاری ہے۔

یکم جون :- عربوں اور یہودیوں نے سلامتی کونسل کی استدعا قبول کرلی۔ یہودیوں نے اپنی شرائط بھی پیش کر دیں۔

۲ جون :- امریکہ نے فوجی بجٹ میں دو ارب ڈالر سے زیادہ خرچ کرنے کی گنجائش رکھی ہے۔ زمانۂ امن میں اتنی بڑی رقم کبھی تجویز نہیں کی گئی۔

۳ جون :- سلامتی کونسل نے کشمیر میں استصواب رائے کرانے والی کمیشن سے فوراً روانہ ہو جانے کے لئے کہا — برطانیہ نے مشرق وسطیٰ کے لئے جنگی سامان بھیجنے کی ممانعت کر دی۔

۷ جون :- لندن میں اسٹرلنگ رقموں کے سلسلہ میں جو گفتگو ہو رہی تھی اس میں آج پاکستان کے نمائندے بھی شامل ہوئے۔

۱۱ جون :- لاہور کے مشہور تاریخی گردوارے ڈیرہ صاحب میں دو دن تک مذہبی فرائض ادا کرنے کے بعد امرتسر سے آئے ہوئے پچاس سکھ بخیر و عافیت واپس چلے گئے۔

۱۲ جون :- متحدہ اقوام کی انجمن کے ثالث نے فلسطین میں عارضی صلح ہو جانے کی رپورٹ سلامتی کونسل کو بھیج دی۔ تمام عرب فوجوں کے افسران اعلیٰ کی کانفرنس قاہرہ میں بلائی گئی۔

ماہِ نو کا خاص نمبر

"ماہ نو" کا اگلا شمارہ خاص نمبر ہوگا۔ خاص نمبر میں جن ادیبوں اور شاعروں کے مضامین شامل ہوں گے

اُن میں سے چند کے نام یہ ہیں:

مولانا شبیر احمد عثمانی	احمد ندیم قاسمی	امتیاز علی تاج	خدیجہ مستور
میاں بشیر احمد	حفیظ ہوشیارپوری	سعادت حسن منٹو	حامد اللہ افسر
غلام رسول مہر	آغا محمد اشرف	ممتاز مفتی	حفیظ جالندھری
عبدالمجید سالک	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	حجاب امتیاز علی	صوفی غلام مصطفےٰ تبسم
ڈاکٹر تاثیر	شوکت تھانوی	قرۃ العین حیدر	اختر شیرانی
باری (علیگ)	جگر مرادآبادی	قدرت اللہ شہاب	ساحر لدھیانوی
چراغ حسن حسرت	آرزو لکھنوی	ہاجرہ مسرور	قتیل شفائی۔

خاص نمبر کی بعض اور خصوصیات

اس خاص نمبر میں ایرانی اور پاکستانی مصوروں کی رنگین تصاویر ہوں گی۔

اس خاص نمبر کے کچھ مضامین کے خاکے مشہور بنگالی آرٹسٹ زین العابدین نے تیار کیے ہیں۔

اس خاص نمبر میں پاکستان کے صوبوں کے متعلق بڑے دلچسپ مضامین شامل ہیں۔

یہ خاص نمبر اگست اور ستمبر کا مشترکہ پرچہ ہوگا اس کا حجم معمولی شماروں سے دوگنا اور قیمت ایک روپیہ ۱عہ ہوگی۔

خاص نمبر ۱۵ اگست ۱۹۴۸ء کو شائع ہوگا۔

"ماہِ نو" پوسٹ بکس ۱۰۷۔ کراچی۔

ڈاکٹر عبدالحق

زعفران

(ایک سچی حکایت)

گرامی مرحوم فارسی کے شاعر تھے۔ ان کا صرف یہی ایک شوق تھا۔ اور اس شوق کو خوب نباہا۔ باقی دنیا کے حالات سے انھیں کچھ واسطہ نہ تھا۔ دل کے بڑے صاف تھے۔ جو دل میں تھا وہی زبان پر۔ کسی قدر اکھڑ ضرور تھے۔ باتیں اس طرح کرتے تھے جیسے کوئی لڑتا ہو۔ جب وہ حیدرآباد میں تھے تو ان سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ شعر و سخن کے سوا شاید ہی کوئی اور بات ہوتی ہو۔

ایک دن جو ان کے ہاں گیا تو ایک نئے شخص کو دیکھا۔ مونچھیں صاف ڈاڑھی کھچڑی گھنی۔ بدن بھرا بھرا۔ چارپائی پہ بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ سوداگر ہیں۔ اور کشمیری صنعت کے نادر تحفے اور کچھ اور سامان لائے ہیں۔ میں ان سے باتیں کرنے لگا۔ لہجے سے پنجابی معلوم ہوتے تھے۔ جہاندیدہ اور ہوشیار آدمی تھے۔ ہندوستان کا شاید ہی کوئی ایسا شہر ہو جہاں اُن کا پھیرا نہ ہوا ہو۔ ان شہروں کے اکثر مشہور لوگوں سے بھی تھوڑے بہت واقف تھے۔ اگرچہ وہ اُن کا ذکر اس بے تکلفی سے کرتے تھے گویا وہ ان کے لنگوٹیا یار ہیں۔

اس کے بعد میں نے کہا کہ اگر زحمت نہ ہو تو میں بھی وہ سوغاتیں دیکھنا چاہتا ہوں جو آپ کشمیر سے لائے ہیں۔ وہ خوشی خوشی مجھے اندر کمرے میں لے گئے اور ایک ایک چیز صندوقوں میں سے نکال نکال کر دکھانے لگے۔ جامہ وار، شالیں، پشمینے کے کپڑے، چاندی کا کام، اخروٹ کی لکڑی کی مختلف چیزیں۔ غرض ہر چیز ایک سے ایک بڑھ کر تھی۔ کشمیر کی یہ بے مثل صنعتیں اور ان کی نزاکت اور نفاست حیرت انگیز تھی۔ جامہ وار کے تھان دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہوتی تھیں اور یہ معلوم ہوتا تھا گویا چمن کھلا ہوا ہے۔ یہی حال چاندی اور لکڑی کے کام کا تھا۔ ہر چیز میں صناعی کا کمال نظر آتا تھا۔ یہ ان غریب اور پامال کشمیریوں کی صناعی تھی جن کی دن رات کام کرتے کرتے انگلیاں ٹیڑھی، سر گنجے، پیٹھ خم اور آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ اور اس محنت کے صلے میں انھیں چند آنے روز سے زیادہ نہیں ملتے۔ ان کے کمال کی سب تعریف کرتے ہیں لیکن غریب کمال والوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ البتہ ان کے جھوٹ، گندگی اور جہالت کی سب مذمت کرتے ہیں۔

میں یہ سب چیزیں حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھ رہا تھا کہ سوداگر نے کہا آپ ان چیزوں کو دیکھ کر کیا حیرت کر رہے ہیں میں ایک واقعہ سناتا ہوں جو سب سے زیادہ حیرت انگیز ہے۔ کہنے لگا پرسوں میں یہ سب سامان لے کر نواب۔۔۔ الملک کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ تو ان کو جانتے ہی ہیں۔ گاؤ تکئے پر اوندھے اس طرح پڑے تھے جیسے کچھوا۔ ان کی پیٹھ پر ایک عجیب قسم کا کوہان سا ہے اس لئے وہ اس طرح اوندھے پڑے پڑے کام کرتے ہیں۔ آدمی بڑے نیک اور شریف ہیں۔ غرض میں نے ایک ایک چیز دکھانی شروع کی۔ دیکھ کر بہت خوش ہوئے، میرے پاس زعفران بھی ہے۔ وہ بھی میں نے پیش کیا۔ پوچھنے لگے یہ تم کہاں سے لائے ہو۔ میں نے عرض کی کہ یہ بھی کشمیر ہی کا تحفہ ہے۔ فرمایا تم نے یہ کیوں کر بہم پہنچایا۔ اور کس مقام سے ملا۔ میں نے کہا کشمیر میں زمین کے بعض خاص قطعے ہیں۔ وہاں یہ بویا جاتا ہے جب اس میں پھول آتا ہے تو اس کا سماں قابل دید ہوتا ہے۔ یہ سن کر بڑے تعجب سے پوچھنے لگے کیا سچ مچ اس کا کھیت ہوتا ہے۔ میں نے کہا جی ہاں اس کا کھیت ہوتا ہے صرف اتنی بات ہے کہ خاص خاص زمینوں میں اس کا پودا پھولتا ہے۔ ہر زمین میں لگانے سے نہیں ہوتا۔ کہنے لگے کیا تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے یا سُنی سنائی بات ہے۔ میں نے عرض کیا حضور میں نے خود اس کے کھیت دیکھے ہیں۔ اور یہ زعفران وہیں کے پھول ہیں۔ فرمایا کیا تم سچ کہتے ہو۔ میں نے کہا میں بالکل سچ عرض کر رہا ہوں۔ یہ سن کر وہ اٹھے اور اندر سے قرآن شریف لے آئے اور میرے ہاتھ میں رکھ کر کہا کہ قرآن کی قسم کھا کر سچ سچ کہو کہ حقیقت میں زعفران کا کھیت ہوتا ہے۔ اور تم نے خود دیکھا ہے۔ میں نے قسم کھا کر کہا کہ درحقیقت زعفران کا کھیت ہوتا ہے اور میں نے اپنی آنکھوں دیکھا ہے۔ کہنے لگے کیا عجیب بات ہے۔ مجھ سے بڑے وثوق سے یہ کہا گیا تھا کہ کشمیر میں ایک بہت بڑا حوض ہے جسے حوض سلیمان کہتے ہیں۔ رات کو پریاں اس میں نہانے آتی ہیں۔ ان کے بدن کے جو بال اس میں گر جاتے ہیں، وہ صبح کو لوگ جا کر سمیٹ لاتے ہیں۔ یہی بال زعفران ہیں۔ مجھے پیر دستگیر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے خاص ارادت ہے۔ ہر سال ان کی گیارہویں بڑے اعتقاد اور اہتمام سے کرتا ہوں پلاؤ اور زردے میں زعفران پڑتا تھا۔ جب میں نے یہ قصہ سنا تو ناپاک سمجھ کر زعفران ڈالنا موقوف کر دیا تھا۔ آج تم سے اصل حقیقت معلوم ہوئی۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ کیسے بھولے لوگ تھے۔ اور ان کے ہاتھ میں لاکھوں بندگان خدا کی قسمت تھی۔ (ہماری زبان)

حامداللہ افسر

سرودِ ازلی

ساحلِ بحر نگاہوں سے نہاں آج بھی ہے
موجِ بیتاب سرِ آب رواں آج بھی ہے

زہد ہے بے خبرِ حسنِ جہاں تابِ حیات
کششِ جلوۂ حورانِ جناں آج بھی ہے

ایک ذرّہ بھی کہیں نور سے محروم نہ ہو
چشمِ خورشید بہ ہر سو نگراں آج بھی ہے

ناز ہے شیخ کو جس راز کی آگاہی پر
وہ ہمیشہ کی طرح سرِّ نہاں آج بھی ہے

ٹھوکریں سیکڑوں ہر گام پہ کھائی ہیں جہاں
اُسی رستے پہ جہانِ گزراں آج بھی ہے

بے نیازی کی ادا حسن میں اب بھی ہے وہی
عشق سرگشتہ و رسوائے جہاں آج بھی ہے

گو ہیں تہذیب و ترقی کی بہاریں ہر سو
پتّے پتّے میں نہاں فصلِ خزاں آج بھی ہے

زندگی گو ابدی ہے مگر اپنے ہاتھوں
زندگی کارگہِ شیشہ گراں آج بھی ہے

رکھ سکی ربط نہ تہذیب زبان و دل میں
سرِّ دلبر بہ حدیثِ دگراں آج بھی ہے

عشق کی جیب میں اک تار بھی موجود نہیں
عقل سودا زدۂ سود و زیاں آج بھی ہے

فوقیت آج تک انسان کو انسان پہ ہے
ہوسِ خواجگیِ کون و مکاں آج بھی ہے

کیوں کوئی منتظرِ حشر رہے اے افسر
ذرّے ذرّے میں قیامت سی نہاں آج بھی ہے

امین حزیں سیالکوٹی

نکات

فطرت کی بلندی سے ہے افکار کی عظمت — اور آئینۂ افکار کا کردار کی عظمت
مقصودِ جہاں عزّ و شرف کا ہو یہ جوہر — رہتی نہیں انکار نہ اقرار کی عظمت

فطرت کی بلندی سے کفِ خاک ضیا بار — خورشید اسی تنویر سے ہر ذرۂ کردار
فطرت کی بلندی کی فلک بوس فضائیں — ظلمت کدۂ ہست کی ہیں مطلعِ انوار

فطرت کی بلندی سے اِدھر فرد سرافراز — اور قوم کو اس جوہرِ قابل پہ اُدھر ناز
پَر ہوں تو ہیں شہباز کی جاگیر فضائیں — وابستۂ افراد ہے ہر قوم کی پرواز

فطرت کی بلندی سے بشر صاحبِ تسخیر — ہے تیغِ اصیل اس سے ہی ادراک کی شمشیر
اللہ سے شب و روز ہیں! مانگ کہ نعمت — فطرت کی بلندی نہیں، اکسیر ہے اکسیر!

بدرالزماں

اسٹیٹ بینک آف پاکستان

(پاکستان کا سرکاری بینک)

یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو پاکستان کا سرکاری بینک اسٹیٹ بینک آف پاکستان اپنا کام شروع کر دے گا۔ عام حالات میں ایسے بینک کا قیام کسی ملک کے مالی نظام میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن پاکستان کے لئے اس کی حیثیت محض ایک سنگ میل سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تقسیم ہند کے بعد سیاست کے میدان میں جو ابتری اور انتشار رہا اس سے ملک کا اقتصادی نظام بھی درہم برہم ہو گیا۔ یہاں تک کہ ناواقف لوگوں کے دل میں یہ اندیشے تک پیدا ہونے لگے تھے کہ یہ ریاست اقتصادی نظام کی کمزوری اور ابتری کی وجہ سے ختم ہو جائے گی۔ یہ صحیح ہے کہ تقسیم کے بعد پاکستان کے علاقوں کو اقتصادی حیثیت سے بہت نقصان پہنچا۔ بینکوں کے دروازے بند ہو گئے اور چند دنوں کے لئے تو یہ حالت ہوئی کہ سارا کاروبار ٹھپ ہو کر رہ گیا لیکن جو لوگ حالات سے واقف تھے وہ کبھی ان اندیشوں کا شکار نہیں ہوئے۔ انھیں یقین تھا کہ یہ صورت حال عارضی ہے اور دیر سویر پاکستان کی اقتصادیات اور اس کا مالی نظام دنیا کی دوسری ترقی یافتہ قوموں کے دوش بدوش جائے گا۔ تاریخ کا تقاضا بھی یہی تھا۔ پاکستان کے سرکاری بینک کا قیام اس قسم کے بے بنیاد شبہات کے لئے اعلان موت ہے۔ اس کا قیام ترقی اور خوشحالی کے ایک نئے دور کا پیامبر ہے۔

پاکستان کے مرکزی بینک کی تاریخ کا سلسلہ اب سے کوئی ایک صدی پہلے تک پہنچتا ہے، جب ۱۸۳۶ء میں ہندوستان کے لئے ایک مرکزی بینک کی ضرورت محسوس کی گئی تھی۔ اس سال تاجروں کی ایک جماعت نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں کے سامنے اس بارے میں ایک عرضی پیش کی تھی۔ اس عرضی کے سو سال بعد تک بھی یہ مرکزی بینک قائم نہیں ہوا۔ لیکن بالآخر ۱۹۳۵ء میں ریزرو بینک آف انڈیا کے نام سے ایک مکمل مرکزی بینک قائم ہوا۔ پورے سو برس کی بحث، تحقیق اور ترقی کے بعد ۱۹۲۰ء تک بین الاقوامی اقتصادی کانفرنس منعقدہ برسلز میں ان ملکوں سے، جن کے پاس کوئی مرکزی بینک نہیں تھا، ایسے بینک کے قیام کا تقاضا ہوا۔ مغربی ممالک بھی (مثلاً امریکہ) جو مرکزی بینک کے قیام میں اعتقاد نہیں رکھتے تھے، رفتہ رفتہ اس کے قائل ہو گئے اور اب تو یہ حال ہے کہ ملک اور قوم کے اقتصادی استحکام کے لئے مرکزی بینک کے قیام کو ایک بے حد ضروری چیز سمجھا جانے لگا ہے۔

مرکزی یا سرکاری بینک کا قیام کئی وجوہ سے اہم اور ضروری ہے۔ بینک کی ایک مستحکم مرکزی تنظیم کا اثر ریاست کی اقتصادی استواری پر بڑا اچھا پڑتا ہے۔ کیونکہ اول تو بعض اہم کام، مثلاً نوٹ جاری کرنا، سرکاری نقدی اور عوامی قرضوں کا بندوبست کرنا اور غیر ملکی سکوں کے تبادلے کی دیکھ بھال کرنا وغیرہ، حکومت اتنی اچھی طرح نہیں کر سکتی، جتنی اچھی طرح مرکزی بینک کر سکتا ہے، چاہے بعض معاملات میں نگرانی اور ہدایات کی ذمہ دار حکومت ہی ہو۔ دوسرے تجربے سے ثابت ہوا ہے کہ جب ملک کے اقتصادی نظام اور بینک کی مرکزی تنظیم کے درمیان کوئی اشتراک یا تعلق نہیں تھا تو معاشی نظام میں بڑی گڑبڑ ہوتی تھی۔ حکومت اور بینک الگ الگ اپنے محفوظ سرمائے رکھتے تھے اور کوئی بحران آتا تھا تو بینک اس کا مقابلہ نہ کر پاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ۱۹۱۳-۱۴ء میں چند بینک فیل ہو گئے۔

یہاں جملہ معترضہ کے طور پر یہ اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ اس طرح جو مرکزی بینک وجود میں آئے گا اس کے فرائض دوسرے بینکوں کی طرح نہ ہوں گے نہ ان بینکوں سے اس کا مقابلہ ہوگا بلکہ یہ حکومت اور دوسرے بینکوں کا بینک ہوگا اور دونوں کے تحفظ کا ذمہ دار ہوگا۔

مختلف النوع معاشی مسائل نے جن میں صنعتی ترقی اور بین الاقوامی تجارت اور کرنسی بھی شامل ہیں، آجکل بینک کے نظام کو بہت پیچیدہ بنادیا ہے۔ ایک طرف تو یہ ضروری ہے کہ تجارت کی مختلف ضروریات پوری کی جائیں۔ اور پھر یہ بھی ضروری ہے کہ دغا و فریب سے بچنے کے لئے روپیہ جمع کرنے والوں کے مفاد کی حفاظت کی جائے۔ کیونکہ یہی لوگ تجارتی تعلقات کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ ان مقاصد کے لئے ملک میں بینک کے نظام کو مرکزی نگرانی اور ہدایات کی ضرورت ہے۔ ایسی ہدایات بہترین طور پر مرکزی بینک ہی جاری کرسکتا ہے۔ پاکستان میں اس بات کی اور بھی ضرورت ہے کیونکہ پرانے بینک زیادہ تر ملک سے جاچکے ہیں اور نئے بینکوں کی تشکیل میں ابھی کچھ وقت لگے گا۔

دوسرے ملکوں کے بینکوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ دوران ترقی میں چھوٹے موٹے بینکوں کی افراط ہوجاتی ہے جو جلدی اور آسانی سے منافع کمانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کا خیال نہیں کرتے کہ اس میں کتنے خطرات ہیں۔ اس لحاظ سے دو وجہات سے ہمارے مسائل اور بھی پیچیدہ ہیں۔ ایک تو جدید قسم کے بینک غائب ہوتے جارہے ہیں، دوسرے ایسے مہاجن اور ساہوکار رفتہ رفتہ یہاں سے جارہے ہیں۔ جو بینکوں کے وجود سے پہلے اور اس کے بعد بھی لین دین کا کام کرتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ساہوکار کا غائب ہونا ایک لحاظ سے خدا کی نعمت ہے، لیکن یہ نعمت اسی صورت میں نعمت ہے کہ ساہوکار کی جگہ کوئی بہتر چیز آئے اور سٹے باز بینک اپنے سر نہ اٹھائیں۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے، کہ پناہ گزین تاجر اور کسان جدید بینکوں کا روپ دھارے ہوئے بے ایمان مہاجن کے چنگل میں نہ پھنس جائیں۔ ہمیں شروع ہی سے بینک کے نظام کو استوار اور سائنٹیفک اصولوں پر چلانا ہے۔ اس میں فائدے کے امکانات بھی ہیں اور خطرے کے بھی۔ لیکن اسٹیٹ بینک کا قیام اس بات کی ضمانت ہے کہ خطروں کا امکان بہت کم ہوجائے گا۔ اسٹیٹ بینک اس قابل ہوگا کہ وہ ٹھوس اور اچھے بینکوں کی ہر ممکن طریقے پر ہمت افزائی کرے اور سٹے بازی کے رجحانات کو بڑھنے نہ دے۔ یہ بینک مرکزی حکومت کو بینک چلانے کے معاملے میں مشورے بھی دے سکے گا تاکہ حکومت روز افزوں تقاضوں کے مطابق قانون بناسکے۔

فی زمانہ ہماری اقتصادیات میں روپیہ کی ادائیگی کی آسانیوں کی بڑی اہمیت ہے۔ سب جانتے ہیں کہ بڑے بڑے تجارتی سمجھوتے اور روپیوں کی ادائیگیاں ڈاک خانوں کی معرفت نہیں بلکہ بینکوں کی معرفت ہوتی ہیں۔ تجارت اور کاروبار کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ تجارتی مرکزوں میں روپئے کی درآمد اور برآمد جاری رہے۔ لہذا بینکوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ روپیہ بھیجنے کی آسانیاں ہونی چاہئیں۔ اگست ستمبر ۱۹۴۷ء میں کاروبار رک جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ریزرو بینک آف انڈیا کے ایجنٹ امپیریل بینک آف انڈیا نے مغربی پنجاب میں اپنی بیشتر شاخیں بند کردی تھیں۔ آج بھی روپیہ کی ادائیگی کی پوری آسانیاں میسر نہیں ہیں۔ ہمارا اسٹیٹ بینک رفتہ رفتہ یہ آسانیاں فراہم کرے گا۔ اور اس طرح ہم اس شدید نقصان اور خطرے سے بچ جائیں گے جن میں موجودہ حالات میں ہم گھرے ہوئے تھے۔

کسی ملک کے نظام زر کا ایک اہم عنصر اس کی کرنسی کا استحکام یا دوسرے لفظوں میں روپئے کی قوت خرید کو ایک سطح پر قائم رکھنا ہے۔ یہ ایک بین الاقوامی مسئلہ ہے جس نے پچھلی جنگ کے زمانے میں سنجیدہ صورت اختیار کرلی تھی۔ اور اب سارے ملک بڑھتی ہوئی قیمتوں کو روکنے کے لئے جدوجہد میں مصروف ہیں۔ بہرحال اس بات کو سب مانتے ہیں کہ یہ مسئلہ دنیا کے بڑے بڑے ملکوں کے اشتراک سے حل ہوسکتا ہے۔ اور یہ اشتراک مختلف ملکوں کے مرکزی بینکوں کے ذریعہ قائم ہوسکتا ہے۔

مختلف ملکوں کے مرکزی بینکوں میں اشتراک کا ذکر کرتے ہوئے یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مرکزی بینک کا ادارہ نہ صرف دو ملکوں کے درمیان تجارتی تعلقات قائم کرنے میں مدد ہوتا ہے بلکہ اقتصادی اشتراک قائم ہونے کے بعد باہمی اتفاق و اشتراک کا جذبہ بھی پیدا کرتا ہے۔

یہ مسئلہ عرصے سے متنازعہ ہے کہ مرکزی بینک حکومت کی ملکیت ہونی چاہئے یا افراد کی۔ حکومت نے دونوں نظریوں کے درمیان یہ راہ نکالی ہے کہ وہ بینک کے حصوں میں ۵۱ فیصدی کی مالک ہوگی، تاکہ حکومت اس کی مناسب نگرانی بھی کرسکے اور افراد بھی اس میں شرکت سے محروم نہ رہیں بہرحال اس غرض سے کہ کوئی فرد یا ادارہ اس پر حاوی نہ ہوجائے، ہر حصے دار کے ووٹوں کی تعداد دس تک محدود کردی گئی ہے بینک کا سرمایہ تین کروڑ روپے ہوگا جو سو سو روپے کے حصوں میں منقسم ہوگا یہ بات بڑی وصلہ افزا ہے کیونکہ ریزرو بینک آف انڈیا

(باقی صفحہ [illegible] پر) جاری ہے

لونٹ - کراچی

قاسم حسن

عبّاسیوں کے عہد میں اسلامی تہذیب

آج جس تہذیب کو ہم اسلامی تہذیب کہتے ہیں وہ تنہا عربوں کی بنائی ہوئی تہذیب نہیں ہے بلکہ اس کی تعمیر میں ان تمام قوموں کا حصہ ہے جو اسلام کے زیر نگیں آئیں۔ جوں جوں اسلام کی سلطنت وسیع ہوتی گئی مختلف قومیں اسلامی تہذیب کی تشکیل میں حصہ دار بنتی گئیں۔ اسلامی تہذیب کی سب سے نمایاں خصوصیت یہی ہے کہ اس میں ایرانی، شامی، قبطی اور بربری قوموں نے عربوں کے ساتھ ہو کر انھیں کی زبان میں اور انھیں کے انداز میں اسلامی علوم و فنون اور تہذیب و تمدّن کو اس کے ارتقاء کی آخری منزلوں تک پہنچایا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت عرب اپنے اندر ایک زندگی بخشنے والی قوت رکھتے تھے۔ اُن کا ذہنی جوش، اُن کی زندہ دلی، اُن کے ولولے اور ان کی امنگیں ایسی تھیں کہ اُن سے ملتے ہی مفتوحہ اقوام کے ذہنوں کا اضمحلال اور طبیعتوں کی افسردگی دور ہو جاتی تھی۔ ایرانی، بازنطینی اور قبطی گو قدیم اقوام تھیں اور پرانی تہذیبوں کی حامل تھیں لیکن عربوں کے میدان میں آنے کے وقت تک یہ قومیں اپنی طبیعت کی روانی اور ذہن کی جودت بالکل کھو چکی تھیں۔ آگے بڑھنے کی صلاحیت ان میں مطلق باقی نہ رہی تھی لیکن عربوں سے ملتے ہی ان کے دماغ جاگ اٹھے اور ان کے ذہن اپنی جولانی دکھانے لگے۔ دفعتہً تحقیق و تجسس اور تلاش و جستجو کی قوتوں نے بیدار ہو کر علم و فن کے قدیم میدان میں فکر و نظر کے جدید سانچے تیار کر دیے۔ اس طرح قدیم تہذیب کا بیج اسلام کی نئی سرزمین میں بویا گیا اور اس کی کونپلیں نمودار ہونے لگیں مگر اموی عہد کے سیاسی انتشار، مسلسل خونریزیوں اور حسد و نفرت کی فضا نے اس پودے کو بار آور نہ ہونے دیا لیکن امویوں کی حکومت کے ختم ہوتے ہی مخالف اثرات کا یہ طوفان فرد ہو گیا اور عباسیوں کے عہد میں اسلامی تہذیب اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ دنیا کے سامنے آ گئی۔

عبّاسیوں نے بغداد کو اپنا پایۂ تخت بنایا اور یہیں نویں صدی عیسوی میں اس عظیم الشان تہذیب کی بنیاد پڑی۔ عباسیوں کی طاقت کا اصل سرچشمہ ان کی فوج تھی جو زیادہ تر نومسلموں پر مشتمل تھی۔ شروع ہی زمانہ میں فوج کی تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی تھی۔ تنہا عراق میں ایک لاکھ پچیس ہزار فوج مقیم رہتی تھی۔ یہ سب تنخواہ دار فوج تھی اس کے علاوہ بدوؤں، کسانوں اور شہریوں کی وہ رضاکار فوج تھی جو جنگی ضرورت کے وقت حکومت کی مدد کرتی تھی۔ مستقل افواج کو قومیت کی بنا پر دو حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ایک حصّہ تو خالص عربی سپاہ پر مشتمل تھا۔ یہ "حربیہ" کہلاتے تھے۔ دوسرا حصّہ غیر عرب افواج پر مشتمل تھا۔ یہ "جند" کہلاتے تھے اور ان میں خراسانیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ تقریباً ایک صدی گزرنے کے بعد ایک اور بیرونی عنصر عبّاسی افواج میں شامل ہونے لگا۔ یہ ترک سپاہی تھے۔ تقریباً سو سال تک عبّاسیوں کی فوج ہی اُن کی طاقت اور اُن کی سلطنت کو سنبھالے رہی۔ اپنے لباس اور آلات حرب میں یہ فوج یونانی فوج کے بالکل مشابہ تھی۔ یونانیوں کی طرح مسلمان سپاہی بھی تیر و کمان اور شمشیر و سنان کا استعمال کرتے تھے۔ اُن کے سروں پر بھی فولادی خود ہوتے تھے، جسم پر زرہ بکتر ہوتا اور بازوؤں اور ٹانگوں پر فولادی خول۔

جس طرح آج ہمارے زمانے میں سائنس کے علوم سے جنگ میں مدد لی جا رہی ہے اسی طرح ہارون رشید کے زمانے میں بھی سائنس جنگ میں مدد اور معاون تھی۔ دشمن کی فوجوں پر آتش گیر مادہ پھینکنے کا رواج عام تھا۔ آگ برسانے والے سپاہی خود ایسا لباس پہنے ہوتے تھے جس پر آگ کا اثر نہ ہوتا تھا اور جس کو پہنے ہوئے وہ دشمن کے جلتے ہوئے قلعوں میں گھس جاتے تھے۔ اس کے علاوہ عباسیوں کے عسکری نظام کے جس پہلو پر ہم نظر ڈالتے ہیں وہاں ہمیں موجودہ زمانہ کی خصوصیات میں سے کوئی نہ کوئی خصوصیت ضرور ملتی ہے۔

عبّاسیوں کا جاسوسی نظام نہایت مستحکم تھا۔ عورتیں اور مرد، کبھی تاجروں کے بھیس میں اور کبھی حکیموں کے، دوسرے ممالک کا دورہ کرتے تھے اور اپنی حکومت کو اطلاعات بہم پہنچاتے تھے خاص کر

بازنطینی سلطنت میں اُن کے جاسوس بہت پھیلے ہوئے تھے۔ کیونکہ یہ سلطنت اب تک ان کی معاند تھی۔ ایسی سلطنت کی زد سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لئے عباسیوں نے اپنی سرحدوں کی قلعہ بندی کی۔ ہارون رشید کے زمانے میں پورے سرحدی صوبے کو فوجی اعتبار سے نہایت مستحکم بنا دیا گیا، اور دفاع کے سلسلے میں تمام وہ تدابیر اختیار کی گئیں جو موجودہ زمانے کی حکومتیں عمل میں لاتی ہیں۔

عباسیوں کے عہد میں مسلمانوں کا بحری بیڑا بھی ممتاز خصوصیات کا حامل تھا۔ عربوں کے پاس اسلام کے ابتدائی زمانے ہی سے ایک خاصا بڑا بیڑا موجود تھا۔ چنانچہ سنہ ۳۶ھ میں وہ اپنی بحری طاقت ہی کی بدولت قبرص فتح کر چکے تھے اور بازنطینی سلطنت پر حملہ کر چکے تھے۔ اس کے بعد بھی ہمیں تاریخ میں اکثر عربوں کے بحری حملوں کا حال ملتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عربوں کے بحری فن نے بازنطینی اثرات کے ماتحت ترقی کی لیکن اس میں بھی مطلق شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ یورپ نے اس فن میں جو ترقی کی وہ عربوں کے زیر اثر کی۔ چنانچہ آج تک یورپ کے ملاحوں میں سینکڑوں ایسی اصطلاحیں رائج ہیں جنھیں عرب جہاز راں استعمال کرتے ہیں۔

جہاں تک فوجی اور ملکی نظامِ حکومت کا تعلق ہے خلافتِ عباسیہ اپنے ابتدائی دور ہی میں عروج پر پہنچ چکی تھی۔ قدیم زمانہ سے کل مملکت صوبوں میں بٹی ہوئی تھی اور ہر صوبہ میں ایک صوبہ دار رہتا تھا۔ عباسیوں نے اس تقسیم کو برقرار رکھا لیکن صوبہ داروں کو اپنے قابو میں رکھنے کے لئے مرکزی حکومت صوبہ داروں کے کام سے پوری طرح باخبر رہتی تھی اور ان کی طاقت کو بڑھنے نہ دیتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بغداد سے مملکت کے ہر گوشے تک سڑکیں تیار کی گئیں۔ بغداد میں سرکاری ڈاک لانے اور لے جانے کے لئے ایک محکمہ قائم کیا گیا اور سرکاری ڈاک کے ہرکاروں کے لئے سڑکوں پر جن سہولتوں کا انتظام کیا گیا انھوں نے عام مسافروں کے لئے بھی سفر کی دشواریوں کو گھٹا دیا، اسی وجہ سے سفر کا شوق لوگوں میں عام ہونے لگا اور تھوڑے ہی عرصہ میں سلطنت کے اندر ایسے سیاح پیدا ہو گئے جنھوں نے جغرافیہ کے میدان میں علمی تحقیق کی بنیاد رکھی۔

عباسی سلطنت کا مالی نظام بھی نہایت مستحکم تھا۔ اس زمانہ کی تحریریں جو آج تک موجود ہیں پتہ دیتی ہیں کہ عباسیوں کی حکومت کے پہلے سو سال میں سلطنت نہایت خوش حال تھی۔ ابتدائی زمانے کی خوش حالی کا پتہ ہمیں اس وقت کے بغداد کی شان و شوکت سے ملتا ہے جہاں کی دولت کی داستانیں آج تک قصوں کہانیوں میں مشہور ہیں۔

عباسی حکومت کے شروع کے ۸۲ سال میں بغداد کی شان و شوکت اپنے کمال پر پہنچی ہوئی تھی۔ تنہا خلیفہ منصور نے اپنے عہدِ حکومت میں بغداد کے اندر تین ایسے محل تعمیر کرائے جو ایرانی فن کے بہترین نمونے تھے لیکن ان نئی عمارتوں سے بھی جب اس کے ذوقِ تعمیر کی تسکین نہ ہوئی تو دجلہ کے دوسری جانب ایک محل اور تعمیر کرایا جس میں اس کا ولی عہد مہدی رہتا تھا۔ بہت جلد اس محل کے اردگرد ایک پورا شہر آباد ہو گیا جو شرقی بغداد کے نام سے مشہور ہوا۔ اسی شہر میں برمکیوں نے اپنے وہ محل تعمیر کرائے جو شان و شکوہ میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ مامون رشید کے وزیر جعفر برمکی کا محل "قصرِ جعفری" ایرانی اور عربی طرز کی ایک بے مثل عمارت تھی۔

بغداد کا شہر دجلے کے بندرگاہ کی حیثیت بھی رکھتا تھا۔ چنانچہ دریا کے دونوں جانب میلوں تک کشتیوں اور جنگی جہازوں کی قطاریں نظر آتی تھیں جن سے شہر کی عظمت اور خوبصورتی اور بڑھ گئی تھی۔

مشرقی بغداد کے بازاروں میں چینی کے برتن، سمور و قاقم، چمڑے کی اشیاء اور اسلحات کی منڈیاں تھیں۔ سویڈن کے ساحل اور روس کے مختلف حصوں میں زمین کے اندر سے جو عربی سکے برآمد ہوئے ہیں وہ پتہ دیتے ہیں کہ ان ملکوں کے ساتھ عرب تجارت کرتے تھے۔ عربوں کے یہاں سے ان ملکوں کو جو سامان جاتا تھا اس میں اونی کپڑے، جواہرات، فولادی آئینے، شیشے کے موتی اور گرم مسالے شامل تھے۔ اپنی مصنوعات کے بدلے میں عرب ان ملکوں سے کچا مال لیتے تھے۔ اسلامی ملکوں کی درآمد و برآمد کی اشیاء پر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ صنعتی اور تجارتی اعتبار سے اسلامی سلطنت دنیا کی ایک نہایت ترقی یافتہ سلطنت تھی۔ شکر سازی اور فولاد کی صنعت ایرانیوں کا حصہ تھی۔ شام شیشے کی مصنوعات کا مرکز تھا۔ قالین سازی اور پارچہ بافی میں عرب دنیا بھر میں مشہور تھے۔ جنوبی عرب ریشمی کپڑا اور کشیدہ کاری اور کلابتون کی صنعت کے نمونے دور دور جاتے تھے۔ بغداد میں زرگری کی صنعت بھی عروج پر تھی۔ عرب گھڑی سازی کی صنعت سے بھی واقف تھے اور بغداد میں نہایت خوبصورت گھڑیاں تیار ہوتی تھیں۔

مصوری کے فن میں بھی عرب دنیا کی دوسری قوموں سے پیچھے

نہ تھے۔ مساجد اور دوسری مذہبی عمارات میں تو البتہ تصاویر نہیں بنائی جاتی تھیں، کیونکہ اس میں بت پرستی کا شائبہ تھا۔ لیکن دوسری عمارتوں میں عرب آزادی کے ساتھ مصوری کے جوہر دکھاتے تھے۔ درحقیقت ایران کے تمام فنون لطیفہ نے عربوں کی طبیعت کو متاثر کیا تھا اور انھوں نے ایرانی تہذیب کی تمام خصوصیات کو اپنا لیا تھا۔

معاش کے سلسلہ میں اسلام کی تعلیم نے مسلمانوں کو صنّاع بننے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اسی وجہ سے مسلمانوں کے نزدیک تجارت اور صنعت مذہبی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس تعلیم کا افادی پہلو یہ نکلا کہ صنعت و حرفت کے میدان میں جو نئی چیز عربوں کے علم میں آئی اس سے فائدہ اٹھانے کی انھوں نے کوشش کی۔ مثلاً چین کی کاغذ سازی کی صنعت سے واقف ہونے کے بعد انھوں نے بھی کاغذ بنانے کی کوشش شروع کی۔ عباسی عہد کے شروع زمانے ہی میں دربار خلافت کی طرف سے چینیوں کو دعوت دی گئی اور انھوں نے سمرقند میں اپنا کاغذ سازی کا کارخانہ کھول لیا۔ اپنی سلطنت میں اس کاروبار کے جاری ہونے کی وجہ سے عربوں کو خود بھی اس نئی صنعت میں تجربے کرنے کا موقع ملا، چنانچہ وہ ملک اور قسطنطنیہ سے کاغذ تیار کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ ان تجربوں میں ان کو کامیابی ہوئی۔ چنانچہ ۷۹۴-۹۵ء میں انھوں نے بغداد میں خود اپنا کاغذ سازی کا کارخانہ کھول دیا اور اتنا کاغذ تیار کرنے لگے کہ سرکاری دفتروں کی کل ضروریات پوری ہونے لگیں۔ رفتہ رفتہ کاغذ سازی کی صنعت کل اسلامی سلطنت میں پھیل گئی اور موٹا اور پتلا، ریشمیں اور سادہ چکنا اور کھردرا، سفید اور رنگین ہر طرح کا کاغذ ہر جگہ بننے لگا۔ عربوں کے تیار کئے ہوئے کاغذ سے پہلے بھی دنیا میں کاغذ موجود تھا لیکن یہ نہایت قیمتی تھا اور ہر شخص اس کو استعمال نہ کر سکتا تھا۔ عربوں کا تیار کیا ہوا سستا کاغذ عام لوگوں کی دسترس میں تھا۔ اس وجہ سے علوم و فنون اور ادبیات کی عام تصانیف میں استعمال ہونے لگا۔ علمی دنیا عربوں کے اس احسان کو کبھی نہیں بھول سکتی۔

عطر سازی کی صنعت میں بھی عرب موجد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے گلاب اور نارنگی وغیرہ کے پھولوں سے عطر تیار کئے۔ عطر اور عرقیات کی صنعت، دمشق اور شیراز کے ارد گرد اس قدر پھیلی کہ حکومت نے اس صنعت پر محصول لگا دیا۔ ان خوشبوؤں کے تیار کرنے میں بہت سی دواؤں کی ضرورت پیش آتی تھی۔ چنانچہ دوا سازی کی صنعت بھی عطر سازی کے ساتھ ہی ساتھ ترقی کرنے لگی۔ اسی طرح زراعت، صنعت اور کیمیاوی تجربات کی ضروریات کے ماتحت آلات سازی کی صنعت نے پوری اسلامی دنیا میں فروغ حاصل کر لیا۔

عباسیوں کے دور کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ باکمال صنّاعوں اور اہل حرفہ نے اپنی اپنی صنعت کو محفوظ رکھنے کے لئے اس کے اصول کتابی شکل میں قلمبند کر لئے۔ گو عربوں کے ادب کے مقابلہ میں اس سرمایہ کی کوئی خاص وقعت نہیں پھر بھی ہم اس کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اس نے صنعتی علوم کے کمالات کو محفوظ کر دیا اور آنے والے صنّاعوں کے لئے ترقی کا راستہ کھلا رکھا۔

صنعت و حرفت کی ترقی نے جب عرب قوم کو آسودہ حال بنا دیا تو وہ ان مشاغل کی طرف متوجہ ہوئی جن میں اس کے ذہن اور قلب کے لئے راحت اور لطف اندوزی کا سامان تھا۔ اس قسم کے مشاغل میں سب سے زیادہ اہم اور مفید مشغلہ علم کی تلاش اور جستجو ہے۔ عربوں کی علم دوستی اور علم نوازی نے بغداد کو بہت جلد علوم کا گہوارہ بنا دیا۔ بغداد کی درسگاہوں میں علوم اس طرح چمکے کہ کل اسلامی سلطنت بلکہ پوری دنیا نے ان سے روشنی حاصل کی۔

قرآن کی تعلیم کے لئے خلافت راشدہ ہی کے دور سے مدارس قائم ہو گئے تھے اور عباسیوں کے عہد میں تو اس قسم کے ابتدائی مدارس سلطنت کے چپے چپے پر موجود تھے۔ بعد میں جب اعلیٰ تعلیم کے لئے یونیورسٹیاں اور دار العلوم کھلے تو ان میں بھی مذہبی تعلیم ہی کو فوقیت حاصل رہی۔ اس فوقیت کی اصل وجہ یہ ہے کہ عربوں نے دنیا میں جو سربلندی حاصل کی تھی وہ اپنے مذہب کے طفیل کی تھی، اس لئے مذہب ان کو دنیا میں سب سے زیادہ عزیز چیز تھی۔ مذہب ہی نے علم کو "مومن کی کھوئی ہوئی پونجی" قرار دے کر عربوں کے لئے علم و حکمت کے دروازے کھولے تھے۔ چنانچہ اپنی یونیورسٹیوں میں انھوں نے سب سے پہلے مذہبی علوم ہی کی تدوین کی۔ یہ علوم قرآن، حدیث اور فقہ پر مشتمل تھے۔ دینی علوم کے ساتھ ہی ساتھ انھوں نے دنیاوی علوم کا سررشتہ بھی ہاتھ سے نہ چھوڑا

ان علوم کی قدردانی اس سے زیادہ اور کیا ہوگی کہ بیس مساجد میں جہاں دین کے علوم کا درس دیا جاتا تھا یہ علوم بھی اسی شغف اور انہماک کے ساتھ پڑھائے جاتے تھے۔ اسلام کی تاریخ میں پانچویں صدی ہجری تک مسجد ہی مسلمانوں کا دارالعلوم تھی۔ تدریس کو چونکہ معلم ایک مقدس کام سمجھ کر انجام دیتا تھا اس لئے اس کی تنقیدیں بے لاگ ہوتی تھیں اور وہ ہر اختلافی مسئلہ پر نہایت آزادی اور جرأت کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرتا تھا۔ معلموں کی اسی ماہ امتیازی اور جرأت نے متعلمین کے لئے رائے اور ضمیر کی آزادی کی راہیں کھول دیں۔ یہی آزادی فکر اسلامی تہذیب کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

اسلامی علوم کی ترقی کے فکر میں ہم ان قوموں کے کارناموں کو کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے جو پہلے سے اپنا روشن تہذیبی پس منظر رکھتی تھیں اور اب اسلام کی آغوش میں آ گئی تھیں۔ دراصل انھیں سب کی اجتماعی کوششوں سے اسلامی تہذیب وجود میں آئی۔ ان قوموں میں خصوصیت کے ساتھ ایرانی قابل ذکر ہیں۔ اسلام کی تاریخ میں ایران کی فتح کی اہمیت اس وجہ سے اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ اس نے عرب کی تہذیب کو عجم کی تہذیب کے ساتھ مزدوج کر دیا اور اسی امتزاج نے وہ تہذیب پیدا کی جسے ہم اسلامی تہذیب کہتے ہیں۔ شاعری، ادب لطیف، فلسفہ اور تاریخ میں ایرانی قدیم زمانہ سے ایک بلند مذاق کے مالک تھے، عجم کے ان اثرات نے عرب کی تہذیب کا سارا مزاج بدل دیا۔

اکتساب علم کے معاملہ میں عرب قوم ایک وسیع قلب اور کشادہ دماغ لے کر دنیا میں نکلی تھی۔ اس نے جس طرح ایرانیوں کے علمی مذاق کا اثر لیا اسی طرح دوسری قوموں کے علوم سے بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ چنانچہ اپنے قانون، طب اور طبعی علوم کی بنیاد اس نے تمام تر یونانی نظریات پر رکھی لیکن اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس نے غیروں کی چیزوں کو اپنا بھی لیا اور اپنی انفرادیت کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

اسلام کے عالموں میں ہر قسم کے لوگ تھے جو ابتداً فکر و نظر میں ایک دوسرے سے یقیناً جدا تھے لیکن عربوں کے ساتھ میل نے ان میں وحدت فکر پیدا کر دی جو آج پوری عرب تہذیب کا طرۂ امتیاز ہے۔ فکر کی یکسانیت کا بڑا سبب یہ تھا کہ جس مسلمان مصنف نے تصنیف کے لئے قلم اٹھایا اس نے پہلے عربی زبان میں دستگاہ حاصل کی، عربوں کے ساتھ ربط ضبط بڑھایا، ان کی شاعری، تاریخ اور مذہبیات کا بہ غور مطالعہ کیا اور پھر انھیں چیزوں کو اپنی تصانیف کا موضوع بنایا۔ اس طرح مختلف قوموں کا فکر ایک سنگم پر اکٹھا ہو گیا یہی سنگم اسلامی تہذیب ہے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ عربوں سے پہلے ان قوموں کی ذہنی قوتیں بالکل خوابیدہ تھیں۔ عرب نے اپنے نئے جوش سے ان کو جگایا عمل کی طرف مائل کیا اور پھر عمل کے لئے مواقع بہم پہنچائے۔ یہی وجہ ہے کہ پوری اسلامی تہذیب پر عربوں کا نمایاں طور پر غالب رہا۔

عربوں کے علوم کو ہم دو حصوں میں منقسم کر سکتے ہیں۔ اول قسم کے تحت وہ علوم آتے ہیں جن کا محرک عربوں کا خالص قومی جذبہ تھا۔ ان میں مذہبیات، لسانیات اور تاریخ شامل ہیں۔ یہ علوم عربوں کے قومی علوم کہے جا سکتے ہیں۔ دوسری قسم کے علوم وہ ہیں جو علم کے عمومی شوق کے ماتحت انھوں نے سیکھے اور پھر ان کو ترقی دی۔ ان میں فلسفہ، ریاضی، ہیئت، نجوم، طب، جغرافیہ اور طبعی علوم شامل ہیں۔

عربوں کے مذہبی علوم کا سرچشمہ قرآن اور حدیث ہے۔ حدیث ہی کے علم سے فقہ کا علم نکلا۔ اسلام کی ابتدائی دو صدیوں کے زمانہ میں فقہ یعنی قانون اسلام حدیث کے دائرے کے اندر ہی محدود رہا لیکن عباسیوں کے عہد میں مسائل کے تصفیے کے سلسلے میں جہاں کتاب و سنت کی روشنی بالکل واضح نہ تھی وہاں قیاس اور رائے سے کام لیا گیا۔ چنانچہ قیاس اسلامی فقہ کا لازمی جز بن گیا اور اس کی وجہ سے فقہ کے علم نے بڑی ترقی کی۔

فقہ کی تدوین کا کام امام ابوحنیفہ، امام مالک ابن انس، امام شافعی اور امام احمد ابن حنبل کی کوششوں نے پورا کیا۔ چونکہ یہ چاروں فقہا مسائل کی تحقیق میں اکثر مقامات پر متفق نہ تھے اس لئے اسلامی فقہ کے یہ چار مختلف مذاہب بن گئے جو آج تک موجود ہیں اور جن کی تحقیق فقہ کے میدان میں اسلام کا سب سے بڑا کارنامہ کہی جا سکتی ہے۔

تاریخ کے میدان میں مسلمانوں کا قلم بنی امیہ ہی کے عہد سے جولانیاں دکھانے لگا تھا۔ عباسیوں کے عہد میں اس فن نے کمال حاصل کیا۔ یہاں تک کہ عربوں نے ابن خلدون (متوفی ۸۰۸ھ) جیسا مورخ پیدا کیا جس کے تاریخی نظریات پر دور جدید کا فن تاریخ نویسی بھی کچھ اضافہ نہ کر سکا۔

لسانیات کے سلسلے میں بھی عربوں نے تحقیق کے جوہر دکھائے۔ ان کے مقرر کئے ہوئے لسانی اصولوں کو آج تک دنیا مانتی ہے۔ ہر زبان کو علمائے اپنی زبان کی صرف و نحو مقرر کرنے میں اور الفاظ کی تحقیق میں عربوں کی لسانی کوششوں سے مدد ملتی ہے۔

اپنے قومی علوم کے ساتھ ہی ساتھ عربوں نے دوسروں کے علوم کو بھی اپنی دسترس سے باہر نہ جانے دیا۔ اس وقت مہذب دنیا کا ایک بڑا حصہ ان کے زیرنگیں تھا۔ محکوم قوموں میں جہاں کہیں ان کو علم کی کرن نظر آئی وہیں لپک گئے۔ اس روشنی سے خود فائدہ اٹھایا اور دنیا کو فائدہ پہنچایا۔ تحصیل علم کا یہ شوق عربوں کے لئے تاریخ کے طالب علم سے ہمیشہ خراج تحسین لیتا رہے گا۔

یونان اور روما کی سلطنتوں کے عروج کے زمانہ سے شام اور عراق یونانی تہذیب کے مرکز چلے آتے تھے اسی طرح ایران میں عیسائیوں کی وجہ سے صدیوں سے یونانی علوم کی شمع روشن تھی۔ علم کے ان سرچشموں پر عرب کے لئے سیرابی کا سامان موجود تھا چنانچہ خلیفہ مامون رشید (۸۱۳ء تا ۸۳۳ء) کے عہد میں یونانی کتب کے عربی زبان میں ترجمے ہوئے۔ حکومت نے ان تراجم کا بڑے اعلیٰ پیمانہ پر انتظام کیا اور اس کوشش کا نتیجہ یہ نکلا کہ فلسفہ، ریاضی اور طب کے مطالعہ کے لیے عربوں کے پاس کتابوں کا ایک خاصا بڑا ذخیرہ تیار ہوگیا۔ فلسفہ میں عربوں نے ارسطو کو استاد مانا اور اس کی تمام تصانیف کو عربی میں ترجمہ کر لیا۔ اور ان تراجم پر حاشئے چڑھائے جن کی مدد سے ارسطو کی تعلیم کا سمجھنا آسان ہوگیا اور فلسفہ کے علم کی تحصیل کا شوق لوگوں میں عام ہوگیا۔ عربوں کے انھیں تراجم نے عہد وسطیٰ کے اختتام پر یورپ کو یونان کے مٹے ہوئے فلسفے سے روشناس کرایا۔ اسی طرح ریاضی میں یونانیوں اور ہندوستانیوں کے علوم سیکھ کر عربوں نے خود ایک نئے علم کی بنیاد رکھی اور یہ "الجبرا" کا علم تھا۔ عرب ریاضی داں الخوارزمی نے الجبرا کی جو تصانیف ۸۴۲ء میں کی تھیں ان کے لاطینی ترجمے سولھویں صدی عیسوی تک یورپ کی درسگاہوں میں پڑھائے جاتے تھے۔

ریاضی کے بعد نجوم اور ہیئت عربوں کے محبوب ترین علوم تھے۔ چنانچہ عباسیوں کے عہد میں عربوں نے البیرونی، الفرغانی اور البطانی جیسے ہیئت داں پیدا کئے جنھوں نے مغرب کو ان علوم سے روشناس کرایا۔ طبعی علوم میں کیمیا کے ساتھ عربوں کو خاص دلچسپی تھی اور اس علم میں ان کی تحقیق یونانیوں کی تحقیق سے کہیں آگے نکل گئی، اس کا راز صرف یہ تھا کہ انھوں نے اس علم کے عملی پہلو پر بہت زیادہ زور دیا۔ طبعی علوم کی عملی تحقیق میں عرب درحقیقت موجد کی حیثیت رکھتے ہیں چنانچہ اہل مغرب نے عربوں ہی کی تحقیق پر اپنے علوم کی عمارت تعمیر کی ہے۔

طبعی علوم میں عربوں کو علم کیمیا اور علم تشریح البدن سے جو دلچسپی تھی اس نے ان کو طب کے فن کی طرف مائل کیا اور اس فن میں انھوں نے بیش قیمت تصانیف چھوڑیں۔ محمد ابن زکریا الرازی (۸۵۰ء تا ۹۲۳ء) نے خلیفہ منصور کے عہد میں دس جلدوں میں طبی دائرۃ المعارف مرتب کی۔ اس فن کا دوسرا امام شیخ بوعلی سینا گذرا ہے جس کی کتاب "قانون طب" ہے یہ دونوں کتابیں سولھویں صدی عیسوی تک یورپ کی درسگاہوں میں پڑھائی جاتی تھیں۔

اسٹیٹ بینک آف پاکستان — بقیہ صفحہ ۹

بقیہ صفحہ ۹

پاکستان کے دس گنے علاقے اور بہت بڑی صنعت و تجارت کے لئے کام کرتا ہے۔ پھر بھی اس کا سرمایہ صرف پانچ کروڑ ہے۔ اس کے علاوہ ہر شیڈولڈ بینک کا فرض ہوگا کہ وہ اپنی واجبات کی ہفتہ وار رپورٹ داخل کرے اور ان واجبات کا ایک تناسب قائم رکھے۔ اس سے یہ ہوگا کہ اسٹیٹ بینک ان بینکوں کی رفتار پر نظر رکھ سکے گا اور کوتاہی کرنے والے بینکوں کو سزا دے گا۔ اور اس طرح ملک کے لین دین کے نظام کی نگرانی کرے گا۔ غیر شیڈولڈ بینک اگر خواہش کریں گے تو اسٹیٹ بینک ان کو ہر قسم کا ٹیکنیکل مشورہ دے گا۔ اس کے علاوہ اسٹیٹ بینک نوٹ جاری کرنے والے شعبے کی املاک کا تیس فی صدی سونے کے سکوں، سونے چاندی کی سلاخوں اور اسٹرلنگ قرضوں کی شکل میں محفوظ رکھے گا تاکہ جو نوٹ جاری ہوں وہ محفوظ رہیں۔

اس طرح ہمارے اسٹیٹ بینک میں وہ تمام خصوصیات ہیں جو اس بات کی ضامن ہیں کہ یہ ایک شاندار مرکزی بینک کی حیثیت سے کام کرے گا۔ اور اس سے جو توقعات وابستہ ہیں وہ پوری ہوں گی۔ یہ صحیح ہے کہ اسٹیٹ بینک آف پاکستان کوئی جادو کی لکڑی نہیں کہ اس کے گھوماتے ہی ہر مسئلہ حل ہو جائے لیکن اس میں شک نہیں کہ اس کے قیام نے استوار اقتصادیات اور صحیح نظام زر کی بنیاد ضرور رکھ دی ہے۔

غلام عباس

ترکی ٹوپی

(ایک فرانسیسی افسانہ)

نسیم کو بس اتنا ہی یاد رہ گیا تھا کہ کبھی وہ ترک تھا اور جوانی میں سر پر ترکی ٹوپی پہنے، مٹھائی کا خوانچہ اٹھائے قہوہ خانوں کے چکر لگاتا اور برف کی سی سفید "راحت جان" اور بادامی کیک بیچا کرتا تھا۔

شباب کے وہ دن بھی کیسے دن تھے۔ دل میں ہزاروں اُمنگیں کمانے کا نیا نیا شوق۔ نہ بھوک کی فکر، نہ فاقے کا ڈر۔ کاندھے پر تیل کا چکیلا خوانچہ ہاتھ میں دمشق کی کھجور کی چھلنی، بس اسی قدر سامان کے ساتھ دو دن یہاں چار دن وہاں۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتا، نئی نئی صورتیں دیکھتا، مہ جبینوں کو اپنی "راحت جان" کی شیرینیوں میں بہلاتا پھسلاتا باتوں ہی باتوں میں اپنا جی خوش کرتا۔ ساری دنیا کا چکر کاٹ چکا تھا۔

اس کی آنکھوں میں کچھ ایسی کشش تھی کہ ہر شخص اس کی طرف خود بخود کھنچا آتا تھا۔ ہونٹوں پر ہر وقت مسکراہٹ رہتی۔ ہشاش بشاش نظر آتا۔ ہر ایک سے ہنس کر ملنے اور حلیمی سے بات کرنے کی اسے عادت ہو گئی تھی۔

اسے کچھ معلوم نہ تھا کہ میرے ماں باپ کون ہیں۔ بچہ ہی سا تھا کہ فکرِ معاش نے اُسے وطن سے دور لا پھینکا تھا۔ وہ زمانہ اچھا بُرا جیسا بھی کٹا۔ کٹ گیا۔ مگر اب اس کی حالت بہت کچھ سنور چکی تھی۔ ملک ملک میں ٹھوکریں کھانے سے اس کا دل اُچاٹ ہو گیا تھا اور اب اس نے ٹھان لی تھی کہ کہیں ایک جگہ جم کر بیٹھ جائے اور زندگی کے باقی دن چین سے گزار دے۔ اسی لئے پیرس کی فضا کو اپنے موافق پا کر وہ یہیں کا ہو رہا تھا۔

اس کے سر کے بال اور بڑی بڑی مونچھیں سفید ہونی شروع ہو گئی تھیں۔ وہ ایک انوکھی زبان بولا کرتا تھا۔ جس جس ملک میں پہنچا۔ وہاں وہاں کے الفاظ اور محاورے اس کی زبان پر چڑھتے گئے۔ ہوتے ہوتے اس کی بولی مل جل کر ایک ایسی معجون بن گئی کہ دنیا میں شاید ہی کوئی زبان ہو گی جس کا ایک آدھ لفظ یا محاورہ اس کی بولی میں ملا ہوا نہ ہو۔ پھر بھی خواہ اس کی بات کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے اس کی آواز میں ایسا ترنم تھا کہ جو کچھ کہتا ملنے والے کو گیت کی طرح لُبھا لیتا تھا۔

پیرس میں رہ کر اس نے اپنی وضع بدل ڈالی تھی۔ سر پر ترکی ٹوپی کی جگہ ایک لمبا سا ٹوپ پہنتا اور تن پر بھورے رنگ کا فراک، کوٹ اور ڈھیلے پائینچے کی پتلون۔ گلے میں بڑی سی سفید نکٹائی۔ پاؤں میں ولایتی بوٹ اور ہاتھ میں زیوروں سے بھرا ہوا ایک صندوقچہ لئے بڑی آن بان کے ساتھ پیرس کے قہوہ خانوں میں گھوما کرتا۔ اس کے صندوقچہ میں کئی قسم کے زیور تھے۔ انگوٹھیاں تھیں۔ جن پر پھول کی پنکھڑی کی وضع کے تین تین موتی جڑے ہوئے تھے اور موتیوں کے بیچ میں الماس کا ایک ایک نگینہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے گل سرِ برگ پر شبنم کی ایک بوند لرز رہی ہو۔ کانوں کے لئے نیلم کے آویزے تھے۔ سونے کے تاروں میں پروئے ہوئے پکھراجوں کا ہار۔ لاکٹ وغیرہ اس کے علاوہ اس کی ہر جیب میں دُہرے کیس والی ایک ایک گھڑی تھی۔ ان گھڑیوں کو نکال نکال کر گاہکوں کو دکھایا کرتا۔

"مونسی! سونا ہے سونا!"

جہاں "مونسی" ذرا سا بھی ذوق ظاہر کرتا۔ یہ بڑے تحمل کے ساتھ اس کے برابر والی کرسی پر جا بیٹھتا اور ایک لمبی "ہُوں" کے ساتھ اپنے صندوقچہ کی طرف ہاتھ بڑھاتا جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ وہ ایسے ایسے عجائبات اور نوادر دکھانے کو ہے جو نہ آنکھوں نے دیکھے، نہ کانوں نے سُنے۔ اب زیور دکھانے بیٹھتا تو اسی وقت بس کرتا۔ جب صندوقچہ میں گاہک کو دکھانے کے لئے کوئی چیز نہ رہ جاتی تو وہ نہایت خوبصورتی اور نزاکت کے ساتھ اپنے زیوروں کی نمائش کیا کرتا۔ جب کسی خاتون کے گلے میں موتیوں کا ہار یا انگلی میں انگوٹھی پہناتا تو اس کا ہاتھ کبوتر کے پَر کی طرح پھیل جاتا۔

اس خیال سے کہ یہ نہ سہی وہ سہی کچھ تو لے ہی لے گا۔ وہ گاہک کو جواہرات دکھاتے دکھاتے اپنی جیبوں سے گھڑیاں بھی نکال نکال کر دکھانے لگ جاتا۔ اگر گاہک کوئی معمولی سا شخص ہوتا تو اس کے مطابق اپنی جیب سے ایک سیدھی سادی کم قیمت والی گھڑی نکالتا۔ اور اگر گاہک کوئی بانکا چھبیلا عاشق مزاج ہوتا تو اس کے لئے وہ خوشنما۔ بڑھیا اور بیش قیمت

بتلانے والی گھڑی نکالتا جس کی پشت پر ایک مست شباب حسینہ کی رنگین تصویر نقش ہوتی جو شامپین کی بوتل منہ سے لگائے غٹا غٹ شراب چڑھا رہی ہو۔

"موسیٰ، بالکل نایاب چیز ہے۔"

آدھی رات کے قریب پھر پھرا کر وہ ہیلڈار کے محلے میں چھٹی منزل پر اپنے کمرے میں واپس آجاتا۔ آخر کار اس نے اپنے رہنے کے لئے ایک چھوٹا سا گھر ناہی لیا تھا۔ گرمی کے موسم میں جب تمام پیرس پر اُداسی سی چھا جاتی اور بازاروں میں آتے جاتے لوگ یوں دکھائی دیتے جیسے کسی جنازے کے ساتھ جا رہے ہوں وہ اپنے ہی گھر میں پڑا رہتا لیکن جب بیکار پڑے پڑے طبیعت گھبرا جاتی تو وہ یونہی دل بہلانے کے لئے چھکڑا کا ذکر نے والی گاڑی کے گاڑی بان چوک کے سپاہی اور پھول بیچنے والوں کو اپنی چیزیں دکھایا کرتا۔

وہ لبشوں قہوہ خانوں میں ناچنے گانے والی میڈموازیل لبشوں کے سوا اور کسی کو نہیں جانتا تھا۔ جو کبھی کبھی ایسے وقت اس سے ملنے آجاتی، جب اسے روپے کی ضرورت ہوتی۔ یہ لبشوں ایک خوفناک عورت تھی۔ چالیس کے لگ بھگ عمر گال نسیم کی "راحت جان" سے کہیں زیادہ رنگے ہوئے مگر جن میں اس سے کہیں کم مٹھاس تھی لیکن نسیم اسے دل و جان سے چاہتا تھا۔ جب وہ اس سے ملنے آتی تو وہ اس کی طرف خوف سے دیکھا کرتا کیونکہ وہ اس کے صندوقچہ کے جواہرات اڑا لینے میں ذرا تامل سے کام نہ لیتی، وہ صندوقچہ سے کبھی کوئی انگوٹھی، کبھی نکلس، کبھی طلائی زنجیر اسی طرح اٹھا لیتی جس طرح طشتری میں رکھے ہوئے انگور کے گچھے سے کوئی انگور کا دانہ توڑ لے؟ پچھلے اٹھارہ برس سے اس کی جھڑکیوں، ظلموں، بے رحمیوں، مکاریوں اور بے وفائیوں نے نسیم کو کچل رکھا تھا۔ اس پر بھی وہ اس کی محبت کا دم بھرے ہی جاتا تھا۔ اس نے اپنے کمرے کی ایک چابی اُسے دے رکھی تھی اسلئے جب اس کا جی چاہتا بے دھڑک چلی آتی۔

ایسے وقت دربان مذاق کے طور پر نسیم سے کہا کرتا "نسیم جی تیری ادھیڑنی کب سے تیری راہ تک رہی ہے"، یہ سن کر نسیم کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہتا۔ وہ حد درجہ کا ملنسار، منس مکھ اور خوشامدی بن جاتا۔ اس وقت اس کی یہی خواہش ہوتی کہ ہر شخص اس سے خوش ہو۔ جواب میں دربان سے کہتا۔ "کیوں جی دربان صاحب کیا میڈم میری دوشنی نے کچھ کہا تو نہیں تھا؟"

پھر وہ آہستہ سے دروازہ کھول دبے پاؤں اپنے کمرے میں داخل ہوتا اور لبشوں کے پاس پہنچ کر لمبا سانس لے کر کہتا:۔

"میری فاختہ! میں ہوں، فکر نہ کر۔"

کئی بار لبشوں نسیم کو الوداع کہہ ناٹک کمپنیوں کے ساتھ شہر بہ شہر گھومنے چل دی تھی جس سے اُسے دولت اور شہرت حاصل ہونے کی توقع ہوتی تھی مگر ہمیشہ بے عزت ہو کر اور اپنا سا منہ لے کر لوٹ آتی تھی۔ اُترا ہوا چہرہ۔ پہلے سے بھی دُبلی اور بد مزاج اور مزا یہ کہ اپنی ناکامی کا سارا غصہ نسیم پر نکالا کرتی۔ اس عورت کا غلام نسیم اسے دوبارہ دیکھتے ہی خوشی کے مارے پھولا نہ سماتا۔ اس بے درد عورت نے جس کے پاؤں وہ ادب اور احترام سے چوما کرتا تھا نسیم پر کچھ ایسا جادو کر دیا تھا کہ بلا سے وہ اس کے کتنے ہی جواہرات کیوں نہ چھین لے، اسے کتنی ہی اذیتیں کیوں نہ پہنچائے وہ اُف نہ کرتا تھا۔

ایک رات گھر لوٹا تو لبشوں کو اپنے بستر پر پایا۔ خوشی سے اس کا دل بلیوں اُچھلنے لگا۔ اپنی دانست میں وہ اسے کھو بیٹھا تھا۔ سمجھ چکا تھا کہ یورپ کے کسی دور دراز حصے میں روپوش ہو گئی ہے۔ مگر مین ہفتے ادھر اُدھر گھوم کر وہ آج پھر آدھمکی تھی۔

نسیم نے اس کی طرف پیار سے دیکھا ہی تھا کہ وہ بولی "کیوں بے تو یہاں بیٹھا کیا کر رہا ہے؟"

اس انوکھے سوال پر نسیم کچھ گھبرا سا گیا۔ وہ پھر بولی: "میں تجھ سے یہ پوچھتی ہوں کہ آخر تو یہاں کیا کر رہا ہے جبکہ تیرے سب بھائی مہد جنگ[1] کے میدان میں اپنی جانیں لڑا رہے ہیں؟"

اس نے اس سوال کو ہنسی ہنسی میں ٹالنا چاہا۔

"جنگ؟ میری فاختہ میں بوڑھا آدمی۔ مجھے ان لڑائی جھگڑوں کی باتوں سے کیا سروکار، میں تو جواہرات بیچتا ہوں۔ جواہرات۔ اور کسی بات کی طرف دھیان نہیں دیتا۔۔۔۔"

"کیا تو ترک ہے بتا ہے کہ نہیں؟"

"نہیں، نہیں میں تو جوہری ہوں۔"

"اخبار نہیں پڑھتا؟"

اس نے سر ہلا کر نفی میں جواب دیا، اخبار پر رام خرچ ہوتے تھے۔

---

[1]:۔ پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء۔۱۹۱۸ء

ماہِ نو۔ کراچی۔

اور پھر اسے پڑھنا بھی تو نہیں آتا تھا۔ غرض اس قسم کی باتیں نسیم کے لئے کچھ دلچسپی نہ رکھتی تھیں۔ اس کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ بشوں اس سے پیار محبت کی باتیں کرے جن کی ابتدا کبھی پروں والی ٹوپی کی فرمائش پر ہوا کرتی تو کبھی اونچی ایڑی کے شو پر۔ مگر نہ جانے بشوں آج کیوں اسی بات پر اڑی ہوئی تھی۔

"اچھا بتا تو آیا کہاں سے ہے؟"

اس نے خیال دوڑایا، وطن سے آئے ہوئے ایک زمانہ ہو چکا تھا۔ سوچ سوچ کر ایک بھلا سا نام لیا۔ اس سرزمین میں ویسی ہی دھوپ، ویسا ہی نیلگوں آسمان تو تھا مگر نہ تو وہاں پیرس جیسی دلکشیاں تھیں نہ آزادیاں، خیال نے نظروں کے آگے اس کے وطن کی تصویر کھینچ دی۔ بچپن کا زمانہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ موٹے کپڑے کا کرتہ پہنے کھلونوں کی جگہ کتیا کے پلّوں سے کھیل رہا ہے۔ یا اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ روٹی کے ایک ٹکڑے کے لئے بلبلا رہا ہے۔

اس نے اپنے شانوں کو جھٹک دیا۔ بھلا یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ اس فاقوں مارے، گندے غلیظ بچے اور اس معزز جوہری میں کسی قسم کا کچھ تعلق ہو جس کے پاس جواہرات کا بھرا ہوا صندوقچہ ہو۔ اچھے سے اچھا لباس زیب تن کرتا ہو۔ پھلا پھولا سوداگر بن گیا ہو، پیرس ایسے شہر میں رہتا ہو۔ گھر کا سب ساز و سامان بھی اسی کی ملکیت ہو۔ پھر ان سب پر طرفہ یہ کہ بشوں جیسی سنہری بالوں والی نازک اندام محبوبہ پہلو میں ہو؟

منت بھری آواز میں کہنے لگا:۔

"جانِ من اپنے نسیم کو چوم لے، اور ان خون خرابے کی باتوں پر خاک ڈال۔ جانے دے ان غریب فقیروں کا کیا ذکر کرتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔؟

"اگر وہ تجھے زبردستی جنگ پر بھیج دیں تو ڈر کے مارے تیری روح ہی فنا ہو جائے۔ اچھا بتا تیری کتنی عمر ہے؟"

اس نے ہاتھ سے کچھ اشارہ کیا۔ وہ نہیں جانتا تھا۔ اپنے متعلق کچھ علم نہ رکھتا تھا۔ وہ نسیم تھا اور بس کبھی وسیع دنیا میں سٹھائیاں بیچتا پھرا کرتا تھا۔ مگر اب پھر پھر کر تھک گیا تھا۔ اب تو اس کی یہی تمنا تھی کہ ایک چھوٹا سا گھر بنا لے اور آرام سے اپنی زندگی گذار دے۔ اپنے بیوپار اور بشوں کے سوا اور کسی چیز کا خیال تک دل میں نہ لاتا تھا۔ پھر بھلا ان گندی گندی باتوں کے پوچھنے سے فائدہ؟

مٹھی سے اپنے ماتھے کو ٹھونکا اور کہا "میری نا خستہ بلبس یہ سمجھ لے۔ ایک بوڑھا بہت بڑا حیوان ہے جو تجھے پیار کرتا ہے۔۔۔۔۔۔!"

ماہِ نو، کراچی۔

لیکن آج اس کی سب بہلا پھسلا دینے والی میٹھی میٹھی باتیں بے اثر ثابت ہو رہی تھیں۔ مسکراہٹ میں وہ پہلی سی شگفتگی نہ رہی تھی۔ آنکھیں جو قہوہ خانوں کے ہنڈوں کی تیز روشنی سے چندھیائی چندھیائی رہتی تھیں۔ آج اپنی طرف کھینچنے کے بجائے التجاؤں کے ساتھ ڈبڈبا رہی تھیں۔

"تو تو اتنا بھی نہیں جانتا کہ تیرا ملک لڑ رہا ہے۔ اچھا ٹھہر" یہ کہہ کر وہ اٹھی۔ اس کے چہرے سے ترش روئی کے وہ آثار ظاہر ہو رہے تھے جو کبھی تنگی کے دنوں میں پائے جاتے تھے۔ اور حرکات میں وہ پھرتی جوان عورتوں پر آپ ہی آپ پیدا ہو جاتی تھی۔ جب وہ کوئی نیا فتنہ بپا کرنے والی ہو۔

"لے میں تیرے لئے اخبار خرید لائی ہوں۔ سن تجھے پڑھ کر سناتی ہوں۔"

نسیم نہیں چاہتا تھا کہ ان فضول باتوں میں اپنا وقت گنوائے لیکن مجبور ہو کر بیٹھ گیا۔ سر سے ابھی ٹوپ بھی نہیں اتارا تھا۔ صندوقچہ گھٹنوں ہی پر دھرا تھا کہنیوں سے اپنے پہلوؤں کو بھینچ کر رکھا تھا کہ اگر بشوں دوسرے دھکا دے تو گھڑیوں کو ٹھوکر نہ لگنے پائے اور وہ ٹوٹ نہ جائیں۔

بشوں نے اخبار نکال کر میز پر پھیلا دیا۔ "دیکھ تیرے ترکوں کی کیسی گت بن رہی ہے۔ تجھے ابھی سب معلوم ہو جائے گا۔"

نسیم نے اس کی طرف بے چینی سے دیکھا۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر بستر پر لیٹ کر صرف ایک دوسرے ہی کے خیال سے اونگھتے میٹھی نیند سو رہتے۔ لیکن نہ جانے آج بشوں کو کیا ہو گیا تھا کہ وہ ایک ہی خیال پر تلی ہوئی تھی۔ اس نے پڑھنا شروع کر دیا۔ نسیم جوں جوں سنتا رہا اس کے دل میں بشوں کی عزت پیدا ہوتی گئی۔ وہ عزت جو ان پڑھ کے دل میں پڑھے لکھے کے لئے پیدا ہو جاتی ہے۔ کیسی ہوشیار ہے یہ بشوں! کیسی رسیلی، کیسی پیاری آواز پائی ہے۔۔۔۔۔۔ پھر یک لخت وہ سب کچھ بھول گیا۔ یہ ایک وحشتناک شکست کی خبر تھی۔ بندوقوں کے انبار کے انبار۔۔۔۔۔۔ موت۔۔۔۔۔۔ دہشت۔۔۔۔۔۔ ہیضہ۔۔۔۔۔۔ بھوک۔۔۔۔۔۔ پھر وہی ترکوں کی بھوک جس سے نسیم اچھی طرح واقف تھا۔ اس خیال کے آتے ہی وہ کانپ اٹھا۔

"دیکھا کیسی گت بنی۔ دیکھا کیسی گت بنی۔" بشوں نے دیوانہ وار مسرت سے چلّا کر کہا۔

بے گور و کفن لاشیں۔۔۔۔۔۔ قیدی۔۔۔۔۔۔ دم توڑنے والے زخمیوں کا کوئی پوچھنے والا نہیں۔۔۔۔۔۔ ناگہانی موت۔۔۔۔۔۔ سخت عذاب کی موت۔۔۔۔۔۔ گاؤں کے نام جو ایک ایک کر کے چھین لئے گئے تھے نسیم کے دماغ میں

بھولے ہوئے خواب کی طرح یاد آنے لگے۔ مت ہوئی وہ ان ناموں کو سن چکا تھا۔ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں دہرانے لگا۔ "بونا رحصار... قمر خان...... فذنا......"

جب بشوں پڑھ چکی تو اس نے نظر اٹھا کر دیکھا نسیم ابھی تک جوں کا توں بیٹھا تھا۔ صندوقچہ بدستور گھٹنوں ہی پر تھا مگر وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ بشوں نے اپنی عمر میں کبھی کسی کو اس طرح کانپتے نہ دیکھا تھا۔ وہ کچھ گھبرا سی گئی۔

"بیمار تو نہیں ہو؟"

وہ اور بھی تھرانے لگا۔ بشوں نے حقارت سے قہقہہ لگایا۔

"ابے جا، گدھا، مکار، فریبی کہیں کا!"

مگر نسیم اٹھا اور تن کر بشوں کے سامنے کھڑا ہو گیا یکایک بشوں پر دہشت چھا گئی۔ نسیم کی حالت ناگفتہ بہ ہو رہی تھی۔ ان چند لمحوں میں اس نے ایسی سخت اور ناقابلِ برداشت تکلیف اٹھائی۔ جیسے ہزاروں نشتر اس کے بدن میں چبھوئے جا رہے ہوں۔ پھر اچانک اس کی ساری تکلیف، قہر اور غصے میں مل گئی۔ آنکھوں سے خون برسنے لگا۔ چاہتا تھا کہ اس ناپاک عورت کی گردن مروڑ کر رکھ دے۔

بشوں دل ہی دل میں اپنی حرکت پر پچھتا رہی تھی اسے کیا خبر تھی کہ نسیم کے دل میں اس کی شرارت سے اس قدر ٹھیس لگے گی۔ جسے بظاہر اپنے ملک اور ہم وطنوں سے ذرا بھی ہمدردی نہ رہی تھی۔ بشوں سے کیسی سخت غلطی ہوئی اسے یہ باتیں نسیم سے نہ کہنی چاہیئے تھیں۔ اس تکلیف دہ ذکر چھیڑنے سے تو اچھا تھا کہ اسی وقت پر لڑکر سو رہتے۔ وہ نسیم سے معافی مانگنے لگی۔ لیکن نسیم نے اسکی ٹوپی اور لباس اس کی طرف پھینک دیا اور ڈپٹ کر کہا:-

"بس ہٹ جا، عقل مند ہو، ابھی دور ہو جا!"

خوفزدہ ہو کر بشوں نے جلد جلد لباس پہنا۔ اب کیا تھا۔ آن کی آن میں وہی بے وقوف بڈھا ایک پرجوش ترک بن گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر بشوں جلد ہی آنکھوں کے آگے سے دور نہ ہوئی تو اٹھا کر کھڑکی سے نیچے پھینک دیگا۔

بشوں کو اٹھ کر زور سے دھکا دے۔ ہانپتی کانپتی باہر نکل بھاگی۔

نسیم اکیلا رہ گیا اس نے ایک صندوق کھولا۔ اور کپڑوں کو الٹ پلٹ نیچے سے اپنی پرانی ٹوپی نکال لی۔ یہ وہی ترکی ٹوپی تھی جسے وہ اس زمانہ میں پہنا کرتا تھا۔ جب وہ "راحت جان" اور بادامی کیک بیچا کرتا تھا۔ یہ ٹوپی اگرچہ کرم خوردہ تھی اور پہننے کے قابل نہ رہی تھی مگر اس نے ہیٹ ٹوپ سر سے اتار حقارت سے دور پھینک دیا اور یہی ترکی ٹوپی پہن لی پھر کسی (باقی صفحہ ۲۸ پر)

مردِ قلندر

یکساں ہے مرا دل حرم و دیر میں خورسند
میں شکل میں بندے کی ہوں اسرارِ خداوند

ہاں چھیڑ دے مطرب مری ہستی کا ترانہ
میں حسن کا مرکز ہوں دلِ عشق کی سوگند

وہ عشق نہیں ہوں کہ ہو آہوں میں مقید
وہ حسن نہیں کہ ہو جلووں میں نظر بند

ہوں لالۂ صحرا کی طرح خانماں بر دوش
وہ سرو نہیں جو کسی گلشن کا ہو پابند

مستی مری محتاجِ مئے و جام نہیں ہے
بے ہجر کے غمگین ہوں بے وصل کے خورسند

جس منزلِ عالی میں پر افشاں ہوں میں اُس جا
دُنیا ہے نہ عقبیٰ ہے نہ بندہ نہ خداوند

کیا دخل ہے زاہد کا مرے دل کے حرم میں
یہ قصر نہیں جنتِ فردوس کے مانند

آزاد ہے کونین سے وہ مردِ قلندر
میکش کو نہ دو تاجِ بخارا و سمرقند

میکش اکبرآبادی
جولائی سنہ ۱۹۴۹ء

حسن الاعظمی

مصر میں اردو

ہر دور میں ایک قوم نے دوسری قوم کو اور ایک ملک نے دوسرے ملک کو سمجھنے کی کوشش کی ہے نہ صرف یہی بلکہ باہمی تعلقات و روابط بھی قائم رکھے ہیں۔ ان تمام مقاصد کے لئے انھوں نے زبان ہی کو اپنا سفیر اور وسیلۂ کار قرار دیا۔ چنانچہ ہر قوم کی زبان اس کی تہذیب و تمدن کی آئینہ دار ہوتی ہے جس میں اس کی ادبی و ملی روایات اسکے جذبات و احساسات اور اس کے سیاسی، اجتماعی اور ذہنی و فکری آثار کی تصویر کا رنگ جھلکتا ہے۔ جب کوئی قوم دوسری ہمسایہ یا اجنبی قوموں کی زبان حاصل کرتی ہے تو در حقیقت وہ ان کے علوم و فنون کے بیش بہا سرمایہ سے اپنے ذہنی و فکری ارتقا کا سامان فراہم کرتی ہے۔ دنیا کی علمی و ادبی تاریخ اس ناقابلِ انکار حقیقت پر گواہ ہے۔ کہ سب سے پہلے مسلمان مفکرین نے مختلف ادوارِ حیات میں یونانی علم و حکمت کے خزانوں کا سراغ لگایا۔ اجنبی زبانیں سیکھیں اور ان کے معلومات کو اپنی زبان میں منتقل کیا۔ یورپ کی عقلی ترقی کا راز بھی اسی میں مضمر تھا کہ قرونِ وسطیٰ میں اس نے غیر زبانوں کے سرمایہ کو اپنے اندر جذب کیا جس کا نتیجہ نشاۃ ثانیہ جیسے شاندار دور کی ارتقائی تعمیر کی شکل میں ظاہر ہوا۔ جس میں یونانی، عبرانی، سریانی اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے عناصر کارفرما تھے۔

ادھر ایک عرصہ تک ہندوستان میں اردو زبان کو کل ہند زبان بنانے کا مسئلہ درپیش رہا۔ ابھی یہ مسئلہ پوری طرح طے نہیں ہو سکا تھا کہ ملک کی تقسیم ہو گئی۔ اور اب اردو کو پاکستان کی سرکاری زبان بنانے کی جدوجہد کی جا رہی ہے۔ اس کو تمام مملکت پاکستان کی قومی و ملکی زبان قرار دینے کے لئے کبھی تو اس کی ساخت، اس کی ہیئت ترکیبی اور اس کی لچک سے بحث کی جاتی ہے اور کبھی اسکے عالمگیر زبان ہونے کا دعوےٰ کیا جاتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ یہ زبان دنیا کے ہر گوشے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ لیکن محقق کی نظر جانتی ہے کہ بیرونِ پاکستان اس زبان کی ترویج و اشاعت اور اس کے ذریعہ ہندی و پاکستانی مسلمانوں کے افکار و خیالات اور ان کے طرزِ تمدن کو واضح کرنے کی طرف کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ یہاں تک کہ سرزمین مصر میں جو اس وقت عالمِ اسلامی کی تہذیب و ثقافت کا مرکز اور اسلامی علوم و فنون کا سرچشمہ ہے۔ اردو زبان کی نشر و اشاعت کی کوئی کوشش نہیں کی گئی کہ اس طرح اسلامی دنیا اس کے ادبیات و معارف، اس کے علمی جواہر ریزوں اور یہاں کے بہترین دماغی شاہکاروں سے روشناس ہو سکے یہاں تک کہ علامہ اقبالؒ نے اپنے اسلامی افکار و تعلیمات، اسلامی حقائق بلکہ انسانیت کے بلند ترین مقام کا جو تشکیلی خاکہ پیش کیا ہے اسے ممالک اسلامیہ میں پھیلانے اور اس کے فلسفہ کا حقیقی تعارف کرانے کے لئے اب تک بالکل کوشش نہیں کی گئی ؛

مصر میں اشاعت اردو کی اولین کوشش

علامہ اقبال نے ممالک اسلامیہ کی سیر و سیاحت کے سلسلہ میں مصر کا بھی دورہ کیا تھا۔ آپ نے مصریوں کے دلوں پر گہرے نقوش ثبت کئے تھے۔ مگر حقیقی معنے میں کسی نے فلسفۂ اقبال کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے ۱۹۳۶ء میں سب سے پہلی مرتبہ علامہ اقبالؒ کی شاعری سے دنیائے عرب کو روشناس کرنے کی کوشش کی۔ ان کے اسلامی افکار اور ان کے اتحادِ عالم اسلامی کے بلند آہنگ تخیلات کو مصریوں کے روبرو پیش کیا۔ پھر ۱۹۳۶ء میں ممالک اسلامیہ سے ربط و ضبط اور اتحاد قائم کرنے کے لئے اخوتِ اسلامیہ کے نام سے ایک جماعت کا تشکیلی خاکہ پیش کیا۔ ڈاکٹر عبدالوہاب عزام بک (موجودہ سفیر مصر متعینہ حجاز) اور علامہ طنطاوی جوہری مشہور مفسرِ قرآن کی صدارت و قیادت میں جماعت کی تاسیس عمل میں آئی۔ اس جماعت میں مختلف جہاتِ عالم کے ۴۲ مسلمان نمائندے شامل ہیں۔ میں نے جماعت الاخوۃ الاسلامیہ کا افتتاح

اقبال کے شہرۂ آفاق نظم طلوعِ اسلام کا ترانۂ ملی کے عربی ترجمے کیا تھا جس کو بعد میں مختلف جرائد و رسائل میں شائع کیا گیا۔ چنانچہ جماعت کے ہر جلسہ میں ترانۂ ملی پڑھا جاتا تھا۔

اس کے کچھ عرصہ بعد میں نے ڈاکٹر طٰہٰ حسین وائس چانسلر سے درخواست کی اردو زبان کی تعلیم کا انتظام کلیۃ الآداب میں کیا جائے۔ اس درخواست کو منظور کر لیا گیا اور ڈاکٹر صاحب نے عارضی طور پر ایک سال کے لئے اردو ادب زبان اور شاعری پر لکچر دینے کی خدمت میرے سپرد کی۔ اس شعبہ میں ایم اے کے تقریباً ۲۰ طلبہ نے شرکت کی۔ ان دروس میں زیادہ تر علامہ اقبال کے فلسفہ کی تشریح اور اردو زبان کے دیگر شعراء مثلاً غالب، انیس، حالی اور اکبر وغیرہ سے تعارف کرایا گیا۔ اوائل ۱۹۳۹ء میں مذکورہ طلباء نے حکومت مصریہ میں ایک عریضہ پیش کیا کہ اردو کو بطور ایک علمی زبان کے فارسی و ترکی زبان کے ساتھ ساتھ کلیۃ الآداب میں داخل کیا جائے۔

اسی اثناء میں ڈاکٹر عبدالوہاب عزام بک نے جو اس وقت کلیۃ الآداب میں شعبۂ السنۂ مشرقیہ کے صدر تھے اور علامہ اقبال سے ان کا تعارف لندن میں ہو چکا تھا۔ اقبالیات کو سمجھنے کے لئے اردو زبان سیکھی اور اقبالیات کا ترجمہ عربی میں کیا اور اردو کو نصاب میں شریک کرنے میں بڑی مدد کی۔

اردو سے مصریوں کا شغف

دارالخلافت قاہرہ میں اردو کی ہر دلعزیزی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اخوت کے مرکزی دفتر حدیقۃ النوری میں ۱۹۴۰ء تک ہر پنجشنبہ کو اقبالیات پر تقریریں کی جاتی تھیں اور وہاں کے ممتاز ادبی مجلات میں اس کے تراجم برابر شائع ہوتے تھے جن کی پہلی کڑی کتابی شکل میں "الحیاۃ والموت فی فلسفۃ اقبال" کے نام سے بزم اقبال حیدرآباد دکن نے شائع کی ہے۔

جامعہ مصریہ کے علاوہ جماعت اخوت اسلامیہ اور دیگر علمی انجمنوں میں خانگی طور سے اردو جماعتیں شروع کی گئیں اور رسائل و دیگر ممکن وسائل و ذرائع سے اردو کا کافی پروپگنڈا کیا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شاہ فاروق نے مصری پارلیمنٹ، یونیورسٹی بورڈ اور مجلس اعیان کے اتفاق کے بعد مارچ ۱۹۳۹ء کو شاہی فرمان صادر کیا جس میں یہ تجویز تھی کہ کلیۃ الادب (ART COLLEGE) میں ایک معہد (TRAINING COLLEGE) کا افتتاح کیا جائے۔ چنانچہ اس تجویز پر عملدرآمد شروع ہوگیا اور اردو کی تدریس کے لئے ہندوستان سے کسی موزوں شخص کے تقرر کے لئے خطوط لکھے گئے۔ چونکہ ذریعۂ تعلیم عربی تھی اور طلباء کے لئے اردودانی کا ذوق عربی تفہیم و تدریس کے بغیر دشوار تھا اور میں ایک عرصہ سے اردو کی خدمات دے رہا تھا۔ اسلئے بالآخر مجھے ہی شعبۂ اردو کا پروفیسر منتخب کیا گیا۔

معہد اللغات الشرقیہ کے نام سے جماعت کھولی گئی اور اردو، فارسی اور ترکی کے لئے تین تین سال کا نصاب مقرر کیا گیا۔ اس جماعت میں صرف وہ طلبا شریک ہو سکتے ہیں جو بی۔ اے کی ڈگری لے چکے ہوں۔ نصاب کے خاتمہ پر امتحان ہوتا ہے اور کامیاب طلبا کو ڈپلوما دیا جاتا ہے۔

مارچ ۱۹۳۹ء میں جامعہ مصریہ میں باقاعدہ اردو کی تعلیم شروع ہو جانیکے بعد میں نے جامعہ ازہر کے وائس چانسلر علامہ شیخ مصطفےٰ مراغی مرحوم کی خدمت میں ایک محضر روانہ کیا جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ جامعہ ازہر میں اردو کی تعلیم کو باقاعدہ شریک نصاب کیا جائے۔ شیخ مراغی مرحوم نے وعدہ فرمایا کہ اگر کوئی قابل اور موزوں شخص ماہرِ عربی تعلیم دینے کے لئے دستیاب ہو جائے تو کل ہی سے اسکا انتظام ہو جائے۔

اردو ادب اور زبان سے خصوصی دلچسپی لینے والوں میں سے مصری ادیب محمد حسن زیات سکریٹری طٰہٰ حسین بے ہیں جو معہد اللغات الشرقیہ کے شعبۂ اردو میں ۱۹۴۰ء کے امتحان میں درجہ اول کامیاب ہوئے اور اردو کا ڈپلوما حاصل کیا۔ آجکل انکو جامعہ فاروق الاول اسکندریہ میں شعبۂ اردو کا لکچرار بنا دیا گیا ہے۔ اسی سلسلہ میں شیخ صاوی شعلان فارغ التحصیل جامعہ ازہر بھی قابل ذکر ہیں جو آجکل شعبۂ اردو میں تعلیم پا رہے ہیں اور اقبالیات کا ترجمہ اخبارات اور رسائل میں عربی میں شائع کر رہے ہیں۔

قاہرہ میں جو اسلامی تہذیب کا مرکز و قلب ہے اردو خدمات اور اس کی سرگرمیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ بغداد میں اردو تعلیم کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ اس طرح ترکی میں بھی آسانی سے اردو زبان کے چرچے ہونے لگے۔

قاہرہ میں اردو کی نشر و اشاعت اور اسکی تعلیم و تفہیم کے لئے آسان کتابوں کی ضرورت محسوس کی گئی تاکہ عربی داں لوگ اردو سیکھنے

باقی صفحہ ۳۴ پر

شان الحق حقی

انطنی وقلوبطرہ

منظوم ترجمہ انطنی وقلوبطرہ کے کچھ حصے اب سے پہلے بعض رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ذیل میں اس کے دوسرے ایکٹ کے پہلے دو سین پیش کئے جاتے ہیں۔ پہلے منظر میں پومپے اور اس کے رفیق نظر آتے ہیں جو سلطنت روما کے تین مشترک حاکموں IRIUMRIS یعنی قیصر انطنی اور لے پدس کے خلاف برسر بغاوت ہیں۔ دوسرے منظر میں قیصر اور انطنی کی اہم ملاقات واقع ہوتی ہے۔ انطنی بہت لیت ولعل کے بعد مصر سے "انس مرد مار ملکہ کی آمیزش چھوڑ کر" روم پہنچا ہے۔ قیصر اس سے بہت برہم ہے۔ مگر لے پدس کی مصالحانہ کوشش اور خود انطنی کی صلح پسندی صاف دلی وصاف گوئی کی بدولت ایک بار پھر سمجھوتہ ہو جاتا ہے۔ مگر یہ صلح عارضی ثابت ہوئی۔ پومپے کی بغاوت بے شک فرو کر دی گئی مگر انطنی کو قلوبطرہ نے پھر مصر کھینچ بلایا۔ قیصر نے مصر پر چڑھائی کی اور اس افسانے کا انجام انطنی وقلوبطرہ کی موت پر ہوا۔

دوسرے منظر کے آخر میں انوبار بس قلوبطرہ کے جلوس کا مرقع بھی کھینچتا ہے جو شیکسپیر کی نہایت مشہور اور دلآویز نگارش میں سے ہے۔

اصل ڈرامہ نظم معرّیٰ میں ہے۔ لیکن اسے مثنوی کی شکل میں ترجمہ کرنا اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ انگریزی بلینک ورس اپنی روایت اور مقبولیت کے لحاظ سے وہی حیثیت رکھتی ہے جو ہمارے ہاں مثنوی۔ اردو میں بلینک ورس نو وارد اور ابھی تجربات کے دور میں ہے۔ اس ڈرامے کو بلینک ورس میں ترجمہ کیا جاتا تو اصل آب وتاب اور حلیہ کلاسکی خصوصیات پیدا نہ ہونے پاتیں۔

ایکٹ ۲ — منظر ۱

مسینا میں پومپے کا کیمپ۔ پومپے، میناس اور منقراط فوجی لباس میں نظر آتے ہیں۔

پومپے: منصف ہیں گر ہمارے قوی دست دیوتا
دیں گے انھیں کا ساتھ کہ ہے جن کا حق سوا

منقراط: ہاں اے لئیق پومپے تم نے سنا نہیں
دستور واں ہے دیر کا، اندھیر کا نہیں

پومپے: بے شک ہم ان کے در ہی سے رکھتے ہیں آسرا
پر مدعا بہ دیر ملا بھی تو کیا ملا

منقراط: ہم بے شعور بندے جہالت میں بے سبب
کرتے ہیں اکثر اپنی ہی آفات کی طلب
لیکن ہے پیچ کہ عالم دبینا وہ کارساز
ہے جانتے ہیں ہماری دعاؤں سے بے نیاز
ہو رد کوئی دعا تو خسارہ نہ جانئے
ہوتا ہے سب ہمارے بھلے ہی کے واسطے
پہلو ہے اک قبول کا ردِّ دعا میں بھی
کچھ مصلحت ضرور ہے اس التوا میں بھی

پومپے: اتنا تو ہے یقیں کہ رہوں گا میں فتح مند

تم دیکھنا رہے گا ستارہ مرا بلند
ہیں اہل ملک میری حمایت میں یک زباں
اور ہے حدود بحر پہ قائم مرا نشاں
قوت مری فروغ پہ ہے، صورت ہلال
امید کہہ رہی ہے کہ پہنچی سر کمال
واں انطنی ہے مصر کے خاصے اڑا رہا
لگتا نہیں کہ کھائے گا میدان کی ہوا
قیصر کا اقتدار سہی، قدر جا چکی
دل ہاتھ سے نکل گئے، گو دولت آ گئی
اور لے پدس۔ وہ دونوں سے یکساں نبھاتے ہیں
یہ ان کو کھینچتے ہیں وہ ان کو چڑھاتے ہیں
لیکن یہ ان کے یار نہ وہ ان کے دوستدار
خاطر پہ یاں ہے میل تو دل میں وہاں غبار

میناس قیصر و لے پدس سر میداں پہنچ چکے
اک لشکر عظیم کماں میں لئے ہوئے

پومپے کس سے سنا یہ؟ یہ کس نے کہا! سر بسر غلط!

میناس جی سلویس سے۔

پومپے خواب ہے ہزیان ہے فقط
میں جانتا ہوں۔ دونوں ہیں روما ہی میں ابھی
ہیں منتظر کہ مصر سے آ جائے انطنی
ہاں جان مصر، دام ہوس اور پختہ تر
افسردہ لب کو اور کچھ اپنے شگفتہ کر!
ہاں ساتھ زور حسن کے جادوگری بھی ہو
اور مستی و ہوس کا فسون قوی بھی ہو
بدمست کو لگا دے شراب و ایاغ سے
سرشار رکھ خمار نہ اترے دماغ سے
باورچیو! ہو کھانے میں اس کے وہ چاشنی
چٹخارہ جس کا محو زباں سے نہ ہو کبھی
غیرت کو گم رکھے یہ خور و خواب اور ابھی
غفلت میں اس کو ہولے دو غرقاب اور ابھی!

(واریوس داخل ہوتا ہے)

کیوں واریوس؟

واریوس پرچہ یہ لایا ہے خاکسار
روما میں انطنی کا ہے ہر آن انتظار
آئی تھی کوچ مصر سے کرنے کی جب خبر
طے جب سے اب تک اور بھی ہوتا بڑا سفر

پومپے کچھ اور بات ہوتی تو کرتا نہ میں خیال
میناس جانتا ہوں میں اس سرپھرے کا حال
لگتا نہیں مجھے کہ وہ متوالا انطنی
اتنے سے معرکے کے لئے لیس ہو کبھی
مانا کہ کار جنگ میں وہ عافیت پسند
بے شک و شبہ دونوں حریفوں سے ہے دو چند
تاہم ہے جائے فخر کہ خود اب تو انطنی
بھرتا تھا جس کا لہو لعب سے نہ جی کبھی
کھنچ آئے یوں ہماری صلائے نبرد پہ
اس مرد مار ملکہ کی آغوش چھوڑ کر

میناس لیکن مجھے تو شک ہے کہ قیصر اور انطنی
اک دوسرے کے ساتھ کھلے دل سے ہوں کبھی
بیوی نے اس کی اپنے زمان حیات میں
قیصر سے بے شمار بڑھائی تھیں رنجشیں
پھر انطنی کے بھائی نے بھی اس سے جنگ کی
گو شاید انطنی کی کوئی اس میں شہ نہ تھی

پومپے میناس کیا خبر ہے یہ آپس کے وسوسے
ہو جائیں محو اس بڑی شورش کے سامنے
ہوتے نہ اس گھڑی اگر ان کے حریف ہم
سامان ہو چکا تھا کہ سر پھوڑتے بہم
دل میں ادھر ادھر تھے بہت دن سے بل پڑے
اب آ گیا تھا وقت کہ تلوار چل پڑے
شاید ہمارے ڈر سے یہ آپس کی دشمنی

مٹ جائے دل سے۔ خیر جو معبود کی خوشی
اب وقت ہے کہ زور شجاعت دکھائیے
چاہیں جو خیر جان تو جا نیں لڑائیے!

ایکٹ ۲ ـــــــــــ منظر ۲

روما ۔ لے بدس کا مکان۔ انوبارلبس (انطنی کا رفیق) اور لے بدس نظر آتے ہیں۔

لے بدس — شاباش! انو! تم آج گر اپنے امیر کو
مائل مصالحت ہی پہ رکھو تو خوب ہو

انوبارلبس[1] — میری تو ان سے عرض یہ ہے۔ کوئی کچھ کہے
باتیں وہی کریں کہ جو شایاں ہوں شان کو
قیصر گر ایسی ویسی نکالیں زبان سے
لازم ہے وہ بھی بات کریں آسمان سے
ہوتا اگر ان کے رتبے پہ جرأت معاف ہیں
کرتا قسم ہے، آج نہ ڈاڑھی بھی صاف ہیں[2]

لے بدس — لیکن نہیں یہ وقت کہ آپس میں سر اٹھے

انوبارلبس — جی بات کا تو وقت وہی ہے جب آپڑے

لے بدس — لیکن گراں معاملہ فائق ہے خورد پر

انوبارلبس — جی اس سے کچھ غرض نہیں۔ جو اٹھے بیشتر

لے بدس — جوشیلا پن ہے محض تمہارا یہ کچھ نہیں
اکسا نہ دینا اور دبی آگ کو کہیں
وہ آرہے ہیں سامنے ذلیق رر انطنی

انوبارلبس — اور لیجیے وہ پہنچ گئے قیصر بھی ساتھ ہی

(انطنی اور قیصر مع چند ساتھیوں کے داخل ہوتے ہیں)

لے بدس — میرے رفیقو! جمع کیا ہم کو اس جگہ
جس چیز نے، وہ ہے اک اہم تر معاملہ
پس احتیاطاً اس امر کی لازم ہے آپ کو
ناگاہ ہیچ بات پہ رنجش بہم نہ ہو
شکوے ہوں کچھ اگر تو سنیں گوش لطف سے
مقصد ہے صلح وخیر تو پھر بات کیوں بڑھے؟
نازک ہے دل کا کار جراحت خبر رہے
مرہم سے کام لیجے نہ نشتر سے چھیڑیے
یہ التجا ہے میری رفیقان محترم!
صلح وصلاحیت سے کریں گفتگو بہم
دکھتی جگہ کو چھیڑیں تو نرمی سے چھیڑیے
ایسا نہ ہو کہ تیز ہو گفتار شر بڑھے
اس کا بھی پاس ہو کہ یہ ہے میری التجا

انطنی — ہاں آپ نے یہ خوب کہا اور بجا کہا!
ہوتے حریف ہم سر میداں اگر کبھی
میں اس گھڑی بھی بڑھ کے جو کرتا تو بس یہی
(قیصر سے مصافحہ کرتا ہے)

قیصر — خوش آمدید

انطنی — شکریہ

قیصر — آرام کیجئے

انطنی — جی آپ بھی تو بیٹھیے

قیصر — بہتر ہے لیجئے۔

انطنی — سنتا ہوں آپ مجھ سے ہیں کچھ بے سبب خفا؟
یا ان پہ جن امور سے کچھ واسطہ نہ تھا؟

قیصر — حیرت ہے مجھ پہ مفت کا ہو گر گلا مجھے
پھر اور بھی کسی سے نہیں۔ وہ بھی آپ سے!
اور حیف ہے زباں سے کہوں گر کچھ آپ کو
اس بات پر کہ جس سے مجھے واسطہ نہ ہو!

انطنی — پھر میں جناب مصر میں جا کے اگر رہا
فرمائیے کہ آپ کو کیا اس سے کام تھا؟

قیصر — اتنا ہی جتنا روم میں میرے قیام سے

---

[1] انوبارلبس ایک آزاد و بیباک مگر خلوص مند اور سمجھدار کیرکٹر ہے [2] قیصر کی توہین کرنے کے لئے بغیر خط بنوائے سامنے آتا، غالباً اشارہ یہ بھی ہو کہ قیصر کی ڈاڑھی بہت خفیف تھی

وہاں مصر میں جناب کو بالفرض کچھ رہے
لیکن گر آپ مصر میں رہ کر خط معاف
کچھ سازشیں بھی کرتے رہیں میرے برخلاف
تو پھر بتائیے مجھے کیونکر گلا نہ ہو؟
اور آپ کے قیام سے کیوں واسطہ نہ ہو؟

انطنی: سازش سے کیا مراد؟

قیصر: سمجھ ہی نہ لیجئے
واقف ہیں آپ پیش جو آیا یہاں مجھے
بیگم نے اور بھائی نے کی جنگ آپ کے
یہ آپ ہی کے بل پہ ہوئے ان کو حوصلے
عنوان جنگ خیر سے تھا آپ ہی کا نام
اور نعرۂ نبرد رہا آپ ہی کا نام!

انطنی: ہے مہرباں یہ محض غلط فہمی آپ کی
یہ جنگ میرے نام پہ ہرگز نہیں ہوئی
بالکل غلط ہے خوب میں تحقیق کر چکا
خود ساتھیوں نے آپ کے تصدیق کر دیا
اور لوسیس[1] نے آپ سے گر کی تھی سرکشی
تو کیا رفیق من یہ مجھی سے دغا نہ تھی؟
جب مشترک ہے منصب و میل و معاملہ
تھا آپ سے تو گویا مجھی سے تھا معرکہ
میں کر چکا ہوں صاف یہ اپنے خطوں میں بھی
لڑنا ہی ہے تو اور کسی بات پر سہی!

قیصر: کہہ کر غلط ئے فہم بری ہو گئے جناب
تاویل محض ہی تو تھا وہ آپ کا جواب

انطنی: بالکل نہیں کبھی نہیں معلوم ہے مجھے
روشن ہے بات خود بھی سمجھ لیں گے آپ سے
جس جنگ سے خطر مری خود عافیت کو تھا
میں آپ کا حلیف اسے کیونکر سراہتا؟
بیگم کی بات یہ ہے کہ بس کیا بتائیے
ایسی ہی کوئی خود کو بھی ملتی تو جانتے
آساں ہے آپ اپنے تہائی جہان کو
تابع رکھیں یہ بس میں نہ وہ جانہار ہو

اتوبالبس: اے کاش ایسی بیوی ملے ہر شریف کو
اچھا ہے خوب عورتوں مردوں میں جنگ ہو

انطنی: بے کل بھی، بے مہار بھی، پر فن بھی تیز بھی
جو کچھ بھی تھی ضرور تھی، پر لاعلاج تھی
ہاں آپ اس کے ہاتھوں پریشاں بہت ہوئے
تسلیم ہے یہ مجھ کو بہت رنج ہے مجھے
میں خوب جانتا ہوں اٹھائے جو آپ نے شر
پر دیکھئے تھا میں بھی تو مجبور کس قدر!

قیصر: قاصد بھی میں نے آپ کو بھیجے کہ کچھ کہیں
دینے تھے وا دلیش جب اسکندریہ میں
بے پڑھے ہی جیب میں خط رکھ لیا گیا
اور منہ بنا کے آپ نے ان کو بڑھا دیا

انطنی: لیکن وہ بے طلب کئے در آئے سامنے
تھا دوسرے سرور بھی اس وقت کچھ مجھے
وہ تین بادشاہوں کی دعوت کا روز تھا
میں جتنا ٹھیک صبح تھا شب کو نہیں رہا
یہ بات اگلے روز بتا دی تھی ان کو بھی
اور اس طرح کہ گویا وہ اک معذرت ہی تھی
لڑنا ہو گر تو لڑیئے۔ پر اس بات پر نہیں
ہو کچھ بنا تو اور ہو۔ یہ نامہ بر نہیں!

---

[1] لوسیس انطنی کا بھائی [2] فلویا انطنی کی سابقہ بیوی جو مر چکی [3] سلطنت روما کے تین مشترک حاکم تھے اور یہ سلطنت اس وقت عالمگیر سمجھی جاتی تھی۔

قیصر: پورے نہ اترے آپ مگر اپنے قول میں
سے ہے منہ کہ آپ مجھکو یہ الزام دے سکیں

لے بدس: قیصر صلاحیت سے

انطنی: نہیں کہنے دیجیے
بات آ پڑی ہے قول کی یہ تشنہ کیوں رہے
بدعہد ہوں اگر تو یہ جو کچھ ہے کہیں بجا
ہاں قیصر آپ بولئے وہ قول کونسا؟

قیصر: اسباب و اسلحہ مجھے دیں گے یہ عہد تھا
جب وقت آیا دونوں سے انکار ہو گیا

انطنی: یہ کہئے غفلت۔ اور وہ اس آن میں ہوئی
جب اس خراب حال کو اپنی بھی سدھ نہ تھی
اس پہ ضرور آپ سے نادم رہوں گا میں
اور جس قدر بنے گا تلافی کروں گا میں
آئے گا اس سے فرق نہ میرے وقار میں
شامل ہے صاف گوئی مرے افتخار میں
سچ یہ ہے فل ویا نے جو کی جنگ آپ سے
وہ یوں کہ میں کشاں کشاں آجاؤں مصر سے
پس میں جو اس فساد کا ناحق سبب بنا
اور شرمسار مفت میں یوں آپ سے ہوا
خواہان معذرت ہوں اسی انکسار سے
جو زیب اس خصوص میں میرے شرف کو دے

لے بدس: شایان شاں یہی تھا۔ بہت خوب۔ مرحبا!

میکناس: خاطر نشیں ہو گر تو ہے میری بھی التجا
ان رنجشوں کو دل سے فراموش کیجئے
یعنی نوائے وقت کو خاطر میں لائیے

لے بدس: شاباش میکناس! بجا ہے تمہاری رائے

انوبارلیس: صورت اک اور بھی ہے، گر ان کی سمجھ میں آئے
اک دوسرے کو دل یہ سر دست سونپ دیں
ایسا ہی ہے تو پھر لیں کل سقنہ طے کریں!
جب یوسے کا نام نہ کانوں میں آئے گا
فرصت جھڑپ کی ہو گی بہت۔ دیکھا جائے گا

انطنی: لشکر کے اک جوان ہو تم حد سے مت بڑھو

انوبارلیس: ہاں بھولا میں کہ سچ کے دہن میں زباں نہ ہو

انطنی: سنجیدگی کا وقت ہے حد ادب رہے

انوبارلیس: سنجیدہ ہو تو سنگ ہو بہتر ہے چھوڑیئے

قیصر: گو طرز خوش نہ آیا مجھے بات ٹھیک تھی
ہو جائے ختم یونہی عجب کیا یہ دوستی
یہ حال اختلاف عمل کا ہے گر ہنوز
ہوتا مجھے یہی نظر آتا ہے ایک روز
تاہم کہیں وہ شے کہ ہم متفق رکھے
ہو گر تو شرق و غرب سے پیدا کروں اسے

اگریپا: گر ہو رضا تو عرض ہے اک میری

قیصر: ہاں کہو!

اگریپا: ناچیز ایک رائے ہے شاید قبول ہو
ناکتخدا ہیں خیر سے ہمشیرہ آپ کی
اور جانتے ہیں آپ مجرّد ہیں انطنی

قیصر: یہ کیا کہا۔ ابھی قلو بطرہ ہو یاں اگر
خوب اس زباں درازی پہ وہ لے تری خبر

انطنی: شادی نہیں ہوئی مری قیصر نہ روکئے
میں سننا چاہتا ہوں اسے کہنے دیجئے

اگریپا: اک رشتۂ مبارک و محکم کا ہو قیام
باہم برادرانہ محبت رہے مدام
اور یوں ملے کہ پھر نہ کھنچے دوستی کا ہاتھ
شادی کریں گر انطنی اور کتیویا کے ساتھ
موزوں ہے اس کے حسن دل آرا کے واسطے
وہ گرجہاں میں جس کا مقابل نہ مل سکے
وہ مرد باکمال و جواں سال و خوش خصال
ناپید جس کے جوہر ذاتی کی ہے مثال

یہ رشتہ ہو تو دور ہو آپس کا بغض و شر
اور سب یہ وسوسے کہ نہیں خالی از خطر
بجلی ہر ایک تلخ حقیقت فسانہ ہو
اب سچ ہر اک فسانہ ہے راسخ ہو یا نہ ہو
آپس میں اس کے فیض محبت سے دل ملیں
یہ دل ملیں تو سارے زمانے کے دل ملیں
کی ہے یہ بات غور و تامل کے بعد عرض
جرأت مری معاف۔ گزارش بھی میرا فرض

انطنی: قیصر کہیں گے کچھ!

قیصر: نہیں جب تک نہ یہ کھلے
کیا کہتے ہیں خود انطنی اس پر جوش چلے

انطنی: گر اگریپا سے انطنی اس وقت ہاں کہے
یاں کس کا اختیار ہے ضامن کہ نبھ سکے

قیصر: قیصر کا اختیار ہے ضامن اگر ہو طے
یعنی جو اختیار اسے ادکتیویا پہ ہے

انطنی: پھر اس صلاح انسب و احسن سے کیا مجال
گر بھول کر بھی ہو مجھے انکار کا خیال
مجھ کو قبول ہے دل و جاں سے یہ مشورہ
آپ اہتمام کیجئے اس کار خیر کا
ملتے ہیں جس خلوص و محبت سے آج ہاتھ
ہر مقصد و مہم میں رہیں دل بھی یوں ہی ساتھ

(دونوں مصافحہ کرتے ہیں)

قیصر: میں سونپتا ہوں آپ کو وہ خواہر عزیز
جس سے عزیز تر نہیں نظروں میں کوئی چیز
اے کاش اس کے دم سے سدا دل ملے رہیں!
اور سلطنت کے جملہ مفاصل ملے رہیں!

لے بدس: آمین! ہزار شکر و صد آمین۔ مرحبا!

انطنی: لڑنے کا پہلے سے گماں بھی مجھے نہ تھا!
حیرت میں ہوں میں بات نہ معلوم کیا ہے یہ
مجھ سے عجب تپاک برتتا رہا ہے یہ
میں معترف ہوں اس کی مروت کا آج بھی
کرنا ہے لیکن اس کی ہوس کا علاج بھی

لے بدس: غفلت نہ ہو ذرا یہ تقاضا ہے وقت کا
اس نے ہمیں کو ورنہ سمجھئے کہ آلیا

انطنی: ہے کس جگہ وہ؟

لے بدس: کوہ مسینا کے آس پاس

انطنی: قوت؟

لے بدس: زمیں پہ کافی سمندر میں بے قیاس

انطنی: شہرت یہی ہے۔ اچھا تو کس لیجے اب کمر
سب نقشے سوچ لیں گے کل آپس میں بیٹھ کر
کر لیجے جا ہے کوچ سے پہلے وہ کام بھی
جو آپ کی صلاح سے طے پایا ہے ابھی

قیصر: بے شک بڑی خوشی سے۔ تو پھر یوں نہ کیجئے
ادکتیویا سے چل کے ذرا مل بھی لیجئے

انطنی: ذی قدر دوست آپ بھی ہمراہ آئیے

لے بدس: عالی وقار کوئی تامل نہیں مجھے

(قرنا کی آواز انطنی قیصر اور لے بدس رخصت ہوتے ہیں)

مکیناس: مصر سے آنا مبارک ہو جناب!

انوبارس: قیصر کے رفیق خاص۔ لئیق مکیناس تسلیم۔ میرے عزیز دوست اگریپا۔ تسلیم تسلیم!

اگریپا: تسلیم۔ انوبارس

مکیناس: بڑی خوشی کی بات ہے کہ آج سارا الجھا ہوا معاملہ سلجھ گیا۔ کہئے مصر میں اچھے تو رہے؟

انوبارس: جی ہاں نہ پوچھئے
دیکھا نہ دن کو چہرہ کبھی آفتاب کا
شب ہی کو دن بناتا تھا پیالہ شراب کا

مکیناس: صبح کے ناشتے میں آٹھ سالم بنکلے اور کھانے والے

صرف بارہ؟ کیا یہ سچ ہے؟

انوبارس — اسے تو یوں سمجھئے جیسے عقاب کے سامنے مکھی ہم نے
تو اس سے بھی بڑھ کے جناتی دعوتیں دیکھی ہیں۔

کیناس — سنتے ہیں عجیب و غریب عورت ہے۔

انوبارس — انطنی کا دل پہلی ہی ملاقات میں اڑا لے گئی۔ جو دریائے
نیل پر ہوئی تھی۔

اگریپا — ہاں وہاں تو سنا ہے عجیب ہی کچھ ٹھاٹھ سے نکلی تھی۔
اگر راوی واقعی ٹھیک نقشہ کھینچتے ہیں۔

انوبارس — جی یہ نقشہ میں کھینچ کے دکھاتا ہوں ؎

کیا پوچھتے ہو اس کے سفینے کی تم بہار
رکھا تھا دوش موج پہ اک تخت زرنگار
کیا اس کی آب و تاب کا عالم کہے کوئی
دریا میں ایک آگ تھی گویا لگی ہوئی
کشتی نہیں سریر مطلا تھا سر بسر
اک شعلہ وسط آب بھڑکتا تھا سر بسر
فردوس آرزو تھا عروس نظارہ تھا
آغوش رود نیل میں اک مہ پارہ تھا!
وہ عطر میں بسے ہوئے خوش رنگ بادبان
رنگت پہ جن کی قوس قزح کا سا تھا گمان
ان کی مہک پہ صدقہ ہوئی جاتی تھی ہوا
ایک ایک بل پہ سینکڑوں بل کھاتی تھی ہوا
دنبالہ تک ڈھلے ہوئے سونے کا تھا تمام
کرتی شعاع مہر بھی جھک جھک کے تھی سلام
چپو سڈول نقرئی۔ زرکار و آبدار
گویا حسین آنکھوں پہ پلکوں کی تھی قطار
ہر دم غضب کی خوبی سے پڑتا تھا ان کا ہاتھ
شہنائی کی سریلی صداؤں کے ساتھ ساتھ
کچھ اس ادا سے کرتے تھے دریا کے دل پہ وار
اس ناز سے تھپکتے تھے موجوں کو بار بار
ہوتی تھی تیز پانی کی رفتار اور بھی
اور دوڑتا تھا پیچھے کہ اک بار اور بھی!
لیکن بیان محال ہے خود اس کے حسن کا
نطق اس کے سامنے نظر آتا ہے بے نوا
اک سرپہ شامیانہ تھا زرکار مخملی
اور اس میں وہ بہار تمنا دراز تھی
وینس کا وہ مرقع، تخیل کا شاہکار
صنعت سے جس کی ہوتی ہے فطرت بھی شرمسار
دیکھو تو یہ کہو وہ مرقع بھی کچھ نہیں
کچھ اس ادا سے جلوہ نما تھی وہ مہ جبیں!
دو طفل، خوبرو تھے دو طرفہ چنور لئے
تھے ٹھوڑیوں میں جن کے غضب کے بھنور پڑے
یوں دونوں مسکراتے تھے کیوپڈ کی شان سے
اترے ہیں جیسے آ کے ابھی آسمان سے
طرفہ تھا کچھ چنور کے ہلانے کا طور بھی
دہکا رہے تھے شعلۂ عارض کو اور بھی!!

اگریپا — کیا لطف رہا ہے انطنی کی!

انوبارس — کیا پوچھتے ہو اس کی خواصوں کی آن بان
جل پریاں تھیں کہ اس پہ فدا کر رہی تھیں جان
یوں چل رہی تھیں اس کے اشاروں پہ ناز سے
سو سو ادا نکلتی تھی اک اک نیاز سے!
پتوار پر کھڑی تھی کوئی جل پری سی نار
تھی کرتی بنت بحر طنابوں کی دیکھ بھال
وہ گورے گورے ہاتھ وہ نازک کلائیاں
انگڑائیاں سی لیتے تھے مستی میں بادباں
کشتی میں تھی عجیب و غریب ایسی کچھ مہک
لپٹیں سی اٹھ کے آتی تھیں دریا کے پار تک!
اس وقت انطنی کا بھلا کس کو ہوش تھا
دربار اس کا شہر میں سونا ہی رہ گیا
خلقت تمام ٹوٹ پڑی اس نظارے پر

سیٹی بجا رہے تھے ہوا میں جناب ادھر
جاتی ہوا بھی سیر کو اس دم عجب ہے کیا
دنیا میں یہ کہو کہ خلا ہی محال تھا

اگریپا
ارے واہ رے مصر کی ملکہ!

انوباربس
اتری ہے جب کنارے تو یہ عرض کی گئی
کھانے پہ یا دشام کو کرتے ہیں انطنی
بولی کہ جا کے دوسری جانب سے یہ پیام
بہتر ہے آپ ہی مرے مہماں ہوں آج شام
اب کس طرح بھلا کرے انکار انطنی
عورت نے اس سے ناتو سنا ہی نہیں کبھی
جکڑے گئے جناب وہیں قصہ مختصر
دعوت میں پہنچے ملکۂ عالم کے قصر پر
اور نقد دل بدل میں ضیافت کے دے دیا
جس کا فقط نگاہ نے ان کی مزا لیا

اگریپا
اف رے میری ملکہ!

انوباربس
اک روز سیر کرنے جو با زار تک گئی
اٹھلاتے تھوڑی دور عجب ناز سے چلی
دم اس خرام شوخ سے کچھ پھول سا گیا
بولی تو جیسے بات کوئی بھول سا گیا!
بے حال ہونے میں بھی عجب حال اس کا تھا
ناطاقتی میں اور سوا زور آگیا!

میکیناس
پر اب تو چھوڑ دیں گے اسے شاید انطنی؟

انوباربس
جی ان کی کیا مجال جو چھوڑیں اسے کبھی!
کمھلائے اس کو گردش دوراں محال ہے
برگشتہ اس سے ہو دل انساں محال ہے
جادو نہ جس پہ گردش دوراں کا چل سکے
افسوں سے اس کے کیا کوئی انساں نکل سکے
ہر حال میں نئی ہے وہ ہر آن میں عجیب
یہ طرفگی و تازگی ہوگی کسے نصیب
وہ عورتیں جو جی سے اتر جائیں اور ہیں
تسکین میں بھی یاں تو طلب ہی کے طور ہیں
کیا سیر اس کے وصل سے ہوگا کسی کا جی
ظالم بجھا بجھا کے لگاتی ہے اور بھی!
بدمستیاں بھی اس کی ہیں اس درجہ دلنشیں
کرتے ہیں زاہدان مقدس تک آفریں!

میکیناس
واہ کیا بات ہے صاحب۔ ہوش گم ہوتے ہیں۔ اب اگر دانشمندی اور جہانداری سے انطنی کی تسکین خاطر ہو سکے تو اوکٹیویا سے بڑھ کر نعمت اسے نہیں مل سکتی تھی۔

اگریپا
آئیے اب چلیں۔ انوباربس آپ جب تک یہاں رہیں میرے مہمان ہوں گے۔

انوباربس
بہتر ہے۔ شکریہ قبول ہو۔

(حلقۂ ارباب ذوق۔ کراچی میں پڑھا گیا)

ترکی ٹوپی

(بقیہ صفحہ ۱۸)

زبردست توقع نے اس کا سر جھکا دیا۔ الفاظ رسیلے مگر عجیب عجیب سے۔ اس کے ہونٹوں سے نکلتے گئے۔ یہ وہی الفاظ تھے جنہیں وہ پتا تھا تو پڑھا کرتا تھا۔

نورانی الفاظ۔ خوشبوؤں بھرے الفاظ۔ درد بھرے الفاظ جن کے معنے اس کے سوا کچھ نہیں جانتا تھا کہ وہ سب مل کر ایک دعا بن جاتے ہیں۔

وہ سسکیاں لیتا ہوا گھٹنوں کے بل گر پڑا .... اور اس کا منہ مکہ کی طرف پھر گیا۔

(ہنری دوورنوئے)

کراچی کی ہوائی بندرگاہ

بندرگاہ کی مرکزی عمارت جس کے درمیانی حصے میں انتظامی امور کے دفاتر ہیں - سر بفلک عمارت کے دوش بدوش دائیں کا ایک ہوائی جہاز نظر آرہا ہے- ←

← بندرگاہ کے ہوائی میدان پر ایر سروسز آف انڈیا کا ایک ہوائی جہاز-

بندرگاہ کی عمارت کا ایک منظر- عمارت کے دونوں بازوؤں میں مختلف شعبوں کے دفاتر اور ریسٹوران وغیرہ ہیں - ←
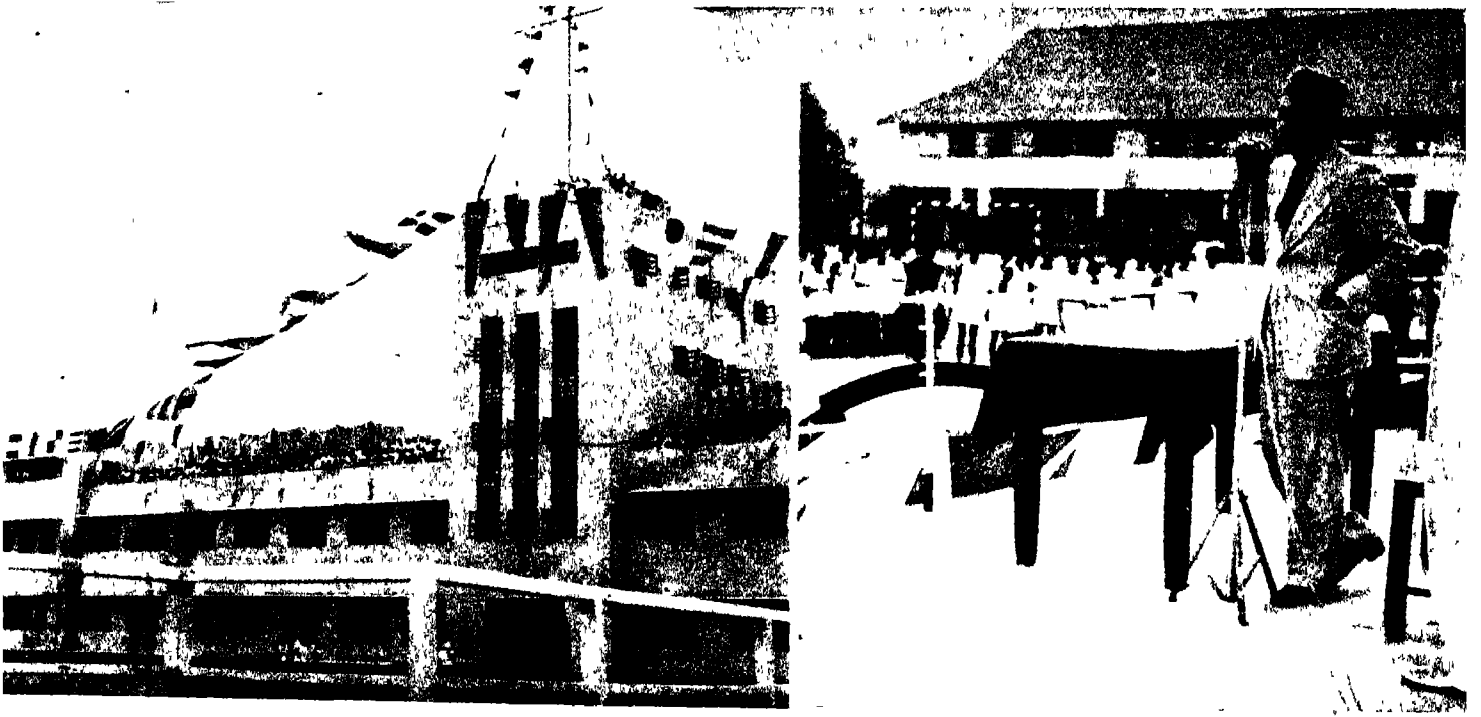
خواجہ شہاب الدین "بہادر" میں

جون ۱۹۴۸ کو رائل پاکستان نیوی کی تربیت گاہ ایچ - ایم پی - ایس "بہادر" میں کشتی رانی کا آٹھواں سالانہ مقابلہ ہوا - اس جلسے میں پاکستان کے وزیر امور داخلہ خواجہ شہاب الدین - بیگم شہاب الدین - ہندوستانی ہائی کمشنر مسٹر سری پرکاش اور دیگر معززین نے شرکت کی -

(اوپر دائیں طرف)
تقسیم انعامات کے بعد خواجہ شہاب الدین نے تقریر کی - آپ کے قریب "بہادر" کے کمانڈنگ افسر کمانڈر ایم - اے علوی کھڑے ہیں

(اوپر بائیں طرف)
"بہادر" کی تربیت گاہ کی عمارت کا ایک منظر - کشتیوں کی دوڑ دیکھنے کے لئے چھت پر تماشائیوں کا ہجوم ہے -

ٹیک شمشیر کیفر ڈویژن کی جیتی ہوئی ٹرافی لینے کے بعد خواجہ شہاب الدین سے ہاتھ ملا رہے ہیں -
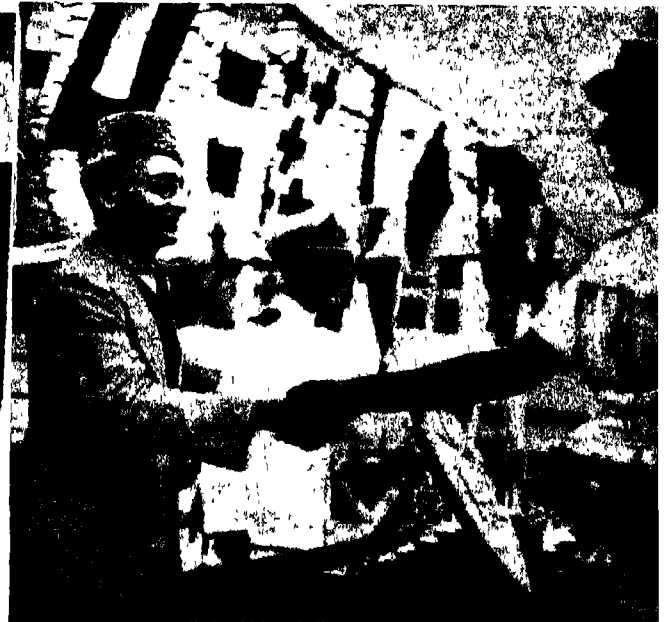
کیبر ڈویژن کے اراکین جنھوں نے سب سے زیادہ انعامات جیتے - ڈویژن کے افسر لفٹننٹ شمشیر بائیں جانب سے ساتویں نمبر پر
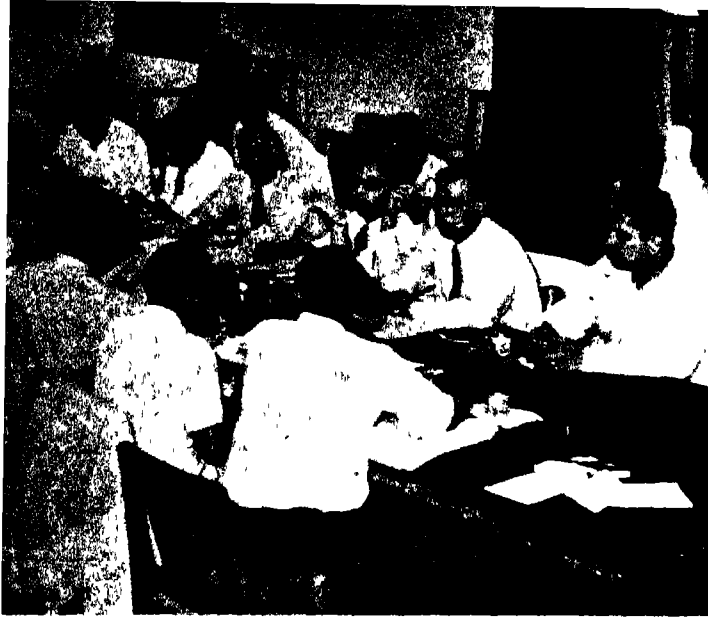
(دائیں جانب سے) پاکستان میں بلجیم کے نمائندے مسٹر گور مسز گور اور وزارت خارجہ کے رکن مسٹر طاہر علی جنہوں نے ان مہمانوں کا استقبال کیا۔

(اوپر بائیں طرف) ۲۴ مئی ۱۹۴۸ء کو کراچی میں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان انٹر ڈومینین کانفرنس ہوئی۔ تصویر میں دونوں ملکوں کے نمائندے گفت و شنید میں مصروف نظر آ رہے ہیں۔

۲۵ مئی ۱۹۴۸ء کو جاپان کا تجارتی وفد حکومت پاکستان سے تجارتی گفت و شنید کرنے کے لئے کراچی پہنچا۔ ہوائی بندرگاہ پر ڈاکٹر جنید (بائیں سرے پر) اور مسٹر قدرت اللہ شہاب (دائیں سرے پر) نے ان کا استقبال کیا۔ درمیان میں وفد کے اراکین ہیں۔

چند دن ہوئے ریڈیو پاکستان ڈھاکہ سے خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم مشرقی بنگال کی صدارت میں ایک مشاعرہ نشر کیا گیا جس میں کئی مشہور شعراء نے شرکت کی۔ تصویر میں حضرت جگر مرادآبادی۔ خواجہ ناظم الدین۔ حضرت خمار بارہ بنکوی اور حضرت حفیظ جالندھری نمایاں ہیں۔

پساور کی ایک چراگاہ کا دلکش منظر

اوپندر ناتھ اشک

ہتھیار

صبح جب کیخسرو جہانگیر پارکھ ناشتے پر بیٹھے تو ان کے پیالے میں چائے ڈھالتے ہوئے اُن کی آیا نے اپنی کرخت غنغنی آواز میں گھاٹن کرشنا بائی کی شکایت کی۔

آیا کی زبان ہندوستانی کی وہ بگڑی ہوئی صورت تھی جو بمبئی میں گجراتی، مراٹھی، کوکنی اور بنگالی سے مل جل کر بن جاتی ہے۔ مذکر کی جگہ مونث اور مونث کی جگہ مذکر۔ لیکن پارکھ صاحب ایک بڑی فرم کے منیجر کی حیثیت سے بلاناغہ اپنے چپڑاسیوں اور دوسرے نوکروں سے اسی زبان کا استعمال کرتے تھے، اس لئے وہ آیا کی ہندوستانی سمجھ جاتے تھے۔

"وہ لے کرشنا بائی بڑا کھٹ کھٹ کرتا ہے" آیا کہہ رہی تھی "ہم تو کنٹال گیا اس سے۔ اچھا سے صفائی نہیں کرتا۔ وہ برتن جیاستی ہو جاتا ہے تو تو مابوم کرنے لگتا ہے۔ ساتھ کے گھر کا گھاٹن سات روپے لیتا ہے چار گھر دن میں صفائی کرتا ہے۔ آتنا لوگ کا برتن گھاستا ہے اور ڈھیر سے کپڑے دھوتا ہے سات روپے پہ اوبائی خوشی سے آئینگا اور کپڑے بھی ساتھ میں دھوئینگا۔"

پارکھ صاحب کو دفتر جانے کی جلدی تھی چائے کو طشتری میں انڈیل کر انھوں نے جلد جلد چار گھونٹ بھرے اور چلتے چلتے صرف اتنا کہا:

"تو اس کو رکھ لو آیا!"

پارکھ صاحب کے پڑوس میں کام کرنے والی یہ گھاٹن جسے آیا رکھنا چاہتی تھی بعد کے رشتے میں پارکھ صاحب کی گھاٹن کرشنا بائی کی نند ہوتی تھی۔ جب آیا نے اسے دوسرے دن سے کام پر آنے کو کہا تو اگرچہ اس نے اپنی رضامندی ظاہر کی لیکن کہا کہ وہ اپنے شوہر سے مشورہ کر کے ایک دن بعد قطعی جواب دے گی۔

کام سے نمٹ کر وہ سیدھی کرشنا بائی کے گھر پہنچی اور اس نے بھاوج کو اس بات کی اطلاع دی کہ پارکھ صاحب کی آیا نے اسے کام پر آنے کے لئے کہا ہے۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا کہ اگر وہ نہ جائے گی تو آیا کسی دوسری کو رکھے گی۔ گھر کی آگ گھر ہی میں رہنی چاہئے۔ اس لئے اگر کرشنا بائی کو کام چھوڑنا ہو تو پھر اسے نند کو وہاں جانے کی اجازت دے دینی چاہئے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ اپنے شوہر سے مشورہ کرنے کا بہانہ کر کے ایک دن کی مہلت لے آئی ہے۔ اگر اس دوران میں کرشنا بائی آیا سے صلح کر لے تو بہت اچھا۔ وہ اپنی بھاوج اور اس کے بچوں کے پیٹ پر لات نہیں مارنا چاہتی لیکن کوئی دوسرا آ کر اس نوکری کو لے اڑے یہ بھی اسے پسند نہیں۔

چلتے چلتے اس نے اتنا اور کہا کہ پارکھ صاحب کی آیا "اول درجے کی "ہلکٹ رانڈ" ہے۔ پارکھ صاحب کے گھر میں اس کی واحد حکومت ہے اور اس وقت تک رہے گی جب تک پارکھ صاحب دوسری شادی نہیں کرتے، اور ان کے دل سے اپنی مرحوم بیوی اور صرف دس دن زندہ رہ کر پرلوک چلے جانے والے اکلوتے بچے کا غم نہیں مٹ جاتا۔ اس نے اپنی بھاوج کو یہ بھی سمجھایا کہ یہ آیا اگرچہ "ہلکٹ رانڈ" ہے اور بڑا کھٹ کھٹ کرتی ہے مگر کھٹ کھٹ کس گھر میں نہیں ہوتی جب بھگوان نے یہ دن دکھائے ہیں تو کھٹ کھٹ سہتے ہوئے سب کام کرنا ہوگا۔

اس کی نند اسے یہ سب سمجھا کر چلی گئی تو کچھ لمحے تک کرشنا بائی مبہوت و بے جواس سی بیٹھی رہ گئی۔ وہ پارکھ صاحب کے گھر پچھلے آٹھ برس سے کام کر رہی تھی۔ اس کے دیکھتے دیکھتے یہ آیا آئی تھی۔ بکری سی منمنایا کرتی تھی اور یہ بھی معلوم نہ ہوتا تھا کہ اس کے دانتوں میں زبان بھی ہے یا نہیں۔ اس کے دیکھتے دیکھتے اس کی مالکن وضع حمل کے بعد بیمار پڑی اور اپنے اکلوتے بچے کے ساتھ (جسے اس نے کئی آپریشنوں کے بعد حاصل کیا تھا) رحلت کر گئی۔ اس کے دیکھتے دیکھتے اس آیا نے پر پرزے نکالنے شروع کئے اور مالک کے بے پناہ غم کا فائدہ اٹھا کر (جس نے اسے گھر اور اس سے متعلق ہر چیز سے بے نیاز سا بنا دیا تھا) آیا گیری چھوڑ کر دسوی گیری شروع کر دی اور گھر کی مالکن سی بن بیٹھی۔

غصہ کے مارے کرشنا بائی کا گلا رندھ گیا۔ اس کے جی میں آیا کہ اسی وقت جائے اپنے اور اس حلکٹ آیا کے بال نوچ ڈالے۔ لیکن تب ہی اس کا بھوکا بلکتا بچہ آیا اور ماں کے تمام رنج وغم سے ناآشنا روٹی کے لئے چلانے لگا۔ کرشنا بائی کے سامنے اس کے دوسرے پانچ بچوں کی صورت گھوم گئی۔ ان کے پیٹ کے دوزخ کی روز بروز بڑھنے والی آگ اور راشن کی دوکان سے ملنے والے اناج کی دن بہ دن گھٹنے والی مقدار اس کی آنکھوں کے سامنے آئی اور اس کا غصہ اپنے آپ ڈھل گیا۔ اس نے ٹھنڈے دل سے اس نئی صورت حالات پر غور کیا۔ اس سے سمجھوتہ کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنی قسمت بنانے بگاڑنے والی اس نئی بدھاتا سے لڑنے کے لئے اسی ہتھیار سے کام لینے کی ٹھانی جس کی بدولت ابتدائے آفرینش سے عقلمند لوگ سمجھداروں کو اور نادان نادانوں کو احمق بناتے آئے ہیں۔

اپنے بلکتے ہوئے بچے کو کندھے سے لگائے وہ اسی وقت پارکھ صاحب کے گھر پہنچی۔ پارکھ صاحب اپنے بیراگی میں صرف صبح کا ناشتہ اور شام کی چائے گھر پر لیتے تھے۔ لنچ اور ڈنر وہ دفتر ہی میں کھاتے تھے اور صبح دس بجے سے لے کر رات کے بارہ بارہ بجے تک دفتر میں بیٹھے رجسٹروں فائلوں آنے جانے والے خطوط سے دل بہلایا کرتے تھے۔ آیا اس وقت دوپہر کا کھانا چپڑاسی کے ہاتھ بھیج کر آرام فرمانے کی فکر کر رہی تھی۔ کرشنا بائی کو وقت سے پیشتر آتے ہوئے دیکھ کر اسے ڈانٹنے کے لئے تیار ہو کر کھڑی ہو گئی۔

کرشنا بائی نے دو برس میں پہلی بار آیا کو سلام کیا اور اپنے بلکتے ہوئے بچے کو رسوئی گھر کی چوکھٹ میں بٹھا کر خود بھی رونے لگی۔

ناک بھوں چڑھاتے ہوئے آیا نے اپنی غنغنی آواز میں پوچھا

"کیا ہے"

کرشنا بائی نے روتے روتے اپنی مرحوم مالکن کی غریب نوازی اور فراخ دلی کا ذکر کیا اور پھر کہا کہ اب نوکر بیوں کے لئے تم ہی مالکن ہو۔ اور مدد کے لئے ہم غریب تمہاری طرف ہی دیکھیں گے۔

آیا کی تنی ہوئی بھویں ڈھیلی ہوئیں۔ نیند خراب کرنے کے لئے کرشنا بائی کو جو ڈانٹ وہ بتانا چاہتی تھی وہ بھی اس کے ہونٹوں ہی میں رہ گئی۔

"مہتر تمہاری بڑی اچھی بات بولتا تھا" کرشنا بائی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "تم ہم سے کاہے کو غصہ ہو گیا۔ راشن پورا نہیں پڑتا۔ بچہ لوگ بھوکا مرتا ہے تب ہی ہم تم سے کہتا ہے۔ نہیں تو آٹھ برس کام کیا ہے کبھی کھٹ کھٹ نہیں کیا۔ تم ہم کو کاہے کو نکالنے کو مانگتا ہے۔ ہم تمہارا سب کام کریگا۔ برتن بھی اچھے گھسیٹیگا اور کپڑے بھی دھوئیگا۔ تمہارا خوشی ہوئے تو پگار چڑھا دینا نہیں ہم اسی پگار پہ کام کریگا۔"

"ٹھیک سے کام کرو ہم کو کھٹ کھٹ نہیں مانگتا"۔ مالکن کے سے تحکمانہ لہجے میں آیا نے کہا۔ اور بڑی فراخ دلی سے ایک روٹی اندر سے لا کر روتے ہوئے بچے کے ہاتھ میں تھما دی۔

شام کو جب پارکھ صاحب ناشتے پہ بیٹھے تو انکے پیالے میں چائے انڈیلتے ہوئے منمناتے سے لہجے میں آیا نے کہا "آج ہم نے کرشنا بائی کو جانے کے لئے بولا تو وہ رونے لگا۔ غریب لوگ ہے چھ بچہ ہے اور پورا نہیں پڑتا۔ بولتا تھا ہم سب کام کریگا۔ برتن بھی گھسیٹیگا کپڑا ابھی دھوئیگا اور کھٹ کھٹ بھی نہیں کریگا۔ ہم کو نکالو نہیں۔ ہم بولتا ہے صاحب جو نا پرانا نوکر ہے کسی گڑبڑ کا ڈر نہیں۔ تم اس کا دو روپیہ پگار بڑھا دیو۔ تم غریبوں کو دیتا ہیں گا تو تم کو خدا دیگا۔"

مصر میں اردو ——————— بقیہ صفحہ ———

اور پڑھانے کے لئے آسان نصاب تیار کیا جائے۔ چنانچہ ڈاکٹر عبدالوہاب عزام بے کی حیثیت میں میں نے اس سلسلہ کی بعض کتابیں تالیف کی ہیں جن کی اشاعت جنگ کی وجہ سے معرض التوا میں پڑ گئی۔

میں نے اس امر کی بھی کوشش کی تھی کہ جامعہ مصریہ اور ازہر سے نوجوان طلبا کو ممالک ہند مثلاً علیگڑھ و جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن بھیج کر تعلیم دلائی جائے۔ چنانچہ اس کے لئے تبادلۂ خیالات بھی کئے گئے لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ قونصل مصر متعینہ بمبئی اس بات پر بھی رضامند ہو گئے تھے کہ اپنے نوجوان مصریوں کو حکومت کے خرچ پر روانہ کرے اور بذریعہ قونصل مصریہ بھی گفتگو ہوئی تھی کہ مصری اساتذہ ہندوستانی جامعات میں آکر عربی کی نشر و اشاعت کریں اور ساتھ ہی یہاں کے ادب و ثقافت کو ممالک عربیہ میں متعارف کرائیں۔

اسی طرح یہاں کے علما مصری جامعات میں جا کر اردو دانی کا صحیح ذوق پیدا کریں اور وہاں کے حالات سے ہم کو روشناس کرائیں۔ اس سلسلہ میں بھی اب تک کوئی عملی اقدام نہیں ہوا۔ لیکن اب جبکہ پاکستان قائم ہو گیا ہے۔ اس سلسلہ میں زیادہ مفید اور دیرپا کام کیا جا سکتا ہے۔
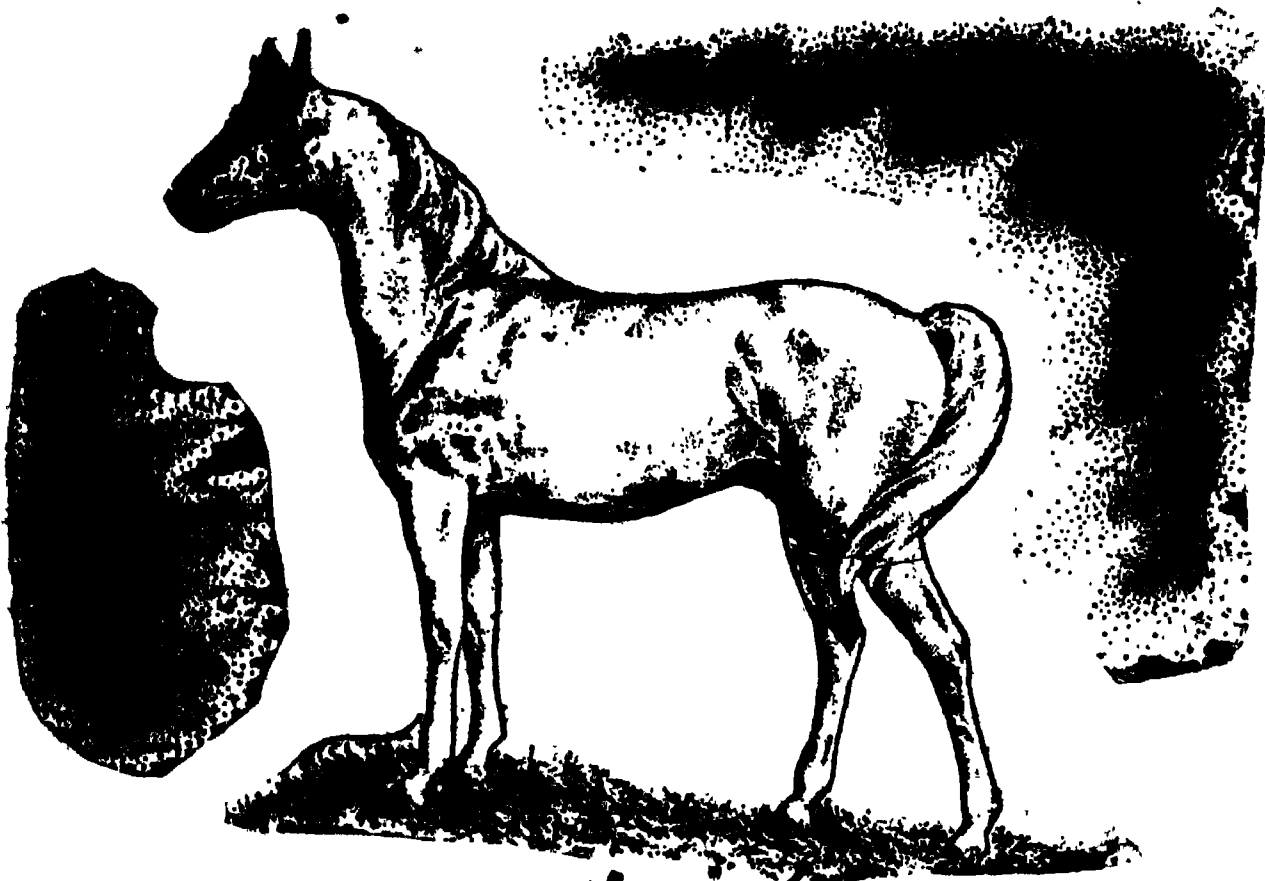
ایک ہی نظر میں

تجربہ کار سلوتری اچھے گھوڑے کی ساری نشانیاں جانتا ہے، اور گھوڑا خریدنے سے پہلے ایک ہی نظر میں ان ساری نشانیوں کی پرکھ کر لیتا ہے۔ قد ۱۵½ یا ۱۶ بالشت، سر پتلا اور شبک، کنوتیاں چھوٹی اور کھڑی، آنکھیں بڑی، نتھنے چوڑے، سینہ کشادہ، کندھے ترچھے اور بھرے ہوئے، پیٹھ مضبوط، ٹانگیں چھوٹی، ہموار اور چوڑی۔
اسی طرح ہر اچھی چیز کی کچھ نہ کچھ پہچانیں ہوتی ہیں۔ مثلاً اگر آپ روپے کا بہترین مصرف تلاش کر رہے ہیں تو آپ یہ ضروری خصوصیات مدنظر رکھیں گے۔ جہاں آپ روپیہ لگا رہے ہیں وہاں وہ محفوظ ہو، آپ اسے ایک مقررہ مدت کے بعد واپس لے سکتے ہیں۔ اس پر آپکو زیادہ سے زیادہ نفع ملیگا۔ اس پر ٹیکس نہیں دینا پڑیگا۔ یہ ساری شرطیں پاکستان سیونگ سرٹیفکیٹوں میں روپیہ لگانے سے پوری ہوتی ہیں۔

ذیل کی باتیں پڑھئے اور خود فیصلہ کر لیجئے

۱- یہ سرٹیفکیٹ ڈاکخانوں سے، سیونگ بیورو سے یا مقرر کردہ ایجنٹوں سے خریدے جاسکتے ہیں۔
۲- ہر شخص پندرہ ہزار روپے تک کی کوئی رقم جمع کرسکتا ہے۔ (دو اشخاص مل کر تیس ہزار روپے تک جمع کرسکتے ہیں)
۳- مبلغ پانچ، دس، پچاس، سو، پانچسو، ہزار اور پانچ ہزار روپے کی مالیت کے سرٹیفکیٹ مل سکتے ہیں۔ تھوڑی رقم بچانیوالے چار چار آنے، آٹھ آٹھ آنے، اور ایک ایک روپے کے سیونگ اسٹامپ خرید سکتے ہیں۔
۴- ہر دس روپے بارہ سال کے بعد پندرہ روپے بن جائیں گے۔ گویا ۳½ فی صدی سالانہ نفع ہوگا۔
۵- اٹھارہ ماہ کے بعد ہر سرٹیفکیٹ نفع سمیت بھنایا جاسکتا ہے۔ (پانچ روپے والے سرٹیفکیٹ کی صورت میں بارہ ماہ کے بعد)
۶- حکومت اصل رقم اور نفع دونوں کی ادائیگی کی ضامن ہے۔
۷- اس طرح حاصل کئے ہوئے منافع پر انکم ٹیکس ادا نہیں کرنا پڑے گا۔

پاکستان سیونگ سرٹیفکیٹ خریدیئے

یہ روپیہ کا بہترین مصرف ہے

وزارت مالیات حکومت پاکستان نے شائع کیا

SPEEDY BATTERY
SERVICE --
برطانوی ساخت کی سب سے زیادہ قابل اعتماد
بیٹری جسے دنیا کی بہترین موٹریں استعمال کرتی
ہیں۔ صرف "دلزانس ڈیگنائٹ" بیٹری ہے۔
DAGENITE
پاکستان اور افغانستان کے واحد ایجنٹ:۔
انٹرنیشنل ٹریڈرز۔ الیکٹرک ہاؤس۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۶۲
صدر۔ کراچی نمبر ۳ فون نمبر ۷۵۵۶

یزدانی ملک

دجلہ کے کنارے

یہ دجلہ یونہی بہتا چلا آیا ہے۔صدیوں سے۔ خاموش پرسکون بہتا مسکراتا ہوا عراق کے لئے زندگی سے بھرپور۔ اس وقت سے جبکہ اسی کے کنارے قرنا کے مقام پر حضرت انسان کو اس جہاں میں آنے کی زحمت دی گئی۔ اس وقت سے یہ دجلہ انسان کی خدمت میں مصروف ہے۔ بے لاگ خدمت۔ خندہ پیشانی سے۔ اسکے بعد انسان نے کتنی ہی ترقی کرلی۔ نہریں اور ریلیں بنالیں۔ ہوائی جہاز بنا لئے لیکن دجلہ کی لہریں اب بھی مسکراتی ہوئی پیغام دے رہی ہیں۔ ہم چھوٹی سے چھوٹی کشتی (قیم) سے لیکر بڑے سے بڑے دخانی جہاز تک کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ اسے اپنے سینہ پر ایسے جگہ دیتے ہیں جیسے ماں بچے کو۔ اسی دجلہ کے کنارے وہ مشہور شہر بصرہ آباد ہے۔ بصرہ۔ جس کا نام ذہن میں آتے ہی کھجوروں کے باغات، وہ چھوٹی چھوٹی بادبانی کشتیاں وہ قہوہ خانے۔ اور وہ فوجی دوشیزاؤں کے جھمگھٹے تصور میں آتے ہیں۔

اسی کے کنارے وہ قدیم شہر سادہ آباد ہے۔ اسی دجلہ کی لہریں اس مشہور شہر (کش) کے کناروں کو بھی چومتی ہیں جوکہ طوفانِ نوح کے بعد پہلا شہر ہے جو وجود میں آیا ہے۔ جیسے کہ یہ لہریں کہہ رہی ہوں۔ کہ تم اس عظیم طوفان کے بعد ظہور میں آئے ہو۔ ذرا ہماری طرف بھی تو دیکھو ہم نے بھی وہ طوفان دیکھا تھا، اور اس کے بعد ابھی کئی اور طوفان دیکھنے باقی ہیں۔ لیکن ہماری چال وہی ہے رفتار وہی ہے۔ دیہاتی عرب دوشیزاؤں کے پاؤں کی جھانجھنوں کی موسیقی سے خوبز۔ اور یہی دجلہ (اُر) کے پاس سے بھی گزرتا ہے۔ (اُر) حضرت ابراہیمؑ کی جائے پیدائش۔ اور اس کے پاس سے اس کی لہریں ایسے گزر جاتی ہیں جیسے کہ پاس احترام سے نزدیک نہ آسکیں۔ اور دُور سے بھی اپنا سلام اور عقیدت نچھاور کررہی ہوں۔

اسی دجلہ میں بابل کے مشہور مینار اپنا سایہ ڈالے دیتے ہیں۔ اسکی لہریں اس قدیم شہر کی تہذیب و تمدن سے بھی متعارف ہیں۔ انہی لہروں نے بابل کو اپنے عروج پر دیکھا ہے۔ جبکہ ایک دنیا میں اس کی دھوم تھی۔ جبکہ بابل کے شگفتے ہوئے باغات اور اس کی وسیع روشنیاں اس دریا کے پانی کے اندر تک اتر جاتی ہیں۔ اسی دجلہ نے ان دو فرشتوں ہاروت ماروت کو بھی دیکھا ہے۔ ان دو ستاروں کو ٹوٹتے ہوئے بھی ملاحظہ کیا ہے۔ اور اس کی زمین پر ان کے نقش قدم بھی دیکھے ہیں۔ وہ چاہ ہاروت ابھی تک قائم ہے اور اس کی لہریں اس کی طرف اشارہ کرتی رہتی ہیں۔ اسی دجلہ نے سکندرِ اعظم کے پاؤں بھی چومے ہیں۔ اور دجلہ تو ایسے لوگوں کا ہمیشہ خیر مقدم کرتا آیا ہے۔ اب بھی مختلف ممالک کی فوجیں دجلہ کے کنارے خیمہ زن ہیں۔ اور اس کی لہریں ہر صبح ان کو بھی سلام بھیجتی ہیں۔

اس کی لہروں کو بابل کے اس مشہور یونانی کا رقص اب تک یاد ہے۔ اور شاید اس کے رقص کی جھلک اب تک اس کی لہروں میں موجود ہے۔ ہوا اب بھی اسکی سطح پر نئی نئی لہریں بناتی ان دیویوں کے نرم و نازک پاؤں کی یاد دلا دیتی ہے۔ انہی لہروں نے یہاں کے مشہور حکمران (ہربی) اور (نیبو چند نذر) کو بھی دیکھا ہے۔ ان کا دبدبہ اور عظمت اب تک شاید اس کے پاٹ میں پنہاں ہے۔ اور اب جبکہ بابل کی عظمت کی یادگار صرف وہاں کے کھنڈر رہ گئے ہیں۔ تو لہریں اب بھی ان کے پاس سے ایسے ہی گزرتی ہیں جیسے ان کے سارے رازوں سے واقف ہیں۔ یہ کھنڈرات جیسے، موٹے، اپنے حکمرانوں کی ہڈیاں اور ان کی تہذیب کی نشانیاں لئے ابھی تک کھڑے ہیں جیسے استہزا کررہے ہوں کہ تم ہمیں نہیں مٹا سکتے تم اپنی تمام تخریبی قوتوں سے بھی ہمارا سر نیچا نہ کرسکے۔

اسی دجلہ کے کنارے آشی، ہترا، اور موصل واقع ہیں جو موصل اور تل کیف جہاں کی دوشیزاؤں کے حسن سے اب بھی یہ لہریں رنگ پکڑتی ہیں۔ اور رشک سے ان کی ایک جھلک لیکر آگے بڑھ جاتی ہیں۔

اور یہی دجلہ بغداد میں اس طرح گھس گیا ہے جیسے وہاں سے نکلنا نہ چاہتا ہو۔ بغداد کے عین بیچوں بیچ یہ دریا نے اور لہروں کا جی شہر کے نظاروں سے بھی بھرتا ہی نہیں۔ اور ان لہروں نے مامون الرشید کا

بغداد بھی دیکھا ہے۔ اور ان دنوں کا جدید بغداد بھی ان لہروں نے وہ الف لیلائی رونق اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ اسی بغداد میں وہ غوث الاعظم" محوِ آرام ہے۔ بغداد یہ قدیم و جدید کا مرقع۔ بغداد جو کہ خلفا کا شہر کہلاتا تھا۔ اسی دجلہ کے کنارے اب عظیم الشان عمارتیں، ہوٹل اور رقص گاہیں اس کے پانی کو اپنے سائے کے نیچے لئے ہوئے ہیں۔ اسی بغداد میں اب چاہو تو سواری کے لئے ہوائی جہاز بھی مل سکتا ہے۔ اور چاہو تو گدھا بھی۔ اسی دجلہ نے مامون الرشید کو اپنی گود میں استقامت بخشی اور اب اسی کے کنارے شاہ فیصل کا بُت اسکی طرف کھڑا اشارہ کر رہا ہے۔ بغداد جسکو کہ تصور میں لوگ یوں دیکھتے ہیں کہ ایک پُرانا مشرقی روایات کا شہر چھوٹے چھوٹے تہ خانے اور اس میں بڑے بڑے عمامے اور لمبے لمبے چغے پہنے ہوئے لوگ چھوٹی چھوٹی قہوہ کی پیالیوں اور حقہ کی لمبی نے میں گم۔ قالینوں پر دراز جہاں کہ تربوز اتنے بڑے بڑے ہوں کہ ان میں سے ہرن جست مار کر نکل آئیں۔ آدھے چہرے پہ نقاب ڈالے ہوئے آہو رفتار دوشیزائیں دجلہ نے یہ سب کچھ دیکھا ہے۔ اور اب یہ جدید دور بھی دیکھ رہا ہے۔ جبکہ اسکے سینہ پر سے یہ بڑے بڑے دخانی جہاز اور ہوا کے غلیظ بناتی ہوئی موٹریں اور گاڑیاں بھی گزر جاتی ہیں۔ کسی دور ملک کے دو گورے رنگ کے باشندے ایک دوسرے کو گالیاں بکتے ہوئے ان پر سے گزر رہے ہیں۔ اور سب جگہ گھوم پھر کر یہ دجلہ سندباد کے شہر بصرہ میں واپس آ گیا ہے۔ اور بصرہ بھی پوری آب و تاب سے اس کی آؤ بھگت کرتا ہے۔ اسکو لینے کے لئے اپنی آغوش کھول دیتا ہے۔ اور اسکا پانی اسکے ہر گلی کوچہ میں پہنچ جاتا ہے۔ سیراب کرتا ہوا نئی زندگی بخشتا ہوا دجلہ نہ آئے تو ان لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں گیہوں کے بجائے بھوک اگے۔ طرح طرح کی کھجوریں دینے کی بجائے یہی درخت کسی پریشان حال ضعیفہ کی طرح نظر آئیں۔ یہی دجلہ کی لہریں اب بصرہ میں گھوم پھر کر ہر اک شے کا نظارہ کر رہی ہیں۔ دیکھ رہی ہیں کہ ان کی غیر حاضری میں کس شے کا اضافہ ہوا۔

وہ سامنے دو عمر رسیدہ جوان فوجی وردی میں ملبوس اپنی گاڑی سے اترے اور اس بازار کی طرف چل دئے۔ اس ہوٹل کی طرف جس کا نام (الفریبی) ہے۔ یہاں زندگی ہی شام کو شروع ہوتی ہے۔ جبکہ دجلہ کی لہریں اونچی ہو کر ہر ایک آنے والے کے قدم چومتی ہیں۔ اور اپنا راگ سنا کر اس کا خیر مقدم کرتی ہیں۔ وہ سامنے ہوٹل میں کوئی حسینہ لاؤڈ سپیکر پر لحن داؤدی میں کوئی عربی گیت گا رہی ہے۔ وہ بیچارے ہندوستانی سپاہی با ادب کھڑے ہیں۔ ان کے خیال میں شاید قرآن مجید کی تلاوت کی جا رہی ہے۔ ذرا دیکھو تو بے چارے کس عقیدت سے ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ خاموش نگاہوں میں ایک عجیب سا لئے ہوئے وہ سامنے ہوٹل میں سے تنور کی روٹیوں کی خوشبو آ رہی ہے۔ روٹیاں بھی طباق جتنی بڑی اور کچھ اس قسم کی خوشبو لئے ہوئے کہ خواہ مخواہ کھانے کو جی چاہے۔ یہی روٹیاں ہوں گی جنہیں اس دیہاتی عرب نے دجلہ کے پانی میں بھگو بھگو کر کھانا شروع کر دیا تھا۔ اور کہا تھا کہ جب تک یہ دجلہ بہتا رہیگا وہ بھی کھاتے جائیگا۔ یہاں کی کھجوریں کچی اور پکی ادھ پکی اور پکی ہوئی ٹوکروں اور ڈبوں میں بند نازک نفیس ایئر ٹائیٹ ڈبوں میں گٹھلی کی جگہ بادام بھری ہوئی کھجوریں، کھجور کے کیک، بسکٹ، پیسٹری، کھجور کا مربہ اور کھجور کا عرق، کھجور نہ ہو تو یہاں کی زندگی ختم ہو جائے۔ اور کھجوریں بھی اس دجلہ کا رس ہے۔ شیرہ ہے اور عرق ہے۔

وہ سامنے چھوٹی سی نہر کے کنارے کبابوں کی دوکان ہے۔ کباب ایسے خستہ کہ ہاتھ نہ لگانے دیں۔ اس دکان کے اوپر ایک بورڈ لگا ہوا ہے۔

وہ چھوٹے چھوٹے بچے (قازوزہ۔ قازوزہ) کہہ کر سوڈے کی بوتلیں بیچ دیتے ہیں۔ اور کسی فوجی کو آتا ہوا دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں "گڈ، ویری گڈ" "صاحب، لفٹنٹ، کیپٹن۔ گڈ"

دجلہ کی لہروں پر چاندنی کی لمبی دور تک بنتی ہوئی سڑک اور اس کے اردگرد گنبد وسے، گانے، اور یہ بادبانی کشتیاں۔ یہ کنارے کنارے ہوٹلوں کی ایک لمبی قطار۔ یہ رونق۔ یہ گہما گہمی جیسے ہر ایک زندگی سے اس کا آخری قطرہ تک نچوڑنے میں مصروف۔ وہ سامنے ہوٹل میں ارغنوں بج رہا ہے۔ اس ہوٹل کا چبوترہ دور تک دجلہ نے اپنی آغوش میں لے رکھا ہے۔ اور چبوترے کے اردگرد بید مجنوں کے درخت گھیرا ڈالے ہوئے ہیں۔ چاندنی کبھی کبھی ان کی شاخوں میں الجھ کے رہ جاتا ہے۔ اور پوری طرح اس رقاصہ کے رقص کا نظارہ نہیں کر سکتا۔ جو کہ اس چبوترہ پر محو رقص ہے۔ چاند حیران ہے کہ اسکو کس طرح اپنے جسم کے ہر عضو پہ اختیار حاصل ہے۔ دجلہ کی لہریں کس عقیدت اور اضطراب سے اس کے فن کی داد دے رہی ہیں اور وفادار کتے کی طرح اسکے پاؤں میں لوٹ پوٹ ہو رہی ہیں۔ چاند بھی درختوں کی اوٹ میں سے نکل آیا ہے۔ چودھویں کا چاند جیسے کہ پورا

قہقہہ لگا رہا ہو۔

وہ سڑک کے اس پار۔ وہ آرمینی ستارا اپنے ہنر میں مشغول ہیں۔ قدرتی مناظر تو جادۂ انسانی تصادیر اپنے اصلی رنگ میں ان اشیا پہ کھو دیتے ہیں۔ وہ سامنے کے قہوہ خانے۔ عربی لوگوں سے بھرپور۔ بیچارے زیادہ لوگ دیہاتی ہی ہیں۔ جو کہ اپنی صحرا کی زندگی سے اکتا کر یہاں ذرا اپنے غم کا بار ہلکا کرنے آتے ہیں۔ تلخ قہوے سے کس طرح تسکین حاصل کرنے میں غرق ہیں۔ کبھی کبھی وہ سامنے کے فوٹوگرافر کے پاس بھی چلے جاتے ہیں۔ جیسے کہ تصویر اتارنے کے لئے ایک حسینہ رکھ چھوڑی ہے۔ تصویر اتروانے والے کے ساتھ اکثر خود کو بھی شامل کر دیتی ہے۔ ہاں دام ذرا زیادہ دینے پڑتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس پر فوجی لوگوں کا جمگھٹا رہتا ہے۔ تصویریں اپنے ساتھ ایک حسینہ کو دیکھ کر پھولے نہیں سماتے۔ بازار کے اس طرف اس لمبی سڑک پر جو کہ دجلہ کے کنارے کنارے گئی ہے جس کے باغ کے نزدیک (اوپن ایئر) سنیما ہے اور اس میں "وادی لبنان" فلم عربی زبان میں دکھایا جا رہا ہے۔ اور وہ سامنے کے جہازیں سے لوگ آ آ کر اس سنیما ہال کی طرف بھاگے جا رہے ہیں۔ دجلہ بھی ان پرانی عربی مہمان نوازی کی خصوصیات کا حامل ہے۔ بڑے بڑے غیر ملکی جہازوں کو تو اس طرح جگہ دیتا ہے جیسے کہ کسی پرانے بچھڑے ہوئے ساتھی سے مل رہا ہو۔ اور وہ جہاز بھی دنوں کیا مہینوں اس کی گود میں محو استراحت رہتے ہیں۔ اب دجلہ کا پانی گھٹنا شروع ہو گیا ہے۔

لہریں سمندر کی طرف بھاگی جا رہی ہیں۔ لیکن شاید کچھ کہتی جا رہی ہیں۔ سرگوشی کے انداز میں فداماں سے مل آئیں اس نے بلایا ہے۔ لیکن پھر آئیں گی۔ جلد ہی آئیں گی۔ اور پھر محفل جمیگی۔ چاند بھی ہوگا۔ سندباد بھی اور ستارے بھی۔ اور وہ رقاصہ بھی جو کہ ہمارے زمانے کے لئے نئے گیت گائیگی۔ اور رقص کے نئے کمالات کے سائے ہم پہ ڈالے گی۔ ہم زندہ ہیں اور زندگی کا ہی پیغام دیتی ہیں جو کہ ہمارے ماہ میں آئے۔

نوائے سروش

تو دل کے خون سے لکھ زندگی کی خود تفسیر
کہ اہلِ عقل تو پانی پہ کھینچتے ہیں لکیر

تمام بندِ غلامی بھی ٹوٹ جائیں تو کیا
دل و نظر ہیں ترے خواہشوں کے اب بھی اسیر

وہی گناہ سے رغبت، وہی خدا سے فرار
کہ سب ہیں ایک ہی انداز پر غریب و امیر

جہاں کے لوگ ہیں زندہ قلندروں کے طفیل
گلوں کے سایہ میں کانٹوں کی کھل گئی تقدیر

گریز پا ہے ہر اک ذرۂ جہانِ وجود
کسے ہے خوابِ محبت کی فرصتِ تعبیر

ہزار حرف و حکایت کے باوجود اے دوست!
دلوں کی بات ابھی تک ہے تشنۂ تقریر

تصورات کی پرچھائیوں کو اور نکھار!
ابھی ہے سادہ و بے رنگ حسن کی تصویر

مصیبتوں پہ ذرا کھل کے مسکرا اے دل!
کہ بند بند تبسم ہے شکوۂ تقدیر

ماہر القادری

اگلے مہینے "ماہ نو" کا ایک خاص نمبر شائع ہوگا۔ اس کی تفصیل اسی شمارے کے صفحہ ۵۵ پر ملاحظہ کیجئے۔ ________ ادارہ

خدیجہ مستور

جھینپ

ابھی ذرا دیر پہلے خوب بادل گرجے تھے، بجلی رہ رہ کے چمکی تھی، ہوا نے سناٹے بھرے تھے اور اب ابر کے چھوٹے بڑے سیاہ ٹکڑے ہوا میں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے پھر رہے تھے، گڑھے دار سڑک پر جگہ جگہ پانی بھرا ہوا تھا جس پر تانگہ بڑی بے بسی سے دھچڑ دھچڑ کرتا ہوا چل رہا تھا اور خاتون ہچکولے کھاتے ہوئے اپنی مرنے والی دادی انا کے لئے سوچ سوچ کر رو پڑنے کی کیفیت طاری کرنے کی کوشش کر رہی تھی ——— ہے۔ ہے۔ بیچاری دادی انا ——— ابا کو تو خیر اسلئے چاہتی تھیں کہ اپنا خون چپا چپا کر پالا تھا مگر اسے بچپن ہی سے کس لئے چاہتی تھیں ——— راتوں کو اسے اپنے پاس سلا کر راجہ بھوج اور گنگو تیلی کی کہانی دو دو ہوں میں گا کر سنائی ——— جب وہ روئی تو سب سے چھپا کر اسے گھی شکر کے بڑے بڑے نوالے کھلائے اور اس کے ضد کرنے پر اسے اکثر اپنے موٹے شیشوں والی عینک بھی پہننے کو دیدی مجال جو کوئی دوسرا بچہ ان کی عینک ایک ذرا دیر کو بھی لے لے عطو اور رضو اس کی حرص میں کیسا کیسا عینک کے لئے مچلتیں مگر دادی انا کے کان پر جوں بھی نہ رینگتی۔ آخر وہ بھی تو اس کی طرح پوتیاں ہی تھیں مگر محبت ہی نہ تھی کسی دوسرے بچے سے، بس اس پر جان چھڑکتی تھیں۔

افوہ ——— وہی تو بچپن کی محبت تھی کہ دادی، نانا ابا کے مرنے کے بعد اپنے گاؤں سے چلی گئیں پھر کبھی بھی نہ آئیں مگر مہینے میں ایک آدھ بار اس کی خیریت ضرور پچھوا لیتیں ——— سچ ——— بیچاری دادی انا اس کے نام کا کلمہ پڑھتی ہوئی مرگئیں ——— کاش کوئی اسے اطلاع دیدیتا کہ تمہاری دادی انا کا آخری وقت ہے، وہ تمہیں یاد کر رہی ہیں تو کتنا اچھا ہوتا، وہ اس وقت ——— !تانگے کا پہیہ ایک بڑے سے گڑھے میں دھچکے سے جا گرا ——— اور کیچڑ ملے پانی کا ایک چھپا کا خاتون کے پشمین سیاہ برقع پر آپڑا۔

"اہو ابیٹا لگا تو زور سے ——— تانگے والے نے چابک ہوا میں ہلا کر سڑاک سے بجائی تو مریل ٹٹو نے ایک جھٹکے کے ساتھ تانگے کے پہیے کو گڑھے سے نکال لیا۔ اور پھر جیسے پھونک پھونک کر قدم رکھنے لگا ——— کتنی دیر سے تانگہ یوں ہی دھچڑ دھچڑ کرتا ہوا چل رہا تھا لیکن گڑھے دار سڑک کسی طرح ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔ جانے کتنے موڑ آئے اور گزر گئے ——— خاتون کے خیالات کا سلسلہ کتنی ہی بار ٹوٹ ٹوٹ کر پھر جڑا مگر دادی انا کا گھر نہ آنا تھا نہ آیا۔ اور خاتون جو اتنی دیر سے دادی انا کے لئے سوچ سوچ کر رونے کی کوشش کر رہی تھی اب پشمین برقع پر کیچڑ کی چھینٹیاں دیکھ کر غصے کی ہلکی ہلکی جھنجھناہٹ اپنی رگوں میں محسوس کرنے لگی ——— بھلا کیا پڑی تھی اس برسات کی رات میں دادی انا کو رونے آنیکی ——— اماں نے کہا بھی تھا کہ صبح چلی جانا گھڑی بھر کو پرسے کے لئے ——— مگر وہ تو ایسی کہ جہاں سنا کہ دادی انا نے مرنے سے پہلے اسے یاد کیا تھا بس مارے فخر کے مرگئی۔ اور جھٹ سے چلی آئی اس گڑھے دار سڑک پر اپنے جسم کی چولیں ڈھیلی کرانے ———

"توبہ! یہ سڑک ہے کہ ———" خاتون جانے اور کیا کہتی کہ نیاز محمد نے اس کی بات کاٹ کر لفظ بہ لفظ وہی باتیں دہرا دیں جنہیں وہ کئی بار کہہ چکا تھا: "مگر نانی نے آپ کو مرنے سے پہلے یاد کیا تھا، آپکے نام کی ایسی رٹ لگا رکھی تھی کہ کلمہ تک پڑھنا یاد نہ رہا" ——— نیاز محمد نے ایک لمبی ٹھنڈی آہ بھری۔ خاتون نے سڑک کی سونی سونی زرد روشنی میں دیکھا کہ نیاز محمد کی بڑی بڑی آنکھوں میں پانی چھلک رہا تھا بھیگتی ہوئی مسوں پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے ابھرے ہوئے تھے اور چہرے پر بڑی بے بسی چھائی ہوئی تھی۔ خاتون یہ دیکھ کر خود بھی رونے کے موڈ میں آنے لگی ——— اوہ! بیچاری دادی انا کی موت سے ان سب کے دلوں پر کیا اثر ہوا ہوگا کس قدر محبت کرنے والی تھیں، مرنے سے پہلے بجائے خدا کے اسے یاد کرتی ہوئی مریں۔ اوہ ——— اللہ! مارے احساس برتری کے خاتون کی آنکھوں میں دو گرم گرم آنسو بھر گئے اور اس کا جھکا ہوا سر جیسے تانگے کی چھت سے لگ گیا۔

دھچڑ دھچڑ کرتا ہوا تانگہ ایک گز بھر چوڑی گلی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ جس کے بالکل قریب سڑک کے کنارے نانبائی کی دوکان میں ایک کالا کلوٹا آدمی سرخ لنگوٹ کسے دھپا دھپ تنور میں روٹیاں لگا رہا تھا، کچھ لوگ وہیں زمین پر اکڑوں بیٹھے بڑے بڑے نوالے ٹھونس رہے تھے، لمبی ڈاڑھی والا نانبائی چولہے پر رکھے ہوئے بڑے سے بدعی پتیلے میں جھانک جھانک کر مٹی کے پیالوں میں سالن نکال رہا تھا اور دوکان

کے بالکل سامنے والے کی سلاخ میں لٹکا ہوا دھواں دینے والا چراغ دھندلی روشنی کے ساتھ دھوئیں کے بادل اگل رہا تھا خاتون نے اپنے گرد و پیش ایک گہری نظر ڈالی اور پھر برقع سنبھالتی تانگے سے اتر آئی۔ پرس کھول کر تانگے کا کرایہ ادا کیا اور جیسے ہی نیاز محمد کے پیچھے گلی میں داخل ہوئی بدبو کا ایک دماغ چکرا دینے والا بھپکا اسکی ناک میں گھس گیا۔ خاتون کو مارے کراہت کے دو تین جھرجھریاں آ گئیں وہ پیچ در پیچ گلیوں میں تیزی سے چلنے کی کوشش کرنے لگی مگر بدبو بھی اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی جیسے۔ دو طرفہ ابلتی ابلتی نالیوں میں کیچڑ اور پانی کی سرسراہٹ کے ساتھ بلبلے اٹھ رہے تھے، مینڈک منہ منہ سے ٹرٹرا رہے تھے۔ مارے بدبو کے خاتون کو اپنا دماغ پھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

"کتنی دور ہے گھر؟"

"بس اب آیا چاہتا ہے۔" نیاز محمد نے مڑ کر جواب دیا اور پھر جلدی جلدی قدم اٹھانے لگا — گلی کے ایک موڑ پر تہبند باندھے دو آدمی کھڑے باتیں کر رہے تھے "بڑا برا زمانہ لگا ہے، ہر وقت جان کا خطرہ رہتا ہے، بیچارے غریبوں کی مصیبت ہے۔" "ہاں! کیا وقت ہے کبھی کیسا بھائی چارہ تھا اب تو ہندو مسلمانوں کو بھونے کھاتے ہیں اور مسلمان ہندوؤں کو، واہ ری آزادی کہ بھائی بھائی کا خون بہا رہا ہے۔"

"چھوڑو یار۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ —" خاتون نے ان دونوں سے بچ کر آگے نکلنا چاہا تو ایک نے اپنا تہبند سمیٹ کر ایک بھیانک گالی بک کر جیسے برے زمانے کی مزید تائید کر دی۔ خاتون بوکھلا کر جلدی سے آگے بڑھ گئی — کسی مکان میں کوئی عورت بڑی کراری آواز میں رو رو کر خوفناک گالیاں بک رہی تھی: "ارے، ارے، رے، دھم — دھم" اور ساتھ ہی کوئی جیسے کسی ملائم چیز پر قوت آزمائی کر رہا تھا۔ — نیاز محمد کے قدم تیز ہو گئے اور پھر وہ ایک مکان کے سامنے کھڑا ہو گیا جہاں گلی کچھ چوڑی ہو گئی تھی۔ مکان کے سامنے نالیوں کے دونوں طرف دو ٹوٹی پھوٹی بانس کی کھاٹیں پڑی ہوئی تھیں جن پر چھ سات آدمی بیٹھے حقہ پی رہے تھے اور نیاز محمد کا باپ سر تھامے ان سب کے بیچ میں بیٹھا تھا۔ خاتون کے پہنچتے ہی سب نے گردنیں اچکا اچکا کر دیکھنے لگے۔

"ارے سب لوگ ذرا منہ پھیرو۔" نیاز محمد کے باپ نے کہا اور سب نے اپنے منہ ادھر ادھر کر لئے۔

"اندر آئیے بجیا" نیاز محمد نے کہا اور اینٹوں کی تین سیڑھیاں چڑھ کر جلدی سے اندر ہو گیا۔ وہ بھی اس کے پیچھے اندر چلی گئی — پتلی لمبی ڈیوڑھی میں ایک چندھی سی لالٹین جیسے سوگ منا رہی تھی، کسی کونے میں چھپا ہوا جھینگر بین کر رہا تھا اور بس ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

"اماں! میں بجیا کو لے آیا" نیاز محمد نے ٹاٹ کے پھٹے ہوئے پردے میں منہ ڈال کر اس طرح کہا جیسے اس نے بڑا کارنامہ انجام دیا ہو۔

"ہائے میری اماں —" نیاز محمد کی بات ختم ہونے کے ایک ہی لمحے بعد گھر کے اندر ایک بھیانک چیخ بلند ہوئی اور خاتون پھٹے ہوئے ٹاٹ کی دھجیوں میں الجھ کر رہ گئی، پھر سنبھلتی ہوئی اندر چلی گئی — چھوٹے سے دالان میں سامنے کے طاق پر جلتے ہوئے چراغ کی اداس روشنی میں اس کی پہلی نظر اس کھاٹ پر پڑی جس پر دادی انا کی لاش میلی چادر سے ڈھکی پڑی تھی، سرہانے کرچھے میں لوبان سلگ رہا تھا، کھاٹ کے ارد گرد زمین پر دس بارہ عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں اور نیاز محمد کی ماں پٹی سے سر ٹیکے بین کر رہی تھی — "ہائے اماں — کچھ تو بولو — میں اماں کہہ کر کسے پکاروں گی — ہائے ایک بار تو بول دو۔ دیکھو تمہاری لاڈلی گڑدوں کی کھلائی پلی آئی ہے — آنکھیں کھولو — ہائے" نیاز محمد کی ماں جانے اور کیا کہہ رہی تھی خاتون کو کچھ بھی نہ سنائی دیا۔ وہ موت کا گھر اپنے ہوش میں دوسری بار دیکھ رہی تھی اور اسے محسوس ہو رہا تھا کہ دادی انا کی موت کا یہ صدمہ اس کے لئے بڑا سخت ہے، اس کا جی گھٹا جا رہا ہے، ڈوبا جا رہا ہے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ خوب چیخ چیخ کر رونے لگے اور دوڑ کر دادی انا کی لاش سے لپٹ جائے، ان کا منہ کھول دے، ان کے سرد ہونٹ چوم لے اور ان سے کہے کہ تم نے مجھے یاد کیا تھا نا، دیکھو میں آ گئی، اب یوں آنکھیں بند کئے چپ چاپ کیوں پڑی ہو، میری اچھی دادی انا! — لیکن خاتون یہ سب کچھ نہ کہہ سکی، نہ کر سکی، اس کے دل میں اچانک پیدا ہونے والے سچے دلی جذبات کو پلنگ کے گرد بیٹھی ہوئی عورتوں کی اشتیاق بھری نگاہوں نے منتشر ہونے سے پہلے ہی جکڑ دیا اور وہ اپنی جگہ پر اس طرح چپ چاپ بے سدھ سی کھڑی رہ گئی جیسے اسکے پاؤں زمین میں کیل دئے گئے ہوں — "ہائے میری اماں —!"

نیاز محمد کی ماں جب بین کرتے کرتے تھک گئی تو ایک دم سسکیوں اور ہچکیوں کی گاڑی پوری رفتار سے چل پڑی۔ مارے ہچکیوں کے اس کا برا حال ہونے لگا۔ پلنگ کے گرد بیٹھی ہوئی عورتوں نے اسے سنبھالنے کی

کوشش کی لیکن اس نے تو جیسے اپنی ماں کے پلنگ کی پٹی نہ چھوڑنے کی قسم کھا رکھی تھی اور وہ قسم اس وقت ٹوٹی جب خاتون نے آگے بڑھ کر جھکتے ہوئے اس کا سوکھا بازو پکڑ کر ہٹایا اور اس نے پٹی چھوڑ کر اپنا سر خاتون کے شانے پر رکھ دیا۔ چراغ کی روتی بسورتی روشنی میں خاتون کو نیاز محمد کی ماں کا چہرہ بڑا ہی گھناؤنا اور بھیانک لگا۔ کالی، سوکھی ہوئی، بڑی بڑی ابھری ہوئی آنکھیں جن میں سے آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے رس رہے تھے۔ پھر اس کے بڑے بڑے دانت، آنسو رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیوں پر ایک لمحے کو رکتے پھر ڈھلک کر ہونٹوں پر سے ہوتے ہوئے دانتوں میں سما جاتے۔ نمکین نمکین آنسوؤں کو پینے کے خیال ہی سے خاتون کو متلی سی اٹھنے لگی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ نیاز محمد کی ماں کا سر اپنے کاندھے سے جھٹک دے لیکن وہ ایسا نہ کر سکی۔ وہ بھلا اس کا سر کیسے ہٹا سکتی تھی جس کی ماں مر گئی تھی اور جس نے اس کے شانے کا سہارا لیا تھا۔ اس نے اپنی نظریں نیاز محمد کی ماں پر سے ہٹا کر دادی اماں کی لاش پر گاڑ دینا چاہیں مگر میت کے ارد گرد بیٹھی ہوئی ان عورتوں میں اس کی نظریں الجھ الجھ کر رہ جاتیں جو اسے اشتیاق اور للچاہٹ سے دیکھ رہی تھیں۔ سوکھی، مرجھلی، بے تحاشہ موٹی، کالی پیلی اور شلجم کی طرح پھیکی عورتیں جنکے گندے گندے لباس چراغ کی بسورتی روشنی میں اور بھی گندے نظر آرہے تھے۔

اسے ان عورتوں کے یوں دیکھنے سے الجھن سی ہونے لگی تو اس نے ان سب کی طرف سے منہ پھیر کر نیچے سے چوکور صحن کو یوں ہی دیکھنا شروع کر دیا۔ پورے صحن میں چراغ کی مدھم سی روشنی رینگی ہوئی تھی، بیچ میں جھلنگا کھاٹ پڑی تھی جس کے بان زمین پر صوبج کی طرح رکھے ہوئے تھے اور صحن کے ایک کونے میں لگے ہوئے نل سے بہتی ہوئی پانی کی پتلی سی دھار کچی زمین پہ جیسے گنگنا رہی تھی ــــ ہائے اماں ــــ خاتون کے شانے پر اچک کر نیاز محمد کی ماں نے ایک چیخ کے ساتھ پھر رونا شروع کر دیا۔ خاتون نے منہ موڑ کر دیکھا تو نیاز محمد کی ماں بڑی بے بسی سے رو رہی تھی، کچھ ایسی بے بسی جس میں ماں کی موت کے رنج سے زیادہ کوئی اور ہی رنج شریک معلوم ہو رہا تھا۔ مگر کیا ــــ ؟ خاتون یہ سوچ بھی نہ سکی۔ عورتیں اسے اسی طرح للچاہٹ سے دیکھ رہی تھیں ــــ دادی اماں کی میت ــــ نیاز محمد کی ماں کی بے بسی اور عورتوں کے مسلسل دیکھتے رہنے کی ملی جلی کیفیت نے اس کی آنکھوں میں مارے الجھن کے گرم گرم آنسو بھر دئیے۔ آہ ــــ ہائے ــــ نیاز کی اماں روئے جا رہی تھی۔ خاتون نے بھری بھری آنکھوں سے دیکھا کہ اب بھی عورتیں چپ چاپ بیٹھی اسے اشتیاق سے دیکھ رہی ہیں۔ نیاز محمد کی ماں کی طرف ان کی ذرا بھی توجہ نہیں۔ ہائے اللہ ــــ وہ جی ہی جی میں الجھی۔ جانے کمبختیں ایسے مرکھنیوں کی طرح کیوں دیکھے جا رہی ہیں۔ خاتون نے سوچا اور پھر اسے ایک دم اپنی کلاس فیلو کلثوم کا خیال آگیا۔ کالی، بدصورت کلثوم جو بے حد غریب تھی اور جس کی فیس معاف تھی اور جسے کبھی کسی نے اچھا یا بہت صاف لباس پہنے نہ دیکھا تھا۔ اسکول میں اسے کوئی لڑکی منہ لگانا بھی پسند نہ کرتی اور کلثوم رنگ برنگے لباسوں میں پھدکتی، تھرکتی خوبصورت خوبصورت لڑکیوں کو اشتیاق اور للچاہٹ سے دیکھا کرتی۔ بالکل اسی طرح جیسے میت کے گرد بیٹھی ہوئی عورتیں دیکھ رہی تھیں اور پھر اس خیال کے بعد اسے فوراً احساس ہوا کہ وہ یقیناً اس انداز میں بہت خوبصورت لگ رہی ہوگی۔ ایک حور جو ارضی مصیبتوں پہ رونے آگئی ہو ــــ خاتون نے اپنے چہرے کو اور بھی غمناک بنا لیا۔ پھر وہ تصور ہی تصور میں اپنے سوگوار حسن کو اچھی طرح محسوس کرنے لگی۔ چڑھی چڑھی آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسو، بڑے پیارے انداز میں موہوم طریقے پر کپکپاتے ہوئے لب، کسی قدر اوپر کو اٹھا ہوا چہرہ، خوبصورت چمپئی گردن میں لپٹا ہوا شیفون کا سفید دوپٹہ اور گھٹنے اس طرح زمین پہ ٹیکے ہوئے جیسے کوئی مسیحی دوشیزہ قربان گاہ کے سامنے دعا مانگ رہی ہو۔ حسن کے اس تصور نے اسے روتے ہوئے نحوست زدہ ماحول سے اڑا کر ایک دم کسی آرٹسٹ کا موڈل بنا دیا۔ دادی اماں کا جنازہ اور رونے والے سب پس منظر میں کھو کر رہ گئے۔

"مت رو بیٹا ــ تمہاری دادی اماں کی روح بے چین ہوگی" نیاز محمد کی ماں نے سسکیوں کے درمیان کہا اور دو تین عورتوں نے جلدی سے اس کی تائید کر دی۔ آرٹسٹ کا موڈل پھر نحوست زدہ ماحول میں آگرا۔

"پھول جیسا چہرہ کمہلا کر رہ گیا" ایک عورت نے اپنے پائنچے سنبھالتے ہوئے کہا۔ "ہاں! بالکل ــ ارے نیازو کی اماں صاحبزادی کو اچھی طرح بٹھاؤ، کب سے زمین پر بیٹھی ہیں" دوسری عورت نے اپنے ہونٹوں پر پان کی لالی ملتے ہوئے کہا۔

"اور دیکھو اب تم بھی رونا دھونا مت، صاحبزادی کا جی تھوڑا ہوگا" اسی عورت نے کہا اور پھر پان چبانے لگی۔ نیاز محمد کی ماں نے ایک سانس لیکر جیسے سارے اندوہ کو چراغ کے دھوئیں میں گھل مل جانے کے لئے کھل دیا

اور خاتون کا جی چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر رو دے، اپنے بال بکھرائے، نیاز محمد کی ماں کی طرح سینہ کوٹ لے، زمین پر پچھاڑیں کھائے اور پھر ان سب عورتوں کو اپنے لئے اور بھی پریشان دیکھے جو اس کا چہرہ اتر جانے پر اتنی بہت سی باتیں کر گئی تھیں۔ لیکن اس سے قبل کہ وہ رو پڑنے کی کوشش کرتی نیاز محمد کی ماں نے اپنا سوکھا ہوا تڑا سا ہاتھ اس کے ملائم بازو میں پہنا دیا۔

"بیٹا یہاں سے اٹھ کر پلنگ پر بیٹھو۔" خاتون نے ہلکی سی مزاحمت میں اپنا ہاتھ کھینچا: "ارے کون نہیں جانتا کہ تمہیں اپنی دادی انا سے حد بھر محبت تھی مگر کب تک اپنا آرام حرام رکھو گی۔ چلو، اٹھو۔" نیاز محمد کی ماں نے ہلکے سے اس کا ہاتھ کھینچا تو وہ ایک ایسی چیخ کے ساتھ رو پڑی جس میں نہ غم تھا نہ خوشی، روتے روتے اس نے اپنا سر دادی انا کی کھاٹ کی پٹی پر ٹیک دیا۔

"ارے — رے — رے — نا نا بیٹا۔" کئی سخت سخت محنتی ہاتھ اس کی طرف لپک پڑے اور سرسراتے ہوئے کپڑوں سے آتی ہوئی برساتی بو اس کے نتھنوں میں گھس گئی۔ خاتون نے گھبرا کر سر اٹھایا۔ وہ عورتوں کے بیچ میں گھری ہوئی تھی، بدبو اور عورتوں کے جمگھٹ سے اس کا دم گھٹنے لگا تو وہ ایک دم کھڑی ہو گئی اور نیاز محمد کی ماں نے اسے بیمار دل کی طرح سہارا دے کر دالان کے کونے میں پڑی ہوئی کھاٹ پر بٹھا دیا پھر خود اس کے پاس ٹیک کر پنکھا جھلنے لگی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں خاتون نے آنکھیں موند لیں۔

"لیٹ رہو بیٹیا" نیاز محمد کی ماں نے آہستہ سے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے لٹانے لگی۔ "نہیں۔ نہیں!" وہ سرہانے رکھے ہوئے میلے چیکٹ تکئے کے خیال ہی سے بیزار ہونے لگی۔ نیاز محمد کی ماں نے اسے اس طرح غور سے دیکھا جیسے وہ اس کی بیزاری تاڑنے کی کوشش کر رہی ہو۔

"ہاں! کون سے دل سے لیٹا جائے، دل میں تو آگ لگی ہے۔" پھر وہ آہستہ سے بولی اور خاتون سوچنے لگی کہ بھلا اسے دادی انا سے محبت ہی کب تھی؟ وہ تو بس ان کی عزت کرتی تھی، اتنی زیادہ کہ اپنی پڑھی لکھی سہیلیوں میں بھی ان کا ذکر کیا کرتی، لیکن یہ سب کتنے معصوم ہیں کہ اس کے رونے پیٹنے کو محبت سمجھ رہے ہیں۔ بیچارے — پھر بھی اسے رونا چاہئے، ورنہ سب کیا کہیں گے؟ یہی نا کہ یہ اس دادی انا کے جنازے پر آئی ہے جس نے مرنے سے پہلے کلمے کے بجائے اس کا نام رٹا، بے دردی دنیا، خاتون کو اپنی ذات پر افسوس ہونے لگا، ساتھ ہی اس نے رونے کی کوشش کی مگر وہ

بھی تو بغیر تیل کا چراغ جلانے کی کوشش کر رہی تھی — بس ہونٹ کپکپا کر رہ گئے اور وہ نظریں جھکا کر چپ چاپ بیٹھی رہی — نیاز محمد کی ماں گھٹنوں میں سر چھپائے بے سدھ سی بیٹھی تھی۔ کبھی کبھی اس کا دبلا پتلا جسم ایک لمبی آہ سے لرز اٹھتا۔ محلے کی عورتیں بھی چپ بیٹھی تھیں۔ بس دہلیز میں چھپا ہوا جھینگر جیسے بین کر رہا تھا اور رکا ہے گا ہے آہوں کے سناٹے دالان میں سرسرا اٹھتے۔ دیر تک یوں ہی خاموشی چھائی رہی۔ خاتون کو بیٹھے بیٹھے بے چینی اور تھکن ہونے لگی تو وہ سوچنے لگی کہ جانے کب اٹھیں گی دادی انا۔ رات ہوتی جا رہی ہے، بھلا وہ گھر کیسے پہنچے گی؟ یہاں تو رات کاٹنا بڑا مشکل کام ہے گھٹن، گرمی اور پھر نیاز محمد کی ماں ساری رات روئے گی، مگر یہاں تو سب اس طرح مطمئن بیٹھے ہیں جیسے کہ بیچاری دادی انا خود ہی اٹھ کر نہا دھو لیں گی، کفن پہن لیں گی اور پھر خود ہی قبرستان چلی جائیں گی، عورتیں تو اطمینان سے بیٹھی آہیں بھر رہی ہیں ابھی اور مردوں کی چلم شاید صبح تک تمباکو سے خالی نہ ہو، جانے کیا ہو رہا ہے ——

"میت کب تک اٹھے گی؟ اب تو کافی دیر ہو رہی ہے۔" خاتون نے فکرمندانہ لہجے میں پوچھا اور نیاز محمد کی ماں جواب دینے کے بجائے اس طرح ایک دم پھوٹ کر رو پڑی جیسے خاتون نے اس کا کلیجہ نوچ لیا ہو —— ہے۔ ناحق ہی تو پھر دادی انا کی یاد دلا کر بیچاری کو رلوا دیا —— خاتون نے شرمندہ ہو کر اپنا سر جھکا لیا نیاز محمد کی ماں تھوڑی دیر تک رو چکنے کے بعد ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان کہنے لگی۔ "جب اٹھیں — نیاز کے ابا محلے بھر سے قرض مانگ آئے، کہیں سے نہ ملا۔ اب صبح صاحب کے بنگلے پہ دوڑ جائیں گے، مگر کون سنتا ہے نوکر کی۔ اب تو ایک پیسہ بھی شاید ہی دے۔ علاج معالجے کے لئے ایک مہینے کی پیشگی تنخواہ دے چکا ہے — ہائے رے۔ اب تو یہ لاش چندے سے اٹھے گی بیٹیا، یا پھر پڑے پڑے سڑ جائے۔ ہائے اماں" —— نیاز محمد کی ماں پھر رونے لگی۔

"ارے کیوں روتی ہو نیاز و کی اماں، ہم غریبوں کا بھی خدا ہے، کچھ تو کرے گا۔ ہم سب تو تمہارے ہی جیسے حال میں ہیں، ورنہ بھلا محلے ٹولے کے لوگ ایسے وقت میں بھی کام نہ آئیں۔ جو دس پانچ بھی پلے ہوتے تو کفن ہو جاتیں۔" ایک عورت نے کہا: "اور دس پانچ میں ہوتا کیا ہے اس زمانے میں، تیس چالیس چاہئیں، تیس چالیس۔" دوسری عورت آہوں اور سسکیوں سے الجھی ہوئی فضا میں محروم محروم نظروں سے دیکھنے لگی۔ دوسری عورتیں اپنی اپنی مصیبتوں کا ذکر کر رہی تھیں۔ پیٹ کو روٹی ہے نہ تن کو کپڑا —— اور پھر وہ سب کی سب امید

بھری نظروں سے خاتون کو دیکھنے لگیں۔ ایسی امید بھری نظریں جو چیخ رہی تھیں کہ تم ضرور اپنی دادی اماں کے کفن کا انتظام کر سکتی ہو، تم بڑی آدمی ہو، تم ریشمین کپڑے پہنے ہو، تمہارے ہاتھ میں بڑا سا بٹوہ ہے، اور پھر تمہیں اپنی دادی اماں سے محبت بھی ہے ۔— خاتون نے ان نظروں کو دیکھا۔ پہچانا اور سوچنے لگی کہ اب اسے کیا کرنا چاہیئے۔ ابھی وہ ہے کس قابل۔ یہ سب اسے نہ جانے کیا سمجھ رہی ہیں جیب خرچ سے وہ صرف پچاس روپے بچا سکی ہے اتنے دنوں میں اور پھر اس نے کب سے سلمہ سے کہہ رکھا ہے کہ وہ اس کے لئے اپنی جیسی ساری خرید لے، پورے تیس روپے اسے دینا ہیں۔ پانچ روپے جلسے کے چندے کے۔ مگر اس نے یہاں تیس چالیس دے دئے تو پھر اماں تو اسے اتنے روپئے اکٹھا دینے سے رہیں۔ ویسے ہی اسے فضول خرچ کہا کرتی ہیں۔ دادی اماں جب بھی اس کی خیریت پچھوایا کرتی تھیں اور وہ انھیں اپنی جیب سے پانچ چھ روپئے بھجا دیا کرتی تو اماں کتنی ناراض ہوتی تھیں خاتون تو خیریت پچھوانے پہ پیسہ جاتی ہے۔ تمہاری دادی اماں کبھی ہماری خیریت نہیں پوچھتیں خاتون روپئے جو دیتی ہے، میں کہتی ہوں کہ کوئی ضرورت نہیں ایک پیسہ دینے کی۔ ان کی خدمات کا کیا کچھ کم صلہ دیا جا چکا ہے؟ اب جو اماں کو معلوم ہوگا کہ وہ ایک دم اتنے بہت سے روپئے دے بیٹھی تو کس قدر ناراض ہونگی —— خیر ناراضگی کی ایسی کیا پروا مگر سلمہ کیا کہے گی کہ دس بار کہا ساری خرید لو خرید لو اور روپئے نہ نکلے جیب سے — اب کیا ہو آخر — خاتون نے الجھ کر عورتوں کی طرف دیکھا تو وہ سب اسے اس طرح دیکھ رہی تھیں جیسے وہ کوئی جادو کا پٹارہ ہو جس میں سے کوئی بہت ہی عجیب چیز نکلنے والی ہو — خاتون پھر سوچنے لگی —— اگر اس وقت وہ دادی اماں کی میت اٹھوا دے تو ان سب عورتوں کو کتنی حیرت ہوگی — اور یہ روتی ہوئی نیاز محمد کی ماں کس قدر احسان مانے گی —— احسان توبہ! توبہ! خاتون کانپ کر پسیجتے پسیجتے بچی —— احسان کاہے کا — یہ تو اس کا فرض ہے کہ وہ اس دادی اماں کی لاش اٹھوا دے جو اسے جان سے عزیز رکھتی تھیں، جنہوں نے مرنے سے پہلے کلمے کے بجائے اس کے نام کی رٹ لگا دی تھی۔ وہ ان کی کچھ بھی تو خدمت نہ کر سکی، وہ ان کی محبت کا بدلہ کسی طرح تو نہ دے سکی، کاش اُدھ بیماری ہی میں ان کی تیمارداری کر لیتی، لیکن اس کی تو قسمت ہی میں نہ تھا۔ پھر بھی اب وہ اس آخری کام کو انجام دے سکتی ہے۔ وہ ساری پھر خرید لیگی، وہ اماں کی کڑوی باتیں بھی برداشت کر لیگی مگر یہ روپئے دادی اماں کی الفت پہ ضرور قربان کریگی۔ آہ! بیچاری — خلوص و محبت کے اچانک پیدا ہونے والے جذبات نے اس کی آنکھوں میں گرم گرم آنسو بھر دیئے۔

"نیاز محمد کی اماں" اس نے نیاز محمد کی ماں کا ہاتھ چھو کر چپکے سے پکارا۔

"ہاں بیٹیا!" وہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"یہ لو —" وہ پرس کھول کر روپئے نکالنے لگی — "یہ لو، جلدی سے انتظام کر لو —" خاتون نے دس دس کے تین نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دئے — "اگر اور ضرورت پڑے تو مانگ لینا، ہماری دادی اماں سے زیادہ عزیز نہیں ہے روپیہ" — نیاز محمد کی ماں نوٹوں کو مٹھی میں دبائے اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی، جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو کہ خاتون نے اسے اتنے بہت سے روپئے دئے ہیں سچ مچ کہ وہ اپنی ماں کی اس لاش کو اٹھوا سکتی جو صبح سے پڑی تھی اور اس کے شوہر کو کہیں سے قرض نہ ملا تھا اور نہ ملنے کی امید تھی۔

"ہائے ماں —" خاتون کو دیکھتے دیکھتے وہ پھر چیخ کر رو پڑی درد دیوانہ وار ٹکرا اپنی ماں کے پلنگ کی پٹی سے لپٹ گئی۔

"یہ لو —" اس نے نوٹ میت پہ پڑی ہوئی چادر پر بکھیر دئے — یہ لو تمہاری لاڈلی پوتی نے تمہاری لاش اٹھانے کا انتظام کر دیا — نہیں تو تمہاری لاش چندے سے اٹھتی، یا پھر سڑ جاتی تمہاری لاش پڑے پڑے — ہائے اماں تم خوش قسمت ہو، آنکھیں کھولو — ایک بار اپنی پوتی کو دیکھ لو۔ ہائے — ہائے —" نیاز کی ماں کلیجہ پھاڑ پھاڑ کر رو رہی تھی جیسے، اس کا سارا جسم بری طرح لرز رہا تھا، ماں کی لاش نہ اٹھوا سکنے کی بے بسی، ماں کے مرنے کا غم ادھر روپئے مل جانے کی خوشی، تینوں نے مل کر اس کے چہرے پر عجیب سی کیفیت پیدا کر دی تھی، ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے رنج و خوشی آپس میں ٹکرا کر اپنی منزلیں بھول گئے ہوں — محلے کی عورتیں ڈبڈباتی ہوئی متشکر نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں اور خاتون کی بڑی عجیب ہی حالت ہو رہی تھی، جیسے وہ متشکر نگاہیں اسے مع پلنگ کے آسمان کی طرف اٹھائے لئے جا رہی ہوں، زمین اور زمین پر پڑی ہوئی ہر چیز اس سے دور تر ہوتی جا رہی تھی۔ پھر اس کی یہ کیفیت اس وقت ختم ہوئی جب چھوٹے سے چوکور صحن میں اینٹوں کا چولہا بنا کر آگ جلا دی گئی تھی۔ پانی سے بھرا ہوا بڑا سا بدقلعی پتیلا چولہے پر رکھ دیا گیا تھا، آگ کے شعلوں کے سائے دیواروں پر کپکپا رہے تھے اور میت کو نہلانے کے لئے بھیانک اور جذبات سے عاری صورت کی موٹی غسالنی ایک طرف بیٹھی پان چبا رہی تھی

اور نیاز کی ماں دیوار کا سہارا لئے تنہا زمین پر بیٹھی لمبی لمبی آہیں بھر رہی تھی، دادی انا کے سرہانے سلگتے ہوئے لوبان کا دھواں دالان میں بے چین ہو رہا تھا۔ خاتون نے سہمی اور نفرت زدہ نظروں سے غسالنی کو دیکھا، عام انسانوں سے کس قدر مختلف تھا اس کا چہرہ۔ اس کا چہرہ جیسے پکار پکار کر کہہ رہا تھا "جب دوسروں کے کلیجوں میں آگ لگتی ہے تو میرے پیٹ کی آگ ٹھنڈی ہوتی ہے، مجھے کسی کے مرنے کا غم نہیں ہوتا۔ موت میرا کاروبار ہے، زندگی سے مجھے نفرت ہے" خاتون نے مارے نفرت کے اپنا چہرہ بازوؤں میں چھپا کر اچھی طرح دیوار کا سہارا لے لیا۔

اب اسے بے چینی سے انتظار تھا کہ کب دادی انا اٹھیں اور وہ اپنے گھر جائے، کئی گھنٹے کی مسلسل بے آرامی، روتا بسورتا ماحول، گرمی اور گھٹن، ساری جان میں چٹکیاں لگ رہی تھیں مگر ابھی تو میت کو نہلانے کے لئے پانی گرم ہو رہا تھا۔ خاتون اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے اونگھ گئی اور جب بے چین سی نیند اس پر پوری طرح چھا گئی تھی تو بہت سی چیخیں اسکے کانوں کے پار ہو گئیں وہ سوتے سے اچھل کر کھڑی ہو گئی ـــ دادی انا کو غسل دیکر کفنایا جا چکا تھا۔ نیاز کی ماں زمین پر پچھاڑیں کھا رہی تھی، محلے کی عورتیں اسے سنبھال رہی تھیں، ڈیوڑھی میں کئی بھاری بھاری آوازیں چیخ رہی تھیں "پردہ کر لو ـــ پردہ کر لو" خاتون دادی انا کے پاس کھڑی ہو کر ان کے کفن سے جھانکتے ہوئے پیلے چہرے کو حسرت سے دیکھنے لگی۔ موت کا زبردست پہرہ لگا ہوا تھا، شکست خوردہ زندگی کا کہیں دور دور پتہ نہ تھا۔ خاتون کی آنکھوں سے بے شمار آنسو بہہ نکلے۔

"پردہ کر لو، دیر ہو رہی ہے، پردہ کر لو" نیاز کا باپ اور کئی آدمی چیختے ہوئے اندر آنے لگے تو محلے کی عورتیں اپنے دوپٹوں میں چھپ چھپ کر بیٹھنے لگیں۔ نیاز کے باپ نے آگے بڑھ کر دادی انا کا چہرہ کفن میں چھپا کر تھیلی کے منہ کی طرح باندھ دیا، لاش کو آہستہ سے کئی آدمیوں نے سہارا دیکر اٹھا اور جب کلمہ پڑھتے ہوئے باہر جانے لگے تو نیاز کی ماں دیوانہ وار ان کے پیچھے بھاگنے لگی

"آہ! مت لے جاؤ، مت لے جاؤ میری ماں کو، چھوڑ دو خدارا"

نیاز کی ماں بے تحاشا چیخ رہی تھی، خاتون نے اسے باہر نکلنے سے بڑی مشکل سے روکا، میت نظروں سے اوجھل ہو گئی تو نیاز کی ماں زمین پر لیٹ کر سینہ کوٹتے کوٹتے جیسے بے ہوش سی ہونے لگی۔ محلے کی عورتوں نے پانی کے چھینٹے مارے دو گھونٹ پانی حلق میں ڈالا اور نیاز کی ماں نے آنکھیں کھول دیں "آہ۔ آہ جانے رے ـــ" وہ دیوار کا سہارا لیکر بیٹھتے ہوئے جیسے کراہنے لگی اور پھر ایک دم چپ ہو کر اس طرح آنکھیں بند کر لیں جیسے سو گئی ہو تھک کر ـــ محلے کی عورتیں، نمازی، پرہیزگار اور محلے کے ہر فرد سے محبت کرنیوالی دادی انا کی دائمی جدائی پر اس طرح چپ اور سوگوار بیٹھی تھیں جیسے ان سے ان کا سب کچھ چھین لیا گیا ہو لیکن تھکی ماندی خاتون اب صرف گھر جانے کے لئے سوچ رہی تھی، تھکا ہوا دل و دماغ دادی انا کے غم کو ان کے ساتھ دفن کر چکا تھا، آرام رہ رہ کے انگڑائیاں لے رہا تھا۔ لیکن اس سے کچھ کہتے نہ بن پڑتی جانے کے لئے، صرف اس خیال کی وجہ سے کہ سب کیا کہیں گے؟ لو ابھی تو دادی انا کو اٹھے چند منٹ گزرے ہیں، ابھی تو ان کی لاش قبرستان بھی نہ پہنچی ہوگی اور صاحبزادی کو اپنے آرام کی سوجھنے لگی۔ یہ وہی صاحبزادی ہیں جنکا کلمہ خدا کے بجائے پڑھا گیا۔ ہے ری دنیا ـــ اور خاتون اکتائی سی چپ چاپ بیٹھی کسمسا رہی تھی ـــ وہ وقت گزارنے کے لئے چراغ کی مدھم روشنی میں دالان کی ایک ایک چیز کو گھورنے لگی۔ چراغ کی ننھی سی کپکپاتی ہوئی سرخ زبان، تیل میں گرے ہوئے ننھے ننھے پتنگے۔ زمین پر لڑھکا ہوا پانی کا گلاس، کئی بسورتے ہوئے چہرے اور دادی انا کا وہ پلنگ جس پر ذرا دیر پہلے وہ جیسے چادر اوڑھے سو رہی تھیں۔ اب بغیر بستر کے وہ کھرا پلنگ کسی قدر سونا اور بھیانک لگ رہا تھا۔ جیسے اس نے بیچاری دادی کو نگل لیا ہو ـــ نیاز کی ماں ٹک ٹک سونے پلنگ کو دیکھ رہی تھی۔

"ہائے ـــ اے اماں ـــ" نیاز کی ماں پلنگ کو دیکھتے دیکھتے پھر رونے لگی۔

"نہ نہ ـــ اب مت روئیو نیاز کی اماں۔ روح پر عذاب ہوگا۔ یہ دعا کا وقت ہے" ایک عورت نے اٹھ کر نیاز کی ماں کے آنسو پونچھ دئے اور لمبی آہ بھر کر بالکل اس کے پاس بیٹھ گئی۔

"ہاں اب مت رونا، ایسی نیک بیوی کی جان پر عذاب ڈالنے سے کیا فائدہ، کون اب وہ ہمیں مل جائیں گی" دوسری عورت نے اپنی خشک آنکھیں دوپٹے کے پلے سے رگڑ ڈالیں۔ "ایسی محبت کرنیوالی تھیں مرحومہ کہ ان کے خیال سے کلیجہ پھٹنے لگتا ہے اور اب تو ایسا لگتا ہے کہ ہم سے پیار سے بولنے والا دنیا میں کوئی نہیں رہا" تیسری عورت بھی بول اٹھی ایک لمبی سسکی کے ساتھ اور نیاز کی ماں پھر بے تحاشہ رونے کی

تیاری کرنے لگی، اس کے ہونٹ زور سے کپکپانے لگے ـــــ خاتون کو غصہ آنے لگا کہ یہ سب چپ بھی کراتی ہیں اور پھر باتیں بھی ایسی کرتی ہیں کہ "خبردار چپ نہ رہنا روئے جاؤ ـــــ"

"آٹھ بچوں کی ماں ہوگئی مگر ایسی موت ہم نے نہ دیکھی ـــــ" جوتھی عورت بھی خاموش نہ رہ سکی تھی ـــــ نہ ایک ہچکی آئی، نہ موت کی تکلیف کا گھٹکا لگا بس بچوں کی طرح پٹ سے آنکھیں بند کرلیں۔ یہ سب ان کی نیکیاں تھیں کہ ذرا بھی خدا نے تکلیف نہ دی ورنہ ـــــ" وہ اور نہ جانے کیا کہنے والی تھی کہ نیاز محمد کی بھاری آواز نے بات کاٹ دی۔ وہ ٹاٹ کے پھٹے ہوئے پردے میں منہ ڈالے ڈیوڑھی سے کہہ رہا تھا

"بجیا میں آپ کے لئے تانگہ لے آیا ہوں، چلئے۔ رات بہت ہو رہی ہے"

"اچھا!" خاتون نے اپنے پاس پڑا ہوا برقع اٹھا کر اوڑھ لیا۔ نیاز کی ماں اٹھ کر خاتون سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر بڑی بے بسی سے رونے لگی "صبر سے کام لو نیاز کی اماں، رونے سے کیا فائدہ" خاتون نے اسے الگ کرتے ہوئے کہا۔ اور پھر ان عورتوں کی طرف ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر تیزی سے نیاز محمد کے پیچھے ہو لی۔

ایک بار پھر تانگہ بڑی بے بسی سے گڑھے دار سڑک پر دھچر دھچر کرتا ہوا جا رہا تھا اور ہر طرف سے گھرا ہوا ابر جیسے ہر لمحے برس کر خاتون کو پانی سے شرابور کر دینے کی دھمکیاں دے رہا تھا ـــــ بجلی کی پتلی سی تلوار جیسی لہر سیاہ ابر کو پھاڑتی ہوئی بار بار لہراتی اور غائب ہو جاتی ـــــ دکانیں بند ہو چکی تھیں، سڑک پر ویرانی نے ڈیرہ ڈال رکھا تھا، کہیں کہیں کوئی راہگیر کھانستا، کھنکھارتا یا گنگناتا ہوا نظر آجاتا یا پھر دم دبائے ہوئے کتے ـــــ نیاز محمد تانگے کی اگلی سیٹ پر بیٹھا سڑک کی سونی سونی روشنی میں نہ جانے کیا دیکھ رہا تھا۔ کبھی کبھی ایک طویل آہ اس کے لبوں پر دم توڑ دیتی اور خاتون بھیگنے اور بیمار پڑنے کے خیال سے بیزار ہو رہی تھی، لیکن گھر تو اس کا ابھی بہت دور تھا۔

"نیاز۔ دادی انا کی حالت کب سے خراب ہوئی تھی؟" خاتون وقت گزارنے کے لئے باتیں کرنے لگی۔ بجلی زور سے کوندی اور بادل گرج اٹھے۔

"آج صبح سے" نیاز نے بڑے کرب سے جواب دیا۔

"اور انتقال کس وقت ہوا؟"

کوئی چار بجے شام کو" نیاز نے ایک لمبی سانس لیکر کہا۔

"ہا ـــــ ہ ـــــ بیچاری دادی انا ـــــ" اور خاتون کو ایک دم وہی سر بلند کر دینے والا خیال آگیا ـــــ دادی انا خدا کے بجائے اس کے نام کا کلمہ پڑھتے ہوئے مریں "کیا کیا کہتی تھیں مرنے سے پہلے؟" نیاز سے پھر وہی بات سننے کی تمنا خاتون کو اکسانے لگی۔

"کچھ بھی تو نہ کہا سنا آہ! ہا ـــــ ہ ـــــ بس کلمہ پڑھتے پڑھتے خدا کو پیاری ہوگئیں"

"کس کا کلمہ، اوہ!" خاتون اپنے سوال پر ایک دم جھینپ گئی بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات تھی کہ دادی انا اس کا کلمہ پڑھتے ہوئے مریں۔ کس قدر نامعقول سوال کیا ہے اس نے۔

"کلمہ کس کا ہوتا ہے ـــــ؟ خدا رسول کا کلمہ تھا، آپ بھی بعض وقت بچوں جیسی بات کرتی ہیں بجیا" نیاز محمد زبردستی ایک تلخ سی ہنسی ہنس پڑا اور خاتون کا جیسے کسی نے کلیجہ نوچ لیا ہو،

"تم بھی ان کمبخت حقیر نیوں کی محبت پر یقین کرتی ہو، یہ تو محبت کا ڈھونگ رچا کر لوٹتی ہیں کمینیاں ـــــ" خاتون کو اپنی اماں کی بات یاد آگئی جب انھوں نے خاتون کے روپے بھیجنے پر ایک بار بہت بگڑ کر کہا تھا۔

"تیز چلاؤ تانگہ" خاتون تقریباً چیخ پڑی۔

"سڑاک ـــــ" چابک لہرا کر زور سے گھوڑے کی پیٹھ پر پڑی اور گھوڑا جیسے جان چھوڑ کر بھاگا۔ مگر خاتون کو محسوس ہو رہا تھا کہ تانگہ اور بھی بے بسی سے دھچر دھچر کر رہا ہے ـــــ بجلی زور سے کڑکی اور آسمان پر جیسے بہت سے بم پھٹ گئے۔

الطاف گوہر

نظم میں ٹیپ کا بند

حروف، الفاظ یا تراکیب کی تکرار سے احساس کی گہرائی اور شدت کا اظہار کرنا شاعری کی ایک مقدس روایت بن چکا ہے، کبھی یہ تکرار احساس کے سروں کو مختلف زاویوں سے ایک ہی مرکز پہ لانے میں مدد دیتی ہے اور یوں قاری کا ذہن کسی شعری تجربے کے کسی خاص پہلو سے پورے طور پر آشنا ہو جاتا ہے، اور کبھی محض ایک روایتی حربہ بن کر رہ جاتی ہے جس کا مقصد شعری چابکدستی دکھانے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔

شعر کی ایک غیر معروف تعریف یہ ہے "شعر لفظوں کے ایک ایسے امتزاج کا نام ہے جو کسی "روایتی تکرار" کے مطابق ہو۔ جہاں تک ہماری شاعری کا تعلق ہے روایتی تکرار سے مراد یہ ہے کہ ایک خاص بحر میں مختلف ارکان ایک مقررہ انداز سے دہرائے جاتے ہیں۔ اس تعریف کے اختیار کرنے میں مصلحت یہ ہے کہ شعر کے خالصتاً فنی پہلوؤں کی جانچ ہو سکے گی اور اس طرح نظم میں ٹیپ کے بند کی فنی اہمیت کا صحیح اندازہ لگایا جا سکے گا۔ "ٹیپ" موسیقی کی اصطلاح ہے جسے عموماً "انترہ" کہا جاتا ہے، مرثیے جب سوز کی طرح پڑھے جاتے تھے تو مسدس کے ہر بند کے پہلے چار مصرعے دھیمے سروں میں "استھائی" کے طور پر اور ہر پانچواں مصرع جو ٹیپ کا مصرعہ ہوتا تھا۔ "انترہ" کی طرح اونچے سروں میں پڑھا جاتا تھا۔ نظم میں ٹیپ کا بند تکرارِ لفظی کی واضح ترین صورت ہے، میں نے اس مضمون میں تکرار کی مختلف صورتوں کو یوں قائم کیا ہے کہ سب سے پہلے حرفوں کی تکرار، لفظوں کی تکرار، مصرع کے بعض ٹکڑوں کی تکرار اور پھر پورے مصرعوں یا شعروں کی تکرار۔

نفسیاتی طور پر تکرار، کی خواہش جذبات کے امڈ آنے کا نتیجہ ہے۔ جوں جوں جذبات کی لہر بڑھتی ہے یہ تکرار مختلف صورتیں اختیار کرتی ہوئی اور زیادہ ہو جاتی ہے اور ایک خاص سانچے میں ڈھلنے لگتی ہے، یوں بھی فطرت کی روانی میں تکرار کی کئی کیفیات ہیں، پرندوں اور جانوروں کی آوازوں میں، چاند اور سورج کی گردش میں، دل کی دھڑکن میں، سمندر کی بڑھتی اور پلٹتی لہروں میں جو ہر بار پھر کر ابھرتی ہیں اور ریت میں جذب ہو جاتی ہیں بعانی سے قطع نظر موسیقی بحر اور انسانی جذبات پر ایک یقینی اثر رکھتی ہے، مدہم مدہم نرم نرم آوازوں کی تکرار، تیز تیز آوازوں کی شدید تکرار مختلف تاثر پیدا کرتی ہے۔ لوریاں پلکوں سے آنکھ بوجھل کر دیتی ہیں اور پے بہ پے بجتے ہوئے ڈھول کا جنگی راگ نوجوانوں کے خون میں جوش پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح شعر میں تکرار جذباتی تاثر کو گہرا کرنے میں مدد دیتی ہے، سب سے پہلے حرفوں کی تکرار لیجئے، تکرار کی یہ نازک ترین صورت ہے، قاری پورے طور پر تاثر قبول کر لیتا ہے اور اسے یہ محسوس تک نہیں ہوتا کہ بعض حروف کی تکرار سے فن کار نے جذبے کی ترجمانی کے لئے کس قدر فائدہ اٹھایا ہے، اقبال کی نظم "دریائے نیکر کے کنارے ایک شام" دیکھئے ؎

خاموش ہے چاندنی قمر کی — شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
وادی کے نوا فروش خاموش — کہسار کے سبز پوش خاموش

کان شام کی سائیں سائیں سننے لگتے ہیں اور آنکھ بے آواز لہروں کو ٹوٹتے اور بڑھتے دیکھتی ہے "ش" اور "س" کے حروف اس لطیف انداز میں دہرائے گئے ہیں کہ ہر مصرع کے ساتھ ساتھ شام کے سکوت اور دریا کی روانی کا منظر خود بخود نکھرتا چلا جاتا ہے۔

اس کے بعد لفظوں اور مصرع کے بعض ٹکڑوں کی تکرار آتی ہے یہ تکرار حروف کی تکرار کی بہ نسبت زیادہ واضح ہوتی ہے، حروف کی تکرار میں شاعر سننے والے کو یہ محسوس نہیں ہونے دیتا کہ وہ ایک ہی آواز کی مختلف لہروں کو کیونکر ایک مخصوص بہاؤ میں ڈھالتا چلا جاتا ہے، وہ ایک ہی رنگ کے سایوں کو یوں ایک دوسرے میں سمو دیتا ہے کہ مختلف دھاریوں کا ایک مربوط نقش نظر آنے لگتا ہے۔ لیکن یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ سب ایک ہی رنگ کے دھبے کا کرشمہ ہے، اور جب دیکھنے والے کی توجہ اس بات کی طرف دلائی جائے تو اس کا ذہن چونک پڑتا ہے، لفظی تکرار کی سب سے بڑی مثال ردیف کی تکرار کی ہے۔ قافیہ اور ردیف کی مقبولیت کا

راں سی تکرار ہیں ہے، قافیہ کے الفاظ گو بدلتے رہتے ہیں لیکن صوتی کیفیت تکراری کی رہتی ہے، اس تکرار کی سب سے پرانی مثالیں وہ ہیں جہاں محض ایک خیال کو اجاگر کرنے کے لئے بار بار لفظوں اور مصرعوں کو دہرایا جائے، حبشہ کی ایک دُعا ہے:۔

اے خدا، یہ میں ہوں، یہ میں ہوں، یہ میں ہوں
اور میں دُعا کر رہا ہوں۔
اے خدا، یہ میں ہوں، یہ میں ہوں، یہ میں ہوں
اور میں دُعا کر رہا ہوں
میرا بھائی نہیں، میری بہن نہیں، میں خود ہوں اے خدا
اور میں دُعا کر رہا ہوں۔

ان دُعاؤں اور گیتوں میں ایک ہی لفظ یا ترکیب بار بار دُہرائی جاتی ہے حتیٰ کہ ایک انوکھا سا آہنگ پیدا ہو جاتا ہے اور کان قافیے یا ردیف کی کمی محسوس نہیں کرتے۔

اس کے بعد تکرار کی وہ صورت ہے جسے ہم ٹیپ کہتے ہیں، ایک ہی مصرع یا شعر ہر بند کے بعد دُہرایا جاتا ہے، ابتدائی صورتوں میں ٹیپ کا مصرع محض صوتی آہنگ پیدا کرنے کی غرض سے ہر بند کے آخر میں ٹانک دیا جاتا تھا، عموماً یہ مصرع بے معنی الفاظ کا مجموعہ ہوتا جسکا بند کے خیال سے کوئی تعلق نہ ہوتا تھا، اس سے خیال کی مختلف کیفیتیں علیحدہ ہو جاتیں اور ذہن کو ہر کیفیت کے بعد آسودگی کا ایک لمحہ مل جاتا، اردو شاعری میں یہ بات کبھی معمول نہیں ہوئی، اردو میں ٹیپ کا استعمال معانی اور خیال کی رعایت سے ہوتا رہا ہے، پرانے شاعروں میں سودا اور نظیر اکبرآبادی اور جدید شعرا میں اختر شیرانی اور حفیظ جالندھری نے اپنی نظموں میں ٹیپ کا استعمال کیا ہے۔
سودا کے ہاں ٹیپ مرثیوں میں خیال کی بڑھت اور غم کی شدت کا احساس ظاہر کرتی ہے۔ مخمس میں ٹیپ ایک مصرعہ ہے اور بین کی طرح مرثیہ کے مختلف بندوں کے ساتھ ساتھ بڑھتی آتی ہے ؎

جسکو دیکھو بھر رہی خونِ جگر سے ہر پلک   خاک سر پر کرتے ہیں مومن سرِ لے کا فر تلک
آج ماتم ہو رہا ہے لے زمیں سے تا فلک   سینہ کہہ کہہ کوٹتے ہیں آدم و جنّ و مَلک
واحسینا، واحسینا، واحسینا، واحسین
تن تو اسکا ان ہیں ہے آلودۂ گرد و غبار   سر لئے جاتے ہیں نیزے پر لعینِ نابکار
اہلِ بیت اونٹوں پہ گرد اسکے ہیں بے محمل سوار   ہر قدم کہتے چلے جاتے ہیں رو رو زار زار
واحسینا، واحسینا، واحسینا، واحسین

سودا کے ان مرثیوں میں ٹیپ کا ہر مصرع بند کے اختتام پر یوں آتا ہے جیسے درد و غم سے نڈھال پرانے واقعات اور باتوں کو یاد کرتے ہوئے بے قابو ہو کر کوئی بین کرنے لگے، "خدا کے واسطے زینب میرا جینا نہ چاہو تم" "بادشاہ مجھے بود و سہا مے مجھے" "ہے ہے اصغر لاڈلا" ٹیپ کے یہ مصرعے ذہن پر پے بہ پے ضربوں کا کام دیتے ہیں، جن سے غم ٹُٹ لَٹ بھڑکنے لگتا ہے، یوں محسوس ہوتا ہے جیسے شعلہ کچھ دیر تو اپنی جگہہ پر کھڑا جلتا رہے پھر یکلخت لپک اُٹھے اور ایک لمحہ کے بعد بے حال ہو کر اپنی جگہہ پر آجائے، ٹیپ کی وجہ سے یہ احساس مرثیے کے شروع سے آخر تک قائم رہتا ہے۔ مرثیہ کے تمام بند لہروں کی طرح بڑھتے ہیں اور ٹیپ کے مصرع میں جذب ہو جاتے ہیں۔ ان مرثیوں میں ٹیپ ایک دردناک لمحے کی طرح لوٹ لوٹ کر آتی ہے۔ مسدس ترجیع بند میں ٹیپ دو مصرعوں کی ہے لیکن تاثر کے لحاظ سے یہ پہلی قسم کی ٹیپ ہی کی طرح ہے، بعض دفعہ ان دو مصرعوں میں ایک مکمل خیال ہوتا ہے جو مرثیہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ نظیر اکبرآبادی کی نظموں میں ٹیپ کا شعر بنیادی خیال یا مرکزی کیفیت کا حامل ہوتا ہے اور نظم کے مختلف بند اسی مرکز کے ارد گرد گھومتے ہیں۔

"چاندنی رات"

صحن چمن میں واہ وا زور کھچی تھی چاندنی   چاند ہوا میں لیتا تھا اور کھلی تھی چاندنی
آیا تھا یار گلبدن پہن کے بادلہ زری   چمکے تھی تار تار میں مہ کی جھلک زری زری
بوس و کنار و جام و مے عیش و طرب ہنسی خوشی   اسمیں کہیں سے یک بیک مرغِ سحر نے بانگ دی
صبح ہوئی، گجر بجا، پھول کھلے، ہوا چلی
یار بغل سے اٹھ گیا، جی ہی کی جی میں رہ گئی
کیا ہی مزوں سے عیش کی رات تھیں کامیابیاں   چھوٹے تھیں ماہتاب کی نہروں میں ماہتابیاں
آگے چنیں تھیں صف بصف مے کی کئی گلابیاں   ہمکو نشے کی مستیاں یار کو نیم خوابیاں
سانسوں میں مضطربیاں آنکھوں میں بے حجابیاں   اسمیں فلک نے رشک سے ڈالی یہ کچھ خرابیاں
صبح ہوئی، گجر بجا، پھول کھلے، ہوا چلی
یار بغل سے اٹھ گیا، جی ہی کی جی میں رہ گئی

نظم کے تمام بند ٹیپ کے دوسرے مصرع کی وضاحت ہیں۔ یا تو یار کے بغل میں ہونے کی تفصیلات اور یا "جی کی جی" میں رہ جانے کا افسوس، ٹیپ کے پہلے مصرع کا لہجہ

ہی دو احساسات کے اثر سے بدلتا جاتا ہے اور بعض دفعہ تو شاعر کے لہجے سے صبح ہونے، گجر بجنے، پھول کھلنے، اور ہوا چلنے، جیسی حسین چیزوں سے بیزاری ظاہر ہونے لگتی ہے اس لئے کہ انہی کی وجہ سے تو یار بغل سے اٹھ گیا اور جی ہی کی جی میں رہ گئی۔ ٹیپ کی سب سے بڑی کامیابی یہی ہے کہ ہر بند کے بعد اس میں کوئی نیا اشارہ یا نئی کیفیت آجائے اور وہ محض میکانکی تکرار بن کر نہ رہ جائے۔ نظیر کی بعض نظمیں ٹیپ کی محتاج نہیں بلکہ ٹیپ کے بغیر شاید وہ اور نکھر جائیں، ان کی کئی نظموں کے ٹیپ کے مصرع کسی سبق آموز کہاوت یا نصیحت کی طرح ہیں جنکے ثبوت میں نظم کے مختلف بند دلیل کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں، اس لئے ان نظموں میں ایک بے جان سی میکانکیت آجاتی ہے۔ نظیر کی نظم "کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں" اس اعتبار سے بہت کامیاب ہے کہ نظم کے قریب قریب سٹر بند ہیں لیکن ان میں کہیں بھی ٹیپ گراں نہیں گذرتی۔ نظم میں برسات کے مختلف مناظر ہیں اور ہر منظر کے بعد ٹیپ کا مصرع ایک نیا لطف دیتا ہے۔ شاعر کے لہجے سے کبھی انتہائی سرور، کبھی غم، کبھی قہقہے، کبھی طنز، ہر قسم کے جذبات ظاہر ہوتے ہیں۔

مرثیوں میں ٹیپ کے کامیاب استعمال کی جدید ترین مثال ہسپانوی شاعر لارکا کا ایک مرثیہ ہے جس میں شاعر مرثیے کے پہلے حصے میں ہر مصرع کے بعد ٹیپ کا مصرع دہراتا ہے، ایک شام پانچ بجے شاعر کا جوان سال دوست جنگلی بھینسے سے لڑتے ہوئے ہلاک ہو جاتا ہے۔ موت کا لمحہ شاعر کے ذہن پر نقش ہو جاتا ہے اور اسی لمحے کی یاد اس کے جذبات کی لہروں کو کاٹتی چلی جاتی ہے، اس قدر مشکل تکرار کہ ہر مصرع کے بعد ٹیپ کا مصرع دہرایا جائے، اس کی مثال شاید ہی کوئی اور ہو۔ مرثیہ میں وقت کا عنصر اور سب باتوں پر غالب ہے۔ شاعر کا ذہن اس لمحے سے بار بار لپٹ جاتا ہے لیکن جوں جوں اور یادیں شاعر کے ذہن کو گھیرتی ہیں۔ ٹیپ کے مصرعہ میں نئے اشارے اور نئے معنی پیدا ہونے لگتے ہیں۔ غم طنز میں بدل جاتا ہے اور طنز گہری ہو کر انتہائی مایوسی کی صورت اختیار کر لیتی ہے، کامیاب ٹیپ کی سب خوبیاں اس میں موجود ہیں، خیال کے ساتھ ساتھ ٹیپ کے مصرعے میں لہجے کے نئے رنگ آجاتے ہیں، احساس کی شدت بڑھ جاتی ہے اور صوتی آہنگ کا تانا بانا مکمل ہو جاتا ہے۔

ٹیپ میں خیال کے ساتھ لہجے میں تبدیلی آنے کی ایک اچھی مثال سلام مچھلی شہری کی نظم "سڑک بن رہی ہے" ہے۔ نظم میں سڑک کبھی عورت، کبھی ستم زدہ مزدور، اور کبھی تہذیب کی علامت کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ اسی نظم پر بحث کرتے ہوئے میراجی لکھتے ہیں "ٹیپ کا مصرع اکثر ہر بند میں مفہوم کے ایک نئے سانچے کا لانا ہے، اس بات کو سمجھنے کے لئے مگر ہم ٹیپ سے پہلے ایک ایک لفظ کا اضافہ کر لیں تو آسانی رہے، مثلاً پہلے بند میں "ایک یا کوئی" دوسرے میں "کہ حرف بیان" تیسرے میں "کیونکہ" چھٹے میں "اور" اور ساتویں میں "گویا" — اس طرح یہیں ٹیپ یکساں یا بیزار کن نہیں معلوم ہوتی کیونکہ سڑک کا مفہوم بدلتا رہتا ہے"

کیفیت کے اعتبار سے اختر شیرانی کی نظم "جہاں ریحانہ رہتی تھی" اور "او دیس سے آنے والے بتا" میں ٹیپ کے مصرعے نہایت کامیابی سے استعمال ہوئے ہیں، "جہاں ریحانہ رہتی تھی" میں ٹیپ نہ صرف نظم کی موسیقی میں ترتیب پیدا کرتی ہے بلکہ شاعر کی موجودہ کیفیت اور ان تمام یادوں کو جو اس وادی سے وابستہ ہیں ایک مربوط خاکے میں پیش کر دیتی ہے۔

حفیظ جالندھری کے ہاں ٹیپ کی مثال "جاگ سوز عشق جاگ" ہے جس میں صدا کی لے ہر بند کے ساتھ بڑھتی ہے اور پھر مایوس ہو کر لوٹ آتی ہے۔ ٹیپ کے استعمال میں اس بات کی احتیاط لازم ہے کہ ٹیپ سننے والے پر گراں نہ گزرے۔ مثلاً حفیظ کی ایک نظم "ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا" نہ صرف بے معنی بلکہ پڑھنے والے کے لئے ایک مصیبت کا سامان بن جاتی ہے۔

آخر میں مجھے شاد عارفی کی نظم "برات" کا ذکر کرنا ہے ؎

گاؤں کنارے باجا باجے پیتم دیس بسانا ہوگا
آئے براتی، آئے ساجن
آنکھوں میں بٹھلانا ہوگا
دے کے تن من پیت کے گاہک
ہاتھ ان کے بک جانا ہوگا
گاؤں کنارے باجا باجے پیتم دیس بسانا ہوگا
دھمک رہی ہے دور سے ڈھولک
سوئے بھاگ جگانا ہوگا
چمک رہی ہے مشعل کی لو
اب تو مگن لگانا ہوگا

گاؤں کنارے باجا باجے   پیتم دیس بسانا ہوگا
گونج رہی شہنائی قرنا
من کی پیاس بجھانا ہوگا
دھن بنسی کی پریم کی دھن پر
اس میں گھل مل جانا ہوگا
گاؤں کنارے باجا باجے   پیتم دیس بسانا ہوگا
پھول کہیں بدمی کے ہنس کر
آنکھ سے آنکھ ملانا ہوگا
پریم کی بھینی بھینی خوشبو
ساجن گھر پھیلانا ہوگا
گاؤں کنارے باجا باجے   پیتم دیس بسانا ہوگا
چہل پہل دنیا کی تھوڑی
اس میں جی نہ کڑھانا ہوگا
ساجن کا پیغام یہی ہے
سکھ کا ساتھ نبھانا ہوگا

گاؤں کنارے باجا باجے   پیتم دیس بسانا ہوگا

اس نظم میں ٹیپ کا تجزیہ میراجی کے لفظوں میں سنئے "ٹیپ ہر بند کے بعد اپنے تواتر سے کسی طرح کی بیزاری یا پھیکاپن نہیں پیدا کرتی، اگرچہ گیت کی ٹیپ نغمے کے بڑھتے ہوئے بہاؤ میں ایک ٹھہراؤ لاکر تاثر کو گہرا کرتی ہے لیکن ٹیپ میں ایک عام کمزوری یہ بھی ہے کہ اس کی یکسانی بے جا محسوس ہوسکتی ہے، ...... لیکن یہاں دیکھئے کہ ٹیپ کی یکسانی فضائے بعید میں باجے کی آواز کے تواتر کا احساس گہرا کرتی ہے، اور تصویر کے بدلتے ہوئے رنگوں سے مرکزی آواز (یا رنگ) کو زائل نہیں ہونے دیتی۔"

(حلقۂ ارباب ذوق کراچی میں پڑھا گیا)

رباعیات

امیدوں نے پھر دھوم مچائی دل میں
پھر شامِ نشاط جگمگائی دل میں
یوں ناز سے کوئی مسکراتا آیا
اک چاندنی رات مسکرائی دل میں

دنیا ہے مجاز، اور حقیقت ہوں میں
تابندگیِ صبحِ سعادت ہوں میں
ہر ایک نفس میرا پیامِ الفت
دنیا میں مہکتی ہوئی جنت ہوں میں

پھولوں کو دمِ صبح جگانے والی
گلشن میں پیامِ زیست لانے والی
کیا تو ہی ڈبوتی ہے سفینے لاکھوں
اے بادِ صبا چمن میں گنگنانے والی

گہ علم کا بہتا ہوا دریا ہوں میں
گہ فکر کا پگھلا ہوا سونا ہوں میں
گہ بارشِ انوار ہوں مثلِ مہتاب
گہ مرگ کا روندا ہوا ذرہ ہوں میں

صفیہ شمیم (ملیح آبادی)

محمد اسلم

کراچی کی ہوائی بندرگاہ

کراچی کی ہوائی بندرگاہ کو دنیا کے ہوائی راستوں میں ایک اہم حیثیت حاصل ہے۔ یہ چار بین الاقوامی ہوائی سروسوں کے راستوں پر واقع ہے جو ایشیا، آسٹریلیا، یورپ اور امریکہ کے بیس ممالک میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کے علاوہ پاکستان اور ہندوستان کی کئی ہوائی لائنیں یہاں ختم ہو کر بین الاقوامی ہوائی لائنوں سے ملتی ہیں۔ پاکستان کے قیام سے اس بندرگاہ کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ اب یہ پاکستان کا ہوائی دروازہ ہے۔

اس ہوائی بندرگاہ کی تاریخ ہندوستان میں شہری ہوابازی کی ترقی سے شروع ہوتی ہے جیسا کہ ہم جانتے ہیں، شروع میں شہری ہوابازی کی ترقی کی رفتار بہت سست تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حکومت ہند مالی مشکلات میں مبتلا تھی اور ہوابازی کی اسکیموں کے لئے روپیہ نہ فراہم کر سکتی تھی۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں تجرباتی کوشش کی گئی اور بمبئی اور کراچی کے درمیان ایک لائن کھولی گئی۔ لیکن مالی نقصان کے باعث چند مہینوں کے بعد اسے بند کر دینا پڑا۔

لیکن جب انگلستان، فرانس، اور ہالینڈ نے اپنی مشرقی نوآبادیوں سے ہوائی تعلقات قائم کرنے کی غرض سے ہوائی لائنیں قائم کرنا شروع کیا تو ہندوستان کے نصیب بھی جاگے۔ یہ انگلستان اور آسٹریلیا کے درمیان کی لائن کی ایک اہم کڑی بن گیا۔ اس کے بعد ہوائی اڈوں، ریڈیو اسٹیشنوں اور رسدگاہوں کے سلسلے میں جو بین الاقوامی معاہدے ہوئے ان میں بھی ہندوستان کو شریک کیا گیا۔

ملک میں پہلی ہوائی لائن کراچی اور دہلی کے درمیان قائم کی گئی یہ دراصل لندن سے کراچی کے ہوائی راستے میں توسیع تھی۔ اس کے فوراً بعد ہوائی لائنوں کا ایک جال بچھ گیا۔ ان میں کچھ سروسیں ہفتہ وار تھیں اور کچھ ہفتہ میں دو بار۔ ان میں قابلِ ذکر لائنیں یہ تھیں۔ کراچی سے کلکتہ براہ لاہور و دہلی، بمبئی سے دہلی براہ اندور، بھوپال و گوالیار کراچی سے مدراس براہِ بمبئی جو بعد میں براہ ترچناپلی کولمبو تک بڑھا دی گئی۔ بمبئی سے ترواندرم جو کولمبو کی سروس سے ملانے کی غرض سے ترچناپلی تک بڑھا دی گئی تھی۔

مغرب سے ایشیا آنے والا جہاز سب سے پہلے کراچی میں پہنچتا تھا۔ اس لئے کراچی کو جو اہمیت حاصل تھی اس کا حکومت کو پورا احساس تھا۔ چنانچہ کراچی میں ایک شاندار ہوائی بندرگاہ بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ عمارت سنہ ۱۹۳۶ء میں بن کر تیار ہوئی۔ اس کی تعمیر میں اس بات کا خیال رکھا گیا تھا کہ یہ ہر لحاظ سے مکمل ہو۔ بلکہ اصل بات تو یہ ہے کہ اس بندرگاہ کے کام کی خوبی بڑی حد تک اسکی عمارت کے عمدہ ڈیزائن کی مرہونِ منت ہے۔ اس کی وجہ سے مختلف شعبوں میں اشتراک قائم کرنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔

عمارت کے وسط میں ایک بڑا ہال ہے جس کا قطر تقریباً پچاس فٹ ہے۔ اس میں سے تین بازو نکلتے ہیں۔ ایک میں کنٹرول روم اور انتظامی دفاتر ہیں۔ دائیں بازو میں کسٹم اور ڈاک کے شعبے ہیں اور بائیں بازو میں ایک ریسٹوراں ہے۔

پچھلی جنگ عظیم کی ضروریات کی وجہ سے اس بندرگاہ میں بڑی اصلاحات ہوئیں خصوصاً رسل و رسائل کے سلسلے میں بندرگاہ کی وسیع ضروریات کو پورا کیا گیا ہے۔ وہاں ریڈیو سے متعلق آلات، ہوائی جہاز کو روشنی دکھانے کے آلات سمت معلوم کرنے کے آلات اور ریڈیو سے چلنے والے ٹیلیفون فراہم کر دئے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ رات کی اڑان کے سلسلے میں جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، مثلاً بجلی سے روشن کئے ہوئے ہوائی میدان، ہوائی جہاز اترنے کے روشن اشارے، اترنے کی سمتیں بتلانے والے آلے اور بادنما وغیرہ کا بھی انتظام ہے۔ آگ بجھانے کے جو آلات یہاں نصب کئے گئے ہیں ان کا مشرق میں جواب نہیں ہے۔

ہوائی جہاز اترنے کے لئے میدان میں جو سڑکیں ہوتی ہیں وہ دوران جنگ میں مشرق بعید کے محاذ کی بڑھتی ہوئی ضرورت کے پیش نظر جلدی میں تعمیر کی گئی تھیں۔ جنگ ختم ہونے کے بعد بھی یہ سڑکیں ہوائی نقل و حمل کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو پورا کر رہی ہیں۔ ان کی لمبائی ڈھائی ہزار گز ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں کہیں بھی اس سے زیادہ لمبی ہوائی میدان کی سڑکیں نہیں ہیں۔ کلکتہ اور بمبئی کے ہوائی اڈوں کی سڑکوں کی لمبائی صرف دو دو ہزار گز ہے۔ آجکل جو جدید وزنی ہوائی جہاز دن میں کئی بار کراچی کی بندرگاہ پر اترتے ہیں ان کی ضروریات یہ سڑکیں خوب پوری کرتی ہیں۔ قاہرہ سے لیکر سنگاپور تک اس سے بہتر ہوائی میدان کوئی اور نہیں!

کراچی کی ہوائی بندرگاہ اس لحاظ سے لاثانی ہے کہ یہ بارہ مہینے استعمال ہو سکتی ہے۔ یہاں بارش کم ہوتی ہے اور ایسی آندھیاں جن سے فضا دھندلی ہو جائے کم اور طویل عرصوں کے بعد آتی ہیں۔

مغرب کی طرف سے ہندوستان اور پاکستان آنے والے سارے ہوائی مسافر کراچی پر اترتے ہیں۔ اس لئے یہاں ایک قرنطینہ ہسپتال قائم کیا گیا ہے اور خاص احتیاط کی جاتی ہے کہ ان ملکوں میں پیلا بخار نہ پھیلنے پائے۔

اس بندرگاہ میں ایک جدید اضافہ شاندار ہوٹلوں کا ہے۔ کے۔ ایل۔ ایم اور بی۔ او۔ اے۔ سی نے اپنی بعض عمارتوں کو جو جنگی ضروریات کے ماتحت بنائی گئی تھیں، اپنے مسافروں کے لئے ہوٹلوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ یہ ہوٹل بڑے سلیقے سے سجائے گئے ہیں اور ان میں ائیر کنڈیشنڈ کمرے، تیرنے کے حوض، کھیل کے میدان اور بچوں کے کھیلنے کے کمرے وغیرہ بھی فراہم کئے گئے ہیں۔

اس بندرگاہ کا رکھ رکھاؤ بین الاقوامی معیار کے مطابق ہوتا ہے۔ قاعدے کے مطابق مشرق کی طرف جانے والے ہر جہاز کا کراچی میں اترنا ضروری ہے۔ بین الاقوامی شہرت رکھنے والے لوگ اکثر کراچی سے گزرتے رہتے ہیں اور انھوں نے اس بندرگاہ کے آرام و آسائش کی تعریف کی ہے۔

فی الحال اس بندرگاہ پر مہینہ بھر میں آنے جانے والے ہوائی جہازوں کی تعداد تقریباً ایک ہزار ہے۔ اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ اب تک دن میں اترنے یا اڑنے والے ہوائی جہازوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ ۴۰۶۰ فی ماہ اور رات کو اترنے یا اٹھنے والے ہوائی جہازوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ ۵۰۴ فی ماہ رہی ہے۔ ہوائی آمد و رفت میں جو اضافہ ہوا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۱۹۳۹ء تک اس بندرگاہ پر آنے جانے والے ہوائی جہازوں کی تعداد ہفتے میں ۶۵ سے زیادہ نہ تھی۔ اس میں دن اور رات دونوں وقت آنے جانے والے جہاز شامل تھے۔

ہر ماہ تقریباً سولہ ہزار مسافر کراچی کی ہوائی بندرگاہ سے گزرتے ہیں اور ایک لاکھ پونڈ ڈاک اور سامان لایا اور لے جایا جاتا ہے۔ اب ہوائی جہاز سے سامان بھیجنے کا رواج بہت عام ہوتا جا رہا ہے چھوٹی چھوٹی قیمتی چیزیں مثلاً سونا، جواہرات اور بعض چیزوں کے نمونے مثلاً پلاسٹک کا سامان، گھڑیاں، قیمتی کھالیں اور کھیل کود کا سامان وغیرہ ہوائی ڈاک سے آنے جانے لگا ہے۔ سخت ضرورت کی صورت میں وزنی مشینیں بھی ہوائی جہاز سے لے جائی جاتی ہیں۔ سب سے وزنی چیز جو ہوائی جہاز کے ذریعہ کراچی پہنچی وہ جہاز کا آٹھ ٹن وزنی شافٹ تھا۔ ایک اور عجیب و غریب چیز اس بندرگاہ سے بذریعہ ہوائی جہاز بھیجی گئی تھی۔ وہ پنڈا نامی ایک چینی جانور تھا جو لندن کے عجائب گھر کے لئے بھیجا گیا تھا۔ ایک دفعہ مصنوعی دانتوں کا ایک سٹ بھی ہوائی جہاز سے بھیجا گیا تھا۔

چار بین الاقوامی کمپنیاں جن کے راستے کراچی ہو کر گزرتے ہیں۔ بی۔ او۔ اے۔ سی، پان امریکن ائیرویز، ائیر فرانس اور کے۔ ایل۔ ایم ہیں۔ ہفتے میں بی۔ او۔ اے۔ سی کی چودہ سروسیں اس بندرگاہ سے گزرتی ہیں۔ انگلستان سے آسٹریلیا جانے والا بی۔ او۔ اے۔ سی کا ہوائی جہاز کراچی سے سنگاپور تک کا ۳،۷۹۲ میل کا فاصلہ ایک اڑان میں طے کرتا ہے۔ پان امریکن ائیرویز کی سروس کلکتہ تک ہفتہ میں دو بار چلتی ہے۔ اس میں جو ہوائی جہاز استعمال ہوتا ہے وہ رفتار اور آسائش کے لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتا۔ کے۔ ایل۔ ایم ایمسٹرڈم اور بٹاویہ کے درمیان ایک سروس چلاتا ہے جو ہفتہ میں سات بار چلتی ہے۔ کراچی سے گزرنے والی بین الاقوامی لائنوں میں یہ سب سے پرانی ہے۔ اس کمپنی کے ہوائی جہاز بھی پان امریکن ائیرویز کے ٹکر کے ہیں۔ ایک اور مشہور بین الاقوامی لائن جو کراچی سے گزرتی ہے، ائیر فرانس ہے جو پیرس اور

سیگاؤں کے درمیان ایک ہفتہ وار سروس چلاتی ہے۔ کبھی کبھی دوسری بین الاقوامی کمپنیاں بھی اس بندرگاہ کو استعمال کرتی ہیں۔ ان میں ایک انگریزی کمپنی اسکائی ویز، ناروے کی کمپنی، برادران، اسکینڈینیویا کے ہوائی جہاز اور فلپائن ائرویز قابل ذکر ہیں۔

ملک کے اندر چار کمپنیاں باقاعدہ ہفتہ وار اور روزانہ سروسیں چلا رہی ہیں۔ یہ اورینٹ ائرویز، ائر انڈیا، انڈین نیشنل ائرویز اور ائر سروسز آف انڈیا ہیں صرف اورینٹ ائرویز پاکستان میں قائم ہوئی ہے۔ اس کی سروسیں کراچی اور ڈھاکہ کے درمیان ہفتہ میں دو بار کراچی اور لاہور کے درمیان براہ ملتان ہفتہ وار اور کراچی اور پشاور کے درمیان براہ لاہور ہفتہ میں تین بار اور کراچی اور بمبئی کے درمیان براہ احمد آباد ہفتہ میں چار بار چلتی ہیں۔ قوی امکان ہے کہ پاکستان میں صنعت و تجارت کی ترقی کے ساتھ یہ سروسیں روزانہ ہو جائیں گی۔

ائر انڈیا اور ائر سروسز آف انڈیا کراچی اور بمبئی کے درمیان روزانہ سروس چلاتی ہیں۔ پہلی سروس براہ احمد آباد اور دوسری براہ بھج اور جام نگر ہے۔ انڈین نیشنل ائرویز کی دہلی اور کراچی کے درمیان روزانہ سروس ہے۔ ان باقاعدہ سروسوں کے علاوہ دوسری کمپنیاں اکثر خاص طور پر ریزرو کئے ہوئے جہاز چلاتی رہتی ہیں۔ ان میں پاک ائرویز، دکن ائرویز اور انڈین اوورسیز ائرویز قابل ذکر ہیں۔

لیکن یہ بندرگاہ اپنی کامیابیوں پر مطمئن نہیں ہو گئی۔ چونکہ آجکل بڑے بڑے وزنی ہوائی جہاز بنانے کا رواج ہو چلا ہے اس لئے بندرگاہ کے میدان میں ایسی بڑی بڑی سڑکیں بنانے کی تجویز بھی زیر غور ہے جو تین لاکھ پونڈ تک کا وزن سہار سکیں۔ ایک اور بہت بڑا ہوائی جہاز رکھنے کا کمرہ بنے گا۔ عمارت کے انتظامی دفاتر والے بازو میں توسیع ہوگی ان اصلاحات کے بعد اس میں وہ تمام خصوصیات پیدا ہو جائیں گی جو بین الاقوامی شہری ہوابازی کے ادارے کے قوانین کے مطابق ایک اول درجہ کے بین الاقوامی ہوائی بندرگاہ میں ہونی چاہئیں۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو کراچی میں تاریخ کا ایک نیا باب کھلا۔ اسی دن ایک خواب حقیقت میں ڈھلا، وہ خواب جو سترہ سال قبل شاعر مشرق اقبالؒ نے دیکھا تھا، وہ خواب جس کی تکمیل کے لئے قائد اعظم محمد علی جناح سات سال سے ان تھک کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ اس دن دنیا کی پانچویں بڑی حکومت پاکستان کے قیام کا اعلان کیا گیا۔ کراچی اس نئے ملک کا دارالحکومت قرار دیا گیا اور مغرب کی پہلی ہوائی بندرگاہ ہونے کی وجہ سے یہ پاکستان کا ہوائی دروازہ بن گیا۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں پاکستان دو دور افتادہ خطوں سے مل کر بنا ہے۔ ایک مغربی پاکستان ہے اور دوسرا مشرقی پاکستان۔ ہوائی جہاز ان دونوں میں دائمی ربط و تعلق پیدا کرنے کا اہم ذریعہ ہیں۔ پاکستان کا ملک ابھی نشوونما کی منزلوں میں ہے۔ اس میں تجارت اور آبادی کے علاقے دور دور پھیلے ہوئے ہیں۔ پاکستان میں تجارت کی ترقی لازمی ہے اور اس ترقی کے ساتھ رسل و رسائل کی ترقی بھی۔ لہٰذا ہوائی جہاز کے ذریعہ اس وسیع ملک کے مختلف حصوں میں سماجی اور تجارتی تعلقات قائم ہوں گے۔

یہ یقینی امر ہے کہ پاکستان دنیا کے ہوائی راستوں میں بڑا اہم حصہ لے گا۔ جغرافیائی لحاظ سے ہوائی رسل و رسائل کی ہر بین الاقوامی اسکیم کے لئے یہ صحیح معنوں میں مشرق وسطیٰ کہا جا سکتا ہے۔ اگر اقتصادی اور تجارتی نقطۂ نظر سے ہوائی نقل و حمل کے لئے پاکستان کو مرکز بنا کر دو ہزار میل کی اڑان کی ضرورت کو ذہن میں رکھا جائے تو ملک میں بین الاقوامی ہوابازی کی ترقی کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔ مغرب میں کراچی کی ہوائی بندرگاہ کو مرکز مانا جائے تو دو ہزار میل کے نصف قطر میں پاکستان اور بحیرۂ روم کے درمیان کے سارے اہم تجارتی مرکز آ جائیں گے۔ اور ڈھاکہ کو مشرقی پاکستان کی آئندہ ہوائی بندرگاہ تصور کیا جائے تو اس مرکز سے دو ہزار میل کے نصف قطر میں برما، سنگاپور اور جنوبی چین کے سارے تجارتی مرکز آ جاتے ہیں۔ انگلستان اور آسٹریلیا کے درمیان کے ہوائی راستے پر بھی کراچی کی حیثیت ناگزیر ہے۔ اپنی جغرافیائی حیثیت کی وجہ سے دنیا میں تجارت اور بین الاقوامی تعلقات کی ترقی کے ساتھ ساتھ پاکستان اور بقیہ دنیا کی ہوابازی میں کراچی کی اہمیت بڑھتی ہی جائے گی۔

اگلے مہینے "ماہ نو" کا ایک خاص نمبر شائع ہوگا۔ اسکی تفصیل اسی شمارے کے صفحہ [illegible] پر ملاحظہ کیجئے۔

ادارہ

اطالوی سیّاح تاتاری دربار میں

فضل حق قریشی دہلوی

تیرھویں صدی عیسوی میں اطالیہ کے مشہور شہر وینس کو بحیرۂ قلزم میں اہم تجارتی بندرگاہ کی حیثیت حاصل تھی۔ اس کا جہاز مشرقی دنیا کے بہت سے ملکوں حتیٰ کہ کریمیا تک سامانِ تجارت لے کر جاتے اور وہاں کا مال لے کر واپس آتے تھے۔ سوداگر کبھی کبھی کچھ زیادہ دن ٹھیر کر ان غیر ملکوں کی سیر بھی کرتے اور واپسی پر وہاں کے عجیب و غریب حالات اپنے ہم وطنوں سے بیان کرتے تھے۔ ایسے ہی سوداگروں میں ایک شخص نکولو پولو تھا جو وینس کے ایک شریف گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اسکا تجارتی مرکز قسطنطنیہ میں تھا۔ لیکن خرید فروخت کا سلسلہ حسبِ دستور دور دراز ملکوں تک پھیلا ہوا تھا۔

۱۲۶۰ء میں نکولو پولو اپنے ذاتی جہاز میں مختلف قسم کا سامان بھر کر اپنے بھائی اور شریکِ کار مافیو پولو کے ہمراہ وینس سے قسطنطنیہ گیا اور کاروبار میں مصروف ہو گیا۔ تھوڑے دنوں بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ بحیرۂ اسود کی بندرگاہوں تک پہنچکر نئی سرزمینوں پر قسمت آزمائی کرنی چاہیے۔ اس خیال کے ماتحت وہ چلے تو گئے لیکن واپس آنا مشکل ہو گیا کیونکہ تاتاری علاقوں میں جن سے آگے ان کے ڈیرے ڈل چکے تھے آپس کی لڑائیوں کا بازار گرم ہو گیا تھا اور مسافروں خصوصاً اجنبی مسافروں کے لئے ان راہوں سے گزرنا غیر ممکن تھا۔

اس مجبوری کے عالم میں وہ اور آگے بڑھے اور خانِ اعظم قبلائی خاں کے دربار تک جا پہنچے۔ اس دوران میں انہوں نے ٹوٹی پھوٹی تاتاری زبان سیکھ لی تھی اس لئے آپس میں گفتگو کا سلسلہ بھی پیدا ہو گیا۔ یہ دونوں پہلے یورپین تھے جن کو خانِ اعظم کے دربار میں باریابی حاصل ہوئی۔ انہوں نے چند قیمتی جواہرات بادشاہ کی نذر کئے ایسے جواہر خان کی نگاہ سے کبھی نہیں گذرے تھے۔ اس لئے وہ بہت خوش ہوا اور ان کو کچھ عرصے وہیں قیام کرنے کے لئے کہا۔ اس نے مغربی دنیا کے رسم و رواج اور دین و مذہب کی بابت بہت سی باتیں دریافت کیں جو بالکل نئی اور عجیب تھیں۔ سب کچھ سُن کر اس نے خواہش ظاہر کی کہ اگر یورپ کے نصرانی مبلغین اس کے شہر میں آکر عیسائیت کا پرچار کریں تو بہت اچھا ہو۔ کیونکہ وہ خود نئے عقائد کا حامی ہو چلا تھا۔

نکولو پولو کے لئے یہ موقع غنیمت تھا۔ اس نے وقت سے فائدہ اٹھانا چاہا اور اس شرط پر کہ خانِ اعظم اپنے دستخطوں سے ایک ایسی حفاظتی چٹھی دیدے جس سے واپسی کے سفر میں ہر قسم کی سہولت میسر آسکے۔ اس نے وعدہ کیا کہ میں خود جاکر نصرانی مبلغین کو اپنے ساتھ لا سکتا ہوں۔ چنانچہ یہ شرط منظور کی گئی اور حسبِ ضرورت واپسی سفر کے انتظامات مکمل کر دئے گئے۔

تقریباً نو سال بعد اپریل ۱۲۶۹ء میں وطن پہنچکر نکولو پولو نے سنا کہ سابقہ پوپ کا انتقال ہو چکا ہے اور نئے پوپ کے انتخاب کا انتظار ہے۔ اس اثناء میں اس کی بیوی بھی مر چکی تھی اور اسکا اکلوتا بیٹا مارکوپولو جس کی عمر صرف پندرہ سال تھی، عزیز و اقارب کے ساتھ رہتا تھا۔ نئے پوپ کے انتخاب میں خلافِ معمول زیادہ وقت لگ گیا اور نکولو پولو جو اپنے کاروبار سے زیادہ اب اس نئی قسم کی سیاحت میں دلچسپی لینے لگا تھا، بہت بے چینی سے انتظار کرتا رہا۔ آخر یہ مرحلہ طے ہوا اور نئے پوپ کے سامنے خانِ اعظم کی دلی آرزو پیش کی گئی۔

پوپ قبلائی خاں کی عظمت و شان کا حال سن چکا تھا۔ اس لئے مذہبی تبلیغ کے علاوہ مشرقی دنیا کی ایک بڑی حکومت سے نئے تعلقات پیدا کرنے کا مسئلہ بھی اس کے لئے جاذبِ نظر بن گیا تھا۔ لہٰذا اس نے فوراً چند پادری کچھ متبرک چیزیں اور سلامتی کے پیغامات وغیرہ دیکر ۱۲۷۱ء میں ان سب کو ایک وفد کی صورت میں روانہ کر دیا۔

اس دفعہ مارکوپولو بھی اپنے باپ اور چچا کے ساتھ شریکِ سفر رہا۔ یہی مارکوپولو جو دنیا کے معروف ترین سیاحوں میں شمار ہوا اور جس کے سفرنامے کو تاریخی اور جغرافیائی اعتبار سے اتنی شہرت حاصل ہوئی کہ

صدیاں گزر جانے کے باوجود وہ آج تک قائم ہے۔

یہ قافلہ آرمینیا سے آگے بڑھنے نہ پایا تھا کہ انھیں معلوم ہوا کہ اس ملک اور قرب و جوار کے علاقوں میں سلطانِ مصر کی فوجوں نے قتل و غارت کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ یہ خبرِ وحشت اثر سنتے ہی عیسائی پادری اس درجہ خائف ہوئے کہ کارِ خیر کے جذبے کو ذہن سے نکال کر اور پوپ کے تحفے وغیرہ نکولو پولو کے سپرد کر کے فوراً اپنے وطن لوٹ گئے۔ معاملہ نازک تھا لیکن منچلے سیاحوں نے ہمت نہ ہاری اور وہ اصل راستہ چھوڑ کر دور دراز کے لق و دق صحراؤں کو طے کرتے شمال مشرق کی جانب چل پڑے تاکہ کسی نہ کسی طرح منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں۔ ان کا عزم راسخ تھا اس لئے کامیابی کی شمع ہر موڑ پر راستہ دکھاتی رہی اور وہ انجام کار تین سال کی طویل مدت کے بعد قبلائی خاں کے دربار میں جا پہنچے اور مفصل رودادِ سفر اس کے گوش گزار کر دی۔ وہ ان سے بہت خوش ہوا اور بہت سے انعامات دے کر انھیں ہمیشہ اپنے دربار میں رکھنے کا ارادہ ظاہر کیا۔

اس کی نظرِ عنایت سب سے زیادہ نوجوان مارکو پولو پر مبذول رہی کیونکہ وہ کم عمر ہونے کے باوجود بلا کا ذہین اور ذکی الفہم تھا۔ خانِ اعظم نے اسے اپنے خاص مصاحبوں میں شامل کر لیا تاکہ ہر وقت اس کے مشوروں سے مستفید ہونے کا موقع ملتا رہے۔ مارکو پولو نے بھی اپنے باپ اور چچا کی طرح بہت جلد تاتاری زبان سیکھ لی لیکن اس کے پیشِ نظر زبان سیکھنے کا مقصد صرف یہی نہیں تھا کہ آپس کی گفتگو میں آسانی ہو بلکہ اس نے پوری طرح عبور حاصل کر کے قدیم تاتاری روایات اور رسم و رواج کا مطالعہ بھی کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود بھی اسی رنگ میں ڈوب کر ایک حد تک تاتاری بن گیا۔ یہ چیز اور بھی خانِ اعظم کی خوشنودی کا باعث ہوئی۔

اس طرح ان تینوں سیاحوں نے سترہ سال قبلائی خاں کے دربار میں گذار دئے۔ اس دوران میں مارکو پولو بارہا سیاسی اور انتظامی امور کے سلسلے میں مغل سلطنت کے مختلف حصّوں میں سرکاری سفیر کی حیثیت سے سفر کرتا رہا۔ کئی مرتبہ اسے حدودِ ملک سے باہر بھی جانا پڑا کیونکہ بادشاہ کو اس پر پورا بھروسہ ہونے کے علاوہ یہ بھی یقین تھا کہ وہ حکومت کے مفاد کے لئے بہترین طرزِ عمل اختیار کرے گا۔

سترہ سال کے بعد آخر وطن کی محبت نے جوش مارا۔ عزیز و اقارب کی یاد بری طرح ستانے لگی۔ مستاتاری وضع قطع اختیار کر لینے کے بعد بھی بالکل تاتاری نہ بن سکے۔ قبلائی خاں بہت بوڑھا ہو گیا تھا اس لئے یہ لوگ چاہتے تھے کہ اس کے آخری وقت سے پہلے راہداری کے مناسب پروانے ساتھ لے کر وہاں سے چل پڑیں تاکہ وہ سردار جو ان کے غیر معمولی اقتدار پر جلنے لگے تھے، راہ میں ان کی مشکلات کا باعث نہ بنیں۔ لیکن خانِ اعظم نے ان کی جدائی کسی عنوان گوارا نہ کی اور انھیں اپنی مرضی کے خلاف وہاں رہنا پڑا لیکن جلدی ہی حسنِ اتفاق سے ایک خاص واقعہ رونما ہوا جس نے ان کی آرزو کو پامال ہونے سے بچا لیا۔

شاہِ ایران و خراسان کی ملکہ بلغان جو تاتار کے شاہی خاندان کی شہزادی تھی، اچانک فوت ہو گئی اور بادشاہ کو دوسری شریکِ حیات کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس نے قبلائی خاں کو پیغام بھیجا کہ اسی ملکہ کے خاندان کی کوئی اور شہزادی میرے حرم کے لئے بھیج دی جائے۔ چنانچہ اس نے فوراً ایک تعلیم یافتہ، باسلیقہ، نوجوان اور خوبصورت شہزادی کوکاتن کا انتخاب کیا اور ایک سفارت کے ساتھ اسے شاہِ ایران کی خدمت میں بھیجنے کے انتظامات کر دئے۔

شہزادی کے قافلے کو روانہ ہوئے آٹھ ماہ گذرے تھے کہ اتفاقاً راستے میں لڑائی کے بادل چھا گئے اور جملہ اراکین کے لئے آگے بڑھنا مشکل ہو گیا۔ اگر وہ ذرا توقف سے کام لیتے تو شاید صورتِ حالات سدھر جانے کے بعد سفر کو جاری رکھنا ممکن ہو جاتا مگر وہ بددل ہو کر لوٹ آئے اور راستے کی رکاوٹوں کی داستان سنا کر اپنی مجبوری ظاہر کر دی۔

انہی دنوں مارکو پولو جزائرِ شرق الہند کی ایک مہم سے واپس آیا تھا اور اس نے جنوب کے سمندری راستوں سے متعلق بہت سی نئی معلومات حاصل کی تھیں۔ چنانچہ اس نے قبلائی خاں سے کہا کہ اگر اس طرف سے ہو کر ایران پہنچنے کی کوشش کی جائے تو راستے میں کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا۔ یہ سفر اگرچہ طویل اور صبر آزما تھا لیکن بادشاہ کو راضی کر لیا گیا، اور اس نے روانگی کی اجازت دیدی۔ مارکو پولو، اس کے چچا اور باپ کو اس لئے ساتھ بھیجا گیا کہ وہ بحری راستوں سے واقف اور جہازرانی کے فن سے خوب آگاہ تھے۔ تاہم بادشاہ نے تاکید کر دی کہ اطالیہ میں اپنے عزیز و اقارب سے مل کر بہت جلد واپس آجانا۔

خشکی کی راہ چین کا سارا علاقہ طے کر لینے کے بعد ان سب لوگوں نے جہاز کا سفر اختیار کیا اور تین ماہ بعد جاوا کے ساحل پر لنگر انداز ہوئے۔

پھر ہندوستان کے ساحل کے ساتھ ساتھ بحرِ ہند کو طے کر کے ایران کی سرحد تک جا پہنچے۔ یہ بحری سفر اٹھارہ ماہ میں طے ہوا اور اس دوران میں جہاز کے بہت سے ملاح مر گئے۔

ایران میں انہیں معلوم ہوا کہ بادشاہ کا انتقال ہو گیا اور اس کا بھائی کم سن شہزادے کا مربی بن کر حکومت کر رہا ہے۔ جب اہلِ دربار کو تاتاری شہزادی کی آمد کا علم ہوا تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ اس کی شادی کم سن شہزادے سے کر دی جائے۔ اگرچہ رشتہ بے جوڑ تھا تاہم اسے عملی جامہ پہنا دیا گیا۔ مارکوپولو کو اس سے غرض نہیں تھی۔ وہ بہت جلد اپنے وطن جانا چاہتا تھا اس لئے اس کارِ خیر سے فارغ ہوتے ہی پھر رختِ سفر باندھا اور وینس کی سمت روانہ ہو گیا۔ ابھی وہ اور اس کے ساتھی راستے ہی میں تھے کہ انہیں قبلائی خاں کے مرنے کی خبر ملی۔

آخر کار وہ تینوں ۱۲۹۵ء میں اپنے وطن پہنچے اور جب چوبیس سال بعد اپنے گھر کی دہلیز پر قدم رکھنا چاہا تو رشتہ داروں نے انہیں دھتکار دیا۔ کیونکہ وہ عجیب و غریب تاتاری لباس میں ان کو پہچاننے سے قاصر تھے۔ چونکہ اب مارکوپولو وغیرہ اپنی مادری زبان بھی مشکل سے بول سکتے تھے اس لئے لوگوں کو ان کی اصلیت پر شبہ تھا تاہم چند حوالے پیش کرنے پر ان کی شناخت ہو گئی۔ اور وہ دوبارہ اپنے گھر میں آرام کی زندگی بسر کرنے لگے۔

لطف و آرام کے یہ لمحے زیادہ دیرپا ثابت نہیں ہوئے کیونکہ بہت جلد وینس اور جینوا والوں میں لڑائی چھڑ گئی اور مارکوپولو کو بھی جنگ میں حصہ لینا پڑا جس کا نتیجہ بہت جلد یعنی ۷ ستمبر ۱۲۹۶ء کو خود اس کے ملک کے خلاف برآمد ہوا۔ بہت سے لوگ قید ہو گئے۔ اسیرانِ جنگ کی فہرست میں مارکوپولو کا نام بھی شامل تھا۔ وہ سارے قیدی جینوا بھیج دیئے گئے جہاں تقریباً تین سال تک انہیں سخت سزا بھگتنی پڑی۔ اس نے بہت کوشش کی کہ تاوان ادا کر کے آزادی حاصل کرے مگر کامیابی نہ ہو سکی۔

انہی تین سال کے دوران میں پیسا کے ایک طالب علم رستی سیانو سے اس کی ملاقات ہو گئی جو اسی کے ساتھ قید تھا۔ وہ ادیب ہونے کے علاوہ سیاست کا بھی دلدادہ تھا۔ اس نے مارکوپولو سے سفر کے حالات سُن سُن کر اسے ترغیب دی کہ انہیں سلسلہ وار قلمبند کرے۔ چنانچہ وہ راضی ہو گیا اور ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی زبان میں اپنا سفرنامہ لکھوانا شروع کر دیا۔ اس کا حافظہ قابلِ تعریف تھا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ لائقِ تحسین یہ امر تھا کہ اپنے جملہ مشاہدات کو قلمبند کرتے وقت اس نے معمولی جزئیات کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ یہ سفرنامہ آج تک اربابِ علم کے لئے ایک نعمت سمجھا جاتا ہے۔

تھوڑے عرصے بعد جب اس مسودے کی ایک صاف نقل کسی خوشنویس نے تیار کی تو شروع صفحات میں دیباچے کے طور پر یہ چند سطور شامل کر دیں:۔

"یہ کتاب بظاہر ناقابلِ یقین باتوں کا مجموعہ ہے۔ جھوٹ سے زیادہ انہیں معجزات پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ مصنف کا بیان ہے کہ یہ بالکل سچ اور حقیقی واقعات ہیں لیکن میں ان کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔"

اور جب دوستوں نے مارکوپولو سے کہا کہ اس بیان کی تردید کرد تو اس نے صرف یہ کہہ کر ٹال دیا کہ میں نے تو آدھی باتیں بھی بیان نہیں کیں۔ اگر وہ سب قلمبند کر دی جائیں تو دنیا نہ جانے کیا رائے قائم کرنے لگے گی۔ اس میں شک نہیں کہ اس میں کہیں کہیں مبالغے سے کام لیا گیا ہے لیکن اس زمانے میں اطالویوں بلکہ سارے یورپ کے عام لوگوں کا علم اتنا محدود تھا کہ وہ معمولی باتوں کو بھی پُراسرار اور عجیب سمجھنے لگے۔ مثلاً اس کی یہ باتیں اُن کے لئے ناقابلِ یقین تھیں کہ جورجیا میں زمین کے اندر سے پانی کی مانند ایک ایسا رقیق مادّہ نکلتا ہے جو آگ لگانے سے بھڑک اٹھتا ہے اور صحرائے گوبی کے بعض پہاڑوں پر ریشوں کی صورت میں ایسا اون دیکھا گیا جو شدید آگ میں بھی نہیں جل سکتا۔ طفلس میں ریشمی اور موصل میں سوتی کپڑا اتنا مہین بُنا جاتا ہے کہ اس کے لباس کے نیچے کوئی اور چیز نہ پہنی جائے تو جسم صاف جھلکتا ہے۔ تبریز میں قالینوں اور کرمان میں شالوں کی بُناوٹ اتنی عجیب ہوتی ہے کہ مختلف رنگ کے سوتی یا اونی تاروں سے بیل بوٹے خود بخود پڑ جاتے ہیں اور انہیں بنا ری کے لئے چھاپنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ انہیں یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ چین میں سونے چاندی کی ایسی کانیں ہیں جو زمین کے اندر ہی اندر دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ نہ یہ بات سمجھ میں آتی تھی کہ دریائے جیحوں کے کنارے نیلم دیا قوت کے

ٹکڑے نکلتے ہیں۔ وسطی ایشیا کے بعض علاقوں میں اس نے ایسی بھیڑیں دیکھیں جن کی چوڑی چکلی اور موٹی دُموں [illegible] میں چربی بھری ہوئی تھی۔ بھلا یورپ کے جن لوگوں نے دنبہ کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا ہو وہ اس بات کو کس طرح مان سکتے تھے۔

خیر یہ باتیں تو ایسی ہیں کہ عام لوگ باور نہ کرسکے لیکن بعض واقعات خود اسکی سمجھ سے باہر تھے جنہیں وہ جادو اور کرشمے سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔ مثلاً جنوبی ایران کے دیہاتوں کا ذکر کرتے ہوئے اس نے لکھا کہ ان لوگوں نے اپنی بستیوں کے گرد اونچی دیواریں بنا رکھی تھیں تاکہ قریب کے صحرا میں رہنے والے جادوگر جو شیطان سے ساز باز رکھتے تھے، جب کالی آندھیاں بھیجیں تو انکی تھوڑی بہت روک تھام ہوسکے کالی آندھیوں سے مراد کہر اور گرد وغبار کے وہ طوفان ہیں جو صرف موسمی تغیرات کیساتھ رونما ہوتے تھے اور سادہ لوح دیہاتی یہ سمجھتے تھے کہ یہ تاریکی انہی بدمعاشوں نے پھیلائی ہے۔ اس نے چین اور ترکستان میں ایسے قبائلی لوگ دیکھے۔ جو سفر کرتے وقت اپنے گھروں کو ساتھ لیجاتے تھے۔ اس کی صورت یہ تھی کہ وہ لوگ کھالوں سے منڈھے ہوئے جھونپڑے بڑے بڑے ٹھیلوں پر بناتے تھے تاکہ جب ضرورت ہو، ان میں کھیتوں کے بیل جوت کر دوسری جگہ لے جایا جاسکے۔

خود خان اعظم قبلائی خاں کی مملکت میں اسے ایک عجیب رسم کا پتہ چلا جب کوئی سردار قبیلہ مرجاتا تو اس کی موت، خصوصاً جائے دفن کو صیغۂ راز میں رکھا جاتا۔ تجہیز و تکفین کا کام سب سے زیادہ معتبر تین چار آدمیوں کے سپرد ہوتا اور وہی جنازے کے ساتھ جاتے۔ اگر بدقسمتی سے کوئی شخص سنسان راستے میں جنازے کی گاڑی دیکھ لیتا تو اسے وہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ یہ احتیاط اس لئے برتی جاتی کہ سرداروں کے ساتھ قیمتی سامان دفن کرنے کا رواج تھا اور اندیشہ ہوتا تھا کہ لوگ قبریں کھود کر چوری نہ کرلیں۔

خان اعظم کے جاہ و جلال کو اور پُرشکوہ والے سرائی محل کے تزک و احتشام کو جن الفاظ میں بیان کیا ہے، ان کی نوعیت الف لیلیٰ کے فرضی قصوں سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ خان کے محل میں ضیافت کا کمرہ اتنا بڑا تھا کہ چھ ہزار مہمان بیک وقت بیٹھ کر کھانا کھا سکتے تھے۔ خالص سونے کے بنے ہوئے پانی پینے کے پیالے سب کے لئے الگ الگ ہوتے تھے۔ لذیذ و مرغن غذاؤں کی مہک اتنی لطیف ہوتی تھی کہ دور سے سونگھنے والوں کے دل بھی نہال کر دیا جاتے تھے۔ اس لئے خانساماؤں اور رکابداروں کے منہ پر کپڑا باندھ دیا جاتا تھا تاکہ وہ خوشبو انہیں چوری کی ترغیب نہ دے سکے۔

سالگرہ کے موقعہ پر خان ایسا لباس پہنتا جو سونے کے پترے جوڑ کر تیار کیا جاتا تھا۔ ایسے ہی بارہ ہزار لباس اس کے مصاحبوں کو ہر سال ملتے تھے نوروز کے موقعہ پر امراء اسے تحائف پیش کرتے لیکن شرط یہ ہوتی کہ کوئی تحفہ اکیاسی عدد سے کم نہ ہو۔ نیز اس کا رنگ سفید ہو۔ مثلاً اکیاسی عدد ہیرے یا موتی یا چاندی کے پترے یا ریشم کے تھان یا گھوڑے۔ اس روز مملکت کے ہر شخص کو سفید لباس پہننا پڑتا تھا کیونکہ سب لوگ اس رنگ کو بھاگوان سمجھتے تھے۔ خان کے پانچ ہزار ہاتھیوں پر اس کی بے پناہ دولت لاد کر نمائش کے طور پر منظر عام پر لائی جاتی اور شام کی دعوت میں ہر خاص و عام کو شریک کیا جاتا۔ جب کبھی وہ شکار کے لئے جاتا تو بیس ہزار شکاری اسکے ہمراہ ہوتے۔ ان میں سے دس ہزار کے لباس نیلے اور باقی کے سرخ ہوتے۔ دس ہزار شکاری کتے بھی ساتھ ہوتے۔ کمرے کے برابر لمبی چوڑی عماری میں جسے چار ہاتھی اٹھائے ہوتے، وہ زرین لباس پہن کر شیر کی کھالوں کے فرش پر ریشمی تکئے سے لگ کر بیٹھ جاتا۔ لوگ جنگل کے کونے کونے سے شکار گھیر کر لاتے اور وہ تیر مار کر اسے نشانہ بنا لیتا۔

مارکوپولو کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ڈاک کا انتظام بہت معقول تھا تین سو میل کے فاصلے پر ہر پیغام چوبیس گھنٹے میں پہنچ جاتا تھا۔ خرید و فروخت کے لئے سکوں کے علاوہ کاغذ کے نوٹ بھی چلتے تھے۔ جوتش اور جنتر منتر کے علوم کو بڑا فروغ حاصل تھا۔

۱۲۹۹ء کے آخر میں رہائی پاکر مارکوپولو وینس آیا تو اس کا سفرنامہ مکمل ہوچکا تھا کچھ عرصے بعد اس نے شادی کرلی اور پھر اپنے کاروبار میں لگ گیا۔ اس کی تجارت کو اتنی ترقی ہوئی کہ بہت جلد وہ اپنے ملک کے بڑے بیوپاریوں میں شمار ہونے لگا۔

[illegible] میں وہ اچانک بیمار ہوا اور وہی علالت اس کے لئے جان لیوا ثابت ہوگئی۔ چھ صدیاں گذر جانے کے بعد بھی اس کا نام صفحۂ تاریخ پر ثبت ہے اور رہتی دنیا تک ثبت رہے گا۔

> اگلے مہینے "ماہ نو" کا ایک خاص نمبر شائع ہوگا۔ اسکی تفصیل اسی شمارے کے صفحہ [illegible] پر ملاحظہ کیجئے۔
>
> ——— ادارہ

Now More than
Ever before
COCOGOLD
The Finest
OF ALL
COOKING
MEDIUMS
COCOGOLD
VACUUM REFINED
THE GANESH KHOPRA MILLS Co
Karachi

د۔ع۔

نئی کتابیں

قومی زبان

شائع کردہ انجمن ترقی اردو، پاکستان، کراچی۔ ملک کی تقسیم نے ہماری قومی زندگی کے جن مختلف شعبوں پر خاصی کاری ضرب لگائی ہے ان میں سے ایک اردو زبان ہے۔ قیام پاکستان کے بعد سے ملک کے اکابر اور عوام دونوں تمدن اور تمدن کی عزیز نشانیوں کے تحفظ، استحکام اور استقلال کے متعلق کچھ نہ کچھ سوچنے کو اپنا فریضہ جاننے لگے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ فرض کے اس احساس میں اب تک جذبات کی سطح سے بلند ہو کر عمل صحیح اور پُرجوش عمل کی بلندی تک پہنچنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ کام بہت بڑا ہے اور بہت دشوار بھی، اس لئے ضرورت ہے کہ اسے بڑا اور دشوار سمجھ کر انجام دینے کی کوشش کی جائے۔ پاکستان کے دارالسلطنت کراچی میں انجمن ترقی اردو کا قیام اور انجمن سے اس ہفتہ وار اخبار کا اجرا پاکستان میں اردو کے مستقبل کے لئے ایک نیک فال ہے۔

انجمن ترقی اردو، اردو کی ترویج و اشاعت کے لئے دہلی سے ایک پندرہ روزہ اخبار نکالتی تھی۔ اب کام کی اہمیت کے پیشِ نظر پاکستان کی قومی زبان کا یہ ترجمان ہفتہ وار نکلا کرے گا۔

قومی زبان کے افتتاحیہ سے پتہ چلتا ہے کہ انجمن اردو کالج کے قیام، تعلیم بالغان کی جماعتوں کے اجرا اور تصنیف و تالیف کے کام کی ترتیب و تنظیم میں مصروف ہے اور بہت جلد یہ سارے منصوبے عملی شکل اختیار کریں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ بابائے اردو مولانا عبدالحق اور شیدائے اردو پنڈت برجموہن دتا تریہ کی رہبری اور رہنمائی میں انجمن کا یہ ہفتہ وار اخبار سارے پاکستان میں اُردو کو ہر دل سے قریب کرنے کا وسیلہ بنے گا۔

ہفتہ وار رسالہ استقلال لاہور

استقلال کے نام سے محکمۂ تعلقات عامّہ حکومت پنجاب نے یہ ہفتہ وار رسالہ نکالنا شروع کیا ہے۔ رسالہ کا سائز $\frac{20 \times 30}{4}$ یعنی عام ماہوار رسالوں سے دوگنا ہے۔ اب تک اس رسالہ کے جو سات شمارے شائع ہو چکے ہیں انہیں دیکھ کر یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ مضامین کی افادیت اور دلچسپی اور ظاہری محاسن کی دلکشی کے اعتبار سے پاکستان اور ہندوستان میں اس آب و تاب کا ہفتہ وار رسالہ اس سے پہلے کبھی نہیں نکلا۔ رسالہ کے مضمون نگاروں میں پاکستان کے سارے اچھے لکھنے والے موجود ہیں۔ مضامین کے ساتھ مناسب موقعوں پر تصویریں بھی شامل ہیں اور تقریباً ہر صفحہ کی تزئین فنکارانہ انداز میں دو تین رنگوں میں کی گئی ہے۔ کتابت، طباعت، ترتیب اور مضامین کی فراہمی میں اس درجہ اہتمام کے باوجود ۲۴ صفحہ کے اس رسالہ کی قیمت صرف ۴ آنے ہے ــــ رسالہ کی باقی خصوصیت سے زیادہ یہ بات حیرت انگیز ہے۔

سالنامہ ادبِ لطیف ۱۹۴۸ء

قیمت ؁۔ ادبِ لطیف کا یہ سالنامہ بھی سابقہ سالناموں کی طرح اچھے شاعروں، افسانہ نگاروں اور ادیبوں کا ایک ایسا اجتماع ہے جسے دیکھ کر نظر لگنے کا اندیشہ پیدا ہوتا ہے۔ ملک کی تقسیم نے اُردو کے ادیبوں کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر دیا اور اکثر ادیب اپنی اپنی مملکتوں میں سیاسی اور جذباتی پابندیوں میں گھرے ہوئے انتشار اور اضطراب کی سختیاں جھیل رہے ہیں۔ اہلِ مجبوری میں یہ افتراق اور یہ بُعد ان کے لئے روح فرسا ہے۔ پاکستان میں ادبِ لطیف گنتی کے ان رسالوں میں سے ایک ہے جو ہندی اور پاکستانی ادیبوں کو یکجا رکھنے کا خوشگوار اور ضروری فرض انجام دے رہے ہیں۔ ادبِ لطیف کے اس سالنامہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ اس کی محفل میں پاکستان اور ہندوستان کے ہندو، مسلمان اور سکھ ادیب شانے سے شانہ ملائے بیٹھے ہیں۔ سب کے دلوں پر گندے ہوئے حالات کا اثر ہے اور سب میں انسانیت کی قدروں کو زندہ رکھنے کی ایک بے کلی اور تڑپ موجود ہے۔

آسان کہانیوں کا دوسرا سلسلہ

عبدالواحد صاحب سندھی اردو کے اُن گنتی کے لکھنے والوں میں ہیں جنہوں نے اپنی ساری خدمات بچوں کے لئے وقف کر دی ہیں۔ ان کی لکھی ہوئی بہت سی کہانیاں اکثر بچے شوق سے پڑھتے اور خوش ہو ہو کر ایک دوسرے کو سناتے ہیں۔ سندھی صاحب نے اب ۹۔۱۰ برس کے بچوں کے لئے ۵ کہانیوں کا یہ دوسرا سلسلہ شائع کیا ہے۔ حسبِ معمول کہانیاں بہت دلچسپ ہیں اور آسان زبان میں لکھی گئی ہیں۔ کتابوں کی لکھائی چھپائی عمدہ ہے۔ ہر کتاب ۳ آنے میں سنٹرل بک ڈپو بندر روڈ کراچی سے مل سکتی ہے۔

ماہِ نو

(خاص نمبر)

جلد ۱ شمارہ ۵-۶
اگست ستمبر ۱۹۴۸ء
مدیر ——— وقار عظیم

قیمت فی پرچہ عہ
چندہ سالانہ صہ

تصاویر

کچھ اپنی باتیں

آج ۱۴ اگست کو پاکستان نے اپنی آزادی کا ایک سال پورا کیا ہے۔ اور آج سارے پاکستان میں جشن آزادی منایا جا رہا ہے۔ یہ جشن پاکستانیوں کی جد و جہد، ان کے عزم، استقلال اور ایثار کی زندگی کی پہلی سالگرہ ہے۔ پاکستان کو اپنی پہلی سالگرہ مبارک ہو۔ مسرت و شادمانی کے اس روز سعید کو "ماہ نو" قارئین کی خدمت میں یہ خاص نمبر پیش کر رہا ہے۔

چہ کند بے نوا ہمیں دارد

ماہ نو کے اس خاص ضخیم شمارے میں قارئین کو ان کی دلچسپی کی گوناگوں چیزیں ملیں گی، جذباتی، اصلاحی، علمی، تاریخی اور ادبی۔ ان میں سے اکثر چیزیں ایسی ہیں جن میں آزادی کے بارہ مہینوں کی زندگی کی کوئی نہ کوئی جھلک ہے۔ کچھ ایسی ہیں جن میں پاکستان کے درخشاں مستقبل کا عکس ہے۔ کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں، جو شعر و ادب کی روایات کے تسلسل کی نشانیاں ہیں۔

نثر و نظم کے اس مجموعے میں ہر طرح کے لکھنے والے شریک ہیں۔ نئے پرانے، ہندو مسلمان، ہندوستانی پاکستانی۔ ماہ نو کی یہ ساری تابانی و درخشانی انہیں لکھنے والوں کی ذات کا پرتو ہے۔ ماہ نو ان سب اہل قلم حضرات کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہے، جو ماہ نو کو رفتہ رفتہ بدر کامل بنانے میں مصروف ہیں۔

وہ حضرات بھی ماہ نو کے شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے اس کی ہمت افزائی کے لیے مضمون لکھنے کا وعدہ فرمایا لیکن کسی نہ کسی ناگزیر سبب کی بنا پر [illegible] بعض ان حضرات نے ہماری درخواست پر اپنے نگارشات قلم ارسال فرمائے لیکن [illegible] خاص نمبر میں شامل نہ ہونے [illegible] تنگ دامانی اس کی وسعت کا ساتھ نہ دے سکی۔

گلچیں بہار تو ز داماں گلہ دارد

ایسے حضرات سے ہم معذرت خواہ ہیں اور ان کی کرم فرمائی کے [illegible]

"ماہ نو" کا یہ خاص نمبر اس کا پانچواں شمارہ ہے۔ مختلف طرح کے پڑھنے والوں نے پچھلے چار شماروں کا خیر مقدم جس فراخ دلی سے کیا ہے وہ ماہ نو کے لیے حوصلہ افزا ہے۔ ماہ نو کی کوشش ہے کہ وہ [illegible] زیادہ سے زیادہ محبوب بنا سکے۔ وہ اپنی اس کوشش میں [illegible] اور پڑھنے والوں سے پورے تعاون کا طلبگار ہے۔ ممکن ہے کہ [illegible] ایسے [illegible] فخر کے ساتھ [illegible] اقبال [illegible] ترجمان سمجھ سکے۔

ہر اک مقام سے آگے گزر گیا مہ نو
کمال کس کو میسر ہوا ہے بے تگ و دو

"تگ و دو" اس وقت ہماری قومی زندگی کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ ماہ نو اس تگ و دو میں آپ کا شریک ہے۔

اس شمارے کے مضامین سے متعلق ایک بات عرض کر [illegible] [illegible] مضامین میں شاید آپ کو کہیں کوئی [illegible] آپ [illegible] [illegible] [illegible]

آزادی کے بارہ مہینے

ویسے تو قوموں کی زندگی میں کچھ بڑی مدت نہیں ہوتی۔ لیکن بارہ مہینے کی یہ چھوٹی سی مدت اگر سختی و آزمائش، خوف اور اندیشہ اور پھر اس سختی اور اندیشہ کے بیچ سے نکلنے کی مسلسل جد وجہد میں گذری ہو تو یہی بارہ مہینے بارہ برس معلوم ہونے لگتے ہیں۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے ۱۴ اگست ۱۹۴۸ء تک کا زمانہ پاکستان اور پاکستانیوں کے لئے بڑی سختی، بڑی آزمائش، بڑے خوف و اندیشہ اور اس سے بھی زیادہ بڑی قربانی، عزم، استقلال اور جانبازی کا زمانہ تھا۔ ایک ایسا زمانہ جس میں پاکستان والوں نے بڑی بڑی اذیتیں اٹھا کر اپنی بلند حوصلگی اور عالی ہمتی سے ہر اذیت کو مستقبل کی جاں بخش زندگی کا پیش خیمہ بنایا اور اس طرح ایک بہت بڑی جنگ کی ابتدائی منزل میں شکست کے آثار کو فتح کا [illegible] دکھلایا۔ پاکستان کی تاریخ کے یہ بارہ مہینے اس کی تاریخ کے پرشکوہ مہینے ہیں۔

آزادی کی اس جد وجہد کی روداد بڑی طولانی ہے۔ ۱۸۵۷ء کا غدر اس طویل زنجیر کی پہلی کڑی ہے۔ اس سال مسلمانوں اور ہندوؤں نے مل کر آزادی کے حصول کی پہلی ناکام کوشش کی۔ اس بغاوت کے انداز نے انگریزوں پر یہ بات ظاہر کر دی کہ ہندوستانیوں کو محض قوت کے زور سے دبانا آسان نہیں ان کے ساتھ سیاست سے کام لینا پڑے گا۔ چنانچہ ۱۸۶۱ء سے لیکر ۱۹۰۹ء تک حکومت ہندوستانیوں کو مختلف طرح کے سیاسی کھلونوں سے بہلاتی رہی۔ انہیں مرکز اور صوبوں کی حکومتوں میں تھوڑی بہت نمائندگی ملتی رہی۔ ۱۹۱۶ء میں کانگریس نے مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب کا حق تسلیم کر لیا اور کانگریس اور مسلم لیگ کے معاہدہ نے انگریزوں کو اپنی پالیسی بدلنے پر مجبور کیا اور ۱۹۱۹ء کے قانون میں ہندوستان نے قانونی اور سیاسی آزادی کی طرف ایک اور قدم بڑھایا۔ اس کے بعد عدم تعاون کی تحریک شروع ہو گئی اور ہندو اور مسلمان دونوں نے کاندھے سے کاندھا ملا کر اس تحریک کو پوری قوت سے آگے بڑھایا، اور ہندوستانیوں کے اس باہمی عزم و جرأت نے انگریزی راج کی بنیادیں ہلا دیں۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ اتحاد زیادہ دیر تک قائم نہ رہا۔ ہندو اور مسلمان میں مذہب، تہذیب اور طرز زندگی کا جو بنیادی فرق ہے اس کے علاوہ ہندوؤں کے [illegible] ان ساری چیزوں کے پیدا کئے ہوئے رویّے نے مسلمانوں کو اس بات پر مجبور کیا کہ سیاسی آزادی کے لئے وہ اپنا محاذ الگ قائم کریں۔ ہندوؤں کے ایک خاصے با اثر طبقے نے شدھی اور سنگٹھن کی تحریک شروع کی، مسلمانوں کو ہندو بنایا جانے لگا اور ہندوؤں کی فوجی تنظیم شروع ہوئی کہ مسلمانوں کو تشدد کی اس قوت سے کچلا جائے۔ ان چیزوں نے ہندوؤں کی طرف سے مسلمانوں کا اعتماد بالکل ختم کر دیا اور ۱۹۲۹ء میں جب سائمن کمیشن ہندوستان آیا تو مسٹر جناح نے مسلمانوں کی طرف سے "۱۴ مطالبات" پیش کئے۔ سائمن کمیشن نے اپنی رپورٹ پیش کی لیکن اس پر کوئی عمل درآمد نہیں ہوا۔ ۱۹۳۰ء میں گاندھی جی نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کی، مسلمان اس میں شریک نہیں ہوئے، اور تحریک ناکام رہی اور آخر گاندھی جی اس بات پر راضی ہوئے کہ گول میز کانفرنسوں میں شریک ہو کر اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی جائے۔ کانفرنسیں ہوئیں اور اس کے بعد ۱۹۳۵ء کا مشہور قانون پاس ہوا۔ ۱۹۳۶-۳۷ء میں اس پر عمل درآمد شروع ہوا اور کانگریس نے گیارہ میں سے سات صوبوں میں اپنی وزارتیں قائم کیں۔ مسلم لیگ وزارتوں میں شریک ہونے کے لئے تیار تھی لیکن کانگریس نے اسے وزارتوں میں شامل نہیں کیا۔ ادھر کانگریسی وزارتوں کے قیام نے ہندو عوام کے دلوں میں یہ خیال پیدا کر دیا کہ ہندو راج قائم ہو گیا ہے۔ انہوں نے ہر ممکن طریقہ سے مسلمانوں کی دل آزاری کی۔ کانگریسی وزارتوں کے صوبوں میں بلوے فساد ہوئے اور مسلمانوں کو جان و مال کا سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ یہ سلسلہ تقریباً تین برس تک جاری رہا اور آخر مارچ ۱۹۴۰ء میں لاہور کے اجلاس میں مسلم لیگ نے ہندوستان کی تقسیم کا ریزولیشن منظور کر کے پاکستان کا مطالبہ کیا۔

۱۹۴۲ء میں جب انگریزوں کو یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ جاپان مشرقی ہندوستان پر حملہ کر دے گا تو انہوں نے سیاسی گتھی سلجھانے کے خیال سے سر اسٹیفورڈ کرپس کو ہندوستان بھیجا۔ مارچ ۱۹۴۲ء میں کرپس نے ایک تجویز پیش کی اور اس میں مسلمانوں کی اکثریت کے صوبوں کے لئے ایک علیحدہ وفاق کے حق کو تسلیم کیا۔ کانگریس نے کرپس کی تجویز منظور نہیں کی۔

ستمبر ۱۹۴۴ء میں گاندھی جی اور مسٹر جناح کی گفتگو ہوئی لیکن گاندھی جی نے علیحدگی کے حق کو نہیں مانا اور گفتگو ناکام رہی۔

جولائی ۱۹۴۵ء میں لیبر حکومت برسرِ اقتدار آئی۔ ۱۹۴۶ء کے شروع میں ہندوستان کے انتخاب شروع ہوئے اور مسلم لیگ نے پاکستان کے مطالبہ کی بنا پر مرکز اور صوبوں کے الکشنوں میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی۔ اب انگریزوں اور کانگریس کو مسلمانوں کا پاکستان کا حق تسلیم کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ مارچ ۱۹۴۶ء میں کیبنٹ مشن ہندوستان آیا۔ کانفرنسیں ہوئیں لیکن کانگریس اور مسلم لیگ کے نقطۂ نظر کے اختلاف کی وجہ سے مشن کو خود اپنا فیصلہ دینا پڑا۔ فیصلہ کے دو جزو تھے۔ ایک فوری عمل درآمد کے لئے اور دوسرا طویل عرصہ کے لئے۔ لیگ نے دونوں جزو قبول کر لئے۔ کچھ رد و قدح کے بعد کانگریس نے بھی انہیں مان لیا۔ لیکن فوراً ہی اس کی ایسی تاویلیں شروع کر دیں کہ مسلم لیگ کو اپنا فیصلہ بدلنا پڑا اور اس نے پھر ہندوستان کی تقسیم کا غیر مشروط مطالبہ شروع کر دیا۔ اگست ۱۹۴۶ء میں کانگریس نے مرکز میں عارضی حکومت قائم کی۔ اکتوبر میں لیگ بھی اس میں شریک ہو گئی۔ ۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کو برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر اٹیلی نے دارالعوام میں ایک بیان دیتے ہوئے کہا کہ جون ۱۹۴۸ء سے پہلے برطانیہ ہندوستان کو آزادی دے دے گا۔ مارچ ۱۹۴۷ء میں لارڈ لوئی ماؤنٹ بیٹن وائسرائے ہو کر دہلی آئے اور انہوں نے کانگریس اور لیگ کی گتھی کو سلجھانے کا اہم کام اپنے ہاتھ میں لیا۔ اب چونکہ کانگریس نے بھی یہ محسوس کر لیا تھا کہ مسلمان پاکستان لئے بغیر نہ مانیں گے۔ اس لئے اس نے اس کی مخالفت چھوڑ دی۔ اس کی کوشش اب صرف یہ تھی کہ پاکستان کا رقبہ جتنا بھی کم کیا جا سکے اچھا ہے۔

۳ جون ۱۹۴۷ء کو ماؤنٹ بیٹن پلان کا اعلان ہوا، اور اس میں صاف لفظوں میں کہا گیا کہ پاکستان مسلمانوں کا حق ہے لیکن اس بات کا فیصلہ عوام کی رائے سے ہونا تھا۔ چنانچہ مسلمان اکثریت کے سارے صوبوں نے پاکستان کے حق میں فیصلہ دیا۔ چونکہ بنگال اور پنجاب کے پورے صوبے مسلمانوں کی اکثریت کے علاقے نہیں تھے۔ اس لئے ان صوبوں کی حد بندی کے لئے ایک باؤنڈری کمیشن مقرر کیا گیا، جس کے صدر سر سیرل ریڈ کلف تھے۔ کمیشن کا فیصلہ انصاف پر مبنی نہ تھا۔ اس لئے پاکستان کے عوام نے اس کی سخت مخالفت کی لیکن مسلم لیگ اسے قبول کرنے کا وعدہ کر چکی تھی اس لئے بادلِ ناخواستہ اس نے اسے قبول کر لیا۔

۱۸ جولائی ۱۹۴۷ء کو برطانوی پارلیمانٹ نے ہندوستانی آزادی کا قانون پاس کیا اور اعلان کیا کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو انڈیا اور پاکستان کی دو آزاد مملکتیں ظہور میں آ جائیں گی۔

۱۹ جولائی کو ہندوستان کی عارضی حکومت ختم کر دی گئی اور اس کے بجائے پاکستان اور انڈیا کی عارضی حکومتیں قائم ہوئیں جس کے تقریباً ایک مہینہ بعد پاکستان کی آزاد حکومت کا افتتاح ہوا اور مسلمانوں کو وہ سرزمین مل گئی جس کے وہ طالب تھے۔

۱۴ اگست کو آزادی کا روزِ روشن طلوع ہوا اور مسلمانوں کے لئے زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

۱۴ اگست کے بہت پہلے سے عملہ اور سامان کی تقسیم شروع ہو گئی تھی مرکزی حکومت کے ملازم تھوڑے تھوڑے کر کے اسپیشل ٹرینوں میں دہلی سے کراچی آ رہے تھے ـــــ بڑا جوش تھا، آنے والوں میں بھی اور رخصت کرنے والوں میں بھی۔ آنے والے اپنی آزادی کی سرزمین میں خدمت کا جذبہ لے کر آ رہے تھے، اور انہیں رخصت کرنے والے ان کے اس مشن کی کامیابی کی دعائیں کرتے ہوئے انہیں رخصت کر رہے تھے۔ اس طرح کی سات گاڑیاں کراچی پہنچ چکی تھیں۔ ۹ اگست کو آٹھویں گاڑی دہلی سے چلی۔ رات کو دس بجے کے قریب بھٹنڈے سے ذرا آگے اس کے راستے میں بم رکھے گئے۔ گاڑی کے تین چار ڈبے الٹ گئے۔ اور اس کے بعد سے مشرقی پنجاب میں فسادوں کی آندھی چلنی شروع ہو گئی۔ ریلوں میں، گاؤں اور شہروں میں ہر جگہ بے دریغ مسلمانوں کا خون بہایا جانے لگا۔ لاکھوں آدمی قتل ہوئے۔ ان میں سے بھی کہیں زیادہ بے سروسامانی کی حالت میں پناہ لینے پاکستان کی طرف چل دیئے اور پاکستان بنتے ہی لاکھوں بے یار و مددگار زخمی خستہ حال، ننگے بھوکے مسلمانوں کے قافلے مغربی پاکستان میں داخل ہونے شروع ہو گئے۔ اور ستمبر کے شروع میں دہلی پر قیامت ٹوٹی۔ اور دلی والے ۱۸۵۷ء کا غدر بھول گئے۔ شہر سے نکل کر لاکھوں مسلمانوں نے پرانے قلعہ کی سخت زمین پر پناہ لی۔ قسمت نے بڑے بڑے دولت والوں کو گداگر بنا دیا۔ [illegible] کی آن بان ختم ہو گئی اور دیکھتے دیکھتے دلی ویرانہ بن گئی۔ قلعہ میں محبوس لاکھوں مسلمان بے کسی کے عالم میں خدا کا سہارا ڈھونڈتے تھے اور ان میں سے اکثر کی نظر پاکستان کی طرف تھی جسے موقع ملتا وہ اسپیشل ٹرین میں بیٹھ کر روانہ ہو جاتا۔ راستہ میں گاڑیوں پہ حملے ہوتے اور جو بچ رہتے وہ پاکستان پہنچ جاتے۔ جو لوگ پاکستان پہنچ چکے تھے ان کے عزیز اقارب ہندوستان میں تھے۔ اپنی جان بچ جانے کے بعد بھی اپنے جگر کے ٹکڑوں کا خیال دل میں ٹیسیں پیدا کر رہا تھا۔ وحشت ناک خبریں پڑھتی جاتی تھیں۔ ملک کا سارا نظام درہم برہم تھا۔ ریلیں چلنی بند ہو گئی تھیں اور لوگوں پر ایک مایوسی کی [illegible] ایک انتشار تھا، ایک بے بسی تھی۔ پناہ گزینوں کے قافلے پیدل ہی آ رہے تھے اور صرف مشرقی پنجاب سے آنے والے مہاجروں کی تعداد ۱۵ اگست تک [illegible] سات لاکھ سے زیادہ ہو گئی۔ ستمبر سے دسمبر تک مہاجر اسی طرح بڑے بڑے قافلوں میں پیدل، بیل گاڑیوں پر، ریلوں میں مغربی پنجاب آتے اور [illegible] داخل ہوتے رہے یہاں تک کہ مارچ ۱۹۴۸ء تک ان کی مجموعی تعداد [illegible] کے قریب پہنچ گئی۔ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے لئے مہاجرین کی دیکھ بھال اور

یہ مسئلہ اتنا سخت بھی اور نازک تھا کہ حکومتیں کئی مہینے تک کسی اور کام کی طرف توجہ نہ کر سکیں۔ ریلیں صرف مہاجروں کو اِدھر سے اُدھر لے جا رہی تھیں غذا کے گودام خالی ان کے کھانے پینے کا سامان مہیا کرنے میں لگے ہوئے تھے، سرکاری فائلوں کو راستے میں آگ لگا دی گئی تھی۔ حکومت کی ساری مشین کو نئے سرے سے چلانا تھا ہزاروں ملازموں کو مفت تنخواہیں دی جا رہی تھیں۔ تجارت کے سارے راستے بند تھے۔ صوبائی حکومتوں کی آمدنی کے سارے وسائل مسدود تھے اور اس بات کا اندیشہ تھا کہ پاکستان بہت جلد مالی کشمکش میں مبتلا ہو جائے گا۔ ادھر لوگوں کے دلوں میں ایک اور اندیشہ جگہ پاتا جا رہا تھا۔ ایک خطرناک پروپیگنڈے نے لوگوں کو اس وہم کا شکار کر دیا تھا کہ پاکستان کی فوجی حالت اچھی نہیں ہے اور بہت جلد ہندوستان پاکستان پر حملہ کر کے اسے فتح کر لے گا۔ یہ حال تو مغربی پاکستان میں تھا۔ مشرقی پاکستان کی صورت اس سے قدرے مختلف تھی۔ وہاں مہاجرین کا مسئلہ بالکل نہ تھا لیکن بعض دوسرے مسائل اتنے سخت تھے کہ مشرقی پاکستان کی ابتدائی زندگی کے چند مہینے بڑی کشمکش میں گزرے۔ حکومت نے جوں ہی انتظام کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی اسے اندازہ ہو گیا کہ صوبہ کی غذائی حالت بہت نازک ہے۔ طوفانوں اور آندھیوں سے ہونے والی فصلوں پر بہت برا اثر ڈالا ہے۔ ریلوے کا سارا ہندو عملہ جا چکا تھا مسلمان عملہ اب تک ہندوستان میں تھا اس لئے غلہ کو ادھر سے اُدھر لے جانا ناممکن تھا۔ غرض تباہی کے ابتدائی مہینے مغربی پاکستان کے لئے بھی سخت بحران کے تھے اور مشرقی پاکستان کے لئے بھی۔ اور دشمن خوشی سے بغلیں بجا رہے تھے کہ پاکستان چند دن کا مہمان ہے۔

لیکن شکر ہے کہ بحران کا یہ دور ختم ہو گیا۔ اور اب سال بھر گزر جانے کے بعد ہم پاکستان کی زندگی کے مختلف شعبوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں چند مہینے پہلے کی مایوسی اور اضمحلال کے بجائے لوگوں کے دلوں پر حوصلہ، امید اور یقین کی درخشانی جھلکیاں نظر آتی ہے۔ لوگ پاکستان کو بحران کے ایک سخت دور سے نکل کر مستقبل کی تعمیر اور استحکام کی طرف قدم بڑھاتے دیکھ رہے ہیں۔ اور یہ امید افزا مستقبل کئی دقتوں سے نپٹ کر پیدا کی ہے۔ سختی کے بڑے سے بڑے دور میں بھی حکومت اور عوام میں بہت سے لوگ ایسے تھے جو پاکستان کے مستقبل کی طرف سے کبھی مایوس نہیں ہوئے۔ وہ کبھی نہ دشمن کے پروپیگنڈے سے متاثر ہوئے اور نہ حالات کے ہوش میں فرق آنے دیا۔ انہوں نے اپنی مستقل مزاجی اور جرأت سے راستے کے روڑے ہٹا کر انہیں گل بداماں بنایا اور آج اپنے گرد و پیش کی زندگی کو غور سے دیکھنے والا آسانی سے یہ کہہ سکتا ہے کہ پاکستان زندگی کی ہر راہ میں ترقی کی طرف گامزن ہے۔ سب سے پہلے مہاجرین کو لیجئے۔ ۱۰ مارچ ۱۹۴۹ء تک مغربی پاکستان میں ۶۵،۹۹،۰۸۶ مہاجر داخل ہوئے۔ حکومت اور عوام نے مل جل کر انہیں مختلف طرح کے کاموں پر لگا دیا ہے اور جو کھیت، کارخانے، دکانیں اور دوسری طرح کے کاروبار ہندو اور سکھ چھوڑ کر گئے تھے وہ مناسب طریقہ سے مہاجرین میں تقسیم کر دیئے گئے ہیں اور انہوں نے اب اطمینان کی زندگی بسر کرنی شروع کر دی ہے۔ اب بھی ۷،۸۰ لاکھ مہاجر کیمپوں میں ہیں۔ وزارت مہاجرین اور صوبوں میں مہاجرین کی کونسلیں ان کی بحالی کے انتظام کی طرف سے غافل نہیں ہیں۔

مہاجرین کی اس کثرت اور بعض دوسری رکاوٹوں نے پاکستان کی غذائی حالت، تجارت، ریل اور ڈاک پر بہت برا اثر ڈالا تھا لیکن اب ایک سال گزر جانے کے بعد ان میں سے ہر ایک کی حالت حد درجہ تشفی بخش ہے۔ پنجاب اور سندھ کی جو زمینیں کچھ عرصہ خالی پڑی رہیں انہیں مہاجرین نے جوتا بویا اور پچھلی فصلوں کا شکر ہے اناج کا اتنا ذخیرہ اکٹھا کر لیا کہ پاکستان نے اپنی ضرورت پوری کرنے کے بعد کچھ غلہ دوسرے ملکوں کو دیا اور اس کے بدلے میں اپنی ضرورت کی چیزیں حاصل کیں۔ اس سال کی فصل کے متعلق وزیر خوراک نے جو پیشین گوئی کی ہے وہ اور بھی حوصلہ افزا ہے۔

پاکستان بنتے ہی سب سے زیادہ زور پاکستان کی ریلوں پر پڑا۔ ریلوں کا پہلا کام ریلوے کے ڈیڑھ لاکھ ملازموں کو اِدھر سے اُدھر لے جانا تھا۔ اور دوسرا کام مہاجرین کو پاکستان پہنچانا۔ شروع شروع میں پاکستان کے پاس نہ کوئلہ تھا، نہ مرمت کا ضروری سامان۔ کام کرنے والے بھی بہت کم تھے۔ اکثر ملازمین اب تک ہندوستان میں تھے۔ ان مجبوریوں کی وجہ سے حکومت کو بہت سے اسٹیشن بند کرنے پڑے۔ ریلوں میں بھی ۱۲ فی صدی کمی کر دی گئی۔ بعض برانچ لائنوں پر گاڑیاں روزانہ کے بجائے تیسرے چوتھے روز جانے لگیں۔ مہاجرین کی کثرت نے بلا ٹکٹ چلنے کی وبا بہت عام کر دی تھی۔ اس سے ریلوے کو بہت سخت نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ لیکن حکومت نے رفتہ رفتہ ان ساری دقتوں پر قابو پا لیا۔ کوئلے کے بجائے تیل کے انجنوں میں برتے جا رہے ہیں۔ انگلستان اور امریکا سے ضرورت کا کوئلہ آنا شروع ہو گیا ہے۔ ایران اور ترکی سے بھی کچھ کوئلہ ملنے کی امید ہے۔ عملہ بھی آگیا ہے اور پوری مستعدی سے کام کر رہا ہے۔ جو ریلیں مختلف دقتوں کی وجہ سے بند کر دی گئی تھیں مئی ۱۹۴۸ء تک وہ سب کی سب پھر شروع کر دی گئی ہیں۔ ریلوں کی آمدنی بڑھ گئی ہے۔ پرانی پٹریاں بدلی جا رہی ہیں۔ بہت جلد ریلوں کے نئے راستے بنانے کی بھی تجویز ہے۔ ریل کا جو سفر چند مہینے پہلے تک قیامت کا سماں پیش کرتا تھا اس میں اب پھر پہلے کی سی سہولتیں اور آسائشیں پیدا ہو گئی ہیں۔

ڈاک کے محکمے کی حالت اس سے ابتر تھی۔ پاکستان سے ہندوستان جانے والا

اسٹاف چلا گیا تھا اور ہندوستان سے پاکستان آنے والا ابھی نہیں آسکا تھا۔ ریلوں پر حملے شروع ہو گئے اور نومبر ۱۹۴۷ء تک ڈاک کا انتظام بہت خراب رہا۔ منی آرڈر اور رجسٹریوں کی آمدورفت بند رہی۔ پھر رفتہ رفتہ ریلیں چلیں، عملہ آیا، پاکستان نے ہندوستان اور دنیا کے ۱۰ دوسرے ملکوں سے ڈاک کے معاہدے کیے۔ اب ڈاک کا انتظام پھر پہلے جیسا ہو گیا ہے۔ پاکستان میں ٹریننگ کے مرکز کھل گئے ہیں تاروں کا جال پہلے سے زیادہ پھیل گیا ہے ٹیلیفونوں کی تعداد بڑھا دی گئی ہے اور تار اور ٹیلیفون کے جو راستے ہندوستان ہو کر گذرتے تھے، وہ پاکستان کے علاقوں میں سے ہو کر گذرتے ہیں۔

جو تجارت تقسیم کے بعد سے، ہندوؤں اور سکھوں کے چلے جانے اور، ریل اور ڈاک کے انتظام کی خرابی کی وجہ سے بالکل رُک کر رہ گئی تھی اس کی اب یہ حالت ہے کہ چٹاگانگ اور کراچی کے بندرگاہوں سے درآمد اور برآمد کی تعداد تقسیم سے پہلے کی تعداد کے مقابلہ میں کئی کروڑ روپیہ زیادہ ہو گئی ہے۔ پاکستان کے سن اور اس کی روئی کی مانگ دنیا کے ہر چھوٹے بڑے ملک میں بڑھ رہی ہے اور اس کے بدلے میں پاکستان کو اس کی ضرورت کا سامان اور کارخانے قائم کرنے کے لئے مشینیں دی جا رہی ہیں۔ بہت جلد پاکستان کی زراعتی معاشیات میں صنعتی اضافے ہونے شروع ہو جائیں گے۔ اس سلسلہ میں پاکستان نے امریکا سے ۵ مئی کو ایک معاہدہ کیا ہے جس کی رو سے امریکا نے پاکستان کو اس کی ضرورت کی مشینیں قرض دینے کا وعدہ کر لیا ہے حال ہی میں [illegible] نے بھی اس طرح کی پیش کش کی ہے۔

پاکستان کے مالیات کے متعلق مارچ ۱۹۴۸ء سے پہلے بڑے اندیشوں کا اظہار کیا جاتا تھا لیکن پاکستان کے پہلے سرپیش مالیہ نے یہ شبے دور کر دیے اور اب اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے قیام اور پاکستان کے اپنے سکّوں کے اجرانے اس کی معاشی بنیادیں ہمیشہ کے لئے مستحکم کر دی ہیں۔

پاکستان کی فوجیں تقسیم کے بعد اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔ انھیں اُن کے حصہ کا ضروری سامان بھی نہیں ملا تھا لیکن اب بکھری ہوئی فوجیں اکٹھی ہو گئی ہیں۔ فوجی، بحری اور ہوائی فوجوں کی تنظیم و ترتیب ہو چکی ہے۔ ہر محکمہ میں تربیت و تعلیم کے مرکز کھول دیے گئے ہیں۔ فوجی افسروں کی ٹریننگ ہو رہی ہے، اور موزوں نوجوانوں کی بھرتی برابر جاری ہے اور اب یہ صورت ہے کہ پاکستان کے شہری اپنی فوجی قوت اور تنظیم پر پورا اعتماد اور یقین کر سکتے ہیں۔

پاکستان نے پچھلے ایک سال میں اپنی بین الاقوامی حیثیت بھی مستحکم کر لی ہے وہ اقوام متحدہ کا ممبر ہے اور اس کے نمائندے بین الاقوامی مختلف کمیٹیوں کے اجلاسوں میں اپنی قابلیت کا سکّہ جما چکے ہیں۔ پاکستان نے دنیا کے سارے بڑے ملکوں سے سیاسی تعلقات قائم کئے ہیں اور دنیا کے ۲۲ ملکوں کے سفیر اور نمائندے مستقل طور پر پاکستان میں آگئے ہیں۔ اس کے اپنے سفارتی نمائندے بھی امریکا، انگلستان، مصر، ایران، افغانستان، ہندوستان اور برما بھیجے جا چکے ہیں۔ باقی سفارتیں بھی رفتہ رفتہ قائم کی جائیں گی۔ پاکستان نے پچھلے سال کئی اہم بین الاقوامی کانفرنسوں میں اپنے نمائندے بھیج کر دنیا کی سیاست میں اپنی آواز پہنچا دی ہے۔ دنیائے اسلام میں اُسکی قیادت تسلیم کی جا رہی ہے، اور اس طرح پاکستان بین الاقوامی دنیا میں ایک باعزت مقام حاصل کر رہا ہے۔ پاکستان اپنی ایک سال کی زندگی میں صرف اپنے جال کی گتھیاں سلجھانے میں نہیں لگا رہا۔ اس نے اس اہم زمانہ میں اپنے مستقبل کی تعمیر کے لئے بنیادیں مضبوط کی ہیں۔ اس نے لوگوں کے شبھے اور اندیشے دور کر کے انھیں یقین کی راہ دکھائی ہے۔ ان کی مایوسی کو امید سے بدلا ہے۔ انھیں دوست اور دشمن میں امتیاز کرنا سکھایا ہے اور اس طرح اس ایک سال میں پاکستان کو سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا ہے کہ اس کے عوام پر اس پروپگنڈے کا فریب کھل گیا جو پاکستان کو اس کے سفر کی پہلی ہی منزل میں ختم کر دینے کا تہیہ کر چکا تھا۔

یہ سچ ہے کہ پاکستان میں مہاجرین کا مسئلہ ابھی پوری طرح حل نہیں ہوا۔ یہ بھی سچ ہے کہ ملک کو صنعتی بنانے کے لئے جو اقدامات ہوئے ہیں ان کی رفتار کسی قدر سست ہے۔ لیکن بے حد دشوار حالات میں جو کچھ ہوا ہے اسے دیکھ کر یقین کیا جاسکتا ہے کہ مستقبل قریب میں یہ مسئلے بھی حل ہو جائیں گے۔

پاکستان کی زندگی میں سکون اور اطمینان کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس نے اپنی اس سخت زندگی میں تمدنی سرگرمیوں کی طرف سے غفلت نہیں برتی۔ شروع کے چند مہینے اس لحاظ سے بے شک بالکل ویران نظر آتے ہیں لیکن اب علمی، ادبی، اور فنی سرگرمیوں کی ضرورت پاکستان کے مختلف طبقوں کے دلوں میں پیدا ہو چکی ہے۔ رسالوں اور کتابوں کی اشاعت کا کام علم، ادب اور فن کی انجمنوں کا قیام، نئے مدرسوں اور کالجوں کے قیام کے ساتھ نصاب تعلیم کی ترتیب کی کوشش، دوسرے ملکوں سے تمدنی روابط پیدا کرنے کا شوق یہ اور اس طرح کی بہت سی تمدنی سرگرمیاں ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستان نے اپنے آزادی کے پہلے سال کا صرف اچھی طرح کیا ہے لیکن یہ سب کچھ ایک بہت بڑی قوم کی آزاد زندگی کی ابتدا ہے۔ پاکستان والے اپنی ہمت، حوصلہ اور قوت بازو سے اس ابتدا میں ترقی، عروج اور تکمیل کا رنگ بھرنے کا عزم کر چکے ہیں ٭

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی

پاکستان کے خصوصی مہمان

نہ چھیڑو انھیں یہ ستائے ہوئے ہیں
قیامت کے صدمے اٹھائے ہوئے ہیں

دہلی اور مضافات دہلی سے اہل قلم ہمیشہ پنجاب وغیرہ پاکستانی علاقوں میں آتے اور آتے رہے۔ پنجاب کے پہلے اردو اخبار کوہ نور اور ماہنامہ خورشید پنجاب کے مالک اور ایڈیٹر اور مطبع کوہ نور کے منیجر نامی منشی نول کشور کا تذکرہ تو پرانی باتیں ہیں جن پر پوری ایک صدی گزرنے کو ہے۔ محمد حسین آزاد، فیض الحسن سہارنپوری، ماسٹر پیارے لال اور مولوی کریم الدین بھی قریبی زمانے کی ہستیاں تھیں جنھوں نے پنجاب کو دہلی کی ثقافت اور ادب سے شناسا کرایا اور آپس میں اتحاد و مذاق قائم کیا۔ اس صحبت میں میرا مدعا ان اہل سخن دہلی اور نواح دہلی اور یوپی کے ان حضرات سے ہے جو اہل قلم ہیں اور پچھلے سال کے خونی ہنگاموں سے تنگ آکر پناہ گزیں کی حیثیت میں پاکستان آئے ہیں۔ ان میں ان لوگوں کو شامل نہ کیا جائے جن کی ملازمتیں آئینی طور پر پاکستان میں منتقل ہوئیں۔ خصوصی مہمانوں سے میرا مطلب اس مصیبت زدہ جماعت سے ہے جس کا شغل وہاں ادبی نوعیت کا تھا یعنی ناشر اور کاتب سے لے کر ادیب، شاعر اور مصنف۔ ان حضرات کی بہت بڑی تعداد اس وقت پاکستان میں آئی ہوئی ہے جس کا بڑا حصہ لاہور اور کراچی میں مہاجرین کی طرح مقیم ہے۔ وہ لوگ مہاجر ہیں، پناہ گزیں ہیں۔ اور بہت کچھ بلکہ بعض اپنا سب کچھ گنوا کر آپ کے دروازے پر پہنچے ہیں۔ آپ نے ان کو پناہ دی، بہت ثواب کا کام کیا۔ آپ جانتے ہیں کہ ان کو صدمے پہنچے ہوئے ہیں۔ وہ سخت پریشانی اور بے سرو سامانی کی حالت میں یہاں تک پہنچے ہیں۔ ان صدموں میں لازمی طور پر انسان کی طبیعت حساس ہو جاتی ہے۔ اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ اور پھر وہ "محض" مہمان نہیں ہیں بلکہ جیسا ان کے ہونے سے پیدا ہے وہ پاکستان میں رہنے کے ارادے سے آئے ہیں، محض سیاحت کے لیے نہیں۔

پٹھان اور پنجابی، سندھی اور غیر سندھی کا سوال کس قدر اہمیت رکھتا ہے یہ مجھے معلوم نہیں۔ بہر حال وہ آپ سب کے، کل پاکستان کے خصوصی مہمان ہیں۔ انشاء اللہ اس کا لحاظ رکھتے ہیں۔

پاکستان خاص کر مغربی پنجاب اور لاہور کے ادب دوست حضرات سے مجھے یہ کہنا ہے کہ جو سلوک گزشتہ زمانے میں یوپی وغیرہ کے ادیبوں اور نقادوں کی طرف سے پنجاب کے شاعروں اور مصنفوں کے ساتھ ہوتا رہا اسے طاق نسیاں پر جگہ دینی چاہئے۔ آنے والے حضرات سے بھی کہوں گا کہ انھیں بھی یاد رکھنا چاہئے کہ وہ اس وقت کہاں اور کن لوگوں میں تشریف رکھتے ہیں۔ مہاجرین و انصار یہ دو متمیز کلمے مجھے بہت کھٹکتے ہیں۔ آخر یہ امتیاز کب تک قائم رہے گا جب دونوں کی قسمتیں شیر و شکر ہو گئیں تو یہ تفریق کیسی؟

لاہور کے ایک بڑے مشاعرے میں جسے بہت مدت نہیں گزری جو ناخوش گوار واقعہ پیش آیا اگر وہ صحیح ہے تو بہت رنج دینے والا ہے۔ سنا گیا ہے کہ کچھ حضرات شاکی ہیں کہ انھیں پڑھنے کا موقع نہیں دیا گیا اس وجہ سے کہ وہ مہاجرین میں سے تھے۔ ایسا ہوا ہے تو بری بات ہے۔ اور اگر ہوا بھی تھا تو اس کی شکایت سے کچھ حاصل نہیں۔ وہ دن اردو کے لئے بہت منحوس ہوگا جب یہ مہاجرین اور انصار اپنی اپنی ادبی انجمنیں اور مشاعرے الگ الگ قائم کر لیں گے۔ یہ وہ وقت ہے کہ حکومت کا جہاں تک تعلق ہے اردو زبان یو۔پی اور انڈین یونین کے دوسرے صوبوں میں نزع کی حالت میں ہے۔ اس پیاری زبان کا جو حشر وہاں ہوتا ہے اس کا خیال کرتے ہوئے جی کڑھتا ہے۔ پھر اس مقامی عصبیت کے کیا معنی؟ اردو والوں کو چاہئے کہ ان جزوی اور ادنیٰ باتوں کو ذہن سے نکال کر اردو کی خدمت اور بقا کے لئے سر جوڑ کر کوشش کریں۔

پاکستان میں پنجاب اور پنجاب میں لاہور کی ادبی رواداری اور عدم عصبیت کا مجھ کو کافی تجربہ ہے اور میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ ادبی معاملوں میں انھوں نے پنجابی اور غیر پنجابی کا امتیاز کبھی روا نہ رکھا۔ میں کراچی میں دیکھ رہا ہوں کہ جو علما، اور ادیب دہلی اور یوپی وغیرہ سے یہاں آئے ہوئے ہیں وہ ہاتھوں ہاتھ لئے جا رہے ہیں۔ کسی خاص تقریب میں اگر کوئی بے لطفی کی صورت پیدا ہو گئی تو وہ بوجوہ ناگزیر ہوگی۔ اس کو کسی کی نیت پر محمول کرنا غلط ہے۔ اور دو پر یہ بہت کڑی گھڑی گزر رہی ہے۔ اردو کے سب حامیوں کا اور خاص کر ان کا جو مہاجرین ہیں فرض ہے کہ اردو کے

(باقی صفحہ ۱۲۳ پر)

میاں بشیر احمد

پاکستان کا قیام و استحکام

پاکستان قائم ہوئے ایک سال ہونے کو ہے۔ پاکستان بن گیا لیکن سچ یہ ہے کہ ابھی اس کی بنیاد ہی پڑی ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ پاکستان کا قیام ایک معجزہ ہے خدا نے مسلمانوں پر بڑی مہربانی کی، بڑی بڑی انسانی اور شیطانی قوتیں ان کے خلاف صف آرا تھیں مگر باوجود اس کے پاکستان کا قیام عمل میں آگیا۔ خدا نہ کرے ایسی کا یہ مطلب ہو کہ اب مسلمان مزید معجزوں کی امید میں محو غفلت رہیں گے۔

بعض دوسرے لوگوں کا قول ہے کہ محض "اتفاقات" ہیں زمانے کے کہ پاکستان معرضِ ظہور میں آگیا۔ چند طاقتوں کی ٹکر ہوئی، ایک طوفان سا برپا ہوا، ایک لہر جو اٹھی تو اس کے پانچ چھ بلبلوں نے پاکستان نام پایا خدا نہ کرے اس کا یہ مطلب ہو کہ اب اپنی ہستی حباب کی سی ہے۔

بلاشبہ پاکستان مسلمانوں کے لئے ایک نعمتِ خداوندی ہے، ان کی آرزوؤں کی تکمیل نے ایک صورت اختیار کی لیکن اب انھیں اپنے آپ کو اس کا مستحق ثابت کرنا ہے یعنی پاکستان بغیر زیادہ قربانیوں کے وجود میں آگیا لیکن اب اس وجود کو برقرار رکھنے کے لئے دلی جذبہ اور مسلسل محنت درکار ہے۔

ہم پاکستان والوں کو خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ آج کل کی مادہ پرست سرمایہ دار دنیا میں ہندوستان کے مسلمان نہ دنیا دار رہے تھے نہ دین دار، ہم نے تھوڑی بہت مغرب کی نقالی کی۔ ہندوؤں کی دریوزہ گری کی لیکن کوا چلا ہنس کی چال اور اپنی بھی بھول گیا۔ ہم نہ اُدھر کے رہے نہ ادھر کے مذہب کو ہم نے محض رسمیات تک محدود کر دیا۔ دنیاوی ترقی کے معنی ہم نے زیادہ سے زیادہ نوکری سمجھے۔ انگریز اور ہندو چکی کے دو پاٹ تھے جن کے درمیان ہم گھن کی طرح پستے چلے گئے۔ کسی کا قصور نہ تھا ہماری اپنی کوتاہی تھی کہ ہم زبردستوں کے آگے سرنگوں ہوئے۔ پھر ہم نے چند کروٹیں لیں، کچھ ہاتھ پاؤں مارے اور ہم آزاد ہو گئے۔

آزاد ہوتے ہی ہم پر کیا کچھ مصیبتیں ٹوٹ پڑیں مسلمانوں کا قتل عام ہوا، مہاجرین ڈھوروں کی طرح ہانکے گئے، گرتے پڑتے آئے کچھ مرے کچھ بچے، سہتے کو ہم انکسار بنے لیکن فی الحقیقت اس امتحان میں پورے نہ اُترے۔ اُدھر کشمیر پر حملہ ہو اور حیدرآباد کو دھمکیاں ملیں۔ ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا گیا۔ لڑنے کا سامان، پہننے کا کپڑا، کلیں پرزے، کیل کانٹے سبھی چھین لئے گئے، کہیں روک دئے گئے۔ دنیا کو دکھایا گیا۔ یہ ننگے ہیں، نہ تن پہ کپڑا ہے، نہ جیب میں پیسہ، جنگ و امن دونوں ہمارے لئے مشکل کر دئے گئے قریب تھا کہ ہم ختم ہو جاتے۔

لیکن ہم ختم نہ ہوئے۔ قدرت نے ہماری مدد کی۔ ہمارے رہنما سوائے معدودے چند کے رہنمائی نہ کر سکے۔ ہماری قوم کا ایک حصہ اپنا اخلاق کھو بیٹھا لیکن ایک دوسرے حصے نے نہ اپنا ایمان کھویا اور نہ ہمت ہاری بلکہ وہ نمونہ پیش کیا جس سے گرے ہوؤں کے حوصلے پھر بلند ہو گئے۔

اس وقت زمانہ ہماری آزمائش کر رہا ہے۔ دیکھ رہا ہے کہ ہم کہاں تک اپنے اسلامی دعوے میں پورے اترتے ہیں کہاں تک اسلام کو حالاتِ حاضرہ میں ایک زندہ قوت بنا کر دکھا سکتے ہیں۔ حریت کو ہم کیا جامہ پہناتے ہیں، اخوت و مساوات کا کیا نمونہ پیش کرتے ہیں؟

ہمارے عوام کو کھانے کے لئے دو وقت کی روٹی پہننے کو چند سادہ کپڑے رہنے کو ایک معمولی سی کوٹھڑی درکار ہے یہ ہوں تو پھر اسلام کی راہ میں اور قوم ملک کے لئے ان کی جانیں بھی حاضر ہیں۔ قصور ہے تو ہم کھاتے پیتے لوگوں کا جو یا تو غافل ہیں یا آرام پسند یعنی خود غرض ہیں اور کوتاہ بین ہیں۔

لیکن یہ غفلت دیر تک قائم نہ رہ سکے گی اسلامی حمیت کا ایک طوفان برپا ہونے والا ہے جس میں غافل ڈوب جائیں گے اور قوم کا سادہ طبقہ اُبھرے گا۔

پاکستان کے مستقبل میں یقین نہ رکھنا ذلیل قسم کی بزدلی ہے اور اس یقین محکم کے ساتھ عمل پیہم سے گریز کرنا بدترین قسم کی بددیانتی ہے یقین دل سے اپنے قوم و ملک کی خدمت کرو اور اسلامی محبت کے تاج عالم جھنڈے کو ہاتھ میں تھامے ہوئے اپنی بکھری ہوئی قوتوں کو مجتمع کر لو۔ دل میں سوز ہو اور نگہ پاک پھر کون ہے جو بے باک نہ ہوگا؟

اسد ملتانی

پاکستان

ہم غلامانِ رسولِ پاک کی یہ شان ہے
جس زمیں پر ہم قدم رکھ دیں وہ پاکستان ہے

بہرِ مسلم زندگی کا ماحصل ایمان ہے
مال بھی اور جان بھی ایمان پر قربان ہے

ہم تو دشمن تک سے بے انصاف ہو سکتے نہیں
کیونکہ ہم لوگوں کا دستور العمل قرآن ہے

ہم نے چاہی اور حاصل ہو گئی اک سرزمیں
اس قدر جلدی کہ خود چشمِ فلک حیران ہے

تجربے سے ہو گیا ثابت کہ مقصد کا حصول
کس قدر دشوار تھا اور کس قدر آسان ہے

منزلیں صدیوں کی کر لیتی ہے یہ لمحوں میں طے
صاحبِ معراج کا اُمّت پہ یہ احسان ہے

ہو گیا ہے آج پاکستان پورے سال کا
دیکھ لیں کہتے تھے جو کچھ دن کا یہ مہمان ہے

ہے یہ بے شک خطۂ محدود لیکن اس میں بھی
اہلِ ہمت کے لئے بے انتہا میدان ہے

دید کے قابل ہے شامِ عید کا منظر اسدؔ
نظم رنگیں ہے شفق اور ماہِ نو عنوان ہے

نہال سیوہاروی

پاکستان کا پہلا سال

مہاجر

جو نہ گذرا تھا کبھی آنکھوں سے ایسا انتشار
گردشِ گردوں کے فریادی قطار اندر قطار

وہ جہاں مظلومیت کا آدمی کی شکل میں
ایک آشوبِ قیامت زندگی کی شکل میں

انتہائے صبر کے ہاتھوں وطن چھوڑے ہوئے
پرورش پائی تھی جن میں وہ چمن چھوڑے ہوئے

وہ غم و آلام کا طوفاں تباہی کا وہ اوج
وہ بلائیں، وہ بلاؤں کا سمندر موج موج

وہ غریبی و امیری کا جہاں اک سطح پر
حشر کا عالم زمین و آسماں اک سطح پر

خانہ ویرانی کے وہ چرچے پریشانی کا ذکر
شکلِ انساں میں درندوں کی ستم رانی کا ذکر

رہ گئی ہے اُن سے کوسوں دور اُن کی مرز و بوم
سمتِ ارضِ پاک آتے ہیں ہجوم اندر ہجوم

گھونٹ بھر پانی سے ہنگامِ سفر ہیں نامراد
خشک ہونٹوں پر ہے "پاکستان دائم زندہ باد"

قائداعظم

چارہ فرمائے غمِ ملت ہے اِک مردِ کہن
اہلِ ملت جس کے پروانے وہ شمعِ انجمن

آئینہ اس کی نگاہوں پر قرینہ قوم کا
اس کے دستِ ناخدائی میں سفینہ قوم کا

جوش پر طوفاں ہے لیکن ہے نڈر طوفان سے
کھے رہا ہے قوم کے بیڑے کو اطمینان سے

جذبۂ تعمیر پاکستان

جذبۂ تعمیرِ ملت کو مٹا سکتا ہے کون
جو اُبھرنے پر ہوں آمادہ دبا سکتا ہے کون

ملتِ بیدار کا ارمان جہدِ مستقل
ملتِ بیدار کی پہچان جہدِ مستقل

مشکلیں جتنی ہیں ان کو فتح کرنا ہے ہمیں
صورتِ طوفاں، چٹانوں سے گذرنا ہے ہمیں

نوائے سروش

آج کانٹے ہیں اگر تیرے مقدر میں تو کیا
کل ترا بھر جائے گا پھولوں سے دامن غم نہ کر

میں نے مانا آج سونی سی ہے تیری بزمِ دل
کل یہ ہوگی عشرت زا دلِ ایمن غم نہ کر

قطرہ اک دن بحر بن جائیگا خونِ دل نہ پی
دانہ کو تیرے ملے گی شانِ خرمن غم نہ کر

ایک عہدِ تازہ آیا چاہتا ہے جام اُٹھا
غم نہ کر اے مائلِ فریاد و شیون غم نہ کر

اس قدر شاداب ہو جائے گی کشتِ زندگی
یہ جہاں کہلائے گا اک دن بہشتِ زندگی

ضمیر بخاری

پاکستان زندہ باد

ملت کے مقدر کی تعمیر ہے پاکستان!
اسلاف کی عظمت کی تصویر ہے پاکستان!

آفاق کی وسعت میں رہ رہ کے جو کوندی ہے
باطل کے لئے حق کی تصویر ہے پاکستان!!

ابھرا ہے اُفق سے پھر خورشید صداقت کا!
ظلمات تعصب میں تنویر ہے پاکستان!!

صد شکر کہ کام آخر تدبیر جناح آئی
بے لوث قیادت کی توقیر ہے پاکستان!!

افغانیؒ و جوہرؒ کی امید اسے کہئے!
اقبالؒ کے خوابوں کی تعبیر ہے پاکستان!!

جو قلبِ مسلماں میں، انگڑائیاں لیتا تھا!
اس رازِ خلافت کی تفسیر ہے پاکستان!!

"وقت است کہ اے مسلم! از خواب گراں خیزی
وقت است کہ در عالم نقشِ دگر انگیزی"

قحط بنگال کا ایک منظر

ایک ترتیب

محمد تقی

مشرقی پاکستان کا ایک مصوّر

زین العابدین جن کی نقاشی کے دو نمونے "ماہ نو" کے اس شمارے میں پیش کئے جا رہے ہیں مشرقی بنگال کے ایک نوجوان مگر پختہ کار آرٹسٹ ہیں۔ کلکتے کے ماہرین فن کے حلقوں میں کئی سال سے ان کی فنی نشوونما مرکز توجہ رہی ہے۔ مگر ۱۹۴۳ء کے قحط کے بعد ان دل ہلا دینے والے مناظر کی تصویروں نے انکا نام سارے ہندوستان میں مشہور کر دیا۔

زین العابدین کی بڑی خصوصیت ان کی مکمل فنی ایمانداری، خطاکشی پر زبردست قدرت اور خلوص ہیں۔ عصر حاضر میں مغربی نقاشی نے جو پہلو بدلے ہیں اور جن سے ہندوستانی فنکار بڑی حد تک متاثر ہوئے ہیں اسکا بیشتر حصہ خطاکشی کے عیوب کو چھپانے کی کوشش پر مشتمل رہا ہے۔ اسکے علاوہ نئی روشنی کے فنکاروں نے ندرت اور انفرادیت کی تلاش میں اپنے طبقے کو عوام سے بہت دور کر لیا ہے۔ حالانکہ وہ عام ماحول میں ہی زندگی بسر کرتے ہیں اور اسی کی مصوری کرتے ہیں پھر بھی وہ زندگی کو ایک ایسے زاویہ سے دیکھنے کے عادی ہو جاتے ہیں اور اس میں ایسے غیر مانوس نکات تلاش کر لیتے ہیں کہ عام آدمی ان کے آرٹ کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ اس کا ردِعمل آرٹسٹ پر یہ ہوتا ہے کہ وہ بھی اپنے آپ کو عوام سے علیحدہ کر لیتا ہے حتٰے کہ اس کا نظریۂ حیات بالکل بدل جاتا ہے۔ اور صرف خواص کو اس تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔

زین العابدین کا آرٹ اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ عام انسانوں سے بہت قریب ہیں پھر بھی خالص اور حساس آرٹ کا دامن نہیں چھوڑتے۔ وہ نقاشی کے کسی خاص مذہب کی پیروی نہیں کرتے بلکہ زندگی کے سچے عکاس ہیں۔ مشرقی بنگال کی دیہاتی زندگی کے مناظر میں انہیں وہ تمام جمالیاتی عناصر مل جاتے ہیں جو ان کے ذوق کی تسکین کے لئے ضروری ہیں۔

انہوں نے اپنے وطن بنگال کی دیہاتی زندگی کا عمیق مطالعہ کیا ہے اور وہاں کے بسنے والوں کی خوشی اور غم۔ ان کی کامیابیوں اور ناکامیوں کو شدت سے محسوس کیا ہے۔ ان کی قحط بنگال کی تصویریں اس شدتِ احساس کی بیّن مثالیں ہیں۔ ان تصویروں میں ان کی تکنیک جو عموماً سیدھی اور صاف ہے بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔ معمولی خطاکشی غلیظ، بھوک سے دم توڑتے ہوئے بڈھوں اور دانے دانے کے لئے تڑپتے ہوئے بچوں کی عکاسی کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ لہٰذا ان میں زین العابدین نے احتیاط کو ایک طرف رکھ کر بڑی جرأت سے کام لیا ہے۔ ان میں خطوط کی بے باکی اس ہیجان کی طرف اشارہ کرتی ہے جس سے آرٹسٹ کا دل معمور ہے۔ یہ تیزی سے کھینچی ہوئی لکیریں بھوکے انسانوں کے اعضا کے عکس نہیں جیسے کہ کیمرے کی پلیٹ پر بھی آ سکتے ہیں۔ بلکہ ایسے اشارے ہیں جن سے تخیل اس جاں گسل کیفیت کا اندازہ لگا سکتا ہے جو ان اجسام پر گذر رہی ہے۔ صحیح مقامات سے ہٹے ہوئے ٹوٹے پھوٹے خطوط اس لئے استعمال کئے گئے ہیں کہ وہ تخیل کے راستے میں حائل نہ ہوں۔

زین العابدین کی دوسری تصویر "ایک ترتیب" ان کی تازہ ترین تخلیق ہے اور کراچی کے ایک عام مشاہدہ پر مبنی ہے۔ اس میں رنگوں کے انتخاب اور توازن سے علاوہ آرٹسٹ کی اس ہمدردی اور احترام کا عکس ہے جو متوسط طبقے کی مسلمان عورت کے لئے اس کے دل میں موجود ہے۔

مشرقی بنگال کے اس نوجوان مصور کی پیدائش ضلع میمن سنگھ کے ایک گاؤں کشور گنج میں ۱۹۱۵ء میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم میمن سنگھ کے ایک اسکول میں حاصل کی۔ وہیں سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا اور پھر چھ سال تک گورنمنٹ آرٹ اسکول کلکتہ میں مصوری کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۳۸ء میں امتحان دیا اور اوّل آئے۔ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۷ء تک آرٹ اسکول میں مصوری کے استاد رہے۔ آج کل حکومت پاکستان میں "آرٹ ڈیزائنر" کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

زین العابدین کی تصویریں ہندوستان کے ہر حصے میں پسند کی گئی ہیں۔ ہندوستان کی بڑی بڑی نمائشوں میں انہیں نمایاں جگہ ملی ہے ۱۹۳۸ء میں کلکتہ کی آل انڈیا آرٹ اکزیبیشن میں زین العابدین کو مجموعی حیثیت سے سب سے اچھا مصور تسلیم کیا گیا۔

زین العابدین کچھ عرصہ بعد ڈھاکے کے آرٹ اسکول کے پرنسپل ہو کر جا رہے ہیں۔ یقین ہے کہ انکی رہنمائی نوجوان پاکستانیوں میں لطیف فن کا سچا شوق پیدا کر سکے گی۔

محمد علیؒ جناح

جاری ہر اک زبان پہ ہر ایک دل پہ نقش ہے
کتنا پیارا نام محمد علی جناح

کچھ کام پر نثار ہیں کچھ نام پر فدا
محبوب خاص و عام محمد علی جناح

دنیا میں سر بلندیٔ اسلام کے لئے
کوشاں ہے صبح و شام محمد علی جناح

اس کے کہے پہ قوم چلی سرخرو ہوئی
ہے وقت کا پیام محمد علی جناح

ہم سب نے اپنا قائد اعظم بنالیا
تو نے کئے وہ کام محمد علی جناح

کردار کی یہ شان کہ دشمن کے دل میں بھی
ہے تیرا احترام محمد علی جناح

ہاں ہاں یہی تو ہے تری خواہش کا منتہیٰ
مسلم ہوں شاد کام محمد علی جناح

زیبا کی بھی دعائے دلی ہے کہ یا اللہ
ہو فائز المرام محمد علی جناح

ہوشیارپوری

جشن سالگرہ

آج کے روز ہی گلزاروں کے دن پلٹے تھے
آج کے روز ہی آیا تھا بہاروں کا پیام !
قافلے نغمہ و نکہت کے یہاں اترے تھے
چاند ابھرا تھا کہ ہر سمت اُجالا ہو جائے
اور کئی برسوں کے پُرہول بھیانک سائے
اجنبی ہاتھوں نے تخلیق کیا تھا جن کو
دیکھتے دیکھتے تحلیل ہوئے کرنوں میں
جن سے ہر گوشہ چمک اٹھا دمک اٹھا ہے
لیکن ان کرنوں کے سائے میں مری آنکھوں نے
اک جنوں خیز قیامت کا سماں دیکھا ہے

خون میں لتھڑی ہوئی لاشیں سرِ رہ پائی ہیں
آگ کے شعلوں میں دہقان کا دیکھا ہے نصیب
جن سے تہذیب بھی نالاں ہے تمدن بھی نڈھال
آنکھ بھی جن سے ندامت سے جھکی جاتی ہے
پھر بھی لیکن یہی کرنیں ہیں کہ جن کے دم سے
بے کراں غم کی سیاہی کا فسوں ٹوٹا ہے
سالہا سال کی زنجیرِ گراں پگھلی ہے
اور یہی کرنیں ہیں وہ چمکتے سہارے اب ہم
بے خطر بڑھتے چلے جائیں گے رقصاں خنداں
کہ زمیں اپنی ہے عرش اپنا فضا اپنی ہے
اور انہی کرنوں سے ہر زلف سنواریں گے ہم
زندگانی کو نئی تاب و توان بخشیں گے
اور یہ گیت انہی کرنوں سے بُنا ہے میں نے

پہلی سالگرہ

کٹ گئی رات سیاہی کا فسوں ٹوٹ گیا
دیکھتے دیکھتے خورشید جہاں تاب ابھرا
نور نے بڑھ کے زمانے کی بلائیں لے لیں
غم کی ماری ہوئی دنیا کا نصیبہ چمکا

پھول ہی پھول ہیں بکھرے ہوئے شہ راہوں میں
گیت ہی گیت ہیں، ہر سمت فضائیں رقصاں
حسن کا روئے دلآویز ہے گلشن گلشن
عشق کا دیدۂ نمناک ہے، خنداں خنداں

ایک طرف [illegible] جو
[illegible] ہے
[illegible]
[illegible] ہے

سرخوشی پھوٹ کے ابھرے [illegible] گلاب
[illegible]
اس گلستاں میں [illegible]
[illegible]

تابش صدیقی

ماہر القادری

پاکستان کا مستقبل

(مستقبل پاکستان کے نورانی افق سے شاعر سرزمین پاکستان کا نظارہ کرتا ہے کارخانوں کی چمنیوں سے لیکر حکومت کے ایوانوں تک معیشت معاشرت سیاست اور اعمال و عبادات کا ہر منظر اسے نظر آتا ہے اور یہ مشاہدے شعر کے قالب میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں)

پاکستان کا آئین

زندہ ہوئیں اسلام کی پائندہ روایات
صد شکر پلٹ آئے ہیں گزرے ہوئے لمحات
قانون کی ہے روح محمدؐ کی ہدایات
دستور کی بنیاد ہیں قرآن کی آیات

پاکستان کی فوج

میدان کے غازی ہیں خدا ترس نمازی
ہاتھوں میں ہیں تیغیں تو لبوں پر ہے مناجات
عورت کے نگہبان ہیں بچوں کے محافظ
اور اس میں نہیں کافر و مسلم کی مراعات
بڑھتے نہیں اللہ کے قانون کی حد سے
گو جنگ میں کتنے ہی ہوں بدلے ہوئے حالات

پاکستان کی خواتین

ایک ایک نفس عظمت کردار کا شاہد
ہیں عفت و عصمت میں سمونے ہوئے دن رات
اخلاق ہی اخلاق شرافت ہی شرافت
ہیں پیش نظر مریم و زہرا کی روایات

پاکستان کے فنون و ادب اور سائنس

ہے شعر و ادب میں بھی جھلک نو یقینی کی
سلجھے ہوئے افکار ہیں پاکیزہ خیالات
خوش ذائقہ بستان ادب میں جو ہر دو کہانی
سبزے کی طرح آگتے ہیں علمی نظریات
آتے ہیں نیا روپ نیا بھیس بدل کر
ارضی[1] کے مضامین غزالی کے مقالات
جزوہ ہو کر ہیں کاوشیں تحقیق کی زد میں
بقائے زمیں ہوں کہ رموز فلکیات
سے عام بہت علم ہیں، یا دو سائنس
ایجاد کی منزل میں ہیں سائنس کے آلات
ہر شعبہ ہستی میں ترقی کے ہیں آثار
دنیا کے نباتات ہوں یا کان کی فلزات
دیہات بھی ہیں صنعت و تخلیق کا مرکز
اللہ رے! یہ سلسلۂ برق و بخارات
صد شکر کہ بے چارے مزدور کی نظر سے
پوشیدہ نہیں بانی کے احوال و مقامات

پاکستان کے عوام اور عام معاشرت

انسان کہ اخلاق و مروت کے نمونے
اپنوں سے بھی کچھ بڑھ کے ہیں غیروں پہ عنایات
سجدوں کے نشانوں سے جبینیں ہیں منور
کس درجہ مبارک ہیں یہ آثار و علامات
اب زینت محفل ہے نہ مطرب نہ مغنی
گونجے ہوئے ہر سمت ہیں قرآن کے نغمات
سرمایہ مسلمان، تجارت بھی مسلمان
مزدور کو شکوہ ہے نہ مالک کو شکایات
محمود و ایاز ایک ہی منزل کے ہیں راہی
ہے گرم سفر قافلۂ عدل و مساوات
ہے قول و عمل ایک، جو دل میں وہ زباں پر
دھوکے کی سیاست ہے نہ بے رنگ بیانات
گھوڑ دوڑ کی بازی نہ کلب گھر نہ ہیں ہوٹل
ویران ہے سنسان ہے دنیائے خرابات
انسان کو انسان سے بے لوث محبت
ہڑتال کی دھمکی ہے نہ اب خوف فسادات
پژمردہ کے چہرے بھی نہیں، گل کی طرح ہیں شاداب
ہے جوش پہ اللہ کے افضال کی برسات
اخلاق و معیشت میں توازن ہے کچھ ایسا
ہر رہرو پُرشوق ہے، ہر شخص خوش اوقات
محنت نظر آتی ہے صداقت کی پجاری
اے عقل! یہ ہیں مذہب اسلام کی برکات

[1] (GEOLOGY) ـه
ـه مجلس عمومہ ادارہ اقبال سے مشتق کے مطابق [illegible]

[illegible]

عشرت رحمانی

جشنِ پاکستان

خوش قسمت غلامی ختم ہے دورِ جہاں بدلا
زمیں بدلی زماں بدلا مکیں بدلے مکاں بدلا

بنی ہے امن کا گہوارہ پاکستان کی جنت
خزینہ علم و دانش کا ہے یہ ایمان کی جنت

یہاں جمعیتِ آدم پہ ہے بارش اخوت کی
ہے اسلامی مساوات اور رواداری ہر ملت کی

یہ سنت ہے مسلک کہ سب چھوٹے بڑے خدامِ ملت ہیں
بلا تفریق سب کے سب ہی انصارِ حکومت ہیں

مہاجر ہوں کہ ہوں انصار سارے بھائی بھائی ہیں
کہ سب انسان ہیں انسانیت کے سب فدائی ہیں

یہ سب آزاد ہیں آزادیوں کی شان والے ہیں
بڑی یہ آن والے ہیں، یہ پاکستان والے ہیں

مسلماں پر صعوباتِ سفر اب ختم ہوتی ہیں
نیا تخمِ عمل آزاد روحیں مل کے بوتی ہیں

شہنشاہِ سیاست رہنمائے قائدِ اعظم
علمبردارِ حق "جناح" جس کا ہر عمل محکم

گورنر جنرل اپنا ہے وہ پاکستان کا ہادی
تدبر سے اسی کے ہم نے پائی ہے یہ آزادی

الٰہی ملک و ملت کو وہ جمہوری اقامت دے
بہ زیرِ سایۂ ایمان اسلامی نظامت دے

اراکینِ حکومت کو صداقت دے شریعت کی
عوامِ ملک کو توفیق دے حفظِ امانت کی

یقیں وہ دے کہ جو سرمایۂ تعمیرِ ملت ہو
عمل وہ دے کہ جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہو

"یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتحِ عالم"
الٰہی شانِ پاکستان ہو اس طور سے قائم

خداوندا! سنی تو نے دعائے شاعرِ مشرق
قبولیت کی خواہاں ہے نوائے شاعرِ مشرق

"ضمیرِ لالہ میں روشن چراغِ آرزو کر دے
چمن کے ذرے ذرے کو شہیدِ جستجو کر دے"

ہلالِ نو جو مسلم کے فلک پر آ نکلا ہے
بنے گا بدرِ کامل یہ جبیں کا اپنی تارا ہے

الٰہی دے ہلالِ پاک کو اب وہ درخشانی
کہ اقوامِ جہاں کو خیرہ کر دے اس کی تابانی

عمل ہم کو عطا کر اس شجاعت کا اخوت کا
کہ ہم اقوامِ عالم کو سبق دیں آدمیت کا

حبیبِ پاک کا صدقہ، ہو تعمیرِ حرم زندہ!
مثالِ ماہِ کامل تیرا پاکستان تابندہ

الٰہی ملتِ بیضا کو یہ دولت مبارک ہو
ہمیں یہ "جشنِ پاکستان" کی عشرت مبارک ہو

[illegible] فن اور اسلام میں کوئی تضاد نہیں۔ فن کے تقریباً ہر شعبے میں ہماری روایات بے حد شاندار ہیں۔ پاکستان ماضی کی عظمتوں کا وارث ضرور ہے۔ اگر ہم اپنے فنی ورثہ کو نئی زندگی نہ دے سکیں یا اسے ترقی کی راہیں نہ دکھا سکیں تو ہمیں پاکستانی ہونے کا کوئی حق نہیں۔ پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ رقص اور موسیقی ہمارے لئے ممنوعات نہیں ہیں۔

ڈراما اور فلم

رقص اور موسیقی کے بعد ڈرامے کا نمبر آتا ہے۔ مسلمانوں نے ڈرامہ میں کبھی بھی پختہ مہارت نہیں حاصل کی۔ ہندوستان کے مسلمان ہی نہیں بلکہ سچ پوچھئے تو پوری اسلامی تاریخ میں کوئی قابلِ ذکر ڈرامہ نہیں لکھا گیا۔ ہندوؤں میں بھی ڈرامائی تخلیق کا صرف ایک دور گذرا ہے۔ ہم لوگوں کو ڈرامہ سے تھوڑی بہت دلچسپی مغرب سے تعلق پیدا ہونے کے بعد پیدا ہوئی اور اس لئے ہمارے لئے ڈرامہ کا فن بالکل اچھوتی چیز ہے۔ اس میں ترقی کی بڑی گنجائش ہے۔ سفری ناٹک کمپنیاں ہمارے یہاں خاصی کامیاب رہیں گی۔ اب تک سنیما نے ایک حریف کی حیثیت سے ڈرامہ کو بہت نقصان پہنچایا ہے لیکن پاکستان میں فلم سازی کی شدید کمی ممکن ہے ڈرامہ کی بقا اور تحفظ کا ایک ذریعہ بن جائے۔

بجائے خود فلم سازی کے فن کا میں مخالف نہیں ہوں لیکن اردو کے فلموں کے متعلق میری رائے کچھ اچھی نہیں۔ وہ شروع سے آخر تک بالکل نکمے ہوتے ہیں۔ اردو فلم سازی کا سارا نظام ہی گندہ ہے۔ پروڈیوسر اور ڈسٹری بیوٹر کی زبردست گرفت نے اس میدان میں فن کے سارے امکانات کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ جہاں تک فنی نزاکت کا تعلق ہے وہ ڈرامہ میں بھی کم ہوتی ہے۔ جیسا کہ آئی اے رچرڈس نے کہا ہے۔ ڈرامہ کو ناول کے مقابلہ میں زیادہ تیزی سے اور زیادہ نمایاں طور پر اپنا اثر قائم کرنا پڑتا ہے۔ یہ کمی سینما میں اسٹیج سے بھی زیادہ ہے! اس میں ہمیشہ اس بات کا اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ خیالات کو ایک پست ذہنی سطح پر پیش کرے۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ فلموں کا اثر عوام پر بہت گہرا ہے اور اسی لئے اگر اسے صحیح آدرشوں کی رہنمائی حاصل نہ ہو تو اتنی زبردست قوت خطرناک نتیجے پیدا کر سکتی ہے۔ اور ہمارے فلم اگر کسی اور لحاظ سے نہ سہی تو کم سے کم ہندوانی ثقافت کا ایک خطرناک وسیلہ ضرور ہیں۔ پاکستان میں خصوصاً فلموں کی حالت بہت نازک ہے پورے ملک میں صرف ایک اسٹوڈیو ہے۔ بڑی لاگت سے بنے فلموں کے لئے صرف پاکستان کا بازار کافی نہیں اور کرایہ کے اسٹوڈیو میں فلم بنانے کی لاگت [illegible] لازمی ہے۔ [illegible] ہندوستانی [illegible] ذہن میں رکھنا

پڑے گا۔ موجودہ حالات میں کسی خاص پاکستانی فلم کی تخلیق ممکن نہیں [illegible] ایسے ہی موقع پر لوگوں کی نظر حکومت کی طرف اٹھتی ہے اور حکومت نے اس سلسلہ میں اب تک کوئی قدم نہیں اٹھایا ہے۔

فنونِ لطیفہ

مصوری کی مثال بھی فلم سازی کی سی ہے۔ مصوری نے ہمارے علاقوں میں ایک باقاعدہ فنی تحریک کی حیثیت کبھی بھی حاصل نہیں کی۔ صرف عبدالرحمن چغتائی کو اس سلسلہ میں بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی ہے۔ لیکن اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ ہمیں مصوری [illegible] دوسری صورتوں پر فنون کے بہت سے باقاعدہ مدرسوں کی ضرورت ہے۔ ہمارے پورے ملک میں فنونِ لطیفہ اور صنعتی فنون کے فضل سے دو ایک استاد ہوں گے۔ صنعتی فن تقریباً مردہ ہو چکا اور مصوری کا فنِ لطیف آخری سانس لے رہا ہے۔ اگر جلدی توجہ نہ کی گئی تو ہماری حالت اس میدان میں حبشیوں کی سی ہو جائے گی۔ ہمارے پاس ایسے آدمی بس گنتی کے ہیں جو کتابوں کے سرورق، کتابوں کی تصویریں اور پوسٹر تیار کر سکیں۔ اچھے خطاط بھی ہمارے یہاں کچھ بہت زیادہ نہیں ہیں۔ اور فنونِ لطیفہ میں اچھے بڑے اور اوسط درجہ کے فن کاروں کی تعداد ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ حال ہی میں پاک پنجاب آرٹ کونسل نے پاکستان اور بیرونِ پاکستان میں اشاعت کی غرض سے آرٹ کا ایک سہ ماہی رسالہ نکالنے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن محض اس خیال سے کہ ہمارے ملک میں اس طرح کے فنی وسائل کی شدید کمی ہے، اس ارادہ کو ترک کر دیا گیا۔ یہ صورتِ حال کسی بڑی قوم کے شایانِ شان ہرگز نہیں۔ ہم جن بیسیوں نوجوان طالب علموں کو یورپ میں خصوصی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیج رہے ہیں کاش ان میں سے کوئی آرٹ کی تعلیم کے لئے بھی ہو۔ معماری کے لئے نہ سہی، صنعتی آرٹ ہی کے لئے سہی۔ غالباً سب سے زیادہ افسوسناک حالت فنِ تعمیر کی ہے۔ ماضی میں ہمارے جتنے فنی کارنامے ہیں ان میں سب سے زیادہ قابلِ فخر و عظیم الشان کارنامے اس فن میں ہیں۔ اور آج اسی میں ہم سب سے پیچھے ہیں۔ تعمیر کا فن ایک ایسا فن ہے جس کی زندگی سرپرستی پر منحصر ہے اور چونکہ ہمارے پاس اس وقت صحیح مذاق اور دولت دونوں چیزوں کی کمی ہے اس لئے صرف حکومت ہی اس فن کے ماہروں کی سرپرستی کر سکتی ہے۔

دوسرے ضروری فنون کی حالت بھی کچھ اچھی نہیں۔ [illegible] ہمارا [illegible] کی حیثیت سے ختم ہو چکا ہے [illegible] چرخے کا کام بھی اسی طرح ختم ہوتا جا رہا ہے جیسے [illegible]

نقاشی، جاسوسی شیا، پرد وغیرہ کے کاریگروں کو فسادات کی آندھیوں نے ادھر اُدھر بکھیر دیا ہے۔ اس لئے خطرہ ہے کہ اس طرح کی فنی روایات اگر ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہونی بند ہو جائیں گی تو ان کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے گا۔ ان کو دوبارہ زندہ کرنا بہت دشوار ہوگا، خاص کر اجتماعی پیمانہ پر۔

اخلاقی رجحانات

مجھے اندیشہ ہے کہ ہماری ساری فنی زندگی وحشت کی نذر ہو جائے گی۔ غیر تعلیم یافتہ اور خاص کر نیم تعلیم یافتہ لوگ اہل علم و فن کو ہمیشہ شبہ کی نظر سے دیکھتے رہے ہیں لیکن ہمارے ملک میں تو جیسے ان لوگوں کے خلاف ایک باقاعدہ سازش ہے۔ ایسے لوگوں کو لامذہبیت اور سیاسی بداعتمادی کے الزامات کا شکار بنایا جاتا ہے۔ جہالت اور حیلہ سازی کے یہ علمبردار ادب و فن کو تہ آب کر دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ یہی وقت ہے کہ پاکستان کے ارباب علم صورت حال کا جائزہ لیں۔ انہیں بربریت کے اس حملہ کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک متحدہ محاذ بنانا چاہئے۔ پروپیگنڈے کی ایک جماعت بنا لینا اور منشور شائع کر دینا ہی کافی نہیں۔ پاکستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا جو حشر ہوا اُسے ہم دیکھ چکے ہیں۔ وہ کچھ سیاسی دیوانوں کی سازش کا تشہیری آلہ کار بن کر رہ گئی ہے۔ آرٹسٹ اور مصنف صرف تخلیقی تحریروں کے وسیلہ سے کوئی مفید کام کر سکتے ہیں۔ کسی بنے بنائے اصولوں کے مطابق لکھ کر نہیں بلکہ اپنی ذات کے ساتھ خلوص برت کر۔ پاکستان کے اکثر لکھنے والے اس وقت اندھیرے میں ہیں۔ نئے حالات نے انہیں بالکل بوکھلا دیا ہے۔

ادبی صورت حال

پاکستان اور انڈیا کی تشکیل نے اردو (اور بنگالی) کے لکھنے والوں کو دو ٹکڑوں میں بانٹ دیا۔ اکثر اشتراکیت پسند سارے سکھ اور ہندو اور کچھ مسلمان لکھنے والے ہندوستان میں رہ گئے۔ دونوں مملکتیں وفاداری کے واضح اظہار کی طالب تھیں۔ کشمیر کے مسئلہ نے اس بات کو اور بھی اہم بنا دیا۔ چنانچہ دونوں مملکتوں کے اشتراکیوں اور یساریوں نے کشمیر کے معاملہ میں ہندوستان کی طرفداری کی۔ سجاد ظہیر نے دسمبر میں لکھا: ہر ایماندار آدمی کو کشمیر اور انڈیا کے اتحاد پر خوش ہونا چاہئے۔ اور اس کے لئے کام کرنا چاہئے۔ ہندو اور سکھ تو خیر ہندوستان سے اس لئے محبت کرتے تھے کہ وہ ان کا وطن تھا۔ ان یساریوں اور ان کے ہم وطن نے کشمیر کے جھگڑے میں پاکستان کے خلاف سخت پروپیگنڈا کرنا شروع کر دیا۔ اور جب پاکستان کے آزاد خیال مصنفوں میں سے [illegible] نظم [illegible] فیض [illegible] حسن عسکری [illegible] نے اس روش کے خلاف [illegible] پاکستان کے یساریوں نے [illegible]

[illegible] کے لکھنے والوں کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس وقت سے پاکستان کے اُردو لکھنے والوں کے خیالات میں ایک طرح کا انتشار ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین (جس پر کمیونسٹوں کا قبضہ ہے) نے اب نئے داؤں پیچ شروع کئے ہیں۔ ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ پاکستانی مصنفوں کے اتحاد اور استحکام کو ختم کر دیں۔ ادبی کام کرنے والوں کی ایک اور منظم جماعت حلقۂ ارباب ذوق ہے یہ لوگ خالص فن کے پرستار ہیں اور گو ذہنی طور پر وہ وطن کی محبت سے سرشار ہیں لیکن ان کے تخلیقی کارناموں میں سماجی ماحول کا پرتو نہیں۔ اس کے علاوہ ان گنت لکھنے والے ہیں جو محض خلا میں گھور رہے ہیں۔ ان کا ذہنی سرمایہ ختم ہو چکا ہے اور اب وہ صرف اپنے ماضی کے کارناموں کو دُہرا رہے ہیں۔

افسانوی ادب کی حالت خاص کر مایوس کن ہے۔ اس صنف کے اچھے سے اچھے لکھنے والے اب تک فرسودہ فرائڈیت کے ذہنی مسائل کا حل تلاش کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کی کہانیاں وقت اور مقام کی قیدوں سے آزاد ہیں۔ اور اس لئے قطعی بے جان۔ شاعروں میں زندگی کی لہر نسبتاً زیادہ ہے اس لئے کہ ہنگامی انتشار جتنا ناول نگار کو مضطرب کرتا ہے شاعر کو نہیں کرتا۔ وہ اپنے فن کو زیادہ نقصان پہنچائے بغیر بھی اپنے حال سے فرار کر کے ادبی تخلیق کر سکتا ہے۔ مجموعی حیثیت سے عقیدہ اور اعتماد کی کمی نے ادب کو سپاٹ بنا دیا ہے۔ لکھنے اور پڑھنے والوں میں کوئی باہمی تعلق باقی نہیں رہا۔ اور حکومت کے بعض محکموں (ریڈیو اور پبلسٹی کی مطبوعات) سے لکھنے والوں کو جو معمولی سہارا ملتا ہے۔ اس سے سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوتا کہ ان کا تخلیقی جوش کم ہو جاتا ہے۔ ہمارے ادیب انتشار کی اس دلدل سے صرف اسی صورت میں باہر نکل سکتے ہیں کہ ان کے عقائد میں دوبارہ پختگی پیدا ہو اور ان کے سامنے ایک واضح ادبی نصب العین ہو۔ میں کسی کے لئے بھی قانون بنانے کا دعویدار نہیں اور خاص کر تخلیقی فنکاروں کے لئے۔ لیکن میرے ذہن میں کچھ سوال پیدا ہوتے ہیں جو ممکن ہے اس ذہنی انتشار کو دور کرنے اور راستہ کو صاف کرنے میں مدد دیں۔

سیاسی رجحانات

۱۔ کیا آپ کو اپنے پاکستانی ہونے پر فخر ہے اور کیا آپ کو پاکستان کی آخری فتح پر پورا بھروسہ ہے؟

۲۔ آپ پاکستان کے لئے کس انداز کا جمہوری آئین پسند کریں گے مثلاً امریکہ، برطانیہ یا روس میں سے کس طرز کا؟

۳۔ آپ کے نزدیک [illegible]

[illegible] سے بچیں۔

[illegible] ہندوستان دونوں [illegible] مغربی اور اسلامی ملک کے [illegible] کی پالیسی کیا ہونی چاہیئے؟

[illegible] کس چیز کے حامی ہیں —— سرمایہ داری، مکمل اشتراکیت یا [illegible] کی جمہوریت کے۔

ان سوالوں کے جواب لکھنے والوں کو عصری مسائل سے متعلق اپنا صحیح نقطۂ نظر متعین کرنے میں مدد دیں گے۔ ان کے جواب ان کے نزدیک خواہ کچھ بھی ہوں لیکن اس صورت میں ملک کی سماجی زندگی کے متعلق ان کے نقطۂ نظر میں الجھن کم ہو جائے گی۔ اور انہیں اس نقطۂ نظر پر استناد ہوگا گو سب لکھنے والوں پر ایک ہی سیاسی مسلک کی پابندی لازمی نہیں۔ لیکن ان کا ادبی نقطۂ نظر اور نصب العین یقینی طور پر واضح ہونا چاہیئے۔

ہمارے افسانوی ادب میں صحیح مقامی فضا کا احساس بالکل نہیں۔ ہمیں اس پر پوری توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اپنے ملک سے ہمیں جو محبت ہے اس کا اظہار مقامی فضا کے گہرے مشاہدہ اور مطالعہ کی صورت میں ہونا چاہیئے۔ مقامی خصوصیات سے محبت اور لگاؤ پیدا ہوگا تو ہم روزانہ زندگی کے صحیح مسائل سے قریب ہوں گے۔ مہاجرین کی آمد نے نئے نئے سماجی مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ اور ان مسائل کی تہ میں ہمیں بے شمار ایسے تجربات مل سکتے ہیں، جنہیں ہم جذباتی طور پر بے حد اثر انگیز بنا سکتے ہیں جس تجارت اور صنعت پر اب تک غیر مسلموں کا پورا پورا قبضہ تھا، وہ اب مسلمانوں کے ہاتھ میں آگئی ہے۔ اور اس واقعہ میں تخلیقی ادب کے لئے بڑے امکانات پوشیدہ ہیں، ایسے امکانات جن میں مزاح کا لطف بھی ہو اور المیہ کی سنجیدگی بھی۔ فسادات اور اس کے بعد پیدا ہونے والی بدطواریاں ہمارے سماجی جسم کو گھن کی طرح کھا رہی ہیں ان پر ہمیں پوری توجہ صرف کرنی چاہیئے سیاسی حیلہ سازی، مقابلہ، حرص اور سماجی مکاری نئی نئی شکلیں بدل کر ہمارے سامنے آرہی ہے۔ اس کی تحلیل کی ضرورت ہے۔ آزادی نے ان عیوب کو اور بھی ابھار دیا ہے اور طنز کو اب پہلے سے بھی زیادہ قوت سے شمشیر قلم سے کام لینا پڑے گا۔ نفسانی وحشت اور بربریت انسان کو اس آزادی سے اپنا شکار بنا رہی ہے کہ کہانی لکھنے والے کے سامنے [illegible] موضوع آگئے ہیں [illegible] ان کے پیش پا افتادہ راستے کو چھوڑ کر دوسری [illegible] پر چلنا پڑے گا۔ لیکن جہاں ایک طرف اس کے لئے [illegible] کا میدان کھلا ہے۔ دوسری طرف عشق و محبت کے میدان میں تنگی پیدا ہوگئی ہے۔ شہری خاتون اب ہمیں عشق و محبت کے افسانوں میں بہت کم نظر آتی ہے اور یہ کوئی عجیب بات نہیں کہ جس طرح لکھنے والے شہریت کی آزادی بڑھانے اور صحافت کی قانونی پابندیاں کم کرنے کے لئے آواز اٹھاتے تھے۔ اب عورتوں کے حقوق کی پاسبانی کے علم بردار بن رہے ہیں۔ ان کی ادبی تخلیقیں اب انہیں خیالی کششیں محلوں سے باہر لا رہی ہیں۔ لیکن انہیں اس بات سے بچنا چاہیئے کہ وہ سیاست کے میدان میں بہت دور تک آگے نہ بڑھ جائیں۔ اس میں اپنی خودی کے گم کر دینے کا اندیشہ ہے۔ اور اس سے شاید کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ فن کار کی سب سے قیمتی ملکیت اس کی خودی ہے۔ ہم اگر ذیل کے انداز پر ایک منشور بنائیں تو وہ شاید اکثر تخلیقی فن کاروں کے لئے "قابلِ قبول ہوگا":-

"ہم پاکستان کا خیر مقدم کرتے ہیں، اس لئے کہ اس نے ہمیں ہماری "خودی" عطا کی ہے۔ جتنی قوتیں پاکستان کے خلاف ہیں وہ ہماری دشمن ہیں، ہمارے فن کی دشمن ہیں۔ ہمارے ہاتھوں میں جتنے موثر حربے ہیں۔ ہم ان سے ان دشمنوں کا مقابلہ کریں گے، اور رجعت پسند قوتوں کا بھی جو ہماری آزادی کا گلا گھونٹنا چاہتی ہیں، اور ہماری خودی کے ارتقا کے راستہ میں رکاوٹ ڈالتی ہیں۔ ہم یہ لڑائی محض شورش یا ہنگامہ آرائی کے انداز پر نہیں بلکہ اپنے تخلیقی حربوں کی مدد سے لڑیں گے۔ سیاست کے افق پر بربریت کا ایک مسلک سر اٹھاتا نظر آرہا ہے۔ وہ ہر طرح کی فنی اور تمدنی سرگرمی کو فنا کر دینا چاہتا ہے۔ وہ اس مقصد کے لئے اسلام کے مقدس نام سے فائدہ اٹھانے میں بھی نہیں چوکے گا۔ ہم بربریت کے ان حامیوں پر ملامت کرتے ہیں کہ انہوں نے ہمارے اس دین کو جس نے ایسی تہذیب کی بنا ڈالی جو علم و فن میں ہمیشہ ممتاز و سرفراز رہی ہے، غلط مفہوم دے دیا ہے۔ ہم اسلامی تہذیب کے ان دشمنوں کو شکست دینے کا تہیہ کرتے ہیں!"

بربریت اور تمدن کی یہ جنگ ہمیں خاتمہ تک لڑنی ہے۔ اب تک صرف بربریت نے زبان کھولی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ مصنف، اور آرٹسٹ، جو حقیقت میں تمدنی قدروں کے خالق ہیں، میدان میں نکل آئیں۔ ضروری نہیں کہ ان کا کوئی سیاسی مسلک ہو۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ ان کا کوئی مستحکم عقیدہ ہو۔ اس مستحکم عقیدہ کی حیثیت محض ایک رائے کی نہیں بلکہ رجحان کی ہوگی۔ بے شک آرٹسٹ کی ذہنی ذاتی باتیں [illegible] ہیں لیکن ان حالات کا اس کے فن کے موضوع سے براہ راست کوئی تعلق

نہیں ہوتا۔ ایک فن کار کی حیثیت سے وہ ایک شخصی تجربہ کو (جو بجائے خود قابل بیان نہیں ہوتا) دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ منطقی طور پر جہاں بھی اس طرح کے شخصی تجربہ کا لازمی نتیجہ نہیں۔ لیکن سیاسی صورتِ حال ایسی ہے اور عام حالات میں اتنا انتشار اور اتنی اُلجھن ہے کہ فن کار کے لئے بغیر کسی مستحکم عقیدہ یا رجحان کے یہ ممکن نہیں کہ وہ حقیقت کی فن کارانہ مصوری کر سکے۔ اس طرح کا عقیدہ پیدا کرنے کے لئے لازمی ہے کہ وہ بنیادی طور پر اس نصب العین کے حامی ہوں جس سے یہ عقیدہ پیدا ہوتا ہے۔ اس نصب العین کی زندگی خطرہ میں ہے، خود فن کی زندگی خطرہ میں ہے۔ آرٹ کے وجود کو بھی جائز تسلیم نہیں کیا جاتا۔

مکرر آنکہ مضمون کے آخر میں میرا جی چاہتا ہے کہ اسی سلسلہ میں وفاداری کے مفہوم کی وضاحت کر دوں۔ ہماری وفاداری تین چیزوں کے ساتھ ہو سکتی ہے :۔

۱۔ ریاست کے ساتھ ۲۔ معاشی یا مذہبی جماعت کے ساتھ ۳۔ اپنی ذات خاص یا ایک مخصوص حلقہ کے ساتھ۔ ریاست فرد اور جماعت دونوں کو آزادی، تحفظ اور بقا کا سرمایہ دیتی ہے۔ لیکن ہمیشہ نہیں۔ لہٰذا ایسے موقع پر نافرمانی یا بغاوت اخلاقی طور پر جائز بن جاتی ہے۔ لیکن بغاوت کے جواز کو محض اخلاص کے پیمانہ پر ناپنا کافی نہیں۔ ریاست کو اس بات کا اخلاقی حق ہے کہ وہ اس کی جانچ کرے اور اخلاص، عقیدہ کی پختگی اور استقلال ہی اس کی جانچ کے صحیح پیمانے ہیں۔ لیکن پاکستان جیسی نئی ریاست کے معاملہ میں اس طرح کے اکثر پیمانوں کی حیثیت محض خیالی ہے اور اس لئے پاکستان کا نیا پن اس بات کا طالب ہے کہ ہماری وفاداری اس کے ساتھ غیر مشروط ہو۔ جہاں تک ادیبوں اور فن کاروں کا تعلق ہے میرا خیال ہے کہ بیرونی اقتدار سے رہا ہو کر ان کے دلوں پر ایک اہتزازی کیفیت طاری ہے۔ ان کے دلوں میں بغاوت کا خیال صرف اسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے کہ ان کی تخلیقی سرگرمیوں پر کوئی سخت زد پڑے اور ان کی آواز نہ سنی جائے۔ لیکن بے وفائی کا اخلاقی حق حاصل کرنے کے لئے انہیں پہلے وفادار ہونا پڑے گا۔ یہی وقت حکومت اور فن کار دونوں کا امتحان ہے۔ دونوں کو اس سخت امتحان کا مقابلہ کرنا ہے۔
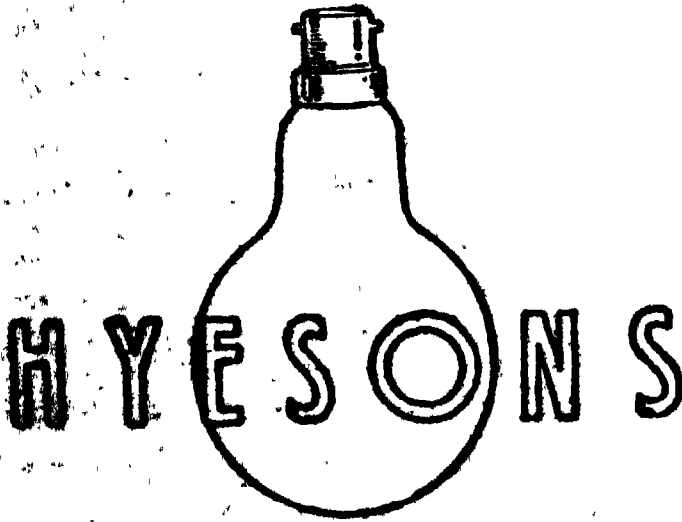
سیدہ نصیر اختر بانو

مشرقی پاکستان کا تمدنی و معاشرتی خاکہ

کراچی آنے کے بعد اور مغربی پاکستان کے باشندوں سے میل جول کے بعد میں نے محسوس کیا کہ مغربی پاکستان والے مشرقی پاکستان کی سرزمین سے قطعی ناواقف ہیں اور ہم انکے پار رہنے والوں کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ بنگال کا خطہ ہمیشہ مرکزی حکومت کے صدر مقام سے دور رہا ہے پاکستان قائم ہونے کے بعد یہ دوری اور بھی بڑھ گئی ہے۔ جب لوگوں میں آپس میں اتنی دوری ہو تو ایک دوسرے کی حالت سے کیسے واقف ہو سکتے ہیں۔ اس کمی کو اس طرح پورا کیا جا سکتا ہے کہ مشرقی پاکستان کے رہنے والے اپنے وطن کے حالات وقتاً فوقتاً لکھا کریں۔ تاکہ پاکستان کے دونوں حصوں سے یہ اجنبیت جاتی رہے۔ حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو اس دوری کے باوجود دونوں حصے بہت سی باتوں میں یکساں ہیں مشرقی پاکستان یعنی (بنگال اور سلہٹ) کی تہذیب و تمدن اور معاشرت میں اور مغربی پاکستان کی تہذیب و تمدن میں شاید ہی کوئی نمایاں فرق ہو۔ دراصل مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کی بنیاد اسلامی معاشرت پر قائم ہے جس میں جابجا مقامی رنگ کا اثر بھی شامل ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے مشرقی بنگال کا صوبہ ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ خلفاء کے وقت سے لیکر آج تک یہاں بھی مسلمانوں کی آمد و رفت بالکل ویسی ہی رہی جیسی ہندوستان کے کسی اور گوشے میں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہاں کے چھوٹے بڑے ہر شہر میں اسلامی عہد کے آثار قدیمہ موجود ہیں ڈھاکہ مشرقی بنگال کا قدیم دارالسلطنت بھی تھا اور اس کا نام ایک زمانہ میں جہانگیر نگر تھا۔ اس شہر میں تقریباً دو سو مساجد اور بزرگوں کے متعدد مزارات اس بات کے شاہد ہیں کہ ہمارے اسلاف نے جسطرح ہندوستان کے مغربی گوشے میں اسلام کا سکہ چلایا تھا وہ اس کے مشرقی حصے کو نہ بھولے تھے۔ یہ وہ بزرگان دین تھے جو اسلام اور ملت کی خاطر اپنے عزیز وطن کو چھوڑ کر۔ اللہ کے دین کو پھیلانے کے لئے دور دراز ناواقف زمینوں میں آبسے تھے۔ اجنبیوں کے ساتھ یوں دو باش اختیار کر کے انہیں اپنے شعار سکھائے اور انہیں شامل کر کے غیروں کی نگاہ میں اسلام کی عزت بڑھائی۔ چنانچہ آج بھی مشرقی پاکستان میں ایسے بہت سے خاندان موجود ہیں۔ جن کے آباؤاجداد عرب و ایران سے سیدھے اس علاقے میں آکر آباد ہوئے تھے۔ مشرقی پاکستان میں بھی شیخ۔ سید۔ قریش و انصار سب موجود ہیں اس کے علاوہ ہندوؤں کے خاندان ہیں جنہوں نے اسلام قبول کیا ہے ان خاندانوں میں سے بعض بہت مشہور ہیں۔ ان سب خاندانوں کے طرز معاشرت نے مشرقی بنگال کی معاشرتی اور تمدنی زندگی پر گہرا اثر ڈالا ہے، بالکل یہی حال سلہٹ کا ہے۔ یہاں شاہ جلال نامی ایک بزرگ کا مزار ہے۔ آپ نے جسوقت عرب سے ہجرت کی آپ کے ساتھ تین سو ساٹھ اولیاء اور بھی تشریف لائے تھے۔ ان کے علاوہ ہر پیشہ اور صنعت حرفت والے مسلمان بھی آئے تھے مثلاً درزی نائی دھوبی تک اس قافلے میں شامل تھے۔ عرب کے ان آنے والوں نے مشرقی پاکستان میں اسلامی تمدن قائم کیا۔ رفتہ رفتہ ان بزرگوں کی اولاد مشرقی پاکستان کے علاقے میں پھیل گئی۔ اور آج بھی ان کے خاندان والے موجود ہیں۔ انہی بزرگوں میں ہمارے جدامجد سید شاہ نصیر الدین بھی تشریف لائے تھے جنکا مزار سلطان نشی (جو اطراف سلہٹ میں ایک دیہات ہے) میں موجود ہے۔

زبان کو تمدن سے بہت گہرا تعلق ہے اردو زبان میں جسے آج قومی زبان ہونے کا فخر حاصل ہو رہا ہے اسلامی تمدن کا اثر بہ نسبت دوسری صوبہ جاتی زبانوں کے بہت زیادہ ہے ورنہ بعض صوبہ جاتی زبانیں خصوصاً بنگلہ زبان جو کہ مشرقی پاکستان کی مقامی زبان ہے بہ حیثیت زبان کے اپنے اندر وہ تمام خصوصیات رکھتی ہے جو کسی ترقی یافتہ زبان کے لئے ضروری ہے اور مشرقی بنگال کے مسلمان خواہ کسی علاقے میں رہتے ہوں اس زبان کو سمجھتے ہیں۔ لیکن ایک خاص چیز جس سے اردو کی اسلامی روایات کا پتہ چلتا ہے یہ ہے، کہ اس نے مسلمانوں کی بنگلہ پر تھوڑا بہت اثر ڈالا ہے۔ اور بنگالی بولنے والے ہندوؤں اور مسلمانوں کی زبان میں اور کوئی فرق ہو یا نہ ہو لیکن ایک فرق ضرور ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں کی بنگالی میں اردو کے زیادہ لفظ شامل ہیں اور ہندوؤں کی بنگالی میں ہندی کے۔ مثلاً مسلمان بنگالی اپنی زبان میں پانی کو پانی اور ہندو بنگالی جل کہتا ہے۔ اس کے قطع نظر دوسری بات یہ ہے کہ فارسی و عربی کے متعدد الفاظ بنگلہ زبان میں موجود ہیں۔ مثلاً باشت۔ بہشتی ہمیشہ

یہ فارسی لفظ ہے۔ یہ بھی مسلمانوں کے تمدن کا عکس ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اردو کو بنگال یا مشرقی پاکستان میں کیا درجہ حاصل ہے عام مسلمان یہاں تک کہ دیہاتوں میں بھی لوگ اردو سمجھتے اور ٹوٹی پھوٹی بول بھی لیتے ہیں لیکن شہروں میں تو اردو اچھی خاصی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ اردو مرکز سے نکلی اور مرکز کے نزدیک اطراف میں پھیلی۔ لیکن اس مشرقی خطہ (جو مرکز سے سب سے دور واقع تھا) کے مسلمانوں نے بھی اردو کو اسلامی تمدن کی نشانی سمجھکر اپنا لیا۔ بلکہ بعض خاندانوں نے تو اسے مادری زبان کی حیثیت سے اختیار کیا۔ اور اس کی ادبی خدمت بھی اس طرح کی جس طرح کہ مرکز سلطنت میں ادیب و شعرا اس کی خدمت کر رہے تھے۔ ایسے خاندانوں میں سے ایک میر اشرف علی کا خاندان بھی ہے جنکے پر پوتے نواب سید محمد آزاد مصنف خیالات آزاد سے اردو داں اچھی طرح واقف ہیں۔ ان کے خاندان والوں کی زبان اب تک اردو ہے۔

آجکل تو اردو کا بہت چرچا ہے اور خصوصاً کلکتہ میں اور ڈھاکہ میں بنگالیوں کے متعدد خاندان ایسے ہیں جن کے بچے بوڑھے اردو لکھتے پڑھتے اور بولتے ہیں۔ ان کے لئے اردو کی حیثیت بالکل مادری زبان کی سی ہے۔

مشرقی بنگال میں اسلامی تمدن کے جو اثرات زندگی پر نظر آتے ہیں ان کی ایک جھلک لوگوں کے لباس اور طرز بود و باش میں بھی نظر آتی ہے۔ شہر کے رہنے والے عام طور سے شیروانی اور کرتے پیجامے پہنتے ہیں لیکن کسان اور دیہات کا غریب طبقہ کرتے کے ساتھ تہہ بند یا لنگی باندھتا ہے۔ اور یہ لباس تقریباً وہی ہے جو یو۔ پی کے دیہاتی مسلمانوں کا ہے۔ عورتوں کا لباس ساڑی ہے یہ لباس امیر و غریب شہر و دیہات میں یکساں رائج ہے۔

طرز رہائش میں تو میرے نزدیک کوئی خاص فرق نہیں۔ ہندوستان کے دوسرے حصوں میں اور مغربی پاکستان میں جیسی بود و باش مسلمانوں کی ہے ویسی ہی بنگال کے مسلمانوں کی بھی ہے۔

مشرقی بنگال کے مسلمانوں کے رسم و رواج بھی عموماً اسلامی شعار کے مطابق ہیں۔ مثلاً بنگال میں لڑکیوں کو وراثت میں اسلامی شرع کے مطابق حصہ ملتا ہے۔ مغربی پنجاب میں حال ہی میں عورتوں کو یہ حق ملا ہے لیکن مشرقی پاکستان والے اس سلسلے میں بہت فراخ دل واقع ہوئے ہیں۔ دراصل یہ اسلام اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پابندی ہے۔ ویسے تو مسلمان ہر جگہ مذہب سے بیگانہ نظر آتے ہیں۔ لیکن مجموعی حیثیت سے مشرقی پاکستان کے مسلمان پابند شرع ہیں۔ شراب خواری یہاں بالکل نہیں۔ اور اب تو حکومت مشرقی پاکستان نے قانوناً شراب بند کروا دی ہے۔ امراء کا طبقہ ہر جگہ مذہب سے بیگانہ ہے لیکن یہاں یہ بات نہیں ہے۔ ہمارے لیڈر عموماً پابند صوم و صلوٰۃ ہیں اور اس چیز کا عوام پر بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔ امیر اور غریب سب اپنے آپ کو ایک ہی مسلک کا پابند سمجھتے ہیں۔

قدرت نے مشرقی پاکستان کو بے انتہا سبز و شاداب بنایا ہے۔ آب و باراں کی یہاں کمی نہیں۔ بلا شبہ یہ خطہ "سرزمین آب و دریا" ہے یہاں کے دریا اور ندیاں قابل دید ہیں۔

یہاں پھل اور پھول بکثرت ہوتے ہیں۔ کیلے ناریل۔ انناس بیگن یہاں کے خاص مشہور پھل ہیں۔ سلہٹ اور دار جلنگ کی نارنگیاں تو دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ اس کے علاوہ متعدد قسم کی جامنیں۔ بیر۔ شریفہ بیل پپیتا بھی یہاں پائے جاتے ہیں۔ اور فضا کی اس سرسبزی و شادابی کا اثر لوگوں کی زندگی پر پڑا ہے۔ اور یہ سرزمین ادب، شعر اور فنون لطیفہ کا سرچشمہ بنی ہے۔

ٹیگور سے کسی نے سوال کیا کہ آپ نے شاعری کیسے سیکھی؟ تو جواب دیا کہ جب میں بچہ تھا اور اپنے آبائی دیہات وکرامپور میں رہا کرتا تھا (جو مشرقی پاکستان میں واقع ہے) وکرام پور دریا کے کنارے آباد ہے۔ جب ملاح اپنی کشتیاں باندھکر گھروں کو چلے جاتے تو میں چپکے سے کسی ایک کشتی میں لیٹ جاتا۔ آسمان کی طرف دیکھا کرتا کبھی تو تارے گنتا۔ اور کبھی اطراف کا سبز و شاداب منظر۔ یہی دلفریب منظر مجھے نغمہ پر آمادہ کرتا تھا۔

ہندوستان کی مشہور شاعرہ مسز سروجنی نائیڈو کے آباء و اجداد بھی وکرامپور کے رہنے والے ہیں۔ مشرقی بنگال نغموں کی سرزمین ہے۔ یہاں کے رہنے والے موسیقی کے بڑے دلدادہ ہیں۔ اور عام طور پر لوگوں کی آوازیں بڑی سریلی ہوتی ہیں۔ خاص کر لڑکیاں جب کوئی گیت گاتی ہیں تو فضا بھی وجد کرنے لگتی ہے۔ فضا کا نغمہ لوگوں کے دلوں پر اثر کرتا ہے اور ہر دل نغمے سے معمور نظر آتا ہے۔

میاں بشیر احمد

اُردو پاکستان کی قومی زبان

پاکستان اور اردو کا گہرا تعلق ہے۔ یہ ایک نہایت دلچسپ اور اہم واقعہ ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ جس کی مساعی سے پاکستان حاصل ہوا اس کے قیام کی بڑی وجہ یہ تھی کہ یو۔پی کے ایک انگریز لفٹننٹ گورنر نے اردو ہندی کے جھگڑے میں ہندی کا ساتھ دیا اور مسلمانوں کے جذبات کا مطلق خیال نہ کیا۔ اردو کی ہستی کو مسلمانوں نے اپنی قومی ہستی کا سنگ بنیاد بنایا اور اس کے لئے وہ بڑی سے بڑی قربانی کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

آخر اردو کی اتنی اہمیت کیوں ہے؟ اردو فارسی اور ہندی کے ملاپ سے بنی۔ جب ہندوؤں کی ایک فعال جماعت نے اُردو سے منہ پھیر لیا تو گویا انہوں نے صاف ظاہر کر دیا کہ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کو ان کا مناسب مقام دینے پر تیار نہیں۔ پس مسلمان اردو کی اہمیت کو سمجھ گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ یہی وہ زبان ہے جو ان کے مقامی حالات اور قومی روایات کی صحیح آئینہ دار ہے۔ وہ تنگ نظر ہوتے تو ہندوؤں کی کم نظری پر وہ بھی اپنی تمدنی زبان فارسی کی طرف رجوع کرتے لیکن اپنی وسعت قلب کی بنا پر انہوں نے اُردو کو اپنایا اردو جس میں ادھر ہندوستان کے تمدن اور حالات کا عکس تھا اور اُدھر عرب و ایران کی تہذیب اور اسلام کے تصورات کی جھلک تھی۔

اردو کے دریا میں کئی ندیاں ملیں۔ پنجابی، ہندی، عربی، فارسی اور بعد میں انگریزی سب نے اس کے ذخیرۂ الفاظ اور حسن بیان کو بڑھایا۔ اردو شاعری نے بہت جلد ترقی کی اور آج ہم بغیر خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ اردو شاعری دنیا کی سب سے بڑی زبانوں کی شاعری کا کامیاب مقابلہ کر سکتی ہے۔ اسلامی تاریخ کا جتنا سرمایہ اردو میں موجود ہے۔ ہندوستان کی کسی اور زبان میں موجود نہیں۔ یہی حال اسلامیات کے دوسرے موضوعات کا ہے۔ ہند تہذیب و تمدن کے بیان سے بھی اردو کا لٹریچر خالی نہیں۔ دنیائے حاضر کے علوم و فنون بھی اردو میں منتقل کئے جا رہے ہیں۔ پھر اردو کی ساخت ایسی ہے کہ اس میں مختلف زبانوں کے عناصر آسانی سے سموئے جا سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ اردو ہی وہ زبان ہے جو برصغیر ہند کے طول و عرض میں بولی یا سمجھی جاتی ہے اس کا رسم خط تقریباً ساری اسلامی دنیا کا رسم خط ہے۔ مسلمانوں کے لئے یہ کیا باعث شرف اور موجب مسرت نہیں کہ اردو قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے "اسی لئے ہندوستان کے تمام مسلمان اسے رکھنا اور پھیلانا چاہتے ہیں"۔ یہ مرتبہ پاکستانی صوبوں کی کسی دوسری زبان کو حاصل نہیں۔ اس کے بعد کونسا آزاد اندیش مسلمان ہے جو اردو کی ہستی کو اپنی قومی ہستی اور اردو کی ترقی کو اپنی بقا تصور نہ کرے گا؟

اردو پاکستان کی قومی زبان ہے اس میں شک و شبہ کی ذرا بھی گنجائش نہیں لیکن ہمارے دوسرے قومی اداروں کی طرح قومی زبان کو بڑھانے اور پھیلانے کی بڑی ضرورت ہے۔ اردو کی بنیادیں مضبوط ہیں اس میں ترقی کرنے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس کے زبان و ادب کو کما حقہ فروغ دیں۔ اور ہماری قوم کا بچہ بچہ اس سرچشمۂ علم سے فیض یاب ہو جائے۔ اردو دنیا کی عظیم ترین زبانوں میں شمار ہونے لگے اور اردو کی تعلیم پاکستان بھر میں مفت اور لازمی ہو جائے۔ اس غرض سے پاکستان کی مرکزی حکومت کو اپنی جگہ اور صوبائی حکومتوں کو اپنی اپنی جگہ مناسب اقدامات کرنے چاہئیں۔ اب جب کہ ہم ایک آزاد قوم بن چکے ہیں ضروری ہے کہ جس قدر جلد ہو سکے انگریزی کی جگہ اردو لے لے۔ اردو شروع سے اخیر تک ذریعہ تعلیم بنے اور اگر کسی صوبے کے حالات ایسے ہیں کہ وہ فی الحال اردو کو ذریعہ تعلیم نہیں بنا سکتا تو وہاں کم از کم اردو کو ایک لازمی مضمون بنا دیا جائے۔

پنجاب اب اردو کا گھر ہے اس لئے سب سے زیادہ ذمہ داری پنجاب پر عائد ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں اردو اور صرف اردو کو رواج دے۔ اس میں حکومت کے دفاتر، محکمہ تعلیم، یونیورسٹی، علمی و ادبی انجمنیں علماء ادبا اور عام شہری سب کو حصہ لینا ہے۔

اقبال اکاڈمی کا قیام جس کا اعلان مرکزی حکومت کی طرف سے فروری ۱۹۵۱ء میں ہوا۔ صاف ظاہر کرتا ہے کہ پاکستان اور اردو کا تعلق کس قدر قریبی اور گہرا ہے۔ اقبال جو اردو کا سب سے بڑا شاعر اور اسلامی مفکر تھا پاکستان کا پہلا علمبردار تھا۔ اس نے ہمارے ادیبوں اور شاعروں کو ایک نئی راہ دکھائی اور ہماری ساری قوم کو جدوجہد اور صحیح قسم کی اسلامی زندگی بسر کرنے کی تعلیم دی۔ اس کی زبان پاکستان کی قومی زبان اردو تھی۔ ہمیں اب اسی کے نقش قدم پر چلنا اور اسی کی آواز پر لبیک کہنا ہے! ◆

غلام رسول مہر

شالامار باغ لاہور

لاہور کی حیثیت:- لاہور میں آگرہ کے تاج محل یا دہلی کے دیوان خاص اور دیوان عام جیسی یگانۂ روزگار عمارتیں تو کبھی نہیں تھیں لیکن یہ بڑا پرانا شہر ہے۔ دہلی سے ڈیڑھ پونے دو سو برس پہلے اسلامی عملداری میں آیا۔ غزنی کی تباہی کے بعد غزنوی بادشاہوں کا پایۂ تخت رہا۔ مغلوں کے عہد عروج میں آگرہ اور دہلی کے بعد سلطنت کا تیسرا بڑا مرکز تھا۔ اور "دارالسلطنت" کے پر افتخار لقب سے ملقب رہا۔ اس لئے یہاں بھی بڑی عالی شان عمارتیں بن گئی تھیں۔ راحت افزا باغ لگ گئے تھے لیکن مغلوں کے عہد زوال اور سکھوں کے دور حکومت میں اکثر عمارتیں منہدم ہو گئیں یا ان کی وضع و ہیئت اس طرح منقلب کر دی گئی کہ آج پرانے تذکروں کو سامنے رکھ کر کوئی شخص چاہے بھی تو ان کی پہلی حالت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا۔

بیگم پورہ:- مثلاً آج باغبان پورہ اور لاہور کے درمیان حضرت ایشاںؒ کے مقبرے کے آس پاس کچھ نظر آتے ہیں یا کچھ عمارتیں بن گئی ہیں۔ کیا اس مقام پر پہنچ کر کسی اجنبی کو یقین آئے گا کہ صرف دو سو سال پیشتر اس جگہ حاکمان پنجاب کے عالی شان محل تھے اور یہ مقام حکومت پنجاب کا مرکز تھا؟ آج ایک خستہ مسجد اور چند شکستہ قبروں کے سوا کیا باقی رہ گیا ہے؟ انھیں میں سے ایک قبر شرف النساء بیگم کی ہے جس کے متعلق علامہ اقبال نے فرمایا ہے۔

قلزم ما ایں چنیں گوہر نہ زاد ÷ ہیچ مادر ایں چنیں دختر نہ زاد
خاک لاہور از نوازش آسماں ÷ کس نہ داند باز او را در جہاں
تاز قرآں پاک مے سوزد وجود ÷ از تلاوت یک نفس فارغ نہ بود
در کمر تیغ دو رو قرآں بدست ÷ تن بدن ہوش و حواس اللہ مست

پھر جب موت کا وقت قریب آیا تو شرف النساء بیگم نے ماں سے کہا کہ شمشیر اور قرآن ایک دوسرے کے محافظ ہیں اور زندگی کے محور ہیں۔ عمر بھر یہی دو چیزیں میری محرم رہیں۔ یہی دو چیزیں میری قبر پر رکھی جائیں اس لئے کہ:

مومناں را تیغ با قرآں بس است
تربت ما را ہمیں ساماں بس است

وزیر خاں کا باغ:- کیا کوئی شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ جہاں آج کل تعلیمات کا دفتر، یونیورسٹی کی عمارتیں، عجائب خانہ پبلک لائبریری وغیرہ واقع ہیں یہاں نواب وزیر خاں کا بہت بڑا باغ تھا جو کھجوروں کے درختوں کی کثرت کے باعث "نخلیہ" کے نام سے مشہور ہو گیا تھا؟ اس باغ کے آثار میں سے صرف ایک بارہ دری باقی رہ گئی ہے جو غالباً پچاس برس تک پبلک لائبریری کی تنہا عمارت تھی اور آج بھی اس میں لائبریری کی کتابوں کا ایک حصہ موجود ہے۔

مختلف باغات:- اسی طرح شہر کے اطراف میں دور دور تک بڑے بڑے باغات تھے۔ شالا راوی کے کنارے مرزا کامران کی بارہ دری حقیقتہً ایک باغ میں تھی۔ اب وہ باقی نہیں رہا۔ نورجہاں کا ایک باغ تھا جو بعد میں جہانگیر کا مقبرہ بنا۔ آصف خاں کا بھی باغ تھا جس میں وہ دفن ہوا۔ اسی طرح نواں کوٹ کی سمت میں زیب النساء بیگم کا باغ تھا جس کا صرف ایک دروازہ باقی رہ گیا ہے۔ نہ کہ آج کل جو برجی کہتے ہیں۔ باغبان پورہ کی سمت میں عنایت باغ، مہتاب باغ، انگوری باغ، گلابی باغ، اور باغ دارا واقع تھے۔ اب وہ ناپید ہو گئے۔ ان میں سنگ مرمر کی جتنی عمارتیں تھیں وہ سکھوں نے ڈھا دیں اور سنگ مرمر نکال کر امرتسر میں رام باغ اور دربار کی تعمیر کے لئے لے گئے بلکہ قبروں کے مرمریں تعویذ بھی نہ چھوڑے۔ شالامار البتہ سخت جان تھا کہ حوادث کے تمام سیل گزر چکنے کے باوجود اب تک اس حالت میں باقی ہے کہ انسان اس میں بیٹھ کر پہلی عظمت کا دھندلا سا خاکہ اپنے دماغ میں قائم کر سکے۔

شالامار کا ماحول:- شالامار کا ماحول پہلے وہ نہ تھا جو آج ہمیں نظر آ رہا ہے۔ اس کے آس پاس متعدد باغ تھے جو اب ویران ہو چکے ہیں۔ محض درخت اور عمارتیں ہی نہیں بلکہ ان کے احاطوں کی دیواریں بھی باقی نہیں رہیں۔ جب یہ تمام باغ موجود ہوں گے تو شالامار کے ارد گرد دور دور تک سبزے، طراوت اور شادابی کی بہار جلوہ ریز ہوگی۔

باغ کی کیفیت:- شالامار کی تعمیر کا آغاز [illegible] میں یعنی شاہجہاں کے جلوس کے چھٹے یا ساتویں سال خلیل اللہ خاں کی نگرانی میں ہوا۔ چھ لاکھ روپے کے خرچ سے تعمیر ایک سال، پانچ مہینے اور چار دن میں تکمیل کو پہنچی۔

غالباً کشمیر کے شالامار کا نمونہ سامنے رکھا گیا تھا۔ اور اسی وجہ سے نام بھی شالامار رکھا گیا۔ کشمیر کا شالامار پہاڑ کے دامن میں واقع تھا۔ اس لئے کابل کے باغ بابر کی طرح اس میں قدرتی طور پر درجہ بندی کا انتظام ہو گیا تھا۔ لاہور کے میدانی علاقے میں اس قسم کی درجہ بندی مشکل تھی اس لئے زمین کھود کر باغ کی جگہ فراز و نشیب کی وہ کیفیت پیدا کی گئی جو کشمیر اور کابل میں قدرتی طور پر موجود تھی کشمیر کے [illegible] اور کابل کے باغ بابر کی جگہوں میں قدرت نے حسن و جمال کی [illegible] ودیعت کر دی تھی۔ انسانی صنعت گری نے مشاطگی کر کے زیادہ آراستہ کر دیا۔ لاہور کے شالامار کا سارا حسن صرف انسانی صنعت گری کا کرشمہ تھا۔ لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہمارا شالامار اگر منظر کی دلکشائی کے لحاظ سے اپنے کشمیری ہمنام یا باغ بابر سے بڑھا ہوا نہیں تو کسی حالت میں کم بھی نہیں ہے۔

مصارف کا مسئلہ:- چھ لاکھ کا خرچ ہمارے عہد کے معیارات کی بنا پر غالباً زیادہ معلوم نہیں ہو گا۔ لیکن نہ محض شالامار بلکہ مغلوں کی تمام عمارتوں کے مصارف کا اندازہ کرتے وقت چند حقیقتیں [illegible] نظر رکھنی چاہئیں۔ مثلاً:-

(۱) [illegible] کے زمانے میں روپے کی قیمت بہت زیادہ تھی اور بڑے سے بڑے کاریگر زیادہ سے زیادہ چار آنے یومیہ اجرت پاتے تھے۔

(۲) شاہی عمارتوں کے مصارف میں ساز و سامان کا خرچ شامل نہیں کیا جاتا تھا اس لئے کہ پتھر اور دوسری ضروری چیزیں شاہی ذخیروں سے آتی تھیں۔

(۳) عمارتوں کے بڑے بڑے مہتمم اور نگران کار بالعموم امرا ہوتے تھے۔ جن کو ہمارے زمانے کے انجینیروں کی طرح تنخواہیں نہیں ملتی تھیں۔ وہ جاگیردار اور منصبدار ہوتے تھے اور ان کی تنخواہیں عام خرچ میں محسوب ہوتی تھیں گویا سمجھنا چاہئے کہ چھ لاکھ روپے محض مزدوروں اور کاریگروں کی اجرت میں صرف ہوئے۔

نام کا مسئلہ:- "شالامار" نام کی توجیہ میں بڑی موشگافیاں کی گئی ہیں۔ صحیح یہی ہے کہ یہ ترکی لفظ ہے جس کے معنی ہیں "عشرتگاہ یا خانۂ عیش"۔ یہ نام اگرچہ اصل میں اجنبی تھا لیکن چونکہ اس کے مختلف اجزا پہلے سے یہاں کی زبانوں میں موجود تھے۔ اس لئے بے تکلف زبانوں پر چڑھ گیا اور اب کسی کو اجنبیت کا احساس بھی نہیں ہوتا۔

ایک مرتبہ رنجیت سنگھ کے دربار میں بھی اس نام پر بحث چھڑی تھی۔ رنجیت سنگھ کو اس کے ترکی ہونے کا یقین نہ آیا۔ لیکن چونکہ لفظ "مار" پنجابی زبان میں اچھے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا اس لئے مہاراجہ نے باغ کا نام "شالامار" کے بجائے "شہلا باغ" مقرر کر دیا۔ لیکن شالامار کے نام کی صحت کو اس سے کوئی گزند نہ پہنچا۔

پورے باغ کا نام شالامار تھا لیکن اس کے مختلف درجوں کے الگ الگ نام رکھے گئے تھے۔ مثلاً پہلے اور سب سے اونچے درجے کا نام "فرح بخش" تھا۔ دوسرے اور تیسرے درجے کو "فیض بخش" کہتے تھے۔ لیکن یہ نام صرف عالمگیر کے عہد تک قائم رہے پھر شالامار کے سوا سب نام مٹ گئے۔

باغ کی وضع و ہیئت:- یہ باغ مستطیل ہے جس کا طول پانسو بیس گز اور عرض دو سو تیس گز ہے۔ پورے باغ کا رقبہ تیس ایکڑ سے کم نہ ہو گا۔ اس کے تین درجے ہیں جن میں سے پہلا اور تیسرا درجہ قریباً یکساں ہیں۔ دوسرا درجہ ذرا چھوٹا ہے۔ پہلے اور دوسرے درجے کی سطح میں کم و بیش پندرہ فٹ کا فرق ہو گا۔ دوسرے اور تیسرے درجے کی سطح کا فرق آٹھ دس فٹ سے زیادہ معلوم نہیں ہوتا۔

پہلا درجہ یعنی "فرح بخش" صرف شاہی حرم کے لئے مخصوص تھا۔ دوسرے درجے میں خاص امرا سے ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ تیسرے درجے میں عام امرا بیٹھے آتے رہتے تھے۔ گویا دوسرا درجہ بادشاہ کا دیوان خاص اور تیسرا درجہ دیوان عام تھا۔

درجوں کی کیفیت:- پہلے درجے کی آخری حد پر سنگ مرمر کی نہایت خوبصورت اور [illegible] بنی ہوئی تھی۔ عین وسط میں بارہ دری تھی جو اب بھی موجود ہے اگرچہ اس کی پہلی حالت باقی نہیں رہی۔ جالی کی وجہ سے "فرح بخش" ایک پردہ دار محل [illegible] حصے میں دو نہریں ہیں ایک فرح بخش کو طولاً اور دوسری عرضاً دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے، وسط میں جہاں یہ نہریں ملتی ہیں ایک چھوٹا سا حوض بنا ہوا ہے۔ اس طرح فرح بخش چار حصوں میں منقسم ہو گیا [illegible] حوض میں فواروں کی قطاریں لگی ہوئی ہیں۔ تقریباً یہی کیفیت [illegible] کی ہے۔

دوسرے درجے میں بڑے تکلفات سے کام لیا گیا ہے [illegible] فرح بخش کی نہر بارہ دری کے نیچے سے گزرتی ہوئی دوسرے درجے میں گرتی ہے تو

نشیب کے مقام پر سنگ مرمر کا ایک خوبصورت جھرنا بنا دیا گیا ہے۔ نیچے بیٹھ کر پانی کے گرنے کی بہار دیکھیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صاف شفاف پانی کے موتی لڑھکتے چلے آتے ہیں جھرنے کے قریب ہی بے داغ سنگ مرمر کا ایک خوبصورت تخت ہے۔

پھر ایک وسیع حوض آتا ہے جو شکل میں مستطیل ہے۔ اس کے کنارے پر دائیں بائیں چھوٹی چھوٹی بارہ دریاں یا سائبان سے بنے ہوئے ہیں، ان سے حوض کے وسط تک آنے جانے کا راستہ ہے۔ عین وسط میں سنگ مرمر کا خوبصورت شہ نشین ہے۔

دوسرے درجے کی آخری حد پر شمالی سمت میں حوض کا پانی نہر کی چوڑائی کی برابر نیچے گرتا ہے اور وہاں سنگ مرمر کا ایک حجرہ سا بنا ہوا ہے جس پر کوئی چھت نہیں۔ اس حجرے کی چاروں دیواروں میں چراغ رکھنے کے لئے محرابی طاق بنے ہوئے ہیں اسے حجرۂ چراغاں کہنا چاہیے۔ اس کے اوپر دونوں جانب چھوٹے چھوٹے سائبان سے ہیں۔ وہاں سے نہر تیسرے درجے میں چلی جاتی ہے۔

تیسرے درجے کے حوض میں بھی فواروں کی قطاریں لگی ہوئی ہیں۔ بادشاہ جب آتے تھے تو نہروں میں پانی جاری ہو جاتا۔ فوارے چھوڑ دئے جاتے۔ رات کے وقت حوض کے نیچے کے کمرے میں چراغ رکھ دئے جاتے۔ اوپر سے پانی گرتا۔ اس طرح مجموعی طور پر دل آویز مناظر کی جو بہار پیدا ہوتی تھی اس کا آج صرف اندازہ کیا جاسکتا ہے اسے دیکھا نہیں جاسکتا۔ اس لئے کہ شالامار اگرچہ باقی ہے لیکن اس کی پہلی شان وعظمت باقی نہیں رہی۔

پانی کا انتظام:۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ یہ باغ مشہور ایرانی امیر علی مردان خاں کی نگرانی میں بنا تھا۔ یہ صحیح نہیں۔ باغ ۱۶۳۹ء میں تیار ہو چکا تھا اور علی مردان خاں ۱۶۳۹ء میں قندھار سے ہندوستان آیا۔ اس کی بنیاد ۱۰۴۱ھ (۱۶۳۲ء) میں رکھی گئی تھی جیسا کہ مندرجہ ذیل رباعی سے ظاہر ہے۔

چوں شاہجہاں بادشہ حامی دیں
آراستہ شالامار باطرز متیں
تاریخ بنائے ایں ز رضوان جستم
گفتا کہ بگو: "نمونۂ خلد بریں"
۱۰۵۱ھ

بعد اس کے لئے پانی کی مستقل نہر کا انتظام علی مردان خاں نے کیا۔

اور مادھوپور سے نہر نکال کر لاہور لائی گئی جہاں سے انگریزی عہد میں لوئر باری دوآب نکالی گئی۔ اس نہر پر ایک لاکھ روپے صرف ہوئے۔ میر ملا علاء الملک نے مزید ایک لاکھ روپے خرچ کر کے نہر کو اتنا چوڑا کر دیا کہ شالامار کے علاوہ لاہور کے دوسرے باغوں اور عام لوگوں کے کھیتوں کو پانی ملنے لگا۔

موکب خسروی:۔ باغ اگرچہ ۱۶۴۲ء میں بن چکا تھا اور اس کے لئے پانی کا انتظام بھی ہو گیا تھا لیکن شاہجہاں پہلے پہل ۹ شعبان ۱۰۵۲ھ (۲۱ نومبر ۱۶۴۲ء) کو اسے دیکھنے کے لئے آیا بہت خوش ہوا۔ پھر جب وہ لاہور آتا تو حرم سمیت اسی باغ میں ٹھہرتا۔ اس میں ایسی عمارتیں موجود تھیں کہ خیمہ وغیرہ لگانے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ شاہجہاں کے بعد بھی بادشاہوں کا دستور یہی رہا۔

دور خزاں:۔ عالمگیر کے بیٹے بہادر شاہ اول کے عہد تک باغ کی پہلی عظمت شان بحال رہی۔ بعد کی خانہ جنگیوں کے باعث باغ سلطنت کی خزاں کی زد میں آگیا۔ اس حالت میں شالامار کا خیال کسے رہ سکتا تھا؟ تاہم اس کی عمارتیں اصل حالت میں باقی تھیں۔ معین الملک عرف میر منو پنجاب کا آخری مغل گورنر تھا جس نے ۱۷۵۳ء میں وفات پائی۔ اس کے بعد باغ [illegible] کی ساری آرائشوں سے محروم ہو گیا گویا اس کی رونق کا کفن زار دشت کی گزرگاہ بن گیا۔

سکھوں کا زمانہ:۔ پھر دہلی کے مرکز میں معاملات [illegible] پنجاب میں آدینہ بیگ کا ظہور ہوا۔ [illegible] نے مرکز کو غیر مسلم قوتوں کی جولانگاہ بنا دیا، پنجاب میں آدینہ بیگ نے سکھوں کو ابھار کر بدنظمی کو فروغ دے دیا۔ احمد شاہ ابدالی جب تک زندہ رہا سکھوں کے لئے قدم جمانے کا موقع پیدا نہ ہوا۔ اس کی وفات کے بعد [illegible] سردار لاہور پر قابض ہو گئے۔ ان میں سے گوجر سنگھ شالامار سے لے کر [illegible] تک کے علاقے پر قابض تھا۔ لہنا سنگھ کے قبضے میں قلعہ کے علاوہ مستی دروازہ، خضری دروازہ، کشمیری دروازہ اور روشنائی دروازہ کا علاقہ تھا۔ [illegible] انارکلی اور نواں کوٹ کی سمت کا مالک بن گیا تھا۔

زمان شاہ درانی نے سکھوں کے استیصال کا [illegible] سلطنت خانہ جنگی میں جاتی رہی پھر کابل یا دہلی کے تاجداروں میں سے کوئی صاحب جوہر نہ اٹھا جو ہندوستان کی فضا کو [illegible]۔ اس حالت سے فائدہ اٹھا کر رنجیت سنگھ نے پنجاب کو لے لیا لیکن یہ کوئی مستقل حکومت نہ تھی بلکہ ایک طرح کی لوٹ کھسوٹ تھی جس کا [illegible]

خاص نہر [illegible]

میں بھی درہم برہم ہوگیا۔

شالامار اور سکھ:۔ سکھوں کے عہد میں شالامار غارت گری کا ہدف بنا۔ حوض کے شہ نشین پر سنگ یشب کا ایک سائبان تھا جسے لہنا سنگھ نے اتار کر چھ ہزار روپے میں سنگ تراشوں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ آج کوئی شخص یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ اس سائبان کی قیمت حقیقۃً کیا ہوگی۔ البتہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس سائبان کے ٹکڑے سنگ تراشوں نے لہنا سنگھ جیسے قدرناشناس کے ہاتھ سے چھ ہزار میں خریدے وہ یقیناً لاکھ دو لاکھ سے کم کا نہ ہوگا۔

رنجیت سنگھ کے عہد میں بارہ دری کا سنگ مرمر اتار لیا گیا۔ اسی سلسلے میں وہ نفیس اور خوبصورت جالی بھی اکھاڑ لی گئی جو "فرح بخش" اور "فیض بخش" کے درمیان پردے کا کام دیتی تھی۔ پھر چونے سے بارہ دری کی مرمت کر دی گئی۔ اور چونے ہی کی ایک منڈیر جالی کی جگہ بنا دی گئی جو آج بھی نظر کے لئے جراحت کا سامان بنی ہوئی ہے۔

سکھ فرماں رواؤں میں سے صرف شیر سنگھ کو شالامار باغ سے ایک گونہ انس تھا۔ لیکن وہ باغ کی سابقہ عظمت کو کیا بحال کر سکتا تھا جبکہ نہ اسے سنگ مرمر مل سکتا تھا، نہ مغلیہ عہد کے کاریگر میسر تھے۔

بحالی کی ضرورت:۔ لیکن قدرناشناسوں کے تصرف و دستبرد کے باوجود شالامار کا عام نقشہ اب تک باقی ہے۔

یک جہاں کدورت - بانایں خرابہ جائیست

سر سکندر حیات خاں مرحوم و مغفور نے شاہی مسجد کی پہلی شان کو بحال کر دینے کا بندوبست کر دیا تھا۔ شالامار مغلوں کے عہد کی ایک بہت بڑی یادگار ہے۔ ہندوستان کے ان اہم اسلامی آثار میں سے ہے جو پاکستان کے حصے میں آئے ہیں۔ کاش ہماری حکومت اس پر خاص توجہ مبذول کر سکے۔ یعنی اس کی نہریں صاف ہو جائیں۔ فوارے از سر نو لگ جائیں۔ سڑکوں کی درستی کا انتظام کر دیا جائے۔ سنگ مرمر کی جالی کی جگہ پہلے جتنی اونچی نہیں تو کم از کم تین فٹ اونچی جالی لگ جائے۔ بے شک ہمارے سامنے اس سے اہم تر کام ہیں جو فوری توجہ کے محتاج ہیں لیکن چند لاکھ روپے کے خرچ سے یہ باغ جلد بہتر حالت پر پہنچ سکتا ہے۔ اس کا انتظام بہتر ہو سکتا ہے اور مسلمانوں کے دور شوکت و جلال کے آثار کو ہم محفوظ نہیں کریں گے تو اس امید کو اور کون پورا کرے گا؟ ہندوستان پر ہماری حکمرانی کی بارہ صدیاں اس انتظار میں ہیں کہ کب ان کے لئے قلب مضطر کی ٹھنڈک کا سامان بہم پہنچتا ہے۔ ان آثار کو

عشرت رحمانی

قطعات

دو عیدیں

چمن چمن ہے بہاراں کلی کلی رقصاں
ہر ایک بندۂ مومن خوشی سے ہے خنداں
دوگونہ عید مسرت ہے آج ملت کو!
یہ عید فطرہ بھی ہے اور عید پاکستاں!

جشن پاک مبارک!

الٰہی مرغِ حرم کو چمن مبارک ہو
نیا ہے دور، نئی انجمن مبارک ہو
منائیں آج مسلمان یوم آزادی!!
ہمیں یہ پاک، یہ پیارا وطن مبارک ہو!

دیکھنے والے لاکھوں زائر آئے اور یقیناً ان کی خستگی و شکستگی پر انہیں افسوس ہوا ہوگا لیکن کل تک ہم یہ عذر پیش کر سکتے تھے کہ اختیارات کی باگ دوسروں کے ہاتھ میں ہے۔ اب اس عذر کے لئے بھی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ ہم ان لوگوں کی میراث سنبھالے بیٹھے ہیں جو جب تک روئے زمین پر تھے اسے غازۂ جمال بنے رہے۔ جب حیات مستعار کو ختم کر کے [illegible] دربار میں پہنچے تو تاریخ و سوانح کی کتابوں کے لئے [illegible] چھوڑ گئے۔ ہمیں اس میراث کا حق ایسے طریق پر ادا کرنا چاہئے کہ [illegible] نسلیں ہماری نیک نامی کے گیت گائیں۔

شالامار باغ - لاہور

(دائیں طرف) محراب میں سے باغ کے درمیانہ حصے کا خوبصورت منظر -

(نیچے دائیں طرف) باغ کا ایک عام منظر -

(نیچے بائیں طرف) باغ کی بارہ دری کا ایک بیرونی منظر -

باغ کا مشہور تالاب اور اس کے کنارے شاہی تخت -

↓
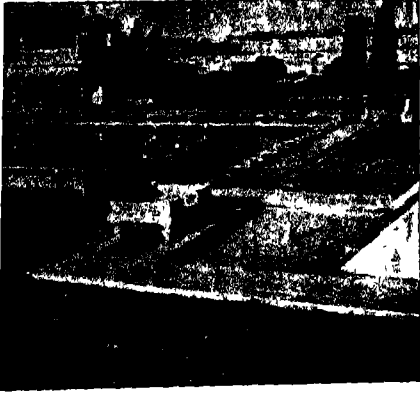
پاکستان کے سکے

یکم اپریل ۱۹۴۸ء کو جب پاکستان کے وزیر مالیات نے نئے سکوں کے ایک خوبصورت ڈبے میں رکھ کر پاکستان کے نئے سکے قائد اعظم محمد علی جناح کی خدمت میں پیش کئے تو پاکستان کی معاشی زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

دائیں طرف قائد اعظم نئے سکے ملاحظہ فرما رہے ہیں۔

اوپر کی تصویر پاکستان کے پانچ روپئے کے نوٹ کی ہے۔

داہنی طرف کی دو تصویروں میں پاکستانی سکوں کے دونوں رخ نظر آرہے ہیں۔ اس شمارہ میں "پاکستان کا نظام زر" کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہو رہا ہے۔ اس میں ان سکوں کا ذکر ملاحظہ فرمائیے

ڈاکٹر انور اقبال قریشی
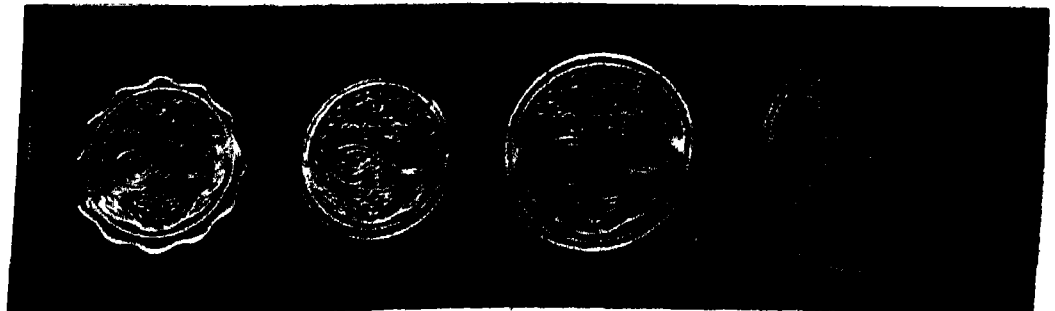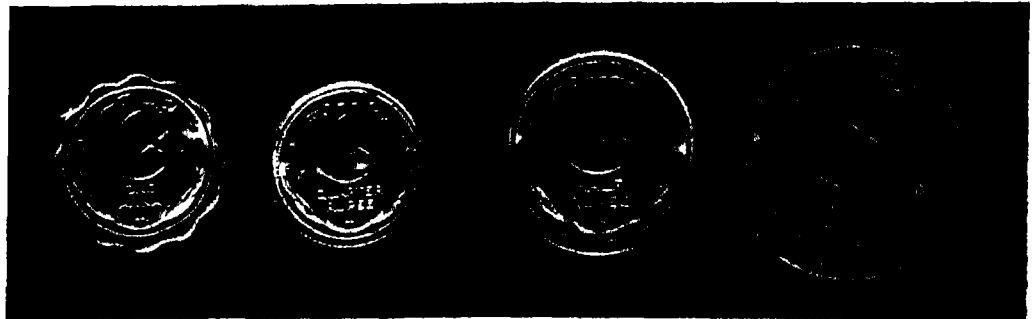
پاکستان کا نظامِ زر

کسی ملک کو صحیح معنوں میں ایک خود مختار سلطنت بننے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے اُن میں سے ایک یہ ہے کہ اس ملک میں خود اپنے نوٹ اور روپے پیسے جاری ہوں اور اس میں ایک ایسا نظامِ زر قائم کیا جائے جسے نہ صرف اس ملک کے باشندے بدل و جان قبول کرنے کے لئے تیار ہوں بلکہ دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی اس زر کی ساکھ قائم ہو اور دوسرے ممالک کے زر کے ساتھ باآسانی اسکا تبادلہ عمل میں آسکے۔

ایک اچھے اور عمدہ نظامِ زر کی نشانی یہ ہے کہ اندرونِ ملک لوگوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے علاوہ اسکا مبادلہ دوسرے ملکوں کے زر کے ساتھ مقررہ اور معینہ شرح پر عمل میں آئے اور اسکی ساکھ ایسی ہو کہ اس کے زر پر دوسرے ممالک میں کوئی خاص شبہ نہ لگے۔

۱۵ اگست کو جب مملکتِ پاکستان کا وجود عمل میں آیا تو اس ملک کا خود اپنا کوئی زر نہ تھا۔ پاکستان میں کئی مہینے تک ہندوستان ہی کے نوٹ اور روپے پیسے چلتے رہے۔ گویا اس اصول کے لحاظ سے جو ابھی بیان کیا گیا ہے۔ پاکستان کی آزادی صحیح معنوں میں مکمل نہ تھی۔ اس کی تکمیل کے لئے ضروری تھا کہ پاکستان میں اس کے اپنے سکے اور نوٹ مروج ہوں۔ پاکستان کی حکومت اس کمی سے بے خبر نہ تھی لیکن اسے روبہ عمل لانے کے لئے وقت درکار تھا۔

یہ محض ایک جغرافیائی اتفاق ہے کہ سرکاری چھاپہ خانہ جس میں سابقہ ہندوستان کے نوٹ چھپتے تھے اور اکثر ٹکسالیں جو روپے پیسے ڈھالتی تھیں ان علاقوں میں ہیں جو اب انڈین یونین کے حصے میں آئے ہیں۔ ریزرو بینک کا صدر دفتر بھی انڈین یونین کے علاقہ میں ہے۔

ہندوستان کی تقسیم اس بجلی کی سی سرعت کے ساتھ عمل میں آئی کہ نہ پاکستان اپنا مرکزی بینک قائم کر سکا اور نہ بیرونی ممالک سے نوٹ چھاپنے کے لئے مشین خرید سکا۔ اسلئے کچھ عارضی عرصہ کے لئے گزشتہ نظام ہی کو قائم رکھنا پڑا۔ پاکستان میں پرانے ہندوستان کے نوٹ اور روپے پیسے چلنے لگے۔ انڈین یونین کے ساتھ پاکستان نے یہ معاہدہ کیا کہ ستمبر [illegible] کے اواخر تک ریزرو بینک آف انڈیا دونوں حکومتوں کے مرکزی بینک کی حیثیت سے کام کرتا رہیگا۔ ۳۱ مارچ ۱۹۴۸ء تک پاکستان میں بھی وہی سکے اور نوٹ جاری رہیں گے جو غیر منقسم ہندوستان میں جاری تھے۔ اسی عرصہ میں پاکستان اپنی لاہور کی ٹکسال میں اپنے نئے سکے تیار کرنے شروع کر دے گا جو پاکستان میں یکم اپریل ۱۹۴۸ء میں جاری ہونگے۔

اسی تاریخ کو پاکستان میں جو نوٹ جاری ہوں گے ان پر الفاظ "حکومت پاکستان" کا اضافہ کر دیا جائیگا۔ چھ مہینے تک یہ نوٹ پرانے ہندوستانی نوٹوں کی جگہ حاصل کریں گے اسی عرصہ میں پاکستان اپنا مرکزی بینک قائم کرے گا اور یکم اکتوبر ۱۹۴۸ء کو خالص اپنے نئے نوٹ جاری کریگا۔ اور ہندوستان کے نوٹ چلنا بند ہو جائیں گے اور اسی تاریخ سے پاکستان اپنا مکمل آزاد اور خود مختار نظامِ زر بروئے کار لائیگا۔

بظاہر یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ہندوستان کے نوٹ تو پاکستان میں زر قانونی کی حیثیت سے جاری رہیں لیکن پاکستانی نوٹوں کی ہندوستان میں یہ حیثیت نہ ہو۔ اگر اس مسئلہ پر تھوڑا سا بھی غور کیا جائے تو حقیقت فوراً سمجھ میں آجاتی ہے۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۴۸ء کے بعد ہندوستان کے نوٹ بھی پاکستان میں اسی طرح غیر قانونی حیثیت اختیار کرلیں گے جس طرح آج پاکستانی نوٹ ہندوستان میں ہیں یا کسی دوسری مملکت کے نوٹ۔ ہندوستانی نوٹوں کے ساتھ جو بظاہر امتیازی سلوک روا رکھا گیا ہے یہ خود ہمارے باشندوں کی سہولیت کے لئے کیا گیا ہے۔ اور انہیں چھ ماہ کا موقع دیا گیا ہے تاکہ وہ تمام ہندوستانی نوٹوں کو آرام اور سہولیت کے ساتھ پاکستانی نوٹوں میں تبدیل کروا سکیں۔

جس طرح ہماری اپنی پسند کے نئے سکے یکم اپریل سے جاری کئے گئے ہیں اسی طرح ہمارے اپنے نئے نوٹ یکم اکتوبر ۱۹۴۸ء سے جاری ہونگے اور ہندوستان کے نوٹوں کا عام چلن پاکستان میں بند ہو جائیگا۔ بعض بے صبر لوگ اکثر یہ پوچھتے ہیں کہ اپنے نوٹ اور سکے جاری کرنے کے لئے اس قدر دیر کیوں ضروری تھی۔ یہ پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی [illegible]

نوٹ اور سکے کیوں جاری نہیں کر دیئے گئے جو لوگ انتظامی دشواریوں کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں اُن کی سمجھ میں یہ بات فوراً آجائیگی کہ یہ کام کسقدر وقت طلب ہے۔ جیسا کہ ابھی ہم نے بتایا پاکستان کے علاقہ میں کوئی ایسا چھاپہ خانہ نہیں جہاں ہمارے نوٹ چھاپے جا سکیں۔ اس کام کے لیئے خاص پریس کی ضرورت ہوتی ہے۔ نوٹ بنانے کے لئے کاغذ بھی باہر سے منگوانا ہوتا ہے جو خاص ڈیزائن کا تیار کروانا ہوتا ہے۔ بیرونی ممالک میں بھی ان تمام چیزوں کی کمی ہے۔ اس کے علاوہ نوٹوں کے ڈیزائن تیار کرنے کے لئے بھی بہت وقت اور غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے۔

یہاں یہ بات برسبیل تذکرہ بیان کرنا بے محل نہ ہوگا کہ انڈین یونین جس کے پاس پریس بھی ہے اور کاغذ بھی ابھی تک نہ تو اپنے نئے سکے بنا سکی اور نئے نوٹ۔ وہاں بھی وہی پرانے نوٹ اور سکے جاری ہیں حالانکہ قاعدہ کی رو سے انڈین یونین کا قیام عمل میں آتے ہی ان کے نئے سکے فوراً جاری ہو جانا چاہئیں تھے۔ لیکن وہاں ابھی تک صرف ڈیزائن ہی تیار ہو رہے ہیں۔ گزشتہ سطور میں ہم نے یہ بتایا ہے کہ وہ کیا دقتیں اور دشواریاں تھیں جنکی وجہ سے قیام پاکستان کے ساتھ ہی پاکستان کا اپنا روپیہ جاری نہ کیا جا سکا۔

اب یکم اپریل سے پاکستان کا نیا روپیہ جاری ہو گیا ہے لیکن ۳۰ رجون تک نظام زر کی حد تک پاکستان کلیتہً خود مختار نہ تھا۔ کیونکہ اس کے نظام زر کی نگرانی ہندوستان کے ریزرو بنک کے ہاتھ میں تھی۔ اگست ۱۹۴۷ء کے معاہدے کی رو سے یہ طے ہوا تھا کہ ۳۰ ستمبر ۱۹۴۸ء تک ریزرو بنک پاکستان کے بنک کار کی حیثیت سے کام کریگا۔ اسکے بعد پاکستان کو اپنا بنک قائم کرنا ہوگا اس وقت یہ خیال تھا کہ بہت سی عملی دشواریوں کی وجہ سے پاکستان کا اپنا بنک اس سے پہلے قائم نہ ہو سکیگا۔ اس لئے کہ ہندوستان کا ریزرو بنک قائم کرنے میں تو تقریباً پچاس سال لگ گئے تھے۔ لیکن پاکستان کے ماہرین یہ تہیہ کر چکے تھے کہ وہ جلد از جلد زر کے معاملے میں خود مختار ہو جائیں اور اپنے مالی نظام کے استحکام کے لیئے ۳۰ ستمبر سے پہلے ہی اپنا بنک قائم کر لیں گے چنانچہ اس معاملے میں انہیں کامیابی حاصل ہوئی۔ ریزرو بنک نے اس بات کی رضامندی ظاہر کر دی کہ وہ ۳۰ ستمبر سے پہلے ہی یہ کام چھوڑنے کے لئے تیار ہے۔ چنانچہ یکم جولائی ۱۹۴۸ء سے پاکستان کے مرکزی بنک نے اپنا کام شروع کر دیا۔ اب پاکستان کا نظام زر بھی آزاد اور خود مختار ہو گیا ہے۔

پاکستان اسٹیٹ بنک کا سرمایہ تین کروڑ روپے ہے اس کے اکیاون فیصدی حصے حکومت نے خریدے ہیں اور باقی انچاس فیصد عوام نے۔ بنک کا انتظام مرکزی مجلس منتظمہ کے تحت ہے۔ اس مجلس کے صدر اور بنک کے گورنر مشہور ماہر مالیات مسٹر زاہد حسین ہیں۔

پاکستانی اور ہندوستانی روپئے کی باہمی شرح مُبادلہ

یکم اپریل ۱۹۴۸ء کو جب پاکستان کا نیا روپیہ ہماری لاہور کی دار الضرب سے جاری کیا گیا اور ریزرو بنک کی طرف سے جو نوٹ شائع ہوئے ان پر حکومت پاکستان کا نام درج کیا گیا یعنی ان نوٹوں کو عام ہندوستانی نوٹوں سے مختص کر دیا گیا تو بعض لوگ یہ باطل پروپیگنڈا کرنے لگے پاکستان کے روپئے اور نوٹوں پر ہندوستان میں بٹہ لگایا جائیگا۔ اس سلسلہ میں ہندوستانی روپئے کی برتری اور فوقیت ظاہر کرنے کے لئے یہ بات کہی جاتی تھی کہ پاکستان کا روپیہ ہندوستان میں زر قانونی کی حیثیت نہیں رکھتا۔ اس کے برعکس ہندوستان کا روپیہ پاکستان میں بھی زر قانونی ہے اور چلتا ہے۔ گزشتہ سطور میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ کس طرح چند ماہ کے عبوری دور کے لئے اور پاکستانی عوام کی سہولت کے لئے ستمبر کے آخر تک ہندوستانی روپئے کو بھی قانونی حیثیت سے پاکستان میں جاری رکھا گیا ہے۔ اس کے بعد ہندوستانی روپئے کی یہ حیثیت ختم کر دی جائیگی۔

پاکستانی روپئے پر ۳۰ رجون تک کسی قسم کا بٹہ لگنے کا سوال پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اس وقت پاکستان کے نوٹ ہندوستان کے ریزرو بنک کی طرف سے جاری کئے گئے تھے اور ان نوٹوں کی پشت پناہی اور ساکھ وہی تھی جو ہندوستان کے نوٹوں کی۔ نظری طور پر یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ ریزرو بنک کی دست برداری کے بعد دونوں ملکوں کی باہمی شرح مُبادلہ ایکسا ہی نہ رہے گی۔ چونکہ دونوں نظام زر آزاد ہیں۔ اسلئے اس مسئلے کا حل کہ کس ملک کی زر پر بٹہ لگے کا دو نظری سوالوں کے جواب سے آشنا ہوگا۔ ایک سوال یہ ہے کہ دو آزاد ملکوں کے زر کا مبادلہ کیونکر عمل میں آتا ہے دوسرے کیا کوئی ملک شرح مبادلہ اپنے حسب منشا مقرر کر سکتا ہے اور اسے قائم رکھ سکتا ہے۔

دو آزاد ممالک کے زر کے درمیان شرح مبادلہ

اس سوال کے جواب کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم کچھ تاریخی پس منظر کا مطالعہ کریں کیونکہ گزشتہ بہت سے سالوں سے دنیا کے تقریباً ہر ملک کا نظام زر آزادی سے کام نہیں کر رہا اور اس پر طرح طرح کی پابندیاں عائد

ہیں۔ ۱۹۱۴ء سے پہلے دنیا کے اکثر و بیشتر ممالک میں نظام زر پر کوئی پابندیاں نہ تھیں۔ اکثر و بیشتر ممالک کا نظام زر سونے کی بنیادوں پر قائم تھا اور سونے کے سکے جاری تھے۔ کسی ملک کے سکے کا نام خواہ کچھ بھی ہو ان کی باہمی شرح مبادلہ سکوں کے سونے کے وزن کے لحاظ سے عمل میں آتی تھی۔ انگلستان کے طلائی پونڈ میں چونکہ امریکہ کے ڈالر سے تقریباً پانچ گنا زائد سونا تھا اسلئے ایک طلائی پونڈ کے بدلے قریباً پانچ امریکن ڈالر ملتے تھے۔ چونکہ انگلستان اور امریکہ میں ہر شخص کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ جب چاہے سرکاری ٹکسال میں جاکر سونا دیکر پونڈ یا ڈالر بنوا لائے اور دونوں ملکوں میں سونے کی فروخت یا درآمد و برآمد پر کوئی پابندی عائد نہ تھی اسلئے دونوں ملکوں کی شرح مبادلہ میں صرف اس قدر برائے نام فرق پڑ سکتا تھا جتنا کہ سونا لندن سے امریکہ یا امریکہ سے لندن بھیجنے میں آتا ہو۔ مثال کے طور پر اگر یہ خرچ آدھ فیصدی ہو تو دونوں سکوں کی شرح مبادلہ آدھ فیصد سے زیادہ نہ بڑھ سکے۔ کیونکہ اس صورت میں یہ ممکن تھا کہ سونا ایک ملک کو دوسرے ملک میں بھیج دیا جائے اور وہاں جاکر سکے بنوا لیئے جائیں کیونکہ اس زمانے میں نوٹ بھی سونے میں بدل پذیر تھے اسلئے نوٹوں کی شرح مبادلہ بھی وہی تھی جو سونے کی ہو۔ اصطلاحی زبان میں اس قسم کے نظام زر کو معیار طلاء یا "گولڈ اسٹینڈرڈ" کہتے تھے۔ اس نظام کی بڑی خوبی یہ تھی کہ یہ آزاد نظام تھا۔ ہر ملک کے زر کا مبادلہ دوسرے ملک کے ساتھ ایک معین اور مقررہ شرح پر عمل میں آتا تھا۔

ہندوستان کا نظام اگرچہ ان بنیادوں پر قائم نہ تھا اور ملک میں سونے کے سکے رائج نہ تھے۔ لیکن چونکہ حکومت نے اس بات کی ضمانت دے رکھی تھی کہ وہ بیرونی ممالک کا زر روپے کے معاوضے میں ایک مقررہ شرح پر مہیا کرے گی اس لئے ہندوستان کو بھی تقریباً وہی فوائد حاصل ہو گئے تھے جو اور ملکوں کو حاصل تھے۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران میں یہ نظام قائم نہ رہ سکا۔ انگلستان جو اس نظام کا بہت بڑا مداح تھا اسے بھی اسے خیرباد کہنا پڑا چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ ممالک کے درمیان مبادلہ کی کوئی مقررہ شرح قائم نہ رہ سکی اور اس میں بہت زیادہ گھٹاؤ بڑھاؤ ہوتا رہا۔ انگلستان اس وقت اس نقص کو محسوس کرتا تھا اور اس کوشش میں تھا کہ جلد از جلد اسے دور کیا جا سکے۔ لہٰذا ۱۹۲۵ء میں انگلستان نے دوبارہ معیار طلاء اختیار کر لیا اور وہ ممالک جن کا زر انگلستان سے منسلک تھا۔ ان میں بھی خود بخود استحکام پیدا ہو گیا اور مبادلہ جنگ سے پہلے کی طرح مقررہ شرح پر ہونے لگا۔

ستمبر ۱۹۳۱ء کو عالمی کساد بازاری کی وجہ سے انگلستان کو پھر نظام طلاء چھوڑنا پڑا اور باہمی مبادلہ میں پھر عدم تیقن کی صورت پیدا ہو گئی۔ چند برس بعد دنیا کے اکثر و بیشتر ممالک بھی نظام طلاء کو ترک کرنے پر مجبور ہو گئے لیکن اس عرصے میں اکثر ممالک کو یہ تجربہ ہو گیا کہ کس طرح بغیر سونے کے نظام کے بھی شرح مبادلہ (کاغذی نظام زر میں) میں استحکام پیدا کیا جا سکتا ہے۔

غیر بدل پذیر کاغذی نظام زر میں شرح مبادلہ کیونکر مقرر ہوتی ہے

گزشتہ صفحات میں بتایا ہے کہ معیار طلاء کے تحت کسی دو ملکوں کے زر کا باہمی مبادلہ ان ملکوں کے سکوں میں جتنا سونا ہوتا ہے اس تناسب سے عمل میں آتا ہے۔ یہ صورت حال نوٹوں کے تبادلے کے لئے بھی درست ہوتی ہے کیونکہ وہ نوٹ سونے میں بدل پذیر ہوتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب معیار طلاء ترک کر دیا جائے اور نوٹ سونے اور چاندی میں بدل پذیر نہ ہوں تو اس صورت میں دونوں ملکوں کے زر کا مبادلہ کیونکر عمل میں آئیگا۔ اسی مسئلہ کو پورے طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے اکثر لوگ جب جنگ کے دوران میں ہندوستانی روپئے میں چاندی کا وزن کم کر دیا گیا تو پوچھتے تھے کہ اب اس روپئے کی قیمت کیوں نہیں گریگی۔ حال میں صورت اور بھی بدل گئی ہے کیونکہ اب جو نیا روپیہ ہندوستان میں جاری ہوا اور پاکستان میں بھی ہے اس روپئے میں چاندی بالکل ہی نہیں ہے۔

گزشتہ جنگ سے پہلے ہندوستان میں جو خالص چاندی کا روپیہ سمجھا جاتا تھا اس میں بھی ۶ آنے سے زیادہ مالیت کی چاندی نہ تھی۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ لوگ روپئے کو چاندی کی خاطر نہ لیتے تھے بلکہ اسے ادائیگیوں کے لئے ایک سہولت بخش آلۂ مبادلہ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ دراصل ہندوستانی یا پاکستانی روپیہ ایک قسم کا کاغذی نوٹ ہے جسے کاغذ پر چھاپنے کے بجائے دھات پر ڈھالا جاتا ہے۔ یہ طریقہ اس لئے اختیار کیا گیا ہے کہ بہ حیثیت مجموعی یہ زیادہ سستا ہے۔ چھوٹی مالیت کے نوٹ چونکہ گردش میں زیادہ آتے ہیں اور جلد خراب ہو جاتے ہیں اسلئے ان کے چھاپنے کی لاگت سکے بنانے سے زیادہ آتی ہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں جبکہ دو ملکوں کا زر کاغذی ہو اور سونے میں

ملی پذیر ہوں گی باہمی شرح مبادلہ کسی مقررہ اور معینہ اصولوں پر مبنی نہیں ہوتی بلکہ بالکل مصنوعی طور پر دو حکومتوں کے باہمی صلاح و مشورے سے عمل میں آتی ہے۔ مثلاً موجودہ جنگ کے دوران میں ہندوستان کے روپے اور انگلستان کے پونڈ کے درمیان دونوں حکومتوں کے باہمی صلاح و مشورے سے وہی تیرہ روپے چھ آنے شرح قائم رکھی گئی جو جنگ سے پہلے رائج تھی۔ انگلستان اور امریکہ کے درمیان جو شرح مبادلہ مقرر کی گئی وہ پانچ ڈالر فی پونڈ کی بجائے ۴ ڈالر فی پونڈ تھی۔ حکومتوں کے درمیان یہ باہمی سمجھوتہ ہو جاتا ہے کہ ہم اس مقررہ شرح پر مبادلہ کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اگر دونوں حکومتوں کے پاس زر کے ذخائر موجود ہوں اور وہ باہمی صلاح و مشورے سے ایک دوسرے کی مدد کے لئے آمادہ رہیں تو یہ نظام اسی طرح کامیابی سے چلتا ہے جیسے کہ معیارِ طلاء چلتا ہو۔ اگر دونوں ملکوں کے درمیان توازنِ تجارت تقریباً برابر برابر ہو یعنی یہ کہ ملک ایک دوسرے سے مادی تعداد میں مال منگواتے ہوں تو اس نظام کو قائم رکھنے کیلئے حکومتوں کو کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ لیکن اگر توازنِ تجارت برابر نہ ہوتا ہو تو یہ ہوتا ہے کہ وہ ملک جو مال منگواتا بہت زیادہ ہو اور بھیجتا مقابلتاً کم ہو دوسرے ملک سے یہ درخواست کرتا ہے کہ زیادہ مال بھیجنے والا ملک اُسے مال دیتا رہے اور ادائیگی کا مطالبہ ملتوی رکھے۔ یہ صورتِ حال جنگ کے زمانے میں انگلستان اور ہندوستان کی تجارت میں پیدا ہوئی۔ انگلستان نے ہندوستان سے مال بہت زیادہ منگوایا اور بھیجا بہت کم۔ ہندوستان کی حکومت نے اپنے نوٹ جاری کر کے اپنے ملک کے تاجروں کو روپیہ ادا کر دیا اور کفالت کے طور پر انگلستان کی حکومت کے نوٹ و تمسکات بطور ذخیرہ رکھے۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ کے دوران میں انگلستان ہندوستان کا مقروض بن گیا کیونکہ ہندوستان کے پاس بارہ سو کروڑ کی مالیت سے زیادہ کے اسٹرلنگ تمسکات جمع ہو گئے۔ ہندوستان کو اسکے لئے بھاری قربانی کرنی پڑی۔ کیونکہ ملک سے بھاری تعداد میں مال باہر جانے کی وجہ سے اشیاء کی کمی ہو گئی۔ روپوں کی تعداد زیادہ ہو گئی اور قیمتیں لا محالہ بڑھ گئیں۔ اگر ہندوستان انگلستان کے ساتھ دوستانہ سلوک روا نہ رکھتا اور ایک معینہ اور مقررہ شرح پر زر کا تبادلہ نہ کرتا اور صورتِ حال کو طلب و رسد کی رسہ کشی کے لئے چھوڑ دیتا تو پونڈ کی قیمت ہندوستانی روپے کے مقابلے میں بہت گر جاتی۔ وجہ صاف ظاہر ہے انگلستان کو کثیر تعداد میں مال خریدنے کے لئے زیادہ روپوں کی ضرورت پڑتی اور ہندوستانی روپے کی قیمت اسی طرح بڑھ جاتی جس طرح عام چیزوں کی بڑھتی ہے۔ چنانچہ پہلی جنگِ عظیم کے بعد جب روپے کو اس کی حالت پر چھوڑ دیا گیا تھا تو پونڈ کی قیمت صرف سات روپے رہ گئی تھی۔ ہندوستان نے حالیہ جنگ میں چونکہ انگلستان کے ساتھ بہت دوستی اور مروت کا برتاؤ کیا تھا اسلئے یہ صورتِ حال پیدا نہ ہوئی اس کے برعکس امریکہ نے اگرچہ انگلستان کی کافی مدد کی لیکن ایسی دوستی کا سلوک روا نہ رکھا جیسے کہ ہندوستان نے۔ اوّل تو یہ کہ شرحِ مبادلہ بجائے سابقہ پانچ ڈالر فی پونڈ کے چار ڈالر فی پونڈ مقرر کر دی گئی اس طرح انگلستان کو امریکہ سے مال خریدنے کے لئے بیس فی صد زیادہ رقم ادا کرنی پڑی۔ اس کے علاوہ امریکہ نے انگلستان کے تمسکات کی ضمانت پر مال دینے کی ذمہ داری نہ لی جس کی وجہ سے انگلستان کو امریکہ سے مال منگوانے کے لئے پابندیاں عائد کرنی پڑیں۔ اسے اصطلاحی زبان میں پابندیٔ مبادلہ یا (EXCHANGE CONTROL) کہتے ہیں۔ اگر انگلستان اور امریکہ کے درمیان یہ معاہدہ نہ ہوتا کہ امریکہ چار ڈالر کی مقررہ شرح پر پونڈ کا مبادلہ کریگا اور صورتِ حال کو آزاد چھوڑ دیا جاتا تو انگلستان کو ایک پونڈ کے مبادلے میں ڈھائی یا تین ڈالر سے زائد نہ ملتے۔

اگر تجارت آزاد ہو اور مبادلہ پر کسی قسم کی پابندی عائد نہ کی جائے تو نظری طور پر دو ملکوں کے درمیان کوئی مصنوعی شرحِ مبادلہ زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتی اور شرح اسی حساب سے قائم ہوتی ہے جس حساب سے کہ ملک کی اندرونی قیمتیں ہوں مثلاً یہ فرض کر لیا جائے کہ ہندوستان اور پاکستان میں صرف گندم ہی ایک تجارتی فصل ہے اور اس کی تجارت آزاد ہوتی ہے۔ اگر ہندوستان میں گندم کا بھاؤ ۲۰ روپے فی من ہو اور پاکستان میں گیہوں کا بھاؤ ۱۰ روپے فی من ہو تو پاکستان اور ہندوستان کے روپے کی شرحِ مبادلہ کبھی یکساں نہیں ہو سکتی نظری اور اصولی طور پر چونکہ ہندوستان میں گیہوں کا بھاؤ پاکستان سے سو فیصد زائد ہے اس سے پاکستانی روپے کی قدر بھی سو فی صدی زائد ہونی چاہیئے کیونکہ پاکستانی روپے سے پاکستان کے لوگوں کو زیادہ گیہوں حاصل ہوتا ہے اگر دونوں حکومتوں کا اس میں کوئی باہمی سمجھوتا نہ ہو تو پاکستانی لوگ ہندوستانی روپیہ قبول نہیں کریں گے کیونکہ انھیں اپنے روپے

زیادہ گیہوں حاصل ہوتا ہے۔ لہذا ہندوستانی روپے کی قدر گھٹ کر صرف آٹھ آنے رہ جائیگی۔ لیکن اگر حکومتیں آپس میں معاہدہ کریں کہ ہندوستانی اور پاکستانی روپیہ برابر رہیگا تو اس صورت میں پاکستان کی حکومت اس بات کے لئے مجبور ہوگی کہ وہ غلہ کی برآمد پر پابندی لگائے تاکہ اس کے ملک سے باہر غلہ نہ جائے اور اس کے باشندوں کو گیہوں سستے داموں پر ملتا رہے۔ اگر حکومت پاکستان یہ چاہتی ہو کہ اس کے کاشتکار اس صورت حال پر مستفید ہوں اور وہ برآمد پر کسی قسم کی پابندی نہ لگانا چاہے تو پھر پاکستان میں بھی گیہوں کی قیمت بڑھنا شروع ہو جائیگی ادھر ہندوستان میں گیہوں کی رسد بڑھنے کی وجہ سے قیمت کچھ کم ہونے لگے گی حتیٰ کہ کچھ عرصہ کے بعد آزاد تجارت کی صورت میں دونوں ملکوں میں گیہوں کی قیمت یکساں ہو جائیگی۔ پاکستان میں گیہوں کی مانگ بڑھنے کی وجہ سے اس کی قیمت دس روپئے سے زیادہ ہو جائے گی اور ہندوستان میں رسد بڑھنے کی وجہ سے قیمت ۱۵ روپئے سے کم ہو جائیگی۔ حتیٰ کہ کچھ عرصے کے بعد ایک ایسا توازن پیدا ہو جائیگا کہ دونوں ملکوں میں گیہوں کی قیمت یکساں ہو جائے گی۔

لیکن موجودہ دور میں نہ صرف آزاد تجارت کا خاتمہ ہے بلکہ درآمد اور برآمد پر طرح طرح کی پابندیاں ہیں اور حکومت کی اجازت کے بغیر اکثر و بیشتر اشیاء کی درآمد و برآمد نہیں ہو سکتی۔ لہذا دونوں ملکوں میں ایک ہی جنس کی مختلف قیمتیں قائم رہ سکتی ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ پاکستان میں گندم کی قیمت قریباً دس روپئے من ہے اور ہندوستان میں قریباً سترہ روپئے من۔ عام ضروریات زندگی کی چیزیں بالعموم پاکستان میں ہندوستان سے سستی ہیں کیونکہ پاکستان ایک زرعی ملک ہے اور یہاں زرعی اجناس کی فراوانی ہے۔

پاکستان کا توازنِ تجارت ہندوستان کے ساتھ ایسا ہے کہ پاکستان ہندوستان کو مال بھیجتا زیادہ ہے اور منگواتا کم ہے۔ اس لئے ہندوستان کے لوگوں کو پاکستان کے روپئے کی زیادہ ضرورت رہیگی۔ اس لئے بٹہ ہندوستانی روپئے پر لگ سکتا ہے نہ پاکستانی روپئے پر نہیں۔ اس پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ:-

(۱) تیس جون ۱۹۴۸ء تک پاکستانی اور ہندوستانی روپئے کی باہمی شرح مبادلہ کا مساوی رہنا لازمی تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسوقت تک دونوں ملکوں کا انتظام زر ایک مشترکہ ادارے یعنی ریزرو بینک آف انڈیا کے سپرد تھا۔

(۲) ۳۰ ستمبر ۱۹۴۸ء تک اگرچہ ہندوستان کے نوٹ پاکستان میں زر قانونی کی حیثیت سے رائج رہیں گے لیکن یہ حیثیت پاکستان کے نوٹوں کو ہندوستان میں حاصل نہ ہوگی۔ یہ عبوری انتظام پاکستان کے باشندوں کی سہولت کے لئے کیا گیا ہے تاکہ وہ اطمینان و سہولت کے ساتھ ہندوستانی نوٹ واپس کر کے ان کے بدلے میں پاکستانی نوٹ حاصل کر سکیں۔

۳۰ ستمبر کے بعد ہندوستانی نوٹوں کی حیثیت پاکستان میں ایسی ہی رہیگی جیسی کہ پاکستانی نوٹوں کی ہندوستان میں۔

(۳) دونوں ملکوں کی معیشت اس بات کی متقاضی ہے کہ فی الحال پاکستانی اور ہندوستانی روپئے کا باہمی مبادلہ مساوی طور پر ہوتا رہے۔ اور دونوں ملکوں کے بنک تبادلہ کی سہولتیں بہم پہنچاتے رہیں۔

(۴) پاکستان اگر چاہے تو ہندوستانی روپئے پر زیادہ بٹہ لگا سکتا ہے۔ کیونکہ توازنِ تجارت ہر طرح سے پاکستان کے موافق ہے اور پاکستان سے ضروری مال خریدنے کے لئے ہندوستان کو پاکستانی روپئے کی زیادہ ضرورت پڑیگی۔

(۵) اگر دونوں حکومتیں آپس میں معاہدہ کرلیں کہ وہ شرح مبادلہ مساوی رکھنے کی ہر ممکنہ کوشش کریں گی تو انکو اس میں کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔

(۶) بدقسمتی سے اگر دونوں ملکوں میں تعلقات ناخوشگوار ہو جائیں اور کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکے تو پاکستانی حکومت اپنے روپئے کو برتر اور اعلیٰ رکھ سکتی ہے۔ اس لئے کہ نہ صرف ہندوستان کے ساتھ بلکہ مجموعی طور پر دنیا کے دوسرے ملکوں کے ساتھ توازنِ تجارت پاکستان کے موافق ہے۔

(۷) ہندوستان کی حکومت اگر یہ کوشش بھی کرے تو پاکستانی روپئے پر بٹہ نہیں لگا سکتی۔ ہاں وہ یہ کر سکتی ہے کہ پاکستان سے اپنے تمام تجارتی تعلقات منقطع کر دے لیکن یہ چیز بعید از قیاس ہے۔

(۸) پاکستان اور ہندوستان اگر چاہیں تو ایک دوسرے کے مبادلہ زر پر پابندیاں لگا سکتے ہیں لیکن اس طرح کی کسی پالیسی سے دونوں ملکوں کو نقصان پہنچے گا۔

(۹) دونوں ملکوں کا باہمی مفاد اسی میں ہے کہ وہ مل جل کر اور آپس میں صلاح و مشورہ کر کے نیک نیتی سے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں اور آزاد مال اور زر کی آزادانہ بدل پذیری پر تکلیف دہ پابندیاں عائد نہ کریں بحیثیت مجموعی اس قسم کی پابندیاں عائد کرنے سے ہندوستان کو زیادہ نقصان پہنچے گا اور پاکستان کو کم کیونکہ معاشی طور پر پاکستان ہندوستان سے زیادہ استوار بنیادوں پر قائم ہے۔

اے۔ بی۔ اڈوانی

سندھی کہاوتیں تاریخ کے آئینہ میں

سندھی کہاوتوں اور محاوروں کی تعداد تقریباً تین ہزار ہے۔ لسانی نقطۂ نظر کے علاوہ ان کا مطالعہ تمدنی نقطۂ نظر سے بھی بڑا دلکش ہے۔ اس لئے کہ ان میں سے بعض اہلِ سندھ کی سماجی اور مذہبی زندگی پر روشنی ڈالتے ہیں اور بعض سے پتہ چلتا ہے کہ سندھ کے ہمسایہ علاقوں مثلاً کچھ، گجرات اور پنجاب کا سندھ پر کیا اثر پڑا۔ اس مختصر سے مضمون میں میں نے صرف تین کہاوتوں کی تشریح کی ہے۔ ان تینوں کہاوتوں کی بنیاد سندھ کی تاریخ کے بعض اہم واقعات پر ہے۔

کنن جي کالھین میر بجار مار ایو

(کانا پھوسی میر بجار کی موت کا باعث ہوئی)

سندھی میں اس کہاوت کے معنی یہ ہیں کہ خفیہ سازشیں فساد کا باعث ہوتی ہیں۔ عباسی کلہوڑے دسویں یا گیارھویں صدی عیسوی میں سندھ آئے۔ چھ سات سو سال کے دوران ہی میں ان کی کایا پلٹ ہوگئی۔ یعنی وہ درویشوں سے جاگیردار بن بیٹھے یہاں تک کہ سندھ پر حکومت کرنے لگے۔ میاں غلام شاہ کلہوڑو کے عہدِ حکومت میں (۱۷۷۲-۱۷۵۷ عیسوی) انکی شان و شوکت اپنے عروج کو پہنچ گئی۔ لیکن ۱۷۷۲ء میں اس ذی وقار حکمران کی وفات ہوگئی تو کلہوڑوں کی عظمت کو گھن لگنا شروع ہوگیا۔ اس کے بعد کے کلہوڑے سردار نہ تو لائق تھے اور نہ ایماندار۔ حماقت و نادانی کے ساتھ ساتھ بداطواری و ریاکاری ان کی رگ رگ میں رچی ہوئی تھی۔ یہاں یہ بتانا شاید بے محل نہ ہو کہ دیہی طرزِ معاشرت کو ترک کر کے باقاعدہ عسکری نظام قائم کرنے میں تالپوروں نے کلہوڑوں کی بڑی مدد کی۔ یہ جنگجو قبیلہ مغربی سندھ کے کوہستانی علاقوں میں آباد تھا۔ یہ تالپور پہلے پہل سترھویں صدی کے آخر میں سندھ آئے اور کلہوڑوں کی ملازمت میں داخل ہوگئے۔ آہستہ آہستہ انہوں نے ترقی کی اور سیاسی معاملات میں زبردست اثر و اقتدار حاصل کر لیا۔ تالپور پوری وفاداری کے ساتھ کلہوڑوں کی خدمت انجام دیتے رہے جن کو وہ روحانی اعتبار سے اپنا سردار یا امام سمجھتے تھے۔ شروع کے کلہوڑا سرداروں نے گوشہ عافیت سے میدانِ جنگ تک ہر جگہ ان کی وفاشعاری کا اعتراف کیا۔ [illegible] جاگیریں عطا کیں۔ اس طرح تالپوروں کے قدم سندھ میں جم گئے۔

۱۷۷۲ء میں میاں غلام شاہ کلہوڑو کی اچانک وفات کے بعد اس کا بیٹا میاں سرفراز خاں سندھ کا حکمران ہوا۔ اس کے مصاحب میں ایک شخص میر بہرام خاں تالپور تھا جو اس کے والد میاں غلام شاہ کی خدمت میں بھی مامور تھا۔ ۱۷۷۵ء میں میاں سرفراز خاں نے اپنے ایک درباری راجو لیکھی کے ایما پر میر بہرام خاں کو موت کے گھاٹ اتروا دیا۔ میر بہرام خاں کے سب سے بڑے بیٹے کا نام میر بجار تھا۔ اس افسوسناک قتل کے وقت وہ حج کی غرض سے مکہ شریف گیا ہوا تھا تاہم دوسرے تالپور سرداروں کو اس کا علم ہوا تو وہ سخت برہم ہوئے نتیجہ یہ کہ میاں سرفراز خاں کو اپنے چچا میاں غلام نبی کے حق میں دست بردار ہو جانا پڑا۔ عین اس وقت میر بجار کی مکہ شریف سے واپسی ہوئی۔ جب اسے اپنے والد کے انتقال کا حال معلوم ہوا تو اس نے قاتل سے انتقام لینے کے لئے بلوچیوں کو جمع کر لیا۔ میاں غلام نبی فطرتاً صلح پسند لیکن کمزور اطوار کا حکمراں تھا۔ وہ قتل و غارت کو پسند نہیں کرتا تھا مگر اس کے صلاح کاروں نے اسے میر بجار کے خلاف لڑنے کے لئے مجبور کر دیا۔ شہداد پور تعلقہ کے قریب لنیاری کے مقام پر دونوں میں سخت لڑائی ہوئی اور خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ میاں غلام نبی نے خفیہ طور پر میر بجار کو پیغام بھیجا جس میں لڑائی روکنے اور اسے بداطوار وزیروں کے چنگل سے بچانے کی درخواست کی گئی۔ ان میں سے ایک وزیر کو اس اعتراف بے چارگی کا علم ہوگیا۔ چنانچہ اس نے میاں صاحب کو مار ڈالا۔ اس طرح لڑائی میں میر بجار خاں کو فتح ہوگئی۔ میاں غلام نبی کے مرنے کی خبر سنتے ہی اسکے بھائی میاں عبدالنبی نے جو اس وقت حیدرآباد کے قلعے میں تھا، چاروں شاہی قیدیوں کو جو وہاں نظربند تھے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ قیدی میاں سرفراز خاں اس کے دو بیٹے اور اس کے بھائی محمود خاں تھے۔ وہ جانتا تھا کہ حکومت سندھ کے سلسلے میں یہی چاروں رقیب بن سکیں گے۔ چونکہ کلہوڑا سرداروں میں اب کوئی باقی نہ رہا تھا۔ اس لئے سندھ کی عنانِ حکومت اس شرط پر میاں عبدالنبی کے ہاتھوں میں دیدی گئی کہ میر بجار کو عہدۂ وزارت پر مامور کیا جائے لیکن میر بجار اپنی لیاقت اور سیاسی تدبر کی بنا پر صحیح معنوں میں سندھ کا حکمراں بن بیٹھا۔ میاں عبدالنبی اس کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا رہا۔ تاہم وہ اس موقع [illegible] کو

پسند نہیں کرتا تھا اور اسی لئے میر بجار اس کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا رہا۔

نومبر ۱۷۸۱ء میں دو راٹھور راجپوت اپنے خادموں کو ساتھ لئے جودھپور سے حیدرآباد سندھ آئے۔ ان کے نام مندنوٹ ہرناتھ سنگھ اور ٹھاودت جاگم سنگھ تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں جودھپور کے حکمران مہاراجہ بجے سنگھ جی نے سفیروں کے طور پر بھیجا ہے چنانچہ وہ میر بجار اور میاں عبدالنبی سے وقتاً فوقتاً ملتے رہے۔ انہوں نے چپکے سے میر بجار کے کان میں کہا کہ ہم آپ کے لئے مہاراجہ کا ایک بہت ہی خفیہ خط لائے ہیں۔ اسے پڑھنے اور مزید مشورہ کرنے کے لئے خلوت ضروری ہے۔ میر صاحب کو کسی قسم کا شبہ نہیں ہوا اور وہ ان دونوں کو ساتھ لے کر ایک علیحدہ کمرے میں چلے گئے۔ ان میں سے ایک نے مہاراجہ کا خط رک رک کر پڑھنا شروع کیا اور جب اس نے یہ ظاہر کیا کہ عبارت کا کچھ حصہ پڑھا نہیں جا سکتا تو اسے اپنے ساتھی سے مدد لینے کی اجازت دیدی گئی۔ میر صاحب ان دونوں کے درمیان مبہوت بیٹھے خط کی طرف دیکھ رہے تھے۔ انہیں اس طرح غرق تحیر پاکر ان راٹھوروں نے اپنے خنجر نکالے اور میر صاحب کے جسم میں بھونک دیئے۔ میر صاحب ایک دم اچھلے اور اپنی تلوار نکال کر ان دونوں کے ٹکڑے کر دیئے۔ تاہم طبی امداد پہنچنے سے قبل ان کے جسم سے اتنا خون بہہ چکا تھا کہ وہ خود بھی جانبر نہ ہو سکے۔

سوال یہ ہے کہ میر بجار کو قتل کرانے کا سبب کیا ہو سکتا ہے؟ بہت سے مورخوں نے مختلف اسباب بیان کئے ہیں۔ لفٹنٹ کرنل جے ٹوڈ کا بیان ہے کہ میر بجار کو اس لئے قتل کیا گیا کہ ایک بار انہوں نے غرور و نخوت کے ساتھ راٹھوروں کی اہانت کی تھی۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:۔

بجار جس کے مزاج میں تیزی اور شاہانہ تمکنت تھی، راٹھوروں کے خلاف ہونے والے فسادات میں گھر گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے مارواڑ سے محض خراج ہی نہیں مانگا بلکہ ایک راٹھور راجہ کی لڑکی بھی شریک حیات بنانے کے لئے طلب کی۔۔۔۔۔۔ اس اہانت کی بنا پر سخت لڑائی شروع ہو گئی جس میں راٹھوروں نے بلوچی فوج کو میدان سے بری طرح مار بھگایا۔ لیکن بجے سنگھ نے اس زخم کو بھی کافی نہیں سمجھا بلکہ تہیہ کر لیا کہ اس کانٹے سے جو پہلو میں چبھ رہا تھا کسی نہ کسی طرح نجات حاصل کرے۔"

اس بیان کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی کیونکہ کرنل ٹوڈ اس حقیقت کے باوجود کہ انہوں نے راجستھان کی تاریخ کو تاریکی سے روشنی میں لانے کے لئے لائق تعریف خدمات انجام دی ہیں، مورخ کی حیثیت سے کچھ زیادہ قابل ذکر نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ کسی دوسری تاریخ میں یہ مذکور نہیں ہے کہ بجے سنگھ کے سپاہیوں اور میر بجار کی فوج کے مابین کوئی دو بدو لڑائی ہوئی۔ بہاولپور کے مورخ شہامت علی نے میاں عبدالنبی کی والدہ کو اس ذلیل کشت و خون کا ذمہ دار ٹھیرایا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ میاں غلام نبی کی موت کا اس خاتون کے دل و دماغ پر اثر قائم رہا کیونکہ وہ اپنی دانست میں میر بجار کو اپنے بیٹے کے قتل کا ذمہ دار ٹھیراتی تھی۔ اس نے اپنی شکایات مہاراجہ جودھپور تک پہنچائیں اور اس سے مدد مانگی۔ مہاراجہ بجے سنگھ نے میر بجار کو قتل کرنے کے لئے دو راٹھور بھیجے اور وعدہ کیا کہ اگر وہ اس مہم کے دوران میں مارڈالے گئے تو ان کے پسماندگان کو تیس ہزار روپے سالانہ کی جاگیر دیدی جائے گی۔ "فتح نامہ" کے مصنف کا خیال ہے کہ وہ قتل میاں عبدالنبی کے اشارے پر کیا گیا اور جرم کا سبب قلعۂ امرکوٹ قرار دیا گیا جسے مہاراجہ جودھپور کے حوالے کرنے کا وعدہ تھا۔ ہماری ذاتی رائے بھی یہی ہے کہ اس قتل میں میاں عبدالنبی کا ہاتھ ضرور تھا کیونکہ اس حادثے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد میاں عبدالنبی بلوچوں کے غم و غصے سے ڈر کر حیدرآباد سے تالات چلا گیا اور جاتے وقت بہت سا خزانہ بھی ساتھ لے گیا۔ اگر ضمیر صاف ہوتا تو اسے بھاگنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہی نہیں بلکہ اس نے اپنے بیٹوں کو بھی جودھپور بھیجا جن کی وہاں خوب آؤ بھگت ہوئی۔ چنانچہ اس وقت بھی میاں عبدالنبی کے جانشین ریاست جودھپور میں جاگیریں سنبھالے بیٹھے ہیں۔ ان باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ میر بجار سے چھٹکارا پانے میں میاں عبدالنبی کی سازش تھی کیونکہ وہ اس کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے خوفزدہ اور اس پر رشک کرنے لگا تھا۔ میر بجار کا قتل کلہوڑا خاندان کے زوال کا پیش خیمہ بن گیا اور جو صحیح معنوں میں ۱۷۸۳ء میں ختم ہو گیا۔ چنانچہ مذکورہ بالا واقعہ ہی پر یہ ضرب المثل قائم ہے:۔

"کلن جی کا کھین میر بجار مارایہ"

۲۔ مدد تو اچھی

(مدد تو ایسا ہے گویا کوئی زبردست مصیبت نازل ہونے والی ہے)

یہ ضرب المثل ۱۷۸۳ء سے متعلق ہے۔ میاں عبدالنبی کے بھاگ فرار ہو جانے کے بعد تالپوروں نے میر عبداللہ کی سرکردگی میں کلہوڑا خاندان کے ایک شخص صادق علی کو سندھ کا حکمران بنا دیا۔ میاں صادق علی [illegible] بہت زیادہ تھا اس لئے [illegible] معاملات [illegible] سلطنت میں [illegible] دلچسپی [illegible] نہ تھی۔ [illegible] میر عبداللہ خان سب سیاہ و سفید کا مالک ہو گیا۔ میاں عبدالنبی نے سوار [illegible] راٹھوروں اور مہاراجہ جودھپور سے امداد مانگی کہ وہ جب سندھ کو واپس

لئے میں میری مدد کی جائے۔ چنانچہ دو فوجیں ایک قلات کی اور دوسری جودھپور کی شمال مشرق کی جانب سے سندھ کی طرف بڑھنے لگیں۔ میر عبداللہ نے اپنے سپاہیوں کو تیار کیا اور جودھپور کی فوج کے مقابلے کے لئے چل پڑا۔ اس لڑائی میں اسے فتح ہوئی اور بہت سا مال غنیمت ہاتھ آیا۔ پھر میر عبداللہ نے اپنی توجہ لشکر قلات کی طرف مبذول کی۔ اسے بھی چاک پل کے قریب جو شمال میں واقع ہے شکست دی۔ اس معرکے میں ترک خاں بروہی بھی کام آگیا۔ یہ سردار قلات نصیر خاں کا داماد اور لشکر قلات کا کمانڈر تھا۔ کچھ عرصہ بعد جب میاں عبدالنبی کو دوبارہ اقتدار حاصل ہوگیا اور وہ سندھ کا حکمراں بن بیٹھا تو اسے شہر کراچی خان قلات کے حوالے کر دینا پڑا گویا یہ اس کے داماد کی موت کا تاوان تھا لیکن یہ ایک جملہ معترضہ ہے۔ میاں عبدالنبی شکست کھاکر اپنی جان بچانے کے لئے قلات بھاگ گیا۔ وہاں رہتے ہوئے مشہور افغان سردار مدد خاں جہاں ہمدار ہے۔ اس نے سردار سے درخواست کی کہ حکومت سندھ حاصل کرنے میں میری مدد کرو اور وعدہ کیا کہ اس خدمت کے صلے میں بڑی دولت عطا کرونگا۔ مدد خاں طوفان کی طرح سندھ پر نازل ہوا اور سارے صوبے کو تباہ و برباد کرکے رکھ دیا۔ سندھ پر مدد خاں کے اس حملے کا مختصر سا ذکر سر ماؤنٹ اسٹورٹ ایلفنسٹن نے ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"مدد خاں نے خونریزی اور آتش زدگی سے سارے ملک میں قتل و
غارت کا بازار گرم کر دیا۔ اس کی یہ تباہ کاریاں اتنی شدید تھیں کہ
اس کے معرکے کے فوراً ہی بعد زبردست قحط پڑا۔ اور کہا جاتا ہے
کہ اس کے اثرات عرصہ دراز تک طاری رہے"

اس حملے کی تفصیلات فارسی زبان کے ایک مسودے "فتح نامہ" میں درج ہیں۔ اوپر کہا جا چکا ہے کہ میاں عبدالنبی اپنے بروہی اور امیری احمد خاں کے پٹھانوں کو ساتھ لے کر سندھ کی طرف بڑھا۔ اس نے سردار مدد خاں سے کہا کہ میری تمام دولت حیدرآباد کے قلعے میں ہے اس لئے جب وہ قلعہ جو اس وقت دشمنوں کے پاس ہے اپنے قبضے میں آجائے۔ تو میں موعودہ انعام دوں گا۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے مدد خاں کو مشورہ دیا کہ ملک بھر میں خوب لوٹ مار کیا جائے تاکہ تمہاری فوج کے اخراجات اس طرح نکل آئیں۔ چنانچہ دیہاتوں پر حملے کرنا شروع ہوگیا۔ اسی اثنا میں تالپور سرداروں نے صلح کے سلسلے میں بات چیت کی اور مدد خاں سے استدعا کی کہ وہ اس قتل و غارت کو روک دے۔ مدد خاں صلح کے لئے تیار ہوگیا لیکن اس نے میاں عبدالنبی سے فوج کے مصارف طلب کئے۔ جب وہ رقم کسی طرح نہ مل سکی تو اس نے واپس لوٹتے وقت

لوٹ مار کا بازار دوبارہ گرم کر دیا۔ اس طرح خوف و دہشت کی ایک لہر سب طرف پھیل گئی جس کی نظیر سارے سندھ میں نہ اس وقت سے پہلے ملتی ہے نہ آنے والے زمانے میں۔ بہت سے شریف خاندان اپنا سب کچھ کھو بیٹھے اور بہت سے گمنامی و تاریکی کے پردوں میں جا چھپے۔ تانبے کا ایک ایک پیسہ وصول کرنے کے لئے فوج کے آدمیوں نے غریب لوگوں کے سو سو درّے مارے۔ تمام دولت زبردستی سب سے چھین لی گئی۔ انسانی ہستیوں کو جانوروں کی طرح ذبح کر ڈالا گیا۔ انہوں نے کپڑوں کی خاطر مرد و عورت تک کو برہنہ کر دیا اور کم سن لڑکے اور بچے فوج میں دو دو روپے میں بک گئے۔ اس کے بعد میر عبداللہ نے مدد خاں سے لڑنے کے لئے اپنی فوج جمع کی لیکن وہ چونکہ خون سے اپنی پیاس بجھا چکا تھا اسلئے مطمئن ہو کر سندھ سے افغانستان چلا گیا اور میاں عبدالنبی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

مدد خاں کے ظلم و ستم سندھ میں عرصہ دراز تک لوگوں کو یاد رہے۔ اس کا نام زبان پر آتے ہی خوف سے لوگوں کے چہرے زرد پڑ جاتے اور جسم کپکپانے لگتا۔ شوخ اور شریر بچے مدد خاں کا حوالہ دیتے ہی خاموش کر لئے جاتے گویا مدد خاں بچوں کے لئے ایک ہوّا بن گیا۔ اب سندھی زبان میں "مدد آرہا ہے" کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ کوئی زبردست مصیبت نازل ہونے والی ہے۔

۳۔ آیا میر، بھگا پیر۔

(میر کے آتے ہی پیر کے پاؤں اکھڑ گئے، یعنی دنیا داری کے بڑھتے ہی مذہب ختم ہو جاتا ہے۔)

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، عباسی کلہوڑے دسویں یا گیارھویں صدی میں سندھ آئے۔ یہ لوگ مذہبی رنگ میں ڈوبے ہوئے اور بڑی حد تک درویش صفت تھے۔ اسی لئے ان کے بزرگوں کو "پیر" کہا جاتا تھا کافی عرصے حکومت کرتے رہنے کے بعد جب انکی حکومت میں بدنظمی پھیلی تو تالپور جو سترھویں صدی میں سندھ آکر کلہوڑوں کی ملازمت میں داخل ہو گئے تھے، آہستہ آہستہ عروج پانے لگے۔ یہاں تک کہ سیاسی معاملات میں انھیں زبردست اثر و اقتدار حاصل ہو گیا۔ تالپور خاندان کے بزرگوں کو "میر" کہا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ اثر و اقتدار کی حدود سے آگے بڑھ کر انہوں نے باقاعدہ عنان حکومت سنبھال لی اور کلہوڑا خاندان کے لوگ پردۂ گمنامی میں چلے گئے۔ گویا ایک کا عروج دوسرے کے زوال کا باعث ہوا۔ یہ تو ہوا اس کا تاریخی پہلو، لیکن عام بول چال میں اب اس کا مفہوم یہ لیتے ہیں کہ دنیا داری کے بڑھتے ہی مذہب ختم ہو جاتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی

پنجاب کے دیہاتی گیت

حسن و عشق اور رنگ و بو کی یہ سرزمین جسے مسلمانوں نے پنجاب کا پیارا نام دیا، اور جس کی وحدت کو ایک فرنگی نے تمام اخلاقی، سماجی اور سیاسی قدروں کو فنا کر دیا۔ ہمیشہ ہلکے پھلکے گیتوں اور نرم و نازک نغموں سے چھلکتی رہی ہے اور آج بھی، جبکہ اس کے کھیتوں میں انسانی پنجر چمک رہے ہیں، اور اس کی وادیاں لہو کے چھینٹوں سے داغدار ہو رہی ہیں، اور اس کی آبادیوں میں ویران آنکھوں اور فق چہروں اور کاہیدہ جسموں کے کارواں بھٹک رہے ہیں، یہاں کے گیتوں میں وہی رس اور یہاں کے نغموں میں وہی گھمبیرتا ہے، آج بھی یہاں کی ملونی شامیں ڈھولک کی آواز اور نقرئی تانوں کی منتظر نظر آتی ہیں، آج بھی یہاں کی چوپالوں پر کالی آنکھوں کی گہرائیوں اور گلابی چہروں کی رعنائیوں کے مترنم تذکرے ہوتے ہیں، یہاں کی شادیوں میں آج بھی دیہاتی گانوں کا پروگرام دوسری تمام دلچسپیوں سے کہیں زیادہ پرکشش ہوتا ہے اور یہاں کی محفلوں میں آج بھی علی حیدر اور خواجہ فرید جیسے شاہ اور وارث شاہ کے دوہے کافیاں اور قصے، کنارے کے اداس اداس پس منظر پر ابھر ابھر کر اور پھیل پھیل کر اس حقیقت کو واضح کر رہے ہیں کہ پنجاب زندہ دلوں کی سرزمین ہے۔

دوسری زبانوں کے عوامی گیتوں کی طرح پنجاب کے لوک گیتوں کا بھی کوئی مصنف نہیں، یہ گیت الہڑ دوشیزاؤں، نوجوان گڈریوں، مراثیوں اور تیز دھوپ میں ہل چلانے والے دہقانوں کی تخلیقات ہیں۔ نت نئے گیتوں سے قوم کے اس دوامی خزانے میں ہمیشہ اضافہ ہوتا رہتا ہے، لیکن آج تک یہ پوچھنے کی کسی نے ضرورت نہیں سمجھی کہ ماہیا کی یہ فلاں کلی کس نے کہی۔ اور خود شاعروں کو بھی یہ خیال نہیں آتا کہ ان گیتوں کو اپنے ناموں سے مشہور کریں۔ علی حیدر ایسے شاعروں کے دوہے، خواجہ فرید اور بلھے شاہ وغیرہ کی کافیاں اور وارث شاہ اور میاں محمد کے قصے ہزار برس سے وابستہ ہو چکے ہیں، قدرتاً ان کے ناموں سے منسوب کئے جاتے رہیں گے، مگر ماہیا، ڈھولا، ٹپا، شادی کے گیت، ناچ کے گیت، رزمیہ گیت، بولیاں اور ان گنت کافیاں اور دوہے حسب معمول کچھ اس طرح نسلوں کے سپرد ہوتے رہیں گے، جیسے یہ مختلف اخلاقی اور سماجی اصول، گیت پنجابی سماج کا حصہ ہیں اور وہ پنجابی بھی، جو شہروں میں رہتے ہیں اور مغربی انداز کے ہوٹلوں میں رقص کرتے ہیں اور ریڈیو کے فرمائشی پروگرام سنتے ہیں۔ محسوس کرتا ہے جب کوئی پنجابی گیت سن لیتے ہیں تو چونک اٹھتے ہیں، جیسے وہ مدتوں کے بعد اپنے آپ میں آ گئے ہیں، اور پھر ان کے ذہنوں میں بھی نیموں کے وہ چھتنار سے سرسرانے لگتے ہیں، جہاں سے الغوزوں کے سُر پھوٹتے ہیں اور پگڈنڈیوں کے موڑ جہاں سانولی عورتیں ندیوں کے کنارے بانسری سنتی اور گنگناتی ہیں، اور وہ سبزہ زاروں میں ستیال چاندی کی طرح چمکتے ہوئے کھلیان جہاں غلے کے ڈھیر کی اوٹ میں دہقانوں کی گیت منڈلیاں سی منعقد ہوتی رہتی ہیں۔

میں شمالی پنجاب کو ماہیا کی، وسطی پنجاب کو قصوں کی اور جنوبی پنجاب کو کافیوں اور دوہوں کی سرزمین کہوں گا، قسمت راولپنڈی کے کسی شہر میں چلے جائیے، آپ محسوس کریں گے کہ یہاں کا مقبول ترین گیت ماہیا ہے، لیکن ہر ضلع بلکہ ہر تحصیل اور ہر گاؤں نے ماہیا گانے کی مختلف طرزیں تراش رکھی ہیں۔ ہر گاؤں میں ہر گانے والے کی طرز ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے، اور ہر طرز اپنی اپنی جگہ موسیقی اور ترنم کا شاہکار ہے، اسی طرح وسطی پنجاب میں عموماً ہیر وارث شاہ اور دوسرے قصوں کو نہایت شوق اور محبت سے گایا جاتا ہے، اور جنوبی پنجاب میں خواجہ فرید کی کافیوں کی دھوم ہے۔ غرض مشترک ماہیا ہے جو پنجاب کے ہر خطے میں گایا جاتا ہے، لیکن جس نے پڑھے لکھے لوگوں کی شہرت کو قبول کرکے کچھ عرصے کے لئے اپنے اس گداز، اس بھاؤ اور اس سلونے پن کو نقصان پہنچایا جو صرف بچے کھچے ماہیوں اور الغوزوں کا مرہون احسان ہے۔ منظم شاعری کے بارے میں تو میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا، لیکن یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ ہر زبان کے غیر فانی لوک گیت دیہات ہی میں تخلیق کئے گئے اور جب دیہاتی شاعروں نے شہرت کا اثر قبول کرنا شروع کیا تو وہ ارتقا اور نقصان مرگئی رہ گئے کے علاوہ پھول کی پتی پر شبنم کے موتی کا رقص بھی دیکھتی ہے ورنہ کچھ عشق ہوئی ہلکی کلیوں کے مہکتے ہوئے پھولوں کی گنگناہٹ بھی ملتی ہے اور آسمان کو چاند کا آنگن اور چاند کو تاروں کا محبوب ماننا دونوں کی آنکھوں کی پتلیاں کھلنے سے نہیں رکھ پاتی۔

ماہیا پنجاب کا مقبول ترین عوامی گیت ماہیا ہے، ہیئت کے لحاظ سے اردو یا ہندی کی کسی صنفِ شعر سے مماثلت نہیں رکھتا، یہ دو ٹکڑوں میں بٹا ہوتا ہے، پہلا ٹکڑا عموماً بے معنی ہوتا ہے، اور یہ دوسرے مصرعے کے ہم قافیہ اور ہم ردیف الفاظ پیش کر کے جیسے ماہیا کی اصل کلی سے قطعی الگ ہو جاتا ہے۔ پچھلے دنوں چند ایسی کلیاں بھی سنی گئیں، جن کے ابتدائی بول بلحاظ مفہوم مکمل مصرعے سے متعلق تھے۔ ان کلیوں کا حسن قدرتی طور پر بہتر تھا۔ لیکن بے معنی اور غیر متعلق ابتدائی ٹکڑے سے قطع نظر ماہیا کا تاثر ہمہ گیر ہے، اس کے موضوعات مختلف ہیں اور اس کا آہنگ بے مثل ہے، رموزِ حسن و عشق کے علاوہ اس میں فلسفہ و نفسیات تک کے نکات مل جاتے ہیں، اور بعض اوقات یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ پہاڑی کی چوٹی پر بیٹھا ہوا اجڈ چرواہا ماہیا کے روپ میں جو مخصوص فکری نظریہ پیش کرتا ہے وہ شیکسپیئر، گوئٹے، غالب اور اقبال کے ہاں ہی مل سکتا ہے اور پھر یہ نظریہ کتابی مطالعہ کا نتیجہ نہیں ہوتا، بلکہ اسے زندگی کی حقیقتیں اور بے نقاب فطرت کی ناز آفرینیاں پیدا کرتی ہیں۔ ایک کلی ہے ؎

ٹھلاں ملاں دا۔   ' ملہ توں نپیئے کوئی اتبار نہ پانداں دا

(پودوں کی ایک بڑی بیل ہے) (تنے کو مضبوطی سے جکڑ لینا چاہیئے کیونکہ پھنگوں پر تو اعتماد کیا ہی نہیں جا سکتا۔)

کتنی قوی شاعری ہے، مگر قوت کی دھن میں شعریت کو ذبح نہیں کیا گیا، پھر کو پتھر کہئے تو بہت کم لوگ دھیان دھریں گے مگر اسی کو قلبِ کہسار کی قاش کہہ دیجئے، ہجوم کا ہجوم چونک اٹھے گا۔

اگر ماہیا کی بہت سی کلیاں جمع کر لی جائیں تو موضوع اور مواد کے لحاظ سے یہ اردو اور فارسی غزل کے قریب پہنچ جاتی ہیں ——— ہر شعر کا ایک موضوع، ردیف اور قافیے کی سخت پابندی اور عموماً نازک اور رسیلے الفاظ کا استعمال ——— ماہیا میں محاکات کو کافی دخل حاصل ہے، عشق کی نفسیات یہاں عجیب و غریب صورتوں میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ مجھے ماہیا کی یہ کلی کبھی نہیں بھولتی ؎

پھلا فاہیئے دا   کھل نہیں پڑیا، کھڑا ایہہ ولیسی ماہیئے دا

(اے پیا بہتر یہ ہے کہ تو دھیرے چل، ورنہ میرے مسافر محبوب کا نقشِ قدم مٹ جائے گا)

ایک اور کلی جس کا محبوب پردیسی ہے، یا پردیس جانے والا ہے اس کی رخصت کا دن جس قدر قریب آ رہا ہے اسی قدر اس کی ہر حرکت کو سفر کی تیاری کی تمہید سمجھا جاتا ہے، یہ عین فطری اور نفسیاتی امر ہے ؎

دھاگے کھیساں وے   کمذب پچھے جھنڈ دے پکھی لگا نیاں دلیاں وے

(پردیس کے پنچھی اڑنے کی تیاری میں اپنے پر سنوار رہے ہیں)

کبھی کبھی جب کلی کے ابتدائی بول اصل کلی سے متعلق ہو جاتے ہیں تو کلی میں عجیب جامعیت سی پیدا ہو جاتی ہے، مثلاً ؎

خط آیا یار دوں   گونجاں وچھڑیاں جیں کرلاون پار دوں

(میرے محبوب کی طرف سے خط آیا ہے) (اس خط کی کیفیت ایسی ہے جیسے دریا کے اس پار سے بچھڑی ہوئی کونجیں کرلاتی ہیں)

ماہیا کی دنیا وسیع ہے، ہزاروں کلیاں ہیں اور سینکڑوں موضوعات ہیں جن کا اس مختصر سے مطالعے میں ان سب کا تذکرہ ناممکن ہے، لیکن یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ ماہیا سدا بہار لوک گیت ہے۔ یہ مدتوں سے پنجابی دیہات میں رائج ہے، مگر اب تک زوال نہیں آیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ غزل کی طرح یہ ہر موضوع کو اپنے اندر سمونے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس کا اختصار، اشاریت کے ان گنت خزانے اپنے اندر پوشیدہ کئے ہوئے ہے۔

ڈھولا ڈھولا مدتوں مغربی پنجاب کے دیہات کا مقبول گیت رہا، لیکن ماہیا کی ابتدا اس کی انتہا ثابت ہوئی۔ اب اس دفترِ پارینہ کو گاہے گاہے قابلِ توجہ سمجھا جاتا ہے، اور وہ بھی محض ماضی کے احترام کی خاطر، ورنہ خود میں نے دیکھا ہے کہ ایک میلے میں ڈھولا گایا جا رہا تھا۔ گانے والوں کے ساتھ ساتھ الغوزے بج رہے تھے، اور لوگ مبہوت کھڑے تھے کہ اچانک پرلی طرف کسی لڑکے نے ماہیا کی تان لگائی، ہجوم کا ہجوم پلٹا اور اس کے گرد جمع ہو گیا۔ حد یہ ہے کہ ڈھولا گانے والے بھی اس ہجوم میں جا ملے۔ انفرادی صورت میں ڈھولا بہت پیارا گیت ہے۔ اس کے ابتدائی بول بے معنی ہوتے ہیں لیکن دوسرے ٹکڑوں کی تیز و طرار اشاریت اور لرزتی ہوئی سی کیفیت ابتدائی بول کو طبلے کی تھاپ یا سارنگی کی گنگناہٹ کی سی صورت بخش دیتی ہے۔

ڈھولا کا آخری ٹکڑا رباعی کے آخری مصرعے کی سی اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں جیسے تمام موضوع کو لپیٹ اور سمیٹ لیا جاتا ہے اور محض اسی ٹکڑے پر سارا گیت چمک اٹھتا ہے۔ مثلاً ایک پنجابی ڈھولے کا مضمون ہے۔

بازار میں برفی بک رہی ہے۔   مجھے ایک ننھا سا چوزہ [illegible]

دکھوں کی پونیاں کاتوں گی۔ غم و اندوہ کے تانے [illegible]

اس مثال میں دکھوں کی پونیوں نے گیت گانے والی کی ساری [illegible]

تیری ضرورت ہے، اسے ساقی یہ کیا غضب ہے کہ میرے ہوتے ہوئے تجھے بہروں (رقیبوں) نے لوٹ لیا ہے)

ایک اور انقلابی پنجابی کا مصرع ہے ؎

کر دیں گے آزاد چھوٹے جیل دے

(جیل کی گھٹن اور ناکافی غذا ہمیں آزادی دلائے گی)

دوہا

پنجابی دوہا دو یا چار مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے، ابھی پنجابی شاعری کا جتنا ذخیرہ دوہوں کی صورت میں محفوظ ہے، اتنا غالباً قصوں اور کافیوں کے علاوہ اور کہیں نہیں۔ دوہے لکھنے والوں کی تعداد بہت ہے، اور ان میں سے اکثر نہایت اچھے شاعر ہیں، بڑے بڑے بزرگوں، پیروں اور عالموں نے بھی دوہے لکھے ہیں اور گڈریوں دہقانوں نے بھی، یہ صنف شاعری رباعی سے ملتی جلتی ہے، اگرچہ اس میں آخری مصرعے کی شدت اور جامعیت شرط نہیں۔ ہر مصرع اپنی جگہ مکمل ہوتا ہے اور چاروں مصرعے مل کر وحدت تاثر پیدا کرتے ہیں جسن، عشق، علم و عرفان، زہد و رندی، بے ثباتی دنیا اور عظمت آدم، غرض ہر موضوع پر ان گنت دوہے موجود ہیں، بے شمار سی حرفیاں ہیں۔ لاتعداد غیر مسلسل دوہے ہیں، جن کا انتخاب اور ترتیب پنجابی شاعری پر بہت بڑا احسان ہوگا۔ مغربی پنجاب میں دوہے گانے کا یہ طریقہ ہے کہ گانے والا پہلے دوہا گائے گا، پھر ماہیا کی دو چار کلیاں، پھر دوہا اور پھر ماہیا کی کلیاں اور یہی سلسلہ چلتا رہے گا۔ جنوبی پنجاب میں دوہے کو کافیوں کے مختلف بندوں کے درمیان دہرایا جاتا ہے۔

دوہا گانے کی دو طرزیں ہیں، ہوائی اور سادہ۔ ہوائی دوہے گانے کے لئے آواز پر بے پناہ قابو اور اختیار کی ضرورت ہے، البتہ سادہ دوہے سادگی سے گائے جاتے ہیں جن میں موسیقی کے نشیب و فراز اتار چڑھاؤ کم ہوتے ہیں، اس لئے عوام میں یہی سادہ طرز رائج ہے۔

عام طور پر دوہے دو بحروں میں لکھے جاتے ہیں ایک بحر تو فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن کے قریب ہے اور دوسری کے ارکان کی ترتیب یوں دی جا سکتی ہے مفعولن فعلن مفعولن مفعولن فعلن مفعولن —— دونوں ہوائی بحریں ہیں، اور دوسری مروجہ بحروں کی طرح راہ میں روڑے نہیں اٹکاتیں ان میں لفظوں کو خوب خوب پھیلایا اور سمایا جا سکتا ہے، اور پنجابی میں (ہندی کی طرح) الفاظ کی کھینچیں اور کٹیاں فراخ دلی سے برداشت کر لی جاتی ہیں، مختلف نظریات کے شعرا کے ایک ایک تعلق سے دوہے کی ہیئت اور مواد کے متعلق بڑا سا اندازہ ہو جائے گا۔

بابا فرید شکر گنج دوہوں کے مشہور ترین شاعر گزرے ہیں ان کی شاعری میں فلسفہ و تصوف کے علاوہ ایک رقصاں لہر سی ہے جو اردو میں صرف میر اور غالب اور اقبال کو نصیب ہوئی ہے۔ افسوس ہے مجھے اس وقت ان کا کوئی دوہا مکمل صورت میں یاد نہیں آیا۔ میرا ارادہ ہے کہ کسی اگلی صحبت میں بلّھے شاہ کی سی حرفیوں پر ایک مفصل مقالہ الگ صورت میں پیش کروں گا۔

حضرت سلطان باہو ضلع جھنگ کے رہنے والے تھے مغربی پنجاب میں اب بھی ان کے مرید ہزاروں کی تعداد میں ملتے ہیں۔ آپ ایک خدا رسیدہ بزرگ اور اپنے زمانے کے ولی تھے، آپ کی شاعری میں انتہا درجہ کا گداز اور نرمی ہے، اور تشبیہات کی ندرت تو بے مثل ہے، آپ کا ایک دوہا ہے ؎

کیوں چھوڑی رودن نیں بھگدی اسانوں کس نے ٹھگ دلاسا
سوڑی ساہی وچ سٹ دیں تینوں سٹھے پرت دکھیں پاسا
ترسے مو سٹھ سوال پچھیسیاں تی گھٹ مِیل نہ ماسا
عمر بندے دی ایویں گذری باہو جویں پانی وچ تے پتاسا

(تو نے گریہ کیوں چھوڑ دیا اور ہنسی پر کیوں کمر باندھ لی۔ آخر تجھ کو یہ (جھوٹا) دلاسا کس نے دیا!

(کیا تجھے معلوم نہیں کہ) تجھے تنگ بغلی قبر میں پھینک دیا جائے گا جہاں تو کروٹ تک نہیں بدل سکے گا۔

(منکر نکیر) تجھ سے تین سو ساٹھ سوالات پوچھیں گے، باہو سے تین سو ساٹھ،

اے باہو انسان کی زندگی یوں گذرتی ہے جیسے پانی میں پڑا ہوا بتاشہ گھلتا ہے)

انسان کی زندگی کو پانی میں پڑے ہوئے بتاشے سے تشبیہ دینا صرف شاعری نہیں، اتنا مکمل مشاہدہ اور اس قدر کا مطالعہ ہے کہ میں تو اس سے زیادہ جامع تشبیہ کا تصور تک نہیں کر سکتا۔

حضرت خواجہ فرید کے دوہے بھی بہت مشہور ہیں مگر ان کی کافیاں ان کے دوہوں سے زیادہ مقبول ہیں، ان کے علاوہ کئی بزرگان دین کے دوہے ہیں اور پھر غیر معروف شاعروں کے دوہے

گھوڑا ضلع سرگودھا کا ایک کسان علی کہتا ہے ؎

ماں ڈھیاں نال پریت لگائی نہیں جو من کرن دیاں چاہیں
مر کے تارے تیر غاں دے تین عرض سنید سے ناہیں
ابجاری منہ بر تھے پونے پائیر نے بغل دوہائیں
علی محمد مبارک یار دا لاتی گھنڈ کھلن تاں ولم شفائیں

(مجھے ایک نہایت کٹھور انسان سے محبت ہوئی، ستم یہ ہے کہ میں اس کے سامنے عرض مدعا بھی نہیں کر سکتا۔

خودغرضوں کے لو بنتے چلے جاتے ہیں اور اب میری التجا تک سننے سے گریز کرتا ہے:
مجھے ایک مرض بخش کر اپنے چہرے کو پردے میں لپیٹا اور دوائیں بغل میں دبا کر
دامن جھڑ گیا۔
اے قتل، اس مرض سے شفا حاصل کرنے کا صرف ایک علاج ہے اور وہ ہے
رخِ محبوب کی بانہیں)

بولیاں

بولی وسطی پنجاب کا محبوب ترین گیت ہے، امرتسر اور فیروز پور کے علاوہ لاہور، گوجرانوالہ اور شیخوپورہ میں بولیاں نہایت خشوع سے گائی جاتی ہیں۔ شالامار باغ میں میلۂ چراغاں کے موقع پر میں نے دہقانوں کو بولیاں گاتے سنا ہے، وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر اپنے خاص سازوں کی چھن چھن پر اتنی تیزی، شدت اور لذت سے بولیاں گاتے ہیں کہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے وہ کسی مذہبی ریاضت میں محو ہیں۔ انتہا درجہ کی ننگی بولیوں کا رواج عام ہے، مگر صاف ستھری بولیوں کی بھی کمی نہیں، بولی اشاریت اور دو لخت ابہام کی انتہا ہے، دو تین لفظوں میں پورا واقعہ، مکمل تجربہ اور طویل قصہ سمٹ آتا ہے اور لطف یہ ہے کہ یہ اشارے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ دو بولیاں درج کرتا ہوں ؎

رن نہا کے چھپڑ دچوں نکلی   سُلفے دی لاٹ ورگی

(عورت تالاب سے نہا کر نکلی ہے اور یوں معلوم ہوتی ہے جیسے سلفے کا کش نکالنے سے چلم پر ایک لمبا سا مخروطی شعلہ ابھر جاتا ہے)

اب اگر آپ سلفے کی "لاٹ" کو غور سے دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کا سرا چھوٹا اور سیاہی مائل ہوتا ہے۔ درمیانہ حصہ قدرے چوڑا اور بے حد روشن اور زیریں حصے تک آ کر یہ پھر چھوٹا ہو جاتا ہے، تالاب سے نکلی ہوئی عورت کے لئے یہ تشبیہ نادر ہی نہیں، حیران کن بھی ہے اور یہ مشاہدہ ہے کسی ایسے کسان کا جسے ہل اور سماج اپنے نظام کا ناکارہ ترین پرزہ سمجھتا ہے ؎

میری گلّی کسے نا دیکھی   ٹُٹدی نوں جگ جاندا

(میری محبت کی ابتدا تو کسی کو علم نہیں مگر اس کے انجام کو ایک زمانہ جانتا ہے)

محاکات کا یہ وہ عروج ہی نقطہ ہے جس کے لئے اچھے اچھے زبان داں ترستے رہے ہیں۔

سلے بولیوں کے بارے میں سعادت حسن منٹو کے دو دلچسپ مضامین ساقی دہلی اور پھر منٹو کے مضامین میں شائع ہو چکے ہیں۔

شادی کے گیت

یہ گیت عام نہیں ہونے پائے کیونکہ انہیں شادی بیاہ کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ ویسے ان میں بھی دوسرے لوک گیتوں کی طرح سچا مشاہدہ اور شفاف احساس رچا ہوا ہے، ان کی طرزیں مختلف ہیں۔ مگر سب کی سب موقع و محل کے عین مطابق یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی بہت بڑے فن کار نے ان کی دھنیں مقرر کی ہیں۔ جو اب تک سینہ بسینہ چلی آ رہی ہیں، عموماً ان گیتوں کو میراثنیں گاتی ہیں۔

ان گیتوں کو ناچ کے گیت بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو ناچ کے موقع پر گائے جاتے ہیں۔ مغربی پنجاب کی عورتوں کا رقص جسے "لڈی" کہتے ہیں۔ بے شمار خموں اور بے اندازہ خطوں کا ایک دلآویز مرکب ہوتا ہے۔ یہ گیت اس رقص کا، یا یہ رقص ان گیتوں کا ساتھ دیتے ہیں، وسط میں ایک میراثن کھڑی ڈھولک بجاتی رہتی ہے اور عورتیں ایک دائرے میں رقص و نغمہ کے تمنے ہانے بنتی ہوئی پنجابی دیہات کی فضا میں کیف و سرود کی پھواریں برساتی رہتی ہیں۔

برات آ چکی ہے، مہمان رخصت ہو چکے ہیں، دولہا اور شاہ بالا ایک پُر تکلف مسند پر بیٹھے ہیں۔ رات بھیگ رہی ہے کہ اچانک دور سے ڈھولک کی آواز سنائی دیتی ہے اور دولہا چونکتا ہے، کیونکہ اسے ایک دلآویز گیت کے ساتھ چند موزوں گالیاں بھی سننا پڑیں گی، اور بعض پُر مذاق مزاح کے تیر چلائے جائیں گے۔ ڈھولک کی آواز قریب آ رہی ہے اور گیت سنائی دیتا ہے۔

اُٹھی جاگ وے لالہ اسی آیاں — بھیا اب اٹھو بھی ہم تمہاری بہنیں آ چکی ہیں
اسی آیاں تاں گلیاں سہایاں — ہم آئیں تو گلیوں پر رونق چھا گئی
اسی کیہڑے ویہے دی کھلیاں — ہم کب سے یہاں کھڑی ہیں۔
لگ گئیاں پیراں دیاں تلیاں — ہمارے تلوے زمین پر جیسے چپک کر رہ گئے ہیں
تُوں تاں جاگ وے لالہ اسی آیاں — بھیا تم جاگ ہی اٹھو ہم آ چکی ہیں۔
اٹھی جاگ وے لالہ اکھاں لو دیا — اے نیند میں گھلتے ہوئے بھیا۔ اب اٹھو بھی۔
اکھاں لو دیا لالہ جیوں جہان کہاں لو دیا لالہ — نیند گھلتے ہوئے بھیا۔ لڑکھڑاتے ہوئے بھیا
اٹھی جاگ وے لالہ — اب جاگ اٹھو
تیری بھاگ وے لالہ — تیرے بھاگ چمکیں
اسی آیاں — ہم آ چکی ہیں۔

یہ گیت رات کے سناٹے میں نئی نئی ڈھولک کے تال پر گا کر عجیب سی فضا طاری کر دیتا ہے، اور شادی بیاہ کی تقریب پر خوش مذاق دہقانوں کو

آنگن میں گیت کا انتظار رہتا ہے، وہ خانہ بدوشوں کے قریب اگر گیت نہیں سن سکتے۔ ان کے جھونپڑوں کی منڈیروں سے دلکش باتوں تک چھنے پڑے رہتے ہیں۔

پنجابی میں "بھین بھراواں دے گیت" (بھائی بہن کے گیت) بھی بہت مشہور ہیں۔ جناب حامد علی خاں نے جو ان دنوں رسالہ "ہمایوں" کے مدیر تھے، "ہمایوں" ہی میں ان معصوم گیتوں پر ایک نہایت عمدہ مضمون لکھا تھا، یہ گیت صرف بہنوں کے لئے مخصوص ہیں اور جب اداس بہنیں اپنے پردیسی بھائیوں کی یاد میں چکی کی گھمر گھمر پر یہ گیت گاتی ہیں تو بھائی بہن کا پاکیزہ اور غیر فانی رشتہ کائنات کی سب سے بڑی نعمت معلوم ہونے لگتا ہے۔

علاوہ ازیں میانوالی، اٹک اور شاہ پور وغیرہ کے اضلاع میں رزمیہ گیتوں کا بھی خاصہ رواج ہے۔ یہ گیت عرب کے زمانۂ جاہلیت کے قبائلی قصیدوں کے مشابہ ہوتے ہیں۔ ان میں خاندانوں کی لڑائیوں کی روداد اور مشہور ڈاکوؤں کی بہادری کے قصے نظم کئے جاتے ہیں، اور صرف اس لئے غلوؤں اور دیوانوں میں گائے جاتے ہیں کہ کہیں ان کی تکرار ایک نئی لڑائی کی ابتدا نہ بن جائے۔

قصے پنجابی کے قصوں کو دنیا کی عظیم اور خلاق شاعری میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ ان قصوں کے مصنف بڑے پائے کے بزرگ تھے، جنہوں نے فن کے ہر مطالبے کا لحاظ رکھا۔ ان شعرا کا اپنا اسلوب ہے، اپنی زبان ہے، اپنا انداز ہے انھوں نے رطب و یابس سے گریز کیا، خیالات و جذبات کے انتخاب کو ضروری سمجھا اور ایسے ایسے فن پارے تخلیق کر گئے جن کو پڑھ کر ہم اس دھوکے میں مبتلا نہیں رہ سکتے کہ پنجابی مردہ یا مضمحل زبان ہے۔ وارث شاہ کی ہیر پنجابی شاعری کا ایک غیر فانی شاہکار ہے جس میں ہر پنجابی اپنے مذاق کے مطابق معانی اخذ کر لیتا ہے، لیکن درحقیقت یہ ایک ایسا منظوم رومانی ڈرامہ ہے جس کے مناسب انتخاب کے بعد اگر اسے اسٹیج پر پیش کیا جائے تو نہایت کامیاب رہے۔ وارث شاہ کو پنجابی زبان پر پورا عبور حاصل ہے۔ اور عربی و فارسی کی مہارت نے ان کی زبان کو بہت نکھار دیا ہے۔ ہیر وارث شاہ کو تمام پنجاب میں نہایت اہتمام سے گایا جاتا ہے، اس لئے پنجاب میں اس سے زیادہ شاید ہی کوئی اور گیت یا نظم مقبول ہو۔

سیف الملوک کے مصنف میاں محمد بھی بہت بڑے شاعر ہیں۔ بکل بکاؤلی اور سیف الملوک کے قصے کو انھوں نے ہیر وارث شاہ سے مختلف بحر میں نظم کیا ہے۔ وہ وارث شاہ سے بڑے شاعر ہیں لیکن وارث شاہ سے قدرے کم درجے کے۔ بطور مثال ان کے قصے کا ایک شعر مجھے کبھی نہیں بھولے گا ؎

بے قدراں دی یاری کولوں فیض کسے نہیں پایا
ککر تے انگور چڑھایا ہر گچھا زخمایا

(قدر ناشناسوں کی صحبت سے بھلا کس نے فیض پایا ہے، انگور کی بیل کیکر پر چڑھے گی تو یقینی بات ہے کہ خوشے زخمی ہو جائیں گے)

قصہ سیف الملوک مغربی اضلاع کا پسندیدہ قصہ ہے اور لہک لہک کر گایا جاتا ہے، ان کے علاوہ پنجابی زبان میں بے شمار قصے لکھے گئے ہیں، چند مختصر قسم کی کہانیوں کو چھوڑ کر باقی تمام قصوں میں شاعر کی ریاضت اور مشق و مشاہدے کا پتہ چلتا ہے، یہ قصے اس قدر ہر دلعزیز ہیں کہ انھیں آسانی سے لوک گیتوں میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

کافی اور اب آخر میں پنجابی شاعری کی وہ محبوب صنف جسے کافی کہتے ہیں، اور جو اس زبان میں وحدت تاثر اور وحدت موضوع کی واحد مثال ہے، ہر کافی ایک مکمل نظم ہوتی ہے، جس کا ٹیپ کا مصرع پلٹ پلٹ کر آتا ہے اور جیسے سننے والے کو خبردار کرتا ہے کہ موضوع کی وحدت سے ہوشیار رہو، ہم تمہیں بھٹکنے نہیں دیں گے۔ پورے پنجاب میں جس شاعر کی کافیاں نہایت عقیدت، محبت اور شوق سے گائی جاتی ہیں، وہ حضرت خواجہ فریدؒ ہیں۔ آپ مٹھن کوٹ کے ایک بزرگ خاندان کے چشم و چراغ تھے، چاچڑاں شریف (ریاست بہاولپور) میں آپ نے مستقل قیام اختیار کیا۔ آپ نواب صاحب بہاولپور کے پیر تھے، اور سندھ، بلوچستان ریاست بہاولپور اور جنوبی پنجاب کے اضلاع میں آپ کے مرید اب بھی ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں۔ آپ ایک خدا رسیدہ رہنما اور مرشد تھے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ آپ کو اللہ تعالیٰ نے قوت شعری کے ان خزانوں سے بھی فیض یاب کیا تھا، جو ابتدائے آفرینش سے اب تک بہت کم خوش نصیبوں کے حصے میں آئے ہیں۔ آپ کی کافیاں ملتانی (یا بہاولپوری) زبان میں ہیں۔ بحیثیت پنجابی سے یہ زبان قطعی الگ ہے مگر اس کی مٹھاس، نرمی اور ملاحت پڑھنے یا سننے والے کو بہت جلد اس سے قریب کر دیتی ہے، خواجہ فریدؒ کی کافیوں کو غیر فانی شاعری کی صف اول میں جگہ دی جا سکتی ہے۔ نواب صاحب بہاولپور کے ایما پر بہاولپور سے انکی کافیوں کا مرتبہ مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ آپ ہر طبقے کے پنجابیوں میں بے حد ہر دلعزیز ہیں اور ریڈیو نے تو ان کے کلام کی نشر و اشاعت میں بہت نمایاں حصہ لیا ہے۔ خواجہ فریدؒ کا کلام وارث شاہ کی ہیر سے بھی زیادہ مقبول ہے، یہ سجادہ نشینوں کے ہاں قوالی کی صورت میں بھی گایا جاتا ہے، اور مزدوروں اور کسانوں کے ہاں لوک گیت کی حیثیت میں بھی، سوز و گداز اور نغمہ ریزی سے چھلکتی ہوئی ان کافیوں کا انتخاب بہت دشوار ہے، کیونکہ ہر کافی پڑھ کر یہ کہنا پڑتا ہے ؎

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

ایک کافی کے چند بند ہیں :-

(بقیہ صفحہ ۷۷ پر)

ڈاکٹر حبیب الرحمٰن

پاکستان کے تمدنی روابط

آنریبل وزیرِ تعلیم نے نومبر ۱۹۴۷ء میں پاکستان کی پہلی تعلیمی کانفرنس بلائی تھی۔ اس میں فیصلہ ہوا تھا کہ دنیا کے تمام امن پسند ممالک میں اقوام کی زندگی کی مختلف قسم کی سرگرمیوں اور خاص کر تعلیم و تمدن کو سمجھنے اور باہمی تعلقات کو ترقی دینے کی غرض سے مل کر کام کیا جائے۔ اس قسم کا پروگرام ترتیب دینے میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ ہمیں تمدنی مراسم کا کام اس غرض کے لئے وقف کر دینا چاہئے کہ زندگی میں اس طرح کے مواقع پیدا ہو سکیں کہ مختلف ملک ایک دوسرے کے علم اور فکر سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اس طرح ہماری نئی مملکت ایک ایسی تحریک پیدا کر سکے گی جو دنیا کو اسلامی تصورات سے واقف ہونے میں مدد دے اور ملک ایک دوسرے کی زندگی سے زیادہ سے زیادہ واقف ہو سکیں۔

اس لئے ہم نے شروع ہی میں فیصلہ کر لیا تھا کہ معلومات کے اضافہ اور اشاعت کی خاطر ذہنی سرگرمیوں سے تعلق رکھنے والے اداروں کی زیادہ سے زیادہ مدد اور حمایت کی جائے۔ ہماری رائے میں یہ سرگرمیاں ایسے وسائل کا کام دیں گی جن سے اخوت، مساوات اور رواداری کے اسلامی تصور کے سمجھنے میں مدد ملے گی۔ ایک دوسرے کی رسوم اور رہنے سہنے کے طریقوں سے بے خبری لوگوں میں اکثر شبہ اور عدم اعتماد کا سبب بن جاتی ہے یہی اختلافات بڑھتے بڑھتے تصادم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ تجربہ نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ جس امن کی بنیاد سیاسی اور معاشی پیمانوں پر ہو اسے اقوامِ عالم کی مستقل، متفقہ اور سچی حمایت نہیں حاصل ہو سکتی۔ مستقل امن بنی آدم کے اخلاقی اور ذہنی تعلقات کی بنیاد پر ہی قائم ہو سکتا ہے۔

کانفرنس نے اس مقصد کے لئے مندرجہ ذیل تجاویز بالاتفاق منظور کیں۔

(۱) کہ شعبۂ تعلیم، مملکتِ پاکستان اور دیگر ممالک کے مابین طلباء اور اساتذہ کے تبادلہ کی ایک اسکیم مرتب کی جائے۔

(۲) پاکستان اور بیرونی ممالک کے درمیان علم و ادب کے ذخیرہ کا تبادلہ کیا جائے۔

(۳) حکومتِ پاکستان دوسرے ممالک میں اپنی تعلیمی اور تمدنی سرگرمیوں کی اشاعت کرے تاکہ دوسرے ممالک کے طلباء و اساتذہ کو پاکستان آنے اور اس سے تمدنی روابط قائم کرنے کا شوق پیدا ہو۔

آنریبل وزیر نے ان تجاویز کو عمل میں لانے کا مسئلہ ہاتھ میں لیا اور پہلے تمدنی تعلقات کی ایک کمیٹی کے قیام کا فیصلہ کیا۔ اس کمیٹی نے مقامی اور بیرونی تمدنی سرگرمیوں کے لئے جامع پروگرام مرتب کئے۔ کمیٹی تعلیمات کی استقامت، ترقی اور اشاعت پر غور کر رہی ہے اور یہ کام اسی وقت ہو سکتا ہے جب مختلف قوموں میں اس جذبہ کو عام کیا جائے کہ ذہنی سرگرمیوں کی ساری شاخوں میں باہمی تعاون ایک ضروری چیز ہے۔

کمیٹی نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اُن تمام ممالک میں جن سے ہمارے دوستانہ تعلقات ہیں، تمدنی انجمنیں قائم کی جائیں۔ ہم نے پاکستان میں، پاکستان ایران، پاکستان افغانستان، پاکستان ترکی، اور پاکستان عرب تمدنی انجمنیں قائم کر لی ہیں۔ دیگر ممالک سے متعلق اسی قسم کی تمدنی انجمنیں بھی عنقریب قائم کی جائیں گی۔ ان میں سے ہر انجمن کا یہ کام ہوگا کہ وہ اپنی باقاعدہ مرتب کردہ اسکیم کے ماتحت تمدنی تعلقات کو ترقی دے۔

امید کی جاتی ہے کہ ان کی جوابی انجمنیں مشرقِ وسطےٰ کے متعلقہ ممالک میں بھی قائم کر دی جائیں گی۔ ہماری حکومت سرکاری طور پر ایسی انجمنوں کے قیام کے لئے گفت و شنید کر رہی ہے۔ ان انجمنوں کی جوابی انجمنیں بیرونی ممالک میں اسی طرح اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں گی۔ ہر انجمن علوم و فنون، طلباء اور اساتذہ کے تبادلے کے منصوبے اور بیرونی ممالک میں تمدنی مشن بھیجنے کے ذیل میں اپنے مشورے مرکزی تمدنی کمیٹی کو بھیجا کرے گی۔

مرکزی کمیٹی فیصلہ کر چکی ہے کہ پاکستانی طلباء کو مندرجہ ذیل ملکوں میں علم کی مختلف شاخوں میں اعلےٰ تعلیم اور تحقیق کی غرض سے بھیجا جائے۔

مطالعہ کے مضامین

افغانستان - تاریخ معاصرت اور پشتو ادب۔

ایران - عہدِ جدید کا فارسی ادب اور تاریخ معاصرت۔

ترکی - تاریخ معاصرت، ترک مغل نسلوں کی تاریخ، فوجی سائنس اور علم لشکر کشی کا مطالعہ، ترکی ادب کا مطالعہ۔

مصر - عہدِ جدید کا عربی ادب، اسلامی مطالعہ، طریقۂ تعلیم

شام اور لبنان - تاریخ معاصرت، فن باغبانی و ریشم سازی۔

کمیٹی اس فیصلہ کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے حکومت سے ایک مناسب عطیہ حاصل کرنے کے لئے بات چیت کر رہی ہے۔

پاکستان اور مذکورہ بالا ممالک کے مابین طلبا کا تبادلہ دو طرفہ اصول پر ہوگا۔ اسی اسکیم کے تین ایرانی طلبا ہمارے ہاں آئے ہوئے ہیں جو مغربی پنجاب میں لائلپور ایگریکلچر کالج میں زراعت کا مطالعہ کر رہے ہیں۔

اس منصوبہ کی وسیع پیمانے پر شہرت دینے اور بیرونی ممالک میں مناسب اشاعت کرنے کے لئے شعبۂ تعلیم ایک جامع رسالہ تیار کر رہا ہے۔ اس وقت پاکستان میں مطالعہ کے لئے مختلف قسم کے موضوعات موجود ہیں اس رسالہ میں ان موضوعات کی گنجائش اور مراعات کی وسعت کے متعلق مفصل اطلاعات پیش کی جائیں گی۔

شعبۂ تعلیم نے بیرونی زبانوں کا ایک پاکستانی انسٹیٹیوٹ قائم کرنے کی اسکیم بھی تیار کی ہے۔ اول اول تو اس انسٹی ٹیوٹ میں فرانسیسی، روسی، جرمنی، ہسپانوی، فارسی، عربی، ترکی اور ہندی زبانیں پڑھائی جائیں گی لیکن بعد میں اس انسٹی ٹیوٹ کی توسیع کے ساتھ، چینی، برمی، انڈونیشی، اور اطالوی جیسی اہم زبانوں کی تعلیم شروع کردی جائیگی۔ زبانوں کے علاوہ طلباء کو سیاسی تاریخ بھی پڑھانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ مزید برآں جن اہم ممالک کی زبانیں پڑھائی جائیں گی ان کا جغرافیہ، اقتصادی ترقی اور تاریخ ادب کی بھی تعلیم دیجائیگی۔ کمیٹی نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ مختلف زبانوں کی تعلیم صرف ان ہی اساتذہ کے سپرد کیجائے جن کی وہ مادری زبان ہو۔

ہمیں یہ بھی امید ہے کہ ہم ایک اسلامی ادارہ قائم کرسکیں گے۔ اس سے مقامی اور بیرونی ممالک کے طلباء کو تمام اسلامی ادوار پر تحقیقی کام میں بہت مدد ملے گی۔ اس کی ایک بہت وسیع اور جامع لائبریری ہوگی جس میں اسلامیات پر مختلف کتابیں اور رسالے ہوں گے، عربی، فارسی اور اردو کی کتابوں کے علاوہ یورپ کے ماہرین مستشرقیات کے کارنامے بھی مہیا کئے جائینگے۔ ایک شعبہ قلمی کتابوں، چھوٹے قلموں اور تصویری عکسوں اور نادر کتابوں کے لئے مخصوص ہوگا۔ ایک ایسا عجائب خانہ قائم کرنے کا بھی ارادہ ہے جس میں مصوری، خطاطی اور مٹی کے برتنوں کے نمونے، آثار قدیمہ سے متعلقہ نمونے، آرائشی تختیاں، پارچہ بافی، لکڑی کا کام، چمڑہ، سونے چاندی کی پچی کاری کڑھائی اور دھات میں جڑاؤ کا کام، چاندی کے مرتبان، قالینیں اور اسلامی ممالک کی دیگر مصنوعات پیش کیجائیں گی۔

یہ بھی تجویز ہے کہ اس دارالخلافہ میں ان مقاصد کے پیش نظر ایک پاکستان اکیڈیمی کھولی جائے۔ اس کے مقاصد کچھ اس طرح کے ہوں گے۔

(۱) علم کی تمام شاخوں میں تحقیق و تفتیش کے کام کو ترقی دینا۔

(۲) فضیلت کا بلند معیار قائم کرنا۔

(۳) تحقیقی کام کو ترقی دینے اور اس میں تحریک پیدا کرنے کے لئے حکومت کو مختلف طریقۂ کار کا مشورہ دینا۔

مجوزہ اکیڈیمی ان مقاصد کو ان طریقوں سے حاصل کریگی ....

(۱) منظور شدہ تحقیقی کارگزاریوں کو اپنے میگزین یا علاحدہ شکل میں شائع کرکے۔

(۲) میعادی اجلاس اور کانفرنس طلب کرکے۔

(۳) طلبا کو وظیفے دے کر۔

(۴) کتب خانے، معمل اور عجائب خانے قائم کرکے

(۵) مشہور و معروف ادیبوں، عالموں اور سائنسدانوں کو دعوت دیکر،

(۶) معیاری اور تحقیقی کارگزاریوں کا اجراء کرکے۔

اکیڈمی میں علوم کے مختلف شعبوں کے نامور آدمی شامل ہوں گے۔

ان مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے چار تمدنی اداروں کا افتتاح کیا گیا تو بیرونی ممالک کے سفیر، کابینہ کے وزراء اور شہر کے نامور افراد شریک تھے اور تمام اسلامی ممالک کے بادشاہوں اور اعلے افسروں سے بہی خواہی کے پیغامات موصول ہوئے تھے۔ افغانستان اور ترکی کے سفیروں اور ایران و مصر کے نائب سفیروں نے اس موقعہ پر مختصر تقریریں کیں اور خواہش ظاہر کی کہ ان اداروں کا افتتاح کامیاب ہو۔ وزیر تعلیم نے فرمایا۔

" میں مختصراً یہ بتادینا چاہتا ہوں کہ ہم نے اپنی سرگرمیوں کو ابھی صرف اسلامی ممالک تک کیوں محدود رکھا ہے۔ ہمیں ان ممالک کے نظریات کا ایسا اشتراک حاصل ہے جس کی بنیادیں روحانی اور اخلاقی رشتہ پر قائم ہیں۔ ہمارا مذہب اور ہماری تمدنی روایات بھی وہی ہیں جو ان کی ہیں اور ہماری طرح وہ بھی صدیوں کی نیند سے بیدار ہو رہی ہیں اور ان میں بھی دن بدن اس اہم تاریخی فریضہ کا احساس بڑھتا جا رہا ہے۔ جو ہمیں دنیا کو متفق کرنے والی قوت کی حیثیت سے ادا کرنا ہے۔ اسلئے یہ ایک قدرتی بات ہے کہ ہمارے تمدنی مراسم سب سے پہلے انہی ملکوں سے ہوں۔ رفتہ رفتہ ہمارے تمدنی مراسم دیگر ممالک سے بھی پیدا ہو جائیں گے حتےٰ کہ تمام دنیا سے ہمارے برادرانہ تعلقات پیدا ہو جائیں گے۔ مجھے قوی امید ہے کہ ہمارے یہ تمدنی مراسم دوسری اقوام کے ساتھ ملکر کام کرنے میں بہت سود مند ثابت ہونگے اور تخیلات کی راہوں کو آزاد کر کے صرف ہمارے دماغ اور دل کو وسعت بخشیں گے بلکہ دنیا کے امن اور فلاح و بہبودی کے مقصد کو تقویت پہنچائیں گے۔

عزیز احمد

کراچی کی سیرگاہیں

ریگستان کی سرد راتیں، ہر آن بدلتا ہوا موسم، سمندر کے شہری کنارے، چٹانوں کے رومان انگیز سلسلے ــــ یہ سب سامان سیاحوں کو کس کا دل سیر کے لئے نہ مچلے گا؟ اور کراچی کی شور و شغب اور ہاؤ ہو سے معمور دنیا کے گرد یہی رومانوی ماحول ہالہ کئے ہوئے ہے۔ دن بھر زندگی کی ہماہمی میں گزارنے کے بعد مضمحل قویٰ اور تھکے ہوئے دماغوں کو فرحت کی ضرورت ہوتی ہے تو کراچی کے آس پاس چند میل کے اندر ہی اندر فرار کا سامان مل جاتا ہے۔ سیر سپاٹا اس میکانکی زندگی سے فرار نہیں تو اور کیا ہے؟

کراچی کی بیشتر آبادی اب ان لوگوں پر مشتمل ہے جو دلی اور شمالی ہندوستان کے دوسرے شہروں سے منتقل ہو کر یہاں آئے ہیں۔ یہ لوگ ایک عظیم الشان تمدن کی روایتیں اپنے ساتھ لائے ہیں۔ دلی لٹتی رہی، مٹتی رہی، اُجڑتی رہی، لیکن اس کا تمدنی اور سماجی پس منظر کم و بیش ایک سا رہا۔ مغل سلطنت کے زمانے میں سیر و تفریح کی جو رسمیں قائم ہوئی تھیں وہ جاری رہیں۔ پھول والوں کی سیر، اوکھلے کی سیر، قطب صاحب کی سیر (یا سیل) بظاہر معمولی سیر سپاٹے تھے۔ لیکن ان کے پس منظر میں ہمیں نہایت عزیز تمدنی اور سماجی روایتیں رچی بسی نظر آتی ہیں۔ دلی والے دلی کی خاک تو بے شک چھوڑ آئے۔ لیکن اپنی عزیز روایتوں کو کیسے چھوڑ سکتے تھے! جہاں موسم سہانا ہوا، ہوائیں سنکیں، فضا پر بادل لہرائے، ان کے دلوں میں اوکھلے، قطب صاحب، روشن چراغ دہلی اور دوسری جگہوں کی یاد مچلنے لگتی ہے اور وہ ان مقامات کی سیر کو نکل کھڑے ہوتے ہیں جو دلی کی سیرگاہوں کے نعم البدل کے طور پر انھیں کراچی میں ملی ہیں۔

کراچی کی مقبول ترین سیرگاہ کلفٹن ہے۔ یہ در اصل اس ٹیلے کا نام تھا جو شہر سے تین میل مغرب کی جانب ساحل سمندر پر واقع ہے۔ اس کی اونچائی ساٹھ فٹ ہے۔ لیکن اسے اب پرانا کلفٹن کہتے ہیں اور جدید کلفٹن کے نام سے وہ پل اور اس سے ملحقہ عمارات وغیرہ موسوم ہیں جو اس ٹیلے سے شمال مغرب کی جانب بنی ہوئی ہیں۔

شروع شروع میں یہ پل لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ لیکن ۱۹۲۰ء میں مشہور پارسی رئیس سر جہانگیر کوٹھاری نے تین لاکھ روپے کے صرف سے یہ پل اور متعلقہ عمارات تعمیر کرائیں۔ سنگین محرابوں پر بنا ہوا یہ پل تیرہ سو فٹ لمبا اور پندرہ فٹ چوڑا ہے اس کی تعمیر میں جودھپوری سرخ پتھر اور گزری پتھر استعمال کیا گیا ہے۔

پل کے ایک سرے پر ایک خوبصورت چمن ہے جس کی روشوں کی تزئین میں چمک دار سیپیاں استعمال ہوئی ہیں۔ چمن کے جنوب مغربی کونے پر ایک خوبصورت گنبد بنا ہوا ہے۔ پل کا دوسرا سرا سمندر کے کنارے ریت پر بنی ہوئی ایک ہموار بارہ دری پر ختم ہوتا ہے۔ اس جگہ سمندر کا ساحل ہموار، صاف اور وسیع ہے۔ اور برِ اعظم ہندوستان کے ساحلوں میں مدراس کے بعد دوسرے نمبر پر گنا جاتا ہے۔ یہ ساحل جنوب کی جانب کئی میل تک اسی طرح ہموار چلا گیا ہے۔ یہاں سمندر بہت دور تک پایاب ہے اور لہروں کے زور و شور کے باوجود یہاں نہانا ممکن ہے۔ یہ گنبد، چمن، پل، بارہ دری، ساحل اور سلسلۂ پہاڑ خوبصورت کیفے سبیر، تفریح اور اور پکنک کے لئے آئیڈیل جگہیں ہیں۔

سمندری ساحلوں میں دوسری مقبول عام سیرگاہ منوڑا ہے۔ یہ کراچی بندرگاہ سے ذرا پرے، سطح سمندر سے سو فٹ بلند جزیرہ ہے اور اس کا رقبہ تقریباً تین سو ایکڑ ہے۔ یہاں کا ساحل بھی کلفٹن ہی کی طرح لطیف اور دلپذیر ہے۔ جزیرے کے جنوبی سرے پر اونچی اونچی سنگین چٹانیں ہیں جن میں سے سمندر کا پانی رستا رہتا ہے یہ دُھلی دھلائی چٹانیں، ان سے ملحق شفاف رتیلا ساحل اور ساحل سے ٹکراتی ہوئی سمندر کی خنک لہریں آن کی آن میں شہری زندگی کی گہما گہمی کو بھلا دیتی ہیں۔

منوڑا میں ڈیڑھ سو فٹ بلند ایک منارہ روشنی ہے جس میں سے گیارہ لاکھ بتیوں کی طاقت کا نور کا دھارا چھٹ کر اندھیری راتوں میں جہازوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ راتوں میں جب اس منارے کی

روشنی اور بھی اٹھتی ہوئی لہروں پر پڑتی ہے تو بڑا سہانا سماں پیدا ہوتا ہے۔

منوڑا سے شمال کی جانب تقریباً آٹھ میل لمبی ریتیلی پٹی چلی گئی ہے بعض جگہ اس کی چوڑائی پچاس گز سے زیادہ نہیں ہے۔ اس پٹی کا کچھ حصہ سینڈس پٹ کے نام سے موسوم ہے۔ یہ مقام عرصۂ دراز تک ویران تھا۔ لیکن دورانِ جنگ میں یہاں آئے ہوئے امریکن سپاہیوں نے اسے ایک سیرگاہ میں تبدیل کر دیا۔ یہاں دور تک لکڑی کی جھونپڑیاں بنی ہوئی ہیں۔ ہفتے کے اختتام پر جو لوگ یہاں سیر یا پکنک کے لئے آتے ہیں وہ انہیں جھونپڑیوں میں رات گزارتے ہیں۔

سینڈس پٹ کا حسن عام طور پر چاندنی میں چمکتا ہے جب وہاں کا ذرہ ذرہ

وہ اجلا سا میدان چمکتی سی ریت
اگا نور سے چاند تاروں کا کھیت

کی تفسیر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اندھیری راتوں میں بھی اس کا حسن کچھ کم دلآویز نہیں ہوتا۔ شاید اس زمین میں فاسفورس کی افراط ہے۔ کیونکہ جب ہم نم زمین پر چلتے ہیں تو پیروں کی دھمک سے اردگرد کی زمین پر لاتعداد ذرے اندھیرے میں چمک اٹھتے ہیں۔

اس حسین خاکنائے کے ایک طرف پایاب اور ساکت سمندر ہے اور دوسری طرف مچلتا ہوا، ٹھاٹھیں مارتا ہوا پُرجوش بحیرۂ عرب۔ دونوں میں موت اور زندگی کی طرح واضح فرق نظر آتا ہے۔ بیک وقت شور اور سکوت کا یہ نظارہ چند لمحوں کے لئے آدمی کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے اور یہ سیرگاہ صرف شاعرانہ لطافت اور نزاکت خیال کو جلا دینے کے بجائے تخیل کے مفکرانہ پہلو کو بھی اجاگر کرتی ہے۔

کراچی سے شمال کی جانب تقریباً دس میل کے فاصلے پر منگھو پیر نامی ایک گاؤں ہے۔ یہ گاؤں پہاڑی چٹانوں میں سے پھوٹتے ہوئے متعدد سرد و گرم چشموں کے گرد آباد ہے۔ چونکہ یہاں منگھو نامی ایک پیر کا مقبرہ ہے اس لئے یہ مقام اسی نام سے مشہور ہے۔ ان گرم پانی کے چشموں میں بعض معدنی آمیزشیں ہیں جن کی وجہ سے ان کا پانی جلدی امراض کے لئے بہت مفید ہے۔ چنانچہ برِاعظم ہندوستان کے کونے کونے سے مریض علاج کے لئے یہاں آتے ہیں۔ ان چشموں پر نہانے کے لئے گھاٹ تعمیر کرائے گئے ہیں۔ اور اس جگہ کوڑھ کا ایک ہسپتال بھی قائم ہے۔ گرم چشموں کا درجۂ حرارت کم و بیش ۱۲۷ ڈگری ف رہتا ہے۔ ایک دفعہ تو یہ ۱۳۳ ڈگری ف تک پہنچ گیا تھا۔ پانی کا رنگ سبزی مائل ہے اور اس کی سطح پر گیس کے بلبلے اٹھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک حوض میں دو فٹ سے لے کر پندرہ فٹ تک لمبے مگرمچھ رہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مگرمچھ منگھو پیر کے پالتو مگرمچھ کی نسل سے ہیں۔ مگرمچھ کے حوض کے قریب ایک چشمہ ہے۔ جس کا پانی نیم گرم ہے۔ اس میں نہانا نسبتاً آسان ہے۔ مقبرے کے نیچے ایک چٹان سے شفاف سرد پانی کا ایک چشمہ ابلتا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں سرد پانی کے کئی اور چشمے ہیں۔

منگھو پیر کا علاقہ سطحِ سمندر سے ۵۸۲ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ یہاں آنے والوں میں زائرین، مریض، تیمار دار اور سیر و تفریح کے شائقین سبھی شامل ہیں۔ یہ سیرگاہ اگرچہ رومانوی نقطۂ نظر سے کلفٹن اور منوڑا وغیرہ سے قطعی مختلف ہے۔ پھر بھی یہاں آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔

ان چند مقامات کے علاوہ کراچی شہر کے اندر کئی ایسے باغ ہیں جہاں لوگ شام گزارنے اور فطرت کے شاداب حُسن سے لطف اندوز ہونے کے لئے جاتے ہیں۔ ان میں سب سے مشہور گاندھی گارڈن ہے جس کی تزئین و آرائش، روشوں کی ترتیب اور رنگ برنگے پھولوں کے تختے اس ریگستانی ماحول میں گلستان کا سماں پیدا کرتے ہیں۔ باغ میں ایک زندہ عجائب گھر بھی ہے۔ جس نے باغ کی دلچسپی میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔

دوسرا مشہور باغ فریئر باغ ہے جو اپنی وسعت، حُسنِ ترتیب اور شادابی کے لحاظ سے کراچی کے لئے ایک نعمت ہے۔ اس میں ملکہ وکٹوریہ اور جارج پنجم کے خوبصورت مرمریں مجسمے نصب ہیں۔ باغ کے وسط میں ایک عظیم الشان عمارت ہے جو فریئر ہال کے نام سے موسوم ہے۔ یہ قدیم گوتھک طرزِ تعمیر کا عمدہ نمونہ ہے۔ اس عمارت میں ایک بڑا دارالمطالعہ اور کتب خانہ ہے۔

اسی قسم کا ایک اور باغ برنس گارڈن ہے جس میں ہر شام کھیل کود اور کسرت کے لئے بچوں اور نوجوانوں کا ہجوم رہتا ہے۔

شہر کی سربفلک عمارتوں کے سنگین ماحول میں یہ چند حسین اور دلفریب باغ بڑی رونق اور دلچسپی کا سامان پیدا کرتے ہیں۔ شہر کی روزافزوں آبادی کے پیشِ نظر یہاں ایسے کئی اور باغوں کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین

اردو غزل اور حسنِ ادا

جس طرح حسن کو محسوس کیا جاتا ہے لیکن اس کی تعریف نہیں کی جا سکتی اسی طرح شعر کے حسنِ ادا کو بھی محسوس کرنا ممکن ہے۔ خیال میں محسوسات کی جو صورتیں جمع ہوتی ہیں ان کے اظہار پر جب تک پوری قدرت نہ ہو اس وقت تک طرزِ ادا میں جدت اور دلکشی نہیں آسکتی۔ حسنِ ادا کے لئے لفظی اور معنوی دونوں خوبیاں درکار ہیں۔ وہی معمولی باتیں ہیں جنھیں سب کہتے ہیں ایک کے کہنے کا اثر ہوتا ہے دوسرے کے کہنے سے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔

قطرۂ اشک کا مضمون پیش پا افتادہ ہے لیکن غالب نے اس مضمون میں ندرت اور نزاکت کی رنگا رنگی سمو دی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ قطرۂ اشک کی قدر و قیمت گہر سے زیادہ ہے۔ اس مضمون کو صاف طور پر بیان کرنے کے بجائے پہلے یہ دعویٰ پیش کیا کہ جتنی ہمت ہوگی اتنی ہی توفیق ہوگی۔ یہ قطرہ کی پست ہمتی ہے کہ وہ گہر بننے پر قناعت کر گیا۔ اگر اس کا حوصلہ بلند ہوتا تو اس کو انسانی آنکھ میں جگہ مل سکتی تھی جو اس کے رتبے کی معراج ہوتی۔ شعر میں دعوے سے زیادہ اہمیت ثبوت کو حاصل ہے جس میں رمزیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ کہتا ہے۔

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا

اس میں شک نہیں کہ غزل میں حسنِ ادا کے لئے جو قدر مشترک ہے وہ رمزی اثر آفرینی ہے۔ چاہے لفظوں سے کوئی بلند یا گہرے معنی نہ نکلتے ہوں یا خود لفظ خوشنما نہ ہوں لیکن اگر شاعر اپنے فکری اور جذباتی محسوسات کی صورتوں میں ذہنی تصرف پر قادر ہو گیا ہے تو ضرور ہے کہ وہ ایمائی اثر پیدا کر سکے گا۔ محسوسات کی مختلف صورتوں میں ذہنی تصرف اس واسطے ضروری ہے کہ وہ انھیں حقیقت سے مجاز کی طرف اور تصریح سے کنایہ کی طرف لے جانا چاہتا ہے کیونکہ بغیر اس کے شعری بلاغت پیدا نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس کے ساتھ اس کا اہتمام بھی ہونا چاہئے کہ رمزی اور مجازی معنی حقیقت سے بالکل منقطع تو نہیں ہو گئے۔ مجاز و رمز کی دنیا میں جس سے غزل عبارت ہے اس قسم کا تصرف جائز ہی نہیں فرض ہے تاکہ حسنِ ادا جلوہ گر ہو۔ غزل کے لفظوں کے ظاہری معنی کسی کا بھی مقصود بالذات نہیں ہو سکتے۔ اور نہیں ہونے چاہئیں۔ اگر ان سے رمزی اثر پیدا ہو جائے تو بس اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہئے۔

طرزِ ادا کی اعلیٰ کسوٹی پر اردو غزل نگاروں میں غالب کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔ وہ پست مضمون کو بھی ایمائی زور سے اوپر اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیتا ہے یہ ایمائی زور کہاں سے آیا؟ اس سوال کا جواب دینا بہت مشکل ہے۔ معنوی اور رمزی اثر بہرحال لفظوں ہی کا رہینِ منت ہوتا ہے۔ اپنی اپنی جگہ سب لفظ بلند اور پست احوال کی طرف ذہن کو منتقل کر سکتے ہیں۔ دراصل لفظوں کی ترتیب ان کی فطرت کو بدل دیتی ہے اور معمولی باتیں سحر بن سکتی ہیں۔

غم کا مضمون بیان کرنا مقصود ہے۔ موت اور کفن کی شعری علامتیں پیش کی گئی ہیں۔ اس فضا میں کیا ملا کی شوخی لفظوں کی مناسب ترتیب نے پیدا کر دی۔ غالب کا شعر ہے۔

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

مرزا یگانہ اس مضمون کو ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ان کا شعر غالب کے شعر کی گرد کو بھی نہیں پہونچتا۔ کہتے ہیں۔

جامہ زیبوں پہ کفن نے بھی دیا وہ جوبن
دوڑ کر سب نے کلیجے سے لگانا چاہا

سوال یہ ہے کہ مرزا یگانہ کے شعر میں کس چیز کی کمی ہے جس کی وجہ سے اس کی تاثیر پھیکی سی رہ گئی؟ سارا طلسم لفظوں کی صحیح اور حسین استعمال کا نتیجہ ہے۔ غالب نے کفن کی مناسبت سے شہیدوں اور حور کے جو الفاظ استعمال کئے ان کے اندر رمز و ایما کا خزانہ چھپا ہوا ہے۔ برخلاف اس کے مرزا یگانہ نے اپنے شعر کو غلط لفظ سے شروع کیا اور آخر تک غلطی میں مبتلا رہے۔ جامہ زیب اور جوبن کے لفظ اس رمزی فضا میں جو وہ پیدا کرنا چاہتے ہیں کھٹکتے ہی نہیں بلکہ ذوقِ سلیم پر گراں گزرتے ہیں۔ کفن کے مضمون کے ساتھ اس قسم کے لفظوں کا تکلف یا چونچلاپن اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ چونکہ لفظ مقتضائے حال کے مطابق نہیں اس لئے ان کا شعر بلاغت اور تاثیر

دربار میں بار نہ پاسکا۔ میر صاحب فرماتے ہیں۔

ہم نے جانا تھا کہے گا تو کوئی حرف اے میر
پر ترا نامہ تو اک شوق کا دفتر نکلا

تھوڑی سی تبدیلی کے بعد مصحفی نے اس مضمون کو اس طرح ادا کیا۔

مصحفی ہم تو سمجھتے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بڑا کام رفو کا نکلا

مصحفی کے دوسرے مصرع میں رفو کا لفظ ایمائی اثر پیدا کرنے کی بجائے نفس واقعہ کے بیان کی طرف ذہن کو منتقل کرتا ہے جس کے باعث شعر کا اثر اور کمزور ہوگیا۔ برخلاف اس کے میر کے شعر میں جدت ادا بلاغت اور سادگی کی دل نشینی معمولی ذوق رکھنے والے کو بھی محسوس ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ رفو کا مضمون غالب نے بھی باندھا ہے اور اپنے انوکھے انداز میں باندھا ہے۔ وہ محبوب کو خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ زخم کو جو میں رفو کروا رہا ہوں تو اس کا مطلب چارہ جوئی یا پاس درد سے غفلت نہیں بلکہ زخم سوزن سے لذت گیر ہونا۔ مرزا کے یہاں ایمائی اثر آفرینی نے مضمون کی خارجیت کو اپنے دامن میں چھپالیا اور وہ عیب جو مصحفی کے شعر میں نظر آتا ہے مرزا کے شعر میں نہیں

رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخم سوزن کی
سمجھیو مت کہ پاس درد سے دیوانہ غافل ہے

دوسری جگہ اس مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے۔

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں

خواجہ میر درد کا شعر ہے۔

کرتی ہے بوئے گل تو مرے ساتھ اختلاط
پر آہ میں تو موج نسیم وزیدہ ہوں

بہت مشہور شعر ہے اس مضمون کو ذرا بدل کر رند نے یوں ادا کیا ہے۔

میں مسافر ہوں اتر جاؤں گا پار اک دم میں
تجھ کو اے موج مبارک رہے دریا تیرا

بلاشبہ رند کے شعر کا ایمائی اور رمزی اثر جو لطافت جذبات کی ترجمانی کرتا ہے خواجہ میر درد کے شعر سے کہیں بڑھ گیا۔ لفظوں کی ترتیب نے مضمون کی رفتاری میں اور اضافہ کر دیا۔ سیدھے سادے لفظ ہیں لیکن ان کا مجموعی اثر پر اسرار طور پر ذہن میں عجیب و غریب یادیں برانگیختہ کرتا ہے۔

اردو غزل میں غالب جدت ادا کا بادشاہ ہے۔ میر اور مومن بھی لفظوں پر قدرت رکھتے ہیں لیکن غالب انھیں جس شاہانہ انداز میں برتتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ جن لفظوں کو برت رہا ہے وہ اسی کے لئے بنے ہیں۔

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما

باوجود میر صاحب کی استادی کو ماننے کے غالب کو خود بھی اپنی خوش ادائی کا احساس ہے اور وہ جانتا ہے کہ جو حسن ادا اس کے کلام میں ہے وہ اردو کے کسی اور شاعر کے یہاں موجود نہیں۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

مرزا کی غزل میں رمزی اور ایمائی انداز بیان اپنے کمال پر پہونچا۔ ذوق کی رسمی معاملہ نگاری کے سمجھنے والوں کے لئے یقیناً غالب کا کلام سمجھنا دشوار ہوا ہوگا جس نے اپنی ابتدائی شاعری میں بیدل کا تتبع کیا تھا۔ چنانچہ انھیں لوگوں کی خیالی پستی کو دیکھتے ہوئے اس کو کہنا پڑا۔

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل ؛ سن سن کے اسے سخنوران کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش ؛ گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل

سطحی علم و نظر رکھنے والے نکتہ چینوں کے جواب میں اس کو کہنا پڑا۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا ؛ گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے ؛ خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

بیدل کے تتبع کا زمانہ بہت جلد ختم ہوگیا اور مرزا نے اپنی جدت خیال کے لئے اپنا علیحدہ طرز ایجاد کیا جو اس کے لئے مخصوص رہا اور آج تک کوئی اس کی پیروی نہ کرسکا۔ اس طرز نے مرزا کو اردو زبان کا عدیم المثال اور کامل شاعر بنا دیا۔ کچھ عرصہ بعد اس طرز میں غریب اور ثقیل الفاظ اور پیچیدہ ترکیبوں سے احتراز کیا گیا لیکن مضمون کا رمزی اشکال باقی رہا۔ یہ اشکال مضمون کے اچھوتے پن اور ایمائی اسلوب بیان کا لازمی نتیجہ تھا۔ اس کے علاوہ اس کی ایک [illegible] بھی کہ مرزا صرف شاعر ہی نہ تھے بلکہ حکیم نکتہ داں بھی تھے۔ انھوں نے تغزل میں حکمت و فلسفہ کو بڑی خوبی سے سمویا اور اسرار زندگی کی تصویروں میں اضافہ کیا۔ مرزا کی ان غزلوں کو بھی جن میں کوئی مشکل نہیں ہر ایک نہیں سمجھ سکتا۔ انھیں سمجھنے کے لئے ایک خاص علوئے ذوق اور علمی بصیرت درکار ہے جس کی کاوش و کاہش کے بغیر رمز و معانی پہ قا

نہیں ہو سکتے۔ مرزا کا تغزل رمز نگاری کا آخری نقطہ ہے۔ یہاں صرف انہیں کی رسائی ہو سکتی ہے جو اس کے سمجھنے کی خاص وجدانی اہلیت رکھتے ہیں۔ اس کے سہل ممتنع کی ایمائی نغمہ سرائیوں میں بھی رموز و معانی کی گہرائی و گیرائی پائی جاتی ہے کیوں کہ تخیل کی پرواز کا انداز بھی نرالا اور اچھوتا تھا۔ اس کی نوا ہائے راز کو محرمانِ راز ہی سمجھ سکتے ہیں۔ یعنی رمز نگاری کی جانب کیا خوب اشارہ کیا ہے۔

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا ÷ یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

غالب نے عامیانہ خیالات اور مبتذل محاوروں سے ہمیشہ احتراز کیا۔ اگرچہ اس نے رعایت لفظی سے اپنے کلام کے حسن کو دوبالا کیا ہے لیکن اس باب میں بھی اس کی راہ دوسروں سے الگ رہی۔ ایک لطیفہ مشہور ہے کہ کسی نے مرزا کے شعر کی بہت تعریف کی اور اسد شاگرد سودا کا یہ شعر پڑھا

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی ÷ مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

اسد کے تخلص کی وجہ سے دھوکہ ہوا کہ یہ شعر شاید مرزا کا ہوگا۔ مرزا شعر کو سن کر برافروختہ ہوئے اور کہنے لگے "اگر یہ کسی اور اسد کا شعر ہے تو اس کو رحمت [illegible] اور اگر مجھ اسد کا شعر ہے تو مجھے لعنت خدا کی۔"

لیکن مرزا غالب نے حسن ادا کو چمکانے کے لئے جہاں مراعات لفظی برتی ہیں وہاں شعر کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا ÷ دل جگر تشنۂ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز ÷ کیوں ترا وقت سفر یاد آیا
سادگی ہائے تمنا یعنی ÷ پھر وہ نیرنگ نظر یاد آیا
زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی ÷ کیوں ترا راہگذر یاد آیا
کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی ÷ گھر ترا خلد میں گر یاد آیا
پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال ÷ دل گم گشتہ مگر یاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے ÷ دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد ÷ سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

اس غزل کے ہر شعر میں لفظی اور معنوی رعایت موجود ہے لیکن تصنع نام کو نہیں۔ ہر لفظ اپنا مقام رکھتا ہے اور کس خوبی کے ساتھ رمز و کنایہ سے ہم آہنگ ہے پوری غزل ایمائی تاثیر میں رچی ہوئی ہے۔ روانی کا یہ عالم ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لفظ معانی کے لئے اور معانی لفظوں کے لئے بنے ہیں یہ تغزل کا کمال ہے۔

مندرجہ ذیل غزل میں کوئی لفظ مشکل نہیں لیکن ان کے اچھوتے طرز ادا نے معمولی لفظوں کو بے پناہ تاثیر قوت اور وسعت عطا کر دی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس غزل کا اشکال لفظی نہیں رمزی ہے۔

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز ÷ میں ہوں اپنی شکست کی آواز
تو اور آرائش خم کاکل ÷ میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز
لاف تمکیں فریب سادہ دلی ÷ ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز
ہوں گرفتار الفت صیاد ÷ ورنہ باقی ہے طاقت پرواز
وہ بھی دن ہو کہ اس ستمگر سے ÷ ناز کھینچوں بجائے حسرت ناز

مرزا کے نغموں میں حقیقت جاں کا انکشاف مختلف پیرایوں میں ہوا ہے۔ اس کے کلام میں کہیں حسن و عشق کی واقعہ نگاری اور اس کے سارے لوازمات ہیں، کہیں رندانہ جسارتوں کی بلند آہنگیاں اور شوخیاں ہیں اور کہیں رموزِ حیات کی حکیمانہ تعبیر و توجیہہ۔ مرزا کے ہاں داخلیت اور خارجیت دونوں ایک دوسرے میں سموئی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس نے اس باب میں انتہا پسندی سے پرہیز کیا۔ نہ ایسی دروں بینی ہے کہ غیر خود کا وجود ہی نہ رہے اور نہ ایسی خارجیت ہے کہ جس کی وجہ سے اپنی ذات کے اندرونی تجربوں اور تاثرات کی دنیا بے رنگ ہو جائے۔ خارجیت جب غزل میں برتی جاتی ہے تو محبوب کے خد و خال، چال ڈھال، زلف رخسار اور قد و قامت کے بیان میں شاعر اتنا منہمک ہو جاتا ہے کہ داخلی زندگی کے احوال پیش کرنے کی نوبت نہیں آتی۔ مرزا غالب کی خارجیت مصحفی، جرأت ناسخ اور لکھنؤ کے دوسرے شاعروں سے بالکل مختلف ہے۔ رمزی اشارتی کی وجہ سے اس میں اندرونی تجربہ کی جھلک ہمیشہ برقرار رہتی ہے۔ اسی طرح مرزا کی دروں بینی میں اگرچہ بعض جگہ ماورائیت پائی جاتی ہے لیکن بالعموم وہ اپنے جمالی رنگ کے باعث اس دنیا کی چیز معلوم ہوتی ہے۔ چاہے مضمون کچھ بھی ہو مرزا کے لب و لہجہ کی متانت اور سنجیدگی، لفظوں اور بندشوں کی موزونیت اور رمزی اثر آفرینیاں دلوں کو تسخیر کئے بغیر نہیں رہتیں۔ بعض دفعہ انسان حیرت میں پڑ جاتا ہے کہ سیدھے سادے لفظوں میں یہ تاثیر کہاں سے آگئی۔ مرزا غالب کے ہاں جذبہ، وجدان اور تخیل کا ایسا لطیف امتزاج ملتا ہے کہ اردو کے کسی اور شاعر کے ہاں اس کی نظیر نہیں۔ غزلوں میں سب ہی بحریں برتی گئی ہیں لیکن کہیں بھی موسیقیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا کہ شعر کا جادو اس سے جگایا جاتا ہے۔

حسن و عشق کی داستان سرائی میں غالب نے تصنع سے احتراز کیا۔ معاملہ بندی یا [illegible] ویسے بھی اس کے کلام میں کم ملتے ہیں۔ لیکن واقعہ نگاری میں ان سے اوپر اٹھنے کی کوشش کی ہے۔ اگر کہیں کوئی صنعت یا رعایت آگئی ہے تو وہ بالکل فطری معلوم ہوتی ہے اور وہ کہیں بھی انگشت نمائی نہیں کر سکتے۔ واقعہ گزاری کے ضمن میں دوسرے شاعروں کی سی معاملہ بندی کی توقع ان سے

ذکر فی چاہیئے۔ اس باب میں بھی اس کا ذوق کمال اور انکے نمایاں ہیں تحسین حسن اور کیفیات محبت کو بڑی دقیقہ سنجی کے ساتھ بیان کیا ہے عشق و حسن کے سارے نازک پہلوؤں پر مرزا کی نگاہ پڑی۔ چنانچہ کہیں عجز و نیاز کا اظہار ہے اور کہیں دامن محبوب کو حریفانہ کھینچنے کی دعوت۔

عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر　　دامن کو آج اسکے حریفانہ کھینچئے

ایک اور جگہ محبوب کے دامن کو کھینچنے کا ذکر کرتے ہوئے اپنے گریبان کی طرف بھی بلیغ اشارہ کر جاتے ہیں۔ خود بالکل معصوم بن کر اپنے ہاتھوں کو برا بھلا کہتے ہیں کہ انہیں کسی طرح چین نہیں۔ ان کی کھینچا تانی کی عادت نہیں جاتی۔ کبھی میرے گریبان کو چاک کرنے کے درپے ہیں اور کبھی جاناں کے دامن کو کھینچتے ہیں۔ اس شعر میں روح تغزل اپنی ساری خوبیوں کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے کہتے ہیں۔

خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو

جذبۂ رشک کی عجیب و غریب توجیہہ کرتے ہیں۔ یہ رشک دوسروں سے زیادہ خود اپنی ذات سے ہے۔

ہم رشک کو بھی اپنے گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں ولے اُن کی تمنا نہیں کرتے

دوسری جگہ اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے۔

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

باوجود محبت کی مایوسیوں کے مرزا پر امید رہتے ہیں۔ ان کے کلام میں محبت اور امید دونوں کے تانے بانے موجود ہیں۔ کہتے ہیں۔

اس لب سے مل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو ہاں
شوقِ فضول جرأت رندانہ چاہیئے

معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک شوق فضول اور جرأت رندانہ آہ و بکا کے مقابلہ میں حصول مدعا کے لئے زیادہ ممد و معاون ہیں۔

وفائے دلبراں ہے اتفاقی ورنہ اے ہمدم
اثر فریاد دلہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

دوسری جگہ اسی مطلب کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے۔

کس نے دیکھا نفس اہل وفا آتش خیز
کس نے پایا اثر نالۂ دلہائے حزیں

چاہے وفا اتفاقی ہو یا نہ ہو لیکن ایک لگاؤ ہمیشہ باقی رہنا چاہیے محبت نہیں تو عداوت ہی سہی بغیر لگاؤ کے زندگی دوبھر ہو جائے گی

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

پھر کیا سادگی اور پرکاری سے اس مطلب کو ادا کرتے ہیں۔

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے ؛ کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے ؛ بے نیازی تری عادت ہی سہی
یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ ؛ گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

کہیں آرزو اس لئے کی جاتی ہے کہ ناکامی کی حسرت سے دل لذت اندوز ہو۔

طبع ہے مشتاقِ لذت ہائے حسرت کیا کروں
آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

اس بات کو دوسرے پیرایہ میں یوں کہتے ہیں۔

ہوں میں بھی تماشائی نیرنگ تمنا
مطلب نہیں اس سے کہ مطلب ہی بر آوے

معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اپنی تمنا کا سفر کسی منزل پر ختم نہیں کرتا جب ایک منزل پر پہنچ جاتا ہے تو آگے کی منزل کی روشنی اسے دور سے نظر آنے لگتی ہے اور وہ اپنا قدم اسی طرف آگے بڑھانا شروع کر دیتا ہے۔ اس بلند اور حکیمانہ مضمون کو اس خوش اسلوبی اور سادگی سے ادا کیا ہے کہ حکمت و نغمہ ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

جس منزل پر پہنچ گئے وہ نقش پائے رہرو کے مماثل ہو گئی جب نقش پا کی طرح اس میں جمود ہے تو دل اس پر کیسے ریجھے۔ دل تو دائمی حرکت چاہتا ہے۔ کس خوبی سے سوال کرتے ہیں کہ دشت امکاں جب نقش پا کے مثل ہے تو اب تمنا دیکھو اپنا دوسرا قدم کدھر بڑھاتی ہے۔ تمنا کے لئے دشت امکان کے علاوہ اور دوسرے بہت سے جہان ہیں جن کی تسخیر اس کا مقصود و منتہا ہے اور جہاں اسباب و علل کی دنیا کی طرح مجبوریاں نہیں۔

غالبؔ کے کلام کا بیشتر حصہ مجاز کا رنگ لئے ہوئے ہے لیکن اس مجاز سے حقیقت کا دامن ٹکا ہوا ہے۔ یہ بھی رمز نگاری کا کمال ہے کہ سامع حقیقت اور مجاز کے دونوں پہلو اپنے ذہن کے مطابق کلام میں سے ڈھونڈھ نکالے اور اس سے لطف اندوز ہو۔ کبھی خاص حالات میں ایک پہلو مزہ دیتا ہے اور

دوسرے حالات میں اس شعر کا دوسرا پہلو لذت بہم پہنچاتا ہے۔ سعدی ۔ حافظ اور دوسرے غزل کے اساتذہ کے کلام میں بھی آپ یہ صفت پائیں گے جس کے باعث ان کے کلام کی ہمہ گیری آج تک مسلّم چلی آتی ہے۔ غالب کے یہاں بھی عشق مجازی کی شورش و مستی اور عشق حقیقی کا جذب و عرفان بدرجۂ اتم ملتا ہے دونوں صورتوں میں تخیل اور اصلیت ایک دوسرے سے وابستہ و پیوستہ رہتے ہیں۔ اس کی دنیائے خیال میں تنوع ہے اس لئے کہ اس کا اندرونی تجربہ نہایت وسیع ہے حقیقت کے اس پہلو کو جو نامعلوم اور غیر مرئی ہے اور جس کا احساس صرف وجدان کرسکتا ہے غالب نے استعارے کی زبان میں بیان کیا ہے۔ چنانچہ اس طرف یوں اشارہ کرتے ہیں۔

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو　　بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

غالب کی اس ہمہ گیری میں اس کی عظمت مضمر ہے لیکن بعض جگہ نہایت فحش طور پر مجازہی سے گفتگو کی ہے۔ اور اس میں کھینچ تان کر کے حقیقت کے پہلو نکالنا ذوق سلیم کے لئے گراں ہے۔ مثلاً یہ شعر سوائے مجاز کے اور کوئی پہلو اپنے اندر نہیں رکھتے لیکن ان میں آپ کہیں عریانی یا ابتذال کا نشان تک نہیں پائیں گے۔

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے

صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو　　یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

کیونکر اس بت سے رکھوں جان عزیز　　کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

گر یہ ہے طرز تغافل پردہ دار راز عشق

پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پاجائے ہے

اسی مضمون کا مومن خاں کا شعر بہت خوب ہے۔

کل تم جو بزم غیر میں آنکھیں چرا گئے

کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

رشک اور عقل کا تقابل اور شاعر کے کان میں لوگوں کی سرگوشیاں کس بلیغ انداز میں بیان کی ہیں۔

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف

عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

یعنی رشک کا یہ شبہ کہ وہ اغیار کے ساتھ اخلاص برت رہا ہے بے بنیاد ہے اس واسطے کہ عقل اس شبہ کے پیدا ہونے کے ساتھ ہی چپکے سے کہہ دیتی ہے کہ بھلا وہ آج تک کس کا دوست بنا ہے کہ اب کسی کا بنے گا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر عقل کی رائے کو رشک کے شبہ پر ترجیح دیتا ہے اور اس طرح اپنے لئے وجہ اطمینان پیدا کرلیتا ہے۔ دل کی یہ پوری داستان کس بلاغت سے دو مصرعوں میں آگئی۔ شاعر الجھن کے وقت بعض دفعہ مفتی عقل سے فتویٰ لینے میں اپنی کسر شان نہیں سمجھتا۔ غالب کی طرح حافظ نے بھی ایک مشابہ عقل کا فتویٰ حاصل کرنا چاہا تھا لیکن عقل بے چاری اس کی عقدہ کشائی نہ کرسکی۔

بس بگشتم کہ بپرسم سبب درد فراق

مفتی عقل دریں مسئلہ لا یعقل بود

غالب کے خالص مجازی رنگ کے چند اور اشعار ملاحظہ ہوں جن کی خوش ادائی پر بلاغت تصدق ہے۔

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیان اپنا

بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

مے وہ کیوں بہت پیتے بزم غیر میں یارب

آج ہی ہوا منظور ان کو امتحان اپنا

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا　　لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

ہجر و انتظار کی کیفیات غزل گو شاعروں کا ایک عام اور بیشتر پا افتادہ مضمون ہے جسے غالب نے اپنے ندرت بیان اور علوئے تخیل سے بالکل دوسرے ہی پیرائے میں پیش کیا ہے۔

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر　　آنے کا وعدہ کر گئے آئے جو خواب میں

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں

میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

انتظار اور تمنا کو کس خوبی سے آغوش در آغوش کیا ہے

پھونکا ہے کس نے گوش محبت میں اے خدا

افسون انتظار تمنا کہیں جسے

محبت یکسر انتظار و تمنا ہے۔ آرزو جب تک پوری نہ ہو اس وقت تک انتظار کی زحمت گوارا کرنا محبت کے آداب میں داخل ہے۔ محبت کی فطرت میں صبر و انتظار کے عناصر موجود ہوتے ہیں تاکہ وہ اپنی تکمیل کرسکے دوسری جگہ انتظار کے مضمون کو اس طرح باندھا ہے۔

تغافل پیشگی سے مدعا دلداری کی مجھے

وہ آسکے یا نہ آسکے پہ یاں انتظار ہے

محبوب کو کس خوبی سے سمجھاتے ہیں کہ میرا نالہ شکوہ بیداد نہیں بلکہ تقاضائے ستم ہے۔ تو غلط مت سمجھ۔ یہ شعر رمز نگاری اور واقعہ گذاری دونوں کا اعجاز ہے۔ کہتے ہیں۔

نالہ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں

ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

اسی مضمون کو دوسرے طور پر یوں بیان کیا ہے۔

گو سمجھتا نہیں پہ حسن تلافی دیکھو ۔ شکوۂ جور سے سرگرم جفا ہوتا ہے

—— ❖ ——

شکوے شکایت کے مضمون کو مختلف انداز سے اسطرح بیان کرتے ہیں۔

پر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا

اک ذرا چھیڑئیے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

اسی خیال کو دوسری جگہ یوں باندھا ہے۔

ہوں سراپا ساز آہنگ شکایت کچھ نہ پوچھ

ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

—— ❖ ——

تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو

حذر کرو مرے دل سے کہ اسمیں آگ دبی ہے

محبوب جب خصوصیت کے ساتھ پردہ کرتا ہے تو اس کو یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ ایسا کرنا چھوڑ دو ورنہ خواہ مخواہ لوگوں کو اس طرف متوجہ ہونے کا موقع ملے گا۔

دوستی کا پردہ ہے بے گانگی ❖ منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہئے

جب وہ پردہ نہیں کرتا اور سامنے آتا ہے تو نظارہ کی تاب نہیں۔ کبھی خود نظارہ کرنے والی نگاہیں رخ جاناں پر بکھر کر پردہ بن جاتی ہیں۔ کبھی بہار کی رنگا رنگی حجاب کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور کبھی خود نگاہ برق نظارہ سوز ہو جاتی ہے۔ بلاغت اور حسن ادا ان اشعار میں اپنے انتہائی کمال کی بلندیوں تک نظر آتے ہیں۔ کہتے ہیں۔

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا

مستی سے ہر نگہ ترے رخ پہ بکھر گئی

—— ❖ ——

نظارہ کیا حریف ہو اس برق حسن کا ❖ جوش بہار جلوہ کو جس کے نقاب ہے

—— ❖ ——

ناکامیٔ نگاہ ہے برق نظارہ سوز ❖ تو وہ نہیں کہ تجھکو تماشا کرے کوئی

عرض کہ عجیب شاعرانہ کشمکش ہے۔ اگر محبوب پردہ کرتا ہے تو وہ ناگوار ہے اگر وہ پردہ نہیں کرتا تو تاب نظارہ نہیں۔ تغافل کا گلہ کرنے گئے اور اس نے ذرا توجہ کی تو ایک ہی نگاہ میں فنا ہو گئے۔

کرنے گئے تھے ان سے تغافل کا ہم گلہ

کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

کبھی عشق کی نگاہ گرم نقاب حسن کے سب بند ایک ایک کر کے کھول دیتی ہے۔ سب پردے اٹھنے پر دل کو یہ شکایت باقی رہتی ہے کہ نگاہ کا پردہ اب بھی باقی رہ گیا۔

وا کر دئے ہیں عشق نے بند نقاب حسن

غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

کبھی نظارہ کی تاب لے آتے ہیں لیکن ادائے مطلب کے لئے زبان بند ہو جاتی ہے۔

پیار کے آگے بول سکتے ہی نہیں ❖ غالبؔ منہ بند ہو گیا ہے گویا

شوق وصل اور شکوہ ہجراں کا مفصل ذکر کرنے کی خواہش دل ہی دل میں رہتی ہے۔

مرے دل میں ہے غالبؔ شوق وصل و شکوۂ ہجراں

خدا وہ دن کرے اس سے کہ میں یہ بھی کہوں وہ بھی

غالبؔ کے طرز ادا میں بلا کی شوخ نگاری ملتی ہے جس کی نظیر اردو کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں۔ یہ شوخی عشقیہ مضامین تک محدود نہیں بلکہ دوسرے مسائل کو بھی بڑی خوبی سے پیش کرتی اور ان کے متعلق ہماری بصیرتوں میں اضافہ کرتی ہے۔ شوخی اور البیلاپن داغ کے یہاں بھی ہے لیکن اس میں بعض جگہ ابتذال اور سوقیانہ پن آگیا ہے۔ غالبؔ کی شوخی کا معیار بہت بلند ہے۔ اور اس کے طرز ادا نے اس بلندی میں خاص دلکشی پیدا کر دی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی

سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

❖

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد ❖ پر طبیعت ادھر نہیں آتی

زندگی اپنی جب اس طرح سے گزرے غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

چھوڑی اسد نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے تو عاشق اہل کرم ہوئے

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

وہ چیز جس کے لئے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام مشکبو کیا ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پُر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں
ایسی جنت کا کیا کرے کوئی

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

رندانہ مضامین میں شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ لیکن اس کے ساتھ متانت اور سنجیدگی کو بھی قائم رکھا ہے۔ اس طرح شعر کی نزاکت اور باریکی اور زیادہ اجاگر ہو جاتی ہے۔

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

کیوں ردّ قدح کرے ہے زاہد ٭ مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے
غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے ٭ یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام بہت ہے
کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ ٭ ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

یعنی ویسے تو میرے لئے تلچھٹ ہی کافی ہے لیکن یہ بات ساقی پر ظاہر کرتے ہوئے شرم آتی ہے کہ کہیں وہ یہ نہ سمجھے کہ کیسا کم حوصلہ آدمی ہے۔

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

(۱) شعر کا اطلاق حقیقت اور مجاز دونوں پر ہو سکتا ہے۔

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

یعنی ترا ملنا اگر دشوار ہوتا تو ہم مایوس ہو جاتے اور تیری جستجو ترک کر دیتے، لیکن بڑی دقت یہ ہے کہ نہ دشوار ہے اور نہ سہل۔ یہ احساس کہ تیرا ملنا دشوار نہیں ہے شوق کو مردہ نہیں ہونے دیتا اور یہ احساس کہ آسان نہیں ہے سعئ آرزو کے لئے مہمیز کا حکم رکھتا ہے۔

غالب نے اپنے حکیمانہ انداز کے اشعار میں بھی طرز ادا کی قدرت سے تغزل کی خوبیوں کو قائم رکھا ورنہ یہی مضمون بالکل روکھے پھیکے ہو جاتے۔ اس کے کلام میں واعظانہ مقدمات نہیں ملتے۔ ہاں حکمت و اخلاق کے مسائل کو رمز و ایما کی زبان میں ادا کیا ہے۔ چنانچہ بعض جگہ اس کی شاعری خالص تصورات کی شاعری بن گئی ہے جس کو لطافت اور دل نشینی کی رنگ آمیزی نے چار چاند لگا دئے ہیں۔

قبلہ مقصود بالذات نہیں بلکہ محض قبلہ نما ہے۔ مقصود و منتہا کی طرف اس سے رہبری ہوتی ہے اور بس۔

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاری وہم
کر دیا کافر ان اصنام خیالی نے مجھے

ہاں اہل طلب کون سنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

حکیمانہ رموز و مسائل کا کس خوبی سے انکشاف کیا ہے۔

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے
طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے

تنگیٔ دل کا گلہ کیا یہ وہ کافر دل ہے
کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنک ظرفیِ منصور نہیں

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

مرزا غالب کے کلام کی اصلی خوبی ان کے طرزِ ادا کی جدت اور انوکھا پن ہے۔ انہیں معمولی بات بھی کہنا ہے تو اپنے خاص رنگ میں کہتے ہیں جو جذبہ کی تاثیر اور خیال کی دلکشی میں رچا ہوا ہوتا ہے۔ الفاظ کی بندش میں اور تشبیہوں اور استعاروں کے استعمال میں ڈگر سے ہٹ کر اپنی علیحدہ راہ اختیار کی ہے اور ضرورت کے وقت لفظی اور معنوی تصرفات سے بھی کام لیا ہے۔ وہ اپنے اسلوب بیان کے خود موجد ہیں۔ ان کے مضامین اور تشبیہوں کا اچھوتا پن انکی شاعرانہ بصیرت پر دال ہے۔ بعض جگہ قدما کے مضمون میں تعجب انگیز نزاکتیں پیدا کر دی ہیں۔ سعدی کا شعر ہے۔

با وفا خود نبود در عالم
یا مگر کس دریں زمانہ نکرد

اسی مضمون کو مرزا نے اپنے حسن ادا سے اور بلند کر دیا

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

خسرو کا شعر ہے۔

جاناں اگر شنیت دہن ندہد ہمن ہم
خود را بجواب ساز و مگو کیں دہان کیست

غالب اسی مضمون کو اس طرح ادا کرتے ہیں۔

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

خسرو کا دوسرا شعر ہے۔

زہے عمر دراز عاشقاں گر، شب ہجراں حساب عمر گیرند

غالب کہتے ہیں۔

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

خسرو کا ایک اور شعر ہے۔

اے گل چو آمدی ز زمیں گو چگونہ اند
آں رونیہا کہ در تہِ گرد فنا شدند

غالب نے اس مضمون کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

حافظ کا شعر ہے۔

آفریں بر دل نرم تو کہ از بہر ثواب
کشتۂ غمزۂ خود را بہ نماز آمدہ

تھوڑے سے تصرف سے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے۔

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

غالب کا شعر حافظ کے شعر سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔ زود پشیماں کی ترکیب میں ایک جہانِ معنی پوشیدہ کر دیا ہے اور پھر اس لفظ میں طنز کس غضب کا ہے کہ جسے بیان نہیں کیا جا سکتا ہے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔

حافظ کا شعر ہے۔

من کہ ملول گشتمے از نفس فرشتگاں
قال و مقال عالمے میکشم از برائے تو

غالب کا شعر حسن ادا اور تاثیر میں حافظ کے شعر سے بھی بڑھ گیا کہتے ہیں۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

عرفی کا شعر ہے۔

نالہ می کنم از درد تو کاہے لیکن
تا بلب می رسد از ضعف نفس می گردد

غالب نے اسی مضمون میں کیا خوب نزاکت پیدا کر دی۔

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے
جو واں نہ کھنچ سکے سو وہ یاں آ کے دم ہوئے

———— ❖ ————

فیضی کا شعر ہے۔

نوشِ دارد ئے محبت را مپرس اجزا کہ چیست
سودۂ الماس در زہر ہلاہل می کنند

غالب نے اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے۔

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا
کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے

میر تقی میر کا شعر ہے۔

عشق کی سوزش نے دل میں کچھ نہ چھوڑا کیا کہیں
لگ اٹھی یہ آگ ناگاہی کہ گھر سب پھک گیا

میر صاحب کے شعر میں ذوقِ شعری کوئی کسر نہیں نکال سکتا۔ لیکن مرزا غالب اپنے اعجازِ بیان اور حسنِ ادا سے شعر کو اور زیادہ بلند کر دیتے ہیں وہ اسی مضمون کو یوں ادا کرتے ہیں۔

دل میں شوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

میر صاحب نے سیدھے سادے لفظوں میں ابتدائے محبت کا کیا خوب نقشہ کھینچا ہے۔

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

غالب نے اسی مضمون کو اپنی رمز نگاری کی بدولت اور زیادہ بلند کر دیا۔ ان دونوں شعروں میں میر اور مرزا کا اسلوب بیان اپنے اصلی اور نکھرے ہوئے رنگ میں نظر آتا ہے۔

رگ و پے میں جب اترے زہرِ غم تب دیکھئے کیا ہو
ابھی تو تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش ہے

تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش کے بعد زہرِ غم رگ و پے میں اترتا ہے۔ اگر کوئی تلخیٔ کام و دہن ہی سے گھبرا اٹھے تو وہ منزلِ عشق کے اس مسافر کے مثل ہے جو سفر کے شروع ہی میں تھک کر بیٹھ جائے اور اپنا حوصلہ پست کر لے۔ انوکھے طرزِ ادا کی ایسی مثالیں سوائے غالب کے اور کسی کے یہاں نہیں ملتیں۔ کہتے ہیں۔

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

[Note: the last couplet above is my reading; see printed text below]

نہ لاتا تجھ سے نادان کیا ہوا گر اس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

جس ہجوم ناامیدی خاک میں مل جائے گی
وہ جو اک لذت ہماری سعی لاحاصل میں ہے

میر صاحب ہوں یا غالب، مومن ہوں یا ذوق، حسرت ہوں یا جگر، ان سبھوں میں تغزل کے بعض مشترک اجزا ملتے ہیں۔ وہ سب اپنے دل کے اندرونی تجربوں کو بیان کرتے ہیں۔ تجربے کے لئے ضروری نہیں کہ وہ طویل ہو۔ ایک لمحہ کا تجربہ اس سے زیادہ قیمتی ہو سکتا ہے جو کچھ زیادہ عرصہ تک محسوس کیا گیا ہو اور غلبی جذب کا نتیجہ ہو۔ غزل کا ایک شعر ایک خاص تجربہ کا اظہار ہے۔ تغزل کے لئے زیادہ تو وہ تجربے قدر و قیمت رکھتے ہیں جو حسن و عشق کی دنیا میں پیش آئیں کہ اس کے لئے یہی ابدی حقائق ہیں۔ اندرونی تجربے کو تفصیل اور وضاحت سے بیان نہیں کیا جا سکتا اور نہیں کرنا چاہئے۔ چونکہ اثر آفرینی میں ابہام مقصود ہوتا ہے اس لئے تغزل میں رمز و ایما کا اسلوب بنتا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ مبہم کیفیت اندرونی تجربے پر مبنی ہوتی ہے اس واسطے اس کا اخلاص غیر مشتبہ ہے۔ بعض غزل گو شاعروں کے ہاں دوسروں کے مقابلے میں خارجیت کا عنصر زیادہ ملتا ہے جیسے مصحفی اور جرأت وغیرہ۔ ان دونوں کا تغزل اعلیٰ پایہ کا ہے۔ لیکن ان کو وہ رتبہ کبھی نہیں ملا جو میر یا غالب کو نصیب ہوا۔ خارجیت لازمی طور پر بیان کی صفائی اور منطقی تسلسل کی محتاج ہے جو تغزل کے لئے سازگار نہیں جس کا خمیر رمز و ابہام سے بنا ہو۔

غزل گو شاعر کے دل کو رمز و ابہام اس لئے عزیز ہیں کہ وہ جس قسم کا اثر پیدا کرنا چاہتا ہے وہ انہیں سے ممکن ہے۔ دن کی روشنی کے مقابلہ میں رات کی چاندنی جذبات پرستوں کو کیوں پسند ہے؟ بقول فرانسیسی مفکر گیو اس کی وجہ یہ ہے کہ جذبہ ابہام چاہتا ہے نہ کہ وضاحت۔ خارجی عالم کی اشیاء، چٹکی ہوئی چاندنی میں عجیب و غریب پُراسرار کیفیت پیدا کر دیتی ہیں ان کے خد و خال ہی بدل جاتے ہیں۔ وہ شخص جو مکان کی پیمائش کرنا چاہتا ہے یا درختوں کی نباتی خواص کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے اس کو چاہئے کہ دن کی روشنی میں دیکھے۔ لیکن وہ شخص جس کو یہ مطلوب نہیں وہ چاندنی رات میں مکانوں اور درختوں کی مجموعی اثر آفرینی سے جتنا لذت اندوز ہوگا اتنا دن کی روشنی میں نہیں ہو سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جذبہ حقیقت اور خیال کی دھوپ چھاؤں میں جھولا جھولنا پسند کرتا ہے۔ دھوپ چھاؤں ہو یا فطرت کی کوئی دوسری مبہم صورت جو دل کے تاروں کو چھیڑے اہلِ نظر کو محبوب ہوتی ہے۔

(بقیہ صفحہ ۱۲۲ پر)

میاں افضل حسین

دیہی اصلاح کا ایک خاکہ

۱۹۳۶ء میں حکومت ہند نے زراعتی سائنس کے مشہور ماہر اور روذمسٹڈ تجرباتی اسٹیشن کے سابق ڈائرکٹر زراعتی تحقیق اور ترقی کے ماہر سرجان رسل کو دعوت دی کہ وہ یہاں آکر فصلوں کی پیداوار بڑھانے کے متعلق امپیریل کونسل آف ایگریکلچرل ریسرچ نے اب تک جو تحقیقات کی تھی اس کے بارے میں اپنی رپورٹ دیں۔ اس رپورٹ میں سرجان رسل نے ہندوستان میں زراعت کی اصلاح کے سلسلے میں دیہاتوں کو بڑی اہمیت دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"........ ہندوستانی زراعت کی اصلاح کا مسئلہ دراصل ہندوستان میں دیہاتی زندگی کی اصلاح کا مسئلہ ہے اور اس پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالنی چاہئے۔"

آگے چل کر وہ کہتے ہیں:۔

"...... دیہاتی زندگی کی اصلاح شاید ہندوستان کی سب سے بڑی ضرورت ہے" اور آخر میں انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:۔

"........ لہٰذا دیہاتوں کی اصلاح کو زراعتی اصلاح کے پروگرام کا لازمی حصہ ہونا چاہئے"

اس طرح سرجان رسل نے بار بار اس بات پر زور دیا ہے کہ زراعتی اصلاح کے سلسلے میں پہلا اور بنیادی قدم ہندوستانی دیہاتوں کی اصلاح ہے اور دیہات کی اصلاح ہی اس سارے کام کی سب سے اہم منزل ہے۔

کسانوں کے بارے میں سرجان لکھتے ہیں:۔

"میں نے دنیا کے مختلف حصوں کے کسان دیکھے ہیں۔ ہندوستانی کاشتکار کا مقابلہ آسانی سے کسی جگہ کے کسان سے کیا جا سکتا ہے"

سرجان رسل کی آمد سے چالیس سال پیشتر حکومت ہند نے ڈاکٹر ووئلکر کو دعوت دی تھی کہ وہ ہندوستانی زراعت کی اصلاح کے لئے تجاویز پیش کریں۔ اس وقت وہ ان نتائج پر پہنچے تھے کہ "ہندوستان کا اچھا کاشتکار اوسط درجے کے انگریز کسان کا ہم پلہ، اور بعض لحاظ سے اس سے بہتر ہے۔

جن لوگوں نے ہندوستانی کاشتکاروں کا مشاہدہ گہری نظر سے کیا ہے ان سب کی یہی رائے ہے ــــ جہاں تک کاشتکاری کے فن کا تعلق ہے ان پر جہالت کا الزام لگانا بھی ناجائز ہے۔ ان پر کاہلی یا آرام طلبی کا جو الزام ہے اسے بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ کاشتکار کی قدامت پرستی دراصل احتیاط اور حفاظت کا دوسرا نام ہے۔ ایک شخص جس کی اپنی اور سارے کنبے کی زندگی کا دارومدار چند ایکڑ زمین کی پیداوار پر ہے وہ تجربے کر کے اپنی روزی کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا وہ مجبور ہے کہ جانے پہچانے ہوئے راستے پر چلے۔ کسان کی جہالت، اس کی غریبی، اس کی بیماریاں، اس کے کمزور مویشیوں اور اس کی بنجر زمینوں کا علاج تلاش کرنا اکیلے اس کے بس کا نہیں۔ وہ جاہل ہے کیونکہ اسے علم حاصل کرنے کے مواقع میسر نہیں۔ وہ غریب ہے اس لئے کہ اس کی جائداد برائے نام ہے اور اسے اپنی صلاحیت بھر کمانے کے مواقع حاصل نہیں ہیں۔ اس کی صحت خراب ہے کیونکہ اس کو جو غذا ملتی ہے وہ مقدار میں ناکافی ہے اور اس میں ضروری صحت بخش عناصر کی کمی ہے اور اس کے اردگرد کا ماحول بھی صاف نہیں۔ اس کے مویشی کمزور ہوتے ہیں کیونکہ وہ ان کو پیٹ بھر خوراک نہیں دے سکتا۔ اس کی زمینیں بنجر ہیں کیونکہ اس کے پاس پوری کھاد نہیں۔ یہ خامیاں اسے ورثے میں ملی ہیں۔ وہ انھیں ساتھ لے کر پیدا ہوا ہے اور ڈاکٹر ووئلکر کے الفاظ میں:۔

"........ اس حالت کی ذمہ داری اصلاحات کی سہولتوں کی کمی پر ہے۔ شاید دنیا کے کسی ملک میں سہولتوں کی اتنی کمی نہیں۔ اسلئے شاید کسان شکوہ زبان پر لائے بغیر صبر و شکر کے ساتھ مصیبتوں کا اس طرح مقابلہ کرتے رہیں گے جس کی مثال اور کہیں ملنی مشکل ہے" آبادی کے اس زبردست دباؤ نے کسانوں کی اس تباہ حالی کو اور بھی مستقل بنا دیا ہے۔

زراعت کے رائل کمیشن نے شعبۂ زراعت کے کام کی ترقی اور کارناموں کی تعریف کی ہے۔ لیکن انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ "ان (شعبۂ زراعت) کا اثر سارے رقبے کے بہت ہی محدود حصے تک پہنچا ہے" اور ان کی رائے میں شعبۂ زراعت اور دوسرے محکمے کاشتکاروں کو جو امداد دے سکتے ہیں، ان سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کے لئے جس ماحول کی ضرورت ہوتی ہے، وہ ماحول پیدا کرنے کا مسئلہ بہت اہم ہے۔ اور یہ مسئلہ ابھی حل نہیں ہوا ہے" یہ ماحول کیا ہے؟ یہ کیسے پیدا کیا جائے؟ اس طرح کے سوالات جن کا

نے مسئلے کے حل کو اور بھی مشکل بنا دیا ہے۔

اب چونکہ مغربی پنجاب میں خصوصاً اور مغربی پاکستان میں عموماً لاکھوں پناہ گزینوں کو آباد کرنا ہے، اس لئے اس مسئلے کا فوری حل تلاش کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ حکومت کے محکموں میں زراعت، آبپاری، تعلیم، امداد باہمی، طب، صحت، علاج مویشیان، جنگلات اور صنعت کے شعبے دیہات کی اصلاح میں اہم حصہ لینے کے دعویدار ہیں۔ یہ محکمے عوام کی فلاح کے لئے قائم کئے گئے ہیں۔ اور عوام کی اکثریت ــــ ۸۰ سے ۹۰ فی صدی تک ــــ دیہاتوں میں رہتی ہے۔ اس لئے ان تمام محکموں کی توجہ دیہاتی آبادی کی فلاح و بہبود پر منعطف ہونی چاہئے۔ حال میں کسانوں کے "خیر خواہوں" کی فہرست میں چند نئے ناموں کا اضافہ ہو گیا ہے مثلاً دیہی تعمیر نو کا شعبہ، دیہی ترقی کا شعبہ، گاؤں سدھار کا شعبہ، پنچایتیں وغیرہ۔ لیکن ان کے باوجود بدنصیب کسانوں کی حالت روز بروز گرتی جاتی ہے۔ اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی فصلوں کی پیداوار میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا۔ تعلیمی [illegible]تی کا حال ناگفتہ بہ ہے۔ جنگ سے پہلے ان پر قرضوں کا بار بڑھتا جا رہا تھا۔ [illegible]ن کی صحت کچھ بہتر نہیں ہوئی۔ ان کے مویشی خراب ہوتے جا رہے ہیں اور ان کا وجود ان پر بار ہو گیا ہے۔ ان پر جنگلوں کو صاف کرنے کا الزام لگایا جاتا ہے۔ انھیں زمین کے کٹاؤ کے لئے ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے۔ انھیں ایندھن میسر نہیں۔ اس لئے وہ اُپلے جلاتے ہیں۔ ان کی گھریلو صنعت تباہ ہو گئی اور انھیں اس کا بدل نہیں ملا۔ گاؤں میں اپنی ضروریات پوری کرنے کی صلاحیت ختم ہو گئی اور ساتھ ساتھ گاؤں کی خوشحالی کا جنازہ نکل گیا۔ کسان کی زندگی میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی۔ بچوں کی شادی میں چند مہمانوں کی خاطر کرنا بھی اس کے لئے فضول خرچی ہو گئی ہے۔ گاؤں کے بھانڈ جو اس کے لئے تفریح کا سامان فراہم کرتے تھے، غائب ہوتے جا رہے ہیں اور سینما تک اس کی پہنچ نہیں۔ ریڈیو کے دیہاتی پروگرام سے بھی شہر والے لطف اندوز ہوتے ہیں کیونکہ انھیں کے پاس ریڈیو سٹ ہیں۔ ان سے گاؤں والوں کی تعلیم بالکل نہیں ہوتی کیونکہ ان کے پاس یہ پروگرام سننے کا ذریعہ ہی نہیں۔

وجہ کیا ہے؟ اگر اتنے پیچیدہ مسئلے کا ایک سبب ہو سکتا ہے تو وہ ہے حکومت کے مختلف شعبوں میں اشتراک کا فقدان! اور اس کا علاج ان میں باہمی اشتراک ہی سے ہو سکتا ہے۔ فی الحال وہ تمام شعبے جو کسانوں کی فلاح کے ذمہ دار ہیں علیحدہ علیحدہ کام کر رہے ہیں۔ بلکہ اگر صاف گوئی سے کام لیا جائے تو ان کے رویے باہم مخالفانہ ہیں۔ ہر شعبہ کوشش کرتا ہے کہ اپنے کارناموں کو بڑھا چڑھا کر دکھائے۔ ہر افسر کسان کی ترقی کا سہرا اپنے سر لینا چاہتا ہے۔ مختصر یہ کہ کسان ہر شعبے کے لئے کھلونا ہے اور ان شعبوں میں آپس میں ناموری کا مقابلہ ہو رہا ہے۔

کسان کی جہالت اور قدامت پرستی کی وجہ سے اسے ترقی کرنے پر آمادہ کرنا مشکل ہے۔ لیکن اسے راہ پر لانا ہی پڑے گا۔ کسی ایک شعبے کے پاس اتنا عملہ نہیں ہے کہ وہ عوام سے تعلقات پیدا کر کے انھیں راہ پر لائے۔ انفرادی کوششوں میں یہ شعبے اب تک ناکام رہے ہیں اور آئندہ بھی ناکام رہیں گے۔

سر جان رسل کا خیال ہے کہ "چیزوں کی صحیح واقفیت اور اصلاحی تجاویز کے امکانی نتائج کے گہرے مطالعہ کے بعد ہی کوئی صحیح تعمیری پروگرام مرتب کیا جا سکتا ہے۔"

کیا ہندوستان کی دیہاتی زندگی پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالی گئی ہے؟ کیا چیزوں کے متعلق صحیح واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے؟ کیا اصلاحی تجاویز کے امکانی نتائج کا غائر مطالعہ کیا گیا ہے؟ کیا مختلف شعبوں کو ایک مرکز پر جمع کر کے اتفاق و اشتراک کے ساتھ کام کرنے کی کوئی کوشش کی گئی ہے؟

میرا ارادہ ان مسئلوں کا کوئی حل تجویز کرنے کا نہیں۔ میری تجویز تو یہ ہے کہ دیہات کے مسائل کا بحیثیت مجموعی مطالعہ کرنے کے لئے ایک خاکہ تیار کر کے اس پر تجربہ کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے تقریباً ایک ہزار ایکڑ کا رقبہ، جس میں کم و بیش دو سو گھرانے آباد ہوں منتخب کرنا چاہئے۔ ان کے موجودہ معیار زندگی کا اچھی طرح مطالعہ کرنے کے بعد اصلاح کا کام ہاتھ میں لے لینا چاہئے۔ اصلاح میں زراعت، ایندھن، خوراک، چارہ، مویشی، انسانوں اور مویشیوں کی صحت، تعلیم، باہمی امداد، آبپاری، صنعت وغیرہ سارے مسائل کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ ایک وسیع خاکہ تیار کر کے اس پر عملدرآمد کرنے کی ضرورت ہے۔ اس تجربے کو عمل میں لانے میں شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ان کا مقابلہ کر کے ان پر قابو پانا چاہئے۔ گاؤں کا ایک مکھیا مقرر کرنا چاہئے اور اسے تجربے کے لئے ضروری اختیارات، مناسب رقم اور ساری آسانیاں فراہم کرنی چاہئیں۔ اس تجربے کے دو مقصد ہوں گے:- (۱) امکانات کا اندازہ لگانا (۲) اور یہ دیکھنا کہ کن حالات میں اور کتنے خرچ سے یہ امکانات پورے ہوں گے۔"

اب تک اصلاح کا کام یا تو نمائشی پیمانے پر ہوتا تھا یا صوبائی پیمانے پر۔ کسی سے بھی کوئی خاص مقصد حل نہیں ہوا۔ کسی سے بھی

کاشتکار کا بھلا نہیں ہوا، نہ فصل کی پیداوار میں کوئی اضافہ ہوا۔ ترقی کے لئے ایک وسیع اسکیم کی ضرورت ہے۔ دیہاتوں کی اصلاح ہر پہلو سے ہونی چاہئے۔ زراعت کے لحاظ سے، تعلیم کے لحاظ سے، صنعت کے لحاظ سے، صفائی کے لحاظ سے، معاشی لحاظ سے وغیرہ!

ضرورت اس بات کی ہے کہ دیہی اصلاح سے متعلقہ تمام شعبوں کے نمائندے مقررہ جگہ پر اکٹھے ہوں اور تجربے کا خاکہ تیار کریں۔ اس تجربے کو عمل میں لانے کا کام جن کے سپرد کیا جائے ان میں تخیل، جوش و خروش، حیثیت اور اختیار کا ہونا ضروری ہے۔ اگر پانچ برس میں خاطر خواہ نتیجہ نکلنے کی کوئی صورت نکل آئی تو سارے صوبے میں کام کیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی نتیجہ نہ نکلا تو حالات بدلنے کے لئے دوسرے ذرائع اختیار کرنے پڑیں گے۔ ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ جن ذرائع پر سالوں سے روپیہ اور وقت صرف ہو رہا ہے ان سے کوئی مفید نتیجہ نکل بھی سکتا ہے یا نہیں۔

ایک بار پھر میں سرجان رسل کے الفاظ دہراتا ہوں کہ "چیزوں کی صحیح واقفیت اور اصلاحی تجاویز کے امکانی نتائج کے گہرے مطالعہ کے بعد ہی کوئی صحیح تعمیری پروگرام مرتب کیا جا سکتا ہے"

آجکل تیزی سے کام کرنے کا بڑا رواج ہے۔ یہ نہیں سوچا جاتا کہ انجام کیا ہوگا۔ یہ روش بڑی خطرناک ہے۔ اپنے سماجی اور معاشی نظام پر غیر ملکی اصول چسپاں کرنے کی وبا بھی بڑی عام ہو رہی ہے۔ یہ چیز بھی بڑی خطرناک ہے۔ عمل کرنے سے پہلے حالات کا مطالعہ کرنا چاہئے اور اصلاحی تجاویز کے امکانی نتائج پر غور کرنا چاہئے۔ یہ طریقہ سست ضرور ہے لیکن یہی صحیح طریقہ ہے جس میں کامیابی یقینی ہے۔

ماہِ نو کا اگلا شمارہ

اکتوبر کے شمارہ کے لئے جن مضمون نگاروں اور شاعروں کی نگارشات ہمیں مل چکی ہیں ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:۔

ڈاکٹر عندلیب شادانی۔ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم۔ شوکت تھانوی۔ مخمور اکبرآبادی۔ حسرت رومانی۔ عزیز احمد۔ صدق جائسی۔ عرشی بھوپالی۔ اختر الایمان۔ بہادر (علیگ)۔ ضیاء الدین احمد برنی۔ محمودہ رضویہ۔

پنجاب کے دیہاتی گیت —— بقیہ صفحہ ۴۶ کا

کالم اللہ دھنے چاندریٹرا میڈا لے سنہڑا جا	اے قاصد خدا کے واسطے میرا ایک پیغام لیجا اور کہہ
جیویں ٹریوں کنڈہ ڈے گیائیں اوویں مڑ ڈسے آ	اے محبوب! جس طرح تم گئے ہو اسی طرح واپس آ جاؤ۔
جا ہے کون کرینداتوں ہی ساڈے بار اٹھا	تمہارے سوا میرا کون ہے اس لئے تم ہی میرے بوجھ اٹھاؤ
سکھڑیں ناں ڈسے یارا لاہنے کر کاں حیا	میرے محبوب، خدا کے لئے ناکردہ گناہ کے طعنے تو نہ دو، کچھ شرم کرو۔

وسطی اور شمالی پنجاب میں حضرت بلھے شاہؒ کی کافیوں کی بہت شہرت ہے۔ شاہ صاحب کا کلام عارفانہ اور متصوفانہ ہے، مگر کچھ ایسے انداز اور بے تکلفانہ انداز میں کہ اچھے اچھوں کو چونکا کے رکھ دیتا ہے، حضرت بلھے شاہ کی کافیاں عوام میں زیادہ مقبول نہیں ہو سکیں مگر ان کی کافیوں کے چند اشعار ضرب الامثال بن چکے ہیں۔

حضرت پیر مہر علی شاہ مرحوم و مغفور (گولڑہ شریف) نے بھی نہایت اچھی کافیاں کہی تھیں۔ افسوس ہے کہ ان کا مجموعۂ کلام اشاعت پذیر نہیں ہوا اور اگر ہوا ہے تو عام نہیں ہو سکا۔

کتھے مہر علی کتھے تیری ثنا گستاخ اکھیں کتھے جا لڑیاں

اگر حضرت پیر صاحب رحمۃ اللہ علیہ زندگی میں صرف یہی کافی کہتے جب بھی پنجابی شاعری میں ان کا درجہ بلند ہوتا۔

پنجابی دیہات کے گیتوں کا یہ ایک ہلکا سا خاکہ ہے جس کا مقصد محض یہ ہے کہ پاکستانی اپنی ایک صوبائی زبان کے فنی معجزات سے روشناس ہو جائیں، ضرورت اس امر کی ہے کہ کوئی صاحبِ دل پنجابی سندھی، بلوچی، پشتو اور بنگالی لوک گیتوں کو جمع کرنے کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دے، اور پھر ان کو الگ الگ مرتب کر کے قومی ادب کے خزانے میں بے بہا اضافے کا موجب بنے۔ لوک گیت عوام کے سماج، عوام کے رجحانات، عوام کے جذبات اور عوام کی پکار کے مظہر ہوتے ہیں، اور پنجابی عوام کو شیکسپیئر کا ایک ڈرامہ یا حافظؒ کی کوئی غزل یا اقبال کی کوئی نظم اس قدر متاثر نہیں کر سکتی جتنی ماہیا کی ایک کلی وارث شاہ کا ایک شعر علی حیدر کا ایک دوہا یا خواجہ فرید کی ایک کافی۔ ممکن ہے کہ پنجابی عوام کا یہ رجحان محسوس کر کے اردو کے عوامی شاعر اپنی نظموں میں فارسی اور عربی الفاظ سے احتراز کرنے لگیں اور اس طرح سلیس اردو میں عوامی جذبات کو نظم کر کے پنجاب کے لوک گیتوں کو ایک نیا روپ بخش دیں۔ وقت ہمیشہ اجتہاد کا منتظر رہتا ہے اور اردو کو اس وقت ایک مجتہد فن کار کی ضرورت ہے۔

حامد علی خاں

حضرت یزداں میں اقبال کی بیباکیاں

(با خدا دیوانہ باش و با محمدؐ ہوشیار)

خدا اور رسولِ خدا سے گہری محبت اور والہانہ شیفتگی کے شواہد اقبال کے کلام میں جا بجا ملتے ہیں۔ لیکن خدا اور رسول سے ان کے تعلق کی نوعیت کسی حد تک مختلف بھی ہے۔ وہ رسولِ خدا کے مقابلے میں خدا سے زیادہ بے تکلف معلوم ہوتے ہیں اور اس کی حضور میں شوخی اور طعن و تعریض سے بھی نہیں چوکتے لیکن آستانِ رسالت پر پہنچتے ہی وہ بہت با ادب نظر آتے ہیں۔ مکے کے یتیم کا ان کی نظروں میں یہ مرتبہ ہے کہ وہ خدا کو بھی اپنی طرح اس کی شمع کا پروانہ سمجھتے ہیں، چنانچہ کہتے ہیں ؎

تو بر شمعِ یتیمے صورتِ پروانہ می آئی

جس کی شمع کا پروانہ خدا ہو اس کے منصبِ بلند کا اندازہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ لیکن اس عقیدے کا ایک اور پہلو بھی ہے جسے کم از کم اقبال نے نظر انداز نہیں کیا۔ رسولِ خدا محض ایک بشر تھے اس لئے من حیث النوع پورا عالمِ بشریت کچھ نہ کچھ اس شرف کا حصہ دار ہے جو رسولِ مقبول کو حاصل ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے نزدیک انسان کا مرتبہ عام تصورات سے حیرت انگیز حد تک بلند تھا۔ ان کو یقین تھا کہ انسان ایک دن پوری خدائی کو مسخر کرے گا۔ کہتے ہیں ؎

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفےٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

اُمتِ رسول کے مردِ مومن کی نگاہِ بلند فرشتہ و حور پر نہیں پڑتی۔ اس کا مقام اس سے بہت اونچا ہے۔ اقبال اُسے مخاطب کرکے کہتے ہیں ؎

ترے صید زبوں افرشتہ و حور
کہ شاہینِ شہ لولاک ہے تو

یہی وجہ ہے کہ اس کو کسی اور ہی شکار کی تلاش ہے ؎

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بہ کمند آور اے ہمتِ مردانہ

بظاہر یہی انسان کی ہمتِ مردانہ کی معراج ہے لیکن اقبال کی حیرت انگیز بصیرت نے ایک اور بلند تر مقام اس کے لئے تلاش کر لیا ہے جہاں انسان خود خدا کا ہم آغوش اور ہم کار ہونے کا شرف حاصل کر سکتا ہے۔ یہ کام ہے اپنی جستجو کا۔ جس انسان پر اپنی خودی کا انکشاف ہو جائے اسے خدا کے جلووں کی گدائی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ اس گدائی پر غالباً حضرت موسیٰ کو وہ یوں ملامت کرتے ہیں :-

گدائے جلوہ رفتی بر سرِ طور | کہ جانِ تو ز خود نا محرمے ہست
قدم در جستجوئے آدمے زن | خدا ہم در تلاشِ آدمے ہست

اور خدا کی تلاش کی تو ضرورت ہی نہیں وہ تو اپنے تمام مظاہر کے ساتھ پیدا ہے پنہاں تو انسان ہے جس نے ابھی اپنے آپ کو نہیں پایا۔ اگر انسان خود کو پالے تو بجز جلوۂ خدا کے کچھ نہ دیکھ سکے۔ خود کو پہچاننا ہی تو پردہ حائل ہے :

کرا جوئی چرا در پیچ و تابی | کہ او پیداست تو زیرِ نقابی
تلاشِ او کنی جز خود نہ بینی | تلاشِ خود کنی جز او نیابی

انسان جن حجابات میں گم ہے خدا بھی اُسے ان سے باہر لانے کا آرزو مند ہے۔ اس آرزو کی تڑپ ملاحظہ ہو۔

ما از خدائے گم شدہ ایم او بجستجوست | چوں ما نیاز مند و گرفتارِ آرزو ست
گاہے بہ برگِ لالہ نویسد پیامِ خویش | گاہے درونِ سینۂ مرغاں بہ ہاؤ ہوست

جس پر یہ راز کھل گیا کہ خدا انسان کی محبت میں گرفتار ہے۔ اس کا شوخ و بیباک ہو جانا کچھ غیر فطری نہیں لیکن اس کے لئے اپنی محبوبیت پر یقین کا حاصل ہونا ضروری شرط ہے۔

رموز ہیں محبت کی گستاخی و بیباکی
ہر شوق نہیں گستاخ ہر جذب نہیں بیباک
فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا میرا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

اس کے باوجود اقبال کو انسان کے فانی ہونے کا احساس بھی ہے۔ اصلاً شکوہ بھی۔ انہیں محسوس ہوتا ہے کہ فانی اور غیر فانی کا عشق کچھ بے جوڑ سی بات ہے ؎ :-

کیا عشق ایک زندگیٔ مستعار کا | کیا عشق پائدار سے ناپائدار کا
وہ عشق جس کی شمع بجھا دے اجل کی پھونک | اس میں مزہ نہیں تپش و انتظار کا
کر پہلے مجھ کو زندگیٔ جاوداں عطا | پھر ذوق و شوق دیکھ دلِ بے قرار کا

ایک جگہ شکوہ کرتے ہیں ؎

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

مگر اقبال فانی ہونے کی فضیلت سے بھی ناواقف نہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں خدا کی بھی رسائی نہیں۔ درد مندی، بے قراری اور اشک باری کے مزے فقط انسان کے لئے مقدر ہیں۔ خدا کو تو نہ دمِ مستعار کی نعمت حاصل ہے نہ غمِ روزگار کی لذت۔ حضورِ خداوندی میں اقبال کی شوخی و بیباکی ملاحظہ ہو۔

بہ جہانِ دردمنداں تو بگو چہ کار داری | تب و تاب ما شناسی؟ دلِ بیقرار داری؟
چہ خبر ترا ز اشکے کہ فرو چکد ز چشمے | تو بہ برگِ گل ز شبنم دُرِ شاہوار داری
چہ بگویمت زجانے کہ نفس نفس شمارد | دمِ مستعار داری؟ غمِ روزگار داری؟

دردِ آرزومندی کی نعمت انسان ہی کا حصۂ خاص ہے۔ اقبال کے نزدیک یہ بندگی کا وہ مقام ہے جس کا بدل شانِ خداوندی بھی نہیں ہو سکتی:۔

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزومندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

انسانی شرف کا ایک اور پہلو ملاحظہ ہو یعنی خدائی اور بندگی میں بھی وہی فرق ہے جو دردِ سر اور دردِ جگر میں

خدائی اہتمامِ خشک و تر ہے | خداوندا خدائی دردِ سر ہے
ولیکن بندگی استغفر اللہ | یہ دردِ سر نہیں دردِ جگر ہے

ایک اور مزے کی چوٹ ملاحظہ ہو۔

تری دنیا جہانِ مرغ و ماہی | مری دنیا فغانِ صبح گاہی
تری دنیا میں میں محکوم و مجبور | مری دنیا میں تیری پادشاہی

مگر اس محکومی و مجبوری پر بھی انسان کچھ ہیٹا نہیں ہے کیونکہ خدا کے کاموں کی تکمیل اسی کا حصہ ہے:۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم | سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی | خیابان و گلزار و باغ آفریدم

انسان کی خلقت کے عیوب کا طعنہ بھی اقبال قدرتاً خالق ہی کو دیتے ہیں مگر انداز گفتگو کی شوخی ملاحظہ ہو:۔

یہی آدم ہے سلطاں بحر و بر کا؟ | کہوں کیا ماجرا اس بے بصر کا

نہ خودبیں، نے خدابیں، نے جہاں بیں | یہی شہکار ہے تیرے ہنر کا؟

انسان کا فانی ہونا اقبال کے نزدیک انسان کی کمزوری نہیں۔ تخلیق کا ہر عیب اس کے خالق کی طرف راجع ہوتا ہے۔ خدا کے ہنر کا شاہکار انسان اگر ناپائدار ہے تو اس ناپائداری کے عیب کے لئے بھی انسان جواب دہ نہیں۔ کیونکہ انسانی ہنر کی تخلیق کم از کم انسان سے تو زیادہ ہی پائدار ہے۔ اس پر بھی خدا اپنی تخلیق (انسان) کو تو فرشتوں سے سجدہ کراتا ہے لیکن انسان کی تخلیق (بُت) کے لئے سجدہ ممنوع ٹھہراتا ہے۔ حالانکہ بت آدمی سے زیادہ پائدار ہوتا ہے۔ اس اعتراض کا کیا جواب ہے:۔

بہ یزداں روزِ محشر برہمن گفت | فروغِ زندگی تابِ شرر بود
ولیکن گر نرنجی با تو گویم | صنم از آدمی پائندہ تر بود

یہ برہمن یا برہمن زادہ "اقبال ہی ہے جس کی محبت اُسے خدا سے ایسے شکووں، طعنوں اور بیباکیوں کی اجازت دیتی ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا
اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا؟

یعنی میں جیسا بھی ہوں تیرا ہی کارنامہ ہوں اس لئے:۔

روزِ حساب پیش ہو جب مرا دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو، مجھ کو بھی شرمسار کر

لیکن ان تمام بے باکیوں کے باوجود وہ بندے کا مقام نہیں بھولتے، اور خلوت میں یوں اظہارِ ندامت کرتے ہیں ؎:۔

چپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبال
کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

ضروری اعلان

ماہ نو کا یہ خاص نمبر اگست اور ستمبر کا مشترک شمارہ ہے۔ اگلا شمارہ یکم اکتوبر کو شائع ہوگا۔ خریداری ایجنٹ اور مشتہر صاحبان نوٹ فرمالیں۔

مینیجر ماہِ نو، پاکستان پبلیکیشنز، پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳۔ کراچی
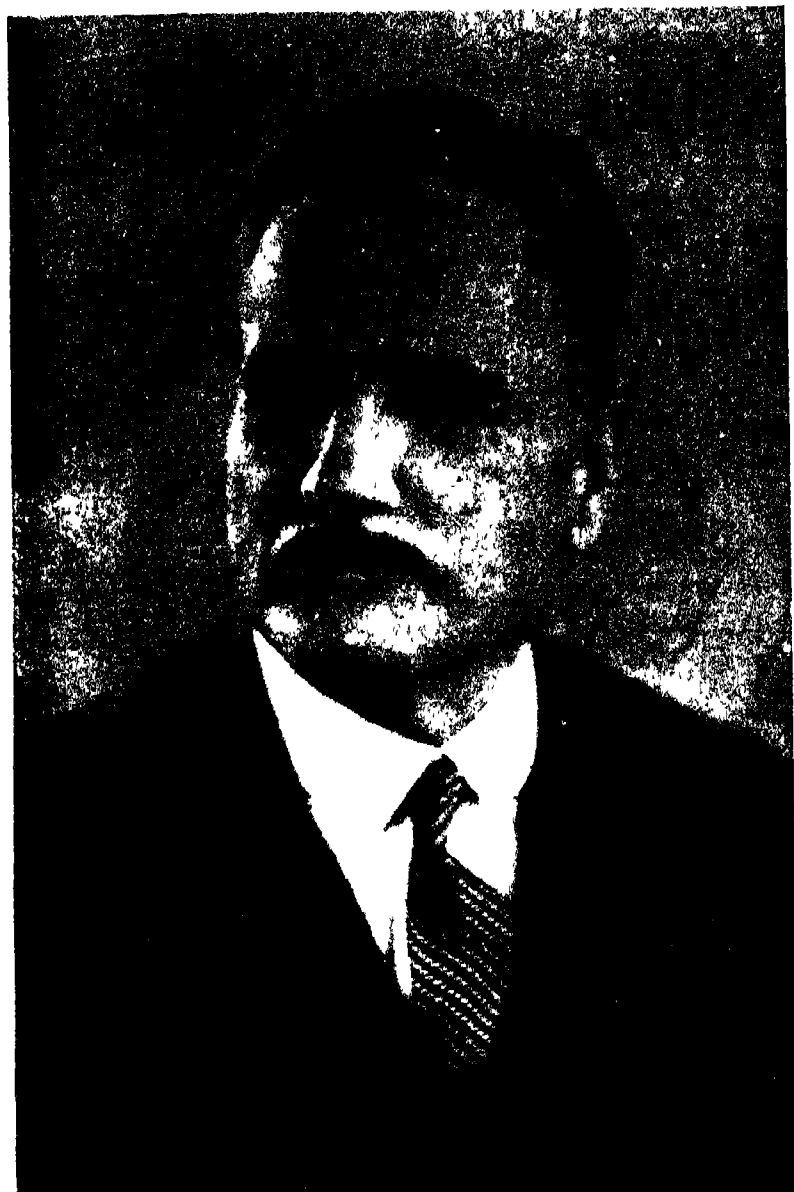
چنان بزی که اگر مرگ ماست مرگ دوام
خدا ز کردۂ خود شرمسار تر گردد

محمد آفتاب لندن ۲۴ ستمبر ۲۰۰۳ء

مسرت جہاں تیموری

پاکستان کی خواتین

اب سے ٹھیک گیارہ مہینے پہلے کی بات ہے ستمبر کی ۹ تاریخ تھی۔ دہلی سے بڑی وحشت ناک خبریں آنی شروع ہوئیں — قرول باغ کے سارے گھر مسلمانوں سے خالی ہو گئے، پہاڑ گنج کی گلیوں میں مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں، چاندنی چوک میں قتل و غارت کا بازار گرم ہے، دہلی کے اسٹیشن پر آنے والی گاڑیاں مسلمانوں کی لاشوں سے پٹی پڑی ہیں۔ دلّی میں ایسا غدر پڑا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے غدر کی کوئی حقیقت نہیں رہی۔ جو مسلمان زندہ بچے انھوں نے جانیں بچا کر پرانے قلعہ میں پناہ لی، تپتی زمین پر کھلے آسمان کے نیچے۔ میں سوچتی یا اللہ کیا ہو گیا ہے دنیا کو۔ پھر خبریں آئیں کہ پرانے قلعہ پہنچنے والوں کو کئی کئی دن سے کھانے کو کچھ نہیں ملا۔ بچے بلک بلک کر جانیں دے رہے ہیں۔ خبریں سن سن کر جی ڈوبا جاتا تھا، کھانا پینا حرام ہو گیا۔ دل چاہتا کہ کس طرح اڑ کر دلّی پہنچ جاؤں کہ شاید بے بسوں کی کچھ مدد کر سکوں۔ میں اسی الجھن میں تھی کہ مجھے خود کراچی میں زندگی کی ایک لہر دوڑتی نظر آئی۔ کراچی کی عورتیں دلّی سے آٹھ سو میل دور رہ کر دلّی کے بے کسوں اور بے بسوں کی مدد کرنے کا تہیہ کر چکی تھیں۔ کراچی کے ہر گھر میں روٹیاں پک رہی تھیں۔ تنوروں پر شیرمال لگ رہے تھے۔ سڑکوں کے کنارے امدادی مرکزوں میں کباب پراٹھے تلے جا رہے تھے۔ کھانے پینے کا یہ سامان اکٹھا ہوتا۔ تیزی سے اسے باندھا جاتا اور اس میں بچوں کے لئے دودھ کے ڈبے، پھل اور مٹھائیاں شامل کر کے ہوائی جہاز کے ذریعہ دلّی بھیجدیا جاتا۔ کراچی کی عورتوں نے کئی دن تک نہ دن کو دن سمجھا نہ رات کو رات۔ دلّی کے بے کسوں کی خاطر اپنے عیش و آرام کو قربان کیا۔ راتوں کو جاگیں، اپنے آپ کو بھوکا رکھا لیکن دلّی والوں کو بھوکا نہیں رہنے دیا۔ انھوں نے ایک سخت امتحان کی پہلی منزل بڑی ہمت اور بڑے حوصلے سے طے کی۔ دوسری منزل اس سے بھی مشکل تھی۔ دلّی کے لاکھوں مہاجر آنے شروع ہو گئے تھے۔ کیمپ کی زندگی کی صعوبتوں سے چور، تھکے ہارے، نادار و ناتوان، جسم ننگے اور پیٹ خالی۔ ان میں بچے، عورتیں اور بوڑھے سبھی تھے۔ کراچی کی عورتوں نے ان بے بس، بے کس مہمانوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ان کے ٹھیرنے کا انتظام کیا۔ ان کے کیمپوں میں جا کر انھیں کھانا دیا، دوائیں دیں اور سب سے بڑھ کر ان کے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑا اور گہرے زخموں پر مرہم رکھا۔ بچوں کی دیکھ بھال، دوا دارو، کیمپوں اور برتنوں کی صفائی۔ غرض انھیں کوئی کام کرنے میں عار نہ تھا۔ اب جاڑے آ رہے تھے۔ آنے والوں کے تن کپڑوں سے خالی تھے۔ اگر انہیں گرم کپڑے نہ ملے تو کیا ہوگا؟ اس خیال نے کراچی کی عورتوں کے دل میں کام کا ایک نیا جذبہ پیدا کیا۔ اون اکٹھا کیا گیا، سوئٹر بنے گئے۔ لحاف بنے، رضائیاں تیار ہوئیں۔ گھر گھر سے نئے پرانے کپڑے اکٹھے ہوئے اور وہ برا وقت کسی نہ کسی طرح ٹل گیا۔

مہاجروں کی خدمت کے یہ سارے کام مہاجرین کی ریلیف کمیٹی (خواتین) کے زیر اہتمام عمل میں آئے۔ اور اس میں محترمہ فاطمہ جناح سے لے کر کراچی کے امیر غریب ہر طبقہ کی عورتیں شامل تھیں۔ یہ کمیٹی اب بھی اپنا کام کر رہی ہے۔ بیوہ عورتوں کو کام سکھانے کے لئے دستکاری کے مرکز کھولے گئے ہیں۔ جہاں انہیں مختلف طرح کی دستکاریوں کی تعلیم دینے کے علاوہ ان کے کھانے اور کپڑے کا بھی مفت انتظام کیا جاتا ہے۔

پاکستان کی خواتین کی بیداری کا دوسرا مظاہرہ گرل گائیڈز ایسوسی ایشن کے قیام کے بعد ہوا۔ ایسوسی ایشن کے قیام کے لئے پہلا جلسہ ۲۹ دسمبر ۱۹۴۷ء کو بلایا گیا تھا۔ اس وقت سے اب تک پاکستان کے مختلف حصوں میں دس ہزار سے زیادہ لڑکیاں اس کی ممبر بن چکی ہیں اور اپنے ملک اور قوم کے مستقبل کو درخشاں بنانے کی خاطر وہ تعلیم حاصل کر رہی ہیں جس سے انسان میں خدمت اور ایثار کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ پاکستان کی عورتوں کو اندازہ ہو گیا ہے کہ آزادی نے ان کی ذمہ داریاں بہت بڑھا دی ہیں۔ انہیں اپنی قوم کے لئے، اپنے ملک کے لئے، اپنی آزادی کے لئے قومی زندگی کے ہر شعبے میں مردوں کا ہاتھ بٹانا ہے۔

جب ایسوسی ایشن نے اپنا کام شروع کیا تو اس کے پاس نہ پیسے تھے، نہ پچھلے کاموں کی کوئی روداد۔ دفتری کاموں کے لئے کاغذ اور چھپے ہوئے فارم تک موجود نہیں تھے۔ لیکن ان ساری کمیوں کے باوجود کام شروع ہوا۔ عورتوں نے اپنی تندہی سے بہت جلد ایسی صورت پیدا کر دی کہ حکومت نے ایسوسی ایشن کی باقاعدہ حیثیت تسلیم کر لی اور اس کی امداد کے لئے ایک سالانہ رقم دینے کا فیصلہ کیا۔ اب یہ ایسوسی ایشن بہت جلد گرل گائیڈز کی

بین الاقوامی انجمن کی رکن بننے والی ہے۔

۹ مئی اپریل کو جب کراچی کے علاقہ کی گرل گائڈ ایسوسی ایشن نے اپنا سالانہ جلسہ کیا تو محترمہ فاطمہ جناح نے خواتین کے نام یہ پیغام دیا: "آگے بڑھئے اور بڑی سے بڑی تعداد میں گرل گائڈ ایسوسی ایشن کی رکنیت حاصل کیجئے۔ اس تربیت سے فائدہ اٹھائیے اور اپنے آپ کو اس خدمت کے لئے تیار کیجئے جو آپ سے پاکستان اور یہاں کے رہنے والوں کی بہتری کیلئے لی جانے والی ہے"۔ ہماری خواتین میں اس جذبہ کی کمی نہیں۔ انکی بے غرض اور مسلسل جدوجہد پاکستان کی زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے میں صرف ہو رہی ہے۔

یہی جذبہ ہے جس نے انہیں پاکستان نیشنل گارڈ کی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر آمادہ کیا ہے۔ وہ اب گھروں کی چار دیواری سے نکل کر فوجی زندگی کے ضبط، تنظیم، باقاعدگی، بے نفسی اور ایثار کی عادی بن رہی ہیں۔ ممکن ہے آپ مجھے جذباتی کہیں لیکن میں اپنے دل کی بات کیوں چھپاؤں۔ میں جب عورتوں کے کسی دستے کو مستعدی سے قواعد کرتے یا گولیاں چلانے کی مشق کرتے دیکھتی ہوں تو میری آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلکنے لگتے ہیں اور میرا دل مسرت کے لامتناہی جذبات سے لبریز ہو جاتا ہے۔

عورتیں اب اصلاحی انجمنیں بنا رہی ہیں، نرسنگ کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں فرصت کے وقت میں دستکاریاں سیکھتی ہیں اور اپنے جسم اور ذہن کو تندرست اور توانا رکھنے کے لئے فوجی تعلیم حاصل کرنے کے لئے تیار ہیں۔ یہ سب کچھ آزادی کے ایک سال نے انہیں سکھایا ہے۔

پاکستان نیشنل گارڈ (خواتین) میں بھرتی کا کام مارچ ۱۹۴۸ء میں شروع ہوا تھا۔ شروع شروع میں بٹالین میں صرف ۳۰ عورتیں تھیں لیکن تین ہی مہینے کے اندر یہ تعداد ۲۰۰ تک پہنچ گئی اور اب بھی ۱۶ سال سے لے کر ۵ سال کی عمر کی خواتین برابر اپنا نام لکھوا رہی ہیں۔ عورتوں کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کے پیش نظر پاکستان کے ہر بڑے شہر میں اس کی شاخیں کھولی جا رہی ہیں اور وہ دن دور نہیں جب پاکستان عورتوں کی اس فوج پر فخر کر سکے گا۔

ابھی تھوڑے ہی دن کی بات ہے کہ خواتین کی نیشنل گارڈ کی پہلی عام پریڈ ہوئی تھی اور پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خاں صاحب نے اس کا معائنہ فرمایا تھا۔ ۱۹۴۸ء کو ایک دوسرا مظاہرہ ہوا اور بیگم لیاقت علی خاں نے اس موقع پر نیشنل گارڈ کی سلامی لی۔ ان دونوں موقعوں پر جن لوگوں نے پریڈ دیکھی ان کے دلوں پر خواتین کی تنظیم اور ان کے استقلال کا بڑا گہرا اثر پڑا۔ یہ تنظیم اور یہ استقلال پاکستان کے مستقبل کے لئے بڑی نیک فال ہے۔

خواتین پاکستان زندہ باد!

تعمیر

مجید لاہوری

کلفتوں کو حسیں بنایا ہے
زہر کو انگبیں بنایا ہے
شعلۂ آتشِ جہنم کو
رشکِ خلدِ بریں بنایا ہے
شورِ ہنگامۂ قیامت کو
نغمۂ دلنشیں بنایا ہے
تند طوفاں کی تیز موجوں پر
ایک نقشِ حسیں بنایا ہے۔
موجۂ بادِ صبح گاہی کو
آندھیوں کا امیں بنایا ہے
تیرہ و ہولناک راتوں کو
گیسوئے عنبریں بنایا ہے
خوں میں لتھڑے ہوئے مناظر کو
بادۂ احمریں بنایا ہے
تیغ کی تابشیں تھیں وہ جن کو
بازوئے مرمریں بنایا ہے
دہر کو اہلِ عزم و ہمت نے
جنتوں سے حسیں بنایا ہے

سید امتیاز علی تاج

جدید سوانح نگاری

سوانح عمریاں بہت پرانے زمانہ سے لکھی جا رہی ہیں۔ پلوٹارک کی مشاہیر یونان و روما سے کون واقف نہ ہوگا۔ لیکن یہ پرانی سوانح عمریاں کوئی خاص مقام ادب میں نہ رکھتی تھیں۔ ان کی حیثیت اخبار کی سی سمجھئے۔ اتنا فرق ضرور تھا کہ اخبار کی طرح ان کی زندگی مختصر نہ ہوتی تھی۔ ادب میں ایک مستقل صنف کی حیثیت اس نے پچھلے پچیس تیس سال میں حاصل کی ہے۔ اس وقت سے ادب کے طالب علموں کو اس سے غیر معمولی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔

پچھلے پچیس تیس سال میں نئی شاعری اور نئے ناول کا تذکرہ بھی کچھ کم سننے میں نہیں آیا۔ لیکن ان میں فرق صرف اتنا پڑا۔ کہ قدیم اصناف نے جدید صورتیں اختیار کر لیں۔ ورنہ بحیثیت اصناف، ادب کے پرانی اور نئی شاعری اور پرانا اور نیا ناول چیز ایک ہی ہے۔ سوانح نگاری میں یہ بات نہیں ہوئی۔ اس نے ایک نئی صورت اختیار کی۔ جو اسے پہلے کبھی حاصل نہ تھی۔ اسے اب پہلی مرتبہ فن کا مقام حاصل ہوا ہے۔

ہر فن میں مقدم ترین بات یہ ہوتی ہے کہ فن کار کی تخلیقی قوتوں کا مظہر ہو۔ ادیب لکھتا ہے تاکہ اپنے کسی ذاتی تصور کا اظہار کرے۔ لکھنے کے لئے موضوع کوئی ایسا منتخب کرتا ہے جو اس کی مخصوص قابلیت کو بہترین طور سے نظارہ افروز کرنے پر قادر ہوتا ہے۔ پرانی سوانح نگاری میں اس کا امکان کہاں تک تھا! اس کا مقصد فنکارانہ نہ تھا افادی تھا۔ سوانح نگار پڑھنے والوں کو صرف معلومات بخشتا تھا۔ اچھا سوانح نگار ہوتا تو زیادہ معلومات بہم پہنچاتا۔ تحقیق سے کام لے کر واقعات کی صحت کا زیادہ خیال رکھتا۔ برا سوانح نگار ہوتا تو ان باتوں کا خیال نہ کرتا۔ اگر اتفاق سے ادیب ہوتا تو انداز بیان میں ادب کی چاشنی آ جاتی۔ ادیب نہ ہوتا جب بھی اس کی تصنیف اپنا اصل مقصد پورا کرنے میں ناکام نہ رہتی۔ فن کارانہ تاثر پیدا نہ ہوتا۔ مگر حقیقت کا اظہار تو ہو ہی جاتا تھا۔

اردو میں زیادہ سوانح عمریاں اسی نوع کی ہیں جس کی سوانح عمری لکھی جاتی ہے۔ اس کی جائے پیدائش۔ تاریخ پیدائش۔ والدین کا حال۔ تعلیم و تربیت کی تفصیل، غرض تمام اہم امور کے متعلق زیادہ سے زیادہ اور صحیح معلومات بہم پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کبھی ایسے حالی اور آزاد جیسے سوانح نگار ہوں تو انداز بیان میں ادبی لطافت بھی ملتی ہے۔ لیکن غرض ان کی ادبی لطافت پیدا کرنا تھا۔ یہ یوں پیدا ہو گئی کہ حالی اور آزاد ادیب بھی واقع ہوئے تھے۔ اس لئے ان کی کوئی تحریر ادبی لطافت سے خالی نہ رہ سکتی تھی۔ ورنہ غرض ان کی اس کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ کہ واقعات بیان کئے جائیں۔ اسی طرح شبلی کو واقعات بیان کرتے کرتے تامل نہیں ہوتا کہ رک کر اپنے مواد کی صحت پر بحث شروع کر دیں۔ اپنے بیان کے ثبوت میں مختلف حوالے لائیں اور اہم اقتباسات سے اپنے دلائل کو تقویت بخشیں۔ ان کے نزدیک مقدم ہمیشہ تاریخ رہی۔ ادب کو انہوں نے ثانوی مقام دیا۔

لیکن موجودہ زمانہ کا امتیازی سوانح نگار مقدم ادب کو سمجھتا ہے۔ وہ کسی کی سوانح عمری اس خیال سے نہیں لکھتا کہ اس کے متعلق معلومات بہم پہنچائے۔ بلکہ صرف اس لئے کہ اس کی زندگی کو فنکارانہ اظہار کے لئے وہ موضوع بہت مناسب سمجھتا ہے۔ اس کی تصنیف کے ڈھب ہی سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس کی غرض ایک فنکارانہ تصور پیدا کرنا ہے۔ وہ شبلی کی طرح واقعات کو حوالے اور ثبوت اور اقتباس کے ساتھ پیش نہیں کرتا۔ بلکہ انہیں افسانے کی لڑی میں پرو لیتا اور ایسے نظم و تناسب سے مرتب کرتا ہے۔ کہ جو تصویر آنکھوں کے سامنے لانا مقصود ہے وہ امکان بھر جیتی جاگتی اور تفریح بخش بن جائے۔ علاوہ ازیں اس میں مورخ کی سی بے تعلقی بھی نہیں ہوتی۔ اس کا تمام بیان اپنے انفرادی تصور کے رنگ سے رنگین اور تفریح بخش معلوم ہوتا ہے۔ اسے ایک شخصیت کا ویسا ہی اظہار سمجھئے۔ جیسے مثلاً مصور کا ہوتا ہے۔

اردو میں اس نوع کی سوانح نگاری مگر کسی نے کامیابی سے کی ہے۔ تو فرحت اللہ بیگ نے۔ ان کے طویل مضمون "ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی۔ کچھ میری اور کچھ ان کی زبان" کو دیکھئے۔ ہمارے پرانے سوانحی مضامین سے کس درجہ مختلف ہے۔

"رنگ سانولا مگر روکھا۔ قد خاصہ اونچا تھا۔ مگر چوڑان نے لمبان کو دبا لیا تھا۔ دوہرا بدن۔ گدرایا نہیں بلکہ موٹاپے کی طرف کسی قدر مائل۔ خود کہتے تھے کہ بچپن میں ورزش کا شوق تھا۔ ورزش چھوڑ دینے سے بدن مرجھا کر [illegible] ہو جاتا ہے۔ بس یہی کیفیت تھی۔ بھاری بدن کی وجہ سے چونکہ قد [illegible] ہونے لگا تھا اس کو [illegible] ٹوپی سے کر دیا جاتا تھا سر کا پھیر ضرورت سے زیادہ تھا توند اس قدر بڑھ گئی تھی کہ گھر میں [illegible]

نہیں بلکہ تکلیف دہ سمجھا جاتا تھا اور محض ایک گرہ کو کافی خیال کیا جاتا تھا۔ گرمیوں میں تہمد (تہ بند) باندھتے تھے۔ اس کے پلو اڑسنے کے بجائے اِدھر اُدھر ڈال لیتے تھے۔ مگر اٹھتے وقت بہت احتیاط کرتے تھے۔ اول تو قطب بنو بیٹھے رہتے۔ اگر اٹھنا ہوا تو پہلے اندازہ کر لیتے تھے کہ فی الحال اٹھنے کو ملتوی کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ ضرورت نے بہت مجبور کیا تو ازار بند گرہ یا تہمد کے کونوں کو اڑسنے کا دباؤ تو ند پر ڈال لیتے تھے۔ سر بہت بڑا تھا۔ مگر بڑی حد تک اس کی صفائی کا انتظام قدرت نے اپنے اختیار میں رکھا تھا۔ جو تھوڑے سے رہے سہے بال تھے۔ وہ اکثر نہایت احتیاط سے صاف کرا دیئے جاتے تھے۔ ورنہ بالوں کی یہ گگر سفید منقش کی صورت میں ٹوپی کے کناروں پر جھالر کا نمونہ ہو جاتی تھی۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی ذرا اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ بھویں گھنی اور آنکھوں کے اوپر سایہ افگن تھیں۔ آنکھوں میں غضب کی چمک تھی۔ وہ چمک نہیں جو غصے کے وقت نمودار ہوتی ہے۔ بلکہ یہ وہ چمک تھی جس میں شوخی اور ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اگر میں ان کو "مسکراتی ہوئی آنکھیں" کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ کلہ جبڑا بڑا زبردست پایا تھا۔ چونکہ دہانہ بھی بڑا تھا۔ اور پیٹ کے محیط نے سانس کے لیے گنجائش بڑھا دی تھی۔ اس لئے نہایت اونچی آواز میں بغیر سانس کھینچے بہت کچھ کہہ جاتے تھے آواز میں گرج تھی مگر لوچ کے ساتھ۔ کوئی دور سے سنے تو سمجھے کہ مولوی صاحب کسی کو ڈانٹ رہے ہیں۔ لیکن پاس بیٹھنے والا ہنسی کے مارے لوٹ رہا ہو۔ جوش میں آکر جب آواز بلند کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ ترم بج رہا ہے۔ اسی لئے بڑے بڑے جلسوں پر چھا جاتے تھے۔ اور پاس اور دور بیٹھنے والے دونوں کو ایک ایک حرف صاف صاف سنائی دیتا تھا۔ ناک کسی قدر چھوٹی تھی اور نتھنے بھاری۔ ایسی ناک کو گنواروں کی اصطلاح میں گاجر اور دلی والوں کی بول چال میں "پھلکی" کہا جاتا ہے۔ گو حالت چھو کر نہیں گئی تھی۔ لیکن جسم کے بوجھ نے رفتار میں خود بخود متانت پیدا کر دی تھی۔ ڈاڑھی بہت چھدری تھی۔ ایک ایک بال بآسانی گنا جا سکتا تھا۔ کلے تو کبھی قینچی کے منت کش نہیں ہوئے۔ البتہ ٹھوڑی پر کا حصہ کبھی کبھی ہموار کر لیا جاتا تھا ڈاڑھی کی وضع قدرت نے خود فرنچ فیشن بنا دی تھی۔ بالوں میں سے ٹھوڑی اس طرح دکھائی دیتی تھی۔ جیسے ایکس ریز ڈالنے سے کسی بکس کے اندر کی چیز ٹھوڑی چوڑی اور ان کے ارادے کے پکے ہونے کا اظہار کرتی تھی۔ گردن چھوٹی مگر موٹی تھی سمجھئے یہ ہیں مولوی نذیر احمد خاں صاحب "

جدید سوانح نگاری ادب کی خاصی ٹیڑھی صنف ہے۔ ایک طرح دیکھئے تو اس میں بھی ناول کی ڈرامیت آنی ضروری ہے۔ اس کا موضوع آخر ایک انسانی زندگی کا ڈراما ہوتا ہے۔ یہ جدا بات ہے کہ مصنف اسے دیکھے کس نقطۂ نظر سے پھر ناول کی مانند جدید سوانح نگاری میں تصویر کشی بھی ہوتی ہے۔ اس کا مصنف پوری کوشش کرتا ہے کہ اپنے ڈراما کو ہمارے ذہن کی نگاہوں کے سامنے لے آئے ہمیں اس کے کرداروں کے چہرے نظر آ جائیں۔ ہم ان مناظر کو دیکھ سکیں جن میں وہ کردار رہتے سہتے تھے۔ اپنی اس خصوصیت کے باعث سوانح نگار کا کام ناول نویسی کے کام سے بہت زیادہ پیچیدہ بن جاتا ہے۔ اسے سنانی ہوتی ہے ایک سچی کہانی۔ چنانچہ ہر ہر جگہ اصلیت کے ساتھ رہنا پڑتا ہے۔ اسے اپنے واقعات اور کردار بنے بنائے ملتے ہیں۔ چنانچہ مجبور ہوتا ہے کہ انہیں حتی الامکان پوری صحت سے بیان کرے۔ اور خیال رکھے کہ اسی ترتیب اور اہمیت سے پیش ہوں۔ جو فی الواقع انہیں حاصل تھی۔ چنانچہ اس کی تخلیقی تحریک ناول نویسی کی تخلیقی تحریک سے مختلف طور پر اپنا اظہار کرتی ہے۔ ناول نویس کی تخلیقی تحریک اپنا اظہار زیادہ تر ایجاد میں کرتی ہے۔ یعنی مناظر اور کردار کو تخلیق کرنے کی قدرت میں سوانح نگار کی تخلیقی تحریک اپنا اظہار کرتی ہے تعبیر میں۔ اس بات کی صلاحیت میں کہ جو کہانی اسے ملی ہے اس کا مفہوم دریافت کرے۔ اس کے سامنے خطوط کا۔ روزنامچوں کا۔ سنے سنائے واقعات کا جو انبار لگا ہے۔ اس مواد میں سے ایک ایسا موضوع تلاش کرے جو اس ساری معلومات پر حاوی ہو کر اسے ایک فنی کارنامہ کی صورت بخش سکے۔ پچی کاری کے ذریعے تصویریں بنانے والوں کی طرح اس کا کام مختلف ٹکڑوں کو گویا مناسب ترتیب بخشنا ہوتا ہے۔ وہ ٹکڑوں کی وضع کو نہیں بدل سکتا۔ اس کا کام ایسا نقشہ ایجاد کرنا ہے جس میں واقعات کے ننھے ننھے پتھر حسن و خوبی سے بیٹھ جائیں۔ مزید برآں اس کے تخیل کا کمال اس طرح ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اپنے مواد میں روح پھونک سکے۔ واقعات کی سوکھی ہڈیوں کو زندگی کے گوشت پوست کا ایسا چولا پہنائے کہ شخصیت جیتی جاگتی معلوم ہونے لگے۔

تو گویا سوانح نگاری کو حقیقت کے ہمرکاب رہنا پڑتا ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں سمجھنے چاہئیں۔ کہ اس طرح اس میں تنوع کا زیادہ امکان نہیں رہتا۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کی دو ایسی سوانح عمریاں تیار ہوں جو ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوں مگر ہوں دونوں قابل قدر۔ اس کا تعلق صرف اس بات سے ہے کہ واقعات کو دیکھا کس نظر سے جاتا ہے۔ ہر مختلف نقطۂ نظر سے وہ مختلف صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ انہیں کوئی جذباتی شخص لکھنے بیٹھے۔ تو وہ موثر بن جائیں گے۔ ظرافت نگار لکھنے بیٹھے گا۔ تو ان میں ظرافت کا رنگ آ جائے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ جدید سوانح نگار کو تلوار کی دھار پر چلنا ہوتا ہے۔ ایک طرف تو اس پر کچھ تقاضے فن کے ہوتے ہیں۔ اور دوسری طرف زندگی کے۔ اس کی تصنیف کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ بحیثیت تصویر کے بھی تسلی بخش ہو اور بحیثیت مشابہت کے بھی۔ اس معیار پر مغربی سوانح نگاروں میں سے بھی بہت کم پورے اترتے ہیں۔ ان میں سے بعض زندگی پر فن کو قربان کر ڈالتے ہیں۔ واقعات بہت زیادہ بیان کرتے ہیں۔ انہیں پیش بھی خوشگوار طریق سے کرتے ہیں۔ لیکن فنی وحدت میں نہیں گوندھ سکتے۔ دوسری طرف بعض مصنف فن پر زندگی کو قربان کر ڈالتے ہیں۔ ان کی تصویر جیتی جاگتی ضرور ہوتی ہیں مگر صحیح نہیں ہوتی۔ بعض اہم واقعات حذف کر جاتے ہیں۔ یا اثر و تاثیر پیدا کرنے کی کوشش میں ان کی صحیح تعبیر کو توڑ مروڑ کر غلط بنا ڈالتے ہیں۔ یا جن امور کے متعلق معلومات بہم نہیں پہنچتی۔ وہاں اپنے ذاتی قیاسات سے کام لینا شروع کر دیتے ہیں جو صحیح نہیں رہتے۔ سچ بات یہ ہے کہ دونوں تقاضوں میں صحیح توازن قائم رکھنا آسان کام نہیں ہے۔ مگر ایسے مصنف بھی ہیں جو توازن پیدا کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ انگریزی میں لٹن اسٹریچی کی "ملکہ وکٹوریا" اس کی مثال ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اس نوع کی سوانح نگاری آخر ہمارے ہی زمانے کے حصے میں کیوں آئی! اس کی طرف اس طرح توجہ اس سے پہلے کیوں نہ ہوئی؟

اس کی ایک بڑی وجہ تو یہ ہے۔ کہ موجودہ زمانہ دوسری اصناف ادب کے پھولنے پھلنے کے لئے زیادہ سازگار نہیں سمجھا جاتا۔ ہمارا زمانہ سائنس کا زمانہ ہے۔ آج کی دنیا میں سب سے زیادہ اہم کام سائنس داں کر رہا ہے۔ ہر چیز کے مطالعہ میں سائنس کا انداز پسند کیا جاتا ہے۔ یہ حالات تخلیقی فن کار کے لئے زیادہ حوصلہ افزا نہیں ہو سکتے۔ علمی انداز ہوتا ہے سرد اور نقادانہ۔ یہ جوشیلے جذبات رنگین تخیل کو جو مثلاً شاعری کی روح رواں ہیں کھل کھیلنے کو آزاد نہیں چھوڑتا۔ ادھر لکھنے والوں میں لکھنے کا شوق آج بھی اتنا ہی زیادہ ہے۔ جتنا پہلے تھا چنانچہ وہ کیا کریں؟ اظہار کی کسی نئی اور زیادہ پسندیدہ صورت کے تجسس میں ان کی نظر سوانح نگاری پر پڑتی ہے۔ اس میں انہیں جدید علمی انداز فکر سے کام لینے کا امکان نظر آتا ہے۔ سوانح نگاری میں گو اظہار تو شخصی تصور ہی پاتا ہے۔ مگر یہ ساتھ ہی ناگزیر طور پر حقیقت کے بیان سے بھی تعلق رکھتی ہے۔ حقیقت کے مطالعہ کے لئے علمی انداز نظر لازمی ہے۔ کسی کی ایسی تصویر پیش کرنے کے لئے جو قابل [illegible] ہو۔ یہ ضروری ہے کہ لکھنے والا تفصیلات پیش کرنے میں اسی قدر محنت کرے اور تحقیق و تفتیش میں اس درجہ مہارت رکھے جیسی مہارت کی ضرورت کسی مرض کی تشخیص میں ہوتی ہے۔ ساتھ ہی اس کے لئے ضروری ہے کہ اپنے موضوع کا مطالعہ بھی ایک سائنس داں کی سی بے تعصبی سے کرے پہلے سوانح نگار جب کچھ لکھنے بیٹھتے تھے تو شدید طور پر یا اپنے موضوع کے موافق ہوتے تھے یا مخالف اور اگر بے تعصب بھی ہوتے تھے تو ان کے خیالات کو ذاتی عقائد اس قدر بدل ڈالتے تھے۔ کہ وہ اپنے موضوع کے افعال و اعمال پر ایک مصنف کی طرح نظر ڈالنے لگتے تھے۔ لیکن سوانح نگار کا کام وجوہ بیان کرنا ہے۔ فیصلہ سنانا نہیں ہے کسی شخص کے متعلق واضح تصور قائم کرانے کے لئے یہ بتانا ضروری نہیں۔ کہ ان کے اعمال اچھے تھے یا برے۔ اس قسم کی رائے زنی سے تو تصور دھندلا جاتا ہے بتانے کی بات یہ ہوتی ہے کہ اس نے وہ اعمال کیوں کئے اور کس طرح کئے۔ یہ انداز فکر بھی سائنس ہی کا ہے سائنس داں کو اس سے کچھ سروکار نہیں رہتا کہ بیماری بری چیز ہے۔ وہ اپنا تعلق صرف اس بات سے رکھتا ہے کہ بیماری کے اسباب کیا ہیں۔ اور علامات کیا ہیں۔ اس قسم کے غور و فکر کے لئے بمقابلہ پرانے زمانے کے آج ہم زیادہ تیار ہیں۔

آخری وجہ جو موجودہ زمانہ کو سوانح نگاری کے لئے زیادہ سازگار ثابت کرتی ہے یہ ہے کہ پچھلے چالیس سال میں نفسیات نے بہت زیادہ ترقی کی ہے۔ انسانی شخصیت کو۔ اسے تحریک دینے والی قوتوں کو۔ وراثت اور ماحول کے اثر کو جیسی وضاحت سے آج سمجھا جا رہا ہے پہلے کبھی نہ سمجھا گیا تھا۔ چنانچہ انسانی کردار کا بیان جس تفصیل و وضاحت سے مصنف آج کر سکتا ہے۔ پہلے کبھی نہ کر سکتا تھا۔

شادمان پاکستان
پاکستان کی اولین سالگرہ پر
K·L·M
کی طرف سے ہدیۂ تبریک
چند باتیں
کے ایل ایم : دنیا کی قدیم ترین ہوائی جہاز کی کمپنی ہے۔
کے ایل ایم : کے جہاز جدید ترین آلات سے مزین ہیں۔
کے ایل ایم : کے طیارے نہایت آرام دہ اور تیز رفتار ہیں۔
کے ایل ایم : کے جہاز ران سالہا سال کے تجربہ کار اور آزمودہ ہیں۔
کے ایل ایم : کے جہاز دنیا کے ہر گوشہ میں جاتے ہیں۔
کے ایل ایم : کے مسافروں کی دیکھ بھال کے لئے خوش مزاج اور مستعد عملہ ہر وقت حاضر رہتا ہے۔
چند کرایے
کراچی سے کلکتہ : ۳۶۰—۰—۰ روپے
کراچی سے بٹاویا : ۱۱۸۶—۱۱—۰ "
کراچی سے بصرہ : ۴۹۲—۵—۰ "
کراچی سے روم : ۱۳۳۴—۵—۰ "
کراچی سے ایمسٹرڈم : ۱۵۸۹—۱—۰ "
کراچی سے لنڈن : ۱۶۰۰—۰—۰ "
کراچی سے نیویارک : ۲۷۵۶—۰—۰ "
"کے ایل ایم" کو فخر ہے کہ پاکستان کے سربرآوردہ لوگ ہمیشہ اس کی سرپرستی کرتے ہیں۔
آپ بھی جب سفر کریں تو "کے ایل ایم" کو یاد رکھیے۔
اس کا سفر پر لطف، برق رفتار اور خطرات سے محفوظ ہے۔
مفصل معلومات اپنے کسی سفری ایجنٹ سے حاصل کیجئے یا براہ راست ہم سے
جنرل ایجنٹس: والکرٹ برادرس، میکلوڈ روڈ کراچی، ٹیلیفون ۲۴۲

نواب سید محمد آزاد

نئی ڈکشنری

(نئی ڈکشنری کے عنوان سے ذیل میں جو دلچسپ اقتباسات پیش کئے جارہے ہیں ان کے مصنف اودھ پنچ کے دورِ اول کے معروف قلمی معاون نواب سید محمد آزاد ہیں
نواب سید محمد آزاد کے متعلق یہ تو اکثر لوگ جانتے ہیں کہ ان کی طنز اور ظرافت کے تیز نشتروں نے انیسویں صدی کے آخری اور بیسویں صدی کے ابتدائی دنوں میں
مغربیت زدہ سوسائٹی کو اپنا نشانہ بنایا تھا، اور ان نشتروں میں اب بھی اتنی آب باقی ہے کہ اردو کی طنزیہ تاریخ لکھنے والا انھیں فراموش نہیں کرسکتا۔ لیکن یہ چیز شاید
بہت کم لوگوں کے ذہن میں محفوظ ہے کہ اس طنز و ظرافت کا مصنف مشرقی پاکستان کے دارالخلافہ میں پیدا ہوا اور وہیں پرورش پائی۔ نواب صاحب ۱۸۴۶ء میں
مشرقی بنگال کے ایک معزز خاندان میں، ڈھاکے میں پیدا ہوئے۔ وہیں تعلیم پائی۔ آپ کے مضامین اودھ پنچ، اودھ اخبار اور آگرہ اخبار میں چھپتے رہتے تھے۔
"نئی ڈکشنری" کے یہ چار الفاظ ان کی اس ڈکشنری سے ماخوذ ہیں جو وقتاً فوقتاً اودھ پنچ میں چھپتی رہتی تھی۔

۱۸۸۱ء میں نواب صاحب کا ایک ڈرامہ "نوابی دربار" شائع ہوا۔ نوابی دربار اب سے ۶۵-۷۰ برس پہلے کی ظرافت کا ایک نادر نمونہ ہے۔ کتاب اب بالکل نایاب
ہے۔ "ماہِ نو" وقتاً فوقتاً اس دلچسپ ڈرامہ کے اقتباسات ہدیۂ ناظرین کرتا رہے گا ——— مدیر)

پولیسی (حکمتِ عملی)

خیالی پلاؤ۔ صفت کرم داشتن۔ لہو لگا کے شہیدوں میں نام۔ ہنگامہ بے ہنگام۔
خودستائی۔ خود غرضی۔ وعدہ فراموشی۔ آشنا فراموشی۔ گیدڑ بھبکی۔ ہوائی بندوق کی آواز۔
ممبرانِ پارلیمنٹ کے آپس کا ناز و نیاز۔ کمزور کو دبانا، زبردست سے ڈرنا۔ اپنی قوت
خیالی کو مبالغے سے بیان کرنا۔ اپنے منھ میاں مٹھو۔ زبانی جمع خرچ۔ وقت کی پرستش۔
خیالی لڑائی میں حریف کو شکست دینے پر نازش۔ ہاں میں ہاں ملانا۔ مارتے کے آگے
اور بھاگتے کے پیچھے جانا۔ کسی کے جلتے ہوئے گھر سے تاپنا۔

آنر (عزت)

مفہوم خیالی۔ جی خوش کرنے کے لئے ایک موثر لفظ۔ لندن کے اخبار نویسوں کی
خامہ فرسائی کے لئے ایک نفیس تختۂ مشق۔ پھوٹی ہوئی ہانڈی۔ نقار خانے میں طوطی کی
آواز۔ عنقا۔ ایک قسم کا ولایتی کمپچر جو تالیفِ قلوب کو مفید ہے۔ نئی طرح کا ولایتی آلو، جو
کبھی زمین سے نکالا نہیں جاتا۔ اور جس کی بو سے لارڈ لیگوں کا دماغ معطر رہتا ہے۔

انٹرسٹ (حقوق)

وہ چیز جس کی حفاظت ضروری نہیں۔ ساری دنیا کو اپنا جاننا۔ ایک تسکل تصوری
دوسروں کو ڈرانے کے لئے قائم کرنا۔ ایک نازک ہڈی جس پر ایک محلے کے ایک ہی رنگ
اور نسل کے کتے اس ہیبت ناک طرح سے لڑیں کہ ان کی آواز سے دوسروں کے
ڈرنے کا احتمال ہو۔ ایک قسم کے تمدن کی مچھلی جو کبھی جال میں پھنستی نہیں۔ جنس کے جنگل کا
کالا خرگوش جس کی تلاش میں بہت سے امریکہ کے ڈاکٹر لگے ہوئے ہیں۔

تھینکس (شکریہ)

انگریزی معصوم لفظوں کا اولڈ بابا۔ خشک تحسین۔ خشک سلام۔ خشک احسان۔
وہ پائی[1] جس کے اندر صرف ہوا ہے۔ وہ لفظ جو دنیا بھر کو خوش کرنے کے لئے بامرف کسی
قسم کے ایک مجرب دوا ہے۔ وہ انعام جو سال بھر تک دل و دماغ کے خون کرنے کا
صلہ دیتا ہے۔ وہ تمغہ جو سیکڑوں کو جاں نثاری کی حسن خدمت کے عوض میں ملا ہے،
وہ پُر معنی لفظ جس نے حاتم دلوں کی سخاوت کی داد دی ہے۔ وہ کرامت کی پڑیا جس نے
بڑے بڑے بجاروں کے دل و دماغ کی جڑی ہے۔ وہ دولتِ لازوال جس کا تہیہ یا فتہ
دنیا میں بے انتہا خرچ ہے۔ وہ تسخیرِ قلوب کا نسخہ جو اکثر رجسٹری کاغذ کی پیشانی پر
درج ہے۔ خوش کرنے کا کم خرچ بالانشین آلہ۔ وہ رئیس بادشاہ مزاج جس کا جامہ
بغیر کمخواب اور زربفت کے درست نہیں ہوتا۔ وہ پُر تاثیر دعا کہ ہزار بلا کو زبان سے
نکلتے ہوئے ٹال دے۔ وہ تسخیر با تاثیر جو دم بھر میں دوست کو دشمن بنادے۔ وہ دم کل جو
کم ظرفوں کو دم بھر میں غرور اور عجب کے آبِ مصفا سے ربڑ کے تکیے کی طرح
پھلا دے، وہ قہقہہ انگیز زعفران کہ بافغانی کو ایک آن میں ہنسا دے

---

[1] ایک قسم کا انگریزی کھانا سرپوش کی صورت کا۔

فضل حق قریشی دہلوی

امیر الامرا نواب شائستہ خاں

اور

جنت البلاد ڈھاکہ

اسلام خاں کی بابت شہنشاہ جہانگیر نے اپنی ایک یادداشت میں لکھا ہے کہ:

"بچپن سے وہ میرے ساتھ پرورش پاتا اور بڑھتا رہا لیکن عمر میں مجھ سے ایک سال بڑا تھا۔ وہ اپنے خاندان بلکہ سارے قبیلے میں سب سے زیادہ بہادر و جوانمرد اور سب سے زیادہ ممتاز حیثیت کا انسان تھا۔ مجھے اس کی وفاشعاری کا لحاظ رکھتے ہوئے اسے "فرزند" کا خطاب دینا پڑا۔"

یہ بارش لطف و کرم اس شخص پر ہوئی جس نے ۱۶۰۸ء میں ڈھاکے پر مغلیہ حکومت کا پرچم لہرا کر اسے تاریخ میں پہلی بار سارے بنگال کا صدر مقام بنایا۔ اور افغانوں اور مغلوں کی باہمی چپقلش سے جو انتشار پیدا ہو گیا تھا، اسے دور کر کے امن و عافیت کی فضا قائم کی لیکن حقیقتاً وہ عظمت و شان نہ اسلام خاں کو نصیب ہوئی اور نہ اس کے بعد نائب السلطنت کے عہدے پر فائز ہونے والے ابراہیم خاں کو جو صرف شائستہ خاں کی قسمت میں لکھی تھی اور جس کا وہ صحیح معنوں میں مستحق تھا۔

اسلام خاں حضرت سلیم چشتیؒ کا پوتا اور ابراہیم خاں جہانگیر کی چہیتی بیگم ملکہ نورجہاں کا بہنوئی تھا، اس لئے فرمانروائے سلطنت کی نگاہ میں دونوں مقرب تھے۔ لیکن شائستہ خاں نے بادشاہ وقت کے ساتھ ساتھ عوام کے دل میں بھی گھر کر لیا تھا اور یہی اس کی شہرت اور ہر دل عزیزی کا سبب تھا۔ ابراہیم خاں کے عہد میں ڈھاکہ صنعت پارچہ بافی کا خاص مرکز بنا لیکن اس کی کوششوں کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ اچھے سے اچھا لباس صرف ملکہ نورجہاں کے لئے تیار ہو، تاکہ وہ اسے زیب تن کر کے بادشاہ کی نگاہوں میں ہمیشہ نور و سرور کی کیفیت پیدا کرتی رہے۔ شائستہ خاں نے پارچہ بافی کے علاوہ دوسری صنعتوں کی طرف بھی اپنی توجہ مبذول کی اور انھیں اس طرح فروغ دیا کہ عوام کے لئے سود مند ثابت ہوئیں اسی لئے اس کو مسلمانان بنگال کی تاریخ میں سب سے بلند مرتبہ حاصل ہے۔

امیر الامرا نواب شائستہ خاں حسب و نسب کے لحاظ سے بھی کوئی معمولی انسان نہیں تھا۔ دو پشت پہلے اس کے خاندان کو وہ عروج حاصل ہوا تھا جو خانوادۂ شاہی کے افراد کے بعد ساری مملکت میں کسی اور کو نصیب نہیں تھا۔ اس کے باپ اور دادا مغل حکومت میں وزیر اعظم کے عہدے پر فائز رہے تھے۔ وہ ملکہ نورجہاں کے بھائی آصف خاں کا بیٹا اور اعتماد الدولہ خواجہ غیاث کا پوتا تھا۔ اس کی بہن ملکہ ممتاز محل جس کی سب سے بڑی یادگار روضۂ تاج محل کی صورت میں آج تک جمنا کے پار ہند کی پیشانی پر جلوہ گر ہے شاہجہاں کی شریک حیات تھی۔ اس کی دو بھتیجیاں اورنگ زیب عالمگیر اور سلطان مراد خاں کے نکاح میں آئیں اور ایک بیٹی "پیری بی بی" اورنگ زیب کے لڑکے محمد اعظم کی منظور نظر تھی۔ اس کا دادا ملک تاتار کے ایک غریب گھرانے کا چشم و چراغ تھا لیکن عقل و فہم کے لحاظ سے وہ مفلس و قلّاش نہیں تھا۔ اسی لئے مغل دربار کے افق پر وہ اس طرح طلوع ہوا کہ بساط حکومت پر رکھے ہوئے باقی تمام مہرے اس کی تابانیوں کے سامنے گہنا کر رہ گئے۔ شائستہ خاں کو فہم و فراست اسی دادا سے ورثے میں ملی اور اس نے اس خاندانی میراث کو بڑی شائستگی کے ساتھ نبھایا اور اس میں اضافہ بھی کیا۔

شائستہ خاں سے قبل میر جملہ بنگال کا حاکم تھا۔ وہ صدر صوبہ خود سر اور مطلق العنان تھا۔ صوبے کے تمام افسران اعلیٰ اس کی مٹھی میں تھے۔ اسی لئے سرکاری روپے کے تصرف بے جا کے علاوہ رشوت ستانی اور ریاکاری کا بازار گرم تھا اور رعایا پر ظلم و ستم بھی روا رکھا جاتا تھا۔ اس کی ان ناشائستہ حرکتوں سے اورنگ زیب اس سے ہمیشہ ناراض رہتا تھا لیکن اس میں اُف کرنے کی ہمت تک نہیں تھی۔ سب جانتے تھے کہ اورنگ زیب بنگال کا برائے نام بادشاہ ہے وہاں کے لوگوں کو اس کا نام تک معلوم نہیں تھا۔ میر جملہ کل سیاہ و سفید کا مالک بنا بیٹھا تھا۔ چنانچہ جب ۱۶۶۳ء میں اس کا انتقال ہوا اور اس کے مرنے کی خبر دربار دہلی میں پہنچی تو سب نے محسوس کیا کہ اب بادشاہ صحیح معنوں میں بنگال کا بھی بادشاہ کہلا سکے گا۔ خود اورنگ زیب نے میر جملہ کے بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "تم اپنے رفیق باپ سے جدا ہو گئے اور میں اپنے شدید ترین اور سب سے زیادہ خطرناک دشمن سے نجات پا گیا۔"

اس کے بعد شائستہ خاں بنگال کا حاکم مقرر کیا گیا۔ اس کے کردار کی سب سے بڑی خوبی اس کی نیک نیتی تھی۔ شاہی خاندان سے قریبی [illegible]

عوام میں اتنا اقتدار حاصل ہونے کے باوجود دوسرے عقلمند لوگوں کی طرح خود مختار حکومت کی طبع اس کے حاشیۂ خیال میں بھی کوئی جھلک نہ دکھا سکی۔ اس اعتماد کو جو اس کے دادا نے اکبر اعظم کے دل میں قائم کیا تھا، اس نے شہنشاہ کے پوتوں کے دلوں میں بدستور قائم رکھا۔ چنانچہ اورنگ زیب جیسا سخت گیر اور شکی مزاج بادشاہ بھی اس پر کامل اعتماد رکھتے ہوئے اس کا ادب احترام کرتا تھا۔

اسے نائب السلطنت کے عہدے پر فائز ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ارض بنگال کی مشرقی سرحد پر بیک وقت کئی فتنے کھڑے ہو گئے، بحری ڈاکوؤں کی شورشوں کو ٹھنڈا کر دینا آسان کام تھا لیکن ایک طرف اراکان کے باج گزار راجہ نے علم بغاوت بلند کر دیا اور دوسری طرف چٹاگانگ کے آزاد قبائلی ہنگامے برپا کرنے لگے۔ شہ پانے کے علاوہ ان کو ہر قسم کی مدد ان پرتگالیوں کی طرف سے ملنے لگی جنہوں نے جزیرۂ سراندیپ کو ۱۶۵۵ء سے اپنا اڈا بنا کر حکومت بنگال کے خلاف سازشوں کا ایک سلسلہ قائم کر رکھا تھا۔ اس طرح شائستہ خاں کو بیک وقت تین چار محاذوں پر اپنی قابلیت کے جوہر دکھانے پڑے اور بڑی ہی خوش اسلوبی کے ساتھ اس نے جملہ شورشوں کو ختم کر دیا۔ اس مختصر دور انتشار سے قطع نظر اس کا تمام عہد نظامت کامل امن و سکون کی فضا میں بسر ہوا۔ اور یہ اس کے حسن عمل کا بیّن ثبوت تھا۔

ملک میں اچھی طرح نظم و نسق قائم کر دینے کے بعد اس نے صنعت و حرفت اور زراعت و تجارت کی طرف اپنی توجہ مبذول کی اور ہر شعبہ کو اتنی ترقی دی کہ مفلس و نادار رعیت خوش حال ہو گئی اور ساتھ ہی سلطنت کے مالیانے میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا جس سے قدرتی طور پر حکومت کی بنیادیں زیادہ مضبوط ہو گئیں۔ اس نے پرتگالیوں، انگریزوں، ولندیزیوں اور فرانسیسیوں سے جو ہگلی، بہری، ہرپور، چنسورا، چندر نگر اور سیرامپور وغیرہ میں چھوٹے چھوٹے کاروبار سنبھالے بیٹھے تھے، باقاعدہ تجارتی معاہدے کئے اور بنگال کی مصنوعات و پیداوار کو ان ملکوں میں بھیجا جانے لگا جہاں اس وقت تک ان کا صرف ذکر خیر ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ متمدن دنیا کا شاید ہی کوئی ملک ایسا ہو جہاں آب رواں، جامدانی اور شبنم کے تھان نہ پہنچے ہوں۔ یہاں تک کہ بھوٹان اور نیپال میں بھی ان اشیاء کی مانگ بڑھتی گئی جو زمین کا سینہ چیر کر یا دریا کی تہہ میں غوطہ لگا کر کان کن یا ماہی گیر برآمد کرتے تھے۔ ساحل کورومنڈل کے قریب آباد شہروں میں بنگال کا چاول اس قدر مرغوب ہوا کہ پیداوار کا زیادہ حصہ وہیں جانے لگا۔ اس چاول کا نرخ عموماً آٹھ من فی روپیہ ہوتا تھا۔ اس سے باہر جانے والی اشیا کی ارزانی کا

اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔

۱۶۶۸ء میں انگریزوں کے قدم اتنے بڑھے کہ انھوں نے خاص ڈھاکہ میں بیرونی تجارت کی ایک کمپنی کھول لی۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسرے ملک والوں نے بھی جرأت کی اور شائستہ خاں قومی ترقی کی خاطر سب کو اجازت دیتا گیا۔ اب ان کمپنیوں کے وجود نہیں، صرف آثار باقی ہیں۔ انگریزی کمپنی کی عمارت میں اس وقت شہر کا سب سے بڑا کالج قائم ہے۔ اس سے کچھ فاصلہ پر ڈھاکہ کے موجودہ نواب کا محل ہے جو کسی زمانے میں فرانسیسی کمپنی کا صدر مقام تھا۔ اسی طرح دریا کے کنارے ولندیزی کمپنی کی عمارت اسپتال کا کام دے رہی ہے۔

شائستہ خاں کی طرف سے ملی ہوئی ہر قسم کی مراعات کے باوجود رفتہ رفتہ انگریزی کمپنی کے ارباب حل و عقد کی نیت میں فرق آنے لگا۔ چنانچہ ۱۶۸۹ء میں انھوں نے سوچا کہ اپنے لئے ایک مستقل مورچہ بنا لینا ضروری ہے تاکہ اگر ضرورت ہو تو اس کے بل بوتے پر مغل حکومت کے خلاف جنگ شروع کی جا سکے۔ لیکن شائستہ خاں ان کی سیاسی حکمت عملی کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس نے کمپنی کے صدر کی درخواست کو ٹھکرا دیا جس نے دریائے گنگا کے دہانے کے قریب ایک قلعہ تعمیر کرنے کی اجازت اس بنیاد پر طلب کی تھی کہ اسے صدر مقام بناتے ہوئے ہم اپنے تجارتی دفتروں اور کارخانوں کی حفاظت کر سکیں گے۔

شائستہ خاں نے خوشنما عمارتیں بنوانے کی طرف بھی اپنی توجہ مبذول کی۔ اس نے مغل طرز تعمیر میں تھوڑی سی تبدیلیاں کر کے ایک نیا آرٹ پیدا کیا جو مخصوص انداز اور انوکھے پن کے باعث شائستہ خانی فن کہلانے لگا۔ بہت سی عمارتیں امتداد زمانہ کے ہاتھوں برباد ہو گئیں لیکن بعض ابھی تک برقرار ہیں چنانچہ اس کی بیٹی پیری بی بی کا مرمریں مقبرہ اس ضمن میں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ اس کے علاوہ چوک کے وسط میں بنی ہوئی شاندار مسجد بھی اس کی یاد تازہ کرتی ہے۔ اس نے اپنے عہد میں کم و بیش دو سو مسجدیں تعمیر کرائی تھیں۔

۱۶۶۴ء سے ۱۶۸۹ء تک چھ ماہ کے عارضی انقطاع کے ساتھ شائستہ خاں تقریباً پچیس سال تک بنگال کا حکمراں رہا۔ اس دوران میں اس نے اپنے صوبے کو بے پناہ ترقی کی راہوں پر لگایا، دربار شاہی میں زبردست عزت حاصل کی اور رعیت میں ایسی ہر دلعزیزی پائی کہ جب اکیاسی سال کی عمر میں اس نے اپنے عہدے سے الگ ہو جانا چاہا تو لوگ صدائے احتجاج بلند کرنے کے لئے مجبور تھے جب تک اس نے ان کو یہ یقین نہ دلا دیا کہ اب میں ضعیف العمر ہونے کے باعث اپنے فرائض منصبی کو خوش اسلوبی کے ساتھ پورا کرنے سے قاصر ہوں۔

اسے اس بات کا بڑا افسوس تھا کہ اس کے آخری عہد میں بعض چیزوں کے

(باقی صفحہ ۸۲ پر)

صدیق احمد صدیقی

ہماری ریاستیں

ہندوستان کی سیاسی اور اقتصادی زندگی میں ملکی ریاستوں کو ہمیشہ بڑی اہمیت حاصل رہی ہے تقسیم ہند سے پہلے ان کا وجود ہر چند کہ انگریزوں کا رہینِ منت رہا لیکن خود انگریزی حکومت کے مفاد کے لئے بھی ہندوستان کے ایک بڑے حصے کا خود مختار ہونا اور اپنی اندرونی ضروریات کا خود کفیل ہونا بہت ضروری تھا۔ اس زمانے میں اس سے ایک فائدہ تو یہ تھا کہ ان ملکی حکمرانوں کے ذریعہ انگریزی وقار کی حفاظت ہوتی رہتی تھی، دوسرے اس حفاظت کے لئے انگریزی حکومت کے مالیہ پر کوئی غیر معمولی بار نہیں پڑتا تھا اور اس طرح یہ دونوں جماعتیں ایک دوسرے کے کندھے پر ہاتھ رکھے آگے بڑھتی چلی جاتی تھیں۔

۱۵؍ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان کی تقسیم نے صورتِ حال بہت کچھ بدل دی۔ ایک برِّ اعظم دو خود مختار اور آزاد مملکتوں میں بٹ گیا اور ملک کی پرانی ریاستیں جغرافیائی اعتبار سے ان دو بڑی حکومتوں کے رقبوں میں گھر گئیں۔ کچھ ہندوستان کے حدود میں آئیں اور کچھ پاکستان کے حدود میں۔

۱۹۴۷ء کے آئین آزادی کی رو سے ان ملکی ریاستوں کو یہ حق حاصل تھا کہ اگر وہ چاہیں تو اپنی آزادی کو برقرار رکھ سکتی ہیں مگر اس حق کا استعمال ان ریاستوں کے لئے کہاں تک مفید یا مضر ثابت ہو سکتا ہے اس کا طے کرنا خود ان ریاستوں کے مصالح ملکی پر منحصر تھا۔ چنانچہ ہندوستان کی تمام ریاستیں سوائے حیدر آباد کے انڈین یونین میں شامل ہو گئیں اور پاکستان کی ریاستوں نے اپنا سیاسی رشتہ حکومت پاکستان سے جوڑ لیا۔

جو ریاستیں پاکستان کی مرکزی حکومت سے اپنا تعلق قائم کر چکی ہیں (اور کوئی ایسی ریاست اب باقی نہیں ہے جو شریک نہ ہو چکی ہو) ان کی اہمیت اس اعتبار سے بہت زیادہ ہے کہ ان میں سے اکثر پاکستان کی سرحد پر قائم ہیں اور اس لئے پاکستان کی حفاظت کرنا ان کا قانونی فرض ہو گیا ہے۔ جو اندرون ملک میں بھی ہیں، انکے عوام اور پاکستانی عوام کی زندگی میں ایک خاص قسم کی معاشرتی ہم آہنگی ہے اور یہ ہم آہنگی اس سیاسی رشتہ کی بنا پر زیادہ دیرپا اور زیادہ مفید ثابت ہو سکے گی جو پاکستان اور ان ریاستوں کے درمیان قائم ہو چکا ہے۔

جو ریاستیں پاکستان کے حدود پر واقع ہیں ان میں سب سے زیادہ اہم قلات، چترال اور بہاول پور ہیں۔

قلات اور چترال مغربی اور شمالی مغربی سرحدوں پر اور بہاولپور مغربی پاکستان کی مشرقی سرحد پر واقع ہے۔ ان ریاستوں کا جو منصبی فرض آج پاکستان کے سلسلے میں ہے وہ وہی ہے جو کل انگریزوں کے لئے تھا فرق صرف اتنا ہے کہ پاکستان کی حفاظت کرنے میں جو قوت محرکہ اس وقت وہاں کے رئیسوں اور عوام کو عامل بنا رہی ہے وہ شاید انگریزوں کے عہد میں مفقود تھی۔ اس زمانہ میں یہ انگریزوں کی قوت اور دولت تھی جس نے انہیں ہندوستان کی چوکیداری پر مجبور کر رکھا تھا مگر آج نہ پاکستان کی قوت انہیں مجبور کر رہی ہے اور نہ دولت۔ آج تو وہ اخوت اور آزادی کے اس نشہ سے سرشار ہیں جس میں ہر فرد اور ہر جماعت اپنی حفاظت کرنا اور اپنے ملک کو دشمنوں سے بچانا اپنی زندگی کا سب سے بڑا نصب العین قرار دے لیا کرتی ہے۔ میرے خیال میں اس جذبہ کو بیدار کر دینا پاکستان کی بہت بڑی کامیابی ہے۔

ہر چند کہ ان ریاستوں کی اقتصادی اور معاشرتی حالت کچھ زیادہ اچھی نہیں ہے تاہم اُمید ہے کہ اگر پاکستان سے ان کے تعلقات خوشگوار اور باہمی اعتماد و معاونت کے قائم رہے تو وہ دن زیادہ دور نہیں جب ان کی ترقی اعلیٰ ترین مدارج طے کرے گی۔

پاکستان کی ریاستیں یہ ہیں:۔ قلات، لاس بیلا، خاران، مکران، سوات، چترال، بہاولپور، خیرپور، پھلیرہ، اور جوناگڈھ۔ ان میں سے قلات کی ریاست ترپن ہزار نو سو پچانوے مربع میل (۵۳۹۹۵) کے رقبہ میں گھری ہوئی ہے اپنی معدنیاتی دولت میں پاکستان کے دوسرے رقبوں سے بہت آگے ہے۔ افسوس اس کا ہے کہ اب تک انگریزوں اور دوسری حاسد قوتوں نے کبھی اس خطے کی ترقی میں پوری دلچسپی نہیں لی ورنہ یہاں کے عوام جن کی تعداد ڈھائی لاکھ سے زیادہ ہے اور جن کا تناسب رقبہ کے لحاظ سے بھی بہت زیادہ کم نہیں، اپنی جفاکشی اور استقلال کی بدولت اب تک کہیں سے کہیں پہنچ چکے ہوتے ویسے تو یہ خطہ بظاہر بہت بنجر خشک اور غیر مزروعہ اراضیات سے بھرا ہوا ہے۔ پھر بھی کچھی، خاران، دشت اور مکران کے وہ علاقے جہاں کاریز (زمین کے اندرونی چشمے) یا دوسرے مقامی دریاؤں سے آب پاشی ہو سکتی ہے، اپنی سرسبزی اور انسانی محنت کی قدر آوری میں کسی تک بھی [illegible]

مظاہرہ کرتے نظر نہیں آتے۔ گیہوں، چاول، آلو، جو، جوار، کھجور، تمباکو، خربوزے اور تربوز کہ یہاں کیا پیدا نہیں ہوتے پھر بھی نہیں سبزی بھی اور سراوان کے علاقوں میں آڑو، آلو بخارا، بادام، انگور، سیب اور شہتوت کی اس قدر کثرت ہے کہ یہاں کی آبادی خود بھی اس سے مستفید ہوتی ہے اور بیرونِ منڈیات کو بھی فراہم کرتی ہے۔ شہتوت کی تو اس قدر کثرت ہے کہ کچھ عرصہ قبل مستونگ کے علاقے میں لوگوں نے ریشم سازی کی بھی داغ بیل ڈالی تھی۔ مگر اس وقت نہ تو مرکزی حکومت نے اس طرف توجہ کی اور نہ یہاں کے عوام میں اتنا شعور بیدار ہوا تھا کہ وہ اسے اپنے بل بوتے پر سنبھال سکتے۔ اس لئے مجبوراً حوصلہ جہالت کے سامنے سرنگوں ہو گیا اور ریشم کے کیڑے جو اس دولت و عشرت کا تانا بانا بنتے تھے، خود موت کے جال میں پھنس کر ختم ہو گئے۔

وہ زمینیں بھی جہاں باقاعدہ زراعت نہیں ہو سکتی، بیکار نہیں پڑی رہتیں۔ کچھ نہیں تو مویشی ہی پالے جاتے ہیں اور مویشی بھی ایسے جن کا اون ہزاروں ٹن کی مقدار میں ہر سال ریاست سے برآمد ہوتا اور وہاں کی دولت میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔

ان میدانی علاقوں سے نکل کر پہاڑوں کے دامن میں پہنچئے تو معدنیات کی بھی کمی نہیں۔ ستورے کے علاقے میں تو خیر کوئلہ تھوڑا بہت نکالا بھی جاتا ہے مگر چاغی اور ان کے خطے میں آہن آمیز گندھک، سکران کی سرزمین میں سیسہ اور شوران کی اراضی میں پٹرول، کچا لوہا، گندھک ایسی دولتیں ہیں جو اب تک زیرِ زمین دبی ہوئی ہیں، اور جن کے نکالنے کی کوئی اسکیم اب تک وجود میں نہیں لائی گئی۔

گھریلو صنعتوں میں بھی قلات کے لوگ اپنے ماحول کو دیکھتے ہوئے کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ کچھی اور براہوئی کی پارچہ بافی تو غیر مقامی شہرت رکھتی ہی ہے۔ قالین سازی، زرکاری اور چمڑے کے کام میں بھی ادھر سندھ اور ادھر مکران اور خلیج فارس کے ساحلوں تک ان کا کام اور نام پھیلا ہوا ہے۔ پھر سوزن کاری میں یہاں کی عورتوں نے جو مہارت پیدا کی ہے وہ تو دور دور اپنا جواب نہیں رکھتی۔

ریاست کے ذرائع آمدنی اب تک تین قسم کے رہے ہیں۔ ایک ذریعہ تو یہ تھا کہ حکومت برطانیہ کچھ رقم سالانہ دیا کرتی تھی اور دوسرا ذریعہ وہ منافع تھا جو ریاست کو بینکوں وغیرہ میں جمع شدہ سود سے ملا کرتا تھا۔ ان دونوں مدوں سے ریاست کی آمدنی تقریباً ایک لاکھ تیس ہزار روپیہ سالانہ کی ہو جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ریاست کی اندرونی کاشت اور پیداوار پر جو لگان ملتا ہے وہ بھی مختلف شکلوں میں جمع ہو کر کل پیداوار کا تقریباً نصف ہو جایا کرتا ہے۔ ان کے علاوہ جو ذرائع آمدنی ہیں مثلاً سامان کی درآمد برآمد، "زرکلان"، "زرسرخ" وغیرہ ان سب کی مجموعی رقم بھی اگر مذکورہ بالا آمدنی میں شامل کر لی جائے تو یہ سب چودہ لاکھ سے اوپر ہو جاتی ہے۔

ان تمام خصوصیات کے باوجود رنج اس کا ہے کہ آج تک یہاں تعلیم کا وہ چرچا نہ ہو سکا جو ان صلاحیتوں کو چار چاند لگا سکتا۔ گو ہز ہائی نس میر احمد یار خان، خان قلات خود اپنی جیب خاص سے پچاس ہزار روپے سالانہ اپنی رعایا کی مفت تعلیم کے لئے عطا فرماتے ہیں۔ مگر آج کی دنیا میں عوام کی تعلیم انفرادی زر پاشیوں سے کامیاب نہیں ہو سکتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ جہل آج سے دو ہزار برس پہلے جس طرح زمین گیر تھا ویسے ہی آج بھی گھر کیا رہتا ہے۔ اور جو سوئی جس انداز سے سینکڑوں برس پہلے ہمارے اجداد کے کپڑوں میں ٹانکے لگاتی تھی ویسے ہی آج بھی لگاتی ہے۔ آپ چاہیں تو اسے وضعداری بھی کہہ سکتے ہیں مگر زمانہ کا مورخ اسے ہمیشہ جمود کے نام سے یاد کرے گا۔

اسی ریاست کے جنوب مشرق میں ایک دوسری ریاست لاس بیلا واقع ہے جو اپنے رقبے، آبادی اور آمدنی تینوں کے اعتبار سے بہت چھوٹی ہے۔ پیداوار ابھی خاصی ہو سکتی ہے مگر اس کے لئے حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے۔ کیونکہ تقریباً سات ہزار مربع میل کا رقبہ جو پوری ریاست پر مشتمل ہے، دریائے حب اور پورالی کی وادی اور ڈیلٹا پر پھیلا ہوا ہے۔ مگر یہاں کے کاشتکار اس درجہ غریب اور فرسودہ خیال ہیں کہ ان سے موجودہ حالات کے ماتحت پیداوار میں اضافہ کی توقع کرنا غلط ہے۔ پھر بھی اٹھتر ہزار کی آبادی میں پانچ لاکھ روپیہ سالانہ کی آمدنی کا جمع ہو جانا اس امر کی دلیل ہے کہ اگر ان کی حالت سدھاری جائے تو ترقی کے بہت زیادہ امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔

قلات کے جنوب میں کوئی ساڑھے اٹھارہ ہزار مربع میل کی ایک اور ریاست ہے خاران، ویسے تو یہ ریاست قلات ہی کے ماتحت ہے اور یہاں کی طبعی اور زرعی حالات بھی بالکل وہی ہیں جو قلات کے ہیں۔ پھر بھی اس کا نظم و نسق ایک خود مختار رئیس نواب حبیب اللہ خان کے ہاتھ میں ہے۔ یہ نوشیروانی خاندان کے ایک فرد ہیں اور ان کا خانوادہ پرانے حکمرانانِ کیانی کی ایک شاخ ہے جو کسی زمانہ میں ایران پر حکومت کیا کرتے تھے اور جن کی تاریخ پر فردوسی کا شاہنامہ مبنی ہے۔

بلوچستان کی ان ریاستوں سے نکل کر شمال کی طرف بڑھئے تو وہاں تین ریاستیں دیر، سوات اور چترال کے نام سے ملیں گی۔ ان میں سے چترال پاکستان کے شمال مغربی کونے پر واقع ہے۔ اس کا رقبہ تقریباً چار ہزار مربع میل ہے مگر سارا خطۂ زمین اتنا ترو تازہ اور شاداب ہے کہ غلہ کی قسم سے شاید ہی کوئی ایسی چیز ہو جو یہاں نہ پیدا ہوتی ہو۔ پھر جنگلات کی لکڑی اور باغات کے پھل ریاست کی مزید آمدنی کا مستقل ذریعہ ہیں۔ آمدنی، آبادی اور رقبہ کا تناسب یوں ہے کہ چار ہزار مربع میل میں اسی ہزار انسان بسے ہوئے ہیں اور اسی ہزار روپیہ سالانہ کی آمدنی ہے۔ یہاں کے لوگ

زرگری اور خنجر سازی میں بھی بہت مشہور ہیں۔ چنانچہ ان کی ہنرمندی سے خانہ ساز اشیا کی برآمد پر جو آمدنی ہوتی ہے وہ ریاست کی سالانہ آمدنی کا ایک بڑا جزو ہے۔ لوہے اور تانبے کی کانیں بھی یہاں موجود ہیں مگر انہیں بالائے زمین لانے کا کوئی خاکہ ابھی تک نہ خود ریاست کے سامنے ہے اور نہ پندرہ اگست سے پہلے انگریزی حکومت کے ذہن میں تھا۔ ممکن ہے اب سیاسی آزادی حاصل ہونے کے بعد پاکستان اور چترال کی باہمی معاونت سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ اس سلسلے میں نکل سکے۔

بقیہ دو ریاستیں دیر اور سوات ہیں جن کا مجموعی رقبہ کوئی چھ ہزار مربع میل ہے۔ ان کی زرعی پیداوار دریائے پنجکوڑا، اور دریائے سوات پر منحصر ہے۔ ویسے تو یہ دریا کافی بڑے ہیں مگر پہاڑی علاقہ میں واقع ہونے کی وجہ سے ان سے آبپاشی کا وہ کام نہیں لیا جا سکتا جو میدانی علاقوں میں ان کے مقابلہ میں چھوٹے دریاؤں سے لیا جا سکتا ہے۔ البتہ جنگلات کم نہیں ہیں اور دیر کوہستان کی لکڑی بڑی مقدار میں باہر بھیجی جاتی ہے۔ پھلوں کی پیداوار اور برآمد بھی زیادہ ہوتی ہے اور ان ریاستوں کی آمدنی کا بڑا حصہ اسی تجارت سے حاصل ہوتا ہے۔

یوسف زئی قبیلے کے لوگ دیر میں حکومت کرتے ہیں اور زیادہ تر آبادی اسی قبیلے کے افراد کی ہے۔ البتہ سوات میں آکازئی، تورُوال اور گرامو لوگوں کی بھی آبادی ہے۔ لیکن یہ ریاست کے مختلف حصوں میں بٹے ہوئے ہیں

سرحدی ریاستوں کو چھوڑ کر سندھ کی وادی میں آئیے تو یہاں بھی ایک چھوٹی سی ریاست ملتی ہے جس کا نام ہے امب۔ یہ دریائے سندھ کی بالائی وادی میں واقع ہے جس کا رقبہ دو سو پچیس مربع میل سے زیادہ نہیں، اور ذریعہ آمدنی عموماً کاشتکاری ہے۔ اسی کے قریب تناول کے علاقہ میں پھلیرہ کی بھی ایک چھوٹی سی ریاست قائم ہے جس میں کل اٹھانوے کے قریب گاؤں آباد ہیں اور آبادی کوئی آٹھ ہزار کے لگ بھگ ہے۔

ان ریاستوں سے مشرق کی طرف بڑھیے تو پھر ایک بہت بڑی ریاست ملتی ہے جس کا نام ہے بہاولپور۔ تقسیم ہند کے بعد پنجاب کی تمام ریاستوں میں سے صرف یہی ایک بڑی ریاست ہے جو پاکستان میں شریک ہوئی ہے۔ یہ مغربی پنجاب کے جنوب مغرب میں واقع ہے اور سترہ ہزار چار سو چورانوے مربع میل پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس ریاست کا وسطی اور مغربی حصہ دریائے ستلج کی نہروں اور دریائے سندھ کے سیلابوں سے سیراب ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کی آبادی بہت گنجان ہو گئی ہے اور ریاست کے سالانہ مالیہ کا سب سے زیادہ بوجھ اسی علاقہ پر پڑتا ہے۔ چونکہ پیداوار میں کافی تنوع اور کثرت ہے۔ مثلاً گیہوں، روئی، چنا، گنا، پھل اور دوسری چیزیں بڑی مقدار میں پیدا ہوتی ہیں اس لئے ان کی برآمد سے ریاست کی آمدنی میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے۔ پھر معدنیات کے اعتبار سے بھی یہ ریاست غریب نہیں ہے۔ سامان عمارت کے لئے منچن آباد کی تحصیل میں کنکر بہت نکلتا ہے۔ کاربونیٹ آف سوڈا اور شورا خیرپور اور منچن آباد کی تحصیلوں میں خاص طور سے تیار کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ چمڑے، لوہے، پیتل اور تانبے کی اشیا بھی کثرت سے بنائی جاتی ہیں۔ ان تمام چیزوں کی پیداوار، صنعت و حرفت اور تجارتی برآمد سے جو رقم ہر سال ریاست کو حاصل ہوتی ہے اس کی مقدار تین کروڑ پچیس لاکھ سالانہ سے کم نہیں ہوتی۔ اب اس رقم کو یہاں کی آبادی کے تناسب سے جانچئے جو صرف تیرہ لاکھ اکتالیس ہزار ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ریاست کے لوگوں کو کتنا خوشحال ہونا چاہیئے۔

بہاولپور کے والیان ریاست خلفائے عباسیہ کے اس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جو مصر پر حکومت کرتا تھا۔ ان لوگوں نے ریاست کی فلاح و بہبود میں کافی حصہ لیا ہے۔ چنانچہ ابھی حال میں ریاست کی طرف سے جو رپورٹ شائع کی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کی اقتصادی ترقی کتنی روز افزوں ہے۔ اگر آمد و خرچ کا یہ تناسب بھی باقی رہے جو گذشتہ سال تھا یعنی تین سو چھیاسی لاکھ کی آمد میں سے تین سو چھبیس لاکھ کا خرچ۔ تو یقین کیا جا سکتا ہے کہ بہت جلد ریاست کے عوام ترقی کی دوڑ میں بہت آگے نکل جائیں گے بشرطیکہ ان کی تعلیمی ترقی کو پوری طرح ملحوظ رکھا جائے۔

سندھ کے صوبہ میں صرف ایک ریاست ہے خیرپور جو پاکستان میں شامل ہو چکی ہے۔ اس ریاست کے مشرقی ڈانڈے ہندوستانی ریاستوں یعنی جودھپور اور جیسلمیر کے مغربی حصوں سے ملتے ہیں اور اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ ریاست بھی پاکستان کی سرحدی ریاستوں میں سے ایک ہے۔ خیرپور کا رقبہ کوئی چھ ہزار مربع میل ہے جو صوبہ سندھ کے شمالی حصے میں واقع ہے یہاں کی زمین زرخیز ہے اور آبپاشی سکھر بیراج کی نہروں سے ہوتی ہے۔ چنانچہ پیداوار میں بڑا تنوع پیدا ہو گیا ہے۔ گیہوں، روئی، تمباکو اور دوسرے قسم کا موٹا اناج کثرت سے پیدا ہوتا ہے اور باہر بھیجا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ ریشمین پارچہ بافی، قالین سازی، ظروف سازی اور ملمع کاری میں لوگوں کو اچھی مہارت ہے اس لئے ان گھریلو صنعتوں کی وجہ سے بھی ریاست کو کافی آمدنی ہو جاتی ہے۔ کل آبادی یہاں کی تین لاکھ سے زیادہ ہے مگر چونکہ زمین

زرخیز ہے اور لوگ محنتی ہیں اس لئے ریاست کا خزانہ سال بھر میں تقریباً باون لاکھ روپیہ جمع کر لیتا ہے۔ یہ تمام ریاستیں تو وہ تھیں جنہوں نے پاکستان میں شرکت کی اور اب تک شریک ہیں مگر ان کے علاوہ ایک ریاست اور بھی ہے جس نے پاکستان کے دامن سے اپنا دامن سی تو لیا مگر غیروں کی دست درازی اور جانبداری سے محفوظ نہ رہ سکی۔ یہ ہے ریاست جوناگڈھ۔

کاٹھیاواڑ کے مغرب میں ہلاد گو ڈھل داڑ پرانت اور بحر عرب سے گھری ہوئی ۱۱،۱ مربع میل کی ایک مسلم ریاست گویا بتیس دانتوں کے بیچ میں ایک زبان۔ شامل ہونے کو تو پاکستان میں شامل ہو گئی مگر اس آئینی حق کا استعمال اپنی جان پر کھیل جانے کا مترادف ہو گیا۔

زمین کی زرخیزی، دریاؤں کی کثرت، بری اور بحری وسائل آمد و رفت کی آسانیاں ذرائع آمدنی کا تنوع۔ آٹھ لاکھ انسانوں کی گنجان آبادی ایک کروڑ سر اور کی سالانہ آمدنی یہ ساری ایسی چیزیں ہیں جنھوں نے اس ریاست کو ہندوستان اور پاکستان کے لئے ایک بڑے نزاع کا مسئلہ بنا دیا ہے۔ ریاست آئینی طور پر پاکستان میں شامل ہو گئی لیکن ہندوستان نے اس پر قبضہ کر کے وہاں کے حکمران کو شہر بدر کر دیا۔ پاکستان آئین شرافت اور قانون سیاست کا پابند ہے اور اسی لئے یو۔ این۔ او کے فیصلہ کا منتظر۔

امیر الامرا نواب شائستہ خاں

بقیہ صفحہ ۴۷

نرخ اٹھ چلے تھے۔ مثال کے طور پر چاول ایک روپیہ کا آٹھ من فروخت نہیں ہوتا تھا چنانچہ اس کا آخری فرمان یہ تھا کہ شہر کا مغربی دروازہ جس میں سے گزر کر میں دہلی واپس جا رہا ہوں بند کر دیا جائے اور میرے بعد مقرر ہونے والے حاکم اسے نہ کھولیں تا وقتیکہ چاول ایک روپے کا آٹھ من نہ بکنے لگے۔ اس کے چلے جانے کے بعد سینتالیس سال تک وہ دروازہ بند رہا اور جب سرفراز خاں کے عہد میں صوبے میں خوش حالی ایک بار پھر بڑھ گئی اور چاول پرانے نرخ پر فروخت ہونے لگا تو مغربی دروازے کے پٹ کھول دیے گئے۔ یہ دروازہ آج بھی کھلا ہوا ہے حالانکہ چاول ایک روپے کا آٹھ من تو کیا آٹھ روپے کا ایک من بھی نہیں ملتا۔

ڈھاکے سے رخصت ہونے کے پانچ سال بعد چھیاسی سال کی عمر میں شائستہ خاں بمقام آگرہ فوت ہوا۔ مورخین کا خیال ہے کہ جتنی پرسکون زندگی اس نے پائی مغل خاندان کے کسی فرمانروا کو بھی میسر نہ آ سکی۔

غزل

جلیل قدوائی

تری جفا بخدا باعثِ گزند نہیں
مذاقِ عشق ترا کچھ مگر بلند نہیں

نیازِ حسن کے قابل تو میں نہیں لیکن
یہ کس طرح سے کہوں میں نیازمند نہیں

اسے خبر نہیں کیا شے ہے عشرتِ ابدی
جو تیرے دردِ محبت سے بہرہ مند نہیں

نہ جانے کیوں دلِ عاشق میں ہو گئی پیوست
وہ ادا جو اسے خود بھی کچھ پسند نہیں

نہیں کہ شرم و حیا وصف خاص ہے اسکا
کہ بے حجابی و شوخی میں بھی وہ بند نہیں

ہزار کام ہیں ایسے جنھیں میں کرتا ہوں
اگرچہ دل سے مجھے ایک بھی پسند نہیں

ستانے والوں سے اپنے یہ پوچھتا ہوں جلیل
تمہارے سینوں میں کیا قلبِ دردمند نہیں

سیماب اکبرآبادی

ماہِ نو

اے مسافر! تجھکو آتی ہی نہیں منزل رسی
بے تعین جانب ہر رہگزر جاتا ہے تو
خندہ زن ہوتی ہیں وہ سمتیں جدہر جاتا ہی تو
مضطرب، وا ماندہ، آشفتہ نظر جاتا ہے تو
اپنی منزل پر پہونچتا ہے تو مرجاتا ہے تو
عبرتِ چشم تماشا ہے یہ تیری بے کسی!

جانبِ منزل رواں ہی کارواں درکارواں
اک حُدی خواں، اک رجز خواں ایک رہبر چاہئے
ایک محمل، اک جرس، اک کیسۂ زر چاہئے
خواب نوشیں کیلئے اک نرم بستر چاہئے
خوانِ نعمت چاہئے، آبِ مقطر چاہئے
اس تکلف پر بھی تجھ پر راہِ منزل ہو گراں!

ماہِ نو کو دیکھ، جو ہر وقت ہے گرمِ سفر
منزلیں کرتا ہی طے اپنی کس آسانی کے ساتھ
خامشی، قائم مزاجی، نورافشانی کے ساتھ
سادگی، سادہ روی و سادہ سامانی کے ساتھ
خندہ روئی، خندہ چشمی، خندہ پیشانی کے ساتھ
ایک لمحہ بھی نہیں رکتا میانِ رہگزر

ہے نظامِ فطرتِ کبریٰ اُسے جکڑے ہوئے
منزلِ اُولیٰ میں یوں ہوتا ہی وہ نظارہ تاب
جیسے سہوًا اک دوشیزہ کا سرک جائے نقاب
نصف منزل پر پہونچتا ہی تو آتا ہے شباب
بحر و بر میں اس سے ہوجاتا ہی پیدا انقلاب
دامنِ فطرت مگر رہتا ہی وہ پکڑے ہوئے

انتہا سے ابتدا ہے، ابتدا سے انتہا
ہر کمالے را زوالے، ہر زوالے را کمال
ہو کمال انجام جسکا، ہی مبارک وہ زوال
مستقل ہی تو زوال اندوز، تیرا ہے یہ حال
ماہِ نو سے سیکھ لے منزل رسی کی کوئی چال
کر مرتب کوئی دستورِ رہِ منزل نیا

اپنے آئینِ کہن میں کرکے پیدا انقلاب
راہِ منزل کو نئی تدبیر سے آساں بنا
سادگی و سادہ کاری کو سر و ساماں بنا
پاک کرکے پہلے اپنے دل کو پاکستاں بنا
عزمِ پاکیزہ سے پھر اس میں نئے ارماں بنا
"ماہِ نو کی شان سے منزل میں ہو جا باریاب

ساغر نظامی

اتحاد

دامِ نفرت سے ہوئے نازشِ دوراں آزاد
کہ تنفّر پہ نہیں فطرتِ ہستی کا مدار
کس کو بخشا ہے یہاں جذبۂ نفرت نے سکوں
کہ تجھے آئے گا اس آگ کے پہلو میں قرار
ناتواں حسرتِ تعمیر نے پالا ہے جسے
ہے یہی جذبۂ نفرت مدنیّت کا مزار
اور یہی جذبۂ نفرت جو محبت بن جائے
تیری جلتی ہوئی دنیا میں پھر آجائے بہار
کنجِ گل میں یہ چہکتے ہوئے معصوم طیور
جن کے نغموں سے ہے ایوانِ ترنم گلزار
لالہ و گل کی خموشی کے حریفِ ناطق
یہ پَر و بال کے بربط یہ فضاؤں کے ستار
مل کے گاتے ہیں تو شاہیں کا جگر ہلتا ہے
ساتھ اُڑتے ہیں تو ہوتا ہے قفس زیرِ غبار
خار و گل ایک ہی ٹہنی پہ بسر کرتے ہیں
بادۂ قرب سے سرشار ہیں اضدادِ بہار
جوئے پُرجوش میں موجیں ہیں رواں دوش بدوش
جرم ہے انکی خدائی میں جدائی کا شعار
گر برسنا ہے تو مل جل کے برس ابرِ کمال
کوئی سنتا نہیں بکھری ہوئی بوندوں کی پکار

یہ پَرا باندھ کے مرغابیوں کی غوطہ زنی
سینۂ آب پہ یہ سوزِ اخوت کے شرار
غول در غول بیاباں میں یہ ہرنوں کا خرام
سوچ اس قافلۂ رم کے رموز و اسرار
سوزِ قربت سے دہکتے ہیں ستاروں کے کنول
کششِ قرب سے ہے محفلِ انجم کی بہار
قطرے ملتے ہیں تو ہوتا ہے سمندر پیدا
وصلِ ذرات کا مرہون ہے طغیانِ غبار
صدیوں پیوستگیٔ خاک نے پایا ہے فروغ
مستقل قرب کا سنگین عمل ہیں کہسار
مل کے ہنستے ہیں تو بنتا ہے چمن بزمِ نجوم
کہیں اک جگنو سے ہوتا ہے چراغانِ بہار
کاٹ دیں وقت نے نادان عصبیت کی جڑیں
صرف اک واہمہ ہے نفرتِ قومی کا شعار
آدمی کے لئے آساں نہیں انساں سے گریز
زندگی کے لئے ممکن نہیں ہستی سے فرار
اس طرح کہنہ عقائد کا ہے ذہنوں میں ہجوم
جیسے طوفاں کے پچھاڑے ہوئے کھوکھل اشجار
دامِ نفرت سے ہوئے نازشِ دوراں آزاد
کہ تنفّر پہ نہیں فطرتِ ہستی کا مدار
کس کو بخشا ہے یہاں جذبۂ نفرت نے سکوں
کہ تجھے آئے گا اس آگ کے پہلو میں قرار

خاطر غزنوی

موضوع

جھکے جھکے ہوئے رنگین مناظر کا ہجوم
بہکی بہکی ہوئی نظروں کا جہانگیر فسوں
رہگذر روشن میں یہ بھٹکے ہوئے مخمور نجوم
کیسا موضوع رہے گا یہ مری نظموں کا ——؟
یہ نہیں —— اور کوئی

وحشت انگیز ڈھلانیں، یہ چمکتے ٹیلے
چیل کے اونچے درختوں کی یہ بڑھتی ہوئی بیل
بلبلیں یا کوئی دیوانہ جو بے حد پی لے
کیسا موضوع رہے گا یہ مری نظموں کا ——؟
یہ نہیں —— اور کوئی

غم و آلام سے آزاد چلا آتا ہے
تانیں بنسی کی اڑاتا ہوا اک چرواہا
تیر نغموں کے مری روح پہ برساتا ہے
کیسا موضوع رہے گا یہ مری نظموں کا ——؟
یہ نہیں —— اور کوئی

اُلجھی اُلجھی ہوئی راہوں کے تقاضوں کی قسم
رکشا والوں کے پسینے سے لہو رستا ہے
اور پھر بھی انھیں دیکھا نہیں میں نے بے دم
کیسا موضوع رہے گا یہ مری نظموں کا ——؟
یہ نہیں —— اور کوئی

اپنے رنگین، حسیں ماضی کی ضو دیتے ہوئے
راکھ اور اینٹوں کے کچھ ڈھیر یہ ویران کھنڈر
کسی جلتے ہوئے احساس کی لَو دیتے ہوئے
کیسا موضوع رہے گا یہ مری نظموں کا ——؟
یہ نہیں —— اور کوئی

آدمیت انھیں کھنڈرات میں دم توڑ چکی
مرے [illegible] سے اس دیس کی تہذیب کا دل
راکھ اور اینٹوں کے ان ڈھیروں میں سر پھوڑ چکی
ہاں یہ کھنڈرات ہی موضوع ہیں مری نظموں کے
اب یہ ویرانے مری نظموں کے عنواں ہوں گے

آرزو لکھنوی

غزل

کھل کر بھی وہ راز ہی رہتا ہے۔ جو راز چھپایا جاتا ہے
آجاتا ہے بیبس میں آنسو کے۔ جو نالہ دبایا جاتا ہے

الزام جفا کا شمع پہ کیوں محفل میں لگایا جاتا ہے
خود جلنے آتا ہے پروانہ۔ یا لا کے جلایا جاتا ہے

کویل جو بکا یک کوک اٹھی۔ دل میں بھی اچانک ہوک اٹھی
کیا میرا ہی درد بھرا قصہ۔ مجھ سے دہرایا جاتا ہے

دل تیرے تلون کے ہاتھوں۔ ہے ایک کل بازی گویا
نظروں سے گرایا جاتا ہے۔ پلکوں سے اٹھایا جاتا ہے

جب ظلم میں لذت ملنے لگی۔ توبہ کی اس نے جفا سے بھی
جو آگ سے کھیلا کرتا تھا۔ بے آگ جلایا جاتا ہے

اس بزم کی گہما گہمی کے۔ آئین ہیں کیا الٹے سیدھے
روتے کو ہنسایا جاتا ہے۔ ہنستے کو رلایا جاتا ہے

گو طور ہوا سرمہ جل کر۔ روشن تو ہوا یہ ہر اک پر
مسلا ہوا اُن کے تلووں کا۔ آنکھوں سے لگایا جاتا ہے

کھولے ہیں یہ شکووں کے دفتر کچھ دل کی بھڑاس نکلنے کو
او کہہ کے مکر جانے والے تو کیوں گھبرایا جاتا ہے

بھرتی ہے جو آنکھوں میں اک جلوے کی نظارہ سوزی
رکتے رکتے ڈرتے ڈرتے پردہ سرکایا جاتا ہے

حفیظ جالندھری

غزل

لب شکر چارہ ساز کا نغمہ لئے ہوئے
دل دردِ جانگداز کا شکوا لئے ہوئے

اب اشتیاق عرضِ تمنا نہیں رہا
اب ہر کوئی ہے عرضِ تمنا لئے ہوئے

میری یہ زندگی ہے کہ مرنا پڑا مجھے
اک اور زندگی کی تمنا لئے ہوئے

ساقی ہے آج کون کہ ہر کوزۂ سفال
آتا ہے ایک نور کا دریا لئے ہوئے

دریا سے موج اٹھی سوئے دریا پلٹ گئی
مجھ کو لئے ہوئے میری توبہ لئے ہوئے

پروانہ دل لئے ہوئے جل جائے بھی تو کیا
جلتی ہے شمع صورتِ زیبا لئے ہوئے

یہ لن ترانیاں ہیں تو اب کون آئے گا
بیٹھے رہو گے برق تجلی لئے ہوئے

پیشِ خدا چلا ہوں فرشتے ہیں ساتھ ساتھ
ساغر لئے ہوئے کوئی مینا لئے ہوئے

احباب ہی نہیں ہیں تو کیا زندگی حفیظ
دنیا چلی گئی مری دنیا لئے ہوئے

(بہ اجازت ریڈیو پاکستان)

جگر مرادآبادی

غزل

جمال اس کا چھپائے گی کیا بہارِ چمن
گلوں سے دب نہ سکی جس کی بوئے پیراہن

جہانِ حسن کو بھی جس نے کر دیا بیدار
خوشا وہ سینۂ اہلِ فراق کی دھڑکن

یہ مرحلہ بھی میری حیرتوں نے دیکھ لیا
بہار میرے لئے اور میں تہی دامن

ابھی ہے دل کو مقامِ سپردگی سے گریز
اک اور بھی ہے گیسوئے عنبریں میں شکن

خرد حقیقتِ چالاک و چست و سست خرام
جنوں صداقتِ بیباک و مصلحت دشمن

جنوں کی بے سروسامانیوں پہ رنج نہ کر
اگر جنوں ہے سلامت ہزار ہا دامن

مقامِ عشق کی نیرنگیاں نہ پوچھ جگرؔ
کمالِ آگہی و سخت آگہی دشمن

اثرؔ لکھنوی

غزل

سب دل کی دھڑکنیں سمٹ آئیں نگاہ میں
وہ لذتیں بھری ہیں ستم گر کی چاہ میں

وارفتگیٔ شوق کے قربان جایئے
اپنی بلائیں لی ہیں ترے اشتباہ میں

تجھ کو خبر بھی ہے کہ ترے غم کشوں نے آج
کارِ وفا تمام کیا ایک آہ میں

نظارہ ہے کہ موجِ نسیم سبک خرام
شاید پہنچ گیا ہوں تری جلوہ گاہ میں

اللہ ری دلربائی اندازِ نقشِ پا
نرگس کے پھول کھل گئے ہر سمت راہ میں

دیوانۂ خرام ہوں اک مستِ ناز کا
زنجیرِ موجِ گل کی ہے پائے نگاہ میں

خطروں سے ڈھونڈھتا تھا پناہ ایکدن اثرؔ
خطروں سے کہہ دو آئیں اب اس کی پناہ میں

اختر شیرانی

اُمیّد

(سانیٹ)

نہ رو، نہ روکہ چمن کی بہار ختم ہوئی
فضائے باغ میں چلنا صبا نے چھوڑ دیا
کلی کلی پہ مچلنا صبا نے چھوڑ دیا
وہ فصلِ خندہ گر و خوشگوار ختم ہوئی!

نہ رو، نہ روکہ مری لالہ رُخ وطن سے گئی!
وہ رات دن کی ملاقات اب تو خواب ہوئی
وہ پیار، پیار کی ہر بات اب تو خواب ہوئی
برنگِ گل وہ مری گلبدن چمن سے گئی!

نہ رو، نہ روکہ بس اب دورِ جام رخصت ہے!
خزاں نصیب ہوئیں ماہتاب کی راتیں
کبھی نہ آئیں گی حسن و شباب کی راتیں
کہ موسمِ قدحِ لعل فام رخصت ہے!
دلِ حزیں یہی ایام پھر بھی آئیں گے!
بہار و لالہ رخ و جام پھر بھی آئیں گے!

حفیظ ہوشیارپوری

غزل

قصۂ غم تری محفل میں گذر ہو تو کہوں
رُخ تری چشمِ توجہ کا اِدھر ہو تو کہوں

میری حالت پہ نہ جا، یوں بھی ہوا کرتا ہے
پوچھنے والے کوئی بات اگر ہو تو کہوں

کون سی، کس کی ادا، کیوں مجھے آئی ہے پسند؟
کہیں آسودہ مرا ذوقِ نظر ہو تو کہوں

غمِ ہستی سے بھی ممکن ہے مفر کی صورت
میری آغوش میں وہ رشکِ قمر ہو تو کہوں

کیوں ملاقات سرِ راہ گذر ہوتی ہے
اب ملاقات سرِ راہ گذر ہو تو کہوں

دل میں جو بات چھپا رکھی ہے اک مدت سے
جذبۂ شوق ہم آہنگِ اثر ہو تو کہوں

کیوں نہیں تجھ کو خبر میری پریشانی کی
خود فراموش! تجھے اپنی خبر ہو تو کہوں

ذرّے ذرّے سے سرِ راہ جو باتیں کی ہیں
اتفاقاً کبھی تیرا بھی گذر ہو تو کہوں

راز کی بات جو آئی نہ لبِ موسیٰ تک
طور پر جلوہ ترا بارِ دگر ہو تو کہوں

ہائے وہ بات کہ ہے منتظرِ پیکِ اجل
منزلِ زیست سے اب میرا سفر ہو تو کہوں

کس طرح میں نے گذاری ہے شبِ ہجر حفیظ
کہیں میری شبِ ہجراں کی سحر ہو تو کہوں

ڈاکٹر تاثیر

غزل

مرے کلام میں حرص و ہوس کی بات نہیں
ہر اک یہ کہتا ہے دو چار دس کی بات نہیں

قدم قدم پہ کمندیں یہاں وہاں صیاد
یہ روئداد چمن ہے قفس کی بات نہیں

یہ تیرا حال ہے، یہ میری "آپ بیتی" ہے
یہ عندلیب و گل و خار و خس کی بات نہیں

سنو تو اہلِ وفا تم کو کیا نہیں کہتے
سخن طرازیٔ اہلِ ہوس کی بات نہیں!

وہ گالیاں مجھے دیتے ہیں اور کیا دیتے
یہ اقتضائے طبیعت ہے بس کی بات نہیں

سزا، عذاب، جہنم کی آگ، اُف توبہ!
نہیں نہیں یہ مرے دادرس کی بات نہیں

وہ کہلواتا ہے تاثیر تو میں کہتا ہوں
ہنر کا کھیل نہیں دسترس کی بات نہیں

ذوالفقار علی بخاری

غزل

دہرِ مرگ ساماں میں زندگی غنیمت ہے
زیست کا مزا کیسا زیست ہی غنیمت ہے

دل کی بات کیا سوجھے ایسی نفسا نفسی میں
ذوقِ عاشقی معلوم! دل لگی غنیمت ہے

موت بھی نہیں ملتی عاشقوں کو منہ مانگے
بے بسوں کو یارائے خودکشی غنیمت ہے

رنگِ بے وفائی سے میری آنکھ پرنم ہے
ایسے خشک صحرا میں یہ نمی غنیمت ہے

باوفا نہیں ملتے شہرِ حسن و خوبی میں
شہرِ حسن و خوبی میں ایک بھی غنیمت ہے

مہر و ماہ و انجم کی بے نیازیاں توبہ
دوست ہو کہ دشمن ہو آدمی غنیمت ہے

جوشؔ ملسیانی

دو غزلیں

اب کس سے پوچھیں تو نے بنایا ہے گھر کہاں
دیر و حرم بھی دیکھ لئے تو مگر کہاں

سب پوچھتے ہیں بیٹھ رہا نامہ بر کہاں
اپنی خبر نہیں تو کسی کی خبر کہاں

ادراک کی حدوں سے بھی آگے نکل گیا
لے جائے دیکھئے مرا ذوقِ نظر کہاں

صیّاد کس لئے ہے قفس کی تلاش میں
اب جا سکے گا طائرِ بے بال و پر کہاں

نادان ہیں وہ جن کو تمنا ہے دید کی
اتنی کسی کی آنکھ میں تابِ نظر کہاں

ہر ذرہ آستاں ہے تری جلوہ گاہ کا
تو ہی بتا مجھے کہ جھکاؤں میں سر کہاں

بے تابیوں کا آپ نہ الزام دیں مجھے
صبر و سکوں کہاں دلِ شوریدہ سر کہاں

شہرہ تمہارے زہد کا ہے شہر بھر میں جوشؔ
پیتے بھی تم نہیں ہو مگر آج ادھر کہاں

بلا سے کوئی ہاتھ ملتا رہے
ترا حسن سانچے میں ڈھلتا رہے

ہر اک دل میں چمکے محبت کا داغ
یہ سکہ زمانے میں چلتا رہے

بدل جائے خود بھی تو حیرت ہے کیا
جو ہر روز وعدے بدلتا رہے

مری بے قراری پہ کہتے ہیں وہ
نکلتا ہے دم تو نکلتا رہے

تمہیں ہم سحابِ کرم بھی کہیں
امیدوں کا خرمن بھی جلتا رہے

یہ طولِ سفر یہ نشیب و فراز
مسافر کہاں تک سنبھلتا رہے

زمانہ ہی بدلے تو کیا فائدہ
مقدر بھی کچھ کچھ بدلتا رہے

کوئی جوہری جوشؔ ہو یا نہ ہو
سخن در جواہر اگلتا رہے

عبدالحمید عدم

غزل

پوچھتے ہیں ہمیں ہوا کیا ہے — یہ نہیں پوچھتے دوا کیا ہے

مدعا ہو تو کچھ بیاں بھی کریں — کیا بتائیں کہ مدعا کیا ہے

موت بھی نیند کا بہانہ ہے — نیند آجائے تو برا کیا ہے

ہم سے ان کو گلا تو ہے بیشک — ہم سے لیکن انہیں گلا کیا ہے

بد دعا اور جینے والوں کو — اے محبت تجھے ہوا کیا ہے

بندہ پرور مری خطا ہی سہی — یہ تو فرمائیے خطا کیا ہے

دور ہے دن ابھی قیامت کا — ہنسنے والو تمہیں ہوا کیا ہے

ہم بھی حیرت سے ہیں تماشائی — یہ نہیں علم ماجرا کیا ہے

آتے جاتے کہاں سے ہیں انساں — خیر و شر کیا ہے ماسوا کیا ہے

موت کا عذر کیوں ضروری ہو — زیست کا حادثہ برا کیا ہے

شام کا ماتمی لباس ہے کیوں — صبح کے رخ پہ نور سا کیا ہے

کس کی خاطر یہ چھیڑ جاری ہو — ساز کیا چیز ہے، نوا کیا ہے

حسن پر جان کیوں نکلتی ہے — عشق کا دردِ لا دوا کیا ہے

لازمی کیوں ہو عذرِ ربط و گریز — بے رخی کیا ہے اعتنا کیا ہے

کون ہے پاسباں سفینوں کا — وہ خدا ہے تو ناخدا کیا ہے

آخر اس مستقل خرابی کی — ابتدا کیا ہے انتہا کیا ہے

موت نادم نہ ہو عدم آکر
زیست کے پاس اب رہا کیا ہے

اقبال صفی پوری

غزل

ذکر ان کا ہے کبھی صبح کبھی شام کے ساتھ
زندگی رقص میں ہے گردشِ ایام کے ساتھ

ہائے کیا چیز ہے اک لفظِ محبت کا اثر
نبضِ کونین ٹھہر جاتی ہے اس نام کے ساتھ

زلفِ تابانیِ عارض کو بڑھا دیتی ہے
صبح ہو جاتی ہے کچھ اور حسیں شام کے ساتھ

جل گئے تابشِ مے سے مہ و انجم کے چراغ
میکدہ جاگ اٹھا گردشِ یک جام کے ساتھ

کبھی جلووں کا اشارا کبھی نظروں کا سکوت
عشق بڑھتا ہی گیا نامہ و پیغام کے ساتھ

اب نہ احساسِ خلش ہے نہ تمنائے سکوں
ہم جئے جاتے ہیں اک لذتِ بے نام کے ساتھ

میکشی ہیچ ہے رندوں کی نظر میں اے دوست
تیری آنکھوں کا تصور جو نہو جام کے ساتھ

اپنی آنکھوں میں لیا اڑ کے ستاروں نے انہیں
ہائے وہ اشک جو نکلے تھے ترے نام کے ساتھ

گردشِ چشمِ محبت کا اشارا جو ملا
ہر نفس دوڑ چلا گردشِ ایام کے ساتھ

اٹھ کے یوں مست گھٹا چھا گئی میخانے پر
توبہ خود ڈوب گئی موجِ تہِ جام کے ساتھ

دیکھتا کون محبت کی پشیماں نظریں
دل مرا ڈوب گیا جراتِ ناکام کے ساتھ

گو میں ناکام سہی ہے یہی کیا کم اے دوست
کہ مرا نام تو آتا ہے ترے نام کے ساتھ

گردشِ ان مست نگاہوں کی نہ سمجھے اقبال
دور تک ہم بھی گئے گردشِ ایام کے ساتھ

حامد اللہ افسر

غزل

جو غم حد سے زیادہ ہو خوشی نزدیک ہوتی ہے
چمکتے ہیں ستارے رات جب تاریک ہوتی ہے

سکونِ قلب کو ہلکی سی بھی امید کافی ہے
کہ نورِ صبح کی پہلی کرن باریک ہوتی ہے

نظر کو روک لے اے حسن بے پردہ کے متوالے
کہ ان بیتابیوں سے شوق کی تضحیک ہوتی ہے

وہ دولت جس کا دُنیا نے مسرت نام رکھا ہے
ترے جلووں کی دامانِ نظر میں بھیک ہوتی ہے

ہمیں اب زندگی کا خواب افسر یاد آتا ہے
یہی وہ خواب ہے تعبیر جس کی ٹھیک ہوتی ہے

دُعاء

کیا ہے وہ جو اس کے قبضے میں نہیں
نعمتیں انمول دیتی ہے دعا

عرش تک جانے سے پہلے اے ندیم
روح کا در کھول دیتی ہے دعا

بارگاہِ حق میں پہنچی یا نہیں
اپنے منہ سے بول دیتی ہے دعا

لائیے گر جام زہرابِ حیات
اس میں امرت گھول دیتی ہے دُعا

زیبا ردولوی

غزل

نظر اٹھاتے ہی دُنیائے شادی و غم سے
سلام آنے لگے ماورائے عالم سے

مرے لئے خلش مستقل بھی کہلائی
وہ زندگی جو عبادت ہے سعیٔ پیہم سے

شریر و شوخ شعاعیں ذرا ٹھہر جائیں
گلوں کی چھیڑ ابھی ہو رہی ہے شبنم سے

تجلیاں نہ سہی خیر بجلیاں ہی سہی
امیدوار ہیں کچھ ہم بھی حسن برہم سے

ہم آنکھ بھر کے نہ دیکھیں تو کیا شکایت ہے
تمہارا جلوہ بھی کھل کر کبھی ملا ہم سے

اسی نظر کی تمنا ہے پھر ارے توبہ!
بدل گئی جو وفا کے پیام محکم سے

کسی کو گریۂ آزاد بھی ملا ہوگا
ہمیں تبسم مبہم ملا ترے غم سے

شبِ فراق سے پہلے خیال آتا تھا
گناہِ عشق کو کیا واسطہ جہنم سے

ہمارا سادہ و معصوم دل تو بچ نہ سکا
وہ شوخ جلوہ بچے کیا نگاہِ عالم سے

اب اس دعا پہ اور اس آرزو میں جیتا ہوں
خدا ملائے کسی دردِ دل کے محرم سے

وہ رقص و شعر ہو زیبا کہ نغمہ و تصویر
کسی کے چند اشارے ہیں وہ بھی ہم سے

خمار بارہ بنکوی

غزل

ایک شعلہ سا گرا شیشہ سے پیمانہ میں
لو کرن پھوٹی سویرا ہوا میخانہ میں

کفر و اسلام ہم آغوش ہیں میخانہ میں
کعبہ شیشہ میں ہے بتخانہ ہے پیمانہ میں

کیسے ہیبت سے بیٹھے ہیں جنابِ زاہد
جیسے پہلے ہی پہل آئے ہیں میخانہ میں

سوئے کعبہ کبھی جا نکلے کبھی جانبِ دیر
آج پہنچے ہیں بھٹکتے ہوئے میخانہ میں

مدبھری آنکھیں یہ ساقی کی الٰہی توبہ!
اور میخانے بھی آباد ہیں میخانہ میں

تو قیامت سے ڈراتا ہے ہمیں اے واعظ
آتی رہتی ہے شب و روز یہ میخانہ میں

جن کی توحید پرستی کی تھی شہرت وہ خمار
آج مصروف پرستش ہیں صنم خانہ میں

(بہ اجازت [illegible])

صفیہ شمیم

غزل

وہ سوز و سازِ دل، غمِ پنہاں کہاں گیا
کہتے ہیں جس کو درد وہ درماں کہاں گیا

اے گلستاں وہ جوشِ بہاراں کہاں گیا
وہ رونقیں وہ حسنِ شبستاں کہاں گیا

غنچے کھلا کے بادِ بہاری کدھر گئی
نغمے جگا کے موسمِ باراں کہاں گیا

ہنستے ہیں اب چمن نہ مہکتی ہے اب فضا
اے گلستاں وہ جانِ گلستاں کہاں گیا

ارماں گئے، امید گئی، آرزو گئی
سب کچھ سہی مگر غمِ جاناں کہاں گیا

اے دل وہ شدتِ غمِ ہجراں کدھر گئی
اے چشم وہ تہیۂ طوفاں کہاں گیا

گو اب امیدِ جلوۂ جاناں نہیں رہی
دل سے مگر تصورِ جاناں کہاں گیا

ہر چند گلستاں میں بہاروں کی دھوم ہے
دل سے سنبھلے شوقِ بہاراں کہاں گیا

شوکت تھانوی

نوائے شوکت

یہ کس نے چھیڑ دئیے ان سے تیرے افسانے
سنک رہے ہیں ترا نام سُن کے دیوانے

مری نگاہ کا مفہوم جس نے سمجھا ہے
خدا کرے کہ وہ اب بھی نہ مجھ کو پہچانے

کبھی نگاہِ کرم ہے کبھی نگاہِ غضب
بدل بدل کے دئیے جا رہے ہیں پیمانے

وہ لاکھ یاس سہی اک سکونِ قلب تو تھا
ہمیں کہیں کا نہ رکھا اُمیدِ فردا نے

غریب شمع اسی غم میں گھلتی جاتی ہے
کہ وہ جلی تو بجھے جا رہے ہیں پروانے

ہمارے ذکر سے نکلیں گے سینکڑوں قصے
سُنائے جائیں گے دنیا کو جب یہ افسانے

جنوں کی تہہ سے خِرد کا سُراغ نکلے گا
بسائے جائیں گے اک روز پھر یہ ویرانے

ہمارے واسطے اب موت بن کے پلٹی ہے
وہی نگاہ جو اُن کو گئی تھی پہچانے

جنوں مصلحت آمیز خوب ہے شوکت
مگر وہ آ گئے [illegible] تم کو بہلانے

ادا جعفری

افسانے

وفورِ شوق کی حیرانیوں کے افسانے
بہت حسین ہیں نادانیوں کے افسانے

جلال و قہر و ستم رانیوں کے افسانے
یہ ہیں ہماری تن آسانیوں کے افسانے

تری نگاہ کی حیرانیاں نہ جان سکیں
مری نگاہ کی نادانیوں کے افسانے

نگاہِ ناز، نگاہِ جنوں سے مل نہ سکی
سُنے نہ جا سکے ویرانیوں کے افسانے

لطیف حُسن کے انداز ناپشیمانی
لطیف تر ہیں پشیمانیوں کے افسانے

چمن کی خیر! تو میری تباہیوں پہ نہ جا
سکوں بدوش ہیں طغیانیوں کے افسانے

بس اب سہے نہیں جاتے ترے کرم کی قسم
ترے کرم کی فراوانیوں کے افسانے

زبانِ لطف بجا لیکن نگاہ چارہ گروں!
بہت ہوئے تری مہربانیوں کے افسانے

یہ زہر [illegible]
یہ جینے کی [illegible] کے افسانے

سعادت حسن منٹو

مزدوری

لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم تھا۔ اس گرمی میں اضافہ ہوگیا جب چاروں طرف آگ بھڑکنے لگی۔

ایک آدمی ہارمونیم کی پیٹی اٹھائے خوش خوش چلا جا رہا تھا ـــــ "جب تم ہی گئے پردیس لگا کر ٹھیس او پیتم پیارا، دنیا میں کون ہمارا۔"

ایک چھوٹی عمر کا لڑکا جھولی میں پاپڑوں کا انبار ڈالے بھاگا جا رہا تھا ـــــ ٹھوکر لگی تو پاپڑوں کی ایک گڈی اس کی جھولی میں سے گر پڑی۔ لڑکا اسے اٹھانے کے لئے جھکا تو ایک آدمی جس نے سر پر سلائی کی مشین اٹھائی ہوئی تھی اس سے کہنے لگا ـــــ "رہنے دے بیٹا! رہنے دے۔ اپنے آپ بھن جائیں گے۔"

بازار میں دھب سے ایک بھری ہوئی بوری گری۔ ایک شخص نے جلدی سے بڑھ کر اپنے چھرے سے اس کا پیٹ چاک کیا ـــــ آنتوں کے بجائے شکر، سفید سفید دانوں والی شکر اُبل کر باہر نکل آئی۔ لوگ جمع ہو گئے اور اپنی جھولیاں بھرنے لگے۔ ایک آدمی کرتے کے بغیر تھا اس نے جلدی سے اپنا تہمد کھولا اور مٹھیاں بھر بھر اس میں ڈالنے لگا۔

"ہٹ جاؤ ـــــ ہٹ جاؤ" ایک تانگہ تازہ تازہ روغن شدہ الماریوں کو لادے ہوا گذر گیا۔

اونچے مکان کی کھڑکی میں سے ململ کا تھان پھڑپھڑاتا ہوا باہر نکلا۔ شعلے کی زبان نے ہولے سے اسے چاٹا...... سڑک تک پہنچا تو راکھ کا ڈھیر تھا۔

"پوں پوں ـــــ پوں پوں" موٹر کے ہارن کی آواز کے ساتھ دو عورتوں کی چیخیں بھی تھیں۔

لوہے کا ایک سیف دس پندرہ آدمیوں نے کھینچ کر باہر نکالا اور لاٹھیوں کی مدد سے اس کو کھولنا شروع کیا۔

"کاؤ اینڈ گیٹ" دودھ کے کئی ٹن دونوں ہاتھوں پر اٹھائے اور اپنی ٹھوڑی سے ان کو سہارا دئے ایک آدمی دُکان سے باہر نکلا اور آہستہ آہستہ بازار میں چلنے لگا۔

بلند آواز آئی۔ "آؤ آؤ لیمونیڈ کی بوتلیں پیو۔ گرمی کا موسم ہے۔" گلے میں موٹر کا ٹائر ڈالے ہوئے آدمی نے دو بوتلیں لیں اور شکریہ ادا کئے بغیر چل دیا۔

ایک آواز آئی۔ "کوئی آگ بجھانے والوں کو اطلاع کیوں نہیں دیتا ـــــ سارا مال جل جائے گا۔" کسی نے اس مفید مشورے کی طرف توجہ نہ دی۔

لوٹ کھسوٹ کا بازار اسی طرح گرم رہا اور اس گرمی میں چاروں طرف بھڑکنے والی آگ بدستور اضافہ کرتی رہی۔

بہت دیر کے بعد تڑ تڑ کی آواز آئی۔ گولیاں چلنے لگیں۔

پولیس کو بازار خالی نظر آیا ـــــ لیکن دور دھوئیں میں ملفوف موڑ کے پاس ایک آدمی کا سایہ دکھائی دیا۔

پولیس کے سپاہی سیٹیاں بجاتے اس کی طرف لپکے ـــــ سایہ تیزی سے دھوئیں کے اندر گھس گیا۔ پولیس کے سپاہی بھی اس کے تعاقب میں گئے۔

دھوئیں کا علاقہ ختم ہوا تو پولیس کے سپاہیوں نے دیکھا کہ ایک کشمیری مزدور پیٹھ پر وزنی بوری اٹھائے بھاگا چلا جا رہا ہے۔

سیٹیوں کے گلے خشک ہو گئے مگر وہ کشمیری مزدور نہ رکا۔ اس کی پیٹھ پر وزن تھا۔ معمولی وزن نہیں، ایک بھری ہوئی بوری تھی لیکن وہ یوں دوڑ رہا تھا جیسے پیٹھ پر کچھ ہے ہی نہیں۔

سپاہی ہانپنے لگے ـــــ ایک نے تنگ آ کر پستول نکالا اور داغ دیا۔ گولی کشمیری مزدور کی پنڈلی میں لگی۔ بوری اس کی پیٹھ پر سے گر پڑی۔ گھبرا کر اس نے اپنے پیچھے آہستہ آہستہ بھاگتے ہوئے سپاہیوں کو دیکھا۔ پنڈلی سے بہتے ہوئے خون کی طرف بھی اس نے غور کیا لیکن ایک ہی جھٹکے سے بوری اٹھائی اور پیٹھ پر ڈال کر پھر بھاگنے لگا۔

سپاہیوں نے سوچا، جانے دو جہنم میں جائے۔

ایک دم لنگڑاتا لنگڑاتا کشمیری مزدور لڑکھڑایا اور گر پڑا۔ بوری اس کے اوپر آ رہی۔ سپاہیوں نے اسے پکڑ لیا اور بوری سمیت تھانے لے گئے۔

راستے میں کشمیری مزدور نے بارہا کہا "حضرت، آپ مجھے کیوں پکڑتی ہے ـــــ میں تو غریب آدمی ہوتی ـــــ چاول کی ایک بوری لیتی ـــــ گھر میں کھاتی ـــــ آپ ناحق مجھ کو گولی مارتی ـــــ" لیکن اس کی ایک نہ سنی گئی۔

تھانے میں بھی کشمیری مزدور نے اپنی صفائی میں بہت کچھ کہا "حضرت دوسرا لوگ بڑا بڑا مال اٹھاتی ـــــ میں تو فقط ایک چاول کی بوری لیتی ـــــ حضرت میں بہت غریب ہوتی ـــــ ہر روز بھات کھاتی ـــــ"

جب تھک ہار گیا تو اس نے اپنی میلی ٹوپی سے ماتھے کا پسینہ پونچھا۔ اور چاولوں کی بوری کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ کر تھانے دار کے آگے ہاتھ پھیلا کر کہا۔

"اچھا حضرت تم بوری اپنے پاس رکھو ـــــ میں اپنی مزدوری مانگتی ـــــ چار آنے۔"

شوکت تھانوی

صدر مشاعرہ

خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ہزاروں مشاعروں میں شرکت کا اتفاق ہوا ہے اور سیکڑوں قسم کے صدر ان مشاعروں کی صدارت کرتے ہوئے اس مختصر سی عمر میں دیکھ چکے ہیں۔ وہ مشاعرے خواہ محض مشاعرے ہوں یا ان کی تقریب انعقاد کچھ اس قسم کی ہو کہ دخترِ نیک اختر کی شادی کی خانہ آبادی ہے اور محفل رقص و سرود گرم کرنے میں اخراجات بھی زیادہ ہیں اور شرعی ستم بھی نکل رہا ہے لہٰذا بجائے ارباب نشاط کو بلانے کے شعرائے کرام کو بلا لیا۔ چہل پہل بھی ہو گئی۔ ادبی خدمت بھی ہو گئی اور خرچ بھی بس واجبی سا ہو گیا۔ بہرحال وہ مشاعرہ خواہ اولاد نرینہ کی پیدائش کی خوشی میں ہو یا بندہ زادہ کی خانہ آبادی کے سلسلہ میں لیکن ہوتا ہے با قاعدہ مشاعرہ اور اس کا ایک صدر بھی ضرور ہوتا ہے۔ یہ صدر عام طور پر کچھ یکساں قسم کے ہوتے ہیں یعنی مسند پر جہاں ایک گاؤ تکیہ لگا ہوا ہے گلدستے آراستہ ہیں مائیکروفون آویزاں ہے وہاں ایک صدر بھی رکھا ہوا ہے۔ یہ صدر زیادہ تر نہ منہ سے بولتے ہیں نہ سر سے کھیلتے ہیں بس بار بار پہنے بیٹھے پان چباتے رہتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ مسند صدارت پر مہرہ طرح رکھا ہوا ہے خواہ مشاعرہ غیر طرحی ہی کیوں نہ ہو۔ بعض صدر ایسے ہوتے ہیں خطبۂ صدارت پڑھتے ہیں اور پھر فوراً ہی اس خیال سے کسی کو اپنا قائم مقام بنا کر چلے جاتے ہیں کہ کہیں ان شاعروں کو یہ نہ معلوم ہو جائے کہ خطبۂ صدارت کسی اور کا لکھا ہوا تھا۔ صاحبانِ صدر کی ایک قسم وہ ہے جو اپنے خطبہ کا اعلان کرنے کے لئے مسند صدارت پر جلوہ افروز ہوتی ہے اور پھر کسی ایسے مرض میں مبتلا ہونے کا بہانہ کر کے رخصت ہو جاتی ہے جو متعدی ہو اور جس سے تمام حاضرین مشاعرہ کو اپنی زندگی خطرے میں نظر آئے۔

لیکن آجکل دور ہی مشاعرے کے صدر کی ایک نئی قسم دریافت ہوئی ہے جس نے "مشاعرہ" کو گویا "مصادرہ" سا بنا کر رکھ دیا ہے۔ ممکن ہے کہ مشاعرے کے عادی اس مصادرہ کو نہ سمجھ سکیں لہٰذا اس کی تشریح ضروری ہے۔ یہ بھی دراصل ایک قسم کا مشاعرہ ہوتا ہے مگر اس میں مشاعرہ کم اور مصادرہ زیادہ ہوتا ہے۔ آپ کہیں گے کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے مگر ہم عرض کریں گے کہ ہو اس لئے سکتا ہے کہ ہم نے خود دیکھا ہے اور اس مصادرے میں شرکت کی ہے ایک مرتبہ نہیں بلکہ متعدد مرتبہ ہو اور یہ عالم ہے کہ اب خدا پہلے ہی سے سونگھ کر دیکھ لیتے ہیں کہ یہ مشاعرہ ہے یا مصادرہ۔ بات یہ ہے کہ معلوم نہیں کیوں اس قسم کے صدر کے بعد پہلے تو ہنسی آتی ہے۔ پھر طبیعت جز بز ہوتی ہے۔ اس کے بعد دماغ چکرانے لگتا ہے۔ پھر اپنے شاعر ہونے پر غصہ آتا ہے۔ تخلص سے نفرت ہو جاتی ہے۔ دوسرے شعراء کے کلام سے متلی ہونے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ آخر میں مشاعرہ کا ارادہ ختم ہو جاتا ہے اور یہ سب کچھ اس لئے ہوتا ہے کہ مشاعرہ کم سے کم ہوتا ہے اور صدارت زیادہ سے زیادہ صاحب صدر ہر شاعر کے متعلق ایک مستقل خطبۂ صدارت ارشاد فرماتے ہیں اور اگر اس مشاعرے میں پچاس شاعر ہیں تو گویا ان کے کلام کے علاوہ ہر شخص کو پچاس صدارتی خطبے بھی سننا پڑتے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے کہ دماغ کہاں تک ٹھکانے رہ سکتا ہے۔

خیر یہ بات تو بیچ ادھر سے شروع ہو گئی۔ عرض کرنا یہ تھا کہ صدر کی اس نئی قسم کو دیکھنے کا اتفاق ایک ایسے مشاعرے میں ہوا جو ایک دوست نے کوئی مقدمہ جیتنے کے سلسلہ میں منعقد کیا تھا۔ جس وقت ہم پہونچے ہیں۔ صدر محترم ارشاد فرما رہے تھے۔

"قسم ہے اُن آبلوں کی جو دشتِ غربت کے ایک ایک کانٹے کو سیراب کرتے آئے ہیں قسم ہے ان کانٹوں کی جو آبلہ پائی کی لذتوں میں اضافے کا سبب ہے۔ قسم ہے ان لذتوں کی جو درد کو مٹھاس عطا کرتی ہیں اور کرب کو خوشگوار بنا کر ہم کو درد آشنا بنا دیتی ہیں کہ ہم تو خود رنجور ہیں کلام رنجور ہمارے دل کی آواز ہے اور اسی آواز کے لئے ہم گوش بر آواز ہیں۔ لہٰذا جناب رنجور ملتانی تشریف لائیں۔"

قریب ہی ایک صاحب سر پکڑے اس طرح بیٹھے تھے گویا بادبانی جہاز پر بیٹھنے کا پہلا اتفاق ہے اور دوران سر میں مبتلا ہیں ہم نے سرگوشی میں دریافت کیا "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

بیزاری کے ساتھ ان حضرت نے فرمایا "میرا سر ہو رہا ہے معلوم نہیں میں کہاں آگیا تھا یہاں۔ یہ آٹھواں خطبۂ صدارت ہے اور رنجور صاحب آٹھویں شاعر ہیں پہلے [illegible] صاحب کے بعد پڑھنے آئے ہیں لہٰذا [illegible] اور رنجور کے [illegible] جناب صدر نے اپنے اس خطبہ سے نوازا ہے۔"

رنجور صاحب غزل شروع کر چکے تھے اور جناب صدر [illegible] ہوئے جھوم جھوم کر فرما رہے تھے۔

"پھر پڑھیں گے رنجور بیتا پھر پڑھیں گے کیا شعر [illegible]

پڑھیں گے۔"

اور مجد صاحب بار بار پڑھ رہے تھے۔ خدا خدا کر کے ان کی غزل ختم ہوئی اور جناب صدر نے مائیکروفون کو اس طرح اپنی طرف کھینچا جیسے چوپال میں ایک کے پی چکنے کے بعد دوسرا پینے والا حقہ اپنی طرف گھماتا ہے اور پھر وہی خطبہ۔

"مجھکو ایک مصرعہ یاد آرہا ہے کسی شاعر کا۔ ع

رنج کا خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج

کلام رنجور کے نقش دلپذیر داغوں کی صورت میں نمایاں ہوئے۔ ان داغوں نے عجیب گل کھلائے کہ داغوں کے باغ لہلہا اٹھے۔ نکہت بار و نزہت افزا کہیں یاسمین کی مہک ہے تو کہیں نرگس آنکھ مچولی کھیل رہی ہے۔ جہاں گل ہوں وہاں بلبل کیسے نہ آئے۔ چنانچہ یہاں بھی بلبل موجود ہے۔ اگر جناب عندلیب سرحدی اب بھی نہ تشریف لائیں تو میں اس بہار کو خزاں ہی سمجھوں گا۔"

ان ہی صاحب نے جو سر پکڑے بیٹھے تھے پہلو بدل کر لونڈیوں کی طرح ٹھنڈ لاتے ہوئے کہا: "مرود وجعلا بسکی [illegible] مشاعرے میں جائے۔"

مگر ساتھ ہی ساتھ مجمع سے ایک آواز بلند ہوئی: "کیا کہنا ہے جناب صدر کے انداز تعارف کا۔"

اور جناب صدر نے مائیکروفون میں گویا نزدیک ٹکسالی شہد انڈیل دیا جس سماعت بے درد بند وکس قابل ہے من آنم کہ من دانم ــــ"

ایک اور آواز بلند ہوئی: "چوں وانی مکتر چرا می کنی۔"

ایک قہقہہ بلند ہوا اور اس شور کی تہ میں جناب عندلیب سرحدی کی آواز ابھر رہی تھی اور جناب صدر اس مرتبہ بجائے شاعر کے شانے پر ہاتھ رکھنے کے اس کا زانو سہلا سہلا کر داد دے رہے تھے۔

"پھر وہا ہوگا۔ نازک بات کہدی ہے۔ پھر پڑھیں گے بھیا عندلیب۔"

اور بھیا عندلیب اسی طرح پڑھتے پڑھتے اپنے مقطعے تک پہونچ گئے۔ پیچھے پھر جناب صدر نے مائیکروفون گھسیٹ لیا۔

"بلبل چہک چکا۔ پھول جھوم چکے۔ نزہت بیز چکی مگر یہ کسی نے نہ سوچا ہوگا کہ جو نیا باغ ہم نے لگایا ہے اس کو ہم نے کتنی قیمتی قربانیوں کے بعد لہلہانے کے قابل بنایا ہے۔ اس کو ہم نے اپنے خون سے سینچا ہے۔ اس کو ہم نے سب کچھ کھو کر حاصل کیا ہے اور اس کا نام پاکستان رکھا ہے۔ اب یہی ہمارا آخری سہارا ہے اس کے تحفظ کے لئے [illegible] جناب عظمت سے [illegible] کے بعد [illegible] مافظ [illegible] بننے کے لئے ہوشیار اور بیدار ہونا پڑے گا [illegible] حفیظ سے ہوشیاری کا پیغام سن لیجئے اگر آپ بھی جناب حفیظ ہوشیارپوری تشریف نہ لائے تو میں اگلے [illegible]

اُن جان سے بیزار صاحب نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک صاحب سے فرمایا: "نہ جائیے حفیظ صاحب۔ کہہ دیجئے کہ میں کوئی ہوشیاری کا پیغام نہیں سنا سکتا۔"

مگر حفیظ صاحب تالیوں کے تھپیڑوں میں تیرتے ہوئے مائیکروفون کے پاس آگئے اور فرمایا: "ہوشیار اور بیدار کرنے کے لئے جناب صدر کی جادو بیانی کافی ہے میں تو غزل کے چند شعر پیش کرتا ہوں۔"

یہ شاعر ذرا باغی نکلا جب جناب صدر نے نعرہ بلند کیا: "بھیا پھر پڑھیں گے۔" وہ دوسرے شعر پر پہونچ گیا اور جب جناب صدر اتفاق سے چپ ہوگئے اس نے شعر کر پڑھ دیا۔ یہاں تک کہ غزل کے گیارہ اشعار میں اس نے جناب صدر کو گیارہ مرتبہ اندازہ کرایا کہ ان کا صادق اقبال کم سے کم اس شاعر کے معاملہ میں [illegible] نہیں کر رہا ہے اور آخر وہ تھک کر خاموش ہوگئے یہاں تک کہ جب شاعر نے غزل ختم کی جناب صدر اس کے نام سے دوسرے شاعر کا سلسلہ ملانے میں بھی ناکام تھے اور آپ نے ایک اور ہی قسم کا اعلان فرمادیا۔

"سامعین کرام اب آپکے سامنے وہ شاعر شیریں مقال آرہا ہے جس کے نام کا پہلا حرف الف ہے۔"

جو صاحب جان سے بیزار بیٹھے تھے برجستگی سے بولے: "الف سے الو۔"

جناب صدر فرما رہے تھے "نام کا پہلا حرف الف ہے اور اللہ کی قسم یہ الف قسم کھا رہا ہے اس آفتاب تاباں کی جس کو خاور بھی کہتے ہیں خاور شاعر کے نام کا دوسرا حرف لیکر طلوع ہوتا ہے یعنی خے۔"

ہم نے قریب بیٹھے ہوئے صاحب سے پوچھا: "کیا ہوسکتا ہے یہ نام الف اور خے۔"

وہ جل کر بولے: "اخروٹ۔"

جناب صدر کا سلسلہ جاری تھا: "الف اور خے کے بعد شاعر کے نام کا تیسرا حرف اس قبہ کو نذر رہا ہے جو کالی گھٹا میں بھی نہ توڑ سکیں اور آخری حرف اس رندگی سے لیا گیا ہے جس کی تو بات چکی ہے یعنی الف خے زبر آخ تے رے زبر تر۔ جناب اختر سہارنپوری ــــ"

اب تو ہم نے بھی سوچنا شروع کر دیا کہ یا اللہ یہ مشاعرہ ہے یا کچھ اور۔ آخر یہ ہو کیا رہا ہے۔ مگر اس مشاعرے میں ایسے ایسے صاحبان ذوق بھی بیٹھے ہوئے تھے جو جناب صدر کے ان ارشادات پر خوش ہو ہو کر تالیاں بجا رہے تھے اور داد بھی دے رہے تھے اب یہ فیصلہ دشوار تھا کہ آخر وہ کیا سمجھ کر داد دے رہے ہیں اور آخر ہم وہ خوبیاں کیوں نہیں سمجھ رہے جن کی وہ داد دے رہے تھے۔ آخر ہم نے قریب بیٹھے ہوئے صاحب سے دریافت کیا: "کیوں صاحب یہ لوگ جناب [illegible] کی [illegible]

سے ہیں کس قسم کے لوگ ہیں "

وہ حضرت بولے : مہاجرین "

ہم نے حیرت سے کہا : مہاجرین - مہاجرین سے کیا مطلب ہے آپ کا ؟

وہ بولے : جو ذوقِ سلیم اور عقل دونوں سے ہجرت کر کے اس مشاعرے میں آگئے ہیں "

ہم نے ہنس کر کہا : وہ تو ٹھیک ہے ویسے مہاجر تو ہم اور آپ بھی ہیں مگر یہ داد کس بات کی دی جا رہی ہے ؟

وہ بولے : دنیا میں ہر قسم کی جہانبانی اسی قوم کے ہاتھوں رواج پاتی ہے "

جناب صدر کا نعرہ گونجا : بھائی اختر تشنگی باقی ہے۔ پھر فرمائیں گے یہ مقطع اختر شمار کہ لگے گا یہ مقطع اختر بھیا "

اور اختر صاحب نے پھر اپنا مقطع پڑھ دیا اب مائیکروفون جناب صدر کی پیشی میں تھا اور وہ نطقِ صدارت سے حاضرین کا ناطقہ بند فرما رہے تھے۔

" لیلیٰ شب اپنے ستارے ایک ایک کر کے بجھانے لگی۔ اختر شماری میں مصروف عشاق کی دعا نے سحر رنگ لانے لگی۔ سیاہی پھیکی پڑ گئی۔ طیور چہچہائے۔ باقی ستارے شبنم بن کر جاگنے والوں کی آنکھوں میں آ گئے۔ مشرق کا مطلع رنگ بدلنے لگا اور وہ سرخی پیدا ہوئی جس کا نام ہمارے ایک رنگین نوا شاعر کا تخلص ہے یعنی جناب شفق زیدی تشریف لائیں بھیا شفق "

ہمارے پاس بیٹھے ہوئے صاحب نے کہا : شفق تو مؤنث ہے۔ پھر یہ بھیا شفق کیا معنی "

مگر ہم بھیا شفق کا کلام سن رہے تھے جن کی آواز رباب دار بھی تھی اور اس نعیم پر بھی پہونچ رہی تھی کہ اسٹیج ڈراموں کی اگر اب بھی تجدید ہو جائے تو غالباً بہت زیادہ مایوسی نہ ہو گی۔ جناب صدر پر ایک عالمِ وجد طاری تھا کبھی شاعر کو گلے لگانے کی کوشش کرتے تھے کبھی اپنے کو اسکے گلے منڈھنے پر تل جاتے تھے اور نعرے وہی حسب معمول۔

" پھر پڑھیں گے۔ رات بھر پڑھیں گے۔ عطا کریں گے۔ رات بھر عطا کریں گے "

جناب شفق کے بعد جناب صدر پھر مائیکروفون میں منہ ڈال کر شروع ہو گئے۔

" شفق کی یہ سرخیاں یاد دلاتی ہیں اس خون کی جو ہمارے جانبازوں کے لئے پانی سے بھی ارزاں ہوتا ہے۔ جس میں ہمارے مجاہد شناوری کرتے ہیں جس کی ہولی کھیل کر سرخرو ہوتے ہیں۔ مگر تلوار کے یہ دھنی جو اس آن بان سے میدان کارزار میں آتے ہیں جب خدا کے حضور جاتے ہیں تو ان کی عبادت ــــــ ،،

قریب بیٹھے ہوئے صاحب نے کہا : آئی پروفیسر عابد علی عابد کی شامت "

ہم نے کہا : خوب بوجھے آپ "

جناب صدر فرما رہے تھے : دن بھر میدانِ جہاد میں خدا کے جوہر دکھانے والے رات کو تسبیح و تہلیل میں اس طرح مصروف ہوتے ہیں کہ ان کے حجروں سے شہد کی مکھیوں کے چھتے کی سی بھنبھناہٹ سنائی دیتی ہے۔ ہم کو ایسے ہی مجاہدوں کی ضرورت ہے ایسے ہی عابدوں کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت اس وقت پروفیسر عابد علی عابد پوری کریں گے "

عابد صاحب نے نہایت وقار سے کھڑے ہو کر کہا : جناب صدر کی اس شگفتہ بیانی کی داد دیتے ہوئے میں عرض کروں گا کہ میں طے کر چکا ہوں کہ میں کچھ نہ پڑھوں گا "

ہمارے قریب بیٹھے ہوئے صاحب نے بے ساختگی میں ایک معنی خیز قسم کی تالی بجا دی۔

جناب صدر نے اصرار کیا : کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں : آج عابد بزل مرا بھا بھائی عابد اپنے فیصلہ پر نظرِ ثانی فرمائیں "

میزبان نے آ کر اعلان کیا کہ کھانے کی میزیں تیار ہیں اور اس سے قبل کہ جناب صدر کوئی اختتامی خطبۂ ارشاد فرمائیں۔ لوگ ان کو مسندِ صدارت پر چھوڑ کر کھانے کی میز پر آ چکے تھے۔

نوٹ :- خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔

حجاب امتیاز علی

چند تصویر بتاں

دوستوں کا خاموش جائزہ لینا اُن سے محبت کرنا ہے

(۱)

ان کی آنکھوں میں اک خاص بات ہے یعنی اک عجیب خیال پرستی اور جنون کی سی کیفیت ظاہر ہوتی ہے۔ ان کی گفتگو، اگر محاورے کا خیال نہ بھی کیا جائے تو شیطان کی آنت سے کسی قدر لمبی ہوتی ہے۔ جب تک کوشش کر کے ان کا منہ نہ بند کیا جائے وہ اپنے خیالات کا اظہار کئے جاتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ انہوں نے اپنی پیدائش کے پانچ منٹ کے اندر اندر ضرور کوئی بات کی ہوگی۔ جسے کند ذہن نرس نے سمجھا نہ ہوگا۔

بظاہر فلسفی معلوم ہوتی ہیں۔ حالانکہ یہ بات نہیں ہے۔ فلسفہ انہیں چھو کر بھی نہیں گیا۔ ظاہراً بہت شائستہ اور طبعاً بے حد باتونی ہیں۔ ان کی معمولی ملاقات جسے وہ ہوائی ملاقات کہتی ہیں سات یا آٹھ گھنٹوں کی ہوتی ہے بعض دفعہ اس سے بھی طویل ——— یعنی آفتاب غروب ہو جاتا، اور رات کے اندھیرے میں اک خوفناک گہرائی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ سگریٹ بہت پیتی ہیں۔ فتور ہاضمہ اور احساس برتری کے شدید مرض میں مبتلا ہیں۔ اول الذکر مرض کے سلسلے میں سگریٹ نوشی کرتی ہیں۔ آخر الذکر مرض کا اب تک کوئی علاج شروع نہیں کیا در اصل کمتری خولیا کے باعث ان میں احساس برتری کا مہلک مرض پیدا ہو گیا ہے۔ طبیعت میں نارسیس کی طرح خود پرستی بہت ہے۔ ان کی خو میں طفل شیر خوار کی طرح "انانیت" بھی بہت زیادہ ہے اس لئے ان کی گفتگو میں "میں" کا لفظ بہت نمایاں اور بکثرت ہوتا ہے۔

زندگی کا رخ شمال کی طرف ہو، یا جنوب کی طرف، ان پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ در اصل یہی باتیں انہیں باوجود فلسفی نہ ہونے کے فلسفی بناتی ہیں۔ وہ محلوں میں بھی خوش رہ سکتی ہیں۔ جھونپڑوں میں بھی۔ انہیں نہ رولس رائس کی سبک رفتاری سے کوئی خاص حظ ملتا ہے نہ دیہاتی وضع کی بیل گاڑی کے ہچکولوں سے کوئی تکلیف پہنچتی ہے۔ وہ اپنی طویل باتوں میں اس قدر غرق ہوتی ہیں، کہ انہیں عالم اور موجودات عالم کا احساس کم ہوتا ہے۔

وہ ارسطو کے نظریۂ اعتدال کی مطلق قائل نہیں۔ طبیعت میں انتہا پسندی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ وہ اپنے دوست سے یا تو شدید عشق کر سکتی ہیں یا اس کی جانی دشمن بنی رہتی ہیں۔ اپنے ہر دوست سے یکلخت اور اچانک کنارہ کش ہو کر اس سے سخت متنفر ہو جاتی ہیں۔ میری تحقیق کے مطابق اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ اک ذہنی مرض (پیرانویا) میں مبتلا ہیں۔ اس کا مریض دنیا کو اپنا دشمن اور انسان کو اپنا نکتہ چیں سمجھتا ہے۔

گذشتہ موسم گل میں وہ میری پرستار تھیں۔ اس موسم گل میں سنتا ہے کہ وہ میرے خون کی پیاسی ہو رہی ہیں۔ ممکن ہے، آئندہ موسم خزاں میں وہ پھر میری پرستش شروع کر دیں۔ آج کل وہ ان دوست کی پرستش میں لگی ہیں جن کی دو سال پہلے دشمن جان تھیں۔ آسمان کی طرح رنگ بدلتی ہیں۔ زمین کی طرح پر اسرار ہیں۔ معمہ کی طرح حل طلب ہیں۔ دوست ان کو مرض لا علاج سمجھتے ہیں اور وہ دوستوں کو!

ہمیشہ کسی گہرے خیال میں گم رہتی ہیں۔ حالانکہ بات کچھ بھی نہیں ہوتی! کیلے بہت زیادہ کھاتی ہیں۔ انہیں ذہنی علاج کی فوری ضرورت ہے۔ ورنہ مجھے اک بات کا ڈر ہے!

(۲)

انہیں دیکھ کر کبھی پہاڑ کا کبھی ہاتھی کا، کبھی گینڈے کا خیال آتا ہے کم از کم یہ خیال بھی آتا کہ اگر اس حجم کے گاؤ تکیے کہیں دستیاب ہوتے! مدعا یہ کہ اک لامحدود جسم کے مالک و مختار ہیں۔

چہرے پر سنجیدگی، چیچک کے داغ۔ عینک۔ اور مونچھیں ہیں چہرے پر اور بھی کچھ ہو تو مجھے اس کا علم نہیں۔ نمایاں چیزوں کا ذکر ضروری سمجھتی ہوں۔

جب پہلی دفعہ میں ان حضرت سے متعارف ہوئی تو میرا خیال تھا کہ ان کی عمر پچاس سے کسی طرح کم نہیں۔ اس لئے میں نے ادب سے ذرا جھک کر سلام کیا تھا۔ مگر بعد میں یہ سن کر میں انگشت بہ دنداں رہ گئی کہ وہ ماشاء اللہ ابھی صرف بائیس سالہ نوجوان ہیں۔ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا ع

خدا را ابت ناداں دراز بین تو کرے ... ستم کے تو بھی ہو لائق خدا وہ دن تو کرے

گذشتہ خزاں میں وہ میرے مہمان تھے۔ اکثر تبادلۂ خیال کا اتفاق ہو جاتا تھا۔ ان کی گفتگو کا موضوع ہمیشہ مرغیاں، چوزے، اناج کی آئندہ فصل فصل کو کیڑوں سے محفوظ رکھنے کی خود ساختہ نرالی ترکیبیں، ہر کی پھل اور ان کی ترکیب استعمال، اور بیماری کے وہ نسخے جو حکیم جالینوس مرحوم استعمال کیا کرتے تھے اور جو اتفاق سے اب انہیں معلوم ہو گئے ہیں، ہوا کرتا ہے۔ چہرے کی سنجیدگی کا میں پہلے ہی ذکر کر چکی ہوں۔ دوران گفتگو میں یہ سنجیدگی انتہا کو

پہنچ جاتی ہے حالانکہ گفتگو بے حد لغو اور واہیات ہوتی ہے۔

جدید تہذیب کی ہر بات انہیں زہر لگتی ہے۔ سائنس کو دنیا کے تنزل کا ایک بہت بڑا راز سمجھتے ہیں۔ جادو اور ٹوٹکوں کو دنیا کی ترقی کی وجہ سمجھتے ہیں۔ عورتوں کے فرائض کے متعلق ان کے خیالات اس قدر مجرمانہ ہیں کہ کئی دفعہ میرا دل بے اختیار چاہنے لگا کہ انہیں اٹھا کر دریچے کے باہر پھینک دوں مگر اس سائز کا کوئی دریچہ نہ ملا۔ سند یافتہ ڈاکٹروں کے دشمن ہیں۔ اناڑی حکیموں کے نسخوں پر جان چھڑکتے ہیں۔ برقی روشنی کو ناپسند اور آنکھوں کیلئے مضر سمجھتے ہیں۔ ٹمٹماتے ہوئے مٹی کے دیئے کو پسند فرماتے ہیں۔ دو بیل کی گاڑی کو ہوائی جہاز پر ترجیح دیتے ہیں اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ اگر ہم نے ہوائی جہاز تمدن میں رائج کر لیا، تو پھر دنیا میں بیل کس مصرف کے رہیں گے؟ ایسی بحث کے وقت ان کے چہرے پر وہ سنجیدگی اور متانت ہوتی ہے کہ دیکھنے والے کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میرے رونگٹے تو ان کی ہر حرکت دیکھ کر ہی کھڑے رہتے ہیں۔

برقی چولہوں پر پکے ہوئے کھانوں کو مرض دق کی بنیادی وجہ، اور چیڑ کی لکڑی پر پکے ہوئے کھانے کو انسانی تندرستی کا بھید خیال فرماتے ہیں۔ چائے سے زیادہ دودھ، دودھ سے زیادہ مکھن کے عاشق زار ہیں۔ میں اکثر سوچتی ہوں کہ انہیں خلل دماغ تو نہیں؟

اک دفعہ میرے باورچی خانے کے زینے پر ایستادہ تھے اور ایکا ایکی نوٹس سے جانے کن خیالات میں محو تھے۔ میری طرف ان کی پشت تھی مگر آسمان کے بالمقابل ان کے رخسار ادھر ادھر اس طرح نکلے ہوئے تھے کہ یہ امتیاز کرنا میرے لئے دشوار ہو رہا تھا کہ میری طرف ان کی شکل ہے یا پشت۔

بے حد مہمان ہیں۔ البتہ بچوں والے گھر کے لئے مضر رساں مہمان ثابت ہو سکتے ہیں۔ وہ محض اپنے عجیب و غریب فلسفہ اور دقیانوسی خیالات کے باعث کہ کہیں نونہالوں پر بھی ان کے خیالات کی تیغ جلیت کا اثر نہ ہو جائے۔ ورنہ ویسے بالکل بے ضرر ہیں۔

اک دفعہ میں ان کو اپنے ساتھ ڈرائیو کو لے گئی۔ نتیجہ کیا ہوا؟

———— میں نے بیٹھنے کے لئے تو پہ کر لی جس طرف وہ بیٹھے تھے اس طرف کے ٹائر کا خاتمہ ہو گیا۔ اس حالت میں فرماتے ہیں "اسی لئے تو میں کار کی بجائے بیل گاڑی کو اچھا سمجھتا ہوں" یہ سن کر میں جل کر رہ گئی۔ مجھے کرائے کی گاڑی میں گھر واپس آنا پڑا۔ مگر میں انہیں وہیں سڑک پر چھوڑ آئی۔

میری اس گستاخی کے خون کا خون ان کی موٹی گردن پر ہے۔ میں نے محض بہن کے سے احسان سے خوبصورت کرسیاں بنوائی ہیں۔ کرسیاں نازک ٹانگوں کی ہیں اور بیٹھنے والے کا بوجھ بے انتہا! اس لئے مر گئیں، اور خون ان کی موٹی گردن پر رہا۔

(۳)

میں ہمیشہ انہیں مرد سمجھتی ہوں اور سمجھتی رہوں گی۔ حالانکہ یہ صنف نازک ہیں۔ ان کی چوڑی چکلی ہڈیاں، ان کے بے تحاشہ اونچے اونچے قہقہے، ان کی موٹی موٹی کلائیاں، اور کھردری انگلیوں کے درمیان مسلسل دھواں نکلتا ہوا سگریٹ ———— یہ سب باتیں ایسی ہیں کہ میں ہمیشہ انہیں مرد سمجھنے پر مجبور رہی اور ان کے عورت ہونے کا مجھے یقین نہیں آتا۔

انداز نشست بھی مردوں کا سا ہے۔ بلکہ بعض بعض شاعر طبع مرد ان سے بہت خفیف معلوم ہوتے ہیں۔ نسوانیت کی طرح شعریت اور خوش مذاقی انہیں چھو کر بھی نہیں گئی۔ اک دفعہ فرمانے لگیں کہ "میں نے خواب دیکھا ہے کہ اک تیشے سے میں پہاڑ کاٹ رہی ہوں" یہ سننا تھا کہ کبھی کبھی جو ان پر عورت ہونے کا مجھے شبہ ہوتا تھا، وہ رہا سہا شبہ بھی جاتا رہا۔ رنگوں کے انتخاب میں وہ سیاہ و سفید کی مالک ہیں۔ لباس میں ضرور ان دو کی آمیزش ہوگی۔ خوشنما اور دلفریب رنگ پہنتے ہوئے انہیں شرم سی محسوس ہوتی ہے اور ان کا یہی مذاق انہیں مرد بنا رہا ہے۔

بال بنانے کا کوئی خاص طریق نہیں۔ جیسے بھی وقت پر بن جائیں، بنا لیں۔ انداز رفتار میں کچھ ایسی قباحت ہے کہ جب قدم اٹھائیں گی تو گھٹنوں کے پاس خم نہیں پڑے گا۔ ہمیشہ اونچی ایڑی کے ملکہ وکٹوریہ کے عہد کے نکیلے جوتے استعمال فرماتی ہیں جو شاید تم سے نصف صدی قبل معاشرت میں رائج تھے۔ جن کے متعلق آج کل کے تمام ڈاکٹروں نے متفق الرائے ہو کر کہا تھا کہ اس قسم کے جوتے خواتین کے لئے مضر ہوتے ہیں۔ تمام خواتین نے ڈاکٹروں کی رائے مان لی اور اس قسم کے جوتوں سے پرہیز لازمی سمجھا مگر یہ ابتک اسی کی شیدائی ہیں شاید وہ اپنے لئے اسے مضر نہ سمجھتی ہوں۔

ان کی اولاد کوئی ہے، تعجب ہے اپنے بچوں سے ماؤں کی سی محبت کرتی ہیں حالانکہ اصولاً انہیں باپوں کی سی کرنی چاہیئے تھی۔ جب میں ان سے باتیں کرتی ہوں تو مجھے ہر گھڑی یوں محسوس ہوتا رہتا ہے جیسے میں کسی مرد سے تبادلہ خیال کر رہی ہوں۔

بے حد محبت شعار اور وفادار دوست ہیں اور میرا خیال ہے کہ بے حد اچھی بیوی مہمان نواز بھی بہت ہیں۔ افسوس ہے کہ مرد معلوم ہوتی ہیں۔ ورنہ ویسے بہت اچھی دوست ہیں۔

خدیجہ مستور

منجدھار میں

وہ پھاٹک کے پاس ہی کھڑی ہو گئی۔ اس نے وہیں سے دیکھ لیا تھا کہ باغیچے میں بچھی ہوئی کرسیوں پر شکیلہ کئی آدمیوں کے ساتھ بیٹھی ایک ہاتھ کو تیزی سے جنبش دے دے کر جیسے کسی اہم مسئلے پر باتیں کر رہی تھی، لیکن اسے شکیلہ سے تو نہ ملنا تھا وہ تو اس وقت اس کے شوہر پرنسپل صاحب اور اس کی ماں بہنوں سے ملنے آئی تھی۔ بہت دن بعد — اور اس لئے کہ ذرا دیر جی بہلا لے۔ شکیلہ کی ماں کی معصوم معصوم باتیں — پرنسپل صاحب کی باتوں میں ننھے ننھے لطیفے اور حمیدہ سعیدہ کی سنجیدگی کر ہنسا دینے والی حرکتیں — کچھ تو بھول ہی جائیگی، کچھ تو اس دھیمی دھیمی جلتی ہوئی آگ سے نجات پا ہی جائیگی جو اسے جھلسائے دے رہی ہے۔ اور اب وہ کھڑی سوچ رہی تھی کہ اندر جائے یا نہ جائے۔ کوٹھی میں داخل ہونے سے پہلے شکیلہ ٹوک دے گی اور پھر اسے بیٹھنا پڑ جائے گا۔ بالکل بے وقوفوں کی طرح بیٹھنا۔ شکیلہ کو تو اپنے کام سے کام رہتا ہے۔ ہر وقت مطلب کی باتیں۔ اسی لئے تو وہ یہاں آتی نہیں وہ تو اخلاقاً بھی شکیلہ کو برداشت نہیں کر سکتی — وہ واپس ہونے کے لئے مڑی اور ایک ہی قدم اٹھایا تھا کہ شکیلہ کی آواز نے روک دیا۔

"ارے آؤ نا نگہت ڈیر' واپس کیسی ہونے لگیں؟" اور وہ آہستہ آہستہ بھیگی بھیگی گھاس کو روندتی جا کر شکیلہ کے قریب کی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"یہ ڈپٹی کمشنر صاحب — اور یہ انٹر کالج کے پروفیسر صاحب اور یہ شوگر مل کے مالک — اور آپ ہیں میری بچپن کی دوست نگہت۔ ہم دونوں نے بی۔ اے تک ساتھ ہی تعلیم حاصل کی پھر انہوں نے ملازمت کر لی اور میں —" شکیلہ کے لبوں پر مخصوص فخریہ مسکراہٹ تھی۔ اس نے تینوں سے ہاتھ ملایا اور چپ چاپ بیٹھ گئی۔ شکیلہ کے چھچھورے پن پر اس کی جان جل گئی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ اتنا وہ خود کہہ دے کہ "اور اب یہ خادمہ انھیں کے قائم کئے ہوئے کالج میں ملازم بھی ہے" مگر کہہ نہ سکی۔

"گھر میں تو سب خیریت ہے نا —؟" شکیلہ نے پوچھا

"ہاں!"

"نگہت تم کچھ [illegible] چہرہ اترا اترا ہوا ہے؟"

[illegible] شکیلہ اس کی

پوری بات سنے بغیر شوگر مل کے مالک سے مخاطب ہو گئی۔

"تو یہ بات بالکل طے ہے کہ آپ ہماری ہمیشہ مدد کرتے رہیں گے؟"

"ضرور ضرور!" شوگر مل کے مالک کے سر اور توند دونوں نے جوش سے حامی بھری۔

"اور پھر آپ دیکھیں گے کہ ہمارا یتیم خانہ عام یتیم خانوں کی طرح نہیں ہوگا" — شکیلہ جوش سے کہنے لگی — "ہمارے ہاں بھیک مانگنے کے گر نہیں سکھائے جائیں گے بلکہ بچوں کو اعلیٰ تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا جائے گا اور ان کی آسائش کا ہر وہ سامان مہیا ہوگا جو بورڈنگ ہاؤس میں رہنے والے طلباء کو میسر آتا ہے۔ بہترین غذا، اچھا لباس، صاف ستھرے بستر اور کھیل کود کا معقول انتظام۔"

"یقیناً یقیناً" مل مالک کی توند نے پھر تائید کر دی اس کے بعد شکیلہ اپنے یتیم خانے کو ایک ایسا یتیم خانہ بنانے کی اسکیم تیار کرنے لگی۔ ایسا کامیاب یتیم خانہ کہ بس ساری دنیا چونک پڑے لیکن نگہت اس کی باتوں پر توجہ دیتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ ایسا یتیم خانہ ہرگز یتیم خانہ نہیں ہو سکتا۔ عجائب خانہ ہوگا، ورنہ یتیم خانے تو وہ ہوتے ہیں جہاں یتیموں سے بھیک منگوائی جاتی ہے جہاں کبھی ان کے نصیبوں سے مناسب غذا کا انتظام ہو جائے تو وہ سب کی سب مخلصین اپنی توندوں کے تہ خانے میں گاڑ لیں [illegible] بچے مناسب غذا کھانے والوں کا صرف غم کھاتے رہ جائیں۔ جہاں کی تعلیمی حالت مڈل سے زیادہ ترقی نہ کر سکے لیکن اب دیکھنا ہے ان کا حسین انتظام۔ ہونہہ — اس نے ایک بچی بچی نفرت کی نظر سے شکیلہ کو دیکھا — اپنے گھر والوں کی نہ بنی تھی کا تو علاج ہو نہ سکا غریب سے۔ اور مری جاتی ہے شہرت حاصل کرنے کی دھن میں — پھر اسے یاد آیا کہ جب شکیلہ کے باپ نے اپنی تھوڑی بہت جمع جتھا سے بی۔ اے تک تعلیم دلا دی تھی اور چاہا تھا کہ اب وہ اپنے معصوم بھائی بہنوں اور ماں باپ کا سہارا بن جائے تو اس نے بڑی خود غرضی سے رو رو کر انہیں تعلیم جاری رکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ لیکن جب ملازمت کر لی تو کسی ایک کی مدد کے بغیر ایک ایک پیسہ کمایا۔ گھر میں بھوکے مرنے تک نوبت آ گئی۔ آخر باپ

اتا ڈگب تک کام دیتا۔ لیکن اس نے پرائمری اسکول کھول کے ہی دم لیا۔ پھر اسے ہائی اسکول بنانے کی دھن، ہائی اسکول بن گیا تو کالج کرنے کی ہوس۔ خدا خدا کر کے گھر والے آرام سے تو ہو گئے مگر وہی حالت کہ جیسے دق کا مریض سینی تودیم میں پڑا ہو ــــ لاحول ولا ــــ زرّیں نے دل ہی دل میں لاحول پڑھی۔ لاکھ عیش ہوں تو کیا۔ اماں کہہ رہی ہیں کہ خشکو جانے کیسا جی رہتا ہے ایک تھوڑی دیر بیٹھ لو پاس اور وہ کہہ رہی ہے میں سوچ رہی ہوں، بورڈنگ کی لڑکیوں کے لئے غذا میں پنیر بہت ضروری ہے ــــ توبہ ــــ

"چائے پیو گی زرّیں؟" شکیلہ نے پوچھا

"نہیں!" زرّیں نے بیزاری سے جواب دیا اور شکیلہ پھر بڑے اخلاق سے مل مالک سے باتیں کرنے لگی۔

"ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ جب دولت سرمایہ داروں کی تجوریوں میں بند رہے گی تو ظاہر ہے کہ ــــ" زرّیں نے شکیلہ کی طرف سے منہ پھیر لیا اور اس کی باتوں پر توجہ نہ دیتے ہوئے باغیچے میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ بھولا ہوا بیلا۔ پام کے کنجن ہرے درخت کروٹن کے گملوں کی لمبی قطار۔ مہندی کے چھوٹے چھوٹے درختوں کے جھنڈ۔ زمین پر ہر طرف پھیلا ہوا سبزہ اور وہ ننھی سی چڑیا جو مہندی کے درخت پر پھدک رہی تھی۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ شام ہوتی جا رہی تھی، اسے محسوس ہوا کہ وہ پھر اداس ہوتی جا رہی ہے ــــ یوں تو بہت دن سے کچھ یوں ہی اداس شامیں لگتیں اسے، مگر یہ سارے دن خوب خوب بارش ہو چکنے کے بعد کی شام ــــ ہر چیز بھیگی بھیگی، اس پر ہولے ہولے بڑھتا ہوا اندھیرا۔ جیسے روئی ہوئی حسین سانولی دلہن اور آج تو اور بھی شدت سے اس قسم کی شام اسے اداس معلوم ہو رہی تھی۔ ہاری کا آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ یاد آ جاتا ــــ جب وہ اس سے رخصت ہو رہا تھا تو اس کا چہرہ ایسی ہی شام کی طرح تاریک اور بھیگا بھیگا تھا ــــ اداسی اور بڑھنے لگی۔ اور وہ خود کو بہلانے کے لئے پھر سب کی طرف متوجہ ہو گئی۔ مگر کیسی اکتا دینے والی باتیں ــــ کیسی جان جلانے والی حرکتیں۔

"تو پروفیسر صاحب اگر آپ کے کہنے کے مطابق پہلے گھر میں چراغ جلایا جائے، پھر مسجد میں تو بس ہو چکے ساری دنیا کے کام ــــ اب آپ مجھے دیکھیے، میں نے اپنی ہر تمنا، ہر مسرت اور ہر آسائش کو خود سے دور جھٹک دیا، پھر کہیں آج یہ دن دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ ورنہ بس پھر جلا کرتا گھر ہی گھر میں چراغ۔ ہیں ہیں ـــ" شکیلہ نے ہنستے ہوئے داد طلب نگاہوں سے مل مالک کو دیکھا۔

"آپ کا کیا کہنا، آپ جیسی عورتیں تو میری نظروں سے گزری ہی نہیں" مل مالک نے جھوم کر تعریف کی اور زرّیں کا جی چاہا کہ وہ زور سے چیخے۔ بالکل نہیں ــــ بالکل نہیں۔ اور پھر وہ شکیلہ کے ان بے غرض کارناموں کا اتنا ڈھول پیٹے، اتنا، اتنا کہ بس سب کے سامنے پھٹ کر رہ جائے۔ مگر وہ جلی جلی سی چپ بیٹھی تھی۔

"یعنی واقعہ یہ ہے کہ ــــ" پروفیسر صاحب بھی اس کی تعریف میں کچھ کہنا چاہتے تھے مگر زرّیں نے پہلے ہی بھانپ لیا۔

"پرنسپل صاحب نہیں دکھائی دیتے؟" اس نے بڑی بدتمیزی سے پروفیسر کی بات کاٹ دی۔

"ہاں۔ وہ تو بیچارے آج چھ دن سے بخار میں پڑے ہیں۔ یعنی سخت ہے، جا کر دیکھ لو نا تم بھی ــــ اور ہاں ڈپٹی صاحب میں سوچ رہی ہوں کہ ــــ"

زرّیں تیزی سے اٹھی اور کوٹھی میں داخل ہو گئی اور جب پرنسپل صاحب کے کمرے میں جانے لگی تو ٹھٹھک کر دروازے ہی پر کھڑی ہو گئی ــــ گھر کے سب لوگ کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ بالکل خاموش، فکرمند۔ کمرے میں مکمل سکوت طاری تھا۔ پرنسپل صاحب آنکھیں بند کئے جیسے غنودگی کے عالم میں پڑے تھے۔ اور بجلی کی تند روشنی میں ان کا چہرہ بے حد کمزور اور دبلا نظر آ رہا تھا۔

"ارے تم زرّیں۔ آؤ نا بیٹی" شکیلہ کی ماں نے سرگوشی کے لہجے میں کہا اور اٹھ کر اسے سینے سے لگا لیا۔ وہ ان کے قریب کی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کب سے طبیعت خراب ہے"

"چھ دن ہو رہے ہیں، بخار چڑھا تو اترنے کا نام ہی نہیں لیتا ــــ" وہ کھسر پھسر کرنے لگیں۔ "ابھی دو تین گھنٹے ہوئے ہیں کہ ڈاکٹر دیکھ گیا ہے۔ پہلے کہتا تھا ملیریا ہے اور اب کہتا ہے ٹائیفائڈ ہو گیا ہے۔ کیا بتاؤں بس ــــ اللہ رحم کرنے والا ہے" انھوں نے ایک تھکی تھکی سی لمبی سانس لی۔

"گھبرانے کی بات نہیں جلدی اچھے ہو جائیں گے" اور اسے فوراً ہی اپنے بھتیجے کا خیال آ گیا۔ اس کے ننھے کا جسم بھی تو گرم ہو رہا تھا جب وہ یہاں آ رہی تھی تو اماں اسے گھٹنے پر لٹائے تھپک رہی تھیں۔ موسم خراب ہے خدا نہ کرے اسے بھی ٹائیفائڈ نہ ہو جائے۔ اتنی سی تو جان ہے ــــ اس خیال کے ساتھ ہی اس کا جی الجھا کہ گھر چلی جائے ــــ کہیں اس کے مرحوم بھائی کی نشانی کو کچھ ہو جائے تو ــــ توبہ توبہ! اس نے اس برے سے خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ پھر وہ سوچنے لگی کہ انھیں سب کے لئے تو اس نے اپنی جوانی کو خاک میں ملا لیا۔ انھیں سب کیلئے تو اس نے اپنے رات دن کا چین حرام کیا۔ انھیں کے لئے تو وہ ہاری سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئی اور اب خواہ مخواہ ہی تو سالے گھر سے [illegible] ہے۔ چلتے وقت اماں کے کہنے کے باوجود اس نے ننھے کو اٹھا کر نہ دیکھا۔ جیسے سب انھیں کا قصور ہو۔

باری سے الگ ہو جانے کا فیصلہ خود اسی نے تو کیا تھا۔ کچھ دنوں سے اس کی بجت میں وہ ہر طرف سے غافل ہو رہی تھی۔ کچھ ہوتا رہے اسے کسی بات سے مطلب نہیں۔ اماں چپ چپ کر رویا کرتیں اور وہ نہ پوچھتی۔ شمو، کو چپ چپ پھرا کرتیں صرف اس کی غفلت کی وجہ سے اور بھابی۔ اجڑی بکھری پھرا کرتی۔ ایک آدھ طنز کرتی اور چپ رہتی۔ اس نے بھی خود سے بھابی کو بنانا سنوارنا چھوڑ دیا تھا، ورنہ جب سے بھائی جان مرے تھے اس نے بھابی کو ایک دن بھی اجڑا بکھرا نہ رہنے دیا تھا۔ لیکن ادھر سے جانے کیا ہو گیا تھا۔ ہر وقت جی بیٹھا بیٹھا رہتا بس اس کے علاوہ اور کچھ سوجھتا ہی نہ تھا کہ بس باری ہو اور وہ اس کے قریب ہوتی چلی جائے یہاں تک کہ وہ اس کی ہستی میں سما جائے، کھو جائے، اور جب ایسا نہ ہوتا تو وہ محسوس کرتی کہ ایک عذاب میں مبتلا ہو ہر وقت عجیب سی کیفیت رہتی۔ شادی کا خیال رہ رہ کر ستاتا اور شاید وہ جلد ہی شادی کر لیتی اگر اس دن اماں روتے روتے اس کی کمر سے لپٹ کر یہ نہ کہتیں کہ زرین جہاں تو نے اپنی جوانی کو خاک میں ملا کر ہم سب کو جلایا ہے وہاں اب تو ہی اپنے ہاتھوں زہر کی ایک ایک پڑیا کھلا دے۔ یوں کیسے زندگی گزاریں کہ کوئی پرسان حال نہیں ـــــ اور پھر اماں اتنا روتی تھیں کہ ان کی آنکھیں سوج گئی تھیں اور اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ باری سے جدا ہو جائے گی۔ مگر اب وہ جھنجھلائی سی رنجیدہ پھر رہی ہے۔ ناحق ہی تو ـــ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔

"اوف ـــ" پرنسپل نے کروٹ لیتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔

"اوہ تم ہو زرین ـــ میں نے خواب میں بھی چاند دیکھا تھا۔" وہ شرارت سے مسکرائے مگر زرین کو معلوم ہوا کہ جیسے منہ چڑا دیا۔ کیسی بیمار شرارت ـــ پھر بھی وہ شرما گئی۔

"اب طبیعت کیسی ہے؟" زرین نے پوچھا۔

"جب تک تم ہو یقیناً اچھی رہیگی۔" زرین بے ساختہ ہنس دی۔ سالی کے رشتے سے وہ اسے اس قدر تنگ کرتے کہ کبھی تو وہ خوب ہنستی اور کبھی جھینپ کر رہ جاتی۔

"تم مجھے پوچھنے نہ آتیں ـــ" وہ پھر کہنے لگے ـــ "یہ کچھ اچھا نہ کیا ورنہ سمجھی تھا کہ حمیدہ اور لطیفہ جیسی خدمت گزار سالیوں کو چھوڑ کر میں تمہیں سے محبت ـــ"

"بس بس رہنے دیجئے۔" زرین بول اٹھی، حمیدہ اور لطیفہ اپنی جگہ پر سکڑ رہی تھیں شرم سے۔ شکیلہ کی اماں پرنسپل کو ہوش میں دیکھ کر خوشی سے کھلی جا رہی تھیں۔ زرین کو یاد آیا کہ ایک بار شکیلہ کی اماں نے کہا تھا کہ پرنسپل نے ہماری روتی بسورتی زندگی کو خدا ہنسا دیا ہے ورنہ چپ رہتے رہتے تو منہ سے بو آنے لگتی۔ خدا اسے ہمیشہ سلامت رکھے اور یہ کہتے کہتے وہ رو پڑی تھیں۔

"بیٹا گھر کی رونق ختم ہو گئی۔ خدا تمہیں جلدی سے اٹھنا نصیب کرے۔" شکیلہ کی ماں نے پرنسپل کی چٹ چٹ بلائیں لے لیں اور زرین کو یہ دیکھ کر ذرا سی حیرت ہوئی کہ پرنسپل نے خوش ہونے کے بجائے ایک لمبی آہ بھری۔ ایک لمحے کو ان کا چہرہ گہرے ـــ غم میں ڈوب گیا اور پھر وہ مسکرانے لگے۔ زرین کو شکیلہ کا خیال آ گیا۔ اسے آج کل ہر وقت ان کے پاس رہنا چاہئے۔

"تھوڑا پانی پلاؤ لطیفہ" لطیفہ اٹھ کر تھرماس سے برف نکالنے لگی۔

"کیسی طبیعت ہے؟" شکیلہ نے اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا اور پلنگ کے پاس کرسی کھسکا کر بیٹھ گئی۔

"بہت اچھی" پرنسپل نے کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔

"کہاں اچھی ہے۔ یہ تو حال ہو رہا ہے کمزوری سے کہ آنکھیں کھولنا دشوار ہے" ـــ شکیلہ کی ماں جلدی جلدی کہنے لگیں ـــ "ابھی زرین کے آنے پر ذرا بات کی۔ ورنہ کب سے غافل پڑے تھے۔"

"ڈاکٹر آیا تھا؟" شکیلہ نے اماں سے پوچھا

"ہاں آیا تھا۔ آج تو کہتا تھا کہ ملیریا نہیں ٹائیفائڈ ہوا ہے۔"

"ٹائیفائڈ؟" شکیلہ کی آواز فکر کے بوجھ سے دبی ہوئی تھی۔ زرین نے دیکھا کہ وہ پریشان سی کچھ سوچ رہی ہے۔

"کوئی بات نہیں۔ ڈاکٹر بہت لائق ہیں بخار کی میعاد پورے نہ ہو نگی۔"

"ہاں، خدا کرے ایسا ہی ہو، کیسے کمزور ہو گئے چھ ہی دن میں۔"

"کیا جب ڈاکٹر آیا تھا تو تمہیں خبر نہ ہوئی تھی؟" پرنسپل نے آنکھیں کھول کر بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

"وہ میں کچھ ایسی مصروف تھی باتوں میں کہ ڈاکٹر کو آتے جاتے دیکھا ہی نہیں۔" یہ زرین بھی پھاٹک ہی سے لوٹ رہی تھیں مگر وہ میری نظر اٹھ ہی گئی اور جو آج جوان کے دیدار ہو گئے اس سے بھی محروم رہ جاتے۔ کالج میں تو غضب کی مصروفیت ہوتی ہے کہ ان سے ملنے کا موقع بھی نہیں ملتا۔ اور تم بھی تو مہینوں کے بعد ادھر آتی ہو۔"

"مجھے بھی خدا کہاں فرصت ملتی ہے۔" زرین نے بہانہ کیا۔

"ایک خوش خبری تو سن ہی لو" شکیلہ نے پرنسپل کا ہاتھ چھوتے ہوئے کہا کہ ـــ "وہ پانچ دن سے چھٹی پر گھر پہ تھیں تو کہیں آج ان کا تبادلہ

[illegible] مشکل کے بعد انھوں نے یتیم خانے کے لئے اپنی بلڈنگ دینے کا وعدہ کیا ہے۔ وہی بلڈنگ جسے دیکھ کر تم نے کہا تھا کہ اگر یہ مل جائے تو کیا اچھا ہے۔ اس کے علاوہ بھی انھوں نے یتیم خانے کے لئے ماہوار معقول رقم مقرر کرنے کا وعدہ کیا ہے۔"

"اچھا!" پرنسپل نے ایک خشک سی ہوں کی اور زرین ان کا منہ تکنے لگی۔ یہ تو ہمیشہ سے شکیلہ کے شریک کار رہے۔ اس کے کارناموں کو سراہتے رہے۔ تھپکی دے دے کر اسے آگے بڑھاتے رہے لیکن آج ایک ہلکی سی مسرت کا اظہار بھی نہیں۔ شاید اس سے پہلے وہ بیمار نہ پڑے ہوں گے اس طرح "خفقان ہی ہی میں ہنسی۔"

"ابھی اب پندرہ بیس دن کی دوڑ دھوپ اور چاہئے۔ دیانت دار شکلیں تلاش کرنی ہیں اور ——"

"مجھے خاموشی چاہئے۔" پرنسپل نے آنکھیں بند کر کے شکیلہ کی طرف سے کروٹ لے لی۔ شکیلہ کی ماں نے زرین کو اس طرح دیکھا جیسے وہ کہہ رہی ہوں۔ —— دیکھا تم نے، بھلا یہ ایسی باتوں کا وقت تھا —— اور زرین کو شکیلہ کی وہ بات یاد آگئی، جب اس نے کہا تھا۔ "سچی زرین پہلے تو پرنسپل مجھ سے محبت کرتا تھا اور میں صرف اس لئے اس کی محبت کا جواب محبت سے دے دیا کرتی تھی کہ اس کی مدد کے بغیر کالج کا قیام مشکل ہے۔ مگر ابھی کالج بنا نہیں اور مجھے بھی اس سے محبت ہو گئی لیکن کچھ ہو جائے میں اس سے اس وقت تک شادی نہیں کروں گی جب تک کالج کا سب ٹھیک ٹھاک نہ ہو جائے ——"

پھر وہ سوچنے لگی کہ جب اس نے محبت کو فائدے پر قربان کر دیا تو اب وہ ان کی بیماری کی وجہ سے بھلا کیسے تمام باتوں سے توبہ کر لے۔ یہ بھی کوئی وہ ہے —— جس نے زندگی تباہ کر لی گھر والوں کی زندگی بنانے کے لئے اور اب وہ کیسی تنہا، سطحی بھٹکی روتی سی پھر رہی ہے۔ اب نہ کوئی شام کی اداسیوں میں اسے بہلانے والا ہے نہ کوئی اس کا دکھ درد پوچھ کر اس کی تسلی کرنے والا ہے۔ وہ کچھ کرتی ہے اس کا اپنا کوئی ساتھی نہیں۔ زندگی چھتنار بیل کی طرح پھیل کر رہ گئی۔ پھر بھی وہ ضبط کئے ہوئے ہے، اتنے دن کا ناتا کیسی آسانی سے توڑ لیا صرف ماں کے آنسوؤں کو دیکھ کر۔ بھرا پرا مکان گرتا ہے تو وہ چار اس کی زد میں آکر ضرور ختم ہو جاتے ہیں۔ مگر اس نے سب کو بچا لیا اور خود بھی ہے مردوں سے بدتر اور ——

"کیا تم سونا چاہتے ہو؟" شکیلہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔ زرین نے دیکھا کہ وہ کچھ ناراض سی تھی۔ اس کا نچلا ہونٹ لٹکا ہوا تھا اور پیشانی پر ایک موٹی سی لکیر ابھر آئی تھی۔

"نہیں، لیکن اس وقت تمہاری باتیں سننے سے زیادہ بہتر ہے کہ میں زرین، لطیفہ اور حمیدہ سے باتیں کروں۔ مجھے سکون چاہئے۔" پرنسپل نے بھی سنجیدگی سے جواب دیا۔

"ہوں!" شکیلہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی اور پاؤں پٹختی تیزی سے کمرے سے باہر ہو گئی۔ پرنسپل اسی طرح آنکھیں بند کئے رہے۔

"دیکھا تم نے ——" شکیلہ کی اماں زرین کے بالکل پاس ہو کر کھسر پھسر کرنے لگیں —— "یہ کوئی روٹھنے کی بات تھی، آج چھ دن سے بخار چڑھا ہے غریب کو اور وہ بس منہ چڑھانے کو آجاتی ہے جیسے۔ غضب خدا کا اس پر یہ تیہا — مگر کوئی کچھ کہہ تھوڑا ہی سکتا ہے۔ وہ تڑ تڑ جواب دیتی ہے کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے۔"

انھوں نے لمبی سانس لیکر سر جھکا لیا۔ زرین چپ چاپ بیٹھی رہی۔ حمیدہ لطیفہ بھی چپ، یعنی اور کچھ سوچ رہی تھیں۔ کمرے میں ایک دم ناگوار سی خاموشی چھا گئی تھی اور پرنسپل کی تیز تیز سانسوں کی آواز جیسے لڑتی جھگڑتی معلوم ہو رہی تھی۔ زرین کا جی الجھنے لگا تو وہ جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"امی! کیا چلیں؟"

"جی!" شکیلہ کی ماں نے اٹھ کر اس کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا۔ حمیدہ اور لطیفہ نے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھے ہی بیٹھے سلام کیا اور پرنسپل اسی طرح آنکھیں بند کئے رہے۔ وہ آہستہ سے کمرے سے نکل گئی اور جب وہ باغیچے سے گزر رہی تھی تو اس نے دیکھا کہ شکیلہ تنہا ایک کرسی پر بیٹھی، میز پر سر رکھے سسک سسک کر رو رہی ہے۔ اسے یوں روتے ہوئے چھوڑ کر اس سے جاتے نہ بن پڑی۔

"رو کیوں رہی ہو شکیلہ ——؟" اس نے شکیلہ کے قریب کھڑے ہو کر آہستہ سے پوچھا۔

"کیوں رو رہی ہوں ——" اس نے ایک دم سر اٹھایا اور دکھی دکھی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ دھلی دھلی چاندنی میں روتی ہوئی شکیلہ اسے بڑی حسین نظر آئی۔

"بدقسمت جو ہوں ——" وہ غم و غصے سے کانپتی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔ "ابھی تک تو اماں بہنیں ہی ہر وقت طنزوں کا نشانہ بنایا کرتی تھیں لیکن اب تو [illegible] صاحب بھی چل نکلے۔ بس یہ سب یہ چاہتے ہیں کہ اگر کسی کا سر پھوڑ دوں [illegible] سے لگ جاؤں۔ ساری دنیا کے کام چھوڑ دوں اور یہ نہیں کہ یہاں پڑی رہوں [illegible]

یہ لوگ تو یہ بھی چاہتے ہیں کہ دن میں دس بار باری باری سب کے پاس جاؤں، مزاج پرسی کروں۔ ان کی ہر ضرورت خود ہی پوری کروں اور زمانے بھر کے بچے ـــــ میں تو بیزار ہوں۔ اب ذرا سوچو تو اگر میں یہ سب کرتی رہوں تو آخر آرام کس وقت کروں۔ آخر مجھے بھی تو دو گھڑی سکون چاہئے۔ اُوف ـــــ سب خود غرض ہیں " ـــــ وہ پھر سسک سسک کر رونے لگی۔ نذیں اسی کے قریب کی کرسی پر بیٹھ گئی۔

" یہ تو ان کی محبت کا تقاضہ ہے کہ وہ کچھ دیر تمہارے پاس بھی رہنا چاہتے ہیں " اس نے سمجھانے کے لئے کہا: " ارے تم کیا جانو۔ تم کچھ نہیں جانتیں۔ یہ لوگ قطعی نہیں چاہتے کہ میں اپنی خوشی کے لئے کچھ کروں۔ میری بھی کوئی تمنا پوری ہو۔ میری سب سے بڑی تمنا تھی کہ میں مر جاؤں مگر میرا نام زندہ رہ جائے۔ برساتی کیڑوں کی طرح پیدا ہونا اور مر جانا بھی کوئی بات ہے۔ اور اسی کے لئے میں نے اپنی جوانی مٹی کر ڈالی۔ اور آخر ان سب کو دکھ ہی کیوں ہو۔ میں نے ان کی خوشیوں کے لئے کیا کچھ مہیا نہیں کر دیا ہے۔ کون سا عیش ہے جو نصیب نہیں۔ لیکن کسی ایک کی بھی ناک سیدھی ہے۔ کبھی تم نے دیکھا کہ کوئی مجھ سے سیدھے منہ بات کرتا ہو۔ اور مجھے تو رنج اس بات کا ہے کہ آج وہ حضرت بھی چل نکلے چھ دن سے دم مارنے کی مہلت نہیں ملی۔ دیکھا تھا تم نے انھوں نے کیا سلوک کیا۔ پٹی سے کبھی نہیں لگے رہے ان کی۔ ہُنہہ۔ خود غرض ـــــ " وہ دونوں ہاتھوں سے کنپٹیاں دبانے لگی۔

اور اُسے خیال آیا کہ جن دنوں وہ باری کی محبت میں اپنی خوشیاں تلاش کر رہی تھی تو گھر میں سب کیسے روٹھے روٹھے پھرتے جیسے راندۂ ہو گئے ہوں۔ نذیں پھر اس غصے اور بیزاری میں جکڑنے لگی جس سے ذرا دیر کو نجات مل گئی تھی۔ شکیلہ روتے روتے ایک دم اٹھی اور اس سے کچھ کہے بغیر تیزی سے کوٹھی میں داخل ہو گئی۔ اس نے دیکھا کہ شکیلہ اپنے کمرے کی طرف کی سیڑھیاں پھرتی سے طے کر رہی ہے۔ وہ اٹھی اور آہستہ آہستہ گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ راستے بھر وہ شکیلہ کی ہمدردی میں بہت کچھ سوچتی رہی۔

گھر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ علاوہ بھابی کے سب لوگ کھانے پر اس کا انتظار کر رہے ہیں اور وہ ننھے کو گود میں لئے متفکر سی بیٹھی ہے۔ اس نے کپڑے تبدیل کئے اور جا کر اپنے بستر پر لیٹ گئی۔

" کھانا نہیں کھاؤ گی ؟ " اماں نے پوچھا

" نہیں ! "

" ننھے کا بخار تیز ہو گیا نند " بھابی نے کہا۔

" ہوں " ـــــ اس نے کروٹ لے لی۔

" توبہ ! تم نے ذرا ہاتھ رکھ کے بھی نہ دیکھا بچے کو " بھابی کی آواز میں غصہ تھا۔ وہ زیر لب بڑبڑانے لگی ـــــ اتنے مسٹنڈے پھر رہے ہیں گھر میں دیکھنے کے لئے۔ گھر میں منزود ننھے صاحب کے سرہانے بیٹھ کر دلجوئی کروں۔ میری تھکن کا احساس بھی نہیں۔ بس فنا کر دو مجھے تب چین پڑے ـــــ بڑبڑاتے ہوئے اس نے بازوؤں میں منہ چھپا لیا۔ اور پھر اس کا ایک ایک ایثار، ایک ایک قربانی، گھر والوں کے خلاف غصہ بن بن کر اُبھرنے لگی۔ لیکن جب سب سو گئے تو وہ باری کو یاد کرنے لگی ـــــ نکھری نکھری چاندنی، بھیگی بھیگی ہوا۔ جھینگروں کے شور مچانے کی آواز۔ اور اسے محسوس ہوتا رہا کہ جیسے اداسی سر پٹخ کر رو رہی ہے۔

صبح اس نے کالج میں چھٹی کی درخواست بھجوا دی، اور گھر میں سب سے الگ تھلگ پڑی رہی۔ باری کی یاد میں شدت سے تڑپنے کیلئے اور گھر والوں کو اپنی بے التفاتی سے سزا دینے کے لئے وہ چھ سات دن تک یوں ہی الگ تھلگ پڑی رہی۔ اداسیاں بڑھتی گئیں، صبحیں اور بے کیف ہوتی گئیں، دوپہریں اور ویران ہوتی گئیں، شامیں اور اداس ہوتی گئیں اور راتیں ـــــ جیسے کسی نے اسے پکڑ کر الاؤ کے قریب ڈال دیا ہو۔ وہ ہٹ نہیں سکتی۔ نہ جانے کب تک اور آگ کی تپش اس کی ساری جان جلسائے دیتی ہے۔ اس کی اس حالت کے بعد گھر میں سناٹا چھایا رہنے لگا۔ بھابی ایک آدھ طنز کرنے کے علاوہ سارا وقت خاموشی سے کاٹتی۔ شمو کو مغموم سی نظر آتیں، اماں کی آنکھوں میں ہر وقت آنسو چھلکا کرتے اور چچا کو دن میں کئی بار دمے کی کھانسی کا دورہ پڑتا۔ لیکن وہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی کسی کو نہ پوچھتی۔ اسے یہ سب کچھ دیکھ کر سکون ملتا۔ وہ بے اعتنائی برت کر جیسے ان سب سے انتقام لے رہی تھی۔ باری سے جدا ہو جانے کا انتقام ـــــ !

" نذیں یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے ـــــ " ایک دن اس کی اماں اس کے پاس آکر بیٹھ گئیں ـــــ " اب تو تم نے ہم سب سے یوں منہ موڑ رکھا ہے۔ جیسے کوئی اپنے جسم پر لگی ہوئی غلاظت دھو ڈالے۔ تمہارے چچا کی طبیعت کتنی خراب ہے۔ مگر تم نے پوچھا بھی نہیں۔ تمہاری بھابی کیسی اُجڑی اُجڑی پھر رہی ہے۔ مگر تم نے ایک دن بھی اس بدنصیب کی خبر نہ لی اور ـــــ "

" کیوں پھرا کرتی ہے اُجڑی اُجڑی ـــــ " اس نے اماں کی بات کاٹ دی۔ " کیا ایک آپ کا سامان ختم ہو گیا اور منگا لیا جائے اور چچا جان کو ایک ڈاکٹر سے فائدہ نہیں ہوتا تو دوسرے کو دکھایا جائے۔ یہ ضروری تو نہیں کہ یہ سب کام میرے بغیر نہ ہوں ـــــ " اس نے بیزاری سے منہ پھیر کر اماں کی طرف سے کروٹ لے لی۔ تھوڑی دیر تک وہ اماں کی دبی دبی سسکیوں کی آواز سنتی

پھر اسے چیلوں کی سٹ پٹ کرنے میں گونج کر باہر ہو گئی اور اس نے محسوس کیا کہ ان کے لئے اس کے دل میں ہمدردی کا ہلکا سا جذبہ بھی نہ ابھرا تھا ——

یوں ہی پندرہ دن گزر گئے پڑے پڑے۔ وہ پرنسپل تک کو دیکھنے نہ گئی پھر گھر میں کسی سے کیا بولتی۔ اماں نے بھی اس سے پھر کچھ نہ کہا۔ ہاں گھر میں سناٹا اور زیادہ چھاتا جا رہا تھا۔ بس کسی کسی وقت ننھے کے رونے یا ہنسنے کی آوازیں سناٹے کو چیرتی ہوئی سنائی دے جاتیں۔

"پرنسپل صاحب مر گئے"

"ایں!" وہ بوکھلا کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے دیکھا کہ اماں کی آنکھوں میں آنسو تھے اور ہونٹوں میں لرزش۔ وہ کپڑے تبدیل کئے بغیر کمرے سے نکل گئی اور تیزی سے شکیلہ کی کوٹھی کی طرف چل پڑی۔ جیسے جیسے کوٹھی کے قریب آتی جاتی رونے چیخنے کی آوازیں پاس ہوتی جاتیں۔ اور پھر وہ باغیچے میں بیٹھے ہوئے بہت سے آدمیوں کی پروا کئے بغیر بھاگتی ہوئی کوٹھی میں داخل ہو گئی۔ شکیلہ کی ماں اور بہنیں چیخ چیخ کر رو رہی تھیں۔ شکیلہ کا بھائی رومال سے منہ چھپائے بیٹھا تھا اور شکیلہ وہاں نہ تھی۔ کچھ دیر تک وہ انھیں سمجھاتی رہی۔ چپ کراتی رہی اور شکیلہ کے لئے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ پرنسپل کی لاش کے پاس بیٹھی تھی۔ وہ ان سب کو چھوڑ کر شکیلہ کے پاس چلی گئی۔ اجاڑ ویران کمرہ اور شکیلہ وہاں زمین پر چت لیٹی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے، چہرہ ایک دم سفید۔ خشک پھٹی پھٹی آنکھیں۔ نذیں کو پہلی بار احساس ہوا کہ وہ بوڑھی ہو رہی ہے۔

"شکیلہ" اس نے پکارا لیکن شکیلہ کو ہلکی سی جنبش بھی نہ ہوئی۔ اسی طرح اس کی آنکھیں سفید چادر میں ڈھکے ہوئے پرنسپل پر جمی رہیں۔

"شکو، شکو!" اس نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ شکیلہ اسی طرح بے سدھ پڑی تھی۔

"کچھ تو بولو شکو۔ بولو، بولو" وہ پھر اسے زور زور سے جھنجھوڑنے لگی کہ کہیں اس طرح اسے سکتہ نہ ہو جائے۔ اور ایک دم پاگلوں کی طرح چیختی ہوئی اٹھ بیٹھی۔

"نذیں، یتیم خانے کی بنیادیں ہلا دو۔ کالج کو پھونک دو" —— وہ چیخنے لگی "مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ کچھ نہیں —— اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔ پھر آہستہ آہستہ کہنے لگی۔ اس نے مرنے سے چند گھنٹے قبل کہا تھا شکیلہ تم جانے کیا سمجھتی ہوگی۔ مجھے تم سے بے حد محبت ہے۔ اور ان دنوں تو میں نے شدت سے محسوس کیا کہ میں تمہارے بغیر ایک منٹ بھی نہیں رہ سکتا۔ مگر تم یتیم خانے کی بنیادیں مضبوط کر رہی تھیں۔ اور میری زندگی کی بنیادیں کھوکھلی ہوتی جا رہی تھیں۔ کاش تم جان سکتیں کہ بعض حالتوں میں محبت اور ہمدردی کی کس قدر ضرورت ہوتی ہے۔ شکو، میں نے بے حد کڑھ کڑھ کر اتنے دن گزارے ہیں" —— وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پھر ایک دم کھڑی ہو گئی۔

"جاؤ —— جاؤ —— سب کچھ جلا دو" وہ پھر چیخنے لگی۔ اس نے دیکھا کہ شکیلہ کے چہرے پر پاگلوں جیسی دہشت رچی ہوئی تھی۔ چیختے چیختے وہ لیٹ گئی بالکل اسی طرح۔ اسے پھر ہمت نہ ہوئی کہ شکیلہ سے کچھ بولے چپ چاپ کمرے سے نکل گئی۔

پھر چیخیں بلند ہوئیں۔ آنسو بہے اور پرنسپل کو آخری منزل تک پہنچا دیا گیا۔ لیکن شکیلہ چپ پڑی تھی اس کی آنکھ میں ایک آنسو نہ تھا اس وقت اور جب وہ گھر واپس جا رہی تھی تو اس کے قدم تیز ہوتے جا رہے تھے۔ اور تیز اور تیز۔ یہاں تک کہ وہ بھاگنے سی لگی۔ آج جب وہ یہاں آ رہی تھی تو چچا کو دورے کا سخت دورہ پڑا ہوا تھا۔

اردو غزل اور حسنِ ادا —— بقیہ صفحہ ۵۹

صبح پو پھٹنے سے قبل اور غروب کے شفقی دھندلکے میں جب تاریکی اور روشنی ہم آغوش ہوتی ہیں دل کیوں پراسرار کیفیت محسوس کرتا ہے؟ صبح اور شام کی مبہم کیفیت روحانی تزکیہ کے لئے موزوں خیال کی جاتی ہے۔ دنیا کے ہر مذہب میں ان اوقات کے لئے عبادتیں رکھی گئی ہیں۔ فطرت کا ابہام جذبات میں تخیل کی آمیزش کرتا اور ان کی شدت کو بڑھاتا ہے حسن و عشق کی رنگینیوں اور کیفیتوں کی تکمیل کے لئے سوا اس فضا کے کوئی اور دوسری ساز گار نہیں ہو سکتی۔ تغزل کے ابہام کی یہی توجیہ ہے۔ ابہام اس کا عیب نہیں ہنر ہے چونکہ ذوقِ حسن اور لطافتِ جذبات کا اظہار رمز و ایما ہی کے ذریعہ اثر آفریں ہو سکتا ہے۔ اس لئے ہمارے غزل گو شاعروں نے جو فنکارانہ اسلوب اختیار کیا وہی اس صنفِ سخن کے لئے موزوں تھا اور اسی سے غنائی اور عشقیہ شاعری کی قدریں متعین ہو سکتی تھیں۔ لیکن ان قدروں کا متعین ہو جانا کافی نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر زمانے کی تنقید اپنی نئی بصیرتوں سے ان کی بازآفرینی کرتی رہے۔ اس بازآفرینی کی بدولت روحِ تغزل کبھی فسردہ یا مردہ نہیں ہوگی اور اس کے سدا بہار پھول مشامِ جان کو ہمیشہ معطر کرتے رہیں گے۔

قدرت اللہ شہاب

انتظار

کردار:-

جامع مسجد
لال قلعہ
پُرانا قلعہ
چاندنی چوک

مقام- دلی

وقت- ۱۵ راگست کے بعد

جامع مسجد:- خاموش! موذن اذان دینے کھڑا ہوا ہے۔

(وقفہ)

پُرانا قلعہ:- ہو چکی اذان؟

جامع مسجد:- (دُعا پڑھتی ہے) اے اللہ تو نے ہمیں اپنی طرف بلایا ہم تیری ہی طرف رجوع کرتے ہیں۔

پُرانا قلعہ:- مجھے تو سنائی نہیں دی۔ میں پوچھتا ہوں صاحب مع وہ تمہارے بلال کیا ہوئے جن کی گونج دم بھر کے لئے میرے ویرانوں کو بھی اللہ کے نام سے آباد کر دیتی تھی؟

جامع مسجد:- میرے بلال تو اللہ کے اب بھی جیتے ہیں لیکن یہ چاندنی چوک میں دن رات کا اودھم مچا رہتا ہے اسی کی وجہ سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔

چاندنی چوک:- تو بی بی- یہ بھی خوب رہی! سر پہ آئی اوروں کے ٹلائی- بس خدا کے لئے میری زبان مت کھلواؤ۔

جامع مسجد:- خود تو بیٹھی ہو برسوں سے میری چھاتی پر مونگ دل رہی ہو- اور مجھے زبان بھی ہلانے کی اجازت نہیں۔

چاندنی چوک:- اے ہے کیا جھینپ لیا ہم نے تمہارا، کون سے مونگ دلے ہیں نے تمہاری چھاتی پہ، جیسے کچھ خدا کے لئے کھڑی ہوئی ہے۔

جامع مسجد:- اللہ کرے میں کسی سے لڑتی پھروں- اپنی عزت اپنے ہاتھ

بی بی- میں کیوں تیرے منہ لگنے لگی۔

چاندنی چوک:- اری چل! مصلّوں میں لپیٹ کے رکھ اپنی عزت کو آئی بڑی پارسا کہیں کی- ہوا، میری زبان نہ کھلواؤ- نہیں تو ساری عزت خاک میں ملا کر رکھ دوں گی۔

لال قلعہ:- لاحول ولا قوۃ- یہ تمہاری آپس کی بک بک کبھی بند بھی ہو گی یا نہیں؟ جب دیکھو جوتی بیزار ہے- ہم تو تنگ آ گئے اس روز کی تکا فضیحتی سے- ابھی قیلولہ پورا بھی نہ ہوا تھا کہ آنکھ کھل گئی- اُف! طبیعت کس قدر منغّض ہے- ہم کہتے ہیں ذرا چپ ہو جاؤ تو ہم بھی دو گھڑی کو آنکھ جھپکا لیں- ہمیں ذرا عادت ہے آرام کی۔

(پرانا قلعہ ایک تلخ اور طنزیہ ہنسی ہنستا ہے)

لال قلعہ:- تم ہنسے؟

پُرانا قلعہ:- ہم یوں ہنسے کہ تمہارے منہ سے سُنا کہ تمہیں آرام کی عادت ہے!

لال قلعہ:- تو میاں اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟ تم نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے ہم اب نہ سہی لیکن کبھی ہمارے بھی دن ایسے تھے کہ زمین ہمارے وجود کو اپنا نگینہ سمجھتی تھی اور تا روز بھر آسمان زمین کی قسمت پر رشک کرتا تھا- صاحبقران ثانی کا دربار معلٰی ہے- دیوان عام دم بخود دزانو بیٹھا ہے- دیوان خاص غلغلہ ادب سے سربسجود ہے- دبدبہ ہے- انتظام ہے- سکوت ہے- ایک خاموشی ہے کہ رعب شاہی کے حضور میں سرنگوں ہے- تختِ طاؤس کے ہیرے، موتی اور جواہرات قاف کی پریوں کی طرح ناچ رہے ہیں چمک رہے ہیں جگمگا رہے ہیں نقیب نے نزول شاہی کا اعلان کیا- باادب باملاحظہ ہوشیار- بادشاہ۔۔۔

چاندنی چوک:- اے حضور! تم بسم اللہ کیا کا قصہ چھیڑ دی بڑا بھی نے لال قلعہ [illegible] الاپ کتاب سے عشق ہے معلوم ہوتا ہے کہ جو تُو دو جوتی اور ہی ہے عشق کے مشک کچھ نہیں لال ہماری کی ایک

شہنشاہِ عالم کے حضور میں عقیدت کی نظریں۔ سینے میں
ارمان، دلوں میں خوف۔ شوق میں تڑپ.......

لال قلعہ:۔ شہنشاہیت کے کیا کیا رنگین خواب ہماری آغوش میں بیدار
ہوئے، اور سو گئے۔ بادشاہی کے کیا کیا بلند پرچم ہماری پیشانی پر
لہرائے۔ نغمہ و سرود کے کیسے کیسے چشمے ہماری چھاتی سے پھوٹے۔
عشرت و نشاط کی کیا کیا راتیں ہماری آنکھوں میں جاگیں.......
ہائے ہماری اینٹ اینٹ سے پوچھو۔ ہماری رگوں میں تڑپتے
ہوئے نغمے نغمے سے دریافت کرو۔ جن کی روح پر ایک
سو سال کی بے دلی، بے طربی، بے خوابی کا رنگ سانپ کے
زہر کی طرح چڑھا ہوا ہے۔

چاندنی چوک:۔ صاحبِ عالم قلعۂ معلیٰ کی وہ پرکیف شامیں، جن کا سرور ساری
دلی پر شراب کے نشے کی طرح چھا جاتا تھا۔ ناچ اور رنگ کی وہ
محفلیں جن کی جھنکار سے میری چھاتی بھی گونج اٹھتی تھی۔ کبھی شاہ و
کبھی غالب۔ اور کلامِ ظفر کی وہ ظفر یابی۔ ہائے حضور، آپ
کے دم سے میری دنیا بھی آباد تھی۔ دور دور بھیڑ کا زور ہو رہا ہے۔
گلی گلی میں محفلیں جمی ہوئی ہیں۔ ٹکڑے ٹکڑے پر دادِ سخن مل رہی ہے۔
ادھر مومن جان نے طبیعت کی تال پر کائنات کو نچا کے رکھ دیا۔ ادھر
استاد ... کے طبلوں کی تھاپ پر دل کی دنیا لرزنے لگی۔
یہاں کباب۔ وہاں شیشہ۔ یہاں رنگ، وہاں بو۔ ہائے وہ
سرود و نغمہ، ہائے وہ ... تیری شانِ کبریائی.......

لال قلعہ:۔ ہماری رگ رگ میں گلاب اور موتیے کے شکیبا رعطر سمندری
لہروں کی طرح بہتے تھے۔ بھیروی ہوا کی ذرا سی اکڑی سے، فضا کی
فضائی کثافت سے ہماری سیم تن، زہرہ جمال، نازک بدن، نازک
خیال شہزادیوں کا دم گھٹنے لگتا تھا۔ اور ہمارے بنفشی سردخانوں
کی گود میں وہ کلیاں یوں بکھر جاتی تھیں، جیسے برف کے گالوں
میں سیب کے پھول، جیسے.......

چاندنی چوک:۔ اگر میری روشوں پر ایک کانٹا بھی بکھرا ہوا پاتو بیگمات کو پالکی
میں بیٹھے بیٹھے بھی خلش کا احساس ہوتا تھا۔ اگر میرے راستوں
میں کنکر نظر آتے تو رنگین چلمنوں کی اوٹ سے جھانکنے والی
زہرہ جبینوں کے پاؤں میں موچ آجاتی تھی۔
(بھانا گھبر زور زور سے ہنستا ہے۔ اس قدر ہنستا ہے کہ اس کی
ایک دیوار کے چند پتھر لڑھک کر نیچے آ رہتے ہیں۔)

لال قلعہ:۔ یا وحشت! یہ ہنسی کا کونسا خزانہ مل گیا آخر تمہیں؟

چاندنی چوک:۔ اے حضور، بندی کی توبہ۔ اتنی ہنسی بھی آخر کیا۔ ذرا ملاحظہ
تو فرمائیے، بی بی جامع مسجد کے ماتھے پر غصے کے لاکھ
تیوریاں بل کھا رہی ہیں!

لال قلعہ:۔ برا نہ مانو بی جامع۔ ہمیں ذرا بیتی ہوئی گھڑیاں یاد آگئیں۔ آہ،
تمہاری آنکھ بھی تو ہمارے ہی ساتھ ساتھ کھلی تھی۔ صاحبقرانِ ثانی
نے کس پیار و شوق سے تمہیں پالا پوسا۔ تمہارے ہاں تو آج بھی
پانچ وقت کے نمازی جمع ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہماری دنیا میں
صرف بھیانک ویرانیاں ہیں۔ اللہ تمہیں نیکی دے، کچھ کم
ایک سو سال سے ہم نیم زندہ لاش کی طرح سسک رہے ہیں۔
نہ تو سرِ شام ہمارے سر پر چراغاں کا تاج چڑھتا ہے۔ نہ صبح سویرے
طرب نواز حنائی انگلیاں ستار کی دھن چھیڑ کر ہمیں خوابِ استراحت
سے بیدار کرتی ہیں۔ نہ ہمارے ایوانوں میں ماہ و انجم کے دربار
منعقد ہوتے ہیں۔ نہ ہمارے شبستانوں میں حسن و سرود کی
محفل جمتی ہے۔ چاندنی، ہم جیتے جی بھی مردہ ہیں۔ ہم کیوں نہ
ایک روز زمین سے سر پھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سو جائیں؟

چاندنی چوک:۔ ایسا نہ کہئے، ظلِ الٰہی۔ ایسی بے آسی بھی آخر کیا۔ دن تو سبھی کے
پھرتے ہیں۔ ایک ذرا میری ہی طرف دیکھئے۔ کیا کیا نہ دیکھے
تھے میں نے۔ تیموری اور نادر شاہی قتلِ عام۔ خونریز حملے۔ ہولناک
لڑائیاں۔ ہیبت غدر — آہ میرا ذرہ ذرہ گرم گرم خون کے
دھاروں پر پروان چڑھا ہے۔ اگر کچھ روز مجھے یہ لال دودھ نہ
ملے، تو میری چھاتی کی رگیں سوکھ کر کانٹا ہو جاتی ہیں۔ سنئے حضور،
جامع کی طرح میں بھی ایک سو برس سے پیاسی پڑی تڑپ رہی تھی۔
سسک رہی تھی۔ سوکھ رہی تھی۔ لیکن نصیبہ بدلتے کیا دیر لگتی
ہے حضور۔ ابھی اگلے دن کی بات ہے، کہ میری چھاتی پر خون
کی وہ وہ ندی پھیل گئی، لہو کے وہ وہ چھینٹے اڑے کہ کیا کہوں۔
بس مزا آگیا۔ تیموری تلواروں اور نادر شاہی خنجروں کی کوند بھی
ماند پڑ گئی۔ کیسے کیسے جیون پر خشکی اور بے گیاہی اور بے رنگی کے
جو بادل چھائے ہوئے تھے، چھٹ گئے۔ وہ پیاس جو برس ہا برس
سے میرے گلے میں کانٹے کی طرح اٹکی ہوئی تھی، بجھ گئی اور ...

اوپندر ناتھ اشک

جب سنت رام نے بیلن اٹھایا

سنت رام میرا نوکر نہ تھا۔ ہمیں سلام دعا ہی کا رشتہ تھا۔ میرے بلاک کے اوپر دوسری منزل میں رہنے والے ایک سندھی سیٹھ کے ہاں وہ کام کرتا تھا۔ کانگڑے کا رہنے والا تھا۔ کبھی خطوط پڑھانے میرے پاس آجاتا تھا اور اسی ناطے سے میرے چھوٹے موٹے کام کر دیتا۔ ساڑھے پانچ ہاتھ کا گورا چٹا خوبصورت اور مضبوط آدمی، لیکن عجز اور انکسار کا پتلا۔ باتیں کرتا تو کبھی آنکھ اوپر نہ اٹھاتا۔

ایک دن پڑوس میں کچھ شور سنکر میں اپنے دروازے کی چوکھٹ میں آکھڑا ہوا، تبھی سنت رام میرے سامنے سے بھاگتا ہوا سا گیا۔

"کیا بات ہے"، میں نے پوچھا۔

"جی کچھ جھگڑا ہو رہا ہے، ابھی آکر بتاتا ہوں"

چند ہی منٹ بعد وہ واپس آگیا۔ معلوم ہوا کہ پڑوس کے سیٹھ کی جو نئی بیوی آئی ہے وہ نوکر چھوکرے کو بڑا پریشان کرتی ہے۔ ابھی ابھی اس نے چھوکرے کو گالی دی، چھوکرا جوان ہے، اس سے برداشت نہیں ہوئی۔ اس نے احتجاج کیا تو بیگم صاحبہ کی لاڈلی نے دھڑ سے ایک تھپڑ اس کے منہ پر جما دیا۔ چھوکرے نے بیگم صاحب سے کہا تو کہنے لگی کہ پندرہ دن کا نوٹس دئے بغیر تو جا کیسے سکتا ہے۔ چھوکرے نے ضد کی تو بیگم صاحبہ بھی اپنی لاڈلی کی مدد کو آگیا۔ چار چھ تھپڑ اس نے جڑ دیئے۔ شور سنکر پڑوسی اکٹھے ہو گئے، لیکن سمجھوتہ ہو گیا ہے۔ چھوکرے نے پندرہ دن کام کرنا منظور کر لیا ہے اور سیٹھ نے پندرہ دن کے بعد سے چھٹی دینے کی بات مان لی ہے۔

"ساڑھے پانچ ہاتھ کا گبرو جوان ہے" سنت رام نے جھگڑنے کی رپورٹ دیکر اپنی طرف سے اضافہ کی "تھپڑ اور گالیاں کھا کر جواب نہ دے سکتا تھا تو کام تو چھوڑ سکتا تھا۔ دس پندرہ دن کی پگار[1] اچھی کہ عزت"۔

میں حیرت سے سنت رام کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ میں نے کبھی اسے بلند آواز سے بولتے نہ سنا تھا لیکن اس وقت نہ صرف اس کی آواز بلند تھی بلکہ اس کی آنکھیں بھی ول ول انگارہ ہو رہی تھیں، گویا بے عزتی چھوکرے کی نہیں خود اس کی ہوئی ہو۔

"اب تو صاحب بیوی ہے، بچے ہیں اور گھر کی ضرورتوں نے خون کی تمام گرمی نکال دی ہے۔ چار باتیں سنکر بھی چپ رہنا سیکھ گئے ہیں" سنت رام کہنے لگا "ورنہ جب میں اس چھوکرے کی عمر کا تھا ایک مالکن نے یوں ہی مجھے گالی دی تھی۔ کھانا پکا رہا تھا میں نے بیلن اٹھا لیا۔ وہ بھاگ کر کواڑ بند نہ کر لیتیں تو میں انکا سر پھوڑ دیتا۔"

افلاطون نے کہا ہے "ظاہر دیکھکر باطن کو نہیں جانا جا سکتا" کہاوتیں گھڑنے میں ماہر کسی شخص نے اس کو دوہرا کر اس طرح بیان کر دیا ہے کہ "سب جو چمکتا ہے سونا نہیں ہوتا" میں جس شخص کو اطاعت اور فرمانبرداری کا مجسمہ سمجھتا تھا وہ اتنا خونخوار بھی ہو سکتا ہے، اس کا مجھے خیال تک نہ تھا۔

بیلن کی بات سنکر میرا تجسس بڑھا۔ میں نے پوچھا "بات کیا ہوئی تھی سنت رام؟"

"کچھ نہیں صاحب" وہ سامنے کے مکان کی سیڑھی پر اکڑوں بیٹھتا ہوا بولا "میں ان دنوں نیا نیا ایک بڑے صاحب کے گھر نوکر ہوا تھا۔ بیس برس کی عمر تھی، خون گرم تھا، کام سے کبھی جی نہ چراتا تھا اور سونا بھی سامنے پڑا ہو تو ہاتھ نہ لگاتا تھا۔ میرا چچا ان صاحب کے دفتر میں چپڑاسی تھا۔ ان کو اچھے باورچی کی ضرورت تھی۔ ایک بڑے ہوٹل میں کام کرنے کی وجہ سے میں بہت اچھا کھانا پکا لیتا تھا۔ اپنے چچا کے زور دینے پر میں ان کے ہاں نوکر ہو گیا۔

صاحب ادھیڑ عمر کے آدمی تھے بارہ تیرہ سو روپیہ مہینہ پاتے تھے، اور بڑی اچھی طبیعت کے مالک تھے۔ میم صاحب ان سے عمر میں بہت کم تھیں۔ شوخ طرار اور غصیلی۔ نوکروں کو تنگ کرتی تھیں۔ جب سے آئی تھیں کئی نوکر بدل چکی تھیں۔ کام شروع کرنے سے پہلے میں نے صاف کہہ دیا تھا صاحب

[1] پگار بمبئی کی اصطلاح میں تنخواہ

سے کہدیا تھا۔ صاحب ہم کام دیں گے مگر عزت نہیں دیجیے۔ رہی کھانا پکانے کی بات تو آپ کی پسند کو سمجھنے میں ہمیں کچھ دن لگ جائیںگے۔ ایک بار پتہ چل گیا پھر کام بگڑے تو کہیئے۔ پیسے پائی کا نقصان ہو جائے تو گردن مار دیجیئے لیکن بے قصور گالی ہم نہ سنیںگے۔ پچپن نہیں خواہ پچاس روپے تنخواہ دیجیئے۔

صاحب کو میرا کھانا بے حد پسند تھا اور مجھے ان سے کوئی شکایت نہ تھی لیکن میم صاحب ان کی تیسری بیوی تھیں اور تھیں بھی کسی چھوٹے خاندان کی۔ گالی دینا ان کی عادت تھی۔ ایک دن میں بیٹھا روٹی بیل رہا تھا کہ انہوں نے پوچھا۔ "پانچ روپے کا نوٹ رکھا تھا کہاں گیا؟"

میں نے کہا "دیکھا نہیں"۔

اس پر بہت بگڑیں اور لگیں اَنٹ سَنٹ بکنے۔

میں نے کہا "یہ تو پانچ روپیہ ہے پانچ سو بھی ہو تو میں تھوکتا نہیں۔۔"

چلا کر بولیں "ہمارے روپے کیا تھوکنے کیلئے ہیں۔ کیا بکتا ہے حرامی۔۔۔"

لیکن گالی ابھی ان کے ہونٹوں ہی پر تھی کہ میں چلایا "کیا گالی دی آپ نے" اور بیلن ہاتھ میں لئے ہوئے اٹھا۔

انہوں نے بھاگ کر دروازہ بند کر لیا اور اسوقت تک نہ کھولا جبتک صاحب نہ آگئے۔ کھانا کھانے بھی وہ باہر نہیں نکلیں"۔

سنت رام چپ ہو گیا لیکن میرا تجسس اپنی انتہا پر پہنچ گیا۔ میں نے پوچھا تو صاحب کچھ بولے نہیں؟

"میں نے ان سے آتے ہی کہدیا تھا" سنت رام بولا "میم صاحب نے ہم پر چوری لگائی اور بڑی بھاری گالی دے ڈالی ہے۔ ہمارے ہاتھ میں بیلن تھا نہ جانے غصے میں کیا ہو جاتا آپ مہربانی کر کے ہمیں چھٹی دے دیجیئے۔ جتنے دن کام کیا ہے اس کی تنخواہ دینا چاہیں دیجیئے نہ دینا چاہیں نہ دیجیئے۔ اپنا گھر سنبھالئے ہم چلے جائیں گے۔!

صاحب دفتر سے آئے تھے تھکے ہوئے تھے انہوں نے سن لیا اور کچھ نہ کہا بولے۔ جب میم صاحب نے ان کے اندر جاتے پر دروازہ کھولا اور میری شکایت کی تو انہوں نے مجھے بلایا بولے "بیلن لئے تم کیا کر رہے تھے؟"

"روٹی بیل رہا تھا"!

تب میم صاحب کو سمجھاتے ہوئے بولے "بیلن تو اسکے ہاتھ ہی میں تھا۔ وہ تمہیں اس سے مارنے تھوڑی ہی آیا تھا۔ یہی بات ہے نہ سنت رام؟" انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

"جی!" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور کیا جواب دیتا۔ وہ بھاگ کر دروازہ نہ بند کر لیتیں تو میں سر توڑ دیتا۔ لیکن صاحب کی بات مجھ سے رد نہ ہوئی۔ میں نیا نیا آیا تھا اور پھر سچی بات تو ایک طرح میں نے ان سے کہہ ہی دی تھی"

سنت رام پھر چپ ہو گیا۔ بیٹھا بیٹھا نہ جانے کن خیالات میں کھو گیا۔ اور میں سوچنے لگا کہ عجیب افسر تھے وہ۔ میں نوکروں کے حقوق کا زبردست حامی ہوں، لیکن اگر میری بیوی کی غلطی کے باوجود، کوئی نوکر اس پر ہاتھ اٹھائے تو اپنی تمام انصاف پسندی کے باوجود میں اس کا سر توڑ کر رکھ دوں۔

سنت رام کھو سا گیا تھا کہ میں نے پوچھا "تو اسی دن وہاں سے نوکری چھوڑ دی تم نے؟"

"جی نہیں! صاحب نے مجھے نہیں چھوڑا۔ اس واقعہ کے بعد تو میں وہاں چھ برس رہا"

میم صاحب نے کچھ نہیں کہا۔؟

انہوں نے دو چار [illegible] کرنے کی [illegible] کی شکایت [illegible]

پھر تو وہ ایسی رام ہوئیں [illegible] ..... کہ اب میں آپ سے کیا کہوں"

آخری فقرہ کہتے کہتے سنت رام اپنی ادھیڑ عمر کے باوجود شرما گیا۔ ہونٹوں پر آئی ہوئی مسکراہٹ کو روک کر اور آنکھوں میں ونڈنے والی چمک کو دبا کر سر جھکائے ہوئے وہ اوپر بھاگ گیا۔

اور جہاں سے سنت رام نے اپنی کہانی ختم کی وہیں سے ایک انوکھی ٹریجڈی آہستہ آہستہ میری آنکھوں کے سامنے کھل گئی۔

ممتاز شیریں

آزادی کی صبح

اندھیرا، اندھیرا، گھور اندھیرا، وسیع، بے کراں سناٹا، بھیانک ویرانی، یکیا ہو رہا ہے کیا ہو رہا ہے؟ اس کی آنکھوں کو اس کے اردگرد کی کوئی چیز نظر نہیں آ رہی ہے۔ کسی نے اٹھا کر کہیں تنہا پھینک دیا گیا ہے کسی خوفناک جنگل میں۔ درندے چیخ رہے ہیں، بھوت خونی ناچ ناچ رہے ہیں ....

ڈراؤنی خوفناک تاریک رات بلائے کالے ڈراؤنے بادل جمع ہو رہے ہیں۔ آسمان پر چھا رہے ہیں، دل ہلا دینے والی گرج اور اندھیرا، اندھیرا، چاروں طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا۔

اور طوفان، آندھی، چنگھاڑتی ہوئی ہوائیں۔ خنکی بھری تیز برفیلی ہوائیں۔

اس کا جسم سر سے پاؤں تک کپکپانے لگا، لرزنے لگا، اور درد کی ٹیسیں سارے جسم میں، پیٹ میں ناقابل برداشت تکلیف جیسے کوئی دو چیزیں آپس میں گتھ گئی تھیں ایک دوسرے کو چیرے پھاڑے دے رہی تھیں اور اس کے اپنے اندرونی اعضا کو کوئی چیر رہا تھا، پھاڑ رہا تھا۔ درد کی شدت سے وہ بے ہوش ہو گئی۔

زمانہ بیت گیا جب وہ اپنے گاؤں میں اپنے ماں باپ کے گھر ہنسی خوشی رہا کرتی تھی، گاؤں کی پاکیزہ فضا اور کھلی ہوا میں سانس لیتی ہوئی، ایک پھول کی طرح تر و تازہ، ایک پنچھی کی طرح آزاد۔ اس کے گاؤں میں پاکیزہ شفاف نہریں تھیں، ان پاکیزہ نہروں سے سیراب، سرسبز و شاداب کھیتوں میں ہر چیز افراط سے پیدا ہوتی تھی۔ زرخیز دھرتی سونا اگلتی تھی۔ ہر طرف خوشحالی تھی۔ اس کے گھر میں دھن برستا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کے گھر سے دھواں بھی سونے کا نکلا کرتا تھا۔

وہ سندر تھی، بے انتہا سندر۔ اس کی رنگت میں ہمالہ کی برفانی چوٹیوں کی سپیدی، کشمیر کے کھیتوں کی زعفران، بنگال کی سانولاہٹ، اور دکن کی ملاحت تھی۔ اس کی چاند سی پیشانی کے اوپر گھور کالے چھڑی دار بالوں کے بیچوں بیچ اس کی مانگ میں گنگا اور جمنا کے پانی کی چاندی جھلملاتی تھی، اس کی ہنسی میں گویا کشمیر کے جھرنوں اور آبشاروں کا ترنم اور موسیقی تھی۔ وہ بولتی تھی تو منہ سے موتی گرتے تھے اس کے خوبصورت چہرے پر سے کی نازک نوکدار ٹھوڑی نے اس کے چہرے پر بھولا پن، پاکیزگی اور معصومیت پیدا کر دی تھی۔ تقدیس، پاکیزگی، معصومیت،

دیویوں کا سا حسن!

بڑے ناز و نعم میں وہ پل کر بڑی ہوئی۔ اسے سات پردوں میں رکھ کر پالا گیا۔ کہیں اس کی سندرتا کو کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ لیکن حسن و جوانی وہ بھی دولت میں پلی ہوئی حسن و جوانی کہیں چھپ سکتی ہے۔ اس کے حسن اور دولت پر بہتوں کی نظر لگی تھی۔ اسے اغیار کی نظروں سے بچانا ناممکن ہو گیا۔ گاؤں کے نوجوان ہی نہیں، مرد دور دور سے آ کر اسے تاک تاک جاتے۔ ہر ایک کی یہی تمنا ہوتی کہ وہ اس کے ہاتھ لگ جائے۔

اور ایک دن جب صبح سویرے وہ اکیلی کھیتوں کی طرف نکل گئی تھی۔ اور پگڈنڈی پر آہستہ آہستہ، خراماں، خراماں، ہنس کی چال چلتی جا رہی تھی۔ اسے کھیتوں کے پار پہاڑیوں کے درمیان کوئی سوار آتا نظر آیا۔ وہ ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ اور غور سے اسے آتا دیکھنے لگی۔ وہ پگڈنڈی کے بیچوں کو طے کرتا، گھوڑا اڑاتا ادھر ہی آ رہا تھا۔ اجنبی سوار اس کے قریب آ گیا۔ وہ اپنے سفید شاندار گھوڑے سے اتر پڑا۔ اور وہ اس کے پرجلال حسن سے مبہوت ہو کر وہیں کھڑی رہ گئی۔ سرخی اور گندم ملا ہوا سفید رنگ، بلند ناک، موٹی موٹی چمکدار کالی آنکھیں، ان بڑی بڑی کالی آنکھوں میں بہادری اور دلیری کی چمک تھی، چہرے پر ایک زبردست فاتح کی شان اور غرور۔ اور شاندار لباس۔ اجنبی کے لب کھلے۔ "راجکماری ...."

اجنبی کو اپنے نام سے مخاطب کرتے دیکھ کر اس کی حیران نظریں پرجلال اجنبی پر جم کر رہ گئیں۔ "میں نے دور دور تمہارے حسن کی شہرت سنی ہے۔ میں بہت دور سے آیا ہوں۔ تمہیں حاصل کرنے، تمہیں اپنانے ......"

اور اپنے مضبوط بازوؤں کی طاقت سے اس نے اسے اپنا لیا۔ محبت سے اس کے دل پر اس نے فتح پا لی۔ وہ اس اجنبی سے مرعوب بھی تھی محبت بھی کرتی تھی۔ اجنبی کی زبان دوسری تھی۔ انہیں ایک دوسرے کو سمجھنے میں دقت ہوتی تھی اور دونوں نے مل کر ایک تہذیب کی۔ اپنی اپنی بولیوں کو ملا کر ایک نئی بولی بنالی۔ ایک ایسی پیاری بولی جس میں گویا سندری کی [illegible] فارسی کی لوچ، شیرینی بھی، سنسکرت کی [illegible] اور جلال بھی۔ وہ برابر ملتے رہے۔ پردیسی اس کے [illegible]

ایسے باریک اور نفیس کہ انہیں تہہ کر کے انگوٹھی میں سے گزارا جا سکتا تھا۔ اور کئی
خوبصورت قیمتی جواہرات سے مزین زیورات۔ سر سے پاؤں تک خوبصورت
زیوروں میں آراستہ کر کے جب پردیسی نے اس کی مانگ میں جھومر لٹکایا تو اس کی پیشانی
"تاج" کے حسن سے جگمگا اٹھی۔ ان زیوروں سے اس کے حسن میں چار چاند لگ گئے۔
اسے اس پردیسی نے کچھ اس طرح اپنایا تھا کہ اس کی شخصیت اس کی اپنی شخصیت میں
تحلیل ہو گئی، اس کی شخصیت کا ایک جزو بن گئی تھی۔ اس پردیسی نے اسے وہ محبت
دی کہ وہ محسوس کرنے لگی۔ وہ اس کی ہو گئی ہے۔

اور اچانک کہیں سے ایک اور اجنبی آگیا۔ بالکل ہی اجنبی۔ کہتے ہیں کہ سات
سمندر پار سے وہ اس کے حسن اور دولت کی شہرت سن کر آگیا تھا۔ لیکن وہ
تھا بہت عیار۔ اس نے بتایا نہیں کہ وہ اسے حاصل کرنے آیا ہے۔ آہستہ آہستہ
اس نے لڑکی کے باپ سے اور اس پردیسی سے بھی دوستی گانٹھنی شروع کی۔ انہیں
بتایا کہ ان کے ملکوں کی بعض چیزیں بڑی بیش قیمت ہیں جو اس کے اپنے ملک میں یہ چیزیں
نہیں مل سکتیں۔ وہ انہیں اپنے ملک لے جائے گا اور اس کے بدلے میں
اپنے دیس سے ایسی چیزیں لائے گا جو یہاں کبھی نہیں بن سکیں گی۔ اور اس بہانے
وہ اکثر گاؤں آتا جاتا رہتا۔ پھر یہ کہہ کر کہ یہ گاؤں اسے بہت ہی پسند آگیا ہے
وہ وہیں آکر رہنے لگا۔ اس کے حسن سے زیادہ اس کی دولت کو دیکھ کر اس کی آنکھیں
لال ہو گئیں۔ اور آہستہ آہستہ بہلا پھسلا کر اور قوت بازو اور محبت سے نہیں
اپنی دماغی قوت اور عیارانہ چالوں سے اُسے اپنے ماں باپ سے بھی چھین
لیا، اس پردیسی سے بھی چھین لیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس شادی پر وہ بالکل رضامند نہ
تھی۔ وہ لانبا قد، بہت زیادہ سرخ و سفید رنگ اور ٹھاٹ باٹ کے باوجود یہ اجنبی
اسے بالکل پسند نہ آیا تھا۔ مجبوری کی شادی!!

شادی کے بعد وہ بڑی محبت جتاتا تھا۔ اس کے پاس پیار کے نئے انداز
تھے، نئی نئی باتیں۔ وہ ہمیشہ کہتا، وہ اسے بہت زیادہ چاہتا ہے۔ وہ جو کچھ بھی
کرتا ہے، اس کا خیال رکھ کر کرتا ہے، اس کی بہبودی کے لئے۔ اور وہ اسے بتاتا
وہ گنوار ہے، تہذیب سے ناآشنا۔ اس کے پاس بے نظیر حسن ہے تو کیا ہے،
نئی تہذیب سے اس حسن کو چار چاند لگ جائیں گے اس کے حسن کی دلکشی بڑھ
جائے گی۔ اور اس نے آہستہ آہستہ اسے نئی تہذیب سکھانی شروع کی۔ نئی تعلیم
دینی شروع کی۔ جو اسے اجنبی زبان میں پڑھایا جاتا تھا۔ وہ زبان کس قدر اجنبی اور نامانوس
تھی۔ ایک [illegible] بہت [illegible] زبان سے بھی بہت محبت تھی۔ اس
نے [illegible] بنائی تھی۔ اجنبی نے ایسی نئی نئی چیزیں
اس کے [illegible] جو اس نے کبھی دیکھا نہ تھا۔ اس کے [illegible] ایک نئی

فضا بن گئی۔ اس کی آنکھیں جو گھروں میں مٹی کے تیل کے دیئے دیکھنے کی عادی
تھیں، بجلی کی روشنی کو دیکھ کر مسحور ہو گئیں۔ وہ بیل گاڑیوں میں سفر کرنے کی
عادی تھی۔ اندھیری رات میں آہستہ آہستہ ہچکولے کھاتے، جھولا جھولتے
ہوئے سفر کرنے میں کتنا لطف آتا تھا۔ یا بہت ہوا تو کبھی گھوڑا گاڑی۔ اب اسے
ایک دھواں اڑاتی انجن سے پٹڑیوں پر چلنے والی نہایت تیز رفتار گاڑی میں سفر کرنا
پڑتا۔ اس نئی فضا میں وہ مسحور اور مبہوت ہو گئی اور ایک سپردگی کے عالم میں وہ
اجنبی کے ساتھ رہی لیکن پھر بھی وہ اسے کبھی پسند نہ آیا تھا۔ پھر اسے اچانک معلوم
ہوا اس کا مال غائب ہو رہا ہے۔ اس کے زیورات میں سے جواہر غائب ہو چکے ہو
ہیں۔ اس کے ماں باپ کے دئے ہوئے زیورات، پردیسی کے لائے ہوئے خوبصورت
زیور، اس کی پیشانی کے بے نظیر جھومر کے جواہرات تک اس نے نکال لئے تو
اس سے نہ رہا گیا۔ وہ آخر پوچھ بیٹھی۔ وہ یہ سب کیا کر رہا ہے۔ اس کا مال، اس کا
زیور...... جواب ملا۔ اسے نئی بنانے میں، نئی تہذیب کے آشنا کرنے
میں اس کی تعلیم میں کیا کم خرچ لگ رہا ہے۔ اتنا سارا خرچ کہاں سے نکلے گا۔
لیکن اس پر تو دراصل بہت تھوڑا خرچ آتا تھا۔ کہتے ہیں کہ بہت سا مال سارے
جواہرات، اس نے اپنے ملک کو بھیج دیئے، اپنے رشتہ داروں میں بانٹ دیئے
اس کے گھر میں کبھی دھن برستا تھا۔ سونے کا دھواں نکلا کرتا تھا، لیکن اب وہ
کھانے کپڑے کو ترس رہی تھی!۔

یوں تو وہ جان گئی تھی کہ وہ اس سے محبت نہیں کرتا۔ لیکن اس کی تو ایک
ساتھی کی حیثیت بھی نہیں تھی، وہ اسے محکوم رکھنا چاہتا تھا۔ اُسے غلام بنا کر
رکھا گیا تھا۔ اور اس محکومی کے خلاف اس کی روح چیخ اٹھی۔ سینے میں بغاوت
سلگتی رہی۔ لیکن وہ کچھ کرتی نہیں تھی۔

ایک تو وہ بیوی تھی۔ اور پھر اس کا اصول ہی یہ تھا کہ ظلم کا جواب صبر سے دینا
چاہیئے۔ صبر کے سامنے ظلم خود بخود بے دست و پا ہو جائے گا۔ تکلیف سہنا
چاہیے بلکہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو تکلیف دینا چاہیئے تاکہ اسے
دیکھ کر ظالم بھی رحم بن جائے۔ اور اس لئے وہ کئی کئی دن تک کھانا چھوڑ دیتی
ایک ہی جگہ کہیں گوشے میں بیٹھ رہتی یا سارا سارا دن ٹوٹی کھٹولی پر پڑی
پڑی رہتی۔ گھر کا کوئی کام کاج کرنے سے انکار کر دیتی بہت ہوا تو کبھی چیخ چیخ کر
احتجاج کرتی۔ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے زخم کھرچنے لگتی۔ نازک نازک
انگلیوں کے ناخن اسے کیا گزند پہنچا سکتے تھے۔ لیکن وہ اس میں بغاوت بالکل
نہیں دیکھنا چاہتا تھا، جب بغاوت ابھرتی نظر آتی، اسے بند کوٹھری
میں قید کر دیتا۔ مار پیٹ سے بھی باز نہ آتا۔ جتنا زیادہ وہ اس پر ظلم کرتا

گویا اس کی بے چینی بڑھتی گئی۔ اور یہ نئی جسمانی تکلیف یہ پیٹ میں ناقابلِ برداشت ٹیسیں۔ یہ درد بھی اسی کا دیا ہوا تھا۔ وہ کل رات چیخ اٹھی تھی۔ "مجھے چھوڑ دو، مجھے چھوڑ دو، یہاں سے چلے جاؤ، یہاں سے نکل جاؤ"۔ یعنی میں اب تمہارے ساتھ نہ رہوں گی، نہیں۔ تم یہاں سے نکل جاؤ، مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ"؟ اتنی بغاوت اتنی سینہ زوری! رات بھر وہ درد کی شدت میں یہی چیختی رہی "یہاں سے چلے جاؤ! مجھے چھوڑ دو"۔ اور اس نے وعدہ کر لیا کہ وہ چلا جائیگا۔ لیکن لوگ کہتے ہیں۔ وہ بھلا اس کے کہنے پر چلا جائے گا۔ گھر بر اس کے احباب اس کے بلا رہے ہیں، خصوصاً اس کا ایک رشتہ کا بھائی جس کی بات وہ بہت سنتا تھا، وہ بھی اس بات پر زور دے رہا ہے کہ اب وہ اس لڑکی کو چھوڑ کر چلا آئے

اپنے ماں باپ اور اس پردیسی کی جدائی کے بعد اس اجنبی کے ساتھ اس کی زندگی اس دکھ سے بھری تھی کہ اس کے لئے یہ عرصہ ایک صدی معلوم ہوتا تھا، ایک صدی سے بھی زیادہ ....

اسے کچھ کچھ ہوش آرہا تھا، آوازیں آہستہ آہستہ سنائی دے رہی تھیں لیکن آنکھوں کے سامنے ابھی دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ پھر اس کے کانوں نے صاف سنا گھڑی گھنٹے بجا رہی تھی۔ گھڑی یہاں کہاں؟ وہ جنگل میں پھینک نہیں دی گئی تھی؟ .... لیکن اس کے آنکھوں کے سامنے کی دھند دور ہوتی گئی اور اس نے اپنے گرد و پیش کو پہچان لیا۔ ٹن ٹن ٹن ٹن ... بارہ؟ آدھی رات۔ اور اچانک اس کی نظر دور اندھیرے میں گم ہوتی ہوئی پرچھائیں پر پڑی۔ کوئی جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں نے چاروں طرف پھیلی ہوئی تاریکی کو چیرنے کی کوشش کی۔ کون؟ اجنبی؟ ہاں وہ اسے چھوڑ کر جا رہا تھا۔ اس کے دل میں نفرت کی آگ پھر بھڑکی۔ جا بھی رہا ہے تو کس وقت۔ اس کی اس حالت میں، اس کی خبر لئے بغیر۔ وہ اس قدر درد سہہ رہی ہے۔ موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ اور وہ جا رہا ہے لیکن اس کے جانے کے لئے وہ کب سے دست بدعا تھی۔ وہ آخر جا ہی گیا۔ جانے دو آخر چھٹکارا ملا۔ اس نے دل میں اطمینان اور مسرت محسوس کی ساتھ ہی اسے محسوس ہوا کہ اس کے جسم کے درد میں بھی کمی ہو گئی ہے اور بے خبری میں اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی۔ کئی ہاتھوں نے اسے پکڑ کر پھر لٹا دیا۔ لیکن وہ دیکھ چکی تھی۔ اف! ان کی آنکھوں نے کیا دیکھا۔ خون خون، ہر طرف خون .... اور دو بچے خون میں لتھڑے ہوئے، خون میں نہائے ہوئے توام بچے۔ اسی لئے تو اسے ہمیشہ یہ ناقابلِ برداشت تکلیف ہوتی رہی تھی اور اب بھی .... اسے اب آرام تھا۔ اس کے گرد گرم پٹیاں لپیٹی گئیں

نقاہت سے نڈھال جسم پر ان کی آرام دہ گرمی سے غنودگی سی چھا گئی۔ اور وہ کسی سوچ میں غرق ہو گئی۔ توام بچے؟ اس کے ایک ہی بچہ کیوں نہ ہوا۔ اور پھر اس کے دل میں اجنبی کے لئے نفرت امڈ آئی۔ یہ بھی اسی کی لائی ہوئی مصیبت تھی پھوٹ کے بیج سے یہ دونوں بچے ایک نہ ہو سکتے تھے ....

دونوں بچے اس کے پاس لائے گئے۔ اور جب اس نے دونوں بچوں کو اپنے دونوں زانوؤں پر الگ الگ لٹایا تو اچانک اسے ایک خیال آیا اور وہ سرد ہو گئی۔

خدا کا شکر ہے یہ اس طرح کے سیامی توام نہیں جن کے جسم لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ حیران تھی کہ اس کے دل میں یہ خیال کیوں آیا کہ ایک ہی بچہ ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ اسے یہ خیال کیوں نہ آیا کہ یہ توام ہیں تو خدا کرے یہ سیامی توام نہ ہوں جن کے جسم لگے ہوتے ہیں۔ اس طرح کے سیامی توام ہوتے تو زندگی بھر مصیبت کا سامنا تھا۔ دونوں کے جسم، دونوں کے ذہن، دونوں کی روح، دونوں کی شخصیتیں الگ الگ ہو کر بھی ان کے جسم ایک طرف ملے ہوئے۔ نہ وہ آزادی سے چل پھر سکتے، نہ آزادی سے کوئی الگ الگ کام کر سکتے، ایک بیمار ہوتا، تو دوسرے کو اس کے بیمار جسم کا بوجھ اٹھانا پڑتا یا اس کی بیماری بھی اس میں سرایت کر جاتی۔ ان میں سے کسی ایک کو غصہ چڑھ جاتا، ایک زیادتی کرتا تو دوسرا اس سے آزاد ہو کر بھاگ نہیں سکتا تھا۔ خصوصاً ان میں سے چھوٹے کے لئے تو بہت مصیبت کا سامنا تھا۔ اس کی زندگی بھی خطرہ میں پڑ جاتی۔ اس نے دونوں کو غور سے دیکھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ چھوٹا شکل و صورت، بناوٹ، انداز میں اس پردیسی سے بہت مشابہ تھا جو بہت عرصہ پہلے اس صبح کو گھوڑا اڑاتے ہوئے اس کے پاس آیا تھا، اور جس سے اسے محبت سی ہو گئی تھی۔ نہیں اس کے جسم کے پھٹنے سے اس کی روح کے دو ٹکڑے نہیں ہوئے تھے۔ اس کا خون ان دونوں کی شریانوں میں بہ رہا تھا، اس کی ایک ہی روح ان دونوں میں تھی۔ صرف اس کی شخصیت میں تحلیل ہو گئی تھی، الگ ہو کر مجسم ہو گئی تھی۔ اور بڑے ہو کر ان کی الگ الگ شخصیتیں، الگ الگ ... آزادی سے ابھریں گی .... وہ دونوں کو اپنا دودھ پلائے گی اپنی گود میں کھلائے گی۔ وہ دونوں اسی کے جسم، اسی کے خون سے بنے ہیں اور دودھ کی گرم گرم دھاروں کے ساتھ محبت کی دھاریں بھی ان دو ننھے توام بچوں کے منہ میں جاتی رہیں۔ جب وہ سیر ہو گئے تو انہیں الگ الگ بستروں پر لٹا دیا گیا۔ اور دونوں ننھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا کڑی نظروں سے۔ بڑا گویا کہہ رہا ہو "تمہیں کیا حق تھا اپنا دودھ ...

(باقی صفحہ ۱۱۵ پر)

ایم اسلم

رقصِ ابلیس

گر پڑیں گے خوف سے ایوانِ عشرت کے ستوں
خون بن جائے گی شیشوں میں شرابِ لالہ گوں

خون کی بو لے کے جنگل سے ہوائیں آئیں گی
خوں ہی خوں ہوگا نگاہیں جس طرف بھی جائیں گی

جھونپڑوں میں خوں محل میں خوں شبستانوں میں خوں
دشت میں خوں، وادیوں میں خوں بیابانوں میں خوں

خون کے دریا نظر آئیں گے ہر میدان میں
ڈوب جائیں گی چٹانیں خون کے طوفان میں

اوہ عالی شان معبود!

وہ رات جو تو نے اپنی مخلوق کے آرام اور راحت کے لئے بنائی۔ وہ رات جو تیرے نیک بندے تیری حمد و ثنا میں گذارتے ہیں۔ وہ رات جس کی آغوش میں منزل کے تھکے ہاروں کو تسکین قلب ملتی ہے۔ وہ رات جس کی تاریکیوں میں فتنے کہیں سوتے ہیں کہیں بیدار ہوتے ہیں۔ وہ رات جو کسی خوش نصیب کی آرزوؤں کے بر آنے کی رات ہوتی ہے۔ وہ رات جو کسی نامراد کی نامرادیوں کی رات ہوتی ہے۔ وہ رات جو کسی مسافر کو منزل پہنچنے کی نوید دیتی ہے۔ وہ رات جس کی خاموشیوں میں ننھے ننھے معصوم بچے ماؤں کی آغوش میں مچل مچل جاتے ہیں وہ رات جس کی دلکشیوں اور مسرتوں کا خیال ایک دولہن کے دل میں چٹکیاں لیا کرتا ہے۔ وہ رات جو کسی کینہ ور کے انتقام کی رات ہوتی ہے۔ وہ رات جو کسی قیدی کی زندگی کی زنداں میں آخری رات ہوتی ہے۔ وہ رات جس کی ظلمتوں میں رحمت کے فرشتے سونے والوں کے لئے خیر و برکت کی دعائیں مانگتے ہیں۔ وہ رات جس کی سیاہی میں سیاہ کاروں کے لئے جہنم کے دروازے کھول دئے جاتے ہیں۔ وہ رات جس کی اداسیاں عشاق کے دلوں میں حسرت و یاس کے طوفان بپا کر دیتی ہیں۔ وہ رات جس کی خاموشیوں میں مائیں اپنے پردیسی بچوں کے لئے بے قرار ہو جاتی ہیں۔ وہ رات جو کسی بیمار کی آخری رات ہوتی ہے اور وہ رات جو کسی نامراد کے انتظار کی کٹھن رات ہوتی ہے۔

اوہ عالی شان معبود!

آج بھی وہی رات ہے۔ قیامت کی رات! مصیبت کی رات! کرب کی رات! بلا کی رات! خوف کی رات! فکر کی رات! ہراس کی رات! دل کی دھڑکنوں کی رات! اور عذاب کی رات!!

معلوم ہوتا تھا کہ خیر و برکت کے فرشتے تیرے اس اشرف المخلوقات کی بہیمانہ حرکات دیکھ دیکھ کر دنیا سے بھاگ گئے۔ اور عذاب کے فرشتے قہر و غضب کی بجلیاں برساتے ہوئے دنیا اور دنیا والوں کی طرف لپکے آ رہے ہیں۔ اوہ میرے معبود! یہ خوفناک رات! خداوندا کیا ہو گیا تیرے بندوں کو!

یہ تو کسی کو سان گمان بھی نہ تھا کہ سیاسی حالات یوں بگڑ جائیں گے اور مذہبی اور سیاسی اختلافات اچانک ایسی خوفناک صورت اختیار کر لیں گے نہ مسلمان کی جان محفوظ رہے گی نہ ہندو اور سکھ کی لیکن آج صبح سے ہی حالات بگڑتے نظر آ رہے تھے۔ کاروبار تقریباً بند تھا۔ بازار سنسان پڑے تھے لوگوں کے چہروں سے خوف و ہراس ٹپک رہا تھا سرکاری ملازم بھی آج دفاتر نہیں گئے تھے۔ نفرت اور فرقہ وارانہ عداوت کی آگ چپکے چپکے سینوں میں سلگ رہی تھی۔ ایک قوم کے جذبات دوسری قوم کے خلاف بھڑک رہے تھے۔ ابھی دن کچھ ایسا نہیں گیا تھا کہ ادھر ادھر سے فساد کی خبریں آنے لگیں۔ کبھی کوئی مجروح بھی خون کے چھینٹوں سے گل رنگ نظر آ جاتا۔ زخمی ہونے والوں میں جوان بھی تھے اور بوڑھے بھی بچے بھی تھے اور عورتیں بھی۔ بھک منگے بھی تھے اور اپاہج بھی۔ پردیسی بھی تھے اور شہر والے بھی۔ ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ پڑھے لکھے بھی تھے اور جاہل بھی۔ مزدور بھی تھے اور دوکاندار بھی۔ شریف بھی تھے لچے بھی لیکن یہ سب کچھ کیوں تھا؟ معلوم ہوتا تھا کہ ابلیس نے ان لوگوں کے کان میں کوئی افسون بیا دیپ پھونک دیا ہے یا ممکن ہے کہ قومی راہنماؤں نے آج انسان کا قتل جائز قرار دے دیا ہے۔

لیکن نہیں! یہ سب کچھ تنگ نظری کا نتیجہ تھا۔ لیڈروں کی اشتعال انگیز تقریریں رنگ لا رہی تھیں ہر طرف سے خوفناک خبریں آ رہی تھیں مختلف

[illegible] رہی تھیں۔ محلوں اور گلیوں میں مختلف قوموں کے افراد ٹولیاں بنائے بیٹھے تھے اور اکے دکے پر اس طرح ٹوٹ پڑتے جیسے بھیڑ پر خونخوار بھیڑیے [illegible]۔ آج سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ اور وہ رنگ کیا تھا۔ خون! خون! خون!۔

— ❖ —

دن تو جیسے کٹا سو کٹا۔ اب رات آئی اور یہ امید ہونے لگی کہ دن بھر کی ہڑبونگ کے بعد شہر کے شیاطین بھی تھک جائیں گے اور خیر و برکت کے فرشتے امن کی منادی کرتے ہوئے میٹھی نیند کی نوید دیں گے لیکن رات آئی بھی تو اپنے دامن میں ہزاروں فتنے لے کر آئی۔ ایسے خوفناک فتنے جن کے بیان سے شرافت کو شرم آئے اور زبان قلم سے کٹ جائے۔ اوہ عالیشان معبود! کیسی خوفناک تھی وہ رات!

— ❖ —

پہلا پہر تھا اور رات کا وقت کچھ یونہی خنکی۔ کچھ سوئے ہوئے کچھ جاگتے ہوئے کچھ سونے کی تیاریوں میں۔ کچھ رات کے انتظام میں مصروف کہ کہیں کوئی بے خبری میں ہی نہ آ دبوچے۔ کچھ سہمے ہوئے کچھ ڈرے ہوئے۔ کسی کے دل کی دھڑکن تیز۔ رگوں میں خون کی گرمی۔ آنکھوں میں ایک غیر مانوس سی چمک۔ اچانک کہیں دور سے کچھ شور و غل کی آواز آنے لگی۔ پہلے کچھ دبی دبی سی دھیمی دھیمی سی پھر کچھ تیز سی جس میں خوف بھی تھا اور غصہ بھی۔ اور اس کے بعد! الٰہی توبہ! جیسے میدان حشر کی چیخ و پکار۔

نقارے بج رہے ہیں۔ ڈھول پیٹے جا رہے ہیں۔ موٹر کے ہارن کی بھوں بھوں۔ چیخ اور تیز سیٹیاں۔ گلی گلی سے نئے نئے نعرے سے شہر گونج رہا۔ ہر بازار سے ڈم، ڈم، ڈم! پھر نعرۂ توحید اللہ اکبر! ایک فلک شگاف نعرۂ پاکستان زندہ باد! اور ساتھ ہی "جے ہند" کی گرجتی ہوئی آواز۔ ست سری اکال کا شور۔ پھر اکا دکا بندوق یا پستول چلنے کی آواز۔ تڑاخ! تڑاخ! پھر پولیس کی گولیاں! ٹھا ٹھیں ٹھیں۔ ٹھا۔ ٹھاں ٹھاں۔ اور کہیں بم پھٹنے کا خوفناک دھماکہ اور لوگوں کا شور و غل۔

معلوم ہوتا تھا کہ گرجتا اور برستا ہوا طوفان کہیں سے آیا ہے اور گرجتا ہوا سر دل پر سے گزر رہا ہے۔

— ❖ —

مشرقی جانب کچھ ہلکی سی چاندنی۔ جیسے شرمیلی دلہن کے چہرے پر ہلکا سا تبسم۔ سردی ذرا ہلکی ہوئی۔ اور شور و غل کی آواز دبی سی۔ کائنات پر اداس اداس سا سکوت اور لوگ آرام کی فکر میں تھے۔ اچانک پھر ایک طرف سے "پاکستان زندہ باد" کا نعرہ بلند ہوا۔ اور اس کے عقب میں پھر وہی "جے ہند" اور "ست سری اکال" کی آواز۔ آوازوں میں کچھ دہشت بھی کچھ خوف بھی۔ اور پھر ایک بار بادل کی خوفناک گرج اور بجلی کی ہیبتناک کڑک کی طرح "پاکستان زندہ باد" کا نعرہ فضا میں ارتعاش پیدا کرنے لگا۔ اور پھر وہی ڈم! ڈم! اور ٹھا ٹھیں۔ ٹھا ٹھیں۔ لیکن ان آوازوں کے ساتھ ایک دلخراش آواز اور بھی تھی۔ آگ! آگ! اور پھر وہی لوگوں کی چیخ و پکار۔ بچوں اور عورتوں کا شور و غل۔ اور آگ بجھانے والے انجن کی ٹن ٹن! ٹن ٹن! اور پھر وہی پولیس کی گولیاں ٹھا ٹھیں ٹھیں۔ "پانی" "پانی" کی فریاد۔ اور پھر کہیں سے اللہ اکبر کا فضا کو دہلا دینے والا نعرہ۔ اور اس کے دوش بدوش "جے ہند" اور "ست سری اکال" کی نفرت سے بھری ہوئی آواز۔ جلتے ہوئے مکان۔ دھوئیں کے سیاہ بادل جیسے ظلم کے کالے دیو! اور آگ کے خوفناک شعلے جیسے جہنم کی چنیاں آگ اگلتی ہوئی۔ کہیں لوگ مکانوں پر کھڑے ہوئے خاموش جیسے بت۔ کہیں دہشت سے حواس باختہ۔ کہیں چلاتے ہوئے جیسے گرفتار عذاب کہیں غصے سے گرجتے ہوئے جیسے عذاب کے فرشتے۔ عورتیں خوفزدہ۔ بچے سہمے ہوئے۔ چاروں طرف ایک ابلیسی نظام۔ اور آسمان پر فرشتے تھا [illegible] اور زبانوں پر فریاد!

"خالق اکبر! تیری مصلحتیں تو ہی کچھ جانے۔ اور تیری حکمتیں تو ہی کچھ سمجھے۔ لیکن کیا یہ وہی آدم ہے جسے تو نے فرشتوں سے سجدہ کروایا۔ کیا یہ وہی انسان ہے جسے تو نے خلیفۃ اللہ کا خطاب عطا فرمایا۔

خداوندا! یہ ہے گناہوں کا کشت و خون۔ یہ تباہی یہ بربادی یہ ظلم و ستم۔ کیوں معصوموں کی بے کسی۔ بوڑھوں کی بے چارگی۔ جوانوں کی جوانی عورت کا ناموس۔ آج یہ سب کچھ ابلیس کی خباثت پر کیوں بھینٹ چڑھ رہے ہیں۔

خالق اکبر! ہم تیری حمد و ثنا کرنے والے انسان کی اس بربریت اور ظلم سے اور ابلیس کے شر سے تیری پناہ مانگتے ہیں۔"

— ❖ —

لیکن معلوم ہوتا تھا کہ آج بارگاہ ایزدی میں حشر [illegible] کی آواز بھی نہیں پہنچ سکتی۔ آج دنیا ایک خونی کھیل کھیل رہی تھی۔ [illegible] تماشا تھا

نراس میں آس

صالحہ عابد حسین

ناول اس کے ہاتھ سے گر گیا، آنکھیں بے معنی نظروں سے خلا میں جم گئیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے سوچنے سمجھنے کی قوت جواب دے گئی ہو — جیسے اس کا دل بے حس اور دماغ مفلوج ہو گیا ہو!

یکایک زور سے اس کے دماغ کے پردوں سے یہ آواز ٹکرائی "میں تو تم سے پہلے ہی کہتا تھا کہ اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں۔ اس بھنور میں بھلا وہ کیسے محفوظ رہ سکتا تھا؟ صبر کرو صبر — یہ تو سیلاب ہے۔ سب کچھ بہالے جانے والا۔ جو بچ جائے معجزہ ہے جو ختم ہو جائے تعجب نہیں۔ مصیبت میں صبر کرنا ہی تو مومن کی پہچان ہے۔ امتحان میں پورا اترنا۔ یہی تو کسوٹی ہے کھرے کھوٹے کی!

اس کے دماغ کو ایک زور کا جھٹکا لگا اور اس نے آنکھیں کھول کر اپنے دوست کی طرف دیکھا، آنکھیں بھر آئیں۔ دل درد سے لبریز ہو گیا، سر تکیہ پر گر گیا اور آنکھیں پھر بند ہو گئیں مگر دماغ تیزی سے کام کرنے لگا۔ روح فرسا، دل دوز خوفناک حقیقت اس کے سامنے آئینہ ہو گئی!

یوں اس کی آرزوؤں، اور ارمانوں کا خون ہو گیا؟
اس کی عمر بھر کی محنت اس طرح خاک میں مل گئی..؟
اس کا سارا سرمایہ، ساری پونجی برباد ہو گئی؟
اس کے جگر پارے آگ میں جل کر راکھ ہو گئے۔
اُف! اللہ یہ بات تو کبھی اس کے خواب و خیال میں بھی نہ آئی تھی!
ایسا بھی ہو سکتا ہے؟؟
اس کے شیریں خواب کی ایسی بھیانک تعبیر؟

اور گذشتہ زندگی کے سارے اہم واقعات، متحرک تصویروں کی طرح اس کی نظروں کے سامنے سے گزرنے لگے۔

"باجی، دیکھنا ذرا اس ننھی کو؟ اتنی بڑی کتاب لے کر آپ پڑھنے بیٹھی ہیں"
"اے سبحان لو پھاڑ ڈالے گی"
"اماں ادھر ہم کو نہیں دیتے ہم تو پڑھ رہے ہیں اب"
"اور کیا آپ تو ابھی سے اقبال کا کلام پڑھیں گی، شرر اور سرشار کے ناولوں کا مطالعہ کریں گی۔ بھلا تم سے زیادہ کون سمجھے گا انہیں"۔
"اماں دیکھ لیجئے۔ یہ باجی مجھے کتاب نہیں پڑھنے دیتیں"
"بیٹی تم اپنی کتاب پڑھو۔ بڑے بہن بھائی کی کتابوں کا کیوں ناس کیا کرتی ہو"
"تو میں ناس کب کر رہی ہوں۔ میں تو پڑھ رہی ہوں"
"ابھی نہیں جب بڑی ہو جاؤ گی تب ان کو پڑھنا۔ لو یہ اپنی سبق کی کتاب اسے پڑھو اور بہن کی کتاب اسے دے دو — شاباش"

اور وہ با دلِ ناخواستہ، تیوری چڑھائے منہ بنائے بہن کے سامنے لے جا کر کتاب پٹخ دیتی اور روٹھی ہو کر کسی کونے میں جا بیٹھتی — اس کا جی چاہتا کہ وہ جادو کے زور سے جلدی سے "بڑی" ہو جائے اور یہ الماری بھری ساری کتابیں پڑھ ڈالے۔

مولوی اسمٰعیل کی کورس کی کتابوں، محمدی بیگم کے ننھے منے قصوں سے بھلا اس کی پیاس بجھ سکتی تھی؟ جب موقع ملتا وہ چرا چھپا کر، منت خوشامد کر کے بڑے بہن بھائیوں سے کتابیں لے کر انہیں پڑھنے کی کوشش کرتی۔ اس کی پڑھنے کی قابلیت تیزی سے ترقی کر رہی تھی۔ وہ روانی اور بے تکلفی سے جو کتاب بھی ہاتھ میں لیتی اس کے الفاظ کم سے کم پڑھ سکتی تھی۔ مگر اس کا کیا علاج کہ گھر والے اس کی "قابلیت" کا لوہا نہ مانتے اور بڑی بڑی کتابیں اسے پڑھنے کو نہ دی جاتیں۔ چوری چھپے، دو چار صفحے پڑھنے سے تو اس کی پیاس اور بھڑک اٹھتی تھی۔ اور وہ اسکے بجھانے کے لئے کوئی نہ کوئی ترکیب سوچا کرتی۔

اور اس طرح آٹھ نو سال کی عمر میں اس کا مطالعہ اپنے ہم سنوں میں سب سے بہت زیادہ ہو گیا۔

کتابیں پڑھتے پڑھتے اس کے دل میں ایک عجیب سی، انوکھی سی خواہش پیدا ہوتی؛ وہ بھی کچھ لکھے۔ ایسے ہی قصے، ناول، مضمون۔ مگر وہ خود جھجک پڑتی! بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ کیا جانے لکھنا؟ یہ تو بڑے بزرگ اور قابل فاضل لوگوں کا کام ہے! کہیں کسی نے اس کی خواہش کا پتہ چلا لیا تو سب کتنا مذاق اڑائیں شاید برا بھلا بھی کہیں — یہ کیسی — کیسی انوکھی آرزوئیں اس کے دل میں پیدا ہوتی ہیں؟

کاش — وہ کسی طرح جلدی سے بڑی ہو جائے — اور خوب قابل فاضل بھی اور پھر — پھر — وہ کتابیں لکھ لکھ کر ڈھیر لگا دے — ہر طرف، ہر کوئی اسی کا ذکر کرے — ارے اسی نے یہ بہت سی کتابیں لکھی ہیں؟ اور وہ تخیل میں اس عزت اور شہرت کا لطف اٹھاتی جو اسے ان فرضی کتابوں کی تصنیف سے حاصل ہوئی تھی۔

شرر اور سرشار، رسوا اور سجاد حسین کے ناول، اور قصے اگر اسے کسی نہ کسی طرح پڑھنے کو مل جاتے اور انہیں پڑھ بھی ڈالتی تو اپنی کم سنی، نا سمجھی اور کچی عقل کے باعث نہ تو وہ عشق و عاشقی کے ان فرضی رومانوں کو سمجھ سکتی تھی جو ان کتابوں پر چھائے ہوئے ہیں۔ نہ شجاعت و بہادری کے ان کارناموں کو اس کی عقل قبول کرتی تھی جو ان کے ہیرو انجام دیتے تھے اور نہ وہ اس بامحاورہ، اور چٹخارے دار زبان سے لطف اٹھا سکتی تھی جو ان کتابوں کی جان ہے۔ وہ ان کو پڑھ کر چکر میں پڑ جاتی — یہ کیا بات ہوئی؟ اس کا کیا مطلب؟ یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟ لیکن کوئی نہ تھا جو اس کے لاتعداد سوالوں کا جواب دے کر اس کی تسکین کرتا۔

اور جب اس کے گھر میں خواتین کے لکھے ہوئے کچھ ناول آئے جن کے پڑھنے کی اسے اجازت بھی مل گئی اور وہ اس کی سمجھ میں بھی آ گئے تو اسے کتنی خوشی ہوئی تھی! ان میں ہندوستانی گھریلو معاشرت کی تصویریں۔ عورتوں کی روزمرہ زبان، بچوں اور لڑکیوں کا ذکر اسے کتنا اچھا لگتا تھا — ہر کتاب کی ہیروئن کی، یا جو کردار اسے سب سے زیادہ پسند ہوتا اس کی، جگہ وہ اپنے آپ کو رکھتی اور دل ہی دل میں لطف اٹھاتی — کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ — سوچتے سوچتے یہ خیالی ہیروئن ایک نیا پلاٹ، نیا قصہ اپنے گرد بُن لیتی — اور پھر گھبرا کر چونک پڑتی......
ارے .... یہ کیا — کتاب میں تو یوں نہ تھا — تو کیا یہ سارا قصہ اس نے اپنے دل سے بنا ڈالا — کیا وہ خود بھی اسی طرح ناول، لکھ سکتی ہے؟ کیسی عجیب بات ہے؟

اور پھر... دل کی چٹیک سے مجبور ہو کر اس نے چھپ چھپ کر اپنی گھسی پنسل سے پرانی کاپی پر قصے لکھنا شروع کر دیئے۔ سہیلیوں کو دے سبق پڑھنے سے گڑیوں اور آنکھ مچولی سے وقت بچاتی اور کسی جگہ چھپ کر، سخت پڑھے ہوئے قصوں جیسے حسین و جمیل، قابل و ذہین، رئیس اور شاندار کردار تخلیق کیا کرتی، کیا ہوا اگر اس کے گرد و پیش یہ ماحول نہیں۔ اس کے تخیل میں تو ویسے ہی نادر روزگار افراد بے جان ہیں... بلکہ ان سے بھی زیادہ حسن و جمال سے مالا مال، زیور و جواہرات سے آراستہ علم و ہنر سے پیراستہ — اور یہ قابل قدر کردار اس کی کسی ٹوٹی صندوقچی، کسی پرانی تھیلی میں چھپے پڑے رہتے۔ کہیں اس کے ہم سنوں یا بزرگوں کو خبر نہ ہو جائے؟ وہ لوگ مذاق نہ اڑائیں!

لیکن آخر کار — ایک دن گھر والوں کو ان کی ہستی کا علم ہو ہی گیا
اُف — کتنا سخت تھا وہ دن اس کے لئے۔

اس کے ہم جولیوں نے عین وقت پر اس کو گرفتار کر لیا۔ اس کی کاپی چھین لی اور اُسے زور زور سے پڑھ کر اُسے چڑانے اور مذاق اڑانے لگے۔ بڑے بہن بھائی طنز سے ہنس رہے تھے، بزرگ زیر لب اس کی "حماقت" پر مسکرا رہے تھے، ہم جولی قہقہے لگا رہے تھے۔

"اوہو — افوہ — چچی اماں دیکھا آپ نے! اب تو یہ بڑی بھاری ادیبہ بن گئی ادیبہ ذرا سنئے گا — اس کی ہرن جیسی کالی کالی حسین آنکھیں،...."

"ارے بھئی اب تو یہ ہم جیسے گھٹیا آدمیوں سے بات بھی نہ کریں گی — یہ ٹھیریں ادیبہ — مصنفہ — ناول نگار —"

"اور کچھ بھی سنا — ہیروئن صاحبہ نے تیرہ سال کی عمر میں بی اے پاس کر لیا تھا۔ افوہ — اوہ — میرا تو ہنستے ہنستے پیٹ پھول گیا —"

"اور یہ ہے کہاں — ذرا بلاؤ تو — میں بھی تو اپنی ادیبہ بیٹی کو دیکھوں!"

دس گیارہ سالہ ادیبہ کو اس ہنسی مذاق کے سوا اور توقع بھی کیا کرنی چاہئے تھی! اور جب کہ یوں بھی گھر میں اس کی کوئی اہم حیثیت نہ ہو۔ مگر اسے تو یہ اپنی انتہائی ہتک اور بے عزتی محسوس ہوئی — اس کے قابل قدر اور قابل فخر کارناموں کا یہ انعام؟ — اس کا دل — ایک طرف درد و غم سے بیٹھا جا رہا تھا اور دوسری طرف شرم اور جھجک سے سر اٹھاتے نہ بنتا تھا۔

اور آخر اس نے جھنجھلا کر سب کاغذ چھین لئے اور خود اپنے ہاتھوں اپنے سب "لختِ جگر" فنا کے گھاٹ اتار دیئے...

اور وہ دن بھر اس حسرت ناک انجام پر روتی رہی — اب وہ کبھی کچھ نہ لکھے گی ہائے اس کی عمر بھر کی محنت برباد ہو گئی — اور آنسو اور زیادہ روانی سے آنکھوں سے جاری ہو جاتے۔ لیکن خوش نصیبی سے گھر میں اس کا ایک ہمدرد پیدا ہو گیا — جس نے اس الھڑ، کم عمر، کم علم ناتجربہ کار لڑکی کی اس حیات کا مضحکہ نہیں اڑایا بلکہ اس کی ہمت بڑھائی اس کی رہبری کی، ڈھارس بندھائی شاید اس کی نکتہ شناس نظر نے بھانپ لیا کہ یہ لڑکی فطرت کی طرف سے ادبی ذوق لے کر پیدا ہوئی ہے.... اور شاید باوجود لڑکی ہونے کے اس کو اپنے باپ کی بے نظیر تصنیف و تالیف کی قابلیت میں سے ورثہ ملا ہے
اور پھر — اسی زمانے میں منشی پریم چند، مختصر اردو افسانے کے خالق، آسمانِ ادب پر نیرِ تاباں بن کر چمکے جن کی بدولت اس کا گھر بھی

شعور پیدا ہوا۔ بار بار ان کے افسانے پڑھتی مگر اسے سیری نہ ہوتی۔ خرد اور سرشار کو
سمجھنا اس کے لئے مشکل تھا۔ خواتین کے تصنیف شدہ قصے اور افسانوں کے کرداروں
کی غیر معمولی قابلیت، ذہانت، حسن و جمال، دولت و ثروت اس کو عجیب اور غیر
فطری سی محسوس ہوا کرتی تھی۔ لیکن پریم چند کی آسان زبان، سیدھا سادا
طرز بیان، تصنع سے پاک حقیقی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں، کرداروں کی سادگی
اور ان کی تمیز یا تر شخصیت اسے مسحور کرلیتی تھی۔ جس چیز کی تلاش میں اس کی
روح بھٹک رہی تھی، اس کا ذہن شعور کریں کھا رہا تھا وہ جیسے اسے مل گئی —
اور غیر محسوس طور پر اس کے خیالات پر ان افسانوں کا گہرا اثر پڑا۔

ایک ذہنی رہبر اور ایک ہمدرد مشیر ملنے کے بعد اس کی جھوٹی شرم اور بے جا
جھجک دور ہونے لگی۔ جرات اور خود اعتمادی کا جذبہ ابھرا۔ بے بضاعتی اور کم مائگی
کا احساس کم ہونے لگا اور وہ اپنے بد صورت شکستہ خط میں، اپنی کم علمی اور
کم سنی کے باوجود زور شور اور ذوق شوق سے لکھنے لگی... ہم سنوں کی چھیڑ چھاڑ
کسی کا تمسخر کسی کا طعن اور اعتراض، سب اس کا حوصلہ پست نہیں کرتے تھے بلکہ اسکی
آتش شوق اور بھڑک اٹھتی تھی۔ دیکھنا ایک دن ایسا آئے گا کہ یہی لوگ تعریف اور
تعجب سے اس کے "کارناموں" کو دیکھیں گے۔

وہ بڑھتی گئی۔ اس کا مطالعہ بڑھتا گیا۔ لکھنے کا شوق بھی بڑھتا رہا —
اور شوق بھی عجب اس پر کوئی جذبہ اثر کرتا تو وہ دل کی جگہ اس صفحہ کاغذ پر نکال
لیتی۔ وہ دنیا والوں سے شکستہ دل ہوتی یا غم و غصے سے بے حال، خوشی اور
مسرت سے سرشار ہوتی یا ناکامی اور بے بسی کے اثرات سے دل برداشتہ، ہر جذبے
کے اظہار کے لئے اس کے پاس قلم کا کارگر حربہ موجود تھا... اور اس طرح اسکے
پاس کاپیوں اور کاغذوں کے ڈھیر جمع ہوگئے۔ اگر کوئی اسے سمجھنا چاہتا تو اسے
ان بکھرے ہوئے کاغذوں سے بڑی مدد ملتی مگر یہ تکلیف کسی نے گوارا نہ کی — مگر
خود اسے اپنی شخصیت کی تعمیر میں ان سے بہت مدد ملی۔ اور اب وہ اپنے اس
شوق کو کسی قیمت پر چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھی۔

اور پھر اس کے مضمون اور افسانے زنانے اخبار رسالوں میں چھپنے لگے۔
رفتہ رفتہ ان کی مانگ بڑھنے لگی۔ وہ بزعم خود "اصلاحی" "معاشرتی" قصے وغیرہ
لکھ کر "ادب" کی اور "انسانیت کی" "بہت بڑی خدمت" انجام دے رہی تھی۔
ممکن ہے کہ ایک حد تک اس کا اصلی مقصد یہی ہو۔

لیکن ان سب کی تہہ میں شاید سب سے گہرا جذبہ اپنی خودی کو تسکین دینا
اور خود پسندی کے جذبے کو آسودہ کرنا تھا — وہ اپنے کو اب "بڑی ادیبہ" سمجھنے
لگی تھی —

اور پھر اس کی زندگی میں ایک انقلاب آیا — اس کی شادی ہوگئی۔ ایک
مستند اور پختہ کار ادیب کے ساتھ۔

اس کا ذوق ادب زندگی کی نئی دلچسپیوں، ذمہ داریوں اور دھندوں میں
پھنس کر شاید کم ہو جاتا، یا ختم ہو جاتا۔ لیکن ہم مذاق اور ہم خیال ساتھی کی صحبت
نے اسے اس ذہنی موت سے بچا لیا۔ اور یہ شوق گھٹنے کی جگہ اور بڑھنے لگا۔

اس نے اپنے مطالعے کو وسیع کرنے، اپنی مشق کو بڑھانے، اپنے ذوق
ادب کو بلند کرنے کے نئے منصوبے بنائے اور ان کو پورا کرنے میں لگ گئی۔

پر افسوس....

جوں جوں اس کا مطالعہ وسیع ہوا قوت تنقید بڑھی اسے اپنی کم مائگی اور
بے بضاعتی کا احساس بڑھنے لگا۔ "ادیبہ" اور "مصنفہ" ہونے کا زعم گھٹ گیا
اور ایک نو مشق شوقین لکھنے والی کے سوا اپنی اور کوئی حیثیت اردو ادب
میں نظر نہ آئی....

شاید یہ احساس ندامت و کم مائگی اسے ہمیشہ کے لئے قلم سے دست بردار
کر دیتا لیکن اس کے رفیق نے اسے بے دل ہونے سے بچا لیا.... اس کا ٹوٹا
ہوا حوصلہ بندھا اور وہ ایک مرتبہ پھر پورے ذوق و شوق اور لگن کے
ساتھ لکھنے پڑھنے میں مصروف ہوگئی!

وہ لگن اور ان تھک محنت اور شوق کے ساتھ اپنا مطالعہ وسیع کرنے،
اپنی قابلیت بڑھانے کی کوشش اور لکھنے کی مشق کر رہی تھی کہ ایک اور چکر نے
اس کے خیالات منتشر کر دئے۔

وہ اب ادبی تخلیق کی جگہ حقیقی تخلیق کر رہی ہے۔

مسرت و خوف، امید و بیم کے متضاد جذبات سے اس کا دل لرزاں تھا۔

وہ سمجھتی تھی کہ اسے بچوں سے کوئی خاص دلچسپی اور لگاؤ نہیں ہے —
اس کی دلچسپی کا اصلی مرکز تو اس کی تحریریں ہیں جنہیں وہ جان سے زیادہ چاہتی
ہے۔ پر اب اسے پتہ چلا کہ یہ اس کی نا تجربہ کاری اور سادہ لوحی تھی۔

وہ عورت کی فطرت سے ناواقف تھی۔

اسے اب اپنی اس بات کی بجائے حقیقی رنگ میں نظر آئی.... ادیبہ اور
مصنفہ کے دل میں بھی بچے کی محبت اور خواہش اسی شدت کے ساتھ ہوتی ہے۔

وہ دوسری عورتوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔

اور اس کا دھیان کرداروں اور افسانوں کی طرف سے ہٹ گیا۔
اب حقیقی انسان کی تشکیل [illegible]
اب اس کے دن اور رات اسی قسم کے خیالات میں گزرنے لگے۔

دل اور دماغ پر ایک ہی جذبہ طاری رہتا تھا۔ وہ ادب کی خادم ہے — اس کا اصلی کام ادبی خدمت کرنا ہے۔ اور اس کی روح کی پیاس اسی وقت بجھتی تھی جب وہ اپنے اس محبوب شغل میں مصروف ہوتی۔

بیماریاں، گھریلو کام، خاندانی جھگڑے بکھیڑے، مالی پریشانیاں، وقت کی کمی یہ سب اس کے راستے میں روڑے اٹکاتے۔ بدقسمتی سے وہ عورت تھی۔ ہندوستانی عورت۔ جس کے لئے اور سب کاموں سے آزاد ہو کر اپنی کسی خاص مقصد کی تکمیل ناممکن ہے۔ لیکن وہ کسی نہ کسی طرح ان سب رکاوٹوں کو دور کر کے کچھ نہ کچھ وقت اپنے اصلی کام کے لئے نکال ہی لیا کرتی۔

اس نئی لگن نے اس کی زندگی کا دھارا ہی پلٹ دیا۔

زندگی کے وہ صدمے اور تلخیاں جن کو وہ پہلے قدرت کا ظلم اور ناانصافی سمجھتی تھی اب اسے خدا کی رحمت اور فطرت کا سبق معلوم ہونے لگے۔

اگر اس نے بچپن سے رنج و غم نہ سہے ہوتے تو اسے دوسروں کے غم کا احساس نہ ہو سکتا۔ اسے مشکلات اور پریشانیاں نہ جھیلنی پڑتیں تو وہ اوروں کی مشکلات اور پریشانیوں کو پوری طرح کیسے محسوس کر سکتی تھی؟

اگر اس نے بیماریوں کے مصائب نہ سہے ہوتے مریضوں کا دکھ اور حالت کس طرح جان سکتی؟

اگر وہ ہزاروں لاکھوں عورتوں کی طرح بال بچوں میں گھر گئی ہوتی تو وہ ادبی کام کیسے کرتی؟

اور اگر — وہ ماں بنی ہی نہ ہوتی تو اس کے دل میں وہ لوچ، وہ گداز، وہ سوز پیدا نہ ہوتا جو اس محبوب غم کے بدلے میں ملا۔ وہ داغ جس نے اسکے دل کو روشن کیا، جس نے اسے دوسری دکھی، غم نصیب ماؤں کے درد کو سمجھنا سکھایا، جس نے اسے شدتِ احساس کی دولت بخشی۔ وہ شاید سخت دل، بے حس۔ دل برداشتہ ناشکر گزار عورت ہوتی جسے اس کا شکوہ اور صدمہ ہوتا کہ وہ زندگی کی سب سے بڑی نعمت سے محروم ہے۔ وہ روکھی اور کھُری ہوتی۔ شاید رشک و جلن کا جذبہ اس پر تسلط پا لیتا، یاس و نامرادی کا احساس غلبہ حاصل کر لیتا۔۔۔ وہ اپنا غم سمجھتی مگر دوسرے کا دکھ نہ محسوس کر سکتی، جو ادیب کی سب سے بڑی محرومی سب سے بڑی ناکامی ہو سکتی ہے۔

کون کہتا ہے قدرت بے انصاف ہے؟ اس سے ایک نعمت چھین لی گئی، پر بدلے میں کتنی بڑی دولت اسے عطا کی گئی ہے؟؟

اور جب اس کی پہلی کتاب چھپ کر آئی تو اس کا دل بچی مسرت سے لبریز ہو گیا۔ اس کی کتاب پر جو حوصلہ افزا ریویو، جو امید پرور تنقیدیں ہوئیں انہوں نے اس کا دل اور بڑھایا اسے اپنے اوپر اور زیادہ اعتماد اور زیادہ بھروسہ پیدا ہوا۔ ترقی کی اور زیادہ چیٹک دل کو لگ گئی۔

یہ کتاب اس کی ادبی زندگی کا سنگِ بنیاد ہے۔ اسی پر وہ باقی پوری عمارت تعمیر کرے گی۔

کتنے سال گذر گئے۔۔۔

وہ لکھتی رہی۔۔۔۔۔

شوق اور لگن سے۔۔۔۔۔

اس کے افسانے، مضامین، ناول کے باب ادبی رسالوں میں تواتر کے ساتھ شائع ہونے لگے۔۔۔۔۔

اس نے اپنی کئی کتابیں اشاعت کے لئے مرتب کر لیں۔

مضامین کے مجموعے۔۔۔۔

افسانوں کے مجموعے۔۔۔۔۔

بچوں کی کہانیاں۔۔۔۔۔

ناول۔۔۔۔۔

لیکن کاغذ کی نایابی، کتابت و طباعت کی مشکلیں جنگ کی برکات میں سے تھیں۔ اس کی کتابیں اشاعت کے انتظار میں پڑی رہیں۔ سالوں کی تعداد بڑھتی رہی۔

اس کا دل ان کو چھپوانے کے لئے اور زیادہ بے قرار ہوتا گیا۔

اس نے — مالی مشکلوں کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی۔۔۔۔

اس نے اپنا زیور فروخت کر دیا۔۔۔۔۔ اپنی جائیداد بیچ دی ——

یہ چیزیں اس کے بڑے مقصد کے سامنے کیا حقیقت رکھتی ہیں اس کے لئے؟

اور اس کی کتابیں طباعت و اشاعت کے مراحل طے کرنے لگیں۔

انتظار۔۔۔۔

انتظار — موت سے زیادہ سخت انتظار۔۔۔۔۔

کاتبوں کی کاہلی،

مطابع کی وعدہ خلافیاں،

جلد سازوں کے حیلے۔

ناشروں کے نخرے۔۔۔۔

وہ سہتی رہی اور انتظار کرتی رہی؟

کبھی تو اس کی مراد بر آئے گی، کبھی تو انتظار کی یہ مدت ختم ہو گی؟ اس کی کتابیں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر اس کے سامنے آئیں گی۔

وہ سوچتی — آخر وہ ان کی اشاعت کے لئے بے قرار کیوں ہے ——

کیا اس لئے کہ اس سے اس کی شہرت ہوگی — یہ نہیں تو پھر چھپنے نہ چھپنے سے
کیا فرق پڑتا ہے؟ اس کا کام تو لکھنا ہے ۔ وہ لکھے جائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر ۔ ۔ ۔ ۔
نہیں ۔ اس سے اسے تسکین نہیں ہوتی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ وہ اس ماں کی طرح بے قرار
تھی جس کے بچے کہیں دور تحصیل علم کے لئے گئے ہوئے ہوں اور وہ ان کے آنے
کے دن گن رہی ہو کہ ۔ ۔ ۔ کب وہ آکر اس کی آنکھوں کو ٹھنڈک ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے
بے چین دل کو سکون بخشیں گے؟

اور آخر کار — اس کی کتابیں چھپ کر آگئیں ۔ ۔ ۔ ۔

پانچ نئی تصانیف!!

مسرت اور فخر، انکسار اور خوف کے متضاد جذبات سے اس کا دل لبریز
ہوگیا ۔ جانے اس کی یہ ناچیز کوششیں ادبی حلقے میں کس نظر سے دیکھی جائیں گی؟
جانے یہ اس کے مقصد اولیٰ، خدمت انسانیت، کے معیار پر کس حد تک پوری
اتریں گی؟

مگر — بہر حال —

اس نے ایمانداری اور محنت کے ساتھ کام کیا ہے ۔ اور محنت کو راحت،
کوشش کو کامیابی حاصل ہوتی ہے — ان میں جو کمیاں، جو کمزوریاں، جو خامیاں
ہوں گی وہ آئندہ تصانیف میں ان کو دور کرنے کی کوشش کرے گی —

اسی طرح زینہ بزینہ تو انسان بام بلند پر پہنچتا ہے ۔

وہ اپنی چھ تصانیف اپنی کتابوں کی الماری کے ایک خانہ میں سجا رہی
تھی کہ اس کی ایک دوست نے خوش ہو کر کہا ماشاءاللہ اب تو بہت سی کتابیں
ہوگئیں — "اللہ کرے زور قلم اور زیادہ ۔ ۔ ۔ ۔"

تو اس نے کس طرح خوشی سے بے خود ہو کر — دھڑکتے دل کے
ساتھ جواب دیا تھا ۔

"انشاءاللہ ۔ ابھی تو یہ پورا خانہ مجھے بھرنا ہے بہن — اگر زندگی رہی تو"
"انشاءاللہ"

اور اب اسے پرانے خیالات کی عورتوں کی باتوں پر ہنسی آیا کرتی —
وہ خدا سے دعا کرتیں کہ اس "بچاری" کے ایک بچہ ہو جائے —
اس کی بدنصیبی اور محرومی پر رنج و افسوس کرتیں ۔ ۔ ۔ ۔

اور وہ دل ہی دل میں مسکراتی!

بچاری قدامت پرست عورتیں!

انجان ۔ ۔ ۔ ۔ بے خبر عورتیں!!

وہ جانتی ہی نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اس کے تو بہت سے بچے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

آخر اس کی یہ ساری تصانیف اس کے بچے ہی تو ہیں ۔ ۔ ۔ ۔

وہ کیوں اپنے کو محروم اور بدنصیب سمجھے، اولاد سے مائیں جن
جن باتوں کی توقع کرتی ہیں کیا اس کی یہ کتابیں وہ سب کچھ اسے نہیں
دے سکتیں ۔ ۔ ۔ ۔ رفاقت کی ۔ ۔ ۔ ۔ نام چلنے کی ۔ ۔ ۔ ۔ نیک نامی کی، عزت و
شہرت کی — کفالت کی؟ تو کون سی ایسی بات ہے جو اپنی "اولاد معنوی" سے
حاصل نہیں ہو سکتی ۔ ۔ ۔ ۔

لیکن جس طرح ماں بچے کی تخلیق اور پرورش ان سب جذبات اور
خیالات سے بالاتر اپنی فطرت سے مجبور ہو کر کرتی ہے، کوئی ذاتی غرض،
خود غرضی کا کوئی نمایاں جذبہ اس کے دل میں نہیں ہوتا ۔ ۔ ۔ محض فطری
محبت اس کی محرک ہوتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ایسے ہی بے غرض جذبے کے ماتحت
وہ اپنی "دماغی اولاد" کی تخلیق و تکمیل کیا کرتی! اس سے اسے وہی سچی اور
روحانی مسرت حاصل ہوتی جو کسی ماں کو اپنے چہیتے بچوں کی خاطر تکلیف
سہ کر اپنے کو تج کر حاصل ہو سکتی ہے ۔

اس نے اپنے ان معنوی بچوں کو حقیقی بچوں کی جگہ دے دی تھی ۔

وہ خوش تھی اور اپنی قسمت پر نازاں ۔

اس کی چھ کتابیں چھپ چکی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ چار پبلشرز کے پاس ہیں جو عنقریب
چھپ جائیں گی —

مضامین اور افسانوں کے تازہ مجموعے زیر ترتیب ہیں — اور
اس کا نیا ناول مکمل ہونے کے قریب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سال بھر کے اندر اس کی شائع شدہ تصانیف درجن بھر ہو جائیں گی!
اس کی کتابیں جس نظر سے دیکھی گئیں تھیں اس نے اسے مایوس
نہیں کیا تھا ۔

وہ تخیل کے پروں پر اڑ رہی تھی —

پھر شیریں خواب ۔ سہانے سپنے دیکھ رہی تھی ۔

مستقبل — شاندار — پرمسرت مستقبل اس کا منتظر ہے!!! —

گرمیوں کی چھٹیاں تھیں ۔ وہ دلی سے بہت دور اپنے عزیزوں کے
ساتھ مسرت و اطمینان کے ساتھ چھٹیاں گزارنے گئی ہوئی تھی!

عرصہ دراز بعد اسے سکون و اطمینان ملا تھا ۔ اس کی صحت بحال، دماغ
حاضر، تخیل کی پرواز زوردار اور دل خوش تھا ۔ آمد ہی آمد تھی ہر وقت
نئی نئی چیزیں اسے سوجھا کرتیں ۔ بچوں کی کتنی کہانیاں اس نے گھڑ ڈالیں

ایک پورا ناول مکمل ہونے کے قریب تھا ...... سالہا سال سے اسے اپنی ادبی مصروفیات کے لئے جس سکون و اطمینان کی خواہش تھی وہ اسے آج میسر تھا۔ اور وہ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہی تھی۔

پندرہ اگست کو ہندوستان آزاد ہوگیا... پاکستان بن گیا! کروڑوں لوگوں کے ساتھ وہ بھی اس مسرت میں دل سے شریک تھی۔ اگرچہ ملک کے بعض حصوں میں فتنہ و فساد اور خوں ریزی جاری تھی ...... جو حوصلہ شکن اور پریشان کن تھی مگر اس کا بھی اوروں کی طرح یہ خیال تھا کہ آزادی کے بعد فساد کی یہ آگ ٹھنڈی پڑ جائے گی ......

آہ اب اس کا دیس آزاد ہے ....

وہ کتنی خوش نصیب ہے کہ اپنی زندگی ہیں یہ وقت اسے دیکھنے کو ملا۔

وہ کیسے اہم زمانے میں پیدا ہوئی!

وہ تاریخ بنتے دیکھ رہی ہے ......

یوم آزادی کو جب ہر طرف خوشی اور مسرت کی لہریں موجیں مار رہی تھیں اس نے بیٹھ کر اپنے جذبات و احساسات کا اظہار ایک مضمون کی شکل میں کیا ...... اس میں بچپن کی یہ عادت اب تک باقی تھی کہ جو جذبہ دل پر گہرا اثر کرتا اسے فوراً قلمبند کر ڈالتی۔

اب وہ آزاد ملک کی آزاد عورت ہے — اب وہ دگنے جوش اور شوق سے کام کرے گی!

جانے وہ کیا کیا منصوبے بنا رہی تھی!!

لیکن ستمبر میں دلی پر جو کچھ بیت گیا ...... اس نے اس کی ساری آرزوؤں امنگوں اور مسرتوں کو خاک میں ملا دیا ....

بدبخت دلی ...... آج پھر تباہ ہو رہی تھی — پھر لٹ رہی تھی — پھر اس میں غدر برپا تھا ...

جب اس نے دلی کے فساد کی خبر سنی تو بجلی سی گر پڑی، اس کے عزیز، دوست، گھر بار، اس کا سب کچھ شدید خطرے میں تھا ..... اور اسے کچھ خبر نہ تھی کہ ان سب پر کیا بیتی؟

اوہ — کس کرب کی حالت میں یہ چند ہفتے بیتے ..... اس روحانی کرب اور دلی بے چینی کو بس یا وہ جانتی تھی یا اس کا خدا .... اس کے دوست اور عزیز زندہ ہیں یا نہیں؟ زندہ ہیں تو کس حال میں ہیں؟ گھر بار ..... وطن سب لٹ گیا یا باقی ہے؟ وہ علمی و ادبی ادارے جن سے اس کا گہرا، پرانا اور روحی تعلق ہے باقی ہیں یا نفرت و تعصب اور انتقام کی نذر ہو گئے .....؟ آف درد و کرب کا یہ شدید ترین زمانہ — کبھی کا ہے کہ ایسا سخت وقت سہا تھا ... اس کا وطن گھر، خاندان، اس کے دوست، اس کی قوم، ملک سب مصیبت و تباہی کے بھنور میں پھنسے ہیں — ذلت و نامرادی، مصیبت و تباہی منہ پھاڑے نگلنے کو تیار ہیں — اور وہ بے بسی سے سب کچھ سن رہی ہے ... سہ رہی ہے اور کچھ نہیں کر سکتی!

آہ کیا ہوگا؟ کیا ہوگا؟ دن رات، سوتے جاگتے یہ سوال اس کے دماغ میں گونجتا رہتا جس کا کوئی جواب اسے نہ ملتا تھا — انتظار — انتظار — بے بسی۔ آہ کیسی بے بسی — نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن — نہ مصیبت ماروں کے پاس جا کر — ان کی کچھ خدمت کر کے اپنے مضطرب دل کو تسکین دے سکتی ہے — نہ اپنے دل و دماغ کو اتنا بے حس بنانے پر قدرت رکھتی ہے کہ وہ سب کچھ دیکھے، سنے اور اثر نہ لے — اس کا دماغ تخیل کی آنکھوں سے اسے وہ سب وحشیانہ مناظر دکھاتا رہتا تھا جو سارے دیس میں ہو رہے تھے ... اس کے دل پر، اعصاب پر، دماغ پر، شدید کرب اور بے چینی کی کیفیت گزر رہی تھی — جس نے آخر کار اسے سخت بیمار کر ڈالا۔

اور پھر رفتہ رفتہ اپنے لوگوں کا حال اسے معلوم ہونا شروع ہوا — کچھ بھاگ گئے ہیں — کچھ لٹ گئے ہیں — کچھ ہمیشہ کے لئے تباہ ہو گئے ہیں — کچھ بچ گئے ہیں — اپنے ہمدرد اور انسان دوست پڑوسیوں کی بدولت۔

اور جب اسے اپنے قریبی دوستوں اور عزیزوں کی کم سے کم جانوں کی طرف سے اطمینان ہوا تو دوسری فکر لگ گئی — جانے دلی کے علمی ادبی اداروں پر کیا گذری؟ ان کا مرکز تو عین اس جگہ تھا جہاں سب سے زیادہ آتش زنی اور لوٹ مار ہوئی ہے — کتنے دن تک کوئی خبر نہ ملی — جانے کیا ہوا ہو؟ پر اس کا دل ہرگز یہ ماننے کو تیار نہ تھا کہ یہ قابل قدر ادبی اور علمی ادارے — جن کو بنانے میں کتنے لوگوں نے اپنی پوری پوری زندگیاں نثار کر دی ہیں، جن کا ادبی سرمایہ کسی قوم کے لئے باعث فخر ہو سکتا ہے .... کوئی تباہ کر سکتا ہے ..... نہیں نہیں — ایسی بھی کیا بے حسی .... کیا اس کے ہم قوم اور ہم مذہب اتنے بے حس — اتنے وحشی ہو گئے ہیں کہ دوسروں کے علمی، ادبی سرمائے کو بھی تباہ کرنے پر تل جائیں گے — اس سرمائے کو جس پر تہذیب و تمدن کی بنیاد ہوتی ہے — ایسی بربریت — ایسی بے حسی۔ انسان سے ممکن نہیں — خدا انہیں بچائے گا — وہ کسی معجزہ کے زیر اثر بچ گئے ہوں گے!!

نادان — ناتجربہ کار — حساس — جذباتی عورت ... کیسی کیسی

طفل تسلیاں اپنے دل کو دے رہی تھی — تعصب و نفرت۔ انتقام اور غصہ سے بدحواس انسانوں کی حالت سے بے خبر عورت....

کتنا یقین تھا اسے انسانوں کی انسانیت پر!!!

اور آج!

یہ تانا بانا....

امید کا آخری تار ٹوٹ گیا...

ہندوستان کا سب سے قابلِ قدر اور ادب کا مرکز، علمی اور ادبی کتابوں کا بیش بہا خزانہ جس کے بنانے میں ملک کے بہترین دل و دماغ چوتھائی صدی سے ان تھک محنت کر رہے تھے — آج مجنوں، وحشی، غضب ناک لوگوں کے ہاتھوں انتقام کی آگ میں جلا کر راکھ کر ڈالا گیا —

لاکھوں کا مالی نقصان.....

کروڑوں کا ادبی سرمایہ....

انمول علمی دولت.....

سالہا سال کی ان تھک محنت اور کوشش — سب خاک میں مل گئیں۔

کتنے نوادر — جل کر راکھ ہو گئے۔

اے خدایا! — ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ یوں بھی ہوتا ہے؟

اور ساتھ ہی...

اس کی عمر بھر کی محنت پر بھی پانی پھر گیا....

مستقبل کے سارے سہانے خواب تاراج ہو گئے....

زندگی کی شیریں آرزوئیں خاک میں مل گئیں...

امنگوں، خواہشوں، مسرتوں پر اوس پڑ گئی...

اس کی دماغ کی پیداوار.....

اس کے دل کے ٹکڑے.....

اس کے لختِ جگر...

اس کے معنوی بچے.....

نہیں نہیں اس کے حقیقی بچے...

آگ میں جل کر راکھ ہو گئے....

اے اللہ... اس نے اور جو کچھ سہا اور دیکھا تھا وہ کم تھا کہ یہ بھی اسے دیکھنا پڑا!

وہ کیوں زندہ رہی یہ دن دیکھنے کے لئے۔

بس اب وہ بھی کچھ نہ لکھے گی۔ کیا اس لئے لکھے کہ عمر بھر کی محنت جب چاہے چند وحشیوں کے ہاتھوں جل کر راکھ ہو جائے....؟

وہ اس شوق کو چھوڑ دے گی —... اس مقصد کو جس میں اس کی جان بستی ہے، جس محور کے گرد اس کی ساری زندگی گھومتی ہے، اس آرزو اور امنگ کو جس کے سہارے وہ سارے رنج و غم، فکر و تردد کو ہنس کھیل کر ہنستی آئی ہے، اس مسرت کو جس کے بغیر اس کی روح کو سکون نہیں ملتا۔ تج دے گی — ترک کر دے گی —

آہ.... اب اس کی باقی زندگی — بے مقصد، بے کار — سنسان اور ویران..... بے کیف اور بے رنگ۔

روتے روتے اس کے خیالات نے پلٹا کھایا!

یہ کیا؟ تو اتنی خود غرض ہے؟ اپنے معمولی سے نقصان کی — ایسا نقصان جس کی زمانہ تلافی کر سکتا ہے تو اتنا غم کر رہی ہے — اور یہ نہیں سوچتی کہ اوروں پر کیا بیت رہی ہے؟ اسی پر اپنے کو بڑا حساس اور دردمند سمجھتی ہے؟ ذرا سوچ۔ غور کر۔ دیکھ — دیس کس دور سے گزر رہا ہے قوم پر کیا بیت رہی ہے؟ تیرا مالی سرمایہ تباہ ہو گیا؟ پھر مہیا ہو سکتا ہے۔ کتابیں جل گئیں؟ پھر چھپ سکتی ہیں! غیر مطبوعہ کتابیں تلف ہو گئیں؟ پھر لکھی جا سکتی ہیں۔ لکھی ہوئی کتابیں لوگوں نے تباہ کر دیں لیکن تیرے دماغ میں جو محفوظ ہیں انہیں کون ضائع کر سکتا ہے —؟ لیکن ذرا خیال کر ان لوگوں کی مصیبت و تباہی کا جو اس زمانے میں اس طرح اجڑے کہ پھر بسنا محال ہے ان معصوم جانوں کا جو ختم کر دی گئیں.... ان گھروں کا جو تباہ و برباد ہو گئے، ان لاکھوں انسانوں کا جو خانماں برباد ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر مارے مارے پھر رہے ہیں — ان عورتوں کا جن کی گودیں خالی ہو گئیں، جن کے سہاگ اجڑ گئے، جن کی آبرو جیسی انمول چیز لوٹ لی گئی ——

آہ — کیسی کیسی سخت تباہیاں اور مصیبتیں لوگوں پر گزر رہی ہیں اور تو — تو..... اپنے اس نقصان پر رو رہی ہے جو ان مصیبتوں کے پہاڑ کے سامنے کچھ بھی نہیں..... جی چھوڑ رہی ہے..... کبھی نہ لکھنے کا عہد کر رہی ہے — غم و غصے سے کانپ رہی ہے — اف تو کتنی بے حس ہے — خود غرض ہے۔

رو — اس انسانیت پر جو ختم ہو رہی ہے، رو اس تہذیب پر جو مٹ رہی ہے، اس تمدن پر جو خاک میں ملایا جا رہا ہے، رو ان نام نہاد انسانوں پر جو اپنی شرمناک وحشیانہ حرکتوں سے انسانیت کا نام بدنام کر رہے ہیں۔ ان ہم وطن لوگوں پر جو غصے میں آدمیت سے خارج نظر آ رہے ہیں، آج اخلاقی قدروں پر جو ظلم و فساد، تعصب و نفرت کی آگ میں جل کر بھسم ہو

— بلکہ ماتم کر اُس بے بسی اور بے حسی اور بے ہمتی پر جو لوگوں کو دوسروں کا دکھ درد نہیں سمجھنے دیتی — اس جہالت، غلامی اور تعصب پر جس نے تیرے دیس والوں کو انسان سے وحشی درندہ بنا دیا۔

رو — اتنا رو کہ تیرا دل خون ہو کر بہہ جائے — تیرا جسم آنسو بن کر پگھل جائے —

ہاں رو کہ تیرے جیسے بے عمل اور بے ہمت لوگ رونے کے سوا کر ہی کیا سکتے ہیں؟

زندہ قومیں، باہمت اور حوصلہ مند انسان، محنتی اور عملی لوگ، انسانیت پر اور خدا پر بھروسہ رکھنے والے مایوس اور نا امید نہیں ہوتے۔ ہاتھ پاؤں چھوڑ کر نہیں بیٹھا کرتے۔ وہ جدوجہد کرتے ہیں، کوشش کرتے ہیں — زمانے سے ٹکر لیتے ہیں، حالات کا مقابلہ کرتے ہیں — ان کا دائرہ کتنا ہی محدود — ان کا عمل کیسا ہی چھوٹا، کام بظاہر کیسا ہی بے حقیقت اور بے بضاعت ہو۔ وہ محنت اور دیانت داری سے حالات کو سنوارنے، مصیبتوں کو دور کرنے، ان کا مقابلہ کرنے اور انسانوں کو انسان بنانے کی انتہائی، ان تھک — پر خلوص کوشش کرتے ہیں — کہ کوشش کرنا انسان کا فرض ہے اور اس کو مشکور کرنا خدا کا کام۔

ہاں رو — کہ تجھ جیسا بے ہمت انسان بس رو سکتا ہے۔

اور واقعی اس کو اپنی حالت پر اس شدت سے رونا آیا کہ معلوم ہوتا تھا آج وہ اس سیلابِ اشک میں بہہ جائے گی — اسے محسوس ہو رہا تھا کہ سچ مچ اس کا دل خون ہو کر آنکھوں کی راہ بہہ رہا ہے۔

لیکن اگلے دن صبح کو جب وہ بستر سے اٹھی تو اس کا دل ہمت اور حوصلے سے بھرا ہوا تھا ..... اس کے چہرے سے ایک نئے ارادے کا — آنکھوں سے ایک نئی روشنی اور مستقل مزاجی کا اظہار ہو رہا تھا۔

اس نے مغلوب نہ ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ناامیدی کی شمع بجھ چکی تھی — امید کا سورج اپنا جلوہ دکھا رہا تھا۔

اس کا چہرہ ایک نئے عزم سے چمک رہا تھا۔

پاکستان کے خصوصی مہمان — باقی صفحہ ۱۰

سے صدق دل اور ایثار نفسی سے کام لیں اور ذاتی تشخص سے غرض نہ رکھیں آخر انہیں رہنا تو یہیں ہے پھر اس قسم کی شکر رنجی کی باتوں کو اچھالا نہیں بلکہ دبا دینا چاہیئے۔

معمولی معاشرت میں آپ دیکھتے ہیں کہ مہذب افراد کا سلوک کیا ہوتا ہے؟ یہی کہ میزبان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ مہمان کو ہر طرح راحت پہنچاؤ اور مہمان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کی وجہ سے میزبان کو کم سے کم زحمت ہو۔ اگر سب اس کو سمجھ لیں تو ہر قسم کی مغائرت اور چپقلش جو مہاجرین اور انصار میں کہیں کہیں کم و بیش پائی جاتی ہے بالکل غائب ہو جائے۔ اور پھر شاعر اور ادیب کو تو ایسے ناگوار کوائف سے بہت دور اور بالاتر رہنا چاہئے۔ جب مقاصد میں احدیت ہے تو عمل میں دو رنگی کچھ معنی نہیں رکھتی۔ جب دونوں ایک دوسرے کی دلداری کے خواہشمند ہیں اور سب کا مطمح نظر اردو کی خدمت ہے تو پنجاب اور دہلی۔ پاکستان اور یو۔پی متغائرانہ فرق مہمل بات ہے۔ سنا نہیں پروانہ چراغ حرم و دیر ندانند

یزدانی ملک

جب قافلہ چلا......

(اس عظیم سانحہ کے کردار تخیلی ہو ہی نہیں سکتے)

بادل ہر طرف سے کچھ ایسے گھر کر آیا کہ بس آج ہی برسیگا۔ پھر نہیں۔ کالے سیاہ گھنگھور بادلوں نے کچھ ایسا گھیرا ڈالا کہ دن کے ہوتے ہوئے بھی ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھا گیا۔ ہاتھ کا ہاتھ اجنبی بن گیا۔ ویسے تو ان دنوں بارش تقریباً ہر روز ہی ہو جایا کرتی تھی۔ بادل گھر گھر کے آیا کرتے تھے مگر یہ طور اطوار۔ یہ گھن گرج۔ ایسے معلوم ہوتا۔ جیسے کسی پہاڑی دوشیزہ نے جس کا پیا پردیس میں ہو۔ بے تحاشا بال کھول دیئے ہوں۔ لمبے گھنگھریالے۔ اور سیاہ کالے۔ اور پرچمبہ اور کانگڑہ کی پہاڑیوں کی طرف بجلی ایسے کوندتی جیسے جوگندر نگر سے آنے والی بجلی کے کھمبوں کے تار کٹ جائیں اور بجلی آزاد ہو کر ہوا میں پھیل جائے۔ لڑکیوں کے سکول میں بند یہ بے گناہ لوگوں کا ہجوم۔ یہ معصوم بھیڑوں کا گروہ۔ گورداسپور میں رہنے والے لوگوں کا آخری سلسلہ۔ آسمان کی طرف دیکھتے اور دیکھ کر رہ جاتے۔ سوچتے کہ پہلے تو کبھی اتنی بارش نہ ہوئی تھی۔ پہلے تو انہی دنوں بڑا سہانا موسم ہوتا تھا۔ اب کی بار یہ کیا ہو گیا آخر۔ قیامت قریب آگئی۔ یا حضرتِ انسان کے گناہ دیکھ دیکھ کر خدا کے صبر کا پیالہ لبریز ہو گیا۔ ایک مہینہ سے وہ اس جگہ میں بند پڑے تھے۔ بھوکے پیاسے۔ باہر نکلنے سے عاری۔ چڑیا گھر کے جانوروں سے بھی بدتر بغیر کسی کامد کے۔ بغیر کسی حفاظت کے۔ مکھیوں۔ غلاظت اور تعفن کے شکار۔ پانچ چھ ہزار انسان۔ اور یہ چھوٹی سی جگہ۔ پھر کمرے کم۔ اور کھلی جگہ زیادہ کہ بارش شروع ہو گئی مینہ برسا اور ایسے برسا کہ پہلے نہ برسا تھا۔ گلی کوچے۔ پانی سے اس طرح بھر گئے کہ معلوم ہوتا جیسے کہ راوی مادھوپور کا بند ٹوٹ گیا ہو۔ ہوا ایسے چلی کہ دیوار کے پاس کا سفیدہ کا لمبا تڑنگا درخت سکول کے صحن میں آ رہا۔ سامنے کے دو کمروں اور وہاں کے مکینوں کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا اور سب لوگ جا چکے تھے۔ لاریوں میں ریل پر اور پیدل اور اب جانے والوں کی شاید یہ آخری قسط تھی۔ ان بدنصیبوں کو نکال کر سٹیشن کے پاس نسیم محمود مجسٹریٹ کی کوٹھی بھیجا گیا۔ اس امید میں کہ وہاں ایک تو بحفاظت رہیں گے۔ دوسرے ریل سے جانے کا انتظام ہو سکے گا۔ مگر بیس دن کوئی بار بار تھوڑی آتے ہیں۔ ریل آتی بھی تو پیچھے سے کھچا کھچ بھری ہوتی۔ اور پھر سٹیشن ماسٹر نے چار ڈبے دیئے کاٹ لئے کیوں۔ یہ کسی کو نہ معلوم ہو سکا۔ لاریاں آتیں۔ مگر لوگوں کے سامان سے بھری ہوئیں۔ اور اگر جگہ ہوتی بھی تو ایک آدھ کی۔ ان ہزاروں افراد کے لئے لاریاں آخر کہاں سے آتیں۔ اور بارش تھی کہ تھمتی تو اپنے سیدھے ترچھے تیروں سے ان کی تواضع کرتی رہتی۔ سکول کی عمارت میں کچھ لوگ کم از کم اس سے تو محفوظ تھے۔ اگرچہ وہاں بھی بم پھٹنے کا ہر لحظہ خوف لگا رہتا۔ پچھلے ہی روز جبکہ لوگ رات کو صحن میں سوئے ہوئے تھے۔ تو باہر سے لگاتار تین چار مقامی ساخت کے بم دھماکے کے ساتھ اندر آ رہے۔ صحن کے لوگ اندر کمروں کی طرف بھاگ نکلے اور اندر کے لوگ باہر کی طرف۔ کہ شاید چھت اوپر نہ آ رہے۔ بیس پچیس لوگ تو وہیں جل بھن کر خاک ہو گئے۔ کئی ایک کے پرخچے اڑ گئے۔ اور کئی ایک پر خوف سے ہی رعشہ طاری ہو گیا۔ شکور کی والدہ اسی حادثہ کا شکار ہو گئیں۔ جبکہ وہ اندر ایک کونہ میں دبکا پڑا تھا۔ آخر ان بھیڑوں کے گروہ میں سے کچھ کو نکال کر شہر کے درمیان خانصاحب محمد نصیب کے گھر میں لا ڈالا گیا۔ جانے والے لوگ سوچتے رہے۔ کہ بس آج نہ بچے تو خبر نہیں یہ کہاں لے جائیں۔ اور جو سکول میں رہ گئے وہ سوچتے کہ وہ ہم سے اچھے رہے کم از کم وہاں پہ فوج کا پہرہ تو ہے۔ حفاظت سے تو رہیں گے۔ وہاں سے ہی کچھ کو سامنے خان بہادر شیخ محمد کے مکان میں ڈال دیا گیا۔

جب تک یہ لوگ وہاں رہے۔ بحفاظت تو رہے۔ مگر ان کے پاکستان بھیجنے کی کوئی سبیل نہ بن سکی۔ ہزار کوشش کے باوجود بھی ریل کا انتظام نہ ہو سکا۔ چالیس پچاس لاریاں تو بڑی دور کی بات تھی۔ آخر وہاں کے انگریز میجر نے فیصلہ کیا۔ کہ وہ اپنے سپاہیوں میں سے چند اچھے گورکھا سپاہی اور فرسٹ پنجاب رجمنٹ کے کچھ سکھ جوان ان کے ساتھ کر دیگا۔ اور انھیں پیدل ہی مارچ کرا دیا جائے۔ آخر کب تک یہ یہاں پڑے سڑتے رہیں گے۔ اور کب تک یہ یہاں بحفاظت رہ سکیں گے۔ اور قافلہ چلا دیا گیا۔ کوئی بھی اس بات پہ یقین نہ کرتا کہ گورداسپور سے لاہور تک کا کوئی سوا ایک سو میل کا یہ پیدل سفر وہ کر سکیں گے۔ اور پھر استقدر خطرات سے بھرپور راستے سے۔ استقلال چل پڑا۔ انسان نے [illegible] کی۔ سڑکیں۔ موٹریں۔ ہوائی جہاز۔ اور اب ایٹم۔ فاصلہ کم سے کم وقت میں طے کرنے اور زیادہ سے زیادہ آرام حاصل کرنے کے لئے انسان نے کیا کچھ نہیں کیا مگر پھر ایک ایسا وقت بھی آ گیا جبکہ یہ سب اشیا اسکے کسی کام کی نہ رہیں۔ وہ ایسا ہی بن گیا جیسا کہ وہ اس سرزمین پر پھینکا گیا تھا ننگا اور بھوکا جس کا بستر جنگل میں تھا اور جس کی خوراک گھاس پات تھی۔ اپنی عادات و اطوار میں وحشیوں سے بڑھ کے۔ انسان چاہے کتنا ہی مہذب کیوں نہ ہو جائے وہ وحشیانہ پن جو کہ ازل سے اسکی سرشت میں شامل کر دیا گیا ہے کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی روپ میں نمودار ہو ہی جاتا ہے۔ قافلہ رواں تھا۔ اس میں مجھ بھی شامل تھے۔

حمید۔ شیرو۔ نبی داد۔ امام دین ماشکی۔ بٹ صاحب۔ بشیر چودھری۔ رحمتے کمہارن۔ پہلوان۔ مستری محمد دین۔ فضل اور حقا نائی۔

حمید بیچارہ خواہ مخواہ ہی اس آفت میں پھنس گیا تھا۔ وہ کہیں لاہور میں ملازم تھا۔ مگر رخصت لیکر ذرا اپنی روح اور جسم کو سبکسار کرنے ڈھونڈی گیا ہوا تھا۔ کہ یہ طوفان شروع ہوگیا۔ اس کے والدین اور عزیز و اقارب تمام گورداسپور تھے۔ وہ وہاں سے بچتا۔ چھپتا کچھ راستہ لاری میں اور کچھ پیدل طے کر کے گورداسپور پہنچا۔ تو اس کے والدین اور عزیز و اقارب پہلے ہی وہاں سے جا چکے تھے۔ وہ اپنے گھر کی طرف گیا۔ مگر وہاں اب کیا رکھا تھا گھر لٹ پڑا تھا۔ اور اس میں اس کے محلے کے ہی لوگ گھسے پڑے تھے۔ اس نے کوشش کی کہ اور کچھ نہیں تو اپنی کتابیں جو کہ بچ رہی تھیں ہی ساتھ لیجائے۔ مگر گھر میں گھسی ہوئی ایک موٹی سی پہلوان سی قسم کی عورت نے کہا چل بے چل۔ بڑا آیا ہے۔ کتابیں لینے والا۔ انھیں تو ہم نے بھگو کوٹ کران کی پڑیاں بنانی ہیں۔ حمید کے سینہ پر جیسے سانپ لوٹ گیا۔ اس کی وہ عزیز از جان کتابیں اور رسالے اسکے کالج کے وقت کی کتابیں۔ اور نصاویر۔ اقبال کی کتابوں کا سیٹ۔ وہ چغتائی کا دیوان غالب۔ "ملاس موڈ" کی "لالہ رخ" وہ قدیم و جدید نسخے۔ کیا ان سب کو بھگو کر کوٹ کر انکی پڑیاں بنائی جاتیں گی۔ وہ موٹی سی لالائین کے بچوں کے لئے چنے ڈالنے کے لئے۔ کیا انسان اتنا گر گیا۔ کیا انسانیت اتنی ذلیل ہوگئی۔ اپنے ان بلند انسانوں اور ان کے بلند افکار سے یہ سلوک۔ اُسنے کھڑکی میں سے دیکھا کہ سامنے اسکی چھوٹی بہن کے کاڑھنے کے ریشمی دھاگے فرش پر بکھرے پڑے تھے۔ اور چھوٹے چھوٹے بچے لاکھ کی مٹھیاں بھر بھر کران پر ڈال رہے تھے۔ وہ زیادہ دیر تک اس منظر کی تاب نہ لاسکا۔ اور وہاں سے بھاگ آیا اور گورداسپور میں ایسا پھنسا کہ بس اب اس قافلہ کے ساتھ نکل سکا۔

شہر سے ذرا باہر نکل کر جب لوگوں نے شہر کی طرف اک اچٹتی ہوئی آخری نگاہ ڈالی۔ تو شیرو بھاگ کر واپس جانے لگا۔ لوگوں نے پکڑ لیا۔ تو کہنے لگا۔ میں اپنے باپ کو ساتھ لے آؤں۔ وہ پیچھے رہ گیا ہے۔ سب لوگ حیران تھے کہ اس کے باپ کو تو مرے ایک عرصہ ہو گیا۔ یہ کسے لانے کو جا رہا ہے۔ شیرو کہنے لگا۔ وہ سامنے قبرستان میں میرا باپ میٹھی نیند سو رہا ہے۔

جب تک میں یہاں تھا۔ تو کبھی کبھی جا کر سلام کر آتا تھا۔ اور فاتحہ کے دو بول پڑھ آتا تھا۔ اب وہاں کون جائیگا۔ کیا اسے اب میں ہمیشہ کے لئے یہاں پیچھے چھوڑ جاؤں۔ اب کون اسے جا کر سلام کہے گا۔ نہیں نہیں میں نہیں جاؤنگا۔ میں یہیں رہوں گا۔ اپنے باپ کے پاس۔ جاؤ تم سب لوگ جاؤ۔ اپنی بیوی اور بچوں سے کہنے لگا تم جاؤ۔ میں یہیں ہونگا اپنے باپ کے شفیق سائے تلے۔ یہ شیرو بھی کچھ عجیب ہی طرح کا آدمی تھا۔ وہاں ایک محلہ میں اس کی دودھ دہی کی دکان تھی۔ مگر دکان تو دن کا اکثر حصہ بند ہی رہتی۔ صبح ہی ایک دو کونڈے دہی کے بیچ دودھ کو کڑاہی میں رکھ۔ دکان بند کر، تو ڈور اور بنسی لئے شیرو دریا کی طرف جاتا ہوا ملتا۔ ننگے سر اور ننگے پاؤں۔ گرمی ہو یا کڑا کے کی سردی۔ برسات ہو یا طوفان اپنی ماہی سے وہ ضرور ملنے جاتا۔ پیچھے دودھ بلیاں پی جائیں پرواہ نہیں۔ بچے بھوکے مر جائیں فکر نہیں۔ مگر شام کو جب دو چار سیر کی مچھلی کندھے پر ڈال گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتا تو اس کی بیوی اندر سے بچوں کو آواز دیتی۔ کہ مت کھولنا دروازہ۔ یہ شیرو نہیں ہے۔ کوئی اور ہوگا۔ شیرو کو تو آج لے گئی مچھلی گھسیٹ کے۔ وہ کہاں آئیگا اب۔ مگر شیرو باہر کھڑا ہی مچھلی کی تعریفیں شروع کر دیتا اور کہتا کہ کاش کہ میری بیوی کو بھی مچھلی کی پہچان ہوتی۔ یہ مچھلی اگر کسی راجہ مہاراجہ کے دربار میں پہنچ جائے تو ایمان سے میری جھولی اشرفیوں سے بھر دے۔ ذرا دیکھو اس کا چمکتا ہوا پنڈا۔ یہ اسکا سڈول جسم۔ یہ اس کے متناسب اعضا۔ یہ اس کے نتھنے۔ ایمان سے میٹھا رہے۔ میٹھا۔ مچھلی نہیں۔ اچھا اب کھول دروازہ۔ اور پھر گئی رات تک وہ اور اس کی بیوی مچھلی کو صاف کرتے اور بناتے رہتے۔ شیرو جاتے وقت کبھی کبھی دکان پر اپنے بھائی شریف کو بٹھا جاتا۔ کہ دیکھو ذرا ہشیار ہو کر بیٹھنا۔ اور اپنی تتلاتی ہوئی زبان میں اور بھی کئی قسم کی ہدایات اس کے لئے چھوڑ جاتا۔ شریف سب کچھ خندہ پیشانی سے سنتا رہتا۔ اور اس کے جاتے ہی پیڑے کچھ تو وہ خود کھا جاتا اور باقی کے پیڑے اور دودھ بیچ ٹکے جیب میں ڈال بازار کی سیر کو نکل جاتا۔ شیرو آتا تو دکان بند پاتا۔ بڑی مشکل سے شریف کو ڈھونڈھ کے لاتا۔ دکان کھلواتا تو اندر کچھ بھی نہ پاتا۔ نہ پیڑے نہ پیسے۔ وہ تتلاتا ہوا شریف سے کہتا۔ ابے تریف اُلّو کے پٹھے۔ نہ پیڑے نہ پیسے۔ کہ اتنے میں شیرو کا مچھلی پکڑنے کا دائمی ساتھی مستری محمد دین بھی کہیں پاس سے ہی نکل آتا۔ اور شیرو کی نقل اتارتے ہوئے کہتا۔ ہاں ہاں ابے شریف کے بچے نہ پیڑے نہ پیسے۔ بتا نہ کیا ہوئے۔ کیا سب کھا گئے۔ یا وہ اپنی ماں (حمیداں) کو دے آئے۔ نہ پیڑے نہ پیسے۔ جلدی بول۔ ٹھکر ڈالوں۔ کہ بتاتے۔ (یعنی لستی میں ٹھکر ڈالوں کہ بتاتے)۔

غرضیکہ ہر دفعہ ایسا ہی ہوتا۔ نہ شیرو مچھلی پکڑنے جانے سے چوکتا۔ اور نہ شریف ہی پیڑے کھانے سے۔ حتےٰ کہ تنگ آکر ایک روز شیرو کی غیر حاضری میں وہ پیسے جیب میں ڈال لاہور کی گاڑی پر چڑھ گیا۔ اور پھر نہ آیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے وہیں کہیں کسی صاحب کے پاس بہرے کی نوکری کرلی ہے۔

شیرو۔ محمد دین مستری۔ اس کا بھائی غلام محمد۔ حمید تانگے والا۔ جمال پیادہ۔ بالو خزانچی۔ یہ سب لوگ مچھلی کے رسیا تھے۔ مچھلی کے لئے فنا ہو جانے والے۔ جان تک دے دینے والے مگر اپنے آرٹ میں خوب ماہر۔ جہاں کہیں مچھلی کے متعلق کوئی بات ہوتی۔ انھیں اس کی بو فوراً پہنچ جاتی۔ اور یہ جھٹ سے وہاں پہنچ جاتے۔

قافلہ شہر سے ذرا باہر نکل آیا تھا۔ آموں کے باغ جھانڈے شاہ کی خانقاہ۔ دربار رحیم کے اونچے مینار۔ پٹھاؤں کا وہ لمبا کھلا میدان۔ سبھی آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے جا رہے تھے۔ اور حمید کو شاید اپنے محلے کا وہ بڑا جوہڑ یاد آ رہا تھا جس میں کر ساتھیوں سمیت وہ اکثر سکول سے واپسی پر نہایا کرتا تھا۔ گرمیوں میں وہ خوب بھر جاتا۔ لبالب۔ اور وہ اوپر آم کے درخت پر کھڑے ہو کر چھلانگ لگانے میں وہ مزا آتا کہ بڑے بڑے نہانے کے تالابوں میں بھی کیا آئیگا۔ پھر وہ ان کے محلے کی لڑکی۔ چڑیل جسے کہ لاکھ کھاؤ، مٹھائی کا لالچ دو۔ کھیل سے الگ کرنے کی دھمکی دو۔ رنگ برنگے آم اس کے آگے لا کر ڈھیر کر دو۔ مگر وہ آکر اماں سے کہہ ہی دیتی کہ آج حمید جوہڑ میں نہایا تھا۔ اور جوہڑ میں نہانے کے بعد لاکھ مسجد کے غسلخانے میں نہاؤ۔ نہر میں ڈبکی لگاؤ۔ لیکن اماں جھٹ سر سونگھ کر بتا دیتیں۔ اور پھر نہانا پڑتا۔ گھر کے چھوٹے سے غسلخانے میں۔ صابن سے۔ اور صابن آنکھوں میں سرایت کر جاتا تو مرچیں سی آنکھوں میں معلوم ہوتیں۔ وہ کچے آم۔ اب تو ان کی ایک قاش بھی نہ کھائی جائے۔ ان دنوں کس طرح جھولیاں بھر بھر کر کھا جاتے تھے۔ کچھ بھی تو نہ ہوتا تھا۔ نزلہ نہ زکام۔ آندھیاں آتیں تو اپنے ساتھ آموں کی جھولیاں لاتیں جنہیں وہ چھپکے کمرے میں لحافوں میں چھپا دیتے۔ چند ہی دنوں میں وہ آم گدرے سے ہو جاتے۔ کتنے لذیذ اور شیریں۔ گھر میں آئے ہوئے آموں سے کہیں بہتر۔ جامن کے درخت پر چڑھنا تو اسے اب تک یاد تھا۔ خوش رنگ اور رسیلی جامنیں۔ جامنوں کے درمیان وہ اس طرح کودتے پھلانگتے۔ جیسے کنہیا کے گرد گوپیاں۔ لوگ بہتیرا کہتے کہ جامن کی ٹہنی کچی ہوتی ہے۔ کسی روز منہ ناک چپٹی ہو جائیگی۔ مگر کبھی کچھ نہ ہوتا۔ جبکہ لوگ خس کی ٹٹیوں اور پنکھوں کی ہولے رہے ہوتے۔ وہ جامنوں کی گود میں ہوتے۔ کتنے پیارے پیارے اور چکیلا اور ان کے سکول کا وہ ڈرل ماسٹر۔ جسکے دیکھنے سے ہی پیشاب خطا ہو جاتا۔ جسکا کہ دل اتنا ہی سیاہ اور سخت تھا جتنا کہ اس کا چہرہ۔ ڈرل کے وقت سکول کا بینڈ بھی بجتا۔ لیکن باجے کی آواز ڈرل ماسٹر کی کرخت آواز ہی میں دب کر رہ جاتی۔ لڑکوں کے زرد زرد چہرے۔ ملتجی آنکھیں۔ ان کے پتلے ٹیڑھے ہاتھ پاؤں۔ دھوپ اور پسینہ۔ سبھی ہی تو یاد آ رہے تھے۔ ان کے محلہ میں شیشم کے وہ تناور درخت۔ کتنی ٹھنڈی چھاؤں ہوتی تھی اس کی۔ گرمیوں میں دوپہر کو کتنی رونق ہوتی تھی وہاں۔ ایک میلہ سا لگ جاتا۔ لوگ تاش کھیلتے۔ بارہ ٹہنی اور شطرنج کا بھی خوب زور رہتا۔ وہ اور اس کے ساتھی جو گھر سے کتابیں اٹھا پڑھنے کے بہانے وہاں آ جاتے تو تمام دوپہر درختوں پر چڑھنے اور اترنے کا کھیل کھیلتے۔ اور وہ خوانچے والا بڈھا۔ وہ اسے وہ اب تک یاد تھا۔ ایک آنکھ سے تو اسے بالکل نظر ہی نہ آتا۔ ایک لڑکا اس سے باتیں کرتا رہتا۔ اور ایک دوسری طرف سے ایک آدھ خوانچہ صاف کر دیتا۔ پھر خوانچوں کے پیچھے ہونے پر سان گزرتی۔ اور خوانچوں کی دعوت

چل جاتی۔ وہ سامنے مسجد کے ملا جھٹ چاقو نکال کر دیتے۔ جو کہ انھوں نے محلہ کی مرغیوں کو ذبح کرنے کے لئے رکھا ہوا تھا اور خربوزے کو بہت میٹھا بتلاتے۔ کیا دن تھے وہ بھی۔ لیکن ایک دن وہ سب شیشم کے درخت کاٹ دئے گئے۔ ان کے کٹنے سے محلہ کس قدر سنسان ہو گیا تھا۔ سبھی تو اداس سے دکھائی دیتے تھے۔ گویا ان کا کوئی عزیز ان سے بچھڑ گیا ہو۔ لیکن میونسپل کمیٹی کے صدر۔ خانصاحب عبدالقمر انھیں اس سے کیا۔ وہ تو بھوپال گئے۔ تو وہاں سے بھی ایک لڑکی اڑا لائے۔ اور اب اس نئی نویلی کے لئے انھیں ایک رقم درکار تھی۔ سو شیشم کے درخت کاٹ دئے گئے اور ان کی جیب گرم ہو گئی۔

حمید کے ذہن میں کچھ ایسے ہی خیالات آ رہے تھے۔ کہ قافلہ دھاریوال کے پاس پہنچ گیا۔ دھاریوال جو کہ ضلع گورداسپور کا دلنشیں تھا چھوٹی چھوٹی نہریں دھاریوال کی گلیوں اور محلوں کے بیچوں بیچ ہوتی ہوئی گزرتیں۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے لڑکیاں نہروں میں ایسے تیرتے پھرتے جیسے کہ کسی بڑی جھیل میں مرغابیاں تیر رہی ہوں۔ وہ بڑی نہر دھاریوال کے عین وسط میں سے ہو کر گزرتی۔ پل پر کئی ایک مترنم آبشاریں بناتی ہوئی۔ دھاریوال جسکے کہ کمبل اور گرم کپڑا دور دور تک مشہور تھے۔ اور اب تو ملوں نے بھی اپنے ہاتھ پاؤں کافی پھیلا لئے تھے۔ اور دھاریوال ایک چھوٹا سا صنعتی شہر بن گیا تھا۔ انتخابات کے زمانے میں مزدوروں کی ووٹیں حاصل کرنے کے لئے وہاں خوب گہما گہمی ہوتی۔ سب لوگ ابھی تک سوچ رہے تھے۔ کہ جیسے اب محفوظ ہی رہیں گے۔ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ اور وہ بآرام اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائیں گے۔ اور قافلہ اب دھاریوال شہر کے بیچ میں سے گزر رہا تھا۔ مکانوں اور دکانوں کی چھتوں پر لوگ اس طرح دیکھنے آتے جس طرح کہ ان کے شہر میں سرکس کی کمپنی آ گئی ہو۔ آپس میں سرگوشیاں کرتے۔ مگر پھر ساتھ فوجی سپاہی دیکھ کر خاموش ہو جاتے۔ کہ قافلہ کے پچھلے حصے سے اک شور اٹھا۔ چیخیں، کراہیں۔ فضا میں بلند ہو گئیں۔ ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ ایسے ہی جیسے رات کو دشمن پر شب خون مارا جائے۔ لوگ ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ اور چند ایک گھوڑ سوار سکھ قافلے کے پچھلے حصے کے لوگوں کو ایسے آگے لگائے ہوئے تھے جیسے کہ کوئی گڈریا اپنی بھیڑوں کو۔ وہ جس پر چاہے وار کرتے جس کو چاہتے چھوڑ جاتے۔ جیسے کہہ رہے ہوں کہ سالے پاکستان چلے ہیں۔ ذرا ہمارے ہاتھ تو دیکھتے جاؤ۔ کبھی نہیں بھولو گے۔ بشیرو جو کہ اپنی بیوی سمیت پیچھے رہ گیا تھا۔ وہ بھی اس حملہ کی زد میں تھا۔ وہ اپنے دونوں لڑکوں کو اپنی کمبل کی پیٹ میں لئے ہوئے تھا۔ کہ اس کی بیوی اس سے بچھڑ گئی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ مگر وہ کہیں نہ ملی۔ اچانک اس کی نگاہ سامنے نہر کے پار سڑک پر پڑی۔ ایک سکھ سوار زبردستی اس کی بیوی کو گھوڑے پر لادے لئے جا رہا تھا۔ بشیرو چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ کہ وہ دیکھو سامنے وہ حرامزادہ سکھ میری بیوی کو اٹھائے لئے جا رہا ہے۔ کوئی پکڑو۔ کوئی چھڑاؤ۔ یہ وہی سکھ ہے

جوکہ میرے پاس دودھ لیکر آیا کرتا تھا۔ اور اس کے دودھ میں پانی ہونے کی وجہ سے میں نے اس کا دودھ لینا بند کردیا تھا۔ دیکھو یہ وہی حرامزادہ ہے۔ دیکھو سب میرے منہ کی طرف کھڑے دیکھ رہے ہیں۔ کوئی کچھ کرو۔ وہ ہمارے فوجی سپاہی کہاں گئے۔ کہاں مر گئے وہ سب۔ کیا اسلئے وہ ہمارے محافظ بن کر آئے تھے۔ مگر وہ کہیں آگے قافلے کے اگلے سرے پہ ایک دکان پر چائے پینے میں مصروف تھے۔ اور شیرو کی بیوی کی چیخیں دور تک سنائی دے رہی تھیں۔ شیرو۔ شیر.... و...... شیر...... دیگر وہاں بچانے والا کون تھا۔ کون تھا اس کی فریاد سننے والا مسلمان تو وہاں سے پہلے ہی جا چکے تھے۔ وہ صرف ڈھائی سو مسلمان جنہیں کہ وہاں کے تھانیدار نے تھانہ کی حدود میں قید کر رکھا تھا۔ وہ بھی اگلے ہی روز وہاں سے جا چکے تھے۔ شیرو اس سمت دیکھ رہا تھا۔ جدھر کہ وہ اس کی بیوی کو اٹھا لے گئے تھے۔ اور کبھی وہ مل کی لمبی چمنی میں سے نکلتے ہوئے بھورے رنگ کے دھوئیں کو دیکھتا جو کہ اس کے کندھوں پر پڑے ہوئے کمبل سے کتنا ملتا جلتا تھا۔ وہ بھاگ کر اپنی بیوی کے پیچھے جانے لگا۔ مگر لوگوں نے روک لیا کہ پاگل ہو گئے ہو کیا۔ اور شیرو اس نہر کے پانی کی طرح اب اپنے جذبات کی لہروں کے سپرد تھا۔ اپنے دونوں ہاتھ دونوں بچوں پر رکھے ہوئے جیسے کہ ان پر سایہ کئے ہو۔ جیسے کہ اسے ان کے بھی چھن جانے کا اندیشہ ہو۔ ایک لہر اسے آگے کی طرف دھکیل کر لے جاتی لیکن تھوڑی دیر اس لہر کے قابو میں رہنے کے بعد دوسری لہر اسے پھر پیچھے دھکیل دیتی۔ اور وہ اس بھنور میں پھنسا ہوا یونہی غیر ارادی طور پر قافلہ کے ساتھ ساتھ چلا جا رہا تھا۔ تمام لوگ اس پہ انگشت بدنداں تھے۔ اور شیرو کو تسلی دے رہے تھے کہ فکر نہ کرو۔ ذرا ہمیں پاکستان پہنچ لینے دو۔ پھر دیکھنا کہ تمہاری بیوی کو واپس لانے کی کیا کیا تدابیر اختیار کی جائیں گی۔ اور وہ پہلوان تسلی دینے میں سب سے آگے تھا۔

پہلوان جوکہ معمار بھی تھا۔ اور پہلوان بھی۔ سردیوں میں جب مکان بنانے کا کام ذرا مندا پڑ جاتا تو وہ پتنگ بنانے شروع کر دیتا۔ ڈور بنتا۔ اور اس ڈور کی کاٹ دکھانے کے لئے خود پیچ لڑا کر دکھاتا۔ طرح طرح کے طریقوں اور مختلف زاویوں سے اس تجارت کو فروغ دیتا۔ اور گرمیوں میں پھر وہی مکان بنانے لگتا۔ ایک دفعہ بھانڈو کے مکان کی منڈیر بنا رہا تھا۔ کہ بناتے بناتے منڈیر ٹیڑھی ہو گئی۔ کہنے لگا ایک چارپائی لاؤ۔ اور دیوار کو اسکا آسرا دیکر گھر چلا آیا۔ ایسے ہی جیسے کہ سیمنٹ کنکریٹ کی عمارت بناتے وقت سانچے میں ڈھالتے ہیں۔ رات بھانڈوں کے ہاں مہمان آ گئے۔ تو انھوں نے چارپائی اٹھالی بس چارپائی کا اٹھنا تھا کہ دیوار دھڑام سے صحن میں آ رہی۔ اور اس کی زد میں ان کے مہمان بھی۔ کہرام مچ گیا۔ بھانڈ پہلوان کے گھر کی طرف دوڑے اور لگے ہاتھ اور دف بجا بجا کر اس کی جان کو دعائیں دینے۔ پہلوان کو بھی پتہ چل گیا۔ کہ یہ اس وقت میری گھوڑیاں کیوں گائی جا رہی ہیں۔ اس نے اندر سے ہی کہلوا دیا۔ کہ پہلوان تو دنیا نگر چلا گیا۔ خبر نہیں کب آئے۔ ایک روز آخر بھانڈوں نے بازار میں پکڑ لیا۔ اور ان ظالموں نے اس کی ایک مکمل نقل تیار کر لی تھی۔ پہلوان کہنے لگا اس میں میرا کیا قصور ہے۔ انھوں نے دیوار میں جھرنے ہی زیادہ رکھوائے تھے دیوار گرتی نہ تو کیا بھی رہتی۔ اور تمام شہر میں پہلوان کے انجینئر ہونے کا چرچا بھی ہو گیا۔ پہلوان کے بعد نبی داد نے شاید یہ ضروری سمجھا۔ کہ اگر اس نے اس سانحہ پر شیرو سے اظہار افسوس نہ کیا۔ تو وہ اپنا فرض نہیں ادا کریگا حالانکہ اس کو سب سے پہلے ایسا کرنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ شیرو کے ساتھ ہی اسی محلہ میں اس کی بھی پان کی دکان تھی۔ اور کئی دفعہ جب شیرو مچھلی پکڑنے گیا ہوتا تو نبی داد ہی اسکا دودھ وغیرہ بیچتا۔ نبی داد پان فروش جوکہ ہر بار ہی میرٹھ کو چلتے تو ایسے وداع ہو کر کہ بس ہمیشہ کے لئے جا رہے ہیں۔ اب نہیں لوٹیں گے۔ لوگوں سے بغلگیر ہو کر جاتے۔ اور یار لوگ بھی اس مفارقت کے وقت دو چار آنسو بہا دیتے۔ مگر دو ہی ماہ کے بعد نبی داد پھر گورداسپور میں پائے جاتے۔ وہی ان کی پان کی دکان ہوتی۔ لوگ بھی کہتے۔ خانصاحب ایمان سے پان کھانا چھوڑ دیا جب سے کہ آپ گئے۔ بس مزہ ہی نہیں۔ یہ کل کے چھوکرے کیا جانیں پان لگانا۔ مگر پھر کچھ مہینے گزرنے کے بعد جب خانصاحب کے پاس پھر روپے ہو جاتے تو پھر میرٹھ جانے کا دورہ ان پہ پڑ جاتا۔ ایک دفعہ میں ان سے پوچھ بیٹھا۔ کہ خانصاحب آخر کیوں جاتے ہیں آپ گورداسپور سے دیکھئے نہ یہ لوگ۔ یہ چھوٹے چھوٹے بچے تھے جب کہ آکر آپ نے پان کی دکان کھولی۔ اب آپ کے پان کھا کھا کر ہی یہ چھ ہاتھ کے جوان ہو گئے ہیں۔ یہ لوگ بھی آپ سے ہل گئے ہیں۔ کہنے لگے ارے میاں جاؤ ہوش کی دوا کرو۔ یہاں پہلے ہی بھرے بیٹھے ہیں۔ جاؤ نہ۔ یہاں رہیں تو کھائیں کس کے باپ کے گھر سے۔ سب کھا گئے سالے۔ وہ مجید ٹھیکیدار نے ساڑھے چار روپے دینے ہیں۔ وہ ناظر حسین ساڑھے بارہ روپیے کا ادھار کھائے بیٹھا ہے۔ اسی مستری محمد دین ہی کو لو۔ گیارہ روپے ہیں اس کی طرف۔ اور دینے کا نام نہیں۔ جب کھاتے تھے تو سالے ایسے جیسے باوا کی دکان ہو۔ بتاؤ اب یہاں رہیں گے تو کیسے۔ نہیں اب نہیں رہیں گے۔ چلیں گے بس میرٹھ ہی۔ لیکن خدا کی کرنی گئے تو میرٹھ میں فسادات ہو رہے تھے۔ جاتے ہی لوٹ آئے۔ اور اب اس قافلہ میں شامل شیرو کو تسلی دے رہے تھے۔ کہ وہ تو خدا کی قسم شیرو میں تمہارے پاس نہ ہوا۔ ورنہ اس سالے مجیل سنگھ کی کیا مجال تھی۔ خیر اب لاہور پہنچ لیں ایک بار۔ پھر بات کریں گے اس سے۔ لاہور تمہیں یاد ہے نہ۔ جہاں کہ چلنے کا تم بھی اکثر ذکر کیا کرتے ہو۔ انہوں نے شیرو کی دلی خواہش بیان کی تھی۔ کیونکہ شیرو اکثر کہا کرتا کہ یار کہیں موقعہ ملے تو لاہور انارکلی میں دودھ دہی کی دکان کریں۔ ملتان سے انارکلی میں میں نے دیکھی۔ کہ وہ دکان جو بازاری

دروازہ کے قریب ہے۔ گاہکوں کا ایک تانتا بندھا ہوا تھا۔ باری نہ آتی تھی۔ ایک کے اوپر دوسرا گرا جا رہا تھا۔ وہ رونق۔ وہ ہجوم۔ اور وہی ادھ سالوں نے موتیے کا دودھ لگا رکھا تھا۔ اس پر بھی لوگ اسے شیر مادر سمجھ کر پی رہے تھے۔ بس وہاں دکان مل جائے تو مزا ہی آ جائے زندگی کا۔ مگر شیرو کسی گہری سوچ میں گم۔ شاید یہ سوچ رہا تھا کہ ان بچوں کا کیا بنیگا۔ میں کوئی کام کرونگا یا ان کو سنبھالوں گا۔ یہ ماں کو کس طرح بھول سکیں گے۔ کیا اب وہ کبھی نہ آئے گی۔ اب میں، کسے پھلی لا کر دیا کرونگا۔ اب کون مجھ سے جھگڑے گا۔ اگر ہم پیدل چلنے کی بجائے فوجی لاری میں ہوتے تو پھر وہ نہ اٹھائی جاتی۔ یا ہم پہلے ہی کیوں گورداسپور سے نہ چل پڑے۔ آج کیوں چلے یا اگر چلتے ہی نہ۔ ٹرک کافی چل چکے تھے۔ کیونکہ قافلہ میں ایسے بھی لوگ تھے۔ جنکا کہ پیدل چلنا بس بھول تھا۔ اور ایسے بھی جنہوں نے کبھی گھر سے باہر قدم نہ رکھا تھا۔ خاص کر عورتیں۔ اور جو چلنے والے تھے وہ بھی بھوک اور خوف سے نڈھال تھے۔ یہی فیصلہ ہوا کہ رات کو یہیں قیام کیا جائے۔ بعض کا خیال تھا کہ آج اگر بٹالہ پہنچ جائیں تو ٹھیک ہے۔ مگر بٹالہ تو ابھی اور پانچ میل باقی تھا۔ اسلئے وہیں زمین کا ایک سوکھا سا ٹکڑا دیکھ سب دراز ہو گئے۔ شام کی تاریکی پھیلتی جا رہی تھی۔ اور زرد رو غروب ہوتے ہوئے سورج کی نارنجی کرنیں چاول کے کھیتوں کو اپنے رنگ میں رنگے دے رہی تھیں۔ بارش کے بعد جو حبس ہوا کرتا ہے وہی کیفیت طاری تھی۔ کچھ پسینہ کی بو۔ کچھ برسات سے رچے ہوئے گیلے کپڑے۔ سہراتے لوگ۔ ماحول میں کچھ عجیب سڑاند سی تھی۔ فضل کمہار اپنے محلہ کے باقی کمہاروں کو ڈھونڈھتا پھر رہا تھا۔ شاید وہ محفل گرم کرنا چاہتے تھے۔ فضل جو کہ دراصل پنچ تھا۔ مگر اب اپنا آبائی پیشہ چھوڑ کر کمیٹی میں لیمپ جلانے کی نوکری پر مامور ہونے سے فضل ہو گیا تھا۔ جب موقع ملتا تو تیل بھی بیچ کھاتا اور کمیٹی کی لالٹینیں بغیر جلی ہی پڑی رہتیں۔ میلاد شریف میں اور نعتوں کو پنجابی لے میں بڑے کمال سے ادا کرتا اور شیرینی بانٹنے میں سب سے آگے ہوتا۔ ان کی برادری میں جب کوئی بیاہ ہوتا تو وہ خوب کلف لگے کپڑے زیب تن کئے۔ تولیہ کندھے پہ ڈال سینہ نکالے۔ مونچھوں کو تاؤ دیتا اپنی برادری کا میں پہنچ جاتا۔ وہ لوگ بھی اس کی کافی عزت کرتے اور اسے اگلی صفوں میں جگہ دیتے۔ سائیں کمہار اپنی سارنگی سی قسم کی چیز پر حاتم طائی اور اس کے سات سفروں کے متعلق منظوم قصہ چھیڑ دیتا۔ سیتا کمہار ایک کورا گھڑا اٹھا لاتا۔ گھڑے پہ تھاپ پڑتی۔ پیچ ذرا داد دیتا۔ سائیں کی آواز رات کی خاموشی میں دور دور تک پہنچ جاتی۔ حاضرین محفل کچھ ایسے ہی محسوس کرتے۔ جیسے کہ شاہ بہرام انکو کسی پری کو اپنے ساتھ لئے اڑا جا رہا ہے۔

حمید ایک کونے میں بیٹھا ادھ مکمل چاند کی پھیکی پھیکی کرنوں کی طرف دیکھنے میں محو تھا۔ شاید سوچ رہا تھا۔ کہ اس چاند نے ان لوگوں کو ہنستے کھیلتے اور کھلکھلاتے ہوئے دیکھا ہے۔ اسی چاند نے ان کی خوشیوں پر اپنی سنہری کرنیں پھیلائی ہیں۔ اور یہی چاند کی کرنیں انہیں بے بس اور مجبور دیکھ رہی ہیں۔ انہی کرنوں نے شیرو کے بچوں کی معصوم مسکراہٹ کا ساتھ دیا ہے۔ اور آج یہی کرنیں ان کے چہرے پر ایک حسرت اور زردی سی چھائی ہوئی دیکھ رہی ہیں۔ اچانک ہی اسے خیال آگیا کہ اگر اس کے والدین عزیز و اقربا بھی ایسے ہی کسی جگہ میں پڑے ہوئے تو۔ خبر نہیں ان پہ راستے میں کیا بیتی ہوگی۔ وہ اس کی چھوٹی بہن۔ وہ اس کی عمر رسیدہ ماں وہ اس کی خالہ کی دو لڑکیاں جو کہ سکول کی چھٹیوں میں ان کے ہاں گورداسپور آئی ہوئی تھیں۔ اگر وہ بھی کسی پیدل قافلے میں ہوئے۔ تو وہ چل سکیں گے پیدل۔ مگر چھانگا تسلی کرتا تھا۔ کہ اس نے خود انہیں ایک فوجی ٹرک میں بیٹھے دیکھا ہے۔ یہ چھانگا بھی اسوقت ادھر سے گزر رہا تھا۔ اس نے تسلی کرنے کے لئے ایک دفعہ پھر اس سے وہ تمام باتیں پوچھیں جو کہ وہ پہلے بھی کئی بار پوچھ چکا تھا۔ کسی نے چھانگا کو دیکھ کر آواز دی۔ کہ آج تو بہت حبس ہے۔ لگاؤ نہ آج بھی باجہ۔ اور یہ باجہ بھی خوب چیز تھی۔ چھانگا۔ رحما۔ اور بابو یہ تینوں بھائی تھے اور کئی دفعہ منگنی اور شادی کرنے کے باوجود ابھی تک اکیلے ہی رہتے تھے۔ ان کے پاس تنخواہ میں سے ہر ماہ جو کچھ بچتا اس کے وہ ریکارڈ خرید لاتے۔ رنگ برنگے مختلف گویوں کے۔ جدید و قدیم طرزوں کے۔ سہگل کے "بسو مورے من میں" سے لے کر ستار قوال کے "آنکھ کھلتے ہی تصور یار کا روپوش تھا" تک۔ گرمیوں کی راتوں میں جب حبس سا ہو جاتا۔ اور ہوا نہ چلنے کی قسم کھا لیتی۔ تو یہ لوگ گراموفون شروع کر دیتے اور تب تک ختم نہ کرتے جب تک کہ اپنے تمام ایک سو ایک ریکارڈ بجا نہ لیتے۔ صبح پانچ بجے کے قریب بالمقابل کے شاہ صاحب انہیں مرصع اور مسجع الفاظ میں بند کر لینے کے لئے کہتے۔ تو وہ سن کر سرگوشیانہ انداز میں ایک دوسرے سے کچھ کہتے۔ ان کے نزدیک دن کو تو وہ پانی بھرتے تھے یا نالیاں صاف کرواتے تھے۔ اور کمیٹی کے ملازم تھے۔ مگر رات تو ان کی اپنی تھی۔ شاہ صاحب کے اس حکم کو کچھ رضامندی اور کچھ غیر رضامندی سے قبول کر ہی لیتے۔ اور اپنے آپ کو باد نسیم کی اٹکھیلیوں میں نیند کی دیوی کی گود میں دے دیتے۔ صبح آٹھ بج جاتے۔ نو اور دس بج جاتے۔ مگر ان لوگوں کا کچھ پتہ نہ چلتا۔ محلہ بھر میں کہرام مچ جاتا۔ زمینے کہا دن لینے کو شجر سے آواز دیتی کہ اسے ہے۔ تمہیں کسی کی آئی آئے۔ کیا ہوا۔ سانپ سونگھ گیا کیا۔ ماتھے مٹکوں میں ایک بوند پانی نہیں۔ منہ اگرچہ ایک موٹی سی لاٹھی لئے ان کے دروازہ

پر پہرہ دیتا کہ ان میں سے کوئی باہر نکلے۔ اور وہ اس کا سر بیچ میں سے دو کر دے۔ داروغہ صفائی کہتا۔ کہ یہ حرامزادے کہاں گئے آج۔ نالیاں ابھی تک نہیں دھلوائیں۔ اور بہ دقت تمام تقریباً گیارہ بجے وہ گرتے پڑتے طوعاً و کرہاً۔ آنکھیں جھپکتے۔ اور مشکیں کندھے پر ڈالے بادل ناخواستہ کام پر روانہ ہو جاتے۔

اب یہی لوگ تھے۔ کہ نہ خود ان ہی میں زندگی کی وہ رمق باقی تھی۔ نہ وہ باجہ اور ریکارڈ ان کے پاس تھے۔ وہ شاہ صاحب ایک مدت ہوئی ایک فوجی ٹرک میں بیٹھ کر جا چکے تھے۔ وہ داروغہ صفائی ہاں آخر دم تک ان کی مدد کرتا رہا۔ اور آتے وقت نہ صرف انھیں اس نے ان کی پچھلی تنخواہ ہی دلائی بلکہ اپنے پاس سے کچھ پیسے بھی دئے۔ ہاں رحمتے کمہارن ابھی ان کے ساتھ اس قافلہ میں موجود تھی۔ اور اب بھی انھیں کوسنے کو تیار۔

اور یوں ہی تاروں کی چھاؤں تلے۔ شبنم کے آنسوؤں کے درمیان رات گزرتی جا رہی تھی۔ ہر کوئی اب تقدیر پر قادر ہو گیا تھا۔ وہ فوجی سپاہی ان کی جو حفاظت کر سکتے تھے سب کوئی دیکھ چکا تھا۔ اس لئے اب ہر کوئی سوچ رہا تھا کہ جو کچھ بھی گزرے گی بھگتیں گے۔

صبح ہوئی۔ سڑک کے کنارے کنارے جتنے بھی گاؤں تھے ان میں آگ کے شعلے بلند تھے۔ اور دھواں دور سے ایسا اٹھتا ہوا دکھائی دیتا جیسے کہ پیٹرول کے کسی بڑے ذخیرہ کو آگ لگ گئی ہو۔ گاؤں خالی پڑے تھے۔ منہ کھولے ہوئے ان کی مسجدوں کے اونچے اونچے سفید مینار شاید نمازیوں کے نہ ہونے پر مرثیہ خواں تھے۔ جیسے کہ کہہ رہے ہوں۔ کہ ہمیں چاہنے والے تو چلے گئے اور وہ محفل بھی اٹھ گئی۔ اب دیکھیں ہم پر کیا گزرتی ہے۔ اور حمید کے ذہن پر کچھ ہلکے ہلکے نقوش ابھر رہے تھے۔ وہ جگہ جہاں کہ اس نے بچپن گزارا تھا۔ جہاں کی خاک کہ اس کے خمیر میں شامل تھی۔ پھر کچھ اشیا کی یادیں۔ کچھ گزرے ہوئے واقعات اسے پریشان کر رہے تھے۔ وہ گھوڑا سیوں کا زراعتی فارم۔ وہاں کے وہ لمبے لمبے کالے شہتوت۔ رس سے بھرپور کسی دوشیزہ کی طرح تر و تازہ۔ وہاں کی وہ مرغیاں۔ ولائتی اور دیسی پر کھولے ہوئے مرغیاں جیسے کہ البڑ لڑکیاں۔ مرغے اونچے اور موٹے تازے گردنیں تانے جیسے کہ چار بیویوں والا چودھری۔

اور یونہی سوچتے گرتے پڑتے۔ الجھتے الجھاتے قافلہ بٹالہ پہنچ گیا۔ بٹالہ جو کہ ضلع بھر کی ملکہ تھا۔ شفیلڈ کی طرح کا صنعتی شہر۔ مگر اب وہاں کا کچھ اور ہی روپ تھا۔ بازار کے دونوں طرف لوہے کے کارخانوں اور دکانوں سے باہر ایک ہجوم تھا کہ کسی طرح بھی قیامت سے کم نہ تھا۔ کیچڑ میں لت پت پانی میں ادھر ادھر

مکھیوں کی ایک چادر اپنے گرد اوڑھے۔ لوگ تھے کہ لاریوں یا قافلہ کے انتظار میں تھے۔ بیاہ شادی کے موقع پر دئے ہوئے بڑے بڑے ٹرنک۔ رضائیاں بڑے بڑے برتن۔ سائیکلیں عین سڑک کے بیچ میں پڑے تھے۔ منہ کھولے ہوئے اپنی اور اپنے مالکوں کی بے بسی کی تصویر۔ ان لوگوں نے اپنا سب کچھ پھینک رکھا تھا۔ تیاگ دیا تھا۔ جسم پر سے کپڑے بھی اتار پھینکے تھے۔ کہ شاید اس طرح ہی کوئی لاری والا انھیں لاری میں جگہ دے دے۔ بچے۔ عورتیں جوان اور بوڑھی۔ مرد جوان اور ادھیڑ مگر چہروں پہ کچھ عجیب سی مایوسی اور خوف لئے ہوئے۔ اس موسلا دھار بارش میں کئی روز سے اپنی چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں بنائے پھرتے تھے۔ مگر اب شہر کے فوجی منتظم انھیں وہاں بھی نہ رہنے دیتے تھے۔ کہتے تھے کہ اب جاؤ یہاں سے۔ جاؤ نا اپنے پاکستان۔ اپنے جناح کے پاس۔ اس سے جا کے پناہ مانگو۔ اور شہر میں لوٹ مچی ہوئی تھی۔ ارد گرد کے دیہات کے سکھ گروہ در گروہ اور جتھے بنا کر شہر میں آ اور جا رہے تھے۔ جھولیاں بھرے۔ چھکڑے بھرے۔ اور سر پہ بھاری بھاری گٹھڑیاں اٹھائے۔ وہ لوگ جو اپنے گھر خالی کئے یہاں آ پڑے تھے۔ انھیں شہر میں جانے کی اجازت نہ تھی۔ فوج والے کہتے تھے کہ تم شہر میں جا کر فساد کرو گے۔ اور پھر جیسے اس تمام صبر و قرار کا بند ٹوٹ گیا۔ بٹالہ مسلم لیگ کے صدر بہاؤالدین گیلانی کو فوج کے کہنے پہ ایک سکھ نے تھانہ کی حدود میں جہاں وہ تحصیلدار اور مجسٹریٹ سے مصروف گفتگو تھے گولی کا نشانہ بنا دیا۔ ایک نہیں لگاتار تین گولیاں ان کے جسم کے آر پار گزر گئیں۔ اور وہ چکرا کر وہیں گر گئے۔

حمید اُدھر بھاگ کر تھانہ کے اندر گھس گیا۔ آہ ایک لمحہ بچ گیا اک کہرام بپا ہو گیا۔ لوگ تھے کہ مختلف سمتوں میں بھاگ رہے تھے۔ اور سپاہیوں کی گولیاں انھیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر آخری پناہگاہ کی طرف [illegible] رہی تھیں۔ وہ بہاؤالدین جس نے کہ آخری دم تک جوانمردی اور ہمت کو ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ ان کے عزیز و اقربا۔ ان کے سیاسی ساتھی۔ سبھی ایک ایک کر کے چلے گئے۔ مگر وہ آخر دم تک ان مخالف قوتوں کے سامنے ڈٹے رہے۔ یہی کہتے ہوئے کہ "جب تک بٹالہ میں ایک بھی مسلمان باقی ہے۔ میں بٹالہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں سب سے آخر میں جاؤں گا"

اُن میں ان لوگوں نے مجھے اپنا لیڈر چنا۔ اپنی عزت و ایمان کا ساجھی بنایا۔ میری ہر آرزو پوری کی تو اب مصیبت کے وقت میں انھیں چھوڑ جاؤں۔ ان سب بھگوڑوں کی طرح جو کہ انھیں بے یار و مددگار چھوڑ کر چل دیئے۔ میں نہیں جاؤں گا۔ انھیں بچانے کے لئے اگر مجھے اپنی جان بھی دینی پڑی تو میں دیدوں گا۔ اور واقعی جس روز وہ شہید ہوئے اس روز بٹالہ سے آخری قافلہ روانہ ہونے والا تھا۔ انہوں نے دن رات ایک کر کے ہندو اور سکھ افسروں کی منت سماجت سے حوصلہ اور شعور سے کام لیا۔ لاریاں نہ آئیں تو ڈیرہ بابا نانک کے راستے قافلوں کو پیدل ہی چلا دیا۔ وہاں سے قافلوں پر حملوں کی اطلاع آئی تو ایک قافلے کے ہمراہ نارووال تک پیدل گئے۔ اور تمام انتظامات مکمل کر کے پھر بٹالہ لوٹ آئے اور اب وہ اپنا مشن پورا کر چکے تھے جو کچھ کہا اسے پورا کر دکھایا۔ مگر لوگ تھے کہ اب انھیں کچھ سوجھتا ہی نہ تھا۔ اس تمام قافلہ کا سالار ہی اب ان میں نہ تھا۔ اس کشتی کا ملّاح ہی اب غائب تھا جس میں کہ وہ سب سوار تھے۔ اس تمام برات کا دولہا ہی غائب تھا۔ تو اب وہ پاکستان کس منہ سے جائیں اپنی برات لٹوا کر۔ اپنا دولہا چھنوا کر، جس کسی کے جدھر سینگ سمائے وہ بھاگ رہا تھا مگر ان ۱۲۔ پنجاب والوں کی گولیاں بھی ہر کونہ تک ان کا پیچھا کر رہی تھیں۔ تمام بازار لاشوں سے اٹ گیا۔ ایک کے اوپر دوسرا۔ انبار در انبار۔ جیسے پلیگ زدہ چوہے، اور فوجی سپاہیوں کی مونچھوں پر تاؤ دی ہوئی مسکراہٹ کہ سالے پاکستان جاتے تھے۔ جاؤ نہ اب۔ رک کیوں گئے۔ سالوں نے اپنے خون سے یہاں کی زمین بھی پلید کر دی نجس کر دی۔

وہ تو خیر ہوئی کہ اچانک ہی گورداسپور سے ایک انگریز بریگیڈیر آ گیا اور اس نے یہ سب سماں اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ وہ چلّا چلّا کر کہہ رہا تھا۔ تم انسان نہیں کتے ہو۔ کتّوں سے بھی ذلیل۔ وہ بھی تو اپنے ساتھی کو اس طرح نہیں چیر پھاڑتے۔ ان کا قصور، ان کا جرم کچھ تو بتاؤ۔ کیا ان لوگوں نے تم پر حملہ کیا۔ کیا تمہیں یہ مغلوب کرنا چاہتے تھے۔ یہ تو جا رہے تھے اپنا گھر بار چھوڑ کر۔ اپنا وطن چھوڑ کر اور لاشوں سے بھرے ہوئے بازار کو دیکھ کر اپنی آنکھوں پہ ہاتھ دھر لیتا اور کہتا۔ میرے خدا تم نے مجھے کتّوں کے درمیان بھیج دیا ہے۔ میں نے افریقہ کے آدم خور حبشی بھی دیکھے ہیں وہ بھی تو اپنے مجنسوں سے ایسا سلوک نہیں کرتے۔ یہ لوگ انسان نہیں بھیڑیے ہیں۔ ذرا اپنی شکلوں کی طرف دیکھو۔ کیا تم انسان معلوم ہوتے ہو۔ تم ایک لعنت ہو۔ لعنت۔ اور اس نے تمام رات دوڑ دھوپ کر کے صبح تک قافلے کے چلنے کا انتظام کر دیا۔ قافلہ جب چلا تو شیرو اپنے [illegible] بہت موجود تھا مگر پہلوان کا کہیں پتہ نہ تھا اس کے بھائیوں نے اسے بہت تلاش کیا مگر وہ نہ ملا۔ وہ [illegible] ہی میں رہ گیا ہمیشہ کے لئے۔ جہاں کہ وہ

اکثر آیا کرتا تھا۔ کنکوؤں کے لئے بانس اور کاغذ لینے، ڈور کی ریلیں لینے۔ اور اب بھی اس نے بٹالہ چھوڑنا مناسب نہ سمجھا۔ غلام محمد پارٹی میں عبدالرحمٰن نہیں تھا۔ جو کہ بٹالہ چل کر سینما دیکھنے میں سب سے آگے ہوتا۔ اب شاید پہلا انسانی فلم دیکھنے کے لئے پیچھے ہی رہ گیا تھا۔ یہ انسانی جگمگاتا یہ اصل کے مناظر اور یہ اصلی فلم۔ اب وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دیکھتا رہے گا۔ قافلہ رواں تھا چاولوں کے لہلہاتے ہوئے کھیت گنّے کے کھیتوں کی دور تک پھیلی ہوئی ہریالی نمایاں ہٹ۔ شہر سے باہر وہ انیٹوں کا بھٹّا۔ وہ پُرانا تالاب جس میں کہ تقریباً بٹالہ کے ہر ایک رہنے والے نے کبھی نہ کبھی ڈبکی لگائی تھی۔ امرودوں کے باغ۔ وہ محصول کی چونگی، وہ منشی جی۔ موٹے موٹے شیشوں والی عینک پہنے۔ ہر ایک کو ٹھہرا لیا کرتے اور کہتے کہ بھئی تسلی کر لو کہ تمہارے پاس محصول کی کوئی شے تو نہیں۔ ورنہ اگر شہر میں پکڑے گئے تو پھر میں کچھ نہ کر سکوں گا۔ محصول دس گنا دینا پڑ جائے گا۔ ابھی بتا دو تو اتنا کر سکتا ہوں کہ آدھا محصول معاف کر دوں، اور قافلہ چلتا رہا۔ لوگوں کی آہیں، کراہیں، دبی دبی سسکیاں اور چیخیں۔ اس چال اور رفتار میں گم ہوتی رہیں۔ کسی کو کچھ معلوم نہ تھا کہ کون کون اس قافلہ میں شریک ہے اور ہمیں کہاں جانا ہے۔ حمید بھی آہستہ آہستہ چلتا ہوا کچھ سوچنے میں مصروف تھا، شاید یہ کہ بعض دفعہ والدین بچّے کا نام بس ایسے ہی رکھ دیتے ہیں، بلا سوچے سمجھے۔ اور یا پھر اچھے بھلے نام کے ساتھ ایک دم چھلا اضافہ کر دیتے ہیں۔ اسکا اپنا نام حمید اچھا خاصا نام تھا مگر یہ ساتھ غلام کیا بلا تھی۔ یہ کیوں اس کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ کیا ہم اتنے ہی بے حس ہو گئے ہیں کہ اپنی غلامی کا ڈھنڈورا اپنے نام کے ساتھ بھی پیٹتے ہیں۔ آخر یہ غلام کا نام اکثر لوگوں کے نام کے ساتھ کیوں چسپاں کر دیا جاتا ہے اس نے دوسرے ممالک کے باشندوں کے نام بھی تو سُنے تھے۔ ان میں تو یہ غلام کا لفظ کسی صورت میں بھی اسے نظر نہ آیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ اپنے نام سے غلام اتار کر یہ قافلہ کے ساتھ چلنے والے [illegible] کے منہ پہ دے مارے۔ غلام کا لفظ اس کے ذہن میں آتے ہی اس کے منہ کا ذائقہ کچھ کڑوا کسیلا ہو جاتا تھا۔ حمید کچھ ایسا ہی سوچ رہا تھا کہ دوسرے غلام محمد نے آواز دی کہ یار کیا سوچ رہے ہو۔ ذرا جلدی قدم بڑھاؤ اور حمید جیسے چونک سا گیا [illegible] لگا۔ یہ غلام محمد پارٹی بھی عجیب بے فکروں کی جماعت ہے۔ تمام قافلہ میں اگر کچھ ہنستے بولتے لوگ ہیں تو یہی۔ کتنے ہی طوفان اب تک آ چکے مگر ان کی [illegible] میں ابھی تک فرق نہیں آیا۔ اس پارٹی میں غلام محمد [illegible] [illegible] شامل تھے۔ یہ سب لوگ بچپن میں اکٹھے رہے، سکول میں اکٹھے رہے [illegible] دوسری جماعت میں جاتے تو یہ [illegible] [illegible] سے ان میں سے کوئی باقی ساتھیوں کے فیل ہونے سے پاس [illegible]

وہ ان کا انتظار کرتا رہتا۔ حتیٰ کہ بچھڑے ہوئے ساتھی بھی اس سے آ ملتے۔ سکول کے بعد بھی اب وہ لوگ گورداسپور میں اکٹھے ہی رہتے تھے۔ کسی نے گورداسپور چھوڑنا اور اس رفاقت کے احساس کو توڑنا مناسب نہ جانا تھا۔

غلام محمد پان کی دکان کرتا تھا اور ساتھ ہی اخباروں کا مقامی ایجنٹ بھی تھا بوٹا کچھ عرصہ کے چکر کے بعد اب ڈسٹرکٹ بورڈ میں کلرک ہو گیا تھا۔ ملازم ہوتے وقت اس سے پوچھا گیا کہ دو آسامیاں خالی ہیں۔ ایک لاہور میں جہاں کہ ترقی کا امکان ہے۔ اور ایک یہاں جہاں کہ مستقل تنخواہ ہے۔ اور بس کہنے لگا۔ میں تو نوکری کے بغیر ہی گورداسپور چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تو ترقی لے کر کیا کروں گا اور کسی کو بھیج دو۔ وہاں بندہ کے بس کی بات تو یہ ہے نہیں۔ ہم تو یہیں رہیں گے۔ ابھی گورداسپور میں۔ جس نے کہ اب تک مجھے ماں کی گود کی طرح پال پوس کر جوان کیا ہے مینی ساتھ ہی کے گاؤں میں پٹواری تھا۔ لیکن کتنا ہی فاصلہ کیوں نہ طے کرنا پڑے رات کو ضرور گورداسپور پہنچ جاتا۔ سردیوں میں اس سب پارٹی کو گاؤں لے جاتا۔ اور گنوں، گنے کے رس، رس کی کھیر، سرسوں کا ساگ، مکھن اور جوار کی روٹی سے ان کی خوب ہی تواضع کرتا۔ معراج الدین ساتھ کہے جاتا۔ یار مینی ایک بار تو بہت ہی مزا آیا۔ کیا بات ہے سرسوں کے ساگ اور مکھن کی۔ میاں مرغ مسلم پانی بھرے ہے اس کے آگے۔ اور شام کو کھانے پر مرغ مسلم بھی موجود ہوتا۔

معراج الدین۔ غلام محمد کا بڑا بھائی تھا۔ اور وہ بھی گورداسپور کی کچہری میں ملازم تھا۔ بولنے اور لیکچربازی میں اپنی مثال آپ۔ کہئے تو سائیں چاندی شاہ کا مجمع ایک منٹ میں لگا دے اور کہئے تو ڈاکٹر دین محمد کی طرح تقریر ایک منٹ میں جھاڑ دے۔ عید کے موقع پر یہ لوگ غازی مصطفےٰ کمال کا کھیل کھیلتے۔ معراج الدین ہی کو مصطفےٰ کمال بننا پڑتا۔ وہ خوب مونچھوں پہ تاؤ دئیے گردن ٹیڑھی کئے، سینہ پھیلائے نہایت تمکنت سے سٹیج پر آتا۔ کہ حاضرین پر رعب سا چھا جاتا۔ ایک دفعہ اسے ترقی پر امرتسر بھیجا جانے لگا۔ معراج الدین کو بھی پتہ چل گیا۔ شام کو ہی صاحب کے گھر پہنچا اور کہنے لگا۔ صاحب مجھے جنگل میں بھیجنے لگے ہو۔ وہاں جہاں کہ جھاڑیاں ہی جھاڑیاں ہیں۔ اگر مجھے گورداسپور سے نکالنا ہی مقصود ہے تو مجھے کسی سرسبز شہر میں بھیجو۔ جہاں کہ میرے ذوق کا کچھ تو سامان موجود ہو۔ اور ان سب کا گورو مولوی محمود، شیخ چراغ دین وکیل کا ایجنٹ۔ شیخ صاحب تو اچھے قابل وکیل تھے۔ اور ضلع مسلم لیگ کے صدر بھی ورنہ وہ کہا کرتا۔ یار یہ ذرا ذرا سے چھوکرے۔ ان دنوں وکیل بن کر آ گئے ہیں۔ ابھی کل تک تو میرے ہاتھوں میں کھیلتے تھے۔ انہیں تو ایمان سے میں وکالت پڑھا سکتا ہوں، سکھا سکتا ہوں۔ اور واقعی میں بات بھی یہی تھی۔ ایجنٹ بنے اسے ایک عرصہ ہو گیا تھا معمولی قسم کے فوجداری مقدمات کو تو وہ خود ہی تیار کر لیا کرتا۔ شیخ صاحب کو کچہری میں بس انگلیاں ہی چٹخانی پڑتیں اور ملزم بری ہو جاتے۔ مولوی محمود کسی زمانے میں احرار کا بڑا سرگرم کارکن تھا۔ اور کشمیر تحریک میں قید بھی رہ چکا تھا۔ وہ کہتا۔ دیکھو یہ سراسر بے ایمانی ہے۔ بھلا گورداسپور کیسے ہندوستان سے مل سکتا تھا۔ پاکستان سے لگتا ہوا علاقہ مسلمانوں کی باسٹھ فیصدی آبادی۔ یہ انگریز کی بدمعاشی ہے اور اب دیکھنا کہ کشمیر بھی پاکستان میں شامل نہ ہوگا۔ یہ ہماری قربانی تو محض کشمیر کی خاطر ہی دی گئی ہے۔ دسمبر کے دنوں میں بارش ہو یا طوفان مولوی محمود قادیان ضرور جاتا۔ احمدیوں کے سالانہ اجلاس پر۔ اور ہمیشہ آکر یہی کہتا کہ ابھی تک ہمارا پلہ ہی بھاری ہے۔ اس نے شادی بھی کی، بچے بھی تھے۔ مگر اس کی نظرِ التفات ہمیشہ سانولے سلونے لڑکوں پر ہی ہوتی۔ میونسپل انتخابات کے زمانے میں مولوی محمود کی خوب مانگ ہوتی۔ اکثر جلسوں کی صدارت اسے ہی کرنا پڑتی۔ فریقین کی یہ کوشش ہوتی۔ کہ کسی طرح اسے اپنی طرف کر لیا جائے کیونکہ جس طرف بھی وہ ہو جاتا۔ اسکا کامیاب ہونا یقینی ہو جاتا۔ غرضکہ سب لوگ اکٹھے ہی رہتے۔ شام کو مولوی محمود کے ہاں محفل جمتی کہیں سے ڈھولک بھی آ جاتی۔ اور وہ قوالی چلتی، وہ داد ملتی۔ وہ وہ مصرعے اٹھائے جاتے کہ بڑے بڑے قوال کان پکڑ کے رہ جائیں یہ لوگ تبڑی بھی اکٹھے جاتے اور بٹالہ سینما دیکھنے بھی۔ آہ تبڑی کے لفظ سے حمید کے ذہن میں کئی یادیں تازہ ہو گئی تھیں۔ سو وہاں کی وہ مشہور نیک طفیل پارٹی بھی تو یہاں قافلہ کے ساتھ موجود تھی

تبڑی کے مقام پر بیساکھی کا میلہ خوب لگتا۔ تبڑی کے مقام پر بڑی نہر میں سے ایک چھوٹی نہر نکالی گئی تھی۔ ان دونوں نہروں کے درمیان کا علاقہ ایک باغ میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ سایہ دار درخت۔ روشیں بنی ہوئی۔ دونوں طرف بنچ نصب۔ اور نہانے کے لئے سیڑھیاں۔ اردگرد آموں کے باغ۔ خواہ مخواہ جی چاہتا کہ یہاں ٹھہر کر ذرا سستا لیں اور آموں کی طرف تکے جائیں۔ رنگ برنگے، سیندوری سفید، سولغی، لڈو، بیبی۔ طرح طرح کے آم۔ اپنے جوبن پر الہڑ دوشیزاؤں کی طرح۔ بناؤ سنگھار کئے۔ بارش کے بعد سبز سبز پتوں میں ایسے دہکتے جیسے کہ شادی بیاہ کے موقعہ پر رنگ برنگے قمقمے۔ انہیں نہر میں ڈال دیا جاتا اس نہر میں جس میں کہ چودہ فٹ پانی ہوتا۔ برف کی طرح ٹھنڈا۔ اس میں رکھے ہوئے آم۔ ایسے ہو جاتے کہ ریفریجریٹر (REFRIGERATOR) میں بھی کیا ہونگے۔ اس روز بجو بہشتی سر پر کیسری رنگ کا صافہ پہنے، بوسکی کی وہ چوڑی چوڑی لکیروں والی قمیص، اور لٹھے کی پاٹ دار نئی شلوار پہنے۔ منہ میں پان اور ہاتھ میں سگریٹ سلگائے ایسے گذر رہا تھا کہ بس میلہ ہی دیکھنے آیا ہو۔ اسکا انداز ہر ایک کو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ اپنے پلے سے پی ہے نہ۔ کیا کسی کے باپ کا احسان ہے۔ لیکن بدقسمتی سے نیک طفیل پارٹی کی اس پر نظر پڑ گئی وہ تو لنگوٹ کسے پہلے ہی پل پر سے چھلانگیں

لگا رہے تھے بس آنکھ کے ایک اشارے پر ان پانچ چھ نے اس کے گرد حلقہ ڈال لیا۔ دو نے اس کی بانہیں پکڑیں۔ اور دو نے ٹانگیں۔ باقی دو نے سہارا دیا اور لے چلے پُل کی طرف۔ اب وہ چھڑانے کی ہزار کوشش کر رہا ہے۔ گالیاں دے رہا ہے، چیخ رہا ہے، منت کر رہا ہے، مگر وہاں کون سنتا تھا۔ انہوں نے اسے اس کلف دار مانے اور استری شدہ کپڑوں سمیت پُل پر سے دھڑام نیچے نہر میں پھینک دیا۔ اتنا وہ جانتے تھے کہ یہ تیرنا جانتا ہے۔ اب وہ ہے کہ ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ مگر اس کی شلوار ہوا کے بھرے ہوئے پیراشوٹ کی طرح پھیل چکی تھی۔ اور اس کی پگڑی اُسے آگے ہی لے جا رہی تھی جو پانی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ کنارے کی طرف آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آخر وہ باہر نکل آیا اور تمام دن کپڑے سکھاتے ہوئے اس پارٹی کو نت نئی گالیوں سے نوازتا رہا۔

یہ نیک طفیل پارٹی بھی خوب تھی جیسے کہ لمیٹڈ کمپنی۔ ایک ہی قماش کے چند بے فکرے۔ گرمیوں میں وہ سامنے کے جوہڑ میں کچھ اس طرح غوطے لگاتے، جیسے کہ کسی تیرنے کے تالاب میں انعامی کھیلوں میں حصہ لے رہے ہوں۔ اور کبھی کبھی کیا اکثر ساتھ کے آموں کے باغ پر بھی نظرِ عنایت پھینک دیتے۔ ایک اوپر چڑھ جھکولے سے تمام آم نیچے گرا دیتا اور جب تک کہ رکھوالا آئے۔ یہ سب یہ جا وہ جا۔ کبھی باغ کے آلوچے تو ان لوگوں کو خاص طور پر پسند تھے۔ باغ کوئی بھی مول لے، ان کا چھاپہ قائم رہتا۔ ایک دفعہ باغ کے مالی نے استدعا کی کہ پکنے پر خود ہی آ کر سیر ہو کے کھا جایا کرو۔ آخر یہ لُوٹ کیوں مچاتے ہو۔ مگر طفیل کہنے لگا کہ چل بے ہم کوئی بھیک منگے ہیں اور پھر۔ تو کیا جانے ان لُوٹ اور بخشش کے آلوچوں میں کیا فرق ہوتا ہے۔ ظالم تو نے کبھی پی ہی نہیں۔ آلوچے کھانے کا مزا ہی کیا جب تک کہ یہی خوف نہ ہو پکڑے جانے کا۔ پھر بھاگنے کی تیاری۔ کچھ کچے اور پکے آلوچے جیب میں ڈال جب تک کہ تو ہمارا پیچھا نہ کرے۔ جا بے رہنے دے، ان چالوں کو۔ ہم ان میں پھنسنے والے نہیں۔ اور کبھی باغ سے لوٹتے لوٹتے کچہری کے جامنوں پہ بھی ہاتھ صاف کر دیتے۔ جامنیں تو اب کبھی رہی نہ تھیں۔ ایک سال بک گئیں تو ان لوگوں نے اس خریدنے والے کا وہ ناک میں دم کیا کہ وہ منافع کمانے کی بجائے اپنی جھونپڑی تک چھوڑ کے بھاگ گیا۔ یہ لوگ کہا کرتے کہ جامنیں تو ان بیچارے غریبوں کا پھل ہے۔ سستی اور افراط میں۔ اور پھر ہیں بھی سانولی سلونی، چکتی ہوئی۔ ان پھولے ہوئے گورے چٹے لوگوں کی طرح نہیں جو کہ موٹروں میں بیٹھے ہوئے آپ کے پاس سے فراٹے سے نکل جائیں۔ یہ یاد دلاتے ہوئے کہ دیکھا ہم چاہیں تو تمہیں کچل کر رکھ دیں۔ ان جامنوں کے ٹوکرے بھرے لوگ محلہ بھر میں تقسیم کرتے اور اس کا بڑھیا میں محلہ بھر کی بڑی بوڑھیوں کی دعائیں حاصل کرتے۔ شام کو جس روز گرمی ذرا زیادہ

ہوتی اور حبس سے دم گھٹنے لگتا، تو انہیں اپنے ذوق کی تسکین کے لئے نت نئی سوجھتی۔ کہیں سے ایک خالی ٹین اٹھا۔ محلہ بھر میں سے دو چار اچھے بھونکنے والے کتے ساتھ لے۔ رحمتے کمہار کے گھر ڈیوڑھی میں جا خوب ٹین پیٹتے، اور کتے زور زور سے بھونکتے۔ حیدا اعلان کرتا کہ کل تمام دن اور تمام رات گدھوں کو گولی ماری جائے گی۔ ہر کوئی گدھے والا یا والی اپنے گدھوں کو باندھ کر رکھے یا اس کے گلے میں پٹہ ڈال کر رکھے۔ ورنہ آوارہ گدھے کو ضرور گولی مار دی جائے گی۔ یہ شور و غل اور کتوں کی خوفناک آواز سن رحمتے کے گدھے، رسیاں توڑا، دولتیاں جھاڑ ڈیوڑھی پھلانگ دالان میں جا گھستے۔ ہر شے تحس نحس کر دیتے۔ ایسا لگتا جیسے کہ گھڑ دوڑ ہو رہی ہو۔ رحمتے موٹی موٹی گالیاں بکتی۔ ایک لمبا لٹھ لئے اوپر سے نیچے آتی اور کہتی کہ گدھوں کو گولی ماری جائے گی نہ، ذرا ٹھہر تو سہی۔ دیکھوں میں تمہیں اور محلہ بھر محسوس کرتا کہ گرمی میں واقعی کچھ کمی ہو گئی ہے۔ حیدر کچھ ایسے ہی سوچ رہا تھا کہ پھر لوندا باندی شروع ہو گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش ہونے لگی لوگوں کے پاس پہلے ہی اوڑھنے کو کچھ نہ تھا اور اگر کچھ تھا بھی تو پسینہ سے تر اور حبس اور بُو سے بھرپور۔ مگر بارش کو اس سے کیا۔ اس کی بوچھاڑ اور ہوا کے جھونکے منہ پر ایسے پڑتے کہ طمانچے۔ لوگ ٹھٹھرے ہوئے گٹھڑی بنے ہوئے سوچتے کہ آخر کدھر جائیں۔ کہاں پناہ لیں۔ درختوں کے نیچے پہلے ہی کتنا پانی کھڑا ہے۔ اوپر آسمان کی طرف دیکھ کر کہتے۔ اے خدا۔ ان تمام آلام و مصائب سے گذر کر کیا ہم ایک دن پاکستان پہنچ جائیں گے؟ پہنچ جائیں گے کیا۔ کہ قافلہ جنتی پہنچ گیا جس کے ارد گرد تمام گاؤں سکھوں کے تھے اور شاید قافلہ کی آمد کی اطلاع انہیں پہلے ہی مل چکی تھی۔ وہ تھانہ کی حدود میں لب سڑک ڈیوڑھی میں۔ تھانہ کی چھت پہ اور بڑے بڑ کے سایہ میں اکٹھے ہوئے بیٹھے تھے۔ لوگ پہلے ہی بھانپ گئے اور جونہی لوگ تھانہ کے آگے سے گذرنے شروع ہوئے وہ ان پر اس طرح ٹوٹ پڑے جیسے کہ کئی روز کے بھوکے تھے، اور بس کھا ہی جائیں گے ان سب کو۔ فوجی سپاہیوں کی گولیاں چل تو رہی تھیں مگر ہوا میں۔ شاید ہی ان سے کوئی زخمی ہوا ہو۔ سکھ تھے کہ لاٹھیوں، کلہاڑیوں اور برچھیوں سے مسلح اپنی دھار لوگوں پر آزما رہے تھے۔ ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ تھانہ کے سپاہی اوپر چھت کے برآمدہ میں بیٹھے ہنسی مذاق میں مصروف تھے۔ کہتے دیکھو بھائی یہ پاکستان جا رہے ہیں۔ فوجی سپاہیوں سے کہتے انہیں وہاں پہنچا کر ہی لوٹنا۔ آخر کو کچھ لوگ بھاگ نکلے کچھ وہیں کھیت ہو گئے کچھ زخمی لنگڑاتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے آ ملے۔ تیلا بھی لنگڑا رہا تھا کہنے لگا اس برچھی لگنے کا اتنا افسوس نہیں جتنا کہ ایسا ہے کہ کس نے لگائی۔ وہ بچپن سنگھ جیسے ساتھ جیل میں تھا اور اس سانے کی بیگار کئی دفعہ میں نے کی تھی۔ یہ تیلا اگرچہ اب ایک عظیم لیڈر نظر

آتا تھا۔ مگر تھا بس ایک ہی۔ بازار میں اس کی خاص شخصیت تھی۔ کئی دفعہ اسکا نام نمبر دس میں لکھا گیا اور کئی دفعہ تاجی ڈاکٹر دین محمد کی کوشش سے قلمزد ہو گیا۔ تیلا کہا کرتا کہ یہ تو تھانیدار پر منحصر ہے۔ اگر تو کوئی ماجھے قسم کا آدمی بالکل لوچڑ کی سی خونخوار آنکھیں اور مجھے جانتے نہیں قسم کی سی مونچھیں لئے ہوئے آ گیا تو بس اپنا دس نمبر میں آ جانا یقینی ہے۔ اور اگر کوئی بھاگوان قسم کا تھانیدار میر صاحب جیسا مرنجان و مرنج۔ طبیعت ایسے جیسے دودھ پر بالائی۔ پھر تو اپنے لوگوں کے پو بارہ ہیں۔ بھرے بازار میں جو کھیلیں دن بھر لال پری سے بغلگیر ہوں۔ تو کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ اور تیلا تھا بھی ہر فن مولا۔ گرمیوں میں زقلفہ کھوئے ملائی والا" لگاتا اور کبھی بناتا بھی خوب۔ آٹھ دس روپے کما لیں۔ دو چار روز دھت گذار دئیے۔ میں نے ایک دفعہ اس سے پوچھا کہ اتنی اچھی چیز آخر روز کیوں نہیں بناتے۔ روزانہ بناؤ تو یقیناً تمہاری آمدنی بھی بڑھ جائے۔ کہنے لگا "صاحب میرے" روز بناؤں تو یہ لوگ میرے پیچھے پیچھے کیسے پھریں۔ اور بس یہ عام سی چیز ہو کے رہ جائے۔ اب کبھی کبھار بناتا ہوں اور ترسا ترسا کے بیچتا ہوں اور لوگ انگلیاں چاٹتے جاتے ہیں۔ ماہِ رمضان میں تیلا دہی لگایا کرتا اور سحری کے وقت اس کی سُریلی آواز بادلوں میں کونج کی آواز کی طرح معلوم ہوتی۔ وہ سب سے پہلے آتا اور اپنی مخصوص لے میں کہتا

رکھو روزے، پڑھو نمازاں۔ اللہ نے فرمایا

اٹھو مومنو، کھاؤ سحری تیلا دہی لے کے آیا

اور دہی ہوتا بھی خوب سچے دار۔ موٹی بالائی لئے ہوئے۔ شہد کی طرح شیریں۔ وہ کہا کرتا توبہ توبہ "صاحب میرے"۔ رمضان شریف میں بھی اگر بے ایمانی برتوں تو آپ سب لوگوں کے سر کا گناہ مجھ پر ہی پڑے۔ اور بہت دن ہیں بددیانتی کے لئے۔ ایک دفعہ خدا کی کرنی کچھ ایسی ہوئی کہ تیلا کے پاس پیسے ختم ہو گئے۔ تیلا کی قسمت کہئے کہ انہی دنوں مداری خانہ بدوشوں کا ایک گروہ شہر میں آ نکلا۔ شہر کی ہر گلی، بازار کا ہر نکڑ۔ ان کی بانسری کی سُریلی تانوں سے گونجنے لگا۔ وہ اپنا کھیل شروع کرنے سے پیشتر حاضرین سے کہتے کہ آپ میں سے ایک آدمی ذرا آگے نکل کر بیٹھ جائے تاکہ بات چیت کا مزا آ جائے۔ اور تیلا کہیں کونہ میں سے نکل لگا چھلانگ مداری کے سامنے آ جاتا۔ مداری پوچھتا کہ بھائی تیلا تمہیں روپے کی ضرورت ہے تیلا فوراً کہتا ہاں ہاں، بہت دکسے نہ ہو گی۔ آ نے دے ذرا۔ مداری ذرا سی خاک مٹھی میں ڈال چھڑک کے ایک روپیہ مٹھی سے تیلا کی طرف پھینک دیتا۔ تیلا کہتا واہ بھائی واہ مداری کیا بات ہے۔ مگر مزا نہیں آیا۔ ایک اور تو آنے دے اور جب اسطرح مداری پانچ چھ روپے بنا، اپنے ہاتھ کی صفائی دکھا تیلا کی طرف پھینک دیتا تو تیلا شاباش دے چھلانگ لگا لوگوں کو چیرتا ہوا روپے لے یہ جا وہ جا۔ لوگ دیکھتے رہ جاتے۔ مداری چیختا ہی رہ جاتا۔ مگر تیلا کہاں۔ بس اسی طرح اس نے آٹھ دس روز میں تقریباً ہر ایک مداری سے آٹھ دس روپے اینٹھ لئے۔ اور ان سے عہد لے لیا کہ آئندہ بھی جب کبھی وہ اس شہر میں آئیں گے اسے اسکا حصہ ضرور دینگے۔ اور اب تیلا اس قافلہ کے ساتھ ایسے تھا جیسے کہ منہ میں زبان ہی نہ ہو۔ میں نے اس سے کہا کہ تم تو بہت اونچ نیچ دیکھ چکے ہو۔ بڑے بڑے بدمعاشوں سے تمہارا واسطہ پڑا ہے۔ اب ان کے لئے بھی تو اپنے تھیلے میں سے کچھ نکالو۔ کوئی داؤ، کوئی جادو منتر۔ کہنے لگا وہ سب ہنرمند اور پکے بدمعاش ہوتے تھے۔ اپنے اپنے فن کے ماہر۔ یہ حرام زادے سب اناڑی ہیں۔ لٹیرے ہیں محض۔ ان میں کوئی پیشہ ور بدمعاش نہیں ہے اور اب کی بار جنتی پور کے واقعہ کے بعد سب کی نگاہیں بشیر چودھری کی طرف اٹھ رہی تھیں اس نے اور حمید نے مل کر ایکی بار وہ لٹھ گھمایا تھا کہ عورتوں کے قریب کسی کو نہ آنے دیا۔ تمام عورتوں کو یکجا کر کے گھاٹی کے پاس ایک طرف بشیر کھڑا لٹھ گھما رہا تھا اور دوسری طرف حمید۔ اور ان کا لٹھ گھومتا دیکھ کر کسی کو عورتوں کی طرف آنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ بشیر چودھری بھی بیچارہ بٹالہ سے اس قافلہ کے ساتھ ہو لیا تھا۔ وہ ڈیرہ بابا نانک کے پل پر اپنے اقربا سے بچھڑ چکا تھا۔ وہ ان کے ساتھ پل پر سے گذر رہا تھا، کہ پل پر تعینات فوج نے گولی چلا دی۔ کچھ تو وہیں ڈھیر ہو گئے۔ کچھ نے پل پر سے کود کر جان دیدی۔ کچھ آگے نکل گئے اور کچھ پیچھے لوٹ آئے۔ بشیر بھی ان پیچھے لوٹنے والوں میں تھا اور وہ اپنے کنبہ کو تلاش کرتا بٹالہ پہنچ گیا تھا۔ بشیر ہو کا اپنے گاؤں میں ایک شہزادہ تھا اسکا تمام کھیتی کا کام گاؤں کے کمین اور دوست کر دیا کرتے اور وہ ڈنڈ پیل، ٹانگ پہ ٹانگ چڑھا تخت پوش پر بیٹھ کر حویلی میں مختلف واقعات پر تبصرہ کرتا۔ اس کے والد نے کبھی کبھار اپنے رسوخ سے اسے ڈاک خانہ میں ملازم کروا دیا تھا مگر شرط یہ تھی کہ پہلے پہل اسے کسی اور ڈاک خانہ میں جاکر حاضر ہونا پڑے گا اور پھر کچھ دیر بعد اسے اپنے گاؤں میں تبدیل کر دیا جائے گا مگر گاؤں کون چھوڑتا۔ بشیر کا اصرار تھا کہ اگر اسے بعد کو گاؤں میں آنا ہے تو ابھی سے ہی کیوں نہ اپنے گاؤں میں لگ جائے۔ بس وہ گیا پر نہ گیا۔ وہ اس کی سنہرے پنڈے کی بھینس۔ وہ اوشن کیونر جیسا بڑا سا اصیل مرغا۔ اسکی چتکبری گھوڑی، گاؤں کی وہ بڑ کی چھاؤں۔ وہ بھگتی موچی کی دکان۔ وہ شطرنج کی بازی۔ یہ سب چیزیں وہ بھلا کیسے چھوڑ سکتا تھا ایک دفعہ زبردستی آخر اسے ایک دوسرے گاؤں بھیج ہی دیا گیا کہ اب اگر تم نہ گئے تو تمہارا نام محکمہ کی فہرست سے ہمیشہ کے لئے خارج کر دیا جائے گا۔ وہ چلا تو گیا مگر چند ہی روز بعد بغیر بستر اور دیگر لوازمات کے اپنے گاؤں ہی میں

پا گیا۔ معلوم ہوا کہ وہاں چند ایک مزدوری رجسٹریاں گم کرنے کے بعد اب مفرور ہیں۔ بابا اللہ بخش نے جو کہ ان کی حویلی کا ایک مستقل پناہ گزین تھا اس کے آنے پر چند ایک شعر کہے جو کہ غیر فانی ہو کر رہ گئے۔ بشیر کو جب بھی وہ سنائے جاتے وہ سیخ پا ہو جاتا۔ مگر اس تصویر کشی کی وہ ضرور تعریف کرتا جو کہ ان شعروں میں کی گئی تھی۔ کچھ ایسے ہی تھے وہ شعر۔

حویلی میں پانی میں تھا شہر یار ، مری فوج پھرتی تھی بے مہار
کہاں کھڈا موچی کہاں بیریاں ، گئی چھوٹ ملوانوں کی دکان

بشیر اب بھی کچھ ان شعروں کے متعلق ہی سوچ رہا تھا کہ کیا بابا اللہ بخش نے وہ شعر کہتے وقت پیشین گوئی کر دی تھی یا وہ شعر اس نے ہمیشہ کے لئے میری حالت کے متعلق کہہ دئے تھے۔ بات بات پر وہ رو دیتا جیسے کہ پانی کے زور سے اس کے اردگرد کے کنارے اندر کو گر جائیں۔ اور پانی بے قابو ہو جائے۔ وہ کہنے لگا کیا اب ہم کبھی اپنے گاؤں میں نہ جائیں گے۔ وہ باغ، وہ کھیت، وہ حویلی، وہ بڑ کی ٹھنڈی چھاؤں وہ اس کے قاصد کبوتر۔ کیا وہ یہ سب چیزیں اب پھر کبھی نہ دیکھے گا۔ مجھ سے کہنے لگا نہیں نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ نارووال اور ہمارے گاؤں کے درمیان وہ پل ہی تو ہے۔ میں پھلانگ کر اسے اپنے گاؤں پہنچ جایا کروں گا۔

مگر فی الحال تو وہ اس قافلہ کے ساتھ چلا جا رہا تھا اور رحمتے کمہارن اب تک جس گدھے پر سوار چلی آ رہی تھی۔ اس ہلڑ میں اسے بھی ایک برچھی لگ گئی تھی۔ اور وہ بھی وہیں ڈھیر ہو گیا تھا۔ اب وہ پیدل چل رہی تھی اور منج کو بے تحاشا گالیاں دے رہی تھی کہ یہ منج کا بیڑہ غرق ہو گیا جو اس کو سب تھے لے آیا۔ ورنہ اپنا گھر وہ کہاں چھوڑنے والی تھی۔ اس کی پچھلی کوٹھڑی میں اسکا تمام گہنا لتا دبا ہی رہ گیا۔ اور کوٹھے پر اس کے اپلے بھی۔ رحمتے کا ہمیشہ یہی حال تھا وہ ہر ایک واقعہ کا منج کو ہی ذمہ دار ٹھہرایا کرتی کیونکہ منج اسکا ہمسایہ تھا۔ اور جب کبھی کوئی شرارت سے اس کے گدھوں کے چارہ والی جگہ میں سیندور چھڑک آتا یا اس کے پانی کے گھڑوں میں یونہی کاغذ پھینک آتا اور رحمتے آتی اور سیندور دیکھ کر منج کو کوسنے لگ جاتی کہ لو آج پھر اسکا بیڑا غرق ہو گیا۔ تمہیں یہ چاہتا ہے کہ میں یہاں نہ رہوں۔ وہ قاضی صاحب تو پہلے بھی میرا مکان خریدنے کی فکر میں ہیں۔ آج پھر میرے مویشی مارنے کی چال چلی گئی ہے۔ میری گائے تو پہلے ہی وہ سرکہ گئی ہے اور حلق تر کرنے کے لئے جب گھڑے میں سے پانی لینے لگی تو کیا کاغذ نظر آتے۔ بس وہ کاغذ لئے ہوئے گلی میں بھاگ آتی اور چیخ چیخ کر کہتی۔ یہ دیکھو تعویذ۔ صاف تعویذ ہیں شکستہ حروف میں
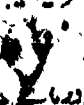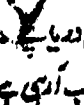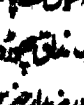
گنڈے لکھے ہوئے اور محلہ والوں کی ایک ایک جوان لڑکی کا نام لے ڈالتی کہ میری جگہ وہ جائے قبر میں۔ میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے۔ میں نے ابھی دنیا کا دیکھا ہی کیا ہے۔ ابھی تو میرے دانت سلامت ہیں۔ یہ محلے والوں نے تعویذ کھلا کھلا کر مجھے مار ڈالا۔ کئی روگ لگ گئے مجھ کو۔ میری بھوک آدھی نہیں رہی۔ کہاں ہے وہ فضل۔ یہ اسی حرامزادے کا کام ہے۔ اس کے بچے مر جائیں اور اس طرح اب بھی اسکا یہی حال تھا۔ اور منج تھا کہ بیچارہ چپ چاپ سب کچھ سنے جا رہا تھا جتنی پورے امرتسر کا راستہ بخیر و عافیت گزر گیا۔ امرتسر سے ادھر ہی باغوں کے پاس ایک کھلی جگہ میں رات بسر کرنے کا سامان کیا گیا۔ بعض لوگ تو بہت نڈھال ہو چکے تھے بعض بھوک سے اور بعض اپنے اقربا کے نقصان سے۔ کہ اتنے میں حقا نائی اپنی سگریٹ جلانے دیا سلائی مانگتا نظر آیا۔ تیلا کہنے لگا بیٹھو یار سگریٹ بھر پی لینا۔ لوگ بہت تھکے ہوئے ہیں بلکہ اپنے آپ سے تنگ آئے ہوئے ہیں۔ کوئی چیز ایسی سناؤ کہ ان کی ڈھارس بندھے۔ یہ حقا نائی جو کہ ہرفن مولا تھا۔ حجامتیں بھی کرتا اور رات کو میلاد کی محفلوں میں نعت خوانی بھی کرتا۔ محرم کے دنوں میں مرثیے بھی پڑھتا اور دیگیں بھی پکاتا۔ حقا بیٹھ گیا اور کان پہ ہاتھ دھر کر اس نے گانا شروع کیا۔

لوگ پھر چوکنے ہو کر بیٹھ گئے گویا کہ اس گانے نے گورداسپور سے وابستہ ان کی تمام یادیں پھر تازہ کر دی تھیں۔ بہتوں کے زخم ہرے ہو گئے۔ تیلے کی آنکھوں میں آنسو تھے اور حمید کا بھی گلا رندھا ہوا تھا کہ حقا نے دوسرا شعر اٹھایا۔

حمید کو یاد آگیا کہ نظیر لدھیانوی نے دورانِ قیام گورداسپور میں بھی ایک نظم لکھی تھی اور لطیف انور صاحب کے رسالے پاسبان میں جو کہ گورداسپور سے شائع ہوتا تھا چھپی تھی اور پھر تو زبان زد عام ہو گئی تھی۔ حمید کو اسکا دوست ذکی پال یاد آگیا جو کہ گورداسپور میں تھوڑے دنوں کے لئے ہی آیا۔ مگر اس کے خطوں میں اکثر گورداسپور کا ذکر ہوتا کہ یار گورداسپور تو جنت ہے جنت۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ ہر دیدبان۔ آب و ہوا کی افراط وہ تبدیلی کا مقام۔ دوسری جگہ یہ چیزیں کہاں ہوں گی۔ اس نے لکھا تھا کہ اگر امرتسر پاکستان میں نہ آیا تو وہ گورداسپور آ جائیں گے۔ مگر اب تو نہ امرتسر رہا اور نہ گورداسپور۔ آخر صبح ہوئی اور قافلہ پھر چل پڑا۔ آج ان کو امرتسر ہی سے گزرنا تھا۔ اسٹیشن کے آگے سے۔ خالصہ کالج کے سامنے سے۔ جہاں کہ ان سے پہلے کئی مسافر گاڑیاں ختم کی جا چکی تھیں۔ کئی لڑکیاں اٹھائی جا چکی تھیں اور کئی لوگوں سے بھری ہوئی موٹر لاریاں پیٹرول ڈال کر جلا دی گئی تھیں۔ کوئی دس بجے کے قریب قافلہ اسٹیشن کے پاس پہنچا اور جب وہ خالصہ کالج کے پاس پہنچے تو خالصہ کالج کی گھڑی نے ٹن سے بارہ بجائے اور حملہ شروع ہو گیا۔ بندوقوں سے برچھیوں سے کلہاڑیوں سے۔ اندر سے لوگ نکلتے ہی آتے تھے۔ دھاریوال میں ایسا ہوا۔ بٹالہ میں بھی ایسا ہوا۔ پولیس موجود تھی۔ فوج والے موجود تھے مگر وہ تو سب تماشائی تھے۔ رحمتے کمہارن

ایک طرف کو بھاگ رہی تھی۔ غلام محمد کے سامنے اس کی لڑکی کے کپڑے پھاڑ ڈالے گئے۔ شیرو نے بچانا چاہا تو وہ غلام محمد کی طرف آتی ہوئی برچھی اس کی ٹانگ میں اٹک کر رہ گئی۔ لیکن طفیل پارٹی کے سب آدمی کٹ گئے۔ بشیر نے دو چار کو تو گرایا۔ مگر کب تک آخر بھاگ نکلا۔ نبی داد کھلے ہوئے تہمد کے ساتھ خون میں لت پت پڑا تھا۔ گولیاں سنسناتی ہوئی آتی تھیں اور لوگوں کے جسم چھلنی کرتی ہوئی گذر جاتی تھیں۔ لوگوں کے بستر، میلی پھٹی ہوئی رضائیاں، ٹوٹے پھوٹے برتن، خراب و خستہ کپڑے وہیں پڑے تھے۔ آخر کچھ دیر کے بعد یہ سب کچھ ختم ہو گیا ایسے جیسے کسی فلم میں لڑائی کے مناظر گزر جانے کے بعد فلم کہانی کی طرف لوٹ آئے۔ ساتھ کے فوجی سپاہی کہنے لگے کہ ہمیں تو انہوں نے پہلے ہی قید کر لیا تھا اور بندوقیں چھین لی تھیں اب واپس دی ہیں۔

خالصہ کالج سے آگے گزر کر اکا دکا لوگ اکٹھے ہونے شروع ہو گئے۔ مستری محمد دین تھا۔ غلام محمد تھا۔ مگر اس کی لڑکی موجود نہ تھی۔ شیرو تھا مگر اس کے دونوں بچے نہ تھے۔ غلام محمد کی مارے خوف کے یہ حالت تھی کہ وہ بول نہ سکتا تھا۔ تیلا اور شیرو دونوں آہستہ آہستہ لنگڑاتے ہوئے آ رہے تھے۔

مگر شیرو پیٹ کے درد کی سخت شکایت کر رہا تھا۔ اس کا چہرہ ظاہر کر رہا تھا۔ کہ جیسے پیٹ کے اندر کوئی چیز اسے کاٹے ڈال رہی ہو۔ جب قافلہ اٹاری سے آگے ہندوستان کی آخری چوکی پر پہنچا تو غلام محمد نے وہاں ایک فوجی افسر سے کہا کہ ہم لوگ جب چلے تو کئی ہزار تھے مگر اب چند سو ہی ہیں۔ تو وہ طنزیہ ہنس ہنس کر کہنے لگا ہاں ہاں تم پاکستان جا کر بھی تو کہو گے۔ اگر ایسے ہی تھا تو تم لوگ کیسے بچ کر آ گئے۔ تمہیں کیوں نہ مار ڈالا انھوں نے۔ اور تیلے نے غلام محمد کو اشارہ کیا کہ مصلحت خاموشی ہی میں ہے۔ کہ شیرو کو قے ہوئی۔ ایک کے بعد دوسری اور پھر شیرو لیٹ گیا۔ نقاہت سے اب وہ بول بھی نہ سکتا تھا۔ چلنا تو درکنار۔ حمید نے اسے جا کر سہارا دیا۔ وہ کانپ رہا تھا اور اسے پسینہ پر پسینہ آ رہا تھا کہ اُسے پھر قے ہوئی اور دست بھی۔ حمید نے چوکی والوں سے کسی دوا کی درخواست کی مگر وہ کہنے لگے ہاں ہے۔ وہ دور، پاکستان والوں کے پاس۔ شیرو پر نیم بیہوشی کی حالت طاری تھی۔ حمید اور مستری محمد دین نے مل کر اسے کندھوں پر اٹھا لیا۔ مگر اس کی حالت دگرگوں ہوتی جا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اسے اٹھا کر چلنے میں بھی تکلیف ہو رہی ہے۔ حمید اور مستری جلدی جلدی چلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پھر وہ بھی تو آخر کئی روز کے بھوکے اور پیاسے تھے۔ آخر شیرو کو اتار کر رکھ دیا گیا۔ حمید گھڑی گھڑی اس کی نبض پر ہاتھ رکھتا اور اس کے دل کی کیفیت دیکھتا۔ سب لوگ اپنی تکلیف بھول شیرو کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ حمید کہیں دور دیکھ رہا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ نہیں نہیں شیرو۔ یہاں مت مرنا۔ وہ دیکھو سامنے پاکستان کی حد آ گئی۔ وہ دیکھو سامنے لاہور کی بڑی مسجد کے مینار نظر آ رہے ہیں۔ وہی لاہور شیرو جہاں تمہارا بھائی شریف رہتا ہے۔ واگہ کی نہر۔ یہ وہی نہر ہے مادھو پور والی۔ دھاریوال اور تبری میں سے گزرتی ہوئی۔ لاہور جہاں کہ مشرق کا وہ مرد دانا سو رہا ہے۔ وہاں راوی بھی ہے۔ وہی راوی شیرو جس میں کہ ایک دفعہ تمہاری ڈور میں مچھلی کے بجائے دو تین من کا کچھوا پھنس گیا تھا۔ اٹھو شیرو دیکھو تو سہی۔ سورج بادلوں کے پیچھے سے نکل رہا ہے۔ یہ اپنا گیلا کمبل اب نچوڑ ڈالو۔ اٹھو میرے بھائی ذرا ہمت کرو۔ منزل آ گئی۔ اب تو غم کٹ گئے۔ دیکھو کہ تمہارے کمبل میں سے بخارات اُٹھ رہے ہیں۔ اب یہ جلد سوکھ جائیگا۔ اٹھو مذاق چھوڑ دو۔ دیکھو میری طرف دیکھو۔ میں حمید ہوں۔ غلام حمید نہیں صرف حمید۔ غلام نہیں شیرو۔ دیکھو کہ نام سے غلام ایسے کٹ گیا جیسے بیل کے پیچھے سے کھینچنے والی گاڑی۔ نبی داد۔ پہلوان۔ نیاب اور طفیل۔ کیا وہ سب مر گئے۔ نہیں وہ نہیں مرے۔ اگر وہ مر گئے تو پھر سب کچھ مر گیا۔ انسانیت ختم ہو گئی۔ ہر وہ اچھی چیز ختم ہو گئی۔ ہر وہ اعلیٰ حس کہ انسان میں ازل سے تھی مر گئی۔ پھر یہ سب کچھ مذاق ہے۔ ہنسی ہے۔ مگر وہ مرے نہیں۔ اٹھو اور دیکھو کہ وہ تمہارے ارد گرد موجود ہیں۔ نبی داد پان لگانے کے نئے معیار مقرر کرے گا۔ اور اب وہ میرٹھ نہیں جائیگا کبھی نہیں۔ پہلوان اب بغیر جھریوں کے مکان بنایا کریگا۔ مستری محمد دین کو دیکھو کہ وہ شاید سوچ رہا ہے کہ مچھلی کے تمام علاقے تو پیچھے رہ گئے۔ مگر فکر نہیں مچھلیاں اور پیدا کی جائیں گی۔ اور انھیں پکڑنے کے نئے طریقے ایجاد کئے جائیں گے۔ چچا کا بہشتی کی طرف دیکھو کہ اس کے ذہن میں اپنے [illegible] دل گھوم رہے ہیں۔ (او دسری کھلی یار دی گھڑیا۔ لود سدی) یعنی سوہنی بیچ دریا کے۔ [illegible] کہ وہ دیکھو محبوب کی منزل سامنے نظر آ رہی ہے۔ وہ قریب آ رہی ہے۔ اب تم مجھے دغا نہ دینا اور پھر یہ ہجرت بھی تو عارضی ہو ایسی ہی جیسی کہ اس نے کی تھی۔ جس کے نام کا کہ آج ہم کلمہ پڑھتے ہیں ہم جلد ہی ان لوگوں سے جا ملیں گے جو پیچھے رہ گئے۔ وہ جو کہ شہید ہو گئے کہ ہم زندہ رہیں۔ انگور کی بیل کو جانتے ہو۔ جب تک اسے خون نہ دیں اس میں پھل نہیں آتا۔ انھوں نے پاکستان کو تناور بنانے کیلئے اسے خون سے سینچا ہے۔ یہ خون ضرور رنگ لائیگا۔ اچھا اب مذاق چھوڑو اٹھو۔ وہ انار کلی میں دکان تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ وہاں بھی تم خالص دودھ دہی اور مزیدار چیزیں بنانا تمہاری دکان خوب چلے گی۔ وہاں پر راوی بھی ہے شیرو۔ مچھلی پکڑنے کے لئے۔ مگر شیرو۔ دونوں ملکوں کی سرحد پر اس زمین پر کہ جس پر کسی کا قبضہ نہ تھا۔ [illegible] آنکھیں اوپر اٹھائے لیٹا تھا جیسے کہ کہہ رہا ہو۔ اب میں آزاد ہوں۔ میرے ایک طرف ہندوستان ہے جو میرے آباؤ اجداد کا وطن اور دوسری طرف پاکستان۔ مستقبل قریب کا وطن۔ اب میں کہہ سکتا ہوں۔ [illegible] یہیں رہوں گا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اب تو سب غم کٹ گئے۔

G.E.C. Radio
جی۔ ای۔ سی۔ ریڈیو
جنرل الکٹرک کمپنی، لمیٹڈ، انگلستان کے بنائے ہوئے
ALL WAVE RECEIVER
جو ریڈیو آپ کو ساری دنیا کی سیر کراتا ہے
آپ کی میز کی زینت بڑھانے والے اس بے حد حسین سٹ نے آواز کی دنیا میں ایک نیا معیار قائم کیا ہے۔ مہاگنی کی عمدہ دانہ والی لکڑی کے خانہ میں جڑا ہوا یہ سُبک اور دلکش سٹ ایسا ہے کہ آپ کو اس کی ملکیت پر ناز ہونا چاہیئے۔ سات والو کے سب لہروں والے اس سٹ سے آپ ساری دنیا کی سیر کر سکتے ہیں، اور بغیر کسی شور و غل کے اپنی پسند کے ہر اسٹیشن کا پروگرام بالکل صاف اور نکھری ہوئی آواز میں سُن سکتے ہیں۔ سٹ کی عمدگی اور نفاست کے لئے یہ ضمانت کافی ہے کہ وہ جی۔ ای۔ سی کا تیار کیا ہوا ہے، جو برطانوی سلطنت میں بجلی کا سامان بنانے کا سب سے بڑا کارخانہ ہے۔
ماڈل بی۔ سی۔ اے۔ سی۔ ۱۹۰-۲۵۰ وولٹ کے لئے قیمت ۲۳۵ روپے۔
ایف۔ او۔ آر۔ پورٹ
ماڈل بی۔ سی۔ ڈی سی/اے۔ سی۔ ۲۰۰-۲۵۰ وولٹ کے لئے قیمت ۲۵۰ روپے۔
ایف۔ او۔ آر۔ پورٹ
تقسیم کنندگان
میسرز واسودیو لمیٹڈ، دی مال، لاہور
میسرز فرینز پال اینڈ سنز انو یرٹی روڈ کراچی
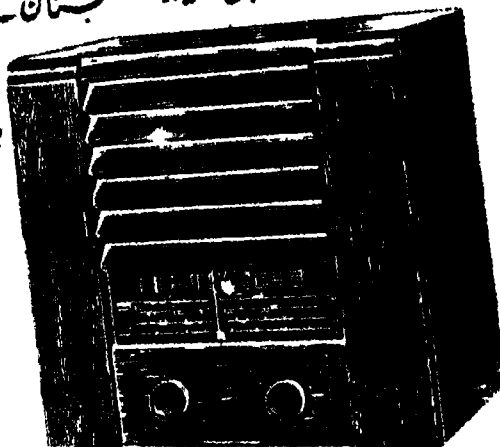
چہرے کے رنگ میں لطافت و دلکشی

پونڈز کی دو کریموں سے پیدا کیجئے
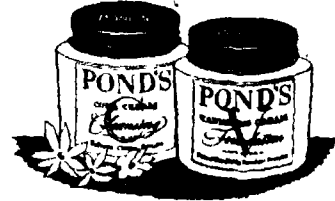
آپ کو اپنے چہرے کے رنگ میں قدرتی دلکشی پیدا کرنے کے لئے دو مختلف کریموں کی ضرورت ہے۔ اول وہ کریم جسکی آمیزش نفاست کے ساتھ کی گئی ہو اور جو مسامات کی گہرائیوں تک پہنچ جانیوالے روغنوں کا مرکب ہو تاکہ جلد کو صاف اور ملائم کردے۔ یہ پونڈز کولڈ کریم ہے۔ دوم وہ غیر روغنی کریم جو تمام دن غیر نمایاں طور پر آپکے چہرے پر قائم رہکر اسکی حفاظت کرتی ہے۔ یہ پونڈز وینشنگ کریم ہے۔

اپنی جلد کی صفائی ہر شب پونڈز کولڈ کریم سے کیجئے۔ چہرے اور گلے پر نفیس روغنی کریم لگا کر تھپتھپایئے اس کے بعد پونچھ ڈالیئے۔ اس دوران میں آپکے مسامات سے تمام میل نکل جائیگا۔ یہ عمل بہت جلد آپ کے چہرے کو حُسن اور صحت سے منور کردے گا۔

اپنی جلد کی حفاظت ہر صبح پونڈز وینشنگ کریم سے کیجئے۔ یہ دن بھر گرد و غبار اور آفتاب کی تپش سے چہرے کی حفاظت کرتی ہے۔ یہ کریم غیر روغنی ہے اور چہرے پر نمایاں نہیں ہوتی۔ یہ ٹھنڈی اور ہلکی کریم ذرا سی لیکر چہرے پر ہر طرف ملئے یہاں تک کہ جذب ہو جائے اس طرح یہ آپ کی جلد کی حفاظت کرنے کی علاوہ چہرے کو پھول کی طرح شگفتہ بنا دے گی۔

خط و کتابت برائے تجارت۔ ایل۔ ڈی۔ سیمور اینڈ کمپنی (انڈیا) لمیٹڈ
بمبئی، کلکتہ، دہلی، مدراس، لوواگورا، کراچی، کولمبو، رنگون۔

ماہِ نو

(قائدِ اعظم نمبر)

نومبر ۱۹۴۸ء

مدیر ــــــــ وقار عظیم

قیمت فی پرچہ ۸ر

چندہ سالانہ صہ۸ر

کچھ اپنی باتیں

ماہِ نو کا "قائداعظم نمبر" حاضرِ خدمت ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ اسے پسند فرمائیں گے۔ اس لئے کہ قائداعظم مرحوم کی شخصیت کے متعلق آپ کو اتنا متنوع اور اتنا مستند مواد کہیں اور یکجا نہیں ملے گا۔ ایک اور وجہ سے بھی یہ نمبر پسندِ خاطر ہوگا۔ اس کے اکثر مضامین ایسے حضرات کے لکھے ہوئے ہیں جنہیں کسی نہ کسی وقت قائداعظم سے قریب رہنے اور ان کی شخصیت کے ایسے پہلوؤں کا مشاہدہ اور مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے، جو ہم میں سے اکثر کی نظر سے پوشیدہ ہیں، ہم نے اب تک اپنے قائد کو ایک مہتم بالشان وکیل اور ایک زبردست سیاستداں کی حیثیت سے جانا پہچانا ہے، ہمارے دلوں میں اُن کا احترام اسلئے ہے کہ انہوں نے ہمیں غلامی کے شکنجوں سے آزاد کر دیا، ہمیں آزادی کی سرزمین دلائی اس سے زیادہ ہمیں اور کچھ نہیں معلوم۔ "ماہِ نو" کے یہ مضامین آپ کو ایسی ہی بہت سی باتیں بتائیں گے جو آپ کو اب تک معلوم نہیں ہیں۔ لیکن مضامین پڑھنے سے پہلے آپ شاید مضمون لکھنے والے حضرات سے متعارف ہونا چاہتے ہوں۔ یہ خوشگوار فرض میں انجام دیتا لیکن ان میں اکثر حضرات محتاجِ تعارف نہیں۔ جن صاحبان سے آپ واقف نہیں ہیں ان کا تعارف خود ان کے مضامین آپ سے کرا دیں گے۔ اظہارِ تشکر کی سعادت البتہ میں حاصل کر رہا ہوں۔ مقالہ نگار اور شعرا حضرات میں سے اکثر کی زندگی حد درجہ مصروفیت کی زندگی ہے۔ اس مصروفیت میں کسی طرح کا اضافہ یقینی طور پر بارِ خاطر ہوتا ہے۔ لیکن قائدِ اعظم نمبر کی ترتیب کے سلسلہ میں جب اِن حضرات کی خدمت میں اپنی درخواست پیش کی تو اسے خندہ پیشانی سے قبول کیا گیا۔ اور پھر اپنی بہت سی مصروفیتوں میں اس ایک مصروفیت کا اضافہ کر کے مجھے اپنے نگارشات مرحمت فرما دیئے۔ اور انھیں نگارشات کی بدولت ماہِ نو کا یہ خاص نمبر اس قابل بنا کہ اسے مسرت و فخر کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش کیا جا سکے۔ یہ سب کچھ یقیناً اس ذاتِ خاص کا فیضان بھی ہے جس کی یاد کے لئے ہم نے یہ شمارہ وقف کیا ہے۔

اس شمارہ میں آپ کو اور بھی کئی اچھے مضامین ملتے — ان میں سے بعض تو اس لئے نہیں شامل ہو سکے کہ وہ وقت پر مکمل نہیں ہو سکے، اور بعض اسلئے کہ ڈاک کی ستم ظریفیوں نے انھیں ہم تک نہیں پہنچنے دیا۔ مولانا غلام رسول مہر نے میری درخواست پر ایک سیر حاصل مقالہ تحریر فرمایا۔ یکم اکتوبر کو اسے ہوائی ڈاک سے کراچی روانہ کیا اور آج ۳۰ راکتوبر تک بھی وہ یہاں نہیں پہنچ سکا ہے۔

مضامین نثر و نظم کے علاوہ بعض چیزیں اور بھی ایسی ہیں کہ اگر کسی نہ کسی کی توجہ اور کرم فرمائی شاملِ حال نہ ہوتی تو وہ اس شمارہ میں شامل نہ ہو سکتیں۔ سرورق کی تصویر، اور اندر کی دو تصویریں، جن میں سے ایک سے زین العابدین صاحب نے قائدِ اعظم کا اسکیچ تیار کیا ہے (اور جو اس شمارہ کے ابتدائی صفحوں میں موجود ہے) اور دوسری جس میں قائدِ اعظم اور محترمہ فاطمہ جناح ساتھ ساتھ ہیں، ہمیں میاں محمد رفیع صاحب نے مرحمت فرمائی تھیں۔ ہم ان کے لئے موصوف کے بے حد شکرگزار ہیں۔ مصر کی ایک دعوت کی تصویر اور اس دعوت کے مینو کارڈ کے دستخطوں کے عکس ہمیں ممتاز حسن آحسن صاحب کی عنایت سے حاصل ہوئے ہیں۔ باقی تصویروں میں سے کچھ ہمارے فوٹوگرافر آفتاب احمد صاحب نے کھینچی ہیں اور کچھ حکومت پاکستان کے پریس انفارمیشن کی وساطت سے ہم تک پہنچی ہیں — قائداعظم کے مزار کے دو عکس زین العابدین صاحب نے بنائے ہیں۔ اور اس طرح قائداعظم نمبر کی ترتیب میں ان سب حضرات کا حصہ ہے۔ اگر آپ کو یہ نمبر پسند آئے (اور یقین ہے کہ پسند آئے گا) تو اس کے لئے شکرگذاری کے مستحق وہ تمام حضرات ہیں جن کا میں نے ابھی ذکر کیا۔ ہماری محنت کا سب سے بڑا انعام تو یہ ہوگا کہ قائداعظم کی روح اس ناچیز ہدیۂ عقیدت کو شرفِ قبول بخشے۔

اس صفحہ کے مقابل قائداعظم کی جو تصویر ہے یہ خاص طور پر ماہِ نو کے اس شمارہ کے لئے مشہور آرٹسٹ زین العابدین صاحب نے بنائی ہے۔ اگر آپ اسے فریم کر کے اپنے پاس رکھنا چاہیں تو دفتر "ماہِ نو" کو ایک روپیہ بھیج کر ایک تصویر منگا لیجئے ؛

ہز ایکسیلینسی الحاج خواجہ ناظم الدین

قوم کے نام

(نشر شدہ تقریر ستمبر ۱۹۴۸ء)

پاکستانی بھائیو اور بہنو! سب تعریف اللہ ہی کے لئے ہے اور اسی کے ہاتھ میں زندگی اور موت ہے۔ فانی اور کمزور انسان کچھ نہیں کرسکتا جب تک خدا تعالیٰ کی مدد اس کی شامل حال نہ ہو۔ انسانی زندگی میں ہر فتح اور برگزیدگی اسی کی طرف سے ہے اور ہمیں ہر حالت میں اس کی رضا پر قانع رہنا چاہیئے۔

قوت ایزدی کو یہی منظور تھا کہ ہمارے محبوب قائد اعظم اس فانی دنیا سے رحلت کر جائیں۔ ان تین دنوں میں آپ نے ملت اسلامیہ کے ہر فرقہ میں ان کے لئے عقیدت اور محبت کے جذبات کے پُر جوش مظاہرے دیکھے ہیں۔ قوم کا ہر مرد عورت اور بچہ یہی سمجھتا ہے کہ قائد اعظم کی وفات اس کا ذاتی اور ناقابلِ تلافی نقصان ہے اور ہر ایک کو ایسا ہی رنج ہے جیسا کسی قریب ترین عزیز کی وفات سے ہوتا ہے اس موقع پر ساری قوم کو قائد اعظم کے لواحقین اور خاص طور پر مس فاطمہ جناح سے دلی ہمدردی ہے۔ اور ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس صدمہ کو برداشت کرنے کے لئے ہمت اور صبر عطا فرمائے۔ دنیا میں ایسی ہستیاں کم پیدا ہوتی ہیں جن کو ہر خاص و عام نے اسقدر عقیدت اور اخلاص اور اسقدر محبت اور احترام کا نذرانہ پیش کیا ہو۔ یہ اس لئے کہ قائد اعظم نے اپنی زندگی کو قوم کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اور اپنی زندگی کے آخری وقت تک یہی ایک چیز تھی جو انہیں سب سے عزیز تھی قوم کی محبت اور خدمت یہی ایک جذبہ تھا جو ان کی ساری زندگی پر حاوی تھا۔ خدا تعالیٰ نے جو فہم و فراست جو اخلاص اور جو عزم ان کو عطا کیا تھا وہ ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا۔ قائد اعظم کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ دنیا کی کسی چیز کا لالچ یا خوف ان کو اپنے راستے سے ہٹا نہیں سکتا تھا۔

اب جبکہ قوم نے یہ گرانقدر خدمت میرے سپرد کی ہے اور مجھے انکی کرسی پر بٹھایا ہے تو مجھے اس کا شدت سے احساس ہے کہ در اصل کوئی انکی جگہ نہیں لے سکتا۔ انکی ہستی اور ان کا کام عدیم المثال ہیں۔ لیکن مجھ ناچیز کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ میں نے اس پختہ کار اور مدبر ہستی کے قدموں میں کافی وقت گذارا ہے اور اس نکتہ داں اور نکتہ رس کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا ہے میری انتہائی کوشش یہ ہوگی کہ میں ان کے نقشِ قدم پر چلوں اور اس عالیشان عمارت کی تکمیل جس کا سنگ بنیاد انہوں نے رکھا تھا ان اصولوں پر ہو جو قائد اعظم کے پیش نظر تھے۔

قوم کی یہ خوش قسمتی ہے کہ ہمارے وزیر اعظم لیاقت علی خاں صاحب بارہ سال قائد اعظم کے نزدیک ترین رفیق کار رہے ہیں۔ اس عرصہ میں قومی بہبودی کا کوئی ایسا مسئلہ درپیش نہیں ہوا جس سے ہمارے وزیر اعظم پوری طرح واقف نہ ہوں اور جس کا انہوں نے گہرا مطالعہ نہ کیا ہو اور جس کے متعلق انہیں قائد اعظم کی رائے کا علم نہ ہو۔ پاکستان میں ان سے موزوں تر کوئی شخصیت موجود نہیں جو ملک کی اس راستے پر رہبری کرسکے جو کہ قائد اعظم کے ذہن میں تھا۔ مجھے یقین کامل ہے کہ اس نازک مرحلے میں قوم وزیر اعظم اور باقی وزرا سے جن کی قابلیت، وفاداری اور جذبۂ خدمت قوم پر عیاں ہے پورا تعاون کرے گی۔

قائد اعظم کی وفات ہمارے لئے ایک مصیبت عظمیٰ ہے لیکن اس موقع پر ہمیں صبر سے کام لینا چاہیئے اور اسلام کی تعلیم کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ مسلمان کا بھروسہ کسی شخص پر نہیں بلکہ ذات باری تعالیٰ پر ہے ہمیں اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے ملک کے استحکام و بہبودی کے لئے قدم بڑھاتا چلے جانا چاہیئے میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو۔

ہمارے جو بدخواہ یہ سوچے بیٹھے ہیں کہ قائد اعظم کی وفات سے پاکستان کمزور ہو جائیگا اور ملت اسلامیہ تنزل کر جائیگی وہ غلطی پر ہیں ہم دنیا کو انشاء اللہ دکھا دینگے کہ ہم ایسے نااہل نہیں کہ قائد اعظم کی قربانیوں کو اکارت جانے دیں۔ لیکن ہم اسی حالت میں کامیاب ہو سکتے ہیں کہ ہماری ملت کا ہر فرد اپنے فرائض سے واقف ہو۔ سب کو جان لینا چاہیئے کہ دنیا کی کوئی قوم ترقی نہیں کرسکتی جب تک اس میں اتحاد اور تنظیم نہ ہو اور جب تک وہ یقین راسخ نہ رکھتی ہو جس قوم کے لئے یہ مقدر ہو کہ وہ ترقی کرے اور اپنی کوششوں سے بنی نوع انسان کی خدمت کرے وہ مصیبتوں سے نہیں گھبراتی۔ وہ قربانی کو قربانی نہیں سمجھتی اور کوئی رکاوٹ اور کوئی دشواری اس کے ارادے کو ایک لمحہ کے لئے بھی متزلزل نہیں کرسکتی۔

پاکستان کو جن اہم مسائل کا حل ڈھونڈنا ہے اور جن فرائض سے عہدہ برآ ہونا ہے ان میں سب سے بڑا مسئلہ پاکستان کے استحکام اور تحفظ کا ہے۔ پاکستان اس لئے قائم کیا گیا ہے کہ اس مملکت کے بسنے والے اخوت، برابری اور آزادی کے اسلامی اصولوں پر زندگی گذار سکیں اور ہر فرد کو اس کا حق مل سکے۔ پاکستان میں ہر ایک برابر ہے خواہ وہ مالدار ہو یا غریب، خواہ وہ کسی قوم کا ہو اور کسی مذہب کا پیرو ہو اور خواہ وہ پاکستان کے کسی صوبے کا رہنے والا ہو مگر یہ سب پر لازم ہے کہ وہ اپنے ملک کے سچے وفادار ہوں اور اس وفاداری کو اپنی صوبجاتی یا ذاتی کششوں یا معاشی اغراض پر یا اپنے قبائلی اور خاندانی رجحانات پر ترجیح دیں۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں پاکستان کے تحفظ کے لئے اتحاد اور تنظیم کی ضرورت ہے

اور اس کے ساتھ ساتھ یقین محکم اور عمل پیہم کی۔

ہمیں ابھی بہت سے کام سر انجام دینے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ پاکستان کی تمام معدنیات اور اس کے قدرتی وسائل کو استعمال میں لاکر اپنے ملک کو صنعتی ترقی دیں اور اسے دنیا کے اور ملکوں کے دوش بدوش لے آئیں۔ ہماری خواہش ہے کہ ہم ملکی تجارت کو فروغ دیکر قوم کو خوشحال بنائیں۔ ہماری آرزو ہے کہ ہم اپنے نظام تعلیم میں ترمیم و اصلاح کرکے اسے ہر ایک کے لئے عام کردیں اور ایک ایسا نظام تعلیم قائم کریں جو قوم کے افراد کو نہ صرف ذہنی ترقی میں مدد دے بلکہ ان کی روحانی پرورش بھی کرسکے سب سے زیادہ ہماری یہ کوشش ہے کہ ہم جلد سے جلد اپنے مہاجر بھائیوں کو پھر سے آباد کریں اور ان کو اور ان کے بچوں کو خوش اور فارغ البال دیکھیں۔

یہ یاد رکھئے کہ دنیا ہمیں ہمارے اعمال سے پرکھے گی۔ ہماری باتوں سے نہیں ہماری تمام تجویزیں خواہ وہ کتنی ہی شاندار ہوں بیکار ہیں اگر ان پر عمل نہیں ہوتا۔

اگر ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے تو دنیا اور خاص طور پر اسلامی دنیا کے لئے ہماری کامیابی ایک نعمت ہوگی اسلئے کہ ہم کسی کے بدخواہ نہیں ہیں اور ہر ایک کو اسکی مشکل میں حتی المقدور مدد دینے کے لئے تیار ہیں

اسلامی ممالک پر نظر ڈالیں تو ہر طرف مسلمانوں کو مصائب سے گھرا ہوا پاتے ہیں۔ شمال کی طرف نظر دوڑائیں یا جنوب کا رخ کریں۔ مشرق کی طرف متوجہ ہوں یا مغرب پر نظر ڈالیں ہم ہر طرف یہی دیکھتے ہیں کہ مسلمان اپنی آزادی اور اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کررہے ہیں۔ ان سب سے ہمیں ہمدردی ہے ہم ان کی پوری مدد اسی صورت میں کرسکتے ہیں کہ ہم خود مضبوط، متحد اور منظم ہوں۔

اگرچہ اسلامی ممالک سے ہمارے خاص تعلقات ہیں۔ ہم باقی دنیا کو بھی غیر نہیں سمجھتے۔ انسانی اخوت پر ہمارا ایمان ہے۔ ہم تمام دنیا کے انسانوں کو بھائی بھائی سمجھتے ہیں۔ ہم امن کے لئے اور تعمیری کاموں کے لئے ہر ایک سے تعاون کرنے کے لئے تیار ہیں۔ دنیا کا ہر ملک خواہ وہ ہمارا ہمسایہ ہو یا ہمارے ملک سے ہزاروں میل دور دنیا کے کسی گوشے میں واقع ہو خواہ اس کے لوگ کسی نسل کے ہوں اور کسی مذہب کے پیرو ہوں ہم سے سچی دوستی اور مدد کی امید کرسکتا ہے ہم کسی کا حق چھیننا نہیں چاہتے۔ اور ہم ظلم کے خلاف ہیں۔ اس وقت ہم دیکھ رہے ہیں کہ بعض لوگ ظلم سے اوروں کا حق غصب کرنے میں مشغول ہیں۔ ان کو عارضی فتح تو حاصل ہوسکتی ہے لیکن یقین رکھو کہ آخری فتح و نصرت صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو نیکوکار ہیں۔ یہ قانون قدرت ہے اور تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جو ملک ظلم و استبداد پر عمل پیرا ہوتا ہے آخر میں اس کا حشر سوائے تباہی کے کچھ نہیں ہوتا۔

ہمارا فرض ہے کہ ہم اللہ پر بھروسہ رکھ کر اپنے کام میں کوتاہی نہ کریں، ہمیشہ سچائی اور امن کے لئے کوشاں رہیں اور ظلم اور بے انصافی کی مخالفت کریں اور بوقت ضرورت صداقت کے لئے ظالموں کے خلاف اقدام لیں۔

آخر میں میں ہر پاکستانی سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس نازک وقت میں اپنے فرائض میں دوگنی ہمت اور اپنے عزم میں ثابت قدمی سے کام لے اور تمام فروعی چیزوں کو نظر انداز کرکے اپنی حکومت کی پورے خلوص، عقیدت اور محبت سے پیروی کرے اور کوئی ایسا فعل نہ کرے جس سے حکومت کو کسی قسم کا ضعف پہنچے۔

قوم نے مجھے جو خدمت سپرد کی ہے میں اس کے لئے شکر گذار ہوں اور سب کو یقین دلاتا ہوں کہ میں ملک اور قوم کی خدمت میں اپنے مال و جان قربان کرنے میں کوئی دریغ نہیں کروں گا اور اپنے محبوب قائد اعظم کے نقش قدم پر چلنے کی پوری کوشش کروں گا۔ خدا مجھے اس بات کی توفیق دے۔ پاکستان زندہ باد۔

حکیم سہسرامی

دو تاریخیں

اللھم صل علی سیدنا محمد النبی الامی
وعلی آلہ واصحابہ وبارک وسلم ابدا

سنہ ۱۳۶۷ھ

(۲)

کس کا ماتم ہے آج دنیا میں — سوگ میں کس کے ہیں یہ پیر و جوان
پھٹ پڑا آسمان غم سر پر — غمکدہ بن گیا ہے پاکستان
اٹھ گیا وہ بھی آہ دنیا سے — جو عدیم المثال تھا انسان
سید القوم قائد اعظم — چل بسے اس جہاں سے سوئے جنان
صدمۂ مرگ ناگہانی سے — دل میں ہے درد لب پہ آہ و فغان
تا قیامت ہو ان کی تربت پر — بارش فضل و رحمت یزدان

لکھ حکیم حزیں یہ سال وفات
انتقال امیر پاکستان
سنہ ۱۳۶۷ھ

آنریبل مسٹر لیاقت علیخاں

پیامِ استقلال

(نشر شدہ تقریر ۱۲ ستمبر ۱۹۴۸ء)

ہماری ملت کے رہبر، ہماری مملکت کے سردار اور پاکستان کے معمار آج ہم سے علیحدہ ہو گئے ہیں۔ ہمارے محترم اور محبوب قائد اعظم ملتِ اسلامیہ کو داغ مفارقت دے گئے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔ خدا کے فعلے کو یہی منظور تھا کہ اس وقت جبکہ پاکستان بلکہ دنیا کے مسلمانوں کو قائد اعظم کی رہبری اور دانش کی ضرورت تھی وہ ہم سے علیحدہ ہو جائیں۔

قدرتی بات ہے کہ یہ صدمہ ہم پر انتہائی غم طاری کر دے۔ لیکن اس رنج و الم کی گھڑی میں میں ہر پاکستانی سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس دلی درد سے متاثر ہو کر اپنے اوپر مایوسی کو مسلط نہ ہونے دے بلکہ اپنے دل کو مضبوط اور اپنے ارادے کو مستحکم کر کے اپنی زندگی کو پاکستان کی خدمت کے لئے وقف کر دے۔

مجھے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ تاریخ قائد اعظم کا شمار دنیا کی عظیم ترین ہستیوں میں کرے گی۔ دنیا میں کم آدمیوں کو یہ نصیب ہوا ہے کہ وہ ایک عظیم الشان کام کو ہاتھ میں لیں اور اپنی ہمت، عزم اور دانش سے اس کو اپنی زندگی میں ہی پروان چڑھتے دیکھیں۔ قائد اعظم نے نہ صرف پاکستان کا نصب العین مسلمانوں کے سامنے پیش کیا بلکہ اس کے لئے جدوجہد کر کے دنیا میں سب سے بڑی اسلامی ریاست قائم کر دی۔

قائد اعظم ان برگزیدہ ہستیوں میں سے تھے جو دنیا میں کبھی کبھی پیدا ہوتی ہیں۔ اپنی تمام سیاسی زندگی میں انھیں ملتِ اسلامیہ کی بہبودی منظور تھی اور وہ اسی کے لئے کوشاں رہے۔

قائد اعظم کی رہنمائی سے پہلے بھی مسلمان اپنی خامیوں سے خوب واقف تھے اور وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ جس انحطاط کو وہ پہنچ چکے ہیں اس سے نکل کر ترقی کی منزل پر گامزن ہوں۔ لیکن وہ واضح طور پر نہیں جانتے تھے کہ انھیں کیا کرنا چاہیئے۔ چنانچہ انھوں نے جتنی جدوجہد اور جو قربانیاں کیں وہ بار آور تو ثابت ہوئیں لیکن اس حد تک نہیں کہ وہ اپنے مقصد کو پالیں۔

قائد اعظم نے اپنی جہاں بیں اور دوررس نظروں سے دیکھ لیا کہ جب تک قوم کے سامنے منزلِ مقصود واضح طور پر نہ رکھ دی جائے اور جب تک انھیں ایک مرکز پر اور ایک ہی پرچم کے نیچے جمع نہ کیا جائے کسی چیز کے حصول کی امید بیکار ہے۔

قائد اعظم اس عظیم الشان کام کو سرانجام دینے کے لئے کئی خداداد قوتیں رکھتے تھے۔ اول تو ان میں ایک ایسا تخیل اور سیاست پر ایک ایسا عبور تھا جو باریک بیں ہونے کے باوجود گذشتہ اور آئندہ پر ایک ہی جست میں حاوی ہو جاتا تھا۔ مسلمانوں کی حالت کا جائزہ لینے کے بعد انھیں اچھی طرح سے معلوم ہو گیا تھا کہ ہماری منزلِ مقصود کونسی ہے اور ہمارا نصب العین کیا ہے۔

اس کے ساتھ ہی ان کو خدا نے ایک ایسا آہنی عزم عطا کیا تھا جو کسی مشکل یا رکاوٹ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے انھیں اور قوم کو آگے لئے چلا جاتا تھا۔ وہ اپنے ارادے پر ایسی مستقل مزاجی سے قائم رہتے تھے جو ہر مسلمان کے دل میں جوش اور مسرت کے جذبات کو ابھارتا تھا۔ ان کی قیادت میں ہر شخص یہ محسوس کرتا تھا کہ کوئی مشکل ایسی نہیں جس پر ہماری ملت قابو نہ پا سکے گی۔

اس فہم اور سیاست، اس عزم و ارادے کے ساتھ ساتھ قائد اعظم میں یہ خوبی بھی تھی کہ وہ دن رات کام کر سکتے تھے اور کوئی فروعی چیز ان کی توجہ مبذول نہیں کر سکتی تھی۔ قائد اعظم اولوالعزمی سے آخر دم تک دن رات ملت کے لئے کام کرتے رہے۔ وہ ملتِ اسلامیہ کے لئے ہمیشہ ایک مثال کا کام دے گی اور ہر فرد کے لئے مشعلِ ہدایت بنے گی۔

قائد اعظم کی ذات کے یہی کمالات تھے جنہوں نے ملتِ اسلامیہ میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اور ہر مرد، عورت اور بچے کے دل میں پاکستان کے حصول کے لئے ایک گہرا جوش پیدا کر دیا۔ اسی جوش سے متاثر ہو کر مسلمانوں نے ایسی قربانیاں کیں جن کی مثال تاریخ میں کم ملتی ہے اور پاکستان کو حاصل کیا۔

اب جبکہ قائد اعظم ہم میں نہیں ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اسی راستے پر اسی صراط المستقیم پر چلیں جو وہ دکھا گئے ہیں تاکہ ایک دن اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ سکیں۔ جو لوگ ہمت اور اولوالعزمی سے کام لیتے ہیں خدا کی مدد ہمیشہ ان کے شاملِ حال رہتی ہے۔

ہمارا فرض ہے کہ جس عظیم الشان عمارت کی بنیاد قائد اعظم نے اخوت، برابری اور آزادی کے اسلامی اصولوں پر رکھی ہے اس کو ہم آسمان تک لے جائیں۔

نہ صرف پاکستان قائم کرنے میں ہمیں بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑا بلکہ اس کے قیام کے بعد بھی ایک کے بعد دوسری مصیبت کا زیر بار ہونا پڑا۔

آج نہ صرف پاکستان ہی کے مسلمانوں کو مصائب سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے بلکہ تمام عالم کے مسلمان مشکلات سے گھرے ہوئے ہیں۔ اس وقت ہمیں قائد اعظم کی

رہبری کی بہت ضرورت تھی۔ اس وقت ضرورت تھی کہ ان کی فراست، ان کا تجربہ اور ان کا عزم قدم قدم پر ہمارے ساتھ ہوتا۔

لیکن اس صدمے سے ہمیں پریشان نہیں ہونا چاہیئے۔ ہمیں وہی کرنا چاہیئے جو قائد اعظم کرنا چاہتے تھے یعنی پاکستان کی حفاظت اور ترقی کیلئے دن رات کی کوشش اور محنت۔ آج ہم پر فرض ہے کہ اپنے تمام تفرقے مٹا کر ایک ہو جائیں ــــ اور اپنی جانیں پاکستان کیلئے وقف کر دیں۔

میں اور حکومت کے دوسرے وزرا نے آج پھر اپنی زندگیوں کو پاکستان کی خدمت کیلئے وقف کر دیا ہے۔ اور ہم خدائے تعالیٰ کے سامنے وعدہ کرتے ہیں کہ ہم ہمت اور عزم کے ساتھ اس کام کو جاری رکھیں جس کیلئے قائد اعظم نے پاکستان کے قیام کے بعد اپنی زندگی کو وقف کر دیا تھا۔ قوم کو قائد اعظم کی وفات سے جو صدمہ پہنچا ہے اور جو رنج سب پر طاری ہے اس کا میں خوب اندازہ کر سکتا ہوں لیکن خود مجھے جو صدمہ ہوا ہے اور میں جس کرب میں مبتلا ہوں اسکا پورا اندازہ شاید اور کوئی نہیں کر سکتا۔

پچھلے بارہ سال سے جبکہ مسلم لیگ کا نیا دور شروع ہوا مجھے قائد اعظم کا رفیقِ کار ہونیکا فخر حاصل ہے۔ ہمیں نشیب و فراز سے گزرنا پڑا اور کئی طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس رفاقت کے عرصہ میں جو التفات وہ مجھ سے برتتے تھے اور جس اعتماد کا ہمیشہ اظہار کرتے تھے اس کی یاد میری زندگی کا بہترین خزانہ ہے۔ قائد اعظم کی وفات سے میں اپنی زندگی میں ایک بہت بڑی کمی کا احساس کرتا ہوں لیکن اس فانی دنیا میں بقا صرف اللہ ہی کو ہے اور ہمارے لئے اسکے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم اللہ کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں۔ ہر پاکستانی کا فرض ہے کہ وہ تمام فروعی اور غیر ضروری چیزیں جو اس کو سیدھے راستے سے بھٹکا سکتی ہیں یا جو اس کی توجہ اور انہماک کو ہٹا سکتی ہیں نظر انداز کرے تاکہ ایسا نہ ہو کہ ہمارے بدخواہ یہ کہہ سکیں کہ ہم اس قابل نہ تھے کہ قائد اعظم ہمارے لئے اتنی قربانیاں کرتے۔

اپنے محبوب و محترم قائد اعظم کیلئے اپنی عقیدت اور محبت کے اظہار کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں کہ ہم اس نصب العین کو ایک لمحہ کے لئے بھی نظر انداز نہ کریں جو قائد اعظم نے ہمارے سامنے رکھا ہے اور پاکستان کو ایسی شاندار مملکت بنا دیں جیسی کہ وہ چاہتے تھے۔

قائد اعظم کی شخصیت ہمارے قومی استقلال کا بہترین مظہر تھی اور اسی قومی استقلال کے ذریعہ جو تعمیری کام حکومتِ پاکستان یا پاکستان کے افراد کرینگے وہ قوم کی طرف سے ہمارے محبوب رہنما کی یادگار رہیگا۔

ہم میں سے ہر ایک کو یہ جان لینا چاہیئے کہ آج ہماری ملت پر امتحان کا وقت ہے اور یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ یہ امتحان نہایت کڑا ہے۔ اس امتحان میں ہم اسی حالت میں کامیاب ہو سکتے ہیں کہ ہم میں سے ہر ایک جان و مال سے دریغ نہ کرتے ہوئے پاکستان کے تحفظ کیلئے اپنی انتہائی کوشش کرے۔ ہم اس امتحان میں ناکام نہیں رہ سکتے کیونکہ اسکے نتائج بہت ہولناک ہوں گے۔ اسکے علاوہ ہماری کامیابی تمام اسلامی دنیا کے لئے بھی اشد ضروری ہے۔

اپنی غمزدہ ملت کے نام میرا یہی پیغام ہے۔ میں سب سے پھر یہی درخواست کرتا ہوں کہ وہ مایوسی کو اپنے اوپر مسلط نہ ہونے دیں اور اپنی کوشش کو دوگنا کر کے ایک عظیم الشان اور شاندار پاکستان کے اس خواب کو جو قائد اعظم نے دیکھا ہے حقیقت میں بدل دیں۔ پاکستان زندہ باد

ماہ نو۔ کراچی

سالک الہاشمی (علیگ)

روحِ قائدؒ سے ......

شاعرِ ملت کا خطاب :۔

سلام اے رہبرِ ملت، سلام اے قائدِ اعظمؒ
سلام اے مخزنِ عظمت، سلام اے قائدِ اعظمؒ
تری ہستی سے رونق تھی گلستانِ شجاعت میں
ترے ذوقِ عمل سے روح تھی اعضائے ملت میں
ترے ہر قول سے چشمے اُبلتے تھے اخوت کے
ترے افعال سے گلشن مہکتے تھے حمیت کے
تری سیرت عقیدت کا خزانہ، عزم کا ملجا
تری لوحِ جبیں حسنِ عمل کا منبع و ماوا
ترے نظمِ عزائم سے سبق لیتی تھی اک دنیا
ترا حسنِ تدبر درس دیتا تھا سیاست کا
تری آفاقیت چھائی ہوئی تھی ذہنِ انساں پر
تری فطرت جلا کرتی تھی تہذیبِ مسلماں پر
ترا ہر لفظ دشمن کے لئے اک تازیانہ تھا
ترا جوشِ ارادت فی الحقیقت عارفانہ تھا
ترے نازِ شہنشاہی میں خودداری سی تھی گویا
تحکم میں بھی تیرے بوئے مشتاقی سی تھی گویا
ہمارے عقدوں کی روشنی تھیں تیری تقریریں
ہمارے قلبِ مضطر کا مداوا تیری تدبیریں
ہمارے آسمانِ علم پر تو مہرِ تاباں تھا
ہماری قوم کی تاریخ میں تو فخرِ انساں تھا •
تری ناوقت رخصت سے نہ جانے دل کی برنائی
ہمارے زندگی بر دوش نعروں میں کمی آئی
نظر آتا ہے کچھ لبریز سا ہمت کا پیمانہ
ہو چگونہ تنظیمِ ملت باز گردد حسنِ افسانہ؟

روحِ قائدؒ کا جواب :۔

شکیب و ہمتِ مردانہ آئینِ مسلمان است
وفا از ملت و ارضِ وطن ہم جزوِ ایمان است

ہز ایکسیلنسی الحاج خواجہ ناظم الدین

قائداعظم رحمتہ اللہ علیہ

قائداعظمؒ کی یاد میں "ماہِ نو" ایک خاص نمبر شائع کر رہا ہے اور مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں بھی اس خاص نمبر کے لئے کچھ لکھوں مجھے کئی برس تک قائداعظم کے قرب کا شرف حاصل رہا ہے۔ اور اپنے قرب کے اس زمانہ میں مجھے ان کی ذات گرامی کے متعدد اوصاف کے مشاہدہ کا موقع ملا ہے لیکن ان بہت سے اوصاف میں سے وہ خاص کر ایسے ہیں جنھوں نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ ایک اپنے بنیادی اصولوں پر اٹل رہنے کے معاملہ میں ان کا عزم راسخ اور دوسرے ان کی وہ بے تقصیر قوتِ فیصلہ جس کی مدد سے وہ پیش آنے والے واقعات کے متعلق لوگوں کے جذبات اور ردّعمل کا صحیح اندازہ لگا لیتے تھے۔ مجھے قائداعظم کی شخصیت کے اس پہلو سے ۱۹۴۵ء میں پہلی شملہ کانفرنس کے زمانہ میں بڑے حیرت انگیز انداز میں آگاہی ہوئی۔ کانفرنس کے زمانہ میں مسلم لیگ کے سارے زعما شملہ میں موجود تھے مسلم لیگی لیڈروں کے علاوہ مختلف فکر و خیال کے تقریباً سارے مسلمان سیاسی رہنما بھی وہیں تھے اور ان سب کی یہ خواہش تھی کہ اس وقت کوئی نہ کوئی سمجھوتہ ہو جائے۔ ان میں سے اکثر الگ الگ اور مل کر قائداعظم سے ملے اور ان کی رائے میں تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن قائداعظم ایک سخت چٹان کی طرح اپنے خیال پر جمے رہے اور اپنے پیش کئے ہوئے بنیادی مطالبات میں کسی قسم کی ترمیم پر تیار نہ ہوئے۔ اور آخر شملہ کانفرنس ناکام رہی۔ ہم سب کا خیال تھا کہ عوام پر اس کا بہت برا اثر پڑے گا لیکن بعد میں پیش آنے والے واقعات سے ثابت ہوا کہ ہم سب غلطی پر تھے اور صرف قائداعظم کی رائے صحیح تھی۔ شملہ سے واپسی پر میں انبالہ اُترا اور یہاں ہر شخص کو قائداعظم کے فیصلہ کی تعریف کرتے سنا۔ نہ صرف انبالہ میں، بلکہ سارے راستے میں نے یہی کیفیت دیکھی۔ ہر کس و ناکس قائداعظم کے فیصلہ کا مداح تھا۔ لیکن اس جذبہ کا نقطۂ عروج مجھے اس وقت نظر آیا جب میں نے لکھنؤ کے ایک عام جلسہ میں شرکت کی۔ یہاں ہر شخص کانفرنس کی ناکامی پر شاداں تھا اور ایک بھی آواز ایسی نہ تھی جو قائداعظم کے فیصلہ کو غلط کہہ رہی ہو۔

جیسا کہ بعد کے واقعات سے ثابت ہوا شملہ کانفرنس میں قائداعظم نے جو فیصلہ کیا تھا اس سے مسلمانوں کو ایک تازہ قوت اور ان کی تحریک کو ایک حیات نو ملی ؂

دو ملاقاتوں کی یاد

آنریبل خواجہ شہاب الدین

۱۹۳۶ء کے الکشنوں سے پہلے جب قائد اعظم مسلم لیگ پارلیامنٹری بورڈ کے قیام اور مسلم لیگ کی ازسرِ نو تشکیل و تنظیم کے سلسلہ میں کلکتہ تشریف لے گئے تو مجھے ان سے پہلی بار ملاقات کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ اس پہلی ملاقات کے بعد کئی ملاقاتیں اور ہوئیں اور ہر ملاقات میں پاکستان کے قیام کا ذکر آیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ قائد اعظم جب قیام پاکستان کا ذکر فرماتے تو اُن کی آواز پر یقین محکم غالب ہوتا۔ انہوں نے ایک دفعہ بھی اس سلسلہ میں مایوسی کا اظہار نہیں فرمایا۔ انہیں اپنے نصب العین پر پورا یقین اور اعتماد تھا اور اس نصب العین کے متعلق گفتگو کرتے وقت اس اعتماد اور یقین سے اپنے مخاطب کو بھی متاثر فرماتے تھے۔ قائد اعظم سے میری جتنی ملاقاتیں ہوئیں ان میں سے ہر ایک ایسی ہے جس کا تفصیلی ذکر سننے والوں کی حرارت ایمانی میں قوت پیدا کر سکتا ہے لیکن اب جب کہ قائد اعظم ہم میں نہیں ہیں ان کی دو ملاقاتوں کی یاد خاص طور پر میرے تصور کا بہت عزیز سرمایہ بن گئی ہے۔

ان میں سے پہلی ملاقات ۱۹۴۶ء کے الکشنوں سے پہلے کلکتہ میں ہوئی تھی قائد اعظم مرزا ابوالحسن اصفہانی صاحب کے مہمان تھے۔ الکشن کے سلسلہ میں گفتگو کرنے کے لئے قائد اعظم نے مجھے اور مرزا احمد صاحب اصفہانی کو یاد فرمایا۔ جس وقت ہم لوگ مرزا ابوالحسن صاحب کے ہاں پہنچے تو قائد اعظم کھانا کھا رہے تھے۔ کھانے کی میز پر سے اٹھ آئے اور علیحدگی میں جا کر گفتگو کی۔ اس دن بھی گفتگو کا موضوع پاکستان ہی تھا۔ اس گفتگو میں بھی قائد اعظم نے اسی یقین کے ساتھ پاکستان کے قیام اور استحکام کا ذکر فرمایا۔ ساری گفتگو ختم ہو چکی تو کہنے لگے۔ "میں جانتا ہوں کہ پاکستان تو ضرور بنے گا۔ مجھے اس کا پورا پورا یقین ہے ـــــ لیکن شاید میں خود نہ ہوں"! تقسیم کے بعد جولائی ۱۹۴۷ء میں دہلی میں قائد اعظم سے ملاقات ہوئی تو میں نے انہیں یہ جملہ یاد دلایا۔ سن کر مسکرا دیئے لیکن اب جب کہ وہ پاکستان کی بنیادیں مستحکم کر کے ابدی نیند سو رہے ہیں تو ان کا وہ جملہ رہ رہ کر میرے دل میں ٹیس پیدا کرتا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد مجھے بارہا قائد اعظم سے ملنے کے موقعے ملے۔ لیکن جو ملاقات مجھے ہمیشہ یاد رہے گی وہ جولائی کے مہینہ کی وہ ملاقات ہے جو ان سے زیارت جا کر ہوئی۔ کراچی کی سندھ سے علیحدگی کا مسئلہ درپیش تھا۔ اس سلسلہ میں قائد اعظم نے مجھے زیارت طلب فرمایا۔ میں اور وزارت داخلہ کے جائنٹ سکرٹری اپنے سارے عملہ کے ساتھ ۲۴ جولائی کو زیارت پہنچے۔ قائد اعظم زیارت کی ایک مختصر لیکن بے حد خوش منظر کوٹھی میں قیام فرما تھے۔ یہ چھوٹی سی کوٹھی محلوں میں رہنے والے قائد کے لئے بہت چھوٹی تھی اور اس میں اتنی گنجائش نہ تھی کہ ان کے علاوہ بھی کوئی ٹھہر سکتا لیکن قائد اعظم نے بکمال شفقت میرے لئے ایک کمرہ خالی کروا کے اُسے میری ضرورت اور میرے آرام کی ساری چیزوں سے آراستہ کروا دیا تھا۔ ہمارے ساتھ کے باقی عملے (خاص کر عباسی صاحب کیلئے) کہیں اور ٹھیرنے کا انتظام تھا لیکن قائد اعظم کا فرمانا تھا کہ یہ سب میرے مہمان ہیں اس لئے یہاں کے سوا اور کہیں نہیں رہیں گے۔ چنانچہ آس پاس کے سبزہ پر خیمے نصب کر کے مہمانوں کی آسائش کا پورا انتظام کر دیا گیا۔

اسی دن رات کو مجھے یاد فرمایا اور دیر تک کراچی کی علیحدگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے رہے اور پھر ارشاد فرمایا کہ کل صبح سارے کاغذات دیکھوں گا صبح کو وقت مقررہ پر ہم قائد اعظم کی خدمت میں پہنچے۔ اس دن ان کی طبیعت بہت اچھی تھی خاصے بشاش نظر آ رہے تھے۔ اپنے مطالعہ کے کمرے میں بیٹھ کر سب ضروری کاغذات ملاحظہ فرمائے۔ کراچی کی علیحدگی کے متعلق سرکاری اعلان کا جو مسودہ تیار کیا گیا تھا اس کی ایک ایک شق کو بڑے انہماک سے ملاحظہ فرمایا۔ ایک ایک لفظ پڑھ کر اس پر ردّ و قدح کی، ترمیمیں فرمائیں اور کہا کہ جس کاغذ پر یہ مسودہ ٹائپ کیا گیا ہے وہ بہت پتلا ہے اسے دوسرے اچھے کاغذ پر ٹائپ کروا کے مجھے دوبارہ بھجوا دیجئے۔ چنانچہ ترمیم شدہ مسودہ دوبارہ ٹائپ کیا گیا۔ جس دن ہم لوگ وہ مسودہ لے کر خدمت میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ طبیعت ناساز ہے۔ چنانچہ ہمیں سونے ہی کے کمرے میں طلب کیا گیا۔ میں اندر پہنچا تو دیکھتا ہوں کہ بستر پر دراز ہیں۔ تین طرف تکیوں کا سہارا ہے۔ لیکن اس حالت میں بھی کوئی ضروری کاغذ پڑھ رہے ہیں۔ آس پاس اور بہت سے فائل بھی رکھے ہیں۔ مجھے دیکھا تو مسکرائے۔ میں قریب ہی بیٹھ گیا۔ ترمیم شدہ مسودہ ملاحظہ کے لئے پیش کیا گیا تو پھر پہلے جیسے انہماک اور توجہ سے اس کے ایک ایک لفظ کو پڑھا اور جب پورا اطمینان ہو گیا تو دستخط ثبت فرما دئے۔ سرکاری کام ختم ہو گیا تو مجھ سے فرمایا کہ کچھ دن زیارت میں ٹھہرو۔ اچھی جگہ ہے۔ ذرا سیر ہو جائے گی۔ میں نے کراچی کی مصروفیتوں کا عذر کیا تو مسکرا دئے۔ کچھ دیر اور باتیں کرتے رہے۔ پھر میں نے اجازت چاہی اور چلا آیا۔ لیکن اس

(باقی صفحہ ۳۹ پر)

کھارادر، کراچی کا وہ مکان جس میں قائداعظم پیدا ہوئے اور جہاں انہوں نے بچپن کا زمانہ گذارا۔ عمارت میں جس جگہ انگریزی میں وزیر مینشن لکھا ہوا ہے، وہ مکان کا وہ حصہ ہے جہاں قائداعظم کا گھرانا رہتا تھا۔

قافلے میں غیر فریادِ درا کچھ بھی نہیں
اک متاعِ دیدۂ تر کے سوا کچھ بھی نہیں

آرزو لکھنوی

نقشِ لوح

شاد جو نیک ذات سے ربِّ انام ہو گیا
مل کے محمد و علی ایک ہی نام ہو گیا

چھا گئیں آ کے آرزو دونوں جہاں کی برکتیں
عقل کنیز ہو گئی ۔ ہوش غلام ہو گیا

قوم کی نبض انتشار رو بہ زوال دیکھ کر
چارہ گری کچھ ایسی کی ٹھیک نظام ہو گیا

جوشِ عمل بلا غرض حسنِ سلوک بے ریا
یوں ہوا وقف کارِ قوم فخرِ انام ہو گیا

ایک زبان ایک بات جس پہ لگے ہوئے تھے کان
منہ سے جو کچھ نکل گیا حکم وہ عام ہو گیا

بہرِ اطاعت آپ ہی جھک گئے سرکشوں کے سر
دارِ فتن تھا جو مقام دار سلام ہو گیا

کم تھا نہ خواب قوم کا خوابِ گرانِ مرگ سے
چونکے تو چونکے اس طرح سونا حرام ہو گیا

تیز سے تیز تر ہوا جوش میں جذبۂ عمل
فصل جو منزلوں کا تھا ایک ہی گام ہو گیا

مہلتِ دم زدن کہاں کثرتِ کار کے سبب
رات بھی ختم ہو گئی دن بھی تمام ہو گیا

فوقِ تدبرِ جناح مان گئے مدبرین
بحث تمام ہو گئی ختم کلام ہو گیا

جنگ بغیر فتحیاب ۔ خون بغیر سرخرو
یوں جو کبھی ہوا نہ تھا یوں ہی وہ کام ہو گیا

بن گئی سلطنت نئی ہو گئی قوم حکمراں
اُٹھ گیا کہہ کے کارکن کام تمام ہو گیا

۱۳۶۷ ہجری

سیماب اکبرآبادی

عزادارانِ قائدِ اعظمؒ سے!

اے عزادارانِ قائد، اے وفادارانِ قوم!
مرگِ قائد سے تمہیں شعلہ بجاں پاتا ہوں میں
جانتا ہوں موت کا اور زندگی کا راز میں
مَوت قائد کی، سیاسی زندگی کی موت ہے
ایسا منزل آشنا صدیوں میں آتا ہے کوئی
کارواں جس کی قیادت میں بھٹک سکتا نہیں
اُس نے آخر اپنا نصب العین پا کر دَم لیا
وہ جَری، وہ دُھن کا پکّا، صاحبِ عزمِ قوی
پھر بھی وہ انسان تھا، مجبورِ دستورِ فنا
مَوت کے آگے کوئی تدبیر چل سکتی نہیں
وقت یہ وہ تھا کہ منزل پر تھا میرِ کارواں
کام اپنا ختم کرکے ہوگیا وہ محوِ خواب،

اے غم اندوزانِ پاکستان واے اعیانِ قوم!
مضمحل، مایوس، زار و ناتواں پاتا ہوں میں
دونوں عالم میں رہا ہوں مائلِ پرواز میں
مَوت اُس کی، دوسرے لفظوں میں اپنی موت ہے
جس کو دیتی ہے مشیّت جرأتِ منزل رَسی
راستہ ہو پا شکن کتنا ہی، تھک سکتا نہیں
کاروانِ قوم کو منزل پہ لا کر دَم لیا
جس کے اِک ذہن رسا میں، دفترِ صد آگہی
زندہ رہتا گر ہزاروں سال، مرنا پھر بھی تھا
موت اپنے وقت پر آتی ہے، ٹل سکتی نہیں
ختم ہو جاتا تھا اس کا کام بھی آکر یہاں
پھر نہیں معلوم، کیوں ہے قوم میں یہ اضطراب؟

نَو بہ نَو ماحولِ منزل سے گزرنا چاہیئے
قوم کو اب اس سے آگے کام کرنا چاہیئے

اب صفِ ماتم اُٹھا دو، نوحہ خوانی چھوڑ دو ــــ موت ہے عنوان جس کا، وہ کہانی چھوڑ دو

زندگی کو کوندتی آواز سے آواز دو ــــ زندگی کے ہاتھ میں عزم و عمل کا ساز دو

نغمہ وہ چھیڑو کہ گونج اُٹھے فضائے کائنات ــــ وجد میں آجائے ہستی، رقص میں آئے حیات

تم تو منزل پر ہو، پھر یہ بے دلی و یاس کیوں؟ ــــ بیکسی کا اپنی، ہے ناحق تمہیں احساس کیوں؟

قائدِ منزل تمہیں کر کے امیرِ کارواں ــــ ہے تہیں میں خواب آسودہ، سرِ منزل یہاں

خواب بھی اُس کا ہے بیداری، جو ہو تم کو یقیں ــــ موت بھی اک زندگی ہے، تم ابھی واقف نہیں

جن کے دل زندہ ہیں، جب سما انھیں آتی ہی موت ــــ زندگی کا اک نیا عنوان بن جاتی ہے موت

تم اُسے زندہ سمجھ کر ہوش میں جب آؤ گے ــــ اُس کو ہر عالم میں اپنا ہم نشیں ہی پاؤ گے

قائدِ اعظمؒ کے جب دنیا میں زندہ ہیں اُصول ــــ اُن کا مرجانا کرے گی عقل پھر کیونکر قبول؟

قائدِ اعظمؒ کے جب نقشِ قدم ہیں دستیاب ــــ کارواں کو پھر ہے کیوں راہِ عمل میں اضطراب؟

قائدِ اعظمؒ کا ہر قول و عمل موجود ہے ــــ نالہ افشانی پھر اُن کی موت پر بے سود ہے

قائدِ اعظمؒ ہیں زندہ، اس یقیں سے کام لو ــــ جو کہے مُردہ اُنھیں، اس کا گریباں تھام لو

کر دو یہ اعلان، اب منزل کے ہم ہیں ذمہ دار ــــ قائدِ اعظمؒ کے پیرو، میرِ میداں، مردِ کار

ہیں تمہارے آب و گل میں قوتیں ایمان کی ــــ حوصلوں کے ساتھ ہو تکمیل پاکستان کی

جو چٹانیں راہ میں حائل ہوں، اُن کو توڑ دو ــــ زندہ دِل ہو، نام لینا بھی اجل کا چھوڑ دو

یہ تصرف قائدِ مرحوم کا کیا کم ہے آج
ہر جوانِ قوم گویا قائدِ اعظم ہے آج

نہال سیوہاروی

قائدِ اعظمؒ

پھر عروسِ شادمانی کے ہوئے مختل حواس
پھر نظر آتا ہے چہرہ زندگانی کا اُداس

ہر طرف اِک انتہائے جوشِ غم پاتا ہوں میں
شرق سے تا غرب طوفانِ الم پاتا ہوں میں

جب یہ عالم ہو تو پھر احساسِ غم ہے ناگزیر
آج ہے رنجیدہ رنجیدہ سا ہر طفلِ صغیر

وہ فضائے دہر پر طاری ہیں آثارِ ملال
اُلفتِ مادر بھلا بیٹھی ہے بچّوں کا خیال

ہے وفورِ حزن سے رنگِ جہاں بدلا ہُوا
یہ زمیں بدلی ہوئی ہے آسماں بدلا ہوا

گونجتی تھیں جو صداؤں سے وہ راہیں ہیں خموش
شور اُٹھتا تھا جہاں وہ درسگاہیں ہیں خموش

اب نہ ارمانوں کا وہ عالم، نہ وہ ارمان ہیں
گل کدوں میں خامُشی ہے، میکدے سنسان ہیں

راستوں پر ہے رواں اس شکل سے جمِّ غفیر
جیسے سرگرداں ہو کوئی کاروانِ بے امیر

عالمِ صبحِ درخشاں پر گمانِ شام ہے
روشنی سورج کی ہے لیکن برائے نام ہے

ڈھونڈنے والے یہ کہتے ہیں کہ پائیں ہم کہاں
تو کہاں ہے اے ہمارے قائدِ اعظمؒ کہاں

ایک تو نے خوابِ غفلت سے جگایا قوم کو
شاہراہِ سربلندی پر لگایا قوم کو

ایک تھی درسِ بقا ہنگامہ پیرائی تری
ایک زندہ کر گئی ہم کو مسیحائی تری

ایک تو نے جذبۂ ملّت کو طوفانی کیا
مورِ بے مایہ کو آگاہِ سلیمانی کیا

ایک تو سمجھا سمجھنے کی طرح حالات کو
صبح کی تابانیاں بخشیں اندھیری رات کو

قوم تھی بارِ جہاں میں صورتِ برگِ دژم
دِل ہلا دیتے تھے جس کا نرم جھونکوں کے ستم

قوم تھی وہ ناشناسِ شیوۂ اہلِ یقیں
سجدہ ریزِ آستانِ غیر تھی جس کی جبیں

قوم اُن بکھرے ہوئے ذرّات کا تھی اِک جہاں
کھیلتی رہتی تھیں جن ذرّوں سے سرکش آندھیاں

قوم تھی جو ہمگنانِ دہر میں گردوں وقار
خود زبوں حالی کو تھی اس کی زبوں حالی سے عار

جاگ اٹھی قوم تیرے نعرۂ بیباک سے
زندگی کا شور اُٹھا خفتگانِ خاک سے

حکمراں جن پر ہجومِ خواب تھا وہ ڈھل گئیں
تو نے یوں ملّت کو چونکایا کہ آنکھیں کھل گئیں

تھے صفِ زاغ و زغن میں جنکو سرگرمِ شمار
تو نے اُن شاہیں نژادوں سے کہا ہاں ہوشیار!

ایک ہی انداز کیوں ہو ہر کسی کے واسطے
قوم شیروں کی نہیں ہے روبہی کے واسطے

اجتماعِ قوم سے تو یوں ہوا گرمِ خطاب
"اے اسیرانِ سراب اے آرزو مندانِ آب!

ایک تم سے ہے دوبالا عزّ و شانِ تاریخ کی
کارنامے ہیں تمہارے داستاں تاریخ کی

ایک محکومی ہے تم کو باعثِ صد ننگ و عار
ایک تم عزمِ محمّدؐ کی ہو زندہ یادگار

قہر ہے امدادِ غیروں کی تمہیں درکار ہو
قسمتِ ملّت کے تم، ہاں صرف تم معمار ہو

آسرا بیگانہ قوموں کا ہے نادانو! فضول
تم کو مل جائیں گے کیا اغیار کے دامن سے پھول

ملّتِ حق کی روایاتِ کہن دہراؤ تم
منتشر کب تک رہو گے، متّحد ہو جاؤ تم

جذبۂ ہمت ہے فتح و کامرانی کی دلیل
آگ بنجاتی ہے گلشن، ہو اگر عزمِ خلیلؑ

قوم کو ہوتا ہے اپنی ذات پر جب اعتبار
قوم ہوتی ہے مہیب و خشمگیں دریا سے پار

یہ جہاں رہوارِ ہمّت کے لئے میدان ہے
اوّلیں منزل جسے سمجھو وہ پاکستان ہے"

ایک تو ہے سرزمینِ پاک میں سرگرمِ خواب
قوم کو تیرے "بڑھاپے" سے ملا تازہ "شباب"

راحتِ ساحل نتیجہ ناخدائی کا تری
ارضِ پاکستاں ہے ثمرہ، رہنمائی کا تری

تا بقائے زندگی ادوار جتنے آئیں گے
تیرے روشن کارناموں کو وہ سب دُہرائینگے

تیری ہستی کر گئی جو کام، مٹ سکتا نہیں
صفحۂ عالم سے تیرا نام مٹ سکتا نہیں

مجتبیٰ حسین

قائدِ اعظم رح

موت سے کس کو رستگاری ہے — آج وہ کل ہماری باری ہے"
پھر بھی دل کو نہیں ہے صبر و قرار — لب پہ آہیں ہیں، اشک جاری ہے
زندگی کھو گئی خلاؤں میں — سربلندی نہ خاکساری ہے
ولولے سرد، حوصلے مجروح — سینہ زخمی ہے، ضرب کاری ہے
کوئی عزت، نہ کوئی حشمت ہے — کوئی ذلت، نہ کوئی خواری ہے
کوئی منزل، نہ کوئی راہی ہے — کوئی رہبر نہ راہ داری ہے
اب نہ سود و زیاں نہ عقل و جنوں — بس رگوں میں جمود ساری ہے
بام و در، کوچہ و بازار — سب ہیں سنسان، سوگ طاری ہے
شمع خاموش، انجمن بے ہوش — تارے بے نور، رات بھاری ہے
نالے لب تک بھی اب نہیں آتے — بے قراری سی بے قراری ہے

دفترِ ہست و بود ہے برہم
اُٹھ گیا آج قائدِ اعظم

لذتِ ہوش و بے خودی نہ رہی — ناز تھا جس پہ، زندگی نہ رہی
زخم کچھ بھر چلا تھا غربت کا — اٹھ گیا دوست، دل ہی نہ رہی
جس کی بیگانگی پہ شیدا تھے — آہ وہ رسمِ دوستی نہ رہی
وہ مجاہد وہ سرفروش کہاں — سطوتِ عزمِ آہنی نہ رہی
ایک روحِ عظیم و جسم نحیف — عظمتِ ذکرِ آدمی نہ رہی
وہ حقیقت شناسیاں نہ رہیں — راہ و منزل کی آگہی نہ رہی
وہ جوانی کے ولولے نہ رہے — وہ بڑھاپے کی پختگی نہ رہی
وہ بصیرت وہ فکرِ تابندہ — عقل کی نرم چاندنی نہ رہی
تجھ کو شمعِ مزار کیا معلوم — بزمِ عالم کی روشنی نہ رہی

"ایک روشن دماغ تھا نہ رہا
ملک میں اک چراغ تھا نہ رہا"

کیسے منزل کا اب نشاں پائیں — تیرگی میں الجھ گئیں راہیں
کون جانے گا دردِ مہجوری — حالتِ زار کس کو سمجھائیں
"لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں — اہلِ میت جنازہ ٹھہرائیں
مرنے والے ہمیں تو چھوڑ چلا — ہم کہاں جائیں کس طرف جائیں

تو ہمارے دلوں کی ہمت تھا — اب کہاں سے وہ گرمیاں لائیں
تیرا اک حرفِ گرم جانِ عمل — جس کے تیشے سے کوہ تھرائیں
سب کی تقریر سُن چکے ہیں ہم — "ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں"
تو وہ معجز بیاں مقرر تھا — نغمگی میں بدل گئیں آہیں
تیرا ہر لفظ ذوالفقارِ علیؓ — کوئی تجھ سا اگر ہو دکھلائیں؟
لوگ کیوں کر نہ تجھ کو پیار کریں — تو ہی کہہ دے نہ کس طرح چاہیں

حسرتِ دید ناتمام رہی
ساقیا! بزم تشنہ کام رہی

دستِ پُرشوق تھک کے چور ہوئے — جام ہونٹوں سے لگ کے دور ہوئے
ہم کو پینے کا ڈھنگ آ نہ سکا — ہم ابھی تک نہ باشعور ہوئے
میکدے کا بھی فیض بند ہوا — تیرہ بختی تھی، بے سرور ہوئے
اک نظر تیری اٹھ گئی تھی کبھی — کتنے نازاں و پُرغرور ہوئے
چھوٹ دل پر تجلیوں کی پڑی — تیرگی میں چراغِ طور ہوئے
آج وہ آفتاب ڈوب گیا — تا ابد سوگوارِ نور ہوئے
تیری الفت میں گھر لٹا بیٹھے — تیری الفت میں ناصبور ہوئے
آج ہر بات پر خموش ہے تو — ہم سے کیا جرم، کیا قصور ہوئے؟
حاصلِ زیست بندگی سمجھے — عاشقِ دوست ہاں ضرور ہوئے!
منہ چھپا کر کفن میں روٹھ گئے — یوں خفا ہم سے کیوں حضور ہوئے

اپنے دامن کو خود ہی چاک کیا
ہم نے تجھ کو سپردِ خاک کیا

عظمتِ قوم آج تیرہ و تار — عظمتِ قوم آج دہر نگار
عظمتِ قوم سرنگوں ہے آج — عظمتِ قوم جبرئیل شکار
عظمتِ قوم خشکیٔ صحرا — عظمتِ قوم قلزمِ ذخار
عظمتِ قوم جنسِ بے مایہ — عظمتِ قوم گرمیٔ بازار
عظمتِ قوم رہبرِ خستہ — عظمتِ قوم قافلہ سالار
عظمتِ قوم بازوئے کمزور — عظمتِ قوم اک اُپی تلوار
عظمتِ قوم خاموشی برلب — عظمتِ قوم مایۂ گفتار
عظمتِ قوم مردہ و بیہوش — عظمتِ قوم زندہ و بیدار
عظمتِ قوم تیرے ساتھ گئی — عظمتِ قوم تیری لوحِ مزار
یاد تیری ہے آنسوؤں کی نمی — یاد تیری ہے حوصلوں کا اُبھار

ملک کی روح، فاتحِ ایام
باعثِ زندگی ہے تیرا نام

سر عبدالقادر

قائداعظم رحمتہ اللہ علیہ

زندگی پائی تو ایسی کہ ایک نیم مردہ قوم کے قالب میں نئی روح پھونک دی۔ اور مرگ دیکھی تو ایسی کہ ہر لحاظ سے قابلِ رشک ہے۔ ع "ہمہ گریاں بوند و تو خنداں" کی پوری تصویر۔

بہت سے بڑے آدمیوں کے جنازے ہماری عمر میں اٹھے۔ بہت سی بڑی شخصیتوں کے گذر جانے پر اُن کے مداحوں کو ہم نے روتے اور بلکتے دیکھا۔ مگر جس شان سے قائداعظم کا جنازہ اٹھا۔ اور جس دِلی اندوہ و غم کا اظہار کروڑوں بندگانِ خدا نے پاکستان کے ہر گوشے میں کیا ہے، اس کی مثال ملنی محال ہے۔

پرانے زمانے میں ملک اطالیہ میں ایک عجیب رسم تھی کہ کسی مرنے والے کے عزیزوں اور دوستوں کے آنسو جمع کئے جاتے تھے۔ میں نے جب اثنائے سیاحت میں پمپیائی کا مشہور مگر اجڑا ہوا شہر دیکھا تو وہاں بعض گھروں کی الماریوں میں چھوٹی چھوٹی شیشیاں نظر آئیں جن میں پانی سا بھرا ہوا تھا۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ مرنے والے کے ماتم میں اس کے جو دوست شریک ہوتے تھے وہ اپنے آنسو شیشیوں میں ٹپکاتے تھے۔ اور جس کے مرنے پر بہت سی شیشیاں آنسوؤں سے پُر ہوتی تھیں، ان کی تعداد کی کثرت اس کی ہر دلعزیزی کا معیار ہوتی تھی۔

اگر ہماری قوم میں کوئی ایسا رواج ہوتا اور وہ سب آنسو جو مسلمانوں نے جا بجا اس پُر افسوس واقعہ پر بے اختیار بہائے ہیں جمع کئے جا سکتے تو ایک طوفان اشک بپا ہو جاتا۔

اس صدمہ کے غم میں تمام عالم اسلام ہمارے ساتھ شریک ہے اور دوسرے ملکوں کے بادشاہوں اور ارباب حکومت نے بھی ہمارے ساتھ گہری ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔ بیشمار ختم قرآن مجید کے گئے ہیں۔ اور مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کی گئی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم کی مخلصانہ خدمات بارگاہ ایزدی میں مقبول ہوئی ہیں۔ اب خدا ہمیں توفیق دے کہ ہم اس عظیم الشان کام کو جاری رکھیں۔ جس کی بنیاد قائداعظم نے ڈالی ہے۔

اس وقت ہر مسلمان کے دل میں یہ خواہش ہے کہ اپنے محبوب رہنما کے متعلق کچھ باتیں سنے جو ان کے کسی نیازمند کی ذاتی واقفیت یا مشاہدہ کا حصہ ہوں۔ مجھے یہ شرف حاصل رہا ہے کہ میں بارہا ان سے ملا۔ اُن میں سے دو تین مواقع قابل ذکر ہیں غالباً جو دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے۔

سب سے بڑا موقعہ وہ تھا جب مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ۱۹۲۶ء میں بمقام دہلی ہوا۔ اور میں اور جناب محمد علی جناح صاحب دو تین دن ایک کیمپ میں فروکش تھے۔ مجھے انہوں نے ازراہ کرم اس اجلاس کی صدارت کے لئے تار دے کر بلایا۔ اور میں حاضر ہو گیا حُسن اتفاق سے ان دنوں مجھے مرحوم کی طبیعت کا ایک رنگ دیکھنے کا موقعہ ملا جس کا مجھے اس سے پہلے احساس نہ تھا۔ میں ان کی اعلیٰ قانون دانی اور فصاحت و بلاغت سے واقف، اور ان کی بے نظیر قابلیت کا مدّاح تھا، مگر یہ نہ جانتا تھا کہ اس لباس کے نیچے، جو اس زمانے میں ان کے زیبِ بدن تھا، ایک انتہا درجے کا مومن دِل پوشیدہ ہے۔ جو ملت اسلام کے درد سے بھرا ہوا ہے۔ پہلے جلسے کے اختتام کے بعد، مرحوم شام کے کھانے سے فارغ ہو کر میرے کمرے میں تنہا تشریف لائے اور مجھے یہ بتایا کہ ان کا ارادہ ہو رہا ہے کہ ہندوستان سے نقلِ مکانی کر کے لندن میں اقامت پذیر ہوں۔ اور وہاں پریوی کونسل کے مقدمات میں بھی پیش ہوتے رہیں اور ملک ہند کی آزادی کے لئے بھی کوشش کرتے رہیں۔ اور اس غرض سے وہ ایک ایسے شخص کی تلاش میں ہیں جو مسلم لیگ کا کام ان کی غیر حاضری میں سنبھال لے۔

یہ بات کہتے وقت ان کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ آیا میں اس خدمت کے لئے آمادہ ہو سکتا ہوں۔ بدقسمتی سے میرے ذاتی حالات اس وقت ایسے تھے کہ میں اپنے آپ میں یہ بارِ امانت اٹھانے کی طاقت نہیں پاتا تھا۔ میں نے نہایت عجز سے معذرت کرتے ہوئے یہ کہا کہ میں ایک کثیر العیال آدمی ہوں۔ اور فکرِ معاش پر مجبور ہوں۔ اور اب سیاسی کام ایسا نہیں رہا کہ اور کاموں کے ساتھ نبھ سکے۔ اپنی معذوری بیان کرتے وقت میں نے ان کی خدمت میں بہ ادب یہ مشورہ پیش کیا کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ مسلم لیگ پوری کامیابی حاصل کرے۔ تو آپ سے بہتر اس کو کوئی نہیں سنبھال سکتا۔ آپ یا ولایت جانے کا ارادہ ترک فرمائیں یا کوئی عارضی انتظام اپنی غیر حاضری کے زمانے کے لئے کر جائیں اور پھر واپس آ کر لیگ کو سنبھالیں۔ اس وقت تو اس جواب سے وہ قدرے مایوس نظر آئے مگر بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا

کہ لیگ کے لئے ان کا اس کو سنبھالنا لیگ کی زیست، اور حد سے زیادہ کامیابی کا موجب ہوا۔ میں محمد علی جناح مرحوم کے اس پُر درد چہرے کو نہیں بھول سکتا جو میں نے اس شب کو دیکھا اور نہ ان آنسوؤں کو جو اس وقت ان کی چشم پُر آب میں نے دیکھے تھے۔ پاکستان اسی پُر درد دِل کا ایک کرشمہ ہے اور اُنہی آنکھوں کے آنسو ہیں جنہوں نے پاکستان کے چمن کی آبیاری کی ہے۔

ایک اور نشست اور اس نشست کی گفتگو میرے ذہن میں موجود ہے۔ دہلی میں مرکزی اسمبلی کے جلسے ہو رہے تھے۔ سر محمد یعقوب مرحوم نے جو اسمبلی کے نائب صدر تھے جناب محمد علی جناح کے اعزاز میں چند دوستوں کو دوپہر کے کھانے پر بلایا۔ میں بھی اتفاقاً اس زمانہ میں وہاں تھا۔ مجھے بھی انہوں نے یاد فرمایا۔ وہاں اثنائے گفتگو میں جناب محمد علی جناح مرحوم نے قدرے دکھی ہوئی آواز میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "سیاسیات کی چالیں شطرنج کی چالوں سے بہت ملتی جلتی ہیں۔ میری قوم نے ایک طرف تو یہ کام میرے سپرد کیا ہے کہ میں ان کی جانب سے بطور ایک سیاسی شاطر کے بساطِ شطرنج بچھاؤں اور چالیں چلوں اور دوسری طرف میری قوم یہ اصرار کرتی ہے کہ میں ساتھ ہی بتاتا جاؤں کہ یہ چال کیوں چلی گئی تھی۔ بتاؤ کہ یہ کھیل اس طرح کھیلا جا سکتا ہے؟" میں نے کہا: "نہیں"۔ اس پر انہوں نے فرمایا کہ "قوم سے کہہ دیجئے کہ اگر انہیں اپنے شاطر پر بھروسا ہے تو مجھے چال چلنے دیں اور مجھ سے ہر چال کا سبب نہ پوچھیں کہ کیوں۔ ورنہ کوئی اور شاطر ڈھونڈ لیں"۔

شاطر تو ان سے بہتر نہ کوئی تھا۔ نہ قوم کو ملا۔ مگر خدا جزا دے جانباز شاطر کو۔ کہ ہم سے جدا ہونے سے پہلے یہ دکھلا گیا۔ کہ اس نے جو بازی قوم کی طرف سے لگائی تھی۔ اسے جیت کے وہ دنیا سے رخصت [illegible] اس نے اپنی صحت بھی اسی بازی کی نذر کر دی۔

ایک اور دلچسپ بات جو میں نے مرحوم سے سنی، سنانے کے قابل ہے۔ ۱۹۴۳ء میں مجھے کوئٹہ جانے کا اتفاق ہوا۔ قائداعظم بھی ان دِنوں وہاں مقیم تھے اور ان کے اعزاز میں پارٹیاں اور جلسے ہو رہے تھے۔ ایک دن ایک بڑی پارٹی چائے کی ہو رہی تھی۔ میں قائداعظم والی میز پر تھا۔ وہاں کچھ ذکر اُن ملاقاتوں کا آگیا جو اس سے پہلے قائداعظم اور لارڈ لنلتھگو وائسرائے ہند میں ہوتی رہی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ ایک دن وائسرائے نے ان سے یہ کہا کہ اگر وہ یہ ضد چھوڑ دیں کہ پاکستان بننا چاہئے اور مسلمان علیحدہ قوم تسلیم کئے جانے چاہئیں۔ تو وہ فریقِ ثانی کو مائل کر سکتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو بہت سی مراعات دے۔ قائداعظم صاحب نے کہا کہ اس کا جواب وہ آئندہ ملاقات میں دیں گے۔ جب چند روز بعد پھر اُن کی ملاقات کا دن آیا تو قائداعظم ایک چھوٹی سی چیز جیب میں ڈال کر وائسرائے کے ہاں گئے۔ وہ چیز تھی پاکستان کا ایک نقشہ جس میں وہ صوبجات جن میں مسلمانوں کی آبادی کی کثرت تھی۔ سبز رنگ کے دکھائے گئے تھے۔ یہ نقشہ ایک گیارہ سال کی لڑکی نے ریشمی رومال پر سوزن کاری سے کاڑھا تھا۔ قائداعظم نے وائسرائے کو بتایا کہ یہ لڑکی ایک پرانی وضع کے مسلمان گھر میں روہیلکھنڈ میں پیدا ہوئی۔ گھر میں پردہ کی سخت پابندی تھی۔ اس لئے یہ لڑکی کسی مدرسے میں پڑھنے کے لئے نہیں بھیجی گئی۔ اس نے نہایت محنت سے یہ نقشہ بنایا اور اس کی آرزو تھی کہ یہ نقشہ خود قائداعظم کی خدمت میں پیش کرے۔ جب مرحوم دورہ کرتے ہوئے اس شہر میں پہنچے۔ جہاں یہ لڑکی رہتی تھی تو اس کا باپ قائداعظم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور ان سے یہ درخواست کی کہ وہ کچھ وقت نکال کر ان کے ہاں چلیں۔ جہاں یہ لڑکی یہ تحفہ ان کی خدمت میں پیش کرنا چاہتی ہے۔ قائداعظم نے باوجود کثرتِ مصروفیات اس لڑکی کی درخواست کو منظور کیا اور اس کے گھر تشریف لے گئے اور وہاں اس کے ہاتھ سے یہ تحفہ قبول کیا اور اپنے پاس سنبھال کر رکھ لیا۔ جب انہوں نے یہ نقشہ وائسرائے کو دکھایا تو وہ بنانے والی کی دستکاری کی تعریف کرنے لگا۔ قائداعظم نے جب اسے لڑکی کی عمر بتائی اور اس کی گھریلو زندگی کا حال سنایا تو اسے بہت تعجب ہوا۔ اس پر قائداعظم نے وائسرائے سے کہا کہ آپ سمجھتے ہیں کہ میں لوگوں کو سکھاتا ہوں کہ وہ پاکستان مانگیں۔ حالانکہ اصلیت یہ ہے کہ یہ خیال اس وقت کے نوخیز طبقے کے رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے۔ اور میں جب اس پر زور دیتا ہوں تو فقط اپنی قوم کے خیالات کی ترجمانی کرتا ہوں۔ قائداعظم فرماتے تھے کہ لارڈ لنلتھگو اس نقشے سے بہت متاثر ہوئے اور ان پر واضح ہو گیا کہ پاکستان کا تخیل پردہ والی عورتوں اور چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کے دلوں تک پہنچ گیا ہے۔ اور اب یہ خیال بدلا نہیں جا سکتا۔

قائداعظم اب ہمیں داغِ مفارقت دے گئے ہیں مگر ان کی یاد ہمارے دِلوں میں تازہ ہے اور رہے گی اور ان کا طرزِ عمل ہمارے لئے مشعلِ ہدایت ہے۔ آؤ اللہ کا نام لے کر آگے قدم بڑھائیں اور جو راہ انہوں نے نکالی ہے اس پر گامزن ہوں۔

"میں پُر جوش طریقے پر آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ آپ سب مل کر قدم بڑھائیں اور پورے خلوص کے ساتھ متحد ہو جائیں۔ آپ مسلم لیگ کے حامی نہیں کیونکہ صرف مسلم لیگ ہی نے اس پاکستان کو حاصل کیا ہے جس طرح پاکستان حاصل کرتے وقت آپ سب مل بیٹھے تھے اسی طرح ہمیشہ رہیں۔ یقین رکھیں کہ کبھی کبھی غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں۔ آپ بہت سی غلطیوں کا ارتکاب ہوتے ہوئے دیکھیں گے لیکن انہیں دور کرنے کی کوشش کریں، دوستانہ طریقے سے، معاندانہ جذبے کے ساتھ نہیں۔ آپس میں چپقلش کی صورت پیدا نہ کریں، جذبۂ اخوت کارفرما ہو"

(قائداعظم ——— پشاور ——— ۳۰ اپریل ۱۹۴۸ء)

قائد اعظمؒ کے سرکاری مشاغل

مجلسِ آئین ساز کے صدر کی حیثیت سے پاکستان اسمبلی میں پہلا دن ←

↑ وزیر اعظم کے ساتھ مملکت کے امور پر گفت

| (اوپر دائیں طرف) سرکاری فائلوں کا مطا

اسٹیٹ بنک آف پاکستان کے افتتاح کے لئے
یہ قائد اعظمؒ کا آخری سرکاری جلوس ۔
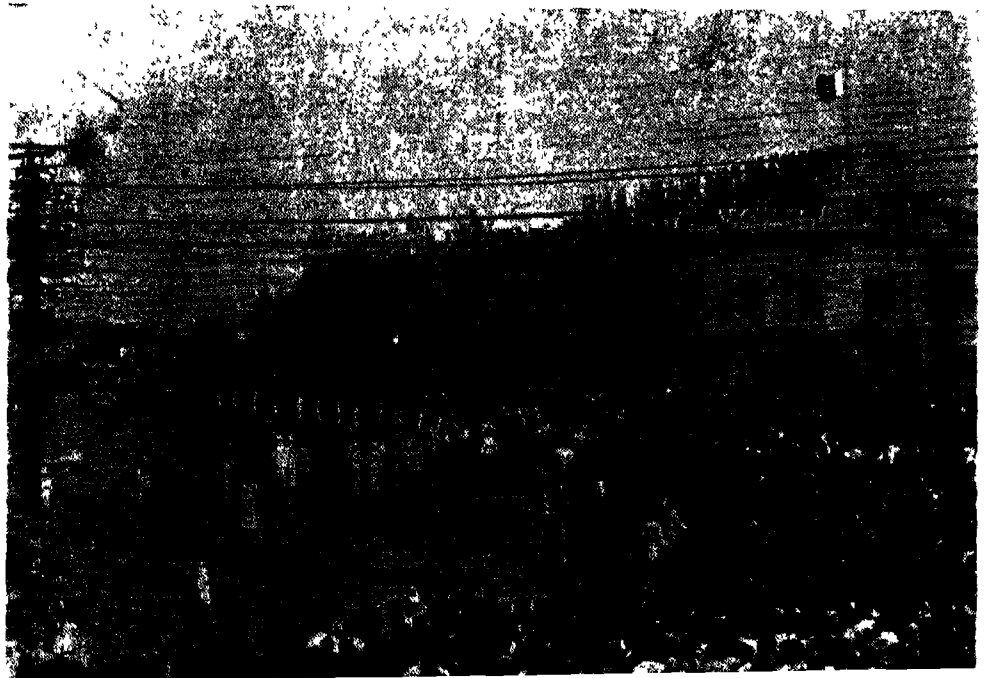
قائدِ اعظمؒ کے بعض دوسرے مشاغل

پاکستان کے اولمپک کھیلوں کے منتظمین کے ساتھ

پاکستان میں پہلی عید کی نماز کے بعد قائد اعظم خطبہ سُن رہے ہیں۔

(اوپر بائیں طرف) وزیر اعظم اور بیگم لیاقت علی خاں کی دعوت میں شرکت کے لئے تشریف لے جا رہے ہیں۔

دعوت کے دن وزیر اعظم سے گفتگو میں مصروف ہیں۔

ڈاکٹر عبدالحق

قائد اعظم اور اردو

میں سیاسی تحریکوں سے ہمیشہ الگ رہا۔ اگرچہ انڈین نیشنل کانگریس، مسلم لیگ، خلافت وغیرہ میرے سامنے وجود میں آئیں اور ان کے ہنگامے بھی دیکھے لیکن ان میں سے کسی جماعت سے کبھی سروکار نہ رکھا۔ ایک تو اس لئے کہ میں سلسلۂ ملازمت میں تھا، دوسرے میں اس کا اہل بھی نہیں۔ قائد اعظم محمد علی جناح سیاست اور قانون کے مرد میدان تھے۔ ان سے ملنے جلنے یا بات چیت کا شرف انھیں کو حاصل ہو سکتا تھا جو سیاست یا قانون سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے مجھے کبھی ان سے ملنے کا اتفاق نہ ہوا۔

۱۹۳۷ء میں شملے سے ان کا ایک خط میرے نام آیا جس کا مضمون یہ تھا کہ مجھے یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ آپ قومی کام کر رہے ہیں۔ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ ان دنوں لکھنؤ میں مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہونے والا ہے اگر آپ وہاں آ کر مجھ سے ملیں تو ممنون ہوں گا۔ اس کے ایک دو روز بعد ہی علامہ ڈاکٹر اقبال اور میاں بشیر احمد بیرسٹر ایٹ لا، ایڈیٹر ہمایوں کے خط آئے جن میں بہ تاکید یہ لکھا تھا کہ میں ضرور مسٹر جناح سے ملوں۔ میرا قیاس ہے کہ ملاقات کی یہ تحریک ڈاکٹر اقبال نے کی ہوگی۔ ان کو شاید یہ اندیشہ تھا کہ میں اہل کانگریس یا ہندی والوں سے کوئی سمجھوتہ نہ کر لوں جو اردو کے حق میں مفید نہ ہو۔

اتفاق سے انھیں دنوں میرے مہربان عبدالرحمٰن صدیقی صاحب حیدرآباد میں میرے مہمان تھے۔ وہ مسلم لیگ کونسل کے ممبر تھے اور اس کے اجلاس میں شریک ہونے کے لئے آئے تھے۔ ان کی رفاقت مجھے بہت غنیمت معلوم ہوئی۔ روانگی سے پہلے بعض احباب کے مشورے سے ہم نے ایک رزولیوشن بھی اردو کے متعلق تیار کر لیا تھا جو ہم مسلم لیگ کی کونسل میں پیش کرنا چاہتے تھے۔

لکھنؤ پہنچ کر میں صدیقی صاحب کے ہمراہ مسٹر جناح سے ملا۔ انھوں نے سلام علیک کے بعد پہلا سوال یہ کیا کہ آپ ہم سے تعاون کیوں نہیں کرتے۔ میں نے کہا کہ آپ کچھ کر ہی نہیں رہے تو تعاون کس سے کروں (میرا اشارہ اردو کے متعلق تھا) فرمایا کہ آئندہ ہم کریں گے۔ تو میں نے کہا میں ضرور تعاون کروں گا۔ پھر میں نے رزولیوشن کا مسودہ ان کے ملاحظہ کے لئے پیش کیا جسے انھوں نے شروع سے آخر تک پڑھا اور پسند فرمایا۔

دوسرے روز کونسل کا اجلاس تھا۔ میں نہ تو لیگ کا ممبر تھا نہ کونسل کا، اس لئے کوئی رزولیوشن پیش نہ کر سکتا تھا۔ اس کام کو عبدالرحمٰن صدیقی صاحب نے اپنے ذمے لیا۔ میں بھی کونسل کے اجلاس میں تماشا دیکھنے گیا کہ اس ریزولیشن کا کیا حشر ہوتا ہے۔ ارکان کونسل کی صفوں کے پیچھے ایک طرف جا بیٹھا۔ اتنے میں بنگال کے نامور عالم اور مسلم لیگ کے پرجوش رکن اور بنگال لیگ کے صدر مولانا اکرم خاں اور دوسرے بعض بنگالی ارکان کونسل میرے پاس آ بیٹھے اور کہنے لگے کہ اب کے آپ کلکتہ ضرور آیئے ہم اردو کی اشاعت و ترویج میں پوری مدد دیں گے۔ اب پہلے سی حالت نہیں رہی ہے۔ وہاں کے لوگ اردو کی طرف مائل ہوتے جاتے ہیں۔ یہ اس قسم کی باتیں کر رہے تھے اُدھر اُردو کا ریزولیشن پیش ہو رہا تھا۔ جب صدیقی صاحب نے ریزولیشن کا یہ آخری فقرہ پڑھا کہ "آل انڈیا مسلم لیگ کی آفیشل (کاروباری) زبان اردو ہوگی"۔ تو یہ بنگالی حضرات پھر سے اُڑ کر میدان میں جا پہنچے۔ اور مولانا اکرم خاں نے نہایت فصیح اور پرجوش اردو زبان میں اس کی مخالفت کی۔ اس کے جواب میں بنگال کے دوسرے مشہور صاحب بدرالدجیٰ نے اپنی لچھے دار انگریزی میں ریزولیشن کی تائید کی۔ اب موافقت اور مخالفت کا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ جب بات بہت بڑھی تو نواب اسمعیل خاں میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ اگر ہم ریزولیشن کو یوں بدل دیں کہ "ہر ممکن کوشش کی جائے گی کہ اردو آل انڈیا مسلم لیگ کی آفیشل زبان ہو"۔ میں نے کہا "کس قدر افسوس کی بات ہے کہ آل انڈیا نیشنل کانگریس تو یہ کہے کہ ہماری زبان ہندوستانی ہوگی اور ہم اب تک کوشش ہی کے چکر میں ہیں جس کے یہ معنی ہیں کہ کچھ بھی نہ ہوگا"۔ اگرچہ کثرت رائے ہمارے ساتھ تھی لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ قرارداد کثرت رائے سے منظور ہو۔ بالاتفاق منظور ہونی چاہیئے۔ جب میں نے دیکھا کہ جھگڑا بڑھتا ہی جاتا ہے تو میں نے صدیقی صاحب سے کہا ریزولیشن واپس لے لیجئے۔ انھوں نے اس کا اعلان کیا تو ہر طرف سے "نہیں نہیں، نو نو" کی آوازیں آنے لگیں۔ اس کے بعد نواب اسمعیل خاں پھر میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ اگر یوں بدل دیں تو آپ کو کوئی اعتراض نہ ہوگا: "ہر ممکن کوشش کی جائے گی کہ اردو تمام ہندوستان کی عام زبان ہو جائے"۔ میں خاموش ہو رہا کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

۱۹۳۹ء میں انجمن دہلی میں منتقل ہو گئی۔ اتفاق دیکھئے کہ کچھ دنوں بعد قائد اعظم بھی دلی میں آ بسے۔ لیکن بہت دنوں تک ان سے ملاقات کا اتفاق نہ ہوا۔ ۱۹۴۵ء میں مولوی سید ہاشمی صاحب کو خیال آیا کہ انھیں انجمن میں بلانا چاہئے۔ چنانچہ ان کے لکھنے پر انھوں نے بڑی خوشی سے انجمن میں قدم رنجہ فرمایا اور ہمارے سا تھ لنچ کھایا

منظور فرمایا۔ ہم نے ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم، نواب زادہ لیاقت علی خاں، سید حسین امام اور دو ایک اور صاحبوں کو بھی مدعو کر لیا تھا۔ قائد اعظم لنچ سے بہت پہلے آگئے دیر تک باتیں کرتے رہے اور انجمن کی مطبوعات وغیرہ کا معائنہ فرمایا۔ میں نے انجمن کی انگریزی اردو لغات اور سرسید احمد خاں کی اردو یونی ورسٹی کی تجویز کی ایک نقل نذر کی جو وہ ساتھ لیتے گئے۔ کچھ دیر بعد دوسرے اصحاب آ پہنچے۔ لنچ پر مجھ سے اردو ہندی کے تنازع کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ لنچ سے فارغ ہونے کے بعد وہ رخصت ہوئے اور چلتے وقت فرمایا کہ پھر بھی آؤں گا۔

اس کے کچھ دنوں بعد اینگلو عربک کالج کے طلبہ نے ان سے درخواست کی کہ وہ کالج میں اس وقت کے معاملات پر تقریر فرمائیں۔ انھوں نے منظور فرمایا۔ تقریر سے قبل شب کے کھانے کی بھی دعوت دی جس میں چند اور صاحبوں کو بھی مدعو کیا۔ ان میں ایک میں بھی تھا۔ کھانے کے بعد مجھ سے فرمانے لگے آپ کو معلوم ہے کہ سب سے پہلے میں نے اردو میں کب اور کہاں تقریر کی۔ میں نے لاعلمی ظاہر کی تو فرمایا کہ کئی سال ہوئے بنگال کے ایک مقام پر (مجھے اس کا نام یاد نہیں رہا) گیا (غالباً یہ جلسہ انتخاب کے سلسلے میں تھا) تو دیکھا کہ کئی ہزار آدمی جمع ہیں۔ اس قدر مجمع کی توقع نہ تھی۔ میں نے سر عزیز الحق سے جو اس وقت میرے ہمراہ تھے پوچھا کہ اس مجمع میں کتنے لوگ انگریزی سمجھتے ہونگے۔ انھوں نے کہا کم و بیش پانسو۔ تب میں نے کہا اردو جاننے والے کتنے ہونگے۔ انھوں نے کہا تقریباً ڈیڑھ ہزار اس کے بعد سر عزیز الحق نے کہا آپ انگریزی میں تقریر فرمائیے۔ میں اس کا ترجمہ بنگالی میں سنا دوں گا لیکن میں نے ان کا مشورہ نہ مانا اور اردو میں تقریر کی۔ یہ میری پہلی اردو تقریر تھی۔" اس کے بعد انھوں نے ہنسکر فرمایا "میری اردو تانگے والے کی اردو ہے"

(MY URDU IS TONGAWALA URDU)

یہ واقعہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جب مسلم لیگ کی کونسل کے اجلاس میں جو دہلی میں (۱۹۴۶ء) ہو رہا تھا، سر فیروز خاں نون نے اپنی تقریر انگریزی زبان میں شروع کی تو ہر طرف سے شور بلند ہوا "اردو اردو"۔ اس سے مجبور ہو کر انھوں نے کچھ جملے اردو میں ارشاد فرمائے اور اس کے بعد پھر اپنی محبوب زبان انگریزی بولنے لگے۔ اس پر پھر "اردو اردو" کا شور بلند ہوا۔ تب آپ نے جل کر فرمایا کہ مسٹر جناح بھی تو انگریزی میں تقریر کرتے ہیں۔ یہ سن کر قائد اعظم اپنی کرسی پر سے اٹھ کر کھڑے ہوئے اور صریح اور صاف الفاظ میں فرمایا کہ "سر فیروز خاں نون نے میرے پیچھے پناہ لی ہے لہذا میں اعلان کرتا ہوں کہ پاکستان کی زبان اردو ہوگی۔" اس پر تمام حاضرین نے بڑے جوش سے تالیاں بجائیں۔ افسوس کہ اس کونسل کی جو روئداد اخباروں میں چھپی اس میں اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا۔ اخبار والوں کی نظر میں شاید یہ معمولی سی بات تھی لیکن ہمارے لئے یہ واقعہ بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

فروری ۱۹۴۱ء میں انجمن ترقی اردو کی سالانہ کانفرنس بمبئی میں ہوئی۔ یہ کانفرنس بڑی شان سے ہوئی اور اہل بمبئی نے انجمن کے عمارت فنڈ میں بھی کافی امداد کی۔ کانفرنس میں جب قائد اعظم کا ہمت افزا پیغام پڑھ کر سنایا گیا تو حاضرین نے خوشی کے نعرے لگائے اور اس جوش سے تالیاں بجائیں کہ سارا پنڈال گونج اٹھا۔ دوسرے روز میں قائد اعظم سے ان کے مکان پر ملنے گیا۔ اگرچہ اس وقت انھیں بخار تھا، پھر بھی وہ نیچے آکر مجھ سے ملے اور کچھ دیر تک کانفرنس اور اردو کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ کانفرنس سے فارغ ہو کر میں وردھا گیا جہاں گاندھی جی کی ہندستانی سبھا کی پہلی سالانہ کانفرنس تھی۔ میں وہاں کیسے گیا اور وہاں کیا گذری، یہ بھی عجیب اور دل چسپ داستان ہے جسے میں یہاں بیان نہیں کروں گا۔

انجمن نے حکومت ہند سے نئی دہلی میں اپنی عمارت کے لئے ایک قطعہ اراضی خریدا تھا۔ اس کے لئے میں جگہ جگہ چندہ جمع کر رہا تھا۔ جنگ کی وجہ سے عمارت کا تخمینہ کئی گنا بڑھ گیا تھا۔ توقع تھی کہ حکومت نظام سے ہمیں اس کے لئے بہت اچھا عطیہ ملے گا۔ چنانچہ اس غرض سے ایک عرضداشت مرتب کی گئی جو سر تیج بہادر سپرو صدر انجمن کی طرف سے پیش کی جانے والی تھی۔ اس ضمن میں قائد اعظم سے بھی ملنا چاہتا تھا۔ کرنل (ڈاکٹر) عبدالرحمٰن بھی ان سے ملنے والے تھے انھوں نے ملاقات کا وقت دریافت کیا اور میرا نام بھی لیا اور کہا کہ وہ بھی آنا چاہتا ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ کل آیئے اور لنچ میرے ساتھ کھائیے۔ دوسرے دن ہم گئے دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ اس اثنا میں میں نے یہ عرض کی کہ انجمن کو عمارت کے لئے کافی رقم کی ضرورت ہے۔ عطیے کی ہمیں سب سے بڑی امید دولت سرکار عالی حیدر آباد دکن سے ہے۔ عرضداشت سر تیج بہادر سپرو کی طرف سے پیش کی جائے گی مگر آپ ایک خط اعلیٰحضرت حضور نظام کے نام عنایت فرمائیں تو منظوری میں بڑی آسانی ہو جائے گی۔ فرمایا کہ میں خط لکھنا مناسب خیال نہیں کرتا۔ لوگوں نے پہلے ہی مجھے بدنام کر رکھا ہے کہ حضور نظام مجھے ۲ لاکھ روپیہ سالانہ دیتے ہیں۔ آپ نے بھی اخباروں میں پڑھا ہوگا۔ میں نے کہا اخباروں میں تو پڑھا ہی تھا لیکن تعجب یہ ہے کہ "ماڈرن ریویو" جو ایک ادبی رسالہ ہے اس نے بھی یہ خبر شائع کی ہے۔ کہنے لگے خط تو میں نہیں لکھوں گا لیکن عنقریب حیدر آباد جانے والا ہوں اس وقت میں بالمشافہ اعلیٰحضرت سے فیاضانہ امداد کے لئے کہوں گا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کانگریس اور مسلم لیگ میں سیاسی الجھنیں بڑھتی جاتی تھیں اور ہر روز کوئی نہ کوئی نیا شگوفہ کھلتا تھا۔ اس وقت قائد اعظم کی مصروفیت انتہا کو پہنچ گئی تھی اور دن رات میں کوئی وقت ایسا نہ تھا جو ان الجھنوں سے خالی ہو۔ ادھر اعلیٰحضرت حضور نظام کا تقاضے پر تقاضا تھا کہ جلد آؤ۔ خط پہ خط اور تار پہ تار چلے آرہے تھے۔ آخر خدا خدا کرکے وہ دن آیا کہ قائد اعظم نے حیدر آباد کی روانگی کی تاریخ مقرر کی۔ جب مجھے تاریخ کا علم ہوا تو میں کئی روز پہلے حیدر آباد جا پہنچا۔ حیدر آباد کا بڑا ہوائی اڈا

شہر سے کوئی پندرہ میل کے فاصلے پر ہے۔ لوگوں کے اشتیاق کا یہ عالم تھا کہ ہزارہا آدمی گاڑیوں میں موٹروں میں اور پیدل ہوائی اڈے کی طرف جا رہے تھے اور ہزاروں دو طرفہ سڑک پر ان کے انتظار میں کھڑے تھے۔ جہاز کے آنے میں دیر ہوئی کیونکہ گوالیار سے بوجہ کثرت بارش وقت پر نہ چل سکا۔ جس وقت جہاز نظر آیا تو لوگوں نے خوشی کے نعرے لگائے۔ جوں ہی زمین پر اترا لوگ اس پر ٹوٹ کر گر رہے اور بعض تو جہاز پر چڑھ گئے۔ قائد اعظم اُتر ہی رہے تھے کہ جب انھوں نے یہ عالم دیکھا تو بہت خفا ہوئے اور پھر اندر جا بیٹھے لوگوں کو ہٹا کر رستہ صاف کیا گیا۔ اب پھر اُترنے والے تھے کہ لوگ بے تحاشا ادھر دوڑ پڑے۔ اُدھر سے دو انگریز پٹرول کی گاڑی لئے جا رہے تھے انھوں نے گاڑی ٹھہرا کر قائد اعظم کو بٹھا لیا۔ اس کی طرف بھی لوگ دوڑے اور بعض نوجوان گاڑی پر چڑھنے لگے۔ بڑی مشکل سے مار کر انھیں ہٹایا۔ غرض وہ انگریز انھیں ہجوم میں سے نکال کر لے گئے۔ جو سرکاری موٹر ان کے لئے آئی تھی وہ پیچھے پیچھے گئی اور کچھ دور چلنے کے بعد اس میں بٹھا کر سرکاری مہمان خانے میں جا پہنچایا۔

دوسرے دن قائد اعظم اعلیحضرت کی ملاقات کو گئے جب وہاں سے واپس آئے تو میں ملنے گیا۔ ملاقات کا حال سنایا تو مجھے نہایت افسوس ہوا اور جو بڑی بڑی اُمیدیں میں وہاں لے کر گیا تھا وہ سب خاک میں مل گئیں۔

اس کے دوسرے دن سہ پہر کو دارالسلام میں قائد اعظم کی تقریر تھی۔ تقریباً ایک لاکھ کا مجمع تھا۔ سارا صحن اور ہال بھرا ہوا تھا اور بہت سے درختوں اور چھتوں پر جا بیٹھے تھے۔ قائد اعظم نے بہت صاف اور اچھی اردو زبان میں تقریر کی۔ یہ تقریر چالیس منٹ تک رہی۔ اس کے بعد انھوں نے انگریزی میں تقریر فرمائی۔ یہ بہت معرکہ آرا تقریر تھی۔ خاص کر حیدر آباد کیلئے۔

دوسرے دن مولوی سید تقی الدین صاحب (سکرٹری گورنمنٹ نظام) کے ہاں دعوت تھی۔ دسترخوان پر میں قائد اعظم کے پاس بیٹھا تھا۔ میں نے مبارک باد دی کہ آپ نے ایسی اچھی اردو میں تقریر کی۔ مجھے اس کی ہرگز توقع نہ تھی۔ فرمانے لگے۔ آپ اُردو کے اُستاد (ماسٹر) ہیں........ میں نے کہا اب آپ کبھی یہ نہ کہئے گا کہ میری اُردو تانگہ والا اردو ہے۔ اس پر وہ مسکرائے۔

۱۹۴۷ء کے وسط میں تقسیم ملک کے بعد حالات کا نقشہ ہی بدل گیا اور جو جو المناک حادثات اور واقعات گزرے وہ ابھی تازہ ہیں ان کے بیان کی ضرورت نہیں۔ انجمن کو بھی اس میں بہت کچھ جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا اور بہت سی عزیز یادگاریں اور قیمتی مسودے تلف ہو گئے۔ انجمن اس سے پہلے سارے ملک کے لئے ایک تھی اور اس کا صدر مقام دہلی تھا۔ تقسیم کے بعد اُن انجمنوں کا الحاق جو پاکستان کے علاقے میں تھیں دلی سے نہیں رہ سکتا تھا اس لئے ہمیں پاکستان کے لئے ایک علیحدہ مرکز کراچی میں بنانا پڑا۔ اب اس کے دو مرکز ہو گئے۔ ہندوستان کا دلی اور پاکستان کا کراچی۔

جب ہندہ حکومت کی عنایت سے انجمن کو ایک مناسب اور اچھی عمارت مل گئی اور ہم نے کام کا ڈول ڈالا تو قائد اعظم سے درخواست کی کہ وہ اس کا افتتاح فرما دیں۔ انھوں نے جواب میں لکھا کہ میں بہت خوشی سے اس کا افتتاح کروں گا اور ضرور کروں گا اس وقت بہت مصروف ہوں سرحد کے دورے سے واپسی پر وسط اپریل کے بعد کسی تاریخ کو افتتاح کی رسم ادا کروں گا۔" پھر معلوم ہوا کہ غالباً ۲ مئی کے لگ بھگ کوئی تاریخ مقرر کی جائے گی۔ لیکن کام کی کثرت اور ناسازیٔ مزاج کی وجہ سے پروگرام جلد جلد بدلتا رہا اور اس کا موقع نہ آیا۔ کوئٹے کی روانگی سے کچھ دیر قبل انھوں نے فون سے معذرت کی کہ ہجوم کار اور بعض دوسرے حالات کی وجہ سے میں افتتاح کرنے سے قاصر رہا۔ کوئٹے کے دورے میں کم سے کم پانچ ہفتے لگیں گے۔ آپ اس اثنا میں کسی اور سے افتتاح کرا لیجے۔ مگر میں کسی دوسرے موقع پر ضرور انجمن میں آؤں گا کوئٹے سے وہ کراچی آئے لیکن ایسے آئے کہ وہ ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو گئے۔ اس انتقال پُرملال سے نہ صرف پاکستان بلکہ تمام عالم اسلامی میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ پاکستان اس غم میں اب تک سوگوار ہے۔ ہزارہا مرد، عورت، چھوٹے بڑے، امیر غریب صبح شام ان کے مزار پر حاضر ہوتے اور عقیدت کے پھول چڑھاتے ہیں۔ اس عام اور غیر معمولی مقبولیت کا منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ الفاظ اور قلم اس کے بیان سے قاصر ہیں۔ ایسے بلند نظر، بلند ہمت اور عزم کے پکے صدیوں میں کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں پاکستان اپنے بانیٔ اعظم کے احسانات کو کبھی نہیں بھول سکتا۔

"مجھے واضح طور پر کہنے دیجئے کہ پاکستان کی سرکاری زبان اُردو ہوگی، کوئی دوسری زبان نہیں۔

ہر وہ شخص جو غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، یقیناً پاکستان کا دشمن ہے۔ ایک سرکاری زبان کے بغیر کوئی قوم نہ تو مربوط رہ سکتی ہے، نہ اپنا کام خوش اسلوبی سے انجام دے سکتی ہے۔ دوسرے ملکوں کی تاریخ پر نظر ڈال لیجے، آپ کو معلوم ہو جائیگا جہاں تک سرکاری زبان کا تعلق ہے، پاکستان کی زبان اردو ہوگی۔ لیکن یہ سب کچھ اپنے وقت پر ہوگا۔"

(قائد اعظم ——— ڈھاکہ ——— ۲۲ مارچ ۱۹۴۸ء)

"ایک ملک میں صرف ایک ہی مشترک زبان ممکن ہے۔ در اصل زبان ہی ہے جو ایک حکومت کے مختلف صوبوں کے درمیان اظہار خیال کا واحد ذریعہ ہے اور وہ زبان اردو ہونی چاہیئے۔ کوئی دوسری زبان اس کی جگہ نہیں لے سکتی۔"

(قائد اعظم ——— ڈھاکہ ——— ۲۴ مارچ ۱۹۴۸ء)

بیگم جہاں آرا شاہنواز

قائداعظم اور مسلمان عورت

وہ کیا بے مثال ہستی تھی جس نے اس برّاعظم کے مسلمانوں کو سات سال کے قلیل عرصے میں غلام سے حاکم بنا دیا! وہ کیا شخصیت تھی جس نے آخری دم تک قوم کی خدمت کی؟ وہ کیا قابلیت تھی کہ دوست، دشمن رطب اللسان ہیں۔ خوش قسمت ہے وہ قوم جسے ایسا لیڈر ملا جسے وہ مردِ مجاہد قسمت نے ہم کو دیا اور دنیا والے رشک کرتے رہ گئے۔ آہ! آج اس باپ کی شفقت سے ہم ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئے۔

آہ! قائداعظم

دنیا والے اور پاکستانی بھائی بہن اُن کی خدمات ملک و ملت وانسانیت سے بخوبی واقف ہیں مگر بہت کم لوگ ہیں جو یہ جانتے ہوں کہ مسلمان عورت کو طوقِ غلامی سے نجات دلوانے میں اُن کا کتنا حصہ ہے۔

قائدِاعظم محمد علی جناح وہ پہلے مسلمان تھے جنہوں نے اپنی ہمشیرہ مس فاطمہ جناح کو پردہ سے باہر نکالا اور انھیں ایسے زیورِ علم سے آراستہ کیا جس سے نہ صرف انھیں اقتصادی خودمختاری حاصل ہوئی بلکہ جس سے مالا مال ہو کر وہ ایسے بے مثال بھائی کی ہر مشکل وقت میں بھی دستِ راست بن سکیں۔

لکھنؤ سیشن کے لیگ کونسل کے اجلاس میں میں نے ان سے سوال کیا کہ کیا ہمیں عورتوں میں بیداری پیدا کرنے کے لئے اور قومی جنگِ آزادی میں حصہ لینے کے لئے علیحدہ نسوانی لیگ قائم کرنی ہوگی؟ اگر ایسا ہے تو پنجاب میں سات سال سے عورتوں کی مسلم لیگ قائم ہے اُسے ملحق کیجئے۔ اس پر انھوں نے فرمایا کہ ہرگز نہیں میں عورتوں کی علیحدہ لیگ بنانے کے سخت مخالف ہوں۔ مسلمان مرد اور مسلمان عورت کو قومی خدمت میں دوش بدوش حصہ لینا چاہئے۔ مسلمان عورتوں کو چاہئے کہ وہ جوق درجوق مسلم لیگ میں شامل ہوں اور جلسوں میں حصہ لیں۔ ہاں پردہ دار خواتین میں بیداری پیدا کرنے کے لیئے اور انھیں قومی خدمت کی دعوت دینے کے لئے عورتوں کی ایک مرکزی سب کمیٹی قائم کی جاویگی۔ میں نے اُن کا دلی شکریہ ادا کیا اور کہا کہ مجھے اُن کے یہ خیالات سنکر بیحد مسرت حاصل ہوئی ہے کہ وہ مرد و عورت کے ایک ہی (ORGANISATION) میں ملکر کام کرنے کے حامی ہیں۔ اسی سیشن میں ہر صوبے سے دو دو خواتین لیگ کونسل کی ممبر بنائی گئیں۔ اور قائدِاعظم نے اسی سال مرکزی کمیٹی نامزد کی۔

قائدِاعظم جب لاہور تشریف لاتے وہ باوجود اپنی اتنی مصروفیتوں کے عورتوں کی ایک نہ ایک میٹنگ میں حصہ لینے کے لئے ضرور وقت نکالتے۔ کبھی انھوں نے ہماری دعوت قبول کرنے سے انکار نہ کیا۔ ہزاروں عورتوں کی موجودگی میں سپاسنامے پیش ہوئے اور ان کا فرمان ہمیشہ یہی ہوتا کہ "اپنے پاؤں پر آپ کھڑا ہونا سیکھو۔ ملک کی تعمیری زندگی میں کام سے اپنے آپکو قومی زندگی کا ایک ایسا مفید اور کارآمد جزو بنالو کہ مرد تمہیں خود کام کی دعوت دیں اور وہ یہ بخوبی جان لیں کہ تمہارے تعاون کے بغیر انھیں کام میں مکمل کامیابی حاصل ہو نہیں سکتی" کیا سنہری الفاظ تھے۔ کیا زریں قول۔ اسی سبق کو ازبر کر کے مسلمان عورت نے آزادی کی جنگ میں اور قوم کی مصیبتوں میں ہر ممکن طریقے سے کام کرنے سے دریغ نہ کیا۔ اُسی مبارک ہستی کا پیدا کیا ہوا جذبہ تھا جس نے چھوٹی چھوٹی لڑکیوں سے وہ کام کرائے جو کبھی بزرگوں کے ذہن میں بھی نہ آ سکتے تھے۔

دسمبر ۱۹۴۶ء لندن میں ایک دن مسٹر حسن اصفہانی بنگال کی تعریفوں کے پُل باندھ رہے تھے اور پنجاب کی مذمت کی جا رہی تھی۔ مجھے کچھ رنج سا ہوا۔ ہم محترم قائدِاعظم کے ساتھ کھانے کی میز پر بیٹھے تھے۔ میں نے جھنجھلا کر کہا کہ انشاءاللہ جب پنجاب نے تحریکِ آزادی کے لئے جھنڈا اُٹھایا تو آپ دیکھ لیں گے کہ پنجاب کا بچہ بچہ جنگِ آزادی میں کیسے حصہ لیتا ہے۔ مرد ہی نہیں عورتیں پیش پیش ہوں گی۔ اپریل ۱۹۴۷ء میں میں نئی دہلی میں قائداعظم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور میں نے اپنے وہ الفاظ انھیں یاد دلائے۔ فرمایا کہ میں پنجاب کی مسلمان عورتوں کی خدمت سے بہت خوش ہوں۔ میں نے کہا کہ یہ میرا ایک خواب تھا کہ آزادی کی جدوجہد کے ساتھ ہی مسلمان عورت اپنی آزادی حاصل کرے اور طوقِ غلامی کو اتار کر پھینک دے۔ الحمدللہ کہ آج وہ میرا خواب پُورا ہوا اور یہ اللہ تعالیٰ کی عنایت اور قائدِاعظم کی برکت سے ہوا۔ فرمایا کہ یہی اُن کا مدّعا تھا اور یہی وجہ تھی کہ انھوں نے عورتوں کی علیحدہ لیگ بنانے سے پرہیز کیا تھا اور وہ خوش ہیں کہ وہ پورا ہوا۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور عرض کیا کہ اب شرعی حقوق کا حاصل کرنا ہمارا کام ہوگا اور ان کے طفیل ہمایوں میں ہم اپنے اسلامی حقوق جلد حاصل کریں گی۔

آہ قائدِاعظم!

وہ زندہ ہیں 'پاکستان' میں

پاکستان زندہ باد

میاں بشیر احمد

تصویرِ عزم

تصویرِ عزم، جانِ وفا، روحِ حُرّیت
ہے کون بے گماں ہے محمد علی جناح!

قائدِ اعظم محمد علی جناح کا نام لب پر آتے ہی قسم قسم کے جذبات دل میں اُبھرتے ہیں، ہزاروں خیالات دماغ میں اُٹھتے ہیں اور اپنے ہجوم میں کچھ اس طرح ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے جد و جہد کرتے ہیں جس طرح عوام الناس بڑے بڑے مجمعوں اور جلوسوں میں اپنے اُس محبوب رہنما کے دیدار کے لئے بے تاب و مضطرب ہو جایا کرتے تھے اور پھر جیسے اس کا ایک معمولی سا اشارہ ان کو خاموش و متوجہ کرنے کے لئے کافی ہوتا تھا! اسی طرح آج اس کی تڑپتی یاد میں اس کی زندگی کی ایک جھلک ہر پاکستانی کے دل کو قرار دیتی ہے اور اس کی تقریر کا ایک ایک پھڑکتا ہوا جملہ ہر کہہ و مہ کو دوڑ کر میدانِ عمل میں اتر آنے پر اُکساتا ہے:۔

"یہ ہے ایک آزمائش کی گھڑی" ۔۔۔ "میں ہر مسلمان کو تنبیہہ کرتا ہوں کہ وہ قومی مفاد کے لئے اپنا جان و مال سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو جائے" ۔۔۔ "خدا ہمارے ساتھ ہے اور ہم یقیناً کامیاب ہوں گے"!

قائدِ اعظم کی زندگی ہمیشہ کسی نہ کسی ملند نصب العین کے حصول کے لئے مصروفِ کار رہی۔ انھوں نے جو کچھ کیا، خلوص سے کیا، جو کچھ محسوس کیا اسے دوست دشمن دونوں کے سامنے برملا کہہ دیا۔ شروع میں جب وہ کانگریسی تھے تو کانگریسی تھے جب لیگی بنے تو لیگی تھے اور جب پاکستانی ہوئے تو ان کی زبان پر صرف پاکستان کا نعرہ تھا۔ اس بات میں وہ سچے مسلمان تھے، جو ان کے دل میں تھا وہی ان کی زبان پر تھا اس میں کسی بڑے سے بڑے آدمی کسی سخت سے سخت حاکم سے بھی وہ کبھی ایک لمحے کے لئے نہ ڈرے۔

"ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق"!

محمد علی جناح کی زندگی کے پانچ دور ہیں۔ (بیس سال کا) پہلا دور ۱۸۷۶ء سے ۱۸۹۶ء تک جب انھوں نے تعلیم پائی اور انگلستان میں بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ (دس سال کا) دوسرا دور ۱۸۹۶ء سے ۱۹۰۶ء تک جب انہوں نے اپنی یکسوئی اور محنت سے اپنی وکیلانہ ناموری کی بنیاد ڈالی۔ پھر (دس سال کا) تیسرا دور ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۶ء تک جب وہ زیادہ تر کانگرسی رہے۔ (بیس سال کا) چوتھا دور ۱۹۱۶ء سے ۱۹۳۶ء تک جب وہ کانگرس اور لیگ اور ہندو مسلمانوں کے درمیان مفاہمت کی مسلسل کوشش کرتے رہے اور (تقریباً گیارہ سال کا) آخری پانچواں دور ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۸ء تک جب انھوں نے وکالت چھوڑ کر اپنی تمام تر مساعی مسلمانانِ ہند کی قومی تنظیم اور پاکستان کے حصول و قیام میں صرف کر دیں۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو وہ پاکستان کے پہلے فرماں روا ہوئے اور اس کے تقریباً ایک سال بعد ۷۱ سال ۸ ماہ اور ۱۰ دن کی عمر پاکر ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو اس دارِ فانی سے عالمِ بقا کو سدھارے!

جناح نے چالیس برس (۱۸۹۶ء سے ۱۹۳۶ء تک) وکالت کی اور ایسی کہ ہندوستان میں بہت کم لوگوں نے اس پیشے میں اتنی ناموری پائی اور اتنی دولت کمائی۔ ۱۹۳۶ء میں انہوں نے دیکھا کہ ان کی قوم انتہائی خطرے میں گھری ہوئی ہے۔ ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کو علامہ اقبال نے انھیں لکھا کہ "ہندوستان میں صرف آپ ہی ایک ایسے مسلمان ہیں جو اپنی قوم کو اس طوفان سے جو شمال مغربی اور شاید سارے ہندوستان پر اُٹھنے والا ہے بچا سکتے ہیں اور اس لئے قوم کو حق ہے کہ وہ آپ کی رہنمائی کی امید رکھے۔" جناح اس سے تقریباً چار سال پہلے جب مسلمان لیڈروں نے انھیں انگلستان میں تحریری تار بھیجا تھا قوم کے اس حق اور اپنے فرض کو بخوشی تسلیم کر چکے تھے بلکہ ۱۹۳۴ء سے وہ مسلم لیگ کے مستقل صدر ہو گئے۔ وہ طول و عرضِ ہند میں شہر شہر پھرے اور جا بجا انھوں نے جاکر مسلمانوں کے لیڈروں اور عوام سے اپیل کی منت سماجت کی سمجھایا کہ قوم کتنے شدید خطرات سے محصور ہے لیکن قوم کی تنظیم کا کام بہت کٹھن نکلا، لیڈروں کی جاہ پرستی اور قوم کی غفلت اس قدر دل شکن تھی کہ جناح کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کارِ دشوار کو ناممکن سمجھ کر اس سے ہاتھ اُٹھا لیتا مگر وہ جناح نہ ہو جو دشواریوں سے دل شکستہ ہو جائے اور ناکامیوں سے حوصلہ ہار بیٹھے۔ ۱۹۳۶ء میں انھوں نے آنے والے انتخابات میں حصہ لینے کے لئے مسلم لیگ کا ایک انتخابی بورڈ بنایا اور زور شور سے ہر صوبے میں اپنا کام شروع کر دیا۔ ۱۹۳۷ء میں کانگرس کے لیڈروں سے گفت و شنید ہوئی مگر خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ کانگرس نے چھ صوبوں میں اکثریت حاصل کر کے وہاں اپنی حکومتیں قائم کر لیں، نہرو نے کہا اس وقت ہندوستان میں صرف دو طاقتیں ہیں برطانوی حکومت اور کانگرس۔ جناح نے ببانگِ دہل کہا کہ تم غلط کہتے ہو یہاں ایک اور طاقت بھی ہے اور وہ مسلمان ہیں جن کا اپنا تمدن اپنی معاشرت اور اپنا نظامِ حیات ہے۔ اس کے بعد جناح نے ملک بھر کے مسلمانوں کو لکھنؤ میں مسلم لیگ کے پچیسویں سالانہ اجلاس (اکتوبر ۱۹۳۷ء) میں جمع ہونے اور ہندو استبداد کے خطرے کا سامنا کرنے کی دعوت دی۔ اپنے خطبۂ صدارت میں انھوں نے کہا "ایک اور صرف ایک صورت مسلمانوں کو بچا سکتی ہے اور ان کو ان کی گئی گذری طاقت دلا سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ پہلے اپنی گم شدہ روح کو پھر ڈھونڈ پائیں۔" اور پھر کہا کہ "اس وقت ایسی قوتیں موجود ہیں جو ممکن ہے تم کو ڈرائیں دھمکائیں اور مرعوب کریں اور ممکن ہے کہ ان کے ہاتھوں تم کو سخت تکلیفیں بھی پہنچیں لیکن یاد رکھو کہ آتشِ ظلم کی

اس بھٹی میں جس میں تم کو ڈالا جائے گا، اگر اس پر بھی تم ثابت قدم رہے اگر تم نے ان مصیبتوں اور سختیوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور تم برابر ایمان دار اور اپنی قوم کے وفادار بنے رہے تو اس طرح ایک ایسی قوم پیدا ہوگی جو اپنی گزشتہ عظمت اور تاریخ کی لاج رکھے گی اور مستقبل میں نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا بھر کی تاریخ کو کہیں زیادہ پر عظمت اور شاندار بنا دے گی۔"

فروری ۱۹۳۸ء میں علی گڑھ میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے اپنی قوم کو ہوشیار کیا کہ "سیاسیات کی دنیا کا دستور ہے کہ آپ طاقتور ہوں گے تو آپ کے لئے خیر خواہی ہمدردی محبت اور پاس خاطر سبھی کچھ ہوگا ورنہ کچھ بھی نہیں۔" اور مارچ ۱۹۴۰ء میں پھر وہیں اپنے نوجوانوں کو اپیل کرتے ہوئے متنبہ کیا کہ سب شانہ بشانہ کھڑے ہو جاؤ۔ ایک مستحکم و مضبوط فولادی پیکر کی طرح اپنی جگہ پر قائم رہو اور اپنی قوم کی تنظیم و تربیت کئے جاؤ۔ دو قوتوں کی فکر نہ کرو بلکہ مسلمانوں کو منظم کر کے ان سب کو یکجا و یک سو کر دو، انکو پابندی کا سکھاؤ اور اس طرح ان کو ایک ایسی حیرت انگیز فوج میں تبدیل کر دو کہ ملک ہند نے کبھی پہلے دیکھی سنی نہ ہو۔ ایسا کرو گے تو یقیناً تم بہت جلد اپنی آزادی کی منزلِ مقصود تک پہنچ جاؤ گے۔" اسی ماہ میں لاہور کے مشہور پاکستانی اجلاس میں انہوں نے کہا کہ "مجھے اپنی قوم پر پورا اعتماد ہے اور مجھے کامل یقین ہے کہ مسلمان متحد ہو کر دنیا کی تمام مشکلات و تکالیف کا کامیابی سے مقابلہ کریں گے۔" اس طرح جناح نے اپنی قوم کو جگایا! سنبھالا اور ابھارا اور ملک کو پاکستان کی راہ پر لگا دیا۔ ان کی گرجتی آواز نے ملت کے رگ و پے میں ایک نئی روح دوڑا دی اور مسلم لیگ صحیح معنوں میں مسلمانوں کی ایک عوامی تحریک بن گئی۔

لکھنؤ کے اجلاس کے بعد دس برس تک جناح نے جواب اپنی قوم کے قائد اعظم بن گئے تھے صوبے صوبے میں بلکہ شہر شہر میں اپنی قوم کی رہنمائی کی۔ پُر خلوص مسلمان اپنی تمام سیاسی مشکلات میں ان کی طرف رجوع کرنے لگے۔ ادھر وہ بھی باوجود پیرانہ سالی کے جگہ جگہ پہنچے اور جہاں تک ہو سکا ایک ایک کارکن کی حوصلہ افزائی کی۔ نوجوانوں اور عورتوں کی طرف انہوں نے خاص توجہ دی۔ اور انہوں نے بھی اپنے قائد کی پکار پر جس طرح لبیک کہی اس کا مسلم سیاسیات پر معتدبہ اثر پڑا۔

قائد اعظم جس بات میں اکثر لیڈروں سے سبقت لے گئے وہ یہ تھی کہ جہاں ایک طرف ان کے دل میں قومی جوش تہور اور شجاعت کے جذبات تھے اور عوام ان کو جلد متاثر ہوئے وہاں ان میں قانونی قابلیت اور سیاسی بصیرت بھی بدرجۂ اتم موجود تھی اور انہوں نے مخالف جماعتوں یا قوموں کے قابل ترین نمائندوں اور لیڈروں کو اپنی ان صفات کے بل پر بُری طرح پچھاڑا۔ ۱۹۳۶ء سے لے کر جب وہ جداگانہ نیابت کے حامی ہوئے ۱۹۴۷ء تک جب باوجود پاکستان کے قیام کے مخالفین اپنی چالیں چلتے رہے قائد اعظم نے اپنے سیاسی مذاکرات و بیانات میں اور اپنی خط و کتابت میں نہرو سے جذباتی نوجوان لیڈر اور گاندھی سے دور اندیش روحانی رہنما کو سیاست میں شکست دی۔ پربھات (دہلی) نے قائد اعظم کی رحلت پر لکھا کہ "متحدہ ہندوستان کی تمام طاقتیں اس ایک شخص سے شکست کھا گئیں۔" اس کے ساتھ ہی وقتاً فوقتاً انکی مصلحت آمیز خاموشی بھی کام کرتی رہی۔ بہت کم لیڈر ہوں گے جن کو اپنے جذبات پر اتنا قابو ہو، جتنا مسلمانوں کی جذباتی قوم کے اس رہنما کو تھا۔ انہوں نے اپنی روشن مثال سے مسلمانوں کو ان کی بعض کھوئی ہوئی خوبیوں کی طرف متوجہ کیا۔

قائد اعظم کی نمازِ جنازہ کے بعد مولانا شبیر احمد عثمانی نے اپنی تقریر میں کہا اور خوب کہا کہ "شہنشاہ اورنگ زیب کے بعد ہندوستان نے اتنا بڑا مسلمان پیدا نہیں کیا جس کے غیر متزلزل ایمان اور اٹل ارادے نے دس کروڑ شکست خوردہ افراد کی مایوسیوں کو کامرانیوں میں بدل دیا!" ؎

راغب مراد آبادی

حرفِ خونچکاں

موت کے آغوش میں آرام فرماتا ہے وہ
گفتگو میں جس کی پنہاں تھا جلالِ قیصری
خامشی میں رات کی پہروں ہی یاد آتا ہے وہ
جنبشِ ابرو تھا جس کی پیامِ سروری

کر دیا جس نے بلند انساں کا معیارِ حیات
عمر بھر روئیں گے اربابِ نظر اس کے لئے
ہیچ تھا اس کی نگاہوں میں عزّ و دیرکائنات
مضطرب ہے کائنات اب تک مگر اس کے لئے

اس کے ارشاد اس کی تعلیمات کے پیشِ نظر
پھر خزاں سے اک بہارِ بے خزاں پیدا کریں
اک جہانِ عافیت اک عالمِ نوعِ دگر
"برتر از اندیشۂ سود و زیاں پیدا کریں"

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی

قائدِ اعظم مرحومؒ

(چند ذاتی تاثر)

طالب علمی کے زمانہ میں بھی مجھے سیاست سے دلچسپی تھی۔ اگرچہ میں نے عملی سیاست میں تحریک ترکِ موالات کے بعد حصہ لینا چھوڑ دیا تھا۔

۱۹۳۴ء میں جب قائدِ اعظم انگلستان سے واپس تشریف لائے تو مسلم سیاست ایک جسدِ بے جان تھا۔ اس وقت عام طور پر یہ محسوس کیا جاتا تھا کہ مولانا محمد علی مرحوم کا جانشین مسلمانوں کو ملنا دشوار ہے۔ مسلمان اہلِ فکر اپنے سیاسی رہنماؤں کی طرف سے بددل تھے، مسلمان رہنما یا تو انگریزوں کی خوشامد کو اپنا شیوہ بنا چکے تھے اور جو اس طرزِ عمل سے بیزار تھے وہ ہندو سیاست کا شکار تھے۔ ایک جماعت انگریز پرست سمجھی جاتی تھی اور دوسری ہندو پرست، مسلمانوں کے مفاد کے لئے انگریزوں اور ہندوؤں سے الجھنے والے یا کم از کم ایسے لوگ جو اسلامی مفاد کو دوسری مصلحتوں پر مقدم رکھیں، بہت کم تھے۔ چند مسلم نوجوانوں میں قائدِ اعظم کی واپسی پر یہ خیال پیدا ہوا کہ ان کی توجہ نوجوانوں کی سیاسی تربیت کی طرف منعطف کرائی جائے۔ یہ خیال اس وجہ سے اور پیدا ہوا کہ قائدِ اعظم کی دیانت، بے لوثی اور خلوص پر ہمیں سب کو اعتماد تھا۔ نومبر کے مہینہ میں مرکزی مجلس مقننہ میں مسٹر این این سرکار نے ہندی آئینی اصلاح کے متعلق مشترکہ کمیٹی کی سفارش پر غور کرنے کی تجویز پیش کی۔ اس موقعہ پر قائدِ اعظم کی سیاسی بیداری اور پارلمانی قابلیت سے ان کی تجویز جو مسلمانوں کے حق میں بہت مفید تھی منظور ہو گئی اور اس حیرت انگیز کامیابی پر کہ کانگریس اور مہاسبھا کے اختلاف رائے سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے ایسی تجویز منظور کرالی جس سے دونوں کو اختلاف تھا، ہندوستانی برِ اعظم کے گوشہ گوشہ سے تحسین و آفرین کا غلغلہ بلند ہوا۔ اس موقعہ پر اینگلو عربک کالج (مرحوم اس لئے کہ اب وہ ہندو تعصب کی وجہ سے دہلی کالج بن گیا ہے) واحد اسلامی ادارہ تھا، جہاں استاد اور طالب علم اپنے رہنماؤں کی تقریریں سن سکتے تھے اور مباحثہ میں حصہ لے سکتے تھے چنانچہ وہاں کے طالب علموں نے قائدِ اعظم کو دعوت دی اور ایک مباحثہ کا انتظام کیا جس میں انھوں نے مجھے بھی، اگرچہ میں ایک اور ادارہ سے تعلق رکھتا تھا، بلایا۔ میں نے اپنی تقریر میں اس امر پر بہت زور دیا کہ قائدِ اعظم کو چاہیئے کہ لیگ میں نوجوان عناصر کو شامل کریں اور ان کی سیاسی تربیت میں دلچسپی لیں تاکہ وہ قومی تنظیم میں ان کا ہاتھ بٹا سکیں۔ اس سے قبل بھی اسمبلی میں کئی مرتبہ میں نے قائدِ اعظم کی تقریریں سنی تھیں مگر اس جلسہ میں وہ پارلمانی انداز میں نہیں بلکہ ایک مشفق استاد کی طرح تقریر فرما رہے تھے، چنانچہ انہوں نے فرمایا: میں نوجوانوں کی ہر طرح ہمت افزائی کرنی چاہتا ہوں۔ ان کی تربیت بلا شبہ ہمارا فرض ہے، لیکن وہ کہاں مسلمان نوجوان؟ وہ آگے تو بڑھیں، کام تو کریں، اسی وقت یہ ممکن ہے کہ ان کی ہمت افزائی کی جائے۔ اس مشفقانہ نصیحت کا یہ اثر تھا کہ ہم میں سے بعض نے خاموشی سے سیاسی کام میں دلچسپی لی اور حتی المقدور قائدِ اعظم کی قیادت میں اسلامی مفاد کو اپنی کوتاہیوں کے باوجود ترقی دینے کی کوشش کرتے رہے۔

دوسرا سنگِ راہ جو مجھے ہمیشہ یاد رہے گا، وہ تھا جب ۱۳ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی مجلس دستور ساز کی مسلم لیگ پارٹی کا جلسہ ہوا۔ قائدِ اعظم مرحوم نے اس جلسہ کی صدارت خود فرمائی۔ اس میں آئندہ کارروائی کے متعلق مختلف امور پر بحث ہوئی۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ ان کی کوشش یہ تھی کہ کم از کم وقت میں اہم امور کے متعلق مناسب فیصلہ ہو۔ جو تجویز پیش کی جاتی تھی اس پر نہایت صائب رائے کا اظہار فرماتے تھے اور اگر جوش میں کوئی بات ایسی کہی جاتی تھی جو نا قابلِ عمل ہو، یا جس میں کوئی خامی ہوتی تو ان کی دور رس نگاہ اسے فوراً معلوم کر لیتی تھی اور وہ ایسا مدلل اور مسکت مگر مختصر تبصرہ فرماتے تھے کہ ہر شخص کی تسکین ہو جاتی تھی۔ اس جلسہ میں نہایت اہم امور پر بحث ہوئی، بعض ان میں سے ایسے نظر آتے تھے کہ طویل بحث کے محتاج ہوں گے مگر قائدِ اعظم کے تدبر سے گھنٹوں کا کام منٹوں میں ختم ہو گیا۔

ایک مرتبہ عالی جناب لیاقت علی خاں صاحب وزیر اعظم کے ہاں ایک شام کی دعوت تھی۔ قائدِ اعظم بھی تشریف لائے تھے۔ مہمانوں کے چھوٹے چھوٹے گروہ کھڑے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ قائدِ اعظم وزیر اعظم کے ہمراہ مختلف لوگوں سے کچھ نہ کچھ تبادلہ خیالات فرماتے تھے اور بعض سوال فرماتے تھے، میں اس وقت جناب ڈاکٹر عمر حیات صاحب ملک وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی اور ڈاکٹر محمود حسین صاحب استاد تاریخ ڈھاکہ یونیورسٹی سے باتیں کر رہا تھا۔ قائدِ اعظم نے تبسم کے ساتھ فرمایا کہ ہم مشرب جمع ہیں۔ اگر انگریزی جملہ کا ترجمہ کیا جائے تو مناسب ترین یہ ہوگا کہ ؎

کند ہم جنس با ہم جنس پرواز
کبوتر با کبوتر باز با باز

پھر تعلیمی مسائل پر گفتگو شروع کی اور فرمایا کہ آپ لوگوں کو چاہیئے کہ پاکستان میں تعلیم کو اعلیٰ سے اعلیٰ معیار پر پہونچا دیں۔ ہم نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ مشکلات کا ذکر ایسے

موقعہ پر کرتے، لیکن قائداعظم نے خود ہی فرمایا کہ حکومت کا فرض ہے کہ آپ کی ہر طرح اعانت کرے اور آپ کو جتنے روپیہ کی ضرورت ہو وہ آپ کو دے۔ قائداعظم کو تعلیم سے بہت زیادہ دلچسپی تھی اور انہوں نے ہمیشہ اس امر پر زور دیا کہ تعلیم کے بغیر مسلمان کوئی ترقی نہیں کرسکتے۔

ان کی زندگی میں آخری مرتبہ مجھے قائداعظم کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقعہ اس وقت ملا جب مجلس دستور ساز کا اجلاس ہو رہا تھا اور بعض ارکان کو ظہرانہ پر حاضری کا شرف حاصل ہوا اس دعوت میں حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی اور خان عبدالغفار خان صاحب بھی شریک تھے۔ قائداعظم میز پر بہت سے امور پر بحث فرماتے رہے۔ اُنہوں نے خاص طور پر خان عبدالغفار خاں سے تخلیہ میں کافی دیر تک گفتگو فرمائی مس فاطمہ جناح نے بھی خان صاحب موصوف سے تبادلۂ خیالات فرمایا۔ ہم سب کو یہ توقع تھی کہ خان صاحب قائداعظم کی تصریحات کے بعد اپنا رویہ تبدیل کردیں گے مگر جیسا کہ سب کو معلوم ہے یہ توقع پوری نہ ہوئی۔

قائداعظم میں بردباری، خلوص، نکتہ رسی اور صفائی اس قدر زیادہ تھی کہ دنیا ان سے واقف ہے۔ ایک مرتبہ مسلم لیگ کے جلسہ میں جس کی وہ صدارت فرما رہے تھے کچھ ایسی بدنظمی پیدا ہوئی جو ان کے مزاج کے خلاف تھی میرا یہ خیال تھا کہ وہ شدید اظہار ناراضگی فرمائیں گے لیکن وہ اپنی قوم کی خوبیوں اور کوتاہیوں سے خوب واقف تھے، خوبیوں کی ہمت افزائی فرماتے تھے اور کوتاہیوں کی اصلاح کی طرف نظر جاتی تھی۔ اگر قوم سے ناراض ہوتے تو اسکی قیادت کس طرح فرماتے اور اسے آزادی و حکومت کی نعمتیں کیونکر میسر ہوتیں؟

آخری دیدار قائداعظم کا اس وقت ہوا جب افسوس ان کی روح اُن کے نحیف جسم کو الوداع کہہ چکی تھی اور انہیں سپردِ خاک کرنے کی تیاری ہو رہی تھی۔ اس وقت اُن کے چہرے کے نور سے ظاہر ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی مساعی کو قبولیت کا شرف بخشا ہے اور وہ اس سے فرحاں و شاداں ہیں، اس لئے کہ ان کے لبوں پر ایسا تبسم تھا جو موت پر فتح کی خبر دیتا تھا۔ پہلی شملہ کانفرنس کے موقعہ پر شملہ کے شہریوں نے قائداعظم کو عصرانہ پر دعوت دینے کا شرف حاصل کیا تھا۔ جب قائداعظم تشریف لائے تو فرطِ جذبات سے ہم چند احباب جو ایک جگہ بیٹھے تھے آبدیدہ ہوگئے، جب زبان میں حرکت کی قوت پیدا ہوئی تو ایک شخص نے ہم سب کے دل کی بات کہہ دی، اور وہ یہ تھی کہ قائداعظم کو ایک آزاد مملکت کا سردار ہونا زیب دیتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے انہیں اس مقصد کے لئے بنایا ہے۔ میں نے جب آخری دیدار میت کیا تو یہ الفاظ میرے کانوں میں گونجتے تھے، اور قائداعظم کے چہرہ پر تبسم و نور کو دیکھ کر میں نے دل میں سوچا کہ جب انکی روح باری تعالیٰ کے سامنے حاضر ہوگی تو کہے گی کہ اے خالق ارض و سما! تو نے مجھے جس خدمت پر مامور کیا تھا اسے تیری تائید سے میں نے انجام دیا اب تو اپنے پرستاروں کی حفاظت فرما کہ یہ قوم ابھی تیری تائید کی بہت محتاج ہے۔+

قیوم نظر

قائداعظم کی آواز

پہنچ چکی ہے مری خاک اپنے مرکز پر
اگرچہ مجھکو ابھی زندگی کی کمیابی
کشاں کشاں لئے پھرتی تھی کوہساروں میں

یہ تیرہ دامنِ لحد، یہ گداز تنہائی
مرے جنوں کے تقاضوں کی اب یہ تاب کہاں
کہ میں نے دیکھا ہے تم کو نئی بہاروں میں

لرزتے ہاتھوں سے بنیادِ گلستاں رکھتے
نحیف ذرّوں کو ہم دوشِ آسماں کرتے
نہیں ہے تم سے کوئی بڑھ کے میرے یاروں میں

تمہارا عشق تھا سرمایۂ حیات مرا
تمہاری بات نے دنیا کو حسنِ زیست دیا
تمہارے فکر کے چرچے ہیں چاند تاروں میں

تمہاری یاد سے ہے کیفِ انبساط مجھے
میں تم کو دیکھوں گا ہر رنگ میں چمکتے ہوئے
جواں گلوں کے تبسم تہی چناروں میں

نشانِ میل کی صورت رہوں گا چشم براہ
کہ تم کو پاؤں حسیں منزلوں کو جاتے ہوئے
مہکتی وادیوں ضوریز آبشاروں میں

میں اپنے بھولنے والے مگر نہ بھولوں گا
لپکتے کوندے کی مانند ان کو چاہوں گا
بنوں گا سیلِ بلا بھی شہاب پاروں میں

سید آلِ رضا لکھنوی

محسنِ اعظمؒ

تُو اپنا محسنِ اعظم ہے، قائدِ اعظم! ترا خیال، ترا پاسِ غم کبھی نہ مٹے

چمک جو ہوتی ہے داغِ الم میں رہ رہ کر یہ رہنمائی داغِ الم کبھی نہ مٹے

خدا سے لے کے دیا تُو نے ہم کو پاکستاں یہ وہ کرم ہے کہ یادِ کرم کبھی نہ مٹے

سمجھ کے کچھ تو، یہ نعمت عطا ہوئی ہم کو یہ فکرِ معتبر و تازہ دم کبھی نہ مٹے

اس اقتدار پہ فائز کیا ہمیں تُو نے کہ بجھ سکے تو یہ اپنا بھرم کبھی نہ مٹے

تری طرح جو سمجھ لیں مزاجِ خودداری خودی کا پاس خدا کی قسم کبھی نہ مٹے

ہوائیں خاک اُڑاتی ہیں اور اُڑائیں گی

خدا کرے ترا نقشِ قدم کبھی نہ مٹے

ممتاز حسن احسن

قائدِ اعظم کا ایک سفر

۳۰ نومبر ۱۹۴۶ء کا دن مجھے ہمیشہ یاد رہے گا کیونکہ اس روز میں نے پہلی مرتبہ قائد اعظم کو قریب سے دیکھا اور ان سے باتیں کیں۔

اسی روز میں لیاقت علی خاں صاحب کی معیت میں دہلی سے کراچی پہنچا تھا۔ ہمارے ہمراہیوں میں لارڈ ویول۔ ان کے پرائیویٹ سیکرٹری سر جارج ایبل اور ان کے نائب ملٹری سیکرٹری میجر میکنزی بھی تھے۔ اسی شام کو پنڈت نہرو اور سردار بلدیو سنگھ بھی دہلی سے کراچی پہنچنے والے تھے اور ہم سب کو دوسرے دن علی الصباح انگلستان روانہ ہونا تھا۔ اس سفر کی غرض وغایت سیاسی تھی۔ برطانوی گورنمنٹ چاہتی تھی کہ ہندوستانی حکومت ہندوستانیوں کو سونپ دی جائے مگر ہندوستان متحد رہے۔ سر سٹیفورڈ کرپس کا ۱۹۴۲ء کا مشن۔ جنگ کے خاتمے کے بعد پارلیمنٹری ڈیلیگیشن اور پھر کیبنٹ مشن ان سب کی کوشش لگاتار یہی تھی کہ ہندوستان ایک رہے، یہ لوگ ایسا کیوں چاہتے تھے یہ ایک الگ بحث ہے، مگر اس کے اصل معنی یہ تھے کہ مسلمانوں کے سیاسی مطالبات کو مسترد کر دیا جائے جب ستمبر ۱۹۴۶ء میں کانگریس اور اکتوبر ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ ہندوستان کی انٹرم گورنمنٹ میں شامل ہوئیں تو انگریزوں کی کوشش یہی تھی کہ ان دونوں پارٹیوں کو گورنمنٹ میں رکھا جائے اور ان میں سے ایک یعنی کانگریس کو دوسری یعنی مسلم لیگ پر مسلط کر دیا جائے۔ مسلم لیگ پر یہ بھی زور دیا جا رہا تھا کہ وہ متحدہ ہندوستان کی قانون ساز اسمبلی میں شامل ہو۔ مسلم لیگ کو اس سے انکار تھا کیونکہ اس سے خطرہ تھا کہ چونکہ مسلمان ہندوؤں کے مقابلے میں تھوڑے تھے، ان کی کوئی بات اس قسم کی اسمبلی میں نہیں چلے گی ہر حال کچھ اس قسم کے حالات تھے، جن کے پیشِ نظر گورنمنٹ برطانیہ نے ضروری سمجھا کہ ہندوستان کے انگریز وائسرائے اور اس کی کونسل کے کانگریسی اور مسلم لیگ پارٹیوں کے لیڈروں اور قائد اعظم کو لندن میں بلا کر آخری فیصلہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ قائد اعظم کے ساتھ گفت وشنید ہو چکی تھی اور وہ ایک حد تک لندن جانے پر رضامند ہو چکے تھے۔ ۳۰ نومبر کو جب ہم لوگ کراچی پہنچے تو وائسرائے۔ گورنر سندھ، قائد اعظم اور لیاقت علی خاں صاحب کے درمیان مزید گفت وشنید ہوئی اور قائد اعظم کے سفرِ لندن کا آخری فیصلہ ہو گیا۔

کراچی میں کچھ عرصہ ٹھیرنے کے بعد لیاقت علی خاں قائد اعظم سے ملنے گئے میں بھی ساتھ گیا۔ قائد اعظم ان دنوں سندھ کے پرانے گورنمنٹ ہاؤس میں جہاں آج کل گورنر سندھ رہتے ہیں مقیم تھے یہ مکان ان دنوں میر بندے علی خاں تالپور وزیر سندھ کے تصرف میں تھا اور انہوں نے اسے قائد اعظم کے حوالے کر رکھا تھا۔ مکان کے دروازے پر دو مسلم لیگ نیشنل گارڈ سبز وردیاں پہنے پہرہ دے رہے تھے میں نے جب لیاقت صاحب سے کہا کہ میں نے آج تک قائد اعظم سے ہاتھ نہیں ملایا، نہ کبھی کوئی بات کی ہے تو انھیں بہت تعجب ہوا اور بات واقعی عجیب تھی۔ کیونکہ میں جنگ شروع ہونے کے پہلے سے گورنمنٹ آف انڈیا میں تھا اور اس سارے عرصے میں دہلی کی سیکرٹریٹ اور اسمبلی کی غلام گردشوں میں مسلسل گردش کرتا رہا تھا۔ اسمبلی کی پارٹیوں کے اکثر ارکان کو ذاتی طور پر جانتا تھا دہلی کی سیکرٹریٹ ایک مقام تھا جہاں بڑے بڑے ہندو اور مسلمان مشاہیر اور خدامِ قوم کسی نہ کسی غرض یا بہانے سے تقریباً آتے جاتے رہتے تھے اور ان میں سے ہر ایک کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ بارگاہِ حکومت کے مقربین سے ان کے تعلقات خوشگوار رہیں۔ مگر ایک جناح تھے جنھیں کسی سے غرض تھی نہ واسطہ۔ اور جنھیں کسی نے دہلی میں وائسرائے کے علاوہ کسی کے پاس جاتے نہیں دیکھا تھا۔ اسمبلی میں بھی وہ کسی سے خوش گپیاں کرتے نہیں دیکھے گئے بلکہ اکثر تو آتے ہی نہیں تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بہت بڑے انگریز ممبر آف کونسل کو ایک مدت تک اس بات کی آرزو رہی کہ کوئی شخص انھیں جناح صاحب سے ملائے اور جب ایک دن ان کے ایک دوست کی کوشش سے ان کی یہ آرزو بر آئی تو وہ خوشی کے مارے پھولے نہیں سماتے تھے۔ ان سب باتوں کو دیکھ کر مجھے جناح صاحب کے پاس جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اگر میں مسلم لیگ پارٹی کے کسی رکن سے کہہ دیتا تو وہ یقیناً مجھے جناح صاحب سے متعارف کرا دیتے۔ مگر جب کبھی مجھے اسکا خیال آیا۔ اکثر یہی سوچا کہ آخر مجھے ان سے کیا کہنا ہے، اور ایک ایسے شخص کا وقت ضائع کرنے سے کیا حاصل ہے جسے دن رات ہندوستان کے مسلمانوں کا مستقبل محفوظ کرنے کے سوا اور کوئی چیز پیشِ نظر نہیں ہے۔

بہر حال جو ملاقات پہلے نہیں ہو سکی تھی وہ ۳۰ نومبر ۱۹۴۶ء کو ہوئی۔ لیاقت علی خاں صاحب نے میرا تعارف ان سے کرایا۔ اور انہوں نے دو چار رسمی سی باتیں مجھ سے کیں اور پہلی ملاقات ختم ہو گئی یہ ملاقات نہایت مختصر تھی اور میرے اور ان کے درمیان میری عقیدتمندی کا پردہ حائل رہا اور میں ان کی شخصیت کے ظاہری پہلو پر اچھی طرح نظر بھی نہ ڈال سکا۔

قائداعظم اور مسٹر لیاقت علی خاں نحاس پاشا کے ڈنر میں۔
تفصیل ممتاز حسن احسن صاحب کے مضمون میں ملاحظہ فرمایئے۔

قائد اعظم کے دورے

قائد اعظم ڈھاکے کے اسمبلی ہال کے دروازے پر۔ قائد اعظم کے بائیں طرف پاکستان کے موجودہ گورنر جنرل ہز ایکسلنسی الحاج خواجہ ناظم الدین ہیں جو اس وقت مشرقی بنگال کے وزیر اعظم تھے ۔

سیبی میں بلوچی قائد اعظم کے خیر مقدم کے لئے اکٹھے ہوئے ہیں ۔ ↓

↑ [illegible] ئد اعظم قبیلوں کے ایک جرگہ کے سامنے تقریر فرما رہے ہیں ۔

قائد اعظم مشرقی بنگال کی حکومت کے مختلف محکموں کے سکریٹریوں کے ساتھ ۔

دوسری صبح ہم سب کراچی سے روانہ ہونے والے تھے۔ ڈرگ روڈ کے ہوائی اڈے پر پہنچے تو وہاں لارڈ ویول، سر فرانسس موڈی گورنر سندھ، سردار بلدیو سنگھ وغیرہ پہلے سے موجود تھے۔ پنڈت نہرو ہوائی جہاز کے اندر پہلے ہی بیٹھ چکے تھے۔ جہاز روانہ ہونے میں دس بارہ منٹ باقی تھے اور قائداعظم کا انتظار تھا۔ کوئی پانچ سات منٹ رہ گئے ہوں گے کہ وہ تشریف لائے۔ ہوائی اڈے کے باہر مسلمانوں کا ایک عظیم الشان ہجوم تھا جو انھیں رخصت کرنے کے لئے موٹروں، لاریوں، گاڑیوں، بائیسکلوں وغیرہ پر کراچی سے ڈرگ روڈ پہنچا ہوا تھا۔ قائداعظم جہاز کی طرف آنے سے پہلے مسلمانوں کے مجمع کے سامنے تشریف لے گئے اور فضا اللہ اکبر، قائداعظم زندہ باد، پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی۔ یہ عالم دیر تک قائم رہا اور جہاز کو کچھ دیر بھی ہوگئی۔ آخر قائداعظم اندر تشریف فرما ہوئے اور جہاز کچھ عرصے کے بعد چل پڑا۔ قائداعظم کے ساتھ ان کے پرائیویٹ سیکرٹری خورشید حسن تھے جو آجکل سرینگر میں قید ہیں۔

جہاز میں جناح صاحب سب سے آگے بیٹھے تھے اور ان کے ساتھ کی نشست خالی تھی پیچھے پنڈت نہرو اور ان کے پیچھے لارڈ ویول بیٹھے تھے۔ میں نے دیکھا کہ جناح صاحب نے اپنے کاغذ نکالے اور انھیں پڑھنا شروع کیا۔ وہ کوئی ناول نہیں پڑھ رہے تھے بلکہ اپنے لندن کے مشن کے لئے تیاری کر رہے تھے۔ جہاز میں ان سے کچھ فاصلے پر ہونے کی وجہ سے میں یہ تو نہ دیکھ سکا کہ وہ اپنا مخصوص مانوکل لگائے پورے انہماک سے گرد و پیش سے بے نیاز کس کام میں معروف ہیں اور کن کاغذات کا مطالعہ کر رہے ہیں مگر یہ ضرور دیکھا کہ وہ پنسل سے کاغذات پر نشان بھی کرتے جاتے تھے اور نوٹ بھی لے رہے تھے۔ خورشید صاحب نے مجھے بتایا کہ ان کے ساتھ اس وقت ایک بھرا ہوا بکس کاغذات کا تھا جو اکثر اہم موقعوں پر قائداعظم کے ہمراہ رہتا تھا۔

جہاز اُڑتا رہا اور جناح صاحب انہماک سے اپنا کام کرتے رہے حتیٰ کہ بصرہ آگیا اور ہم لوگ وہاں ایک گھنٹہ کے لئے اترے۔ یہاں ایک معقول تعداد ہندوستانی مسلمانوں کی موجود تھی جنہوں نے ان کے استقبال میں پُرجوش نعرے لگائے۔ مسلمان سپاہی بھی تھے انہوں نے بھی اپنے قومی جذبات کا مظاہرہ کیا۔ کچھ ہندو اور سکھ سپاہیوں نے پنڈت نہرو اور سردار بلدیو سنگھ کا خیرمقدم کیا اس پر لارڈ ویول کے انگریز ہمراہیوں میں سے ایک صاحب کہنے لگے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی فوج سیاسیات کی نذر ہو چکی ہے۔ میں نے انھیں تسلی دینے کی کوشش کی۔

بصرہ کے ایک گھنٹے کے قیام میں لوگوں نے قائداعظم کو بیٹھنے نہیں دیا۔ مسلمانوں نے آگے بڑھ بڑھ کر ان سے مصافحہ کیا، ان سے باتیں کیں، ان کی تصویریں اتاریں اور شاید ان حضرات کا پروگرام ابھی نامکمل ہی تھا کہ گھنٹہ ختم ہوگیا اور ہم سب ہوائی جہاز میں بیٹھ کر پھر اُڑنے لگے۔

جناح صاحب کو میں نے دیکھا تو پھر حسب معمول معروف پایا۔ دوپہر کے کھانے اور سہ پہر کی چائے کے علاوہ شاید ہی ان کے کام میں کوئی وقفہ آیا ہو۔ ساڑھے چار بجے تک یہی سلسلہ رہا۔ اتنے میں ہم قاہرہ پہنچ گئے۔

قاہرہ پر مصریوں نے قائداعظم کا پُرجوش استقبال کیا۔ اخوان المسلمین کے لیڈر شیخ حسن البنا کی طرف سے قائداعظم کی خدمت میں ایک مصری قرآن شریف پیش کیا گیا کچھ ہندوستانی مسلمان بھی تھے مگر ان میں اکثر مشتبہ اور مشکوک قسم کے انسان واقع ہوئے تھے۔ ان میں دو چار کے متعلق مجھے خاصا چوکنا رہنا پڑا۔

قاہرہ کے ہوائی اڈے سے ہمیں شیپرڈ ہوٹل میں لایا گیا جہاں قائداعظم اور لیاقت علیخاں صاحب کے کمرے ساتھ ساتھ تھے اور خورشید صاحب اور میں بھی قریب ہی کے کمروں میں تھے وہاں اترے ہی تھے کہ قائداعظم کے لئے ملاقاتیوں، پریس کے نامہ نگاروں، فوٹوگرافروں، ایڈیٹروں اور مصر کے سیاسی قائدین کا ایک تانتا بندھ گیا اور انھیں ایک منٹ کی فرصت بھی مشکل سے ملی۔ ایک خاص بات جو میں نے دیکھی یہ تھی کہ قائداعظم جس کسی کو کوئی بیان دیتے تھے اسے کہتے تھے کہ اسے لکھ کر مجھے دکھاؤ۔ پھر چھاپو۔ پھر مسودہ انھیں دکھایا جاتا تھا اور وہ اسکی تصحیح کرکے خورشید صاحب کے حوالے کرتے تھے تاکہ ٹائپ ہوکر ان کے سامنے دوبارہ منظوری کے لئے پیش کیا جائے اور وہ اس کے چھاپے جانے کی اجازت دیں۔ یہ کام خود ان کے لئے اور دوسروں کے لئے بڑی محنت کا تھا۔ مگر ان کا حکم تھا اور اس کی تعمیل لازم تھی۔

دس بجے کے قریب قائداعظم ہم سب کو ساتھ لے کر ہوٹل کے کھانے کے کمرے میں گئے۔ ابھی میز پر بیٹھے ہی تھے کہ خبر آئی کہ عبدالرحمان عزام پاشا سیکرٹری عرب لیگ ملاقات چاہتے ہیں انھیں بھی وہیں کھانے کے کمرے میں بلا لیا گیا اور قائداعظم نے میز پر بیٹھے بیٹھے ان سے باتیں کیں۔

کھانے کے بعد وہی ملاقاتیوں کا سلسلہ جاری رہا اور اسی صورت [illegible] کا ایک بج گیا۔ اس سارے عرصے میں قائداعظم یا تو کھانے کے کمرے میں گئے تھے۔ یا شاہِ مصر کے محل پر ملاقاتیوں کی کتاب میں نام لکھنے۔ باقی سارا وقت ان کا اپنے کمرے میں ہی گذرا تھا۔ ایک بجے کے قریب انہوں نے پوچھا کہ کوئی اور شخص تو ملنا نہیں چاہتا۔ ہم نے کہا صرف کچھ مسلمان سپاہی باقی رہ گئے ہیں جن کی ابھی تک باریابی نہیں ہو سکی یہ سُن کر قائداعظم کمرے سے باہر نکل آئے۔ ان سپاہیوں کو وردیوں میں دیکھ کر بہت خوش ہوئے انہیں سے ہر ایک کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ ان کا حال پوچھا اور انھیں رخصت کرکے کمرے میں واپس تشریف لائے۔ اس کے بعد ہمیں بھی چھٹی ملی۔ واقعہ یہ ہے کہ خورشید صاحب کی اور میری آنکھیں نیند سے بند ہوئی جارہی تھیں۔ مجھے سب سے زیادہ حیرت اس بات کی تھی کہ اس روز جناح صاحب نے کم و بیش بیس گھنٹے کام کیا تھا۔ اور میری سمجھ میں

نہیں آتا تھا کہ ایک دبلے پتلے کمزور شخص کے انسان کے لئے یہ کیونکر ممکن ہے۔

ابھی ہم لیٹے ہی تھے کہ ہوٹل والوں نے جگا دیا۔ ساڑھے تین بجے صبح ہمیں ہوٹل سے ہوائی اڈے پر جانا تھا اور چار بجے جہاز کی روانگی تھی۔ جہاز میں پہنچ کر میں نے دیکھا تو باقی سب لوگ نیند کے مختلف درجوں میں تھے۔ آنکھیں پوری کھلتی بھی نہیں تھیں مگر قائداعظم معلوم ہوتا تھا حجامت بنا چکے ہیں اور شاید نہا بھی چکے ہیں کیونکہ ان کے چہرے یا لباس سے یہ بالکل ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ ایک بجے رات تک کام کرتے رہے ہیں۔ بہر حال ہم لوگ تو جہاز میں خوب سوئے، صاف دن گئے آنکھ کھلی۔ اس وقت مالٹا قریب تھا۔ وہاں پہنچنے سے کچھ پہلے ہوائی جہاز کے چار انجنوں میں سے ایک انجن بیکار ہو گیا اور ہمیں مالٹا میں ٹھیرنا پڑا۔ قائداعظم گورنر مالٹا کے ہاں ٹھیرے۔ انجن کی مرمت نہ ہو سکی تو ایک اور جہاز جو مارسیلز کے قریب پہنچ چکا تھا مارسیلز پر اترنے سے پہلے واپس بلا لیا گیا۔ اور اس کے پہلے مسافروں کو اس میں سے نکال کر ہم سب کو اس میں سوار کرا دیا گیا۔ اس وقت تک رات کے بارہ سے اوپر کا وقت ہو چکا تھا۔ اگلے دن صبح سویرے ہم لندن میں ہیتھرو کے ہوائی اڈے پر اترے۔ لارڈ پیتھک لارنس اور کچھ اور برطانوی وزرا وہاں استقبال کے لئے موجود تھے۔ قائداعظم اور لیاقت علی خاں صاحب کو "کلیرجز" ہوٹل میں جو شاید لندن کا سب سے اونچا ہوٹل ہے ٹھیرایا گیا۔ ہمارے کمرے بھی اسی ہوٹل میں تھے۔ میرے پاس ایک ڈبل بیڈ روم تھا۔ دوسرے دن جب "ڈان" کے ایڈیٹر الطاف حسین صاحب لندن پہنچے تو وہ بھی میری دعوت پر میرے ہی کمرے میں آ گئے۔ جن کمروں میں قائداعظم اور لیاقت علی خاں صاحب کو ٹھیرایا گیا تھا انہیں ہوٹل میں "رائل سوئٹ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے کیونکہ اس میں یورپ کے اکثر حکمران تخت و تاج سے محروم ہونے سے پہلے یا بعد ٹھیر چکے ہیں۔ یونان کا بادشاہ جارج وہاں تین چار سال تک رہا۔

چونکہ لندن کا سفر محض سیاسی تھا اس لئے قائداعظم کا وقت زیادہ تر سیاسی گفتگوؤں اور برطانیہ کے سیاسی لیڈروں سے ملاقاتوں میں صرف ہوا۔ کبھی کبھی وہ تھیٹر بھی تشریف لے جاتے یا ایک آدھ مرتبہ بازار پیدل گئے جس کی وجہ سے ان کے محافظ پولیس کے سپاہیوں کو کافی تشویش ہوئی۔ برطانوی گورنمنٹ نے دو اعلیٰ موٹر کاریں قائداعظم اور لیاقت علی خاں صاحب کے لئے مخصوص کر رکھی تھیں اور دو سکاٹ لینڈ کے سپاہی بھی حفاظت پر مامور تھے۔ میں نے اور خورشید صاحب نے سازش کی اور ایک موٹر کار اپنے استعمال میں لے لی اور جب وقت ملتا اس میں لندن کی سیر کر لیتے۔ اس کے علاوہ یہ کمال یہ کیا کہ ان دو سپاہیوں میں سے ایک کو اپنی مشاورت اور رہبری کے لئے لے لیا۔ تاکہ ہمیں سیر میں مدد دے۔ قائداعظم کی خدمت میں جب ہم نے ان کی اطلاع کے لئے اس بندوبست کا تذکرہ کیا تو انہوں نے ایک مشفقانہ مسکراہٹ سے ہمیں دیکھا اور ہم نے سمجھا کہ معاملہ ٹھیک ہو گیا۔

قائداعظم لندن میں صبح سات بجے سے پہلے اٹھتے تھے۔ سات بجے ان کے کمرے میں چائے پہنچائی جاتی تھی، وہ آٹھ بجے تک کپڑے پہن اور اخبار پڑھ کر اپنی ڈاک دیکھ رہے ہوتے تھے۔ خورشید صاحب کو ان کی ڈاک کھولنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ ہر خط کو سب سے پہلے خود دیکھتے اور پھر یا خود اس کا جواب لکھاتے یا سیکرٹری کو حکم لکھ دیتے۔

ان کی پوشاک نہایت اعلیٰ درجے کی ہوتی تھی۔ ان کی وضع۔ انداز گفتگو اور طبیعت کی متانت کچھ اس درجہ پر تھی کہ میں نے جب کبھی انہیں کسی بڑے سے بڑے برطانوی سیاست داں سے باتیں کرتے دیکھا یہی محسوس ہوا کہ وہ ان کے برابر کا آدمی نہیں ہے۔ برطانوی وزرا کی شخصیت اور ان کی قابلیت سے وہ کوئی زیادہ متاثر بھی نہیں تھے۔

قائداعظم کی گفتگو میں یہ خاص بات تھی کہ جو کچھ وہ کہتے تھے وہ نہایت واضح اور قطعی ہوتا تھا۔ ایک ایک لفظ کو صاف صاف اور علیحدہ علیحدہ ادا کرتے تھے، اور مخاطب تک اپنا مافی الضمیر اس خوبی سے پہنچاتے تھے کہ کسی غلط فہمی یا ابہام کا امکان نہیں رہتا تھا۔ پڑھتے وقت یا کسی خاص مسئلے پر غور کرنے کے دوران میں ان کی انگلیاں بے اختیار مانوکل کی طرف جاتی تھیں۔ وہ مانوکل پہنے ہوئے ایسے باوقار معلوم ہوتے تھے کہ تصویر اتارنے کو جی چاہتا تھا۔ ان کی مسکراہٹ میں ایک بے مثال دلکشی تھی مگر کوئی شخص بغیر ان کے مسکرائے ان کے سامنے ہنس یا مسکرا نہیں سکتا تھا۔ ان کے ہاتھوں کی انگلیاں حسین تھیں، اور وہ گفتگو کے دوران میں کسی بات پر زور دینے کے لئے یا اپنا مطلب واضح کرنے کے لئے اپنی انگلیوں کو حرکت دیتے تھے۔ اور مخاطب کی طرف انگشت شہادت سے اشارہ کرتے تھے۔ آنکھوں میں ایک عقابی سی چمک تھی۔ ان کی نظر ہر کام کے اصول کے علاوہ جزئیات پر رہتی تھی۔ ان کی طبیعت میں ایک سلیقہ اور ایک باضابطگی تھی جس کی شہادت نہ صرف ان کے سیاسی کارناموں میں بلکہ ان کی روزانہ زندگی میں بھی ملتی تھی۔

لندن کے قیام کے دوران میں سرکار برطانیہ کی طرف سے قائداعظم کی خوب مہمانداری کی گئی۔ لنکاسٹر ہاؤس میں ڈنر ہوا۔ پھر ہاؤس آف کامنز میں دعوت ہوئی پھر بادشاہ نے لنچ پر بلایا۔ پھر انڈیا ہاؤس میں ہندوستانی ہائی کمشنر نے چائے کی دعوت دی۔ عام طور پر قائداعظم اور لیاقت علی خاں کی دعوت الگ ہوتی تھی، اور پنڈت نہرو اور سردار بلدیو سنگھ کی الگ۔ ایک دفعہ غلطی سے مجھے پنڈت نہرو کی پارٹی کا دعوت نامہ بھیج گیا۔ میں نے فوراً گورنمنٹ برطانیہ کے افسر متعلقہ سے اس کا تذکرہ کیا۔ اور اس نے بڑے ہی تپاک سے میرا شکریہ ادا کیا۔ ورنہ اگر میں وہ دعوت قبول کر لیتا تو شاید ان لوگوں کے لئے کچھ اچھا نہ ہوتا۔ سوائے بادشاہی لنچ اور انڈیا ہاؤس کی پارٹی کے مجھے کوئی پارٹی ایسی یاد نہیں ہے جہاں قائداعظم۔ لیاقت علی خاں صاحب، پنڈت نہرو اور سردار

بلدیاں سنگھ بھی موجود ہوں۔

لندن کی سیاسی گفتگوؤں کا فیصلہ ۶ دسمبر کو ہو گیا۔ مگر قائداعظم نے فیصلہ فرمایا کہ وہ لندن میں کچھ دن اور قیام کریں گے اور وہ کل دو ہفتے تک وہاں ٹھیرے۔ اس قیام کے تین واقعات مجھے خاص طور پر یاد ہیں۔ پہلا واقعہ قائداعظم کی ایک پبلک تقریر تھی جو لندن کے کنگزوے ہال میں ہوئی۔ اس میں دو تین ہزار کے قریب آدمی موجود تھے۔ قائداعظم نے ایک وکیل کی طرح تقریر شروع کی۔ ابتدا میں واقعات بیان کئے اور ان کا جائزہ لیا۔ اس کے بعد انکی گفتگو میں ایک گرمی اور آواز میں ایک کڑک آ گئی۔ تقریر کے دوران میں کسی ہندو نے جو ایک طرف بیٹھا تھا کچھ شور مچایا۔ ایسے موقعوں پر بہت سے لیڈر آپے سے باہر ہو جاتے ہیں مگر میں نے دیکھا کہ قائداعظم نے اسکا بالکل کوئی نوٹس نہیں لیا۔ وہ دو لمحوں کے لئے رک گئے اتنے میں ہمارے والنٹیرڈں نے اس فسادی شخص کو ہال سے باہر کر دیا۔ اور قائداعظم کے ماتھے پر نہ تو اس وقت کوئی بل آیا نہ ان کی تقریر میں کوئی فرق پڑا اور نہ اس کے بعد اس واقعہ کا کوئی تذکرہ کیا۔

دوسرا واقعہ جمعہ کی نماز کا ہے۔ قائداعظم کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ وہ جمعہ کی نماز لندن کی کسی مسجد میں ادا کریں۔ انہوں نے گرمجوشی سے یہ تجویز منظور فرمائی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ میں اس مسجد میں جانا پسند کروں گا جہاں عام مسلمان نماز پڑھتے ہوں ہم نے ایسٹ اینڈ کی ایک مسجد جو غریب مسلمانوں کی آبادی ہوئی ہے منتخب کی۔ وہاں قائداعظم پہنچے تو خطبہ ہو رہا تھا۔ کچھ لوگ کھڑے ہو گئے اور انہوں نے اگلی صفوں میں ان کے لئے جگہ خالی کر دی۔ مگر انہوں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ میں دیر سے آیا ہوں اس لئے جہاں مجھے جگہ ملی وہی میرے لئے مناسب ہے۔ نماز کے بعد لوگوں نے ان سے نہایت پُرجوش معانقے کئے۔ ایک شخص پر معانقے کے بعد رقت طاری ہو گئی اور اس نے مسجد میں ہاتھ اٹھا کر دعا کی کہ اے خدا تو میری زندگی محمد علی جناح کو بخش دے۔ اکثر حاضرین آبدیدہ ہو گئے۔

تیسرا واقعہ ڈاکٹر بک مین سے متعلق ہے جو "مارل ری آرمامنٹ" کی تحریک کے علمبردار ہیں۔ انہوں نے قائداعظم کو ویسٹ منسٹر تھیٹر میں اپنی تحریک سے متعلق ایک ڈرامہ دیکھنے کی دعوت دی۔ کھیل ختم ہوا تو ہمیں وہ کھانا کھلانے اپنے مکان پر لے گئے۔ اس مکان میں کسی زمانے میں لارڈ کلائیو رہا کرتا تھا۔ یہاں ڈاکٹر بک مین کے حاشیہ نشین جن میں نوجوان عورتیں بھی تھیں۔ میزبانی کے فرائض ادا کرنے لگیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ اپنی تحریک کے اوصاف بھی بیان فرماتی جاتیں۔ ڈاکٹر بک مین نے بھی جناح صاحب سے یہی تذکرہ چھیڑا۔ کچھ عرصے تک اسی تحریک کے متعلق گفتگو رہی۔ اور ڈاکٹر بک مین تبلیغ کرتے رہے مگر کچھ عرصے کے بعد مجھے یک لخت محسوس ہوا کہ گفتگو ڈاکٹر صاحب کی تحریک پر نہیں بلکہ پاکستان کی ضرورت اور اس کے قیام کے امکان پر ہو رہی ہے۔ اور خود قائداعظم بات کر رہے ہیں۔ اس کے بعد باقی کے دو تین گھنٹے تک میں نے سوائے پاکستان کے کوئی بات نہیں سنی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قائداعظم کسی اور موضوع پر دھیان دینے کے لئے تیار ہی نہیں ہیں محض رسمی طور پر اور اپنے میزبان کو خوش کرنے کے لئے بھی نہیں۔

ہاں ایک اور معمولی سا واقعہ یاد آیا۔ بادشاہ کا لنچ پہلے جس دن مقرر ہوا تھا اتفاق سے اس روز محرم کی دسویں تاریخ تھی۔ یہ تاریخ پہلے سے مقرر ہو چکی تھی۔ جب ہمیں معلوم ہوا تو ہم نے قائداعظم کی خدمت میں گذارش کی۔ انہوں نے فی الفور لارڈ ویول سے جو ان کے قریب تھے بات کی۔ اور کہا کہ مجھے افسوس ہے۔ میں بادشاہی دعوت میں اس روز شریک نہ ہو سکوں گا۔ یہ واقعہ سفر کے دوران کا ہے۔ لارڈ ویول نے فوراً لندن تار دیا اور ہمارے لندن پہنچنے سے پہلے تاریخ بدلی جا چکی تھی۔

سیاسی میدان میں قائداعظم نے لندن جا کر فتح پائی اور درحقیقت اسی سفر میں پاکستان کی عمارت کی بنیاد اٹھائی گئی۔ واپسی پر انہوں نے فیصلہ کیا کہ مصر میں تین دن ٹھیریں۔ قاہرہ میں عرب لیگ کی طرف سے دعوت آ چکی تھی۔ قاہرہ میں ہمیں اسی شیپرڈ ہوٹل میں ٹھیرایا گیا۔ قائداعظم کے لئے جو کمرہ مقرر کیا گیا تھا وہ انھیں پسند نہ آیا اور انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ انہیں وہی کمرہ دیا جائے جہاں وہ لندن جاتے ہوئے ٹھیرے تھے۔ ان کی یہ خواہش فی الفور پوری کی گئی اور مجھے اور خورشید صاحب کو بھی ان کے اور لیاقت علی خاں صاحب کے کمروں کے برابر میں کمرہ دیا گیا۔

مصر میں قائداعظم کا یہ تین دن کا قیام ایک تاریخی قیام ہے کیونکہ انہوں نے ان تین دنوں میں مصری مسلمانوں کے دلوں پر مکمل طور پر قبضہ کر لیا۔ یہاں وہ بادشاہ مصر وزیراعظم اور دوسرے وزرا سے ملے مفتی اعظم سے ملاقات کی، اور حزب اختلاف کے لیڈر مصطفیٰ نحاس پاشا نے بھی ان کی دعوت کی مصطفیٰ نحاس ان مصری قائدین سے ہیں جن کا عرصے تک کانگریس سے رابطہ رہا ہے۔ وہ مسلم لیگ سے بدظن تھے۔ ان کے ہاں کھانا بڑا پُرتکلف تھا، اور ان کا گھر بھی محل سا معلوم ہوتا تھا۔ کھانا کھا چکے تو وہ قائداعظم کو تخلیے میں لے گئے جہاں ان دونوں کے علاوہ صرف ایک شخص اور تھا جو ترجمانی کے فرائض ادا کرتا تھا۔ ان دونوں کی گفتگو رات کے ایک بجے تک ہوتی رہی۔ قائداعظم نے بعد میں کہا کہ اس نے بہت سے سوالات نہایت معاندانہ نقطۂ نگاہ سے کئے۔ بہرحال اگلے دن جب مصطفیٰ نحاس قائداعظم سے ان کے ہوٹل میں ملنے آئے تو ان کا انداز بالکل بدلا ہوا تھا۔ انہوں نے آتے ہی قائداعظم سے معانقہ کیا اور انھیں بوسہ دیا۔ پھر وہ اسی گرمجوشی سے لیاقت علی خاں صاحب سے ملے۔

یہی حال مصری اخباروں کا تھا۔ قائداعظم کے ورود سے قبل جو مصری اخبار کانگریس کے ہمنوا تھے جو ان کے اور مسلم لیگ کے سخت مخالف تھے اور جن میں سے بعض کو شاید اس سلسلے میں

مالی امداد بھی ملتی تھی۔ تین دن کے اندر اندر ان کا دم بھرنے لگے۔

مصر کے وزیر اعظم نے قائد اعظم کی دعوت کی۔ ایک اور وزیر اباظا پاشا اور عرب لیگ نے بھی۔

ایک شام کو مجھے خیال آیا کہ اہرام مصر کو دیکھنا چاہیئے۔ چنانچہ میں نے چند گھنٹے کی چھٹی مانگی۔ قائد اعظم نے فرمایا کہ جاؤ مگر شرط یہ ہے کہ تم ان کے اوپر چڑھنے کی کوشش نہیں کروگے۔ یہ بات انہوں نے اس انداز سے کہی جیسے انھیں یقین ہے کہ اگر وہ مجھے تنبیہ نہیں کرینگے تو شاید میں اہرام پر چڑھنے سے باز نہیں آؤں گا اور اسکا نتیجہ یقیناً یہ ہوگا کہ ان کے ہمراہیوں میں سے ایک کی کمی ہو جائے گی۔ ان کے انداز میں کچھ ایسی بات تھی کہ میں نے پکا وعدہ کیا کہ ہرگز اہرام پر چڑھنے کی کوشش نہیں کروں گا اور اس وعدہ کو نبھایا۔

ہم لوگوں کو ان سے کام کے علاوہ ملنے کا موقع شاذ ہی ملتا تھا۔ مگر ہمیں نہ معلوم کیوں یہ تسلی ہر وقت رہتی تھی کہ انکی شفقت ہر وقت شاملِ حال ہے جب وہ ہمیں کھانے پر اکٹھا بلاتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کوئی سردار اپنے قبیلے کو اکٹھا کر رہا ہو۔ وہ ہم سے ملتے کم تھے مگر ہماری طرف سے بے خبر کبھی نہیں تھے۔ ایک مرتبہ خورشید صاحب کی طبیعت معمولی طور پر خراب تھی۔ انھیں معلوم ہوا تو وہ خود اپنے کمرے سے اٹھ کر خورشید صاحب کے کمرے میں انکی مزاج پرسی کے لئے تشریف لائے۔ جو لوگ قائدِ اعظم کی مصروفیت اور ان کی زندگی کے نظم و ضابطہ سے واقف ہیں۔ وہ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان کا خود خورشید صاحب کے کمرے تک آنا کس قدر شفقتِ بزرگانہ کا پتہ دیتا تھا۔ خورشید صاحب کے پاس انگلستان کی سردی سے مقابلہ کرنے کے لئے مناسب گرم کپڑے نہیں تھے۔ جب قائد اعظم کو معلوم ہوا تو انھوں نے کراچی ہی میں انھیں اپنا ایک نفیس اوورکوٹ اور شاید کچھ اور کپڑے بھی دیئے۔

قاہرہ سے واپسی پر بی۔ او۔ اے۔ سی۔ کے لوگوں نے ایک حماقت کی۔ رات کا سفر تھا اور ان کا وعدہ تھا کہ وہ ایسا ہوائی جہاز مہیا کریں گے جس میں آرام سے سونے کا انتظام ہوگا۔ جب ہم ہوائی جہاز میں داخل ہوئے تو معمولی قسم کا تھا۔ جس میں قائد اعظم کو کرسی پر بیٹھ کر رات کاٹنی پڑی اور وہ بہت تھک گئے۔

جب ہم کراچی پہنچے تو قائد اعظم وہیں اتر پڑے۔ لیاقت علی خاں صاحب کو دہلی جانا تھا اور مجھے ان کے ساتھ۔ جہاز کراچی کے اڈے پر رکا تو قائد اعظم اٹھے۔ جہاز سے باہر نکلنے سے پہلے میری طرف تشریف لائے اور کہنے لگے کہ شاید اب تم سے ملاقات نہ ہوسکے۔ خدا حافظ۔ انہوں نے ہاتھ ملایا۔ میں نے خدا حافظ کہا۔ اور وہ جہاز سے اتر کر میرے دیکھتے ہی دیکھتے مسلمانوں کے ایک بہت بڑے ہجوم کی طرف بڑھے اور غائب ہوگئے۔

(حلقۂ اربابِ ذوق کراچی میں پڑھا گیا)

زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر
خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر (اقبال)

ظہیر فتحپوری

میرِ کارواں کی موت

ذہن و دل سو گئے، راہوں نے قدم تھام لئے
شورشِ غم میں نگاہوں کی ضیا ڈوب گئی
صبحِ خنداں کی طرف یاس کے سائے لپکے
انجمنستانوں میں ظلمات کی برسات ہوئی

سوچتے سوچتے غنچوں نے بدل لی صورت
غم سے پتھرا گئی تابندہ ستاروں کی نظر
موت کی جابر و بے رحم نظر کے ہاتھوں
چھن گئی ساز سے نغماتِ شگفتہ کی لہر

اس سے پہلے بھی بہت رنج سہے ہیں دل نے
اس سے پہلے بھی غم و فکر نے یورش کی ہے
لیکن ان ہاتھوں نے ساغر کو چھلکنے نہ دیا
یاد بھی جن کی نیا عزم عطا کرتی ہے

—— اور اگر یورشِ طوفاں ہی سمجھے کرنی تھی
اتنا تاریک تو راہوں کو نہ کرتا، یارب!
عزمِ محکم تو دیا تو نے دلوں کو، لیکن
غم کو پیوستِ رگِ جاں تو نہ کرتا، یارب!

دیکھ لے، حال، بھٹکتے ہوئے مستقبل کو
پھر نگاہوں کو وہ جرأت وہ جوانی دیدے
کشتیٔ گردشِ دوراں کے چلانے والے
ان سکوں یافتہ لہروں کو روانی دیدے

ایس۔ ایم۔ یوسف

قائدِ اعظم رح

یہ ستمبر ۱۹۴۷ء کی ایک صبح کا ذکر ہے میں ان دنوں آنریبل وزیرِ اعظم پاکستان کے پرائیویٹ سکریٹری کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ مجھ سے وزیرِ اعظم نے فرمایا کہ تمہیں اب قائدِ اعظم کے پرائیویٹ سکریٹری کی حیثیت سے کام کرنا ہے۔ یہ خبر میرے لئے بالکل غیر متوقع تھی اور اُسے سنتے وقت میرے دل میں خوشی اور گھبراہٹ کے ملے جلے جذبات پیدا ہو رہے تھے۔ مجھے اس سے پہلے کبھی قائدِ اعظم سے ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوا تھا۔ اور دوسروں کی زبانی میں نے جو کچھ سُن رکھا تھا اس سے مجھے یہ اندازہ تھا کہ قائدِ اعظم ایک سخت گیر آقا ہیں۔ اور اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ جہاں ایک طرف مجھے اپنی اس عزّت افزائی پر حد درجہ کی مسرت تھی۔ وہاں دوسری طرف اس خیال سے کہ معلوم نہیں میں اپنے نئے آقا کو مطمئن کر سکوں گا یا نہیں، ایک طرح کی گھبراہٹ اور جھجک بھی تھی۔ لیکن اپنی ذمہ داری کو پورے عزم اور استقلال سے پورا کرنے کا ارادہ کر کے میں ۲۵ ستمبر کو گورنر جنرل ہاؤس پہنچ گیا۔ قائدِ اعظم سے میری پہلی ملاقات بہت مختصر تھی۔ وہ انتہائی مہربانی سے پیش آئے اور اس امید کا اظہار فرمایا کہ میں اپنے منصب کو اچھی طرح پورا کر سکوں گا۔

میں نے کام شروع کر دیا۔ کام کے ابتدائی زمانے میں قائدِ اعظم کے پاس جو کاغذات آتے تھے ان کا تعلق زیادہ تر مرکزی یا صوبائی قانونوں کی وضع و تشکیل سے ہوتا تھا۔ مملکت کو اس وقت جو نئے نئے مسئلے درپیش تھے ان کے پیشِ نظر بڑی سرعت اور تیزی سے یا تو نئے قانون بنانے کی ضرورت تھی یا مروجہ قانون میں ترمیم کی۔ یہ کاغذات میں قائدِ اعظم کے سامنے پیش کرتا تھا۔ اسی زمانہ میں مجھے اندازہ ہوا کہ قائدِ اعظم کو قدرت نے کیسا غیر معمولی دماغ عطا کیا تھا۔ عبارت کا کوئی بے ڈھنگا جملہ یا کوئی مبہم ترکیب ان کی باریک بین نظر سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی۔ ان کی نظر اکثر معاملے کے کسی ایسے نکتہ کی طرف جاتی تھی جس کی طرف اس سے پہلے نہ وزارت کی نظر گئی تھی نہ میری۔ ان کے لئے کوئی تفصیل بے جا طول یا غیر ضروری نہ تھی۔ اور اسی لئے وہ جب تک معاملے کے ہر پہلو کی تہ تک نہ پہنچ جاتے کاغذ پر دستخط نہ کرتے۔ قائدِ اعظم کی یہ دقتِ نظر اکثر وزارتوں کے لئے خاصی پریشانی کا باعث بنتی تھی۔ حوالہ کی کتابیں اور معاملہ متعلقہ کے سارے کاغذات چونکہ دہلی میں رہ گئے تھے اسلئے وزارتیں بڑے مشکل حالات میں کام کر رہی تھیں۔ لیکن قائدِ اعظم کے اس سخت احتساب کی وجہ سے انھیں بے حد چوکنا رہنا پڑتا تھا اور وہ کبھی کسی معاملہ کو پوری طرح سمجھے بوجھے بغیر قائدِ اعظم کے سامنے پیش نہیں کرتی تھیں۔ قائدِ اعظم کے سامنے مبہم بیانات اور دلائل یا ناکافی اور نامکمل معلومات لے جانے والے کی دال گلنی ناممکن تھی۔

قائدِ اعظم کے متعلق عموماً یہ مشہور رہا ہے کہ وہ کسی دوسرے کے نقطۂ نظر پر غور کرنے یا دوسروں کے مشوروں پر عمل کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ تجربے نے مجھے جو کچھ بتایا ہے اسکی بنا پر میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس بات میں صداقت کا شائبہ بھی نہیں۔ ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔ اُس سے آپ کو خود اندازہ ہو سکے گا۔ ہوا یوں کہ ایک دن کسی بیرونی اخبار کے نمائندے نے قائدِ اعظم سے ملاقات کا وقت مانگا۔ جن مختلف موضوعوں پر گفتگو ہوئی ان میں کشمیر کا مسئلہ بھی تھا۔ سب جانتے ہیں کہ کشمیر کے معاملہ میں قائدِ اعظم کے خیالات بے حد واضح تھے اور آن کا اظہار بھی وہ اسی وضاحت سے فرماتے تھے۔ کشمیر کا معاملہ ابھی تک سلامتی کی کونسل کے سامنے پیش نہیں ہوا تھا اور اسی سلسلہ میں گفتگو کرنے کے لئے دو تین دن کے بعد ہمارے وزیرِ اعظم، پنڈت جواہر لال نہرو سے ملنے والے تھے۔ اس لئے میں نے قائدِ اعظم سے عرض کیا کہ کشمیر کے معاملہ پر دونوں مملکتوں کے وزیرِ اعظموں کے درمیان گفتگو ہونے والی ہے اس پر آپ کے اظہارِ خیال کا اچھا اثر نہیں پڑے گا۔ قائدِ اعظم نے جوں ہی یہ بات سُنی اپنے بیان کے اس حصہ کو جس میں کشمیر کا ذکر تھا خارج کر دیا۔

قائدِ اعظم خود بے حد جانفشانی سے کام کرنے کے عادی تھے اور جو لوگ اُن کے آس پاس رہتے اُن سے بھی اسی جانفشانی کی توقع رکھتے تھے۔ فرض کی پکار ان کے لئے ہر آواز سے زیادہ مقدّم تھی۔ چنانچہ پاکستان کی مجلسِ آئین ساز میں گاندھی جی کی موت کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے یہ فرمایا کہ گاندھی جی نے فرض کی آواز کو لبیک کہا، اور جس چیز کو اپنا فرض سمجھا اس کی ادائیگی میں اپنی جان قربان کر دی۔ بیماری یا کمزوری بھی قائدِ اعظم کو فرض کی بجا آوری سے نہیں روک سکتی تھی۔ وہ آخر دم تک کام کرتے رہے ہو موت سے کچھ پہلے تک بھی اہم سرکاری کاغذات پر غور فرمانے سے گریز نہ کیا۔ یہ ضرور ہے کہ جب قائدِ اعظم کی صحت اچھی نہ ہوتی تو کام کرتے وقت وہ کبھی کبھی جھنجھلانے لگتے تھے۔ لیکن ہر جھنجھلاہٹ اور غصہ بہت سی شفقتوں اور مہربانیوں کا پیش خیمہ ہوتا تھا۔ میرے ساتھ ان کا برتاؤ ہمیشہ نرمی، مہربانی اور اخلاق سے مملو رہا۔ وہ فطرتاً تنہائی پسند تھے۔ لیکن کبھی کبھی، اور خاص کر کھانے کے وقت وہ ماضی کے واقعات بیان کرتے یا اپنی مخصوص ذہنی کیفیتوں کا اندازہ ہوتا۔ گو رنر جنرل ہونے کے بعد وہ لوگوں سے بہت کم ملتے تھے۔ لیکن ان کا ہاتھ ہمیشہ عوام کی زندگی کی نبض پر تھا۔ وہ ان کے جذبات اور نفسیات سے پوری طرح واقف تھے اور اکثر کہا کرتے تھے کہ عوام کے معاملہ میں ایجاز اور اختصار مفید ثابت نہیں ہوتا۔ جو کچھ ہم عوام کے دل میں اتارنا چاہتے ہیں، چاہیئے کہ اُسے بار بار دُہرائیں۔

اُن کی موت نے قوم سے ایک بڑی شخصیت چھین لی۔ اُن کے جانے سے جو خلا ہماری زندگی میں پیدا ہو گیا ہے اسے بھرنا ممکن نہیں۔

فرخ امین

حیاتِ قائد کا آخری سال

۱۱ ستمبر کی اس سوگوار گھڑی سے جب ہمارے قائداعظم نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا، ہر طرح کے لوگ، چھوٹے بڑے، امیر غریب مجھ سے اپنے مرحوم محبوب قائد کے متعلق سوال پر سوال کر رہے ہیں۔

"ہمیں تو ان کی بیماری تک کا علم نہیں تھا، یہ آخر ہوا کیسے؟"

"موت سے پہلے ان کی حالت کیا تھی؟"

"ان کی آخری گھڑیاں کس طرح کٹیں؟"

لوگوں کو ان کی موت کا یقین نہیں آتا۔ خود وہ جنہوں نے انہیں موت کے خلاف جنگ کرتے دیکھا، ان کا دل بھی کسی طرح یہ بات قبول کرنے تیار نہیں کہ وہ اب ہم میں نہیں ہیں، اور یہ بات اس لئے ہے کہ ہم نے بارہا انہیں محض اپنی قوتِ ارادی کے زور سے مہلک بیماریوں پر فتح پاتے دیکھا تھا۔ اور اس لئے ان کے جانے کے بعد ہمیں یہ دنیا مردوں کی دنیا نظر آتی ہے۔ اس دن کا ایک ایک منظر جو گورنر جنرل ہاؤس میں پیش آیا، میری آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے پہلے وزیراعظم آتے پھر دوسرے وزیر پھر گورنر سندھ اور ان کے بعد مس جناح کے پاس آنے والے بے شمار گریہ کناں انسان، پھر جنازہ کی تیاریاں ہوئیں اور سب کچھ اس طرح ہوا جیسے [illegible] ہولناک اور سنسان سیاہی میں بے جان حرکت کر رہی ہوں۔ جس نے یہ خبر سنی دم بخود رہ گیا، جیسے کسی نے کوئی ضرب کاری لگا دی ہو۔ ہماری زندگی میں کچھ عظمت اور رفیع الشان چیز کی کمی آ گئی تھی۔ یہ غم بھی ہر غم کی طرح وقت کے ساتھ کم ہوتا جائے گا، لیکن نقصان کا شدید احساس دلوں میں ہمیشہ نشتر کی طرح چبھے گا۔

میری خوش نصیبی مجھے قائداعظم کے قریب لائی۔ پاکستان کی عارضی حکومت کے قیام کے چار دن بعد، ۲۴ جولائی ۱۹۴۷ء کو نئی دہلی میں مجھے حکم ملا کہ میں ٹھیک دس بجے محمد علی صاحب سکرٹری جنرل سے ملوں۔ میں وقت مقررہ پر پہنچا اور انہوں نے مجھے اسسٹنٹ پرائیویٹ سکرٹری منتخب کر کے قائداعظم کی خدمت میں پہنچنے کا حکم دیا۔ میں [illegible] اس غیر معمولی تغیر پر مسرور بھی تھا اور کسی قدر پریشان بھی۔ مسرور تو اس لئے کہ کسی مسلمان کے لئے اس سے بڑی عزت کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ اسے قوم کے معمار اور مملکت کے بانی قائداعظم کی خدمت کا موقع ملے۔ لیکن اس مسرت کے ساتھ مجھے تھوڑی سی پریشانی بھی تھی۔ اب تک میں نے قائداعظم کو دور سے، جلسوں کے منبروں اور اسمبلی کے ایوان میں دیکھا تھا اور ان کا گرویدہ تھا لیکن اتنی بڑی ہستی سے اس قدر قریب ہونا ذرا مختلف بات تھی۔ اور اسی لئے جب میں ۱۰ اورنگ زیب روڈ کی طرف جا رہا تھا تو میری رفتار میں ایک عجیب قسم کی ہچکچاہٹ تھی۔ وہاں پہنچ کر اپنا کارڈ بھجوایا۔ شاید میرے پہنچنے کی اطلاع قائداعظم کو پہلے ہی دے دی گئی تھی مجھے فوراً اندر طلب فرمایا۔ اور میں ذرا سی دیر میں قائداعظم کے سامنے کھڑا تھا۔ یہ لمحہ میری زندگی کا اہم ترین لمحہ ہے۔ قائداعظم صوفے پر تشریف فرما تھے اور سگار پی رہے تھے۔ مجھے بیٹھنے کا اشارہ فرمایا۔ گھبراہٹ اب بھی مجھ پر غالب تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ خدا جانے قائداعظم مجھ سے کیا خدمت لیں گے لیکن قائداعظم کے مخصوص مشفقانہ انداز نے بہت جلد میری گھبراہٹ ختم کر دی۔ پہلے انہوں نے مجھ سے میری ذات، میری ملازمت اور میرے کراچی جانے کے متعلق کچھ سوالات پوچھے۔ اور پھر خطوں اور تاروں کے اس ڈھیر کی طرف جو گورنر جنرل کے تقرر پر دنیا کے مختلف حصوں سے قائداعظم کے پاس آئے تھے، اشارہ کرتے ہوئے فرمایا "کیا تم مہربانی کر کے ان پر ایک نظر ڈال لو گے؟" یہ بات قائداعظم نے ایسے لہجہ اور انداز میں فرمائی کہ جو تھوڑی بہت گھبراہٹ اب تک مجھ پر طاری تھی وہ یک لخت رخصت ہو گئی۔

اس کے دو ہفتہ بعد ہم کراچی پہنچ گئے اور آتے ہی سرکاری مصروفیتوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ ۱۰ اگست کو جب دستور ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس ہوا تو قائداعظم نے فرمایا کہ تم بھی میرے ساتھ چلو۔ اسمبلی کا یہ اجلاس کراچی میں ان کی پہلی سرکاری مصروفیت تھی۔ سڑک کے دونوں طرف سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ فضا قائداعظم زندہ باد اور پاکستان زندہ باد کے فلک شگاف نعروں سے گونج رہی تھی اور میری آنکھوں میں مسرت کے آنسو تھے۔ اس دل افروز منظر سے قائداعظم بھی متاثر تھے۔ انہوں نے لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا "ہمارے پاس انسانی قوت کا کتنا شاندار ذخیرہ ہے۔ اگر ہم ان کے جوش کو صحیح راہوں پر لگا سکیں تو پاکستان یقیناً دنیا کی عظیم سلطنتوں میں سے ایک ہو گا۔" اب ہم اسٹریچن روڈ پر وائی۔ ایم۔ سی۔ اے کی عمارت کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ اس عمارت کو دیکھ کر قائداعظم نے فرمایا "وائی ایم سی اے تنظیم کی ایک بڑی اچھی مثال ہے۔ تھوڑے سے آدمیوں نے دنیا کے کونے کونے میں اس کی شاخیں قائم کر لی ہیں۔"

قائد اعظم
کے
چند رشتے دار

محمد علی کی والدہ فاطمہ بائی جن کی شادی کے وقت قائد اعظم کی عمر نو سال تھی
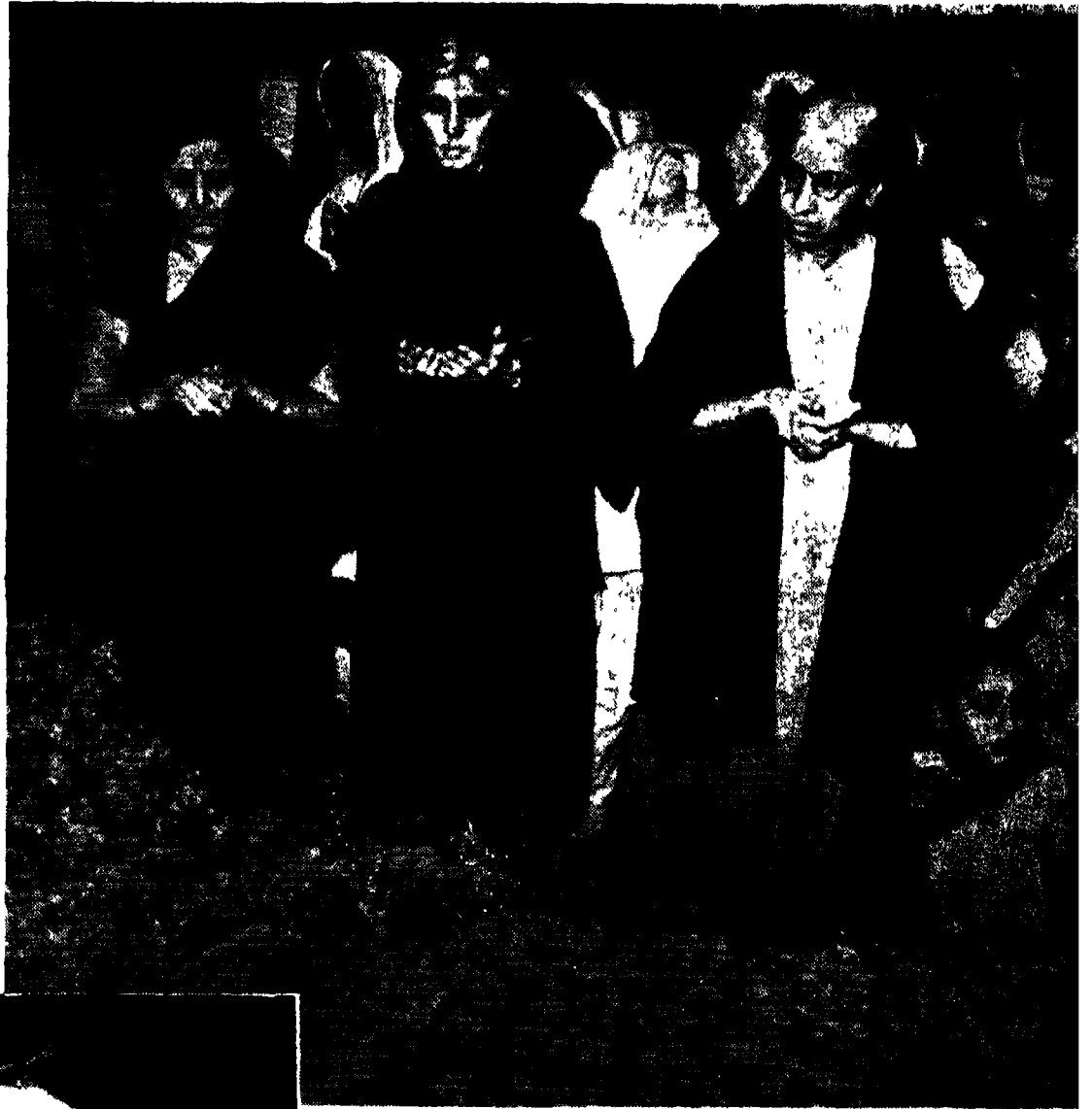
قائد اعظم کے مزار پر ان کی تین بہنیں (دائیں طرف سے) مریم بائی - محترمہ فاطمہ جناح اور شیریں بائی

قائد اعظم کے ایک چچا زاد بھائی کے لڑکے - ان کا نام بھی محمد علی

اس کے بعد باتوں باتوں میں قائداعظم پاکستانیوں کے متعلق فرمانے لگے کہ یہ تھوڑے سے لوگ محض اپنی جانفشانی اور تنظیم کی بدولت عزت اور دولت دونوں کے مالک ہیں۔ "اگر ہم بھی اپنے لوگوں کو صحیح تربیت دے کر منظم کر سکیں تو ہم حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کر سکتے ہیں۔"

حالانکہ گورنر جنرل ہونے کے بعد قائداعظم نے ایک لمحہ بھی آرام نہیں کیا اور آخر ان کی یہ کثیر الاشغالی ان کی موت کا باعث بنی، لیکن پاکستان کے قیام کے بعد کے ابتدائی دو مہینے ان کے لئے انتہائی مصروفیت اور پریشانی کے مہینے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کو بے دردی سے تہ تیغ کیا جا رہا تھا اور مغربی پنجاب کی حکومت (جو ۱۶ اگست کو مسلم لیگی وزارت کے ہاتھوں میں آئی تھی) کو یکا یک جہاجرین کے سخت اور زبردست مسئلے سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ یہ سخت آزمائش کا وقت تھا۔ حکومت کے قدم متزلزل تھے اور یہ اندیشہ تھا کہ پاکستان اپنے قیام کی پہلی ہی منزل میں ختم ہو جائے۔ قائداعظم نے اس زمانہ میں جانفشانی سے کام کیا اور تزلزل کے اس اندیشہ ناک دور میں ان کی آواز کی یہ گرج کہ "پاکستان قائم رہنے کے لئے بنا ہے"۔ لوگوں کے لئے سہارا بنی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان مستحکم ہو گیا اور مستحکم رہے گا۔ لیکن آزمائش کے اس دور کی قائداعظم کو بہت بڑی قیمت دینی پڑی۔ ان کی صحت خراب ہو گئی۔ بعض لوگ قائداعظم کے متعلق کہتے تھے کہ دوسروں کا دکھ درد محسوس نہیں کرتے۔ یہ بے شک صحیح ہے کہ وہ فکر اور اندیشہ کے ایسے موقعوں پر بھی جب دوسروں کے کمزور اعصاب پر جذبات کا غلبہ ہو جاتا، وہ سکون اور توازن کو قائم رکھتے۔ اپنی پریشانی ظاہر کر کے دوسروں کو پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ان کا باطن ان حالات سے درد و کرب میں مبتلا تھا۔ اس زمانہ میں میں نے انہیں دو ایک بار رات کی خاموشیوں میں سونے کے کمرے میں ٹہلتے دیکھا ہے۔ اور اسی لئے میرا خیال تو یہ ہے کہ اگر ان دنوں قائداعظم کو یہ کرب نہ سہنا پڑتا تو وہ آج بھی ہم میں ہوتے۔ اللہ ان کی روح کو ابدی سکون دے۔

اکتوبر ۱۹۴۷ء میں جب وہ دوسری بار لاہور تشریف لے گئے تو انہیں نزلہ ہو گیا۔ اور اس زمانہ میں میں نے دیکھا کہ وہ اپنی صحت کے معاملہ میں کس قدر بے نیاز تھے۔ میں نے دو مرتبہ ان سے مودبانہ گذارش کی کہ اپنے لئے اچھے سے اچھا ڈاکٹر بلوانے کی اجازت دیجئے۔ لیکن دونوں مرتبہ انہوں نے مجھے یہ کہکر خاموش کر دیا "مسٹر امین! مجھے کوئی خاص تکلیف نہیں۔ میرا گلا تو بار ہا خراب رہ چکا ہے، اور میں جانتا ہوں کہ ایسے موقعے پر مجھے کیا کرنا چاہئیے۔" (قائداعظم مجھے ہمیشہ امین کہہ کر مخاطب فرماتے تھے لیکن جب کبھی کوئی بات ان کے خلاف مزاج ہوتی تو وہ نام کے پہلے مسٹر لگا دیتے اور یہ علامت تھی اس بات کی کہ جو کچھ میں نے کہا یا کیا ہے وہ ان کی مرضی کے خلاف ہے۔ چنانچہ مجھے خاموش ہو جانا پڑا۔) قائداعظم دراصل [illegible] وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ڈاکٹر انہیں اپنے

"تجربہ" کا آلۂ مشق بنائیں۔ قائداعظم کو اس بات سے بھی سخت نفرت تھی کہ کوئی نرس ان کی دیکھ بھال کرے، اس لئے کہ اپنے ذاتی کاموں میں انہیں کسی کی مدد اچھی نہ لگتی تھی۔ شروع شروع میں میں انکے کاغذات یا ان کا قلم اٹھا کر ان کے سامنے رکھ دیتا۔ لیکن انہوں نے کبھی اس بات کو پسند نہیں فرمایا۔

قائداعظم اپنے خیالات اور عقائد کے معاملہ میں بڑے راسخ تھے، وہ صرف ایک مملکت کے گورنر جنرل ہی نہیں بلکہ قوم کے قائداعظم بھی تھے اور جانتے تھے کہ قوم کے لئے کیا چیز سب سے اچھی ہے۔ اور گو میں ان کا ایک ادنیٰ خادم تھا وہ ہمیشہ میرے نقطۂ نظر کو سنتے اور اپنا خاصا وقت صرف کر کے مجھے میرے خیال کی کوتاہیوں سے آگاہ کرتے۔ وہ عموماً معاملات کا فیصلہ خاصے سوچ بچار کے بعد کرتے، لیکن ہمارے خلوص کی قدر دانی کی خاطر کبھی کبھی ہماری بات مان کر اپنے فیصلے میں تبدیلی بھی فرما لیتے۔ مثلاً مجھے یاد ہے کہ مئی ۱۹۴۸ء میں وہ پاکستان ملٹری اکیڈیمی کے افتتاح کے لئے کاکول تشریف لے جانے والے تھے کہ انکی طبیعت ناساز ہو گئی۔ لیکن وہ جانے پر مصر تھے، نہ صرف اس لئے کہ وہ وہاں جانے کا فیصلہ فرما چکے تھے بلکہ اس لئے بھی کہ انہیں اپنے کسی سرکاری پروگرام میں تبدیلی کرنا بے حد ناگوار ہوتا تھا۔ لیکن ہم سب کا خیال تھا کہ انہیں وہاں نہیں جانا چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے ہماری بات مان لی اور آخری وقت کاکول جانے کا خیال ترک فرما دیا۔

قائداعظم سے میرے تعلقات محض ایسے نہیں تھے جو گورنر جنرل اور اس کے [illegible] کے درمیان ہونے چاہئیں۔ بے تکلفی کے لمحوں میں قائداعظم شفقت اور کرم کا مجسمہ ہوتے تھے۔ خصوصاً ایسے لمحوں میں مجھ پر ان کے الطاف بے پایاں ہوتے تھے۔ اکثر [illegible] نصیب ہوتی کہ وہ مجھ سے اپنے خیالات اور رجحانات کے متعلق گفتگو فرمانے لگے۔ ہم [illegible] لاہور میں تھے۔ ہندوستانی فوجیں کشمیر میں داخل ہو گئی تھیں۔ اسی زمانہ میں ایک دن قائداعظم فرمانے لگے کہ مسلمان قوم کی ایک بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ ہمارے دشمنوں کو خود ہم ہی میں سے ایسے لوگ مل جاتے ہیں جو آسانی سے ان کا آلۂ کار بن جاتے ہیں۔ ایک اور موقع پر زیارت میں ایسے مسلمان گفتگو کا موضوع بن گئے جنہوں نے جنگ کے زمانہ میں جنگی ملازمتیں کر لیں اور اپنے انگریز افسروں کو خوش کرنے کی امید میں شراب خوری کے عادی ہو گئے۔ اس سلسلہ میں قائداعظم نے فرمایا کہ یہ انسانی کردار کی انتہائی پستی ہے کہ وہ ایسی رکیک حرکتیں کر کے دوسروں کی خوشنودی حاصل کرنا چاہے۔ "لوگوں کو چاہیئے کہ جو کام ان کے سپرد کیا جائے خواہ وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو، اسے قابلیت کے ساتھ اور اچھی طرح انجام دیں۔ دیر یا سویر ان کی محنت کا انعام ضرور ملتا ہے۔ کوئی آقا یا حکومت کسی شخص کو ترقی کرنے سے ہرگز نہیں روک سکتا۔ اگر سرکاری ملازم اسی اصول کو اچھی طرح سمجھ لیں، اور اونچے مرتبے یا ترقی حاصل کرنے کے لئے سفارشوں اور سازشوں سے کام لینا [illegible] اور دوست نوازی کا خاتمہ ہو جائے اور ہماری سیاسی زندگی کہیں زیادہ [illegible]

ایک دن کا ذکر ہے۔ قائداعظم بے حد مسرور معلوم ہو رہے تھے فرمانے لگے "زیارت مجھے بہت پسند ہے ملتے ایک خوبصورت شہر بنایا جا سکتا ہے جس میں ہر جگہ بڑے بڑے آرام دہ ہوٹل، خوبصورت بنگلے، پارک، پھولوں سے بھرے ہوئے باغ بغیچے ہوں۔" اس کے بعد مسکرا کر فرمایا "تمہیں معلوم ہے۔ میں اسی طرح کے خواب دیکھتا ہوں اور کبھی کبھی میرے یہ خواب پورے بھی ہو جاتے ہیں۔ پاکستان بھی کبھی اسی طرح کا خواب تھا۔ اسی طرح کا یہ خواب زیارت کے متعلق ہے اور ممکن ہے کہ ایک دن یہ خواب بھی پورا ہو کر رہے۔"

قائداعظم کی شخصیت میں کچھ ایسی کشش تھی کہ مجھے جتنے عرصہ ان کی خدمت میں رہنے کا اتفاق ہوا وہ زمانہ میرے ذہن پر نقش ہے میں اپنے آپ کو بھول سکتا ہوں لیکن ان مبارک لمحوں کی یاد کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

قائداعظم کی شخصیت کی جس خصوصیت سے لوگ عموماً ناواقف ہیں وہ ان کی لطافت مزاج ہے کبھی کبھی وہ ہمیں کھانے کی میز پر مزے مزے کے لطیفے اور قصے سناتے۔ قائداعظم کا سنایا ہوا ایک لطیفہ مجھے اب تک اچھی طرح یاد ہے۔

انگلستان کے کسی چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن پر گاڑی معمول سے ذرا زیادہ ٹھہر گئی ایک ہندوستانی جج نیچے اُتر کر پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگے اتنے میں ایک انگریز بھی گاڑی سے اُترا اور سیدھا ان جج صاحب کی طرف آکر اُن سے پوچھنے لگا "گاڑی کب چھوٹے گی؟" جج نے جواب دیا "مجھے کیا معلوم؟" اس پر انگریز نے کہا "لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کیا تم اسٹیشن ماسٹر نہیں ہو؟" اس پر جج نے کسی قدر جھنجلا کر جواب دیا "نہیں میں اسٹیشن ماسٹر نہیں ہوں۔" انگریز بولا "اگر نہیں ہو تو ویسے معلوم کیوں ہوتے ہو؟"

قائداعظم کی آخری بیماری کے حالات لوگوں کو عام طور پر معلوم ہیں۔ ہوا یوں کہ کراچی میں جب قائداعظم نے کسی طرح بھی سرکاری کام کرنا کم نہ کیا، یہاں تک کہ جب ڈاکٹروں کے مشورے سے وہ تبدیلی کے خیال سے دو ایک دن کے لئے جا کر ملیر رہتے تو وہاں بھی کام کرتا پایا لوگوں سے ملنا بند نہ کرتے انہیں آرام کی سخت ضرورت تھی اس لئے وہ ۲۵ مئی کو کوئٹہ کے لئے روانہ ہوئے۔ لیکن اسی آرام کے زمانہ میں پاکستان کے اسٹیٹ بنک کا افتتاح کرنے کی غرض سے جون کے آخر میں کراچی تشریف لائے اور یہاں کے مختصر قیام میں اتنا کام کیا کہ جب وہ بلوچستان واپس پہنچے تو وہ سارے اچھے اثرات جو ایک مہینے کے آرام سے پیدا ہوئے تھے زائل ہو چکے تھے۔ کام کی زیادتی نے انہیں پھر تھکا دیا تھا۔ وہ بیمار ہو گئے اور محترمہ فاطمہ جناح نے اس بات پر زور دیا کہ باہر سے کسی ماہر معالج کو بلا لیا جائے لیکن قائداعظم راضی نہ ہوئے اور مس جناح نے اس زمانہ میں قائداعظم کی دیکھ بھال اور تیمارداری کی خاطر خدا جانے کتنے دن رات قائداعظم کے کمرے میں آتے جاتے گذارے۔ ایک دن ڈاکٹر صاحب نے قائداعظم سے کہا "قائداعظم جو پاکستان آپ نے اتنی طویل جدوجہد کے بعد حاصل کیا ہے اسے مضبوط بنانے کے لئے ہمیں ابھی دس برس تک آپ کی ضرورت ہے۔" میں نے سنا ہے کہ ابھی ڈاکٹر صاحب اپنا جملہ پورا بھی نہیں کر سکے تھے کہ قائداعظم نے فرمایا "میں اپنا کام کر چکا۔ اب مجھے مرنے کا دکھ نہیں ہوگا لیکن میں زیارت میں نہیں مرنا چاہتا۔" یہ کہہ کر انھوں نے اپنے وہی الفاظ فرمائے جو بعد میں یوم استقلال کے پیغام میں دہرائے گئے ہیں "آپ کے پاس اب سب کچھ ہے، ایک آزاد، اور خودمختار ملک جس میں آپ زندگی کی تشکیل اپنی مرضی کے مطابق کر سکتے ہیں۔ قدرت نے آپ کو سب کچھ دیا ہے۔ آپ کے وسائل لامحدود ہیں، سوائے کوئلے اور لوہے کے۔ لیکن یہ چیزیں بھی آپ اپنی فاضل پیداوار کے بدلے میں دوسرے ملکوں سے حاصل کر سکتے ہیں۔ اب یہ کام نئی نسل کا ہے کہ وہ اپنے ملک کی تعمیر کرے اور اسے مضبوط بنائے۔"

اسی زمانہ کا ذکر ہے کہ قائداعظم ایک دن کوئی سرکاری کاغذ ملاحظہ فرما رہے تھے، ان کی عینک پھسل کر نیچے گر پڑی۔ انہوں نے اسے اٹھا کر پھر لگا لیا لیکن وہ پھر پھسل کر گر پڑی۔ ایک مرتبہ قائداعظم نے میری طرف نظر اٹھائی جیسے وہ متوقع ہیں کہ میں کچھ کہوں میں نے عرض کیا "قائداعظم آپ کی عینک ڈھیلی ہو گئی ہے"۔ انہوں نے فرمایا "ہاں! میرا خیال تھا کہ یہاں آکر میں ذرا توانا ہو جاؤں گا، لیکن اس کے برخلاف میں دبلا ہوتا جا رہا ہوں۔"

بیماری کے پورے زمانہ میں قائداعظم نے اس وقت تک سرکاری کاموں کا سلسلہ جاری رکھا جب تک ان میں ذرا بھی سکت باقی رہی۔ ہم انہیں کاموں کی اطلاع نہ دیتے۔ لیکن اگر انہیں پتہ چل جاتا تو وہ کام کرنے پر مصر ہوتے۔ مجھے وہ دن ہمیشہ یاد رہے گا جب انہوں نے یو۔ این۔ او میں پاکستان کی نمائندگی کرنے کے لئے سر محمد ظفر اللہ خاں کو پورے اختیارات دینے کے لئے آخری سرکاری کاغذ پر دستخط کئے۔

قائداعظم اپنی مسہری پر لیٹے ہوئے تھے۔ میں نے کاغذ ان کے سامنے پیش کیا۔ اس پر نظر ڈال کر قائداعظم نے میری طرف دیکھا اور فرمایا "مجھے کچھ نظر نہیں آرہا" میں نے یہ سمجھ کر کہ روشنی کی کمی کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے بجلی روشن کر دی۔ قائداعظم نے پھر کاغذ پر نظر ڈالی اور اسے پڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے ذرا سی دیر میں وہاں سے ہٹالی اور میری طرف دیکھا میں سمجھ گیا کہ کاغذ کو پڑھنے میں انہیں اب بھی دقت ہو رہی ہے۔ کمرے کے بائیں طرف ایک کھڑکی تھی۔ اس پر ایک موٹا سا پردہ پڑا ہوا تھا۔ کھڑکی کے پاس جا کر میں نے پردہ سرکا دیا کہ باہر سے روشنی آسکے۔ اس مرتبہ بھی قائداعظم کاغذ کی عبارت کو اچھی طرح نہ پڑھ سکے۔ دل کہہ رہا تھا کہ یا اللہ یہ کیا ہوا، اتنے میں مجھے دیکھا اور فرمایا کہ مجھے اٹھا کر بٹھاؤ۔ میں نے حکم کی تعمیل کی۔ ان کی پسلیوں کے پیچھے ہاتھ رکھ کر آہستہ سے سہارا دیا اور پیچھے کی طرف دو تکیے رکھ کر انہیں بٹھانے کی کوشش کی لیکن قائداعظم کے لئے یہ بھی ممکن نہ ہوا کہ وہ اس طرح بیٹھ کر کاغذ پر دستخط کر سکیں۔ اس صورت حال سے انہیں بڑی الجھن ہوئی۔ وہ مجھ سے فرمانے لگے کہ مجھے سہارا دو تاکہ میں پوری طرح بیٹھ سکوں۔ میں نے ہاتھوں کے سہارے سے ان کے جسم کو اوپر سیدھا کیا۔ میں ان کے سامنے کی طرف کھڑا تھا اور میرے دونوں ہاتھ ان کی دونوں پسلیوں کے نیچے تھے۔

اس طرح اگر وہ کاغذ پر دستخط بھی کرنا چاہتے تو میرے دونوں ہاتھ ان کے لئے رکاوٹ پیدا کرتے۔ اس لئے میں نے ان کے جسم کو ایک ہاتھ سے روکا اور پیچھے کی طرف جاکر اسے اپنے دونوں ہاتھوں پر سنبھال لیا۔ اس وقت میرے دل کی یہ کیفیت تھی کہ جیسے میں نے شیشے کی کوئی بہت نازک سی چیز پکڑ رکھی ہے۔ اور میری ذرا سی کوتاہی سے بھی اس نازک شیشے میں بال پڑ جائے گا۔ قائدِ اعظم نے اس وقت فرمایا: "مضبوطی سے پکڑو" یہ لفظ تحکمانہ انداز میں فرمائے گئے تھے لیکن آواز میں کسی قدر ضعف تھا۔ اس طرح قائدِ اعظم نے بڑی مشکل سے اس کاغذ پر دستخط کئے۔ اس دستخط کا نقش اب بھی میرے سامنے ہے ان میں قائدِ اعظم کے پچھلے دستخطوں کی سی استواری نہ تھی۔ اس وقت میرا دل رو رہا تھا۔ یہ نحیف جسم اور ہڈیوں کا یہ ڈھانچا جسے میں نے اپنے ہاتھوں میں سنبھال رکھا تھا اسی شخص کا تھا جس نے برسوں ہندوستانی اور انگریزی سیاست دانوں کا مقابلہ کیا اور جس نے منتشر مسلمانوں کو ایک منظم اور طاقتور قوم بنایا۔ اس کی آج یہ حالت ہے! جب وہ کاغذ پر دستخط کر چکے تو قطعی تھک چکے تھے۔ انہوں نے بڑے دردناک انداز میں فرمایا "امین! میں بھی ہانپ رہا ہوں اور تم بھی ہانپ رہے ہو" میرا سانس بیشک تیز تھا لیکن اس لئے نہیں کہ قائدِ اعظم کو سہارا دینے سے تھک گیا تھا۔ میں تو اس لئے ہانپ رہا تھا کہ اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش نے مجھے تھکا دیا تھا۔ میرے ہاتھوں میں، اور میرے جسم سے ملحق، پاکستان کی سب سے محبوب شخصیت تھی، وہ شخصیت جس کے ایک اشارہ پر لاکھوں آدمی اپنی جان قربان کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ اور اس وقت اس کی یہ حالت تھی کہ بیماری کے ہاتھوں میں بے بس تھا۔ اس ساری صورت حال نے میرے ذہن میں جو اضطراب پیدا کیا تھا وہ میرے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ اس لئے قائدِ اعظم کو بستر پر لٹاتے ہی میں تیزی سے کمرے کے باہر نکل گیا اور خوب پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

اس کے بعد سے میری کوشش یہ ہوتی کہ جہاں تک ممکن ہو میں قائدِ اعظم کی خدمت میں نہ جاؤں۔ اس لئے کہ وہ جوں ہی مجھے دیکھتے تو انہیں کوئی نہ کوئی سرکاری کام یاد آجاتا۔ اور اس کے متعلق گفتگو شروع کر دیتے۔ ۱۰ ستمبر کو کوئٹہ میں انہوں نے مجھے طلب فرمایا اور پوچھا "کیا سب کچھ تیار ہے۔ فرض کرو کہ میں آج ہی کراچی جانا چاہتا ہوں"۔ کراچی پہنچ کر قائدِ اعظم کو ملیر کے جس مکان میں ٹھہرنا تھا وہاں کے سارے انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ لیکن ہم لوگوں کا خیال تھا کہ ہم ۱۵ ر سے پہلے وہاں نہیں جائیں گے۔ میں نے عرض کیا کہ "جی ہاں" اس پر تھوڑے وقفہ کے بعد فرمایا "کیا مجھے کوئی ضروری کاغذ دکھانا چاہتے ہو؟" میں نے عرض کیا "جی نہیں قائدِ اعظم، کچھ نہیں" لیکن اس بات نے مجھے اس درجہ متاثر کیا کہ میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ میں سوچ رہا تھا کہ ان کی حالت اس قدر نازک ہے، پھر بھی ان کے دل سے مملکت کے کاموں کا خیال نہیں جاتا۔ اگلے دن ہم کوئٹہ سے چل دیے۔ کراچی پہنچنے کے کچھ دیر بعد ان کی حالت خراب ہو گئی۔ میں آخری وقت تک ان کے پاس ہی تھا۔ رات کو دس بج کر دس منٹ پر ڈاکٹر نے ان سے کہا: "قائدِ اعظم، آپ زندہ رہیں گے"۔ قائدِ اعظم بولے: "نہیں، اب نہیں"۔ اور اس کے پندرہ منٹ بعد وہ نہیں رہے۔ ملت کا بانی دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ ہم سے رخصت ہو کر وہ فنا نہ ہونے والوں میں جا ملا۔ قائدِ اعظم کے آخری لمحات بے حد پرسکون تھے۔ موت کی آغوش میں بھی وہ ہمیشہ کی طرح خاموش اور پُرعظمت نظر آرہے تھے۔ کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ۔

دو ملاقاتوں کی یاد

بقیہ صفحہ ۱۲

ملاقات نے میرے دل پر بڑا گہرا اثر کیا کہ صحت کا یہ حال ہے لیکن ہمارا قائد نہ مملکت کے امور کی طرف سے غافل ہے اور نہ اپنے ساتھ کام کرنے والوں کی خوشنودی کے خیال سے بے خبر۔ آنکھوں کے گرد حلقے ہیں، جسم نحیف و زرد ہو گیا ہے۔ لیکن ضروری کاغذات اب بھی زیرِ غور ہیں۔

اس ملاقات کے تقریباً دو مہینے بعد قائدِ اعظم کے انتقال کی خبر ملی۔ میں دورہ پر تھا۔ ۱۲ ستمبر کی صبح کو مری کے ایک مرکزی مقام پر سوگوار پاکستان کا مجمع تھا۔ شہر کے ہر حصے سے لوگ خاموشی سے اس طرف بڑھ رہے تھے۔ میں بھی وہاں پہنچا۔ لوگوں کو صبر کی تلقین کی اور وہاں سے راولپنڈی اور لاہور ہوتا ہوا کراچی پہنچا۔ ہوائی اڈے سے سیدھا نمائش کے میدان میں آیا جہاں قائدِ اعظم کی آخری آرام گاہ تھی۔ چھ بج کر بیس منٹ پر وہاں پہنچا تو لوگ قائدِ اعظم کو سپردِ خاک کر کے واپس آرہے تھے اور اب سے دو برس پہلے کا وہ جملہ کہ "پاکستان تو بن جائے گا لیکن میں نہ رہوں گا" رہ رہ کر میرے دل میں چٹکیاں لے رہا تھا۔

قارئین سے

اگر آپ چاہتے ہیں کہ "ماہِ نو" آپ کو وقت پر ملتا رہے اور آپ کا فائل بھی مکمل رہے تو "ماہِ نو" کے مستقل خریدار بن جائیے۔ آپ کی سہولت کے لئے اس شمارے کے آخر میں ایک کارڈ منسلک ہے اسے آج ہی بھر کر بھیج دیجئے۔

منیجر

مطلوب حسین سید

قائدِ اعظمؒ کی زندگی کا ایک باب

ہم شخصیتوں کی عظمت اور بلندی کو عموماً ان کی ذاتی کامرانیوں اور کارناموں کی روشنی میں دیکھنے کے عادی ہیں۔ کسی بڑی ذات کا تصور ذہن میں آتا ہے تو ہم کچھ اسی طرح کی باتیں سوچنے پر مجبور سے ہو جاتے ہیں کہ اس سورما نے کتنی لڑائیاں لڑیں اور کیسے کیسے ان میں فتح حاصل کی۔ ہم اس موضوع پر تو گفتگو کرتے ہیں کہ اس عظیم المرتبت شخصیت نے کس طرح پتھر کو ہاتھ لگایا تو وہ ہیرا بن گیا لیکن یہ سوچنے کی ضرورت نہیں سمجھتے کہ یہی بڑا آدمی شاید اپنے بچپن میں گولیاں بھی کھیلتا رہا ہو۔ جنگ کے میدان اور ان میدانوں میں اس کی ہمت اور اولوالعزمی، طوفانی سمندر، اور ان طوفانوں میں اس کی جرأت و عزم، سیاست کے پلیٹ فارم اور ان پلیٹ فارموں پر کھڑے ہو کر سامعین کو متاثر کرنے کی بے پایاں قوت —— یہ ساری چیزیں اس طرح ہمارے ذہنوں پر چھائی ہوتی ہیں کہ ہم یہ سوچنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس کرتے کہ یہی جنگجو سپہ سالار، یہی جری امیر البحر اور یہی مدبر سیاست داں فرصت اور فراغت کے لمحوں میں کیا کرتا ہوگا۔

یہ صحیح ہے کہ جن لوگوں نے اپنی زندگی کی ہر ساعت دوسروں کی خدمت کے لئے وقف کر دی ہو انہیں فرصت کے یہ لمحے شاذ و نادر ہی میسر آتے ہیں۔ اب یہ آپ کی قسمت پر منحصر ہے کہ آپ ان شاذ لمحوں میں سے کسی ایک میں اپنے ممدوح کے پاس پہنچ سکیں اور وہ اپنے صوفے پر لیٹے لیٹے آپ سے ہلکی پھلکی باتیں کرے۔ صرف ایسے ہی لمحوں میں آپ کو اس کے مزاح، اس کے ظرافت آمیز فقروں، اور باتوں کے اس متوازن چٹخارہ کا لطف محسوس ہوگا، جو گفتگو کی جان ہے۔ آپ اپنی کرسی کو اپنے ممدوح کے قریب سرکا کر بیٹھ جائیں گے۔ اور اس سے قریب ہو کر آپ کو رفتہ رفتہ اس کی پسند اور ناپسندیدگی کا اندازہ ہوگا—— وہ اپنی انگلیوں میں سگریٹ کیسے پکڑتا ہے، اسے کون سے کھانے مرغوب ہیں، اس کے محبوب مصنف اور کتابیں کون سی ہیں، اسے کون سے رنگ دلکش معلوم ہوتے ہیں۔ اور اس سے بھی کہیں زیادہ، اس کی آنکھوں کے اشارے اور اس کے ہاتھوں کی جنبش نہ جانے کتنی چھپی ہوئی باتوں کی غمازی کر دیں گی۔ اور اس طرح آپ کا محبوب ہیرو، آپ کا ممدوح آپ کو ایسے لباس میں دکھائی دے گا۔ جس کے تانے بانے میں انسانیت اور اس کی نرمی اور دلکشی ہوگی۔

بالکل یہی حال ہمارے محبوب قائداعظم کا ہے، جن کی وفات کو ہر پاکستانی نے اپنے ذاتی نقصان کی طرح محسوس کیا ہے۔ قوم اپنے قائد کی کمی صرف اس لئے محسوس نہیں کر رہی ہے کہ وہ اس کے مستقبل کا راہبر و رہنما تھا، بلکہ یہ احساس اس لئے شدید ہے کہ موت کے ہاتھ نے ہم سے ایک ایسی ہستی چھین لی جس نے ہمیں نہ صرف ایک مملکت اور آزادی کی سرزمین دلائی بلکہ جس کی زندگی انسانیت کا مجسمہ تھی۔ اور اس لئے قائداعظم کی بلند شخصیت کا ہر وہ مطالعہ جس میں ان کی انسانیت کے جوہر کی جھلک موجود نہ ہو نامکمل سمجھا جائیگا۔

ایک دوست کی حیثیت سے (قائداعظم) محمد علی جناح بے حد شگفتہ اور پر لطف تھے۔ بلکہ سچ پوچھئے، تو ان کی نجی زندگی کا ایک لمحہ بھی شگفتگی اور مزاح سے خالی نہ تھا۔ اپنے مخصوص بے تکلف حلقوں میں قائداعظم کا چلن عموماً بے تکلفانہ ہوتا تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ ان کے قیمتی مشاغل اس بات کی اجازت ہی نہ دیتے تھے کہ وہ اپنے قریبی دوستوں کو بھی کچھ وقت دے سکیں۔ ان کی قومی زندگی اور اس زندگی کی شدید ذمہ داریوں نے باقی ساری چیزوں پر اس درجہ غلبہ پالیا تھا کہ اُن کی زندگی کا بہت کم وقت اُن کا اپنا وقت رہ گیا تھا اور غالباً ان کی اس مصروف زندگی میں کھانے یا چائے کے وقت اپنے گرد و پیش بیٹھنے والے لوگوں سے تبسم آمیز گفتگو کے دو ایک جملے بس یہی ان کی زندگی کا تفریحی سرمایہ تھا۔

مسٹر محمود حسن جو کسی زمانہ میں مدراس کے ہفتہ وار اخبار ڈکن ٹائمز کے ایڈیٹر اور بعد میں ڈان کے پہلے منیجر تھے، ایک دن جناح صاحب کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ کھانا لگا دیا گیا۔ جناح صاحب نے حسب معمول بہت تھوڑا سا کھانا کھایا اور اس کے بعد چھری اُٹھا کر اسے اپنے ناخنوں پر بجانے لگے۔ (اُن کی اس عادت سے اُن کے اکثر دوست واقف ہوں گے) مسٹر محمود جو اب تک کھانے میں مصروف تھے کچھ خفت سی محسوس کرنے لگے اور جناح صاحب سے کہا کہ آپ نے تو کچھ کھایا ہی نہیں۔ جناح صاحب نے جواب دیا "دنیا والے اسی لئے تکلیفوں میں مبتلا ہیں کہ وہ کھاتے بہت ہیں۔"

ایک امریکی اخبار کے نمائندے سے میری گفتگو ہوئی تو وہ کہنے لگا کہ "جس زمانہ میں میں انگلستان میں تھا، انگریزی حلقوں میں میں نے محمد علی جناح کے متعلق اتنی باتیں سنی تھیں کہ مجھے ان سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اور اس لئے جب مجھے اخبار کی طرف سے ہندوستان آنے کی ہدایات ملیں تو میں نے یہ تہیہ کیا کہ ہندوستان پہنچ کر اس عظیم المرتبہ لیڈر سے ضرور ملوں گا۔ چنانچہ ہندوستان پہنچ کر جب میں جناح سے ملا تو میں نے انہیں اپنی توقعات سے کہیں زیادہ بڑا پایا۔" میں نے اس امریکن سے پوچھا کہ تم آخر مسٹر جناح کے ایسے مداح کیسے بن گئے؟ اس پر اس نے جناح صاحب کا ایک مذاق مجھے سنایا:-

" انگلستان میں ایک مرتبہ ایک خاتون نے جناح سے پوچھا "ہندوستان کے دو مذہبی رہنماؤں یعنی سیواجی اور اورنگ زیب میں سے آپ کس کی اولاد ہیں؟"
جناح نے جواب دیا "محترمہ، دونوں کی۔"

لاہور میں مسٹر جناح لڑکیوں کے کالج کے ایک جلسہ میں شریک ہوئے۔ کالج مسلمانوں کا تھا اور لڑکیاں پردہ کرتی تھیں لیکن انہوں نے جناح سے پردہ نہیں کیا۔ جلسہ سے واپسی پر یہ بات جناح نے اپنے بعض دوستوں سے کہی جس پر ذیل کی گفتگو ہوئی:-

مس جناح :- لڑکیوں نے شاید اس لئے آپ سے پردہ نہیں کیا کہ آپ بوڑھے آدمی ہیں۔

مسٹر جناح :- میں یہ بات ماننے کو تیار نہیں ہوں۔ اس میں میری تضحیک کا ایک پہلو ہے

مسٹر لیاقت علی خاں :- لڑکیاں آپ کو اپنا سیاسی شہنشاہ سمجھتی ہیں اور اپنے جذبات کے اظہار کا سب سے موزوں طریقہ یہی سمجھا کہ وہ آپ سے پردہ نہ کریں۔

مسٹر جناح :- ہاں! یہ کچھ بات ہوئی۔

ایک دن میں مسٹر جناح کے ساتھ کار میں میسور سے آٹکمند جا رہا تھا۔ مس جناح بھی ساتھ تھیں۔ ہمیں کوئی اسی میل کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ موٹر بہت آہستہ آہستہ چل رہی تھی اس لئے سفر میں کئی گھنٹے لگ گئے۔ اور راستہ میں ایک جگہ جناح صاحب نے یہ خیال ظاہر کیا کہ موٹر سے اتر کر ذرا ٹانگیں سیدھی کر لیں اور چاء کی ایک پیالی پی لیں۔ پاس ہی ایک ریلوے اسٹیشن تھا۔ ہم اتر کر وہاں پہنچے۔ مس جناح تو چاء کے انتظامات میں مصروف ہو گئیں اور قائد اعظم نے پلیٹ فارم پر ٹہلنا شروع کر دیا۔ وہ ٹہلتے جاتے اور مجھ سے باتیں کرتے جاتے اس دوران میں میں نے محسوس کیا کہ لوگوں نے جناح صاحب کو پہچان لیا اور اسٹیشن پر ایک ہلچل سی شروع ہو گئی ہے۔ میں نے جناح صاحب کو اس طرف متوجہ کیا تو وہ ہنس کر کہنے لگے :- "یہ چاء کا اُبال ہے ابھی ختم ہو جائے گا"۔[1]

کیبنٹ مشن پلان کے بعد قائد اعظم دلی تشریف لے گئے تو ایک دن وہ پریس کے نمائندوں کو یہ بتا رہے تھے کہ کس طرح کانگریس کی پالیسی نے مسلمانوں کو نقصان پہنچایا۔ گفتگو کے دوران ہی میں کسی نمائندے نے کہا، لیکن جناب آپ بھی تو کبھی کانگریس میں تھے۔" قائد اعظم نے فوراً جواب دیا۔ "ہاں، لیکن جب میں بچہ تھا تو ابتدائی مدرسہ میں بھی پڑھتا تھا۔"

قائد اعظم کو قالین جمع کرنے کا بڑا شوق تھا اور اس شوق کو وہ اس زمانہ میں بھی پورا کرتے تھے جب ان کا ہاتھ تنگ ہوتا۔ لیکن انتہائی شوق کے باوجود وہ قالینوں کے معاملہ میں جذباتی ہرگز نہیں تھے۔ وہ قالین استعمال کیلئے خریدتے تھے اور کوئی شخص محض باتیں بنا کر ان سے ان کے پسندیدہ قالین کی زیادہ قیمت ہرگز وصول نہیں کر سکتا تھا۔ ایرانی قالینوں پر اُن کی نظر فوراً پڑتی اور ان کی مشاق نظر آن کی آن میں ان کی صحیح قیمت کا اندازہ لگا لیتی۔ اور اس لئے کسی قالین فروش کی یہ مجال نہ تھی کہ محض زیادہ قیمت وصول کرنے کے خیال سے ان کے پاس جاتا۔ ایک مرتبہ ایک قالین والا بہت نفیس ایرانی قالین لے کر قائد اعظم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ قائد اعظم نے سارے قالین اپنی کوٹھی کے سامنے سبزہ پر پھیلوا دیئے۔ سورج کی شوخ کرنوں نے ایرانی صنعت کے ان بیش بہا نمونوں کی چمک دمک میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ لیکن قائد اعظم کی باریک بین نظر نے ان میں سے ہر ایک کی صحیح قیمت کا اندازہ لگا لیا۔

قائد اعظم جہاں جاتے ان کے گرد پرستاروں کا ایک جمگھٹا ہو جاتا۔ یہ چیز انہیں ہمیشہ ناگوار ہوتی تھی اور اس لئے وہ جہاں کہیں آتے جاتے اس بات کی کوشش کرتے کہ کم سے کم لوگوں کو ان کے آنے کا علم ہو۔ لیکن جب انہیں فرصت ہوتی تو وہ دور و نزدیک سے آنے والے شیدائیوں سے بڑی محبت سے ملتے۔

۱۹۴۱ء میں جب قائد اعظم جنوبی ہند کے دورہ پر گئے تو میسور کے شاہی مہمان خانہ میں مقیم ہوئے۔ کچھ لوگ کوئی بیس میل چل کر ان سے ملنے یہاں آئے۔ اس وقت جناح صاحب کو تیز بخار تھا۔ اور ملک کے سیاسی حالات نے انہیں کسی قدر پریشان کر رکھا تھا لیکن جب انہیں لوگوں کے آنے کی اطلاع ملی تو فوراً باہر آئے اور ان لوگوں سے کوئی گھنٹہ بھر باتیں کرتے رہے۔

یہ بات شاید آپ کو عجیب معلوم ہو لیکن قائد اعظم میں ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ اپنے شرکائے کار کی رائے اور فیصلہ سے اتنے متاثر نہیں ہوتے تھے جتنے ادنیٰ درجہ کے پیروؤں کی رائے سے۔ ان کے عقیدت مند ہر طرح کی باتیں لکھ کر بھیجتے اور اس طرح کے سینکڑوں خط ہر روز ان کے پاس آیا

[1] یہ ترجمہ انگریزی کے جملے (STORM IN A TEA CUP) کا ہے۔

کرتے تھے وہ اپنے ہاتھ سے ان خطوں کو کھولتے اور اگر کسی اہم قومی کام میں مصروف نہ ہوتے تو ہر خط کو شروع سے آخر تک پڑھتے۔ ان خطوں کو پڑھ کر انہیں اپنے لاکھوں عقیدتمندوں کے صحیح احساس کا پتہ چلتا ـــــــ یہ خط لکھنے والے جن کے نام سیاست کی دنیا میں کبھی کسی نے نہ سنے تھے، ان کے سچے عقیدتمند ہونے کے باوجود ان کے کاموں پر نکتہ چینی بھی کرتے تھے بعض تو اس حد تک بے باک ہوجاتے کہ محض نکتہ چینی پر اکتفا کر لینے کے بجائے ان سے جواب طلب کرتے تھے۔ قائداعظم جہاں تک ممکن ہوتا ان سب کو جواب دیتے۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ مسٹر جناح موٹر میں سفر کر رہے تھے۔ راستہ میں ایک گاؤں پڑا۔ بہت سے مداح اور مشتاق ان کے خیر مقدم کو اکٹھے ہوگئے مشتاق ہجوم نے قائد سے موٹر سے باہر آنے کی درخواست کی۔ قائداعظم باہر آئے تو ان کے گلے میں ہار ڈالے گئے اور قومی کاموں کے لئے روپئوں کی تھیلی انہیں نذر کی گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ مسلم لیگ کے نعرے بھی جاری رہے۔ نعرہ لگانے والوں میں ایک دس سال کا بچہ بھی تھا۔ قائداعظم نے انگلی کے اشارے سے اسے اپنے قریب بلایا اور پوچھا "تم پاکستان زندہ باد کہہ رہے ہو۔ پاکستان کا مطلب بھی سمجھتے ہو؟" بچہ نے جواب دیا: "بے شک! مجھے پاکستان کے بارے میں اتنا تو نہیں معلوم جتنا آپ کو۔ لیکن صرف اتنا جانتا ہوں کہ پاکستان کے معنی یہ ہیں کہ ہندوستان کے جن حصوں میں مسلمان زیادہ ہیں حکومت مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور جہاں ہندو زیادہ ہیں حکومت ہندؤوں کے ہاتھ میں ہو۔" قائداعظم اس معصوم کے جواب سے مطمئن ہوگئے۔ شفقت سے اس کی پیٹھ ٹھونکی اور اسے رخصت کیا۔ لیکن یہ چھوٹا سا واقعہ انہیں ہمیشہ یاد رہا۔ اور وہ اسی واقعہ کے حوالے سے ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی آواز، پروپیگنڈے کے ساز و سامان کی کمی کے باوجود ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچ گئی ہے۔

الطاف حسین

قائدِ اعظمؒ کی یاد میں

قائدِ اعظم کو ہم سے جُدا ہوئے آج چار ہفتے گذر چکے ہیں[1]۔ میرا خیال ہے کہ آسانی سے یہ قبول کر لینا ہمارے لئے کبھی بھی ممکن نہ ہو سکیگا کہ وہ واقعی اس دُنیا سے رخصت ہو گئے ہیں۔ اب بھی لوگ مجمعوں میں "قائدِ اعظم زندہ باد" کے نعرے لگاتے ہیں۔ یہ صرف اسلئے نہیں کہ وہ ان نعروں کے عادی ہو گئے ہیں اور نہ اسلئے کہ وہ نعرہ لگانے والوں کے نادیدہ محبت و احترام کے جذبے کا اظہار ہوتا ہے۔ میرے خیال میں یہ نعرہ اس قومی نصب العین کا مظہر ہے جسے غیر فانی بنانے کا قائدِ اعظم نے بیڑا اٹھایا تھا۔ واضح طور پر ہر شخص جانتا ہے کہ وہ نصب العین کیا تھا۔ کیونکہ ہمیشہ اس کی یاد تازہ رکھنے کے لئے معجزۂ پاکستان ظہور میں آچکا ہے لیکن اگر ہم ان کے نظریات و اصول کے صحیح معنوں میں شیدائی ہیں تو ہمیں چاہئے کہ اپنی بھی زندگی میں ان پر کاربند ہونے کی کوشش کریں اور اپنی کارگذاریوں کے ہر شعبے میں اس پر عمل پیرا رہیں۔ ان نظریات و اصول کو تفصیل وار بیان کرنا یا ان کو من و عن پیش کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ میں آج کی صحبت میں کوشش کروں گا کہ اپنے حافظہ کی لوح سے چند نقوش اجاگر کر کے آپ کی خدمت میں پیش کر دوں۔

تقریباً بارہ سال گذرے جب پہلی بار مجھے ان سے شرفِ ملاقات حاصل ہوا۔ وہ مسلم لیگ کی ازسرِ نو تنظیم کے سلسلے میں سارے ہندوستان کا دورہ کرتے ہوئے کلکتہ تشریف لائے تھے۔ ان کی آمد کے دوسرے ہی دن مجھے پیغام ملا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں بے حد استعجاب اور کسیقدر گھبراہٹ کے عالم میں اصفہانی صاحب کے دولت کدہ واقع ہیرنگٹن اسٹریٹ پر پہنچا۔ قائدِ اعظم وہیں قیام فرما تھے۔ انھوں نے مجھ سے ایسے خلوص سے مصافحہ کیا کہ میں حیران رہ گیا کیونکہ میں ان کے لئے بالکل اجنبی تھا اور سیاسی اعتبار سے میری کوئی اہمیت نہیں تھی۔ انھوں نے سب سے پہلی بات جو مجھ سے کہی یہ تھی کہ "میں آپ کے مضامین پڑھتا رہا ہوں اور آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ آپ صحیح راستے پر گامزن ہیں۔" آج تک مجھے معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ اس راز سے جسے بڑی کوشش سے سربستہ رکھا گیا تھا کیسے واقف ہو گئے کہ اخبار "اسٹیٹسمین" کے صفحات میں "عین الملک" کے قلمی نام سے میں ہی یہ مضامین لکھتا ہوں (بعد ازاں اس قلمی نام کو "شاہد" سے تبدیل کر دیا گیا) پھر انھوں نے باتیں شروع کیں اور میں محوِ حیرت ہو کر سنتا رہا۔ اس کے بعد جب بھی ملاقات ہوئی یہی صورت عمل میں آئی۔ یعنی وہ گفتگو کرتے رہتے اور میں ہمہ تن گوش ہو کر سنتا رہتا۔ اس پہلی ملاقات کا اثر میرے لئے جتنا حیرت انگیز تھا اتنا ہی بصیرت افروز بھی تھا۔ اس موقعہ پر میں نے صحیح معنوں میں پہلی بار آنے والے واقعات کا جائزہ لیا۔ مجھے کامل یقین ہو گیا کہ مسٹر جناح (اس وقت تک ہم نے ان کو "قائدِ اعظم" کہنا شروع نہیں کیا تھا) اس امر کا لحاظ رکھیں گے کہ واقعات کی تشکیل اسی انداز پر ہو جس کا ہیولا ان کے تصورات نے قائم کیا ہے اور جس کے خاکے ان کے ذہن میں مرتب ہوئے ہیں۔

مذکورہ بالا واقعہ سے، اس حقیقت سے قطع نظر کہ وہ میرے لئے کس درجہ اہمیت رکھتا تھا، یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شروع دن سے مسلمانوں میں تنظیم پیدا کر کے انھیں ناقابلِ تسخیر بنانے کا اعلیٰ مقصد ذہن میں لئے قائدِ اعظم ہر موقع و محل پر ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتے تھے جن کی خدمات قومی مقاصد کے حصول میں ذریعۂ کار بنائی جا سکیں۔ چنانچہ ایسے لوگ بے کھٹکے منتخب کرنے کا انھیں بڑا ملکہ تھا اور ہمت افزائی کر کے وہ ان سے کام لینا بھی خوب جانتے تھے۔

اب میں دس سال کی لمبی جست لگا کر ۱۹۴۵ء میں قدم رکھتا ہوں جبکہ مجھے قائدِ اعظم کی طرف سے باریابی کا شرف حاصل ہوا اور انھوں نے براہِ راست میری خدمات حاصل کرنے کے لئے "ڈان" کی عنانِ ادارت میرے سپرد کر دی۔ اب مجھے ان سے ایک قریبی تعلق حاصل ہونے کا موقع ملا اور میں زیادہ اچھی طرح معلوم کر سکا کہ وہ مفادِ ملی کے سلسلے میں قومی کارکنوں سے کس قسم کی خدمات چاہتے ہیں۔

اس مقصد کے حق بجانب ہونے میں جس کے وہ مردِ غازی تھے، ان کی عقیدت ناقابلِ شکست تھی اور ان کا یہ عقیدہ راسخ تھا کہ وہ انجام کار اس کی تکمیل و تحصیل میں ضرور کامران و بامراد رہیں گے۔ عموماً جب راہِ منزل کٹھن معلوم ہوتی اور خدا کم ہمت کے لوگ میدان ہارتے نظر آتے تو قائدِ اعظم کی چند لمحے کی گفتگو اپنا کرشمہ کر دکھاتی حصولِ آزادی کی کشمکش کے دوران میں بارہا بادِ مخالف کے تند و تیز جھونکوں کا مقابلہ کرنا پڑا مگر قائدِ اعظم کی بلند ہمت کبھی پست و ماندہ ہونے نہ پائی۔ چند دن ہوئے ہمارے وزیرِ اعظم نے فرمایا "ہمت ہارنا ایک ایسی اصطلاح ہے جو ہمارے لغت میں نہیں مل سکتی۔" بلاشبہ یہ قائدِ اعظم کے سچے جانشین کی آواز ہے۔

---

[1] یہ تقریر ریڈیو پاکستان کراچی سے ۱۲ اکتوبر کو نشر ہوئی تھی۔ ریڈیو پاکستان کے شکریہ کے ساتھ اس کا ترجمہ ہدیۂ ناظرین ہے۔

قائد اعظم نے ہمیشہ ایسے بالغ نظر لوگوں کی تعریف کی ہے جو ایک نگاہ میں معاملے کے تمام پہلوؤں کو سمجھنے اور نشیب و فراز سے آگاہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ انھیں ایسے لوگوں سے چڑ تھی جو اپنی رائے قائم کرنے یا کسی نتیجے پر پہنچنے میں جوش و خروش یا جذبات سے کام لیتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو "پکا منطقی" کہتے تھے اور چاہتے تھے کہ سب ایسے ہی ہو جائیں۔ انھوں نے کئی بار مجھ سے کہا: "آپ کو صحیح غور و فکر کی عادت ڈالنی چاہئے" اور مجھے یقین ہے کہ یہ بات انھوں نے اور بہت لوگوں سے بھی کہی ہوگی ——— "ہماری قوم کے افراد میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ وہ سیاق و سباق کا پورا لحاظ رکھے بغیر بہت عجلت کے ساتھ نتائج اخذ کر لیتے ہیں"۔ یہ بات بھی انھیں بار بار کہنی پڑی۔ ہم میں سے بہت سے لوگ جن میں صفِ اول کے اپنے چند لیڈروں کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے، عموماً قائد اعظم کے پاس اس کامل یقین کے ساتھ گئے کہ مسئلہ زیرِ بحث کا حل ہم بخوبی جانتے ہیں لیکن جب انھوں نے تشریح و توضیح کے بعد اپنی رائے ظاہر کی تو تسلیم کرنا پڑا کہ اس سلسلے میں ہمارے نتائجِ افکار حقیقتاً ناقص اور نامکمل تھے۔

قائد اعظم اس چیز کے سخت خلاف تھے کہ کسی شخص سے ایک ہی وقت میں کئی مختلف قسم کے کام لئے جائیں۔ وہ ہمیشہ اس امر کی تلقین فرماتے تھے کہ اپنے کام پر جمے رہو اور اسے خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دو۔ کبھی کبھی میں جوش میں آکر ان کے پاس گیا اور کسی نہ کسی کام کے لئے اپنی خدمات پیش کیں لیکن ہمیشہ انھوں نے مجھے نرمی اور شفقت کے ساتھ ٹال دیا۔ وہ تقسیمِ عمل کے زبردست حامی تھے۔

کوئی چھوٹے سے چھوٹا مسئلہ ایسا نہیں تھا جس میں وہ خود دخل نہ دیتے ہوں۔ میں اپنی عمر میں کسی ایسے شخص سے نہیں ملا جو اسقدر عروج کے باوجود اتنی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو حتٰی کہ اپنے نام آئے ہوئے ہر خط کو شروع سے آخر تک پڑھنا ایک ہی فرض سمجھتا ہو۔ ان کی دن بھر کی مصروفیت میں سے بہت سا وقت بے شمار خطوط کو کھولنے اور پڑھنے کے لئے مخصوص تھا۔ وہ ان سب کا جواب دیتے یا نہ دیتے لیکن پڑھتے ضرور تھے وہ چاہتے تھے کہ عوام کے خیالات و احساسات سے ایک قریبی ربط حاصل رہے تاکہ وہ ان لوگوں کی دقتوں اور پریشانیوں سے آگاہ رہیں جن کی وہ رہنمائی کرتے تھے۔ البتہ گورنر جنرل ہونے کے بعد ان کے کچھ خطوط ان کے عملے کے پاس رہ جاتے تھے۔ ایسا کرنا ضروری تھا حالانکہ اس کے بعد سے لکھنے پڑھنے میں ان کا اور زیادہ وقت صرف ہونے لگا تھا کیونکہ ان کے پاس "اس" اور "بے بنیز" کا طومار لگا رہتا تھا جسے سرکاری زبان میں "مسلوں" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

قائد اعظم بہت ہی محنتی انسان تھے۔ وہ کبھی نچنت ہو کر نہ بیٹھے۔ اسی کا المناک نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے۔ اپنے ساتھ انھوں نے ان لوگوں کو بھی نچنت ہو کر بیٹھنے نہ دیا جو ان کی نگرانی میں قومی خدمات انجام دیتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے: "ہر شخص اپنے کام سے لگا رہے۔ ہمیں چھٹی منانے کی فرصت کہاں!" ایک بار انھوں نے سب سے زیادہ سختی سے مجھے اسی لئے جھنجھوڑا کہ میں نے اس اُصول کی خلاف ورزی کر کے ایک چھٹی منا لی تھی۔

شاید قائد اعظم اس روئے زمین کے انسانوں میں سب سے زیادہ بااصول محتاط اور دور اندیش تھے۔ ان کے فولادی صندوقوں میں اہم خطوط کے علاوہ اخباروں اور رسالوں کے وہ تراشے بھی جمع رہتے تھے جنہیں وہ کسی لحاظ سے سودمند سمجھتے ہوں۔ کبھی کبھی گفتگو کے دوران میں وہ ایک لمحے کے لئے رُکتے، آہستہ سے اپنی کنجیاں نکالتے، احتیاط کے ساتھ کسی ایک صندوق کو کھولتے، کوئی مسودہ اٹھاتے اور اس میں سے حوالہ دینے لگتے اور پھر اسی احتیاط کے ساتھ مسودہ صندوق میں رکھ کر قفل لگاتے اور کنجیوں کا گچھا اپنی جیب میں ڈال لیتے۔ گفتگو کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو جاتا۔ وہ ایسے موقعوں پر کبھی عجلت نہیں برتتے تھے۔

بے پناہ کام کرنے اور بے شمار لوگوں سے ملنے کے باوجود وہ اخبار پڑھنے کے لئے وقت نکال لیتے تھے۔ اور ایک دو نہیں بہت سے اخبارات۔ چنانچہ بزرگی و برتری کے اعتبار سے ہی نہیں باخبر رہنے کے لحاظ سے بھی ان کا مرتبہ لیڈروں میں سب سے زیادہ بلند تھا۔

قائد اعظم جانتے تھے کہ قلم کی آزادی کا صحیح مفہوم کیا ہے اور اسی لئے ایک صحافت نگار کی عظمت ان کی نگاہ میں بہت زیادہ بلند تھی۔ اگر وہ چاہتے تو "ڈان" کے بانی و متولی ہونے کے اعتبار سے اخبار کی حکمتِ عملی کے مختارِ کل ہو سکتے تھے لیکن میری ادارت کے تین سال کے دوران میں صرف ایک بار انھوں نے مجھے ایک مضمون لکھنے کا مشورہ دیا۔ اس کا تعلق سیاسیات سے بالکل نہیں تھا۔

ایک روز نئی دہلی میں انھوں نے مجھے بلا کر کہا: "میں نے آج تک تمہیں کوئی چیز لکھنے کے لئے نہیں کہا ہے لیکن آج اس کی ضرورت ہوئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ لوگ مجھے خطوط لکھنے کم کر دیں کیونکہ آجکل میں ان سب کا جواب دینے سے قاصر ہوں۔ اس سلسلے میں آپ کچھ کیجئے"۔ انھوں نے بغیر کھلے ہوئے خطوط کے ایک بے پناہ انبار کی طرف اشارہ کیا جو صرف اسی روز صبح کی ڈاک سے ان کے پاس آئے تھے۔ انھوں نے فرمایا: "جب کوئی خط میرے پاس آجاتا ہے تو اسے کھولنا اور پڑھنا میرا فرض ہو جاتا ہے"۔ نزاکت وقت کے لحاظ سے ان دنوں ان کا یہ کہنا بجا و درست تھا کیونکہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے مذاکرات کا سلسلہ قائم تھا اور ہماری قوم کی قسمت کا آخری فیصلہ ہونے والا تھا اسلئے انھیں کسی اور کام کے لئے ایک لمحے کی بھی فرصت نہیں تھی۔

ایک اور واقع کو یاد کر کے میرا سر اظہارِ تشکر میں جھکتا اور احساس فخر سے بلند ہو جاتا ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد کراچی میں ایک طویل گفتگو کے موقع پر انھوں نے میرے اخبار کے افتتاحیہ مقالوں میں آزادی رائے کی ضرورت پر زور دیا۔ میں نے ایک مضمون

لکھا تھا جسے چھپے لفظوں میں خود قائد اعظم پر اعتراض سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ وہ اس کا مطالعہ فرما چکے تھے۔ اسی روز شام کو ان سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے صرف اتنا کہا "میں تمہارا مضمون پڑھ چکا ہوں" اور پھر ان کی زبانِ مبارک سے وہ الفاظ نکلے جنکو میں تمام صحافت نگاروں کے لئے آزادی کا منشور سمجھتا ہوں۔ انھوں نے فرمایا "کسی موضوع پر غور کرو اور اپنے دل میں فیصلہ کرلو۔ اگر تم اس نتیجے پر پہنچ چکے ہو کہ ایک خاص نظریہ یا اعتراض پیش کرنا ضروری ہے تو بالکل وہی لکھ ڈالو جو حقیقتاً تم نے محسوس کیا ہے۔ کبھی پس و پیش نہ کرو اس خیال سے کہ کوئی ناراض ہو جائیگا یہاں تک کہ اپنے قائدِ اعظم کی ناراضگی کی بھی پروانہ کرو"۔ اس سے زیادہ قدر و منزلت ہمارے پیشے کی اور کیا ہو سکتی ہے اور حقیقتاً ایک عظیم المرتبت ہستی ہی یہ الفاظ ادا کر سکتی ہے۔

قائد اعظم کی وحدتِ مقصد ایک ضرب المثل بن گئی تھی۔ چنانچہ بعض معترضین اپنی کج فہمی کی بنا پر یا تعصب کی وجہ سے انھیں "ہٹ دھرم" کہتے تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ ایک بار فیصلہ کر لینے کے بعد کہ مسلمانوں کی آزادی کا مسئلہ صرف قیام پاکستان ہی کی صورت میں حل ہو سکتا ہے، انھوں نے اسکو اپنی زندگی کا واحد مقصد بنا لیا۔ یہی ان کے خوابوں کا محل تھا اور یہی ان کی گفتگو کا موضوع چاہے وہ بر سرِ اجلاس جلوہ فرما ہوں چاہے خلوتِ راز میں محوِ تکلم یا احباب کے ساتھ کھانے کی میز پر۔ مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آگیا جو پوری طرح اس رائے کی ترجمانی کر سکتا ہے۔ ۱۹۴۶ء میں جب قائد اعظم لندن تشریف لے گئے تو (MORAL REARMAMENT MOVEMENT) کے بانی مسٹر فرینک بچمین نے ان کو مدعو کیا اور ایک ناٹک دیکھنے کے لئے کہا جو اسی تحریک سے متعلق تھا۔ کھیل ختم ہونے کے بعد محفل طعام منعقد ہوئی۔ کھانے کے دوران میں مسٹر بچمین نے اپنی تحریک کے موضوع پر بڑی لچھے دار گفتگو شروع کر دی۔ دس منٹ تک قائد اعظم ان کی باتیں سنتے رہے اور پھر موضوع بدل کر پاکستان کا ذکر چھیڑ دیا۔ حسبِ معمول ان کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک رونما ہو گئی۔ اور آواز میں زبردست زور پیدا ہو گیا۔ مسٹر بچمین کان دبائے سب کچھ سنتے رہے۔ اور جب کھانا ختم ہو گیا اور لوگ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں الگ ہٹ کر باتیں کرنے لگے تو سب کا موضوعِ گفتگو صرف پاکستان تھا اور یہ سلسلہ دیر تک قائم رہا۔

قائد اعظم کو خوش وقتی کے بہت کم موقعے نصیب ہوتے لیکن جب کبھی اتفاق ہوتا تو وہ بہت لطیف مذاق کرتے اور اپنی زندہ دلی کا ثبوت دیتے تھے۔ لندن میں ایک روز شام کے وقت انھوں نے چہل قدمی کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ مسٹر لیاقت علی خاں اور اسکاٹ لینڈ یارڈ کے چند افسران کی معیت میں وہ ہوٹل سے نکلے اور سڑک پر ادھر ادھر گھومنے لگے۔ اسی شام کو محکمہ پولیس کے ان افسران نے ہمیں بتایا کہ قائد اعظم اور لیاقت علی خاں صاحب نے لندن کے قواعدِ آمد و رفت کا بالکل خیال نہیں رکھا۔

کئی موقعوں پر میں ان کی ظرافتِ طبع پر حیران رہ گیا۔ مثلاً گذشتہ سالگرہ کی تقریب ایک دعوتِ طعام پر ختم ہوئی جو شیخ غلام حسین ہدایت اللہ مرحوم نے ان کے اعزاز میں دی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد جب قائد اعظم چلنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تو بیگم ہدایت اللہ نے ان کے بازو پر امام ضامن باندھ دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے اثر سے ہر قسم کی بلائیں دور رہتی ہیں۔ میں اتفاق سے قائد اعظم کے قریب ہی کھڑا تھا۔ وہ میری طرف پلٹے اور اپنا بازو ہلا کر کہنے لگے "اب میں ڈان کا بھی سامنا کر سکتا ہوں"۔

آخری بار میں ۲۷ جون کو قائد اعظم سے زیارت میں ملا۔ اس وقت وہ پچھلے چند مہینوں کے مقابلے میں کسی قدر بہتر معلوم ہوتے تھے۔ تقریباً دو گھنٹے تک وہ ان منصوبوں کا ذکر کرتے رہے جو انھوں نے پاکستان کی آئندہ بہتری کے لئے تیار کئے تھے۔ اسکے سوا کوئی دوسرا موضوع نہیں چھیڑا۔ ان دنوں پاکستان کے اسٹیٹ بنک کی رسمِ افتتاح ادا کرنے کی تیاری ہو رہی تھیں اور انھیں اس غرض سے کراچی آنا تھا۔ ان کے دل میں زبردست جوش و خروش تھا۔ وہ بنک کے قیام کو پاکستان کے اقتصادی استحکام سے تعبیر کر رہے تھے۔ اپنے مخصوص انداز میں اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے وہ فولادی صندوق کھولا اور "لندن اکونومسٹ" کا ایک پرچہ نکالا جس میں پاکستان کے اقتصادی وسائل پر ایک اچھا مضمون شامل تھا۔ انھوں نے وہ پرچہ پڑھنے کے لئے مجھے دیدیا۔ میں حیران تھا کہ وہاں بھی سرکاری مسلوں سے ان کا پیچھا چھوٹ سکا۔ میں نے استدعا کی کہ آپ اپنی طبیعت پر زیادہ زور نہ ڈالا کریں تاکہ جلدی سے آپ کو صحت و تندرستی ہو جائے۔ انھوں نے فرمایا "یہ کیونکر ممکن ہے؟ — میں شروع سے آخر تک اچھی طرح پڑھے بغیر کسی کاغذ پر دستخط نہیں کر سکتا"۔ یہ ان کا خاص طریقہ تھا اور اس طرح ہمارے محبوب قائدِ اعظم پاکستان کے مفاد کی خاطر کام کرتے کرتے موت کے آغوش میں پہنچ گئے۔ انھوں نے عظمتِ پاکستان کے خوابوں کو حقیقت میں بدلنے کے تمام منصوبے اسی جانکاہی کے ساتھ تیار کئے تھے۔ اب جبکہ وہ رخصت ہو گئے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ اپنی محبت و عقیدت کا ثبوت دینے کے لئے ہم ان کے خوابوں کو سچ کر دکھائیں۔ ہم اس بات کے ذمہ دار ہیں کہ پاکستان کو خوش حال ہی نہیں ابد تک قائم رکھنے کی صورت پیدا کریں۔

"اپنے بچوں کو پاکستان کا لائق شہری اور سپاہی بنائیے۔ آپ نے پاکستان کے لئے بڑی قربانیاں کی ہیں — لیکن ابھی قربانیوں کی منزل ختم نہیں ہوئی۔ ایک قدم اور آگے بڑھئے، اور وہ وقت دور نہیں کہ انشاءاللہ دنیا کی ساری قومیں پاکستان کی عظمت کو تسلیم کریں گی۔"

قائد اعظم ——— ۲۰ فروری ۱۹۴۸ء

ایشیائی مسلمانوں کی تاریخ میں ان دو مجاہدوں کو ہمیشہ تکریم و تحریم سے یاد کیا جائے گا۔

ٹیپو سلطانؒ قائد اعظم محمد علی جناحؒ

ٹیپو سلطان تلوار سونت کر انگریزی فوجوں کی صفوں میں گھسے۔ اور انہیں درہم برہم کرانے کے بعد کمال جوانمردی اور جرأت سے جام شہادت نوش فرمایا اور تلوار آنے والی نسلوں کے حوالے کر دی۔

بطل جلیل ٹیپو سلطان کی سوانح و احکام و قوانین اور طرز حکومت کے حالات صحیفۂ ٹیپو سلطانؒ مصنفہ محمود بنگلوری میں پڑھئے اور پاکستان کی تعمیر میں عملی حصہ لیجئے۔

قیمت دو خصص آٹھ روپے (۸/-)

قائد اعظم اپنی شخصیت کی قوت سے نہ صرف انگریزوں کو بلکہ رام راج کے خواب دیکھنے والوں کا متحدہ محاذ توڑنے میں کامیاب ہوئے اور اپنی پسماندہ قوم کو عروج کی شاہراہ پر گامزن کر کے اسی سفر میں شہید ہوئے۔

قائد اعظم کی زندگی کے حالات پڑھئے اور دیکھئے کہ کس طرح ایک مخلص مسلمان محض جذبۂ خدمت اور دلولۂ عمل سے ایک قوم کا ناجی قرار پاتا ہے۔

مصنفہ چودھری سردار محمد خاں (چھ روپے آٹھ آنہ) بچوں کیلئے خاص ایڈیشن (چھ آنہ)۔

> ٹیپو سلطانؒ اسلامی جلال کے قصر میں آخری قمقمہ تھے ۔۔۔!
> قائد اعظمؒ نئے اسلامی قصر کے اولین و روشن ترین فانوس تھے ۔۔۔!

ہماری دیگر کتابیں

چھپ چکی ہیں

تاریخ سلطنت خداداد	محمود بنگلوری	۱۲/-
تاریخ جنوبی ہند	"	۵/-
حیدر علی تاریخی ناول	"	۲/۸
انقلابات ہیں زمانے کے	"	۲/۸
پندرہ اگست	رشید اختر ندوی	۳/-
شہناز	منفلوطی مترجم حبیب اشعر	۱/۴
عورت کا گناہ	فارغ بخاری۔	۲/-
گورکی کے افسانے	مترجمہ سعادت حسن منٹو	۳/۸
رنگین مشاہدے	مظفر گیلانی	۲/۸

چھپ رہی ہیں

فیصلہ کن جنگیں	محمود بنگلوری	۲/۸
تاج	"	۱/۴
سیرت الصدیق	حبیب الرحمٰن خان شروانی	۲/-
ایک پہیلی	رشید اختر ندوی۔	۱/۴
اشک و تبسم	جبران مترجم حبیب اشعر	۳/-
ریت اور جھاگ	جبران " "	۲/۸

مفصل فہرست طلب فرمائیے

انڈین مجلس کے سالانہ ڈنر کا دعوت نامہ، جس میں قائدِ اعظم مہمان خاص کی حیثیت سے مدعو تھے۔ دعو
بائیں حصہ پر شریک ہونے والے مہمانوں کے دستخط ہیں۔ ان میں قائد اعظم کے دستخط بھی نظر آ رہے

...idge Muslim Association

SATURDAY, 6th JUNE

3 p.m.

Mr M. A. JINNAH, Delegate to the Indian Round Table Conference, will speak on "The Present Situation in India", in the Old Combination Room, Trinity College

TUESDAY, 9th JUNE

8.30 p.m.

Election of Office Bearers and Social At M. Qizilbash's rooms in St Mary's Chambers, St Mary's Passage

M. QIZILBASH, Clare,
Hon^y Sec.

کیمبرج مسلم ایسوسی ایشن کا دعوت نامہ ←

TOASTS

Hindoostan

The President

Our Guests

The President — Mr M. A Jinnah

Cambridge University

Mr H. M. Malik (*Secretary*) — Mr J M Wordie

Sister Societies

Mr A. K Mitra (*Treasurer*) — Mr F W. D Obeyesekere (*Ceylon Society*)

The Majlis

Mr H Z A Kabir (*Oxford Majlis*) — Mr M A. Husain

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

ایم، اے حسین

ایک نئے دور کا آغاز

۱۹۲۹ء بحران کا سال تھا، معاشی خوش حالی اور سیاسی استحکام کے ایک دور کے بعد اس سال سے دنیا میں معاشی اور سیاسی خرابیوں کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اسی سال گرمیوں میں وال اسٹریٹ سے، جو امریکا کی اقتصادی زندگی کا مرکز ہے معاشی تباہی کی ابتدا ہوئی، اور اس تباہی نے دنیا کی معاشی بنیادوں کی جڑیں تک ہلا کر رکھ دیں۔ چونکہ ہمارے زمانہ میں معاشیات اور سیاست کا رشتہ بہت قریبی ہے۔ اس لئے معاشی تباہ حالی نے سیاست پر اپنا اثر ڈالا اور دنیا پر غم کے بادل چھا گئے۔ ہندوستان بھی اس اثر سے محفوظ نہ رہا۔ سیاسی ہیجان جو ۱۹۲۴ء سے برابر خاموش تھا پھر کروٹیں لینے لگا۔ مہاتما گاندھی نے نئے حالات سے فائدہ اٹھایا اور "ڈنڈی چلو" کے نعرے سے ایک نئی سیاسی جد وجہد شروع کر دی۔

اس کے بعد ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۳ء کے درمیان جو کچھ ہوا وہ ہم میں سے ہر ایک کو معلوم ہے ستیہ گرہ کی تحریک خوب چلی اور لارڈ اروِن کی خاموش پالیسی نے کانگریس کو کامیابی کا موقع دیا۔ اس کامیابی کا نتیجہ وہ معاہدہ ہے جو گاندھی اروِن معاہدہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہی زمانہ ہے جب ہندوستانی سیاست کا اسٹیج ہندوستان سے لندن منتقل ہوا۔ جہاں گول میز کانفرنس کے اجلاس ہوئے۔ اور دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر یہ بات صاف ہو گئی کہ ہندوستان کو ڈومینین اسٹیٹس یا مہاتما گاندھی کے لفظوں میں "آزادی کا خلاصہ" نہیں ملیگا۔ جس چیز کے ملنے کی توقع تھی اس کا انداز کچھ اس طرح کا تھا جس میں صوبائی خود مختاری کے ساتھ ساتھ ایک معمولی قسم کا وفاق ہو، اور آخری اختیارات تحفظات کی صورت میں مرکز میں گورنر جنرل کے ہاتھ میں ہوں اور صوبوں میں گورنروں کے ہاتھ میں۔ فرقہ وارانہ مسئلہ سیاسی اصلاحوں کے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ اس لئے اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لئے سب سے پہلے ہندو مسلم سمجھوتہ کرانے کی کوشش کی گئی یہ سب کو معلوم ہے کہ سمجھوتہ کی اس گفتگو میں دو جماعتیں خاص تھیں — ایک طرف مسلمان اور دوسری طرف ہندو، مہاسبھائی، سکھ اور دوسرے لوگ۔ مہاتما گاندھی اس گفتگو سے الگ رہے اس لئے کہ وہ اپنے آپ کو ہندو اور مسلمان دونوں کا نمائندہ سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی سب جانتے ہیں کہ گفتگو میں ایک منزل ایسی آگئی تھی جب اختلاف صرف پنجاب میں ایک اور بنگال میں دو نشستوں کا رہ گیا تھا اور بالآخر گفتگوؤں کا یہ طول طویل اور تکلیف دہ سلسلہ مکمل ناکامی میں ختم ہوا اور دونوں فریقوں نے اس بات پر رضامندی ظاہر کی کہ برطانوی وزیر اعظم مسٹر ریمزے میکڈانلڈ اس مسئلہ کا کوئی فیصلہ پیش کریں۔

اس زمانہ میں جو ہندوستانی طالب علم انگلستان میں تعلیم حاصل کر رہے تھے انہیں اس بات پر بڑی الجھن اور غصہ تھا کہ ہندوستانی رہنما آپس میں ذرا ذرا سی باتوں پر جھگڑ رہے ہیں، حالانکہ ان کی اصلی لڑائی اپنے مشترک دشمن انگریزوں سے ہونی چاہیئے تھی۔ ہم میں سے کچھ لوگ جو اس زمانہ میں کیمبرج میں تھے اپنے ساتھیوں کے ان جذبات میں شریک تھے۔ ہم نے انڈین مجلس کی طرف سے ایک ایک کرکے مختلف وفدوں کے لیڈروں کو اپنے یہاں تقریر کی دعوت دی۔ تقریر کے بعد ان سے جو بحث ہوئی اس میں ہم لوگ خاصی ترشی اور کبھی کبھی گستاخی سے بھی کام لیتے۔ مدن موہن مالوی اور مونجے کی خاصی گت بنائی گئی۔ مسٹر جیکر نے تقریر کی لیکن ہماری معلومات میں کوئی خاص اضافہ نہ ہوا۔ مہاتما گاندھی آئے تو سننے والوں کا بڑا ہجوم تھا۔ ان کی تقریر لوگوں نے بڑی عزت اور احترام سے سُنی۔ انھوں نے سیاسی ناکامی کی ذمہ داری ہندو اور مسلمان دونوں پر رکھی، برخلاف اسکے دوسرے لیڈر عموماً براہِ راست یا بالواسطہ اس ناکامی کا ذمہ دار صرف مسلمانوں کو ٹھہراتے رہے تھے۔

طالب علموں کی سیاسی سرگرمی ان مقرروں کی تقریروں ہی تک محدود نہ تھی بلکہ وہ اپنی مجلسوں میں آپس میں بھی لگاتار بحث مباحثے کرتے رہتے تھے۔ طالب علموں میں سے اکثر (جن میں بہت سے مسلمان بھی شامل تھے) کانگریس کے حامی تھے لیکن مسلمان طالب علموں کا ایک گروہ ایسا بھی تھا جو یہ سمجھتا تھا کہ مسلمانوں کو بلا وجہ مطعون کیا جا رہا ہے۔ ان طالب علموں کو ان کے ساتھی فرقہ پرست کہتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تھوڑے سے مسلمان طالب علم ہر ایک کی نظر میں بُرے بن گئے۔ انڈین مجلس کے علاوہ ایک دوسری جماعت کیمبرج مسلم ایسوسی ایشن تھی۔ لیکن یہ ایسوسی ایشن کچھ عرصہ سے خاموش سی تھی جس زمانہ کا حال میں لکھ رہا ہوں یعنی ۱۹۳۱ء میں اسے دوبارہ زندہ کیا گیا۔ یہ چیز ہمارے ہندو اور نیشنلسٹ خیال رکھنے والے مسلمان دوستوں کو بہت ناگوار ہوئی۔ اپنے احیا کے بعد ایسوسی ایشن نے سب سے پہلے جلسہ میں مسٹر ایم اے جناح کو دعوت دی اور انھوں نے ہندوستان کے مسئلہ پر تقریر کی۔ اس جلسہ کا دعوت نامہ اب تک میرے پاس ہے قارئین اس کا عکس اس مضمون کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں گے۔ جلبہ ٹرنٹی کالج کے اولڈ کامبینیشن روم

میں کیا گیا تھا۔ دعوت نامے سارے ہندوستانی طالب علموں اور اتنے انگریز دوستوں کے نام بھیجے گئے تھے جتنے آسانی سے ہال میں آسکتے تھے۔ مسٹر جے اے رحیم (جو اس وقت قاہرہ میں پاکستانی سفارت کے مشیر ہیں) ایسوسی ایشن کے صدر اور میرے دوست ایم۔ اے۔ کے قزلباش (اب نواب سر مظفر علی خاں قزلباش) سکریٹری تھے۔ جب مسٹر جناح سے جلسہ میں تقریر کرنے کی درخواست کی گئی تو انھوں نے فوراً قبول کر لی۔

اور جلسہ ہفتہ کے دن ۲۰ جون ۱۹۳۱ء کو ہوا جلسہ میں مسٹر جناح اپنی بہن محترمہ فاطمہ جناح کے ساتھ فرانس کی بنی ہوئی مشہور قیمتی گاڑی ہسپانو سوئزا میں بیٹھ کر تشریف لائے۔ جن لوگوں نے انھیں پہلی مرتبہ دیکھا تھا وہ ان کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوئے۔ ان کی خوش پوشی نے انھیں فوراً ہی نوجوان خوش باش طالب علموں کا محبوب بنا دیا۔ طالب علموں کے علاوہ جو علم دوست حضرات جلسہ میں شریک ہوئے ان کی حیرت کا وقت بعد میں آنے والا تھا۔ مسٹر جناح کی تقریر کوئی گھنٹہ بھر جاری رہی۔ جیسا کہ عام طور پر لوگوں کو معلوم ہے، اس وقت تک وہ ہندو مسلم اتحاد کے بڑے زبردست حامی تھے اور حالانکہ ان کے "۱۴ مطالبات" نے فرقہ پرست ہندوؤں کے دل میں ان کی طرف سے ایک کد پیدا کر دی تھی، لیکن ان میں اکثر سچے دل سے یہی سمجھتے تھے کہ ہندو مسلم اتحاد اگر کوئی حاصل کر سکتا ہے تو صرف مسٹر جناح صاحب۔ جناح صاحب کے ان خیالات کا ہمیں علم تھا، لیکن جو چیز ہم سب کے لئے بے حد بصیرت افروز تھی وہ ہندو مسلم مسئلہ کے متعلق ان کا گہرا تجزیہ تھا۔ اور اب جبکہ میں اس دن کا تصور کرتا ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ اب سے ۱۷ برس پہلے کی تقریر میں بھی بعد میں آنے والے واقعات کی ایک جھلک موجود تھی اور اس طویل مدت کے گزر جانے کے باوجود اب تک میرے ذہن میں اس تقریر کے نکات تازہ ہیں مثلاً اس بات پر کہ ہندوستانی مسلمانوں کا ایک واضح کلچر اور طرز زندگی ہے جو انہیں کے لئے مخصوص اور انھیں بے حد محبوب ہے، اور اس لئے ان کی خواہش ہے کہ ہر آئین میں ان کے اس تمدن اور معاشرت کا پورا تحفظ ہونا ضروری ہے ان کے قوی دلائل اب بھی روز روشن کی طرح میرے سامنے ہیں۔ حالانکہ اسوقت ان کے ذہن میں یہ بات نہ تھی کہ ہندو مسلمانوں کے کلچر کو تباہ و برباد کر دینا چاہتے ہیں، لیکن انھوں نے اس بات پر پورا زور دیا تھا کہ اکثریت رکھنے والی سب جماعتیں شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے کلچر کو اقلیتوں کے کلچر پر غالب دیکھنا چاہتی ہیں۔ چنانچہ ہندوستان کی موجودہ سیاست اس بات کی شاہد ہے۔ ابھی پچھلے دنوں ہندوستان کے وزیر اعظم مسٹر جواہر لال نہرو نے ایک موقع پر اس بات کا اظہار ان لفظوں میں کیا کہ "گو ہماری ریاست مذہبی نہیں لیکن چونکہ ملک میں آبادی کی اکثریت ہندوؤں کی ہے اس لئے لازمی طور پر ملک کے مجموعی کلچر پر ہندوؤں کا کلچر غالب رہے گا" یہ خطرہ ایسا ہے جو ساری دنیا کے ملکوں کو یکساں طور پر لاحق ہے اور اسی لئے ہر آئین میں سیاسی، سماجی اور مذہبی معاملات میں اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ ایک لازمی چیز ہے۔ اس موقع پر انہوں نے کناڈا کی مثال دی، جہاں دو مختلف قوموں کے لوگ ساتھ ساتھ آباد ہیں، ایک قوم برطانوی نسل سے ہے اور دوسری فرانسیسی ان دونوں کے کلچر آئینی تحفظ کی بنا پر بغیر باہمی تنازعے کے وہاں پھل پھول رہے ہیں۔ انہوں نے اس موقع پر یہ خواہش ظاہر کی کہ کاش ہندوستان کے ہندو بھی کناڈا سے سبق حاصل کریں، اور یہ بات تسلیم کر لیں کہ اقلیتوں کو آئینی تحفظات کی ضرورت ہوتی ہے اور ان مسلمانوں کو جو اس طرح کے تحفظات کے طالب ہیں فرقہ پرست اور قومیت کے دشمن کہنا چھوڑ دیں۔

دوسری اہم بات جو جناح صاحب نے اس موقع پر کہی یہ تھی کہ مسلمانوں کے جائز مطالبات بھی اکثریت رکھنے والی قوم کے دل میں اس کی طرف سے بے اعتباری پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ رویہ مناسب نہیں۔ اس موقع پر انہوں نے مصر کے زاغلول پاشا کے ایک واقعہ کا ذکر کیا جس میں زاغلول پاشا نے اپنے ایک صحیح عمل سے قبطی اور مصری مسئلہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ واقعہ یوں تھا کہ زاغلول پاشا قبطی لیڈروں کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ اپنے مطالبات ایک کاغذ پر لکھ دو۔ قبطیوں نے اپنے مطالبات لکھ دئے زاغلول نے ان مطالبات کو پڑھے بغیر انھیں لوگوں کے سامنے اس کاغذ پر دستخط کر دئے۔ اس بات نے قبطیوں پر بڑا اثر کیا اور اعتبار اور بھروسہ کے اس معمولی سے عمل نے مصر کی موجودہ قوم کو ایک متحد قوم بنا دیا۔ اس کے برخلاف ہندو ہمیشہ مسلمانوں سے کوئی سودا کرنے اور سودے پر جھگڑنے کی فکر میں رہتے ہیں مسئلہ کو حل کرنے کا یہ طریقہ صحیح نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ لوگ ایک دوسرے پر بھروسہ کریں۔

یہ بات شاید اب بھی لوگوں کے ذہن میں ہو گی کہ جس زمانہ کا حال میں لکھ رہا ہوں اس کے کچھ عرصہ بعد گاندھی جی نے ایک اعلان میں یہ کہا تھا کہ "میں مسلمانوں کو ایک سودیشی قلم اور سودیشی کاغذ دوں گا کہ وہ اس کاغذ پر اپنے مطالبات لکھ دیں اور کانگریس کی طرف سے میں ان مطالبات کو جوں کا توں قبول کر لوں گا" یہ وعدہ محض لفظی وعدہ رہا اور دوسری گول میز کانفرنس کے بعد کانگریس نے مسلمانوں کے ان مطالبات کے قبول کرنے کی طرف کوئی قدم نہیں اٹھایا جنھیں ابھی چند دن ہوئے "ہندوستان ٹائمز" میں انتہائی جائز کہا گیا تھا۔

حالانکہ اس جلسہ میں جناح صاحب نے مسلمانوں کے نقطۂ نظر اور مسلمانوں کے وفد کے طرزِ عمل کی ترجمانی بڑی قابلیت اور کامیابی سے کی تھی۔ لیکن انکی پوری تقریر قومیت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ انہوں نے مشترک انتخاب کی حمایت کی اور اس بات پر زور دیا کہ ہم سب کو انگریزوں کے خلاف متحد ہونا چاہیئے لیکن انہوں نے اس موقع پر اس چیز کی وضاحت بھی کر دی کہ چونکہ عام طور پر مسلمان مشترک انتخاب کے حامی نہیں ہیں اس لئے آئین میں جداگانہ انتخابات کا ہونا لازمی ہے۔ جناح صاحب نے پورے مسئلہ کو اس قدر وضاحت اور منطقی انداز سے پیش کیا کہ کیمبرج کے وہ

نوجوان بھی جنھیں عموماً اپنی قابلیت کا پندار ہوتا ہے ان سے کوئی الٹا سیدھا سوال نہ کرسکے۔ اس طرح جناح صاحب کی ذات کی بدولت کیمبرج مسلم ایسوسی ایشن کا پہلا جلسہ بے حد کامیاب رہا۔ اس بات سے ہمارے بعض ہندو دوست کچھ خوش نہ ہوئے اور ہم لوگوں سے تعلقات (بظاہر بغیر کسی معقول وجہ کے) کچھ دن تک کشیدہ رہے۔ اگلے دن (یعنی) ۲ جون ۱۹۳۱ء کو کچھ مسلمان طالب علموں کی ملاقات سینٹ جان کالج میں چاء پر ہوئی اور یہاں ذرا زیادہ بے تکلفی سے باتیں ہوئیں۔ اس ملاقات میں جناح صاحب نے ہندوؤں کے ارادوں کے متعلق زیادہ یقین کے ساتھ شبہے ظاہر کئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس دن جناح صاحب نے گاندھی جی کا ذکر برابر "مہاتما جی" کہہ کر کیا لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا کہ "آخر تو ہندو ہیں اور اس لئے ان کے لئے ہندوؤں کا مفاد باقی ہر مفاد سے بڑھ کر ہے"۔ اس دن کی گفتگو سے یہ بات صاف طور پر ظاہر تھی کہ جناح صاحب کے دل میں گاندھی جی کی بڑی عزت تھی۔ اپنے متعلق جناح صاحب نے فرمایا کہ جب سے انہوں نے مسلمانوں کے چودہ مطالبات پیش کئے ہندوؤں کو ان پر بھروسہ نہیں رہا۔ اس پر ہم میں سے کسی نے کہا "لیکن مسلمان رہنماؤں میں صرف آپ ہی ایسے ہیں جن کی طرف سے ہندوؤں کے دل میں سب سے کم بے اعتباری ہے اور اسلئے شاید آپ ہی کی ذات ہے جو ہندوؤں سے مسلمانوں کے مطالبات منوا سکتی ہے۔

اگلے سال فروری ۱۹۳۲ء میں جب انڈین مجلس کا ڈنر ہوا تو میرے دوست مسٹر حسین ملک (جو اُس وقت انڈین مجلس کے سیکرٹری تھے) کے ایما پر مسٹر جناح کو مہمان خاص کی حیثیت سے دعوت دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس موقع کا مینو کارڈ، میرے پاس ہے اس پر مسٹر جناح کے دستخط ہیں اور اس لئے میں نے اسے بیش بہا خزانہ کی طرح احتیاط سے اپنے پاس رکھ چھوڑا ہے۔ اس ڈنر میں جو بہت سے معزز مہمان موجود تھے۔ ان میں سینٹ جانز کالج کے ماسٹر مسٹر جے۔ ایم ورڈی اور کیمبرج یونیورسٹی یونین کے گذشتہ اور موجودہ صدر بھی موجود تھے، انڈین مجلس کے صدر سیلون کے رہنے والے نوارتنا راجا تھے اور آکسفورڈ مجلس کی نمائندگی مسٹر ہمایوں کبیر نے کی تھی۔ ہمارے ان مہمانوں نے مسٹر جناح کے خیر مقدم کے لئے جو تقریریں کیں ان کے جواب میں انہوں نے ایک بہت اچھی تقریر کی چونکہ یہ تقریر کھانے کے بعد ہوئی تھی اس لئے اسکا انداز بڑا ہلکا پھلکا تھا۔ لیکن یہ ہلکی پھلکی تقریر بھی شروع سے آخر تک شوخ مزاح اور تیز طنز سے پُر تھی۔ نوارتنا راجا نے جناح کے چودہ مطالبات کی طرف ایک طنز آمیز اشارہ کیا تھا۔ اس لئے اپنی تقریر میں جب مسٹر جناح ہندوستان کے مسئلہ پر گفتگو کرنے لگے تو ان کا شوخ اور شگفتہ انداز فوراً بے حد سنجیدہ ہو گیا اور انہوں نے بڑی تلخی سے ہماہما کے اس رویہ کی مذمت کی جس کی بدولت قوم کو یہ ذلت گوارا کرنی پڑی کہ وہ اپنے معاملہ میں ملک کے حکمرانوں سے فرقہ وارانہ فیصلہ کے طالب ہوں۔ انہوں نے آج بھی مسلمانوں کے مطالبات کا ذکر کیا اور کہا کہ یہ مطالبات اتنے جائز ہیں کہ ہر ایک کے لئے قابل قبول ہونے چاہئیں۔ حالانکہ اس دن بھی جناح صاحب نے ذاتی طور پر مشترک انتخاب کو ترجیح دی۔ اس سلسلہ میں مجھے ان کے گونجتے ہوئے الفاظ اب تک اچھی طرح یاد ہیں۔

"حضرات! جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، میں فرقہ وارانہ اختلافات سے تنگ آچکا ہوں۔ میرے لئے تو ہندوستان سب کچھ ہے!" یہ بات ایسی تھی کہ نیشنلسٹ ذہنیت رکھنے والے ہندوؤں کو بے حد پسند آئی اور ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ ڈنر ختم ہوا تو مشتاق طالب علموں نے آکر جناح صاحب کو گھیر لیا۔ ان میں ہندوستانی، انگریز، ہندو اور مسلمان سب شامل تھے۔ بے شمار سوال پوچھے گئے اور بار بار ان کے بارہا کہے ہوئے جملوں کی تصریح اور توضیح کرائی گئی۔ یہ تصریحات اور توضیحات مسٹر جناح نے اپنے مخصوص انداز میں اس قدر صفائی اور یقین کے ساتھ کیں کہ انہوں نے ہم میں سے ہر ایک کے دل پر قبضہ کر لیا۔ اس جلسہ میں سنٹ جانز کالج کے ماسٹر مسٹر ورڈی بھی شریک تھے۔ انہوں نے اپنی تقریر میں جناح صاحب کے متعلق جو کچھ کہا تھا وہ مجھے اب تک یاد ہے" مجھے جب آج کے ڈنر کا دعوت نامہ ملا تو مجھے بتایا گیا تھا کہ مسٹر جناح بھی اس میں تشریف لا رہے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ مسٹر جناح ہماری ہی یونیورسٹی کے سابق طالب علم ہیں۔ لیکن ان سے ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ وہ کبھی کیمبرج کے طالب علم نہیں رہے حالانکہ میرا جی یہی چاہتا تھا کہ کاش وہ ہماری یونیورسٹی کے طالب علم ہوتے۔ لیکن اب جبکہ میں ان کی شاندار تقریر سن چکا ہوں میری یہ خواہش تیز تر ہو گئی ہے کہ کاش اس یونیورسٹی کو انہیں اپنا کہنے کی عزت حاصل ہوتی"۔ اپنے قائد کی یہ تعریف ہم سب کے لئے باعث افتخار ہے۔ اس رات کا بھولنا وہاں موجود رہنے والوں سے شاید کسی کے لئے بھی ممکن نہیں۔ رات خاصی گذر چکی تھی لیکن مشتاق طالب علموں نے اب بھی جناح صاحب کو گھیر رکھا تھا اور ان سے سوال پر سوال کئے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ ہوٹل کے نوکروں نے اس بڑے ہال کی روشنی گل کرنی شروع کر دی جہاں ڈنر ہوا تھا۔ ہم لوگ جناح صاحب کی گفتگو میں جو دلچسپی لے رہے تھے اسے دیکھ کر انہوں نے ہمیں اپنی قیام گاہ پر آنے کی دعوت دی اور وہاں پہنچ کر ہم کئی گھنٹے ان سے گفتگو کرتے رہے۔ وہ صبر و تحمل سے ہر سوال کا جواب دے رہے تھے اور انہیں اس وقت تک اطمینان نہ ہوتا جب تک وہ سوال کرنے والے کو مطمئن نہ کر دیتے۔

مسٹر جناح نے اس دن ہم سب کو اتنا متاثر کیا کہ کچھ طالب علموں نے جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے جوش میں یہ فیصلہ کر لیا کہ ہم اپنی پڑھائی لکھائی چھوڑ کر مسٹر جناح کا ساتھ دینگے اور اس وقت تک چین سے نہ بیٹھیں گے جب تک ہندوستان کی قیادت ان کے ہاتھ میں نہ آجائے ہم لوگ یہ محسوس کر رہے تھے کہ یہی ایک شخص ہے جو ہندوستان کو آزادی دلاکر اسے فرقہ وارانہ مناقشات سے آزاد کرا سکتا ہے، یہی ایک شخص ہے جس کی ذات نام و نمود اور جاہ پسندی، خواہش اور جذبہ سے مبرا اور بے نیاز ہے۔

اسی سال مسٹر جناح کو انڈین مجلس نے ایک دوسری دعوت دی۔ یہ غالباً جون ۱۹۳۲ء کی بات ہے۔ اس مرتبہ ان سے درخواست کی گئی کہ وہ مجلس کے ہفتہ وار اجلاس میں آکر تقریر فرمائیں۔ مجلس کے صدر مسٹر حسین ملک جناح صاحب کو مدعو کرنے کی غرض سے خود لندن گئے تھے۔ جناح صاحب نے ازراہ کرم دعوت منظور کر لی۔ جلسہ کیمبرج کے ٹاؤن ہال میں ہوا۔
جناح صاحب کی پچھلی تشریف آوری اور اس جلسہ کی تشریف آوری کے درمیان لندن کی گول میز کانفرنسوں میں بہت کچھ ہو چکا تھا۔ وزیر اعظم مسٹر ریمزے میکڈانلڈ نے ہندوستانی لیڈروں سے ایک متفقہ فیصلہ کے مان لینے کی جو اپیل کی تھی وہ مہا سبھائی اور سکھ لیڈروں کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے ناکام رہی۔ گاندھی جی بھی اس موقع پر کچھ نہ کر سکے اور یہ کہہ کر خاموش ہو رہے کہ مہا سبھا پر میرا کوئی اثر نہیں۔ سب ہندو لیڈر جس میں پنڈت مدن موہن مالوی سے لے کر سر تیج بہادر سپرو تک سارے لیڈر شامل تھے۔ گول میز کانفرنس میں گاندھی جی کے اس رویّہ کے خلاف تقریر کر چکے تھے، جو انہوں نے کانگریس کے واحد نمائندے کی حیثیت سے کانفرنس میں اختیار کیا تھا۔ ان ساری چیزوں نے جناح صاحب کے رویّہ میں بھی تبدیلی پیدا کر دی۔ اس لئے کہ اس جلسہ میں وہ کانگریس اور مہا سبھائی لیڈروں سے یکساں طور پر برافروختہ معلوم ہوتے تھے۔
انھوں نے کانگریس، مہا سبھا اور برطانوی حکومت، ہر ایک کو اپنی تیز و تند طنز کا نشانہ بنایا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہماری موجودہ سیاسی جدوجہد میں تین جماعتیں ہیں — انگریز، ہندو اور مسلمان۔ اور اس لئے جب تک ہندو اور مسلمان آپس میں لڑتے رہیں گے۔ انگریز ہندوستان سے نہیں جائیں گے اور یہ صورت اس وقت تک قائم رہے گی جب تک ہندو مسلمانوں کے مطالبات کو تسلیم نہ کر لیں۔ اور انگریز اپنی اس پالیسی کو ترک نہ کریں کہ کبھی ایک کا ساتھ دینے لگے اور کبھی دوسرے کا۔ ہندوؤں کو مخاطب کرتے ہوئے انہوں نے کہا "آخر مسلمان کیا مانگ رہے ہیں؟ وہ جو کچھ مانگ رہے ہیں وہ ان کی حیثیت اور ضرورت سے ہرگز زیادہ نہیں ہے اگر آپ ان مطالبات کو بھی زیادہ سمجھتے ہیں تو اللہ آپ پر رحم کرے۔" حیرت کی بات یہ ہے کہ اس صاف گوئی کے باوجود ہندو طالب علموں نے ان کی کسی بات پر اظہار ناراضی نہیں کیا بلکہ اس کے برخلاف ہندو مسلم مسئلہ پر ان کے رویہ میں یہ تبدیلی پیدا ہو گئی کہ انھوں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ زیادتی مسلمانوں کی طرف سے نہیں بلکہ ہندو مہا سبھا کی طرف سے ہے۔ میرے خیال سے ان کی یہ آخری تقریر تھی جس میں انہوں نے ہندوؤں سے اپنے رویہ میں تبدیلی پیدا کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔
کیمبرج میں انہوں نے جو تیسری تقریر کی اس سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ ہندو مسلم سمجھوتے کے امکانات کی طرف سے ان کے یقین میں اب تزلزل پیدا ہو چکا ہے۔ یہی وقت تھا کہ ان کی سیاسی زندگی میں ایک خاص دور کا خاتمہ ہوا — وہ دور جس میں

قائد اعظم مشرقی پاکستان میں :

بقیہ صفحہ ٦٩

۲۹ مارچ کو حضرت قائد اعظم ڈھاکہ کے ہوائی مستقر سے بصد شان و شوکت اپنے لاکھوں شیدائیوں کو آخری پیغام دے کر رخصت ہوئے۔ اور کراچی پہنچ گئے۔ لیکن خطۂ بنگال کا ہر گوشہ پیغام بصیرت سے مہینوں گونجتا رہا اور آج تک اس کی یاد تازہ ہے! اور صد حیف کہ ۱۲ ستمبر ۱۹۴۸ء کو مشرقی بنگال کے اسی دار الخلافہ ڈھاکہ اور دوسرے مقامات نے اچانک اپنے اسی محبوب قائد اعظم کی اچانک وفات کی خبر سنی جس کے خیر مقدم کی دوبارہ تیاریوں کے لئے وہ منتظر تھے۔ اس حادثۂ عظیم نے ان مقامات کو ماتم کدہ بنا دیا! ہر ایک کی نظر میں ۱۹ سے ۲۹ مارچ تک کے جانفروز مناظر رک رک کے گزرنے لگے۔ اور حیرت و حسرت نے مجبور و پریشان بنا کر کہلوا دیا کہ
حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد

متعدد مقامات پر ماتمی جلسے۔ تعزیتی اجتماع۔ مجالس اور نمازیں ادا کی گئیں۔ صوبائی مسلم لیگ ڈھاکہ کے صدر قبلہ محمد اکرم خاں صاحب مدظلہ نے خراج عقیدت ادا کرتے ہوئے اپنی ایک تقریر میں فرمایا۔
"مِلّت کا سپہ سالارِ اعظم گزر گیا۔ پرچم حریت مِلّت کے ہاتھ میں دیکر منزلِ حقیقی پر پہنچا۔ محمد علی جناح نے رحلت فرمائی۔ قائد اعظم زندہ ہے!"
لاریب کہ ملّتِ اسلامیہ کو زندہ تابندہ کرنے والا قائد اعظم زندہ ہے۔ مشرقی پاکستان کی سرزمین انہیں نعروں سے گونجتی رہے گی۔ جو اس کے ورود مسعود پر گونجے تھے۔ قائد اعظم زندہ باد! اور پاکستان کا چپہ چپہ ہی نہیں ہندوستان کا گوشہ گوشہ بلکہ دنیائے اسلام کا کونا کونا انہیں نعروں سے آباد ہے اور ابد الآباد تک آباد رہے گا۔ پاکستان آزاد ہے اور ان شاء اللہ تا قیامت آزاد رہے گا —

ان کے سوانح نگاروں نے انھیں "اتحاد کے سفیر" کا لقب دیا ہے۔ تاہم ۱۹۳۲ء ابھی بہت دور تھا اور پاکستان اور اس کے تصور کو کچھ تخیلی لوگوں کا خواب رنگین سمجھا جاتا تھا۔ پاکستان کا تصور کیوں پیدا ہوا، اس کی داستان خاصی طولانی ہے پچھلے پچاس سال کی تاریخ کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے کچھ مطالبات کئے، انھیں ٹھکرایا گیا اور انگریزوں نے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے جو رعائتیں دیں ان کی ہندوؤں نے مخالفت کی اور آخر واقعات اس حد کو پہنچ گئے کہ ملک کی تقسیم ایک ناگزیر چیز بن گئی اور قائد اعظم کی دور بین نظر نے ہندوؤں کے اس رویہ کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکالا کہ مسلمانوں کی فلاح بہبود اور نجات صرف قیام پاکستان میں ہے۔ اس نتیجہ پر پہنچ کر اس منزل کی طرف قوم کی رہبری کی اور اس منزل پر پہنچ کر دم لیا ●

رئیس احمد جعفری

قائداعظم کی کہانی

کچھ کہیں سے — کچھ کہیں سے

لکھنؤ چیف کورٹ، جسٹس گوکرن ناتھ کی عدالت تماشائیوں سے، قانون کے طالب علموں سے، نوآموز وکیلوں سے، بڑے بڑے بیرسٹروں اور سینئر وکیلوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی ہے، ریاست نانپارہ کا مقدمۂ ملکیت زیر سماعت ہے۔ ایک فریق کے وکیل، مشہور انگریز دشمن، سابق صدر کانگریس، اور مسلم لیگ کے مایۂ ناز قانون داں، مسٹر حسن امام ہیں، دوسرے فریق کے وکیل، ہوم رول لیگ کے خالق تلک اور گوکھلے کے ممدوح، دادا بھائی نوروزجی کے چہیتے، چند سال پہلے تک کانگریس کے روح رواں نیشنلسٹوں کے امام حاضر اور مسز سروجنی نائیڈو کے الفاظ میں ہندو مسلم اتحاد کے سفیر، مسٹر جناح ہیں۔ خلقت انہی دونوں چوٹی کے وکیلوں کی بحث سننے آئی ہے!

وہ دیکھئے جسٹس گوکرن ناتھ مسرا با صد جلال و تمکین تشریف لائے۔ تمام حاضرین سرو قد تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے کارروائی شروع ہوئی مسٹر حسن امام نے بحث کا آغاز کیا، غرارے دار پاجامہ تن زیب کا انگرکھا، سر پر دو پلی ٹوپی زبان انگریزی، لب و لہجہ ہندوستانی!

تقریر کیا تھی، فن آئین و قانون کا بہتا ہوا دریا تھی ایک سے ایک بڑھ کر دلیل، نئی نئی تکلیریں، اچھوتے نکتے، زور بیان، حسن استدلال، شگوفہ کاریاں، زبان کی گلکاریاں، دلائل کی پرکاریاں، کیا کچھ نہیں تھا؟ حاضرین تو حاضرین، خود جسٹس گوکرن ناتھ کا یہ حال تھا کبھی انکا قہقہہ عدالت میں بانگ دہل کی طرح گونج اٹھتا تھا، کبھی محویت، تحیر حسن استدلال کے بوسے لیتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

اور مسٹر جناح؟

مسٹر جناح، خاموشی سے اپنی کرسی پر متمکن تھے، نہ قہقہہ نہ تبسم، نہ پیوست نہ استکراہ، یہ معلوم ہوتا تھا، وقار و متانت اور دبدبہ و طنطنہ کا مجسمہ بیٹھا ہوا ہے۔ حسن امام کی تقریر ختم ہوئی، سب سنبھل کر بیٹھ گئے، اب جناح کی باری تھی، جچے تلے الفاظ پر زور مدلل لیکن باوقار لہجہ۔ وکیل مخالف کی ایک ایک دلیل، جو ابھی چند لمحے پہلے تک پہاڑ کی طرح وزنی اور چٹان کی طرح مستحکم نظر آ رہی تھی اب روئی کے گالے کی طرح کمرۂ عدالت میں اڑ رہی تھی، جسٹس گوکرن ناتھ، اب تک باغ و بہار بنے ہوئے تھے، ہنستے بھی تھے، ہنساتے بھی تھے، اب یکسر فکر و استغراق نظر آ رہے تھے، حسن امام نے دو گھنٹے سے زیادہ تقریر کرکے یہ طلسم باندھا تھا، اور اس طلسم کو توڑنے آدھے گھنٹے کی مختصر لیکن جامع و مانع تقریر سے اسے ختم کرکے رکھ دیا!

ایک تاثر کے عالم میں عدالت برخاست ہوئی، اور لوگ، اس وقت تک اس دبلے پتلے لیکن آہنی انسان کو دیکھتے رہے جب تک، اسکی کار شملہ پیلس، جہانگیر محمود آباد کے دولت کدہ کی طرف روانہ نہیں ہو گئی!

انڈین لیجسلیٹو اسمبلی! سر عبدالرحیم، کرسی صدارت پر رونق افروز ہیں کمیونل ایوارڈ زیر بحث ہے، حکومت، اور کانگرس پارٹی، اپنی اپنی تائید و حمایت کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہیں، حکومت چاہتی ہے کہ اصلاحات جدیدہ سے متعلق، رپورٹ جوں کی توں منظور کر لی جائے، کانگرس چاہتی ہے اسے یکسر مسترد کر دیا جائے، مسٹر جناح، اصلاحات کے مخالف ہیں، لیکن کمیونل ایوارڈ کے حامی ہیں، ایک حد تک وہ حکومت کا ساتھ دینا چاہتے ہیں، اور ایک حد تک کانگریس کا۔

سر ہنری کریک نے ملامبر، اور لیڈر آف دی ہاؤس کی حیثیت سے ایک معرکہ آرا تقریر میں حکومت کے نقطۂ نظر کی شکایت کی، مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی نے فصاحت و بلاغت کا دریا بہا کر، کانگریس کی ترجمانی کی، سرکار کی تقریر، خطابت اور جوش بیان کا نمونہ تھی، ڈیسائی کی تقریر استدلال اور منطق کا شاہکار تھی، اب جناح، حقیقت پسندی کے حربے سے مسلح ہو کر کھڑا ہوا،

جناح کی تقریر دودھاری تلوار تھی، جو برق بالنوزانبکر، فرنگی سامراج کے خرمن حیات پر گر رہی تھی، اور ساتھ ہی ساتھ، وہ ہندو امپیریلزم کے گھونٹے مشکبوں پر بھی پڑ رہی تھی، جناح نے حکومت سے مخاطب ہو کر کہا، تمہاری فیڈرل اسکیم مکر و فریب کے سوا کچھ نہیں ہے، تم ہندوستان کی روح سے اقوام ہند کی نفسیات سے، ہندو اکثریت کی سرشت سے، اور اقلیتوں کے حال زار سے ناواقف ہو، ہر مرتبہ جب تم اصلاحات کا خاکہ تیار کرتے ہو، تمہارے پیش نظر صرف سامراجی اغراض و مقاصد ہوتے ہیں، پھر وہ مسٹر ڈیسائی کی طرف مخاطب ہوا اور اس نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا، اگر تم میں اتنی وسعت قلب، اور عالی ظرفی نہیں ہے کہ اقلیتوں کے ساتھ باعزت سمجھوتہ کر سکو، ان کی شکایات رفع کر سکو، ان کے مطالبات منظور کر سکو، ان کے احتیاجات پورے کر سکو، تو تمہیں حکومت کا پیش کردہ کمیونل ایوارڈ

منظور کرنا پڑے گا، اگر تم واقعی سچائی اور صداقت کے ساتھ حکومت کو شکست دینا چاہتے ہو، تو آؤ ہم سے سمجھوتہ کرو، ورنہ ہم اصلاحات مسترد کر دینگے اور ایوارڈ منظور کر لینگے، اصلاحات اسلئے مسترد کر دینگے کہ وہ ملک کیلئے بحیثیت مجموعی مہلک ہیں اور ایوارڈ اسلئے منظور کر لینگے کہ اس کے سوا کوئی اور چارہ کار رہی نہیں ہے۔

اس تقریر کا ردّ عمل یہ ہوا کہ حکومت کی اکڑی ہوئی گردن، اور اکڑ گئی اور کانگریس کی گردن میں خم آگیا، حکومت اپنی روش پر اڑی رہی اور کانگریس کمیونل ایوارڈ کے معاملہ میں غیر جانبدار ہو گئی ووٹنگ ہوئی، تو فتح جناح کی تھی یعنی اصلاحات کی رپورٹ مسترد، اور کمیونل ایوارڈ منظور!

نظام دکن کا گسٹ ہاؤس! — لارڈ ویول وائسرائے ہند نے مسلم لیگ کی تجاویز ماننے سے معذوری ظاہر کی ہے، مسٹر جناح نے، ان سے جنگی سرگرمیوں میں ان سے اور ان کی حکومت سے تعاون کرنے سے انکار کر دیا ہے، وائسرائے ایک جنگی کونسل بناتے ہیں، اور اس کی ممبری کے لئے مسلم لیگ کی بعض سربرآوردہ شخصیتوں ـ سر سکندر حیات خاں وزیر اعظم پنجاب، مسٹر فضل الحق وزیر اعظم بنگال، سر سعد اللہ وزیر اعظم آسام، سر سلطان، اور نواب صاحب چھتاری وغیرہ سے ساز باز کرتے ہیں، اور انہیں ممبری پر راضی کر کے سرکاری اعلان کر دیتے ہیں، ساتھ ہی ساتھ نظام دکن کا فرمان شائع ہوتا ہے، جس کی رو سے نواب صاحب چھتاری کی وزارت عظمیٰ کا اعلان کیا جاتا ہے۔

شاہی گسٹ ہاؤس سے مسٹر جناح ایک بیان شائع کر کے وائسرائے کو ان کی کامیاب سازش پر مبارکباد دیتے ہیں، اور مذکورہ تمام اصحاب کے مسلم لیگ سے اخراج کا اعلان کرتے ہیں۔

یہ اعلان سنکر، دنیا دنگ رہ جاتی ہے، سکندر حیات اور فضل الحق، سعد اللہ، سلطان احمد اور چھتاری، اگر مسلم لیگ سے نکال دئے گئے تو رہ کیا جائے گا؟

ہم اٹھ گئے تو کیا تری محفل میں رہ گیا؟

لیکن قائد اعظم اپنے فیصلہ پر قائم ہیں، لوگ منتیں کرتے ہیں، التجائیں کرتے ہیں، اصرار کرتے ہیں کہ فیصلہ واپس لے لیں، لیکن جناح کے "نو" (NO) کو "یس" (YES) سے کوئی نہ بدل سکا!

اور آخرکار سکندر حیات، اور سعد اللہ، اور چھتاری توبہ کر کے اپنے گناہ سے تائب ہوتے ہیں، باقی اپنے مسلک پر قائم رہتے ہیں اور ان کا جو حشر ہوا اسے کون نہیں جانتا؟

مسلم لیگ کونسل کا اجلاس! حکومت برطانیہ نے ایک مرتبہ پھر مسلم لیگ سے بدعہدی کی، کابینہ مشن کی تجاویز مسترد کر دینے، اور حکومت کا تشریحی بیان، ماننے کے باوجود، مسلم لیگ نظر انداز کر دی گئی، اور کانگریس کے بغیر تشکیل وزارت کی اسے اجازت نہیں دی گئی!

ان بدلے ہوئے حالات پر غور کرنے کے لئے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا ایک جلسہ بمبئی کے قیصر باغ ہال میں منعقد ہوتا ہے قائد اعظم کرسئی صدارت پر جلوہ فرما ہیں۔

بڑے پر جوش انداز میں مباحثہ ہو رہا ہے۔

گرمی گفتار عنائی مجالس الاماں! کسی گوشہ سے سول نافرمانی کی تحریک شروع ہو رہی ہے، کوئی مقرر زمین و آسمان تہ و بالا کئے دے رہا ہے، کسی زبان میں خنجر کی روانی ہے، کسی کے الفاظ میں تیر و نشتر کی چبھن، کسی کے نعرہ میں زلزلہ کی گرج ہے اور کسی کی گرج، ستارہ شکن، اور آسمان گیر!

قائد اعظم سب کی سن رہے ہیں، کبھی تبسم کبھی سکوت، تبسم میں سنجیدگی اور سکوت میں فکر کے آثار نمایاں!!

دوسرے روز قائد اعظم کی مرتب کی ہوئی سرکاری تجویز پیش ہوتی، کابینہ مشن کی تجاویز مسترد، ڈائرکٹ ایکشن کا فیصلہ ابتدائی اقدام سرکاری خطابات کی واپسی!

خطابات کی واپسی کی تحریک، خلافت اور کانگریس کی پر آشوب تحریکوں کے زمانہ میں بھی اٹھی تھی لیکن ناکام ہوئی تھی، لیکن قائد اعظم کی ولولہ انگیز اور معرکہ آرا تقریر نے فضا بدل دی لوگ جو فرزند دلبند سلطنت انگلشیہ سمجھے جاتے تھے، سب سے پہلے اٹھے، اور انہوں نے اس طوق لعنت کو گلے سے اتارنے کا برسر عام اعلان کر دیا، جوش اعلان اتنا بڑھا ہوا تھا کہ لاؤڈ سپیکر تک پہنچنے کے لئے بڑے خان بہادروں اور سروں کی قطار لگی ہوئی تھی کہ کب ہماری نمبر آئے اور ہم ترک خطاب کا اعلان کریں؟

سر فیروز خاں نون، سر غلام حسین ہدایت اللہ، سر سعد اللہ، سر ناظم الدین، نواب زادہ لیاقت علی خاں، راجہ غضنفر علی خاں، نواب اسمٰعیل خاں، سب ہی تھے، جو خطاب واپس کرنے کے لئے لپک رہے تھے، جو جوش خطاب حاصل کرنے کے لئے لوگوں میں ہوتا ہے، اس سے کہیں زیادہ خطاب واپس کرنے کا تھا،

فیض یہ کس کا؟ کرامت کس کی تھی؟

کیا قائد اعظم کے سوا، کوئی دوسرا نام بھی لیا جا سکتا ہے؟

یہ کہانی بڑی لمبی ہے، نہ کہنے والے کا جی بھرے گا، نہ سننے والے کا،

حد ہی تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کے لئے

ضیاء الدین احمد برنی

جناح میموریل ہال کیسے بنا؟

۱۹۱۷ء اور ۱۹۱۸ء کے دو سال سارے ہندوستان کی تاریخ میں بہت ہی ہنگامہ پرور سال تھے۔ جنگ کی وجہ سے ویسے کافی ہیجان موجود تھا۔ ترکی کی شرکتِ جنگ نے مسلمانوں میں گہرا تردد پیدا کر دیا تھا، اسلئے کہ وہ ترکی کے مستقبل کے بارے میں بہت متشوش تھے۔ علاوہ بریں ملک کا ایک بڑا طبقہ حکومت ہند کی جنگی پالیسی سے سخت ناراض تھا اور کوشاں تھا کہ حکومت ملک کے مستقبل کے متعلق کوئی ایسا اعلان کرے جس کی بنا پر باشندگانِ ہند کی سیاسی تمنائیں بھی پوری ہو جائیں اور وہ جنگ میں مقدور بھر حصہ بھی لے سکیں۔ یہی خلفشاری کیفیت تھی کہ حکومتِ مدراس نے یکایک ۱۶ جون ۱۹۱۷ء کو مسز اینی بیسنٹ (بانی ہوم رول لیگ) کو نظر بند کر دیا۔ کچھ دن بعد حکومت برطانیہ نے ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کو ایک اعلان شائع کیا جس میں وعدہ کیا گیا تھا کہ پہلے سے زیادہ ہندوستانیوں کو ملکی نظم ونسق میں دخیل کیا جائے گا، انہیں سیلف گورنمنٹ کی ڈگر پر ڈالا جائیگا اس ارادے سے کہ بالآخر وہ حکومت کی باگ ڈور سنبھال لیں۔ مگر یہ کام تدریجی منازل کے ذریعہ انجام کو پہنچیگا اور اس کا فیصلہ خود حکومت کرے گی کہ ترقی کا ایک قدم اٹھ جانے کے بعد دوسرا قدم کب بڑھایا جائے۔ ساتھ ہی وعدہ کیا گیا کہ وزیر ہند مسٹر مانٹیگو ہندوستان بھیجے جائینگے تاکہ حالات کا بطور خود جائزہ لیکر رپورٹ پیش کریں۔

اس کے بعد مانٹیگو تشریف لائے اور اپنی تحقیقات مکمل کرنے کے بعد جولائی ۱۹۱۸ء کو اپنی اسکیم اصلاحات بھی شائع کر دی۔ اس پر کافی جوش وخروش کا اظہار ہوتا رہا۔ انتہا پسندوں نے اسے "ناکافی، غیر اطمینان بخش اور مایوس کن" قرار دیا اور اعتدال پسندوں نے اسے غنیمت سمجھکر قبول کر لینے کی رائے دی۔

اس اثنا میں حکومتِ ہند نے بعض انقلابی سرگرمیوں کو دبانے کے لئے رولٹ کمیٹی کا تقرر کیا اور اس نے اپنی رپورٹ بھی شائع کر دی۔ سب لیڈران اس کمیٹی کی سفارشات کے خلاف تھے۔ مسٹر جناح کی رائے تھی کہ اس ملک میں انقلابی سرگرمیاں بالضرور موجود ہیں اور کم وبیش ملک میں ہوا کرتی ہیں، اسلئے حکومت کو چاہیئے کہ وہ یہ معلوم کرے کہ یہ بیماری کیوں پیدا ہوئی۔ اسباب بیماری کا ازالہ کر دینے کے بعد کسی قانون کی ضرورت نہ پڑیگی۔ اس سلسلہ میں انہوں نے حکومت کی جنگی پالیسی کی بھی مذمت کی اور فرمایا کہ "بیماری کی اصل جڑ یہی پالیسی ہے کہ ہندوستانیوں پر اعتماد نہیں کیا جاتا۔"

انہی دنوں میں حکومت سے ایک اور غلطی ہوئی جس نے ملک کی فضا کو اور زیادہ مکدر کر دیا۔ پہلی غلطی مسز اینی بیسنٹ کی نظر بندی تھی جس سے ہندوستانیوں کو یقین ہو گیا تھا کہ سیاسی مطالبات پورا کرنے کے بجائے الٹا ان کی جائز سیاسی تحریکوں کو بھی کچلا جا رہا ہے۔ ہوم رول لیگ ایک وفد مسٹر بی۔ جی۔ تلک کی زیر سرکردگی انگلستان بھیجنا چاہتی تھی تاکہ وہ وہاں جاکر صحیح واقعات سے برطانوی پبلک کو روشناس کرائے اور آزادی ہند کے بارے میں اہل ملک کے مطالبات بھی پیش کرے۔ حکومت ہند نے تو اس غرض کے لئے پاسپورٹ دیدیا تھا مگر حکومت برطانیہ نے منسوخ کر دیا۔ اس پر بہت شور مچا۔ چونکہ مسٹر جناح بھی ہوم رول لیگ (بمبئی برانچ) کے صدر تھے، اسلئے انہوں نے بھی برطانیہ کی تنگ نظری کی پالیسی کے خلاف زوردار الفاظ میں صدائے احتجاج بلند کی۔ یہ حکومت کی دوسری غلطی تھی۔

ملک کے حالات اس درجہ خراب ہو رہے تھے کہ ان کی روک تھام کرنے کی غرض سے اپریل ۱۹۱۸ء میں ملک کے لیڈران مسٹر جناح، مسز اینی بیسنٹ اور مسٹر تلک نے ایک عام اعلان شائع کیا جس میں حکومت کو جتایا گیا تھا کہ "چونکہ جنگ نہایت خوفناک مرحلے پر پہنچ چکی ہے اسلئے ضروری ہے کہ ہندوستانی لیڈروں کو اعتماد میں لیا جائے اور ہندوستانیوں کو اس طرح سے شریکِ جنگ کیا جائے گویا کہ یہ ان کی اپنی جنگ ہے۔" اعلان میں یہ بھی درج تھا کہ "ہم نوجوانوں سے ان اصولوں کی خاطر لڑنے کے لئے نہیں کہہ سکتے جن کا اطلاق خود ان کے ہم وطنوں پر نہیں ہوگا۔ لہٰذا انگلستان کو چاہیئے کہ کانگریس لیگ نے جو متحدہ مطالبات ۱۹۱۶ء کے سالانہ اجلاس کے بعد پیش کئے ہیں ان کو عملی جامہ پہنا دیا جائے۔" اعلان کے آخر میں کہا گیا تھا "ہم ایک ساتھ یا تو فتح حاصل کرینگے یا قعر تباہی میں جا گرینگے۔ ہمیں آزادی کے جھنڈے کے نیچے لڑنے دو۔ اس سے کم میں ہمارے مردوں اور عورتوں میں قربانی کا جذبہ ابھارا نہ جا سکے گا۔"

یہ تو تھی ملک کی عام فضا مگر صوبہ بمبئی میں بے چینی کے چند مقامی وجوہ بھی تھے جن میں سے یہاں پر صرف دو کا ذکر کیا جائیگا۔ ایک وجہ تو لارڈ ولنگڈن کی وہ پالیسی تھی جسکے ماتحت اس نے پولیس کے ذریعہ ۱۹۱۸ء کے اجلاس مسلم لیگ کو درہم برہم کرنے کی کوشش کی تھی اور دوسری وجہ اسکے وہ الفاظ تھے جو صوبائی جنگی کانفرنس (جون ۱۹۱۸ء) میں ہوم رول لیگ کے ارکان کے بارے میں اس نے بحیثیت صدر ادا کئے تھے۔ اب علیحدہ علیحدہ ان دونوں کی تشریح کی جاتی ہے۔

مسلم لیگ کا آٹھواں سالانہ اجلاس ۱۹۱۵ء میں (۳۰-۳۱ دسمبر ۱۹۱۵ء اور ۱ جنوری ۱۹۱۶ء) بمبئی میں ایسے میدان میں منعقد ہوا تھا جو میرین لائنز کے قریب واقع ہے۔ یہ اجلاس ملک کے مشہور محب وطن اور مسجد کانپور کی تحریک کے ہیرو مسٹر مظہر الحق بیرسٹر کی زیر صدارت انعقاد پذیر ہوا تھا۔ حکومت وقت نہیں چاہتی تھی کہ کانگریس اور لیگ میں اتنی ہم آہنگی پیدا ہو کہ وہ دونوں اپنے اجلاس ایک ہی مقام پر منعقد کیا کریں اور اس لئے اجلاس میں گڑبڑ ڈالنے کی سبیل نکالی گئی۔ بمبئی میں ہندوستان غنڈوں کی کافی تعداد رہتی آئی ہے جنہیں موالی کہا جاتا ہے۔ اس زمانہ میں وہاں کے مسلمانوں میں دو تین افراد ایسے تھے جو اپنی گرمیوں کے سبب حقیقتہً موالیوں کے سردار تھے۔ ان میں سے ایک کا نام سلیمان قاسم مٹھا[1] (جو بعد کو سر دار بہادر، جے۔ پی کے خطابات سے نوازے گئے اور شریف بھی بنائے گئے) اس دور کا پولیس کمشنر ایس۔ ایم۔ ایڈورڈز[2] تھا جو کرزن کی قسم کا افسر واقع ہوا تھا۔ حکومت کی شہ پاکر اس نے سلیمان قاسم مٹھا کی خدمات سے فائدہ اٹھایا اور سینکڑوں موالیوں کو اس جلسے میں ہنگامہ کرنے کے لئے بھیج دیا۔ اجلاس کی کارروائی ۲ بجے شروع ہوئی۔ وزیٹرز گیلری میں بہت سی نشستیں خالی تھیں۔ ابتدا میں مولانا حسرت موہانی نے لوکل باڈیز میں فرقہ وارانہ نمائندگی کے سلسلہ میں پوائنٹ آف آرڈر پیش کیا۔ صدر نے اس کے خلاف رولنگ دی اور وہ خاموشی سے بیٹھ گئے۔ اسکے بعد ہی انجمن اسلام کے سیکریٹری مولوی ضیاء الاسلام وزیٹرز گیلری سے کھڑے ہو کر چلانے لگے کہ مولانا حسرت کو بولنے کی اجازت دی جائے اور اسکے بعد کہا کہ یہ جلسہ مسلمانوں کا ہے ہندوؤں کا نہیں ہے۔ اس پر ایک شور مچ گیا مگر وہ تھوڑی دیر بعد فرو ہو گیا۔ اس کے بعد صدر نے اپیل کی کہ میں مسلمان ہوں اور جلسہ کی صدارت بھی اسلامی طریق سے کروں گا۔ اس پر ایک نے کہا کہ اگر مسلمانی کا دعویٰ ہے تو تمہارا لباس بھی مسلمانوں کا سا ہونا چاہیئے۔ تم ہرگز مسلمانوں کے لیڈر نہیں بن سکتے۔ اب کیا تھا، جلسہ میں ہنگامہ کی سی کیفیت پیدا ہونے لگ گئی۔ اسی دوران میں سلیمان قاسم مٹھا، مولوی عبدالرؤف، مسٹر ایم۔ ٹی۔ قادربھائی (صدر، انجمن ضیاء الاسلام) عبدالصمد خاں[3] نے آگے بڑھ کر کہا کہ کارروائی جلسہ اردو میں ہونی چاہیئے تاکہ مسلمان سمجھ سکیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ مسلمانوں کے مفاد کے خلاف تو نہیں ہے۔ ان میں سے چند آدمی پلیٹ فارم پر بھی چڑھ گئے اور صدر نے ان سے مصافحہ کیا اور انہیں سمجھا کر خاموش کیا، اور یقین دلایا کہ آئندہ کارروائی اردو میں ہوگی۔ سلیمان قاسم مٹھا نے کہا کہ کل ساری کارروائی کیوں انگریزی میں کی گئی تھی اور کیوں کانگریسی لیڈروں کو بلایا گیا تھا حالانکہ تم لوگوں کا دعویٰ ہے کہ یہ مسلم لیگ کی کارروائی ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ تم سب کانگریسی ہو۔ اسکے بعد چند مسلمان اور کھڑے ہو گئے اور اب کی مرتبہ انہوں نے یہ کہہ کر غل مچانا شروع کر دیا کہ ہم کانز مسلمان پر کیسے بھروسہ کر سکتے ہیں جسکے ڈاڑھی نہ ہو حالانکہ ہنگامہ کرنے والوں میں بہت سے ڈاڑھی منڈے تھے۔ خود سلیمان قاسم مٹھا اور قادربھائی ڈاڑھی منڈے تھے۔ پھر کہا کہ تم لیگ اور کانگریس کو ملا رہے ہو اور لیگ کو تاریکی میں ڈبو رہے ہو۔ اس قسم کا ہنگامہ بہت دیر تک ہوتا رہا اور انہوں نے کرسیاں پھینکنی شروع کر دیں۔ ذمہ دار آدمیوں کے چہروں سے مایوسی اور پریشانی کا اظہار ہو رہا تھا مگر صدر اور مسٹر جناح نہایت بہادری سے جمے رہے۔ اکیلے مسٹر جناح ہی ایسے تھے جو مطلق نہیں گھبرائے اور نہ انہوں نے کسی برہمی کا اظہار ہی کیا اور وہ طوفان پر قابو پانا چاہتے تھے اور بالآخر انہوں نے قابو پا لیا۔ وہ ہر سوال کا جواب دیتے رہے اور اس طرح شرارت پسندوں کو اخلاقی شکست دیدی۔ مسز بیسنٹ پلیٹ فارم سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ وہ غصہ کے مارے باہر نکلیں اور ایڈورڈز سے کہا کہ اسے روکئے۔ اس نے کہا کہ میں کچھ نہیں کر سکتا حالانکہ اس کے پاس چھ یورپین آفیسر، ڈپٹی کمشنر اور چیف پریسیڈنسی مجسٹریٹ رائے بہادر ستیلوڈ[4] باہر موجود تھے۔ پولیس کمشنر نے ستیلوڈ سے یہ کہا تھا کہ "آپ یہیں رہیئے کیونکہ عنقریب کچھ ہونے والا ہے اس وقت ہمیں آپ کی امداد کی ضرورت پڑے گی۔" پولیس کمشنر نے کیا تو یہ کیا کہ سارا

---

[1] اس لائن میں دو شخصیتیں اور بھی مشہور ہوئی ہیں۔ ایک الایا سیٹھ اور دوسرے غنی خان والا۔ اول الذکر نے اپنی زندگی کے آخری سال مسلم لیگ کی خدمت میں صرف کر دئے تھے اور اسی خدمت میں مصروف تھے کہ کسی ریلوے اسٹیشن پر ان کا انتقال ہو گیا۔ دوسرے صاحب کا بھی حال میں انتقال ہو گیا ہے۔

[2] اس نے کئی سال تک مہاراجہ کے ساتھ کمشنری کی تھی۔ یہ متعدد کتابوں کا مصنف بھی ہے جن میں "لیزرا اینڈ ہائی لینز آف بمبئی" (بمبئی کی سڑکیں اور گلیاں) بہت شہرت رکھتی ہے۔ اس نے بمبئی پولیس کی تاریخ بھی لکھی ہے جسے آج بھی حوالہ کی کتاب کی حیثیت سے استعمال کیا جاتا ہے۔ مگر اس علمیت کے باوجود مزاج میں کمزور نیت بہت تھی۔ اس نے اپنی ملازمت کے دوران بیسیوں کو جو اس کی خاموش خدمت کرتے تھے، بڑے بڑے عہدے اور خطاب دلوائے۔ چند سال ہوئے انگلستان میں نہایت نقر و فاقہ کی حالت میں اس کا انتقال ہو گیا ہے۔

[3] یہ بمبئی میں پٹھانوں کا پٹیل ہے اور خان بہادر کا اعزاز رکھتا ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ گودیوں میں اور پورٹ ٹرسٹ وغیرہ میں مزدور رکھا کرے۔ یہ بالکل ان پڑھ آدمی ہے مگر ایڈورڈز جیسے کمشنروں کی وجہ سے اس نے کافی دولت اور رسوخ حاصل کر لیا ہے۔

[4] یہ پہلا ہندوستانی ہے جو چیف پریسیڈنسی مجسٹریٹ کے عہدہ پر فائز ہوا۔ بعد کو رشوت کے ایک کیس میں اسے علیحدہ کر دیا گیا۔ یہ مرحوم لال ستیلواڈ کا بھائی تھا۔

بنیادیں خالی کرا دیا۔ لیگ کی باقی نشستیں تاج محل میں منعقد ہوئیں اور لیگ کو ناکام بنانے کے سارے منصوبے خاک میں مل گئے۔

بعد کو ایڈورڈز کے ذلیل طرز عمل کی گورنمنٹ ہاؤس جا کر گورنر سے شکایت کی اور سارے معاملہ کی تحقیقات کا مطالبہ کیا۔ گورنر نے ایڈورڈز کو بلا کر کہا کہ تمہیں کسی جانبداری سے کام لینے کی ضرورت نہیں ہے، مگر یہ محض دکھاوے کے الفاظ تھے اسلئے کہ گورنر نے چند ہی دن بعد جو ڈنر دیا اس میں پولیس کمشنر کے علاوہ سلیمان قاسم مٹھا اور اس کے دیگر حواری بھی مدعو تھے۔ رہا تحقیقات کا سوال تو حکومت نے یہ کہکر اسے ٹال دیا کہ وہ اس کے لئے تیار نہیں ہے۔ پولیس کے اس مذموم طرز عمل سے صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ موالیوں کی پشت پر ہے۔ پبلک میں عرصہ تک سخت جوش و خروش رہا اور اسے کامل یقین ہو گیا کہ حکومت دل سے ہندو مسلم اتحاد کی خواہاں نہیں ہے۔

دوسری چیز لارڈ ولنگڈن کے وہ الفاظ تھے جو اس نے جون ۱۹۱۸ء میں صوبائی جنگی کانفرنس میں ہوم رول پارٹی کے افراد کے بارے میں کہے تھے۔ اس نے کہا تھا "یہ لوگ سودا کرنا چاہتے ہیں مگر سودا کرنے کا یہ وقت نہیں ہے۔ انہیں چاہیئے کہ وہ تھڑدلی کے ساتھ نہیں بلکہ پورے دل کے ساتھ ہمارے ساتھ شامل ہوں اور تقریر یا تحریر یا عمل کے ذریعہ کوئی ایسی حرکت نہ کریں جس سے ہماری جنگ کی کامیابی کو نقصان پہنچے"۔

جس جلسہ میں یہ الفاظ کہے گئے تھے اس میں مسٹر جناح بھی موجود تھے اور انہوں نے اس ہتک کا وہیں جواب دیا تھا۔ انہوں نے فرمایا تھا "ہم محض چکنے چپڑے الفاظ نہیں چاہتے۔ ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ ایسا نہیں کہ اسے مزید التوا میں ڈالا جائے۔ ہم باتوں کی بجائے عمل چاہتے ہیں۔ ہوم رول پارٹی کی سچائی پر یقین نہ کرنا اس کی توہین کرنا ہے اور یہ ایسی بات ہے جسے میں تو برداشت نہیں کروں گا"۔

اس واقعہ کے چند دن بعد ۱۶ جون کو شانتا رام چال[1] میں ایک زبردست جلسہ مسٹر گاندھی کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ جلسہ میں جو قرارداد منظور کی گئی اس کی تحریک مسٹر جناح نے کی تھی۔ اس قرارداد میں کہا گیا تھا کہ "حکومت ابھی تک ہندوستانیوں کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جنگ کے سلسلہ میں اس نے جتنے اقدامات کئے ہیں ان سب میں اسی کی بو آتی ہے۔ فوج میں کمیشن والے درجے ابھی تک ہندوستانیوں کو نہیں دئے گئے۔ نہ صرف یہ بلکہ باشندوں کو اسلحہ رکھنے سے روکا جا رہا ہے۔ امپیریل کونسل کی قرارداد کے مطابق ہندوستانی طلبا کو ابھی تک فوجی کالجوں میں داخل ہونے کیلئے نہیں بھیجا گیا"۔ مسٹر جناح نے دوران تقریر میں لارڈ ولنگڈن کے الفاظ کو بہت بڑی غلطی سے تعبیر کیا اور صاف صاف کہا کہ اس نے ہوم رول لیگ کی سخت توہین کی ہے اور اعلان کیا ہے کہ جب تک لارڈ ولنگڈن کی طرف سے ان ذلت آمیز الفاظ کو واپس نہیں لیا جائیگا وہ کسی ایسے جلسہ میں حصہ نہیں لینگے جس کا صدر وہ ہوگا۔ اس کے بعد حکومت ہند کے ارکان کو مخاطب کرکے فرمایا "جب تک آپ اپنی پالیسی تبدیل نہیں کرینگے اس وقت تک آپ ہمیں اس قابل نہیں کر سکتے کہ ہم اپنی بساط بھر سپاہیوں سے آپ کی مدد کریں"۔

اسی سال کے آخر میں لارڈ ولنگڈن کی میعاد گورنری ختم ہو رہی تھی چنانچہ بمبئی کے چند خطاب یافتگان کی ایک جماعت ٹائمز آف انڈیا[2] کے ایڈیٹر مسٹر اسٹینلے ریڈ کی زیر صدارت بنائی گئی جس نے شریف بمبئی[3] سے درخواست کی کہ وہ سبکدوش ہونے والے گورنر کے اعزاز میں اہالیان صوبہ بمبئی کے نام سے ایک پبلک جلسہ کا انتظام کرے تاکہ اس میں اس کی یادگار قائم کرنے کے مسئلہ پر غور و خوض کیا جا سکے۔

مسٹر جناح نے اہالیانِ صوبہ بمبئی کی طرف سے ایک خط جس پر ۲۰۰ اکابر کے دستخط تھے مسٹر اسٹینلے ریڈ کے نام بھیجا اور اسے اطلاع دی کہ "ہم مخالفین اس جلسہ میں شرکت کرینگے تاکہ آئینی طریقے سے ہز ایکسیلینسی کو اہالیانِ صوبہ کے نام سے ایڈریس دینے، انکے عہد حکومت کو سراہنے، بمبئی گورنر کی حیثیت سے اسکی خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھنے یا اسکی یادگار قائم کرنے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں"۔ اسوقت بمبئی کرانیکل[4] اپنے وقت کا سب سے نڈر اور قومی تحریک کا سب سے بڑا علمبردار تھا۔ اس نے مختلف مضامین کے ذریعہ لارڈ ولنگڈن کے عہد حکومت کی دھجیاں بکھیر کر رکھدیں اور ساتھ ہی اسنے ۱۹۱۸ء میں آل انڈیا مسلم لیگ اور آل انڈیا نیشنل

[1] بمبئی میں گرگام کے علاقہ میں ایک مشہور جگہ کا نام ہے جو کھلے میدان ہونے کے ساتھ ساتھ چاروں طرف سے عمارتوں سے محصور ہے۔ ایک زمانہ میں وہ مقام بمبئی کی سیاسی زندگی کا مرکز تھا۔ اب اس کی جگہ چوپاٹی اور شیواجی پارک (دادر) نے لے لی ہے۔

[2] جس زمانہ کا اس مضمون میں ذکر ہے اس وقت ٹائمز آف انڈیا نیم سرکاری اخبار کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس نے تحریک آزادی کا اور مختلف ہندوستانی لیڈروں کا جتنا مذاق اڑایا ہے اتنا کسی اور اخبار نے نہیں اڑایا۔ اب اسے سیٹھ ڈالمیا نے خرید لیا ہے۔

[3] یہ ایک اعزاز ہے جسے گورنمنٹ ہر سال اپنے کسی نہ کسی منظور نظر کو دیتی ہے۔ بمبئی میں اسکی میعاد ۲۰ دسمبر سے شروع ہوتی ہے۔ شریف کو بھی عہدہ سنبھالتے وقت حلفِ وفاداری اٹھانا پڑتا ہے۔

[4] اسے ۱۹۱۳ء میں سر فیروز شاہ مہتہ نے جاری کیا تھا۔ اس کے پہلے ایڈیٹر مسٹر بی۔ جی۔ ہارنیمن تھے۔ جب وہ ولنگڈن میموریل کی تحریک میں حصہ لینے کے جرم میں ۱۹۱۹ء کے شروع میں یکایک جلاوطن کر دئے گئے تو انکی بجائے مسٹر محمد مارماڈیوک پکتھال ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ مسٹر پکتھال کے چلے جانے کے بعد سے مسٹر سید عبداللہ بریلوی ایڈیٹری کے فرائض ادا کر رہے ہیں۔ ۱۹۱۹ء میں مسٹر سید حسین، مسٹر پوتھن جوزیف اسی اخبار سے وابستہ تھے۔ اس اخبار کا اتنا اثر تھا کہ حکومت کے افراد بھی اسے بغیر پڑھے نہ رہتے تھے۔ جس دن لارڈ ولنگڈن کی روانگی عمل میں آئی تھی اسی صبح کو اس نے مذمت میں کنگ کام لیڈنگ آرٹیکل لکھا تھا۔ میرے ایک دوست جو سی۔ آئی۔ ڈی میں تھے اور اس دن گورنمنٹ ہاؤس میں فرض منصبی ادا کر رہے تھے مجھ سے کہا تھا کہ لارڈ ولنگڈن نے ہفتہ کی صبح کو یعنی روانگی کے دن مجھے بلا کر کہا کہ کرانیکل لا کر دو۔ اس دن کا اخبار لارڈ ولنگڈن کے کارناموں سے بھرا ہوا تھا۔ غنیمت ہے کہ چلتے چلاتے اس نے تصویر اپنے آئینہ میں دیکھ لی۔

کانگریس کے سالانہ اجلاس ایک ہی مقام پر منعقد کرنے کے سلسلہ میں مسٹر جناح کی خدمات کو بھی خوب سراہا[1]۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر بمبئی کرانیکل اور بمبئی سماچار[2] نہ ہوتے تو قومی پریس کی آواز یکسر خوشامدی پریس کے شور و شغب میں دب کر رہ جاتی۔ وہ زمانہ برطانوی طاقت کی سطوت کے شباب کا تھا اور اس وقت بہت کم اخباروں میں ہمت تھی کہ وہ حکومت وقت کے خلاف اپنی آواز بلند کریں۔

آخرکار وہ دن آگیا جو شریف بمبئی کے اعلان کردہ جلسہ کا دن تھا یعنی ۱۱ دسمبر یہ جلسہ ٹاؤن ہال میں منعقد ہونا تھا جو الفنسٹن سرکل کے سامنے واقع ہے۔ وہ دن ہمیشہ یادگار رہے گا اسلئے کہ وہ طاغوتی قوتوں کے خلاف اس دور کا سب سے زبردست اور سب سے پر امن مظاہرہ تھا۔

صبح ہی سے ٹاؤن ہال کے سامنے مخالفین جلسہ کا اجتماع ہونا شروع ہو گیا تھا اور وہ سب کے سب سڑکوں اور عمارتوں پر کھڑے واقعات کا خاموشی سے مشاہدہ کر رہے تھے۔ پولیس بھی اپنی پوری طاقت کیساتھ موجود تھی اور رات کو اعلان کر دیا گیا تھا کہ دروازے کھلنے سے پیشتر کسی کو ہال کے پاس پھٹکنے کی بھی اجازت نہیں دی جائے گی۔ خدا خدا کر کے ۱۰ بجے دروازے کھلے اور مخالفین جلسہ جن میں مسٹر جناح، مسٹر جمنا داس دوارکا داس[3]، مسٹر بی جی۔ ہارنیمن، مسٹر عمر سوبانی[4]، مسٹر ایل۔ آر۔ ٹیرسی[5]، مسٹر بی۔ کے۔ تیلنگ[6]، مسٹر سید حسین مسٹر پوتھن جوزیف[7] وغیرہ آگے آگے تھے، اپنے یار و انصار کی ہمراہی میں پبلک کی تالیوں کے ساتھ ہال میں داخل ہونے شروع ہوئے۔ جلسے سے پہلے اور بعد تک مسٹر جناح ہال کی سیڑھیوں پر والنٹیروں کی رہنمائی میں مصروف رہے۔ یہ حالت تھی کہ سلیمان قاسم مٹھا اپنے سینکڑوں موالیوں اور گودیوں کے مزدوروں کی معیت میں وہاں پہنچے اور کوشش کی کہ آگے کی صفوں کو جن پر جانبازی سے "ریزرو" لکھ دیا گیا تھا گھیر لیں تاکہ مخالفین صرف پیچھے کی جگہوں پر بیٹھ سکیں، مگر اسکے باوجود مخالفین آگے کی نشستوں پر بیٹھنے میں کامیاب ہو گئے[8]۔ بجے تک ہال کچا کچ بھر گیا۔ پلیٹ فارم پر ہوکے قریب پالن وفادار جلوہ فرما تھے جنہیں زیادہ تر پارسی، یوربین، اینگلو انڈین اور معدودے چند مسلمان تھے۔

یہ حضرات وہ تھے جنہوں نے جلسہ طلب کرنے کا شریف سے تحریری مطالبہ کیا تھا جب شریف بمبئی جلسہ گاہ میں پولیس کی حفاظت میں پہنچے تو پلیٹ فارم پر بیٹھنے والوں نے اور کرایہ کے ٹٹوؤں (یعنی موالیوں[9]) نے ان کے خیر مقدم میں چیرز دینے شروع کئے۔ ادھر مخالفین نے "شرم، شرم" کے نعرے بلند کئے اور جلسہ شروع ہونے تک یہی مناظر دیکھنے میں آتے رہے۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا تھا ہال کے باہر والوں کی تعداد میں ہزارہا کا اضافہ ہوتا جاتا تھا اور آخرکار نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ہال سے لیکر فلورا فاؤنٹین تک صرف سر ہی سر نظر آتے تھے۔

ٹھیک ۵½ بجے جلسہ شروع ہوا۔ سب سے پہلے شریف نے وہ نوٹس پڑھکر سنایا جس میں جلسہ طلب کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔ اس کے فوراً بعد ہی ہارنیمن نے کھڑے ہو کر اس نوٹس کے خلاف تقریر کی اور کہا کہ وہ اہالیان شہر کا مطالبہ نہیں ہے بلکہ وہ لارڈ ولنگڈن کے چند مخصوص دوستوں کا مطالبہ ہے۔ ابھی وہ بول ہی رہے تھے

---

[1] مسٹر جناح کی تحریک یہ تھی کہ دونوں سیاسی جماعتوں کے اجلاس ایک ہی مقام پر ہوا کریں۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ مسلم لیگ کو کانگریس سے قریب تر لانے کی سب سے زیادہ ذمہ داری مسٹر جناح کی ہے۔ کانگریس نے بھی اس تجویز کی ہم نوائی کی۔ چنانچہ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۰ء تک لیگ اور کانگریس کے اجلاس ایک ساتھ ہوتے رہے اور ان دونوں میں انتہائی دوستی اور یگانگت کے تعلقات رہے۔ ۱۹۱۸ء میں کانگریس کا اجلاس پرنسس گیٹ اسٹیشن کے قریب منعقد ہوا تھا اور لیگ کا اجلاس میرین لائنز کے قریب منعقد ہوا تھا۔ دونوں جماعتوں کے کارکن بھی مرتبہ اسی سال ایک دوسرے کے اجلاس میں شریک ہوئے تھے اور اس طرح انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کو مستحکم کرنے کی کوشش کی تھی۔

[2] یہ صوبہ بمبئی کا گجراتی زبان کا سب سے پرانا اخبار ہے۔ اسے جاری ہوئے ۱۰۰ سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے۔

[3] یہ مسز اینی بیسنٹ کے متبع تھے اور رفاہی کاموں میں دامے، درمے، سخنے مدد بھی دیتے تھے۔

[4] شہر بمبئی کے کروڑپتی مسلمانوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ بہت مخیر تھے۔ روئی کے سٹہ میں لگا ہوا اور ساری جائداد جو کروڑ ہا پر مشتمل تھی، دوسروں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ تحریک آزادی میں آگے آگے رہتے تھے۔

[5] یہ کانگریسی خیال کے لبرل لیڈر تھے۔ بہت نڈر اور بذلہ سنج بھی تھے۔

[6] یہ بہت فاضل شخص تھے اور جسٹس تیلنگ کے بیٹے یا بھتیجے تھے۔ مسز بیسنٹ کے ممتاز رفیق کار تھے۔

[7] یہ پہلے کرانیکل سے وابستہ تھے۔ بعد کو دلی میں چلے گئے اور پھر سرکاری پرچہ کے ایڈیٹر ہو گئے عیسائی ہیں اور ابھی انگریزی لکھتے ہیں۔

[8] چرچ گیٹ اسٹریٹ میں جو ٹاؤن ہال کے بالمقابل ہے، اس زمانہ میں ایک نامی ہوٹل تھا جس کا نام دربار ریسٹوران تھا۔ سلیمان قاسم مٹھا کے موالیوں کیلئے رات بھر یہیں بریانی تیار کی گئی تھی۔ بمبئی کرانیکل کئی دن تک سرکاری بریانی کا مذاق اڑاتا رہا۔ اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی تو موالیوں کو مزدوری کے طور پر کچھ رقم بھی دی گئی تھی۔ بریانی ہال کے قریب کمرے میں کھلائی گئی تھی اور ہوٹل کے ملازم صبح سے سہ پہر تک مہانداری میں مشغول تھے۔ لیڈران اور پبلک کے افراد میں سے بہت سے اشخاص "بے آب و دانہ" لڑ رہے تھے۔

کو سرڈنشا واچا نے سر محمد شفیع جی جی بھائی کا نام صدارت کے لئے پیش کیا۔ اس کی تائید سر فاضل بھائی کریم بھائی نے کی۔ مسٹر یاسین کی تجویز کہ مسٹر تیلنگ کو صدر بنایا جائے موالیوں کے شور و شغب میں دب کر رہ گئی۔ اس اثنا میں جلسہ کے مویدین اور ان کے والنٹیر اور موالی مخالفین جلسہ پر آوازے اور پھبتیاں کستے رہے۔ پلیٹ فارم پر جو کچھ ہو رہا تھا اسے نہ کوئی سن سکتا تھا اور نہ پورے طور پر دیکھ ہی سکتا تھا اسلئے کہ لوگ بار بار کھڑے ہو جاتے تھے۔ عالم یہ تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ چند ہی منٹ میں سر محمد شفیع جی جی بھائی نے اعلان کر دیا کہ اصل تحریک جس کا مقصد یادگار قائم کرنا ہے منظور ہو گئی ہے اور اسکے بعد جلسہ ختم کر دیا۔ عین اس موقع پر پولیس کمشنر پولیس کا دستہ لیکر ہال میں داخل ہو گیا اور مخالفین پر لاٹھیاں برسانی شروع کر دیں اور سب کو ہال سے باہر نکال دیا۔ مخالف پارٹی کے بڑے بڑے لیڈر کم و بیش پولیس کے تشدد کا شکار ہوئے۔ پولیس نے ان والنٹیروں پر بھی لاٹھی چارج کیا جو باہر سیڑھیوں پر مصروف انتظام تھے۔

پبلک ہزارہا کی تعداد میں اپنے بے باک اور محبوب لیڈروں کا استقبال کرنے کے لئے چشم براہ تھی۔ چنانچہ ان کے نکلتے ہی انہیں خوب چیرز دئے گئے۔ مسٹر جناح اور مسٹر ہارنیمین دونوں کے دونوں لیڈروں میں سب سے ممتاز نظر آتے تھے اسلئے کہ دونوں غیر معمولی طور پر لمبے قد کے تھے اور عام لوگوں سے ایک ایک فٹ ڈیڑھ ڈیڑھ فٹ بلند تھے اور اس لئے دور سے بھی بآسانی نظر آسکتے تھے۔ پبلک نے ہارنیمین کو کندھوں پر بٹھالیا اور پھر سب جلوس کی شکل میں اپالو اسٹریٹ میں ایک بیمہ کمپنی کے دفتر کے سامنے جمع ہوئے، جہاں کے برآمدے سے ہارنیمین اور مسٹر جناح نے تقریریں کیں۔ مسٹر جناح نے فرمایا "آج پبلک نے جمہوریت کی عظیم الشان فتح حاصل کی ہے۔ تمہاری فتح نے ثابت کر دیا ہے کہ دفتری اقتدار اور استبداد کی قوتیں تمہیں مرعوب نہیں کر سکتیں۔ ۱۱ دسمبر کا دن شہر بمبئی کی تاریخ میں دور آفریں دن رہیگا۔ اب تم اس فتح پر خوب خوشیاں مناؤ، اسلئے کہ آج جمہوریت کی فتح کا دن ہے"۔

عام پبلک کے جوش و خروش کا جو عالم اس وقت دیکھنے میں آیا وہ آئینی جد و جہد کی تاریخ میں عدیم المثال ہے اور اگرچہ یہ واقعات ۲۰ برس پہلے ظہور میں آئے تھے لیکن آج بھی ان کی یاد میرے دماغ میں جوں کی توں محفوظ ہے۔ وہ درحقیقت نہ فراموش ہونے والے واقعات تھے اور اسی لئے انہوں نے حد درجہ کا بہت کم اثر قبول کیا ہے۔

اسی شام کو شانتا رام چال میں زبردست جلسہ منعقد ہوا۔ اس میں کئی ایک ریزولیوشن پاس ہوئے جن میں شریف اور دوسرے طبقوں کے طرز عمل کی مذمت کی گئی پولیس کی جابرانہ روش کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی اور لارڈ ولنگڈن

پر خوب لے دے کی اور کہا" ہم سے کہا جاتا ہے کہ جس شخص نے وہ ذلت آفریں طریق عمل اختیار کیا تھا اسے بیگناہی کا سرٹیفکیٹ دیں۔ یہ وہی ولنگڈن ہے جس نے حال میں ایڈورڈ کے مجسمہ کی نقاب کشائی کرتے وقت اس کی خدمات کو سراہا ہے حالانکہ اسکے خلاف پبلک کی طرف سے سخت الزامات عائد کئے جا چکے ہیں لیکن عام پبلک اس بات کو فراموش کر سکتی ہے کہ اس گورنر نے ایڈورڈ جیسے شخص کو نیک چلنی کا سرٹیفکیٹ دیا ہے اور یہ ایڈورڈ وہ شخص ہے جو انڈو برٹش ایسوسی ایشن کا سکریٹری رہ چکا ہے جس نے موقع بے موقع ہندوستانیوں کے جائز حقوق کی ہر طرح سے مخالفت کی ہے"۔

اب بمبئی میں ہر جگہ جناح ہی کا نام ورد زبان تھا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ان کی دلیرانہ رہنمائی کے بغیر یہ مہم سر نہ ہو سکتی تھی۔ سارے شہر میں انہی کا غلغلہ تھا اور ان ہی کی دھوم تھی اور ولنگڈن جیسے مستبد گورنر کی مخالفت کرنے میں انہوں نے جس جرات کا اظہار کیا تھا اس کی ہر جگہ تشکر آمیز طریقہ سے حمایت کی جا رہی تھی۔

اس واقعہ کے تیسرے دن بمبئی کے ایک مشہور با اثر پارسی مسٹر بی۔ ڈی۔ لام نے بمبئی کرانیکل میں ایک طویل خط شائع کرایا جس کے ذیل کے اقتباسات سے لکھنے والے کے دلی جذبات کا اندازہ ہو سکے گا۔

"مکرمی۔ کل کے جلسہ کی رپورٹ میں نے بڑی عزت و احترام سے پڑھی۔ مسٹر جناح کی بلند حوصلہ اور بے باک قیادت جس نے ہماری قومی زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز کیا ہے، ہر اعتبار سے قابل تحسین ہے۔ مسٹر جناح اور ان کے رفقائے کار کی کامیابی کا راز درحقیقت دو اہم حقیقتوں میں مضمر ہے۔ اولاً یہ کہ نام نہاد پبلک میٹنگ محض چند منٹ تک ہی منعقد ہو سکی اور لارڈ ولنگڈن کے حامیان تقریریں بھی نہ کر سکے۔ اس میٹنگ کو اہالیان شہر بمبئی کے نام سے موسوم کر کے میموریل کا ریزولیوشن پاس کر لینا شرمناک ریاکاری ہے۔ ثانیاً یہ کہ آئندہ شریف بمبئی اہل بمبئی کی طرف سے اس نوعیت کی میٹنگ طلب کر کے رائے عامہ کی خلاف ورزی کرنے کی جرات نہیں کریگے۔ مسٹر جناح اور ان کے رفقائے کار کی یہی سب سے بڑی کامیابی ہے اور وہ اسپر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔

اس میٹنگ کے نتائج کو مد نظر رکھکر میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی شخص حقیقی معنوں میں میموریل کا حقدار ہے تو وہ صرف مسٹر جناح ہیں جنکی بے خوف قیادت میں ہمارے مرحوم لیڈر دادا بھائی نوروجی اور گوپال کرشن گوکھلے کی روح جلوہ گر نظر آتی ہے۔

ہمیں اسی شاندار ہال میں مسٹر جناح کا مجسمہ نصب کرنا چاہیئے جہاں انہوں نے اس نام نہاد پبلک میٹنگ کے ظلم و تشدد کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا ہے ..... ہمیں اس موقع کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے اور مسٹر جناح کے شایان شان خراج عقیدت ادا کرنا چاہیئے ...."

مسٹر لام کی تجویز کو صوبہ بمبئی کے باشندوں نے بلا تفریق مذہب و ملت ہاتھوں ہاتھ لیا اور تھوڑے ہی دنوں میں کافی رقم جمع ہو گئی۔ مجسمہ کی بجائے یہی مناسب سمجھا گیا کہ مسٹر جناح کی خدمات کی یاد میں "پیپلز میموریل ہال" تعمیر کیا جائے۔ یہ ہال لیمنگٹن روڈ کے قریب کانگریس ہاؤس کے کمپاؤنڈ کے اندر ہے۔ زمانہ گذشتہ میں یہاں ہندو مسلم اتحاد کے نہایت روح پرور مناظر دیکھنے میں آچکے ہیں۔ اس ہال نے تحریک آزادی میں نمایاں حصہ لیا ہے اور تحریک سول نافرمانی کے زمانے میں پولیس متعدد دفعہ اس پر قبضہ کر چکی ہے۔ یہ ہال ایک منزلہ عمارت ہے اور اس میں چار پانچ ہزار آدمی بآسانی بیٹھ سکتے ہیں۔ ہال کے دروازہ پر انگریزی میں "جناح پیپلز میموریل ہال" لکھا ہوا ہے۔ یہ ہال اس فتح کی جیتی جاگتی تصویر ہے جو مسٹر جناح اور انکے چند جری اور بہادر رفقائے کار نے ۱۹۱۸ء میں اس دور کے سب سے بڑے مستبد گورنر کیخلاف حاصل کی تھی۔ یہ فتح جمہوریت کی فتح تھی جسکے مقابلہ کیلئے طاغوتی طاقتیں پوری آن بان سے صف آرا تھیں۔ یہ کہنا تحصیل حاصل ہے کہ ولنگڈن میموریل بنانیکی اسکیم شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکی، اور بیچارہ گورنر بے نیل مرام انگلستان رخصت ہو گیا۔

TAXI
زیادہ سے زیادہ لوگ کہہ رہے ہیں
بہتر ہے کہ
کیپسٹن خریدیئے
اسلئے کہ
یہ بہترین قوام سے تیار ہوتی ہیں
MEDIUM STRENGTH
CAPSTAN
Navy Cut
CIGARETTES
TRADE MARK
W.D.&H.O.WILLS
BRISTOL & LONDON
دس کیلئے سات آنے، پچاس کے لئے
W. D. & H. O. WILLS, BRISTOL & LONDON

اپنے بچّہ کو
بیماری کی مدافعت کے لئے
قوّت پہنچایئے

ضروری اشیاء کی قلّت اور رہنے کے کمرے میں زیادہ ہجوم متعدی امراض کا باعث ہوتا ہے اور سب بچّے لازمی طور پر اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایسے حالات میں اسکاٹس املشن بچّہ کے لئے نہایت ضروری ہے۔

خوش ذائقہ اسکاٹس املشن ایک زائد غذائیت رکھنے والا فوڈ ٹانک ہے جس کے زود ہضم اور خالص کاڈلیور آئل میں وٹامن اے اور ڈی بکثرت پائے جاتے ہیں اور جس میں کالشیئم و فاسفورس کے نمکیات شامل ہوتے ہیں۔ یہ طاقت اور جسمانی صحت کے لئے ضروری ہیں اور بیماری کے اثرات سے محفوظ رکھتا ہے

اسکاٹس املشن خالص کاڈلیور آئل سے کئی گنا زیادہ موثّر ہے یہ جسم کی نشوونما میں ترقی دینے والے مکھن اور گھی سے آٹھ گنا زیادہ بہتر ہے اور اسکاٹس کا صرف ایک ہی بڑا چمچہ ہڈیاں مضبوط بنانے کے لئے تازہ دودھ کے چار گلاسوں کے برابر ہے۔

۸ اونس اور ۱۶ اونس کی بوتلوں میں فروخت ہوتا ہے۔
بڑا سائز خرید کرنا نفع بخش ہے

SCOTT'S Emulsion

ہول سیل ڈسٹری بیوٹرز:- امپیریل کیمیکل انڈسٹریز (ایکسپورٹ) لیمیٹڈ (انکارپوریٹڈ ان انگلینڈ) کراچی پوسٹ بکس ۱۱۱ - لاہور پوسٹ بکس ۱۹۵

خوبصورت بن جائیے

پونڈز کی (دو) کریموں کے ذریعہ
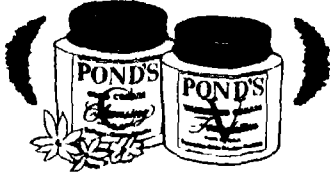
ایک جلد کی صفائی کے لئے — دوسری جلد کی حفاظت کے لئے

دلکش حسن کیلئے علٰحدہ علٰحدہ اثرات رکھنے والی دو کریموں کی ضرورت ہے۔ اوّل' چونکہ جلد کی صفائی حُسن کے اصول میں سب مقدم ہے لہٰذا اسکے لئے نفاست کے ساتھ آمیز کئے ہوئے اور جلد میں سرایت کر جانیوالے روغنوں سے تیار کی ہوئی کریم کی ضرورت ہے تاکہ وہ مسامات کو میل سے صاف کر ڈالے' یہ پونڈز کولڈ کریم ہے۔ دوئم اکی غیر روغنی کریم جو غیر نمایاں طور پر چہرے پر قائم رہ کر دن بھر گرد اور تپش سے اسکی حفاظت کرتی ہے' یہ پونڈز وینشنگ کریم ہے۔

جلد کی صفائی ہر شب پونڈز کولڈ کریم سے کیجئے۔ اسکی کافی مقدار چہرے اور گلے پر لگائیے اور چند لمحوں تک ملنے کے بعد پونچھ ڈالئے صرف چند روز ایسا کرنے سے جلد اتنی شفاف اور دمکتی ہوئی نظر آئیگی کہ آپنے اس سے قبل کبھی نہ دیکھی ہوگی۔

جلد کی حفاظت ہر صبح پونڈز کی غیر روغنی اور سرایت کرنے والی کریم سے کیجئے۔ اسے چہرہ پر لگا کر ملئے۔ یہ لیجئے وہ غائب ہوگئی۔ تاہم یہ غیر نمایاں کریم دن بھر گرد اور تپش سے چہرے کی حفاظت کرتی رہتی ہے۔ یہ جلد کو مخمل کی طرح ملائم کر دیتی ہے۔

آزمائش کیجئے۔

یاد رکھئے کہ گرمیوں کے موسم کی جھلسا دینے والی تپش اور سردیوں کے موسم کی سردی دونوں جلد کے قدرتی روغنیات کو خشک کر دیتی ہیں اور اسے سیاہ اور کھردرا بنا دیتی ہیں۔

اسے بھی نہ بھولئے کہ مساموں کی گہرائیوں میں گرد و غلاظت کا جمع ہو جانا جلد کے بہت سے امراض کا باعث ہوتا ہے

پونڈز کی دونوں کریموں کا روزانہ استعمال آپکی جلد کی تمام خرابیوں کو دور کر کے اسے ملائم و دلکش بنا دیگا۔ چہرہ ہمیشہ جوان نظر آئیگا۔ ان دونوں کریموں کے استعمال کو روزمرہ کا "اصول خوبصورتی" بنا لیجئے۔

خط و کتابت برائے تجارت:- ایل۔ ڈی۔ سیمور اینڈ کمپنی (انڈیا) لمیٹڈ بمبئی کلکتہ دہلی مدراس نواگوا کراچی کولمبو رنگون

ماہِ نو

مدیر ــــــ وقار عظیم

جلد ۱ شمارہ ۹

دسمبر ۱۹۴۸ء

قیمت فی پرچہ ۸ر

چندہ سالانہ ۸صر

کچھ اپنی باتیں

'ماہ نو' کا پچھلا شمارہ قائداعظم نمبر تھا۔ اسے قارئین نے بے حد پسند کیا۔ اور ہمیں ہماری محنت کی داد مل گئی۔ اس شمارہ کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ اسکی جو دس ہزار کاپیاں پہلی مرتبہ چھپی تھیں وہ دو تین دن کے اندر ختم ہو گئیں۔ بہت سے ایجنٹ صاحبان کے مطالبات پورے نہ کئے جا سکے اسلئے دو ہزار پرچے پھر چھپوائے گئے۔ اس میں سے بھی مشکل سے فائل کے دو ایک پرچے بچائے جا سکے ہیں۔ مطالبات کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ ایک ایجنٹ نے تین ہزار کاپیاں مانگی ہیں۔ کاغذ کے حصول میں کوئی دقت نہ ہوئی تو تین ہزار پرچے اور چھپیں گے۔ اس کے بعد بھی اگر کچھ پڑھنے والوں کو یہ شمارہ نہ پہنچ سکے۔ تو ہم معذرت کے طالب ہیں۔

قائداعظم نمبر کے متعلق ایک ضروری بات اور عرض کرنی ہے۔

اس شمارہ میں جتنے مضامین شائع ہوئے ہیں وہ خاص طور پر فرمائش کر کے لکھوائے گئے ہیں۔ جن مضمون نگاروں کا اصرار تھا کہ اُن کے مضامین کے حقوق ان کے پاس محفوظ رہیں۔ ہم نے اُن مضامین کے نیچے "جملہ حقوق محفوظ" کا فقرہ لکھوا دیا تھا۔ لیکن فرخ امین صاحب کے مضمون کے ساتھ یہ فقرہ نہیں لکھا جا سکا۔ قارئین اب اس کا اضافہ کر لیں۔

اب کچھ دسمبر کے شمارہ کے متعلق۔ اس شمارہ کے مضمون نگاروں کی فہرست پر ایک سرسری نظر ڈالیئے۔ لکھنے والوں کے نام دیکھ کر آپ کو یہ خیال گذرے گا کہ شاید یہ بھی کوئی خاص نمبر ہے۔ ہم اہلِ قلم حضرات کے ممنون ہیں کہ وہ 'ماہ نو' کو بہتر سے بہتر بنانے میں ہمارے معین و مددگار رہیں۔ اگر تعاون کا یہ سلسلہ جاری رہا (اور اُمید ہے انشاء اللہ جاری رہیگا) تو آپ کو ماہِ نو کا ہر شمارہ خاص نمبر نظر آئے گا۔ قارئین جانتے ہوں گے کہ 'ماہ نو' کی اشاعت کا مقصد مالی منفعت کا حصول نہیں۔ اور اسی لئے جوں جوں سہولتیں بڑھتی جاتی ہیں ہم اسے بہتر بنانے کی تدابیر اختیار کرتے جاتے ہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ 'ماہ نو' برابر اسی طرح ظاہری اور معنوی حیثیت سے گامزن رہے تو اس کا حلقۂ اشاعت بڑھا کر اُسے پاکستان اور اس کے لئے ادب اور کلچر کی خدمت کا زیادہ سے زیادہ موقع فراہم کیجئے۔ اگر آپ اور آپ کے احباب 'ماہ نو' کے مستقل خریدار نہیں ہیں تو اپنا نام یا ہمارے دفتر میں یا اپنے مقامی ایجنٹ کے پاس درج کرا دیجئے 'ماہ نو' کی اشاعت جتنی زیادہ ہوگی اسے آپکی خدمت کا اتنا ہی زیادہ موقع ملے گا۔

اس شمارے میں تصویروں کے صفحے ۴ کے بجائے ۷ ہیں۔ ۵ صفحوں میں ہمارے نئے گورنر جنرل ہز اکسلنسی الحاج خواجہ ناظم الدین بالقابہ کی تصویریں ہیں۔ ان تصویروں کے ساتھ ڈھاکہ یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر اور حکومت پاکستان کے موجودہ مشیر تعلیم ڈاکٹر محمود حسن صاحب کا لکھا ہوا تعارف بھی شامل ہے۔

عبدالسلام خورشید صاحب کا مضمون سوہنی مہینوال بھی آپ یقیناً دلچسپی سے پڑھیں گے۔ سلام صاحب نے فضل شاہ کے منظوم قصہ کو نثر میں منتقل کیا ہے اور یہ کوشش کی ہے کہ قصہ میں مصنف کے اسلوب نگارش کی ساری خصوصیات واضح ہو جائیں۔ سوہنی مہینوال کو قصہ کی طرح تو اردو میں بار بار لکھا جا چکا ہے لیکن سلام صاحب کی یہ کوشش انوکھی ہے اور قابلِ تحسین۔ امید ہے کہ اس طرح کے دوسرے عوامی رومان بھی ایک ایک کر کے پڑھنے والوں کی خدمت میں پیش کئے جائیں گے۔

ایک چیز میں اور ہمیں آپ کے پورے تعاون کی ضرورت ہے۔ ہماری کوشش یہ ہے کہ ماہ نو پڑھنے والوں کے لئے دلچسپی اور افادیت کا زیادہ سے زیادہ سامان فراہم کر سکے۔ لیکن جب تک خود آپ ہمیں یہ نہ بتائیں کہ ہماری پیش کی ہوئی چیزوں میں سے آپ کو کون سی اچھی لگیں اور کون سی بُری، اس وقت تک ہم نہ اپنی خرابیوں کی اصلاح کر سکتے ہیں نہ اچھی چیزوں کا اضافہ۔

اس لئے آپ سے ہماری درخواست یہ ہے کہ 'ماہ نو' کے متعلق تفصیل سے اپنی مخلصانہ رائے لکھیئے تاکہ ہم اس سے استفادہ کر سکیں۔

پچھلے چند دنوں سے بعض قارئین کے شکایتی خطوط موصول ہو رہے ہیں کہ رسالہ اُن تک نہیں پہنچتا۔ ہم قارئین کو یقین دلاتے ہیں کہ دفتر سے رسالہ پابندی سے اُن کی خدمت میں بھیجا جاتا ہے۔ اور کوئی غاصب راستہ میں اُسے غصب کر لیتا ہے۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ کم از کم یہاں سے روانگی کے وقت رسالہ غاصبوں سے محفوظ رہے۔ اگر آپ کو رسالہ پابندی سے نہیں ملتا تو آپ اپنے یہاں غاصبوں کو پکڑنے کی کوشش کیجئے یا اپنی شکایت مقامی ڈاکخانہ کے افسران تک پہنچائیے۔ امید ہے اس طرح شکایتوں کے موقعے کم ہوتے جائیں گے۔

ڈاکٹر محمود حسن

ہز ایکسلنسی الحاج خواجہ ناظم الدین

(ایک تعارف)

مشرقی بنگال کا سب سے ممتاز اور مشہور خاندان نواب ڈھاکہ کا خاندان ہے جسکی قومی خدمات محتاج بیان نہیں ہیں۔ موجودہ نواب ڈھاکہ کے والد نواب سلیم اللہ مرحوم نے جس جوش خلوص اور بیباکی کے ساتھ مسلمانوں کے جائز حقوق کے تحفظ اور قوم کی فلاح و بہبود اور ترقی کے واسطے مرتے دم تک سعی و جہد کی وہ تاریخی امر ہے نواب مرحوم کی وسعت نظر اور عاقبت اندیشی کی وجہ سے مسلم لیگ کا وجود ہوا اور مسلمانوں کی اس واحد قومی جماعت کی ابتدا انکی کوششوں سے ڈھاکہ میں ہوئی۔ پاکستان کے گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین نواب سلیم اللہ مرحوم کی سگی بہن کے بڑے صاحب زادہ ہیں اور آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی خواجہ نظام الدین تھا۔ خواجہ ناظم الدین (تعالی اللہ عمرہ) کی ابتدائی تعلیم مسلمانوں کی عزیز درسگاہ علی گڑھ کالج (مرحوم) میں ہوئی۔ علی گڑھ سے آپ بغرض حصول تعلیم اعلیٰ انگلستان تشریف لے گئے اور کیمبرج کے ٹرنٹی ہال کالج میں داخل ہوئے اور لندن میں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کی۔ آپ انگلستان محض تحصیل علم کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ تلاش معاش یا حصول دولت کی حاجت اور خواہش نہ تھی۔ بیرسٹری کا امتحان پاس کرنے کے بعد آپ ڈھاکہ واپس تشریف لائے۔ خدمت خلق اور ملت کے کاموں میں دلچسپی لینی شروع کردی۔ اور مقامی میونسپلٹی کے چیرمین ہوئے۔ آج سے بیس پچیس برس پہلے جب ہندوستان کی سلطنت انگریزوں کے ہاتھ میں تھی اور وہ لوگ تمام سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ لوکل سیلف گورنمنٹ یعنی میونسپلٹی وغیرہ کے معاملات میں حصہ لینا اہم سیاسی کام سمجھا جاتا تھا۔

ڈھاکہ کی میونسپل چیرمینی اس زمانہ میں خاص اہمیت رکھتی تھی۔ چنانچہ جب خواجہ ناظم الدین چیرمین ہوئے تو میونسپلٹی میں نئی جان پیدا ہوگئی۔ اور خواجہ صاحب موصوف کی کوشش اور اثر سے ڈھاکے میں رفاہ عام کے لئے بے شمار کام کئے۔ ان خدمات کا اعتراف اہل ڈھاکہ نے ناظم الدین ہال اور ناظم الدین روڈ کی تعمیر سے کیا۔

۱۹۲۱ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی کی ابتدا ہوئی۔ اس درسگاہ کے اصلی بانیوں میں نواب سلیم اللہ مرحوم کا اسم گرامی خاص طور پر ممتاز ہے۔ ان کے والد بزرگوار نواب احسن اللہ مرحوم نے ڈھاکے میں انجینیرنگ اسکول بنوایا جو گذشتہ سال سے ڈھاکہ یونیورسٹی کا انجینیرنگ کالج ہوگیا ہے۔ یونیورسٹی قائم ہونے سے پیشتر نواب سلیم اللہ مرحوم کا انتقال ہوچکا تھا لیکن ان کے خاندان کے نمائندوں نے یونیورسٹی کے حالات میں دلچسپی قائم رکھی اور اس کی ترقی اور استحکام میں برابر کوشاں رہے۔ خواجہ ناظم الدین یونیورسٹی کی اگزیکیٹو کاونسل یا سنڈیکیٹ کے ممبر تھے اور جب وہ ۱۹۲۹ء میں وزیر تعلیم مقرر ہوئے تو اسوقت اس خدمت سے مستعفی ہوئے ڈھاکہ یونیورسٹی مسلمانان مشرقی بنگال کے واسطے قائم ہوئی تھی لیکن ابتدا میں مسلمان طلبا کی تعداد کم تھی اور عربی فارسی شعبوں کے سوا دیگر شعبوں میں مسلمان معلمین اکا دکا ہی تھے۔ یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد زیادہ تر غیر مسلم تھے اسلئے مسلمانوں کے جائز حقوق کی تشفی بخش حفاظت نہ ہوتی تھی۔ خواجہ ناظم الدین جس دن سے یونیورسٹی کی اگزیکیٹو کاونسل کے ممبر ہوئے اس دن سے حالات کا رنگ بدل گیا۔ انکی باعظمت اور پُر اثر شخصیت اور خلوص اور ہمت سے غیر مسلم ممبران متاثر ہوئے اور مسلمانوں کے ساتھ دیدہ و دانستہ جو ناانصافیاں ہو رہی تھیں ان میں نمایاں تخفیف ہوئی۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ کا ذکر کرتا ہوں مسلمانوں نے یہ فیصلہ کیا کہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا آئندہ اجلاس ڈھاکہ میں ہو۔ چنانچہ کانفرنس نے دعوت قبول کرلی۔ یونیورسٹی سے درخواست کی گئی وہ کانفرنس کے اخراجات کے لئے چندہ دے۔ جب یہ معاملہ کاونسل میں آیا تو غیر مسلم ممبران نے ہر طرح کے اخلاقی تعلیمی، مذہبی، سیاسی وغیرہ وغیرہ اعتراضات پیش کئے اور بہت زور سے کہا کہ یونیورسٹی کو ہرگز چندہ نہیں دینا چاہیئے۔ میں اس کانفرنس کے جلسے کا اعزازی معتمد منتخب ہوا تھا اور میں پریشان تھا کہ بغیر یونیورسٹی کی مدد کے کیسے جلسہ ہوگا۔ جب کاونسل کے دیگر ممبران اپنی تقریریں ختم کرچکے تو خواجہ صاحب نے کمال سنجیدگی سے کہا کہ کانفرنس کو دعوت دیدی گئی ہے اور اسکا اجلاس ڈھاکہ میں ضرور ہوگا خواہ یونیورسٹی چندہ دے یا نہ دے لیکن یونیورسٹی کو اپنی اصلی ذمہ داری اور نصب العین اور مفاد کا خیال رکھتے ہوئے معقول رقم بطور چندہ اور دیگر سہولتیں کانفرنس کو دینی چاہیئے ورنہ یونیورسٹی کے مستقبل پر اسکا بہت ہی مضر اثر ہوگا۔ خواجہ صاحب کے اصرار پر یونیورسٹی نے ہماری ساری تجویزیں قبول کرلیں۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں مسلمانوں کی شیرازہ بندی اور ان کے حقوق کے تحفظ کا دشوار کام خواجہ صاحب کی جان توڑ کوشش سے شروع ہوا اور ہم لوگوں کو غیر متوقع کامیابی ہوتی رہی۔ میرا تعلق یونیورسٹی کی اکاڈمک اور اگزیکیٹو کاونسل کے ساتھ تقریباً یونیورسٹی کی ابتدا سے رہا ہے اور مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ خواجہ صاحب کس ہمت اور عزم بالجزم کے ساتھ غیر مسلم ممبران کی مخالفت کے باوجود مسلمانوں کے مفاد کیلئے ہر طرح کی کوشش کرتے رہے اور اپنے خلوص اور بے لوثی اور جانفشانی کی وجہ سے بہت حد تک کامیاب ہوئے۔ خواجہ صاحب کے بعد اس اہم قومی خدمت کو آنریبل خواجہ شہاب الدین اور آنریبل مسٹر فضل الرحمن نے نہایت حسن و خوبی کے ساتھ ادا کیا۔ کئی سال تک مجھے خواجہ صاحب کے ساتھ یونیورسٹی کی اگزیکیٹو کاونسل میں بحیثیت رکن کام کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ میں نے ہمیشہ

یہ دیکھا کہ آپ دوران بحث میں ہمیشہ نہایت سکون اور تحمل کے ساتھ دوسروں کی تقریریں سنتے اور کبھی غصہ میں نہ آتے بلکہ غیر فریق کے بیجا بے ربط اعتراضات اور بدتمیز حملوں کا جواب نہایت متانت اور سنجیدگی سے دیتے اور جب کبھی میں یا اور کوئی مسلمان ممبر غصہ سے ترکی بہ ترکی جواب دینا شروع کرتا تو خواجہ صاحب ہم لوگوں کو روکنے کی کوشش کرتے لیکن ایک مرتبہ میں نے ان کو غصے میں آتے دیکھا۔ یونیورسٹی میں کوئی معمولی نوکری خالی تھی خواجہ صاحب نے اس کے لئے ایک مستحق مسلمان کا نام پیش کیا۔ حسب معمول اسپر بہت اعتراض اور جھگڑا ہوا لیکن آخرکار یہ تجویز منظور ہوگئی۔ جب میٹنگ ختم ہوئی اور سب لوگ باہر نکلے تو ایک غیر مسلم ممبر نے (جو اسوقت ہندوستان میں بہت اہم اور ممتاز عہدے پر ہیں) خواجہ صاحب سے کہا: "یہ منتر ناظم آپ نے لڑجھگڑ کر ایک معمولی مسلمان کو قابل غیر مسلم امیدواروں کے باوجود جگہ دلوادی۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے نزدیک مسلمان ہونا اور ڈاڑھی رکھنا ہی تمام قابلیتوں اور ڈگریوں سے زیادہ اہم اور قیمتی ہے۔" خواجہ صاحب کا چہرہ تمتما اٹھا اور آنکھیں سرخ ہوگئیں اور آپ نے نہایت کرخت آواز سے کہا "آپ غیر مسلم ممبران یونیورسٹی میں اپنی اکثریت اور قوت پر اسقدر نازاں ہیں کہ مسلمانوں کے جائز حقوق کو ہر موقع پر بے خلل وغش پامال کررہے ہیں اور یونیورسٹی کو اپنی زمینداری بنانے کی کوشش کررہے ہیں۔ لیکن آپ لوگ یہ اچھی طرح یاد رکھیں کہ ہم مسلمان سوائے خدا کے اور کسی سے نہیں ڈرتے اور نہ کسی کی خوشامد کرتے ہیں۔ ان شاء اللہ آپ لوگ دیکھیں گے اس ڈھاکہ یونیورسٹی میں جو مسلمانوں کے واسطے قائم کی گئی ہے مسلمانوں کا دور دورہ ہوگا اور ہم لوگ آپ لوگوں کی متواتر اور غیر منصفانہ مخالفت کے باوجود اپنے جائز حقوق حاصل کرکے رہیں گے۔" جہاں تک مجھے یاد ہے یہ واقعہ ۱۹۲۲ء میں ہوا تھا اور خواجہ صاحب موصوف کی پیشینگوئی خدا کے فضل وکرم سے تھوڑے دنوں کے بعد ہی پوری ہوگئی۔ جس اہم اور مشکل کام کو آپ نے یونیورسٹی میں شروع کیا تھا وہ آپ کے رفیقوں اور دوستوں نے جاری رکھا اور یونیورسٹی میں مسلمان طلباء اور معلمین کی تعداد بڑھتی گئی اور ان کی سہولتوں میں روزافزوں ترقی ہوتی رہی۔

مشرقی بنگال کے نوجوان مسلمانوں میں اپنے حقوق کا احساس اور ان کے تحفظ کا عزم بالجزم اور قوم کی فلاح اور ترقی کے لئے ہر طرح کے جائز وسائل اور طریقوں سے کوشش کرنے کا کام ڈھاکہ یونیورسٹی میں شروع ہوا اور اس کی ابتدا خواجہ ناظم الدین نے کی۔ یہ اتنی بڑی خدمت خواجہ صاحب نے کی ہے کہ اس کی جتنی تعریف کی جائے بجا ہوگی۔

بنگال میں جو عظیم الشان اور دندان شکن فتح مسلم لیگ کو گزشتہ الکشن کے موقع پر حاصل ہوئی اس کی بہت بڑی وجہ یہ تھی کہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے پرانے اور نئے طلباء نے مرحوم قائداعظم کے فرمان کے مطابق قدم اٹھانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ اور چونکہ شیرازہ بندی اور یکجہتی کا کام خواجہ صاحب نے بہت پیشتر سے شروع کیا ہوا تھا اسلئے مشرقی بنگال کے نوجوانوں میں قومی خدمت کرنے کا مادہ پہلے سے موجود تھا اور جب وقت آیا تو انہوں نے دنیا کو دکھا دیا کہ وہ قائداعظم مرحوم کے حکم کے مطابق ہر ایک طرح کا ایثار اور ہر قسم کی قربانی کرنے کو تیار ہیں۔

۱۹۲۹ء میں خواجہ صاحب بنگال کے وزیر تعلیم کے عہدے پر سرفراز ہوئے اور آپکو مجبوراً ڈھاکہ چھوڑنا پڑا۔ آپکی سیاست دانی دوراندیشی، انصاف پسندی اور دیانت داری نے بہت جلد آپ کو اس زمانے کے لیڈروں اور حکومت بنگال کے وزراء میں مشہور و ممتاز کردیا اور آپ مسلم بنگال کی سیاسی زندگی کے باوقار راہنما مان لئے گئے۔ صوبائی تقسیم سے پیشتر بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت تو تھی لیکن مخالف فریق کی یکجہتی اسقدر مستحکم اور اسکی مالی قوت اسقدر زیادہ تھی کہ مسلمانوں کو کوئی مفید العام قانون پاس کرانے یا کسی اور سودمند تجویز کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں سخت مخالفت اور مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ خواجہ صاحب نے عہدۂ وزارت تعلیم کو قبول کرنے کے بعد ہی لازمی ابتدائی تعلیم کے قانون پاس کرانے کا انتظام شروع کیا اور بصد دشواری اس تجویز کو صوبائی مجلس مقننہ سے قبول کرایا۔ جو لوگ بنگال کے حالات سے کماحقہ واقف نہیں ہیں ان کو اس بات کے سمجھنے میں مشکل ہوگی کہ لازمی ابتدائی تعلیم کے قانون سے مسلمانوں کو کیا خاص فائدہ پہنچا جبکہ یہ قانون صوبے کے ہر فرد بشر کے لئے یکساں مفید تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ بنگال میں تجارت اور زمینداری ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی، اور وہ اپنے بچوں کے لئے تعلیم کا خاطرخواہ انتظام کرسکتے تھے کیونکہ روپیہ ان کے پاس کافی تھا اور وہ یہ ہرگز نہ چاہتے تھے کہ مسلمان ترقی کریں۔ مسلم غریب تھے اور انکی تعلیم و تربیت کے انتظام کا خیال اور اس سے سچی ہمدردی اس حکومت کو بہت کم تھی جس پر ہندو چھائے ہوئے تھے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ۱۹۱۳ء میں جب میں بنگال پہنچا تو مجھ سے اکثر بنگالی ہندو صاحبان نے کہا کہ پنجاب یوپی وغیرہ کے مسلمان تو خیر شریف اور مہذب ہوتے ہیں لیکن بنگالی مسلمان رذیل ("چھوٹو لوک") اور غیر مہذب ہیں۔ آکسفورڈ میں ایک دن چند غیر مسلم دوستوں کے ساتھ میں بیٹھا ہوا تھا اور ان میں ایک صاحب بنگال سے آئے تھے جو I.C.S. میں منتخب ہوچکے تھے۔ دوران گفتگو میں آپ نے فرمایا کہ مسلمان کبھی "بھدّر لوک" (شریف آدمی) ہوتا ہی نہیں۔ ایک اور بنگالی غیر مسلم حضرت نے جو ایک مشہور تعلیمی ادارے کے صدر تھے میرے سامنے چند بنگالی مسلم طالب علموں سے کہا کہ تم لوگ لکھنا پڑھنا کیوں سیکھنا چاہتے ہو۔ تم لوگ گھر جاکر ہل چلاؤ اور کاشت کرو۔ ان باتوں کا ذکر صرف اس وجہ سے کررہا ہوں کہ اس امر کا صحیح طور پر اندازہ ہوجائے کہ کن دقتوں اور مخالفتوں سے سامنا کرنے کے بعد خواجہ ناظم الدین نے لازمی ابتدائی تعلیم کا قانون بنگال میں پاس کرایا ہوگا۔ کیونکہ اس سے غریب مسلمانوں کو زیادہ نفع پہنچنے کی توقع تھی۔

خواجہ صاحب کو قدم قدم پر ہر طرح کی مشکل اور مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور

ایسے ماحول میں کام کرنا پڑا جس میں اپنے سارے مقاصد کو انجام دینا قطعی ناممکن تھا سیاسیات میں ناجائز طریقوں سے فائدہ اٹھانا آسان امر ہے اور بہت افسوس اور رنج کے ساتھ اس بات کو کہنا پڑتا ہے کہ ہر ملک اور ہر قوم میں ایسے سیاسی لیڈر ہوئے ہیں اور موجود ہیں جن کا ایمان ضعیف تھا اور جنہوں نے ذاتی فائدے کو قومی مفاد پر ترجیح دی۔ خواجہ ناظم الدین کا سب سے بڑا دشمن بھی اس کے کہنے کی جراءت نہیں کر سکتا کہ انہوں نے سیاسیات سے یا وزارت اور حکومت سے حبہ یا شمہ بھر بھی ناجائز ذاتی فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے اکثر اوقات ایسے لوگوں کو ساتھ لے کر مجبوراً کام کیا جو ظاہر میں ایماندار اور قوم پرست تھے لیکن باطن میں مارواڑیوں کے روپیوں کی آنچ سے موم کی طرح پگھل کر ملت فروشی اور قوم کی بیخ کنی پر آمادہ ہو جاتے۔ خواجہ صاحب نے اسکا ہر طرح اور ہر جگہ ثبوت کامل دیا ہے کہ وہ سچے دل اور کمال بے لوثی اور ایمانداری کے ساتھ قوم اور ملک کی خدمت کرنا اپنا فرض عظیم سمجھتے ہیں

گذشتہ انتخابات عام کے زمانے میں مسلم لیگ کی زندگی کا دارومدار مسلمانوں کی یکجہتی پر تھا۔ بنگال میں اس وقت بدقسمتی سے آپس میں پھوٹ سی پڑ گئی تھی جسکو دیکھ کر خواجہ صاحب نے فیصلہ کر لیا کہ انتخاب کے واسطے امیدوار نہ ہونگے۔ اس لئے آپ کے اس فیصلے سے لوگوں کو بہت استعجاب اور افسوس ہوا اور لوگوں نے بہت کوشش کی کہ آپ اس فیصلے کو بدل دیں لیکن تمام کوششیں ناکامیاب ہوئیں میرے ایک محترم دوست بہت متمول تاجر ہیں اور مسلم لیگ اور مسلم ملت کے سچے خادم ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ خواجہ صاحب کا میں پرانا نیازمند ہوں اس لئے مجھے ہمراہ لے کر خواجہ صاحب کے مکان پر شب کو دس بجے پہنچے۔ خواجہ صاحب اسوقت اوپر جا چکے تھے لیکن ہمارے آنے کی خبر سن کر نیچے تشریف لائے میرے دوست نے ان سے کہا کہ مسلمانوں کو ان کی رہنمائی کی اشد ضرورت ہے اس لئے وہ انتخاب کے واسطے ضرور امیدوار ہوں۔ میرے دوست نے کہا کہ الکشن میں جتنا بھی خرچ ہوگا وہ اسکو برداشت کرینگے۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ اگر میں انتخاب کے واسطے امیدوار ہو جاؤں تو بغیر خرچ کے میں منتخب ہو جاؤں گا۔ اور اسمیں بالکل مشکل نہ ہوگی لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ بنگال میں ہر مسلمان پورے انہماک اور خلوص سے سب کے ساتھ مل کر قوم کی خدمت کرے۔ اگر میں اسمبلی کا ممبر ہو گیا تو آپس میں نفاق ہو جانے کا احتمال ہے۔ اور میں اس کو ہرگز گوارا نہیں کر سکتا۔ میں اسمبلی کے باہر سے قوم کی خدمت پوری طرح کروں گا۔ مجھے وزارت اور حکومت کی مطلق خواہش نہیں ہے۔ تقسیم بنگال کے بعد تمام سمجھدار اور ایمان پرست اشخاص کو اسکا احساس اور یقین ہو گیا کہ اس تلاطم کے زمانے میں قومی حکومت کی کشتی کا ناخدا سوائے خواجہ ناظم الدین کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

تقسیم بنگال سے پیشتر ڈھاکہ ایک خوبصورت لیکن چھوٹا سا شہر تھا جس میں سب سے بڑی اور اہم چیز ڈھاکہ یونیورسٹی تھی۔ یکایک ڈھاکہ صوبہ مشرقی بنگال کا دارالسلطنت اور حکومت کا مرکز بن گیا۔ نئی حکومت کو جس کے صدر اعظم خواجہ ناظم الدین تھے، طرح طرح کی اندرونی اور بیرونی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ کچھ لوگ ایسے تھے جو سمجھتے تھے کہ تیلیں بٹنے کو تو آل اب ظاہر کا ہے کہ حکومت اپنے ہاتھ میں ہے جو چاہیں گے نہ کرینگے۔ کچھ لوگ یہ توقع رکھتے تھے مسلم گورنمنٹ سیاسی نظام میں کایا پلٹ کر دے گی اور چشم زدن میں نئی دنیا قائم ہو جائے گی۔ اس کے برعکس کچھ ایسے لوگ بھی تھے (خدا کے فضل سے ان کی تعداد بہت کم تھی) جو یہ سوچتے تھے کہ بغیر دولت بغیر صنعت و حرفت مسلمانوں کی حکومت بھلا کتنے دن چلیگی۔ مسلمانوں کے پوشیدہ دشمنوں نے یہ مشہور کرنا شروع کر دیا تھا کہ مشرقی بنگال کی حکومت اپنے ملازمین کو ماہانہ تنخواہ بھی نہ دے سکے گی جس جوش و انہماک اور خلوص اور بےخوفی کے ساتھ خواجہ صاحب نے مشرقی پاکستان کی حکومت کی بنا ڈالی اور اس کے استحکام کی جان توڑ کوششیں کیں وہ اظہر من الشمس ہے اور اسکا ہر انصاف پسند انسان معترف ہے۔ صبح سے لیکر رات تک آپ کی کوٹھی پر لوگوں کا جمگھٹ رہتا اور چھوٹا بڑا ہر شخص اپنی حاجت اور درخواست لے کر پہنچتا اور آپ سب سے ملاقات کرتے اور درخواست سنتے لیکن بے قاعدہ اور ناجائز درخواست کو پورا کرنے سے صاف انکار کر دیتے۔ جن لوگوں سے آپکی بے تکلفی ہے اُنسے کہتے کہ کیوں فضول باتیں کرتے ہو سوچ سمجھ کر بات کرو جن لوگوں سے رسمی ملاقات ہوتی اُن سے نہایت نرمی اور خندہ پیشانی لیکن بہت صفائی سے کہہ دیتے کہ ان کی ناجائز درخواست نہیں منظور کی جاسکتی بلکہ کہہ دیتے کہ فلاں آفیسر یا وزیر کے ہاتھ میں اس معاملے کا فیصلہ ہے میں دخل نہیں دوں گا۔ میں نے خواجہ صاحب کے بارے میں کسی سے یہ کبھی نہ سنا کہ انہوں نے کسی بات کا وعدہ کیا ہو اور بعد ازاں عہد شکنی کی ہو۔ خواجہ صاحب دراصل خدا پرست اور خدا ترس مسلمان اور ہمیشہ سے صوم و صلوٰۃ کے پورے پابند ہیں۔

اس موقع پر مجھے ایک واقعہ یاد آگیا ۱۹۲۵ء یا ۱۹۲۶ء میں میں نے ایک مرتبہ چند احباب کو چائے پر بلایا تھا جن میں خواجہ صاحب اور ان کے کئی شناسا تھے۔ ان میں ایک صاحب تھے جنکا نام لینا میں ضروری نہیں سمجھتا۔ ان کا انتقال ہو چکا ہے اور وہ علیگڑھ کے بہت پرانے اولڈ بوائے تھے۔ آدمی تھے بڑے اور ہم سب لوگ ان کی بہت عزت کرتے تھے یکایک آپ نے خواجہ صاحب کی پیشانی پر ہاتھ لگایا اور کہا کہ مسٹر ناظم آپ بیرسٹر ہیں اور ماشاءاللہ بہت فیشن ایبل جنٹلمین ہیں لیکن اس عمر میں نماز کے سجدے کا نشان آپکی پیشانی پر اسقدر نمایاں ہے۔ خواجہ صاحب کو شاعری سے بہت دلچسپی ہے اور ایک زمانے میں جب آپ پبلک خدمات میں اسقدر مصروف نہ تھے تو مشاعروں اور ادبی جلسوں میں بہت شوق سے شرکت فرماتے تھے۔ خواجہ صاحب کو سیاسی لیڈر کی حیثیت سے تو تقریباً ساری مہذب دنیا جانتی ہے اور انکی قدر کرتی ہے۔ لیکن ان کی پرائیویٹ زندگی سے وہی لوگ واقف ہیں جنکو ان کی ملاقات کا شرف حاصل ہے۔ آپ نہایت ہی زندہ دل اور خوش مذاق ہیں، اور آپکی طبیعت نہایت شستہ اور مذاق نہایت پاکیزہ ہے۔ آپ کو مچھلی کے شکار سے بہت شوق ہے۔ ڈھاکہ میں آپ نے ایک باغیچہ میں نہایت وسیع تالاب کھدوایا ہے اور اس میں بہت سی مچھلیاں ڈلوائی ہیں۔ اتوار کے دن یا کسی چھٹی کے دن آپ وہاں تشریف لے جاتے ہیں اور دوست احباب کے ساتھ بیٹھکر مچھلی کا شکار کھیلتے ہیں۔ ایک زمانے میں پتنگ بازی سے بھی شوق تھا۔ آپ کے ماموں زاد بھائی موجودہ نواب ڈھاکہ

خواجہ حبیب اللہ کے ساتھ آپکی اکثر بازی ہوا کرتی تھی۔ دلکشا باغ میں یا پری باغ کے عقب کے میدان میں ایک پارٹی خواجہ صاحب کی اور ایک پارٹی نواب حبیب اللہ کی کھڑی ہوتی تھی اور خوب پیچ لڑتے تھے۔ کبوتروں کے اڑان کا بھی آپکو شوق ہے اور احسن منزل کی چھت سے دریا کے کنارے آپکے کبوتر اڑا کرتے تھے۔ یہ دونوں چیزیں گویا تہذیب کے ایک دورِ ماضی کی نشانیاں ہیں۔

ولایت سے واپس آنے کے بعد آپ کو گھوڑ دوڑ کا بہت شوق تھا۔ برج آپ بہت اچھا کھیلتے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کمزور کھلاڑی اگر آپ کے ساتھ ہو تو کھیل کے دوران میں یا اس کے بعد اسکا قیمہ نہیں بناتے جب کبھی میرے جیسے کھلاڑی کے ساتھ شرکت ہوتی۔ خاصکر میرے ساتھ۔ تو کہتے ہیں یا اللہ تیرا رحم! آپ کو نفیس اور لذیذ کھانیکا بہت شوق ہے اور دسترخوان پر ہمیشہ انواع اقسام کے عمدہ کھانے ہوتے ہیں۔ آپ کو کھانے پکانے میں بھی اگر مہارت نہیں تو دخل ضرور ہے تقسیم بنگال سے پیشتر ہم لوگوں کا ڈھاکے اور کلکتے کے درمیان اکثر آنا جانا تھا اور عموماً جہاز اور ریل سے سفر ہوتا تھا مشرقی بنگال کے دریا مشہور ہیں اور ان پر جو جہاز چلتے ہیں ان میں کھانا بہت ہی عمدہ ہوا کرتا تھا۔

خواجہ صاحب کو پدما دریا کی ہلسا مچھلی سے خاص شوق ہے۔ جب جہاز پر سفر کرتے تھے تو بٹلر کو خاص حکم ہوتا تھا کہ تازی ہلسا مچھلی کو بھونا جائے۔ جہاز پر جتنے شناسا ہوتے سب کا کھانا آپ کے ساتھ ہوتا۔ جاڑے میں کبھی کبھی آپ بجرا اور کشتیاں لے کر دریا کے شکار کو جاتے اور اکثر دوست احباب ساتھ ہوتے۔ بن بھر پرندوں کا شکار اور شام کو دوستوں کے ساتھ خوش گپی۔ رمضان مبارک میں آپ نماز تراویح کے بعد اپنے عزیزوں اور خاص دوستوں کو لیکر کبھی کبھی سحری کے وقت تک بیٹھا کرتے اور نہایت ہی پُر لطف صحبت رہتی۔ چند ایسی صحبتیں مجھے کبھی نہیں بھولیں گی۔ چاندنی اور گاؤ تکیوں پر پندرہ بیس آدمی بالکل بے تکلف ہو کر بیٹھتے اور ہر طرح کے موضوع پر بہت ہی کھلے دل سے گفتگو ہوتی۔ مہذب مذاق اور لطیفے ہوتے۔ آپ کو جب کسی بات پر ہنسی آتی ہے تو بے اختیار قہقہہ لگاتے ہیں اور کبھی کبھی زانو پر ہاتھ مارتے ہیں۔ کبھی بہت ضروری اور اہم کانفرنس یا میٹنگ وغیرہ کا ذکر ہوتا ہے اور اس میں اگر ہنسی مذاق کی بات ہوتی ہے تو اسے بہت ہی مزے کے ساتھ دہراتے ہیں اور سامعین لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہ بات خواجہ صاحب میں بہت ہی قابلِ قدر ہے کہ سنجیدگی کے موقع پر آپ سنجیدہ اور ہنسی تفریح کے موقع پر دوستوں کے ساتھ بالکل بے تکلف اور شیر و شکر۔ اپنے عزیزوں سے آپ کو بہت محبت ہے اور بزرگوں کا بہت ادب اور لحاظ کرتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ آپ کے مکان پر آپ کے عزیز و اقربا موجود تھے میں بھی موجود تھا اور بہت بے تکلفی سے باتیں ہو رہی تھیں۔ یکایک ایک موٹر آئی اور اس میں سے آپ کے چھوٹے ماموں نوابزادہ عتیق اللہ مرحوم اترے۔ آپ نے فوراً کہا "دیکھو ماما آ گئے" اور فوراً آپ مؤدب ہو گئے۔ بچوں سے آپ کو بہت زیادہ محبت ہے۔ اپنے اور خاندان کے بچوں کے ساتھ بڑی خوشی اور آزادی سے باتیں کرتے ہیں اور انکے ساتھ کھیلتے ہیں۔ گھر میں عموماً کرتا پاجامہ پہنتے تھے اور کرتے کی جیبوں میں روپیہ رکھتے ہیں۔ کوئی ضرورت مند آتا ہے تو اُسے بغیر کچھ دئے جانے نہیں دیتے۔ تمکنت، تکبّر اور غرور سے آپ کو سخت نفرت ہے اور خوشامد اور چاپلوسی کو بیحد ناپسند کرتے ہیں مزاج بہت سادگی پسند ہے اور دوستوں سے نہایت بے تکلفی اور خندہ پیشانی سے ملتے بہت قابلِ قدر بات یہ ہے کہ آپ کبھی اپنے دل میں کسی کی طرف سے بُغض نہیں رکھتے اور آپنے کبھی کسی کو نقصان پہونچانے کی کوشش نہیں کی۔ اور نہ کبھی کسی دوست یا عزیز کی خاطر کسی سے ناانصافی یا کسی کی حق تلفی کی۔ اہل پاکستان کے لئے یہ امر باعثِ مسرت و فخر ہے کہ ایسا ایماندار تجربہ کار اور باہمت شخص اس ملک کا سرتاج ہے۔ قائد اعظم محمد علی جناح علیہ الرحمۃ کے پایہ کی ہستی زمانۂ موجودہ میں ناپید و عنقا ہے اور ان کے انتقال پُر ملال سے ملک اور ملّت کو سخت صدمہ اور نقصان عظیم پہنچا ہے لیکن خداوند کریم کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ پاکستان میں ایسے لائق اور خدا پرست لیڈر موجود ہیں جو قائد اعظم مرحوم و مغفور کے کام کو جاری رکھنے اور اسکو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی ہمت اور قدرت رکھتے ہیں۔ خواجہ ناظم الدین کے گورنر جنرل ہو جانے سے ہر سچے پاکستانی کو دلی خوشی ہے کیونکہ سب کو اس امر کا یقین کامل ہے کہ وہ ہر طرح اس بارِ گراں کو اٹھانے کے قابل ہیں انکی دیرینہ خدمات قومی اس بات کی شاہد ہیں کہ وہ سچے مسلمان ہیں اور نہایت خلوص اور جوش کے ساتھ اصول اسلام "سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُهُمْ" کے پیرو اور اسپر کاربند ہیں۔ خدا انکی عمر دراز کرے اور ان کو اور زیادہ قوت و ہمت عطا فرمائے تاکہ وہ قوم اور ملک کی عرصۂ دراز تک خدمت کر سکیں۔

بلّیوں کی جنّت

بقیہ صفحہ ۱۶

تھرتھراہٹ تھی۔ میں گھر میں داخل ہوا تو بچی نے ہنٹر لے کر میری خوب مرمت کی۔ آج مجھے اس پٹنے میں بھی بڑی لذت مل رہی تھی۔ مجھے پٹنے کی تکلیف سے زیادہ گھر کی اس گرمی کا احساس تھا جو میرے جسم میں داخل ہو رہی تھی اور اس لذیذ گوشت کا جو تھوڑی دیر بعد مجھے ملنے والا تھا۔

بلّے نے اپنی کہانی ختم کرتے ہوئے آتشدان کے شعلوں کے آگے اطمینان کی ایک انگڑائی لی اور کہا کہ اے میرے عزیز آقا، یہی خوشی اور جنت کی سی آسائش ایسے کمرے کے اندر بند رہ کر بیٹھے رہنے میں ہے جہاں کھانے کے لئے گوشت موجود ہے لیکن یہ جذبات ایک بلّی کے ہیں۔

اشد ضروری

اگر آپ کو رسالہ وقت پر نہیں ملتا تو ہمیں بھی فوراً اطلاع دیجئے اور مقامی ڈاکخانہ میں بھی پوچھئے۔ ہمیں یقین ہے آپ کا پرچہ کسی نے راستے میں غائب کیا ہے۔

لیگ آف نیشنز کے آخری اجلاس میں

وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر
کی حیثیت سے

ہز اکسلنسی الحاج خواجہ ناظم الدین بالقابہٗ

(پاکستان کی گورنر جنرلی سے پہلے)

ایکسلنسی فرصت
اوقات میں

لائبریری میں مصروف مطالعہ ہیں -
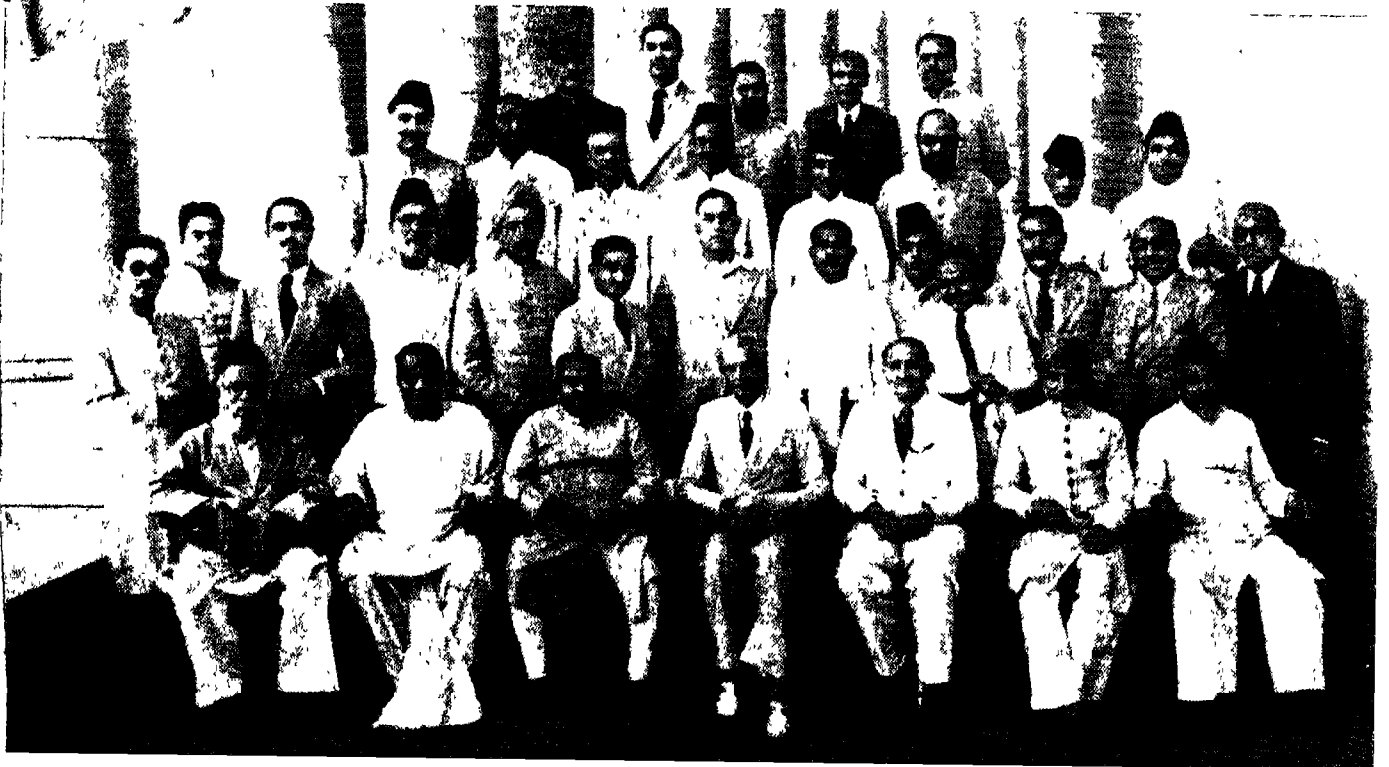
ہز ایکسلنسی گورنر جنرل محل میں ...
امور خانہ داری مسٹر لک اور ان پر
صاحب زادے خواجہ معنی الدین سے گفت
کر رہے ہیں -

ہز ایکسلنسی کے سرکاری مشاغل

ہزایکسلنسی اپنے دفتر میں سرکاری
کاغذات ملاحظہ فرما رہے ہیں -

کے جلسہ کی صدارت فرما رہے ہیں -

پاکستانی بحریہ کے سپاہیوں
گارڈ آف آنر ملاحظہ فرما رہے

بیرونی سفرا سے مصروف گفتگو ہیں -

ایمل زولا

بلّیوں کی جنّت

میری چچی نے مجھے ایک مرتبہ ایک ولایتی بلّا لاکر دیا بلّا بڑا پیارا تھا اور بہت جلد مجھ سے مانوس ہو گیا سردی کا زمانہ تھا اور شام کے وقت میں اسے گود میں لئے آتشدان کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس دن بلّے نے مجھے اپنی عجیب وغریب حکایت سنائی۔ شاید آپ کو بھی اس سے دلچسپی ہو سن لیجئے۔ کہانی میں آپ کو خود اسی کے لفظوں میں سناؤں گا۔

(۱)

میری عمر دو سال کی تھی۔ میرا جسم اس وقت بھی خاصا گدر گدرا تھا۔ میں خدا کی اس عنایت کا بے حد شکر گذار ہوں کہ اس نے مجھے تمہاری چچی جیسی مالکہ دلوائی۔ وہ مجھ سے بے حد محبت کرتی تھیں۔ انہوں نے میرے آرام کے لئے کپڑوں کی الماری کے ایک خانہ میں ایک نرم اور گرم بستر لگا دیا تھا۔ میں اس بستر میں چین کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ کھانا بھی بہت اچھا ملتا تھا یعنی ہمیشہ تازہ اور سرخ گوشت۔ اس سے زیادہ ایک بلی کو اور کیا چاہیئے لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ مجھے گھریلو زندگی کے اس سارے عیش وآرام سے ایک نفرت سی تھی۔ میرا دل تو بس یہ چاہتا تھا کہ دو منزلے کی کھڑکی میں سے نکل کر باہر کی چھتوں پر دوڑتا پھروں میرا تصور مجھے دن رات یہی خواب دکھاتا تھا۔ چچی کی شفقت میں میرے لئے کوئی لذت نہیں تھی۔ نرم بستر کانٹوں کی طرح چبھتا تھا اور اپنے موٹاپے سے دل میں نفرت پیدا ہوتی تھی۔ سارے دن کا یہ عیش میرے لئے سوہان روح بن گیا تھا۔ ہاں! میں ایک بات بتانا بھول گیا۔ کبھی کبھی جب میں کھڑکی سے باہر سر نکال کر کھلی ہوئی چھت پر نظر ڈالتا تو وہاں مجھے چار بلیاں آپس میں کھیلتی نظر آتیں جسم کے بال تنے ہوئے ہوتے، دُمیں اوپر کی طرف اٹھی ہوئی اور چہرے خوشی کی تمتماہٹ سے بھرپور۔ میں انھیں اس طرح دھوپ کی روشنی میں کھلی ہوئی سلیٹی چھت پر کودتا پھاندتا دیکھتا تو میرے دل کی عجیب حالت ہوتی۔ اور اب میرے دل کو یقین آگیا تھا کہ سچی خوشی اسی چھت پر ہے جسے کھڑکی بند کرکے اتنی احتیاط سے چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے بالکل اسی طرح جیسے نعمت خانہ کی کھڑکی بند کرکے گوشت کی حفاظت کی جاتی تھی۔

میں نے بھاگنے کی اسکیم تیار کرلی۔ یہ سوچ کر کہ زندگی میں سرخ گوشت ہی سب کچھ نہیں۔ وہ بھی ہے جو ہماری نظروں سے اوجھل ہے، ہمارا نصب العین۔ اور ایک دن جب کسی طرح باورچی خانہ کی کھڑکی کھلی رہ گئی تو میں کود کر اس کے نیچے کی چھت پر پہنچ گیا۔

(۲)

کتنی اچھی تھیں وہ چھتیں! چھتوں کے کنارے کنارے بڑی بڑی نالیاں تھیں۔ ان میں سے بڑی سوندھی خوشبو نکل رہی تھی۔ میں نے خوشی خوشی ان نالیوں کے برابر چلنا شروع کردیا۔ میرے پنجے بار بار اس نرم مٹی میں دھنس جاتے تھے جو ان نالیوں کے کنارے اکٹھی ہو گئی تھی۔ کتنی مٹھاس اور گرمی تھی اس نرم مٹی میں۔ معلوم ہوتا تھا کہ میں مخمل کے فرش پر چل رہی ہوں۔ سورج کی گرمی میرے جسم کو بڑا سکون دے رہی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اس گرمی سے آہستہ آہستہ میری چربی پگھل رہی ہے۔ کتنا شیریں تھا یہ احساس!

میں آپ سے یہ بات کیوں چھپاؤں اس وقت میرے جسم کا ایک ایک حصہ کانپ رہا تھا۔ میری خوشی میں خوف کا ایک احساس شامل تھا۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ تین بلیاں ایک مکان کی چھت سے لڑھکتی ہوئی میرے پاس آکر گریں۔ میں خوف سے تھرانے لگی اور قریب تھا کہ بے ہوش ہوجاؤں۔ لیکن جب ان بلیوں نے مجھ سے کہا کہ ارے ہم تو کھیل رہے تھے تو میں نے اپنی حماقت محسوس کی۔ میں نے بھی ان کے ساتھ کھیلنا شروع کردیا۔ واقعی کس قدر دلچسپ تھا وہ وقت۔ میں نے دیکھا کہ ان کے جسم میری طرح چربی سے لدے ہوئے نہیں ہیں۔ اور اس لئے ایک مرتبہ میں جب جسم کے بوجھ کی وجہ سے میرا پاؤں پھسلا تو بلیاں میرا مذاق اڑانے لگیں۔ ان تین بلیوں میں سے ایک مجھ سے بہت مانوس ہوگئی۔ اس نے مجھے اس نئی زندگی میں تربیت اور رہنمائی دینے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ اور میں نے اس کی اس پیشکش کو شکریہ کے ساتھ قبول کرلیا۔

اور اب میں چچی کے گھر کے عیش وعشرت سے کتنی دور تھا۔ میں نالی کے پانی سے اپنی پیاس بجھاتا اور اس پانی میں مجھے ایسی لذت ملی جیسی اس سے پہلے کبھی تازے اور میٹھے دودھ میں بھی نہیں ملی تھی۔ اس نئی زندگی کی ہر چیز میں میرے لئے ایک کشش اور دل آویزی تھی۔ میرے قریب سے ایک دبلی پتلی بلی گذری تو اس کی نازک ہڈیوں کو دیکھ کر میرے دل میں ایک ایسا جذبہ پیدا ہوا جس کا اس سے پہلے مجھے کبھی احساس نہیں ہوا تھا۔ اس نئے مہمان کے خیر مقدم کے لئے ہم چاروں اس کی طرف دوڑے۔ میں ان سب سے آگے بھاگا اور قریب تھا کہ اس حسینہ

کی خدمت میں اپنا خراجِ تحسین پیش کر دوں کہ میرے ساتھیوں میں سے کسی نے بڑے زور سے میری پیٹھ میں کاٹ لیا۔ میں تڑپ کر رہ گیا۔

میرے رہنما نے مجھے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا "گھبرائے کیوں جاتے ہو۔ ایسی بیسیوں بلیاں اور بھی آئیں گی۔"

(۳)

گھنٹہ بھر کی کود پھاند کے بعد مجھے سخت بھوک لگ آئی تھی۔ میں نے اپنے رہنما سے پوچھا "یہاں کھانے کو بھی کچھ ملے گا؟" اس نے کہا "ہاں ہاں، جو کچھ نہیں اِدھر اُدھر مل جائے۔"

اس جواب سے مجھے بڑی الجھن ہوئی اسلئے کہ میں نے اِدھر اُدھر گھوم پھر کر دیکھا تو کھانے کی کوئی چیز نہ ملی۔ آخر ایک کوٹھری میں میں نے دیکھا کہ ایک عورت کھانا پکا رہی ہے۔ کھڑکی کے نیچے میز پر سُرخ تلا ہوا کباب رکھا تھا۔ اسے دیکھکر میرے منہ میں پانی بھر آیا میں نے لپک کر کباب اٹھالیا۔ لیکن ابھی بھاگنے نہ پایا تھا کہ عورت نے میری پیٹھ پر ایسا ڈنڈا رسید کیا کہ کمر ٹوٹ کر رہ گئی۔ کباب میں نے وہیں چھوڑا اور چیخ کر باہر نکل آیا۔

بوڑھی بلی نے میری داستان سنی تو کہا کہ "تم آخر اپنی حد سے باہر کیوں گئے۔ میز پر رکھا ہوا گوشت ہمارے لئے نہیں۔ ہمیں تو اپنی غذا انہیں نالیوں میں تلاش کرنی ہے۔" یہ بات کچھ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ بھوک سے میرا بُرا حال تھا۔ بوڑھی بلی نے میری یہ حالت دیکھی تو کہا کہ "رات تک انتظار کرلو۔ اندھیرا ہوگا تو نیچے اتر کر کوڑے کے ڈھیروں کا جائزہ لیں گے۔" اس نے یہ بات تجربہ کار فلسفی کی طرح بڑے سکون اور اطمینان سے کہی اور میرا یہ حال تھا کہ رات تک فاقہ کشی کرنے خیال ہی سے جیسے مجھ پر غشی طاری ہو رہی تھی۔

(۴)

اور بالآخر رات بھی آگئی۔ سرد ٹھٹھرا دینے والی رات بارش ہوئی ہواؤں کے تیز جھونکے بدن میں تیر کی طرح چبھنے لگے۔ ہم ایک زینہ سے نیچے اترے اور سنسان، اندھیری رات میں بھیانک سڑک پر پہنچ گئے۔ جہاں نہ سورج کی گرمی تھی، نہ چھتوں کو منور کرنے والے سورج کی روشنی، جس میں نے دن بھر اپنے بدن کو لذت سے کے .. ساتھ سینکا تھا۔ میرے پنجے چکنی گلی میں پھسل رہے اور مجھے اس وقت اپنا گرم بستر اور پروں والا گدا بری طرح یاد آرہا تھا۔

ہمیں سڑک پہنچے ابھی ذرا ہی سی ہوئی تھی کہ بوڑھی بلّی نے کانپنا شروع کردیا اور اپنے بدن کو پوری طرح سمیٹ کر ایک چھلانگ لگائی اور مجھے پیچھے آنے کے لئے اشارہ کیا۔ وہ ایک ٹھہر دانے کی آڑ میں چھپ رہی تو اس نے جیسے اطمینان کی سانس لی۔ میں نے کہا "کیا بات ہے؟"

"تم نے سامنے دیکھا؟ وہ آدمی جس کے ہاتھ میں ایک ٹوکری اور ٹوکدار چھڑی سی ہے؟"

"ہاں، تو پھر" میں نے جواب دیا۔

"پھر یہ کہ اگر وہ ہمیں دیکھ پاتا تو ہمارا سر توڑ ڈالتا اور پھر ہمیں بھون کر کھا لیتا؟"

"بھون کر کھا لیتا!" میں نے گھبرا کر کہا "تو گویا یہ سڑک ہماری نہیں۔ ہم یہاں کھاتے نہیں بلکہ کھائے جاتے ہیں"؟

(۵)

لوگوں نے اپنے گھروں کا کوڑا سڑک پر ڈال دیا تھا۔ بڑی تلاش کے بعد مجھے چوڑی ہوئی تین ہڈیاں ملیں۔ اور اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ تازہ سُرخ گوشت میں کیا لذت ہے۔ میرے رہنما نے ہر کوڑے کے ڈھیر کو ایک ماہر کی طرح کرید ڈالا اور اس میں سے کچھ نہ کچھ حاصل کرلیا۔ اس طرح ہم نے ساری رات آہستہ آہستہ گلیوں میں گھوم پھر کر گزار دی۔ اور دس گھنٹے تک برابر جسم بارش میں بھیگتا رہا۔ میں تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اور مجھے اس آزادی میں اپنی قید یاد آرہی تھی۔

صبح کے وقت بوڑھی بلی نے مجھے لڑکھڑاتے دیکھا تو مجھ پر ایک غلط انداز نظر ڈال کر بولی "کہو، تمہارا جی بھر گیا" میں نے خاموشی سے جواب دیا "ہاں"

"تو اب تم اپنے گھر واپس جاؤگے؟"

"بے شک! لیکن مجھے گھر ملے گا کیسے؟"

"آؤ میرے ساتھ آؤ۔ میں نے تم جیسی موٹی تازی بلی کو جب آج صبح باہر نکلتے دیکھا تو مجھے یقین تھا کہ آزادی کی پُر آسائش لذتیں تمہارے لئے نہیں ہیں مجھے تمہارا گھر معلوم ہے۔ میں تمہیں وہاں تک پہنچا دوں گی۔"

اس نے ساری باتیں بڑی سادگی سے کہیں اور جب میرا گھر آگیا تو کسی قسم کے جذبات کے اظہار کے بغیر مجھ سے کہا "اچھا۔ خدا حافظ"

لیکن میں جذبات سے متاثر تھا۔ میں نے فوراً کہا "نہیں نہیں! میں تمہیں اسطرح ہرگز نہیں جانے دوں گا۔ تم میرے ساتھ آؤ۔ ہم دونوں ایک ساتھ سوئیں گے۔ ایک ساتھ کھائیں گے۔ میری مالکہ بڑی اچھی ہے۔"

اس پر اس نے تیزی سے جواب دیا "بہت بہت شکریہ! لیکن میں تمہاری طرح احمق نہیں ہوں۔ تم جانتے ہو کہ میں تمہارے نرم بستروں پر مروں۔ زندگی کا یہ طریقہ تمہاری جیسی دوغلی بلّیوں کے لئے موزوں ہے۔ آزاد بلیاں آزادی کی قیمت پر تمہارے نرم بستر اور لذیذ گوشت نہیں خرید سکتیں۔ خدا حافظ۔"

وہ تیزی سے چھت پر پھسل گئی۔ طلوع ہوتے ہوئے سورج کی روشنی میں مجھے اس کے جسم کا عکس نظر آرہا تھا، اور عکس میں خوشی کی (باقی صفحہ ۵۲ پر)

میاں فضل حسین

علومِ اجتماعی اور شہریت

اگر ہم سماجی نظام کو ایک عمارت تصور کریں تو اس عمارت میں انسان کی حیثیت معمار کی اور رسم و رواج اور قانون کی حیثیت چونے اور گارے کی سی ہوگی۔ اس عمارت کی مضبوطی اور استحکام کا دارومدار یکساں طور پر بنانے والے کی قابلیت اور سامانِ تعمیر کے حسن و خوبی پر ہوگا۔ انسان کا زاویۂ نظر اور اس کا طرزِ عمل حد درجہ متنوع ہے۔ اس کی تشکیل اتنے مختلف سانچوں میں ہوتی ہے کہ زاویۂ نظر اور طرزِ عمل میں ایک انسان کا دوسرے انسان سے مختلف ہونا لازمی ہے۔ تبدیلی اور انقلاب اس کی فطرت ہے، یہ فطرت کبھی ترقی کی طرف مائل ہوتی ہے، کبھی تنزل اور انتشار کی طرف۔ یہ تبدیل پسند فطرت اسے ہمیشہ اس کے اس منصب سے غیر مطمئن رکھتی ہے جو اسے معاشی نظام میں حاصل ہے۔ اور یہی عدمِ اطمینان اس کی زندگی کو تضاد کا مجموعہ بناتا ہے۔ کبھی وہ استحصال کی قوتوں کے نیچے دبا ہوا آزادی کے حصول کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ اور کبھی جب قسمت اسے بلندیوں تک پہنچا دیتی ہے تو اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اس بلندی پر قائم رہے۔ غرض انسانی زندگی مجموعہ ہے شورشوں اور ہنگاموں کا۔ زندگی کی یہ شورشیں اور ہنگامے سارے سماجی نظام میں ہلچل پیدا کرتے رہتے ہیں۔ ایک ایسا مکمل سماجی نظام جو اس ہلچل سے خالی اور ہر لحاظ سے ہموار اور متوازن ہو نہ اس سے پہلے کبھی رہا ہے اور نہ شاید آئندہ کبھی ہو۔ اس لئے ہمواری اور توازن کی یہی کمی سماج کے ارتقا میں مدد دیتی ہے۔ اور اسی توازن اور ہمواری کی کمی کبھی کبھی ایسے حالات پیدا کر دیتی ہے کہ ارتقائی عمل انقلاب کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ مختصر طور پر یہ ہے خلاصہ اس نظام کا جس میں ہم گھرے ہوئے ہیں۔

ہم سے کبھی کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ انسان کے علاوہ بعض دوسرے حیوان بھی معاشرت پسند ہیں اور انہوں نے اپنے لئے ایک ایسے بہتر معاشرتی نظام کی تخلیق کی ہے جو اس طرح کی ناہمواری اور بے آہنگی سے مبرا ہے۔ شہد کی مکھیوں، چیونٹیوں یا دیمکوں کی بستیاں اس طرح کی معاشرتی زندگی کی مثالیں ہیں جہاں امن کا راج ہے، جہاں اس معاشرتی نظام میں ہر فرد اسی جگہ لگا ہوا ہے جو اس کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہے۔ اور اس جگہ رہ کر وہ کسی انعام کی خواہش اور طمع کے بغیر، معاشرہ کی بھلائی کے لئے پوری کوشش اور تن دہی سے کام میں مصروف ہے۔ یہاں کوئی مجرم نہیں اور اس لئے پولیس کی ضرورت نہیں۔ یہاں کسی قاعدے قانون کی خلاف ورزی نہیں کی جاتی اس لئے عدالتوں کی ضرورت نہیں۔ قوانینِ قدرت جو سزائیں دیتے ہیں انہیں بے چون و چرا تسلیم کیا جاتا ہے۔ چھتے میں نر مکھی کی ضرورت باقی نہیں رہتی تو اسے باہر پھینک دیا جاتا ہے۔ اور اس کی مجال نہیں کہ وہ اس فیصلے کے خلاف کچھ کہہ یا کر سکے لیکن سماجی نظام کا استحکام و استقلال سخت قربانی کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ اس کے لئے افراد کو اپنی شخصی زندگی کے حقوق قربان کرنے پڑتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ کہ چھتے میں کام کرنے والوں کی زندگی جنسی احساس سے خالی ہوتی ہے۔ ان کی حیاتیاتی زندگی کا ماضی اور حال تو ہے مستقبل نہیں۔ ان کی نسل آگے نہیں چلتی۔ جنسی ضرورتیں پوری کرنے اور چھتے کی آبادی بڑھانے کا کام کسی اور کے سپرد ہوتا ہے۔ ارتقا کے عمل سے رفتہ رفتہ معاشرہ کے افراد کی جسمانی ساخت، عضوی ترتیب اور نفسیات میں جو مستقل تبدیلیاں پیدا ہو گئی ہیں ان سے اس معاشرتی نظام کو ایک استحکام مل گیا ہے۔ کام کرنے والوں کے مختلف گروہ بن گئے ہیں اور ہر گروہ صرف ایک خاص طرح کے فرائض انجام دینے کا اہل ہے۔ اسی لئے سارے نظام میں ایک توازن اور ہم آہنگی ہے۔ لیکن اس توازن اور ہم آہنگی کی ایک دوسری قیمت بھی ادا کرنی پڑی ہے اور وہ یہ کہ اس معاشری نظام میں ارتقا کا عمل بالکل مسدود ہو گیا ہے۔ یہ معاشرہ کائنات کی بدلتی ہوئی رنگینیوں سے محروم ہو گیا اور یہ محرومی حیوانی زندگی کا شدید نقصان ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے انسان بھی اپنی معاشرتی تنظیم میں چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے۔ کبھی کبھی ہمیں ایسے افراد سے واسطہ پڑتا ہے جن کا نفسیاتی ترجمان نمایاں طور پر اسی طرح کا نظر آتا ہے جیسا شہد کے چھتے میں کام کرنے والوں کا۔ اور غالباً ان کا یہ نفسیاتی رجحان جسمانی اور عضویاتی بنیادوں پر قائم ہے۔ اگر یہ صحیح بھی ہے تو اس تبدیلی کو ایک مستقل صورت اختیار کرتے کرتے ہزاروں برس لگیں گے۔ زندگی کے جس دور سے ہم اس وقت گزر رہے ہیں اس میں معاشرتی استحکام نہ ممکن ہے اور نہ شاید مناسب اور موزوں۔ معاشرتی زندگی میں استحکام کے دوسرے معنی لوچ اور لچک کی کمی ہیں۔ لوچ اور لچک کی کمی میں تبدیلی کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ جہاں تبدیلی ممکن نہ ہو وہاں ترقی بھی ناممکن ہو جاتی ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ انسان میں اب تک خاصی لچک موجود ہے اور اس لئے وہ انسانیت کے مستقبل کا پاسبان بن سکتا ہے۔

رسم و رواج، روایتیں، شہنشاہی، حکومت کے دوسرے نظام، مذاہب۔ ان ساری چیزوں نے کسی نہ کسی حد تک معاشرہ کو متوازن بننے میں مدد دی ہے لیکن جتنا توازن اور جتنی ہمواری ضروری تھی وہ اسے اب تک حاصل نہیں ہو سکی۔ مناقشات

اب بھی جاری ہیں، جنگیں اب بھی ختم نہیں ہوئیں۔ یہاں تک کہ معاشرہ کا سب سے چھوٹا ٹکڑا گھرانا بھی ایسی جگہ نہیں جسے ہر لحاظ سے متوازن اور ہم آہنگ کہا جاسکے۔

غرض یہ ہے موجودہ صورتِ حال معاشرہ کے ہر چھوٹے بڑے حصہ میں ایک کا مفاد دوسرے کے مفاد سے ٹکراتا ہے۔ اختلافات پیدا ہوتے ہیں اور ہم آہنگی اور توازن رخصت ہو جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ صورتِ حال قابلِ اطمینان ہے؟ اس سوال کے جواب کے لئے اور معاشرہ کے ان متنازعہ فیہ مسائل کو حل کرنے کے لئے ہمیں شہری اور اس کی زندگی کے اس معاشرتی نظام کا مطالعہ کرنا پڑے گا جس میں وہ رہتا ہے۔ یہ کام آسان نہیں، بڑا پیچیدہ ہے۔

ڈارون نے ایک جگہ لکھا ہے" انسان کا موازنہ بہت سی حیثیتوں سے ان جانوروں سے کیا جاسکتا ہے جو مدتوں سے پالتو جانوروں کی زندگی گذار رہے ہیں۔۔۔" انسان نے بہت سے پودوں اور جانداروں کی فطری خصوصیات کو اس حد تک بدل ڈالا ہے کہ ان میں اپنے وحشی آباواجداد کی ایک نشانی بھی باقی نہیں رہی۔ ہماری فصلیں، ترکاریاں پھل پھول ہر چیز پر انسان کی تربیت کے گہرے اثرات نمایاں ہیں۔ انسان کی تربیت نے جمادات اور حیوانات کی زندگی کی تنظیم کو بدل کر ان کی ہیئت اور فطرت میں زبردست انقلاب پیدا کر دیا۔ اسی تربیت کا نتیجہ ہے کہ اسوقت گیہوں، گنے، نارنگی، آم، کتے، کبوتر اور چوپایوں کی طرح طرح کی قسمیں موجود ہیں۔ خود انسانی زندگی پر بھی اس تربیت نے گہرا اثر ڈالا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ انسان کو تربیت کی جن منزلوں سے گذرنا پڑا ہے وہ ان سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہیں جو پودوں اور جانوروں کو پیش آئیں۔ اس لئے لازمی طور پر دونوں کے نتیجے میں بھی بڑا فرق ہے۔ انسان اپنے جسم کو کپڑوں سے ڈھکتا ہے، مکانوں میں رہتا ہے اور گرمی سردی کے اثرات سے محفوظ رہنے کے لئے مصنوعی وسیلے استعمال کرتا ہے۔ یہاں تک کہ جس ہوا میں وہ سانس لیتا ہے اسکے اجزا بھی بالکل مختلف ہیں۔ انسان نے اپنی زندگی کو ایک محدود مقام میں محصور کر لیا ہے اور یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ جانداروں پر مقام یا مکان کے تعین کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ انسان پکا ہوا کھانا کھاتا ہے اور اس میں نمک، مرچ، مسالے ملا کر اسے اور بھی مصنوعی بنا لیتا ہے۔ لیکن یہ ساری چیزیں ان ذہنی اور نفسیاتی عناصر کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں جن میں انسان گھرا ہوا ہے۔ اس کی پرورش کا ماحول بچپن کے تاثرات تعلیم، تربیت، پڑھی ہوئی کتابیں، جذباتی لگاؤ، مختلف چیزوں کے ساتھ اس کی وفاداری۔ یہ ساری چیزیں ایسی ہیں جو بڑی حد تک انسان کے نفسیاتی رجحانات کی تشکیل کرتی ہیں۔ فنونِ لطیفہ ــ مصوری، موسیقی اور رقص کا انسانی ذہن پر جو اثر پڑتا ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ پھر سینما اور اس کی عریاں اور نیم عریاں تصویریں، ریڈیو اور پروپگنڈے کا فن ــ یہ سب چیزیں انسانی ذہن پر گہرے نقوش چھوڑتی ہیں پھر زندگی کی گہما گہمی (جو نئے زمانہ کی جدوجہد کی پیداوار ہے) اس کی فکریں اور پریشانیاں، معاشی دباؤ اور کھنچاؤ، امیر و غریب کے درمیان کی وسیع خلیج، ازدواجی زندگی کی پیچیدگیاں، بچوں کی پرورش کی ذمہ داریاں، ان کے مستقبل کے متعلق سوچ بچار، سب ایسی چیزیں ہیں جنھیں انسانی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ نشہ اور جوا جیسی عادتیں بھی اس کی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ حد سے زیادہ محنت اور اس محنت کی وجہ سے ذہنی اور جسمانی تھکاوٹ بھی انسانی طرزِ عمل پر اثر ڈالتی ہے یہ اور اس طرح کی ان گنت چیزیں ہیں جو برابر انسانی فکر اور عمل کو متاثر کرتی رہتی ہیں اور اس لئے شہری حالت ان حالات کے ساتھ بدلتی رہتی ہے جن میں وہ رہتا ہے اور تغیر کا اثر قبول کرنے والی زندگی اور بھی متغیر ہوتی جاتی ہے۔ انسان کو ماحول کس حد تک بدل سکتا ہے اسکا اندازہ ہم دو مختلف ماحولوں میں رہنے والے دو انسانوں کی جسمانی اور نفسیاتی زندگی کا مقابلہ کر کے لگا سکتے ہیں ــ ان میں سے ایک گاؤں میں رہنے والا کسان ہے جو قدرت کی بے لوث فضا کے گہوارے میں پرورش پاتا ہے اور دوسری طرف نئے معاشرہ کا وہ "مہذب" انسان جو صد درجہ کی مصنوعی فضا میں زندگی بسر کرتا ہے۔ یہ انسانی زندگی کی دو ایسی منزلیں ہیں جن میں بعد المشرقین ہے۔ ان دونوں منزلوں کے درمیان بے شمار منزلیں اور ہیں۔ فضا اور ماحول کا یہ فرق ہمارے معاشرتی نظام کے لئے لاانتہا پیچیدگیاں پیدا کر دیتا ہے۔ ہمیں ان کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے ذہنی اور جسمانی حیثیت سے ایک صحت مند معاشرہ پیدا کرنے کے لئے کون سی زندگی بہتر ہے؟ کیا ایسی زندگی جو تربیت کی پابندیوں سے آزاد ہو تاکہ اس میں لچک باقی رہے، یا ایسی زندگی جو تکلفات سے مملو اور بظاہر دلکش ہو لیکن انسان کو خاتمہ کی طرف لے جائے؟ انسان فطرتاً نقّال ہے۔ وہ ہر نئے فیشن کی نقل کرتا ہے اور ضروری نہیں کہ ہر فیشن کی بنیاد عقلِ سلیم پر ہو۔

پوپ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ" نسلِ انسانی کا بہترین مطالعہ انسان کے مطالعہ سے ہوسکتا ہے" اور یہ بات پوری طرح تسلیم کی جاچکی ہے کہ" علم انسانی سارے علوم سے زیادہ اہم ہے" پچھلے چند برسوں میں انسان نے اپنے علم کو بے حد وسعت دی ہے، اور اس علم کے استعمال سے اس کی قوت میں لاانتہا اضافہ ہوا ہے۔ اور اس بات میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ سائنس نے انسانی قوت کو ہزاروں گن بڑھا دیا ہے لیکن ایک اجتماعی مخلوق کی حیثیت سے اس نے تنزل کیا ہے جس حد تک اس نے ماحول کو اپنے قابو میں کیا ہے وہ اپنے آپ پر اتنا قابو نہیں حاصل کر سکا۔ اسی خیال کو اقبال نے اپنے اس مشہور قطعہ میں نظم کیا ہے ؎

عشق ناپید و خرد می گزدش صورتِ مار — عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں اُلجھا لیا — آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

ہم اسوقت اس بے آہنگی کا شکار ہیں کہ گو فطرت کی قوتیں انسان کی مرضی کے آگے سر بسجود ہیں لیکن انسان کو خود اپنے اوپر ذرا بھی اختیار نہیں اور کبھی کبھی اس سے ایسی بے ضابطہ حرکتیں سرزد ہو جاتی ہیں جیسے اس کے نسلوں پہلے کے آباؤ اجداد سے۔ ہمارے معاشری مسائل کی پیچیدگیاں بھی اسی طریقہ سے دور ہو سکتی ہیں جیسے دوسرے پیچیدہ مسائل لیکن اس کے لئے سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ہم گہری نظر سے "اجتماعی علوم" کا مطالعہ کریں۔

انسان اور معاشرہ کا تعلق بنیادی طور پر ایک حیاتیاتی مسئلہ ہے، اور اسلئے انسان کا مطالعہ ہمیں جہاں ایک طرف فرد کی حیثیت سے اسے معاشرہ کا ایک جزو سمجھ کر کرنا چاہیئے وہاں دوسری طرف اُسے معاشرے کے اجتماعی پہلو سے بھی دیکھنا چاہیئے۔ ماحول کے پیچیدہ عناصر ایک فرد کی حیثیت سے اُس پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں، اور مختلف طرح کے حالات میں معاشرہ کے مختلف پہلوؤں میں کس طرح اس پر اثر ڈالتے ہیں۔ ہماری تحقیق کا موضوع یہی ہے۔ اس تحقیق کے جو مختلف نتائج برآمد ہوں ان میں صحیح امتزاج اور ترکیب پیدا کرنی ضروری ہے اس لئے انسان کے اجتماعی مسائل بنیادی طور پر ایک متحد اور مشترک حیثیت رکھتے ہیں اور اس لئے انکا مطالعہ بھی انھیں متحد اور مشترک کر کے کرنا چاہیئے۔

یہ وقت کی ایک اہم ضرورت ہے کہ ہم حیاتیات کو بنیاد بنا کر علوم اجتماعی کو ایک مکمل علم کی حیثیت سے ترقی دیں اور اس کام میں انسانی علم کے ہر شعبہ، یعنی تاریخ، معاشیات، نفسیات، اخلاقیات اور مذہبیات اور جغرافیہ وغیرہ سے پوری مدد لیں۔ دنیا بڑی تیزی سے بدل رہی ہے اور ہم مستقبل کے منصوبے بنا رہے ہیں تاکہ زراعت، صنعت و حرفت، تعلیم اور صحت عامہ میں زیادہ سے زیادہ ترقی ہو سکے۔ یہ منصوبہ بندی بین الاقوامی پیمانے پر ہو رہی ہے۔ لیکن ضرورت ایسی منصوبہ بندی کی ہے جسکا مقصد بہتر قسم کے انسان پیدا کرنا ہو، بہتر قسم کے معقولیت پسند انسان جو ایک معقول قسم کے معاشی نظام میں رہنا چاہتا ہو۔ اس مقصد کے حصول کے لئے تعلیم ایک مرتب اور منظم نظام اور علوم اجتماعی میں تحقیق کی منصوبہ بندی کی اشد ضرورت ہے کہ "انسان" کا صحیح مطالعہ ہو سکے۔ ایک ایسے وقت میں جب ہمیں بے شمار اجتماعی اور اقتصادی مسائل سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے اس طرح کے مطالعہ کی ضرورت کی اہمیت اور بھی واضح ہے۔

آج اور کل

جب چھلکتے ہیں زر و سیم کے گاتے ہوئے جام
ایک زہراب سا ماحول میں گھل جاتا ہے
کانپ اٹھتا ہے تہی دست جوانوں کا غرور
حسن جب ریشم و کمخواب میں تل جاتا ہے

ہم نے دیکھا ہے کہ افلاس کے صحراؤں میں
قافلے عظمتِ احساس کے رُک جاتے ہیں
بیکسی گرم نگاہوں کو جھلس دیتی ہے
دل کسی شعلۂ زرتاب سے پھنک جاتے ہیں

جن اصولوں سے عبارت ہے محبت کی اساس
ان اصولوں کو یہاں توڑ دیا جاتا ہے
اپنی منزل کے غلط کار تحفظ کے لئے
رہگذاروں میں دھوآں چھوڑ دیا جاتا ہے

میں نے جو راز زمانے سے چھپانا چاہا
تو نے آفاق پہ اس راز کا در کھول دیا
میری باہوں نے جو دیکھے تھے سنہرے سپنے
تو نے سونے کی ترازو میں انہیں تول دیا

آج افلاس نے کھائی ہے زر و سیم سے مات
لیکن اس میں ترے جلووں کا کوئی دوش نہیں
یہ تغیر اُسی ماحول کا پروردہ ہے
اپنی خود رنگ تباہی کا جسے ہوش نہیں

رہگذاروں کے دھندلکے تو ذرا چھٹ جائیں
اپنے تلووں سے یہ کانٹے بھی نکل جائیں گے
آج اور کل کی مسافت کو ذرا طے کر لیں
وقت کے ساتھ ارادے بھی بدل جائیں گے

قتیل شفائی

قارئینِ کرام سے التماس ہے کہ خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

اے، بی، اے حلیم

تعلیم میں حکومت کی ذمہ داری

تعلیم میں حکومت کی ذمہ داری کے مسئلہ کی جو نوعیت دورِ حاضر میں ہے اس کے متعلق کچھ کہنے سے قبل اس مسئلہ کے تاریخی پہلو پر تھوڑی سی روشنی ڈالنا نامناسب نہ ہوگا۔ اسلامی تاریخ کے دورِ اولین یعنی خلافت راشدہ کے زمانہ میں حکومت کی طرف سے قرآن پاک اور سنت کی تعلیم کا خاص انتظام تھا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں تعلیم قرآن اور فقہ کا سلسلہ بہت وسیع پیمانے پر قائم کیا۔ تمام صوبوں میں مکاتب قائم کئے اور بڑے بڑے شہروں میں صحابہ کرام کو بہ حیثیت معلم کے بھیجا۔ بعض حالات میں قرآن مجید کی تعلیم جبری قرار دی گئی مثلاً ابوسفیان اس کام پر مامور کئے گئے کہ بدوی قبائل میں دورہ کریں ہر شخص کا امتحان لیں اور جو شخص قرآن مجید صحت کے ساتھ نہ پڑھ سکے اسکو سزا دیں۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے عہد میں بھی یہ سلسلہ تعلیم کی اشاعت اور توسیع کا جاری رہا۔ روایت ہے کہ حضرت علیؓ نے طلباء قرآن کے لئے دو ہزار وظیفے مقرر فرمائے عہد بنی امیہ میں حکمرانوں کی زیادہ تر توجہ سلطنت کو وسیع سے وسیع تر کرنے اور حکومت کے نظم و نسق کو مستحکم کرنے پر صرف ہوتی تھی لیکن باوجود اپنے مشاغل اور اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے خلفائے بنی امیہ تعلیم کی اہمیت سے غافل نہ تھے خلفائے بنی عباس کا دور تعلیمی ترقی کے لحاظ سے دنیا کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ان کے پایہ تخت بغداد اور رجا بجا مختلف صوبوں میں مدارس اور مکاتب قائم تھے اور انہیں حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔ خلافت عباسیہ کے دور انحطاط میں بھی بغداد میں تیس بڑے بڑے مدارس موجود تھے جن میں سے بعض اپنے وسیع سلسلہ عمارات کے لحاظ سے ایک مستقل آبادی کی حیثیت رکھتے تھے۔

مسلم فرمانروایان اسپین کی تعلیمی خدمات خلفائے بنی عباس سے کم شاندار نہیں ہیں۔ اسپین کے اسلامی ادارے علم و فن کے مرکز اور علماء و فضلاء کے گہوارے تھے۔ نہ صرف دنیائے اسلام بلکہ دور دراز عیسائی ممالک سے طلبا آتے تھے اور ان کے مدرسین کے علم و فضل سے مستفید ہوتے تھے۔ یہ امر اس سلسلہ میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ حکومت وقت ان اداروں کے نظم و نسق اور درس و تدریس میں کسی طرح مخل نہیں ہوتی تھی اور انہیں نصاب تعلیم اور اندرونی انتظامات کے سلسلہ میں آزادی حاصل تھی۔ ہاں مورخین نے اتنا ضرور قلمبند کیا ہے کہ اگر کسی ادارے میں کسی قسم کی بدعنوانی پائی جاتی تھی مثلاً اگر کوئی معلم طلبا کو زد و کوب کرنے میں اعتدال سے بڑھ جاتا تھا تو محتسب مداخلت کر سکتا تھا۔

ہندوستان کے مسلم فرمانروا بھی محمود غزنوی اور محمد غوری کے زمانہ سے لیکر اورنگ زیب کے عہد تک اپنے تعلیمی فرائض سے غافل نہ رہے۔ اور اکثر و بیشتر نے تعلیم کی اشاعت اور علم و فن کی توسیع میں بیش بہا خدمات انجام دیں۔ سلاطین دہلی کے عہد میں صدر الصدور کے مختلف فرائض میں ایک فرض منصبی یہ بھی تھا کہ تعلیم کی اشاعت اور علوم و فنون کی ترقی کے اسباب مہیا کرے۔ وہ سلطان کی خدمت میں فضلاء اور کاملین فن کی سفارش کرتا تھا اور اس کی سفارش پر ان کے لئے وظائف مقرر کئے جاتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ان علماء کے توسط سے جو مختلف اداروں میں مدرسین اور مختلف مساجد میں خطابت کی خدمات انجام دیتے تھے۔ صدر الصدور ایک حد تک رائے عامہ اور اداروں کی پالیسی پر اثر انداز ہو سکتا تھا لیکن اس کا اثر اداروں کی داخلی آزادی میں مخل نہیں ہوتا تھا۔

ایک خصوصیت زمانہ قدیم اور قرون وسطی کے اسلامی اداروں کی خواہ وہ ایران کے ہوں یا توران کے عرب کے ہوں، یا عجم کے، یہ تھی کہ طلبا سے کسی قسم کی فیس نہیں لیجاتی تھی بلکہ کثیر تعداد میں طلباء کے قیام و طعام کا بھی انتظام حکومت یا اداروں کی طرف سے کیا جاتا تھا۔

عہد مغلیہ کے زوال اور برطانوی سامراج کے قیام کے بعد ہندوستان کے اسلامی اداروں کا بھی انحطاط شروع ہوا اور جب فارسی کے بجائے انگریزی کو حکومت کی زبان قرار دیا گیا تو یہ ادارے دم توڑ توڑ کر ختم ہو گئے اور ان کی جگہ پر انگریزی طرز کے کالج اور انگریزی طرز کی یونیورسٹیاں قائم ہوئیں۔ ان اداروں کو برطانوی حکومت ہند نے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے قائم کیا۔ ان کی تشکیل سرکاری مقرر کردہ کمیٹیوں کی رپورٹوں پر مبنی تھی اور ان کا نظام سرکاری اسناد پر قائم۔ ان کے نظام تعلیم، نظم و نسق، اور مالیات میں ایک عرصہ تک حکومت کو بہت دخل رہا۔ البتہ بیسویں صدی میں ان کے نظام میں ترمیم کی گئی اور سرکاری مداخلت کم ہوئی۔

دورِ حاضرہ میں دنیا کے مختلف ملکوں میں حکومت کی تعلیمی پالیسی کا انحصار بڑی حد تک حکومت کی نوعیت اور ساخت پر منحصر ہے ان ممالک میں جہاں حکومت آمرانہ طرز کی ہے خواہ وہ فسطائی ہو یا بالشوک نہ صرف تعلیمی پالیسی بلکہ اداروں کے نظم و نسق نصاب تعلیم اساتذہ کے تقرر وغیرہ پر حکومت پوری نگرانی رکھتی ہے تاکہ نئی نسلوں کی ذہنی تربیت خاص سیاسی اور اقتصادی عقائد کے مطابق ہو۔

اس کی بہترین مثال روس ہے جہاں سارا نظام تعلیم ابتدائی جماعتوں سے

لیکر یونیورسٹیوں تک حکومت کے تعلیمی محکمہ کے ہاتھ میں ہے جیسے تعلیمی کمی سیریٹ کہتے ہیں۔ شہری اور دیہی کتب خانوں کا قیام۔ تعلیم بذریعہ مراسلات۔ محکمہ تحقیق و تدقیق۔ فنی اور علمی انجمنوں اور کانفرنسوں کا انعقاد اور اس قسم کے اور کام بھی حکومت سے متعلق ہیں۔

ان ممالک میں جہاں جمہوری حکومت قائم ہے مثلاً برطانیہ فرانس اور امریکہ حکومت کا تعلق تعلیمی اداروں سے مختلف نوعیت رکھتا ہے اور حکومت ان کی آزادی میں مخل نہیں ہوتی ہے۔ ان ممالک میں جامعات ابتداءً علماء اور فضلا کے جد وجہد سے وجود میں آئیں اور بعد میں ان کو حکومت کی امداد اور سرپرستی حاصل ہوئی۔ اسی طرح ابتدائی اور ثانوی ادارے بھی پبلک کی کوشش سے قائم ہوئے۔ برطانیہ میں ایک بڑی تعداد ایسے اداروں کی ہے جنہیں کلیسا یا کونٹی کونسل یا افراد چلاتے ہیں اور جو حکومت کی امداد کے محتاج نہیں۔ لیکن تقریباً ستر سال سے برطانیہ میں یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ ہر بچہ کی ابتدائی تعلیم کی ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے اور اب ایک گروہ ماہرین فن تعلیم کا اس بات کا مطالبہ کر رہا ہے کہ ثانوی تعلیم بھی ہر لڑکے اور لڑکی کے لئے اس کی صلاحیت کے لحاظ سے لازمی قرار دی جائے اور اس مزید مالی بار کو حکومت برداشت کرے۔ اس وقت بھی حکومت کی طرف سے یونیورسٹیوں اور ثانوی اسکولوں کو بہت کافی امداد دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ حکومت وقتاً فوقتاً ماہرین تعلیم کی کمیٹیاں مختلف مسائل پر غور کرنے کے لئے مقرر کرتی ہے اور ان کی مرتب کردہ رپورٹوں کو پبلک تک پہنچانے کی کوشش کرتی ہے۔

امریکہ میں قومی تعلیم کی ذمہ داری اسٹیٹس یعنی ریاستوں کی حکومتوں پر عائد ہوتی ہے لیکن پرائیوٹ اسکول کالج اور یونیورسٹیاں بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ اور ان کے اخراجات کے لئے انجمنوں یا افراد کی فیاضی سے بڑے بڑے اوقاف قائم کر دئے گئے ہیں۔ اسوقت ۵۴۳ یونیورسٹیاں ریاستی حکومتوں کی طرف سے قائم ہیں اور ۱۰۰ پبلک کی طرف سے۔

جبری تعلیم بعض ریاستوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کو بارہ سال کی عمر تک دیجاتی ہے۔ بعضوں میں ۱۴، ۱۵، ۱۶ سال تک اور بعضوں میں ۱۷ سال تک کی عمر تک۔ حال تک وفاقی حکومت تعلیم کی ذمہ دار نہ تھی لیکن اس پالیسی میں گذشتہ جنگِ عظیم کے بعد ایک بڑا تغیر پیدا ہوا۔ وفاقی مقننہ نے ان طلبا کی تعلیم کے لئے جو جنگ میں کسی نہ کسی حیثیت سے شریک رہے ایک بڑی رقم منظور کی ہے جو کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تقسیم کر دی گئی ہے اور جس سے ۱۹۳۶ء میں ۲۶۰۰۰۰ طلباء کے لئے مالی سہولتیں بہم پہنچائی گئیں۔ قرین قیاس ہے کہ یہ ایک نئی پالیسی کی ابتدا ہے اور آئندہ چل کر تعلیم کے لئے مالی امداد بہم پہنچانا وفاقی حکومت کے فرائض میں شمار کیا جائے گا۔

اب یہ سوال پیش ہوتا ہے کہ مملکت پاکستان میں تعلیم میں حکومت کی کیا ذمہ داری ہونی چاہئیے۔ اس بحث کی آغاز اگر ابتدائی مدارج سے کی جائے تو بہتر ہوگا۔ جہاں تک ابتدائی تعلیم کا تعلق ہے کسی کو اختلاف نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ ابتدائی تعلیم جبری اور مفت ہونا چاہئیے اور اس تعلیم کو جاری کرنے کی ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے لیکن اگر ہم دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کی صف میں کھڑا ہونا چاہتے ہیں اور ان کے دوش بدوش آگے بڑھنا چاہتے ہیں تو ہم اسپر اکتفا نہیں کر سکتے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہر لڑکے اور لڑکی کے لئے اس کی صلاحیت کے لحاظ سے ثانوی تعلیم کا انتظام کریں خواہ وہ علمی ہو یا صنعتی اور اس ثانوی تعلیم کو رواج دینے اور کامیاب بنانے کی ذمہ داری بھی بڑی حد تک حکومت پر ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ہمیں پبلک کو بھی بیدار کرنا چاہئیے۔ قوم کی تعلیم کی ذمہ داری سے وہ بری نہیں ہو سکتی۔ دولتمند افراد اور خوشحال طبقہ درمیانی کا یہ فرض ہے کہ وہ تعلیمی انجمنیں بنائیں اور قومی ضروریات یا مقامی ضروریات کے لحاظ سے ابتدائی اور ثانوی ادارے قائم کریں۔ ہمارے میونسپل بورڈ اور بلدیہ تعلیم کی اہمیت کو پوری طرح محسوس نہیں کرتے ان کو بھی اپنے تعلیمی فرائض کو انجام دینا چاہئیے۔ جہاں تک کہ اعلیٰ تعلیم کا تعلق ہے موجودہ حالات متقاضی ہیں کہ صنعتی اداروں اور یونیورسٹیوں کے قیام اور ان کی ترقی میں پہل حکومت کی طرف سے کی جائے لیکن اس میدان میں بھی پبلک اپنے فرائض سے غافل نہیں رہ سکتی۔ عوام کی منظم کوششیں عظیم الشان نتائج پیدا کر سکتی ہیں۔ تعلیم کے سلسلہ میں ہمارا سب سے بڑا کارنامہ دورِ حاضرہ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہے جس کی ملکیت آج تقریباً چار کروڑ روپے کی ہے ابھی چند سال ہوئے ہیں کہ اراکین یونیورسٹی نے صرف اساتذہ اور طلباء کی کوشش سے تقریباً پچاس لاکھ روپے میڈیکل کالج کے لئے فراہم کر لئے۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ پاکستان کے رہنے والے پاکستان کی حکومت کا ہاتھ تعلیم کے سلسلہ میں نہ بٹائیں۔ جہاں حکومت اپنی ذمہ داری کو فراموش نہیں کر سکتی پبلک کو بھی اپنی کوشش سے باز نہ آنا چاہئیے۔

تربیت

زندگی کچھ اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے
زندگی سوزِ جگر ہے علم ہے سوزِ دماغ
علم میں دولت بھی ہے قدرت بھی ہے لذت بھی ہے
ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ!
اہلِ دانش عام ہیں کم یاب ہیں اہلِ نظر
کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ!
شیخ مکتب کے طریقوں سے کشادِ دل کہاں
کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ!

حجاب امتیاز علی

پنجرہ

افرادِ تمثیل

دادا ابا ———
نجم اور شکیل ——— ان کے پوتے
زرین ——— پوتی
فرخ ——— نجم کا بچہ (عمر ۵ سال)
بیگم نجم ——— نجم کی بیوی
اک فوجی دوست ———

سٹیج ایک درمیانی دیوار کے ذریعے دو حصوں میں تقسیم ہے۔ چنانچہ دو کمرے پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں۔ ان میں سے ایک ذرا چھوٹا ہال ہے جس میں ایک طرف بالاخانے کو زینہ جاتا ہے اور سامنے کی دیوار میں باغ کی طرف کا دروازہ ہے۔ اس ہال کا دوسرا دروازہ پہلو والے کمرۂ ملاقات میں کھلتا ہے۔ ہال میں اک تپائی دو تنکوں کی کرسیوں اور اک آئینہ دار ہیٹ اسٹینڈ کے سوا اور کچھ نہیں۔

اس کے پہلو کا کمرہ ملاقاتی کمرہ ہے۔ اس میں باغ کی طرف ایک لمبی دریچی ہے جس میں سلاخیں لگی ہیں۔ بیچ دیوار میں ایک گھڑیال جس میں سات بج رہے ہیں۔

دائیں طرف ایک صوفہ اور گدوں والی کرسی۔ بائیں طرف ذرا اونچی گدوں والی آرام کرسی دو تپائیاں جن پر گلدان۔ درمیانی دروازے کے برابر دیوار میں آتش دان جس پر نجم کی فوجی لباس میں اک تصویر۔ ایک پیانو جس پر ایک بڑا گلدان اور دریچے میں طوطے کا ایک خوبصورت سلاخوں والا پنجرہ۔

اختتامِ موسمِ خزاں کی ایک گہرے زرد رنگ کی شام۔ باغ کا لمبا دریچہ کھلا ہوا ہے جس میں سے باغ کا کچھ حصہ نظر آ رہا ہے کچھ درخت، پھول، آسمان کا اک کونا اور باغ کا صدر دروازہ۔

پردہ اٹھتے پر ہال خالی ہے۔ مگر اس کے پہلو کے کمرۂ ملاقات میں زرین اک کرسی پر چڑھی ہوئی ہال اور ملاقاتی کمرے کے درمیانی دروازے پر پردہ ٹانگتی نظر آتی ہے۔ لباس معمولی ہے مگر بال سنوارے ہوئے ہیں۔ وہ اک بیس سالہ دلفریب لڑکی ہے۔

دادا ابا اونچی گدوں والی آرام کرسی پر نیم دراز ٹکٹکی باندھ کر اپنی سیدھ میں دیکھ رہے ہیں جیسے عام اندھوں کی عادت ہوتی ہے۔

فرخ گھونگریالے بالوں والا پیارا سا بچہ، دریچے کے پاس گھٹنے ٹیکے بڑے انہماک سے طوطے کو دانا کھلا رہا ہے۔

دادا ابا (ایک گہرا سانس لے کر): "اب کیا بجا ہے؟"

زرین: "سات دادا ابا"

دادا ابا (اکتا کر): "یوں معلوم ہوتا ہے آج آفتاب کبھی غروب نہیں ہونے کا۔ میری اندھی آنکھوں کو بھی اس کی تیز روشنی کا احساس ہے"

زرین (کرسی سے نیچے اتر کر گلدان سجاتے ہوئے): "بھیا نجم کے پہونچنے میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اور باقی ہے دادا ابا بشرطیکہ ———"

فرخ: "مٹھو مٹھو ——— آج اباجان آ رہے ہیں ——— اباجان ———"

دادا ابا: "شور نہ کرو بیٹا۔ ہاں تم کیا کہہ رہی تھیں بیٹی؟"

زرین (گلدانوں میں پانی ڈال رہی ہے) "بشرطیکہ آج ٹرین دیر میں نہ آئے"

دادا ابا: "دیر میں ———؟"

زرین: "ان دنوں ریلیں اکثر دیر میں آتی ہیں"

دادا ابا: (اداس) "بعض لوگوں کی زندگی میں اہم چیزیں وقت کے بعد ہی آتی ہیں بیٹی۔ کیا شکیل اسٹیشن چلے گئے؟"

زرین: "ابھی سے؟"

دادا ابا۔ (بے چین ہو کر): "چلا ہی جاتا تو اچھا تھا ——— بجا کیا ہے؟"

زرین۔ (ہنس کر): "ابھی تو بتایا دادا ابا ——— سات بج کر اس وقت تین منٹ ہوئے ہیں"

دادا ابا: "دیر نہ ہو جائے کہیں تم کیا کر رہی ہو؟"

زرین۔ (قینچی سے پھول کاٹتے ہوئے): "پھول ——— گلدانوں میں سجا رہی ہوں"

دادا ابا: "تو کارنیشن کے پھول لگانا نہ بھولنا بیٹی نجم کو بہت پسند ہیں"

زرین: "خزاں میں کارنیشن کہاں سے آیا دادا ابا (مسکرا کر) چار سال بعد بھیا نجم جونہی کمرے میں داخل ہوں گے ——— انہیں یوں معلوم ہو گا کہ گھر کی اک اک چیز انہیں خوش آمدید کہہ رہی ہے۔ یہ پھول ——— یہ تصویریں ——— یہ ———"

فرخ (یکلخت گردن اٹھا کر): "اور یہ طوطا ———"

زرین: "اور یہ کھلے ہوئے دریچے ———"

فرخ: "تو پھوپی! یہ ہال کا دروازہ بھی کھول دیجئے"

زرین: "نہیں ——— یہ بھرا ہوا ہو گا۔ اس پر میں نے [illegible] پردہ ٹانگ دیا ہے۔

پردے میں نے ترموسنگ کے ٹانگے ہیں دادا ابا — تاکہ خزاں کی زردی کی شدت انہیں گھر پہنچتے ہی مضمحل نہ کر دے۔ اور —"

دادا ابا :۔ "اور میرے بستر کی چادر تم نے بدل دی ؟"

زرین :۔ "ابھی نہیں"

دادا ابا :۔ "جاؤ بیٹی۔ جلدی کرو۔ اور میرے سرہانے الماری میں دوا کی جو خالی شیشیاں رکھی ہیں انہیں بھی نکال دو۔"

زرین ۔ (کمرے پر تنقیدی نظر ڈالتی ہے) "بس کمرہ ٹھیک ہو گیا۔ اب مجھے لباس تبدیل کرنا رہ گیا ہے۔"

(زرین ہال کمرے اور ملاقاتی کمرے کا درمیانی دروازہ کھول کر ہال میں سے گزرتی ہوئی بالاخانے پر چلی جاتی ہے۔

دادا ابا (زرین کو موجود سمجھ کر) :۔ "میں نے کہا خالی شیشیاں ضرور نکال دینا۔"

فرخ :۔ "ابا جان آتے ہی آپ کے کمرے میں تھوڑا ہی جائیں گے؟"

دادا ابا (بغیر سنے) :۔ "فرخ! تمہاری امی کہاں ہیں ؟"

فرخ :۔ "مجھے معلوم نہیں۔"

دادا ابا :۔ "میں انہیں یہ کہنا چاہتا تھا کہ آج رات کے کھانے پر بھنی ہوئی مرغابی اور میٹھے میں بادام کے لوز ہونے چاہیئے تھے۔ تمہارے ابا کو یہ دونوں چیزیں بہت پسند ہیں۔ میدان جنگ میں یہ گھر کی نعمتیں کہاں نصیب ہوتی ہیں! چار سال گزر گئے بیچارہ لڑکا —"

فرخ :۔ "امی جان تبدیل لباس کر رہی ہیں میں ابھی جا کر بادام کے لوز کے لئے کہہ دوں گا۔"

دادا ابا :۔ "نہ صرف بادام کے لوز — بلکہ بھنی ہوئی مرغابیاں بھی —"

فرخ :۔ "وہ نہیں مجھے پسند۔"

دادا :۔ "تمہارے ابا کو جو پسند ہیں (یکلخت) بیٹے! ذرا ادھر آنا۔ دیکھنا میری قمیص کا گریبان! کہیں سے پھٹا ہوا تو نہیں ؟"

فرخ (وہیں بیٹھے بیٹھے ہنستا ہے) :۔ "پھٹا ہوا ہو تو کیا ہے ؟ ابا جان آتے ہی ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کو تھوڑا ہی دیکھیں گے ؟"

دادا :۔ "پر تم وہاں بیٹھے ہوئے کر کیا رہے ہو ؟"

فرخ :۔ "میں طوطے کو دانہ کھلا رہا ہوں۔ بڑا ضروری کام ہے۔ دانہ نہ کھلاؤں گا تو یہ مر جائے گا۔"

دادا (گہری سانس لے کر) :۔ "وہ صرف دانہ نہیں ہے بیٹا۔ جو طوطے کو زندہ اور خوش رکھتا ہے۔"

فرخ (حیران ہو کر) :۔ "تو اور کیا چیز ہے دادا ابا ؟"

دادا (گہری سانس) :۔ "وہ تمہاری محبت اور توجہ بھی ہے جو اسے زندہ رکھنے میں مدد دیتی ہے۔"

فرخ (اٹھتا اور دریچے سے دادا کی طرف جاتا ہے) "اگر میں اسے صرف دانہ دوں اور محبت اور توجہ نہ دوں تو طوطا مر جائے گا دادا ابا ؟"

دادا (مغموم لہجے میں) "بہت جلد —"

(وقفہ)

فرخ (اب تک حیران) :۔ "عجیب بات سنائی دادا ابا۔"

دادا :۔ "یہ بتاؤ، اپنے طوطے کو آج تم نے نہلایا بھی ؟ اس کا پنجرہ صاف کر دیا ؟ آج تمہارے ابا آ رہے ہیں۔"

فرخ :۔ "میرے طوطے کو وہ کہاں دیکھیں گے۔"

دادا :۔ "کیوں۔ ؟"

فرخ :۔ "یہ نہ بولتا ہے۔ نہ ناچتا ہے۔ ایک ہی جگہ بیٹھا رہتا ہے اسے کون دلچسپی سے دیکھے ؟ اب وہ بوڑھا ہو گیا ہے۔"

دادا (دلگیر) :۔ "بوڑھا ہو گیا ہے — تو یہ غلطی اس کی تو نہیں بیٹا۔ مگر سچ کہتے ہو۔ ایسے طوطے کو کون دیکھے!"

[وقفہ جس میں فرخ پھر طوطے کے پنجرے کے پاس چلا جاتا ہے۔ دادا ابا چپ چاپ ہیں۔

[پہلو کے کمرے یعنی ہال میں زرین اور بیگم نجم بالاخانے سے اترتی نظر آتی ہیں۔ دونوں نند بھاوجیں پُر تکلف لباس میں ہیں۔ دونوں کے بال نہایت خوبصورتی سے آراستہ ہیں]

بیگم نجم (ہال میں اتر کر) تمہارا یہ لباس مجھے بہت دلفریب معلوم ہوتا ہے نندی۔ اچھا کیا کہ خزاں کی اس زرد شام میں سبز لباس پہن لیا۔ مگر تم نے اس لباس میں میں کیسی لگتی ہوں ؟

(ہیٹ اسٹینڈ کے آئینے میں چہرہ دیکھتی ہے)

زرین :۔ "بھابی جان گلابی لباس میں آپ واقعی ایک شگفتہ گلاب کا پھول معلوم ہوتی ہیں۔"

بیگم نجم :۔ "تمہاری بھی باتیں بس ایسی ہی ہوتی ہیں۔"

زرین :۔ "مبالغہ نہیں کرتی۔"

[بیگم نجم ہال کے چاروں طرف نظر ڈالتی اور تنقید سے دیکھتی ہے کہ کوئی چیز مزید توجہ کی محتاج تو نہیں]

زرین :۔" ملاقاتی کمرہ چل کر دیکھئے۔ میں نے پھولوں سے اسے گلستان بنا دیا ہے"

(ملاقاتی کمرے سے دادا کی کھانسی کی آواز آتی ہے)

بیگم نجم (ملاقاتی کمرے کے دروازے تک پہونچی اور کھانسی کی آواز سن کر یکلخت رُک جاتی ہے) ایں! کون بیٹھا ہے وہاں ؟"

زرین :۔" دادا ابا ؟"

بیگم نجم :۔" کیوں ؟"

زرین :۔" بھائی نجم کی آمد کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں کہتے تھے ملاقاتی کمرے میں چل کر بیٹھیں گے "

بیگم نجم :۔" اور تم نے بٹھا دیا ؟"

زرین :۔" کیا کرتی۔ چار بجے سے ضد کر رہے تھے !"

بیگم نجم :۔" نہیں نہیں، مجھے ان کے بیٹھنے پر اعتراض تھوڑا ہی ہے ؟ اعتراض ہے تو ان کے سازوسامان پر۔ دوا کی بوتل، ہاتھ کی لکڑی، عینک، رومال اور خدا جانے کیا کیا۔ چلو اچھا ہی ہوا ہے "

[درمیانی دروازہ کھول کر دونوں ملاقاتی کمرے میں داخل ہوتی ہیں]

بیگم نجم (خوش ہو کر ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے) :۔" واقعی کمرہ تم نے خوب سجایا زرین! یہاں آکر خزاں کا احساس مطلق نہیں ہوتا! سب پھول ہی پھول! آغازِ بہار کی شام معلوم ہوتی ہے !"

زرین :۔" اور بھائی جان ــــ ادھر دیکھئے آتش دان پر۔ بھائی جان کی بڑی تصویر"

بیگم نجم :۔" خوب خوب ــــ طوطے کا پنجرہ یہاں سے نکال دو فرخ! مجھے ملاقاتی کمرے میں غیر ضروری چیزیں دیکھ کر اُلجھن ہوتی ہے "

فرخ [مستقل مزاجی سے] نہیں امی! اسے آپ نہیں چھو سکتیں۔ یہ یہیں رہے گا"

دادا ابا (یکلخت چونک کر) :۔" کون ؟ بیٹی نہمیدہ ؟ ــــ میں نے کہا آج کھانے پر کیا پکوایا بیٹی ؟ "

بیگم نجم :۔" مرغ مسلّم"

دادا :۔" بھنی ہوئی مرغابیاں نہ پکوائیں ؟ "

بیگم نجم :۔" خزاں کے موسم میں مرغابی ملتی کہاں ہے ؟"

فرخ :۔" مل جاتی ہے امی۔ کل خالہ اشرف کے ہاں نہ پکی تھیں ؟ "

[ذرا سا وقفہ]

دادا :۔" اب کیا بجا ہوگا ؟ شکیل سٹیشن چلے گئے ؟ "

[شکیل ہال سے گذرتے ہوئے درمیانی دروازے سے کمرۂ ملاقات میں داخل ہوتا ہے چوبیس پچیس سال کا خوش رو نوجوان ہلکے نیلے رنگ کے بُش کوٹ میں ہے ہاتھ میں اک تار ہے]

شکیل :۔" ارے آج یہاں ہیں دادا ابا ؟ آداب دادا ابا! ابھی ابھی یہ تار آیا ہے بھائی جان کا "

[زرین اور بیگم نجم اس کی طرف بڑھتے ہیں دادا ابا دہشت زدہ ہو جاتے ہیں]

بیگم نجم :۔" تار ؟"

دادا ابا :۔" الٰہی خیر! کس کا ہے بیٹے !"

[زرین اور بیگم نجم کھڑکی کی روشنی میں بہ یک وقت تار پڑھ رہے ہیں]

دادا ابا (گھبرا کر) :۔" کوئی بتاتا کیوں نہیں آخر ؟ کس کا تار ہے ؟ "

شکیل :۔" بھائی جان نے معلوم ہوتا ہے کل تار دیا تھا وہ آج پہونچا۔ "

دادا ابا :۔" لکھا کیا ہے ؟ "

شکیل :۔ لکھا ہے کہ ان کے ساتھ ان کے ایک فوجی دوست بھی آ رہے ہیں"

دادا (مطمئن) " شکر ہے"

بیگم نجم (دریچے سے ہٹ کر قریب آتے ہوئے) :۔" آپ خواہ مخواہ پریشان ہو جاتے ہیں دادا ابا۔ بات ہی کیا تھی !"

زرین :۔" جب تو بھابی جان ایک کمرہ مہمان کے لئے ٹھیک کرنا ہوگا "

بیگم نجم :۔" مگر کون سا کمرہ دیں انہیں ؟ "

شکیل :۔" دادا ابا کا دے دیجئے دو ایک دن کے لئے ہی تو آ رہے ہیں "

فرخ (پنجرے کے پاس بیٹھے بیٹھے مڑ کر) :۔" واہ! تو پھر دادا ابا کہاں رہیں گے ؟ "

شکیل :۔" دو ایک دن کے لئے میں انہیں اپنے کمرے میں اٹھا لے جاؤں گا"

دادا ابا (بادلِ ناخواستہ) :۔" ہاں ہاں کیا مضائقہ ہے "

بیگم نجم :۔" نہیں نہیں۔ وہ ٹھیک نہیں۔ دن کے وقت بھی وہاں کچھ اندھیرا ہی رہتا ہے فرخ کا کمرہ دے دیا جائے گا۔ زیادہ روشن اور خوشگوار ہے "

دادا ابا :۔" تو بیٹی فہمیدہ۔ اب تو کھانے میں دو ایک چیزوں کا اضافہ ضرور ہونا چاہیئے "

بیگم نجم :۔" مجھے ہر بات کا خیال ہے دادا ابا۔ آپ کیوں خواہ مخواہ پریشان ہوتے رہتے ہیں ؟ آپ کے بغیر کہے چیزیں تیار ہو جاتی ہیں "

فرخ :۔" مگر امی بادام کے ورق تو تیار نہیں ہوئے تھے۔ دادا ابا کے کہنے پر تیار ہو رہے ہیں "

ــــــــــــــــ

سلے :۔ دادا ابا غنودگی کے عالم میں ہیں

دادا: "ہوں ـــــ بجا کیا ہوگا؟ شکیل بیٹے اسٹیشن کب جاؤ گے؟"

شکیل (ہنس کر): "ابھی تو ساڑھے سات ہی بجے ہیں دادا ابا۔"

زرین [کھڑکی میں سے باہر دیکھتی ہے]: "دور کی پہاڑیوں پر آفتابی شعاعیں چمک رہی ہیں۔"

بیگم نجم [دروازوں کے پردے ٹھیک کرتے ہوئے] ہاں گرم خزاؤں میں آفتاب دیر میں غروب ہوتا ہے۔"

دادا ابا: "آج یہ سورج کبھی ڈوبے گا بھی! میری آنکھیں ہوتیں، تو چار ہی بجے سے سٹیشن چل دیتا۔"

شکیل: "بھائی جان کے آنے میں ابھی دیر ہے، اور گھر پہنچتے پہنچتے اور بھی زیادہ وقت لگ جائے گا۔"

بیگم نجم: "آپ کو تو ابھی تھوڑی دیر اپنے کمرے میں آرام کرنا چاہیئے۔"

شکیل: "یہ آج آپ کیسے گئے دادا جان؟"

دادا [لمبی سانس]: "کشش عجب چیز ہوتی ہے بیٹا۔ نجم کے آنے کی رات ہے نا۔ ہمت کر کے یہاں آہی گیا۔"

شکیل: "یہ آپ نے خوب کیا دادا جان [فرخ کی طرف مڑ کر] لڑکے! تو وہاں بیٹھا کیا کر رہا ہے؟ بوڑھے طوطے سے کھیل رہا ہے؟"

فرخ: "بوڑھا ہونا اس کی غلطی تو نہیں چچا جان۔ کیوں دادا ابا؟ یہی کہا تھا نا آپ نے؟"

زرین [فرطِ مسرت سے بے خود]: "چار سال بعد بھیا نجم کو دیکھنا! اُف خوشی کے مارے میرے ہاتھ پاؤں سرد ہو رہے ہیں۔"

فرخ: "نہ جانے ابا جان ہم سب کے لئے لائیں گے کیا! کیوں امی! آپ کو کتنی خوشی ہو اگر وہ آپ کے لئے چینی ریشم کا ایک رنگین تھان لے آئیں؟"

بیگم نجم: "بے انتہا۔"

فرخ: "اور پھوپی زرین! ابا جان کو آپ کے لئے کیا لانا چاہیئے؟"

زرین [خوشی کی وارفتگی میں]: "کاش وہ میرے لئے سونے کی ایک پتلی سی زنجیر لے آئیں۔ فوراً گلے میں پہن لوں گی۔"

فرخ: "اور چچا شکیل ـــ آپ کے لئے؟"

شکیل: "میں اپنی اس پرانی گھڑی سے اکتا چکا ہوں۔ میرے لئے وہ ایک گھڑی لیتے آئیں تو بڑا خوش ہوں گا۔"

فرخ [کیلنٹ مڑ کر]: "ارے دادا ابا! آپ سے تو میں نے پوچھا ہی نہیں ـــ بھلا بوجھئے ـــ ابا جان آپ کے لئے کیا تحفہ لائیں گے؟"

دادا: "میری اب وہ عمر نہیں رہی بیٹے، جب انسان تحفوں کو خوش آمدید کہتا ہے۔ بہار گذر چکی ہے۔"

فرخ۔ [حیران ہو کر]: "تو کیا خزاں کے موسم میں تحفے نہیں دئے جاتے دادا جان؟"

دادا: "نہیں ـــ"

فرخ: "عجیب بات ہے۔"

زرین: "تحفوں کے سلسلے میں میری تو یہ حالت ہے کہ اگر کوئی جانی دشمن بھی مجھے کوئی تحفہ دے ـــ مثلاً فرانسیسی عطر کی کوئی شیشی ـــ یا ریشمی دستی بٹوہ ـــ تو میں اس کی خطائیں معاف کر دوں اور دوست بن جاؤں۔"

دادا: "بہار میں یونہی ہوتا ہے بیٹی۔"

فرخ: "دادا ابا۔ آپ کو خزاں اور بہار کا اتنا خیال کیوں لگا رہتا ہے؟"

دادا: "کیونکہ دونوں دیکھ چکا ہوں [توقف] تم نے میرے بستر کی چادر بدل دی؟"

زرین: "بالکل بھول گئی۔ کپڑے بدلنے چلی گئی تھی۔ اب بدلے دیتی ہوں۔"

دادا: "اور وہ دوا کی خالی شیشیاں بھی ـــ کاش! آج ایک شام کے لئے مجھے آنکھیں مل جاتیں ـــ! اب بجا کیا ہے؟"

بیگم نجم: "میرا خیال ہے شکیل، تم کو اسٹیشن چلا ہی جانا چاہیئے۔ دادا ابا ہر کام وقت سے بہت پہلے چاہتے ہیں۔"

دادا [معذرت کے لہجے میں]: "بعد کی نسبت پہلے ہونا بہتر ہوتا ہے بیٹی؟"

شکیل: "درست فرمایا دادا جان۔ تو میں جاتا ہوں میرا خیال ہے آپ کو کچھ دیر آرام فرمانا چاہیئے۔ آپ کے اعصاب مضمحل ہیں۔"

دادا: "ہاں سدھارو۔ خدا حافظ۔ نجم کے ساتھ جلدی لوٹنا۔"

شکیل درمیانی دروازہ کھول کر دالان میں جاتا ہے اور باغ کے زینے سے نیچے اتر جاتا ہے۔

دادا: "فہمیدہ بیٹی گھر کا ہر کمرہ صاف ہو گیا نا؟"

بیگم نجم: "ایسے میلے تھے کہاں؟"

دادا: "تاہم ـــ مسافر جب گھر میں داخل ہو تو اسے یوں محسوس ہونا چاہیئے کہ ہر چیز آرام دہ اور صاف ستھری ہے۔ ہاں نجم کو کھانا تیز گرم ملنا چاہیئے بیٹی۔ نوکروں کو ہدایت کر دی؟"

بیگم نجم: "کر دی۔"

بیگم نجم پیانو کی طرف جاتی اور اسے کھول کر بیٹھ جاتی ہے اور ہلکے ہلکے بجانے لگتی ہے۔

دادا :- "نجم کے لئے سگار منگوا لئے بیٹی فہیدہ ؟"

بیگم نجم [سجانا بند کرتی ہے] :- "توبہ ——— آپ تو خواہ مخواہ پریشان ہوتے ہیں ؟"

دادا - [دل شکستہ] :- "اور دوسروں کو بھی پریشان کرتا ہوں ——— سچ کہتی ہو مگر میری عمر اس پر آ گئی ہیں ———"

زرین [جلدی سے] :- "فہیدہ بھابی کا یہ مطلب یقیناً نہیں تھا دادا ابا "

خاموشی

[دادا ابا اپنی آرام کرسی پر آنکھیں بند کئے نیم دراز ہو جاتے ہیں زرین باغ کی کھڑکی میں کھڑی راستہ دیکھ رہی ہے ۔ فرخ طوطے کے پنجرے کے پاس دیوار سے ٹیک لگائے قالین پر بیٹھا کوئی کتاب دیکھ رہا ہے اور بیگم نجم ہلکے ہلکے پیانو بجا رہی ہیں]

بیگم نجم [آہستہ دادا کی طرف دیکھتی اور کرسی سے اٹھ کر دبے پاؤں زرین کی طرف کھڑکی میں جاتی ہے] :- "شکر ہے سو گئے "

زرین :- "انہیں آرام کی ضرورت تھی ۔"

دادا (غنودگی سے چونک کر) :- "میں سویا تو نہیں ——— نجم کی راہ دیکھ رہا ہوں ۔ بہت دیر ہو گئی اب بجا کیا ہے ؟"

زرین :- "آپ اپنا اوولٹین پی لیجئے وقت ہو گیا ہے "

دادا :- "میں آج اپنا اوولٹین تم سب کے کھانے کے ساتھ پیونگا "

بیگم نجم :- "کیا معلوم ہم کھانا کب کھائیں اور کہاں کھائیں ؟ رات گرم ہوگی ۔ نجم شاید کھانا باغیچے میں کھانا پسند کریں "

زرین :- "اور آپ کا وہاں پہونچنا مشکل ہوگا "

فرخ (کتاب سے نظر ہٹا کر) :- "تو کھانا یہیں کیوں نہ منگا لیا جائے تاکہ دادا جان بھی شریک ہو سکیں ؟"

دادا [کچھ دیر اس سوال کے جواب کا انتظار کرکے مایوسانہ لہجے میں] :- "نہیں ——— اس سے شاید تم سب کو تکلیف ہو ——— خیر تو میں اوولٹین یہیں پیئے لیتا ہوں "

بیگم نجم :- "دادا ابا آپ اپنے کمرے میں نہ لے چلا سکے جائیں اب ؟"

دادا [متنفر ہو کر] :- "کیوں ؟"

زرین :- "بھابی محض آپ کی تکان کے خیال سے کہہ رہی ہیں"

دادا (خفگی سے) :- "وہاں مجھے نیند آ جائے گی ؟ آج نجم کے آنے کی رات ہے ۔ میں یہیں بیٹھ کر انتظار کروں گا ۔ ورنہ نجم کیا سمجھیں ؟ چار سال بعد آ رہے ہیں "

[کھڑکی میں سے باغ کا صدر دروازہ کھلتا ہوا نظر آتا ہے]

فرخ (یکلخت کھڑا ہو کر اور چیخ کر) :- "امی ۔ امی جان ! وہ دروازہ کھل گیا ۔ ماما جان کی گاڑی اندر آ گئی "

[لپٹ کے بھاگتا ہے پھر باہر نکل جاتا ہے]

دادا (کرسی پر بے قابو ہو جاتے ہیں) :- "اللہ تیرا شکر ہے ۔ نجم آ گیا ———"

[اٹھنے کی کوشش کرتے ہیں]

زرین :- "نہیں نہیں ——— اٹھنے کی کیا ضرورت ہے ۔ ——— دادا جان ——— سامنے تپائیاں کرسیاں رکھی ہیں ۔ بھیا نجم ابھی یہیں آ جائیں گے ——— آئیے بھابی جان ——— ہم ہال میں جائیں ———"

دادا :- "نہیں ——— نجم کو سیدھے یہیں آنے دو "

بیگم نجم (ہال کی طرف جاتے جاتے) :- "ان کے ساتھ ایک مہمان بھی ہیں "

دادا (بے چین) :- "تو کیا مضائقہ ہے ؟"

(مگر کسی نے ان کا آخری جملہ سنا نہیں دونوں درمیانی دروازے کا پردہ ہٹا کر ہال میں چلی آتی ہیں ۔ فرط شوق سے بے تاب ہو کر دونوں ہال کے اس دروازے کے پاس جا کھڑی ہوئی ہیں جو باغ کی طرف کھلتا ہے ۔ دروازے کے باہر اسباب کے اترنے اور لوگوں کے بولنے کی آواز پھر یکلخت سب سے پہلے نجم فوجی وردی میں ہال میں فرخ کو گود میں لئے داخل ہوتا ہے ۔ خوبصورت وجیہہ اور گلابی رنگ کا نوجوان ہے)

زرین :- "بھائی جان "

بیگم نجم :- "نجم پیارے !"

نجم فرخ کو نیچے اتار کر دونوں کو اپنے دائیں بائیں پہلو میں لے لیتا ہے ۔

نجم :- "چار سال بعد اپنے پیاروں کو دیکھنا ——— فہیدہ پیاری ! تم بالکل ایسی ہی دلفریب اور نوخیز ہو جیسے چار سال پہلے تھیں بلکہ زیادہ ——— زرین پیاری ——— تم تو اب اچھی خاصی عورت بن گئی ہو ۔ ارے میرے فرخ ! ننھے سے چڑے ! اتنا بڑا ہو گیا ؟ جب شکیل نے بتایا تو مجھے یقین نہ آتا تھا کہ فرخ اتنا بڑا ہو گیا !"

(ملاقاتی کمرے میں سوائے دادا ابا کے کوئی نہیں ۔ وہ بے چین ہو کر اٹھنے کی کوشش کرتے ہیں مگر ہاتھ کی لکڑی نہ ملنے کی وجہ سے مایوس و مجبور ہو کر بیٹھ جاتے اور ہال سے آنے والی آوازوں کو چپ چاپ سنتے رہتے ہیں)

بیگم نجم :- "نجمی ! انہیں کیا اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ چار سال کتنے اداس گذرے ! میں تو صبح سے شام تک اخبار اور ریڈیو پر جنگ کی ہولناک خبریں سن سن کر نیم جان ہوئی جاتی تھی ۔

آنکھوں پر رومال رکھ لیتی ہے
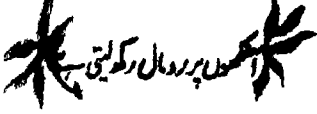
زرین: "فوجی زندگی ہنگامے کی ہوتی ہے آپ کا دل تو وہاں لگا رہا ہوگا مگر ہم لوگ یہاں ——"

(آنکھوں پر رومال رکھ لیتی ہے)

بخم۔ (ذرا ہنسکر اور دونوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھکر درمیان میں کھڑا ہو جاتا ہے): "پاگل لڑکیو! سمجھتی ہو کہ فوجی زندگی عیش کی زندگی ہوتی ہے۔ ایں؟ —— [یکلخت دروازے کی طرف گردن موڑ کر دیکھتا ہے] ارے ہاں —— میرا تار پہونچ گیا تھا نا؟ میرے ساتھ میرے ایک دوست بھی ہیں میرا خیال ہے تم دونوں انہیں پسند کروگی۔ بڑے مزے کے آدمی ہیں۔"

فرخ (باہر دیکھتے ہوئے زور سے ہنس پڑتا ہے): "ابا جان! یہ تو ایک کھلونا معلوم ہوتے ہیں" ——

(ملاقاتی کمرے میں دادا ابا یوں سر اور ہاتھ اٹھاتے ہیں جیسے کسی کو آواز دینا چاہتے ہوں مگر پھر کرسی پر ٹیک لگاکر خاموش بیٹھ جاتے ہیں)

بخم (فرخ کا جواب دیتے ہوئے): "کھلونا ہی ہیں بیٹے! جس سے تم سب کھیلوگے۔ میجر صاحب! اندر تشریف لے آئیے نا ——"

(شکیل کے ساتھ دو مزدور اسباب لئے اندر داخل ہوتے ہیں اور پھر شکیل کی نگرانی میں بالاخانے کے زینے چڑھنے لگتے ہیں۔ میجر صاحب مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوتے ہیں۔ یہ عجیب وضع قطع کے بزرگ ہیں۔ فوجی وردی میں کھلونا لگتے ہیں۔ چھوٹا سا قد۔ توند آگے کو نکلی ہوئی۔ تالو پر بال کبھی تھے ہی نہیں۔ صرف دونوں کانوں کے پاس گھنگھریالے بالوں کی ایک جھالرسی لٹک رہی ہے اور سب سے زیادہ قابل توجہ چیز انکی مونچھیں ہیں مونچھیں نہایت بڑی بڑی ہیں اور اس کی نوکیں کاشک سو بنائی گئی ہیں یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ناک کے نیچے عین درمیان میں کوئی لمبی لوہے کی سلاخ رکھدی گئی ہو۔ آنکھیں مونچھوں سے مشابہ نہایت لمبی اور باریک ہیں زرین اور فہمیدہ کو ہنسی آ جاتی ہے

بخم: "یہ میجر صاحب ہیں جو مسلسل تین سال میرے شریک رنج و راحت اور رفیق حیات بنے رہے میری بیوی فہمیدہ۔ اور بہن زرین"

بیگم بخم: "آداب۔ مزاج شریف؟"

میجر: "زہے نصیب۔ شکریہ شکریہ"

بخم: "دونوں بہت معقول لڑکیاں ہیں مجھے یقین ہے ان کے ساتھ آپ کا وقت بہت دلچسپی میں گذرے گا"

بیگم بخم: "مجھے آپ کی تشریف آوری سے دلی خوشی ہوئی"

زرین: "آپ کا سفر آرام سے کٹا؟"

میجر: "جی جی۔ زہے نصیب۔ گویا بالکل آرام سے! شکریہ شکریہ"

زرین (ہنسی روک کر): "بھائی جان۔ اسباب اوپر کمرے میں لگوا دیا جائے؟"

بیگم بخم (ہنسی روک کر): "ضرور۔ تم خود اوپر چلی جاؤ"

زرین: "بہت اچھا بھائی جان (مہمان سے مخاطب ہوکر) آپ کا کمرہ تیار ہے بس آپ کا اسباب ذرا اوپر رکھوا دوں"

میجر: "شکریہ —— [پھر کچھ سمجھ میں نہ آیا تو ہنس پڑے) شکریہ اور —— زہے نصیب"

بخم (مسکراکر) دیکھا فہمیدہ ہمارے دوست کس قدر بے تکلف اور با اخلاق واقع ہوئے ہیں، ان کی خوبیوں سے رفتہ رفتہ آگاہ ہوتی جاؤ گی"

بیگم بخم: "یقیناً"

میجر (شرماکر): "شکریہ شکریہ۔ ذرہ نوازی۔ خوبیاں تو کیا ہیں —— زہے نصیب"

[شکیل اسباب سے فارغ ہوکر باغ کے دروازے سے اندر داخل ہوتا ہے اور زرین بالاخانے کے زینے سے نیچے اتر آتی ہے]

زرین: "بس بھائی جان آپ کا کمرہ سنگوا دیا ہے اور آپ کا بھی میجر صاحب"

میجر: (بوکھلاکر) "زہے —— شکریہ نصیب" (سب کے چہروں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ۔ فرخ ایک کرسی پر چڑھ کر مہمان کے مونچھوں کے سرے پر اپنی ہتھیلی پھیرتا ہے)

فرخ: "جب آپ سوتے ہیں تو یہ چبھتی نہیں؟ —— ذرا ہاتھ لگاکر دیکھنا پھوپی زرین —— چاقو کی طرح تیز ہیں"

(پھر اپنی ہتھیلی یوں دیکھتا ہے کہ کہیں زخم تو نہیں پڑگیا)

بیگم بخم: "فرخ! بزرگ مہمانوں سے یوں پیش آیا کرتے ہیں؟ —— مجھے بڑا افسوس ہے میجر صاحب ——"

میجر (گھبراکر): "کیوں کیوں —— کوئی بات نہیں —— شکریہ —— ادھر آو بیٹے —— زہے ——"

بخم: "ہمارے دوست ان چھوٹی باتوں پر برا نہیں مانتے اور پھر فرخ کی نیت نیک تھی ——"

میجر (بوکھلاکر): "بالکل بالکل ——"

شکیل (ہنسکر فرخ کو اٹھا لیتا ہے): "بدمعاش کہیں کا! کسی موقع پر نہیں چوکتا معافی تو مانگ!"

فرخ: "میجر صاحب! ادھر جھکئے جیسی تھی ویسی ہی بنا دوں"

زرین۔ (ہنسی دباکر۔ موضوع بدلنے کے لئے): "بھائی جان آپ لوگ تھکے ہوئے ہوں گے۔ پہلے آرام کریں گے یا کھانا کھائیں گے؟"

نجم: "زرین پیاری۔ تکان کو ایک ہی چیز رفع کرتی ہے۔ بوجھو کیا ——— ؟"
شکیل: "گرم گرم لذیذ کھانا"
بیگم نجم: "وہ بالکل تیار ہے"
شکیل: "تو میں اپنا کوٹ بدل آؤں" (چلا جاتا ہے)
زرین: "میجر صاحب! آئیے۔ میں آپ کو کمرے تک پہونچا دوں"
میجر: "شکریہ بشکریہ۔ زہے نصیب چلئے چلئے"
(دونوں بالاخانے کے زینے پر چلے جاتے ہیں)
بیگم نجم: "اچھا تو میں کھانا منگواؤں ———"
(بیگم نجم ملازم کو آواز دیتے ہوئے ملاقاتی کمرے کے دروازے کے قریب سے باہر جانے لگیں۔
(قدموں کی آواز سن کر دادا ابا اپنی کرسی پر اٹھ بیٹھے اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگتے ہیں)
دادا (آہستہ سے): "کون؟ — نجم تو نہیں — ؟ ذرا سننا بیٹی ——— ایں کوئی نہیں ——— تو ———"
(دادا ابا مایوس ہو کر پھر کرسی پر سر رکھ کر نیم دراز ہو جاتے ہیں)
نجم (زینے کی طرف بڑھ کر اونچی آواز میں): "فہمیدہ ذرا جلدی کرنا۔ مجھے زوروں کی بھوک لگی ہے"
(فرخ ماں کے پیچھے جانا ہی چاہتا ہے کہ نجم بڑھ کر اسے پکڑ لیتا ہے)
نجم: "ارے تو کہاں چلا؟ سب سے پہلے تو مجھے تجھی سے باتیں کرنی ہیں"
(دادا ابا کرسی سے ٹیک لگائے اُداس سے لیٹے ہوئے آنے والی آوازوں کو سُن رہے ہیں)
فرخ: "ابا جان آپ نے میرے طوطے کی خیریت تو پوچھی ہی نہیں —"
نجم: "ابھی زندہ ہے؟"
فرخ (حیران ہو کر): "کیوں نہ ہوتا؟"
نجم (ہنس کر): "معاف کرنا بھئی۔ بوڑھا تھا۔ میں نے سمجھا کسی اور نوخیز طوطے کے لئے اپنا پنجرہ خالی کر گیا ہوگا"
فرخ: "اسکا کیا مطلب ہے ابا جان؟"
نجم (ہنس کر) عام طور پر طوطے جب بوڑھے ہوتے ہیں تو پنجرے خالی کر جاتے ہیں پھر اس پنجرے میں کوئی اور نیا اور نوجوان طوطا قید کر دیا جاتا ہے —"
فرخ: "عجیب بات ہے۔ بوڑھے طوطے نوجوان طوطے کیلئے پنجرہ خالی کر جاتے ہیں!"
یکلخت زرین داخل ہوتی ہے
زرین: "بھائی جان چلئے کھانا تیار ہے۔ مچھلی ٹھنڈی نہ ہو جائے"

[بال کی روشنی نجم گل کر دیتا ہے اور تینوں کھانا کھانے کے لئے چلے جاتے ہیں]
(سٹیج پر صرف دادا جان اور طوطے کا پنجرہ باقی رہ جاتا ہے۔)
(کسی دوسرے کمرے سے چھری کانٹوں، پلیٹوں اور قہقہوں کی آواز بلند ہوتی جاتی ہے)
دادا ابا بڑی مشکل سے کرسی کے دائیں بائیں ہاتھ پھیلا کر اپنی چھڑی ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتے اور اس کے سہارے آہستہ آہستہ اٹھتے ہیں اور اِدھر اُدھر گھوم کر کوئی چیز تلاش کر رہے ہیں بڑی مشکل سے طوطے کے پنجرے کے پاس پہونچ کر اس پر ہاتھ پھیر رہے ہیں کہ یکلخت فرخ دوڑتا ہوا اندر داخل ہوتا ہے اور دادا ابا چپ چاپ کھڑے ہو جاتے ہیں]
فرخ (جیسے کوئی بھولی ہوئی چیز یاد آ جائے): "ارے دادا ابا — آپ یہیں اور تنہا؟ ابا جان کو شاید آپ کا خیال ہی نہ رہا — میں چچا شکیل کے لئے سگریٹ لینے ادھر آگیا — مگر دادا ابا — آپ وہاں کھڑے کیا کر رہے تھے؟"
دادا (پنجرے کی طرف اشارہ کر کے): "بیٹے میرا جی چاہتا ہے اسے آزاد کر دوں"
فرخ (حیران): "طوطے کو؟ کیوں؟"
دادا (مغموم اور رقت بھرے لہجے میں): "ہاں — تاکہ یہ پنجرہ کسی نوجوان طوطے کے لئے خالی ہو جائے"
یہ کہتے کہتے دادا جان نے جھک کر پنجرے کا دروازہ کھول دیا۔
فرخ (روتے ہوئے): دادا جان، دادا جان، یہ آپ نے کیا کر دیا۔ پنجرہ خالی ہو گیا" رونے لگتا ہے
دادا: "یونہی ہوتا ہے بیٹے۔ پنجروں کے خالی ہونے پر لوگ روتے چلاتے ہیں مگر دراصل وہ جانے والے کے لئے، یا خالی پنجرے کے لئے آنسو نہیں بہاتے۔ وہ اصل میں اپنی کرتوت شاید اور اپنے کئے پر آنسو بہاتے ہیں کہ ہم نے جانے والے کی کبھی خاطر مدارات نہ کی۔ وہ اپنے گناہوں پر آنسو بہاتے ہیں۔"
فرخ (خوف زدہ ہو کر): "یہ آپ آج کیسی باتیں کر رہے ہیں؟"
دادا: "جیسی اس وقت مجھے کرنی چاہئیں — فرخ بیٹے — تم مجھے سہارا دے کر آہستہ آہستہ میرے کمرے تک پہنچا دوگے؟"
فرخ: "میں کھانے کے بعد ابا کو یہیں لے آؤں گا۔ آپ کے پاس دادا ابا — شاید ان کو آپ کا خیال ہی نہ رہا۔ آپ یہیں ٹھیریئے"
دادا: "نہیں بیٹے۔ مجھے سہارا دو۔ میں اپنے کمرے میں جاؤں گا"
فرخ: "مگر کیوں؟"
دادا: "تاکہ یہ کمرہ بھی خالی ہو جائے — اور کھانے کے بعد تم سب یہاں بیٹھ کر کافی پیو اور مزے مزے کی باتیں کر سکو"
فرخ نامعلوم جذبات سے متاثر ہو جاتا ہے اور دو موٹے موٹے آنسو اس کے
(باقی صفحہ ۲۸)

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی

موہن جوڈاڑو

"موہن جوڈاڑو سندھی زبان کا ایک فقرہ ہے اور اس کے معنی ہیں مُردوں کا ٹیلہ، اس مہیب نام سے جس ٹیلہ کو موسوم کیا گیا وہ اس وقت ساری دنیا کی علمی مجلسوں میں مشہور ہے۔ اور اس کرۂ ارض کی قدیم ترین یادگاروں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ چند ٹیلوں کا یہ گروہ لڑکانہ کے ضلع میں ڈوکری ریلوے اسٹیشن سے تقریباً سات میل کے فاصلہ پر واقع ہے اور ایک نہایت قدیم دور کے تمدن کا افسانہ گو ہے بعض بودھ آثار کی وجہ سے اس علاقہ کی اہمیت کا محکمہ آثار قدیمہ اور مورخین کو عرصہ سے اندازہ تھا۔ چنانچہ کرتھر کے کوہستان اور دریائے سندھ کے درمیان کم و بیش ستائیس بڑے اور ترین چھوٹے قصبوں کے آثار کا علم ۱۹۲۲ء سے پہلے ہو چکا تھا۔ لیکن اب تک کوئی چیز ایسی نہ ملی تھی کہ ذہن بودھ زمانہ سے قبل کی تاریخ کی طرف منتقل ہوتا۔ موہن جوڈاڑو میں چند سطحی بودھ آثار کی تحقیقات کے سلسلہ میں یہ انکشاف ہوا کہ جب بودھ، برہمن اور آریہ اس سرزمین میں موجود بھی نہ تھے تو یہاں ایک ایسی قوم آباد تھی جو تمدن و تہذیب کی حیرت انگیز منزلیں طے کر چکی تھی اور جو آج سے پانچ ہزار سال قبل خوشحالی، آسودگی، آرام، اور مدنیت کی زندگی بسر کرتی تھی۔ ۱۹۲۲ء میں جب موہن جوڈاڑو کے انکشافات کا دنیا میں اعلان ہوا تو تاریخ اور آثار قدیمہ کے طالب علموں میں غلغلہ بلند ہو گیا اور ساری دنیا کی توجہ موہن جوڈاڑو پر منعطف ہو گئی۔"

جب کھدائی شروع ہوئی تو سطح سے قریب ایک شہر کے آثار ملے جو کشان شہنشاہ وسودیو اول کے زمانہ میں آباد تھا، اس کا معاصر ایک بودھ اسٹوپا معلوم ہوتا ہے جو سب سے بڑے ٹیلہ پر تعمیر کیا گیا تھا اور جس کا کچھ حصہ اب تک موجود ہے۔ اس کے بعد کھدائی جاری رہی، یہاں تک کہ تیرہ ایکڑ سے زیادہ رقبہ کھود دیا گیا جس سے سات شہروں کے آثار تہہ بہ تہہ ایک دوسرے کے نیچے برآمد ہوئے اور اس کے بعد پانی آ جانے کے سبب سے کھدائی دشوار ہو گئی۔ ایک ہی مقام پر سات شہروں کے آثار ملنے سے خیال ہوتا ہے کہ یہ مقام دریائے سندھ کے کنارہ پر آباد تھا۔ اور اسے آمد و رفت کے ذرائع اور تجارت کے سبب سے بہت اہمیت حاصل تھی۔ چونکہ یہ دریا متواتر اپنا راستہ تبدیل کرتا رہا ہے اس لئے یہ امر قرین قیاس ہے کہ ان تبدیلیوں کے دوران میں جو کرتھر کی پہاڑیوں اور دوسری طرف کی اونچی زمین کے سبب سے تھوڑی سی چوڑائی میں ہوتی رہی ہے یہ شہر کئی مرتبہ غرقاب ہوا اور پھر دریا کے ہٹ جانے اور عمارتوں کے مٹی سے اٹ جانے کے سبب سے اس جگہ پر از سر نو آباد ہوا۔ اس بار بار آبادی کے کئی سبب ہوں گے۔ ایک تو اس مقام کی تجارتی اہمیت، دوسرے دریا کے کنارے پر شہر بسانے والے ہمیشہ سیلاب سے بچنے کے لئے اونچا مقام تلاش کرتے ہیں اور شہروں کے بار بار بسنے اور اُجڑنے سے زمین بلند ہوتی چلی جاتی ہے۔ دریائے سندھ کے اس سرزمین پر جہاں اور احسان ہیں وہاں ایک یہ بھی ہے کہ اس کی وجہ سے نیچے کے شہر تقریباً محفوظ رہے اور اس طرح اس تمدن کی یادگار باقی رہی جس کا نشان اس کے بغیر شاید فنا ہو جاتا۔ نیچے کے شہروں میں متواتر ایک ہی قوم کے لوگ کئی مرتبہ آباد ہوئے، اس قیاس کا سبب یہ ہے کہ اگرچہ ان شہروں میں زمانہ کا فرق زیادہ ہے لیکن جو چیزیں برآمد ہوئی ہیں وہ یکساں نوعیت کی ہیں، جس کے معنی یہ ہیں کہ کئی صدیوں تک ایک ہی قوم جو ایک خاص تمدن کی حامل تھی اس علاقہ میں آباد رہی۔

بالکل اوپر کی سطح کو چھوڑ کر زمانۂ قریب کے شہروں کی تاریخ بھی ۳۲۵۰ ق م سے ۲۷۵۰ ق م تک معلوم ہوتی ہے، یعنی اس تمدن کے پانچ ہزار سال قدیم ہونے میں شک و شبہ مشکل سے ہو سکتا ہے۔ اگرچہ بعض ہندو تاریخ نگار یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ یہ تمدن آریائی تھا اور اس لئے تاریخوں کو قریب تر کھینچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن یہ نظریہ اہل علم کے نزدیک قابل قبول نہیں ہے اور محض نسلی تعصب کا شاخسانہ ہے۔ اس عہد میں لوہے کا استعمال معلوم نہیں ہوا تھا اور استعمال کے اوزار پتھر یا تانبے کے بنتے تھے مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ان شہروں میں بسنے والے وحشی تھے اس لئے کہ انکا تمدن بہت ترقی کر چکا تھا اور اگر اس کے ارتقا کے زمانہ کو بھی شامل کر لیا جائے تو مورخین کا اندازہ ہے کہ اس کا دور سات ہزار سال سے بھی پہلے شروع ہوا ہوگا، لبدیں جو تحقیقات ہوئی ہے اس سے یہ خیال اور تقویت پکڑ گیا ہے، اس لئے کہ اسی علاقہ میں بعض ٹیلے ایسے ملے ہیں جن کے متعلق خیال ہے کہ وہ موہن جوڈاڑو سے بھی پرانے ہیں اس لئے کہ ان کی سطح پر بعض ایسی اشیاء ملتی ہیں جو ماہرین کی رائے میں ان چیزوں سے بھی پرانی ہیں جو موہن جوڈاڑو میں برآمد ہوئی ہیں۔ اس تمام علاقہ میں مزید تحقیقات کی بڑی گنجائش ہے۔ لیکن اس قسم کی تحقیقات میں روپیہ بہت خرچ ہوتا ہے، امید ہے کہ ابتدائی مشکلات سے نجات پانے کے بعد حکومت اس طرف توجہ کر سکے گی، مگر یہ کام اس قدر عظیم الشان ہے کہ اس میں ہماری اعلیٰ تعلیم گاہوں اور غیر ممالک کے علمی حلقوں کے

تعاون کی ضرورت ہے۔

اب تک جو آثار نکل چکے ہیں اُنھیں دیکھنے والے پر سب سے زیادہ اثر جس چیز کا پڑتا ہے وہ شہر کی تعمیر اور ترتیب ہے۔ مکانوں اور دوسری عمارتوں کے آثار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بسنے والے خوشحالی اور چین کی زندگی بسر کرتے تھے۔ شہر کی بڑی بڑی سڑکیں سیدھی اور چوڑی ہیں اور دوسری سڑکوں کو زاویہ قائمہ بناتی ہوئی کاٹتی ہیں۔ ہر محلہ اس طرح آباد ہے کہ اس کے چاروں کونوں پر چوراہے ہیں اور اس کے چاروں طرف سڑکیں ہیں۔ عمارتیں سب صاف اور گھڑی ہوئی اینٹوں کی ہیں جنہیں امداد زمانہ نے کسی طرح خراب نہیں کیا ہے اور ان کی سرخی اب بھی تازگی کا فریب دیتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اجنبی کو تو ایسا لگتا ہے کہ یہ شہر اب زیر تعمیر ہے اور جلد ہی تکمیل کو پہنچنے والا ہے۔ صرف ماہر فن کی نکتہ رس نگاہ یہ معلوم کر لیتی ہے کہ یہ اینٹیں تاریخ کے کسی اور دور میں استعمال نہیں ہوئیں۔ اگر آپ کسی مکان کے اندر گھس کر دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کے درمیان ایک چھوٹا مگر قرینہ کا صحن ہے جس کا فرش اینٹوں کا ہے۔ اس صحن کے چاروں طرف مکان کی باقی عمارت ہے جس میں اچھے کشادہ کمرے ہیں، غسل خانے ہیں، ان میں بھی اینٹوں کا فرش ہے، ہر غسل خانہ میں اینٹ اور چونے کی بنی ہوئی نالی ہے جو سڑک کی زیر زمین ڈھکی ہوئی نالی سے جا کر ملی ہے۔ غسل خانہ کے فرش کی اینٹیں بھی چونے سے جڑی ہیں اور دروازوں میں اینٹ کا چورا اس طرح بھرا گیا ہے کہ زیادہ پانی جذب نہ ہو۔ یہ فرش اس انداز سے سلامی لئے ہوئے بنائے گئے ہیں کہ پانی سیدھا نالی میں پہونچ جائے۔ سارے شہر میں چھوٹی بڑی نالیوں کا جال بچھا ہوا ہے تاکہ کسی عمارت یا گلی میں پانی کھڑا نہ رہے اور بہہ کر شہر سے نکل جائے۔ نالیاں سب ڈھکی ہوئی ہیں، بڑی نالیوں میں جگہ جگہ اس کا انتظام ہے کہ اگر بہاؤ میں رکاوٹ پیدا ہو تو آدمی ڈھکن کھول کر نالی میں اتر جائے اور رکاوٹ کو دور کر دے۔ گھر کی غلاظت کو بھی صاف کرنے کا انتظام تھا۔ پاخانہ عام طور پر دوسری منزل پر ہوتا تھا، وہاں سے دیوار میں پیوست پکی ہوئی مٹی کا پرنالہ سڑک کی نالی یا حوبچہ میں لاکر غلاظت ڈال دیتا تھا اور وہ وہاں سے بہہ کر شہر کی بدررو میں پہونچ جاتی تھی۔ ان نالیوں کی صفائی درستی اور تعمیر سے معلوم ہوتا ہے کہ شہری زندگی اور بلدیہ کا انتظام دونوں اعلیٰ پیمانہ پر پہونچ چکے تھے۔ اس قوم کو صفائی کا خاص خیال تھا، چنانچہ ہر گھر میں ایک کنواں ملتا ہے تاکہ پانی افراط سے خرچ ہو سکے۔ رہنے کے مکانوں کے علاوہ مفاد عامہ کی عمارتیں بھی پائی جاتی ہیں۔ بعض عمارتیں ستون دار ایوانوں کی شکل کی ملتی ہیں جن کے دالانوں میں جگہ جگہ پختہ نشستیں بنی ہیں، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ان ایوانوں میں لوگ شہری یا سماجی ضروریات کے لئے جمع ہوتے تھے۔ بعض عمارتیں ایسی ملی ہیں جو شاید مندر رہوں اس لئے کہ ان میں مندروں کے مقدس حجروں کی شکل کی کوٹھریاں موجود ہیں۔ فرق یہ ہے کہ مندر کے مقدس حجروں میں بُت ہوتے ہیں مگر ان میں کوئی بت برآمد نہیں ہوا ہے۔ بت نصب کرنے کے لئے کرسی چبوترہ ملا ہے۔ ان عمارتوں کی کرسیاں بلند ہیں اور دیواریں موٹی ہیں حتیٰ کہ بعض کی چوڑائی تو دس فٹ ہے حالانکہ دوسری عمارتوں کی دیواریں معمولی موٹائی کی ہیں۔ شہر کے ایک حصہ میں جہاں چاروں طرف آبادی کی علامتیں برآمد ہوئی ہیں ایک بڑا تالاب نکلا ہے جو اب تک بہت اچھی حالت میں ہے۔ اس کا طول ۳۹ فٹ اور عرض ۲۳ فٹ ہے اور زمین کی سطح سے ۸ فٹ عمیق ہے مگر اس کی دیواریں جو سات آٹھ فٹ موٹی ہیں سطح زمین سے اونچی ہیں لہٰذا حوض میں کافی پانی بھرا جا سکتا تھا۔ حوض کے دو طرف چوڑا سا زینہ ہے، زینہ کے ختم ہوتے ہی نہانے والوں کے لئے چبوترہ ہے۔ تالاب کے فرش کی سطح ذرا شمال مغرب کی طرف جھکی ہوئی ہے، اس طرف ایک نالی ہے جس میں سے تالاب کو بدررو میں خالی کیا جا سکتا تھا، یہ بدررو اتنی گہری ہے کہ چھ فٹ کا آدمی اس میں کھڑا ہو جائے۔ پھر بھی اس کا سر چھت سے نہ لگے۔ چھت بھی اینٹوں کی ہے۔ تالاب کے دو طرف حجرے بنے ہیں، ان میں سے ایک میں کنواں ہے جو شاید تالاب میں پانی بھرنے کے کام آتا تھا۔ تالاب کی دیواروں میں جپسم کا سمنٹ لگا ہوا ہے اور شرقی دیوار میں اب تک اسفالٹ کے نشان پائے جاتے ہیں جو آجکل سڑکوں کی سطح پر پھیلائی جاتی ہے تاکہ ان میں پانی سرایت نہ کرے۔ ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ موہن جوڈارو میں معماری اور شہر بسانے کے فن نے بہت ترقی کر لی تھی اور اُنہی اسفالٹ کا استعمال بھی معلوم تھا۔

یہ لوگ زراعت سے اچھی طرح واقف تھے، گیہوں، جو اور کپاس کی کاشت تو ضرور کرتے تھے، ان کے گھروں سے اس زمانہ کے گیہوں اور جو برآمد ہوئے ہیں، چرخے اور تکلے کے استعمال کے شواہد بھی موجود ہیں۔ اچھی قسم کا کپڑا بھی ملا ہے، ایسی ناندیں بھی پائی گئی ہیں جن میں کپڑا رنگا جاتا تھا، ان ناندوں کا رنگ اب تک نہیں چھوٹا ہے۔ انکی غذا میں کھجوریں، مچھلیاں، دریائی جانور اور گوشت یہ تمام چیزیں شامل تھیں۔ گائے کے گوشت سے بھی انھیں پرہیز نہ تھا۔ عورتیں خوبصورت سونے چاندی، بیش قیمت جواہرات یا اوسط درجہ کی قیمت کے پتھروں کا زیور پہنتی تھیں۔ ان کے بعض زیوروں کے نمونے ملے ہیں جو بہت خوبصورت ہیں۔ تانبے کے برتن یہ لوگ اچھے بناتے ہیں۔ مٹی کے برتن بنانے میں بھی مہارت رکھتے تھے چنانچہ سادہ، رنگین اور کاغذی تینوں قسم کے برتن پائے گئے ہیں، کاغذی برتنوں سے وہ سُبک اور پتلے مٹی کے برتن مراد ہیں جو اب بھی مغربی پاکستان کے بعض حصوں میں بنائے جاتے ہیں، کھلونوں کی بھی اچھی خاصی تعداد برآمد ہوئی ہے۔ زراعت کے ساتھ جانور پالنے کا فن بھی انھیں آتا تھا، اُن کے استعمال میں جو بیل گاڑیاں تھیں، سندھ میں اب بھی ویسی ہی استعمال ہوتی ہیں۔

(باقی صفحہ ۴۲ پر)

سیّد شرف الحسینی

ڈھاکے کا محرّم

غم ہے الم ہے اور بپا شور و شین ہے   پیارے نبیؐ کے پیارے نواسے کا بین ہے
ماتم سرا ہے بیت محبانِ اہلِ بیت   روتا ہے ایک ایک کہ ذکرِ حسینؑ ہے

حسینؑ کی یاد کے لئے بیشمار امام باڑے قائم ہیں۔ اس شہر ڈھاکہ میں بھی عظیم الشان امام باڑہ موسوم بہ حسینی دالان آباد ہے جس کی حفاظت اور رونق افروزی کے لئے سالانہ ڈھائی ہزار حکومت سے ملتا ہے۔ اور بھی آمدنی کے وسائل ہیں۔ حکومت کی جانب سے نواب بہادر ڈھاکہ چار پشت سے متولی ہیں۔ منتظم کاران کی منظوری لیکر حسینی دالان کے کاموں میں روپیہ صرف کرتے ہیں۔ نواب بہادر کے حکم سے ایک شخص صاحب اقتدار مقرر رہتا ہے جو داروغہ حسینی دالان کہلاتا ہے۔ چونکہ حسینی دالان مونومنٹ میں داخل ہے ہر سال اس کی مرمت حکومت سے ہوتی ہے۔ بادشاہ اورنگ زیب کے ایک بیٹے عظیم الشان زمانے میں امیر البحر سید مراد نے ۱۰۵۲ھ مطابق ۱۶۴۲ء میں اس کو بنوایا تھا۔ تاریخ تعمیر یوں کندہ ہے۔

در زمان بادشاہ باوقار   آں عظیم الشان شاہ نام دار
ساخت ایں ماتم سرا سید مراد   در سن پنجاہ و دو و بریک ہزار

۱۸۹۷ء میں زلزلہ سے حسینی دالان ناقص ہو گیا تھا۔ اس وقت نواب بہادر سر خواجہ احسن اللہ۔ کے۔ سی۔ آئی۔ ای۔ مرحوم رئیس اعظم ڈھاکہ تھے ایسے صاحب ثروت جنکے قبضے میں چوبیس لاکھ کی سالانہ آمدنی تھی۔ جن کے مہمان وایسرائے ہوتے تھے۔ جن کی شان بلا مبالغہ والئ ملک کی تھی۔ جن کے نوا سے آج تختِ گورنر جنرل پہلو افروز ہیں۔ انہوں نے از سرِ نو عمارت کو نقشۂ سابق پر بنوا دیا جس میں قریب ۱ لاکھ روپیہ جیب خاص سے صرف کیا۔ مذہب اہل سنت کا رکھتے تھے۔ وہ حسینی دالان کے بانی ثانی ہوئے۔ علاوہ بریں اس کی رونق افروزی کے لئے ہر سال زرِ کثیر انفۂ گرامایہ نذر کرتے رہے۔

محرم کی ساتویں تاریخ حسینی دالان کی مجلس عزا میں ہر سال خود شریک رہتے نیز حکام وقت بھی اس دن جاتے تھے۔ جن کو الگ کرسیوں پر بٹھا کر خود فرش ماتم پر بھین کے ساتھ بے تکلف بیٹھ جاتے تھے۔ حسینی دالان کے لئے کم از کم تین لاکھ روپیہ صرف کر کے ۱۹۰۱ء میں راہئی جنت ہوئے۔

حسینی دالان کی عمارت بیچ میں قائم ہے۔ اُدتر جانب پُر شوکت نوبت خانہ ہے۔ جس کے نیچے سے ہودج کے ساتھ ہاتھی آتا جاتا ہے۔ دکھن جانب بڑا دروازہ لوہے کا ہے۔ محرم کا چاند نکلتے ہی نوبت خانے کے اوپر غم کی نوبت بجتی ہے۔ جس سے سارے شہر میں محرم کا اعلان ہوتا ہے۔ امام باڑے سے ملحق دکھن جانب کو ایک بڑا تالاب ہے۔ تین طرف پختہ گھاٹ اور متعدد ستون بنے ہوئے ہیں جن میں چراغاں ہوتا ہے۔ تالاب کی فضا قابلِ دید ہے۔ امام باڑے کی بڑی سیڑھی پورب جانب سے ہے۔ اور اس سے دو تین گز دور پر نواب نصرت جنگ بہادر اور ان کے جانشینوں کی قبریں ایک پختہ کمرے کے اندر ہیں۔ ان مزاروں پر صبح و شام قرآن خوانی کے لئے دو شخص مقرر ہیں۔

محلہ اعظم پور کے ایک غیر آباد جگہ پر جو یہاں کے کربلا اور شہر کے درمیان واقع ہے متعدد خیمے نصب کئے جاتے تھے۔ نواب خاندان کے ایک معزز رکن شہزادے صاحب مرحوم کی نگرانی میں پُر تکلف کھانا پکتا تھا۔ برف آب کی سبیل رکھی جاتی تھی۔ اور زعفران سے مہکتا ہوا دودھ کا شربت جس میں پستے اور بادام کی ہوائیاں کثرت سے ہوتی تھیں عام طور سے پلایا جاتا تھا خصوصاً کربلا سے لوٹتے وقت عصر کے بعد ہزاروں بندۂ خدا آسودہ اور سیراب ہوتے تھے۔ اس لنگر حسینی کا تمام خرچ نواب بہادر جیب خاص سے دیتے تھے۔

حسینی دالان میں سوزخوان، حدیث خوان اور نوحہ خوان مقرر ہیں۔ ہر تو چندی اور ایام محرم میں مجلسیں ہوتی رہتی ہیں۔ حدیث خوانی کے لئے محرم میں الگ ایک واعظ مقرر ہوتا ہے۔ محرم کی آٹھویں، نویں اور عاشورا کو حسینی دالان سے علم، ذوالجناح اور تعزیوں کے ساتھ جلوس نکلتا ہے جس میں اہل سنت کثرت سے شریک رہتے ہیں۔ کچھ لوگ تعزیوں میں باری باری سے کاندھا دیتے ہوئے جاتے ہیں۔ پیک کی شکل میں رہتے ہیں۔ ایک بڑی جماعت سقہ کی صورت میں رہتی ہے۔ کچھ لوگ برف آب پلانے اور گلاب پاشی کرتے جاتے ہیں۔ پانچ میل تک سڑکوں میں محتاج رومال بچھا کر قطار لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔ لوگ ان کو حسینؑ کا صدقہ دیتے جاتے ہیں۔ کہیں کہیں لوگ سبیل رکھتے ہیں اور کھچڑا بانٹتے ہیں۔ اکثر گھروں میں ختم قرآن مجید اور ذکرِ شہادت ہوتا ہے۔ بعض محلہ دار یکجا جمع ہو کر بیان شہادت سنتے ہیں۔

الغرض عشرۂ محرم میں اہلِ سنت بھی حسینؑ کی یاد کو تازہ کرتے ہیں۔ شہر سے

دو میل دور پر مگ بازار ایک ویرانہ جگہ تھی جسکو ایک صاحب کمال صوفی شاہ نوری قدس سرہٗ نے آباد کیا تھا جنکی وفات ۱۱۰۰ھ میں ہوئی اور ان کے بیٹے شاہ محمدی قدس سرہٗ سجادہ نشین ہوئے۔ جن کے علم و فضل کا حال ڈھاکے میں بچہ بچہ جانتا ہے۔ صوفی صاحب کا یہ دستور العمل تھا کہ ذوالجناح کی ڈوری تھامے ہوئے ایک مرقع الم بنکر روتے ہوئے جاتے تھے۔ ان کی اولاد و اقارب اس سنت آبائی پر عمل پیرا ہیں۔ یہ وہ خانوادہ ہے کہ دو سو برس گزرنے پر ہر سال ماہ ربیع الاوّل میں صوفی صاحب کے عرس کی تقریب یوں ہوتی ہے کہ مگ بازار میں میلا لگ جاتا ہے۔ مرثیہ خوانی کا ایک عنوان ڈھاکے میں بے نظیر ہے کہ شہر میں مختلف بستیوں سے اور دریا کے اس پار سے سنّی مسلمانوں کا ایک ایک گروہ اپنی اپنی تاسنگ منظر میں بلند آواز سے مرثیہ پڑھتے اور حسین حسین پکارتے ہوئے حسینی دالان جاتا ہے پھر ساری رات وہاں مرثیہ پڑھتا ہے۔ مرثیہ خوانی کا یہ ہنگامہ خیز رواج ایسا ہے کہ سارے شہر میں غمِ حسینؑ کا اعلان ہوتا ہے۔

بی بی کا روضہ ایک امام باڑہ محلہ فراش گنج میں قائم ہے۔ جو حسینی دالان سے قدیم ہے۔ اس کا بانی ایک شخص سنّی تھا اور اب تک اس کا خادم سنّی ہے۔ آٹھویں محرم کو وہاں سے علم کا ایک جلوس نکلتا ہے۔ خصوصیت یہ ہے کہ صبح عاشورا کو اہل سنت وہاں ایک تعزیہ بناتے ہیں جو ایک اعجاز نما واقعہ کی بنا پر بولتا گھوڑا کہلاتا ہے۔ عاشورا کے دن نمازِ عصر کے بعد دس بیس ہزار سنی مسلمان حسینؑ حسینؑ پکارتے ہوئے کندھوں پہ یہ تعزیہ لیکر پانچ میل کا راستہ دوڑتے ہوئے کربلا جاتے ہیں حسین حسین کے نعروں سے شہر گونج اٹھتا ہے اور اسلام کا رعب چھا جاتا ہے۔

نواب بہادر ڈھاکہ کے فرجد کے عہد ریاست سے پہلے میرزا غلام پیر مرحوم رئیس اعظم تھے۔ وہ بھی سنی تھے۔ انہوں نے بی بی کے روضہ کی آرائش کے لئے پانچ ہزار روپے نقد دئے۔ عشرۂ محرم میں ان کی جانب سے ہر روز کھچڑا تقسیم ہوتا تھا۔ اور مشکوں پر سبز رنگ لگا کر جگہ جگہ سبیل رکھی جاتی تھی۔

حسینی دالان سے قریب میر یعقوب کا امام باڑہ ہے۔ اس کی تحت میں کافی جائداد تھی جسکو لوگوں نے بیچ کھایا۔ بہرحال اس میں ایک تعزیہ ہے اور ہر روز چراغاں ہوتا ہے۔ عشرۂ محرم میں زیادہ آباد رہتا ہے۔

پنجرہ
بقیہ صفحہ ۲۴

رخسار پر بہہ آتے ہیں۔ دو منٹ وہ چپ چاپ دادا کے مقابل میں کھڑا رہتا ہے

فرخ (بھرائی آواز میں): "آئیے دادا ابّا۔ سہارا دوں"

فرخ سہارا دیتا ہے اور دادا ابّا اپنی لکڑی ٹیکتے ہوئے آہستہ آہستہ چلے جاتے ہیں۔

خالی کمرہ اور خالی پنجرہ۔ روشنی مدھم پڑتی چلی جاتی ہے ●

موہن جو ڈارو
بقیہ صفحہ ۲۸

یہ قوم بہت وسیع تجارت کی مالک تھی، چنانچہ بدخشاں کے کوہستان میں جو قیمتی جواہرات اور پتھر پائے جاتے تھے وہ موہن جو ڈارو سے برآمد ہوئے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقہ سے تجارتی تعلقات تھے۔ اسی طرح سمیر اور بابل اور کیش میں ایسی مہریں پائی گئی ہیں جو اصل میں موہن جو ڈارو کی ہیں، اس لئے کہ وہاں بہت کثرت سے دستیاب ہوئی ہیں۔ یہ مہریں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اب تک صحیح طور پر معلوم نہیں ہو سکا ہے کہ ان کا استعمال کیا تھا۔ ان میں سے بعض اسطوانی، بعض مکعب ہیں، بعض چپٹی اور مربع ہیں اور بعض کی شکل مستطیل ہے، کچھ ہاتھی دانت کی بنی ہوئی ہیں، اکثر سنگ جراحت کی، چند تانبے کی اور تھوڑی سی مٹی کی۔ ان پر بالعموم جانوروں کی شکلیں بنی ہیں، بعض پر تصویری حروف میں کچھ لکھا بھی ہے، ان حروف کی شکل سمیری حروف سے مشابہ ہے۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز یہ چیز ہے کہ ایسٹر آئلینڈ جو یہاں سے ہزاروں میل دور وسط بحر میں ہے وہاں بھی اسی قسم کے حروف پائے گئے ہیں اور اب تک دونوں کا تعلق صحیح طور پر متعین نہیں ہو سکا ہے۔ موہن جو ڈارو کے رسم الخط کو پڑھنے کی بہت سی کوششیں ہوئی ہیں جن میں زیادہ قابل ذکر فادر ہیراس کی تعبیر ہے، لیکن حروف اس قدر کم ہیں اور عبارت اتنی مختصر کہ ابھی تک ان کی کوئی تشریح پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچی ہے۔

الغرض موہن جو ڈارو سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچ ہزار سال قبل یہاں ایک ایسی قوم آباد تھی جس نے دور دراز ممالک سے تجارتی تعلقات قائم کر لئے تھے جو صاف ستھرے شہروں میں رہتی تھی جنکی سیدھی اور چوڑی سڑکوں کے کنارے دو منزلہ مکان تعمیر تھے، جسے جسمانی طہارت اور بلدیہ کی صفائی کا بہت خیال تھا اور جو آرام و آسائش کی زندگی بسر کرتی تھی۔ اس قوم کی اصل نسل غیر متیقن ہے، اس لئے کہ یہاں بہت کم مُردوں کے ڈھانچے ملے ہیں اور جو ملے وہ مختلف نسلی خصوصیات کے حامل ہیں جس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان میں سے کون تھا اور مسافر کون۔ لیکن تمدن کے اعتبار سے یہ لوگ غالباً دراوڑ تھے جس کی اصل اساس کے بعض ماہروں کی رائے میں بحیرۂ روم کے ممالک سے تھی، مہروں اور کھلونوں پر بعض ایسی تصویریں ملی ہیں جن سے گمان ہوتا ہے کہ جنوبی ہند کے دراوڑوں کی مبتدیانہ خصوصیات ان لوگوں میں موجود تھیں، اب بھی بلوچستان کے بعض حصوں میں براہوی زبان بولی جاتی ہے جو ایک دراوڑ زبان ہے اور شاید اس زمانہ کی یادگار ہے جب آریوں نے دراوڑ تمدن کو تباہ نہیں کیا تھا۔ غرض سندھ کی وادی نہایت قدیم زمانہ سے تمدن کا گہوارہ ہے اور اس کے تمدن نے ساڑھے پانچ ہزار سال قبل حیرت انگیز ترقی شروع کر دی تھی جس کے نمونے اب بھی دنیا کو حیرت میں ڈال رہے ہیں ●

(باجازت ریڈیو پاکستان)

وزیر اعظم پاکستان قاہرہ میں

آنریبل مسٹر لیاقت علی خان وزیراعظم پاکستان حال ہی میں دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کے اجلاس میں شرکت کی غرض سے لندن تشریف لے گئے تھے - راستہ میں آپ نے قاہرہ میں قیام فرمایا -

دائیں طرف کی تصویر میں وزیراعظم کچھ زعمائے مصر اور پاکستان کے شہریوں کے ساتھ تشریف فرما ہیں

۲ نومبر کو قاہرہ پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد
وزیراعظم اور بیگم لیاقت علی خاں کے علاوہ تصویر میں محمد علی صاحب سکریٹری جنرل حکومت پاکستان اور قاہرہ میں پاکستان کے سفیر بھی موجود ہیں -

داہنی طرف کی دونوں تصویروں میں وزیراعظم اور عرب لیگ کے
سکریٹری جنرل عطام پاشا

ایک ادبی اجتماع

اس شمارہ کے صفحہ ۳۵ پر حلقہ ارباب ذوق کراچی کے سالانہ اجلاس کی مختصر روداد درج ہے - یہ تصویریں اسی موقع کی ہیں۔ اوپر کی تصویر میں حضرت سیماب اپنی غزل پڑھ رہے ہیں۔ تصویر میں ہادی مچھلی شہری، ادیب سہارنپوری، شان الحق حقی، نہال سیوہاروی، اسعد شاہجہانپوری، حامد لکھنوی، آل رضا لکھنوی اور ر ردولوی بھی نظر آ رہے ہیں

مشاعرے کے سامعین میں سے چند - دائیں طرف کونے میں اسٹیٹ بنک کے گورنر جناب زاہد حسین تشریف فرما ہیں

جلسہ کی صدارت آنریبل خواجہ شہاب الدین وزیر امور داخلہ مہاجرین نے فرمائی - مجلس استقبالیہ کے بعض رکن خواجہ صاحب موصوف کا استقبال کر رہے ہیں

ایک ادبی اجتماع

ایک ایسے زمانے میں جب "غمِ عشق" اور "غمِ روزگار" دونوں کی صعوبتوں اور آزمائشوں نے انسان کو حد درجہ مادیت پسند بنا دیا ہو اور اس کے لئے کسی ادبی یا شاعرانہ ہنگامہ آرائی کا تصور جنون کے مرادف ہو، کسی طرف کسی ادبی سرگرمی کا شعلہ بھڑکے تو پروانے دیوانہ وار اس پر گرتے ہیں۔ کچھ یہی حال ۳۱ اکتوبر اور یکم نومبر کو کراچی میں ہوا۔ حلقہ اربابِ ذوق کراچی کی شاخ نے اپنے پہلے سالانہ اجتماع کا اعلان کیا۔ اور اس اعلان کے مطابق ۳۱ اکتوبر کو شام کے ساڑھے پانچ بجے اس کا پہلا اجلاس آنریبل خواجہ شہاب الدین وزیر امور داخلہ و مہاجرین حکومت پاکستان کی صدارت میں منعقد ہوا۔ وائی ایم سی اے کا وہ ہال جس میں جلسہ ہوا تھا حاضرین سے بھرا ہوا تھا اور سب بے چینی سے معینہ وقت کے منتظر تھے۔ ساڑھے پانچ بجنے سے چند منٹ پہلے خواجہ صاحب موصوف تشریف لائے اور ٹھیک ساڑھے پانچ بجے جلسہ کلام پاک کی تلاوت سے شروع ہوا۔ اس کے بعد حلقہ کے سکرٹری نے حلقہ کی کارگزاری کی روداد بیان کی کہ کس طرح دشوار حالات کے باوجود حلقہ کے جلسے ہر اتوار کو پابندی کے ساتھ ہوتے رہے اور ان میں ۷۳ لکھنے والوں نے نثر اور نظم کی نگارشات پڑھیں۔ سکرٹری کی رپورٹ کے بعد جناب صدر نے اپنا خطبہ پڑھا۔

خطبہ میں جناب صدر نے سب سے پہلے اردو کے متعلق یہ فرمایا کہ کیونکہ مجھے ہر مہاجر سے دلچسپی ہے خواہ انسان ہو یا زبان، میرا فرض اس کے لئے مناسب اور سازگار حالات کا پیدا کرنا ہے تاکہ یہ نئے ماحول میں آباد ہو سکے۔ میری دعا ہے کہ جس طرح لاکھوں انسان نئی فضا اور نئے ماحول میں آباد ہو رہے ہیں، اسی طرح ہماری زبان اور اس کی معنوی اولاد بھی پاکستان میں خوش و خرم رہے اور نئی فضا اسے راس آئے" اس دعا کا خیر مقدم حاضرین نے بڑے جوش سے کیا اور ہال تالیوں کی آواز سے گونج اٹھا۔ اس کے بعد جناب موصوف نے حلقہ کی ادبی انہماک اور خدمت گذاری کو سراہتے ہوئے فرمایا کہ۔

"آپ کے اغراض و مقاصد میں ادبی روایات کے تحفظ کے ساتھ ساتھ نئے صحت مند رجحانات کی تشکیل کا بھی ذکر ہے۔ اور مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ نئے رجحانات کے ساتھ آپ نے صحت مندی کی شرط وابستہ کر دی ہے۔ کیونکہ بعض اوقات ہم ہر نئی اور جدید شے کو گوارا کر لیتے ہیں حالانکہ یہ ہماری صحت اور بقا کے لئے مضر ہوتی ہے۔ خصوصاً ادب کی دنیا میں ضروری ہے کہ جب پرانی روایتوں کے ساتھ نئے رجحانات کو سمویا جائے تو ہر ہر قدم پر ہم ان کی صحت مندی پرکھ لیں...... اگرچہ ہم آزادی کے حق صرف سوسائٹی کے مسلّمہ اصولوں سے بغاوت سمجھے جاتے ہیں تو پھر اس معاملے میں بہت تحصیل حاصل ہے لیکن ادیب اور فنکار کا اگر یہ دعویٰ ہے کہ وہ زندگی کا آئینہ دار ہے اور فن کی تخلیقی صلاحیتوں کو زندہ رکھنا اس کا اصول ہے تو پھر کسی ادیب اور فنکار کے قلم سے کوئی ایسا کلمہ کیسے نکل سکتا ہے جسے عام محفل میں دہراتے ہوئے آنکھیں شرم سے جھک جائیں یا جس کا اعادہ کسی باعزت خاندان کے افراد کے سامنے کہنے والے کی پیشانی کو عرقِ انفعال سے تر کر دے۔ ایسے ادیب ممکن ہے کہ چند لمحوں کیلئے کچھ لوگ واہ واہ کہہ اٹھیں مگر مجھے یقین ہے کہ جس طرح انسانی جسم کی عریانی نگاہوں کو چند ناگوار لمحوں سے زیادہ جذب نہیں کر سکتی، اسی طرح ادب میں عریانی اور سفلی جذبات کا اظہار انسانی ذہن کیلئے زیادہ دیر تک جاذبِ نظر نہیں بن سکتا۔ اس مقام پر پہنچ کر ادب اور ادیب پر احتساب کی ضرورت کا سوال پیدا ہوتا ہے جس طرح کوئی ذمہ دار ریاست شہری حدود کے اندر مخرب اخلاق افعال کا اظہار گوارا نہیں کرتی، اسی طرح ایک ذمہ دار ریاست ادب کے مقدس سرچشمہ کو نجاست کی آلائش سے ناپاک ہونے کی اجازت نہیں دے سکتی"

خطبہ کے آخر میں خواجہ صاحب موصوف نے ارشاد فرمایا کہ "حکومت کی طرف سے بار بار اس امر کا اعلان ہو چکا ہے کہ اردو پاکستان کی سرکاری زبان ہے۔ اور آپ خوب جانتے ہیں کہ اردو زبان کا مستقبل صرف پاکستان میں نظر آتا ہے۔ پاکستان میں اردو کا اعلیٰ منصب تسلیم کیا جا چکا ہے"

صاحب صدر کے خطبہ کے بعد حلقہ کے ایک رکن ماجد علی صاحب نے حلقہ میں پڑھے ہوئے مضامین کا مطبوعہ انتخاب "نئی تحریریں" جناب صدر کی خدمت میں پیش کیا۔ اس کے بعد حلقہ کے دوسرے رکن الطاف گوہر صاحب نے "حلقہ اربابِ ذوق" کا منشور پیش کیا اور اپنی تقریر میں اس کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی۔ اس گفتگو اور بحث میں علی الترتیب وقار عظیم، رفیق خاور، آغا محمد اشرف اور صدیق احمد صدیقی نے حصہ لیا۔ منشور کے بعض حصوں سے اتفاق کیا گیا۔ بعض میں تضاد بتایا گیا اور بعض کے متعلق کہا گیا کہ وہ ادب کے صحیح نقطۂ نظر کے حامل نہیں۔ خاصی گرما گرم بحث رہی۔ اور اس کے بعد پہلے دن کا اجلاس ختم ہوا۔

دوسرے دن مشاعرہ تھا۔ مشاعرہ کے لئے طرح کے دو مصرعے دئے گئے تھے۔

۱۔ ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا۔ ۲۔ دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

مشاعرے کا انتظام وائی۔ ایم۔ سی۔ اے کے اس کشادہ صحن میں کیا گیا تھا جس کا

نام رینبو روم ہے اور جس کی دیواروں کو اسی نام کی مناسبت سے قوس قزح کے سات رنگوں سے رنگا گیا ہے۔ سامنے کی طرف اسٹیج ہے، جس کی دیواروں اور پہلوؤں پر بھی قوس قزح کے رنگوں کی گل کاری ہے۔ یہ حصہ شعرا حضرات کے لئے مخصوص تھا۔ چبوترے کی تزئین مشرقی انداز سے کی گئی تھی۔ اس پر ہر طرف قالین بچھے ہوئے تھے اور درمیانی مسند پر مخمل کے گاؤ تکیہ رکھے تھے۔ اور ان کے آس پاس چمکدار اگالدان۔ کشادہ صحن میں مہمانوں کے لئے کرسیاں لگا دی گئی تھیں۔ اگلی دو صفیں خصوصی مہمانوں اور خواتین کے لئے تھیں باقی صفیں دوسرے مہمانوں کے لئے۔ مشاعرہ شروع ہونے سے بہت پہلے شعرا حضرات اور سامعین کی آمد شروع ہو گئی اور جب پونے نو بجے کے قریب ساری نشستیں بھر گئیں تو مشاعرہ شروع ہوا۔ مشاعرہ کی صدارت حضرت سیماب اکبر آبادی نے فرمائی۔ سب سے پہلے جناب صدر نے اپنا خطبۂ صدارت پڑھا اور اس میں پابند شاعری کے محاسن سے فاضلانہ بحث کی۔ اس کے بعد شعرا حضرات نے طرح کی غزلیں سنائیں طرحی غزلیں پڑھنے والے شعرا میں حضرت سیماب، حضرت ہادی مچھلی شہری، حضرت اسعد شاہجہانپوری، جناب ارم لکھنوی، جناب ادیب سہارنپوری، جناب ضیا اکبر آبادی، جناب راغب مراد آبادی اور بعض دوسرے شعرا نے طرح میں غزلیں کہی تھیں۔ جب غزلیں ختم ہو چکیں تو مشاعرہ میں شریک ہونے والے دوسرے شعرا نے غیر طرحی کلام پڑھا۔ جناب حامد لکھنوی جناب آلِ رضا لکھنوی، جناب اسد ملتانی، جناب نہال سیوہاروی، جناب رئیس امروہوی، جناب زیبا ردولوی، جناب الطاف گوہر، جناب جمیل نقوی، جناب شان الحق حقی اور جناب تابش صدیقی کا کلام بڑے ذوق شوق سے سنا گیا۔ بعض حضرات سے دوبارہ پڑھنے کی بھی فرمائشیں کی گئیں۔ مشاعرے میں کچھ شاعرات کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ ان میں سے نسیمہ سوز صاحبہ نے تشریف نہ لانے کی معذرت کرتے ہوئے اپنی ایک نظم بھیجی تھی۔ نظم مشاعرے میں سنائی گئی تو سامعین نے اسے بے حد پسند کیا گیا۔ ان اشعار کو خصوصاً بار بار پڑھوایا گیا ؎

چمک چمک کے تمہیں بجلیاں بلاتی ہیں — برس برس کے گھٹائیں سلام کہتی ہیں

کلی کلی کا تبسم سلام کہتا ہے — چمن چمن کی فضائیں سلام کہتی ہیں

مشاعرہ ۱۲ بجکر کچھ منٹ پر ختم ہوا۔ شعرا حضرات کو رخصت کیا گیا سامعین گھروں کو سدھارے اور انجمن کی رنگین فضا میں خاموشی چھا گئی۔

آپ کے لئے

اگر آپ چاہتے ہیں کہ ماہِ نو کے صوری و معنوی محاسن میں برابر اضافہ ہوتا رہے تو اسکا حلقۂ اشاعت بڑھائیے۔ یہ پاکستانی ادب اور تمدن کی خدمت ہے۔

احمد ندیم قاسمی

پاکستان

رہگذرِ باد پر، اک چراغ جلتا ہے

وقت، اسکے گرد و پیش، کروٹیں بدلتا ہے

ان گنت پتنگے ہیں اس دئے کے رکھوالے

اس کے رنگ کے پیاسے، اسکی لَو کے متوالے

تند سا کوئی جھونکا جب اسے نچاتا ہے

کانپتی ہوئی لَو میں پھول کھلکھلاتا ہے

آندھیاں بھی آتی ہیں، بدلیاں بھی چھاتی ہیں

ضو فشانیاں اس کی پھیلتی ہی جاتی ہیں

اِک چراغ کے دم سے، ہر طرف چراغاں ہے

ظلمتوں کے طوفاں میں روشنی خراماں ہے

ہر طرف پتنگوں کی بے شمار لاشیں ہیں

یا لپکتے دریا پر چاندنی کی قاشیں ہیں

چاند ڈوب جاتا ہے جب خموش جھیلوں میں

ہولناک سناٹا گونجتا ہے ٹیلوں میں

سطحِ آب پر لہریں ناچتی ہیں گاتی ہیں

اور لوگ کہتے ہیں، چاند کو بلاتی ہیں

اسطرح پتنگے بھی اُڑ گئے ہواؤں میں

اور چراغ روشن ہے سنسناتی راہوں میں

سطحِ آب پاتی ہے چاندنی سے جولانی

اور ان پتنگوں سے یہ دیا ہے نورانی

سیماب اکبرآبادی

غزل

سبو پر، جام پر، شیشے پہ پیمانے پہ کیا گزری
نہ جانے میں نے توبہ کی تو میخانے پہ کیا گزری

بتائیں برہمن اور شیخ، ان کی خانہ جنگی میں
خداخانے پہ کیا بیتی، صنم خانے پہ کیا گزری

ملیں تو فائزانِ منزلِ مقصود سے پوچھوں
گزرگاہِ محبت سے گزر جانے پہ کیا گزری

کسی کو میرے کاشانے سے ہمدردی نہیں شاید
ہر اک یہ پوچھتا ہے میرے کاشانے پہ کیا گزری

نہ ہو جو زندگی انجام، وہ وجدانِ ناقص ہے
حضورِ شمع بعدِ وجد پروانے پہ کیا گزری

تو اپنے ہی مآلِ سوزِ غم پر غور کر پہلے
تجھے اس سے نہیں کچھ بحث پروانے پہ کیا گزری

تری ہر سو تجلی اور میری ہر طرف نظریں
تجھے تو یاد ہوگا آئینہ خانے پہ کیا گزری

کسی حکمت سے کر دے کوئی گویا مرنے والوں کو
یہ راز اب تک ہے سربستہ کہ مر جانے پہ کیا گزری

زباں منہ میں ہے، عرضِ حال کر، تو نے تو دیکھا ہے
کہ خوئے ضبط و خاموشی سے پروانے پہ کیا گزری

وہ کہتا تھا خدا جانے بہار آئے تو کیا گزرے
خدا جانے بہار آئی تو دیوانے پہ کیا گزری

یہ ہے سیماب اک ناگفتہ بہ افسانہ، کیا کہیے
وطن سے کنجِ غربت میں چلے آنے پہ کیا گزری!

ہادی مچھلی شہری

غزل

وفورِ شوقِ جانبازی میں دیوانے پہ کیا گزری
خبر کیا شمع بیخود کو کہ پروانے پہ کیا گزری

میں جب تک بے خودی سے باہر تھا دنیا میری قائم تھی
خبر مجھ کو نہیں اب ہوش میں آنے پہ کیا گزری

نگاہِ مستِ ساقی کا اثر تھا ذرے ذرے پر
کسے تھا ہوش جو دیکھے کہ میخانے پہ کیا گزری

نہیں معلوم کیا میں نے کہا اور کیا سنا اس نے
خدا ہی کو خبر ہے میرے افسانے پہ کیا گزری

مجھے قیدِ قفس میں کیا خبر اپنے نشیمن کی
گریں جب بجلیاں تو اس سیہ خانے پہ کیا گزری

نگاہِ مستِ ساقی کا اثر اس پر ہوا کیسا
لگا کر منہ سے دیکھے کوئی پیمانے پہ کیا گزری

مجھے ہادی نہیں معلوم بزمِ نازِ جاناں کی
مرے آنے پہ کیا گزری، مرے جانے پہ کیا گزری

اسعد شاہجہاں پوری

غزل

قطرہ قطرہ سرِ دامن دلِ ناشاد آیا
بے خودی تو ہی بتا دے مجھے کیا یاد آیا

ہوں وہ ناشاد قفس تشنۂ آہنگِ بہار
شاخِ گل تک بھی نہ پہنچا تھا کہ صیاد آیا

زندگانی کے مزے شوق و تمنا کا ہجوم
مجمعِ حشر میں ہنگامۂ دل یاد آیا

اب تری شرم کی بیداد چھپاؤں کیونکر
کہے دیتی ہیں نگاہیں کہ میں ناشاد آیا

پھر ترے کفرِ محبت نے قسم دی مجھ کو
پھر مجھے سجدۂ محرابِ وفا یاد آیا

میں خرابات سے نکلا تو نئی تھی دنیا
غم سے بیگانہ ہوا فکر سے آزاد آیا

برق چمکی کہ دھواں دل سے اٹھا تا بہ فلک
آشیاں یاد نہ آتا تھا مگر یاد آیا

آسمانوں پہ فرشتے ہیں زمیں پر انساں
کوئی تسکین بھی دینے دمِ فریاد آیا؟

پھر ابھرنے لگے جذباتِ ستم ہائے اسعد
پھر اسے شیوۂ اربابِ وفا یاد آیا

ارقم لکھنوی

غزل

حضورِ دوست خونِ التجا کیا — اگر ہو بھی تو اس کا خوں بہا کیا

نہیں کھوٹے جو ان کی غیرت میں — تو پھر اپنے لئے باقی رہا کیا

نہ جانیں شوق میں کیا کہہ گئے ہم — نہ جانیں سننے والے نے سنا کیا

محبت نے سمجھ رکھا ہے اک ربط — وگرنہ میرا اُن کا واسطہ کیا

مٹایا دل نے لیکن سوچتا ہوں — نہیں اب کچھ مگر پہلے بھی تھا کیا

محبت ہر نظر پہچانتی ہے — بظاہر آشنا، نا آشنا کیا

نہیں جب اپنی کوشش ہی مکمل — حوادث کا خیالی آسرا کیا

جہاں خودداریوں کا خون بہہ جائے — اسی در پر فقیرانہ صدا کیا

مری کشتی ہے تیرے ہی حوالے — خدایا اعتبارِ ناخدا کیا

جفاؤں میں بھی ان کی اک کشش ہے

ارقم میں کیا، مِری سی وفا کیا

ادیب سہارنپوری

غزل

خرابِ دوریٔ منزل ہیں کیا کیا

بچارے سست رَو کیا، ہادِ پا کیا

مری خود آگہی کی حسرتیں ہیں

کلیسا کیا۔ حرم کیا، بتکدہ کیا

گئی ان کی نہ بیگانہ نگاہی

ہمارا دل یونہی تڑپا کیا

نہیں ہوتی گوارا ان کی دوری

گوارا ورنہ ہو جاتا ہے کیا کیا

کچھ اس انداز سے لوٹے گئے ہم

سبھی کہنے لگے ان کی خطا کیا

ہمیں اپنے کو جب بھولے ہوئے ہیں

رہے گا یاد انہیں عہدِ وفا کیا

کسے معلوم دیوانوں کی ضد سے

گذر جاتی ہے فرزانوں پہ کیا کیا

وہی بے رونقی ہے انجمن میں

بپا ہیں ورنہ ہنگامے تو کیا کیا

صہبا اکبر آبادی

غزل

جو توبہ ہم نے کی ساقی تو میخانے پہ کیا گذری
جدا ہو کر ہمارے لب سے پیمانے پہ کیا گذری

نہ پوچھ اے ہمنشیں ابرِ بہار آنے پہ کیا گذری
قیامت دل پہ گذری برق کاشانے پہ کیا گذری

نظر آتا تھا جلنا شمع کا اربابِ محفل کو
یہ پروانے سے بھی پوچھا کہ پروانے پہ کیا گذری

دلِ حیراں سے پوچھو حال اپنی جلوہ سازی کا
نظر کو کیا خبر ہے پردہ اُٹھ جانے پہ کیا گذری

تری محفل میں میرا بیٹھنا بے لطف تھا لیکن
ذرا یہ بھی تو سُن لوں میرے اٹھ جانے پہ کیا گذری

یہ افسانہ برہمن کی نگاہِ یاس سے سُنیے
کہ پوجا چھوڑ دی میں نے تو بت خانے پہ کیا گذری

یہ دیواروں پہ چھینٹے خوں کے یہ زنجیر کے ٹکڑے
فضا زنداں کی شاہد ہے کہ دیوانے پہ کیا گذری

دلِ مایوس سے سارا زمانہ پوچھنے آیا
بتا اے خود فراموش ان کے یاد آنے پہ کیا گذری

صبا گلشن میں آکر یہ تصور کھائے جاتا ہے
میں ویرانے کو چھوڑ آیا تو ویرانے پہ کیا گذری

ماہِ نو۔ کراچی۔

راغب مراد آبادی

غزل

تمنّائے دلِ دردآشنا کیا
صدا دیتا ہے سازِ بے صدا کیا!

سناؤں اپنے دل کا ماجرا کیا
ہے دنیا میں کوئی دردآشنا کیا!

خیال آنے لگے ہیں دل میں کیا کیا
دیارِ دوست نزدیک آگیا کیا!

طلب توہینِ اربابِ وفا ہے
زباں پر آئے حرفِ مدعا کیا!

ہے دو روحوں کی یکرنگی محبت
کہیں یہ راز تم سے برملا کیا!

کسی کا ہر ستم جانِ کرم ہے
رُوا کہتے ہیں کس کو ناروا کیا

حباب آسا ہیں دریائے فنا میں
ہماری ابتدا کیا انتہا کیا

وہ جانِ عشق خود پُرسانِ غم ہے
اب اس سے بڑھ کے ہوگا معجزا کیا

جنوں خضرِ رہِ منزل تھا جن میں
خرد بھٹکی ہے اُن راہوں میں کیا کیا

سرِ تسلیم کعبے سر جھکا دوں!
سمجھ لوں اس کو تیرا نقشِ پا کیا؟

ہمارا ادب۔ تقسیم سے پہلے، تقسیم کے بعد

آفتاب احمد

پاکستان کی تحریک اور پاکستان کے قیام سے مسلمان عوام نے فی الحال اور چاہے کچھ نہ پایا ہو، اتنا تو ضرور ہے کہ ان کا قومی احساس ایک نئی کروٹ کے ساتھ جاگ اٹھا ہے۔ ہماری نئی زندگی اور نئی تعمیر کا سب سے روشن پہلو یہی ہے کہ ایک بار پھر ہم اپنے اندر اس احساس کی لرزشیں محسوس کر رہے ہیں، کم سنی کی وجہ سے اس نئے قومی احساس میں ابھی بھڑک، تندی اور عصبیت زیادہ ہے، اور شاید اسی لئے اس احساس سے سرشار مسلمان ادیب، آزادی کے اس ایک سال کے دوران میں، زیادہ تر ہنگامی قسم کا ادب ہی پیدا کر سکے ہیں حقیقی قومی ادب، یعنی وہ ادب جس میں پاکستان کی زندگی کی بُو باس آئے گی، وہ تو اس وقت پیدا ہوگا جب کچھ وقت گزرنے پر یہ احساس قوم اور ادیب کے شعور میں رَس بَس جائے گا تبھی اس احساس کو وہ رچاؤ، وہ نرمی اور لچک اور وہ بردباری نصیب ہوگی جسے دنیا کے مختلف مگر عظیم کلچرل سرمایوں کی قدر مشترک کہنا چاہیئے۔

میں نے اسی قومی احساس کو کم سن کہا ہے، اس لئے کہ اس کا عوام کے شعور کی سطح پر اس نئی آب و تاب سے اُبھر آنا، زیادہ دنوں کی بات نہیں، ورنہ ایک لحاظ سے تو یہ احساس بالکل نیا نہیں ہے، بلکہ اتنا پرانا اور سخت جان ہے کہ محض اسی کے دم قدم سے مسلمان بطور قوم زندہ رہے ہیں، ہمارے عوام کی روزمرہ زندگی اور اس کی جزئیات میں یہ احساس کچھ دبا ہوا، کچھ چھپا ہوا ہمیشہ قائم رہا ہے، تبھی تو انہوں نے اپنی زندگی کے مخصوص رنگ ڈھنگ، اس کے طور طریقے، اس کے آداب و رسوم کو نہ صرف یہ کہ مٹنے نہیں دیا بلکہ انہیں اپنی متاع عزیز سمجھا اور ان کا احترام کیا، دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کہ وہ اس حقیقت کو عملاً ثابت کرتے رہے کہ ہندی مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں، ان کا اپنا ایک کلچر ہے، ان کی کچھ روائتیں ہیں۔

آج کل کبھی کبھی یہ طعنہ سننے میں آجاتا ہے کہ صاحب "مسلمان ایک قوم ہیں" کا نعرہ محض ایک سیاسی حربہ تھا جو آپ کی ملک گیری کی جنگ میں کامیاب نکل آیا، اب اسے آپ کہاں تک لئے پھریں گے؟ قائد اعظم مرحوم نے ایک نظریہ تراشا اور بات چل نکلی، بس یہ ہے اس کی حقیقت۔ مجھے تسلیم ہے کہ سیاست کے میدان میں قائد اعظم ہی نے اس نظریے کو پاکستان کے مطالبہ کی اساس قرار دیا، مگر مجھے اصرار ہے کہ یہ نظریہ محض نظریہ نہیں، بلکہ ایسی گہری حقیقت ہے جس کی جڑیں مسلمانوں کے شعور میں پیوست ہیں، اور اس کا اظہار نظریوں سے کہیں زیادہ قابل قدر اور وقیع صورتوں میں ہوتا رہا ہے، غدر کے بعد سے یعنی سر سید سے اقبال تک مسلمانوں کے شعور کے سب سے بڑے مظہر یعنی ان کی فکری اور ادبی تاریخ میں شاید ہی کوئی بڑا آدمی ایسا گذرا ہو جو ہندی مسلمانوں کی کلچرل روایت اپنے اندر علیٰ قدر مراتب جذب نہ کئے ہوئے ہو یا جسے یہ احساس نہ ہو کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں، ان کی اپنی ایک ہستی ہے۔ اور وہ یقیناً اس قابل ہے کہ اسے زندہ رکھا جائے۔ ان بڑے آدمیوں میں خود مولانا ابوالکلام آزاد بھی شامل ہیں۔

سنہ ۳۰ء کے لگ بھگ مسلمانوں کے قومی لیڈر مولانا محمد علی گول میز کانفرنس کی کارگزاریوں سے مایوس ہو کر دنیا سے چل بسے۔ اس وقت ان کی جگہ لینے والا کوئی نہ تھا چنانچہ مسلمانوں کی سیاست پر ایک جی بیٹھ جانے والی اداسی اور تھکن چھا گئی۔ یہ مضمحل فضا کمیونزم کو بڑی راس آئی اور ہندوستان کے ولایت پاس کمیونسٹ نوجوانوں کی بدولت ہمارے ہاں کمیونزم کا اثر پھیلنے لگا۔ خصوصیت سے اہل دماغ طبقے میں ایک ہیجان پیدا ہوگیا۔ ادب میں ترقی پسندی کی تحریک چلی۔ قوم کا پرانا تصور بے معنی قرار پایا، معیشت اور سیاست کے نئے نظریوں کے زیر اثر ادیبوں نے سماج کے نچلے طبقوں سے رشتہ جوڑنا چاہا۔ ہندو مسلم کی تفریق مٹ گئی، "عوامی ادب" کے لئے راستہ صاف ہوگیا۔ مسلمان ادیب اپنا مخصوص قومی احساس کھو بیٹھے، ترقی پسند تحریک نے حال کے معاشی اور سیاسی تجزیے پر زور دیا اور مستقبل کے متعلق بڑے بڑے حسین خواب دکھائے، آج دس سال گزر جانے کے بعد ہمیں یہ احساس ہو رہا ہے کہ ہندوستان کی سیاسی حالت کے متعلق ترقی پسندوں کا تجزیہ کس قدر دور از کار اور غلط نکلا۔ بات یہ ہے کہ ترقی پسندوں کا نقطۂ نظر زندگی کے حقائق کے بلاواسطہ مطالعہ سے نہیں بلکہ کمیونزم کی تعلیمات کے زیر اثر پیدا ہوا تھا، اس میں نظریہ بازی زیادہ تھی حقیقت کم، ترقی پسند اپنے ممدوح طبقے تک زندگی کی راہ سے نہیں، کتاب کی راہ سے پہنچے تھے، وہ اپنے تصورات میں محو تھے اور تاریخ کی اور ہی ڈھب

پر چل رہی تھی، چنانچہ مستقبل کے متعلق ان کے خواب، خواب پریشان ثابت ہوئے۔ اس کا ثبوت ترقی پسندوں کی وہ نظمیں ہیں جو انہوں نے ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کے متعلق لکھی ہیں۔

ترقی پسند تحریک شروع تو حقیقت نگاری کے نام پر ہوئی تھی مگر اس کے زیر اثر جو ادب پیدا ہوا وہ بہت حد تک نظریاتی تھا خصوصیت سے شاعری، ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ تحریک بڑی حقیقت فراموش اور رومانیت پسند رہی ہے۔ یہ ایک ادبی بوالعجبی ہے اور اس کی وجہ میرے خیال میں یہ ہے کہ ہمارے ادیبوں نے آس پاس کی زندگی کو بھلا کر نظریوں سے متاثر ہونا شروع کر دیا تھا یعنی مطلب یہ ہے کہ وہ زندگی کو دیکھتے تھے تو محض نظریوں کی عینک چڑھا کر، چنانچہ اس کی صرف مخصوص رنگ ہی نظر آ سکتے تھے۔ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ زیادہ تر ترقی پسندوں کے نظریوں پر عائد ہوتا ہے، اس سے مجھے انکار نہیں کہ ادیبوں کے ہاں حقیقت نگاری کے بڑے کامیاب نمونے بھی مل جاتے ہیں، خصوصیت سے افسانوں میں، اس کے علاوہ ترقی پسند اردو میں ایک نیا ہنگامہ، ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا کرنے کے موجب ہوئے اور یہ چیزیں بذات خود قابل قدر ہیں، اس تحریک کے ذکر سے مجھے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ اس کے زیر اثر مسلمان ادیبوں نے اپنا قومی احساس کھو دیا۔

پاکستان کے قیام نے مسلمان ادیبوں میں پھر اس قومی احساس کو ابھارا۔ وہ پھر اپنی قوم کو یاد کرنے لگے ہیں اس کا احترام کرنے لگے ہیں۔ انہیں اپنی تہذیبی اور ثقافتی روایات کے تحفظ اور ترقی کی فکر ہونے لگی ہے۔ اصل میں تو خود پاکستان کا مطالبہ بھی اسی بنا پر کیا گیا تھا کہ ہم اس کلچر کو زندہ رکھنا چاہتے تھے جو ہندوستان میں مسلمانوں کی بدولت پیدا ہوا، کیونکہ ہمیں یہ خوف تھا کہ متحدہ ہندوستان میں ایک معاندانہ ہندو اکثریت کا کلچر اسے برداشت نہیں کر سکے گا اور ہر حیلے بہانے اسے مٹانے کی کوشش کرے گا۔

اس ہند اسلامی کلچر کا سب سے ممتاز کارنامہ اور سب سے حسین یادگار اردو ہے۔ اسی لئے تو اردو کو پاکستان کی قومی زبان تسلیم کیا گیا ہے۔ حالانکہ اردو پاکستان کے کسی حصے کی بھی مادری زبان نہیں ہے۔ مادری زبان یہ اس برعظیم کے اس حصے کی ہے جس سے ہم سیاسی اور جغرافیائی طور پر ہمیشہ کے لئے کٹ گئے ہیں، لیکن اب وہاں سے اسے دیس نکالا مل گیا ہے، اردو کو اب پاکستان میں اپنا گھر بنانا ہے۔ اسی اعتبار سے بعض اوقات اردو کو مہاجر زبان کہا جاتا ہے۔

اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ میں اردو کو پاکستان میں غیر یا اجنبی زبان کا درجہ دے رہا ہوں۔ ہرگز نہیں، تعلیمی لحاظ سے پاکستان کے سب سے ترقی یافتہ صوبے یعنی مغربی پنجاب کی زبان سوائے بول چال کی زبان کے، ہر اعتبار سے اردو ہی رہی ہے، اور یہاں کے شہریوں کی پنجابی اور دیہات کے معمولی پڑھے لکھوں کی پنجابی کو اردو ہی کی ایک شاخ سمجھنا چاہیئے، فرق ان میں ضرور ہے، مگر پاکستان کی دوسری زبانوں کی بہ نسبت یہ زبان اردو سے بہت زیادہ مماثلت رکھتی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو پنجاب میں پیدا ہوئی اور یہاں سے نکل کر ہندوستان اور دکن میں جا پھیلی اور وہیں پلی بڑھی صرف یہی نہیں کہ پنجاب میں لکھنے پڑھنے کی زبان مدتوں سے اردو ہی چلی آتی ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ پنجاب میں اردو کے تخلیقی ادب کی ایک شاندار اور مایۂ ناز روایت بھی موجود ہے جس کی عمر پچاس برس سے اوپر ہونے کو آئی ہے، اس روایت کی اہمیت اور عظمت اسی سے ظاہر ہے کہ اس کا بیج خود حالی اور آزاد کے ہاتھوں بویا گیا تھا اور اس میں اقبال ہو گزرا ہے اور اس کو پروان چڑھانے میں سر عبدالقادر جیسے لوگ پیش پیش رہے ہیں اور ہر نئے ادب کے ضمن میں تو پنجاب کا نام زبانوں پر سب سے پہلے آتا ہے۔

اب تک پاکستان میں جس طرح اردو کی آؤ بھگت ہوئی ہے اور جس طرح پاکستان کے اہل اقتدار نے اردو کی اہمیت پہچانی ہے، وہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہم اردو کو اپنے کلچر کی عزیز ترین متاع اور پاکستان میں کلچرل وحدانیت پیدا کرنے کا سب سے مضبوط وسیلہ سمجھتے ہیں، اردو کو اپنانے اور اسے عام کرنے کے چرچے ہو رہے ہیں، سکولوں۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے اور اسے بتدریج انگریزی کی جگہ دینے کی اسکیمیں بن رہی ہیں، یہ جو کچھ ہو رہا ہے بڑا نیک شگون ہے، اردو پھیلے گی اس میں نئے نئے مضامین آئیں گے، رنگا رنگ دلچسپیاں پیدا ہونگی، اس کو ہر قسم اور ہر خیال کے پڑھنے والے ملیں گے۔ اردو کی دنیا میں یہ ریل پیل اور گہما گہمی صرف زبان ہی کے لئے نہیں ہمارے تخلیقی ادب کے لئے بھی بڑی سازگار ثابت ہوگی، یہ فضا ہمارے ادیبوں کی بہت سی مشکلات کو رفع کر دے گی، یہ جو کبھی کبھی ہمارے نئے ادیب اردو میں لکھتے ہوئے انگریزی ترکیبوں اور محاوروں میں جکڑے ہوئے اور دلیے احساس اور زبان کی کشمکش میں بے طرح الجھے ہوئے نظر آتے ہیں، شاید ایسا پھر نہیں ہوگا، جب وہ سب کچھ اردو میں پڑھیں گے تو ان کو اردو میں کھل کر بات کرنے کا ڈھب بھی آ جائے گا۔ جب اردو ان کے ذہن کی رگ رگ میں اتر جائے گی۔ تب ہمارا ادب احساس و شعور کی ان دیکھی سرزمینوں کو دریافت کرے گا اور اظہار اور ترجمانی کے نامعلوم وسیلوں کو ممکن بنائے گا۔

لیکن اردو کو عام کرنے کی ہماہمی میں اگر ہم ایک بات بھول گئے تو اس کی تلافی مشکل سے ہو سکے گی۔ میں نے "اگر بھول گئے" کہا ہے مگر حقیقت یہ ہے

کہ گذشتہ چند برسوں سے ہم واقعی اس کو کچھ بھولے ہوئے ہیں، ترقی پسند ادب ہی نہیں ہمارے نئے ادب کی تحریک اس کی شاہد ہے۔ اصل میں بات یہ ہے کہ قومی احساس تیز ہو تو ماضی کا احترام بھی قائم رہتا ہے۔ گزرے ہوؤں کی یاد آتی رہتی ہے، ہم نے قومی احساس کھویا تو زندگی کے دوسرے شعبوں کے ساتھ ساتھ اپنے ادب کے ماضی سے بھی بے نیاز ہو گئے، اس کی بہت سی وجہیں اور بھی تھیں جن کے تجزیے کا یہاں موقع نہیں، ادیب کے پرکھنے کا ایک معیار جو ہمیں ایلیٹ نے دیا ہے اس پر نئے ادیب بہ حیثیت مجموعی پورے نہیں اترتے، یعنی ان کے ہاں ماضی جیتا جاگتا محسوس نہیں ہوتا، اور نہ کچھ "میا نے سر دن" کی گونج سنائی دیتی ہے، اور باتوں میں شاید یہ بیگانگی چل سکتی تھی مگر ادب میں اس کا چلنا محال تھا، ماضی سے بے تعلق رہنے میں ایک شائبہ بغاوت، ایک نشۂ خود پسندی بھی تو موجود ہے۔ چنانچہ نئے ادب کی تحریک بڑی دھوم دھام سے شروع ہوئی کچھ عرصہ بڑے زوروں پر رہی مگر جلد ہی نڈھال ہونے لگی اور سات آٹھ برس کے عرصے میں اس کی ترقی تمام ہو گئی، اس کے زوال کی ایک وجہ میرے خیال میں یہ بھی ہے کہ ہمارے ادیبوں نے اپنے آپ کو روایت سے پیوست نہیں کیا تھا، انہوں نے زمین سے اپنے پاؤں اوپر اٹھا لئے تھے اور وہ ہوا میں فراٹے بھرنے لگے تھے اسی لئے ان کا دم جلد ٹوٹ گیا،

نئے ادب کی تحریک میں پنجاب کے ادیب سب سے آگے تھے۔ کیونکہ ان کا اردو کی روایت سے پیوست ہونا اوروں کی بہ نسبت بہت زیادہ مشکل تھا، ان کے اور اردو کے درمیان بُعدِ ذہنی ہی نہیں بُعدِ مکانی بھی تو حائل تھا، اور ادب کی دنیا میں یہ بُعدِ مکانی بڑی خرابیاں پیدا کر سکتا ہے، اردو کی روایت زیادہ تر مغربی یوپی میں پھولی پھلی، اسی سرزمین کی زندگی میں اس کی جڑیں پھیلی ہوئی ہیں، وہیں اردو بول چال کی زبان ہے، پنجاب کے ادیبوں نے یوپی کے کلچر اور اردو سے رشتہ جوڑا تو بڑی ہمت کا کام کیا، ہمارے ہر ادیب کو جو اردو میں لکھنا چاہتا ہے چند "پیدائشی مشکلات" کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ذرا خیال فرمایئے کہ پنجابی ادیب کی بول چال تو ہے پنجابی مجھے تسلیم ہے کہ اس زبان میں اور اردو میں بڑی مماثلت ہے مگر پھر بھی یہ اردو تو نہیں۔ اور روزمرہ کی زندگی میں قدم قدم پر اسے کئی ایسی چیزیں، کئی ایسی جذباتی کیفیتیں، کئی رسم و رواج کئی کہاوتیں اور حکایتیں، ایسی ملتی ہیں جن کے بدل یا جن کو بیان کرنے کے لئے اردو الفاظ اسے میسر نہیں آتے۔ ایک لحاظ سے تو اس مشکل کا کوئی علاج ہی نہیں، لیکن بہت حد تک یہ اس طرح حل ہو سکتی ہے پنجابی ادیب اردو کی صدہا سالہ روایت کو اپنے اندر جذب کریں اور جو فاصلے ان میں اور اردو کے کلچرل گہوارہ میں بدنی طور پر حائل ہیں کم سے کم ذہنی طور پر طے کر لیں، مگر نئے ادب کی تحریک اس انداز سے چلی تھی کہ ہمارے ادیب اردو ادب کے روایتی دھاروں کو تو بڑا حقیر جاننے لگے تھے، ان سے تو انہوں نے واقفیت ہی پیدا نہ کی آجکل کے ہمارے ادیب اگر پڑھتے تھے تو انگریزی ادب پڑھتے تھے اور اسی سے متاثر ہوتے تھے۔ اب صورت یہ ہو گئی کہ ہمارے ادیبوں کی بول چال کی زبان تو تھی پنجابی، لکھنے کی اردو اور پڑھنے کی انگریزی جب آپ کو تین زبانوں سے واسطہ پڑ گیا ہو تو آپ کے لئے کسی ایک کو قابو میں لانا آسان نہیں، اور پھر بولنے کی زبان اور لکھنے کی زبان میں جو گہرا رشتہ ہے وہ ایسی بات نہیں جسے فراموش کیا جا سکے، زندہ ادب اس وقت پیدا ہوتا ہے، جب آپ زندہ زبان لکھیں اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب یا تو آپ وہ زبان خود روزمرہ کی زندگی میں بولتے ہوں، دوسرے لوگوں کو بولتے ہوئے سنتے ہوں اور یا آپ نے اس کے اکتساب میں اتنی ریاضت کی ہو کہ آپ اس زبان پر پوری طرح حاوی ہو گئے ہوں، اس کی رگ رگ کو پہچانتے ہوں۔ اس کی آوازوں اور رنگوں سے آشنا ہوں۔ اس کے مزاج کو پا گئے ہوں یہ سب باتیں پنجاب کے نئے ادیبوں میں کم پائی جاتی ہیں۔ انہوں نے اردو کی بڑی خدمت کی ہے اردو شاعری اور اردو افسانے کو نئی راہوں پر لا ڈالا ہے انہوں نے حتی المقدور اس جدید طرزِ احساس و شعور کی ترجمانی کی ہے جو ہمارے ہاں مغرب کے زیرِ اثر پیدا ہوا ہے، اور اس طرح انہوں نے اردو ادب کو وقت سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے ایسے ایسے بیباک تجربے کئے ہیں جو اگر اپنی کامیابیوں کے بل بوتے پر نہیں تو کم از کم اپنی ذہنی اپج ہی کی وجہ سے اردو میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ یہ سب کچھ ہے مگر انہوں نے اردو کی ماضی سے بیگانہ ہو کر اپنے ادب میں ایک قسم کی اجنبیت، نیم پختگی اور ادھورا پن پیدا کر لیا ہے، یہ سب باتیں میں عام طور سے کہہ رہا ہوں کچھ ادیب ان سے یقیناً مستثنےٰ ہیں۔ مثلاً فیض کے ہاں روایت اور اختراع کا بہت کامیاب امتزاج ملتا ہے، فیض کا طرزِ احساس و شعور بالکل نیا ہے مگر اس کی نظموں کی زبان اور لب و لہجہ میں وہی روانی اور شگفتگی، وہی رچاؤ اور رسیلا پن، وہی رمزیت اور تاثر کا وہی ارتکاز پایا جاتا ہے جو اردو غزل کے امتیازی اوصاف ہیں، نئے شاعروں میں شاید فیض ہی ایسا شاعر ہے جس کو پڑھ کے آپ کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اس نے اردو شاعری پڑھ رکھی ہے اور وہ اس کے زندہ عناصر کو اپنی شخصیت کا جزو بنانے میں کامیاب بھی ہوا ہے۔

بہرحال نئے ادب کی تحریک جیسی کچھ بھی تھی اپنی ایک منزل پوری کر چکی،

اس کے بڑے بڑے ادیب تقریباً خاموش ہو چکے۔ اب اگر وہ کبھی بولتے بھی ہیں تو ان کی آواز میں وہ بات نہیں ہوتی جو آج سے چند برس پہلے فضا میں تھرتھری پیدا کر دیتی تھی، اب محفل کا رنگ اور ہے، وقت نے نئی کروٹ بدلی ہے اپنی نئی تعمیر میں ہم اردو کو نمایاں جگہ دے رہے ہیں۔ مگر مجھے جس چیز پر زور دینا ہے اور جس کی خاطر میں نے نئے ادب کی تحریک پر ایک سرسری نگاہ ڈالی ہے۔ وہ یہ ہے کہ پاکستان میں اردو کا مسئلہ محض حکومت اور یونیورسٹیوں کی کارکردگی سے حل نہیں ہو سکتا۔ حکومت اور یونیورسٹیاں زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتی ہیں کہ اردو کو عام کر دیں، اس کے استعمال کا دائرہ وسیع کر دیں۔ یہ بہت بڑی بات ہے اور بہت مفید بھی۔ میں نے ابھی تسلیم کیا ہے کہ اس سے اردو کا تخلیقی ادب بھی ایک نئی زندگی پائے گا۔ مگر نئے ادب کے تجربے سے ہمیں ایک چیز حاصل ہوئی ہے اور میں اس پر زور دینا چاہتا ہوں، اگر ہم ادب کی صحیح نشو و نما اور ترقی چاہتے ہیں تو ہمیں اردو کی روایت کو ہندوستان سے اکھاڑ کر پاکستان میں لا بسانا ہوگا۔ ہمیں اردو کے پرانے گھر کا اثاثہ اس کے نئے گھر میں منتقل کرنا ہوگا، اور یہ وہ ایک "مہاجر" ہے جسکے گھر کے اثاثہ پر ہندو سرکار نے پہرے نہیں بٹھا رکھے! یہ کام نہ حکومت کر سکتی ہے نہ یونیورسٹیاں یہ ان کے بس کی بات ہی نہیں، یہ کام ہے پاکستان کے نئے ادیبوں کا نئے نقادوں کا، اس کیلئے کچھ ذہنی کاوش کرنی پڑیگی، لیکن اگر ہمیں اپنے قومی کلچر کو زندہ رکھنا مقصود ہے تو اس کے بغیر چارہ نہیں، ہم کپڑے کی ملیں اور لوہے کے کارخانے تو دنوں میں قائم کر سکتے ہیں نیا کلچر اس طرح پیدا نہیں کر سکتے۔ اس کیلئے ایک مضبوط پشتیبان کی ضرورت ہے جو صرف ماضی فراہم کر سکتا ہے۔ کلچر کی دنیا میں ماضی کو بھول کر حال اور مستقبل کی تعمیر ممکن ہی نہیں، مگر ہمارا ماضی، ہمارا کلچر جس سرزمین میں پروان چڑھا، اس کے اور ہمارے درمیان نئی دیواریں ابھر آئی ہیں، نئے فاصلے حائل ہو گئے ہیں، ہم نے اپنی تازہ بستیاں اتنی دور آبسائی ہیں کہ یادِ رفتگاں کے لئے کچھ ہمت درکار ہوگی۔ مگر ان تازہ بستیوں میں رونق اس وقت آئے گی جب یہاں قدم قدم پر یادِ رفتگاں کی مشعلیں روشن کی جائیں گی۔ کہ سے کم ادب اور کلچر کی تازہ بستیاں تو ان کے بغیر آباد ہو ہی نہیں سکتیں، ذرا سوچئے تو کیا ہم میرؔ، سوداؔ، مصحفیؔ، آتشؔ، نظیرؔ، غالبؔ، مومنؔ، انیسؔ، نذیر احمد، سرشار، حالیؔ، آزادؔ، شبلیؔ، سرسید وغیرہ کے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں؟ اس تنظیم کے نقشے پر ایک لکیر کھینچی، اور یہ سب لوگ ہمارے لئے "غیر ملکی" ہو گئے۔

سوال یہ ہے کہ کیا ہم کلچر کی دنیا میں یہ تقسیم قبول کر سکتے ہیں؟ کیا ہم انہیں واقعی "غیر ملکی" سمجھ سکتے ہیں؟ اگر ہمارا مقصد ادب کی تخلیق ہے تو ہمیں ان لوگوں کو اور ان کے ترکے کو پاکستان کی روحانی اور کلچرل زندگی کے اجزا بنانا ہوگا، انہیں پھر سے اپنے درمیان زندہ اور متحرک کرنا ہوگا اور ان کی روحوں کے نور و نغمہ سے دلوں کو گرمانا ہوگا۔ مختصر یہ کہ اس وقت پاکستانی ادب کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ ہم ایک ایسی قوی تنقیدی تحریک پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں جو اس نئی سرزمین میں پرانوں کی یادیں تازہ کرا سکے۔ جو ان تنوں میں نئی جان ڈال سکے، جو نئے ادیبوں کو یہ کہتی ہوئی معلوم ہو کہ "تمہارا آنا مبارک۔ مگر ذرا مڑ کے ایک نگاہ پیچھے ڈال لو۔ دیکھو کیسے کیسے لوگ ہو گذرے ہیں، تمہیں ان کی وراثت کا حقدار بننا ہے"! اپنی روایت سے ایسی ذہنی قربت پیدا کرنے کے بعد ہی ہم اپنے کلچر اور ادب میں وہ تسلسل اور ربط قائم رکھ سکیں گے جو ان کی زندگی اور بقا کے لئے ازبس ضروری ہے۔

کرار نوری

غزل

سرور میں کوئی تلخی نہ تلخیوں میں سرور
یہ کیا مقام خبر ہے کہ غیب ہے نہ حضور

یہاں نہ دادِ نظر ہے نہ جلوۂ پر نور
تو کس جہان میں پیدا ہوا تھا اے منصور!

کوئی تو مقصد ہے چاہیے اس کے دل میں ضرور
تراشتی ہے جو دنیا نئے نئے دستور

بغیر سمجھے ہر اک شے میں کچھ سمجھتا ہوں
زمین بے خبری پر رکھی اساس شعور

نہ جانے کس گل نغمہ نواز کی ہے تلاش
جو شاخ شاخ پہ کچھ دیر بیٹھتے ہیں طیور

فضائے عالمِ ہستی میں تھا سوادِ عدم
مرے خیال کی تابش نے کر دیا پُر نور

نزاکتِ دلِ نوری پہ ضربِ کینۂ دوست
نہ ہو تو کیوں نہ ہو یہ آبگینہ چکنا چور

عقیل ہاشمی

پاکستان کی بین الاقوامی تجارت

پاکستان اور ہندوستان اقتصادی اعتبار سے ایک دوسرے کے دست نگر ہیں۔ ہندوستان کو پاکستان کے فاضل اناج اور خام اشیا کی ضرورت ہے۔ اور پاکستان ہندوستان سے کوئلہ اور تیار شدہ سامان لینا چاہتا ہے۔ تقسیم کے وقت دونوں حکومتوں کے مابین ۳۱ مارچ ۱۹۴۸ء تک کے لئے ایک عارضی معاہدہ ہوا تھا جس کی رُو سے دونوں کے علاقوں میں تجارت بے روک ٹوک قائم رہتی تھی لیکن جب ہندوستان نے سَن پر وصول شدہ محصول برآمد کی رقم میں سے پاکستان کا واجبی حصہ دینے سے انکار کر دیا تو پاکستان نے خود اس مال پر یہ محصول عائد کر دیا۔ اس کے بعد ہندوستان نے جہاں تک بیرونی تجارت کا تعلق ہے، پاکستان کو ایک غیر ملک قرار دے دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں مملکتوں کے درمیان تجارتی پابندیاں بڑھتی گئیں اور اس طرح دونوں کو شدید دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ ۲۶ مئی ۱۹۴۸ء کو دونوں حکومتوں کے درمیان واضح الفاظ میں ایک اور معاہدہ ہوا جس کی اہم شرطیں حسب ذیل ہیں۔

(۱) ہندوستان پاکستان کو یہ چیزیں فراہم کرے گا:- ۱۲،۹۲،۰۰۰ ٹن کوئلہ، ۴،۰۰،۰۰۰ گانٹھ کپڑا اور سوت، ۸۰،۰۰۰ ٹن فولاد، ڈھلا ہوا اور کچا لوہا، ۷،۵۰۰ ٹن کاغذ اور گتا، ۱،۲۷۰ ٹن مرکب و مفرد ادویات، ۲،۵۰۰ ٹن اسبسٹوس سیمنٹ کی چادریں، ۲،۵۰۰ ٹن روغن، انیمل اور وارنش، ۸۰،۰۰۰ امارز اور ٹیوب، کافی مقدار میں دباغت شدہ چمڑا اور چمڑے کے جوتے، ۱۰،۰۰۰ ٹن مالاباری لکڑی، ۵۰،۰۰۰ ٹن سن سے بنی ہوئی اشیا، ۲۰،۰۰۰ ٹن بسیلہ یا پتھر، ۱۱،۰۰۰ پونڈ سادے اور بٹے ہوئے اون کا مال، ۲۰،۰۰۰ ٹن رائی کا تیل، ۵،۰۰۰ ٹن مونگ پھلی کا تیل، ۲،۰۰۰ ٹن عمدہ صابن اور ۷،۰۰۰ پونڈ تمباکو

(۲) پاکستان ہندوستان کو یہ چیزیں فراہم کریگا:- ۵۰،۰۰،۰۰۰ گانٹھ سن، ۶،۵۰،۰۰۰ گانٹھ کچی روئی، ۱،۵،۰۰۰ ٹن اناج، ۱،۰۰۰ ٹن جپسم روزانہ، ۲۷،۰۰،۰۰۰ عدد کچی اور صاف کی ہوئی کھالیں، ۲۰،۰۰۰ ٹن لاہوری نمک، ۵،۰۰۰ ٹن پوٹاسیم نائٹریٹ اور ۵۵۰ راس مویشی۔

(۳) تاوقتیکہ کوئی اور صورت عمل میں نہ آئے، اشیا کی فراہمی تجارتی اداروں کی معرفت ہوگی۔

(۴) ہندوستان نو لاکھ گانٹھوں سے زیادہ سن باہر نہیں بھیجے گا اور اس میں بھی وہ قسمیں شامل ہوں گی جو ہندوستانی کارخانوں میں کام آنے کے لائق نہیں اور عموماً دساور بھیجی جاتی ہیں۔

(۵) معاہدہ ایک سال کے لئے یعنی یکم جولائی ۱۹۴۸ء سے ۳۰ جون ۱۹۴۹ء تک قائم رہے گا۔

ہندوستان کے سوا دوسرے ملکوں سے پاکستان کے جاری تعلقات کم و بیش انہی بنیادوں پر قائم رہے جن پر تقسیم سے پہلے ان ملکوں کے ساتھ قائم تھے۔ حال ہی میں دونوں حکومتوں کے درمیان ایک نیا معاہدہ پابندی عمل میں آیا ہے جس کی رُو سے ایک ملک کا درآمد یا برآمد شدہ مال حسب ضرورت دوسرے ملک کی سرزمین سے گذر سکے اور اس طرح دوسرے ملک کی بندرگاہ پر کسی قسم کا بحری محصول وصول نہ کیا جائے۔

برآمد | پاکستان سے جو مال باہر جاتا ہے اس میں سَن، کپاس، اون، کھالیں، غلہ، خشک میوے، پہاڑی نمک، جپسم، پوٹیشیم نائٹریٹ اور مویشی خاص طور پر اہم ہیں اور ان میں بھی سب میں اہم سَن ہے۔ سَن کی پیداوار پاکستان میں ۷۰ لاکھ گانٹھیں ہے جس کی قیمت ۱۰۰ کروڑ روپیہ سے کچھ زیادہ ہوتی ہے۔ ۳۰ کی یہ ساری پیداوار بیرونی ممالک کو بھیج دی جاتی ہے۔

سَن کے بعد دوسری قیمتی پیداوار کپاس ہے، کپاس مغربی پاکستان میں پیدا ہوتی ہے اور اس کی پیداوار تقریباً ۱۵،۰۰،۰۰۰ گانٹھیں سالانہ ہے۔ اس کپاس کا زیادہ حصہ لمبی ریشے والی امریکی کپاس کی نسل سے ہے۔ ۱۵ لاکھ گانٹھوں کی اس پیداوار میں سے کوئی ۱۰ لاکھ گانٹھیں ہندوستان جاتی تھیں — ۱۰ لمبے ریشے والی امریکی کپاس کی اور ۲ لاکھ دیسی کپاس کی۔ ۱۹۴۷ء میں کوئی ۱۲ گانٹھوں کے برابر کپاس پیدا ہوئی اور اس سال کی کپاسوں کا زیادہ حصہ ہندوستان کے بجائے دوسرے بیرونی ملکوں کو گیا۔

درآمد | پاکستان دوسرے ملکوں سے جو سامان خریدتا ہے اس میں کارخانے کی بنی ہوئی چیزوں کے علاوہ کوئلہ، لوہا، تیل اور مشینیں شامل ہیں۔ کارخانہ

کی بنی ہوئی چیزوں میں سب سے اہم سوتی کپڑا ہے جس کی مقدار سارے درآمدہ مال کا پچاس فی صدی ہے۔ ان کے علاوہ دوسری ضروری چیزیں شکر، اونی کپڑا، چمڑے کا سامان، جوتے، کاغذ، سائیکلیں، موٹر ٹیوب کیمیائی اشیا اور ادویات ہیں جن ملکوں سے پاکستان مال حاصل کرتا ہے ان میں انگلستان، امریکا اور ہندوستان خاص ہیں۔ تجارت کے معاملہ میں دوسرے ملکوں سے پاکستان کا توازن اس کے حق میں ہے۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ پاکستان کے قیام کے بعد غیر مسلم بیوپاری پاکستان سے چلے گئے اور ان کی خالی جگہ کو پُر کرنے میں دیر لگی اس لئے جو مال باہر کے ملکوں سے آتا تھا اس کی مقدار پہلے سے بہت کم ہو گئی۔

پاکستان اور خاص خاص ملکوں کے درمیان تجارت کی جو صورت حال رہی ہے اس کا اندازہ ذیل کے گوشواروں سے ہو سکتا ہے۔

(۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے ۳۱ مارچ ۱۹۴۸ء تک۔ غیر سرکاری حساب میں)

(لاکھ روپے کی صورت میں)

سخت زر کے علاقے	درآمد	برآمد	بچت
امریکا	۴۶۶	۳۹۶	۷۰
دوسرے سخت زری ممالک	۶۵۳	۷۶	۵۷۷
میزان	۱۱۱۹	۴۷۲	۶۴۷
نرم زری علاقے			
انگلستان (سے)	۱۳۱۶	۴۶۶	۸۵۸
دوسرے ممالک (سے)	۱۷۷۱	۵۵۳	۱۲۱۸
میزان	۳۰۸۷	۱۰۱۹	۲۰۶۸
ہندوستان (سے)	۱۱۵۰۰	۴۰۰۰	۷۵۰۰
میزانِ کل	۱۵،۷۰۶	۵۴۹۱	۱۰،۲۱۵

انگلستان، امریکا اور پاکستان کے درمیان اس عرصہ میں جو تجارت ہوئی اس کی تفصیل ذیل میں درج ہے۔ ہندوستان کی تفصیلیں مہیا نہیں ہو سکیں اس لئے صرف اشیا کے نام درج کر دیئے گئے ہیں۔

انگلستان کے ساتھ

(۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے ۳۱ مارچ ۱۹۴۸ء تک)

لاکھ روپوں میں

اشیا	برآمد	اشیا	درآمد
[illegible]تی اشیا	۸	ہڈی	۵
ادویات	۱۴	کچی کھالیں	۱۴
لوہے کے برتن	۹	کرد ہائیٹ	۴
بجلی کا سامان	۹	پیرافین ویکس	۳۶
ریڈیو	۱۲	چائے	۷۹۳
اسپرٹ	۷	کپاس	۱۵۵
بجلی کی مشینیں	۲۳	سن	۱۷۶
دوسری مشینیں	۱۲۰	اون	۵۲
دھاتیں	۳۱	قالین	۵
مشین میں ڈالنے کا تیل	۸	دوسری اشیاء	۷۶
رنگ روغن	۵		
سوتی کٹ پیس	۱۹		
بننے کا اون	۶		
اونی کپڑا	۱۳		
سگریٹ	۷		
سائیکلیں	۴۲		
موٹریں	۱۱		
ڈاک کا سامان	۲۰	میزان	۱۳۱۶
دوسری اشیا	۱۱۲	بچت	۸۵۰
میزان	۴۶۶		

پاکستان کی تجارت امریکا کے ساتھ

(۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے ۳۱ مارچ ۱۹۴۸ء تک)

(لاکھ روپوں میں)

اشیاء	درآمد	اشیاء	برآمد
پوشش کا سامان	۲۰	پوشش کا سامان	۱
ادویات	۹	ہڈی	۱
لوہے کے برتن	۱۷	کھالیں	۶۵
ریڈیو	۱۲	کپاس	۷۸
مشینری	۸۸	سن	۱۸۵
دھاتیں	۲۲	اون	۱۱۵
مشین میں ڈالنے کا تیل	۴۹	قالین	۴۰
اشیائے خوردنی	۸	دوسری اشیاء	۱۷

اشیاء	درآمد	اشیاء	برآمد
سوتی کپڑا	۱۱	۰	۰
مصنوعی ریشم کا کپڑا	۱۷	۰	۰
سامان آرائش	۱۰	میزان	۴۶۶
موٹریں	۱۲	بچت	۷۰
دوسری اشیاء	۱۴۱		
میزان	۲۹۶		

پاکستان کی تجارت ہندوستان سے
(۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے ۳۱ مارچ ۱۹۴۸ء تک)

لاکھ روپئوں میں

اشیاء	درآمد	اشیاء	برآمد
کپڑا اور سوت	۱۲۵۰	سن	۹۵۰۰
کوئلہ	۲۵۰	کپاس	۱۰۰۰
دوسری اشیاء	۲۵۰۰	دوسری اشیاء	۱۰۰۰
میزان	۴۰۰۰	میزان	۱۱۵۰۰
		بچت[1]	۷۵۰۰

[1] چونکہ یہ گوشوارے ناکافی اعداد و شمار کی بنیادوں پر بنائے گئے ہیں اسلئے ان میں ۵ سے ۱۰ کروڑ تک کی غلطی کا امکان ہو سکتا ہے۔

علی ناصر زیدی

آبدوز کشتی

تین سو سال سے زائد عرصہ گذرا کہ ایک ولندیزی نے جس کا نام ڈربیل تھا پہلا آبدوز ایجاد کیا جس کو بارہ ملاح چلاتے تھے اور دریائے ٹیمز میں تقریباً بارہ فیٹ کی گہرائی پر کئی گھنٹہ تک اس کی مالش کی گئی۔ ۱۸۸۸ء میں فرانسیسی بحری فوج کے لئے پہلی آبدوز کشتی تیار کی گئی۔ اس کا وزن تیس ٹن تھا اور وہ برقی طریقہ سے چلتی تھی۔ جدید برٹش ٹیمز کلاس آبدوز کا وزن اٹھارہ سو پچاس ٹن ہے اور اس کی لمبائی سوا تین سو فیٹ ہے اس میں کام کرنے والوں کی تعداد ساٹھ ہے اور ایک چار انچی بندوق دو مشین گنوں اور چھ اکیس انچی تارپیڈو نلکیوں سے مسلح ہے۔

یہ تھی آبدوز کی ابتدا اور انتہا۔ انسان کی تباہ کن فطرت کا مظاہرہ آپ کو آبدوز کشتی سے بہتر کسی دیگر ایجاد میں نظر نہیں آئے گا۔ ان کشتیوں نے گذشتہ جنگ کے دوران میں جو معرکۃ الآرا کام انجام دیا آپ اس سے باخبر ہیں۔ انسان کی دانش مندی و عوفناکی پر دلالت کرنے والی یہ تباہ کن ایجاد اپنی خمدار فولادی دیواروں کے درمیان نہایت پیچیدہ مشینری پنہاں رکھتی ہے۔ والو اور لیور ہوتے ہیں، چرخیاں اور پہیئے ہوتے ہیں اور شور و شر کرنے والے پمپ اور پائپ بھی ہوتے ہیں۔ لیکن ہر آلہ کم از کم جگہ میں اس خوبی سے لگایا جاتا ہے کہ وہ بہترین کام انجام دے سکے۔

کشتی کا ڈھانچہ بات خود بحری انجینیرنگ کا لاثانی نمونہ ہوتا ہے۔ اس کو کافی دباؤ بھی برداشت کرنا پڑتا ہے اور ساتھ ساتھ دھاروں کے ساتھ بہنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ جو برقی قوت اس کو حاصل ہے اس کے ساتھ وہ زیادہ سے زیادہ رفتار حاصل کرے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ آبدوز کو پانی کی سطح کے نیچے چلانے کے لئے بڑے بڑے دخانی یا تیل کے انجن نہیں ہوتے ہیں بلکہ یہ کام برقی موٹروں سے لیا جاتا ہے اور کشتی خواہ سطح آب پر رواں ہو یا اس کے نیچے، اس کی رفتار کا خاص خیال رکھا جاتا ہے ان کشتیوں کے ابتدائی نمونوں میں پٹرول سے چلنے والے انجن استعمال کئے گئے لیکن چونکہ پٹرول آتشگیر ہوتا ہے اس لئے ایسے انجنوں کا استعمال اتنی مختصر جگہ میں نہایت خطرناک سمجھا گیا اور جب ڈیزل انجن ایجاد ہو گئے تو کشتیوں کو سطح آب پر رواں دواں رکھنے کے لئے ان کا استعمال شروع کیا گیا۔ پانی کی سطح کے نیچے دوڑنے کے لئے برقی موٹر استعمال کئے جاتے ہیں۔ ان کو چلانے کے لئے، روشنی مہیا کرنے کے لئے، نیز دیگر ضروریات کے لئے بڑی بڑی بیٹریاں استعمال کی جاتی ہیں۔ غوطہ لگانے کے بعد کشتی کی حیات ان بیٹریوں پر ہی منحصر ہوتی ہے اور یہ ضروری ہے کہ ان کو پوری طرح چارج رکھا جائے۔ جدید آبدوز دو تین دن تک مسلسل طور سے پانی کی سطح کے نیچے رہ سکتے ہیں لیکن شرط یہی ہے کہ غوطہ لگانے سے قبل ان کی بیٹریاں مکمل طور سے چارج کر لی گئی ہوں۔ یہ مدت بیٹریوں کی حالت کے علاوہ آبدوز کے عملے کی آکسیجن کی ضرورت پر بھی منحصر ہوتی ہے۔ دس جہازی میل (ایک جہازی میل ۶۰۸۰ فیٹ کا ہوتا ہے) کی رفتار سے معمولی آبدوز ایک گھنٹہ سے کچھ زیادہ عرصہ تک پانی کے اندر ٹھہر سکتی ہے۔ اگر رفتار صرف دو میل ہے تو یہ عرصہ چھتیس گھنٹے سے بھی زاید ہو سکتا ہے بشرطیکہ غوطہ لگانے سے قبل بیٹری اچھی طرح چارج کر لی گئی ہو۔ اتنا عرصہ پانی میں گذارنے کے بعد آبدوز کا سطح آب پر آنا ضروری ہوتا ہے تاکہ بیٹریوں کو پھر چارج کیا جا سکے۔ عام طور سے اس مقصد کے لئے رات کا وقت مناسب سمجھا جاتا ہے کیونکہ دن میں دشمن کا خوف رہتا ہے۔

آبدوز کا اندرونی منظر

آبدوز کشتی کا اندرونی مطالعہ نہایت دلچسپ ہے ضرورت کی ہر چیز مہیا نظر آتی ہے۔ پتوار ہوتے ہیں سکان ہوتے ہیں۔ دھکیلنے والے آلے لگے ہوتے ہیں۔ توازن درست رکھنے کے لئے ٹینک مہیا کئے جاتے ہیں۔ کچھ آلے آبدوز کا رخ بدلنے کے لئے لگے ہوتے ہیں ہوا کے داخلے کے لئے سوراخ رکھے جاتے ہیں۔ درمیانی حصہ کافی لمبا ہوتا ہے اور چوڑائی بھی پوری ہوتی ہے۔ اسی میں برقی موٹر لگے ہوتے ہیں جو کہ غوطہ مارنے کے بعد کام کرنا شروع کرتے ہیں۔ برابر میں تیل کے ٹینک ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ڈیزل انجن ہوتے ہیں جو سطح آب پر کشتی کو چلاتے ہیں۔ ہوائی قفل ہوتا ہے لاسلکی کا دفتر ہوتا ہے۔ اس کے بعد کپتان کا کمرہ ہوتا ہے۔ دبی ہوئی ہوا کی بوتلیں ہوتی ہیں بیٹریوں کے لئے جگہ ہوتی ہے۔ ساتھ ہی سوئچ بورڈ ہوتا ہے۔ اس کے بعد افسروں کے کوارٹر ہوتے ہیں۔ پھر تیل کے ٹینک ہوتے ہیں۔ پھر معمولی ملازمین کے کوارٹر ہوتے ہیں۔ پھر خطرہ کے وقت بچنے کے لئے کچھ آلے مہیا ہوتے ہیں۔ تارپیڈو فلیٹ ہوتا ہے۔ آگے کی سمت رُخ بدلنے میں مدد کرنے والے ٹینک ہوتے ہیں۔ پھر تارپیڈو نلکیوں کا انتظام ہوتا ہے۔ آخر میں لنگر اندازی کا سامان

ہوتا ہے۔ اوپر کی طرف پیرسکوپ لگی ہوتی ہے جو ایک بحری آلہ ہوتا ہے جس میں
شعاعوں کا عام راستہ مڑ کر ایک یا ایک سے زائد نئی سمتوں میں تبدیل ہو جاتا ہے
آبدوز میں اس کا یہ استعمال کیا جاتا ہے کہ جس وقت کشتی پانی کے اندر ہو سطح سمندر کا
حال معلوم ہو جائے۔

غوطہ خوری کے وقت بیرونی ڈھانچہ کا توازن قائم رکھنے کے لئے پانی سے
بھرے ہوئے ٹینک استعمال کئے جاتے ہیں۔ کشتی کے سامنے اور اس کے دنبالہ
میں کچھ پتوار لگے ہوتے ہیں جن کی مدد سے کشتی کا اگلا حصہ دبا دیا جاتا ہے اور وہ غوطہ
مار جاتی ہے۔ ان پتواروں کو سائنسی طریقوں سے متوازی الارض بنایا جاتا ہے
اور وہ کشتی کی اوپر نیچے کی حرکات کو قابو میں رکھتے ہیں۔ جیسے ہی کشتی غوطہ مارتی
ہے اس کے سطح آب پر کام کرنے والے انجن بند کر دیئے جاتے ہیں۔ سمندر کی تہہ میں پہنچنے
کے لئے آبدوز کو ایک منٹ سے بھی کم وقفہ لگتا ہے۔

توازن قائم رکھنے والے ٹینکوں میں سے ہر ایک میں ایک والو (VALVE)
لگا ہوتا ہے جس میں پانی داخل بھی ہو سکتا ہے اور نکل بھی سکتا ہے۔ اوپر کے حصہ میں
ایک سوراخ ہوتا ہے جس میں سے ہوا آ جا سکتی ہے اور ایک نلکی ہوتی ہے جس میں
سے دبی ہوئی ہوا ٹینک میں داخل ہوتی ہے تاکہ پانی پر دباؤ ڈال کر اسے باہر پھینک
دے۔ جب کشتی غوطہ مارتی ہے تمام والو کھل جاتے ہیں اور ٹینکوں میں پانی بھر
جاتا ہے۔ ہوا اوپر والے سوراخوں سے باہر نکل جاتی ہے اور جب ٹینک بھر جاتے
ہیں تو ان سوراخوں کے والو بند ہو جاتے ہیں۔

کافی گہرائی پر پہنچنے کے بعد کشتی کے سکان اس کی پوزیشن درست کر دیتے
ہیں۔ موٹروں کی رفتار کچھ کم کر دی جاتی ہے اور کشتی کے پتوار مطلوبہ گہرائی میں اس
کا توازن قائم رکھتے ہیں۔ اگر ترتیب درست ہے تو آبدوز کشتی ایک ہی موٹر کی
مدد سے چل سکتی ہے لیکن اس کا توازن قائم رکھنے کے لئے بڑی احتیاط کی جاتی
ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ اس کو کوئی فوری جھٹکا نہ لگے۔ تیل وغیرہ کا ذخیرہ
جب استعمال سے کم ہو جاتا ہے تو اس وزن کی کمی پانی سے پوری کر لی جاتی ہے
تاکہ کشتی کے توازن پر کوئی اثر نہ پڑے۔ کشتی کے دونوں سروں پر ٹینک واقع
ہوتے ہیں اور دبی ہوئی ہوا کے ذریعہ کسی بھی سرے پر پانی بھر دیا جاتا ہے تاکہ
حسب ضرورت کشتی کا رُخ درست ہو جائے۔

آبدوز دو سو سے چار سو فیٹ تک کی گہرائی تک اپنے ڈھانچہ کو نقصان
پہنچائے بغیر غوطہ مار سکتی ہے۔ جب کپتان سطح سمندر یا ہوا کا جائزہ لینا چاہتا
ہے تو وہ پیرسکوپ کا استعمال کرتا ہے جس کا سرا پانی سے باہر نکلا رہتا ہے
صحیح گہرائی پر پیرسکوپ تقریباً تین فیٹ باہر نکلی رہتی ہے۔ کپتان ہینڈل کے
ذریعہ پیرسکوپ کو گھما کر اپنے چاروں طرف کی اشیاء کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔

سطح پر آنے کے لئے دبی ہوئی ہوا کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ٹینکوں میں
ہوا بھر دی جاتی ہے اور کشتی پانی پر نمودار ہو جاتی ہے آہن پوش حجرہ (ناخدا کا
حجرہ جس پر گولی اثر نہ کر سکے) کا ڈھکن کھل جاتا ہے۔ ڈیزل انجنوں کا کلچ دبا دیا
جاتا ہے اور آبدوز پانی پر چلنا شروع کر دیتی ہے۔ یہ سب کام چند منٹ میں
انجام پذیر ہو جاتا ہے۔

اندرونی حصہ کی تفصیل میں یہ بات دلچسپ ہے کہ یہ حصہ چھوٹے چھوٹے
درجوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان میں پانی داخل نہیں پا سکتا ہے۔ درمیانی درجہ جو
آہن پوش حجرہ کے نیچے ہوتا ہے کنٹرول روم کہلاتا ہے۔ اسی کمرہ میں آبدوز
کی تمام نازک مشینری ہوتی ہے جو اس کو قابو میں رکھتی ہے۔ سمت بدلنے والے
آلات پہیئے جو غوطہ خوری کے وقت پتواروں کو چلاتے ہیں، تارپیڈو
(سگار کی شکل کی پھٹنے والی شے جو پانی کے اندر اندر جا کر جہاز میں لگتی ہے اور
پھٹ کر اسے اڑا دیتی ہے) کو قابو میں رکھنے والے آلات، موٹروں کے بٹن،
جہاز رانی سے متعلقہ جملہ آلات جو آبدوز کے راستہ اور اس کی پوزیشن سے
متعلق ہوتے ہیں، دیگر متعدد آلات اور اوزار اسی مختصر سی جگہ میں موجود
ہوتے ہیں۔ کنٹرول روم درحقیقت آبدوز کا مرکزی اور نازک ترین حصہ ہوتا ہے

آبدوز کا خاص اوزار تارپیڈو ہوتا ہے۔ اگرچہ آجکل طیارہ شکن توپوں کا ساتھ
رکھنا بھی ضروری ہے۔ تارپیڈو کی نلکیاں سب سے آگے کے حصہ میں ہوتی ہیں
اور ان کو برقی طریقہ سے کنٹرول روم سے فائر کیا جاتا ہے۔ پیچھے کے درجہ میں
دنبالہ جہاز کی نلکیاں ہوتی ہیں اور ٹھیک ان کے سامنے برقی موٹر ہوتے ہیں۔

جیسا کہ بیان ہوا دوسرے درجوں میں جہاز کے افسر اور معمولی ملازمین رہتے
ہیں اور ان کے چاروں طرف پیچیدہ مشینری ہوتی ہے۔ معمولی ملازمین کے کوارٹر
بہت مختصر ہوتے ہیں کیونکہ مشینری کے لئے کافی جگہ درکار ہوتی ہے۔ آبدوز کی
کامیابی اس کی رفتار پر منحصر ہوتی ہے اور یہ جس قدر مختصر ہو گی اتنی ہی تیز دوڑ
سکے گی۔ سونے کے لئے دیواروں میں تختے لگے ہوتے ہیں جن کو حسب منشا
نیچے اوپر کیا جا سکتا ہے۔ وارڈ روم میں بھی سونے کا انتظام ہوتا ہے۔ تخلیہ
کے لئے پردوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اشیائے خوردنی کے لئے برقی المایو
کا انتظام کیا جاتا ہے اور ایک دوسرے کمرہ میں لاسلکی ٹیلیگرافی کا انتظام ہوتا
ہے۔ ایک آلہ اور لگا ہوتا ہے جس کی مدد سے پانی میں انجن اور پتوار وغیرہ کی آواز
سنی جا سکتی ہے۔ اسی آلہ کی مدد سے اپنے دوستوں کو سگنل بھی دیئے جاتے
ہیں۔ غوطہ لگانے کے بعد لاسلکی آلات کو اچھی طرح سے استعمال نہیں

کیا جا سکتا۔ البتہ جدید ترین آلات کی مدد سے تھوڑی بہت کارروائی کر لی جاتی ہے۔ آواز کے ذریعہ سگنل اب بھی دیئے جاتے ہیں لہٰذا یہ بات ظاہر ہے کہ آواز کے ذریعہ سگنل دینے اور موصول کرنے کے آلات آبدوز کشتیوں کے لئے ضروری ہیں خاص طور پر اس وقت جبکہ کشتی پانی کے اندر ہو۔ چونکہ دشمن کے پاس بھی اس قسم کا ساز و سامان موجود ہوتا ہے اس کو دھوکا دینے کے لئے کافی چالاکی اور تجربہ کی ضرورت پڑتی ہے۔

آبدوز کشتی میں مقناطیسی قطب نما کچھ زیادہ فائدہ بخش ثابت نہیں ہوتا کیونکہ برقی موٹروں اور دیگر آلات کی وجہ سے بہت سے پریشان کن مقناطیسی اثرات پیدا ہو جاتے ہیں اور اس لئے اس میں برقی قوت سے حرکت کرنے والے قطب نما لگے ہوتے ہیں۔

تارپیڈو کی نلکی میں بارود وغیرہ بھرنے کیلئے اس کے پیچھے لگا ہوا ڈھکن کھول دیا جاتا ہے اور سب چیزیں بھرنے کے بعد اس کو بند کر دیا جاتا ہے۔ تارپیڈو کی نلکی پر ایک چھوٹی ٹوپی چڑھی ہوتی ہے تاکہ پانی اندر نہ داخل ہو سکے۔ جب تارپیڈو کو فائر کرنا مقصود ہوتا ہے تو اس ٹوپی کو برقی ذریعہ سے اڑا دیا جاتا ہے فائرنگ کے فوراً بعد اس کی جگہ دوسری ٹوپی خود بخود آ جاتی ہے۔ تارپیڈو کو دبی ہوئی ہوا کے ذریعہ فائر کیا جاتا ہے جس کا ذخیرہ مناسب اور مطلوبہ دباؤ پر قائم رکھا جاتا ہے۔

دشمن کے دشمن

آج کل آبدوز کشتیوں کا سب سے بڑا دشمن ہوائی جہاز ہے۔ گشتی ہوائی جہاز تین چار سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اچانک نمودار ہو جاتے ہیں اور اگرچہ آبدوز تیزی سے غوطہ مار جاتی ہے تاہم وہ اوپر سے پانی میں دیکھی جاتی ہے۔ یہ چیز سمندر کی سطح اور پانی کی گہرائی پر منحصر ہوتی ہے یہ بھی خطرہ لاحق رہتا ہے کہ دشمن کے ہوائی جہاز رات کے وقت ساحل کے نزدیک اور بندرگاہ کی گودی میں بحری سرنگیں (لوہے کی نلکیاں جن میں آتشگیر مادہ بھر کر سمندر میں ڈال دیتے ہیں) بچھا دیں۔ جیسے ہی آبدوز ان سے ٹکراتی ہے یا مقناطیسی اثر کارفرما ہوتا ہے یا جیسے ہی کوئی آواز پیدا ہوتی ہے وہ پھٹ جاتی ہیں اس لئے آبدوز کشتیوں کا ساحل کے نزدیک آنا کافی خطرناک ہوتا ہے آبدوز کشتیوں کی کوششوں کو ناکام بنانے کے لئے ہوائی جہاز کئی طریقے اختیار کرتے ہیں جن میں پانی میں پھٹنے والے بم کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کے اثرات بڑے تباہ کن ثابت ہوتے ہیں۔ روشنی گل ہو جاتی ہے کشتی کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ آلات ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں اور کشتی کی ساخت کو کافی نقصان پہنچتا ہے یہاں تک کہ اگر کوئی بم پچاس فیٹ کی حد میں پھٹتا ہے تو وہ عام طور سے ہلاکت آفریں ثابت ہوتا ہے جب کوئی اس قسم کا بم آبدوز کشتی کا پیچھا کرتا ہے تو اس کے ملازمین کے لئے بڑی دقت کا سامنا ہوتا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ کشتی کو سمندر کی گہرائیوں میں لے جائیں اور یہ امید قائم رکھیں کہ قبل اس کے کہ وہ خود آکسیجن کی کمی کی وجہ سے سطح سمندر پر واپس آنے کے لئے مجبور ہوں، دشمن خود تعاقب سے تھک کر اپنے ارادہ سے باز آ جائیگا.

اندرونی زندگی

چونکہ آبدوز میں گنجائش بہت ہی کم ہوتی ہے اس لئے افسر اور معمولی ملازمین ایک دوسرے سے بہت نزدیک ہوتے ہیں کسی دیگر ملازمت میں افسر اور ماتحت کے درمیان اتنا قرب نہیں پایا جاتا ہے۔ اس وجہ سے سب لوگ پورے انتظام اور مستعدی سے کام کرتے ہیں۔ ساتھ ہی بڑی دانشمندی اور تحمل کی ضرورت ہوتی ہے اسی لئے آبدوز پر کام کرنے والے افسران اور دیگر ملازمین کے انتخاب میں صرف ان کی قابلیت و ہنرمندی ہی کا خیال نہیں کیا جاتا بلکہ ان کے ذاتی اوصاف کو پہچانا جاتا ہے۔

آبدوز میں زندگی کی تکالیف کو کم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔ کھانا عمدہ اور افراط سے ملتا ہے اور چونکہ غوطہ مارنے کے بعد درجہ حرارت بہت گر جاتا ہے ملازمین کیلئے ہر قسم کے گرم کپڑے مہیا کئے جاتے ہیں۔ سطح آب کے نیچے کشتی کی ہوا گندہ ہو جاتی ہے اس لئے اس کو صاف رکھنے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ سطح پر آتے ہی ڈیزل انجن تازہ ہوا اندر کھینچنے لگتے ہیں اور اس کو رہائشی کمروں میں سے گذارتے ہیں۔ جب آبدوز واپس جائے روانگی پر واپس آتی ہے تو افسروں اور ماتحتوں کی تفریح کے لئے ہر ممکن ذریعہ مہیا کیا جاتا ہے کشتی میں اگر کوئی چیز قابل مرمت ہوتی ہے تو اس پر بھی فوری توجہ کی جاتی ہے۔

اس سخت زندگی کے باوجود جو آبدوز کشتیوں کے ملازمین کو گذارنا پڑتی ہے۔ ان لوگوں کی صحت بہت اچھی ہوتی ہے!

شاید آپکو یہ پڑھ کر تعجب ہوگا کہ آبدوز کشتیاں صرف اتنی بڑی ہی نہیں ہوتی ہیں بلکہ ایک آدمی کی آبدوز بھی ہوتی ہے۔ اس میں ایک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ یہ جل تھلی ہوتی ہے۔ یعنی خشکی اور تری دونوں جگہ کام دیتی ہے۔ اس میں پہیئے لگے ہوتے ہیں اور خشکی و تری یا کم گہرے پانی میں یکساں طور سے کارآمد ثابت ہوتی ہے۔ حال ہی میں ایسی چھوٹی آبدوز کشتیاں بھی ایجاد ہوئی ہیں جو پورے سائز کی تارپیڈو کو کامیابی کے ساتھ لے جا سکتی ہیں بیسویں صدی میں پیرسکوپ میں کچھ تغیر ہوا ہے۔ ابتدائی کشتیوں میں بھری نلکیاں لگی ہوتی تھیں جن میں ٹیڑھے آئینے لگے ہوتے تھے لیکن جدید پیرسکوپ میں دانشور لگے ہوتے ہیں اور مختلف شیشے (LENSES) بھی لگے ہوتے ہیں۔ پیرسکوپ کی پوری اونچائی ساڑھے پینتیس فیٹ تک ہوتی ہے۔

زمانۂ امن میں آبدوز کشتیوں کا کوئی افادی پہلو نظر نہیں آتا ہے لیکن تخریبی نقطۂ نظر سے وہ ایجادات نو کے زمرے میں جنگی تباہ کاریوں کا حیرت انگیز نمونہ اور جہاز سازوں کی انتہائی فراست پر دلالت کرتی ہیں۔ غوطہ مارتے ہی وہ تیزی سے اپنے نشانہ کی طرف بڑھتی ہیں اور ان کی تباہ کن تارپیڈو نلکیاں بڑے سے بڑے جہاز کے قلب پر ٹکر مار کر اس کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے سمندر کی تہہ میں سلا دیتی ہیں

عبدالسلام خورشید

سوہنی مہینوال

(فضل شاہ کے منظوم افسانہ کی نثر)

دریائے چناب کے کنارے گجرات کے شہر میں ایک عالی نسب اور مشہور کمہار رہتا تھا جس کا نام تھا تُلاّ۔ عقل و دانش میں افلاطون اور لقمان سے برتر تھا۔ فن کوزہ گری میں کمال رکھتا تھا۔ ایسے ایسے کوزے تیار کرتا کہ جو دیکھتا طلب گار ہوتا۔ وہ اپنے بنائے ہوئے کوزے بادشاہوں کی نذر کرتا اور انعام واکرام سے مالامال ہو جاتا۔ وہ اپنی قوم کا سردار تھا۔ عزت، شان اور اقتدار کا مالک تھا۔ اور بڑا نیک نام تھا۔

لیلتہ القدر کو اس کے ہاں ایک بچی پیدا ہوئی جس کا چہرہ چاند کی طرح چمکتا تھا۔ حسن وجمال کی رعایت سے اس کا نام سوہنی رکھا گیا۔ پیدائش کے فی الفور بعد مُلاّ نے اس کے کانوں میں اذان دی جو گھٹی عشاق کو ملی تھی، وہی اسے دی گئی۔ اسے دایہ کے سپرد کیا گیا جو اسے دودھ پلاتی اور شیرینی چٹاتی۔ دوسرے برس وہ چلنا پھرنا سیکھی۔ اور اشاروں سے باتیں کرنے لگی۔ تیسرے برس اپنی توتلی باتوں سے سب کا دل لبھاتی۔ چوتھے سال گیند سے کھیلتی۔ پانچویں سال ماں اس کے بالوں کو سجا سجا کر بناتی۔ چھٹے برس وہ گڑیوں سے کھیلنے لگی۔ ساتویں برس میں قرآن پڑھ لیا۔ آٹھویں برس سہیلیوں کے ساتھ کھیلتی اور گاتی رہی، نویں برس اس کا حسن اتنا چمکا کہ جنت کی حوریں بھی دیکھ کر شرماتیں۔ دسویں برس اس نے چوڑیاں پہنیں۔ اور طرح طرح کے چمکیلے اور بھڑکیلے لباس زیب تن کئے۔ گیارہویں برس اس کی آنکھوں میں شرم و حیا پیدا ہوئی۔ وہ بھول کر بھی کسی طرف نگاہ کرتی تو شاہوں کو گدا کر دیتی۔ بارہویں برس وہ سہیلیوں کے جھرمٹ میں یوں معلوم ہوتی جیسے ستاروں میں چودہویں کا چاند۔

سوہنی مچلتے ہوئے شباب کی ایک تصویر جمیل تھی۔ اس کا ماتھا اتنا روشن تھا کہ چاند، ستارے اور سورج بھی فدا ہوں۔ رخسار انار کی مانند خوبصورت، سُندر چہرے پر سُندر تل، ناک جیسے تلوار کی دھار، نینوں میں نیم خوابی کیفیت، ہونٹوں کی سُرخی ایسی کہ لعل بھی شرما جائیں۔ سینہ صاف بلور کی طرح اور ان کی رکھوالی کو کالی زلفوں کے ناگ، جنہوں نے بڑے بڑے مومنین کو پریشان کر دیا۔ اس کے پاؤں اتنے نازک جیسے گلاب کے پھول۔ باتوں میں طوطیٔ شیریں مقال۔ اور چال میں مور اور ہنس اس کے سامنے ماند پڑ جاتے۔

بخارا میں بلخ کے مقام پر ایک مغل سوداگر مرزا عالی کے نام سے مشہور تھا۔ تھا غنی اور سخی تھا۔ کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ لیکن ایک تلخی اسے کھائے جاتی تھی۔ اس کے ہاں اولاد نہ ہوتی تھی۔ کسی نے کہا۔ کہ تو پہاڑ کے فلاں غار میں جا۔ وہاں ایک فقیر ملے گا۔ شاید وہ تیری مدد کر سکے۔ مرزا عالی وہاں پہنچا اور بڑے عجز و نیاز سے التجا کی کہ میرے لئے اولاد کی دعا کیجئے۔ فقیر نے دعا کی اور کہا۔ کہ خدا تجھے ایک فرزند دلبند عطا کرے گا۔ لیکن عمر کے چودہویں سال وہ عشق میں گرفتار ہو جائے گا۔ نو ماہ بعد مرزا عالی کے گھر ایک بچہ پیدا ہوا۔ قرآن سے فال نکال کر باپ نے اس کا نام مرزا عزت بیگ رکھا۔ پہلے برس ہی بچے کا جمال حسن یوسف کی طرح عیاں ہوا۔ دوسرے برس غلام اُسے دربار میں لے جاتے۔ تیسرے برس وہ کچھ کچھ چلنے لگا۔ چوتھے برس اُسے زیورات پہنائے گئے۔ پانچویں برس الحمد سے والناس تک سارا قرآن حفظ کر لیا۔ اور بارہ برس تک اُسے دُنیا بھر کے علوم پر عبور حاصل ہو گیا۔ تیرھویں برس اس نے تیراندازی کا فن سیکھا۔ اور چودھویں برس وہ شہسواری میں طاق ہوا۔

مرزا عزت بیگ نے ایک دن اپنے باپ کے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں چاہتا ہوں۔ کہ دلّی کی سیر کروں اور کچھ سوداگری بھی کروں۔ یہ سنتے ہی باپ کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ بے ہوش ہو گیا۔ اور جب ہوش آیا تو جی بھر کر رویا۔ لیکن اسے فقیر کا قول یاد تھا۔ اس نے جھٹ قافلے کی تیاری کا حکم دیا۔ قافلے کے ساتھ تجارت کے لئے سامان بھی بہم پہنچایا۔ بہلیوں میں لونگ، الائچی، پستہ، کشمش، سیب، کھجور، اور کابل اور خراسان کے ان گنت میوے لد گئے۔ عنبر، مشک، کافور، بادام، جائفل وغیرہ سے بھی کئی بہلیاں بھریں۔ کپڑوں میں کمخواب، سنجاب، سمور، مخمل، حریر، دیبا، کمرخ، اور لٹھا شامل تھے اور ان کے علاوہ بے شمار ایسی چیزیں تھیں۔ جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ

آسکتی تھیں۔ قافلہ تیار ہوا۔ تو پہلے باپ بیٹا گھر آئے۔ ماں نے سُنا۔ تو اس کے باغ عیش و نشاط میں بادِ خزاں آئی۔ وہ بیٹے کو سینے سے لگا کر روئی۔ اور بڑی کوشش کی کہ اُسے سفر سے روک دے۔ لیکن بے سود۔ آخر آب و دانہ اور عشق کی کشش عزت بیگ کو دلّی لے چلی۔ اور ماں نے دلدوز آہوں اور چیخوں سے اسے وداع کیا۔

سفر کی تمام منازل طے کرتا ہوا تھکان سے چُور عزت بیگ قافلے کے ہمراہ دلّی پہنچا، تاجروں نے اُس کے مال کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اُدھر اس کے حسن کا شہرہ شاہ جہاں تک پہنچا اور وہ دربارِ شاہی میں طلب ہوا۔ مرزا عزّت بیگ نے حضورِ شاہی میں تحفے پیش کئے۔ بادشاہ انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ ایک لاکھ مُہریں بخشیں ایک سراپا دیا۔ ایک شوخ سمند گھوڑا عطا کیا۔ اور بہت سی جاگیر دی، عزت بیگ نے بادشاہ کی مدح و ثنا کی۔ سلام کیا اور قیام گاہ پر واپس پہنچا۔ ہر روز دلّی کی سیر کرتا۔ آخر تنگ آگیا۔ اور واپسی کی ٹھانی۔ قافلہ دلّی سے چل کر لاہور پہنچا۔ اور اس جنّت مثال شہر کو دیکھکر آگے بڑھا۔ راوی اور چناب کو پار کیا تو سامنے گجرات پر نظر پڑی۔ سورج غروب ہوا، شام پڑ گئی اور پھر رات کے سیاہ پردے چھا گئے۔ قافلہ تھک کر چور ہوگیا اور یہاں قیام کیا۔ گجرات میں اتنی کشش تھی کہ عزت بیگ کا دل آگے جانے کو نہ چاہا۔ چنانچہ موسیقی کی ایک بزم آراستہ کی گئی۔

گجرات کے ایک شخص نے عزت بیگ کو بتایا کہ یہاں ایک کمہار تلا نامی بہت ماہر کوزہ گر ہے۔ اس سے ایک آدھ کوزہ ضرور منگوائیے۔ عزت بیگ نے جھٹ غلام کو بھیجا۔ غلام گیا۔ تو اس کی نظر سوہنی پر پڑی۔ جو اپنی سہیلیوں کے ساتھ چرخہ کات رہی تھی۔ وہ سوہنی کے ہوشربا حسن کو دیکھ کر اس کا غلام بے دام بن گیا۔ تُلّا سے ایک کوزہ خریدا اور عزت بیگ کو پیش کیا۔ عزت بیگ کوزے کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اور ہر ایک کو دکھانے لگا۔ اتنے میں غلام نے ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ حضور! میں نے ایک محبوب کو دیکھا ہے۔ جس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ وہ ہے تو کمہار کی بیٹی۔ لیکن اُس کے حُسن کو دیکھ کر سورج بھی شرما جاتا ہے۔ اس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح ہے۔ پلکیں تیر کی مانند اور زلفیں کالے ناگ کی طرح ہیں۔ کون ہے جو اُسے دیکھ کر بے ہوش نہ ہو جائے۔ بس جس طرح مردوں میں آپ حسین ہیں۔ اسی طرح عورتوں میں وہ خوب صورت ہے۔ یہ سنتے ہی عزت بیگ کو اشتیاق ہوا۔ کہ وہ سوہنی کو دیکھے۔ چنانچہ اس نے غلام سے کہا کہ مجھے وہاں لے چل۔ دونوں منزلِ مقصود پر پہنچے۔ تلّے کو سلام کیا۔ اور کوزے دیکھنے کی فرمائش کی۔ تلّا خود مصروف تھا۔ اسلئے اس نے سوہنی کو بلا کر کہا کہ انھیں برتن دکھا۔ سوہنی ادا کے ساتھ اس طرح باہر نکلی۔ جیسے بدلیوں میں سے چاند نکلتا ہے۔ عزّت بیگ نے دیکھا تو بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ لیکن غلام نے اسے اُٹھا لیا۔ سوہنی یہ رنگ دیکھ کر حیران ہوئی۔ غلام نے عزت بیگ کو اشارہ کیا کہ یہاں کوئی فریب بناؤ۔ عزّت بیگ اشارہ پہچان گیا۔ سوہنی اُسے برتن دکھانے لگی۔ کئی برتن دکھائے۔ لیکن عزت بیگ نے ایک پر بھی پسندیدگی کا اظہار نہ کیا۔ وہ ہر برتن دیکھتا اور واپس کر دیتا۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی، کہ برتن اچھے نہ تھے۔ دراصل عزّت بیگ کو تو سوہنی کو دیکھتے رہنے کی بھوک تھی۔ جو کسی صورت مٹتی ہی نہ تھی۔ آخر سوہنی خفا ہو کر بولی۔ بھائی! جاؤ۔ کسی اور سے برتن خرید لینا۔ محبوب کی جھڑکی سُن کر عزّت بیگ سے نہ رہا گیا۔ اُس نے سمجھ لیا کہ زیادہ مذاق مناسب نہیں۔ جھٹ دو چار برتن اٹھا لئے۔ سوہنی نے اپنے منہ سے جو قیمت مانگی اُس کے حوالے کر دی۔ اور پھر اپنے ڈیرے پر واپس آگیا۔ سوہنی کو دیکھکر اس کا حال بے حال ہوا عشق کا زخم عجیب ہوتا ہے۔ اس کا رنگ زرد ہوگیا۔ ہر وقت آہیں بھرتا دوستوں نے یہ رنگ دیکھا تو بہت متفکر ہوئے۔ اور پوچھا تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ اس نے کہا میرے کلیجے میں درد ہوتا ہے۔ غذا ہضم نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ صحت ٹھیک نہیں رہتی۔ دوستوں نے انگور کا سرکہ، شربت اور عرق وغیرہ پلائے۔ لیکن بے سود۔ بڑے بڑے طبیب آئے۔ لیکن وہ اصل مرض کی صحیح تشخیص نہ کر سکے۔ اور ان کا کوئی علاج کارگر نہ ہُوا۔

عشق اور مشک کبھی چھپے نہیں رہتے۔ مرزا عزّت بیگ کے دوست تاڑ گئے۔ کہ وہ مریضِ عشق ہے۔ مرزا ہر روز غلام سے رو کر کہتا کہ مجھے سوہنی کے پاس لے چلو۔ غلام سمجھاتا ذرا صبر کرو صبر کا اجر ضرور ملتا ہے۔ تمہیں اتنا زیادہ وہاں نہ جانا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہیں سوہنی کے باپ پر تمہارے عشق کا راز کھل جائے۔ لیکن مرزا کا اصرار آخر غالب آتا۔ وہ دونوں کمہار کے ہاں پہنچتے۔ اور دو چار کوزے خرید لاتے۔ رفتہ رفتہ کوزوں کا ایک انبار لگ گیا۔ اتنا بڑا انبار کہ سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ اس نے غلام سے کہا۔ یہ کوزے تو میرے گھر میں سماتے ہی نہیں۔ ان کا کیا علاج کیا جائے۔ غلام نے یہ نیک صلاح دی کہ گجرات کے شہر میں کوزوں کی ایک دکان کھول لی جائے عزت بیگ کو یہ مشورہ بہت پسند آیا۔ چنانچہ شہر میں ایک شاندار دکان لی گئی۔ اس میں سارے برتن بڑے سلیقے سے سجائے گئے۔ کہتے ہیں عشق گھاٹے کا بیوپار ہے۔ مرزا عزت بیگ نے اُسے ثابت کر دیا۔ وہ سوہنی سے مہنگے داموں برتن خریدتا۔ اور دکان میں لا کر سستے داموں بیچ دیتا۔ لیکن کب تک۔ آخر اس کا ستارہ گردش میں آیا۔ مشتری نے تیر و کمان پھینک دئے۔ اور زحل و مریخ کا دَور دورہ ہوا۔ جہاں خدا قہر نازل کرے۔ وہاں دوسرا کب مہربان ہوتا ہے۔ دوست اس کی روش سے بیزار ہو کر چل دئے۔ قافلے والے فرداً فرداً بلخ کو روانہ ہوگئے۔ نہ سوداگری کا مال باقی رہا۔ نہ اونٹوں کی قطار۔ آخر اسکا غلام بھی بھاگ نکلا۔ مرزا عزت بیگ کی ساری شان ختم ہوگئی۔ مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

پریشانیوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ مالکوں نے دکان چھین لی۔ اور عزت بیگ روٹی کو محتاج ہو گیا۔ وہ خدا سے فریاد کرتا۔ میرے اللہ تیرے سوا میں کس کے پاس جاؤں۔ تو ہی عاجزوں کا نگہبان ہے۔ تیری قدرت کے قربان جاؤں۔ تو نے اس شاہ کو گدا کر دیا۔ کون ہمدرد میری کہانی میرے باپ کو سنائے۔ یا خدا تو میری حالت کو جانتا ہے۔ میں تیرے سامنے کیا بیان کروں۔

عزت بیگ حالات سے لاچار ہو کر تُلّے کمہار کے پاس گیا۔ اور رو رو کر اپنی مصیبتوں کا حال کہہ سنایا۔ اس نے کہا۔ میرا سارا مال چوری ہو گیا ہے۔ میں روٹی کے لئے بھی محتاج ہوں۔ میں تیری خدمت میں اسلئے حاضر ہوا ہوں کہ مجھے کوئی خدمت بتا۔ میں غلاموں کی طرح تیرا ہر کام کروں گا۔ تُلّے کمہار نے اسے کوڑا کرکٹ اٹھانے پر مقرر کیا۔ عزت بیگ نے اسے اپنی محبوب کی وجہ سے بڑا احسان سمجھا۔ عشق کی نیرنگیاں ملاحظہ ہوں۔ کہ والئ بلخ بازاروں سے کوڑا کرکٹ جمع کرتا۔ اور غلاموں کا غلام بنتا۔ اُس نے تلّے کی دکان کے پاس کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں کے ڈھیر لگا دئے۔ اب تلّے کو اور کوڑے کرکٹ کی ضرورت نہ رہی۔ لیکن اس نے سوچا کہ یہ غلام بہت محنتی اور ہوشیار ہے اسلئے اسے پاس رکھنا چاہیئے۔ ایک دن تلّے نے عزت بیگ کو بلا کر کہا کہ تو بھینس چرا لایا کر۔ پنجابی زبان میں بھینس کو مہیّں کہتے ہیں۔ اسلئے اسی رعایت سے اب عزت بیگ مہینوال کے نام سے مشہور ہوا۔ عزت بیگ نے یہ سب تکالیف برداشت کیں صرف اسوجہ سے کہ اُسے سوہنی اکثر نظر آ جاتی تھی۔

ایک دن سوہنی کو تنہا دیکھ کر مہینوال زار زار رویا۔ اور اسے اپنی محبت کی پوری داستان لفظ بلفظ کہہ سنائی، اور کہا۔ اے حسینوں کی سردار! میں تیرا غلام ہوں۔ والئ بلخ ہونے کے باوجود میں نے صرف تیرے لئے مہینوال بننا قبول کیا۔ کئی سال سے میں فراق کے شعلوں میں جل رہا ہوں۔ اور تجھے کبھی میرا خیال نہ آیا۔ سوہنی نے اس کی آہ و زاری سُنی تو بہت محجوب ہوئی۔ وہ خاموش تھی۔ لیکن عشق کامران ہو چکا تھا۔ اس کی جھکی جھکی آنکھوں سے آنسوؤں کا مینہہ برسنے لگا!

اور اب یہ حالت تھی کہ اُمنگوں کی راتیں مرادوں کے دن۔ دونوں ایک دوسرے پر جان دیتے۔ ایک دن ملاقات نہ ہوتی تو بے چین ہو جاتے۔ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ گجرات شہر کے چغلخور لوگوں نے اس عشق کی داستان بچّے بچّے تک پہنچا دی۔ سوہنی کی ایک خاص محرم راز سہیلی نے سوہنی کے عشق کی تشہیر دیکھی تو وہ بھاگی بھاگی آئی۔ اور سوہنی کو بتایا کہ بات نکل گئی ہے۔ سوہنی نے کہا۔ تو دانا اور عقلمند ہے خود ہی بتا۔ اب کیا کیا جائے۔ میرے ماں باپ کو خبر ہوئی تو وہ مہینوال کو جواب دے دیں گے اور مجھے مار ڈالیں گے۔ سہیلی نے کہا۔ اب نتائج سے ڈرنا بے سُود ہے۔ دکھ کے بعد سکھ اور سکھ کے بعد دکھ آتا ہے۔ اب بات جبھی ہے کہ تو اپنے عشق پر ثابت قدم رہے۔

سوہنی کی ماں تک بات پہنچی۔ تو وہ بہت پریشان ہوئی۔ سوہنی کو بلا کر کہا۔ کیا ہم نے تجھے اسلئے پالا پوسا تھا کہ تو باپ کی عزت کو بٹّہ لگاتی۔ سوچتی ہوں تجھے پیدا ہوتے ہی زہر دے دیتی۔ تو نے کیتوں سے عشق لگایا۔ کچھ شرم کر۔ ماں نصیحتیں کرتی رہی اور سوہنی خاموش بیٹھی رہی۔ آخر کہنے لگی۔ ماں! تو بار بار عشق کا نام لیتی ہے۔ مجھے کیا معلوم یہ کیا چیز ہوتی ہے؟ تو اپنی بیٹی پر چوری کا الزام لگاتی ہے۔ خواہ اسے کسی اور نے ہی چرایا ہو۔ میرے تو ہاتھ جل جائیں۔ اگر میں نے تیرے عشق کو ہاتھ لگایا ہو۔ مجھے اتنا تو بتا دے کہ یہ کھانے کی چیز ہے یا پینے کی۔ اس کا رنگ کیا ہے؟ کچھ پتہ تو لگے۔ اور مجھے یہ بھی بتا۔ میں نے اس چیز کو کیتوں سے کیسے لگایا۔ مجھے اگر اس چیز کی ضرورت ہوتی تو چھپاتی کیوں تجھ سے کہہ کر لے لیتی۔ ماں یہ سُنکر بہت غضب ناک ہوئی۔ اور کہا۔ دیکھ یہ مکر و فریب چھوڑ دے۔ کیتوں سے یاری لگاتی ہے اور پھر بھولی بنتی ہے۔ بے حیا کہیں کی۔ سوہنی بولی۔ خدا سے ڈر کنواری بیٹی کو یاری کا طعنہ دیتی ہے میں نے تو کبھی کسی کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ ماں نے کہا۔ مکّار! مجھ سے زیادہ باتیں نہ بنا۔ تجھے خاوند کی ضرورت تھی۔ جبھی تو یاری لگائی۔ فکر نہ کر میں تیرا بیاہ کر دوں گی۔ سوہنی نے چلّا کر کہا۔ ماں تو بڑی ظالم ہے۔ تیرے طعنے سُنکر تو میرا جی چاہتا ہے۔ زہر کھا کر مر جاؤں۔ پہلے تو نے مہینوال کا نام لیا۔ اب خاوند کا ذکر لے بیٹھی ہے۔ ماں نے کہا تیرے جیسوں کو موت آئے تو ہم اللہ کا شکر کریں۔ میں تجھے خوب جانتی ہوں۔ تو مجھے باتوں میں اڑاتی ہے چوری اور پھر سینہ زوری۔ تیری زبان تو قینچی کی طرح چلتی ہے۔ تو دیکھے گی کہ مہینوال کا شوق کیسے ختم ہوتا ہے۔ بس آج ہی اسے نکلوا دوں گی۔ یہ سنا تو سوہنی نے صاف کہہ دیا۔ کہ مجھے مہینوال سے اتنی محبت ہے کہ اس پر جان فدا کرنے میں بھی تامل نہیں۔ اب تو میری زندگی اور موت اسی سے وابستہ ہے۔ ماں نے کہا تو نے تو شرم کا جامہ اتار دیا ہے۔ تو اپنے چاک (نوکر) پر جان فدا کرنے کو تیار ہے لیکن جب اس راہ کی ساری مصیبتیں نظر آئیں گی۔ تو خود بخود بھاگے گی۔ حیرانی کی بات ہے کہ کنواریاں بھی کھلے بندوں خاوندوں کی فرمائش کرنے لگی ہیں۔ سوہنی بولی۔ ماں تو کس قسم کی باتیں کرتی ہے۔ مہینوال تو میرا خدا ہے۔ میرا رسول ہے۔ میرا کعبہ ہے۔ میرا ایمان ہے۔ میں اس کی غلام ہوں۔ ماں نے کہا۔ اس کفر کی بات سے توبہ کر کہیں ہم پر خدا کا قہر نازل نہ ہو جائے۔ تجھے تو پتہ ہی نہیں کہ ایمان کیا چیز ہوتی ہے۔ تو نے اپنا سب پڑھا لکھا بھلا دیا ہے۔ سوہنی رو کر بولی۔ ماں مہینوال کو چھوڑنا تو ناممکن ہے۔ جدھر دیکھتی ہوں۔ مہینوال ہی نظر آتا ہے۔ مجھے طعنے دے دے کر نہ جلا۔ ہم دیوانوں پر ہنسنے سے کیا حاصل؟ یہ سُنکر ماں نے کہا۔ مہینوال کو نکالے بغیر مجھ پر تو کھانا پینا حرام ہے۔ یہ کہکر وہ غصّے سے بھری ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

تلّا کو بھی خبر ملی۔ وہ غصّے سے بھر کر گھر آیا۔ ادھر سوہنی کی ماں نے جلتی پر تیل کا کام دیا۔ اور سوہنی کی ساری باتیں کہہ سنائیں۔ اتنے میں بھینس چرا کر مہینوال خوشی خوشی گھر پہنچا۔

دیکھا تو یہاں اور ہی رنگ تھا۔ سوہنی موجود نہ تھی۔ اور اسکے ماں باپ غصّے سے لال پیلے ہو رہے تھے۔ تُلّا نے کہا۔ بس بس اب بہت نمک حرامی ہو چکی۔ تو اسی درخت کو کاٹنے کے درپے ہے۔ جسکے سائے تلے تجھے آرام ملا تھا۔ تو نے اس لئے نوکری کی تھی کہ میری بیٹیوں سے ہنسی مذاق کرتا۔ تو نے مجھے اپنی حرکتوں سے جگ بھر میں بدنام کر دیا ہے۔ اب تیرا اسی میں بھلا ہے کہ بوریا بستر باندھ لے۔

مہینوال یہ جواب سُنکر گھر سے نکلا۔ اسے محبوبہ کے بغیر دنیا ویران نظر آئی۔ پریشانیوں کے ہجوم میں وہ جنگل کی جانب روانہ ہوا۔ کئی راتیں رو رو کر کاٹیں۔ سوچتا۔ میں جدھر جاتا ہوں۔ دھکے ہی ملتے ہیں۔ سارا جہان میرا دشمن ہو گیا ہے۔ اب کہاں جاؤں۔ موت بھی تو نہیں آتی۔ اس کی حالت عجیب ہو گئی۔ وہ دیوانوں کی طرح کبھی مسجد کی جانب جاتا کبھی دارے (چوپال) میں آتا اور کبھی بازار میں آوارہ پھرتا۔

ادھر مہینوال کے فراق میں سوہنی کو بھی سارا جہان تاریک نظر آنے لگا۔ وہ مہینوال کو دیکھنے کی ہوک میں بیقرار تھی۔ اس کے بال پریشان رہتے۔ ہر وقت آنکھوں سے آنسو بہتے۔ اور دل و دماغ پر محبوب کے خیالات کا سایہ محیط رہتا۔

یہ دیکھ کر ایک دن سوہنی کے ماں باپ نے سوچا کہ جس طرح بن پڑے بیٹی کا بیاہ کر دیں۔ گجرات میں اُن دنوں ایک نوجوان کمہار آیا ہوا تھا۔ انھوں نے جھٹ منگنی کر دی۔ اور برات لانے کو کہا۔ برات بڑے کروفر سے آئی۔ اور اس چیختی چلاتی موہنی سوہنی کو لے گئی۔ شبِ عروسی کو سوہنی نے خدا سے دعا کی۔ کہ مجھے محفوظ رکھ۔ اس کی دعا قبول ہو گئی۔

سوہنی کی پُرانی محرمِ راز سہیلی نے مہینوال کا حالِ زار دیکھا۔ تو اس سے مل کر کہا کہ المکتوب نصف الملاقات تو سوہنی کے نام ایک خط لکھ جس میں اپنا سارا حال بیان کر۔ میں یہ خط سوہنی تک پہنچا دوں گی۔ مہینوال نے ایک طویل خط میں سوہنی کو لکھا۔ کہ تیرا کوئی اعتبار نہیں۔ تو اپنے قول کی جھوٹی ہے۔ تیرا اپنے خاوند سے اتنا گہرا پیار ہے کہ دو مردوں کا کیا ہوگا۔ تو عیش و عشرت میں زندگی گذار رہی ہے۔ اور اپنے گھر میں سردار بنی بیٹھی ہے۔ تُو تو ڈولی میں چڑھتے بھی ذرا نہ روئی۔ عشق کی بازی لگا کر اسے چھوڑ دینا بھلا کہاں کا انصاف ہے۔ آخر تو نے مجھ سے جھوٹے قول کیوں کئے۔ تجھے اپنے حُسن کا گھمنڈ ہے۔ حالانکہ یہ چار دن کا مہمان ہے۔ یہ رنگ محل یہ عظیم الشان زندگی یہ عیش و عشرت کوئی دوامی چیز نہیں۔ حسن کا بازار بھی ہمیشہ گرم نہیں رہتا۔ تو نے مجھے بُھلا دیا ہے۔ لیکن یقین کر کہ میں تجھے کبھی نہ بھولوں گا۔ میں تیرا نام لیتا ہوا گلیوں میں آوارہ پھرتا ہوں۔ مجھے رونے کے سوا کوئی کام نہیں۔ تو نے مجھے ڈبو دیا۔ لیکن پار لے جانے سے انکار کر دیا۔ مجھے دکھوں میں گرفتار کر کے خود سکھ کی زندگی گزارنے لگی۔ ذرا ہوش سنبھال۔ اور اپنے قول و قرار کو یاد کر۔ پھر اُس نے خط پر اپنے خون کے چھینٹے دئے۔

سہیلی نے ساس کی نظر بچا کر مہینوال کا نامہ سوہنی کے سپرد کیا۔ سوہنی کو یوں معلوم ہوا۔ جیسے عید کا چاند نکلا ہے۔ اس نے بڑے ذوق و شوق سے خط کھولا۔ خط پڑھتی اور اُسے چوم لیتی۔ دل سے لگاتی۔ اور باغ باغ ہو جاتی۔ اتنے میں اُس کی نظر خون کے چھینٹوں پر پڑی۔ دیکھتے ہی صدمے سے اُسے غش آگیا۔ مہینوال کے طعنوں نے سوہنی پر تیز تلوار کی دھار کے زخموں کا سا اثر کیا۔ وہ اسی وقت بیٹھی اور جواب لکھا۔

سوہنی نے ہزاروں سلام بھیجنے کے بعد اپنی داستان سُنائی۔ اس نے لکھا۔ جب میرے ماں باپ نے تجھے نکالا۔ تو میں چیختی چلاتی جانی جانی پکارتی رہی۔ مجھے خبر بھی نہ ہوئی۔ اور ماں نے جبراً مجھے ڈولی میں بٹھا دیا۔ میں نے کپڑے خاک میں ملائے اور کنگنا توڑ کے پھینک دیا۔ اگر مجھے خبر ہوتی کہ میرا بیاہ ہونے والا ہے تو میں زہر کھا کر مر جاتی۔ میں نے تو سسرال میں کسی سے بات بھی نہیں کی پہلی رات کو میں نے خدا سے دعا کی کہ میں محفوظ رہوں۔ میری دُعا قبول ہوئی۔ اور میرا خاوند جنسی شعور سے محروم ہو گیا۔ میں یہاں عجیب حالت میں ہوں۔ آنکھوں میں نیند نہیں آتی۔ ساری رات جاگتے کاٹتی ہوں۔ اور ہر وقت تیرے خیال میں ڈوبی رہتی ہوں۔ میری وفا کا یہ حال اور تو نے اپنے طعنوں سے میرے دل و جگر کو چھلنی کر دیا ہے۔ تو نے جلتی پر تیل کا کام دیا ہے۔ میرا دنیا میں تیرے سوا اور کوئی آسرا نہیں۔ میں تیرے سوا کسی اور کو سجدہ کرنا روا نہیں رکھتی۔ میں تیری کنیز ہوں۔ تیری باندی ہوں۔ کبھی بھیس بدل کر یہاں آ۔ تاکہ میں وصال کے آبِ حیات سے اپنی پیاس بجھاؤں۔ تو مجھے ایک نئی زندگی بخشے گا۔ اور پھر ہم دونوں مل کر آئندہ کے متعلق صلاح کریں گے۔

مہینوال نے جواب پڑھا تو سوچ میں پڑ گیا۔ کہ ملاقات کی صورت کیا ہو۔ آخر اس نے فقیر کا بھیس اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے جسم پر خاک ملی۔ اور در در بھیک مانگنے لگا۔ کسی سے گالیاں ملیں، کسی سے گھڑکیاں۔ کہیں خیرات بھی مل جاتی۔ وہ گلی گلی پھرتا اور کونجوں کی طرح کرلاتا" سوہنی کے سسرال پہنچا۔ اور اونچی آواز سے صدا دی۔ کہ فقیر کو بھیک دو۔ سوہنی کے کان میں آواز پڑی۔ اسے مہینوال کا شک ہوا لیکن یقین نہ آیا اتنے میں ساس نے کہا۔ جا فقیر کو خیرات دے۔ ہم تو فقیر کے آسرے پر زندہ ہیں۔ سوہنی نے ایک طرف ہو کر خیرات ڈالی۔ لیکن مہینوال نے اپنا رومال گرا دیا۔ سوہنی کو دیکھکر اس کے ہوش و حواس گم ہو گئے۔ دونوں گلے ملے۔ دل کی آگ بجھی۔ لیکن سوہنی کو یہ خوف دامنگیر ہوا کہ کہیں ساس نہ آجائے۔ اسلئے جلد جلد دونوں نے اپنا اپنا حال سنایا۔ اور پھر سوہنی نے مہینوال سے کہا۔ تو دریائے چناب کے کنارے اس گھاٹ پر صدق و یقین کے ساتھ بیٹھ۔ تیرا خدا حافظ ہو۔

مہینوال نے کنارِ چناب پر دھونی رمائی۔ دھیرے دھیرے لوگ اس کے پاس آنے لگے۔ اور ملاحوں کو تو اس پر اتنا اعتماد ہوا کہ وہ اپنی کشتیاں اس کے سپرد کر جاتے۔ جو گھر میں پکتا اسے بھیج دیتے اور ہر روز مچھلی کا شکار کر کے مہینوال کو بھی حصّہ

دے دیتے۔ مہینوال مچھلی کو بھون کر آدھی رات کے وقت کشتی پر سوار چناب کے اس پار جاتا۔ سوہنی سے ملاقات ہوتی۔ اکٹھے بیٹھ کر مچھلی کھاتے۔ اور پھر مہینوال ہنس کھیل کر واپس آجاتا۔ ایک رات چناب میں طوفان آیا۔ لیکن مہینوال کالی رات کو چیرتا ہوا جان کو ہتھیلی پر رکھ کر سوہنی کے پاس پہنچ گیا۔

وقت گزرتا گیا۔ ایک دن بڑی موسلا دھار بارش ہوئی۔ چناب کی طوفانی لہروں میں مچھلیاں پکڑنا ناممکن ہو گیا۔ مہینوال نے سوچا کہ محبوبہ سے ملنے جاؤں۔ اور مچھلی نہ لے جاؤں یہ آئین عشق کے خلاف ہے۔ وہ جھونپڑی میں آیا۔ اپنی ران سے گوشت کا ایک ٹکڑا کاٹا۔ مسالے لگا کر اُسے بھون کر تیار کیا۔ اور پٹی باندھ کر چناب کے اس پار گیا۔ سوہنی نے گوشت چکھا۔ تو طبیعت بہت بیزار ہوئی۔ کہنے لگی۔ سچ سچ بتا۔ یہ کیا بلا بھون کر لایا ہے؟ مہینوال بولا۔ کچھ نہیں۔ تیرے لئے مچھلی لایا ہوں۔ بڑے شوق سے کھا۔ اچھی طرح بھون کر لایا ہوں۔ آج مچھلی کچھ سخت ہے، اور تو کوئی بات نہیں۔ سوہنی ہنس کر کہنے لگی۔ میرے سردار۔ یہ مچھلی نہیں۔ اسکا تو کچھ اور ہی ذائقہ ہے۔ سچی بات کہہ دے! سوہنی کا اصرار ہوا تو مہینوال نے پٹی کھول کر اپنا زخم دکھا دیا۔ اور کہا۔ اگر تمہیں اب بھی لذت نہیں آئی تو مجھے جان سے مار دے۔ سوہنی زار زار روئی اور کہا۔ بس اب تم نے حد کر دی ہے۔ اب تم نہ آیا کرو۔ میں تمہارے پاس خود آیا کروں گی۔ دوسرے دن سے ہر رات سوہنی خود مٹکے کا سہارا لیکر تیرتی ہوئی چناب کے اس پار پہنچتی۔ اور واپسی پر مٹکا جھاڑیوں میں چھپا آتی۔

ایک رات سوہنی سنگار کر کے چلی۔ تو نند جاگ اٹھی۔ وہ دبے پاؤں سوہنی کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئی۔ سوہنی چناب کے کنارے پر پہنچی۔ جھاڑیوں کی اوٹ سے مٹکا نکالا۔ اور خدا کا نام لے کر مٹکے کے سہارے دریا کو پار کر لیا۔ نند یہ تماشا دیکھتی رہی۔ اتنے میں سوہنی واپس آئی۔ مٹکا انہی جھاڑیوں کی اوٹ میں رکھا اور گھر آکر سو گئی۔ نند نے چور کا کھوج لگا لیا۔ اور چور کو خبر بھی نہ ہوئی۔ صبح ہوئی تو نند بازار گئی۔ ایک کچا مٹکا لیا۔ اور اصل مٹکا اٹھا کر انہی جھاڑیوں کی اوٹ میں کچا مٹکا رکھ دیا۔ نند جب گھر پہنچی۔ تو ماں کو سارا قصہ سنایا۔ ماں یہ سنکر بہت خوش ہوئی۔ اس کی تو مراد بر آئی۔

قہر اور غضب کی رات سیاہ ماتمی لباس میں آئی۔ آدھی رات گزری۔ تو سوہنی روانہ ہوئی۔ رات اندھیری تھی۔ ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ تیز ہوا چل رہی تھی۔ بادل گرجتے تھے اور بجلی کڑکتی تھی۔ اور زمین کے تختے کو ہلا دیتی تھی۔ اجل سوہنی کو پکار رہی تھی۔ اور سوہنی قدم بڑھائے چلی جاتی تھی۔ دیو ہیکل درخت خون خشک کئے دیتے تھے۔ جانوروں کے ہول خوفناک آوازیں نکال رہے تھے۔ مصیبتوں کو جھیلتی اور اس قیامت کی رات کو چیرتی ہوئی خدا کا نام لیتی جھاڑیوں کی اوٹ کے قریب پہنچی تاکہ مٹکا اٹھا لے۔ حیران ہوئی کہ پکے مٹکے کی جگہ کچا مٹکا دھرا ہے۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ لیکن سوچا۔ خدا کی مرضی کے آگے کسی کی کیا پیش چل سکتی ہے۔ وہ چاہے تو مجھے زندہ رکھ سکتا ہے۔ اب پیچھے مڑنا ملامت

اسلئے کہ یہ عشاق کے دستور کے خلاف ہے۔ اگر میں پیچھے ہٹوں تو محبوب کی نظروں میں جھوٹی بنوں گی۔ یہ مجھ سے برداشت نہ ہوگا۔ میں کہہ چکی ہوں۔ میرا کعبہ مہینوال ہے۔ اب یہاں سے لوٹنا کفر میں داخل ہے۔ میرا عشق اسی صورت میں سچا ثابت ہوگا۔ اگر میں آج اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر نکلوں۔ آج یا دیدار یار ہوگا یا جان کی قربانی دینا ہوگی۔ یہ کہتی ہوئی وہ ایک عزم کے ساتھ پانی میں اتر گئی۔ اور اس طرح اپنے عشق کو بٹہ نہ لگنے دیا۔

سوہنی چناب میں اتری۔ تو زمین اور آسمان کانپ اُٹھے۔ طوفان اتنا شدید تھا کہ پانی کناروں تک چڑھ آیا تھا۔ سوہنی بجلی کی کڑک سے سہم گئی۔ لیکن اس نے اپنے دل کو تسلی دی کہ میں نے عشق سے منہ نہ موڑ کر عشق کی لاج رکھ لی ہے۔ مہینوال پر میری جان قربان ہے۔ وہ میری عزیز ترین متاع ہے۔ لیکن امید کی شاخ ٹوٹ گئی۔ زندگی کا باغ ویران ہونے لگا۔ امید کی کشتی ڈوبنے لگی۔ زندگی خواب و خیال نظر آنے لگی۔ مٹکا گداز ہو گیا۔ سوہنی ڈوبنے لگی۔ اس نے مہینوال کو پُکار پکار کر کہا۔ نزع کا وقت آگیا۔ موت کا فرشتہ مجھے قرار نہیں لینے دیتا۔ آہ میری قسمت میں لکھا تھا۔ کہ اس دنیا میں تجھ سے ملاپ نہ ہوتا۔ میں نے ساری عمر دکھوں میں گزاری۔ کبھی جی بھر کر تجھ سے باتیں نہ کیں۔ خدا کے لئے مجھ سے آکر مل۔ میری جان عذاب میں ہے۔ پروردگار نے مجھے گنہگار سمجھ لیا ہے۔ میرے بیلی۔ ملک الموت آپہنچا ہے۔ وہ میری جان لینا چاہتا ہے۔ مجھے تیری آس ہے۔ اب بھی وقت ہے۔ مجھ سے مل لے۔ پیارے۔ یونس کی مچھلی آن پہنچی۔ وہ میرا گوشت کھانا چاہتی ہے۔ میں تیری راہ میں کھڑی ہوں۔ مجھے ملاقات سے محروم نہ رکھ۔ مجھے تیری قسم پانی نے میرا سانس روک لیا ہے۔

سوہنی نے ماں کو یاد کر کے کہا۔ بھولی ماں۔ وہ کونسی منحوس گھڑی تھی۔ جب تو نے مجھے جنا تھا۔ مجھے گلا گھونٹ کر مار دیتی۔ زہر گھول کر پلا دیتی۔ مجھ غریب پر جو کچھ بیتی ہے اسے بھول جا۔ میری جان لبوں پر ہے۔ موت کی سیاہ اندھیری رات محیط ہے۔ میری ایک تمنا ہے کہ جب میرا ڈھول (محبوب) تجھے نظر آئے۔ اُسے پیار دینا۔

باری تعالیٰ کی بارگاہ میں فریاد کرتے ہوئے سوہنی بولی۔ تو نے مجھ پر اتنا بڑا قہر نازل کیا ہے لیکن میری ایک خواہش کو ضرور قبول کرنا۔ میں مر جاؤں تو میری قبر مہینوال کے ساتھ ہو۔ ان گھنگھور گھٹاؤں کی گرج اتنی تیز ہے کہ میری آہیں محبوب تک نہیں پہنچ سکتیں۔ تجھ سے میرا مقابلہ کیا؟ تو نے مہینوال کو مجھ سے چھڑا دیا۔ تجھ پر میرا بس نہیں چلتا۔ تو نے پلک جھپکتے ہی عاجزوں کا بیڑا چناب میں غرق کر دیا۔ تو نے مہینوال کے دشمنوں کو خوش کر دیا۔ میں روز حشر تیرے دربار میں دہائی دونگی۔

سوہنی محبوب کا نام لیتی اور خدا سے فریاد کرتی ہوئی چناب کی خوفناک لہروں کی نذر ہو گئی۔ اس کی نعش نے روح سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ اس اندھیری رات میں تو مجھے مگرمچھوں کے سپرد کر کے کہاں جا رہی ہے۔ دیکھ۔ ہاتھی کی طرح تیز پرواز کر کے

مہینوال کے پاس جا۔ میری طرف سے اس کے سامنے رو رو کر باہیں کھول کر فریاد کر۔ اسے بتا کہ میری آنکھیں نرگس کی طرح تیرے دیدار کی منتظر ہیں۔ تیری سوہنی چناب میں ڈوب گئی ہے۔ اسے موت نے اپنی آغوش میں لے لیا ہے۔ وہ سچی عاشق ہے۔ اس نے جان دیدی لیکن قول شکنی پسند نہ کی۔

دریائی جانور سوہنی کی نعش کے گرد منڈلانے لگے۔ سوہنی کی نعش پکاری۔ مجھ عاجز کو کچھ نہ کہو۔ میں مہینوال کی امانت ہوں۔ میرے جسم کو داغ نہ لگانا۔ باری تعالےٰ نے تم پر ہمارا گوشت حرام کر دیا ہے۔ جاؤ۔ میرے پیاروں کو میرے سجنوں کو میرا حال سناؤ۔ مجھے خدا کی قسم کہ میں اپنے محبوب کے انتظار میں ہوں۔

ادھر مہینوال سوہنی کے انتظار میں کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں سوہنی کی راہ دیکھتے دیکھتے تھک گئیں۔ وہ رونے لگا۔ آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔ دل کہہ رہا تھا۔ سوہنی پر کوئی آفت آئی ہے۔ اتنے میں سوہنی کی روح نے آکر مہینوال کو سوہنی کی تمام داستان کہہ سنائی۔ اور بتایا کہ سوہنی کو چناب کی خونی لہروں نے دبوچ لیا ہے۔ مہینوال یہ سنتے ہی بیہوش ہو کر گر گیا۔ ہوش میں آیا تو بڑے دردناک لہجے میں روح سے کہنے لگا مجھے تیری بات پر اعتبار نہیں آتا۔ مجھے سچ سچ بتا۔ سوہنی کس حال میں ہے۔ روح بولی۔ مجھے رسولِ کریم کی قسم۔ میں نے جھوٹ نہیں بولا۔ مہینوال باہیں پھیلا کر بولا۔ میرے دشمن تو نے کتنی منحوس خبر سنائی ہے۔ جی چاہتا ہے تجھے تیز کٹار سے ہلاک کر دوں۔ اس کا منہ زرد ہو گیا۔ دل میں درد کی ایک لہر اٹھی۔ اور کلیجے کا یہ حال تھا۔ جیسے کسی نے چھری مار دی ہو۔ دوسری بار بیہوش ہوا۔ تو روح چلی گئی۔ مہینوال دیوانہ وار چناب کے کنارے پہنچا۔ آہ و فغاں کی۔ اس کی آہ و فغاں سنکر خدا کے حکم سے سوہنی کی نعش بہتی بہتی کنارے کے قریب آ پہنچی۔ خدا نے سوہنی کی نعش میں بولنے کی قوت پیدا کر دی۔ وہ پکاری۔ میرے ساتھی۔ مجھ سے مل جا۔ مہینوال نے کہا۔ میں تجھ پر قربان جاؤں۔ اس نے دریا میں چھلانگ لگائی۔ نعش سے جا ملا۔ دل کی آگ بجھی اور مہینوال کی روح بھی قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ اتنے میں بجلی کڑکی۔ بادل گرجے اور موسلا دھار مینہہ برسنے لگا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے آسمان بھی ان عشاق کا ماتم کر رہا ہے۔ اُدھر یوسف زلیخا۔ لیلےٰ مجنوں۔ شیریں فرہاد۔ ہیر رانجھا۔ سسی پنوں۔ اللہ دیا ماہیاں جیسے عشاق صادق کی ارواح نے نوحہ کیا۔ زمین اور آسمان پر ہر جگہ غم و یاس کی گھٹائیں چھا گئیں۔ سوہنی اور مہینوال موت کی آغوش میں ہیں۔ لیکن دریائے چناب کی وادی میں ان کی محبت کے نغمے ہمیشہ گونجتے رہیں گے۔

خطوکتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے

فارغ بخاری

حیاتِ جاوداں

پھول کھِلتے رہے مرجھاتے رہے
پتیاں تند بگولوں کا کفن بنتی رہیں
نہ وہ بو باس نہ رعنائی نہ وہ کیف نہ رنگ
نہ وہ شاداب بہاریں نہ مہکتا ماحول
نہ چھلکتے ہوئے نغمے نہ مچلتے ہوئے گیت
نہ ہواؤں میں ترنم نہ فضاؤں میں نشہ
سرد لاشے جنہیں چھوڑ آیا ہے گزرا ہوا دور
اپنے ایوانوں کے طاقوں میں سجانے کے لئے
اور ماضی کے دھندلکوں نے جنہیں پھینکدیا
گہرے تاریک وزبوں غاروں میں

پھول کھلتے رہے مرجھاتے رہے
پتیاں تند بگولوں کا کفن بنتی رہیں
اور کبھی ایسے بھی رخشندہ شگوفے پھوٹے
جو خزاؤں کے تھپیڑوں سے بھی مرجھا نہ سکے
جنکو آغوش فنا میں بھی فنا چھو نہ سکی
لہلہاتے رہے اک عزم جواں سال کے ساتھ
لہلہاتے ہی رہینگے وہ ابد تک یونہی

چند خاص خاص
کتابیں

موضح القرآن	تفسیر	۱۰ روپے
فرعون وکلیم۔	انقلابی تاریخ	۳ روپے
حسنِ ادب۔	عالمی افسانے	۳ روپے
مدوجزر۔	ناول	۳ روپے ۴ر
اسلام اور یورپ	تبلیغی مباحثہ	۱۲ر آنے
منزل۔	سیاسی ناول	۴ روپے
شاہنامہ اسلام	چار حصے	۲۰ روپے
تلخابہ شیریں۔	شعروسخن	۵ روپے
نغمہ راز۔	نظم وغزل	۳ روپے ۴ر
سوزوساز	نظم وغزل	۳ روپے ۴ر
انقلاب جشن	تاریخ	۱۲ر آنے
خالد بن ولیدؓ	سوانح حیات	۲ روپے
قصص الانبیاء	سوانح حیات	۳ روپے ۴ر
تذکرۃ الاولیاء	"	۳ روپے
رسول مقبولؐ۔	سوانح پاک	۲ روپے
رکن دین۔	مسائل دینیہ	۲ روپے
دختران صحرا۔	پاکیزہ ناول	۲ روپے
خوان نعمت۔	کھانے پکانے	۱ روپیہ ۴ر
نافع اللغات۔	اردو لغت	۳ روپے
نعمان ومریم	تبلیغی ناول	۲ روپے
اعمال قرآنی	وظائف وعملیات	۱۲ر آنے
مناجات مقبول	منظوم دعائیں	۱۲ر آنے
امیر حمزہؓ	تاریخی داستان	۳ روپے

فہرست مفت طلب فرمائیے

تجرید البخاری مترجم

خدا کے بعد رسول ——— اور ——— قرآن کے بعد بخاری

چھ لاکھ احادیث کا منتخب مجموعہ، جس کی تکمیل ۱۶ برس میں ہوئی۔ جس طرح قول کے ساتھ کردار کا ہونا ضروری ہے، اسی طرح قرآن کے ساتھ بخاری کا ہونا بھی لازمی ہے۔ کتاب کے دو کالم ہیں۔ ایک میں اعراب کے ساتھ احادیث درج ہیں اور دوسرے میں صاف وشگفتہ ترجمہ۔

بڑی تقطیع۔ ضخامت: ۱۰۲۴ صفحات۔ کتابت وطباعت روشن۔ عمدہ کاغذ مضبوط جلد

(ہدیہ فی جلد: ——— بارہ روپے)

جہانِ اقبالؒ

ایک نیا خدا لے بنائی ——— دوسری کا خالق اقبالؒ ہے

آئیے ان دریچوں سے جہانِ اقبال کا نظارہ کیجئے:۔

(۱) اقبال کا مقام خودی (۲) اقبال کا نظریۂ فقر۔ (۳) اقبال کا تصور مومن و ابلیس۔ (۴) اقبال اور مسئلۂ تقدیر (۵) اقبال اور شاہین۔ (۶) اقبال اور دین وسیاست۔ (۷) اقبال کے طنزیات۔ (۸) اقبال کی پیشگوئیاں (۹) اقبال کا غیر مطبوعہ کلام اور اس کی شرح وتفسیر۔

بانگ درا سائز۔ ضخامت ۵۰۰ صفحات۔ کتابت وطباعت نفیس۔ سرورق آرٹ کا شاہکار

(ہدیہ فی جلد: ——— ۷ روپے ۸ر)

تاریخِ اسلام مکمل

(۵ حصوں میں)

دنیائے اسلام کے عروج وزوال کی حیرت انگیز داستان

گذشتہ ساڑھے تیرہ صدیوں میں مسلمانوں کے مذہبی، سیاسی، تمدنی اور معاشرتی کارناموں کا مبسوط مجموعہ۔ صرف یہی کتاب کا مطالعہ آپکو سینکڑوں دوسری کتابوں کی ضرورت سے بے نیاز کردیگا۔ اسلامی تاریخ کا کوئی ایک گوشہ ایسا نہیں جس پر اس کتاب میں سیر حاصل روشنی نہ ڈالی گئی ہو۔ اس وقت تک اس کے چودہ ایڈیشن چھپ کر مقبول ہو چکے ہیں۔

— بڑی تقطیع۔ ضخامت ۲۰۴۴ صفحات۔ کتابت وطباعت عمدہ۔ کاغذ جلد مضبوط۔ ہدیہ فی جلد دس روپے

ملک دین محمد اینڈ سنز۔ اشاعت منزل بل روڈ لاہور

کے ، ایل ، ایم ، اپنے فضائی راستوں کے ذریعہ

، سارے کرۂ ارض کو گھیرے ہوئے ہے
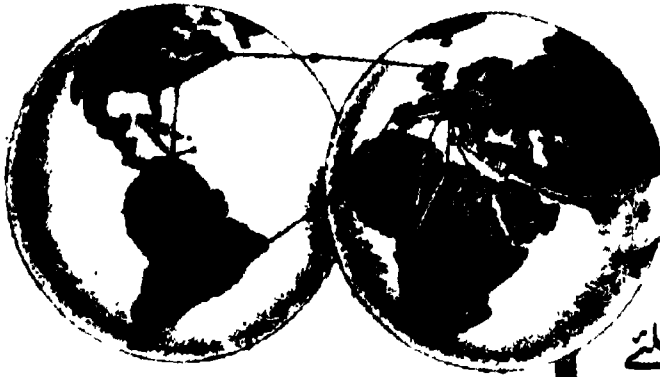
ہمیشہ K·L·M کے ذریعہ سفر کیجئے

کے ، ایل ، ایم دنیا کی قدیم ترین ، تیز رفتار اور آرام دہ کمپنی ہے۔

افواہیں دشمن کے زہریلے تیر ہیں۔ اپنی باتوں کے ان زہریلے تیروں سے وہ ہمارے تخیل کو پریشان اور ذہنوں کو تاریک بنانا چاہتا ہے۔ ہماری ہمتوں کو پست کرنا اپنے رہنماؤں کی طرف سے ہمارے اعتماد کو گھٹانا، پاکستان کے مستقبل پر ہمارا جو ایمان ہے اسے شکستہ کرنا، اور اس طرح ہمیں ہمیشہ کیلئے غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دینا۔ یہ ہے افواہوں کا زہر پھیلانے والوں کا مقصد۔ خبردار رہئے۔ افواہوں پر یقین نہ کیجئے۔ انہیں سچ سمجھ لینے سے پہلے کسی مستند اخبار سے بلکہ بہتر تو یہ ہے ریڈیو پاکستان کی خبروں سے ان کی تحقیق کر لیجئے۔

افواہوں پر یقین نہ کیجئے

افواہیں پھیلانے والوں کو پولیس کے حوالے کیجئے

جاری کردہ وزارت داخلہ حکومت پاکستان ۱۹۶۵ء۔

مونگا سمندری کیڑوں کی ایک قسم ہے جسے بعض لوگ غلطی سے پودا سمجھ لیتے ہیں۔ جمع کرنے اور بڑھتے رہنے کے فن میں کوئی اس سے بازی نہیں لے جا سکتا۔ اس کی زندگی صرف ایک کیڑے کی حیثیت سے شروع ہوتی ہے۔ وہ سمندر کی کسی چٹان سے چپک کر اپنی تعداد بڑھانے لگتا ہے یہاں تک کہ الگ الگ ہزاروں لاکھوں جاندار پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ آخر کار بڑی چٹانوں اور جزیروں کی صورت میں سطح سمندر سے ابھر کر انسانی آبادی کے قابل بن جاتے ہیں۔

جمع کرتے رہنے کی یہ مثال لائق تقلید ہے۔ چھوٹی چھوٹی رقمیں باقاعدہ بچاتے رہنے سے بہت جلد ایک بڑا سرمایہ بن جاتا ہے۔ بچت کا سب سے زیادہ آسان اور محفوظ طریقہ یہ ہے کہ پاکستان سیونگ سرٹیفکیٹ خرید لئے جائیں۔

پاکستان سیونگ سرٹیفکیٹ خریدنے کی تفصیلات

۱- یہ سرٹیفکیٹ ڈاک خانوں سے سیونگ بیورو سے یا منظور شدہ ایجنٹوں سے خریدے جا سکتے ہیں۔

۲- ہر شخص پندرہ ہزار روپے تک کی کوئی رقم جمع کر سکتا ہے (دو اشخاص مل کر تیس ہزار روپے تک جمع کر سکتے ہیں)

۳- مبلغ پانچ، دس، پچاس، سو، پانچ سو، ہزار اور پانچ ہزار روپے کی مالیت کے سرٹیفکیٹ مل سکتے ہیں۔ تھوڑی رقم بچانے والے چار چار آنے آٹھ آٹھ آنے اور ایک ایک روپے کے سیونگ اسٹامپ خرید سکتے ہیں۔

۴- ہر دس روپے بارہ سال کے بعد پندرہ روپے بن جائیں گے گویا ۴½ فی صدی سالانہ نفع ہوگا۔

۵- اٹھارہ ماہ کے بعد ہر سرٹیفکیٹ نفع سمیت بھنایا جا سکتا ہے (پانچ روپے والے سرٹیفکیٹ کی صورت میں بارہ ماہ کے بعد)

۶- حکومت اصل رقم اور نفع دونوں کی ادائیگی کی ضامن ہے۔

۷- اس طرح حاصل کئے ہوئے منافع پر انکم ٹیکس ادا کرنا نہیں پڑتا۔

پاکستان سیونگ سرٹیفکیٹ خریدئیے